خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر: ۳۳۴۴۴/۷۷ | قیمت فی شمارہ: پچیس روپے
شمارہ: پینتالیسواں | سالانہ: ۱۰۰ روپے (ہند)
قیمت: پچیس روپے | ۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۳۰ ڈالر (دیگر ممالک)

مخطوطات طب کے موضوع پر پہلے جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار کے مقالات کا ایک حصہ خدابخش لائبریری جرنل کے شمارہ ۲۹-۳۱ میں شائع ہوا تھا۔ اس شمارے میں اس سمینار کے **بقیہ مقالات شائع کیے جا رہے ہیں۔**

حکیم ظل الرحمن کے طویل مقالہ "علی گڑھ کے نادر طبی مخطوطات" کی پہلی قسط جرنل شمارہ ۲۹-۳۱ میں شائع ہوئی تھی۔ صفحہ $\frac{۱۲۸}{۱}$ تا $\frac{۱۲۸}{۷۴}$ اس مقالہ کی دوسری اور آخری قسط ہے۔

صفحہ ۱۵۹- ۲۲۰ میں متفرق مقالات ہیں جن کا سلسلہ بھی جرنل شمارہ ۲۹-۳۱ میں **صفحہ ۱۵۸ تک شائع شدہ مقالات سے جڑتا ہے۔**

پچھلے شمارے میں برصغیر پاک کے طبی مخطوطات کی تین جامع فہرستوں کے علاوہ چار مقالے شائع ہو چکے ہیں بقیہ ۴ مقالے اس شمارے میں شامل ہیں۔ کل ملاکر ۱۲ طبی مقالے نادر مخطوطات کے سلسلے میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے۔

۱۹۸۸ء

محبوب حسین نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ ۴ سے چھپوا کر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

فہرست

مختلف کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں محفوظ اہم طبی مخطوطات:

علیگڑھ کے نادر طبی مخطوطات

حکیم سید ظل الرحمن
(علیگڑھ)

اجمل خان طبیہ کالج لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

عربی و فارسی طبی ذخیرے کے نوادر

عربی مخطوطات

۱۔ تقویم الادویہ، مؤلفہ محمد بن علی اسفرائنی: علم الادویہ پر بیش قیمت کتاب ہے۔ یہ مفردات و مرکبات دونوں کے بیان میں ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جدول کے طرز پر ہے۔ اس میں بارہ جدولیں پیش کی گئی ہیں:

۱۔ عربی و یونانی نام، ۲۔ فارسی نام، ۳۔ بیان دوائیت و خاصیت، مثلاً دوا مطلق یا دوا و غذا وغیرہ، ۴۔ شناخت، ۵۔ انواع و اقسام، ۶۔ بہترین قسم، ۷۔ درجات مزاج، ۸۔ مقدار خوراک، ۹۔ منافع، ۱۰۔ مضر، ۱۱۔ مصلح، ۱۲۔ بدل۔

پہلا باب ادویہ مفردہ پر ہے جو کتاب کی اصل جان ہے۔ یہ بہت طویل ہے اور اس میں پانچ فصلیں ہیں۔ فصل اوّل ادویہ نباتیہ، فصل دوم لحوم اور شحوم اور اسی طرح مختلف اقسام کے دودھ ان کے منافع، فصل سوم روغن، فصل چہارم کھانے کے طریقوں اور فصل پنجم مختلف قسم کے پانیوں کے بیان میں ہے۔

کتاب کا دوسرا باب ادویہ مرکبہ سے متعلق ہے جو بہت مختصر ہے۔ خاتمہ بھی طویل نہیں ہے۔ اس میں حشرات اور کیڑوں مکوڑوں کے کاٹنے کا علاج تحریر کیا گیا ہے۔ جن کتابوں سے اس کی تالیف میں مدد لی گئی ہے ان میں جامع ابن بیطار، قانون، حاوی، منہاج، تجربیات، قرابادین، قلانسی، خجندی، موجز وغیرہ ہیں۔ ترقیمہ کے مطابق جمادی الاول ۱۱ سنہ جلوس اکبر شاہ کتابت ہوئی ہے۔ تقویم الادویہ کے نام سے کمال الدین ابوالفضل حبیش بن ابراہیم محمد التفلیسی (وفات تقریباً ۶۰۰ھ / ۱۲۰۳ء) کی بھی ایک مشہور کتاب ہے۔

۲۔ حاشیہ شرح اسباب، مؤلفہ حکیم شریف خاں: حکیم شریف خاں بن حکیم اکمل خاں بن حکیم واصل خاں سے پہلے اگرچہ خاندان میں طب کی تین پشتیں گزر چکی تھیں مگر ان کی بے مثال شخصیت، حذاقت اور تحریک کی وجہ سے یہ خاندان ان کے نام سے موسوم ہوا۔ خاندان شریفی کے متقدمین میں خواجہ محمود

محمود اور حاذقین میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نہایت نگوں جیسی شخصیتیں ہیں۔ حکیم شریف خاں ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ شارح اسباب و علامات حکیم عابد سرہندی سے تلمذ کا موقع ملا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ۱۲۳۱ھ/۱۷۹۹ء میں انتقال ہوا۔ مدارک الحکیم یعنی حاشیہ نفیسی، حاشیہ قانون، اسرار العلاج، علاج الامراض، عجالہ نافعہ، تالیف شریفی، رسالہ خواص الجواہر، تحفہ عالم شاہی وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔

حاشیہ شرح اسباب ۔ ۵۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ نسخہ کے کافی صفحات کی عبارت دیمک کی نذر ہوگئی ہے اور اس پر سادہ کاغذ چسپاں کر دیا گیا ہے۔ مخطوطہ کے شروع اور آخر میں حکیم مظفر حسین خاں لکھنوی کی مہریں ثبت ہیں۔

۳۔ **حاشیہ شرح اسباب**، مؤلفہ حکیم اسد علی: حکیم اسد علی حکیم درویش محمد کے صاحبزادے اور عارف و حکیم نجم اللہ الملقب بہ حافظ عالم خاں کے پوتے ہیں۔ یہ شاہجہاں آباد کے مضافات کے رہنے والے تھے۔ حکیم شریف خاں کا حاشیہ شرح اسباب چونکہ بہت طویل اور بسیط ہے۔ اس کے مضامین کے مطالعہ میں طلبا کی دشواری کے پیش نظر حکیم اسد علی نے یہ حاشیہ لکھا ہے۔ اس میں اس بات کا لحاظ ہے کہ کتاب کا نفس مطالب اور حل مزاحمت طلباء کے سامنے تمام ضروری مباحث آجائیں۔ یہ شرح ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱ء میں کی گئی ہے اور یہ ۵۵۲ صفحات پر مشتمل ہے ترقیمہ ندارد ہے۔

۴۔ **شرح قانون جلد سوم**، مؤلفہ علاء الدین قرشی: علاء الدین علی بن ابی الحزم قرشی المعروف بہ ابن النفیس جسے جالینوس ثانی کے نام سے یاد کیا گیا ہے، طبی مصنفین اور شارحین قانون کے درمیان بہت عظیم المرتبت نام ہے۔ دمشق میں مہذب الدین الدخوار سے طب کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد قاہرہ کے طبی مدرسہ منصوری سے متعلق رہا۔ اور وہیں بروز جمعہ ۱۱ ذیقعدہ ۶۸۷ھ/۱۲۸۸ء کو وفات پائی۔ ابن النفیس نے شادی نہیں کی تھی۔ اپنا عالیشان مکان، دوسری جائداد اور کتابیں سب بیمارستان منصوری کے لئے وقف کیں۔

ابن النفیس نے زندگی بھر تدریسی و تصنیفی مشغلہ جاری رکھا۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے اس مصنف نے قانون کی پانچوں جلدوں کی شرح کے علاوہ موجز القانون جیسی مشہور زمانہ کتاب اپنی یادگار چھوڑی۔ اس کے بے شمار شاگردوں میں امین الدولہ ابن القف، السدید الدمیاطی، ابوالفرج سکندری، ابن البرہان جرائحی، شامی قاموس نگار العمری جیسی شخصیتیں ہیں۔ عام شارحین قانون کا انداز یہ تھا کہ اور

حمایت کی ہے جس میں ابن سینا کی ہر مسئلہ میں تائید اور موافقت کی گئی ہے۔ وہ نئی بات کہہ سکے اور قرانی کی شرحوں میں مزید اضافہ اور تحقیق کی گنجائش محسوس کی جاسکی۔ علاء الدین قرشی اس خالص اعتقادی اور تقلیدی طرز سے مستثنیٰ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کے ہاں اعتدال باقی نہیں رہ سکا۔ شیخ پر تنقید میں وہ حد سے زیادہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ بقول حکیم غلام حسنین کنتوری قانون کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جسے اس نے مخدوش نہ قرار دیا ہو۔ جبکہ آملی اور گیلانی نے یہ روش اختیار کی کہ شیخ کی حمایت میں قرشی کے ہر اعتراض کا جواب ضروری سمجھا۔

قرشی کی شرح کلیات کا ایک نفیس مخطوطہ حکیم محمد احمد خاں دہلی کے پاس راقم نے دیکھا تھا۔ اس پر دوسری مہروں کے ساتھ ایک مہر عنایت خاں شاہجہانی ۱۰۴۲ھ کی تھی۔ خدا بخش لائبریری میں اس کا صرف جلد اول و دوم کی شرح ہے۔ جلد دوم پر ایک مہر ۱۰۸۴ھ کی ثبت ہے۔ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں شرح قرشی کے چار مکمل حصے موجود ہیں۔ وہاں صرف جلد پنجم کی شرح نہیں ہے۔ حیدرآباد میں معالجات کی شرحیں ہیں۔ راقم الحروف کا ذخیرہ بھی جلد سوم چہارم اور پنجم کی شرح سے مزین ہے۔ ادارۂ تاریخ و تحقیق طب تغلق آباد میں جلد سوم و چہارم یعنی معالجات کی دونوں شرحیں ہیں۔ رضا لائبریری رامپور کا یہ امتیاز ہے کہ وہاں اس کے پانچوں حصے محفوظ ہیں۔

طبیہ کالج علی گڑھ میں شرح معالجات جلد سوم کا یہ نسخہ نہایت نفاست و اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ اس ضخیم کتاب کے قلم کا حسن آخر تک اسی پرکاری کے ساتھ برقرار ہے۔ پہلا صفحہ مطلّیٰ ہے اور اس کی تزئین دیدہ زیب ہے۔ ہندوستان میں موجود نسخوں میں یہ سب سے عمدہ اور نفیس مخطوطہ ہے۔ یہ مخطوطہ سلاطین اودھ کے کتب خانہ میں رہا ہے۔ اس پر امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کی مہریں ہیں۔ احمد نگر میں یہ جن صاحب ذوق کی ملکیت رہا ہے اس کے ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء کے دستخط ہیں۔ ۱۰۲ قیمت درج ہے۔ دوسرے دستخط ۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء کے ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری میں شرح قرشی کلیات کے ناتمام نسخہ کے علاوہ شرح قرشی جلد سوم بھی محفوظ ہے۔ یہ امراض جگر کے بیان سے شروع ہوتی ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

۵۔ شرح قانون جلد چہارم و پنجم، مؤلفہ علاء الدین قرشی: یہ حمیات قانون (جلد چہارم) بلکہ قرابادین قانون (جلد پنجم) کی شرح ہے۔ اس کے ذریعہ نہ صرف ابن سینا بلکہ علاء الدین قرشی کی حمیات اور ادویہ مرکبہ کے سلسلہ میں فنی کاوشیں سامنے آتی ہیں۔ قرابادینی مطالعہ میں جلد پنجم کا

یہ شرح نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ قانون کے اس حصہ کو زیادہ موضوع نہیں بنایا گیا ہے حالانکہ مختلف اعتبارات سے یہ اس فن کی توجہ کا مستحق ہے۔

طبیہ کالج میں موجود یہ دونوں شرحیں ایک جلد میں مجلد ہیں۔ ترقیمہ موجود نہیں ہے اور نہ جلد سوم کی شرح کے مخطوطہ کی طرح اس میں کوئی ندرت ہے۔

۶۔ شرح قانون جلد چہارم، مؤلفہ علی گیلانی: علی گیلانی کو مکمل قانون کی شرح کا شرف حاصل ہے۔ اس کی جلد اول یعنی کلیات کی شرح آملی کی شرح کلیات کے ساتھ جامع الشرحین کے نام سے طبع ہو چکی ہے۔ باقی چاروں جلدیں غیر مطبوعہ ہیں۔ طبیہ کالج لائبریری میں صرف جلد چہارم یعنی حمیات کی شرح موجود ہے۔ گیلانی معانی کی تحقیق اور ندرت کے خیال میں اگرچہ اپنے پیش رو شارح علاء الدین قرشی ابن نفیس کے مرتبہ کا نہیں ہے لیکن مکمل قانون کی شرح کے امتیاز کے ساتھ ہی اس کے بعض اضافے قابل قدر ہیں۔ اجمل خاں اس کی شرح قانون کے بہت معترف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ گیلانی نے قانون کی شرح میں ہر عضو کے امراض کی تشریح کر کے آخر میں بہت سے وہ امراض اسباب، علامات و معالجات اپنی طرف سے اضافہ کئے ہیں جنہیں شیخ نے نہیں لکھا ہے۔

شرح گیلانی کے نسخوں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ اجمل خاں کے استاد حکیم جمیل الدین صدیقی نگینوی کے حوالے سے ملتا ہے: "حکیم گیلانی نے جو دربار اکبری کے نورتنوں میں سے تھے جب قانون کی شرح لکھی تو اپنے غلاموں کو ایک خاص طرح کے خط نسخ کی مشق کرا کے شرح مذکور کی متعدد نقول ان سے لکھوائیں۔ ان میں کا ایک نسخہ حکیم اجمل خاں کے کتب خانہ میں بھی تھا۔ اس شرح کا خط حکیم صاحب کو بہت پسند آیا۔ وہ اس کی پوری پوری نقل کر لیا کرتے تھے۔ حکیم عبدالمجید خاں مزاحاً ان کے اس شوق کو "کار غلامان" کہا کرتے تھے"۔ راقم الحروف نے حکیم محمود احمد خاں مرحوم کے پاس شرح مذکور کا یہ نسخہ دیکھا تھا۔

حکیم اجمل خاں نے ایک کتاب المحاکمۃ بین القرشی والعلامۃ کے نام سے لکھی تھی۔ خدا جانے اس کے مسودے کا کیا حشر ہوا۔ انھوں نے اس کتاب پر قرشی و گیلانی کے درمیان متنازعہ مسائل میں اپنی فیصلہ کن رائے ظاہر کی ہے۔ قرشی کی ذہانت اور قانون پر تنقیدی اعتراضات اور گیلانی کی شیخ کی طرف سے صفائی کی کوشش اور ان سے اجمل خاں کے تاثر کے پیش نظر یہ محاکمہ بہت دلچسپ اور اہم ہوگا۔

۷۔ شرح مسائل حنین، مؤلفہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن علی بن ابی صادق: ابن ابی صادق ابن

سینا کے ممتاز شاگردوں میں ہے۔ یہ نیشاپور کا باشندہ اور صاحب فن طبیب تھا۔ بقراط اور جالینوس کی تصانیف
پر گہری نظر تھی اس نے ۴۵۹ھ/۱۰۶۶ء میں جالینوس کی کتاب منافع الاعضاء کی شرح کی۔ بقراط کی
کتاب الفصول اور کتاب تقدمۃ المعرفۃ پر بھی اس کی شرحیں ہیں۔ حنین بن اسحق کی کتاب المسائل کی
اس نے بڑی مفصل شرح لکھی ہے۔

شرح مسائل دس فصول پر مشتمل ہے۔ کلیات، معالجات، قوانین ادویہ مفردہ و مرکبہ، حمیات، اور اورام وغیرہ
اس کے مباحث میں شامل ہیں۔ کتاب المسائل کی پوری عبارت لکھنے کے بعد شرح تحریر کی گئی ہے۔ اس طرح
اس کے ذریعہ نہ صرف ابن ابی صادق کی شرح بلکہ اصل کتاب بھی سامنے آجاتی ہے۔ ابن ابی صادق کی کتابوں
میں اس شرح کا اختصار بھی ملتا ہے۔ شرح مسائل کا یہ نسخہ ۲۱۲ صفحوں میں ہے۔ ناقل کا نام اور سنہ کتابت
درج نہیں ہے۔ یہ کتاب ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء میں حکیم عابد حسین بن حکیم محمد حسین بن مسیح الدولہ حکیم مرزا علی
حسن خاں لکھنوی کی ملکیت میں پہنچی ہے۔

۸۔ **کشف الاشکالات**، مؤلفہ حکیم محمد ہاشم بن حکیم محمد احسن بن حکیم محمد افضل دہلوی:
برہان الدین نفیس کی کتاب شرح الاسباب والعلامات جو معالجات کے نصاب کی مشہور کتاب ہے۔ اس
کے مشکل مقامات کی توضیح میں حکیم محمد ہاشم نے عربی ہی میں یہ ضخیم کتاب تالیف کی ہے۔ شرح اسباب کی
تشریح اور حل مطالب میں یہ کتاب شاہ عالم کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان میں طب کے عربی سرمایہ
اور بالخصوص معالجاتی ذخیرہ کی ایک اچھی کتاب ہے۔ نام سے تاریخ تالیف برآمد ہوتی ہے۔ شرح اسباب
کا یہ حاشیہ انھوں نے اپنے زمانہ شباب میں ۱۱۸۴ھ میں لکھا تھا۔ مخطوطہ ۵ محرم بروز شنبہ ۱۲۸۱ھ کو نقل
کیا گیا ہے۔ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں بھی اس کے
نسخے موجود ہیں۔ ذخیرہ سبحان اللہ مولانا آزاد لائبریری کا نسخہ ۱۲۶۱ھ کا مکتوبہ ہے۔ فضل رسول بن حکیم
سید امام بخش حسینی واسطی بلگرامی اس کے ناقل ہیں۔ صفحات کی تعداد ۸۰۷ ہے۔

۹۔ **کتاب المیامیر**، مؤلفہ فخر الدین محمد بن علی بن ابی نصر نیشاپوری اسفرائنی: معالجات پر
ایک قابل قدر کتاب ہے جس میں اس فن کی معتبر کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اس میں ۲۲ میامر ہیں
اور ہر میمر متعدد مقالات اور ابواب پر مشتمل ہے۔ مرض کی ماہیت اور اسباب سے بہت اچھے انداز میں
گفتگو کی گئی ہے۔ مثلاً خفقان کے مختلف اسباب گناتے ہوئے ایک سبب حلق کے داخلی عضلات کا

کا ورم یا فقرات العنق میں سے سقطہ، ضربہ یا عضلات کے ورم کی وجہ سے کسی نقوہ کا ہٹنا ہے۔
۱۵۰ صفحات کی اس کتاب کو ۱۵ رجمادی الاول ۱۳۱۳ھ کو سید حامد حسین نے نقل کیا ہے۔

فخرالدین اصفرائنی نے ۱۰۵۰ھ/ ۱۳۴۹ء میں قال اقول کے نام سے الفصول الایلاقیہ کی شرح لکھی ہے۔ ان کی کتاب تقویم الادویہ کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔

۱۰۔ **مجربات خواص**، مؤلفہ ابوالعلاء ابن زہر: یہ ابن زہر کے مجربات ہیں۔ ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔ حرف الف کی ابتداء انسان سے ہوتی ہے۔ انسان کے بال، ناخون، دودھ، بول و عرق کے خواص بیان کئے ہیں۔ اس میں اگرچہ ادویہ مفردہ تحریر ہیں لیکن ابن زہر نے صرف انہی دواؤں کو لیا ہے جو اس کی ذاتی تجربہ میں مفید ثابت ہوئی ہیں۔ حیوانی ادویہ کی تعداد کافی ہے۔ جن اطباء کے حوالے ہیں ان میں عرب اطبا علی بن ربن الطبری، محمد بن زکریا رازی، یوحنا بن سرابیون اور دیمی کے علاوہ بیشتر یونانی عہد کے مصنفین ہیں مجربات ابن زہر کے حوالے بعد کے لوگوں کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں۔ ڈیڑھ سو صفحات کا یہ مخطوطہ کافی خوشخط ہے۔ ترقیمہ اگرچہ نہیں ہے لیکن نسخہ زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۱۱۔ **مدارک الحکیم**: مؤلفہ حکیم شریف خاں دہلوی: حکیم شریف خاں (وفات ۱۲۳۱ھ/ ۱۷۹۹ء) جنہوں نے طبع زاد کتابوں کے علاوہ درسی کتابوں کے حاشیے، شرح اور ترجمے کے فرائض انجام دیے ہیں، جہاں انہوں نے حاشیہ قانون، ترجمہ حمیات قانون، شرح موجز، حاشیہ شرح اسباب لکھا وہاں مدارک الحکم کے نام سے نفیسی کا حاشیہ بھی تحریر کیا۔ یہ نفیسی کے فن اول کی عالمانہ توضیح ہے جس سے ان کی مہارت فن اور اعلیٰ علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے۔

ترقیمہ نہیں ہے۔ مدارک الحکم کے نسخے رضا لائبریری رامپور، اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد اور خدابخش پٹنہ میں ہیں۔ اس کا ایک مخطوطہ حکیم محمود احمد خاں دہلوی کے ذخیرہ میں راقم کو دیکھنے کو ملا تھا اس پر ان کے جد بزرگوار حکیم محمود خاں کے دستخط تھے جو حکیم شریف خاں کے پوتے ہیں۔

۱۲۔ **منتخب کتاب الارشاد فی مصالح الانفس والاجساد**، یہ کتاب الارشاد کا صرف تیسرا مقالہ ہے۔ اسی لئے اس کو منتخب کتاب الارشاد کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تیسرا مقالہ حفظ صحت و مداواۃ امراض میں ہے اور اس میں ۲۴ فصلیں ہیں۔ پہلی فصل خلاف قوانین حفظ صحت، دوسری حمیات، تیسری وباء، چوتھی بحران، پانچویں جدری و حصبہ، چھٹی جرب و حکہ اسی طرح پھر دوسری فصلیں امراض سے متعلق ہیں۔ آخری فصل

امراض ناخن کے بیان میں ہے۔ ان فصلوں میں مرض کی مختصر ماہیت کے بعد علاج تحریر کیا گیا ہے۔ یہ تیسرا مقالہ ۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترقیمہ ندارد ہے۔

۱۳۔ معالجات ایلاقی: سید محمد بن محمد بن یوسف ایلاقی نیشاپوری (وفات ۴۶۰ھ/۶۸-۱۰۶۷ء) پانچویں صدی کا معروف طبیب اور ابن سینا کا شاگرد ہے۔ اس کی ذات علمی و عملی کمالات کا مجموعہ تھی۔ جس طرح اس کے رفیق درس ابو عبید جوزجانی نے تفسیر مشکلات قانون لکھ کر قانون کے پیچیدہ مقامات کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اسی طرح اس نے الفصول الایلاقیہ کے نام سے استاد کی کتاب کا اختصار تیار کیا۔ اس کی یہ تلخیص طب کے علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ متعدد لوگوں نے اس کی شرحیں لکھیں۔ اس کے شارحین میں محمد بن علی المعروف فخر الدین اسفرائنی، سدید الدین محمد سمنانی، محمد آملی، ابوالفضا منصور بن محمد تبریزی، محمد بن عمران وغیرہ ہیں۔

فصول ایلاقیہ کے علاوہ اس نے معالجات قانون جلد سوم و چہارم کی بھی تلخیص کی ہے جو معالجات ایلاقی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ امراض کے لحاظ سے مرتب ہے۔ طبیہ کالج کا یہ نسخہ ۱۰۰۵ھ/۱۵۹۶ء کا المکتوبہ ہے۔ اور یہ ۴۰۰ صفحات میں ہے۔ رضا لائبریری میں اس کا ایک زیادہ قدیم مخطوطہ ۵۹۴ھ/۱۴۸۹ء کا ہے۔ اسی لائبریری میں اس کا دوسرا نسخہ ۱۱۵۶ھ/۱۷۴۳ء کا بھی محفوظ ہے۔ مولانا آزاد لائبریری کے علاوہ ادارہ تاریخ و تحقیق طب تغلق آباد میں اس کا ۱۲۳۵ھ کا نقل شدہ نسخہ ہے۔

ذخیرہ سبحان اللہ خاں مولانا آزاد لائبریری میں اس کا نسخہ متعدد رسائل کے جس مجموعہ کے ساتھ شامل ہے، اس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ رسالہ بیخ چینی: عماد الدین محمود شیرازی

۲۔ رسالہ [illegible]

۳۔ رسالہ چوب چینی حکیم مرزا قاضی بن کاشف الدین۔ اس میں خواص قہوہ و چائے کا بیان بھی ہے۔ چوب چینی کے ذیل میں عماد الدین محمود کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ عماد الدین کے رسالہ چوب چینی کے صفحات کی تعداد ۹ ہے۔

۴۔ اصول التراکیب محمد بن علی بن عمر سمرقندی عربی

۵۔ مطلع النیرین بیجاپوری [illegible]

یہ مجموعہ حکیم مولوی تراب علی بلگرامی کی حسب فرمائش سید خیر علی نے یکم ذی قعدہ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء کو نقل کیا ہے۔ اس کے سرورق پر مالک کی حیثیت سے حکیم تراب علی کی تحریر ہے۔ بعد میں یہ کتاب علی نقی بن سید مظہر احمد حسینی کی ملکیت میں آئی ہے۔ ان کے ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء کے دستخط ثبت ہیں۔

کتاب الطب الایلاقی کے نام سے مولانا آزاد لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ ۶۸۶ صفحات پر پھیلا ہوا یہ بڑا بیش قدر مخطوطہ ہے۔ تجلید نو کے وقت درمیان میں باریک کاغذ لگا کر اسے محفوظ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

۱۴۔ منافع الاعضاء جالینوس: علم منافع الاعضاء پر یونانی طب میں دوسرے مضامین کے مقابلہ میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جالینوس ان مصنفین میں ہے جسے اس موضوع پر پہلے مصنف کا درجہ حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس موضوع کو جدید مضمون سمجھ لیا گیا ہے جبکہ ماہیت الامراض اور معالجات وغیرہ یونانی مضامین کے بطور شامل ہیں۔ اور یونانی مصنفین نے ان موضوعات پر جو کام کیا ہے اسے اہل فن کے ہاں پوری اہمیت حاصل ہے۔ لیکن منافع الاعضاء جیسا اہم مضمون بالکل ہمارے ہاتھ سے نکلا ہوا ہے اور اس میں یونانی نظام طب کی روشنی میں کوئی قابل ذکر کام موجود نہیں ہے۔ جالینوس کی یہ کتاب اس مضمون کے مطالعہ میں ایک بنیادی اور ابتدائی خاکہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے بنیاد بنا کر اس کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

۲۵۹ صفحات کا یہ مخطوطہ اگرچہ قدیم نہیں ہے اور یہ سید ابوالقاسم عرف سید مولوی کشمیری کا ۱۵ ربیع الاول ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء کا مکتوبہ ہے۔ لیکن یہ جس نسخہ سے منقول ہے وہ نواب علوی خان کے دست خاص سے لکھا ہوا تھا۔ اس سے حکیم علوی خان کے اس مضمون سے شغف کا پتہ چلتا ہے۔

●●

فارسی مخطوطات

۱۔ آئینۂ سکندری: سلطان سکندر لودھی کے عہد میں جو علمی وفنی کام انجام پائے ان میں معدن الشفا سکندر شاہی نہایت معلوم کتاب ہے۔ جس کا اس عہد کی کتابوں کے ساتھ عام طور پر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس عہد کی کتاب آئینۂ سکندری محتاج تعارف ہے اور عام طبی تاریخی حلقے اس کے نشان سے بے خبر ہیں۔ دیباچہ میں مؤلف نے لکھا ہے۔ "چوں حضرت سلطان نشان، قاآنی خاقانی ذات ملک سلیمانی عیسیٰ انسان عالم عینی الخلد آدم المنفرد بالدولۃ الابدیۃ المحقق بالسعادۃ السرمدیۃ من الملک المنان جلال الحق والسلطنۃ والدین الخان بن الخان سلطان سکندر بہادر شاہ جعلہ اللہ تعالیٰ آثار معدلہ علی مفارق العالمین در ربط روابط دولت و اطناب سرادقات الخلافۃ باوتاد الخلود الی یوم الدین الزید کمینہ بندگان درگاہ عالم پناہ رسالہ مشتمل بر معالجات بیماریہای دیدہ طلب فرمودند این خاکسار باوجود عدم بضاعت بالعین والراس اطاعت نمودن واجب دیدہ بر تالیف آں اقدام نمود و این رسالہ را آئینۂ سکندری نام نہاد۔ وباللہ التوفیق۔"

معالجۂ عین کے بیان سے قبل بطور مقدمہ آنکھ کی تشریح بیان کی گئی ہے۔ پہلے باب میں ۲۵ فصلیں ہیں۔ اس میں دمعہ، ناسور، بیاض، تہیج، ترفہ، ثؤلول، مکنہ، سلاق، شرناق، شعر زائد، انقلاب شعر، انتشار، شترہ، التصاق وغیرہ امراض کا بیان ہے۔ دوسرا باب امراض طبقہ ملتحمہ سے متعلق ہے اور اس میں سات فصلیں ہیں۔ تیسرا باب امراض طبقہ قرنیہ پر ہے اور اس میں تین فصلیں ہیں۔ چوتھا باب امراض طبقہ عنبیہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پانچواں باب بینائی کے احوال میں ہے اور اس میں چار فصلیں ہیں۔ چھٹا باب دردہائے چشم اور تدابیر ادویہ کے بیان میں ہے۔ اس میں شادنج، توتیا، مرقشیشا اور سنگ سرمہ کا طریقہ استعمال درج کیا گیا ہے۔ ۱۷ صفحات کے اس رسالہ میں ہر صفحہ میں تقریباً ۱۱ سطریں ہیں۔ سن تحریر موجود نہیں ہے۔ حکیم ضیاء الحسن بھوپال کے ذخیرہ کی کتاب ہے۔

۲۔ انتخاب التحفہ و منتخب التحفہ، مؤلفہ امیر علی: تحفۃ المومنین تصنیف ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء

حکیم میر محمد مومن تنکابنی کی علم الادویہ کی مشہور کتاب ہے۔ امیر علی نے اس ضخیم کتاب کا انتخاب تیار کیا ہے۔
انھوں نے لکھا بھی ہے کہ تحفۃ المومنین کی طوالت کی وجہ سے جس میں کہ خواص الاشیا، ضروری اور غیر ضروری مرقوم ہے
مطالعہ میں دقت پیش آتی ہے، طالب علموں کی آسانی کے لیے خاص طور پر اس اختصار کی ضرورت محسوس کی گئی۔
آخر کے صفحات موجود نہیں ہیں اور یہ "ل" کی تختی میں حرف لین تک کے بیان میں ہے۔

امیر علی حکیم سید محمد حسین دہلوی سانبھر والے کے صاحبزادے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ایک دلچسپ
بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے مخطوطہ میں مرتب کے نام کی یہ عبارت تھا خواجہ عباس علی بن خواجہ محمد معظم خاں نبیرہ
خواجہ ایوب المخاطب نواب جمیل بیگ خاں اورنگ آبادی از شفقت و عنایت استادمن جناب حکیم صاحب
قبلہ حکیم میر محمد حسین سانبھری "قلمزد کرکے اس کی جگہ امیر علی ولد حکیم میر محمد حسین لکھا گیا ہے۔ اس طرح خواجہ
عباس علی نے اسے مرتب کرکے اپنے استادزادہ کا نام دے دیا ہے۔

۳۔ احسن التجارب، مولفہ ہردیال منشی ہندسی: منشی ہردیال طب، رمل، ہندسہ اور
نجوم کے ماہر تھے۔ انھوں نے اپنے اور دوسرے ماہرین فن کے تجربات احسن التجارب کے نام سے مرتب کیے ہیں۔ ان
کا یہ کام ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۸ء میں انجام پایا ہے۔ اس میں امراض کے نسخے نہیں ہیں بلکہ اس کے فن اول کے باب اول
میں بعض ادویہ کا امتحان، باب دوم میں اصلاح ادویہ، باب سوم میں کیفیت ترتیب ادویہ مرکبہ، باب چہارم کی
فصل اول میں طریق گرفتن ادویہ، فصل دوم میں مدت بقائے ادویہ مرکبہ، فصل سوم میں غسل جریات، باب پنجم
میں تکلیس معدنیات، باب ششم میں تدبیر ادویہ، باب ہفتم میں استخراج و ترتیب اجزا کا بیان ہے۔ فن دوم
معالجات امراض میں ہے۔ اس مجموعہ میں رسالہ نقد محمد بیگ بھی شامل ہے۔

۴۔ النسخ المجربات المنتشرات، مولفہ رحمت اللہ: مرتب نے اس رسالہ میں منتشر
مجرب نسخے جمع کیے ہیں۔ یہ کسی ترتیب کے بغیر ہے۔ پہلا نسخہ خضاب کا ہے، پھر شبکوری، آتشک اسی
طرح متفرق نسخے مختلف امراض کے تحریر ہیں۔ جن لوگوں کے حوالے سے نسخے بیان کیے ہیں ان میں مرزا یار علی،
رمضان علی، حکیم محمد خاں کے علاوہ زیادہ نسخے حکیم ولی اللہ کے حوالے سے ہیں۔ نسخہ کی کتابت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔
بہت خوش خط لکھا ہوا ہے۔ ۷۵ صفحات کا مجموعہ ہے۔

۵۔ بیاض حکیم نورالحسن، حکیم سید نورالحسن بھوپال کے گرامی منزلت طبیب ہیں۔ ان کے والد
حکیم سید حسن نواب سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال پہنچے تھے۔ حکیم نورالحسن نے حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں دہلوی

اور حکیم محمد محسن (بھوپال) سے طبی تعلیم حاصل کی۔ نواب سلطان جہاں بیگم کے زمانہ میں افسر الاطبا ریاست ہوئے۔ بھوپال میں بڑی شان سے انہوں نے طبی روایات کو آگے بڑھایا۔ ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں آصفیہ طبیہ کالج کے قیام میں ان کا بڑا حصہ رہا۔ انہیں کے زیر نگرانی اس نے اپنی ابتدائی منزلیں طے کیں۔ ۱۹۱۲ء میں ان کے انتقال پر فرمانروائے وقت نواب سلطان جہاں بیگم نے ان الفاظ میں انہیں خراج عقیدت پیش کیا تھا۔

"ان کا دماغ طب کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اور اس کے ساتھ خلق و انکسار اور بنی نوع انسان کی ہمدردی کی صفت بھی بدرجہ اتم ان میں موجود تھی۔ یہ ہمارے زمانہ ولی عہدی میں ہماری ڈیوڑھی کے طبیب تھے جب میں مسند نشین ریاست ہوئی اور حکیم فرزند علی نے انتقال کیا تو میں نے بلحاظ استحقاق و قابلیت افسر الاطبا کے عہدہ پر مامور کیا۔ ان کا وجود ایثار و خلق کا ایک بہترین نمونہ تھا جو بھوپال کے ہاتھ سے جاتا رہا۔"

افسر الاطبا حکیم سید ضیاء الحسن اور حکیم سید قمر الحسن مدیر طبی روزنامہ قدیم ان کے عالی قدر صاحبزادے تھے۔ حکیم نور الحسن کی یہ بیاض ادویہ باہمہ ایک عجیب مجموعہ ہے۔ ۲۷ صفحات پر مشتمل ---------

---------- اس کی تاریخ اختتام ۲۳ ذی قعدہ ۱۳۰۷ھ تحریر ہے۔ ---------

---------- اس میں متعدد نسخے ان کے استاذ حکیم غلام محمد کے حوالے سے مذکور ہیں، ایک جگہ شیخ قطب الدین کو بھی اپنا استاذ لکھا ہے۔

اس جلد میں حکیم نور الحسن کی مرکبات پر مشتمل ایک بیاض بھی ہے جس میں قرابادین کی طرز پر ادویہ مرکبہ درج ہیں۔ طبیہ کالج لائبریری میں حکیم نور الحسن کی ایک بیاض تجربات ڈاکٹری بھی موجود ہے۔ اس میں فارسی میں مختلف امراض کی ایلوپیتھی دوائیں لکھی ہیں۔

۶- **بیاض علوی خاں:** یہ دراصل علوی خاں کی قرابادین ہے۔ اس میں حروف تہجی کے لحاظ سے مرکبات درج ہیں۔ مثلاً پہلا مرکب اطریفل اسطوخودوس ہے۔ دوسرا اطریفل زمانی۔ اسی طرح مختلف شکلوں کے مرکبات حب، جوارش، لعوق، معجون، مفرح وغیرہ شامل کتاب ہیں۔ یاقوتی مرکبات پر کتاب ختم کی گئی ہے۔

مخطوطہ بروز یکشنبہ ۵ جمادی الثانی ۱۲۲۵ فصلی کو نقل ہوا ہے۔ حکیم ضیاء الحسن کے ذخیرہ کی کتاب ہے۔

۷۔ **تذکرۂ شریفی**: حکیم شریف خاں دہلوی ہندوستان کے مایہ ناز طبیب ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں علاج الامراض، تالیف شریفی وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب دراصل ان کے اقوال اور نسخہ ہائے مطب کا مجموعہ ہے جسے ان کے کسی شاگرد نے مرتب کیا ہے۔ نہایت تجربہ پر مبنی ہے۔ یہ طبی ارشادات دوران درس یا دوران مطب طلباء کے افادہ کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں علاج امراض سے متعلق طبی کام کی باتیں آگئی ہیں۔ ان کے مطب کے علاجی واقعات بھی مذکور ہیں۔ اس سے تشخیص و تجویز کے سلسلہ میں خاص طور پر رہنمائی ملتی ہے۔ ۱۷۶ صفحات کی یہ کتاب شریف خانی سلسلہ کی ایک قابل مطالعہ کتاب ہے۔ اس کا تعلق بھی حکیم ضیاء الحسن کے ذخیرہ سے ہے۔

۸۔ **جامع المجربات**، مؤلفہ حکیم امام بخش: حکیم امام بخش بن شیخ پیر محمد ساکن بلوا گھاٹ جونپور، حکیم سید غلام علی جونپوری (محلہ سپاہ) کے شاگرد ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد حکیم غلام علی کے مجربات کے علاوہ دوسری بیاضوں اور حواشی کتب متفرقہ کے ذریعہ اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب میں اپنے استاذ کے صاحبزادہ قاضی سلامت علی خاں سے بھی مدد لی ہے۔ اس کا سال تالیف ۱۲۶۶ھ/۱۸۲۰ء ہے۔ دوسری حوالہ جاتی کتابوں میں علاج الامراض بطور خاص شامل ہے۔ ۲۷ صفحے کے اس مجموعہ کو قاضی احمد حسین (نبیرۂ قاضی سلامت علی خاں) نے ربیع الاول ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں برائے حکیم احمد حسین ساکن دہلی نقل کیا ہے۔

۹۔ **خزینۃ المجربات**، مؤلفہ حکیم امان: حکیم امان علی علوی دہلوی ایک حاذق طبیب تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبدالقادر سے حدیث اور دوسرے علوم کی کتابیں پڑھیں۔ درس و افادہ اور معالجہ میں عام شہرت تھی۔ آثار الصنادید میں ان کا تذکرہ ہے۔ حکماء متقدمین و متاخرین کے یہ مجربات حکیم محمد صادق کی فرمائش پر مرتب کئے ہیں۔ حکیم صادق کا نام کافی احترام سے لیتے ہوئے اپنی حکمت پناہ لکھا ہے۔ اس سے یقیناً حکیم صادق خاں دہلوی مراد ہیں۔ اس میں بلحاظ امراض ترتیب قائم کر کے مجرب دوائیں تحریر کی گئی ہیں۔ نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ یہ افسر الاطباء حکیم سید نور الحسن بھوپالی کے قلم کی یادگار ہے۔

۱۰۔ **خلاصۃ العلاج**، مؤلفہ حکیم علی بن محمد المشہور بہ عوض: مصنف نے لکھا ہے کہ ارباب فضل و کمال کی خدمت میں عمر کا بڑا حصہ صرف ہوا ہے۔ معالجہ امراض میں یہ کتاب لوگوں کے فائدے کے لئے تصنیف کی ہے۔ یہ ایک مقدمہ اکیس ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں قانون معالجات کلی کو بیان

۷- ابواب امراض کی ماہیت، اسباب، علامات اور علاج کے لئے وقف ہیں۔ آخری باب تدبیر سموم پر
ہے۔ خاتمہ میں امراض صبیان اور ان کے معالجہ کا ذکر ہے۔

علاج میں نسخے نہیں پیش کئے گئے ہیں بلکہ باقاعدہ اصولی طور پر معالجہ کے بارے میں لکھا ہے۔
اصول علاج کے لحاظ سے یہ ایک اچھی کوشش ہے۔

مخطوطہ کی کتابت شیخ عبدالرحمن ساکن محلہ گوجر ٹولہ رامپور نے بروز پنجشنبہ غرہ ذی قعدہ ۱۲۷۰ھ
کی ہے۔

۱۱- **دستور العلاج**، مؤلفہ حکیم شفائی خان: یہ دستور العلاج فوائد شافیہ کے نام سے موسوم
ہے۔ اس میں بیس ابواب ہیں۔ پہلا باب امراض راس میں اور آخری باب اورام و بثور میں ہے۔ جسے جدری
حصبہ کے علاج پر ختم کیا گیا ہے۔ معالجہ امراض میں یہ حکیم شفائی خان کا دستور مطلب ہے جس میں علاج کے ساتھ
علامات اور تشخیصی نکات بھی درج ہیں۔

۱۲۷ صفحہ کا اس مخطوطہ کی کتابت سید اولاد علی خاں نے حکیم سید حسن علوی (جد گرامی حکیم سید
بار الحسن بھوپال) کے حسب فرمائش بروز یکشنبہ ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں کی ہے۔

۱۲- **دستور العلاج**، مؤلفہ سید محمد علی نقی: سید محمد علی نقی مولوی سید بندہ حسن کے صاحبزادہ
ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور معالج تھے۔ انھوں نے معالجات و عزیزیات طب کے لحاظ سے نسخہ جات مجربہ اور
ترکیب نادرہ کا انتخاب کرکے یہ دستور العلاج مرتب کیا ہے۔ نسخوں کے ساتھ ہی اس میں مرض کی وضاحت
اور سبب وغیرہ بھی مختصر طور پر لکھا ہے۔ ترتیب امراض روایتی طریقہ پر ہے۔ امراض راس سے شروع کرکے
اورام و بثور اور تدبیر سموم پر کتاب کو ختم کیا گیا ہے۔

اس مجموعہ میں دوسری کتاب رسالہ فصد ہے جو کل بارہ صفحات کا رسالہ ہے۔ اس میں تعریف و
شرائط فصد، عروق کے نام اور ان کے حدود، کیفیت فصد اور مختلف امراض میں ان کی منفعتوں پر روشنی
ڈالی گئی ہے۔ ۲ جمادی الثانی ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۳ء روز سہ شنبہ کو نقل کیا گیا ہے۔

۱۳- **دستور العمل**، مؤلفہ حکیم مسیح الدولہ: مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن خاں اپنے عہد کے
لکھنؤ کے سربرآوردہ طبیب تھے۔ ان کے والد حکیم الملوک حکیم مرزا علی بن جواد علی المعروف مرزا محمد منطق
فلسفہ اور طب میں مرجع رکھتے تھے۔ مولانا دلدار علی مجتہد سے تلمذ تھا۔ امراض متشابہ کی تفریق اور

ادویہ متشابہ کی شناخت میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ شاہان اودھ کے درباروں میں معزز رہے اور حکیم الملک کے خطاب سے نوازے گئے۔ ان کے شاگردوں کی بہت تعداد ہے، جن میں حکیم مسیح الدولہ بھی شامل ہیں۔ جمعرات ۱۵ر صفر ۱۲۴۹ھ کو فوت ہوئے۔ ناسخ نے "لے واسے مرزا علی خان بہادر" سے تاریخ نکالی۔

سلطان الحکماء رحیاۃ الملک حکیم مسیح الدولہ شاہی شفاخانہ کے طبیب اعلیٰ اور سلاطین اودھ کے خصوصی معالج رہے۔ مطب اور درس کا بڑا وسیع حلقہ تھا۔ ان کے مطب کے متعدد نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ۱۲۷۶ھ میں انتقال ہوا۔ امیر لکھنوی کے مصرعہ "رفت از جہاں جناب مسیحا بر آسمان" سے تاریخ نکلتی ہے۔ حکیم مرزا مظفر حسین (وفات ۲ر صفر ۱۲۹۸ھ) ان کے عالی قدر بیٹے تھے۔ اس خاندان کے طبی اثرات بہت بعد تک قائم رہے۔ ان کے تلامذہ میں مشہور طبیبوں کے نام ملتے ہیں۔

مسیح الدولہ کا یہ دستور العمل دراصل ان کے معمولات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۳۸۲ نسخے درج ہیں۔ حکیم سید حسن اور ان کے صاحبزادے حکیم سید نور الحسن (بھوپال) نے اسے نقل کیا ہے۔ مسیح الدولہ کا مطب تکمیل الطب کالج اور اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد میں بھی ہے۔

۱۴۔ دستور العمل حمیات، مؤلفہ حکیم محمد محسن خیر آبادی: اس پر قانون کلی کے طور پر علاج حمیات کے ساتھ ہی معمولات مطب بھی تحریر ہیں۔ اسے ان کے شاگرد نجف حسین نے نقل کیا ہے۔ نجف حسین حکیم خادم حسین (بھوپال) کے بھائی ہیں۔ اس میں حکیم محمد محسن فاروقی خیر آبادی کے والد محمد نذیر کو حاذق الحکماء اور بطلیموس عہد جیسے القاب سے مخاطب کیا ہے۔ ۶۴ صفحات کا رسالہ ہے۔ یہ کتاب حکیم ابن حسن (عم مکرم حکیم سید ضیاء الحسن) کی ملکیت ہے۔ ان کے ۸ر رجب ۱۳۱۸ھ کے دستخط ہیں۔ اس میں دوسرا رسالہ فرحت العینین مجلد ہے۔

۱۵۔ رسالہ اطریفلات، مؤلفہ حکیم علوی خان: اطریفلات کے علاوہ اس میں نوشدارو اور انقرویا کے نسخے بھی درج ہیں جو یا علوی خان کے مرتب کردہ ہیں یا قدیم نسخوں میں علوی خان نے ترمیم کی ہے۔ عماد الدین محمود شیرازی اور ان کے صاحبزادہ محمد باقر کے مرتبہ نسخوں میں جو شاہ طہماسپ، شاہ عباس صفوی، شاہ سلیمان صفوی کے لئے لکھے گئے ہیں ان میں انہوں نے خاص طور پر تصرف کیا ہے۔ سترہ صفحات کا یہ مختصر رسالہ ۲ر رمضان کو نقل ہوا ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ درج نہیں ہے۔

۱۶۔ رسالہ حکیم شفائی خاں، حکیم شفائی خاں اودھ کے ممتاز طبیبوں میں ہیں۔ ان کا یہ

رسالہ علاج امراض یہ ہے جس میں اقسام امراض اور علامات مختصر طریقہ پر لکھ کر ان کا علاج درج کیا گیا ہے۔ اس طرح بیان کے معمولات سے متعلق ایک مجربہ ہے۔ ۱۲۲ صفحات کے اس رسالہ کو بروز چہار شنبہ ۱۸ رجب ۱۲۸۹ھ کو سید محمد عسکری نے نقل کیا ہے۔

رسالہ شفائی خاں کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں بھی محفوظ ہے۔

۱۷۔ رسالہ حدود الحمیات، مؤلفہ حکیم میر محبوب علی: حکیم میر محبوب علی حکیم صالح خاں کے شاگرد ہیں۔ صالح خاں کشمیری جو دہلی کے اپنے وقت کے اطبا کبار میں تھے۔ محمد شاہ کے دربار میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ صالح خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور اسی سے شہرت پائی۔ شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد پہنچے۔ شجاع الدولہ اور ان کی بیگم اور ان کی سرا کے خصوصی معالج ہوئے۔ فیض آباد میں پوری زندگی گزری۔ آصف الدولہ کے زمانہ میں وفات پائی۔ حکیم میر محبوب بھی اپنے علاج اور علمی صلاحیت کی وجہ سے ممتاز تھے۔ ان کا یہ مختصر رسالہ حدود الحمیات جو اگرچہ صرف گیارہ صفحات کا ہے لیکن حمیات مفردہ و مرکبہ کی تعریف و تقسیم کے لحاظ سے جامع ہے۔ اسے سید محمد عسکری نے پنجشنبہ ۲۹ شوال ۱۲۸۸ھ نقل کیا ہے۔

یہ درج بالا رسالہ کے ساتھ مجلد ہے۔

۱۸۔ رسالہ علاج حمی صفراوی، مؤلفہ حکیم محمد صادق رضوی: حکیم محمد صادق رضوی حکیم میرزین العابدین حسینی عرف میر نواب بن سید صلح الدین خاں کے تلمیذ رشید ہیں۔ حکیم میر نواب اور ان کے والد حکیم سید صلح الدین دونوں کو حکیم علوی خاں سے تلمذ حاصل تھا۔ اس طرح حکیم محمد صادق علوی خاں کے علمی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی منظوم کتاب کا تعارف آئندہ صفحات میں درج ہے۔

حکیم صادق نے اس رسالہ میں اپنے اساتذہ کے علاج حمی صفراوی سے متعلق قواعد تحریر کئے ہیں اور ان کے مطابق پہلے روز سے چالیسویں روز تک کے لئے دوائیں تجویز کی ہیں۔ ۱۰ صفحے کا یہ رسالہ بھی سید محمد عسکری کا ۱۵ر شوال ۱۲۸۸ھ کا رقم کردہ ہے اور درج بالا رسالے کے ساتھ مجلد ہے۔

۱۹۔ ریاض الشفاء، مؤلفہ حکیم شفائی خاں: ریاض الشفا میں ان جڑی بوٹیوں اور پھلوں کے خواص تحریر کئے گئے ہیں جن کا قدیم کتابوں میں تذکرہ نہیں ہے۔ یہ زیادہ تر ہندوستانی پیداوار میں مفردات کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔ اس میں مثلاً آم، امرود، اننناس، آلو، اروی، اکھروٹ، لوبیا، ناشپاتی، کرم کلا، ککروندہ، گل عباس، عنبہ، شلجم شریف، جل نم، تمباکو، پلاس، پیپل پلستہ، بھنڈی،

پنڈ کھور، انبر ہلدی وغیرہ ہیں۔ ادویہ مفردہ کے سلسلہ میں شفائی خان کی یہ قابل ستائش کوشش ہے۔
۲۲۷ صفحات ہیں۔ اس نسخہ کی کتابت ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۶ء میں ہوئی۔

۲۰۔ ریاض عالمگیری، مؤلفہ محمد ریاض شیرازی: یہ کتاب سات ریاض پر مشتمل ہے اور عالمگیر کے نام پر ریاض عالمگیری کے نام سے موسوم ہے۔ محمد رضا شیرازی بن ابوالفضل المشہور بہ سلیمان اس کے مؤلف ہیں۔
تاریخ تالیف کے بارے میں انھوں نے کہا ہے ؎

از پے تاریخ آں چوں متفکر شدم　　عقل بگفتا کہ شد "سبز ریاض ابد"

مؤلف کے ذوق شعری کا اظہار نہ صرف اس میں پیش کردہ اشعار سے ہوتا ہے بلکہ ہر ریاض مختلف چمنوں پر مشتمل ہے ایک چمن میں متعدد تختہ اور ایک تختہ میں متعدد شگوفے ہیں۔ اطبائے قدیم مثلاً بقراط، جالینوس، حنین بن اسحٰق، محمد بن زکریا رازی وغیرہ کے حوالے کثرت سے پیش کئے گئے ہیں۔

ریاض اوّل حفظان صحت کے موضوع پر ہے۔ اس میں تعدیل بدن، سبب وبا، تدبیر ہوائے وبائی، مختلف مزاجوں کے لئے اغذیہ و اشربہ، حرکت و سکون بدنی و نفسانی، مادر ہر لئے حفظ حرارت غریزی، نوم و یقظہ، استفراغ و احتباس وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ کتاب کا خاص حصہ مختلف اعضاء کی حفظ صحت کی دواؤں کے بیان سے متعلق ہے۔ اس میں مثلاً حفظ عین، حفظ دہن، حفظ الف، حفظ زبان، حفظ دندان، حفظ معدہ، حفظ قلب، حفظ کبد، حفظ طحال، وغیرہ کا بیان ہے اور اس کے لئے مختلف دوائیں تجویز کی گئی ہیں۔ تدبیر اشخاص مولود، مرضعہ، مسافر اور معرفت سوء مزاج کے علاوہ مختلف مزاج و درجات کی دوائیں تحریر ہیں۔

زیر نظر مجموعہ صرف ریاض اوّل کے چار چمنوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۱۲۵ صفحات ہیں۔ جہاں تک اس ریاض اوّل کا تعلق ہے یہ خود ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں حفظان صحت سے متعلق سارے ضروری عنوانات آگئے ہیں۔ طبیہ کالج لائبریری میں ریاض دوم بھی موجود ہے۔ یہ معالجات پر ہے۔ اس کے شروع کے صفحات غائب ہیں۔ اسے ۲۷ شوال ۱۲۴۴ھ بروز پنجشنبہ رام چند کاتب نے لکھا ہے۔

ریاض عالمگیری کا ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں عہد محمد شاہی کا مکتوبہ موجود ہے۔ سالار جنگ اسٹیٹ لائبریری اور نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد میں بھی اس کے نسخے محفوظ ہیں۔

۲۱۔ سلم الدرجات، مؤلفہ احمد اللہ: استخراج درجہ مرکب اور قدر شربت پر اگرچہ کئی کتابیں

لکھی گئی ہیں لیکن اس نوع کی کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ حکیم احمد اللہ صاحب کا یہ قابل قدر کام ہے۔ اس میں مرکب دواؤں کے مزاج نکالنے کے طریقہ کے ساتھ ہی تعداد خوراک کے استخراج پر بھی قلم اٹھایا ہے، اصول مخلوطہ ہے اکثر اوقات طبیب کو ان دونوں باتوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن کسی کتاب یا رسالہ میں اس سلسلہ میں شافی معلومات نہیں تھی اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے یہ رسالہ تالیف کیا گیا۔ ١١٧٠ھ/١٧٥٦ء تاریخ تالیف ہے۔ ٢١ صفحے کے اس مختصر رسالہ کی کتابت عبد الباسط نے برائے خاطر میاں فرح الدین ١٩ رشعبان ١٢٥٩ھ کو کی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی اور اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں بھی اس کے نسخے موجود ہیں۔ ان کی دوسری کتابوں میں شفاء المجسد اور تفریح القلوب ہیں۔

٢٢۔ شرح محسنی، مؤلفہ حکیم محمد محسن خیرآبادی: حکیم محمد محسن فاروقی خیرآبادی بھوپال کے صاحب علم و فضل طبیب تھے۔ موجز کے درس کے دوران اپنے تلمیذ رشید سید وزیر علی باقری کی درخواست پر انھوں نے موجز کی یہ شرح مرتب کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ شرح دوسری شروح مثلاً سدیدی، نفیسی اور مفرح القلوب سے بے نیاز کر دے گی اور اس کی موجودگی میں ان کی احتیاج باقی نہیں رہے گی۔ یہ شرح ١٩٨ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور سید وزیر علی کی مکتوبہ ہے۔ انھوں نے بھوپال میں نواب سکندر بیگم کے عہد میں ٢٢ محرم ١٢٨٢ھ کو اسے لکھا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اس کتاب کا اصل نسخہ ہے اور غالباً واحد بھی ہے۔

٢٣۔ شفاء المریض، مؤلفہ حکیم محمد نور عالم: حکیم محمد نور عالم سکندرآباد بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے بپاس خاطر محمد قطب عالم اپنے اساتذہ کے نسخہ ہائے مطب جمع کیے ہیں۔ ان اساتذہ میں خصوصیت کے ساتھ حکیم ذکاء اللہ خاں المشتہر بہ طبیب اودھی اور میر قدرت اللہ تلمیذ حکیم شریف خاں دہلوی شامل ہیں۔ ٢٩٠ صفحے کے اس مطب بطرز دستور العمل کو افسر الاطباء حکیم نور الحسن نے ١٠ محرم ١٣٠٢ھ بروز جمعہ مکمل کیا ہے۔ اس کی کتابت انھوں نے ٢٨ ذی قعدہ ١٣٠١ھ کو شروع کی تھی۔ کتاب کے سادہ اوراق پر حکیم نور الحسن کے صاحبزادہ حکیم ضیاء الحسن کے قلم سے کچھ نسخے تحریر ہیں۔ سکندرآباد میں حکیم نور عالم کا خاندان آج بھی طبی اعتبار سے معروف و ممتاز ہے۔ ان کے بیٹے حکیم قطب عالم کے اخلاف میں حکیم مسعود عالم آنریری مجسٹریٹ اور مشہور طبیب تھے۔ حکیم مسعود عالم کے والد حکیم افضل عالم بھی آنریری مجسٹریٹ تھے۔ حکیم افضل عالم کے والد حکیم محمد عالم اور دادا حکیم قطب عالم تھے (بحوالہ محب مکرم شیخ عصمت اللہ قادری سکندرآبادی)۔

٢٤۔ طب النبی، مؤلف کا نام کتاب سے ظاہر نہیں ہوتا۔ یکم ٥ رشعبان ...

کی تکمیل سے فراغت ہوئی ہے۔ سرورق مطلّا و مذہب ہے۔ سرخیاں سرخ روشنائی سے اور حاشیہ سرخ آسمانی
اور سنہری لائنوں سے مزین ہے۔ کتاب میں ۱۱۵ ابواب ہیں جو امراض کے لحاظ سے مرتب ہیں۔ سال کتابت نہ لکھا ہے۔

۲۵۔ غیاث الطب، مؤلفہ حکیم محمود بن الیاس: طبیہ کالج لائبریری میں طب محمودی اور
غیاث الطب (غیاثی) کے نام سے دو کتابیں مخطوطہ ہیں۔ دونوں میں بطور مصنف حکیم محمود بن الیاس کا نام ہے۔ یہ
دراصل دو علیحدہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ ایک کتاب کو دو ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ طب محمودی کے نام سے اس کا
نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اور غیاث الطب کے نام سے جو نسخہ ہے اس کا صرف آخری ورق موجود نہیں ہے۔ دیباچہ
کے مطابق مصنف نے اس کا نام غیاثی رکھا ہے اور یہ غیاث الدین کے لیے تصنیف کی گئی ہے۔ نجم الغنی
محمود بن الیاس شیرازی کی کتاب کے حوالے بعد کے اطباء کے ہاں پڑھنے کو ملتے ہیں۔

یہ چار مقالوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ اوّل علم نظری، مقالہ دوم جزو عملی، مقالہ سوم ادویہ مفردہ و فواکہ
اور مقالہ چہارم ادویہ مرکبہ میں ہے۔ ہر مقالے کے تحت متعدد ابواب ہیں۔ مخطوطہ ۶۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔
اس مخطوطہ کو حکیم محمد حسین شیرازی نے دہلی میں بعہد اکبر شاہ ثانی نقل کیا ہے۔ اس مجموعہ میں کفایہ مجاہدیہ [illegible]
منصور بن احمد اور خلاصۃ العلاج علی بن محمد عوض شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی حکیم محمد حسین کی مکتوبہ ہیں۔
ان پر حکیم محمد حسین کے بیٹے حکیم محمد حسن کی ۱۲۶۲ھ کی مہریں اور ان کے نبیرہ حکیم سید ضیاء الحسن کے دستخط
ہیں۔ دوسرا نسخہ جو ناقص الآخر ہے اس کے ساتھ کوکا پنڈت کی تالیف لذت النساء (فارسی) بھی مجلد ہے
جو ۲۹ رجب ۱۲۱۷ھ کی مکتوبہ ہے۔

طب غیاثی کا ایک نسخہ سالار جنگ حیدرآباد اور ایک نسخہ ادارہ تاریخ تحقیق طب تغلق آباد میں بھی ہے۔

۲۶۔ فوائد المرضیٰ، مؤلفہ حکیم غلام امام اکبرآبادی: علاج الغربا کے مصنف حکیم غلام امام کی
تصنیف ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد اس علم پر مہارت رکھتے تھے اور ان کا فیض عام تھا۔
اس کتاب میں کتب سلف کے اقوال و مجربات جمع کیے گئے ہیں۔ فوائد المرضیٰ تاریخی نام ہے جس سے سال تالیف
۱۲۷۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ جالینوس، ابن سینا، علی بن عباس مجوسی، ابو سہل مسیحی، محمد بن زکریا، علاء الدین قرشی،
نفیس کرمانی، فخر الدین رازی، داؤد انطاکی، فضل اللہ تبریزی، اکبر ارزانی، نور الدین عبداللہ کے حوالے ملتے ہیں۔
یہ امور طبیعیہ، علم الاحوال و الاسباب و العلامات و الاعراض، ادویہ، معالجات وغیرہ کے بیان میں ہے۔ ۵۰۰ صفحات
کے اس مخطوطہ کی ۲۶ رمضان ۱۲۲۸ھ کو کتابت ہوئی۔ حکیم ضیاء الحسن رحمہ اللہ ذخیرہ کی کتاب ہے۔

۲۷۔ قرابادین فرحت العیون، مؤلفہ سید محمد مشرف: حکیم سید محمد مشرف مشہور بہ سید لطف رسول بن سید غلام اشرف سندیلوی کے جد امجد حضرت مخدوم سید علاء الدین جاجنیری واسطی تھے جنہوں نے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حسب ہدایت سندیلہ میں اقامت کی۔ حکیم سید محمد مشرف شاہجہان پور کے حکیم سید شمس الدین مشہور بہ سعدی کے شاگرد ہیں۔ حکیم سعدی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادۂ عالیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ حکیم مشرف کا لکھنؤ میں قیام رہا۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت ان کی عمر کافی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انھوں نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں ۵۰ سال سے معالجہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ۷۰۸ صفحوں کی یہ کتاب لکھنؤ ہی میں ۱۲۳۸ھ میں تالیف کی ہے۔

اس قرابادین میں کتاب کی وجہ تسمیہ بھی درج ہے۔ جتنا قرابادین کے لئے لکھا ہے کہ یہ یونانی لفظ "اگرابادین" کا معرب ہے جس کا اطلاق اس دفتر پر ہوتا ہے جس میں ادویہ مرکبہ لکھی جاتی ہیں۔ نوشادر کے بارے میں لکھا ہے کہ ہندی ترکیب ہے عوام کی زبان سے معرب ہے۔ مرکبات کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔

سید وزیر علی باقر قادری نے ۱۵ شوال ۱۲۸۳ھ بروز جمعہ اس مخطوطہ کی کتابت کی ہے۔ سید وزیر علی خواجہ باقی باللہ کی اولاد سے ہیں۔ یہ بھوپال میں حکیم محسن خیرآبادی کے شاگردوں میں تھے۔ اس رسالہ کے ساتھ کلام امام اکبر آبادی کی کتاب کا ایک باب جو اغذیہ سے متعلق ہے مجلد ہے۔ اسے سید وزیر علی نے بھوپال کے نامور طبیب حکیم مولوی سید غلام حسین سندیلوی کی کتاب سے ۱۹ شوال ۱۲۸۳ھ کو نقل کیا ہے۔ مخطوطہ کا تعلق افسر الاطباء حکیم سید ضیاء الحسن کے کتب خانہ سے ہے۔

۲۸۔ جامع الامراض طب اورنگ شاہی، مؤلفہ حکیم درویش محمد احسن آبادی: کتاب میں شیخ فرید الدین گنج شکر سے ارادت کا اظہار کیا گیا ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کی مدح کرتے ہوئے اسے طب اورنگ شاہی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ باب اول میں ارکان، اخلاط، خلقت جنین، اعضاء رئیسہ اور دوسرے کلیاتی مباحث کے علاوہ نبض، بول و براز اور باب دوم میں امراض کا تفصیلی بیان ہے۔ یہ دوسو صفحہ ہے اور ۸ فصلوں پر مشتمل ہے۔ باب سوم امراض زنان پر ہے۔ باب چہارم دھاتوں کے کشتوں اور ان کی صنعت کرنے کے طریقہ پر ہے اور اس میں مختلف دھاتوں کے کشتوں کی خاصیت بیان کی گئی ہے۔ باب پنجم فصد، حجامت، حقنہ وغیرہ کی تدابیر پر، باب ششم معاجین، سفوف، اشربہ، حبوب، معمول مستعملہ، باب ہفتم مرکبات پر ہے جو حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔ مخطوطہ ہے

اور ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کا ایک نسخہ نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد میں بھی ہے۔

۲۹۔ گنج بادآورد صاحب قرانی، مؤلفہ امان اللہ خاں المخاطب بہ خان زمان فیروز جنگ

ہندوستانی قرابادین سلسلہ کی نہایت عظیم بالشان تصنیف ہے۔ قرابادین خان زمانی اور قرابادین دارا شکوہی کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ کتاب شاہ جہاں کے زمانہ میں ۱۰۴۰ھ میں تصنیف ہوئی ہے۔

سال ختمش از خرد جستم و گفت   ختم شد تاریخ ختم این کتاب

سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ دیباچہ میں شاہ جہاں کی توصیف کے علاوہ تینوں بیٹوں دارا شکوہ، شاہ شجاع اور اورنگ زیب کو منظوم خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ دارا شکوہ کو شاہجہان ثانی لکھا ہے۔ یہ دفتر دراصل اطبا، دارالشفار کے لئے بطور دستور ہے۔ یہ سولہ مفتاح اور تین گنجور پر مشتمل ہے۔ فتح اول ماخذ کے بیان میں فتح دوم تعریف غذا، دوا، زہر، فتح سوم التقاط و اذخار، فتح چہارم مزاج و درجات ادویہ، فتح پنجم مقدار دوا (یعنی دوا کا کون جز اور کونسی قسم اختیار کی جائے) فتح ششم امتحان دوا، فتح ہفتم صنائع ادویہ و اجساد (اسی میں دس صنعتیں مثلاً تدبیر ادویہ، ترتیب ادویہ، قتل اجساد، غسل احجار، ترکیب حرق بریان، استخراج اجساد، سحق و صلایہ، حل اجساد، تنقیہ مغشوشات)، فتح ہشتم کیفیت ترکیب و استعمال ادویہ، فتح نہم یافتن درجہ ادویہ مرکبہ، فتح دہم اوزان و کیل، فتح یازدہم قدر شربت۔ دوازدہم مصلحات و ابدال ادویہ۔ سیزدہم اعمار و بقائے ادویہ، چہاردہم اعراب و اسما ادویہ، پانزدہم معانی بعض اسامی ترکیب، شانزدہم تعیین مخصوص ادویہ مفردہ۔

گنجور اول ادویہ مفردہ مرکبہ، اس گنجور میں متعدد عقد ہیں اور ان عقدوں میں مختلف نظام کی ادویہ درج ہیں۔ گنجور دوم دراصل قرابادین ہے۔ یہ بھی بہت سے عقدوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً تریاقات، معاجین اطریفلات وغیرہ۔ گنجور سوم عطریات، اغذیہ، حلوئی، اچار، نمک، کھار، تیاری سموم، عطارونے بیہوشی وغیرہ اس پر بھی متعدد عقود ہیں۔ اس طرح تقریباً گیارہ سو صفحات کی اس کتاب میں نہایت شرح و بسط سے قرابادینی اور ادویہ مرکبہ کے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ کتاب بڑے سائز میں ہے اور ہر صفحہ میں زیادہ تر ۲۴ سطریں ہیں۔ کاتب کا نام اور سنہ درج نہیں ہے۔ ادارہ تاریخ و تحقیق طب تغلق آباد اور جامعہ عثمانیہ کے علاوہ مختلف جگہوں میں بھی اس کے نسخے ہیں۔

۳۰۔ ماہیت عظام سر، مؤلفہ مفتی شرف الدین، رام پور، کوثر مفتی شرف الدین مرحوم

سالہ تشریح ہے اس پر لکھا ہے۔ یہ اگرچہ ۱۶ صفحات کا مختصر سا رسالہ ہے اور اس میں کوئی خاص اور نئی بات بھی نہیں
لیکن اس موضوع پر علاحدہ سے رسالے نہ لکھے جانے کی وجہ سے اسے ایک قسم کی ندرت حاصل ہے۔ منشی
شرف الدین رام پور کے ممتاز عالم اور صاحب فن طبیب تھے۔ رام پور ہی کے سراج الدین خان نے ۱۲ جمادی الاول
۱۲۷۶ھ میں اس کی کتابت کی ہے۔ اس رسالہ کے ساتھ ترکیب ماء الجبن و خوردن چوب چینی، رسالہ در علاج
بات، حکیم محمد عثمان خان اور رسالہ قبریہ بھی مجلد ہیں جو سب سراج الدین کے مکتوبہ ہیں۔ آخری رسالہ
انہوں نے ریاست جاورہ (مدھیہ پردیش) میں ۱۶ صفر ۱۲۷۱ھ کو لکھا ہے۔

۳۱۔ مجموعۃ الصنائع، مولفہ حکیم شمس الدین محمد فیلسوف اندلسی مغربی: حکیم شمس الدین
اندلسی (وفات ۶۷۶ھ/۱۲۷۷ء) کی صنعت تکلیس پر ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ ۴۲ ابواب اور ۲۰۰
فصول پر مشتمل ہے۔ اس میں معدنی دواؤں کے ترکیب استعمال، طریقہ تیاری اور کشتہ سازی پر بہت تفصیل
سے لکھا گیا ہے۔ صنعت تکلیس پر یہ ایک قابل ماخذ کتاب ہے اور چونکہ یہ ایک ایسے مصنف کے قلم کی
یادگار ہے جس کا ہندوستان سے تعلق نہیں ہے، اس لئے اس کا مطالعہ اور بھی زیادہ اس لئے اہم ہے
کہ اس موضوع کے ہندوستانی مصنفین نے آیورویدک معلومات اور مقامی تراکیب کو بھی اپنی کتابوں میں
شامل کر دیا ہے اور اس مضمون کی بیشتر معلومات ہندی محققین سے منسوب ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ یہ تجزیہ
کیا جا سکے گا کہ قدیم یونانی ذخیرہ میں فن تکلیس سے متعلق کس قدر مواد موجود تھا، اور بعد میں اطبائے ہندوستانی
ادوار میں اس پر کتنا اضافہ کیا گیا۔

مخطوطہ بہت خوش خط اور نہایت اہتمام سے لکھا گیا ہے اور پہلے صفحہ پر کافی تزئین و آرائش
کی گئی ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

۳۲۔ مخزن الجواہر، مؤلفہ حکیم سید حسن: حکیم سید حسن ابن حکیم محمد حسین علوی شیرازی
صاحب مخزن الادویہ قرابادین کبیر دہلی سے سکندر بیگم کے عہد میں بھوپال آئے۔ بھوپال میں طبیب کے طور
پر ملازم ہوئے۔ آس پاس کی ریاستوں کورواٹی، کھلچی پور، راج گڑھ، نرسنگ گڑھ، محمد گڑھ، باسودہ، چندیری
وغیرہ میں بحیثیت طبیب خدمات انجام دیں۔ ایک جگہ مستقل قیام نہیں رہا۔ بھوپال میں فوت ہوئے۔
[illegible] پان کھانے کا شوق تھا۔ سکندر بیگم کے دربار میں پان کھانا آداب کے منافی تھا مگر انہیں
[illegible] خاص اجازت تھی۔ اس لئے یہ پان والے طبیب کے نام سے مشہور تھے۔ سکندر بیگم کے دربار میں

ریاست کی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا تھا۔

حکیم حمید حسن، حکیم محمد حسن، حکیم احمد حسن، حکیم صدیق حسن، حکیم شریف حسن اور حکیم نورالحسن چھ صاحبزادے اور ایک صاحبزادی تھیں۔

اس کتاب میں اہل ہند کے امراض اور امزجہ کا لحاظ کرتے ہوئے نسخہ جات مرکب تحریر کئے گئے ہیں۔ اس میں متقدمین و متاخرین اطباء بالخصوص ہندوستانی طبیبوں کے معمولات کثرت سے ملتے ہیں۔ ان میں حکیم علی گیلانی، حکیم سعد اللہ گیلانی، حکیم اکمل خان، حکیم علوی خان، شریف خاں، حکیم محمد جعفر، حکیم ذکاء اللہ، حکیم ارزانی، حکیم محمد تقی لاہوری، حکیم علی اکبر وغیرہ ہیں۔ لیکن یہ کافی ضخیم مخطوطہ بے ربط نسخوں کا مجموعہ ہے۔ اور اس میں کوئی ترتیب قائم نہیں ہے۔

۲۳۔ مطب حکیم مرزا محمد علی لکھنوی: حکیم مرزا محمد علی صاحب اپنے ہم عصروں میں طبی علوم میں فائق اور کبار علماء میں تھے۔ لکھنؤ میں حکیم سید محمد اصغر حسین سے طبی درسیات کی تکمیل کی۔ مسند درس پر اسی طرح قائم ہوئے کہ طبی ریاست ان پر ختم تھی۔

علاج کے معاملہ میں امیر اور وزیر کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ نصیر الدین حیدر ایک مرتبہ ان کے زیر علاج تھے۔ بتلائے ہوئے پرہیز پر جب انہوں نے عمل نہیں کیا تو حکیم صاحب نے علاج ترک کر دیا۔ آخر میں خود وزیر نے ان کی خدمت میں پہنچ کر علاج کے لئے اصرار کیا۔ حکیم صاحب نے عذر لیا کہ بادشاہ کی حکومت اجسام پر ہے اور میری حکومت قلوب پر ہے اگر میں صحرا میں بھی بیٹھ جاؤں گا تو لوگ میرے پاس آ جائیں گے۔

غرباء کی طرف ان کی توجہ مبذول رہتی تھی۔ طلباء کی توقیر کرتے تھے۔ ان کا فرزند تو ان اور اخراجات کے کفیل رہتے تھے۔ ملوک اور امراء کی طلبی کے باوجود اوقات درس کا ناغہ نہیں کرتے تھے۔

جمعرات ۶ ذی الحجہ ۱۲۶۲ھ بعمر ۸۶ برس فوت ہوئے۔ علی اوسط لکھنوی نے "افسوس طبیب ہائے حاذق افسوس" اور "طبیب بے نظیر بود ہے ہے" سے تاریخ نکالی ہے۔

ان کی تصانیف میں ایک کتاب حکیم درویش محمد کی مباحث الاطباء کے جواب میں ہے۔ کتب خانہ دار العلوم دیوبند میں ان کی کتاب تبصرۃ الاطباء محفوظ ہے۔ ۲۲۸ صفحات کی اس کتاب میں علامات اور اسباب پر اطباء کے اقوال نقل کرکے ان کی تشریح کی گئی ہے۔ یہ نسخہ وفات کے دو سال بعد ۱۲۶۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ دیوبند ہی میں ان کی ایک کتاب منتخبات حمیدی کا بھی ہے۔ یہ اردو میں [illegible]

۱۲۹۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ ان کا ایک دستور العمل مولانا آزاد لائبریری میں محفوظ ہے۔

طبیہ کالج میں موجود ان کے اس مطب میں امراض دماغ سے امراض نظام ہضم تک مختلف بیماریوں کے معمول نسخے تحریر ہیں۔ مخطوطہ نہایت خوشخط ہے اور بڑی تقطیع کے تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ حاشیے نسخے نقل ہیں۔

(۲) اس مجموعہ پر قرابادین انداز پر سو صفحے کی ایک بیاض شامل ہے اس میں اطریفل سے یاقوتی تک مرکبات درج ہیں۔ نسخوں کی ترکیب بہت عمدہ ہے۔ یہ نسخے جن لوگوں کے لئے تجویز کئے گئے سلطان عالم واجد علی شاہ "خلد اللہ ملکہ" حضور عالم (علی نقی خاں) عزیز اعظم، اشرف الدولہ، شمس العلما، شہزادی صاحبہ، میر قمر الدین حسین، محمد مصطفیٰ خاں، خرد محل صاحبہ، حبیب اللہ خاں صدر امین، سلطنت محل، نواب سرفراز محل، اقبال الدولہ، راجہ کندن لعل، میر مخلص حسین، شیخ مفضل علی، حبیب علی، نواب سردار محل، گلشن الدولہ، مقبول الدولہ، مولوی جعفر علی، دیوان رام چرن، میر ابو الحسن ہیں۔ مؤلف واجد علی شاہ کے معالج خاص ہیں اس لئے کہ اس میں زیادہ نسخے انہیں کے لئے تجویز کئے ہیں۔

(۳) اس قرابادین کے علاوہ مجموعہ میں اور بھی معمولات اور دستورات علاج شامل ہیں مگر جن کی وضاحت نہیں ہے، لیکن ان میں جن اطبا کے تجویز کردہ نسخے تحریر ہیں، ان میں اطبائے لکھنؤ محمد یعقوب، حکیم محمد ابراہیم، حکیم میر محمد صادق وغیرہ ہیں۔

۴۳۔ مطب حکیم فرزند علی فرخ آبادی، مؤلفہ حکیم سید امیر بخش: حکیم فرزند علی [illegible]الدین بن غریب اللہ متوفی فرخ آباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد سے تحصیل علم کی اور انہیں سے طب سیکھا۔ پھر درس و افادہ اور مطب میں ان کے جانشین ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگوں نے استفادہ کیا۔ مفتی ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں لکھا ہے کہ یہ جالینوس عصر اور بقراط زمانہ تھے۔

حکیم سید امیر بخش فرخ آبادی ان کے تلامذہ میں تھے۔ امیر بخش کو ان کے علاوہ حکیم [illegible] علی سے بھی [illegible]۔ امیر بخش کے والد سید [illegible] بخش اپنے زمانہ کے اچھے خوشنویس تھے۔ فرخ آباد سے وہ لکھنؤ [illegible] مستقل ہوئے۔ پھر [illegible] جب [illegible] درمیان استاد کا انتقال [illegible]

حاصل کر کے انھیں مرتب کیا۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ ہر مرض کے تحت متعلقہ مرض کے تعلق سے اعتماد
کے مفردات درج کئے ہیں۔ جس سے کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ مثلاً صداع کے تحت لکھا ہے
"ایلوا اور مرکی کی بباعث درد سر ہے۔ صاحب صداع کو ان سے باز رکھا جائے"۔ "اشیاء باردہ سر کے
پچھلے حصہ پر ضماد نہ کریں یہ اعصاب دماغ کے لئے موجب مضرت ہوتا ہے"۔

مخطوطہ دوشنبہ ۴ صفر ۱۲۹۹ھ/۲۶ دسمبر ۱۸۸۱ء کو حکیم کریم بیگ ولد محمد بیگ ساکن ہاپوڑ
نے نقل کیا ہے، حکیم ضیاء الحسن کی ملکیت رہا ہے۔

۳۵۔ مطلب علوی خاں: معتمد الملوک حکیم علوی خاں کا یہ مطلب جو ان کے مخترعات
اور مجربات روزمرّہ کا مجموعہ ہے ان کے کسی شاگرد نے مرتب کیا ہے۔ نسخوں کی ترتیب امراض کے لحاظ سے
ہے۔ اطباء کے جو معمولات ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں ان میں یہ نہ صرف اپنی ضخامت کے لحاظ سے بلکہ
اصول فن اور معیار نسخہ کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔ اس میں محض نسخے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے
بلکہ کلینکل واقعات اور مریض کی روئداد درج کرتے ہوئے دوائیں تجویز کی گئی ہیں۔ نسخوں کے مجموعوں کے
سلسلہ میں اصل اہمیت اسی کی ہے۔ موقع اور محل سے بے پرواہ ہو کر اگر کسی مرض میں کوئی کتابی اور مجرب
نسخہ استعمال کرایا جائیگا تو اس کے وہ فوائد سامنے نہیں آئیں گے۔ علم اصول ترکیب اور مواقع استخراج
مرکبات کی اہمیت پوری طرح محسوس کرنی چاہیئے۔ اس کے بغیر نسخہ نویسی میں مہارت نہیں پیدا ہو سکتی۔
اطباء مجربین کے مطلب اور ان کے نسخوں کے نمونے اسی وقت رہنمائی کا کام انجام دے سکتے ہیں جب
تشخیص اور مواقع استعمال میں غلطی نہ ہو۔

اس مجموعہ کے ناقل نے ایک زیادتی یہ کی ہے کہ اس میں علوی خاں کے ساتھ حکیم شریف خاں کے
معمولات بھی درمیان میں لکھ دیئے ہیں۔ اس طرح یہ نسخوں کا ایک اچھا مجموعہ ضرور بن گیا ہے لیکن یہ خالص
علوی خاں کا مطلب نہیں رہا۔

یہ خوش خط مجموعہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سید منور علی باقری قادری نے نواب سکندر بیگم
کے عہد میں پنجشنبہ ربیع الاوّل ۱۲۸۳ھ اسے نقل کیا ہے۔ آخر میں ۲۷ صفحات میں اس کتاب سے کچھ علاجاتی
نکات اخذ کر کے فائدے کے عنوان سے درج کئے ہیں۔ مخطوطہ پر حکیم سید ضیاء الحسن کے دستخط ہیں۔ علوی
خاں کا ایک مختصر مطلب طبع ہو چکا ہے۔ راقم کے پیش نظر فخر المطابع لکھنؤ کا مطبوعہ نسخہ ہے جس کا سنہ اشاعت ...

جس میں صرف ۱۸ صفحات ہیں۔

۳۶۔ معالجات حسینی، مؤلفہ حکیم احسن اللہ اکبرآبادی: حکیم احسن اللہ حکیم عطاء اللہ اکبرآبادی کے صاحبزادہ ہیں۔ دونوں اپنے زمانہ میں علم اور حذاقت میں معاصرین میں امتیاز رکھتے تھے۔ حکیم عطاء اللہ کے دامن فیض سے سینکڑوں شاگردوں نے استفادہ کیا۔ ان کے تلامذہ میں حکیم احسن اللہ کے علاوہ سید حمزہ بن آل محمد حسینی مارہروی اور حکیم شکر اللہ وغیرہ ہیں۔ صفر ۱۱۵۹ھ/ ۱۷۴۶ء میں ۹۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ (کاشف الاشیا، نزہتہ الخواطر)۔

حکیم احسن اللہ نے اس کتاب میں امراض کے اسباب و علامات وغیرہ سے مختصر بحث کی ہے۔ زیادہ زور نسخوں پر ہے۔ عنوانات امراض کے لحاظ سے قائم کئے گئے ہیں۔ اور ان کے تحت مختلف قسم کے مرکبات درج ہیں۔ اس ضخیم کتاب کی جلد اوّل امراض معدہ تک ہے اور یہ ۴۸۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں امراض معدہ سے امراض ظاہرہ بدن تک کا بیان شامل ہے۔ یہ ۱۰۱ صفحات میں ہے۔ معالجہ امراض کے تعلق سے ہندوستان میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ ایک اہم اور موثر الآثار کتاب ہے۔

مخطوطہ صاف اور خوشخط ہے۔ جلد دوم کی کتابت جگو رکشور ولد دست سنگھ ساکن مارہرہ نے بروز پنجشنبہ ۵ صفر ۱۲۵۲ھ کو کی ہے۔ اس پر ۱۲۵۲ھ ہی کے محمد عطا مارہروی کے دستخط ہیں۔ کاتب نے لکھا ہے کہ اس نے مصنف کے خطی نسخہ سے اسے نقل کیا ہے۔ اس جلد میں عماد الدین محمود شیرازی کا رسالہ چوب چینی بھی مجلد ہے۔

۳۷۔ مجربات نعیمی، مؤلفہ حکیم وسیم اللہ: ایک جگہ مجربات سلیمی المعروف بہ نعیمی درج ہے۔ یہ حکیم مولوی نعیم اللہ کے مجربات ہیں۔ جنہیں حکیم مولوی وسیم اللہ علی گڑھی نے مرتب کیا ہے۔ ایک جگہ اپنے جد امجد کی بیاض کا ذکر کیا ہے: "از بیاض جد امجد در موضع کلوا پور ضلع پوریاں محلہ شاہجہاں پور"۔ ایک جگہ "راقم محمد نسیم اللہ بن حکیم علیم اللہ بن حکیم امین اللہ ساکنان" لکھا ہوا ہے۔ آخر کتاب میں حکیم وسیم اللہ کی شان میں بر صنعت توشیح ایک قصیدہ ہے۔ اس میں انھیں "آفتاب سپہر حکمت ماہتاب، رشادت، ارسطو فطرت، لقمان حکمت، دریائے سخاوت، اختر سپہر زبانت رئیس علی گڑھ" لکھا ہے اور راقم میں محمد عظیم اللہ عظیم اللہ خاں البتانی کے لڑکے ہیں۔ عظیم اللہ کی تاریخ وفات ۳ر مارچ ۱۹۱۸ء ہے۔ حکیم وسیم اللہ کے داماد حکیم مجید اللہ کے نام کا بھی کتاب کے صفحات سے پتہ چلتا ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۰۸ ہے۔

۲۸۔ مفردات محسنی، مؤلفہ سید وزیر علی باقری قادری: سید وزیر علی میر ظہور اللہ سالار کے بیٹے اور خواجہ باقی باللہ دہلوی کی اولاد میں ہیں۔ انھوں نے اپنے استاد حکیم محمد محسن کے نام سے اس کتاب کو موسوم کیا ہے۔ حکیم محمد محسن خیرآباد کے رہنے والے تھے، بھوپال میں قیام رہا اور وہاں بحیثیت معالج اور استاد طب بڑی شہرت پائی۔ ۱۳ شعبان ۱۳۰۰ھ میں انتقال ہوا۔ حکیم محمد محسن کے والد حکیم محمد نظیر کو مسیح الزماں کا شاہی خطاب تھا۔

مفردات محسنی کے ابتدائی کافی صفحات میں باعتبار مزاج حیوانات کے طرز پر دوائیں درج کی گئی ہیں اس کے بعد نباتاتی حیوانی اور معدنی ادویہ کا مزید تفصیلات کے ساتھ بیان ہے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صرف ادویہ ہندیہ کے خواص ان کے ہندوستانی ناموں کے عنوانات کے ساتھ تحریر کئے گئے ہیں۔ ماخذ کے طور پر بعض ہندی مصنفین کے علاوہ دیسقوریدوس، ابن ماسویہ، اسحق بن عمران، ابن بیطار وغیرہ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حکیم شریف خاں کے حوالے کثرت سے ملتے ہیں۔

بعض جگہ انھوں نے متقدمین سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی ذاتی تحقیق بھی پیش کی ہے۔ مثلاً ادرک کے مزاج کے بارہ میں لکھا ہے کہ "اس کی طبیعت گرم تیسرے درجے کے آخر میں اور خشک دوسرے درجہ میں ہے۔ ابن ماسویہ نے تیسرے درجے کے آخر میں گرم اور پہلے درجہ میں تر قرار دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ پہلے درجہ میں تر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر درجہ اول میں تر ہوتی تو تیسرے درجہ کی حرارت اس کو فنا کر دیتی اس لئے پہلا قول صحیح ہے۔"

ریاست بھوپال میں لکھی جانے والی طبی کتابوں میں یہ ایک بیش قدر کتاب ہے اور یہ غالباً اس کا واحد نسخہ ہے جو بخط مصنف ہے۔ اس کی کتابت نواب سکندر بیگم والیہ ریاست بھوپال کے عہد میں ۶ شوال ۱۲۸۰ھ کو ہوئی ہے۔ مخطوطہ ۶۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۹۔ مفردات علوی خاں: علوی خاں کی مفردات کا یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ الف کی تختی میں اطریلال سے اس کی ابتداء ہوتی ہے اور ب کی تختی میں صرف بنفشہ تک ہے۔ اس طرح علم الادویہ میں مفردات اور مرکبات دونوں پر علوی خاں کی کتابیں ہیں۔ ہندوستانی عہد میں مفردات کے تعلق سے جو کام کیا گیا ہے یہ اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا مکمل نسخہ جو ۳۵۰ اوراق پر مشتمل ہے کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں موجود ہے۔

۴۰۔ مفتت الحجرین، مؤلفہ سید ابوالقاسم عرف میر قدرت اللہ قادری: اپنے دیباچہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ فصول الامراض ترجمہ حدود الامراض اور تغیر و ترتیب تالیف شریف (حکیم شریف خاں دہلوی) سے جب فراغت ہوئی تو راجہ اجیت سنگھ نے فرمایا کہ وہ ایک عرصے سے حصاۃ کلیہ میں مبتلا ہیں اور اکثر سیر و تفریح میں ان کا رہنا ہوتا ہے۔ اگر سنگ گردہ و مثانہ میں ایک کتاب لکھی جائے تو وہ بطور زاد راہ اپنے ساتھ رکھیں۔ ان کے حسب الحکم یہ کتاب تصنیف ہوئی۔ ۱۲۰۵ھ اس کا سال تصنیف ہے "سال ختم مفتت الحجرین" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

۲۶۰ صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ زکریا رازی کا رسالہ حصاۃ کلیہ و مثانہ اگر نقش اول تھا تو اسے نقش ثانی کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مقدمہ دو ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ اس میں حصاۃ و رمل کی ماہیت، حصاۃ کی پیدائش کے مقامات، تشریح گردہ و مثانہ، اسباب تولید حصاۃ، علامات، معالجات ادویہ مفردہ و ادویہ مرکبہ پر خاص طور پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنے ذاتی معمولات اور طریقہ علاج کے لئے ایک مستقل باب وقف کیا ہے۔ اس سے ان کی حذاقت اور کامیاب معالج کی حیثیت سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے کلینکی طور پر مطب کے واقعات لکھے ہیں۔

مخطوطہ سلطان سنگھ ولد کنور سین نے ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۰۵ھ کو مہاراجہ اجیت سنگھ کے لئے "دارالامن" میں لکھا ہے۔ عجب نہیں یہ اس تصنیف کا واحد نسخہ ہو۔

۴۱۔ منتخب الاطبا، مؤلفہ کریم اللہ: مرتب کتاب کریم اللہ خود طبیب نہیں تھے وہ کسی مرض میں مبتلا ہوئے اور اطبا وقت نے علاج میں بے رخی اختیار کی تو انھوں نے ہر مرض کے مجرب معالجات عام لوگوں کے استفادے کے لئے طب کی معتبر کتابوں سے انتخاب کر کے یہ کتاب ترتیب دی۔ اس کا پہلا باب نبض کی شناخت، دوسرا قارورہ اس کے بعد کے ابواب معالجات کے بیان میں ہیں۔ نسخوں کے انتخاب میں طبیب نہ ہوتے ہوئے بھی سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ اس سے مؤلف کی ذہانت اور ان کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے۔ مخطوطہ کی کتابت ۸ رجب ۱۱ جلوس اکبر شاہ بادشاہ غازی ہوئی ہے۔

۴۲۔ منظوم طب، مؤلفہ حکیم صادق بن کاظم رضوی: طب کے منظوم ذخیرے کی رفیع الشان کتاب ہے۔ (اس میں) امور طبیعیہ، ستہ ضروریہ، نبض، بول و براز اور معالجات کے فنی مباحث شاعرانہ

عظمت کی آئینہ دار ہے۔ فارسی میں متعدد منظوم طبی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن شیخ احمد قنوجی کی منظوم کتاب تحفۃ الاطبار (شرح قانونچہ) کے بعد یہ ہندوستان میں لکھی گئی سب سے ضخیم کتاب ہے۔ ساڑھے چار سو صفحے کا یہ نسخہ ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے۔

حکیم سید محمد صادق محلہ اشرف آباد لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے صاحبزادہ حکیم سید یحیٰی خان گوالیار میں مقیم رہے۔ وہاں مطب اور درس کا سلسلہ تھا۔ ان کے ایک شاگرد سید اوصاف علی جلالی ضلع علی گڑھ نے اپنے بیٹے سید محمد حسین کے لیے اس کتاب کو حکیم یحیٰی خان کے مکان چاؤڑی بازار لشکر گوالیار میں اصل کتاب سے ۱۲ر جمادی الاوّل ۱۲۵۶ھ میں نقل کیا ہے۔ "اغراض الطبیہ" کے نام سے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علیگڈھ اور ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ میں بھی طب منظوم کے نسخے موجود ہیں۔

●●

ذخیرۂ حکیم سید ظل الرحمٰن

عربی و فارسی طبی نوادر

عربی مخطوطات

۱۔ **اختیارات العلاج**، مؤلفہ ابوالفرج عبداللہ بن طیب: معاصرین ابن سینا میں ابوالفرج عبداللہ بن طیب نہایت مرتبہ کا طبیب ہے۔ ابن سینا اس کی طبی فضیلت کا معترف تھا لیکن فلسفہ میں اس کا قائل نہیں تھا۔ ابن سینا کی تصانیف میں ایک رسالہ ابوالفرج بن طیب کی تردید میں ہے۔ یہ بیمارستان عضدی بغداد سے وابستہ رہا۔ وہاں علاج کے علاوہ طبی درس کا سلسلہ بھی رہتا تھا۔ اس نے جہاں ارسطو کی فلسفیانہ کتابوں کی شرحیں لکھیں وہاں بقراط اور جالینوس کی طبی کتابوں کی بھی تشریح کی۔ تصنیف تالیف خاص مشغلہ تھا۔ اس کی بیشتر کتابیں بطور املا تصنیف ہوئی ہیں۔ وہ بولتا تھا اور تلامذہ لکھتے تھے اس کے تلامذہ میں ابن بطلان جیسا فاضل زمانہ طبیب ہے۔ یہ کتاب بھی بطور املا لکھی گئی ہے۔

اختیارات علاج یونانی معالجہ کی ایک قدیم معتبر کتاب ہے۔ ۸۰ صفحہ کے اس مجموعے میں امراض کے منتخب نسخے تحریر ہیں۔ اسباب علامات وغیرہ سے بحث نہیں ہے۔ اس کی ابتدا امراض راس میں داء الثعلب سے ہوتی ہے۔

یہ کتاب ثمار الکتب الستہ عشر کے مجموعے میں شامل ہے۔

اسرار العلاج والسراج الوہاج، مؤلفہ حکیم مرزا علی شریف: حکیم مرزا علی شریف ابن

محمد زمان دہلوی لکھنوی) لکھنؤ کے حاذق طبیب ہیں۔ ان کے والد حکیم محمد زماں کو حکیم علوی خاں سے تلمذ
تھا۔ حکیم مرزا علی شریف نے مولانا دلدار علی مجتہد نصیر آبادی اور دوسرے علمائے لکھنؤ سے فقہ اور اطبائے کبار
سے طب کی تعلیم حاصل کی معالجہ میں کمال کے ساتھ منطق، فلسفہ اور علم کلام میں امتیاز رکھتے تھے۔ علم کلام
کی کتابوں پر ان کے حواشی اور تعلیقات ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء کو وفات پائی۔ ان کی ایک
کتاب مجموع الطب بھی ہے۔ غازی الدین حیدر نے انہیں "رئیس الاطباء" کا خطاب عطا کیا تھا۔

تعلیقات علی حمیات قانون ایک نفیس کتاب ہے۔ یہ اسرار العلاج کے نام سے موسوم ہے۔
حمیات پر عربی میں یہ ضخیم کتاب انہوں نے اپنے فاضل دوست مولوی میر علی کے لیے تالیف کی ہے۔
ہندوستانی طبی مصنفین کی عربی کتابوں میں یہ ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مقدمہ اور
خاتمہ کے علاوہ اس میں پانچ فصلیں ہیں۔ اصول سے فروع کے استنباط کے طریقوں پر اچھے انداز میں لکھا
ہے۔ اقسام بخار مثلاً حمیٰ یوم، حمیٰ خلیطہ اور حمیٰ دق کا ان کی تمام تفصیلات کے ساتھ بیان ہے۔
۱۸۷ اکا یہ مخطوطہ نامکمل ہے اور آخری چند ورق غائب ہیں۔

ذخیرہ سبحان اللہ خاں مولانا آزاد لائبریری میں بھی اس کے دو مخطوطے موجود ہیں۔ ایک نسخہ مکمل
ہے اور یہ ۳۶۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس میں ترقیمہ نہیں ہے۔ دوسرا نسخہ جو عمدہ اور نفیس خط میں
ہے اس کے پہلے ورق کے بعد دو ورق غائب ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۹۶ ہے۔ سید رسول بن سید
محمد نے سہ شنبہ ۲۸ ذی قعدہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۰۹ء کو اسے نقل کیا ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ خدا بخش
میں بھی ہے۔ حکیم علی شریف کے بیٹے حکیم جعفر بھی لکھنؤ کے مشہور طبیب تھے۔ انہوں نے اپنے والد
سے طبی کتابیں پڑھی تھیں اور مطب حکیم مرزا محمد علی اصم سے سیکھا تھا۔ دار الشفا لکھنؤ کے طبیب
رہے۔ مطب اور درس کا سلسلہ تھا۔ آخر محرم ۱۲۹۸ھ میں فوت ہوئے۔

۲۔ الطب المسیحی: مؤلفہ ابو سہل مسیحی: ابو سہل مسیحی کی اگرچہ طب میں ۸ کتابوں کے نام
ملتے ہیں لیکن کتاب المائۃ کے بعد اس کی جس کتاب کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی وہ الطب المسیحی ہے۔ یہ
کلیات اور معالجات دو مقالوں پر مشتمل ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں مقالے اس کی اعلیٰ فنی قابلیت
اور تجربہ پر شاہد ہیں۔ یہ ابن سینا سے مختلف رازی اور مجوسی کی طرح خالص معالجات کا آدمی ہے
اس لیے اس کے ہاں منطقی استدلال کے بجائے سادہ انداز میں فنی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس کی عمدگی

کتابیں ہیں مقالہ فی الجدری، کتاب فی الوباء، کتاب اظہار حکمۃ اللہ فی خلقۃ الانسان۔ ومنافع الاعضاء وغیرہ ہیں۔
۹۲ صفحات کا یہ مخطوطہ بھی شمار الکتب الستۃ عشر کے مجموعے میں شامل ہے۔ اس کا ایک نسخہ سالار جنگ حیدرآباد میں بھی ہے۔

۴۔ **بضاعۃ الاطباء:** مؤلفہ حکیم محمد علی کوجک، یہ دراصل حکیم محمد علی کوجک کے جوابات ہیں جو انھوں نے حکیم درویش محمد کے سوالات کی تردید میں لکھے ہیں۔ رد مباحث الاطباء کے نام سے بھی اسے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میں انہی بیس مباحث پر گفتگو کی گئی ہے جو مباحث الاطباء میں ہیں۔ یہ ۹۲ صفحات پر محیط ہے۔ ان دونوں رسالوں میں متعلقہ مباحث پر بڑی دلچسپ اور کام کی باتیں آگئی ہیں۔ قدماء کے حوالوں سے اپنے قول کی تائید میں جو دلیلیں پیش کی گئی ہیں وہ قاری کو بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچاتی ہیں۔ اس طرح ان میں وہ بہت سا مواد جمع ہو گیا ہے جو کسی ایک کتاب میں پڑھنے کو نہیں ملتا۔

مخطوطہ یکشنبہ بتاریخ ۸ (مہینہ کا نام چھوٹا ہوا ہے) ۱۳۱۴ھ کا مکتوبہ ہے۔

۵۔ **تحریم الدفن**، مؤلفہ جالینوس: دس صفحے کے اس رسالہ میں جالینوس نے لکھا ہے کہ بعض امراض میں موت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور غلط فہمی کی وجہ سے زندہ آدمی کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ پہلے مقالہ میں اس نے دماغی عوارض دیہوشی دوسرے مقالہ میں وجع القلب، تیسرے میں غم مفرط یا فرح مفرط اور چوتھے مقالہ میں اژدہا، سانپ یا بچھو وغیرہ کے کاٹنے پر موت جیسی علامت کا تذکرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ دفن میں جلدی نہیں کرنا چاہیئے۔ اس نے امراض کے علاج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مخطوطہ بروز جمعہ ۶ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ کو نقل کیا گیا ہے۔

کتب خانہ دیوبند میں اس کا ۱۱۶۰ھ کا مکتوبہ نسخہ ہے۔

۶۔ **ترویح الارواح**، مؤلفہ ابن سعد الدین: ابن سعد الدین کی کتاب شرح ملتقط تنقیح المکنون مباحث القانون شروح قانون میں امتیازی مرتبہ کی حامل ہے۔ اس شرح کی تکمیل کے بعد اس نے دوسری کتاب ترویح الارواح تصنیف کی۔ یہ وزیر سعد اللہ کے نام معنون ہے۔ اس میں امراض کی تعریف اور اسباب علامات اور متعلقہ غذاؤں اور مفرد و مرکب دواؤں اور ان کے مصلحات و ابدال، اور قدر شربت سے بحث شرح و بسط سے گفتگو کی گئی ہے۔ قانون ابن سینا کے بعض مقامات کی وضاحت اور اس کے معانی کی تشریح

سلکوں میں مفردات و مرکبات کے بیان کے علاوہ اصول و قوانین ادویہ سے متعلق بڑی اچھی بحث کی گئی ہے
ب کا انداز یہ ہے کہ مثلاً پہلا قول احوال دماغ میں ہے اور اس میں تین تعلیم ہیں۔ اس میں پہلی تعلیم اس کے
ین کی تعریف، دوسری تعلیم ان سے متعلق ادویہ مفردہ اور تیسری تعلیم ان کے علاج اور اسباب و علامات
تق ہے، اس طرح ہر قول جو مختلف نظام کے امراض سے متعلق ہے اس کی تعلیمات کی ترتیب اسی انداز
الم ہے، اور ہر دوسری تعلیم متعلقہ امراض کی ادویہ مفردہ کے لیے وقف ہے۔ معالجات کی کسی کتاب کا یہ
ا بحوتا اور مفید طرز ہے اس طرح نہ صرف معالجات بلکہ مفردات کے مطالعہ میں اس کتاب سے خاص
ائی ملتی ہے۔ ترویح الارواح کے مصنف کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مزید تحقیق کی
رت ہے۔

مخطوطہ اگرچہ ۱۲ ذی قعدہ ۱۲۶۱ھ کا مرقومہ ہے لیکن اصل کتاب سے مقابلہ محنت تام کے
تصحیح سے فراغت پائی گئی ہے۔

۷۔ ثمار الکتب الستۃ عشر لجالینوس (جوامع الاسکندرانیین)، مؤلفہ ابوالفرج عبداللہ
الطیب:- جالینوس کی ۱۶ تصانیف پر مشتمل یہ دُرِّ یکتا ہندوستان کے معلوم کتب خانوں کی فہرستوں کے
ابق ملک کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ اطبائے اسکندریہ نے جالینوس کی ۱۶ تصانیف پر مبنی
ی نصاب تیار کیا تھا اس کی نہ صرف رومی عہد میں متعدد شرحیں کی گئیں بلکہ عربی عہد میں بھی اس کے ترجمے
رح اور تلخیص پر فاضل اطباء کی بہترین علمی صلاحیتیں صرف ہوئیں۔ بیشتر عرب مصنفین کا کام ان ملخصے
ں مخصوص کتابوں کی حد تک رہا۔

ابوالفرج عبداللہ بن الطیب ان مصنفین میں ہے جسے ان مکمل ۱۶ کتابوں کی شرح کا اعزاز
ل ہے۔ یہ اپنے زمانہ کا زبردست عالم طب و فلسفہ، فاضل استاذ و مصنف اور حاذق معالج
۔ طب کی تعلیم اس نے ابوالحسن بن خمار سے حاصل کی تھی۔ ابن سینا سے معاصرانہ چشمک بھی رہی۔ بیمارستان
ضدی بغداد میں جن طبی کتابوں کا وہ درس دیتا تھا ان میں اس کی یہ شرحیں بھی شامل تھیں جو اس نے جالینوس
ا تصانیف پر لکھی ہیں۔ کتاب مخطوطہ کے ایک نسخہ پر کسی شاگرد نے جو تاریخ درس بطور یادداشت درج
ہ وہ روز پنجشنبہ ا رمضان ۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء ہے۔ ان سولہ[۱۶] کتابوں کے علاوہ اس نے بقراط کی کتاب
سول کتاب طبیعۃ الانسان اور کتاب الاخلاط کی بھی شرح کی ہے۔ جالینوس کی کتاب المنافع الاعضاء

اور حنین بن اسحاق کی کتاب المسائل کی شرح مرتبہ ۲۰۵ھ ۱۰۱۴ء بھی اس کی تالیف میں ہیں۔

جالینوس کی تصانیف کی یہ شرحیں اس نے حسب عادت املا کرائی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہیں۔

۱۔ کتاب الفرق ۲۔ کتاب الصناعۃ الصغیرۃ ۳۔ کتاب النبض الصغیر ۴۔ کتاب اغلوقن ۵۔ کتاب الاسطقسات (کتاب الارکان) ۶۔ کتاب المزاج ۷۔ کتاب القوی الطبیعیہ ۸۔ کتاب التشریح الصغیر ۹۔ کتاب العلل والاعراض ۱۰۔ کتاب علل الاعضاء الباطنہ ۱۱۔ کتاب النبض الکبیر ۱۲۔ کتاب الحمیات ۱۳۔ کتاب البحران ۱۴۔ کتاب ایام البحران ۱۵۔ کتاب حیلۃ البرء ۱۶۔ کتاب تدبیر الاصحاء۔

ان کتابوں کی تہذیب و شرح کی ترجمے اگرچہ جالینوس کی تحریرات اصل شکل میں باقی نہیں رہی ہیں پھر بھی ان کے اور حنین بن اسحاق کے تراجم کے مطالعہ کے ذریعہ عہد جالینوس کی معلومات اور بعد کے عرب اضافات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یونانی عہد کی قدیم نا شدہ کتابوں کے بطور ان کا مطالعہ طبی محققین کے لئے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

مخطوطہ میں ترقیمہ نہیں ہے لیکن اس کی قدامت کا اس سے اظہار ہوتا ہے کہ اصل کتاب کے کاغذ کو محفوظ کرنے کے لیے بعد میں کسی نے حاشیہ کے ساتھ جو دوسرا کاغذ لگایا تھا اس پر بھی دست برد زمانہ کے آثار نمایاں ہیں۔

تمام الکتب الستۃ عشر الطبیۃ لجالینوس من املاء ابی الفرج عبد اللہ بن الطیب کے علاوہ اس مجموعے میں کتاب المائۃ اور کتاب الطب الکلی ابو سہل مسیحی، مقالۃ قسطا بن لوقا فی الفرق بین الروح والنفس اور اختیارات العلاج من املاء ابی الفرج عبد اللہ بن الطیب شامل ہیں۔

یہ مجموعہ حکیم حاذق خاں کی ملکیت رہا ہے۔ متعدد مہروں کے علاوہ ایک جگہ کتب خانہ میں داخل ہونے کی تاریخ ۱۱۱۶ھ اور دوسری جگہ دوسرے کتب خانہ میں داخل ہونے کی تاریخ ۱۹ جمادی الاول ۰۰ لکھی ہوئی ہے۔

۸۔ **جوامع الاسکندرانیین**، تصانیف جالینوس: جالینوس کی وہ ۱۶ تصانیف جنہیں اسکندریہ نے اس کی تمام تصانیف میں سے درس کے لیے منتخب کیا تھا جوامع الاسکندرانیین نام سے مشہور ہیں۔ ابوالحسن علی بن رضوان (وفات ۴۵۳ھ) نے کتاب النافع میں طب کی تعلیم کے بارہ میں لکھا ہے اطباء اسکندریہ نے جالینوس کی جملہ کتابوں میں سے سولہ [16] کتابیں درس کے لیے منتخب کی تھیں۔ یہ اختصاراً طالب علم کے لیے کافی تھا اس کے ذریعہ سے فن کو سمجھنے کا شعور اور ضروری طبی معلومات حاصل ہوتی تھیں

نصاب اسکندریہ کے طبی مدرسہ میں رائج تھا۔

ابن بطلان: (وفات ۴۵۴ھ) کے بیان کے مطابق اسکندریہ کے اطبا میں انقیلاؤس، اصطفن، جاسیوس، ثاؤدوسیوس، اکیلاؤس، فلادیوس، اور یحییٰ نحوی ممتاز طبیب شامل ہیں، جنہوں نے یہ سولہ کتابیں جمع کیں اور ان میں سے ہر ایک نے الگ الگ ان کتابوں کی شرح کی۔ ان میں جاسیوس کی شرح سب سے اچھی سمجھی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انقیلاؤس پہلا شخص ہے جس نے ۱۶ کتابوں کا نصاب مرتب کیا۔ اصطفن، انقیلاؤس اور جاسیوس یہ تینوں جالینوس کے معاصر طبیب ہیں۔ یہ ۱۶ کتابیں سات درجوں میں تقسیم کی گئی تھیں جن کی ترتیب درج ذیل ہے۔

درجہ اوّل: ۔ کتاب فی الفرق الطبیہ، کتاب الصناعۃ الصغیرۃ، النبض الصغیر، کتاب افلوقن۔

درجہ دوم: ۔ کتاب الاسطقسات، کتاب المزاج، کتاب القوی الطبیعیہ، کتاب التشریح الصغیر۔

درجہ سوم: ۔ کتاب العلل والاعراض۔

درجہ چہارم: ۔ کتاب علل الاعضاء الباطنہ (کتاب المواضع الآلمہ)، کتاب النبض الکبیر

درجہ پنجم: ۔ کتاب الحمیات، کتاب البحران، کتاب ایام البحران

درجہ ششم۔ کتاب حیلۃ البرء

درجہ ہفتم: ۔ کتاب تدبیر الاصحاء

جوامع الاسکندرانیین کے نام سے راقم الحروف کے ذخیرہ میں موجود اس دوسرے مجموعہ میں درج درج ذیل آٹھ کتابیں شامل ہیں: ۔

۱۔ فرق الطب ۲۷ صفحات	۲۔ الصناعۃ الصغیرۃ ۲۷ صفحات
۳۔ النبض الصغیر ۳۵ صفحات	۴۔ کتاب الی اغلوقن ۱۲۳ صفحات
۵۔ کتاب العناصر ۲۸ صفحات	۶۔ کتاب المزاج ۴۲ صفحات
۷۔ کتاب القوی الطبیعیہ ۴۰ صفحات	۸۔ کتاب التشریح الصغیر ۲۶ صفحات

یہ کتابیں حنین بن اسحٰق کی ترجمہ شدہ ہیں۔ ترجمہ موجود نہیں ہے اور نہ مجموعہ پر کوئی مہر یا کسی کے دستخط ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جوامع الاسکندرانیین کا ایک مجموعہ جو رضا لائبریری رامپور میں محفوظ ہے

وہ بھی مکمل سو تصانیف کے بجائے اپنی درج بالا آٹھ تصانیف پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ۲،۱۲،۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۶ء کو ہوئی ہے۔ ان میں سے دو رسالے فرق الطب اور کتاب النعاظ از مستعقات، بخط حکیم علوی خان ٹونک میں حکیم محمد عمران خان کے ذخیرہ میں ہیں۔

۹۔ رسالہ آتشک، مؤلفہ عمادالدین محمود شیرازی: عمادالدین شیرازی علم و فن اور حذاقت طب کی وجہ سے ایک یادگار شخصیت اور ہند و ایران کے طبی رشتہ کی تاریخ میں بہت اہم نام ہے۔ اس کے تلامذہ میں خواجہ خاوند محمود، حکیم غیاث الدین بن منصور، اور حکیم ابوالفتح گیلانی جیسے یگانۂ عصر شامل ہیں۔ عمادالدین نے شاہ طہماسپ اور شاہ اسماعیل صفوی کے درباروں میں طبی خدمات انجام دیں۔ ۱۰۰۰ھ/ ۱۵۹۲ء کے قریب وفات پائی۔ یہ کثیر التعداد کتابوں کا مصنف ہے۔

آتشک پر ۱۵۶۹ء سے قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔ اس موضوع کی پہلی کتاب کی تصنیف کا سہرا عمادالدین کے سر ہے اس کے مطابق متقدمین کے ہاں اس مرض کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے۔ امیر بہاء الدولہ نوربخشی پہلا مصنف ہے جس نے خلاصۃ التجارب میں اس کا ذکر کیا ہے۔

عمادالدین نے اپنے اس رسالہ میں غسل خانہ کے ذریعہ آتشک کی سرایت کو غلط قرار دیا ہے۔ اس رسالہ سے اس کی آستانہ رضویہ مشہد سے وابستگی کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستان میں رسالہ آتشک کے نسخے ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ، اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد اور خدابخش پٹنہ میں بھی ہیں۔

ڈاکٹر سائرل الگوڈ نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے جو نیویارک سے ۱۹۲۱ء میں طبع ہوا ہے۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں رسالہ آتشک کے نام سے سید محمد گیسو دراز کی ایک فارسی تصنیف محفوظ ہے۔

۱۰۔ رسالہ اطعمۃ المرضیٰ، مؤلفہ محمد بن زکریا رازی: اس میں مختلف امراض کی غذائیں تجویز کی گئی ہیں۔ چار صفحے کے اس رسالہ میں داء الثعلب، صداع حار، صرع، فالج، لقوہ، تشنج، سکتہ، اوجاع عین، خناق، سعال، اوجاع معدہ، اوجاع کبد، اوجاع طحال، خفقان، ذرب، حصبہ، اسہال، قولنج، ضعف باہ میں جو غذائیں مفید ہیں ان کا اندراج ہے۔ اسی طرح ان امراض میں جن غذاؤں سے اجتناب کرنا چاہیے انہیں بھی اس میں بیان کیا گیا ہے۔

۱۱۔ رسالہ فی الفصل بین الروح والنفس، مؤلفہ قسطا بن لوقا: قسطا بن لوقا عربی عہد کے طبی مترجمین کی صف اوّل میں شمار کیا جاتا ہے۔ مختلف زبانوں کا ماہر تھا۔ متعدد یونانی مصنفین کی کتابوں کے

اس نے عربی ترجمہ کیا۔ ۹ صفحات کے اس مختصر رسالے میں روح اور نفس کے فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ جبکہ منافع الاعضاء میں ان دونوں کو کافی اہمیت حاصل ہے۔ کلیاتی مباحث میں ان پر تفصیلی گفتگو ملتی ہے۔ بعض لوگوں نے علاحدہ سے ان پر مستقل رسالے تصنیف کئے ہیں۔ ابن سینا کی کتابوں میں رسالہ فی معرفۃ النفس والنبض کے نام سے ایک رسالہ ملتا ہے۔

یہ رسالہ ثمار الکتب الستہ عشر کے مجموعے میں شامل ہے۔

۱۲۔ رسالۃ النقرس، مؤلفہ قسطا بن لوقا: قسطا بن لوقا ابتدائی عربی عہد کے ممتاز ترجمہ نگاروں میں ہے اور اس کی متعدد علمی یادگاریں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کسی ایک مرض کو بنیاد بنا کر عرب اطباء نے جو تحقیقی کام کیا ہے، قسطا بن لوقا کا رسالہ نقرس اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں نقرس کے اسباب، علامات، علاج کھانے پینے کی تدابیر، حمام، ریاضت، ادویہ، شروبہ، اطلیہ، ضمادات، فصد کے ذریعہ اخراج دم، حجامت وغیرہ کے علاوہ نقرس اور وجع المفاصل کا فرق اور نقرس کے حدوث وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ رسالہ ابو جعفر محمد بن یحییٰ کے لئے تالیف کیا گیا ہے۔

مخطوطہ کی کتابت ۱۰ رجمادی الاول ۱۰۵۸ھ کو ہوئی ہے۔

قسطا بن لوقا کی ایک کتاب "فی تدبیر البدن فی سفر الحج" رضا لائبریری اور اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں ہے۔

۱۳۔ شفاء الاسقام، مؤلفہ خضر بن علی الخطاب المعروف بالحاج پاشا: شفاء الاسقام و دواء الآلام دو ضخیم جلدوں میں معالجات کی بیش بہا اور کمیاب کتاب ہے، جلال الدین خضر بن علی نے برسوں بیمارستان منصوری قاہرہ میں معالجے کے فرائض انجام دینے کے بعد اپنے تجربات اور اعمال طبیہ کی روشنی میں ۸۱۶ھ/ ۱۴۱۳ء میں اس کو تالیف کیا ہے، یہ متقدمین کی کتابوں کے گہرے مطالعہ کا عکس بھی ہے۔ اپنے استاذ شیخ جلال الدین المعروف ابن الصوری سے استفادہ کا دیباچہ میں خاص طور پر تذکرہ کیا ہے۔ کتاب کا انتساب سلطان عیسیٰ بن محمد بن آیدمر کے نام ہے۔ یہ چار مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلا مقالہ کلیات طب، دوسرا اغذیہ و اشربہ، تیسرا امراض خاصہ اور چوتھا امراض عامہ کے بیان میں ہے۔

کتاب الشقائق النعمانیہ کے مطابق خضر بن علی روم کے علاقہ آیدین کا رہنے والا تھا۔ وہاں سے یہ قاہرہ منتقل ہوا جہاں اکمل الدین اور مبارک شاہ منطقی سے درسیات کی تکمیل کی۔ ایک شدید بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد

طب کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور اس فن میں مہارت پیدا کی۔ بیمارستان مصر میں طبی خدمات انجام دیں اور جنہوں
میں مشہور ہوا۔ طب میں کتاب الشفاء تصنیف کی اور کتاب التسہیل کے نام سے اس کا ایک اختصار لکھا۔ تعلیم
کے حصول سے قبل اس نے قطب الدین رازی کی کتاب شرح المطالع پر حاشیہ لکھا تھا۔ اس کا یہ حاشیہ سید شریف کے حاشیہ
شرح المطالع سے پہلے کا ہے۔ اس لئے سید شریف نے اس کی فضیلت کے اعتراف کے ساتھ بعض مقامات
میں اس کی تردید کی ہے۔

مخطوطہ خوش خط اور دیدہ زیب ہے۔ ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے سن کتابت کا پتہ نہیں چلتا۔ راقم کے
ذخیرہ میں اس کا دوسرا نفیس خطی نسخہ بھی ہے۔ شفاء الاسقام کا ایک مخطوطہ نواب رحمت اللہ خان شروانی کے
ذخیرہ میں ہے، سالار جنگ حیدرآباد میں بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔

۱۴۔ صادقہ، مؤلفہ محمد یوسف بن عبداللطیف: بقراط کے مشہور رسالہ قمس و عشرون
قضایا جو رسالہ قبریہ کے نام سے مشہور ہے اس کی یہ ایک جامع شرح ہے۔ یہ شرح ۹۵۴ھ/۱۵۴۷ء میں
گئی اور یہ شیخ الاسلام محمد صادق کے نام معنون ہے اور انہی کے نام پر تبرکاً اس کا نام رکھا گیا ہے۔ ۸ صفحہ کا یہ
رسالہ یک شنبہ ۱۶ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ کو نقل ہوا ہے۔ خدا بخش میں بھی اس کا مخطوطہ ہے۔

۱۵۔ طب الملوک، مؤلفہ محمد بن علی بن محمد النجد دانی: مؤلف محمد یزدانی نے اس میں دراصل
استاد فضل اللہ تبریزی کے افادات اور تجربات جمع کئے ہیں۔ اس طرح یہ فضل اللہ تبریزی کے فنی کمالات کا آئ
ہے اور فضل اللہ کے مطالعہ میں اس کی نہایت اہمیت ہے۔ اس میں انہیں جامع الفضائل والکمالات محقق
والاشارات، معتمد الامراء والسلاطین۔ استاذ نا مولانا جلال الملۃ والدنیا والدین جیسے الفاظ سے مخا
کیا گیا ہے، ابن سینا کی دونوں کتابوں قانون اور اشارات کی تحقیق میں انہیں جو امتیاز حاصل تھا اس
خاص طور پر اشارہ ہے۔

معالجات کی اس کتاب میں اسباب و علامات سے مختصر بحث کرتے ہوئے علاج پر تفصیل سے لکھ
اور یہی کتاب کا زیادہ اہم حصہ ہے۔ نہ صرف متقدمین اطباء اور اپنے استاذ کے آزمودہ اور کارآمد نسخے
ہیں بلکہ شخصی واقعات اور ذاتی تجربات بھی مفید انداز میں بیان کئے ہیں۔

مخطوطہ ۲۹ شعبان ۱۱۳۰ھ بروز جمعہ شاہجہان پور میں نقل ہوا ہے، ناقل کا نام محمد صلح
خلیفہ طاؤس ہے جسے انہوں نے محمد طاہر کے لئے لکھا ہے۔

۱۶۔ **عین الحیوٰۃ**، مؤلفہ محمد بن یوسف طبیب ہروی: عین الحیوٰۃ المعروف بہ رسالہ عمر اپنے
موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم اور بلند پایہ عربی تصنیف ہے۔ ۹۳۹ھ/۱۵۳۲ء کی اس تصنیف میں
حرارت غریزی کو تقویت دینے والی اور عمر بڑھانے والی دوائیں بیان کی گئی ہیں۔ تین مقالوں پر مشتمل اس
کتاب کا پہلا مقالہ حرارت غریزی کی تحقیق، دوسرا مقالہ حرارت غریزی کو قوی کرنے اور عمر میں اضافہ کرنے والی
دوائیں اور تیسرا مقالہ حرارت غریزی کو کمزور اور عمر کو کم کرنے والی ادویہ کے بیان میں ہے۔

اس موضوع پر مستقل حیثیت میں میری نظر سے کوئی کتاب نہیں گزری ہے اور نہ معلومات تاریخ سے
اس نوعیت کی کسی کتاب کا علم ہو سکا ہے۔ یہ ایک اچھوتا اور ندرت کا کام ہے۔ علم الادویہ کے لحاظ سے
اس کی اہمیت پوری طرح محسوس کیے جانے کے لائق ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔

ترقیمہ کی عبارت دیمک کی نذر ہو گئی ہے، لیکن مخطوطہ کافی قدیم معلوم ہوتا ہے۔ پہلے صفحہ پر ۲۸/
ربیع الاول ۱۰۱۶ھ کی تاریخ کے ساتھ کسی کے دستخط تھے جو مٹا دیئے گئے ہیں۔ ایک اور مٹے ہوئے دستخط
کے ساتھ تیسرا نام سید علی پڑھا جا سکتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کتاب مختلف لوگوں کی ملکیت رہی ہے۔

مولانا آزاد لائبریری میں بھی اس کا ایک نسخہ محفوظ ہے جو ترقیمہ سے خالی ہے۔ عین الحیوٰۃ کا نہایت
بیش قدر خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا نسخہ حکیم محمد عمران خاں کے ذخیرہ میں ٹونک میں موجود ہے۔

۱۷۔ **فروق الامراض**، مؤلفہ نجیب الدین سمرقندی: امراض کی تشخیص فارقہ پر نہ صرف عام طبی
کتابوں میں لکھا گیا ہے بلکہ اس کی اہمیت کی وجہ سے علاحدہ سے بھی مستقل کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ اسحٰق
بن حنین (وفات ۲۹۸ھ/۹۱۰ء) کا ایک رسالہ اس سلسلہ میں عربی عہد کی ابتدائی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔
نجیب الدین سمرقندی (وفات ۶۲۴ھ) جو اپنی کتاب اسباب و علامات اور اپنی قرابادین کی وجہ سے شہرہ
آفاق ہے اس نے بھی اس کو موضوع بنایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اسباب و دلائل کے اشتراک کی وجہ سے
امراض میں مشابہت پائی جاتی ہے اور ان کی تشخیص میں دشواری ہوتی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں اشتراک
اور تشابہ اور ان کے درمیانی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۵ مقالوں پر مشتمل ہے۔ ۶۶ صفحات کا یہ مخطوطہ
چہارشنبہ ۵ ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ کو نقل ہوا ہے۔

نجیب الدین سمرقندی کی دوسری کتابوں میں اغذیۃ المرضیٰ علی ترتیب العلل، اصول التراکیب
الادویہ، کتاب المفردات من الادویہ، کتاب المفردات من الاغذیہ وغیرہ ہیں۔ اس مجموعہ میں دوسرے

درج ذیل مخطوطات بھی شامل ہیں ۔ مجربات ابن بیطار، رسالہ باہ، اصادقہ (شرح رسالہ قبریہ) سوالات حکیم درویش محمد خاں (مباحث الاطباء) لبضاعۃ الاطباء، رد مباحث الاطباء، جوابات حکیم محمد علی کوچک اسرار العلاج (رسالہ حمیات) رسالہ تحریم الدفن جالینوس

۸۔ کتاب المائۃ، مؤلفہ ابو سہل مسیحی: ابو سہل عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم مسیحی (وفات ۵۲ ۱۰۶۰ء) ان سربرآوردہ طبع زاد عربی مصنفین میں ہے جنہوں نے عربی عہد میں طب کے ابتدائی نقوش قا کئے ۔ یہ کتاب سو ابواب پر مشتمل ہونے کی وجہ سے کتاب المائۃ کہلاتی ہے ۔ اس میں امور طبعیہ، اغذیہ وا اور معالجات پر نہایت شرح و بسط سے لکھا گیا ہے ۔ اس کا پہلا حصہ ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد سے طبع ہو چکا لیکن دوسرا حصہ جو معالجات سے متعلق ہے غیر مطبوعہ ہے ۔ ابو سہل ابن سینا کا ہم عصر ہے ۔ اس کے بارہ یہ روایت کردہ ابن سینا کا استاد ہے صحیح نہیں ہے ۔ کتاب المائۃ طب کی قابل اعتماد ماخذ ہے اور اہل عـ کے ہاں اسے قدر کی خاص نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ معالجاتی حصہ کمیاب ہے ۔ کتاب المائۃ کی جن لوگوں شرحیں اور حاشیے لکھے ہیں ان میں ابن تلمیذ جیسا مرتبہ کا طبیب ہے ۔

یہ مخطوط ثمار الکتب الستۃ عشر کے مجموعہ میں شامل ہے ۔

۱۹۔ کتاب المفتاح، مؤلفہ ابو الفرج علی بن حسن بن ہندو: ابو الفرج بن ہندو وفا ۴۲۰ھ اپنے زمانہ کا عالی مرتبہ اور فاضل اجل تھا ۔ طب کی تعلیم ابو الخیر حسن بن سوار المعروف ابن خمـا سے پائی تھی ۔ طب کے علاوہ ادب اور بلاغت میں خاص دستگاہ حاصل تھی ۔ مفتاح الطب کے علاوہ کی کتابوں میں دیوان شعر، رسالہ ہزلیہ اور الکلم الروحانیۃ فی الحکم الیونانیۃ ہیں ۔ موخر الذکر کتاب مصر سـے ۱۹۰۰ء میں طبع ہو چکی ہے ۔ کتاب المفتاح جسے اس نے اپنے تلامذہ کے لئے تصنیف کیا ہے دس ابواب مشتمل ہے ۔

باب اوّل: علی تعلیم الصناعات عموماً و تعلیم علم الطب خصوصاً، باب دوم: فی اثبات صناعۃ الطب
باب سوم: فی حد الطب باب چہارم: فی شرف الطب باب پنجم: فی اقسام الطب
باب ششم: فی فرق الطب، باب ہفتم: فی ذکر الطرق التی بہا استنبطت صناعۃ الطب
باب ہشتم: فی تحدید ما یجب علی الطبیب معرفتہ من العلوم لیکون کاملاً فی صناعتہ،
باب نہم: فی کیفیۃ تدرج المتعلم الطب و ذکر مراتب الکتب فیہ باب دہم: فی العبارات و الحدود الطبیۃ

مخطوطہ میں ۳۴ صفحات ہیں۔ کاتب محمد حسینی۔ مکتوبہ ۲۰ رجمادی الثانی ۱۱۵۷ھ در شاہجہان
آباد۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں بھی اس کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔

۲۰۔ مباحث الاطباء، مؤلفہ درویش محمد: مختلف علوم و فنون کے ماہرین میں جو علمی چشمکیں
اور معاندانہ آمائیاں رہی ہیں، اطباء کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ نہ صرف ابن سینا اور رازی کے عہد کے دوسرے
ممتاز اطباء، مثلاً ابن بطلان و ابن رضوان کو اس سے سابقہ پیش آیا بلکہ ہندوستان میں بھی معاصر اطباء
کے درمیان اس قسم کے علمی مناظرے ہوئے۔ خاندان شریفی دہلی اور خاندان عزیزی لکھنؤ کے علمی
مباحثے اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ طرفین کی طرف سے مخالفت و موافقت میں متعدد رسالے تصنیف
کئے گئے ہیں۔ حکیم درویش محمد اور حکیم محمد علی کو جو اپنے زمانہ کے صاحب فن طبیب تھے، ان کے درمیان بھی یہ
سلسلہ جاری رہا۔ حکیم درویش محمد بن علیم خان صدیقی رامپوری، مشہور بہ حکیم اللہ صدیقی شاہجہان پور
کے رہنے والے تھے حالی رام پور نواب سید احمد علی خان کی سرکار سے وابستہ رہے ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء
میں رحلت کی۔ حکیم درویش محمد نے مباحث الاطباء میں جن مسائل پر قلم اٹھایا تھا حکیم محمد علی امم لکھنوی،
حکیم محمد علی کو جلی لکھنوی اور حکیم فتح الدین گوپاموی نے ان کے جوابات تحریر کئے۔ حکیم عاشق ابن بندہ حسن
لکھنوی نے ان کا فارسی ترجمہ "النتائج الحسینیہ" کے نام سے کیا ہے۔ حکیم مظفر حسین لکھنوی نے "التحقیقات
البہیۃ" میں اس کا جواب دیا ہے اور اطباء مذکور کا اس میں تعاقب کیا ہے۔ حکیم درویش محمد کے صاحبزادے
حکیم اسد علی لکھنؤ میں رہتے۔ یہ صاحب درس و افادہ تھے۔ ان کے شاگرد حکیم فتح الدین گوپاموی نے "حل مشکلات
المباحث" لکھا ہے۔ ترکیب القوانین بھی فتح الدین کی ایک کتاب ہے۔

مباحث الاطباء میں پہلی بحث تعریف طب، دوسری تقسیم طب (جزء علمی و عملی) تیسری
موضوع طب، چوتھی ارکان، پانچویں مزاج، چھٹی اخلاط، ساتویں اعضاء، آٹھویں ارواح، نویں قوی، دسویں
افعال نفس، گیارھویں احوال بدن انسان، بارھویں اسباب، تیرھویں علامات، چودھویں قول کلی (متعلقہ
علاج بالغذا)، پندرھویں ادویہ مفردہ، سولہویں ادویہ مرکبہ، سترھویں امراض مخصوصہ، اٹھارھویں حمیات،
انیسویں بحران، بیسویں اسئلہ متفرقہ پر ہے۔

بروز جمعہ ۲۶ (مہینہ کا نام درج نہیں ہے) ۱۲۶۴ھ کو مخطوطہ کی کتابت ہوئی ہے اور یہ ۱۲۵
صفحات پر مشتمل ہے۔ حکیم درویش محمد کا رسالہ فی الطب عربی کا ایک نسخہ رضا لائبریری میں ہے [1]

۲۱۔ مجربات ابن بیطار، جامع الادویہ والاغذیہ جیسی عظیم کتاب کے مصنف ابن بیطار

کے مجربات یقیناً صاحبان فن کے لئے باعث قدر ہیں۔ اس میں امراض کے تحت مجرب و کارآمد دوائیں تحریر کی گئی ہیں۔ دیباچہ پر اس نے لکھا ہے کہ لوگوں نے معالجات پر ضخیم کتابیں تصنیف کی ہیں لیکن ان سے مجرب دواؤں کا انتخاب مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں ان دواؤں کو بیان کیا گیا ہے جن کی تجربہ نے شہادت دی ہے اور جو اگر ایک طبیب کے پیش نظر رہیں تو اسے علاج میں سہولت حاصل ہوتی ہے۔ اس میں ہر مرض کی مختصر وضاحت کرتے ہوئے علاج تجویز کیا گیا ہے۔ علاج زیادہ تر متعلقہ مرض کی کارآمد مفرد دواؤں پر مشتمل ہے اور اگر مرکب نسخہ درج ہے تو وہ بھی چند مفردات سے زیادہ کا نہیں ہے۔ ایک حاذق اور ماہر ادویہ کی یہ تصنیف مجربات کی کتابوں میں اپنے مرتبہ کے اعتبار سے نہایت بلند ہے۔

سہ شنبہ ۱۰ ذی قعدہ ۱۲۶۴ھ کو ۱۴ صفحہ کے اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے۔ دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ میں بھی اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔

۲۲۔ **معالجات بقراطیہ**، مؤلفہ احمد بن محمد الطبری: ابن سینا (۱۰۳۷ – ۹۸۰ء) سے پہلے کے طبی مصنفین میں ابوالحسن احمد بن محمد الطبری (وفات ۳۶۶ھ/ ۹۷۶ء) نہایت سربرآوردہ نام ہے۔ یہ امیر رکن الدولہ کا طبیب خاص اور اپنے وقت کا زبردست معالج تھا۔ طبی کتابوں میں اس کی تصنیف معالجات بقراطیہ (۳۵۸ھ/ ۹۶۸ء) کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں امراض اور علاج کا بڑی تحقیق کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے پہلا مرتبہ بتایا کہ سل ایک مادی مرض ہے اور یہ پھیپھڑے کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی ہو سکتا ہے۔ خارش کا سبب اس نے ایک قسم کے کیڑوں کو قرار دیا۔ یہ کتاب دس مقالوں میں منقسم ہے۔ اس کی جلد اول حکیم ضیاء الحسن کے ذخیرہ میں تھی جو اب طبیہ کالج لائبریری علی گڑھ میں ہے اور جلد دوم جو آٹھویں، نویں اور دسویں مقالہ پر مشتمل ہے۔ راقم الحروف کے ذخیرہ کی زینت ہے۔ آٹھواں مقالہ امراض صدر و ریہ و غشاء حاجب، و جملہ آلات نفس و قلب، نواں مقالہ امراض معدہ اور دسواں مقالہ امراض کبد و طحال سے متعلق ہے۔ اس کے صفحہ اول پر افسر الاطباء حکیم معز الدین خان کے قلم سے یہ عبارت تحریر ہے "ہر دو جلد کتاب ہذا بقیمت مبلغ بست و پنج روپیہ حالی از کتب خانہ حکیم محمد اعظم خان صاحب بزرگ وار استقاریا سعت (بھوپال) خرید کردہ شد، مورخہ سی ام جمادی الاول ۱۳۰۷ھ" اس عبارت کے نیچے حکیم معز الدین خان کی ۱۲۹۸ھ کی مہر ثبت ہے، مخطوطہ صاف اور خوشخط ہے۔ بروز جمعہ ۵ رمضان ۱۲۴۳ھ میں کتابت ہوئی کاتب کا نام ارشد علی بہاری ہے۔ جیسا کہ یاد ہے تین نسخوں کے علاوہ رضا لائبریری رامپور اور مولانا

آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی اس کے مخطوطے محفوظ ہیں۔

۲۳۔ معالجات محمد بن زکریا و علی بن عباس: معالجات محمد بن زکریا رازی و علی بن عباس مجوسی کے مرتب کا نام اس مجموعے سے ظاہر نہیں ہوتا۔ مرتب نے ان دونوں نامور طبیبوں کی کتابوں سے ان کے محض مجرب نسخے جمع کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مریض کی پوری روداد اور مرض کی پوری نوعیت و حیثیت کے ساتھ علاج قلمبند کیا ہے۔ دوسرے مصنفین نے عام طور پر علاجی واقعات کو ضبط تحریر میں نہ لاتے ہوئے محض مجربات اور نسخے جمع کیے ہیں۔ اس میں چونکہ مرض کیفیت کے بیان کے بعد علاج درج کیا گیا ہے اس لیے مطلب عملی اور سریری یاتی نقطہ نظر سے یہ ایک اہم مجموعہ ہے۔ زکریا رازی کے علاجی واقعات "قصص و حکایات مرضیٰ" کے نام سے ایران سے طبع ہوئے جس میں عربی کے ساتھ فارسی ترجمہ بھی شامل ہے۔

مخطوطہ ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ کا مکتوبہ ہے کتابت اولاد علی موہانی کی ہے۔ اس کاتب کی دوسری کتاب بریانو علی گیلانی راقم کے ذخیرہ میں ہے۔ یہ مخطوطہ بھی اکبر حسین کی ملکیت رہا ہے۔ ان کے ۱۲۹۵ھ کے دستخط آخر پر ثبت ہیں۔ معالجات محمد بن زکریا و علی بن عباس کا کوئی اور نسخہ کہیں میری نظر سے گذرا ہے۔

۲۴۔ مقالہ نبیذ مؤلفہ روفس: جالینوس سے پہلے کے مشہور یونانی طبیب روفس کے مقالہ نبیذ کا عربی ترجمہ عباسی عہد میں دوسری یونانی کتابوں کی طرح عربی جامہ پہنایا گیا ہے۔ اس کا مترجم قسطا بن لوقا البعلبکی ہے۔ سات صفحہ کے اس رسالہ میں نبیذ کے منافع اصناف و طریق استعمال پر بہت اچھے انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۰ جمادی الاول کا مکتوبہ یہ نسخہ جس مخطوطے سے منقول ہے وہ بروز منگل ۲ شوال ۶۹۱ھ کا لکھا ہوا تھا۔

فارسی مخطوطات

احسن القرابادین، مؤلفہ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی: حکیم احسن اللہ خاں بن عزیز اللہ صدیقی دہلوی شیخ زین الدین ہروی کی اولاد سے تھے۔ ان کے بزرگ ہندوستان میں پہلے کشمیر آئے، وہاں سے دہلی پہنچے۔ حکیم احسن اللہ خاں مغلیہ عہد کے آخری عظیم المرتبت طبیب ہیں۔ ابتدا میں نواب فخر الدولہ کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد نواب فیض اللہ خاں جھجھر کے معالج خاص نے اور ان کی آخر زندگی تک وہاں طبی خدمات انجام دیں۔ پھر اکبر شاہ ثانی کے عہد میں شاہی طبیب کا اعزاز ملا۔ اور عمدۃ الملک حاذق الزماں کے خطاب سے نوازے گئے۔ بعد میں بہادر شاہ کے طبیب خاص مقرر ہوئے۔ احترام الدولہ ثابت جنگ کے خطابات عطا ہوئے، اور وزیر اعظم کے عہدے سے سرفراز کئے گئے۔ یہ بڑے دانشور، صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ حسن معالجہ اور درس میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ جہاں رہے وہاں درس کا سلسلہ جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بھوپال میں نواب سکندر بیگم کے عہد میں افسر الاطبا مقرر ہوئے۔ وہ ریاست کے پہلے افسر الاطبا تھے۔ اس سے قبل یہ عہدہ وضع نہیں ہوا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد مہاراجہ بڑودہ کی دعوت پر گراں قدر مشاہرہ پر بڑودہ گئے جہاں بڑا اعزاز و افتخار حاصل ہوا۔ بڑودہ ہی میں ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ "وائے بقراط وقت مرد افسوس" سے تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

راقم کے ذخیرہ میں حکیم احسن اللہ خاں کی بیاض کا ۱۱۲ صفحات کا انتخاب ہے۔ حکیم سید کرم حسین (تجارہ سالوں) کو حکیم بدیع سہائے میرٹھی کے واسطہ سے ان سے تلمذ کی نسبت حاصل تھی۔ ان کے معمولات میں نہ صرف احسن اللہ خاں کے مجربات شامل تھے بلکہ ان کے تجارہ کے ذخیرہ میں احسن القرابادین کا ایک نسخہ بھی تھا جو فسادات تجارہ کی نذر ہو گیا۔ حکیم بدیع سہائے کے شاگرد حکیم محمد حسن حاذق میرٹھی نے اپنی قرابادین میں حکیم احسن اللہ خاں کے متعدد نسخے تحریر کئے ہیں۔ میرے علم میں حکیم احسن اللہ خاں کی قرابادین کے درج ذیل نسخے ہیں۔

۱۔ کتب خانہ محل مہاراجہ جے پور ۲۔ نواب صابر قلی خاں، نواب محمد گڑھ

۳۔ ڈاکٹر عبد الحمید راجہ لائل پور

۴۔ رضا لائبریری رام پور میں اس کا جو نسخہ ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا سال کتابت ۱۲۷۵ھ ہے جو قرابادین کا سال تالیف ہے۔

۲۔ **انیس العشاق**، مؤلفہ میر نوازش علی خاں: میر نوازش علی نے امور عشق، مقدمات باہ، اور اس کے متعلقات پر مختلف کتابوں سے انتخاب کر کے اسے مرتب کیا ہے۔ رسالہ حکیم گیلانی، رسالہ ناجیہ در قوانین جامع تالیف حکیم ابو نصر علی بن ابی سعد، ذہبیہ امام علی بن امام علی بن موسیٰ رضا کا اس میں حوالہ ہے۔ اس ۴۴ صفحے کے مختصر رسالہ میں ـــــ نسخے مختلف مرکب شکلوں میں مثلاً معجون، طلاء، حبوب وغیرہ تحریر ہیں۔ ترقیمہ ندارد ہے۔

۳۔ **بیاض**، مؤلفہ برادر میر سید وارث علی الہ آبادی: اس بیاض میں فہرست امراض کے ساتھ نسخے درج ہیں۔ صاحب بیاض کا نام معلوم نہیں ہو سکا لیکن اس کے صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ الہ آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا نام میر وارث علی تھا جو سورام میں تحصیلدار تھے۔ صاحب بیاض کے دو لڑکوں سید وارث حسن اور محمد ضامن اور ایک لڑکی لکون کا نام بھی اس میں ملتا ہے۔ ان کے آرہ اور عظیم آباد کے سفر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مشہور معاصر اطباء جن سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں اور جن کے مجوزہ نسخے تاریخ کے حوالے کے ساتھ انھوں نے درج کئے ہیں ان میں حکیم فخر الدین عرف حکیم بادشاہ صاحب، حکیم مسیح الدولہ لکھنوی اور حکیم خلیل الدین خاں لکھنوی وغیرہ ہیں۔ ایک نسخہ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی وزیر اعظم بہادر شاہ ظفر کا ہے جو انھوں نے ۲ر فروری ۱۸۷۲ بروز یکشنبہ الہ آباد میں بر دانگی بڑودہ د گجرات، مولوی سمیع اللہ خاں وکیل ہائی کورٹ کے مکان پر بطور مہمان قیام کے دنوں میں لکھا ہے۔ حکیم مسیح الدولہ بہادر لکھنوی کا نسخہ ۱۰ر فروری ۱۸۵۷ء مطابق ۲۲ جمادی الاول ۱۲۷۱ھ بروز شنبہ کا ہے جسے انھوں نے ان کے بھائی سید وارث علی کے لئے تجویز کیا ہے۔

بیاض کے نسخوں کی تاریخیں ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ اور ۳۰ر اگست ۱۸۷۳ء (۶ر رجب ۱۲۹۰ھ) کے درمیان کی ہیں۔

۴۔ **بیاض نواب اشرف محمد خاں**، حکیم اشرف محمد خاں بھوپال کے ذی علم حاذق طبیبوں میں تھے۔ نسخہ نویسی میں ملکہ اور دست شفا کی وجہ سے ان کا مطب مرجع خلائق تھا۔ یہ حکیم محمد یوسف خاں (وفات ۱۲ر ربیع الاول ۱۲۶۴ھ) کے صاحبزادے تھے اور ریاست کے نواب خاندان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے

ان کی پیدائش کی خوشی میں نواب سکندر بیگم نے قیدیوں کو رہا کیا تھا اس لیے یہ "بندی چھوڑ" کہلاتے تھے۔ بھوپال میں اسی نام سے شہرت ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں انھوں نے مجاہدین کا ساتھ دیا۔ نواب سکندر بیگم نے جو انگریزوں کی طرفدار تھیں "باغیوں اور مفسدوں" کے خلاف کارروائی کی اور بعض دوسرے افراد کے ساتھ حکیم بندی چھوڑ بھی قید میں مبتلا ہوئے۔ انھوں نے بیاض میں ایک جگہ لکھا ہے "۲۸ ربیع الثانی ۱۲۷۴ھ ایام غدر میں مردمان ذیل کو نواب سکندر بیگم صاحبہ نے بطور حوالات بریشی صاحب اجنٹ روانہ سیہور کیا۔ فرید الدین، سعید الدین، حکیم بندی چھوڑ خان، منصب علی بخشی محمد طاہر، قاضی کوثر علی، دیلان پربھوں لال، باقر علی اور گڑھی سیہور میں نظربند ہوئے۔ اور ۹ جمادی الاول ۱۲۷۴ھ کو گڑھی سے اٹھ کر چھاؤنی سیہور میں مقیم ہوئے، اور تاریخ ۲ صفر ۱۲۷۵ھ کو پھر گڑھی میں آکر قیام کیا اور تاریخ ۵ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ کو حکیم بندی چھوڑ خاں اور فرید الدین گڑھی سیہور سے فتح گڑھ آئے اور تاریخ ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۷۹ء رہائی پاکر حکیم بندی چھوڑ خاں اپنے گھر بخیر و عافیت آئے اور فرید الدین نے فتح گڑھ میں خودکشی کی"۔

حکیم بندی چھوڑ نے دو سو[۲۰۰] صفحہ کی اس بیاض میں اپنے ذاتی مجرب و قابل اعتبار نسخے درج کئے ہیں۔ راقم کے ذخیرہ میں حکیم بندی چھوڑ کی درج ذیل اردو کتابوں کے بھی خطی نسخے ہیں جو سب بخط مصنف ہیں۔

۱۔ **اشرف الاسرار**: اس میں امراض کے دلائل اور ردی و محمود علامات کا بیان ہے۔ یہ دلائل اطبا متقدمین کے تجربات کے علاوہ ان کے ذاتی تجربوں پر مبنی ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے صاحبزادہ عنایت محمد خاں کی تعلیم کے لئے مرتب کی تھی۔ یہ بھی تقریباً دو سو[۲۰۰] صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ **بحث بحران**: یہ رسالہ بھی انھوں نے اپنے صاحبزادہ عنایت محمد خاں کے لیے تالیف کیا ہے اس میں ۲۲ (بائیس) صفحات ہیں۔

۳۔ **رسالہ حمٰی دق**: نواب شاہ جہاں بیگم اور نواب صدیق حسن خاں کے نام معنون ہے۔ شعبان ۱۲۹۵ھ میں یہ رسالہ انھوں نے اپنے صاحبزادہ عنایت محمد خاں کی طبی تعلیم کی غرض سے مرتب کیا ہے۔ اس میں انھوں نے جو تجربات پیش کئے ہیں دیباچہ کے مطابق وہ ان کے چالیس سالہ مطب کا نچوڑ ہے۔

۵ - **بیاض علی گیلانی**: حکیم علی گیلانی جہانگیری کا مشہور طبیب اور مصنف ہے۔ دوسرا

رناموں کے علاوہ عربی میں قانون کی شرح کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ بیشتر شروح کا تعلق
ے کلیاتی حصّے سے ہے لیکن مکمل قانون کی شرح کا شرف صرف دو شارحین کے حصّہ میں آیا ہے ایک
دین قرشی المعروف بہ ابن نفیس اور دوسرے ہندوستان کا مایہ ناز طبیب علی گیلانی۔ جامع الشروحین
سے شرح آملی کے ساتھ گیلانی کی شرح کلیات طبع ہو چکی ہے لیکن باقی حصوں کی شرح مخطوطات
یں ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ شرح قانون کی تصنیف کے علاوہ
کی شکل میں اس نے اپنے مجربات بھی جمع کئے ہیں۔ اس بیاض کی نایابی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے
د عہد مغلیہ میں حکیم کوثر چاند پوری نے لکھا ہے" اکثر طبی کتابوں میں مجربات گیلانی کا نام بھی گزرا
ن مجربات حکیم علی کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی کوئی مجلد کسی لائبریری میں ہے
،" روغن دیودار حکیم علی کے اختراعات میں ہے۔

حکیم علی علوم متداولہ میں شیخ عبدالنبی اور طب میں اپنے ماموں حکیم الملک شمس الدین گیلانی
اللہ شیرازی کا شاگرد تھا۔ حذاقت اور معالجہ کے ساتھ ہی سیاسی طور پر بھی اس کی شخصیت ممتاز تھی۔
یں حکیم علی کا حوض مشہور رہا۔ جس میں اس نے کمال فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ آگرہ میں بھی اس نے
م کا ایک حوض بنوایا تھا۔ عہد اکبری میں اسے ہفت صدی منصب، جالینوس الزمان کا خطاب
ر بہار کی صدارت حاصل تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں دو ہزاری منصب عطا ہوا۔ ۵ محرم ۱۰۱۸ھ
ز وفات ہے۔

زیر نظر مخطوطہ کی کتابت اولاد علی نے ۲۹ ربیع الاول ۱۲۵۲ھ کو فرخ آباد میں کی ہے۔ یہ
۱۲۹ھ میں اکبر حسین کی ملکیت رہا ہے۔ صفحۂ آخر پر ان کے دستخط ہیں۔

راقم کے ذخیرہ میں اس بیاض کا دوسرا نسخہ بھی ہے جسے نواب محمد شاہجہاں خاں نے ۱۵ جمادی الاول
ھ کو نقل کیا ہے اور ۲۰ جمادی الاول ۱۲۵۱ھ کو سید احمد حسین نے اس کے مقابلہ موازنہ کے فرائض
ئیے ہیں۔

۱- **تحفۂ دوستان**، مؤلفہ سید ماجد علی عظیم آبادی: مؤلف کتاب عظیم آباد (پٹنہ) کے رہنے
یا۔ والد کا نام سید امام علی رضوی ہے۔ اپنے استاذ حکیم امام بخش اور ان کے بیاض کے حوالے
نسخے نقل کئے ہیں۔ منشی قاسم علی کا بھی بطور استاذ ذکر ہے اور انہیں طبیب حاذق لکھا ہے ایک

مجرب نسخہ لالہ رام دیال اور ایک نسخہ محی الدین خاں کے حوالہ سے مرقوم ہے۔ تحفۂ دبستان "ساغر جبار" سے تاریخ تالیف ۱۲۶۵ھ برآمد ہوتی ہے۔

علاج امراض پر نسخوں کا اچھا مجموعہ ہے۔ معمولات کے علاوہ اصول علاج سے بھی گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب دو مقالوں اور خاتمہ پر مشتمل ہے، لیکن یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ اس مجموعہ میں درج ذیل دیگر رسائل شامل ہیں۔

(۱) خمسۂ عشرین قضایا بقراط (۲) دلائل نبض یوسفی (۳) دلائل بول یوسفی تالیف ۹۴۲ھ (۴) مختصر البیان فی ضروریات البحران۔ محمد بدرالدین بن خواجہ جمال الدین۔ (۵) انیس المشرحین (علم تشریح کی مشہور جامع کتاب ہے) (۶) رسالہ ستہ ضروریہ یوسفی۔ تالیف ۹۴۴ھ (۷) رسالہ ماکول و مشروب یوسفی (منظوم) (۸) رسالہ حمیات مفردہ و مرکبہ۔ حکیم سید حیدر علی تلمیذ حکیم میر محبوب علی (ناکمل)۔

ان میں صرف رسالہ ماکول و مشروب میں تاریخ کتابت ۱۲ ربیع الاوّل ۱۲۶۶ھ بروز یکشنبہ درج ہے، لیکن چونکہ پورے مجموعے کا کاغذ اور خط یکساں ہے اس لئے تمام رسائل کی کتابت تقریباً اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے۔

ترجمہ عیون الخواص' امیر ابونصر اسفارینی بن رستم دیلمی کی عربی کتاب "عیون الخواص" کا فارسی ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ ۶۲۶ھ میں سلطان دیالم احمد بن ہوخنگ بن اسفندیار کے حکم سے کیا گیا ہے۔ کتاب تین مقالوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ اوّل میں حیوانات مقالہ دوم میں نباتات اشجار و خشائش اور مقالہ سوم میں جواہر و احجار کے خواص لکھے گئے ہیں۔ مترجم کا نام کتاب سے ظاہر نہیں ہوتا۔ دیلمی کی کتاب عیون الخواص کا ذکر کشف الظنون میں ہے۔

ترکیبات طعومات: مصنف کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ اس میں مختلف غذاؤں مثلاً مغلئی گوشت، مختلف قسم کے دوپیازے، دوپیازہ کدو، دوپیازہ باذنجان، دوپیازہ کریلہ، دوپیازہ قلیہ، دوپیازہ کچنال، دوپیازہ، ساگ چولائی، مختلف قسم کے بھرتے، پلاؤ، قبولی، متنجن، نان ورقی، بورانی، حلوہ کی تیاری کے طریقے تحریر ہیں۔ خصوصیت یہ ہے کہ محض پکانے کا طریقہ درج نہیں بلکہ غذا کو طبی لحاظ سے مفید بنانے کے لئے انہیں مختلف ادویہ کی آمیزش کے ساتھ ترکیب دیا گیا ہے۔ خوشبودار ادو

اور مسالوں مثلاً قرنفل، دارچینی، زعفران، ادرک، مرچ سیاہ، کشنیز، الائچی، بادام، کشمش، پستہ شنگرف وغیرہ کی شمولیت سے ذائقہ کی لذت کے علاوہ طبی فوائد حاصل کئے گئے ہیں۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے منفرد کتاب ہے۔ کتابت ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ترقیمہ موجود نہیں ہے۔

تریاق فاروق، مؤلفہ حکیم کمال الدین حسین شیرازی: حکیم کمال الدین بن حکیم نورالدین بن مولانا کمال الدین صفوی عہد کے ایران کے نامور طبی اساتذہ میں ہیں۔ حکیم کمال الدین نے شاہ اسماعیل صفوی کے یہاں طبی خدمات انجام دیں۔ یہ شاہ نورالدین نعمت اللہ الباقی الحسینی کا مرید و معتقد تھا۔ یزد میں جہاں ان کا قیام تھا وہاں ایک مدت تک یہ طبی معالجے میں مشغول رہا۔ شاہ اسماعیل صفوی کی وفات تک وہاں اس کی اقامت رہی۔ شاہ طہماسپ حسینی صفوی کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد یہاں کے دربار سے وابستہ ہوا پھر شاہ اسماعیل ثانی کے زمانہ میں اسے اور عروج حاصل ہوا۔ لیکن بعض مخالفتوں کی وجہ سے اسے قزوین چھوڑنا پڑا اور وہ گیلان خان احمد خان شاہ کی خدمت میں پہونچا جہاں اس کا نہایت اعزاز و اکرام ہوا۔ خان احمد نے اسے اپنا طبیب اور مصاحب خاص بنایا اور عہدہ صدارت پر فائز کیا۔

یزد کے زمانہ قیام میں شاہ نعمت اللہ کے ایما پر اس نے تریاق فاروق تصنیف کی۔ اس کتاب میں تریاق کبیر یعنی تریاق فاروق پر شرح و بسط لکھا ہے۔ یہ ایک مقدمہ، تین رکن اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں اس کی وجہ تسمیہ اور محاسن پر روشنی ڈالی ہے۔ پہلے رکن میں اس کے نسخوں پر تفصیلی بحث ہے، دوسرے رکن میں اس کی مفرد ادویہ کا بیان ہے، جس میں ان کی ماہیت، درجات اور جزئی و کلی افعال سے بحث کی گئی ہے۔ اس طرح نسخہ میں شامل ہر دوا کی کافی تفصیل آ گئی ہے۔ یہ حصہ ادویہ مفردہ سمیہ کے لحاظ سے خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ تیسرے رکن میں سبب ترکیب تریاق اور اس کے اجزا کے انتخاب کی وجہ لکھی گئی ہے۔ خاتمہ میں تریاق کی عمر اور قواعد امتحان اور فوائد تریاق بیان کئے ہیں۔ علم السموم کے مطالعہ میں یہ ایک اہم کتاب ہے، طب یونانی میں سموم و تریاق کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔ اس موضوع پر اس قدر مکمل اور جامع انداز میں دوسروں نے نہیں لکھا ہے۔ مخطوطہ میں ۶۶ صفحات ہیں۔

تعلیمات بہادر شاہی، مؤلفہ حکیم عسکری: تعلیم الطب بہادر شاہ اور تعلیمات عسکری

سے بھی اس کتاب کو موسوم کیا گیا ہے ۔ مؤلف کتاب حکیم عسکری کے بارہ میں کتابچے سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ان کی ایک کتاب مقدمۃ الطب بھی ہے ۔ ۶۷۴ صفحات کی ضخیم کتاب "تعلیمات بہادر شاہی" طبیات طب سے تعلق رکھتی ہے ۔ اس کی ترتیب کلیات کی عام کتابوں سے مختلف ہے ۔ یہ سات اظہار پر منقسم ہے ۔ اظہار اول فضیلت طب ، دوم آداب و اخلاق اطباء ، سوم ضروری علوم برائے طبیب ، چہارم حد طب ، پنجم احوال بدنی (صحت و مرض وغیرہ) ششم موضوعات طب ، ہفتم تقسیم طب (جزو علمی و جزو عملی) پھر جزو علمی میں امور طبیعیہ ، علم الاحوال و الاسباب و الاعراض ، نبض و بول و براز کا بیان شامل ہے ۔

دوسرا حصہ جو جزو عمل سے لیطریق کی متعلق ہے اس میں بحث اول بیان حیات و موت بحث دوم تدبیر مولود اور بحث سوم حفظان شباب میں ہے ۔ جزو علمی کی کتابت حکیم فیض علی خاں نے کی ہے ، اور جزو عملی سید احمد علی کے قلم سے بروز دوشنبہ ۱۲۲۰ھ کو مکمل ہوا ہے ۔ ایک ورق پر ۱۲۱۹ھ کی مہر کندہ ہے ۔

خلاصۃ الادویہ ، مؤلفہ حکیم میر جان : حکیم میر جان لکھنؤ کے فاضل طبیب تھے ۔ ان کی مہارت فن اور حذاقت کا عام شہرہ تھا ، شوال ۱۲۶۱ھ وفات پائی ۔ سید علی اوسط لکھنوی نے "ماہ شوال حیف لیل خمیس" سے تاریخ نکالی ۔

یہ مختصر تالیف جدول کے طرز پر ادویہ مفردہ کے بیان میں ہے اور اسے سات دوائر میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ منشاء یہ ہے کہ بیک نظر دوا کے اقسام کی تفصیل سامنے آجائے ۔ مؤلف نے غرہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ سے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا اور غرہ جمادی الثانی میں اس کی تکمیل کی ۔ یہ کتاب غازی الدین حیدر کی بارگاہ میں پیش کی گئی ہے ۔ ۱۹ رمضان ۱۲۵۱ھ کے اس مکتوبہ نسخہ کے کاتب کا نام مظہر علی ہے اس طرح یہ نسخہ مؤلف کی حیات میں لکھا گیا ہے ۔

دستور الاطباء ، مؤلفہ امان اللہ حسینی المخاطب بخان زمان فیروز جنگ : مؤلف کتاب خان خاناں مہابت خاں (وفات ۱۰۴۴ھ/۱۶۳۴ء بمقام برہانپور) سپہ سالار شاہجہاں کے صاحبزادے ہیں ۔ امور سلطنت کے ساتھ ہی طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے ۔ ابتداء میں کابل کے گورنر رہے پھر سہ ہزاری منصب عطا ہوا بعد میں بنگال کے گورنر بنائے گئے ۔ شاہجہاں نے پنج ہزاری منصب خان زمان کا خطاب

لوہ کی صوبیداری سے سرفراز فرمایا۔ آخر میں دکن میں مامور ہوئے اور وہیں بالاگھاٹ میں ۱۰۴۶ھ/ ۱۶۳۶ء ار
عزا فراختیار کیا۔ یہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ام العلاج کے علاوہ جو طبع ہو گئی ہے، گنج بادآورد
مشہور طبی کتاب ہے۔ تاریخ عام، چہار عنصر دانش اور ایک دیوان بھی ان کی تصانیف میں ہے۔

دستور الاطبار ۱۰۳۸ھ میں برہان پور میں تصنیف کی گئی ہے۔ دیباچہ کے مطابق یہ دستور الاطبار
ملق "دستور العمل اطبار ہند" ہے، اس میں غذا اور شراب کے فوائد اور نقصانات پر بہت تفصیل سے
ہے۔ غذا میں گوشت، شہد اور سبزیوں کے تعلق سے کافی معلومات فراہم کی گئی ہیں اور کتاب کی ۹ تدبیریں
سے متعلق ہیں۔ دسویں اور گیارہویں تدبیر ادویہ کے بیان میں ہے جو پہلا استفراغ کرنے والی دوائیں اس
ودا دویہ مسہل بیان کی گئی ہیں۔ بارہویں تدبیر سے معالجات امراض کا بیان شروع ہوتا ہے، اور مختلف
م کے امراض کا علاج ترتیب کے ساتھ لکھا ہے۔ اس طرح کتاب ۶۱ تدبیروں پر تقسیم ہے۔

مخطوطہ ۹ رجب ۱۲۵۳ھ کو فرخ آباد میں بندہ علی نے نقل کیا ہے۔

دستور الصید، مؤلفہ خواجہ محمد رضا بن خواجہ محمد یوسف: یہ کتاب اگرچہ شکار کے قوانین اور
ازروں کے احوال میں ہے اور یہ ۱۹۹ ابواب پر مشتمل ہے لیکن اس میں متعدد باب جانوروں کی دوا و علاج کے بیان
لئے مخصوص ہیں۔ علم الادویہ کے نقطۂ نظر سے ان دواؤں کے مطالعہ کی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ آخری باب
بنگسو آسامی ادویہ سے متعلق ہے۔

یہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی ۱۰۹۹ھ کی تالیف ہے۔ اورنگ زیب کے علاوہ حسن علی
ں بہادر کی بارگاہ میں بھی نذرانہ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ مؤلف دہلی کا باشندہ تھا اس نے شاہجہاں
عرف دہلی استعمال کیا ہے۔ نسخہ بہت خوش خط اور اہتمام سے لکھا ہوا ہے۔ سرخیاں روشنائی سے
۔ ۲۲۸ صفحات کی اس کتاب کا پہلا اور آخری ورق غائب ہے۔

دستورات علاج علوی خاں: حکیم محمد ہاشم شیرازی المعروف بہ نواب معتمد الملک
م علوی خاں ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۱۱ھ میں ہندوستان آئے پہلے اورنگ زیب
دمت سے اس کے بعد محمد اعظم کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ پھر بہادر شاہ کے زمانے میں بھی وہ بلند
بہ رہے اور علوی خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ محمد شاہ کے عہد میں انہیں چاندی سے تولا
۔ چھ ہزاری منصب اور معتمد الملوک کا خطاب عطا ہوا۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ انہیں اپنے ہمراہ

ے گئے وہاں سے حج بیت اللہ سے فارغ ہوتے ہوئے ۱۱۵۶ھ میں وہ ہندستان واپس آئے
اور ۱۵ رجب ۱۱۶۰ھ / ۱۷۴۷ء کو فوت ہوئے۔ درگاہ حضرت نظام الدین میں آسودۂ خاک ہیں۔
ترجمۂ شہرۂ آفاق معالج کی حیثیت سے ان کی حذاقت اور مسیحائی کے بہت سے واقعات تاریخوں میں
مذکور ہیں بلکہ ان کے درس کی وسعت کا یہ عالم رہا کہ ہندوستان کے بیشتر گرامی منزلت طبیبوں کا سلسلہ
انہی پر منتہی ہوتا ہے۔ بے شمار طلبا نے ان سے استفادہ کیا۔

تذکرۃ العلاج الکتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں دو جلدوں پر مشتمل اس کا مخطوطہ علوی خاں
کی حیات میں لکھا گیا ہے۔ اس پر محمد شاہ کی ۱۱۴۳ھ کی مہر کندہ ہے۔ عشوہ کا مطلع آبادین علوی
خاں، مفردات علوی خاں وغیرہ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ مطب علوی خاں ان کی عام مقبول کتاب
ہے۔ دستور العلاج میں امراض مثلاً سوداء لقنیہ، استسقاء، قرحہ کلیہ و مثانہ اور بواسیر کے علاج کے
قوانین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مظہر علی نے ۱۹ محرم ۱۲۴۶ھ اس نسخہ کی کتابت کی ہے۔

دستور العمل، حکیم شفائی خاں: طبی دستور العمل پر متعدد مشہور ماہرین طب نے قلم اٹھایا
ہے۔ اس موضوع کا تعلق اعلیٰ علمی یا کتابی قابلیت سے زیادہ فنی حذاقت، معالجانہ شعور اور مطب و نسخہ
نویسی میں مہارت سے ہے۔ اس لئے عام مصنفین کے بجائے حاذق طبیبوں نے اپنے تجربات اور معالجات
کی روشنی میں اس موضوع پر لکھا ہے۔ اس قسم کی کتابوں میں مطب میں کام آنے والے رموز و نکات
ملتے ہیں اور ایک معالج کے لیے وہ ضروری باتیں جن سے وہ کامیابی کے ساتھ علاجی فرائض انجام دے
سکتا ہے۔

حکیم محمد ارشد بن عبدالشافی خاں مسیح الملک دہلوی المعروف بہ شفائی خاں (وفات ۱۲۳۰ھ)
مشہور معالج اور مصنف ہیں۔ دہلی سے احمد شاہ درانی کے حملے کے وقت فیض آباد منتقل ہوئے۔ اس
دستور العمل میں سبب مرض پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے علامات، تشخیصی نکات اور اصول علاج
کے بعد معمولات مطب نسخے تحریر کئے گئے ہیں۔ علامات مرض کے بیان میں خوبی یہ ہے کہ ان سے تشخیص
مرض میں خاص رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ شفاء الجمیل، فوائد شفائیہ شرح موجز القانون کے علاوہ
جواہر المعالجات ان کی ایک کتاب ہے۔ اس میں ادویہ غذائیہ کے جرم کے عدم بقا پر لکھا ہے۔

مرزا حیدر نے ادتاد المجانین کے نام سے اس کی تردید میں مولانا دلدار علی (وفات ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء) کی حیات میں ایک کتاب لکھی ہے۔ یہ اسٹیٹ لائبریری اور رضا لائبریری میں ہے۔ حنفیۃ المجانین فی رد جرا اجتماع المعاندین کے نام سے ایک کتاب دار العلوم دیوبند میں بھی ہے۔ دستور العمل کا یہ نسخہ ۱۶۲ صفحات پر مشتمل ہے اور ۸ رجمادی الثانی ۱۲۶۹ھ کا مکتوبہ ہے۔ کاتب کا نام باقر علی ہے۔

دستور العمل قرابادین شفائی کا ایک نسخہ جواہر میوزیم مولانا آزاد لائبریری میں بھی ہے۔ عہد اکبری کا طبیب مظفر بن محمد الحسینی وفات ۱۰۳۷ھ بھی اپنے تخلص "شفائی" سے مشہور ہے۔ قرابادین شفائی اس کی مقبول عام کتاب ہے۔

رسالہ ادویہ مفردہ و مرکبہ امراض عین، مؤلفہ حکیم باقر۔ عماد الدین محمود شیرازی کا بیٹا حکیم محمد باقر بھی اپنے وقت کا حاذق معالج اور ماہر امراض چشم تھا۔ یہ شاہ عباس صفوی کے دربار سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے آنکھ کی بیماریوں کے علاج پر شہنشاہ کے لیے یہ کتاب تصنیف کی، اس کی فرمائش شاہ نے اس وقت کی تھی جب وہ ۱۶۰۲ء میں تبریز پر حملہ کرنے کے لیے اصفہان چھوڑ رہا تھا اور حکیم باقر اس کے ہمراہ تھا۔ حکیم باقر کے تلامذہ میں صدر الدین بن فخر الدین شیرازی المشہور بہ مسیح الزمان (وفات ۱۰۶۱ھ) ہیں۔ صدر الدین شیرازی عہد رسالت کے طبیب حارث بن کلدہ کی اولاد میں سے تھے۔

۸۶ صفحات کا یہ رسالہ امراض عین اور قروح اورام اور جراحات کی مفرد و مرکب دواؤں پر مشتمل ہے۔ فصل سوم میں مفرد دواؤں کا بیان ہے اور یہی اس کتاب کا اصل حصہ ہے۔ اسی میں امراض کے متعلق مفردات درج ہیں۔ مرکبات میں شیافات، اکحال ذرور، برود، باسلیقون، مرہم وغیرہ کے بہت سے نسخے بیان کیے ہیں۔ ادویہ مفردہ قروح و جراحات کی تعداد ۲۰۱ ہے۔ علم الجراحت کے مطالعے میں یہ حصہ نہایت قابل قدر ہے۔ مرکب ادویہ میں مراہم اور طلاء وغیرہ کے کافی نسخے درج ہیں۔ تدبیر الاستفراغ کے نام سے بھی حکیم محمد باقر کا ایک رسالہ ہے۔

رسالہ افیون، مؤلفہ عماد الدین محمود شیرازی: متاخرین اطبا میں عماد الدین محمود شیرازی کا مرتبہ بزرگ نہایت قد آور شخصیت ہے۔ اس کی تصانیف و مؤلفات اس کے فضائل اور کمال فن کا آئینہ ہیں۔ طبی علوم کے دقائق میں اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ سلاطین و امراء کے دربار سے وابستگی رہی وہ شاہ اسماعیل صفوی کا طبیب خاص تھا۔ ابو الحسن علی بن موسیٰ رضا کے آستانہ سے بھی منسلک رہا۔ اس کی تصانیف میں رسالہ

افیون اپنی نوعیت اور مضمون کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ۸۲ صفحات کے اس خاصے ضخیم رسالہ میں افیون کا ماہیت، طبیعت، کیفیت استخراج، خالص افیون کی صفات و طریق امتحان، مدت عمر، کیفیت استعمال، منافع و مضار، علاج سمیت افیون، سبب نشہ و نشاط، رفع عادت افیون، عوارضات بعد از ترک افیون کے استعمال سے لاحق ہونے والے امراض کا علاج، افیون کے استعمال کا طریقہ، مرکبات افیون مثلاً برشعثا وغیرہ کے علاوہ دوسری نشہ آور دوائیں مثلاً اجوائن خراسانی، جوز ماثل، شوکران، لفاح، یبروح الصنم، کے علاوہ مفرح ادویہ مثلاً زعفران، حرمل، کاکنج، کندر، قہوہ کو بھی مختصر بیان کیا ہے۔ سمیات کے مطالعہ میں نہایت اہم کتاب ہے۔

خدابخش پٹنہ کے ناقص الطرفین نسخہ کے علاوہ ادارہ تاریخ و تحقیق طب نئی دہلی اور ساٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں اس کے نسخے ہیں۔ رضا لائبریری رامپور میں اس کا ایک تلخیص موجود ہے۔ صاحب تلخیص کا نام رسالہ سے معلوم نہیں ہوتا۔

راقم الحروف کے ذخیرہ کا نسخہ ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۵۷ھ کے درمیان کا مکتوبہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں عمادالدین محمد کے رسالہ جدری تا آتشک کے علاوہ رسالہ بیخ چینی، رسالہ افیون اور رسالہ امراض صبیان بھی محفوظ ہیں۔

رسالہ جراحی، مؤلفہ حکیم جزی ڈسلوا: فن جراحت پر ہندوستانی اطبا نے زیادہ کام نہیں کیا ہے اور یوں بھی اس موضوع پر طب یونانی میں کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ حکیم جزی ڈسلوا کی ۴۴ صفحات کی یہ کتاب اسی مضمون میں ایک قابل قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں امراض جراحیہ کو شرح و بسط سے بیان کرنے کے ساتھ ہی ان کے مفید اور کارآمد نسخے تحریر ہیں۔ یہ مخطوطہ مصنف کے قلم کا یادگار ہے۔ بحر تیجور میں ۲۷ جولائی بروز دوشنبہ ۱۸۲۷ء اس کی کتابت ہوئی ہے۔ راقم کے ذخیرہ میں اس کا دوسرا نسخہ بھی محفوظ ہے۔

رسالہ چوب چینی، مؤلفہ حکیم عمادالدین محمود شیرازی: چوب چینی (SMILAX) جو SARSAPARILLA کا مشرقی بدل ہے، زہر کے تریاق کے طور پر معلوم کی گئی ہے۔ اس سے پہلے متعدد تریاق دریافت کئے گئے تھے۔ لیکن مصنفین نے ان کی زود اثری کے بارے میں بہت زیادہ وثوق سے کوئی بات نہیں لکھی تھی۔ چوب چینی ایرانی اطبا کی دریافت ہے۔ جس سے ایران و ہند

کی علمی دنیا کو سب سے پہلے عماد الدین کے اس رسالے نے متعارف کرایا۔ اس نے لکھا ہے کہ مشہور و معروف دواؤں پر طبی کتابوں میں کافی معلومات پیش کی گئی ہیں لیکن چوب چینی کے خواص و منافع چونکہ ابھی معلوم نہیں ہوئے ہیں اس لیے اس رسالہ میں اس پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالہ شاہ سلیمان صفوی کے حسب الامر تصنیف ہوا ہے۔ تاریخ تصنیف ۹۹۳ھ/۱۵۸۵ء ہے۔ اس میں چوب چینی کی دریافت، مزاج، مختلف امراض میں اس کی افادیت، استعمال کی شرطوں اور کھانے کے طریقوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

مخطوطہ تیس صفحات پر مشتمل ہے۔ کاتب کا نام سید ہدایت ہے۔ کتابت صفر سنہ ۳ جلوس شاہ عالم میں ہوئی ہے۔

رسالہ چوب چینی، مؤلفہ حکیم نوراللہ: عماد الدین محمود شیرازی کا ہم عصر حکیم نوراللہ علاء الدین چوب چینی پر پہلے لکھنے والوں میں ہے۔ اس کے رسالہ نے بعد کے مصنفین کے لئے رہنمائی کا کام کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ حکمائے فرنگ نے چوب چینی کی اگرچہ بیس[۲۰] خاصیتیں لکھی ہیں لیکن ان کے علاوہ بھی اور دوسرے منافع ہیں۔ اطبائے فرنگ نے جن جن امراض میں اس کی افادیت بیان کی ہے ان میں آتشک کہنہ، استسقاء، مالیخولیا، برص، بہق، جذام، فالج، لقوہ، قرع، بواسیر، حمی ربع، جرب و حکہ، داء الفیل، داء الثعلب، اورام احشاء، صرع، خدر وغیرہ ہیں۔ رسالہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا حکیم نوراللہ کا بیس برس ہندوستان میں قیام رہا اور یہاں کے اطباء سے انھیں اس کے جو فوائد معلوم ہوئے انہیں انھوں نے قلمبند کیا۔

نسخہ کی کتابت ۱۶ ربیع الاول ۱۱۴۹ھ کو ہوئی ہے۔

رسالہ چوب چینی و قہوہ و چائے، مؤلفہ مرزا قاضی بن کاشف الدین: مرزا قاضی بن کاشف الدین محمد حکیم یزدی (وفات ۱۰۷۵ھ/۱۶۶۴ء) شاہ عباس صفوی کے طبیب کا بیٹا اور اصفہان کا قاضی القضاۃ تھا۔ اس کے رسالہ چوب چینی کی تاریخ تصنیف تقریباً ۱۰۶۵ھ ہے اور یہ شاہ عباس صفوی ثانی کے نام معنون ہے۔ اس کے مطابق چوب چینی ۹۴۲ھ/۱۵۳۶ء میں شاہ اسمٰعیل صفوی کے زمانہ میں اطبائے فرنگ کی تصانیف کے ذریعہ بلاد عراق میں متعارف ہوئی۔ یہ وہی سال ہے جس میں آتشک کا ظہور ہوا۔ لیکن جیسا کہ ڈاکٹر الگوڈ نے بھی لکھا ہے قاضی کا بیان بہت مشتبہ ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ سترہویں صدی کے وسط سے قبل خود یورپ میں چوب چینی سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ بہاء الدولہ نے جس نے نہ صرف یہ کہ پہلی مرتبہ آتشک کو بیان کیا ہے بلکہ اس کے علاج سے اپنی کتاب خلاصۃ التجارب میں تفصیل

سے بحث کی ہے۔ اس دور کا ذکر نہیں کیا ہے، جب کہ چوب چینی اس مرض کی خاص دوا قرار دی گئی ہے۔ اس لیے عمادالدین کے سر ہی سب سے پہلے اس سے متعارف کرانے کا سہرا جاتا ہے۔ الگوڈ کا اندازہ ہے کہ اس کا رسالہ چوب چینی ۱۵۵۰ء کے قریب لکھا جانا چاہئے لیکن الگوڈ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ رسالہ کی تاریخ تصنیف ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء ہے۔

مرزا قاضی نے لکھا ہے کہ اطبائے فرنگ کے یہاں اس کے مزاج کا ذکر نہیں تھا۔ عمادالدین محمود نے اس کا مزاج متعین کیا اور حار رطب قرار دیا۔ قاضی کا بیان ہے کہ اس کے والد کاشف الدین اس کے قائل تھے اور حکیم کمال الدین حسین شیرازی نے بھی اسی کو نقل کیا ہے۔ لیکن مرزا قاضی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے اس کا مزاج دلیل و تجربہ کی روشنی میں مرکب القوی بتایا ہے، اور کہا ہے کہ یہ حار نہیں ہے۔ بلکہ سرد جزہی اس میں غالب ہے اور یہ بیخ خشک ہے نہ کہ رطب۔ چونکہ یہ آتشک کی مخصوص دوا تھی اور خود آتشک کا شمار ان امراض میں ہے جس کا تقریباً اسی زمانہ میں ظہور ہوا تھا۔ اسی لیے عمادالدین نے نہ صرف چوب چینی بلکہ آتشک پر بھی مستقل کام کیا۔

مرزا قاضی نے تجربات و معالجات کی روشنی میں اس کے استعمال و منافع پر لکھا ہے۔ اس رسالہ میں جہاں وہ ایک تجربہ کار معالج کی حیثیت سے نظر آتا ہے وہاں اس سے اس کی ندرت ذہن اور ذوق تحقیق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ جگہ جگہ اپنے پیش رو مصنفین سے اختلاف کرتا ہے۔ اس نے نتائج تک پہونچنے کی خود کوشش کی ہے۔ اور عمادالدین کی باتوں کو دہرایا نہیں ہے اسی لیے اس کے یہاں بعض نئی چیزیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ اس رسالہ کے آخر میں قہوہ اور چاے کے منافع پر بھی مختصر طور پر لکھا گیا ہے۔ بعد کے مصنفین کے یہاں مرزا قاضی کے کثرت سے حوالے ملتے ہیں۔ مخطوطہ نہایت خوش خط مطلیٰ و مذہب ہے۔ ۲۱ صفحات کے پورے مخطوطہ کی زمین طلائی ہے۔ حاشیہ کی لائنیں بھی دوسرے رنگوں کے علاوہ سنہری ہیں۔ پہلے صفحہ کا لاجوردی و طلائی کام اور اس کی زینت و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ تاریخ کتابت درج نہیں ہے لیکن یہ یقیناً شاہی خاندان کے کسی فرد کے لئے لکھا گیا ہے۔

راقم کے ذخیرہ میں اس کا دوسرا خطی نسخہ بھی ہے جو ۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کی کتابت ۲ ربیع الاوّل ۱۱۴۹ھ کو ہوئی ہے۔

چوب چینی کے علاوہ فادزہر اور رسالہ "جام جہاں نمائے عباسی" بھی اس کی تصانیف ہیں۔ جام

جہاں نماشاہ عباس صفوی کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ یہ شراب کے منافع، پینے کے آداب و قواعد اور اس
کی مضرتوں کو دور کرنے کے بیان میں ہے۔ اس رسالہ میں مرزا قاضی نے بہاءالدین محمد العاملی کو اپنا استاد
بتایا ہے۔ اس سے مرزا قاضی کے خطاب حکیم الملک کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء کی یہ تالیف
رضا لائبریری رامپور اور اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں ہے۔

رسالہ در حمیات مرکبہ، مؤلفہ مولانا رستم جرجانی: مولانا رستم جرجانی اپنے وقت کے کامل طبیب
تھے۔ خان احمد بادشاہ گیلان کے اطباء و معالجین میں انہیں امتیاز خاص حاصل تھا۔ کچھ ایسے حالات پیدا
ہوئے کہ انھیں وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ پہلے حج بیت اللہ کے لیے گئے۔ وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا اور
دکن میں سلطان نظام شاہ کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے علاقہ بیجاپور کے قیام میں
۹۷۱ھ میں اس وقت قلمبند کیا ہے جب نظام شاہ نے اس کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ یہ کل ۶ صفحہ کا رسالہ
ہے۔ اس میں جدول کے طرز پر حمیات کو بیان کیا ہے اور بخار کی نوبت اور وقفہ راحت پر جس خاص انداز
میں لکھا ہے وہ حمیات سے متعلق دوسرے مصنفین کے ہاں پڑھنے کو نہیں ملتا۔ یہ ان کا اچھوتا طرز ہے۔
تاریخ کتابت ۱۲ ربیع الاول ۱۱۴۹ھ ہے۔

مولانا رستم جرجانی کی ایک کتاب رشیحہ کا مخطوطہ حکیم علیم الدین بلخی ندوی پٹنہ کے ذخیرہ میں
ہے۔ یہ نبض، دلائل احوال تنفس، بول، عرق، علاجات سموم کے بیان میں ہے۔ یہ بڑا خوبصورت مطلّٰی
مذہب نسخہ ہے اس کی کتابت ربیع الاول ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں دولت آباد میں علی کرمانی کے ہاتھوں
ہوئی ہے۔ ان کی ایک کتاب ذخیرہ نظام شاہی ہے جو سالار جنگ میوزیم میں موجود ہے۔

رسالہ عالم شاہی، مؤلفہ حکیم محمد شریف خان: خاندان شریفی دہلی کے گل سرسبد اور حکیم
اکمل خاں کے بیٹے حکیم محمد شریف خان ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء میں بعہد محمد شاہ پیدا ہوئے۔ خاندانی بزرگوں
کے علاوہ محشی شارح اسباب و علامات حکیم عابد سرہندی (م ۱۱۵۱ھ/ ۱۷۳۹ء) جیسے فاضل زمانہ
استاذ کی شاگردی کا موقع ملا۔ شاہ عالم کے زمانہ میں ان کی علمی شہرت عروج کو پہنچی۔ دہلی میں ان
کے مطب اور درس کی دھوم تھی۔ ہندوستان بھر سے مریض اور طلباء ان کی خدمت حاضر ہوتے
تھے۔ ۸۴ سال کی عمر میں ۱۸ محرم ۱۲۲۱ھ/۱۷۹۹ء میں فوت ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز نے "دخل
جنت بلا حساب" تاریخ وفات کہی۔ مہرولی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی

درگاہ میں مدفون ہیں۔

یہ رسالہ ہندوستانی غذاؤں پر ہے اور اس میں مقامی پھلوں اور ترکاریوں کے خواص اور ان کی طبی منفعتوں پر تفصیل سے لکھا ہے نام بھی ہندوستانی استعمال کئے گئے ہیں۔ طب یونانی کو ہندوستانی بنانے اور یہاں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں سے استفادہ کے سلسلہ میں حکیم شریف کی جو مساعی رہی ہیں یہ مختصر رسالہ انہی کا ایک حصہ ہے اور اسی کی تالیف میں اسی جذبہ کی کارفرمائی ہے کہ اطبا کو زیادہ سے زیادہ مقامی پیداوار کی طبی منفعتوں سے روشناس کرایا جائے۔

رسالہ شاہ عالم کے نام معنون ہے۔ ترقیمہ نہیں ہے لیکن کتابت میں خاص حسن اور اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ پیشانی طلائی اور خوش نما رنگوں سے آراستہ ہے۔ ہر صفحہ میں سنہرا اور آسمانی حاشیہ ہے۔ اور سرخیاں سرخ روشنائی سے تحریر ہیں۔ مخطوطہ جن لوگوں کی ملکیت رہا ہے ان میں کسی نے عدالت ہردوئی کے کسی مقدمہ کی تاریخ ۱۳ اگست ۱۸۶۶ء بطور یادداشت درج کی ہے۔

اس مجموعہ میں حکیم شریف خاں کا دوسرا رسالہ خواص الجواہر الموسوم تحفہ عالم شاہی بھی شامل ہے۔ خواص جواہر پر ان کا یہ رسالہ تالیف شریفی کے حاشیہ پر طبع ہو چکا ہے لیکن ان کی دوسری کتابوں کی طرح طبی حلقوں میں معروف نہیں ہے۔

مخطوطہ کی پیشانی دیدہ زیب حسین اور دلکش بیل بوٹوں اور رنگوں سے مزین ہے۔ اور اس کے بھی ہر صفحہ میں خوبصورت سنہرا اور آسمانی حاشیہ ہے۔ دونوں رسالے ایک ہی کاتب کے حسن کتابت کا مرقع ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم شریف خاں کی دوسری طبی تصانیف میں حاشیہ شرح اسباب علاج الامراض، فوائد شریفیہ، حاشیہ کلیات نفیسی، مجالس نافعہ، تالیف شریفی، ترجمہ و شرح حمیات قانون اور غیر طبی کتابوں میں ترجمہ قرآن مع تفسیر، کاشف المشکوٰۃ (حدیث)، سوالات اربعہ (تصوف)، آثار نبوت، حاشیہ حمداللہ (منطق) ہیں۔

ان کی تصانیف میں رسالہ چوب چینی، رسالہ قوت باہ، رسالہ مارالجبنی انتقال کے بعد اور ترجمہ کلیات قانون، ترجمہ معالجات بقراطیہ کے مسودے ان کی زندگی ہی میں ضائع ہو گئے تھے۔ حکیم شریف خاں کے پوتے حکیم غلام محمد خاں کی تصانیف میں بھی ایک رسالہ عجالہ غریبہ یعنی چوب چینی میں ہے۔ تالیف شریفی کے حاشیہ پر طبع ہو چکا ہے۔ رسالہ ستہ ضروریہ، رسالہ زبدۃ الاخلاق، رسالہ احوال خنثیٰ کے علاوہ

ن کا ایک رسالہ ماکول و مشروب بھی ہے۔

شفاء المجدور، مولفہ حکیم احمد اللہ: حکیم احمد اللہ حکیم علوی خاں کے صاحب نقل اور صاحب تصنیف تلامذہ میں ہیں۔ حیدرآباد میں قیام رہا۔ ابن سینا کی کتاب الادویۃ القلبیۃ کا فارسی ترجمہ تفریح القلوب کے نام سے انہوں نے ترجمہ کیا ہے۔ تفریح القلوب کے تین خطی نسخے اسٹیٹ لائبریری، سالار جنگ اور نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد میں محفوظ ہیں۔ شفاء المجدور میں چیچک کی ماہیت، اقسام، اسباب و علامات، علاج، حفظ ما تقدم اور دفع نشانات پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے اور یہ ۳۴ صفحات پر منقسم ہے۔

نسخہ کی کتابت ۱۰ رمضان ۱۲۴۹ھ بروز پنجشنبہ ہوئی ہے۔ کاتب کا نام نوازش علی ہے۔

شفاء المرضی، مؤلفہ حکیم یونس ڈسلوا: بھوپال کے مشہور پرتگالی طبی خاندان ڈسلوا کے ممتاز طبیب حکیم یونس ڈسلوا کی ۱۶۰ فصلوں پر مشتمل یہ تصنیف نہ صرف طب کے منظوم سرمایہ میں ایک اضافے کے بطور بلکہ ایک غیر ملکی خانوادہ کی طب کے علاوہ علمی زبان و ادب میں مہارت کی بنا پر خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ خاندان جس طرح اپنی طبی خدمات کی وجہ سے شہرت یافتہ رہا اسی طرح اپنی شعری و ادبی خدمات کے لحاظ سے بھی اسے امتیاز حاصل ہے۔

حکیم یونس ڈسلوا کے جد امجد حکیم دون پیڈرو ڈسلوا تھوتھاپاسے ہندستان آئے اور شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی کے کامیاب علاج پر خردمند خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ پالکی جھالردار اور منصب عطا ہوا پھر سوائی جے سنگھ مہاراجہ جے پور بحصول اجازت محمد شاہ اپنے ہمراہ جے پور لے گئے بعد میں خاندان بھوپال منتقل ہوا ——— حکیم یونس ڈسلوا (ابن حکیم دون الیشس ڈسلوا ابن حکیم دون جوزی ڈسلوا ابن حکیم شوپیڈ ڈسلوا ابن حکیم دون پیڈرو ڈسلوا) کے دادا حکیم دون جوزی ڈسلوا معالجات پر مجربات فرنگی (مجربات مسیحا) جیسی مہتم بالشان کتاب کے مصنف ہیں۔

حکیم یونس کے بھائی حکیم جو ن ڈسلوا کو نواب سکندر بیگم والیہ ریاست بھوپال نے ارسطوئے زماں کا خطاب دیا تھا۔ حکیم جو ن ڈسلوا کے پوتے حکیم الیاس ڈسلوا عبرت (وفات ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۲ء بعمر تقریباً ۹۵ سال) اس خاندان کے آخری اہم فرد تھے۔ یہ بھی صاحب تصنیف ہیں۔ ان کا ایک رسالہ "آفتاب بحق" (تاریخی نام ۱۳۲۲ھ) اور دوسرا تعلیم المبتدی ہے جس سے ان کا آغاز ترتیب

۱۳۳۳ھ برآمد ہوتا ہے، اس کا دوسرا نام قلم مخزن حکمت ہے جس سے سن اختتام ترتیب ۱۳۳۵ھ نکلتا ہے۔ یہ دونوں رسالے اردو میں ہیں اور بخط مصنف یکم جولائی ۱۹۱۸ء کے لکھے ہوئے ہیں۔ راقم کے ذخیرہ میں ہیں۔

حکیم لوئس ڈسلوا کے بیٹے حکیم فرانسیس ڈسلوا فطرت اور حکیم تبیس ڈسلوا (وفات نومبر ۱۹۱۷ء) اپنے زمانہ کے اچھے شاعر و طبیب تھے۔ حکیم لوئیس ڈسلوا نے ۱۳۱۵ھ میں وفات پائی۔ حکیم فرانسیس ڈسلوا فطرت نے قطع تاریخ وفات کہا ہے:۔

بماہ محرم کہ چون بست و ہفت   سنہ سیزدہ پانزدہ باکریم
نماندہ بعالم فلاطون زماں   ارسطو منش لوئس صاحب حکیم

ادارہ تاریخ و تحقیق طب تغلق آباد نئی دہلی میں تالیف ڈسلوا اکتوبر ۱۸۸۰ء تالیف ڈسلوا اردو ترجمہ اکتوبر ۱۸۸۸ء خلاصہ علم طب لوئس ڈسلوا اکتوبر ۱۸۹۸ء تین کتابیں محفوظ ہیں۔

طب صدیقی، مؤلفہ ابوبکر صدیق ناگوری: ابوبکر صدیق حنفی ناگوری حاذق طبیب تھا۔ ادویہ ہندیہ کی شناخت و معرفت میں اسے خاص مہارت حاصل تھی۔ اہل ہند کے اصول پر معالجات میں یہ عہد جہانگیری کی منظوم کتاب ہے جسے ۱۰۲۴ھ میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں امراض اور ادویہ کے ہندی نام استعمال کیے گئے ہیں۔ اور حتی الامکان عربی و فارسی الفاظ سے گریز کیا ہے۔ اس نے خود بھی کہا ہے:۔

نوشتم دوا ہا بہندی زباں   کہ حاجت بفرہنگ نبود در آں

آیورویدک سے بھی اس میں استفادہ کیا گیا ہے۔ ۱۰۵ صفحات کا یہ مخطوطہ مکمل ہے لیکن ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے سال کتابت معلوم نہیں ہو سکا۔ کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اس کا ۱۰ رجب ۱۱۸۳ھ کا مکتوبہ نسخہ ہے۔ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ ذخیرہ حبیب گنج میں اس کے ۲۱ صفر ۱۲۳۸ھ کو لکھے ہوئے نسخہ کی اشیری سنگھ نے قصبہ بہٹ میں کتابت کی ہے۔ اس کے ساتھ خیال تجارت نواب خیر اندیش خاں کا نسخہ بھی مجلد ہے وہ بھی اشیری سنگھ ساکن لکھونی نے قصبہ بہٹ سے محرم ۱۲۲۷ھ کو نقل کیا ہے۔

طب فیروز شاہی، مؤلفہ شاہ قلی: ہندوستان کے ابتدائے مسلم عہد میں جو طبی کتابیں

لکھی گئی ہیں ان میں ایک مشہور کتاب طب فیروز شاہی ہے۔ اس کے نام سے اگرچہ ذہن فوراً فیروز شاہ تغلق
طرف منتقل ہوتا ہے لیکن یہ فیروز شاہ تغلق کے عہد ۷۹۰ – ۷۵۵ھ سے تقریباً سو سال قبل ۶۸۰ھ کی
تصنیف ہے، دہلی میں اس زمانے میں سلطان معز الدین کیقباد سریر آرائے سلطنت تھا۔ مگر اس کا خطاب
فیروز شاہ نہیں تھا۔ جلال الدین خلجی جس کا عہد حکومت ۶۸۷ سے ۶۹۵ھ تک ہے اس کا خطاب البتہ
فیروز شاہ ملتا ہے۔ ممکن ہے اس کا تعلق اسی عہد سے ہو۔ رہبر فاروقی نے جلال الدین خلجی کے عہد سے
سے منسوب کرتے ہوئے ۶۸۰ھ کو کتابت کی غلطی کا امکان ظاہر کیا ہے۔ لیکن ۶۸۰ھ کا اندراج صرف
ان کے پیش نظر حیدر آبادی کے نسخے میں نہیں ہے، جسے انھوں نے اس تصنیف کا واحد نسخہ خیال کیا ہے۔
راقم کے ذخیرہ میں موجودہ نسخہ میں بھی سالِ تصنیف ۶۸۰ھ ہی منقول ہے۔ یہ نسخہ ۲۶ر شوال ۱۰۶۵ھ جلوس
۴ کا لکھا ہوا ہے۔ اکبر نگر میں نور محمد صدیقی نے اس کی کتابت کی ہے۔

طب فیروز شاہی اگرچہ پرندوں کے معالجہ میں ہے لیکن علم الادویہ کے نقطہ نظر سے اس کا
مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ نہ صرف لسانی اعتبار سے بلکہ ادویہ کے ہم معنی ناموں کے لحاظ
سے بھی اس میں استعمال کیے گئے مقامی و دیسی نام خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ چنانچہ اس میں الائچی،
پھٹکری، سرپھوکہ، پیپل دراز، سہاگہ، گھونگچی، لونگ، بیربہوٹی، میتھی، کافور، بھیم سینی، برگ مہندی
جیسے نام ملتے ہیں۔ جو آج بھی اطبا کے درمیان اپنے فارسی ناموں کے ساتھ مستعمل ہیں۔

علاج الاطفال، مؤلفہ سید فضل علی المخاطب بہ شفائی خاں:۔ حکیم سید فضل علی
شفائی خاں حیدر آباد کے گرامی منزلت طبیب ہیں۔ ان کا اصلی وطن شاہ جہاں پور تھا۔ شاہ جہاں
پور ہی میں پیدا ہوئے۔ مولانا عبد العلی لکھنوی سے درسیات پڑھی پھر مدراس گئے اور حکیم احمد اللہ
مدراسی سے طبی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے حیدر آباد پہنچے۔ راجہ چندو لعل کا تقرب حاصل ہوا۔ پھر
نواب سکندر جاہ آصف جاہ ثالث (وفات ۱۷ر ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ) کے دربار سے وابستہ ہوئے
اور معتمد الملوک کے خطاب سے نوازے گئے۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہ زبردست
عالم، حاذق طبیب اور صاحب فہم و فراست تھے۔ ۱۲۵۷ھ وفات پائی۔ نواب ناصر الدولہ (وفات
۲۲ر رمضان ۱۲۷۳ھ) کے عہد حکومت اور راجہ چندو لعل کے دورِ وزارت میں انھوں نے یہ کتاب
تالیف کی ہے۔ جن احباب کی حسب فرمائش یہ عمل انجام پایا ہے ان میں حکیم میر محمد علی خاں بھی شامل

ہیں۔ حکیم احمد اللہ چلپی پر شفاء المجدد نام کی ایک کتاب کے مؤلف ہیں۔ علاج الاطفال کے خاص مآخذ اگرچہ حکیم احمد اللہ، حکیم علوی خان، حکیم اکبر ارزانی، بہاء الدولہ اور ابن سینا ہیں لیکن مؤلف نے اپنے ذاتی تجربات اور علاجی واقعات بھی بیان کیے ہیں۔ اس سے نہ صرف کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس سے ان کی حذاقت اور حسن معالجہ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ حیدر آباد میں ۶ ربیع الاول ۱۲۵۷ھ کو ۱۱۲ صفحات کے اس نسخہ کی کتابت ہوئی ہے۔ اور ۲۹ شعبان ۱۲۶۳ھ کو اس کی تصحیح و مقابلہ کا کام انجام پایا ہے۔ ذخیرہ سبحان اللہ، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی تحفۃ العاشقین (علاج الاطفال) کا ایک مخطوطہ محفوظ ہے۔

عین الحیوٰۃ (فوائد و منافع چوب چینی)

مؤلفہ محمد ہاشم بن محمد طاہر: چوب چینی ان دواؤں میں ہے جس سے اطبائے قدیم لاعلم تھے، یہ سولہویں صدی میں دریافت ہوئی۔ متعدد طبی محققین نے اس پر مستقل رسالے تصنیف کئے۔ ان میں عماد الدین محمود شیرازی، حکیم نور اللہ مرزا قاضی کے ساتھ ہی محمد ہاشم بن محمد طاہر، طبیب طہرانی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں اس پر مجتہدانہ طور پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ شاہ سلیمان صفوی کے نام معنون ہے۔ دیباچہ کے مطابق اس کی تالیف کے وقت ان کی طبی خدمات کو چالیس سال کا عرصہ گذر گیا تھا۔ مقدمہ کے بعد اس رسالہ کے پہلے مقالہ میں ۵ صفحہ پر لکھا ہے۔ چوب چینی کے مزاج و خاصیت اور مختلف امراض، استان دفصول میں اس کے منافع و نقصانات، ضرورت فصد و تنقیہ، قدر خوراک، مدت استعمال، دستور خوردن اور قانون استعمال تفصیل سے لکھا ہے۔ ۶۰ صفحات کا دوسرا مقالہ عشبہ مغربی کے بیان میں ہے جو اکثر منافع میں چوب چینی سے مشابہ ہے اور بعض امزجہ و امراض میں اس سے زیادہ نافع اور بہتر ہے اور قدیم طبی کتابوں میں اس کا بیان مذکور نہیں ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں دو ہی مقالوں کا ذکر ہے لیکن اس میں تیسرا مقالہ بھی شامل ہے جس کا باب اوّل خواص جدوار باب دوم فادزہر باب سوم مومیائی پر ہے۔ یہ دراصل ان کی دوسری تصنیف ہے جسے اس رسالہ میں تیسرے مقالے کے طور پر شامل کر دیا گیا ہے۔ فادزہر پر عماد الدین شیرازی اور مرزا قاضی کے بھی رسائل ہیں۔ محمد ہاشم کا یہ رسالہ المعروف تحفۂ سلیمانی شاہ سلیمان صفوی کے نام منسوب ہے اور اس کا سال تصنیف ۱۰۷۹ھ/۱۶۶۸ء ہے۔ محب گرامی حکیم ظلیل الدین بلخی ندوی پرنسپل گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ کے ذخیرہ میں عین الحیوٰۃ اور تحفۂ سلیمانی در خواص جدوار و فادزہر کا ۱۰۹۶ھ/۱۶۸۴ء کا مخطوطہ نسخہ موجود ہے

جو تصنیف کے صرف ستر سال بعد کا نقل شدہ ہے۔ راقم کے ذخیرہ میں موجود عین الحیاۃ کا نسخہ سید ہدایت اللہ نے حسب فرمائش حکیم مرزا محمد جان غرہ ماہ صفر ۱۳ جلوس شاہ عالم نقل کیا ہے۔

راقم کے ذخیرہ میں "رسالہ طریق خوردن چوب چینی" کے نام سے بھی ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ مظہر علی کا ۱۷ محرم ۱۲۴۶ھ کا مکتوب ہے۔

طبیہ کالج لائبریری علی گڑھ میں عین الحیاۃ کا ایک بہت عمدہ نسخہ موجود ہے۔ اسے مقبول نبی نے مہاراجہ اجیت سنگھ بہادر کے حسب الامر ۲۷ رجب سنہ ۳۵ جلوس شاہ عالم نقل کیا ہے۔ چونکہ اس کی کتابت ایک فرمانروا کے لیے ہوئی ہے اس لیے نفاست اور حسن تحریر میں یہ واقعی ایک حکمراں کے شایان شان ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری میں بھی ہے۔

فصول الاعراض، مؤلفہ سید ابوالقاسم میر قدرت اللہ قادری:۔ فصول الاعراض حکیم اکبر ارزانی حدود الامراض کی شرح ہے۔ اس میں نہ صرف تشریح و توضیح کا حق ادا کیا گیا ہے بلکہ مؤلف نے بعض مقامات میں جہاں اسباب علامات اور وجہ تسمیہ امراض سے اعراض اختیار کیا تھا شارح نے اس کو بھی برسبیل اجمال تحریر کیا ہے۔

حکیم قدرت اللہ قادری سید احمد بن محمد کے سلسلہ میں داخل تھے درسیات کی تکمیل مولوی خواجہ احمد جان سے کی اور طب میں حکیم شریف خاں دہلوی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ ریاست بلم گڑھ و فرید آباد میں انھوں نے طبی خدمات انجام دیں اور وہاں کے علم پرور فرمانروا مہاراجہ اجیت سنگھ (ابن چودھری کشن سنگھ بن راؤ بلرام) کی حسب فرمائش حدود الامراض کی شرح کی۔ تاریخ ۱۲۹۳ھ اس شعر سے برآمد ہوتی ہے۔ ؎

شد نام بدیں چو خامہ از وی گفت | ہاتف تاریخ از فصول الاعراض

مخطوطہ میں ترقیمہ موجود نہیں ہے۔

فوائد الانسان، مؤلفہ حکیم دوائی: حکیم دوائی گیلانی عہد اکبری کا مشہور طبیب ہے اکبر کے دربار میں رسائی اور بلند مرتبہ رکھتا تھا۔ طب اور شاعری میں امتیاز کے علاوہ صاحب درس و افادہ بھی تھا۔ اس کے تلامذہ میں حکیم علیم الدین چنیوٹی (وفات ۱۰۵۰ھ) کے علاوہ شاہجہاں بھی شامل ہے۔ شاہجہاں بھی اکثر کہا کرتا تھا کہ دوسرے اساتذہ کے مقابلہ میں حکیم دوائی کی تعلیم کے حقوق

مجھ پر زیادہ ہیں۔ فوائد الانسان اس کی تین سال کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اکبر سے جب اس کتاب کے نام کا ذکر آیا تو اس نے جواب میں کہا "شدہ احشن فوائد الانسان" اتفاق سے برجستگی سے ادا کیے ہوئے اس جملے سے اس کا سال تصنیف ۱۰۰۴ھ برآمد ہوتا ہے۔ طب کے منظوم ذخیرہ کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ یہ نسخہ صاف خوشخط اور مکمل ہے لیکن ترقیمہ ندارد ہے۔ فوائد الانسان کا ایک دوسرا عمدہ مخطوطہ بھی راقم کے ذخیرہ کی زینت ہے۔ اس کی کتابت ۱۱۵۰ھ اور ۱۱۵۷ھ کے درمیان کی ہے۔

قرابادین، مؤلفہ خواہرزادہ حکیم عماد الدین محمود شیرازی: حروف تہجی کے مطابق ادویہ مرکبہ پر ایک بہترین کتاب ہے جو طب کے قرابادینی ذخیرہ میں توجہ اور قدر کی مستحق ہے۔ یہ استحقاق اسے نہ صرف ایک عالی مرتبت خانوادہ طب کے ایک فرد سے انتساب کی وجہ سے بلکہ اس کے نسخوں کے حسن اور ترکیب کی خوبی سے بھی ہے۔ مؤلف حکیم عماد الدین شیرازی کا بھانجہ اور شاگرد ہے اس نے "من اطبار خال مرحوم عماد الدین محمود" کہہ کر ان کے متعدد نسخے نقل کیے ہیں۔ ان کے علاوہ اپنے جن دوسرے اساتذہ کے نسخے انھوں نے درج کیے ہیں ان میں مثلاً مولانا شرف الدین حکیم شیرازی، مولانا جلال الدین محمد گیلانی، حکیم کمال الدین حسین شیرازی ہیں جن کے آگے اس نے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے۔ مزید براں ایران کے اس عہد کے نامور اطبا رمثلاً حکیم صدر الدین محمد شیرازی، مولانا عبد الرزاق گیلانی، مولانا صدر شریف لاہیجانی، مرزا محمد حکیم شیرازی، حکیم تاج الدین شیرازی، حکیم غیاث الدین علی، حکیم رکن الدین کے نسخے اس میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ یہ نسخے زیادہ تر ایران کے شاہی خاندان کے افراد یا امرا رمثلاً شاہ طہماسپ، شاہ اسماعیل، نواب شاہ رخ مرزا، نواب سلطان حسین مرزا، نواب سلطان سلیمان مرزا، نواب سلطان ابراہیم مرزا، نواب خان احمد وغیرہ کے لیے تجویز کیے گئے ہیں۔

تین سو صفحہ کی اس قرابادین کی کتابت ۱۷ رجمادی الثانی ۱۰۷۵ھ میں بلدۂ اردبیل میں کی گئی ہے۔ اس پر ایک مہر غلام مسیح کی ۱۱۲۹ھ کی ثبت ہے۔

قرابادین جلالی، مؤلفہ مولانا حاجی جلال بن امین طبیب مرشدی گازرونی: یہ قرابادین اختیارات بدیعی کے حصہ مرکبات کی تہذیب یافتہ شکل ہے اس کے دیباچہ میں مؤلف نے لکھا ہے کہ اختیارات بدیعی کے مقالہ دوم مرکبات میں جو فروگذاشتیں ہوتی ہیں۔ انھیں اس قرابادین میں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اختیارات بدیعی میں بہت سے مستعمل مرکبات کو چھوڑ دیا گیا ہے اور

بعض کو اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تکمیل بھی دوسرے اساتذہ کی کتب اور ذاتی تجربہ کے ذریعہ کی گئی ہے اس طرح قرابادین پر ایک جامع کتاب لکھنے کا جذبہ جو مؤلف کے دل میں تھا وہ کامیاب شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ قرابادین ذخیرہ خوارزم شاہی اس کا خاص ماخذ ہے۔

مخطوطہ کی کتابت امام بخش ساکن جلالی ضلع علی گڑھ نے ہاتھرس میں ۱۴ محرم ۱۲۵۰ھ کو کی ہے۔ نسخہ کے پہلے صفحہ میں حکیم محمد عبدالحمید کے ۱۷ ستمبر ۱۸۹۸ء مطابق ۳۰ ربیع الثانی ۱۳۱۶ھ بروز سنیچر کے دستخط ہیں۔ یہ حکیم عبدالحمید شفاء الملک لکھنوی ہیں جن کی ملکیت میں یہ نسخہ رہا ہے۔

حیدرآباد میں قرابادین جلالی کا ایک زیادہ قدیم مخطوطہ موجود ہے۔ وہ دولت آباد میں ۲۶ شعبان ۱۰۹۰ھ میں لکھا گیا ہے۔ کاتب کا نام حافظ قلندر ہے۔ اس مخطوطہ پر صمصام الملک کے علاوہ شفا طلب خاں کی ۱۱۹۵ھ کی مہر ہے۔

راقم کے ذخیرہ میں حاجی جلال کی اس قرابادین کے انتخاب کا بھی ایک نامکمل نسخہ ہے جو چند صفحات پر مشتمل ہے۔ انتخاب کرنے والے کے نام کا اس سے پتہ نہیں چلتا۔ قرابادین جلالی کے نام سے حکیم جلال الدین امروہوی کی بھی ایک کتاب ہے۔

قرابادین فرنگی، مؤلفہ حکیم جرمی ڈسلوا: صاحب مجربات فرنگی حکیم ڈسلوا کی یہ قرابادین ایک فرنگی کتاب کا ترجمہ ہے جسے انھوں نے فارسی جامہ پہنایا ہے۔ انگریزی کی اصل کتاب کا نام یا مصنف کا اگرچہ پتہ نہیں چلتا لیکن اس کا مطالعہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں جو مرکبات تحریر ہیں وہ عام قرابادینی مرکبات سے بالکل مختلف ہیں۔ ترتیب و ترکیب دونوں لحاظ سے اس کے نسخوں میں نہ صرف جدت اور ندرت ہے بلکہ افادیت و اثر کے اعتبار سے بھی یہ اہمیت کے حامل ہیں۔

یہ نسخہ خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے اور اس کی کتابت بروز شنبہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۸ء کو بھوپال کے قصبہ آشٹہ میں ہوئی ہے۔ اس مجموعہ میں ان کا ایک رسالہ جراحی مکتوبہ ۲۷ جولیو ۱۸۲۰ در بحر تپوسا در رسالہ چیچک (اردو) مکتوبہ ۳۱ جولیو ۱۸۲۹ اور در بحر تپور شامل ہیں۔

راقم کے ذخیرہ میں مجربات فرنگی کا بھی ایک نسخہ بخط مصنف محفوظ ہے، جو ان کی عالمانہ حیثیت اور طبی فضیلت کے ساتھ ہی ان کے حسن تحریر کا آئینہ ہے خط اس قدر پختہ پاکیزہ اور دلکش ہے کہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک غیر ملکی خاندان نے خطاطی میں بھی اس قدر ملکہ حاصل کر لیا تھا کہ اچھے

اسے چھاپا۔ زبان خط طاس کے آگے شرائیں گے۔ ۲۱ سطروں پر مشتمل ۱۳۴۰ صفحات کی اس کتاب میں جو انداز خط پہلے صفحہ کا ہے اس میں آخر تک سر مو فرق نہیں کیا ہے۔ اور پوری آب و تاب کے ساتھ قلم کی وہی یکسانیت برقرار ہے۔ شعر و ادب اور طب و سیاست کے علاوہ خط کی پاکیزگی بھی اس خاندان کے امتیازات میں ہے۔ چنانچہ اس خانوادے کے ایک اور رکن حکیم اکرم حسین ڈسلوا کا مکتوبہ طب اکبر جو تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کے قلم کا حسن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور طرز خط کی وہی یکسانیت آخر تک قائم ہے۔ طب اکبر کا یہ نسخہ انھوں نے مہر تیور رئیس راجہ بلونت سنگھ کے عہد میں ۷ ستمبر ۱۸۴۴ء حکیم جبر کا ڈسلوا کیلئے نقل کیا ہے۔

قرابادین معصومی مؤلفہ معصوم بن کریم الدین شیرازی: حکیم محمد معصوم شیراز میں پیدا ہوا۔ شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا۔ ۱۰۵۰ھ/۱۶۴۰ء میں اس نے قرابادین معصومی تصنیف کی۔ یہ طب کے قرابادینی ذخیرہ کی خاص کتابوں میں ہے۔ مصنف نے جیسا کہ وہ دیباچہ میں رقم طراز ہے معمول مرکبات کے علاوہ جو کتب متداولہ میں مذکور ہیں اور جو تجربات اطباء میں مفید ثابت ہو چکے ہیں نہ صرف ان کا انتخاب اس قرابادین میں پیش کیا ہے بلکہ وہ تراکیب جن کا متقدمین کے ہاں ذکر نہیں ہے اور جنھیں متاخرین نے وضع کیا ہے اور وہ اہل ہند کے تجربہ و امتحان میں پوری اتری ہیں انھیں بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

اس کی ترتیب قرابادین کے روایتی طرز حروف تہجی کے لحاظ سے نہیں ہے چنانچہ مثلاً مقالہ اوّل کا پہلا باب تریاقات، دوسرا مفرحات، تیسرا معاجین، چوتھا جوارشات، پانچواں اطریفلات، چھٹا ایارجات کے بیان میں ہے۔

یہ تصنیف مقدمہ اور خاتمہ کے علاوہ سات مقالوں پر منقسم ہے۔ مقدمہ کے بارہ فائدوں میں مثلاً فائدہ اوّل کیفیت ترکیب ادویہ، دوم عمل مجربات، سوم سحق ادویہ تکلیس وغیرہ۔ مقالہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ مقالہ دوم شربت، لعوق، مربا، رُب، سکنجبین، حلوی، سفوف، سنون۔ مقالہ سوم حب، بندق، قرص، ذرور، سنون، لخلخہ، بخور، شموم۔ مقالہ چہارم نطولات، جوشاندہ، خیساندہ، نطول، غرغرہ، قطور، سعوط، حقنہ۔ مقالہ پنجم ضماد، طلا، خضاب، دہن، مرہم، فرزجہ۔ مقالہ ششم مقیات، انواع حقنہ، شیاف وغیرہ۔ مقالہ ہفتم ادویہ عین۔ خاتمہ میں فادزہر پر گفتگو کی گئی ہے۔

ام عباس کی ۱۲۲۹ھ کی مہر ثبت ہے۔ یہ نسخہ جن ہاتھوں میں رہا ہے ان میں سے کسی نے شروع اور آخر
ہ صفحات پر بعض نسخے بھی تحریر کئے ہیں۔ ایک نسخہ جو خضاب کا ہے جمیل خواص بہادر شاہ کیلئے لکھا گیا
ہے۔ مولانا آزاد لائبریری میں اس کا ۱۲۵۷ھ کا مکتوبہ نسخہ ہے۔

معصوم بن کریم الدین کے ہم نام میر محمد معصوم سندھی (وفات ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء در سکھر) کی
مفردات معصومیہ کے نام سے ایک کتاب ہے۔

مفردات، مؤلفہ حکیم سید نوازش علی: مؤلف نے یہ کتاب اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لئے
مرتب کی ہے۔ اس میں ہندی اور یونانی مفردات ادویہ بیان کی گئی ہے۔ ہندوستان میں مفردات
لکھی جانے والی کتابوں کے سلسلہ کی یہ ایک کڑی ہے۔ مؤلف کی شخصیت کے بارہ میں کتاب کے
اوراق سے روشنی نہیں پڑتی ہے۔

ترقیمہ کے مطابق ۳۰ رجمادی الثانی ۱۲۴۱ھ کو اس کی کتابت کی گئی ہے۔ مؤلف کی دوسری
کتاب انیس العشاق ہے۔

مفردات ہندی، مؤلفہ حکیم جرجی ڈسوا: اگرچہ بعض دوسری کتابوں میں بھی ادویہ ہندیہ کو
موضوع بنایا گیا ہے اور ہندوستانی دواؤں کے خواص تفصیل سے لکھے گئے ہیں لیکن ان کے علاوہ
مشہور دواؤں کا بیان بھی ان میں شامل ہے۔ حکیم جرجی ڈسوا نے یہ اہتمام کیا ہے کہ اس کو صرف
ہندی عقاقیر و نباتات کے خواص تک محدود رکھا ہے۔ چنانچہ مقامی دواؤں کے مطالعہ میں یہ ایک
نہایت اہم اور کارآمد کتاب ہے جس سے ہندوستانی طبیبوں کے یہاں پیدا ہونے والی جڑی بوٹیوں سے
دلچسپی لی اور ان کے خواص اور یونانی نقطۂ نظر سے ان کے مزاج کے تعین کے سلسلہ میں کی جانے والی
کوششوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک طویل فہرست ایسی ادویہ کی پیش کی جا سکتی ہے جنہیں اس سے قبل
یونانی طب کے مصنفین کے ہاں نہیں بیان کیا گیا ہے۔ ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔ نباتی
ادویہ کے ساتھ حیوانی اور معدنی دوائیں بھی درج کی گئی ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ جن ادویہ
کے مترادف عربی یا فارسی نام ملتے ہیں انہیں بھی مقامی ہندی ناموں کے عنوان کے ساتھ بیان کیا گیا
ہے۔ مخطوطہ کی کتابت ۵ رشعبان ۱۲۲۷ھ مطابق ۲ جلوس اکبر شاہ ثانی کو ہوئی ہے۔

اس کا ایک دوسرا نسخہ بھی ہاتھ کے ذخیرہ کی زینت ہے جس کو ڈسوا نے اپنے صاحبزادے

کے مطالعہ کیلئے ۱۸ مارچ ۱۹۴۹ء کو نقل کیا ہے۔ یہ پہلے نسخہ کے مقابلہ میں زیادہ مکمل ہے۔

مفردات ہندی ، مؤلفہ شرف الدین: ادویہ مفردہ پر ہندوستان میں جو چند بہترین کتابی
لکھی گئی ہیں ان میں سے اس کتاب کا شمار کیا جانا چاہیے۔ ۴۰۰ صفحات کی اس ضخیم کتاب میں خواص ادویہ کے
بیان میں کافی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ ان کے مآخذ میں تحفۃ المومنین، اختیارات بدیعی، ریاض الادویہ
تالیف شریفی، خلاصۃ المفردات، تالیف میر نجم الدین علی وغیرہ ہیں۔ لیکن انھوں نے تحفۃ المومنین پر تنقید کرتے
ہوئے لکھا ہے کہ یہ اگرچہ اس فن کی جامع کتاب ہے لیکن صاحب تحفہ نے اکثر دواؤں کے خواص جہاں سے بھی
انہیں دستیاب ہوئے تحقیق یا عدم تحقیق کی پرواہ کیے بغیر اس میں جمع کر دیئے ہیں۔ اسی لیے ان کے اقوال اکثر لوگوں
کے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہیں۔ ہاں اگر دوسری معتبر کتابوں کے ذریعہ اس کی تائید ہو تو وہ درجہ پذیرائی رکھتے
ہیں۔ انھوں نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ مفردات کے بعض مصنفین کی طرح اپنی کتاب میں مرکبات کا بیان شامل
کر کے اسے زیادہ طول نہیں ہونے دیا ہے۔ مرکبات کی کتابوں میں انھوں نے قرابادین شفائی کی خاص طور
تعریف کی ہے۔

حکیم شرف الدین سہاور ضلع ایٹہ کے باشندہ تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی شمس الدین تھا۔
انھوں نے اپنے دو بیٹوں علیم الدین اور روح الدین کی تعلیم کے لیے ۱۲۲۱ھ میں یہ کتاب تالیف کی ہے اور
میں انہیں دواؤں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو عام طور پر استعمال میں آتی ہیں۔ اور جن کی دستیابی آسان
ہوتی ہے۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے "چونکہ اس میں مفردات کے معنوی نام تحریر کیے
ہیں اور ادویہ ہندیہ کے خواص طور پر درج کیے گئے ہیں اور مؤلف اسی سرزمین کا باشندہ ہے۔ لہٰذا
مفردات ہندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔

حکیم محمد شرف الدین مشہور طبیب حکیم محمد علی خاں سکندر پوری (وفات ۱۲۲۶ھ) کے شاگرد
حکیم محمد علی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں ان کی دو کتابوں بدایع النوادر اور بضاعۃ الاطبا کا حکیم شرف
نے حوالہ دیا ہے۔ ان کے علاوہ بدیع التجارب اور بعض دوسری کتابیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ ۱۷ ربیع
۱۲۲۴ھ کو وفات پائی۔ "الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند" میں ایک جگہ ان کا سال
۱۲۲۴ھ اور دوسری جگہ ۱۲۲۵ھ لکھا ہوا ہے۔ نزہۃ الخواطر نے صفحہ ۴۰۲ پر ان کا ذکر کیا ہے۔
مخطوطہ کی کتابت ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۷۴ھ کو ہوئی ہے اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہ انیسویں صد

کے نصف آخر کے مشہور معالج اور مصنف افسر الاطبا حکیم اصغر حسین فرخ آبادی (وفات ۱۳۱۴ھ) کے ہاتھوں میں رہ چکا ہے۔ سالار جنگ اور اسٹیٹ لائبریری حیدر آباد، نیشنل بائلیکل گارڈن لائبریری لکھنؤ اور رضا لائبریری رام پور میں اس کے مخطوطات محفوظ ہیں۔

معالجات النبوی معروف بہ مجربات امامی، مؤلفہ حکیم غلام امام اکبر آبادی: طب نبوی پر مختلف مصنفین نے مختلف انداز سے کام کیا ہے۔ اور اس موضوع پر سیوطی، حنفینی، ذہبی جیسے صاحبان علم کی کتابیں ہیں۔ غلام امام اکبر آبادی نے اس کتاب میں نہ صرف ان ادویہ کے خواص تحریر کیے ہیں جو احادیث پر متضمن ہیں بلکہ خواص ادویہ یونانی کے بجائے خواص ادویۂ ہندی بھی بیان کیے ہیں۔ ادویہ کی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے۔ حکیم سید غلام امام کی دوسری کتابوں میں مصباح المجربات موسوم بہ مرات الحکمت، خلاصۃ الشروح مقاصد المرض تالیف ۱۱۸۲ھ علاج الغربا وغیرہ ہیں۔ غلام امام کا سال وفات ۱۲۱۴ھ ہے۔

معالجات النبوی کے کافی مخطوطات ملتے ہیں۔ رضا لائبریری رام پور (۱۰ نسخے)، ذخیرہ سبحان اللہ خاں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، سالار جنگ حیدرآباد، نیشنل بائلیکل گارڈن لائبریری لکھنؤ کے علاوہ بھی حکیم صیانت اللہ امروہہ کے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔

معدن تجربات، مولفہ حکیم محمد مہدی بن محمد جعفر اکبر آبادی: ۱۱۷۰ھ کی ادویہ مرکبہ اور ہندوستانی ادویہ مفردہ کے ذخیرہ کی قابل قدر کتاب ہے۔ مرکبات کے تفصیل بیان کے علاوہ اختیارات بدیعی، تحفۃ المومنین اور الفاظ الادویہ کی ان غلطیوں کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے جو ان کے مصنفین نے مفردات کے عربی و فارسی ناموں کے ہندی مترادفات کے سلسلہ میں کی ہیں۔ ادویہ کی شناخت اور ہم معنی ناموں کے مطالعہ میں مولف کی کوشش نظر انداز نہیں کی جا سکیں گی۔ مندرجہ بالا پیش رو مؤلفین کی عدم تحقیق پر جس تنقیدی انداز میں لکھا گیا ہے اس سے صاحب کتاب کی تحقیق کاوشوں کا اظہار ہوتا ہے، یہ مخطوطہ کتاب کی فصل سوم پر مشتمل ہے جس کا تعلق مفرد ادویہ سے ہے۔ شروع کا حصہ جو مرکبات سے متعلق ہے وہ اس مخطوطہ میں نہیں ہے۔ اس طرح یہ نامکمل مخطوطہ ادویہ مفردہ کے لحاظ سے ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ "معدن تجربات" تاریخی نام ہے۔

ترتیب کے مطابق "کتاب طب فرہنگ ادویہ مفردات من کتاب معدن تجربات" کی قاضی اسماعیل علی بن فتح علی ساکن جیکلا نانہ نے ادویہ ہندی و ولایتی کے مطالعہ اور دریافت احوال کی خاطر ۱۲ ذی الحجہ

۱۲۱۲ھ میں کتابت کی ہے۔

ذخیرہ سبحان اللہ علیگڑھ میں اسکا جو نسخہ محفوظ ہے وہ بھی فصل سوم سے متعلق ہے "فصل سوم از قرابادین خان صاحب وحید حکیم پادشاہ خان در بیان دمزاج و مصلح و شربت ادویہ مفردہ بترتیب حروف تہجی" مفید بحرف اول و ثانی۔ پہلی دوا اطریلال ہے۔ گلزار خان نے ۱۰ر صفر ۱۲۵۲ھ ۲ر جون ۱۸۳۶ء کو سکرول بنارس میں اسے نقل کیا ہے۔ اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد، خدابخش پٹنہ، اور حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی جلالی ضلع علیگڑھ کے پاس اسکا مکمل نسخہ موجود ہے۔ مفردات ہندیہ کے نام سے مولانا آزاد میں انکی جو کتاب ہے، وہ ممکن ہے اسی کا ایک حصہ ہو۔ حکیم مہدی کی ایک کتاب مخزن اسرار الاطبا راسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں موجود ہے۔

نسخہ جات، مؤلفہ حکیم فرید الدین عرف حکیم کلو کے معمولات اور معالجاتی تجربات پر مشتمل یہ ضخیم مجموعہ ان کے پوتے نے مرتب کیا ہے، حکیم کلو اپنے زمانہ کے مشہور طبیب اور حاذق معالج تھے۔ ان کا ایک مطبوعہ رسالہ بھی ہے۔ دوسرے مصنفین کے ہاں بھی ان کے حوالے مجرب نسخے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ترقیمہ ندارد ہے۔

نورالفواد، مؤلفہ شیخ طاہر: اس کتاب میں مختلف امراض کے نہایت مختصر اور مجرب نسخے تحریر ہیں۔ حکماء ہند کی تدابیر تراکیب اور معمولات کو خاص طور پر پیش کیا گیا ہے۔ معالجہ امراض کے لحاظ سے ۱۰۶۶ھ کی یہ تالیف مغلیہ عہد کی عمدہ کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ ۱۶۰ صفحات کی اس کتاب میں ۹۴ فصلیں ہیں۔ ہر فصل کا تعلق مختلف نظام کے امراض سے ہے۔ نسخوں کا اختصار کتاب کی خاص خصوصیت ہے۔ یہ نسخے محض کتابی نہیں ہیں بلکہ کامیاب مطب اور عملی تجربہ کا آئینہ دار ہیں۔

کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔

اس کتاب کا ایک نسخہ قرابادین شیخ طاہر کے نام سے مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں ہے، یہ نسخہ بہت سرسری انداز میں لکھا گیا۔

ہدایۂ محمدیہ، مؤلفہ ابن عبدالقادر: طب نبوی کو موضوع بنا کر عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض میں ادویہ، بعض میں امراض اور بعض میں احادیث کا عنوان قائم کیا گیا ہے۔ ہدایۂ محمدیہ میں امراض مثلاً صداع سرسام، طاعون، نسیان، صرع، جنون، عشق، وجع الاسنان، رعاف، بخر، ذات الجنب، وجع القلب، غشی، امراض معدہ، یرقان، جرب، بخور، جذام، برص، بہق، قولنج، کی فصلوں کے علاوہ حجام اور حجامت کے عنوانات کے تحت ارشادات رسولؐ کے بعد طبی اعتبار سے ان کی توضیح کی گئی ہے۔

۶۴ صفحہ کے اس مخطوطے کے شروع کا ایک ورق اور آخر کے چند صفحات غائب ہیں۔ کتاب سے مؤلف کے بارے میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس کے والد کا نام عبدالقادر ہے۔

ذخیرۂ نواب رحمت اللہ خاں شیروانی

عربی و فارسی طبّی نوادر

بی

کتاب الکافی فی الکحل، مردن بن الحکیم موفق الدولہ بن ابی الحسن الحلبی

طب یونانی کے ہنصنت وارتقاء کے زمانہ میں جو موضوعات اطبا کی خاص توجہ کا مرکز رہے،
ان میں ایک علم العین بھی ہے۔ امراض چشم کو مستقل موضوع بنا کر جہاں بیش قدر تحقیقی کام کیا گیا وہاں اس پر
کثرت سے کتابیں تصنیف کی گئیں۔ ان کثیر التعداد تصانیف میں کتاب الکافی فی الکحل ایک نہایت اہم مرتبہ
تصنیف ہے۔

مصنف نے اس کی تیاری میں جن ماخذ کو پیش نظر رکھا ہے ان میں عشر مقالات فی العین حنین بن
…ق، کتاب تعریف امراض العین جیش بن الاعصم، تذکرہ علی بن عیسیٰ الکحال، کتاب العین رازی، مقالہ ابن ذریں مصری
…العین، کتاب موسیٰ بن ابی ماہر الکحال، مقالہ ابن سیار فی العین، کتاب عبدان الکحال، تذکرہ منصور، مقالہ ابو المطرق
…والوزار تین المغربی، نزہتہ الافکار فی علاج الابصار، کتاب اصلاح الباصر والبصیرہ، ارجوزہ اللمعی فی العین و
امراضہا جیسی بلند پایہ کتابیں ہیں، جن سے مصنف کے تبحر اور اعلیٰ علمی مذاق کا اظہار ہوتا ہے۔ کتاب دو جلدوں
پر مشتمل ہے۔ جلد اول میں حد ذیل چھ فصلیں ہیں۔

۱۔ حد العین و مزاجہا والوانہا و اسباب ذالک ۲۔ تشریح طبقات العین
۳۔ رطوبات العین ۴۔ زوج باصرہ اعصاب و کیفیت ابصار ۵۔ عصب محرک
…ین ۶۔ تشریح عضل العین و عضل الجفن

جلد ثانی میں بھی چھ فصلیں ہیں۔ ان میں حفظ صحت و امراض عین ادویہ مفردہ و مرکبہ پر سیر حاصل
…پر لکھا گیا ہے۔

۳۴۸ صفحات کی اس کتاب میں دماغ اور آنکھ کی تصاویر کے ساتھ آلات عین کی تصاویر بھی پیش کی گئی
…ہیں۔ یہ تصویریں رنگین اور دیدہ زیب ہیں۔ ان کی تیاری میں جس تزئین و اہتمام سے کام لیا گیا ہے اس سے فن
…مصوری کی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ آلات کی تعداد ۳۶ ہے۔

یہ مخطوطہ اس لحاظ سے بھی بیش قیمت ہے کہ یہ شاہی کتب خانوں کی زینت رہا ہے۔ اس پر شاہجہاں
…اور عالمگیر کی مہریں ثبت ہیں۔ دوسری مہروں کے علاوہ جن لوگوں کے دستخط ہیں ان میں عبداللہ بن عین الملک بن
…سید علی شیرازی بھی ہیں۔ ایک دستخط کے نیچے ۲۴ رجب ۱۱۱۵ھ/۱۷۰۳ء کی تاریخ درج ہے۔

رضا لائبریری رامپور کے نسخہ میں اس کے مصنف کا نام "خلیفہ بن ابی المحاسن الاسرائی الحلبی"
…وفات ۶۶۴ھ/۱۲۶۵ء سے قبل تحریر ہے۔

فارسی

حاوی الدستور، حکیم احمد بخش

پہلا مقالہ امور طبیعیہ، ستہ ضروریہ، احوال بول و براز کے بیان میں ہے۔ دوسرا مقالہ ادویہ مفردہ و مرکبہ
ماہیت و علامات امراض اور نسخے امراض مختلفہ پر مشتمل ہے۔ مرکبات کا بیان خاص طور پر اہم ہے اور کافی
تعداد میں امراض کے مرکب نسخے درج ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ مرکب ادویہ کے بیان سے پہلے
ہر مرض کی مفرد دوائیں تحریر کی ہیں۔ یہ بڑا اچھا طریقہ ہے، اس سے ترتیب نسخہ میں مدد ملتی ہے۔
اس ضخیم کتاب کے علاوہ اس مجلد میں دو رسالے اور شامل ہیں۔ ایک رسالہ شفاء الصبیان
(نامکمل)، دوسرے خلاصۃ الطب امام بخش جو صرف چودھویں فصل پر مشتمل ہے۔

طب عملیات

ظہور اسلام سے پہلے بھی جادو، منتر اور دعا تعویذ کے ذریعہ ازالہ امراض کی کوشش کی جاتی تھی۔ حصول
صحت کے لئے مذہب کا سہارا اختیار کرنے کی تاریخ کا تعلق بعید ترین انسانی تہذیب کے زمانہ سے ہے
اسلام میں دوسرے مذہبی عقائد و اعمال کی طرح طبی عملیات کی شکل میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ اور مخصوص
دینی عقیدوں کی روشنی میں علاج و مداوے کی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ قرآنی آیات، دعا، تعویذ، اسم
بزرگوں سے منقول بعض اعمال سے اس سلسلہ میں مدد لی گئی۔
سینہ بہ سینہ منتقلی کے علاوہ اس موضوع پر بہت کتابیں لکھی گئی ہیں۔ زیر نظر کتاب روحانی طبی ذخیرہ
کی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اسمیں جہاں مختلف بیماریوں کے نسخے تحریر ہیں وہاں کافی تعداد میں متعلقہ دعائیں
اور تعویذ بھی درج ہیں۔

مطلع النیرین، بیراگی خاں

کتاب کا تعلق طبی کیمیا و اکسیر کے اعمال سے ہے۔ مختلف دھاتوں اور اُپ دھاتوں کے
تصعید، تحلیل، تکلیس، تصفیہ وغیرہ کے طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ ۱۹ ابواب پر مشتمل یہ مختصر رسالہ اس موضوع
کی اچھی کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ وزیر الدین حسن بن غلام جیلانی نے مولانا حافظ سید محمد صاحب
کے لئے ۱۲ جمادی الاول ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء کو مین پوری میں اسے نقل کیا ہے، محمد علی حیدر حسین کے ۱۲۵۱ھ
/۱۸۳۵ء کے دستخط اور مہر ثبت ہیں۔ صفحات کی تعداد ۲۳ ہے۔
اس مجموعہ میں اسی صنعت میں دوسرا رسالہ برہان اور تیسرا رسالہ فن کیمیا پر جو زکریا رازی کی
کتاب کا ترجمہ ہے شامل ہیں۔
مطلع النیرین کا ایک نسخہ ذخیرہ سبحان اللہ خاں مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

حکیم محمد زماں حسینی (کلکتہ)

محمد بن زکریا رازی کی

کتاب الفاخر

۳۹-۱۹۴۰ء کی بات ہے میں شرح الاسباب والعلامات کا طالب علم تھا کہ پہلی مرتبہ دماغ ریحی کی علامات کے ذیل میں دوران درس قرأت عبارت کے وقت ــــ "قال الرازی فی الفاخر .." کی عبارت سامنے آئی اور اس کے بعد بار بار متعدد مواضع میں الرازی فی الفاخر یا کناش المشہور الفاخر کے الفاظ دوران اسباق سامنے آتے رہے اور حافظے میں یہ حقیقت محفوظ ہو گئی کہ شہرۂ زمانہ یگانہ محمد بن زکریا رازی (المتوفی ۳۲۰ھ) کی مصنفات طب میں ایک اہم کتاب الفاخر ہے۔ مرور ایام کے ساتھ ساتھ طبی تدریس اور اشتغال مطالعہ نے اس حقیقت کو اور استحکام عطا کیا کہ "الفاخر" رازی کی ایک اہم طبی اور فنی کتاب ہے مگر چونکہ الفاخر خطی اور کمیاب ہے اس لئے اس کی زیارت کی نوبت نہیں آئی تھی۔

میرے ایک برگزیدہ اور بزرگ کرم فرما ملک کے نامور محقق اور فرد یگانہ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم (متوفی ۱۹۷۶ء، صدر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی) نے اپنی وفات سے تقریباً سال بھر پہلے از راہ دلنوازی حسب عادت میرے مطب کاشانۂ طب [illegible] اسٹریٹ کلکتہ کو اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی۔ یوں طرفین کی آمد و رفت از راہ محبت و مودت لگی رہتی تھی اور علمی مذاکروں سے قلب و دماغ کو سرور پایاں حاصل ہوتا رہتا تھا، مگر آپ کی وفات سے قبل ہی ایک جدید مبارک [illegible] پڑا ــــ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری میز پر ایک ضخیم مجلد فل اسکیپ سائز سے لکھا ہوا رکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ کتاب الفاخر خطی نسخہ ہے۔ سنتے ہی میرے منہ سے برجستہ نکلا کہ محمد بن زکریا رازی کی؟ کیونکہ ایک دوسرے مصنف محمد بن عبد المجید اندلسی کی بھی اس نام کی ایک کتاب ہے، اس لئے میں نے یہ استفسار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کا [illegible] کی شکل میں جواب میرے ذہن میں گونجتا رہتا تھا۔ اس بنا پر میرا ذہن

رازی ہی کی کتاب کی طرف فوراً منتقل ہوگیا۔

میرے اس استفسار پر ڈاکٹر صاحب تعجب و خوشی کے انداز میں کہنے لگے کہ تم تو باخبر نکلے! مجھ کو بہت خوشی ہوئی، تم اسے دیکھ لو، دو چار دن کے بعد تم سے مشورہ کروں گا۔ حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی متولی ہمدرد دواخانہ نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں اس کو ایڈٹ کردوں، تاکہ وہ اس کی طباعت و اشاعت کرا سکیں۔ میرے لئے یہی تقریب ہے "کتاب الفاخر"[1] کی زیارت کی۔

اس کی تحقیق کے لئے ڈاکٹر صاحب اپنی ضعیفی کی معذوری کی بنا پر مجھے اس کام میں اپنا معاون بنانا چاہتے تھے جس کے لئے میں تیار تھا۔ لیکن ناسازیٔ حالات و معذرات کی بنا پر میں نہیں لگ سکا، اور دوسری متبادل شکل پر ڈاکٹر صاحب قادر نہ ہو سکے، تا آنکہ ان کی رحلت کا حادثۂ فاجعہ پیش آگیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

مجھے جب خدا بخش لائبریری کی جانب سے اس علمی سیمینار میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، تو میں نے کتاب الفاخر کے تعارف اور اس کی قدر و قیمت پر چند سطریں حوالۂ قلم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ مگر آغاز کار سے پہلے یہ لازم تھا کہ الفاخر کا خطی نسخہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ کتاب کا افتتاحیہ اور اختتامیہ اضافی الکتاب کا صحیح جائزہ لینا ممکن ہو سکے۔ میں نے ڈاکٹر صدیقی مرحوم کے فرزند اکبر، ماہر امراض قلب، ڈاکٹر خالد صدیقی نیویٹ مالیہ کی طرف رجوع کیا تو معلوم ہوا کہ قبلہ حکیم عبد الحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ دہلی کی تحویل میں "الفاخر" واپس جا چکی ہے۔

میں نے قبلہ حکیم عبد الحمید صاحب زید مجدہ کو دہلی خط لکھ کر "الفاخر" کے بارے میں معلومات چاہیں، حکیم صاحب نے جواب دیا:

> "کتاب الفاخر ابھی ایڈٹ بھی نہیں ہو سکی ہے، اس کے تمام مسودات ادھ صاحب کے پاس ہیں، ان سے چند دن بعد معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی اور آپ کو مناسب جواب دیا جائے گا۔"

حکیم صاحب کے اس گرامی نامے کے بعد میں یکسو ہو گیا اور رجال طب کی کتابوں کی ورق گردانی میں لگ گیا

---

[1] کتاب الفاخر، ایک اور مصنف، عمر بن عبد المجید اندلسی، المتوفی ۵۰۷ھ کی بھی ہے جس کا پورا نام الفاخر فی شرح الجمل عبد القاہر ہے (ابجد العلوم، کشف الظنون ...)

اس علمی جد وجہد اور کد وکاوش کے نتیجے میں جو معلومات حاصل ہوئیں وہ پیش کر رہا ہوں۔

مجھے الفاخر کے سلسلہ میں بزرگوں کی تین طرح کی علمی روشیں دکھائی پڑی ہیں جنھیں میں بترتیب بیان کرتا ہوں:

پہلی روش :- (الف) مقدم ترین مآخذ "کتاب الفہرست لابن ندیم" (المتوفی ۳۸۵ھ) ہے، اس میں مصنف نے صفحہ ۴۱۶ تا صفحہ ۴۱۹ زکریا رازی کی ۱۲۰ مصنفات کی طویل فہرست دی ہے مگر ان کتابوں میں "الفاخر" کا ذکر نہیں ہے۔

(ب) قاضی صاعد اندلسی (المتوفی ۴۶۲ھ) کی کتاب "طبقات الامم" میں رازی کا دو جگہ تذکرہ ہے۔ انھوں نے صفحہ ۹۱ پر یہ صراحت کی ہے کہ سو سے اوپر رازی کی کتابیں ہیں، جن میں سے اکثر فن طب میں ہیں اور باقی علوم طبیعیات و الٰہیات میں — بس اسی پر انھوں نے اکتفا کر لیا ہے اور فہرست کتب سے صرف نظر کیا ہے۔

(ج) نظامی عروضی (المتوفی در حدود ۵۵۰ھ) نے چہار مقالہ صفحہ ۷۰-۱۰۹ پر محمد بن زکریا رازی کی ان کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جو عروضی کی نگاہوں میں فنی اور طبی افادہ کے اعتبار سے مفید ترین ہیں (۱) مرشد (۲) منصوری (۳) حاوی (۴) تحفۃ الملوک۔ "الفاخر" کے ذکر سے چہار مقالہ خالی ہے۔

(د) ظہیر الدین ابو الحسن علی ابن ابی القاسم زید البیہقی (المتوفی ۵۶۵ھ) :- انھوں نے بھی تتمہ صوان الحکمۃ میں رازی کے تذکرے میں بس یہی تحریر کیا ہے، "واشتغل بعلم الطب حتی نسخت تصانیفہ تصانیف من قبلہ من الاطباء المتقدمین" (تتمہ صوان الحکمۃ ص) انھوں نے بھی فہرست کتب نہیں دی ہے۔

(ہ) جمال الدین القفطی (المتوفی ۶۴۶ھ) انھوں نے بھی "الفاخر" کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(و) ابن خلکان (المتوفی ۶۸۱ھ) کی کتاب وفیات الاعیان جلد خامس صفحہ ۱۵۸ پر رازی کے تذکرے میں صرف یہ تحریر کیا ہے: "ولہ مصنفات کثیرۃ"

(ز) طاش کبری زادہ (المتوفی ۹۶۸ھ) نے مفتاح السعادہ جلد اول ص ۲۳۳ پر رازی کا ذکر کیا ہے، بیان فضائل وکمالات کے بعد تحریر فرمایا ہے: "وتصانیفہ تبلغ مائۃ وست عشرین الکتب والرسائل فی الطب والفلسفۃ کلہا نافع فی بابہ" انھوں نے

الفاخر کا ذکر نہیں کیا ہے۔

(ج) ۱۹ مرجودہ عہد کے ڈاکٹر غلام جیلانی خاں لاہوری نے بھی تاریخ الاطباء میں رازی کی فہرست کتب میں الفاخر کا ذکر نہیں کیا ہے۔

منقولہ ماخذ میں بنیادی ماخذ ابن ندیم ہی ہے۔ اس کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "کتاب الفاخر" سے نا واقف ہے اور دوسرے بزرگوں نے تتبع کیا ہے۔

پس، ان حضرات کی یہ روش "عدم ذکر" کی ہوئی۔ اس بنا پر محمد بن زکریا کی جانب اس کتاب کا انتساب ان حضرات کے اعتبار سے درست نہیں ہوگا

"عیون الانباء فی طبقات الاطباء" کے نامور مصنف ابن ابی اصیبعۃ الخزرجی المتوفی (۶۶۸ھ) کی روش "الفاخر" کے بارے میں تشکیکی ہے۔

محمد بن زکریا رازی کی فہرست کتب کی تعداد ان کے نزدیک ۱۹۱ ہے، اس فہرست میں انہوں نے صرف اسامی کتب کی نقل پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ مواد کتاب، حجم کتاب، انتساب کتاب پر موقع بموقع رائے زنی بھی کرتے جاتے ہیں۔ زکریا رازی کے حقیقت پسند ہمدرد ہیں جس کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ رازی کی فہرست کتب میں ایک کتاب مسمّٰی بہ "کتاب فیما یرویہ من اظہار ما یدعی من عیوب الاولیاء" کا جب ذکر کیا ہے تو اس موقع پر جوش حمایت میں تحریر فرماتے ہیں: "اقول وھذا الکتاب ان کان قد الف فاللہ اعلم فربما ان بعض اشرار المعادین للرازی قد الفہ ونسبہ الیہ لیسئی من یری ذالک الکتاب او یسمع بہ الظن بالرازی و الا فالرازی اجل من ان یحاول ھذا الامر و ان یصنف فی مثل ھذا المعنی وحتی ان بعض من یذم الرازی بل یکفرہ کعلی بن رضوان المصری وغیرہ لیسمون ذالک الکتاب "کتاب الرازی فی مخاریق الانبیاء" (صفحہ ۳۳۰ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱)۔ یعنی یہ کتاب رازی کی نہیں ہے کسی سخت دشمن نے رازی کو بدنام کرنے کے لئے اس کی جانب منسوب کر دی ہے۔ رازی اس قسم کی جہل سازی سے بہت بلند اور بری ہے۔ علی بن رضوان مصری وغیرہ نے عناداً رازی کی تکفیر کا ذریعہ اسی کتاب کو بنایا۔

.... ایسے ہمدرد محقق نے مصنفات رازی میں الفاخر کا نام شمار کیا ہے گویا ان

ب رازی ہی کی ہے؟ اس باب میں انھیں تردد و شبہ ہے جس کا انھوں نے اظہار یوں کیا ہے:
نول وانما اثبت ھذا الکتاب فی جملۃ مصنفاتہ لکونہ قد نسب الیہ واشتہر لہ
(عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اوّل صفحہ ۳۱۸) الفاخر کو میں رازی کی مصنفات
میں اس لئے برقرار رکھتا ہوں کہ اس کی نسبت انہی کی جانب لوگ کرتے ہیں اور اسی کی شہرت ہوگئی ہے۔
افسوس انھوں نے جو شک کی وضاحت نہیں کی ہے جس سے نفسِ حقیقت پر کچھ روشنی پڑتی،
تردد و شبہ کے باوجود انھوں نے اس کتاب اور اس کی افادیت پر اظہار اطمینان کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں
الجملۃ فانہ کتاب جیّد قد استوعب فیہ مؤلفہ ذکر الامراض ومداواتھا
ختیار معالجاتھا علی اتم ما یکون وافضلہ" (عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد
ل صفحہ ۳۱۸)۔

بہرصورت الفاخر نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ مؤلف نے اس میں نہایت جامعیت اور
گی سے بیماریوں اور اس کے ازالہ کی تدبیروں اور علاجوں کو سمیٹ کر بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد
مندرجات کتاب پر فرماتے ہیں: "وجمھور ما فیہ منقول من کتاب التقسیم والتشجیر
رازی ومن کناش ابن سرابیون وکل ما فیہ من کلام الرازی فاولہ قال محمد
.. (عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اوّل صفحہ ۳۱۸) الفاخر میں کل مواد محمد بن زکریا
زی کی کتاب التقسیم والتشجیر سے منقول اور کناش ابن سرابیون سے ماخوذ ہے۔ ان دونوں
ذرات کے مضامین میں امتیاز یوں ہوتا ہے کہ رازی کے کلام کے آغاز میں قال محمد لکھا ہے۔
کتاب التقسیم والتشجیر کا شمار رازی کی مستند کتابوں میں ہے، اس کی وضاحت بھی صاحب عیون
کی ہے۔ اس کے طرزِ بیان کے بارے میں فرماتے ہیں: یذکر فیہ تقاسیم الامراض واسبابھا
علاجھا بالشرح والبیان علی سبیل تقسیم وتشجیر الحاصل" الفاخر اپنے مواد
شمولات کے لحاظ سے صاحب عیون کی نگاہوں میں گو مفید و معتبر ہے لیکن محمد بن زکریا کا اثر مصنف
ان کے نزدیک مشکوک ہے ــــــ بزرگوں کی باتوں کا دائرۂ اثر بڑھتا اور پھیلتا ہے کہ اس کی
رفت میں بعد کے اطبا بھی آ جاتے ہیں۔ چنانچہ صاحب عیون کے اظہار شک و تردد نے دوسرے محققین کو
متاثر کیا اور ان کو بھی الفاخر کے انتساب میں تشکیک ہوگئی۔ مثال کے طور پر میں اسماعیل

صرف ایڈیشن ڈجی ابراؤن کا اسم گرامی پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے اربین میڈیسن میں رازی کی مبسوط طبی کتابوں کی فہرست میں الفاخر کا ذکر کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے "لیکن فاخر کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا مصنف رازی ہی ہے" (طب العرب ص۶۶) مترجم کتاب مرحوم حکیم نیر واسطی نے بھی ڈاکٹر صاحب کی اس رائے کو بلا نقد و تبصرہ چھوڑ دیا ہے، ممکن ہے ان کی بھی یہی رائے ہو۔

تیسری روش: امین الدولہ ابن تلمیذ (المتوفی ۵۶۰ھ) ایک عظیم طبیب گزرا ہے، صاحب عیون نے اس کی شان میں لکھا ہے: "اوحد زمانه فی صناعة الطب وفی مباشرة اعمالها ويدل على ذلك ما هو مشهور من تصانيفه وحواشيه على الكتب الطبية" (عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اول ص۲۵۹)، ابن تلمیذ فن طب اور سرجری میں یکتائے زمانہ تھا۔ اس کی مشہور کتابیں اور طبی کتابوں پر اس کے حواشی کی شہرت اس کی عظمت پر شاہد عدل ہیں۔ اس نے یقین کے ساتھ الفاخر کو محمد بن زکریا رازی کی تصنیف قرار دیا ہے۔ صاحب عیون نے لکھا ہے: ولامین الدولة بن تلميذ حاشية على هذا الكتاب (الفاخر) وانه للرازي قال الذی کثیراً يذكره الرازي فی كتاب الفاخر (عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۳۲۰) امین الدولہ نے الفاخر پر حواشی بھی لکھے ہیں اور صراحت کی ہے کہ کتاب الفاخر رازی کی ہے۔

ایک دوسرے طبیب محمد حسن طبیب معتمد باللہ بغدادی نے بھی لکھا ہے "وله كناش عجيب في تجاربه لكنه قليل الوجود الا ببغداد المحروسة" (عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد اول صفحہ ۳۱۸) زکریا کی ایک عجیب کتاب اس کے تجارب پر مشتمل ہے مگر قلیل الوجود ہے صرف بغداد میں ملتی ہے، اس کی مراد الفاخر سے ہے۔

ایک تیسرے محقق دوران طبیب ہیں، علامہ نفیس بن عوض۔ ان کی بھی قطعی اور واضح رائے الفاخر کے بارے میں یہی ہے کہ یہ اہم کتاب محمد بن زکریا رازی ہی کی ہے۔ اس میں انہیں کوئی تردد و شبہ نہیں ہے۔ علامہ نفیس ابن عوض کی ایک اہم کتاب "شرح الاسباب والعلامات" ہے جو سن ۸۲۷ ہجری میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب میں مسائل طب پر نہایت ہی محققانہ بحثیں ہیں، مصنف نے سو سے زیادہ اکابر اطباء کی کتابوں اور رائیوں سے استفادہ کیا ہے۔ اکابر کے نام اور کتابوں کی صراحت کا برابر خیال رکھا ہے۔ ارباب فن مصنف اور کتاب کی عظمت سے خوب واقف ہیں، انہوں نے اس کتاب میں

زکا کو بنام محمد زکریا رازی صرف جلد اوّل میں نو مقامات پر کیا ہے تفصیل یوں ہے ،

جلد اوّل صفحہ ۱۷ قال الرازی فی الفاخر
" " " ۳۵ ومحمد بن زکریا الرازی فی کتابہ المشہور بالفاخر
" " " ۵۰ قال الرازی فی الفاخر
" " " ۱۰۶ والرازی نقل منہ ھذا الکلام فی کتابہ المشہور بالفاخر
" " " ۱۲۳ ونقل الرازی فی الفاخر
" " " ۲۰۹ وقد ذکرہ الرازی فی الفاخر
" " " ۲۱۵ ھٰکذا قال الرازی فی الفاخر
" " " ۲۵۱ وکذلک قال الرازی فی الفاخر
" " " ۲۵۳ لکنہ ذکر ھٰھنا عبارۃ الرازی فی الفاخر

(شرح اسباب مطبع یوسفی لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۲۱ء)

مصنف کا یہ طرز عمل الفاخر کو زکریا رازی کی تصنیف قرار دینے کے لئے کافی ہے۔

عصر حاضر کے محققین کی رائیں بھی علامہ نفیس کی ہمنوائی اور تائید میں ہیں

(۱) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم نے فردوس الحکمۃ کے مقدمہ میں تحریر کیا ہے "ان ابابکر محمد
زکریا الرازی تلمیذہ وان کان قد سبقہ وبذہ فی الطب لم یزل یردد صدی
دوس الحکمۃ فی بعض تالیفہ ویغترف من بحرہ ویستفید من متنہ ویشیر
ما استفادہ منہ بقولہ قال الطبری کما ھو فی کتاب الفاخر وکتاب الحاوی
داستفاد فی الاول بالنقل من الباب الثالث والرابع للمقالۃ الثانیہ فی النوع
الرابع من فردوس الحکمۃ (مقدمہ فردوس الحکمۃ صفحہ ۱۵) اس مقام پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کا حاشیہ
نظر ہو..... لکھتے ہیں، "Browne in Ms. P.S.F.F. 57.a–58.b ھذا الکتاب لابی بکر زکریا
ز ولم یطبع الی الآن والنسخ القدیمۃ لہ ایضا قلیلۃ الوجود واننی وجدت ھذہ الاقتباسات
نسخۃ پروفیسر براؤن المرحوم وھو رحمہ اللہ اھدی مکتبۃ الخطیۃ لخزینۃ الکتب
بجامعۃ کیمبرج (حاشیہ فردوس الحکمۃ صفحہ ۱۵) بعد کا عبارت کا خلاصہ یہ ہے

کہ رازی نے اپنی کتاب الفاخر میں اپنے استاد ابن ربن طبری کی کتاب "فردوس الحکمۃ" کے بعض اقتباسات لیے ہیں۔ الفاخر کا خطی نسخہ ڈاکٹر براؤن کے پاس تھا جس کو صدیقی صاحب نے پڑھا ہے، ڈاکٹر براؤن نے اس نسخہ کو کیمبرج یونیورسٹی کو ہدیہ کر دیا۔

اس موقع پر میرے ذہن میں یہ بات آ رہی ہے کہ فردوس الحکمۃ پر صدیقی صاحب کا کل کام جب براؤن کی نگرانی میں ہوا ہے تو خود الفاخر کے انتساب والی عبارت مذکورہ براؤن کی نگاہوں سے گذر کر صحیح ہوئی ہے جو ان کی میڈیسن والی رائے کے خلاف ہے۔ ممکن ہے ۱۹۲۱ء کی براؤن کی رائے ۱۹۲۸ء میں بدل گئی ہو اور الفاخر کے بارے میں صدیقی صاحب کی رائے بھی براؤن کی بدلی ہوئی رائے ہی کا نتیجہ ہو۔

(۲) ہندوستان کے صاحب تصانیف حکیم محمد اعظم خاں رامپوری (المتوفی ۱۳۲۰ھ) نے بھی الفاخر کو محمد بن زکریا رازی کی کتاب قرار دیا ہے۔ حکیم صاحب کی عظیم کتاب اکسیر اعظم جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کے دیباچہ میں ایک سو چھپن کتب ماخذ کی طویل فہرست میں تحریر فرماتے ہیں "وکتاب حاوی کبیر ومن لا یحضرہ الطبیب، وبرء الساعۃ، وشامل الادویہ، ومقالات وکتاش فاخر ہم از محمد بن زکریا رازی (دیباچہ اکسیر اعظم جلد اول صفحہ ۵)۔

(۳) ڈاکٹر محمود نجم آبادی (ایرانی مصنف) نے بھی اپنے رسالے میں رازی کی کل تصنیفات کی طویل فہرست دی ہے۔ اور ہر کتاب پر جدید معلومات کی روشنی میں مفصل تبصرے کئے ہیں وہ بھی تحریر فرماتے ہیں "کتاب الفاخر فی الطب" اس میں سر سے پاؤں تک کی تمام بیماریوں کا بیان ہے اور قانون شیخ کی اکثر شرحوں میں اس کا نام آیا ہے (حکمائے اسلام جلد اول صفحہ ۲۱۲ مطبوعہ دار المعنفین)

(۴) ملا چلپی صاحب کشف الظنون (المتوفی ۱۰۶۷ھ) نے بھی الفاخر کا دو جگہ تذکرہ کیا ہے پہلی مرتبہ "علم الطب" کے زیر عنوان "الکتب المؤلفۃ" کے ذیل میں لکھا ہے (نے فصول بقراط وشروحہ ۔۔۔ الفاخر۔ جلد ثانی صفحہ ۱۰۹۳) اس مقام پر گو مصنف کے نام کا ذکر کیا ہے لیکن مقام ذکر کی اہمیت کے اعتبار سے یہ قابل لحاظ ہے' دوسری مرتبہ جلد ثانی ہی میں صفحہ ۱۲۱۵ پر ذکر کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں "الفاخر فی الطب۔ للفیلسوف الفاضل ابی بکر محمد بن زکریا الرازی (المتوفی ۳۱۱ھ احدی عشرۃ وثلثمائۃ)۔

(۵) اسماعیل پاشا بغدادی مصنف ھدیۃ العارفین ضمیمۃ کشف الظنون
بھی جلد سادس صفحہ ۲۷ پر بعنوان الشیرازی، اس کا مفصل ذکر کیا ہے اور الفاخر فی الطب کو ان کی
تصانیف میں شمار کیا ہے۔

الفاخر کے حجم و ضخامت اور تعداد جلد کے لحاظ سے درج ذیل معلومات حاصل ہوئیں۔

(۱) حکیم عبد الحمید صاحب دہلوی متولی ہمدرد دہلی کا نسخہ صرف ایک مجلد ہے۔

(۲) صاحب شرح الاسباب والعلامات علامہ نفیس بن عوض کے پیش نظر صرف ایک جلد
جو امراض رأس سے لیکر امراض معدہ کو حاوی ہے۔

میری رائے ہے کہ ان کو صرف یہ حصہ کتاب خطی نسخے کا ملا ہے شرح اسباب جلد ثالث ہوئی
اور ان کی سطر سطر دیدہ ریزی سے دیکھ ڈالیں مگر دوسرے حصے میں کہیں الفاخر کا ذکر نہیں ملا، پھر خیال
کہ علامہ نفیس کی معرکۃ الآراء کتاب "نفیسی" کا جائزہ لوں۔ اس کتاب کو شرح الاسباب والعلامات
کے بعد علامہ نے تصنیف کیا ہے، جس کی صراحت معالجات نفیسی صفحہ ۲۰۲ میں انہوں نے ان الفاظ
میں کی ہے " وادلۃ الفریقین ووجوھھما مذکورۃ فی شرح الاسباب والعلامات " چنانچہ
میں نے مطبوعہ نولکشور، کلیات و معالجات کے ہزار سے اوپر صفحات کی سطر خوانی نہایت جگر کاوی سے کی
مگر ان میں الفاخر کا کہیں بھی سراغ نہیں ملا تب میں نے وہ رائے قائم کی جس کا اوپر ذکر کیا ہے۔

(۳) ڈاکٹر محمد نجم آبادی نے صراحت کی ہے کہ الفاخر کے قلمی نسخے کتب خانہ لینن گراڈ (روس)
کتب خانہ شہید علی پاشا (استنبول) اور کتب خانہ آقا حسین ملک (ایران) میں ہیں، ملک کے
کتب خانہ کا نسخہ ۲۷۰ صفحوں میں ہے اور ہر صفحے میں ۲۵ سطریں ہیں اس کتاب کے دو حصے ہیں اس کا
دوسرا حصہ برلن کے سرکاری کتب خانہ میں موجود ہے، (حکمائے اسلام جلد اوّل صفحہ ۳۱۲ مطبوعہ
دار المصنفین اعظم گڈھ)۔

(۴) مگر علامہ جلیلی نے لکھا ہے کہ وہ مجلد ہے اولہ الحمد للہ رب العلمین
یہ صرف ایک جلد ہے۔ جس کی ابتداء ہے الحمد للہ رب العالمین الخ سے
ممکن ہے کہ ان کی دسترس میں علامہ نفیس کی طرح یہ ایک حصہ رہا ہو۔
مشمولات الفاخر کے لئے صرف تین چیزیں پیش کر سکتا ہوں۔

(۱) علامہ چلپی کی صراحت ذکر انہ جمع فیہ آراء الفلاسفۃ فیما ینفع ویضر من الادویۃ والاغذیۃ واضاف الی ذالک آراء المحدثین والمتقدمین فی الصنعۃ نحو ما وردت بمصنفاتهم من عوارض ما یلحق الانسان من الفرق الی القدم لیکون دستوراً یرجع الیہ ورتبہ علی ستۃ وعشرین باباً (کشف الظنون جلد ثانی صفحہ ۱۲۱۵) مگر لفظاً ذکر سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ چلپی نے من رجات کا خود مطالعہ نہیں کیا ہے۔ اس کی عبارت منقولہ میں "من الفرق الی القدم" کے الفاظ واضح کرتے ہیں کہ تصنیفی اعتبار سے کتاب مکمل ہے۔ صرف امراض حادہ تک نہیں ہے۔ اس کی تائید ڈاکٹر محمود نجم آبادی کے حوالے سے بھی ہوتی ہے۔

(۲) صاحب عیون الانباء نے الفاخر کے مشمولات کے بارے میں جو صراحت کی اس کو نقل کر چکا ہوں۔

(۳) علامہ نے شرح الاسباب والعلامات میں الفاخر کی جو عبارتیں استشہاد کے لئے لی ہیں انہیں بحوالہ صفحات میں بھی ہدیہ ارباب فن کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ الفاخر کی مندرجہ ذیل عبارتیں شرح اسباب میں منقول ہیں:

(۱) قال الرازی فی الفاخر ویلزمہ شدۃ ضربان الاصداغ لما ان الطبیعۃ تروم نقص تلک الابخرۃ وتنقیۃ الروح منها فتنبض الشرائین وتتحرک حرکۃ شدیدۃ مستکرھۃ لذالک (شرح الاسباب والعلامات جلد اول بحث امراض راس زیر عنوان وقد یکون الصداع من ریاح غلیظۃ)

(۲) وصفتہ علی ما قال الرازی فی الفاخر ان یوخذ عند المغرب لبن حمراء فتیۃ صحیحۃ ولدت من اربعین یوماً الا اکثر من ذالک بیسیر قد ... بالخیار والکزبرۃ الرطبۃ والخس وورق بزر قطونا ویغلی فی قدر برام علی ... شدیدۃ ثم ینزل عن النار ویصب علی کل رطلین ثلث رطل من السکنجبین الصادق الحموضۃ او ماء الحصرم ویحرک بقضیب رطب من شجر التین مرضوض ماخوذ لحارۃ لیتعلق بما الجبن من اللبنیۃ واللبوعیۃ التی فی

قوة تعينه على الاسهال، حتى يتبل ثم يلقى فى كرباس صفيقة ويعلق حتى يصفو ويسيل منه الماء ثم يصفى من الغد ويغلى ويخرج رغوته فاذا انقطعت الرغوة يصفى ويشرب مع السكنجبين (شرح الاسباب والعلامات جلد اوّل ص۵۶ زیر عنوان دوار بحث امراض راس)

(۳) لان ابن سرافيون ذكر فى كتابه ان الدماغ مقسوم بقسمين يفرق بينهما خط مستوى ليكون مضاعفا حتى ان الم منه جانب بقى الجانب الآخر على صحته كالعينين والاذنين ووعائى الصدر والخصيتين وما اشبه ذالك والرازى نقل منه هذا الكلام فى كتابه المشهور بالفاخر (شرح الاسباب والعلامات جلد اول ص۱۰۶ بحث امراض راس

(۴) نقل الرازى فى الفاخر عن سرافيون ان فى هذا النوع من الجرب تحدث فى جفن العين ثقب يشبه الثقب الكائنة فى اسافل القصب من التين ولذا سمى به فعلى هذا يكون التينى بالياء منقوطة بواحدة لكن الاسم اليونانى يخالف هذا القول (شرح الاسباب والعلامات جلد اول ص۱۶۴) امراض چشم میں جرب -

(۵) قال الرازى فى الفاخر وسببه ان مادة السرسام والبرسام حارة لطيفة سريعة التحليل فاذا انصبت الى اللسان وهو عضو سخيف متخلخل مستعد لان يتحلل ما فيه بسرعة تحلل لطيف المادة وصار الباقى صلباً غليظاً غير مستعد للاستفراغ ويزداد يوماً فيوماً ويعين على ذالك ايضاً حرارة موضعة فيتحجر ويبقى على ذالك بخلاف البلغم (شرح الاسباب والعلامات جلد اول ص۲۱۵) امراض اللسان والعنين والفم

کتاب الفاخر کے تعارف اور اس کی افادی قدر و قیمت کے اندازہ کے لئے میری چند سطریں انشاء اللہ کافی ہوں گی ۔ مذکورہ بالا تفصیلات کی بنا پر میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ الفاخر واقعی رازی ہی کی تصنیف ہے ۔

خاتمہ کلام پر میں اپنی اس آرزو کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ کاش ! "الفاخر" جبا عتی لباس

فاخرہ سے مزین ہو کر منصۂ شہود پر سامنے آجاتی، اس کے مطالعے سے میرے دیدۂ دل منور و شاد کام ہو جاتے
جس طرح رازی کی الحاوی نے دائرۃ المعارف العثمانیہ کی کاوشوں کے نتیجہ میں زیورِ طبع سے
آراستہ ہونے کے بعد اربابِ طب و حکمت کی دنیا میں نئی روشنی پیدا کر دی، الفاخر کی روشنی اس
میں مزید اضافے کا سبب بن جاتی، نورٌ علیٰ نور۔

فللہ الحمد اولاً و آخراً والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبیہ و آلہ وصحبہ اجمعین

مسائل حنین ابن اسحاق

(حکیم) صیانت اللہ امروہی

حُنین ابن اسحاق نام ہے اور کنیت ابوزید۔ عرب کے مشہور قبیلہ بنی عباد کی نسل میں تھا۔
عیسائی مذہب کا پیرو و پابند رہا۔ حیرہ جو عراق کا مشہور شہر ہے اس میں اس کی سکونت تھی، لیکن بغداد
میں بھی خاصی زندگی گزری۔ بغداد میں خلیفہ مامون رشید کا درباری طبیب رہا اور خلیفہ متوکل علی اللہ کے
عہد تک دربار سے وابستگی رہی۔ ۱۹۴ھ میں پیدا ہوا اور ۷۰ سال کی عمر میں ۲۶۴ھ میں انتقال کیا۔
حنین نہایت ذہین و فطین تھا، اسی لئے اپنے تعلیمی دور میں اپنے استادوں سے محیر العقول سوالات کیا کرتا
تھا جس کی وجہ سے اپنے ایک استاد یوحنا ابن ماسویہ کی سرزنش بھی برداشت کرنا پڑی۔

حنین کی تصنیفات و تالیفات اور تراجم کی فہرست خاصی طویل ہے۔ کتاب المسائل بھی اس کی
تالیفات کا ایک جزء ہے جو مبتدئین و طالبین علم طب کے لئے لکھی گئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں طبی مدرسیات کے طور،
تشجیر کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ مطالب علمیہ کے ذہن نشین کرانے کا اس دور کا ایک جدید و بہتر
طریقۂ تعلیم ہے۔ لیکن یہ ابھی تحقیق طلب ہے کہ اس کتاب میں جو عمل تشجیر اختیار کیا گیا ہے وہ حنین کا اپنا اسلوب
ہے یا حنین کے بعد اس کو اس قالب میں ڈھالا گیا ہے، کیونکہ کتاب المسائل کا جو مخطوطہ رضا لائبریری رام پور
میں موجود ہے وہ تشجیر سے خالی ہے اور عرف عام کی کتابت ہے۔ لیکن اس تحقیق طلب مسئلہ کے باوجود تشجیر کا
یہ اسلوب اور طریقۂ تعلیم، مضامین و مسائل کی ترتیب و تقسیم کو سمجھنے اور ذہن نشین کرانے کا آج بھی ایک
آسان و سہل تعلیمی طریقۂ کار ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کی تدوین میں بعض شارحین کی رائے ہے کہ حنین اس کتاب کی تسوید کی تکمیل اپنی حیات
میں نہ کر سکا اور اس ناتمام تسوید کو اس کے بھانجے اور شاگرد حُبیش الاعسم نے مکمل کیا اور اپنی طرف سے
بعض اضافات بھی کیے۔ اسی لئے اس کتاب کو کتاب المسائل بزیادات حُبیش الاعسم سے بھی شہرت ملی۔
کن کن مقامات پر حُبیش نے اضافات کیے اس میں محققین کا اختلاف رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اس ضمن کے

اوقاتِ اربعہ کو حبیش نے اضافات کیے ہیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ حبیش نے صرف تریاقات کا اضافہ کیا ہے۔ ورنہ مکمل کتاب حنین ہی کا مسودہ ہے۔ یہ مختلف رائیں قیاسی معلوم ہوتی ہیں جن کا اثبات کسی مستحکم دلیل سے نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دو محققین کے پاس کتاب کا کوئی ایسا نسخہ موجود نہیں تھا جس سے اصل مسودہ اور اضافاتِ حبیش کا تعین ہو سکتا۔ لیکن زیرِ نظر کتاب میں ایک ایسی واضح عبارت بھی موجود ہے جس سے مسودۂ حنین اور اضافاتِ حبیش کا تعین ہوتا ہے۔ ادویہ مرکبہ میں ادویۂ مفردہ کی تعداد کیا ہو اس کے اصول کے بیان میں اصحابِ تجارب و اصحاب القیاس کی بحث کے بعد بطور تتمہ یہ عبارت موجود ہے:

"ههنا انقضى كلام حنين وتبعه بما الحقه به حبيش من كلامه"

اس مختصر عبارت سے یہ ثبوت تو فراہم ہوتا ہے کہ حنین کا مسودہ کہاں تک ہے اور حبیش نے اضافات کہاں سے شروع کیے۔ لیکن دلیلاً کسی نسخۂ معتبر کا ذکر نہیں کیا گیا جس سے یہ عبارت سند بن سکے۔ اگر اس عبارت کو قولِ فیصل تسلیم کر لیا جائے تو پھر یہ بھی مسلمات سے ہوگا کہ تقریباً نصف کتاب حنین کی مرقومہ ہے اور نصف حبیش کی۔ پھر بھی ہر دو مذکورہ آرا کے مقابلہ میں جن میں کسی عبارت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس مختصر عبارت سے کسی حد تک اصل مسودہ اور اضافات کا تعین ہوتا ہے۔

کتاب کی خصوصیات:۔ نظریاتِ طب یونانی کے اعتبار سے اس میں اگرچہ طب کی نظری و عملی دونوں تمام اصناف و اقسام کا خصوصی لحاظ رکھا گیا ہے جن کا بطور مبادیات ایک طالب علم کے لئے جاننا از بس ضروری ہوتا ہے۔ لیکن مسائل کو تشریحاً جس طرح تقسیم کیا گیا ہے، وہ کتبِ متاخرہ سے جداگانہ و ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ نیز ایجازاً و ضمناً ایسے مسائل کی نشاندہی ہوتی ہے جن سے شروع ہی سے ایک مبتدی کی ذہن سازی میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً طب یونانی کے اساسی موضوع اخلاطِ اربعہ کے بیان میں خلطِ سودا کی اقسام کا ذکر اس طرح کیا ہے:

اصناف السوداء صنفان

الطبيعية الباقية المجانسة للدم وهي خلطا سوداويا وهذا الصنف

بلا حاليته. والخارجة من الطبيعة ويتولد من احتراق الاخلاط و

[illegible]

([illegible])

اطبائے یونانیین کے یہاں خلط سودا کی اس تعریف و تقسیم میں کوئی اختلاف نہیں اور بعض امراض کا سبب مرۃ سوداء کو قرار دیتے ہوئے ان کو حصیر البرأ اور جبک بھی کہا ہے۔ لیکن سودا کی تعریف و اصناف کے بیان میں اس کو حنین کے علاوہ متاخرین میں کسی نے بھی "وکیفیتها حادة مهلکة" نہیں کہا ہے۔ مگر ایک طالب علم کے ذہن میں ابتدائی تعلیم ہی سے مرۃ سوداء کی ہلاکت آفرینی مستحضر رہے تو آئندہ امراض و اسباب کی تعلیم میں سرطان جیسے جبک اور خنازیر، جذام جیسے موذی، حصیر البرأ امراض کے اسباب میں مرۃ سوداء کے عوامل کو سمجھنے میں آسانی ہو سکتی ہے۔

کتاب المسائل سے امراض آلیہ جن کو متاخرین نے امراض الترکیب سے تعبیر کیا ہے ملیک علمی و تحقیق طلب بحث کا در بھی کھلتا ہے۔ یہ کہ حنین نے اپنے اساتذہ و متقدمین کی نظریاتی رہبری میں امراض آلیہ کی چار اقسام بیان کی ہیں:

مرض الخلقة ، مرض المقدار ، مرض العدد ، مرض الوضع

اس تقسیم کو متاخرین نے بھی مسلم قرار دیا ہے۔ حنین نے مرض الخلقة کی پانچ اقسام اس طرح بیان کی ہیں:

(۱) مرض الشكل كالرأس المسفط	(۲) مرض التجويف مثل ان يكون اخمص القدم ممتلی	(۳) مرض المجاری وهذا بان يضيق ويتسع
(۴) مرض الخشونة كخشونة قصبة الرئة	(۵) مرض الملابسة كملابسة الرحم	(کتاب المسائل ص…)

لیکن متاخرین جن میں شیخ بوعلی سینا بھی شامل ہے۔ مرض الخلقة کو چار اقسام میں تقسیم کیا ہے اور مرض الخشونة اور مرض الملابسة کو امراض السطوح میں شامل کر کے ایک ہی مرض قرار دیا ہے۔ ترمیم و تبدیل کس دور میں اور کن ہاتھوں سے ہوا، یہ تحقیق طلب ہے اور بحث طلب بھی۔

نظریات طب یونانی کے اعتبار سے طب یونانی کے معدم روح کو علاج بالغذاء، بالمفردات و ترکیب نسخہ سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح موجودہ فنی اخلاط و مزاج کو بھی علاج بالمفردات و اصول ترکیب نسخہ سے الگ بھی نظر کو ایک اہم سبب تسلیم کرنا ہوگا۔ علاج الامراض و ازالۂ علت میں ماہرین فن نے علاج بالمفردات و مرکبات اور قرابادین کے جو اصول و قوانین مرتب کیے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کے طبی نصاب میں ابتدائی معلومات کے لئے

علم الادویہ کی فنی معلومات کے بطور ذخیرہ کتب جو جزو نصاب ہیں وہ یا تو اتنے ایجاز و اختصار پر مشتمل ہیں کہ ابتدائی درجہ کے طالب علم کے لئے کفایت نہیں کرتیں، یا اتنے اطناب و طوالت پر محمول ہیں کہ ان کی ذیل فہرست مضامین کو دیکھ کر ہی ایک مبتدی خوف زدہ ہو جائے۔

کتاب الملکی میں علم الادویہ کے جو عنوانات و مندرجات ہیں وہ قوانین کلیہ و موضوعات کے اعتبار سے بہت حد تک ذہن رسا ہیں اور تشبیہاً جو کلیات ادویہ بیان کیے گئے ہیں ترتیب و بیان کے انداز سے بھی حنین کو اس میں ایک امتیاز حاصل ہے۔ کلیات طب کے جزو عملی میں بطور مداواۃ و علاج ان امور کو اہمیت دی گئی ہے : اصلاح ستہ ضروریہ، استعمال الادویہ، علاج بالید۔

حنین نے اول و آخر امور کا ضروری حد تک ذکر تو کیا، لیکن ان دونوں امور کے مقابلہ میں استعمال ادویہ پر بہت زیادہ توجہ صرف کی ہے۔ اگر شروع ہی سے ایک طالب علم کے ذہن پر یہ اصول کلیہ مرتسم ہو جائیں تو آخر تک یہ اصول صحیح رہ علم و عمل ثابت ہوں گے۔ علاج بالمفردات میں امتزاج مزاج نسخہ کا سرمایہ افتخار و نشان امتیاز رہا ہے اور اطباء کے مذاق کے لئے یہ خصوصیت نقطۂ انعطاف بھی تھا۔ بالکلیات ادویہ استخراج مزاج نسخہ کے رہنما اصول رہے ہیں اور آج بھی ہو سکتے ہیں۔

ابتداءً ہندوستان میں طبی نصاب تعلیم کی جو تدوین ہوئی ہے اس پر اگر نظر ڈالی جائے تو مختلف درجات و ادوار میں مبتدئین و منتہین کے لئے جو درسی کتب شامل نصاب رہی ہیں وہ قانونچہ، میزان الطب، طب اکبر، کفایۂ منصوری، مفرح القلوب، موجز القانون، سدیدی، اقسرائی، شرح اسباب و العلامات، نفیسی، اور کتاب القانون پر مشتمل ملتی ہیں۔ لیکن اگر ان کتب کے متون کا تجزیہ کیا جائے تو ان تمام کتب پر کتاب القانون کا عکس نظر آتا ہے۔ حتی کہ بعض وہ کتب جن کی درس و مطالعہ خاص اہمیت رہی ہے اور آج بھی ہے ان کی بعض عبارات تو کتاب القانون کا بعینہ عکس معلوم ہوتی ہیں۔ اس محل پر میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا جبکہ کچھ دیگر مثالیں بھی موجود ہیں۔

ذخیرۂ خوارزم شاہی اسماعیل جرجانی کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں جہاں امراض وبائیہ کے ذیل میں ایک عبارت ہے کہ:

"ہرگاہ کہ ببینند حشرات الارض و جانوران زمینی کہ از عفونت تولد کنند"

(ذخیرۂ خوارزم شاہی، جلد پنجم [illegible])

عبارت کتاب القانون کے اسی موضوع کی ایک عبارت کا ترجمہ معلوم ہوتی ہے کہ:

"وتری الحیوانات المتولدۃ من العفونۃ قد کثرت" (القانون [illegible])

مذکورہ بالا مثال ماضی بعید کی تھی۔ ماضی قریب کی دو مثالیں بھی دلچسپی سے خالی نہ ہونگی:

(۱) "لیکن فن طب کی تکمیل کے لحاظ سے یہ بات باقی رہتی ہے کہ عملی طور پر صحت کی حفاظت اور مرض کا ازالہ کیا جائے تو یہ ضروری ہے کہ دونوں حالتوں (حفظ صحت وازالۂ مرض) کے لئے بھی ان کے اسباب و ذرائع کے لحاظ سے کچھ موضوعات ہوں، اور وہ تین ہیں: اوّل: ستہ ضروریہ میں تصرف کرنا۔ دوم: ادویہ کا استعمال کرنا۔ سوم: دستکاری (اعمال ید)" (قانون عصری ص۱)

(۲) "علاج تین امور سے مکمل ہوتا ہے یعنی علاج تین امور سے کیا جاتا ہے (۱) تدبیر یعنی اسباب ستہ ضروریہ یا جو ضروری اسباب کھانا پینا ہوا ریاضت وغیرہ میں تغیر وتبدل اور ہیر پھیر کرنے سے۔ (۲) دواؤں سے (۳) اعمال ید یا دستکاری سے۔"
(افادہ کبیر ص۱۲۵)

مذکورہ بالا دونوں مثالیں بعینہ ترجمہ ہیں کتاب القانون کی حسب ذیل عبارت کا:

"قول کلی فی العلاج۔ نقول ان امر المعالجۃ یتم من احد اشیاء ثلثۃ احدھا التدبیر والتغذیہ والاخر استعمال الادویہ والثالث استعمال اعمال الید والعنی بالتدبیر التصرف فی الاسباب الضروریہ..." (کتاب القانون ج۱ ص۲۲۵)

چنانچہ یہ بات ثابت ہوئی کہ ہماری نصابی کتب کے ایک بڑے حصہ کا ماخذ کتاب القانون ہے۔ پھر یہ سوال بھی پیدا ہوگا کہ خود کتاب القانون کے ماخذ کیا ہیں۔ شیخ کی ذہنی افتاد طبع کے مطابق ان کی تصنیفات وتالیفات میں بعض متقدمین کو اگر استاد کچھ مقام ملا ہے تو جالینوس کا نام زیادہ سامنے آیا ہے۔ بقراط ودیگر متقدمین کے نام کم سے کم ملتے ہیں اور یہ بات شاید تعجب سے سنی جائے کہ ابوبکر محمد ابن زکریا رازی کا نام لئے بغیر طنزاً "قد زعم بعض المتطبیین" کہہ کر اس پر تنقید بھی کی اور واقعہ یہ ہے کہ رازی کی مشہور کتاب "الحاوی فی الطب" سے استفادہ کرتے ہوئے پوری پوری عبارتیں معمولی ترمیم کے ساتھ کتاب القانون میں نقل کرلی ہیں۔ نظیراً یہاں صرف ایک مثال کافی ہو گی:

"یقطع العضل ویجعل فی برنیۃ قد صعدت فیھا خل ویغطی رأسھا وتوضع فی زاویۃ یستقبل الجنوب ولا یستقبل الشمال

حنین نے امراض آلیہ و ترکیبیہ میں مرض الخلقۃ کی جس طرح تقسیم کی اور ان کی جو مثالیں بیان کی ہیں، سوائے ایک معمولی ترمیم کے یہ عبارتیں اور مثالیں کتاب القانون کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان امراض کے اسباب کا ذکر شروع ہوا تب بھی یہ ماخذی مماثلت برقرار رہی۔ مثلاً مرض الخلقۃ کی تیسری اور چوتھی اقسام یعنی مرض التجویف اور مرض المجاری کے تین اسباب اس طرح بیان کیے گئے ہیں:

اسباب المجاری والتجویف

لانضمام یکون بشدۃ قوۃ الماسکۃ	والالتحام	والسدۃ تکون بشئ یقع فی المجری
او بضعف الدافعۃ وغلبۃ بردھا وقبض	یکون	مثل کیموس او حجر او دم جامد
او یُبس او خفظ وثاق او سدۃ لواقعۃ	تتقدم	او مِرۃ او شی ینبت فی المجری
تدخل علی الشکل او ورم یحدث فیہ	قرحۃ	کاللحم الفوائد والثولول

(کتاب المسائل ص ۵)

اسی مسئلہ کو کتاب القانون میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

" وقد تعرض السدۃ لالتحام المنفذ بسبب اندمال قرحۃ فیہ
او نبت شی زائد کنبات لحم ثولولی ساد او لانطباق المجری
لمجاورۃ ورم ضاغطۃ او لیقبض برد شدید او لیشد یبس حادث
من المقبضات او شدۃ قوۃ من القوی الماسکۃ او یعصب عصابۃ
شدید الشد وانشاء یکثر فیہ السدد لکثرۃ احتقان الفضول
ویقبض البرد " (کتاب القانون ج اول ص ١٧٩)

یہ قریب قریب دونوں مماثل عبارتیں اسباب مجاری کے التیام و انضمام کی ہیں۔ اتساع مجاری کی تقسیم اس طرح بیان کی گئی ہے:

تنقسم اسباب اتساع الی

حرکۃ ردیۃ	او ضعف	او غلبۃ	او ادویۃ
من الدافعۃ	من الماسکۃ	الحرارۃ	فتاحۃ

(ک۔ المسائل ص ۵)

مذکورہ بالا مماثل عبارتوں اور نفسِ موضوع کا یہ عکسِ ماضی ہمارے سامنے حال کے بعض امراض کی کثرت کی تصویر پیش کر رہا ہے۔ آج کل قلبی امراض کس حد تک عمومی حیثیت رکھتے ہیں وہ کسی فرد سے بھی پوشیدہ نہیں۔ لیکن یہ سمجھا جا رہا ہے اور باور یہ کرایا جا رہا ہے کہ یہ تحقیقاتِ جدیدہ کا ماحصل ہیں۔ حالانکہ انجائنا' بلڈ پریشر'
یا ان جیسے دیگر اور امراض قلب و شرائین' ان سب کا تعلق شرائین کی طبعی ساخت میں غیر طبعی حالات پیدا ہو جانے سے ہے' جو کلی طور پر مذکورہ بالا اسبابِ امراضِ مجاری و تجاویف میں محصور ہیں اور ہماری کتب قدیمہ میں ان کا اجمال و تفصیل بھی موجود ہے۔

یہاں صرف ایک مثال شاید بے محل نہ ہو۔ ابوبکر محمد ابن زکریا رازی نے الرابعۃ من الاعضاء الآلمہ کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ :

"کان رجل طبیب فی عرقہ جمیع ضروب الاختلاف بلا حمی فأعلمتہ' ان ذلک لسدۃ فی الشریان الذی فی الرئہ ثم جعلت أسئلہ هل یجد ابہ ضیق نفس فقال ، لا، ثم بدا بہ فاشتد أمرہ وانحلت قوتہ وأخذہ الغشی ومات کما یموت اصحاب علل القلب۔"

(کتاب الحاوی الکبیر جز ۷، ص[illegible])

پھیپھڑے میں آنے والی شریان اور اس میں سدہ لاحق ہو جانے کی تشخیص اور علامات جملہ کی دریافت اسباب امراض مجاری سے متعلق ہے۔ آج کل کے قلبی و دماغی امراض کی عمومیت اور اسباب خارجی و داخلی کی وسعت کو کتاب المسائل کے بیان کردہ نکاتِ کلیات کے تحت ایک مبتدی طب کی اس طرح ذہن سازی ممکن ہے کہ وہ بغیر کسی احساس کمتری کے حال و مستقبل کی تحقیقات سے ہم آہنگ ہو سکے اور پوسٹ گریجویشن میں پہنچ کر ایک کامیاب محقق اور ریسرچ اسکالر کہلا سکے۔

کتاب المسائل' کلیات طب پر ایک مختصر ترین کتاب ہے جو صرف ۳۸ صفحات پر مشتمل ہے [illegible] سائز ہے چونکہ موضوعات تشجیر ہیں اس لئے ہر صفحہ کی سطروں کا تعین نہیں ہو سکتا۔ کاغذ' روشنائی اور کتابت سے کم از کم تین سو سال قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خط باریک ہے۔ کتاب میں کتابت کی کافی اغلاط ہیں اور کہیں کہیں مسائل بھی بے ترتیب ہیں۔ یہ بھی کتابت کی غلطی ہو سکتی ہے۔ ـــــ میری نظر میں زیر تبصرہ یہ مخطوطہ ترجمہ و تصحیح کے بعد ابتدائی درجات طب کے لئے موزوں و مناسب ہے۔

جناب حکیم اسرار الحق

رسالہ فی المعالجات لابن بیطار

یہ رسالہ ابن بیطار کی تصنیف ہے۔ خط نستعلیق، زبان عربی، سائز ۱۷×۲۵، صفحات ۴۰، کاتب سید حسن ہیں ۱۳۰۹ھ کی کتابت ہے۔ رسالہ شفاء الملک حکیم مظاہر احمد صاحب کے یہاں سے آیا ہے۔ اس پر حکیم صاحب موصوف کا دستخط ہے۔ اور رسالہ کا نام بھی انہیں کے قلم سے ہے "ہذا الرسالہ من ابن بیطار" یہ رسالہ خدابخش لائبریری میں ہے۔

ابن بیطار ساتویں صدی ہجری کے آخر میں ہیں۔ ان کا تعلق مالقہ کے ابن بیطار خاندان سے تھا۔ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب ۱۹۶۸ء ص ۴۳۹ لاہور نے مختلف حوالہ جات سے ابن بیطار کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

ابو محمد عبداللہ بن احمد ضیاء الدین ابن البیطار، نباتی جڑی بوٹیوں اور دواسازی کا مشہور ماہر۔ اس کا تعلق غالباً مالقہ کے ابن البیطار خاندان سے تھا۔ (قب۔ ابن الابار، المعجم، شمارہ ۲۳۵، ص ۲۴۱)

اور وہ چھٹی صدی ہجری/بارھویں میلادی کے ربع آخر میں پیدا ہوا تھا۔ علم نباتات میں اس کے استاذ کی حیثیت سے ابو العباس النباتی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کے ساتھ وہ اشبیلیہ کے گرد و نواح میں پودے جمع کرتا تھا۔ تقریباً بیس سال کی عمر میں عالم نباتات کے مطالعہ کی غرض سے افریقہ، مراکش اور ٹیونس اور الجزائر کی سیاحت پر روانہ ہوا۔

جب وہ مصر پہنچا تو وہاں ایوبی خاندان کا بادشاہ الملک الکامل حکومت کر رہا تھا۔ ابن البیطار نے اس کی ملازمت اختیار کر لی اور "رئیس علی سائر العشابین" (تمام ماہر نباتیات کا افسر اعلیٰ) مقرر ہوا۔

الملک الکامل کی وفات کے بعد اس کے بیٹے الملک الصالح نجم الدین کے عہد میں بھی جو دمشق میں رہتا تھا، وہ اپنے منصب پر برقرار رہا۔ دمشق کے قیام کے زمانہ میں اس نے شام اور ایشیائے کوچک میں جڑی بوٹیوں کے جمع کرنے اور ان کا مطالعہ کرنے کا کام جاری رکھا اور اسی موضوع پر دو کتابیں لکھیں، جو اس کے مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہیں اور جن کی بدولت اسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔

کتاب الجامع فی الادویہ المفردۃ (ابن ابی اصیبعہ ج ۲ ص ۱۳۳) ۱۲۹۱ھ میں "کتاب الجامع المفردات الادویہ والاغذیہ" کے نام سے چار جلدوں میں بولاق میں طبع ہوئی۔

یہ کتاب حیوانات، نباتات اور معدنیات کے ذریعہ معالجے کے سہل نسخوں کا مجموعہ ہے جنہیں اس نے یونانی اور عرب مصنفین کی کتابوں اور خود اپنے تجربات سے فراہم کیا تھا۔ یہ کتاب حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ دوسری کتاب "المغنی فی الادویۃ المفردۃ" یا المغنی فی العلاج بالادویۃ المفردہ" یہ مفرد دواؤں پر ایک کتاب ہے جس نے اعضا کے ماؤف کے اعتبار سے سہل شکل میں طبیبوں کے استعمال کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔
ابن البیطار نے ۶۴۶ ہجری/۱۲۴۸ء میں دمشق میں انتقال کیا۔

مذکورہ کتاب کا ترجمہ جے وی سنتھائی مرنے کیا ہے۔ وہ ناقص ہے لیکن لیکرک (Leclerc) نے اڈیشن ۱۸۷۷-۱۸۸۳ء میں طبع کیا ہے اسے قابل اعتبار سمجھا جا سکتا ہے۔ زیر نظر رسالہ غالباً اس کی دوسری کتاب ہے جو المغنی فی الادویۃ المفردہ یا المغنی فی العلاج بالادویۃ المفردہ کے نام سے موسوم ہے کیونکہ اب تک اس کی دو کتابوں کا ہی پتہ لگ سکا ہے۔ یا تطاول زمانہ کی وجہ سے معالجات لابن بیطار کے نام سے موسوم ہو سکتی ہے کہ کاتب کو یہ تو معلوم تھا کہ رسالہ ابن بیطار کا ہے لیکن نام کی تصریح نہ تھی۔ اس لئے یہ دیکھ کر کہ کتاب میں امراض اور اس کے علاج ہیں معالجات لابن بیطار نام لکھ دیا۔ اس کتاب کا مخطوطہ اسکندریہ میں موجود ہے۔ اس کے تقابلی مطالعہ سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔

ابن اصیبعہ جو اس کا ہم عصر ہے اور جسے اس کے ساتھ جڑی بوٹیوں کی تحقیق کا موقع ملا ہے۔ وہ اس کا تعارف بڑے شاندار الفاظ میں کراتا ہے۔ اس کے اخلاق حسنہ صفات جمیلہ جود وسخا رافت و رحمت حسن معاشرت علم و فضل تحقیق و تفتیش، عقل و دانش، تجربہ و مشاہدہ فہم و فراست ذکاوت و درایت فی النبات کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔

اس کی ملاقات ابن بیطار سے ۶۳۳ھ میں دمشق میں ہوئی وہ اس کے علم و فضل تحقیقات و تنقیحات اور علم نباتات میں اس کی معلومات کو دیکھ کر اس کا ایسا گرویدہ ہوا کہ اس کے ساتھ مل کر اس نے اپنی تحقیقات کو جاری رکھا۔ ابن اصیبعہ اس کے سامنے دیسقوریدوس اور جالینوس کی کتابوں کو پڑھتا تھا۔ اور ابن البیطار نباتات کے یونانی، شامی اور دوسرے ممالک میں بولے جانے والے نام بتاتا، پھر اس کے افعال و خواص پر تبصرہ کرتا۔ دیسقوریدوس نے جڑی بوٹیوں کے مزاج افعال و خواص کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اسے بیان کرتا۔ پھر اس دوا کے متعلق جالینوس کی رائے بیان کرتا۔ اور متاخرین نے اس کے متعلق کیا لکھا ہے۔ متقدمین سے کیا اختلاف کیا ہے بیان کرتا پھر ان کے افعال و خواص کے متعلق ان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا۔ اس کے ساتھ مل کر ان کتابوں کو جمع کرتا تھا سب

سے زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز یہ بات ہے کہ دیسقوریدوس اور جالینوس کی کتابوں میں جتنی دوائیں ہیں وہ اسے جب تک اپنی آنکھ سے نہ دیکھ لیتا اور اس کے افعال و خواص کی تحقیق نہ کر لیتا۔ بیان نہیں کرتا تھا۔

وہ اس کی جلالت شان، عزت، تمکنت کا ہر جگہ خیال رکھتا ہے۔ اس کا تعارف ان الفاظ شروع کرتا ہے۔ ضیاء الدین بن البیطار هو الحکیم الاجل العالم ابو محمد عبداللہ بن احمد المالقی النباتی یعرف بابن البیطار احد زمانہ وعلامۃ وقتہ فی معرفۃ النبات وتحقیقہ واختیارہ ومواضع نباتہ ونعت اسمائہ علی اختلافہا وتنوعہا۔

وہ ابن بیطار کی تصانیف کی تعداد چار لکھتا ہے۔

۱۔ الابانۃ والاعلام بما فی المنہاج من الخلل والاوہام شرح ادویہ کتاب دیسقوریدوس۔ ۲۔ کتاب الجامع فی الادویۃ المفردۃ۔ ۳۔ کتاب المغنی فی الادویۃ المفردہ ۴۔ کتاب الافعال الغریبہ والخواص العجیبہ۔

ابن ابی اصیبعہ کے بیان سے اس کے نام کی بھی تحقیق ہو جاتی ہے نام ضیاء الدین عبداللہ کنیت ابو محمد عرف ابن البیطار والد کا نام احمد ہے۔ ایک شبہ اور رہ جاتا ہے۔ ابن اصیبعہ کی شاگردی کا تو وہ بھی ابن اصیبعہ کے قول "اول اجتماعی بہ کان بدمشق" سے رفع ہو جاتا ہے۔ دونوں کی ملاقات دمشق میں ہوئی دونوں نباتات کے عالم تھے جس طرح ایک اسکالر دوسرے اسکالر سے استفادہ کرتا ہے۔ ابن اصیبعہ نے بھی ابن البیطار سے استفادہ کیا اور اس کا اقرار وہ فخر کے ساتھ کرتا ہے۔ غالباً اس کے شاگردی کا شبہ لوگوں کو اس کے لفظ قرأت علیہ سے ہوتا ہے۔

رسالہ معالجات لابن بیطار میں مصنف نے حمد و نعت کے بعد رسالہ کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے کتاب پندرہ بابوں پر مشتمل ہے۔

پہلا باب۔ اسباب ضروریہ کی تعدیل کے بیان میں، دوسرا باب۔ فضلات بدن کے بیان میں، تیسرا باب۔ جنس فضلات کے بیان میں، چوتھا باب۔ امراض راس کے علاج کے بیان میں، پانچواں باب۔ امراض حلق کے علاج کے بیان میں، چھٹا باب۔ امراض آلات تنفس کے علاج کے بیان میں، ساتواں باب۔ امراض آلات غذا و امراض معدہ کے علاج کے بیان میں، آٹھواں باب۔ امراض آلات بول کے علاج کے بیان میں، نواں باب۔ امراض آلات براز کے علاج کے بیان میں، دسواں باب۔ امراض فخذ، ساق، قدم کے علاج کے بیان میں، گیارہواں باب۔ بخاروں کے علاج کے بیان میں، بارہواں باب۔ امراض جلد کے علاج کے بیان میں،

تیرھواں باب — امراض زینت کے بیان میں، چودھواں باب۔ زہر اور دواء سمیہ کے ذریعہ علاج کے بیان میں، پندرھواں باب — اسم اور ضروری وصیتوں کے بیان میں۔

پہلا باب میں اسباب ضروریہ اور حرکت و سکون کے اعتدال کو بیان کرتے ہوئے ریاضت (ورزش) کے منافع کو بیان کیا ہے۔ چہل قدمی اور گھوڑے کی سواری کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ گھوڑے پر سواری کرنا ان لوگوں کے لئے مضر ہے جن کے جسم کے اوپر کے حصے (نصف اعلیٰ) میں درد یا قرحہ (زخم) ہو اور یہ بھی بتلایا ہے کہ گھوڑے کی سواری نصف بدن کی ریاضت ہے، فضلات کو صورت نکالنے میں معاون ہے۔ چہل قدمی جسم کے نچلے حصے کی ریاضت ہے اور ان لوگوں کے لئے مضر ہے جن کے نصف اسفل میں درد یا زخم ہو۔

استحمام (حمام میں غسل کرنا) کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ وہ سلعۂ خنازیر وجع المفاصل، سبل فی العین اور سوداوی لوگوں کے لئے مفید ہے۔

نوم و تیقظ: کے ذکر میں بیان کرتے ہیں کہ زیادہ سونا بدن کے لئے مضر ہے اس سے بدن میں ترہل (ڈھیلا پن) پیدا ہوتا ہے اور رات کے کھانے کے بعد فوراً سونا برا ہے اور دن کو کھانے کے بعد سونا (قیلولہ) بہتر ہے۔

کثرت طعام کی مضرت: — زیادہ کھانے کے نقصان کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، زیادہ کھانا معدہ کی حرارت کو بجھا دیتا ہے جس طرح زیادہ لکڑی کیا ایک آگ پر ڈال دی جائے تو وہ بجھ جاتی ہے زیادہ کھانے کی وجہ سے غیر منہضم غذا جسم میں رہ جاتی ہے جس سے سقوط قوت اور انطفاء حرارت ہوتا ہے۔

پھر فصول دہرا کا ذکر ہے اس سلسلہ میں اہم بات یہ بتائی ہے کہ نابالغ بچوں کا استفراغ نہیں کرنا چاہئے ہاں جب بہت ضروری ہو تو استفراغ کی دوا دی جا سکتی ہے۔

دوسرا باب فضلات بدن کے ادرار (نکالنے) کے بیان میں اس میں لکھتے ہیں کہ فضلات بدن دس ہیں۔ دموع (آنسو)، تھوک، رینٹھ، دردمد، منی، حیض، بول، براز، بخار، عرق (پسینہ) پھر ہر ایک کے ادرار (اخراج) کی ضرورت کی امراض میں ہوتی ہے اس کو بیان کیا ہے اس کے بعد مسہل صفرا و سودا ادویہ کا بیان اور اس کے نسخہ جات ہیں اور حقنہ (اینما) کے بعض نسخے دیئے گئے ہیں۔

تیسرے باب میں حبس فضلات اور اس سے پیدا ہونے والی بیماریاں اور اس کا علاج و دوا مذکور ہے۔

چوتھے باب میں سر میں پیدا ہونے والی بیماریوں کا ذکر ہے اس ضمن میں صداع اور درد سر اس کے اقسام اور علاج صرع (مرگی)، مالیخولیا، جنون، نسیان، امراض چشم میں رمد، بثور العین، قروح العین کا بیان

رمد، سبل، ظفرہ، جرب الجفن، سلاق، ناصور الانف، ناک کی مختلف بیماریاں اور ناک، دانت، منہ کی بیماریوں کا ذکر ہے۔

پانچویں باب میں حلق اور گردن میں پیدا ہونے والے امراض کا علاج ہے۔ مرض خناق کے بیان میں لکھتے ہیں۔

الخوانيق هو ورم حار يعرض في الحلق من داخل و هو مرض مخوف خطر اكثر خطره اليوم الرابع لانه اكثر ما يقتل صاحبه في هذه الايام و علاجه المبادرة بالفصد عند اول الابتداء بالورم وعسر البلع۔ خناق ورم حار ہے جو حلق کے اندرونی حصہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہ نہایت ہی خطرناک مرض ہے۔ زیادہ تر اس کا خطرہ چوتھے دن ہوتا ہے کیونکہ زیادہ تر خناق کے مریض پانچ دن سے کم ہی میں فوت ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ورم حلق اور شرب و اکل نگلنے میں تکلیف کا احساس ہو تو فوراً فصد لینا چاہئے۔ علاج کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

دواء يشفي نجاحه من جميع اوجاع الحلق وهو ان يخنق الافعى بخيط الابريسم الاحمر فاذا مات ذلك واخذ الخيط منه فاحفظ۔ فانه ترياق عجيب يشفي من جميع سائر اوجاع الحلق .... اذا علق في العنق۔

ذكر جالينوس انه ابرأ جماعة من الخوانيق والخنازير بهذا التدبير ص ۱۷۸

خناق و خنازیر پر قیمتی نسخہ:- وہ دوا جو بالخاصہ حلق کی تمام تکلیف اور دردوں کو دور کرتی ہے یہ ہے کہ افعی کے گردن میں سرخ ریشم کا دھاگہ باندھ کر اس کو اتنا کسا جائے کہ اس کا دم گھٹ جائے اور وہ مر جائے۔ افعی کے مرنے کے بعد دھاگے کو لے کر محفوظ رکھو کیونکہ وہ عجیب تریاق ہے اس کا گردن میں لٹکانا حلق اور گردن کے تمام دردوں کو دور کرتا ہے۔

جالینوس نے بیان کیا ہے کہ اس نے اس تدبیر سے خناق اور خنازیر کے بہت سے مریضوں کو اچھا کیا ہے۔

اس کے بعد سعال (کھانسی) کا علاج اور اس کی دواؤں کا بیان ہے۔

چھٹے باب میں آلات تنفس کے امراض اور اس کا علاج بیان کیا ہے اس ضمن میں ضیق النفس، نفث الدم وغیرہ کا بیان ہے۔

ساتویں باب میں پیٹ اور اس کے متعلقہ اعضاء کے امراض اور اس کے علاج کا بیان ہے۔ اس میں استسقاء، ورم کبد، سدۃ الکبد، یرقان، قولنج، سوء ہضم، ضعف معدہ، استطلاق بطن وغیرہ کا ذکر ہے۔

آٹھویں باب میں آلات بول کے امراض کا علاج ہے اس ضمن میں وجع الکلیہ، ورم خصیہ، فتق کو بیان کیا ہے۔

نویں باب میں آلات باہ کے امراض کا علاج مثلاً بواسیر، شقاق فی المقعدہ، [illegible]

دسویں باب میں فخذین، قدمین، ساقین کے امراض کا علاج مثلاً وجع الورک والرکبۃ، عرق النساء والحکۃ فی القدمین والساقین نقرس وغیرہ کا بیان ہے۔

وجع الورک اور عرق النساء کے مریضوں کو ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یحذر اللبن وسائر الاطعمۃ الاشربۃ المبلغم۔

دودھ اور بلغم پیدا کرنے والی تمام اغذیہ ومشروبات سے پرہیز واحتراز لازمی ہے۔

نقرس کے بیان میں فرماتے ہیں۔ النقرس صاحبہ یستضرّ بالجماع قلیلہ وکثیرہ فان لم یجامع مطلقاً لا یصیبہ النقرس۔ ص ۱۹۶

نقرس کے مریض کو جماع سے نقصان ہوتا ہے تو اسے اس سے بچنا چاہئے اگر وہ مطلقاً مباشرت ومجامعت نہ کرے تو اسے نقرس نہ ہوگا نقرس کے متعلق اتنی واضح ہدایت دوسری جگہ نہیں ملتی ہے۔

علامہ علاء الدین قرشی فرماتے ہیں لان الجماع ایضاً اقوی اسباب ھذا المرض خصوصاً علی الامتلا جماع نقرس کے قوی اسباب میں سے ہے خصوصاً امتلا کی حالت میں۔

گیارہویں باب میں حمیات کے مختلف اقسام کا بیان ہے۔ بارہویں باب میں جرب، بہق، داء الثعلب کا بیان ہے۔ تیرہویں باب امراض زینت کے بیان میں۔ چودہویں باب میں سموم (زہر) کا علاج مذکور ہے۔ پندرہویں باب میں وصایائے جمہ بیان کئے گئے ہیں اس ضمن میں سب سے

۱ پہلی بات جو بیان کی گئی ہے یہ ہے کہ ہر ذی ہوش اور صاحب عقل وخرد کو حزن وغم سے بچنا چاہئے کیونکہ وہ بدن کو بہت تیزی سے سقیم وبیمار اور کمزور کرتا ہے۔ ۲ دوسری ہر ایسی غذا جسے معدہ ہضم نہ کر سکے اور جو معدہ پر بار ہو۔ ان سے پرہیز لازمی ہے۔ ۳ صوم دہر وہمیشہ روزہ رکھنا۔ ۴ ہمیشہ بھوکا رہنا وغیرہ۔

پھر دوائے مسہل اور مقوی پینے والوں اور فصد لینے والوں کی ہدایتیں مذکور ہیں۔ آخر میں حمیات میں کن غذاؤں سے بچنا چاہئے اور حاملۂ دموی والوں کے قارورہ کا بیان ہے۔ آخیر میں مصنف لکھتے ہیں:۔

فھذا ما اردناہ کافیاً فی حفظ الصحت وھو الذی یلیق ایرادہ فی ھذہ التذکرۃ واللہ الموفق والمعین۔

رسالہ اپنے افادیت کے لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے اور اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ شائع کیا جائے۔

حکیم محمد اشرف کریم

الکناش المنصوری

(۲۳۶ ھ ——— ۳۲۰ ھ)

یہ ایک نادر طبی عربی مخطوطہ ہے جس میں طب کے علمی و عملی اصول اور تشخیص و علاج کے طریقے نہایت جامع طور پر بیان کئے گئے ہیں۔

اس میں کل اوراق ۱۴۵ ہیں۔ سائز 22 ½ × 17 c.m اور 17 ½ × 10 c.m

ہر صفحہ میں شروع سے آخر تک لکھی ہوئی عبارت کو پانچ مختلف لکیروں سے گھیرا گیا ہے۔ پہلی باریک لکیر سرخ روشنائی سے، دوسری اور تیسری لکیر سیاہ روشنائی سے بنائی گئی ہے۔ چوتھی لکیر جو کشادہ ہے وہ مُطلّا ہے۔ پانچویں باریک لکیر سیاہ روشنائی سے بنی ہوئی ہے۔ کاغذ کی قدامت اور دوسرے قرائن سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس مخطوطہ کی کتابت سولھویں صدی عیسوی مطابق دسویں یا گیارھویں ہجری میں ہوئی ہے۔

(بحوالہ توضیحی کیٹلاگ جلد ۴ نمبر ۲ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری)

اس نادر و اہم کتاب کا مصنف، چوتھی صدی ہجری کا مشہور اور حاذق طبیب علامہ ابو بکر محمد بن زکریا رازی ہے۔

معجم المؤلفین اور کشف الظنون کے حوالے سے رازی کی تاریخ پیدائش ۲۳۶ھ اور بقول بعض ۲۴۰ھ ہے اور تاریخ وفات ۳۱۱ھ اور بقول بعض ۳۲۰ھ ہے۔

یہ ایران کے مشہور شہر رَے کا رہنے والا تھا (۳) لئے رازی سے مشہور ہوا۔

اسکو جملہ علوم متداولہ میں درک اور مہارت تھی۔ اس نے طب خصوصی طور پر علی بن ربن طبری صاحب فردوس الحکمت سے حاصل کی۔

طب کے علمی و عملی میدان میں اتنا کامیاب ہوا کہ جالینوس العرب کے لقب سے مشہور ہوا
رازی مشہور طبیب اسحٰق بن حنین عبادی کا معاصر تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی اور امیر خراسان منصور بن اسمٰعیل کے درمیان بہت زیادہ تعلقات اور ان میں دوستی تھی اسی لئے رازی نے اپنی معالجات کی اس اہم کتاب کو امیر منصور کے نام سے موسوم کیا اور المنصوری نام رکھا درحقیقت زکریا رازی نے معالجات کی اس اہم کتاب کو نئے انداز سے ترتیب دے کر متاخرین اطباء کے لئے ایک روشن مثال قائم کی ہے۔

انھوں نے اختصار اور جامعیت کے ساتھ طب نظری اور طب عملی دونوں کو ایسے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا اس کو پوری دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ اکتاتا نہیں۔

پوری کتاب دس مقالے پر مشتمل ہے۔

پہلے مقالہ میں اعضاء مفردہ، عظام، اعصاب، رباطات، شرائین و اوردہ وغیرہ کی مکمل تشریح و وضاحت اور ان سے وابستہ افعال و وظائف کا جامع بیان ہے۔

دوسرے مقالہ میں ابدان و اخلاط کے مزاج اور علامات مزاج کا مفصل بیان ہے۔

تیسرے مقالہ میں اغذیہ و ادویہ کے افعال و خواص اور ان کے مزاج سے بحث کی گئی ہے۔

چوتھے مقالہ میں حفظان صحت کے ضروری اسباب بیان کئے گئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چند ایسی علامتیں بھی بیان کی گئی ہیں جو بعض خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہونے کی خبر دیتی ہیں اور ان کا علاج بھی بتایا ہے جیسے اگر شدید درد سر اور شقیقہ دیر تک قائم رہ جائے تو نزول الماء اور انتشار العین کی خبر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر دوا سے فائدہ نہ ہو تو کن پٹی کے دونوں طرف شریانی صدغی میں فصد دینے سے فوری فائدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح چہرہ کا بار بار پھڑکنا لقوہ میں مبتلا ہونے کی خبر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں تنقیہ کا اسہال اور قے کی ضرورت ہے پرانی شراب کے سرکہ میں پودینہ جوش دے کر چہرہ پر ملا جائے تقلیل غذا اور ترک شراب کرائی جائے اور مناسب غرغرہ اور چھینک لانے والی دوا استعمال کرائی جائے۔ چہرہ اور پلکوں کا متورم ہونا استسقاء کی خبر دیتا ہے۔

اس مقالہ کے آخر میں محنت الطبیب کے عنوان سے بتایا ہے کہ طبیب اپنے دعوات

فرصت میں قدیم اطبا اور فلاسفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اور وہ متکلمین اور مناظرہ کرنے والوں کی مجلس میں بیٹھ کر ان فرقوں اور بحث میں حصہ لیتا ہے یا لہو ولعب اور شراب وغیرہ میں مشغول رہتا ہے۔ پہلی جماعت کے لوگ قابل بھروسہ اور علاج کے سلسلے میں اعتماد کے لائق ہیں۔ دوسری جماعت کے اطبا سے بھلائی کی کوئی توقع نہیں۔

پانچواں مقالہ امراض زینت کے تذکرے اور علاج میں مخصوص ہے۔

آخری مقالہ میں مخمور کے خمار کو دور کرنے کی ترکیب بتائی ہے کہ اسے ذرا کم سلایا جائے۔ اس کے بعد حمّام کرایا جائے۔ معتدل ہوا کی جگہ پر بٹھا کر سر پر نیم گرم پانی ڈالا جائے۔ پھر حمّام سے نکال کر آب انگور وغیرہ کے ساتھ چوزہ پکا کر کھلایا جائے۔ اس کے بعد بھی درد سر قائم رہے تو اس کے سر پر خالص شراب، روغن گل، عرق گلاب کو برف سے ٹھنڈا کر کے اس کی مالش کی جائے۔

چھٹے مقالہ میں مسافروں کی تدابیر بتائی گئی ہیں۔

آخر مقالہ میں بحری سفر کرنے والوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اس کو چکر اور متلی آنے کا خطرہ ہو تو اپنے ساتھ ربوب فواکہ رکھ لینا چاہیئے۔

شروع سفر میں چند دن غذا کم کر دے اور پانی کی طرف نہ دیکھے۔ ساتھ میں خوشبودار عطر وغیرہ جو غشی میں مفید ہو ساتھ رکھ لے۔ حب سماق، حب رمّان اور ربوب فواکہ استعمال میں رکھے۔

مسافر جب سفر پر نکلتا ہے تو دھوپ اور ہوا کی تیزی سے اس کے چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے اس سے حفاظت کی صورت یہ بتائی گئی ہے کہ سایہ میں آرام کرے اور چہرے پر رومال یا کوئی کپڑا وغیرہ لپیٹ کر باہر نکلے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کتیرا، صمغ عربی، لعاب اسپغول، لعاب بہدانہ سفیدی بیضہ مرغ ملا کر یا آب خرفہ میں ملا کر چہرہ پر مالش کرے سفر پر نکلے اور منزل پر پہنچ کر چہرہ دھو ڈالے۔

ساتویں مقالہ میں زخم، پھوڑے، ٹوٹی ہوئی ہڈی پر پٹی لگانے اور دستکاری کے متعلق ضروری ہدایات بیان کی گئی ہیں۔

آخر مقالہ میں عرق مدنی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ مرض گرم و خشک علاقوں میں پیدا ہوتا ہے جہاں پانی اور سبزہ وغیرہ کی کمی کے باعث فضا خشک ہو جاتی ہے۔

عرق مدنی اکثر پنڈلیوں پر ہوتا ہے۔ کبھی دوسری جگہوں پر بھی ہوتا ہے۔ جب یہ امتداد

ہو جاتا ہے تو اس جگہ پہلے سوزش اور لہر ہوتی ہے پھر آبلہ بن کر دھاگے کی شکل میں نکلنے لگتے ہیں۔
اس مرض سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ بدن میں غذا اور حمّام کے ذریعہ ترطیب پیدا کی جائے ایسے ملک کے باشندوں کو جہاں یہ مرض کثرت سے واقع ہوتا ہو پھل اور سبزیوں کا کثرت سے استعمال کرنا چاہیئے۔

اس کا مخصوص علاج یہ بتایا ہے کہ جب پنڈلیوں میں آبلہ پھوٹ کر عرق مدنی نکلنا شروع ہو جائے تو پہلے دن نصف درہم صبر کھلایا جائے، دوسرے دن ایک درہم تیسرے دن ڈیڑھ درہم استعمال کرایا جائے اور صبر ہی سے مقام ماؤف پر طلا کیا جائے۔ اس طرح مرض بالکلیہ زائل ہو جاتا ہے۔ لیکن جب عرق مدنی نکلنا شروع ہو جائے تو ایک درہم وزن کے سیسہ کا ایک ٹکڑہ پر لپیٹ کر گرہ دے دیا جائے۔ سیسہ کے وزن سے وہ رگ پنڈلی سے جلد جلد نکلنا شروع ہوگا۔ اگر زیادہ طویل ہو جائے تو تھوڑا سا کاٹ کر پھر سیسہ کے ٹکڑہ پر لپیٹ دیا جائے۔ کاٹنے میں احتیاط برتی جائے کہ جڑ سے ہرگز نہ کاٹیں ورنہ سکڑ کر گوشت کے اندر داخل ہو جائیگا اور وہاں ورم پیدا کر کے قروح ردیہ کا باعث ہوگا۔ اسی لئے آہستہ آہستہ کھینچنے اور نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کا کوئی حصہ اندر باقی نہ رہ جائے۔ اسکے بعد مقام ماؤف پر مناسب دہن طلا کیا جائے اور اس پر منبت لحم دوائیں استعمال کی جائیں

آٹھویں مقالہ میں چند مخصوص زہریلی دواؤں کی زہریلی تاثیرات اور بعض مشہور زہریلے جانوروں کے ڈسنے اور ان کے مخصوص علاج کا تذکرہ ہے۔

نویں مقالہ میں سر سے پاؤں تک کے جملہ امراض اور اُن کے علاج کا بیان ہے۔
مثلاً رُعاف (نکسیر) کے خون کو روکنے کے لئے بتایا ہے کہ جنگلی تلسی (بادروج) کے پانی میں کافور حل کر کے ناک میں ٹپکایا جائے، تو اس سے خون رک جاتا ہے۔ یا پھر گِل، کاغذ سوختہ، مازو، دم الاخوین، چونہ، پھٹکری سب کو باریک پیس، کر ناک میں پھونکا جائے یا ایک بتی تر کر کے یہی دوا چھڑک کر ناک میں داخل کی جائے۔ یا شبّ یمانی کو سُرمہ سا باریک کر کے نشاستہ ملا کر ناک میں پہنچایا جائے اگر اس پر بھی رُعاف کا خون نہ رُکے تو دونوں بغل کے پاس دونوں بازو کو اور گنج ران زانشین کے پاس دونوں ران کو کس کر باندھ دیا جائے۔ اگر خون رُک جائے تو ٹھیک ہے ورنہ رگِ قیفال میں فصد دے کر خون نکالا جائے۔

اگر اس تدبیر سے فائدہ ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ جس جانب رعاف ہے اسی طرف پیٹ میں حجم
نار (سنگی) کے ذریعہ کیسری خون کا امالہ کیا جائے۔

اسی طرح فواق (ہچکی) کے متعلق لکھا گیا ہے کہ اگر ثقیل و غلیظ غذا اور شراب کثیر کے استعمال
کے بعد ہچکی پیدا ہو جائے تو مریض کو نیم گرم پانی میں زیرہ، نعناع اور پودینہ کو خوب جوش دے کر تھوڑا تھوڑا
پلایا جائے، سونے کی ہدایت کی جائے، پیٹ سینکا جائے اور چند دن غذا روک دی جائے اس کے
بعد حمام کرایا جائے اور خشک جاذبِ رطوبت غذا دی جائے۔ جیسے مصالحہ دار بھنے ہوئے
گوشت وغیرہ۔

اگر فواق بخار کے بعد پیدا ہو یا ہچکی کے ساتھ بے چینی، غشی، پیاس اور منہ میں خشکی محسوس
ہو تو مریض کو نیم گرم پانی تھوڑی تھوڑی کر کے پلاتے رہیں۔

اگر اس سے شفا ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ماء الشعیر میں روغن مغز بادام شیریں ملا کر دیا جائے
اور پشت و گردن کے مہروں پر نیم گرم تیل کی ہلکی ہلکی مالش کی جائے اور لعاب اسپغول عرق گلاب
اور آب انار ملا کر پلایا جائے۔

آخر میں رازی نے بتایا ہے کہ ہچکی کے مریض کو چھینک لانے والی دوا استعمال کرائی جائے
اور مریض کو سانس روکنے کی ہدایت کی جائے۔ اس طرح اکثر ہچکی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔

دسویں مقالہ میں حمیات کے متعلق نہایت واضح اور تفصیلی بیان ہے جس میں بخار کے
اقسام، اسباب ان کی علامتوں اور علاج کو بیان کیا گیا ہے۔

بخاروں کے بحران، بخاروں کے مریضوں کی مخصوص غذا و پرہیز، اعراض لاحقہ کی تدابیر، نضجِ مواد
اور علامت منذرہ وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخری دو اوراق میں چند ایسے امراض کا بیان ہے جن سے مریض فوری طور پر
شفایاب ہو سکتا ہے۔ جن کو اصطلاحاً بُرءُ السَّاعَة کہتے ہیں۔

علامہ زکریا رازی نے بُرءُ السَّاعَة کو وزیر ابو القاسم بن عبداللہ کی فرمائش پر ترتیب
دیا ہے۔ ان میں سے مثال کے طور پر چند امراض حسب ذیل ہیں:۔

قلعِ اسنان (دانت اکھاڑنا):۔ عاقرقرحا کو شراب میں ایک ماہ تک بھگویا جائے پھر

تک کہ انگلی کے مانند نرم ہو جائے۔ اس کو درد والے دانت پر ضماد کرنے سے دانت اکھڑ جاتا ہے یا تب توت شامی کو شیشے کے برتن میں ڈال کر دھوپ میں رکھا جائے۔ چند دن کے بعد دانت پر لگائیں۔ دانت اکھڑ جائے گا۔

خلفۃ الصبیان (بچوں کا اسہال) بکری کے بچہ کا پنیر مایہ ماں کے دودھ میں حل کر کے دینے سے بچوں کا اسہال فوراً رک جاتا ہے۔

زحیر اطفال (بچوں کی پیچش) اس کے لئے حب الرشاد ساڑھے چار ماشہ، زیرہ کرمانی ڈھائی ماشہ باریک سفوف کر کے گھٹ کے پرانے ٹکڑی میں ملا کر ماں کے دودھ کے ساتھ کھلانے سے بچہ کی پیچش فوراً دور ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

دوی الاذنین (کان کی سنسناہٹ)، اس کے لئے افیون خالص پانی میں گھول کر کان میں ٹپکانے سے فوراً آرام ہو جاتا ہے۔

رعاف (ناک سے خون بہنا) شب یمانی باریک سفوف کر کے ناک میں پھونکا جائے۔ یا جس جانب سے خون آ رہا ہے اسی جانب پیٹ پر حجم ناری کا استعمال کرنے پر فوری فائدہ ہوتا ہے۔

حرق النار (آگ سے جلنا) آگ سے جل جانے پر اکثر سخت درد اور لہر ہوتی ہے اس کے لئے مردار سنگ، بجھا ہوا چونا، برگ گلاب، برگ حنا سے ایک ایک جز لے کر خوب باریک سفوف کریں۔ مقام ماؤف پر روغن گل تازہ ملا کر کے یہی سفوف چھڑک دیں، اس سے فوراً سکون ہو جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ ۲ دن میں پورا آرام ہو گا۔

عرق النسا (درد عرق النسا) یہ ایک خطرناک بیماری ہے جس میں بہت سے لوگ مبتلا رہتے ہیں یہ درد پاؤں کے بیرونی جانب عظم العصعص سے قدم تک پایا جاتا ہے۔ یہاں پر بغیر کسی طوالت کے مختصر طور پر بیان کا ضرورت ہے۔

اس کا شافی علاج یہ ہے کہ صبر زرد، ہلیلہ زرد، سورنجان ایک ایک درم کوٹ کر چھان کر گولیاں بنالی جائیں اور مریض کو کھلا دی جائیں۔ اس سے مریض کو پانچ چھ دست آئیں گے اور مریض فوراً شفایاب ہو گا۔

راقم کا کہنا ہے کہ اس نے اس دوا سے ایک بوڑھے شخص کا علاج کیا جو ایک سال سے بیمار تھا اور جو اپنی جگہ سے اٹھ سکتا تھا اور نہ ایک پہلو سے دوسرا پہلو بدل سکتا تھا۔

فروق الامراض

مصنفہ اسحٰق بن سلیمان اسرائیلی

صفحات ۸۴ سنہ کتابت: ۱۳۱۵ھ کاتب: علی حسن عظیم آبادی

مصنف نے شروع کتاب میں تحریر فرمایا ہے، چونکہ بہت سے امراض ایک دوسرے سے متشابہ ہوتے ہیں اس لئے ایک ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں دو امراض کے درمیان کا تشابہت تشخیصی علامت کے ذریعہ دور کردی جائے۔

مصنف نے "فروق الامراض" کو ترتیب دے کر اس میں کل پانچ (۵) مقالے تحریر کئے ہیں۔

پہلا مقالہ پانچ فصلوں پر مشتمل ہے جس میں کل ۲۸ تشخیصی علامات بیان کی گئی ہیں جو اجزاء راس کے حالات و امراض سے متعلق ہیں۔

دوسرا مقالہ تین فصلوں پر مشتمل ہے جس میں وہ تشخیصی علامات بیان کی گئی ہیں جو آلات تنفس حالات و امراض سے متعلق ہیں۔

تیسرا مقالہ چار فصلوں پر مشتمل ہے جس میں معدہ، کبد، طحال، گُردہ، مثانہ اور آلاتِ تناسل سے متعلق تشخیصی علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

چوتھا مقالہ تین فصلوں پر مشتمل ہے جس میں سارے بدن کے حالات و امراض سے متعلق تشخیصی علامتیں بیان کی گئی ہیں۔

پانچواں مقالہ، بعض اقسام نبض کے فرق اور بولِ متشابہ کی تشخیصی علامات پر مشتمل ہے۔

تمہید میں بیان کیا گیا ہے کہ اشتباہ کبھی حقیقت میں ہوتا ہے اور کبھی امراض حقیقت میں الگ الگ حقیقت میں ہے تو سوال اٹھتا ہے کہ ایسے دو متشابہ امراض میں ہم کیسے امتیاز کریں گے تو اس صورت

میں علامات فارقہ کی ضرورت لاحق ہوتی ہے جس سے وہ ایک دوسرے سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔

مثلاً یہ کہا جائے کہ سوء مزاج کبد، حرارت غریزیہ کے ضعف کا موجب ہے جس سے کبھی تو استسقاء ہو جاتا ہے اور کبھی اسہال غسالی ہوتا ہے۔ یہ دونوں لازمی طور پر ایک ساتھ نہیں پائے جاتے۔ ایسی صورت میں علامات فارقہ کو ذہن نشین رکھ کر حالت اور مرض کی تشخیص کریں گے اور اگر اشتباہ اعراض حقیقت میں واقع ہو تو حقیقت میں اختلاف کے باوجود اس کا اشتباہ علامات فارقہ سے دور ہوگا۔

مثلاً ضعف ہضم معدہ و ضعف ہضم کبد کبھی تو ضعف قوت ہاضمہ کی وجہ سے ہوتا ہے اور کبھی قوت ماسکہ کے ضعف کی وجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

یا جیسے کبھی بطون دماغ میں سدہ کی وجہ سے سکتہ واقع ہوتا اور کبھی ورم دماغ کی وجہ سے سکتہ واقع ہوتا ہے۔ یہاں پر بھی علامات فارقہ سے حقیقت واضح ہوگی۔

چونکہ متقدمین اطباء اپنے فن میں کامل ہوا کرتے تھے جس کے باعث ان کو فن میں قدرت اور اجتہاد کا درجہ حاصل تھا اس لئے ان کو فروق امراض سے واقفیت کی ضرورت نہیں تھی لیکن متاخرین اطباء سے تشخیص امراض میں غلطی کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے ایسے اطباء کی سہولت اور رہنمائی کے لئے فروق الامراض ترتیب دی گئی ہے تاکہ تشخیص اعلاج میں کوئی غلطی واقع نہیں ہو۔

مقالہ اولیٰ کی پہلی فصل میں امراض دماغیہ کے بارہ میں علامات فارقہ بیان کئے گئے ہیں بطور نمونہ چند حسب ذیل ہیں۔

بیداری (سہر): یہ کبھی تو دماغ میں خشکی کے باعث ہوتا ہے اور کبھی اخلاط لاذعہ کی وجہ سے نفس بیداری میں دونوں مشترک ہیں۔

اگر بیداری کا سبب دماغ کی خشکی ہے تو اس کے ساتھ نتھنوں، حلق اور آنکھ کی رطوبت میں کمی ہوگی اور اکثر ایسی بیداری سے پہلے امراض سوداویہ یا بلسہ، حمیات محرقہ، فکر و رنج و غم پایا جائے گا۔

اگر بیداری اخلاط لاذعہ سے لاحق ہوتی ہے، خواہ یہ مواد دماغ میں ہوں یا معدہ میں۔ اگر دماغ میں ہونگے تو اس کے ساتھ دکھار ہوگا، مواد کی ماہیت کے مشابہ آنکھوں کے سامنے خیالات اور شکلیں

ظاہر ہوں گی۔ ایسے مواد ناک سے جاری ہوں گے۔ پیشاب طبعی حالت پر ہوگا۔ بسا اوقات مادۂ مرض کے
مشابہ احلام اور خواب نظر آئیں گے۔

اگر بیداری معدہ میں مواد نافذ ہونے کی وجہ سے ہوگی تو ایسی صورت میں فساد ہضم ہوگا۔ نیز اسی
بیداری سے مریض نے بھنی، خردل، شراب جریف وغیرہ کا استعمال کیا ہوگا۔

سکتہ ایک دماغی مرض ہے جو عام طور پر بطون دماغ میں سُدّہ واقع ہونے سے ہوتا ہے اور
کبھی ورم دماغ سے ہوتا ہے۔ یہاں حقیقت امراض ایک ہے اور سبب مرض جدا جدا ہے۔

سکتۂ سُدّی میں سکتہ براہ راست مواد سُدّیہ سے واقع ہوتا ہے۔

سکتۂ ورمی میں ورم، مادّہ کی مقدار اور حجم میں اضافہ کر کے سکتہ پیدا کرتا ہے۔

سکتۂ سُدّی میں سکتہ دفعتہً واقع ہوتا ہے۔

سکتۂ ورمی میں آہستہ آہستہ سکتہ واقع ہوتا ہے۔

سکتۂ سُدّی میں بخار نہیں ہوتا۔ سکتۂ ورمی میں بخار ہوتا ہے۔

مذکورہ علامات فارقہ سے دونوں سکتہ کے درمیان آسانی سے تشخیص کی جا سکتی ہے۔

تیسرا مقالہ آلات تنفس کے احوال و امراض کی علامات فارقہ کے تذکرہ میں ہے۔ چنانچہ
ان میں سے ایک مرض بطور مثال نفث الدم ہے۔

نفث الدم کبھی پھیپھڑے سے متصل شرائین کے منہ کے کھل جانے کے باعث خارج ہوتا
ہے اور کبھی عروق و شریان کے پھٹ جانے کے باعث خارج ہوتا ہے۔ حقیقت نفث الدم میں
دونوں شریک ہیں۔ بسا اوقات سبب یعنی کثرت دم میں بھی شریک رہتے ہیں۔

لیکن انفتاح عروق کا سبب ہمیشہ کثرت دم و امتلاء عروق و شریان ہوا کرتا ہے۔ انصداع
عروق میں ان اسباب کے ساتھ اسباب بادیہ مثلاً چیخنا، چلّانا، اچھلنا کودنا بھی شامل ہوتا ہے۔

انفتاح عروق سے نکلنے والے خون کا قوام رقیق، گرم اور رنگ شوخ سرخ ہوا کرتا ہے۔
ایسی صورت میں فصد کے بعد خون خود بخود رک جاتا ہے۔

رگ پھٹنے سے جو خون نکلتا ہے اس کا قوام غلیظ، رنگ سرخ سیاہی مائل۔ اس میں خون مقداراً
زیادہ خارج ہو جاتا ہے۔

حکیم سید علی حیدر جعفری
علیگڑھ

طب کے دو اہم نادر مخطوطات

کتاب المنصوری اور الاسباب والعلامات

ورق :- ۱۸۸ سطر :- فی صفحہ ۲۰ سائز :- 13 × 19 ، 24 × 11 cm

روشنائی :- سیاہ و سرخ مصنف :- زکریا رازی ۔ متوفی ۳۱۱ھ تا ۳۲۰ھ باختلاف ۔

علیگڑھ کے علاوہ اس کے نسخے رامپور اور پٹنہ میں موجود ہیں ۔ بیرون ہند برٹش میوزیم اور برلن میں بھی محفوظ ہیں ۔ مخطوط کے پہلے صفحہ پر "کناش منصوری معروف بکناش فاخر از محمد بن زکریا رازی دلیہ رسالہ بردالساعۃ" لکھا ہوا ہے ۔ از سے فارسی ترکیب دلیہ کا عربی جوڑ کاتب کی ستم ظریفی کی غماز ہے ۔

کتاب کا عنوان ابن ندیم نے الفہرست (۴۱۷) پر کتاب المنصوری فی الطب دیا ہے ۔

ابتدائی صفحہ پر جو "کناش" کی لفظ ہے اس کے بارے میں خدا بخش لائبریری کیٹلاگ (جلد ۴ ص ۱۲) میں وضاحت ہے کہ منصوری کے ساتھ کناش کی لفظ غلط ہے ۔ کناش فاخر رازی کی دوسری تصنیف ہے مصنف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے البتہ وجہ تصنیف اور کتاب کا انتساب تحقیق طلب یقیناً ہے ۔

یہ کتاب رازی نے منصور کے لئے تالیف کی تھی اس کا تذکرہ طبقات الاطباء (۱ : ۳۱۰) میں ہے ۔ قاضی ابن خلکان نے کہا ہے کہ وله ایضا کتاب المنصوری المختصر المشہور وھو علی صغر حجمہ من الکتاب المختار جمع فیہ من العلم والعمل ویحتاج الیہ کل احد وکان قد صنفہ لابی صالح منصور بن نوح بن نصر بن اسمٰعیل بن اسد بن سامان احد الملوک السامانیہ' وفیات (۲ : ۷۸)

مزید تائید طبقات الاطباء (۱ : ۳۱۰ و ۳۱۷) چہار مقالہ (۲۳۳) سے بھی ہوتی ہے ۔ اسی مناسبت سے اس کو منصوری کہا جاتا ہے ۔

ابن خلکان نے وفیات (۲: ۸۷) وجہ تصنیف کے سلسلہ میں کہا ہے قد صنف له الرازی المذکور والکتاب المذکور فی حال صغرہ تشتغل به یہ بیان تمام مشہور واقعات کی تردید میں ہے۔

کتاب کی ابتدائی عبارت اگرچہ چند سطروں میں ہے لیکن ان چند سطروں میں ہی کتابت کی متعدد غلطیاں ملتی ہیں جن میں کچھ کی تو میں تصحیح کرسکا ہوں لیکن بعض مقامات بالکل سمجھ میں نہیں آتے ہیں کہ کاتب کیا لکھنا چاہتا ہے۔ آپ حضرات کے سامنے یہ عبارت میں اسی طرح پڑھ رہا ہوں جس طرح اصل مخطوطہ میں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے۔

قال ابوبکر محمد بن زکریا انی للامیته (للامیر) منصور بن اسحاق بن احمد اطال الله بقائهٗ ... فی کتابی هذا جملا وجوامع ونکتا وعیونا من صناعة الطب وحتحری (متحیزا) فی ذالک الاختصار والایجاز واذکر (من حفظ والصحة) و معالجة الامراض وتوابع ذالک ولواحقه با(ما) لایزال الحدث (یحدث) ویدعو (الحاجة) وتفرطوالحاجة معرفته (ویظطر الی معرفة) وتمکن اهل العقل والرای مشارکة الاطباء فیه وتارک ذکرنا (ما) لایکاد یحدث الا فی المدة الطویلة و یحتاج فی معرفته الی وغول واغراق فی الصناعة وجاعل کتابی عشر مقالات فی کل مقالة فصولا معرتبا بالحروف علی مراتب عدد ها لیسهل اصابه ما یرید منها وآسال الله التوفیق والقول علی یرضیه ویقرب الیه ویدنی منه والله تعالی اعلم۔

اغراض مقالات الکتاب کے تحت حسب ذیل مقالوں کی فہرست دی ہے۔

المقالة الاولی فی شکل الاعضاء وهیأ تها المقالة الثانیه فی تعرف مزاج الابدان والاخلاط الغالبه علیها۔ المقالة الثالثه فی قوة الاغذیه والادویه المقالة الرابعه فی حفظ الصحة المقالة

النفس في الزينة وفيها يذهب الخراز المقالة السادسة في تدبير
المسافر في المقالة السابعة في جبر وجوامع من صناعة الجبر والجراحات
والقروح المقالة الثامنة في علاج السموم والهوام المقالة التاسعة في
الامراض الحادثة من الفرق الى القدم المقالة العاشرة في الحميات وما يتبع
ذلك مما يحتاج اليه معرفته في تجويد علاجها ۔

مصنف نے اپنے مقدمہ میں طب کے جن جن مسائل کی طرف اشارہ کیا تھا ان تمام مسائل کو مذکورہ دس مقالوں میں اپنے انفرادی انداز میں مختصر لیکن مکمل طور سے بیان کر دیا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن سے معالج و غیر معالج دونوں کو واسطہ پڑتا ہے اس لئے رازی نے ہر ایک کو پڑھنے کا مشورہ دیا ہے۔

۲۔ الاسباب و العلامات

مصنف: سید محمد بن یوسف الایلاقی متوفی ۴۶۰ھ

علم طب کی ایک مخصوص شاخ معالجات پر ایک نہایت اہم تالیف ہے۔ اس کے دو نسخے مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ ایک نسخہ انتہائی کرم خوردہ ہے۔ نسخہ کے سرورق پر ایک عبارت ۷ سطروں پر مشتمل ہے لیکن کرم خوردگی کی وجہ سے اچھی طرح پڑھی نہیں جا سکتی ہے صرف اتنا سمجھ میں آتا ہے کہ ابن غلام محی الدین الطبیب نے محمد مقیم کاتب نسخہ سے [illegible] میں خریدا۔ آخر کتاب پر [illegible] سنہ کتابت تحریر ہے۔

پہلے اور آخری صفحہ پر عزمی قنع وذل من طمع کی ایک مہر لگی ہے جس کے اندر مخفی الفاظ میں جلال الدین حیدر لکھا ہے۔

یہ کتاب ۲۲۳ اوراق یعنی ۴۴۶ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ کی سطریں ۱۳ ہیں روشنائی کالا ہے لیکن عنوانات اور اہم الفاظ سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔

دوسرا نسخہ بہت اچھی حالت میں ہے لیکن پہلے صفحہ کی عبارت روشنائی کے پھیلنے کی وجہ سے ناقابل قرأت ہے۔ اس نسخہ میں نہ تو کاتب کا نام ہے اور نہ کسی مقام پر سنہ کتابت تحریر ہے۔ اس کے اوراق کی تعداد ۳۴۲ ہے ۱۲ اور ۹ اسطریں ہیں۔

سائز 20x12 cm, 25x18 ہے۔

ابتداء :۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے بعد عبارت الحمد للہ بارئ النسم ومنشی الاشیاء بعد العدم والصلوٰۃ علی رسولہ محمد سید العرب والعجم وعلی آلہ الاذکیاء ثم مصابیح الظلم قال الشیخ الامام الاجل الامیر السید محمد بن یوسف الایلاقی۔

ابتدائی عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔ کاتب عربی سے اچھی طرح واقف نہیں اس لئے کہ بارئ النسم عربی گرامر کے اعتبار سے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی اصل متن میں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ کا امکان ہے۔ اس عبارت سے مصنف کے نام کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ محمد بن یوسف الایلاقی کو حقیقت (۲۰:۲) الاعلام (۸) البیہقی (۱۳۱، ۱۳۲) حاجی خلیفہ (حرف الف) معجم المؤلفین کحالہ (۹:۲۸۳) بحوالہ تاریخ حکمائے اسلام متفقہ طور سے شیخ الرئیس کا شاگرد قرار دیا ہے لیکن سنہ وفات میں اختلاف ہے صاحب الاعلام نے ۵۳۶ھ، بائی پور میں سنہ وفات ۴۶۰ھ، صاحب معجم المؤلفین کا بیان کان حیاً قبل ۴۲۶ھ/ ۱۰۳۴ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بانکی پور کے کیٹلاگر نے مؤلف کے سنہ وفات کی تحقیق بھرپور کی ہے۔ ۴۶۰ھ شیخ الرئیس کی شاگردی کو سامنے رکھتے ہوئے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے تقریباً تمام مورخین نے اس کی تالیفات میں الاسباب والعلامات اور اختصار القانون یا الفصول الایلاقیہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اصل کتاب میں نام کا تذکرہ کہیں نہیں ہے۔ جتنے نام دیئے ہیں الگ سے لکھے گئے ہیں۔ کتاب کا موضوع اس کے عنوان ہی سے ظاہر ہے۔ تصنیف کو مصنف نے مقدمہ کتاب میں خود ہی مختصراً سے بیان کر دیا ہے۔

عام رجحان کے مطابق باب، مقالہ یا فصل کے تحت امراض کی تفصیلات نہیں بیان کی ہیں بلکہ درمیان میں ہر مرض کا نام دیگر ضمنی سرخی کے تحت کثیر التوقیع امراض کے اسباب، علامات مخصوصہ اور علاج کو انتہائی ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نسخے سہل الحصول اور مختصر اجزاء پر مشتمل ہیں۔ مرکبات کی تیاری کا طریقہ بھی بہت سہل و آسان ہے۔ اپنے خیالات کی تائید میں جالینوس، مدوفس، رازی، شیخ جیسی مستند ہستیوں کا حوالہ دے کر کتاب میں وزن پیدا کر دیا ہے۔

مقدمہ میں جو مصنف نے لکھا ہے کہ کتاب میں سہولت، تجربہ اور اختصار کو فوقیت دی ہے۔ اس کا التزام آخر کتاب تک ملتا ہے جس سے قاری یا معالج کا ذہن تنفر و تقباض سے محفوظ رہتا ہے۔ سر سے پیر تک جملہ امراض کی مخصوص علامات و علاج کو بیان کرنے کے بعد آخر میں بول کی شناخت اور استفراغات کی افادیت و شرائط کی مختصر تفصیل پر کتاب کو ختم کر دیا ہے۔

اسی مصنف کا دوسرا مخطوطہ بھی اسے آزاد لائبریری میں موجود ہے جس کو اختصار القانون کا نام دیا گیا ہے۔

ابن اصیبعہ (۲ : ۲۰) نے تو اس کی تصانیف الاسباب والعلامات اور اختصار القانون فی طب کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن معجم المولفین (۱۲ : ۱۲۳) میں من آثارہ مختصر القانون لابن سینا، الاسباب والعلامات والاصول الایلاقیہ فی کلیات الطب اختصر فیہ القانون لابن سینا دیا ہے۔

موجودہ فہرست غیر مطبوعہ طبی مخطوطات میں ایلاقی تصانیف میں اختصار القانون (۱م طب ایلاقی (۳۰ مطبوعہ) الفصول الایلاقیہ (۱۳) المعالجۃ الایلاقیہ (۴۶) غیر مطبوعہ) کا تذکرہ اس فہرست کے اعتبار سے چار کتابیں الگ الگ معلوم ہوتی ہیں۔ حالانکہ اس کی طبی تصانیف باعتبار ابن اصیبعہ دو ہیں۔ بانکی پور کیٹلاگ میں تحقیق کے بعد یہ تحریر ہے کہ اختصار القانون اور الفصول دونوں ایک کتاب ہے۔

کتاب کے نام الفصول اور ترتیب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ بہت سی فصلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں ہر بیان فصل سے شروع ہوا ہے۔

قانون کے خلاصے بہت سے لکھے گئے ہیں اور پھر ان خلاصوں کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں لیکن زمانہ شیخ کی قربت کی بنا پر غالباً یہ پہلا خلاصہ ہوگا۔ اس خلاصہ کی بھی شرح لکھی گئی ہے۔

حکیم محمد حسین خاں شفا

فصول فیض اللہ خانی

کتب خانہ رام پور کا ایک معالجاتی قلمی تذکرہ

رام پور کے علمی ذخیرے میں ایک کتاب "اقتباس العلاج عرف فصول فیض اللہ خانی" ہے۔ اس کے صرف دو نسخے میرے علم میں ہیں ایک دہلی دوسرا رامپور۔ ناظم کتب خانہ سرکاری ریاست رامپور جناب احمد علی خاں شوق (م ۱۹۳۲ء) نے نسخہ رامپور کے بارے میں تحریر کیا ہے:

"فن طب میں اس جامعیت[۲] کی کتاب کم ہوگی، علاج معالجے کے ساتھ واقعات مطب وحکایات بھی لکھے گئے ہیں۔"

اس کتاب کے مصنف حکیم محمد بایزید ہیں جن کی عمر تالیف کے وقت تقریباً ستر سال کی تھی انھوں نے اپنی زندگی کے طبی تجربات اس میں تحریر کرنے کی کوشش کی ہے

فہرست مضامین سے الگ ۵۸۶ اوراق ہیں۔ ہر صفحے پر اکیس[۳] سے تیئس تک سطریں ہیں۔ تقطیع ½۱۸ × ½۱۲ انچ ہے۔ یہ خط نستعلیق میں ہے۔ مصنف کے کسی شاگرد نے اسے ۱۲۶۱ھ = ۱۸۴۵ء میں اصل مسودہ سے نقل کیا ہے۔ یہ داخل کتب خانہ ہونے سے قبل مختلف حضرات کی ملکیت رہ چکا ہے۔ چنانچہ اس پر دست غیر سے کچھ حواشی و نسخہ جات کا اندراج ہے۔ ورق (۴۷۹) پر بحث آتشک میں کسی شخص نے نسخہ جب توتیا مجرب حکیم علوی خاں تحریر کیا ہے اور اس کے نیچے ۱۳ اکتوبر ۱۸۶۸ء تحریر ہے۔ شروع میں ۶ صفحات پر مشتمل فہرست مضامین ہے جو ۵۸۴ عنوانات پر مشتمل ہے۔ یہ اصل مخطوطہ میں نہیں تھی۔ کارکنان کتب خانہ کی بنائی ہوئی ہے۔ اس قسم کے مخطوطات پر فہرست مضامین لگانے کا کام علامہ شبلی کی تحریک پر کتب خانہ سرکاری میں شروع کیا گیا تھا۔ حمد و نعت کے بعد ۱۲۵ کتابوں پر مشتمل فہرست ماخذ ہے۔ مضمون کے متن میں کچھ ایسی کتابوں کے نام بھی آتے ہیں جو فہرست ماخذ میں نہیں ہیں۔ اس میں کئی قدیم و جدید ایسی کتابوں کے حوالے بھی آئے ہیں جو اب نادر و نایاب ہیں۔ جدید کتابوں میں قوانین العلاج حکیم کبیر علی انصاری، دستور الحل حکیم اکمل خاں، معالجات حکیم ساجد علی رامپوری اور

کی بیاضیں شامل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید کے پاس خوش قسمتی سے کتابوں کا ذخیرہ بھی تھا۔

حکیم بایزید طب قدیم کے ساتھ طب جدید کے علوم و تجربات سے بھی واقف تھے۔ انھوں نے فصول میں ایک باب ادویۂ جدیدہ منسوب بہ فرنگیہ کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ دیباچے میں مصنف نے اپنی دیگر تصانیف کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ فصول سے پتا چلتا ہے کہ حکیم بایزید کو مختلف طبی مسائل پر رسائل مرتب کرنے کا شوق تھا جن کا انھوں نے مختلف امراض کے ذیل میں حوالہ دیا ہے۔ چونکہ بایزید کے عہد میں (۱۸ویں صدی) برصغیر کے مسلمان سیاسی بحران میں مبتلا تھے۔ عربی زبان، علوم عقلیہ اور خاص طور سے فن سرجری سے بے رغبتی عام تھی۔ قوم پر بڑھاپا طاری تھا۔ ایسے ماحول میں حکیم بایزید ایک مجدد طب کی حیثیت سے میدان میں آئے۔ اور انھوں نے فارسی زبان میں خود نصاب تعلیم طب مرتب کیا اور برسوں اپنی درس گاہ میں پڑھایا۔ اس نصاب کی جن کتابوں کا فصول میں حوالہ آیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- جوائب النعمت - یہ کتاب حکیم بایزید نے بقول خود اپنے بھائی اور دیگر شاگردوں کے جرد عملی یعنی سرجری کی تعلیم دینے کے واسطے ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء میں مرتب کی تھی۔ جواب ان کی دیگر تصانیف کی طرح نایاب ہے۔

۲- فوائد نعمت نامی کتاب امراض متعدیہ آتشک وغیرہ سے متعلق ہے۔ اس کا ذکر دیباچہ اور بحث آتشک میں کیا گیا ہے۔ سنہ تصنیف ۱۱۵۷ھ / ۱۷۴۴ء ہے۔

۳- ایک رسالہ در معالجات عامہ از ابتدائے نطفہ تا ضعف طب ۱۱۸۷ / ۱۷۷۳ میں مرتب ہے۔

۴- خزینۃ العلاج کے نام سے مقالات طب کو مرتب کیا جس میں طب کے مختلف مسائل پر محاکمہ ہے۔ سنہ تالیف ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷-۸۸ء ہے۔

۵- ریاض العمل نامی رسالہ نوز تشخیص و عملیات طب سے متعلق ۱۲۰۲ھ / ۱۷۸۷-۸۸ء میں مرتب کیا۔

۶- مرکبات میں قرابادین "نافع الامراض" بہت معرکہ کی کتاب ہے۔ علامہ نجم الغنی خاں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"اس قرابادین میں نسخہ ہائے مرکب جن جن لوگوں نے تجویز کئے ہیں ان کے نام ہر نسخے کے ساتھ درج کر دیئے ہیں اس لئے یہ روہیلہ سرداروں کے امراض گوناگوں کا کچا چٹھا ہے اور دلچسپ مرقع تالیف ۱۱۸۰ھ / ۱۷۶۶-۶۷ء ہے"

حکیم بایزید کی تصانیف میں سے صرف "فصول" ہی میرے مطالعہ میں رہی ہے۔ تلاش کے باوجود کوئی

ور کتاب اب تک نہیں مل سکی۔ فصول کے تمام اور سنہ تالیف کے بارے میں حکیم بایزید لکھتے ہیں:۔

"چونکہ اس کتاب کی ترتیب سے جناب نواب فیض اللہ خاں کے عہد ۱۲۰۴ / ۱۷۸۹

میں فارغ ہوا ہوں، اس وجہ سے ان کے اسم گرامی پر اس کا نام رکھا ہے۔

اس مخطوطہ کا کاتب حکیم صاحب کا عقیدت مند شاگرد ہے۔ وہ ترقیمہ میں تحریر کرتا ہے۔

"تمت الکتاب من مسودۃ المصنف قدس سرہ العزیز تصنیف حکیم ہادینا مولوی

محمد بایزید ساکن بلدہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور۔

فصول کتب طبیہ میں کئی اعتبار سے ممتاز ہے۔ اس کے طبی نسخہ جات کی جامعیت تاریخی واقعات کی صداقت اور علمی و ادبی حکایات کی ندرت اہل ذوق حضرات سے داد تحسین وصول کر رہی ہے کہ اس مخطوطہ کی تدوین طب کی عام معالجاتی کتابوں کی طرح ترتیب اعضا پر ہے۔ جو امراض راس سے شروع ہو کر قدم پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن بلحاظ مواد وہ اس فن کی دیگر کتابوں سے ممتاز ہے۔ بایزید نے جن اعضا کے امراض سے بحث کی ہے۔ پہلے ان اعضا کی مختصر تشریح اس کے بعد کچھ مفید معلومات اور مبادیات علاج امراض، علامات، عام معمولات اور خاص مجربات کا تذکرہ ہے۔ پیچیدہ امراض کے سلسلے میں "فوائد" کا عنوان قائم کرکے اہم نکات اور خاص تشخیصی رموز بیان کئے ہیں۔ کہیں کہیں دستور العلاج کا عنوان قائم کرکے اطبائے قدیم و جدید کا طریقہ علاج تحریر کیا ہے، جس میں خاص طور پر دہلی اسکول اور حکیم علوی خاں کا تفصیلی ذکر ہے۔ حکیم علوی خاں کے بارے میں اس مخطوطہ میں کافی اہم معلومات ہیں۔ حکیم بایزید نے پہلے علوی خاں سے طب پڑھی اس کے بعد علوی خاں کے کچھ شاگردوں سے بھی استفادہ کیا۔ وہ بحث بخار میں ورق ۲۳۷ ب پر تحریر کرتے ہیں:۔

"در بیان مطلب قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم کہ استاذ فقیر بودند نوشتہ دیدم"۔

علوی خاں کے ہم عصر ایسے اطبا کے نام بھی فصول میں آتے ہیں جن کا دیگر تذکروں میں ذکر نہیں ہے۔ تر نسخے قلیل الاجزا مفردات پر مشتمل ہیں۔ مرکبات کے سلسلہ میں اپنی تصنیف "قرابادین نافع الامراض" اور دیگر قرابادینوں کے حوالے دیئے ہیں۔

امراض وبائیہ میں کہیں کہیں سنہ، موسم اور مقام کا تعین بھی کر دیا ہے۔ آخر میں رموز تشخیص، کی مشکلات اور ان کے جوابات، علامات و احوال اموات، وصایا الطبیب، تحقیق اسماء جمیع امراض، لغویات طبیہ باللغت، فہرست ادویہ مفردہ مع خواص اور ورق ۱۰۵ ب سے حکیم ارزانی کی عربی تصنیف

حدود الامراض کا بایزید نے خود فارسی ترجمہ کر کے شامل کتاب کر دیا ہے۔

فن معالجات سے متعلق حکیم بایزید نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے اور قدیم متون کو سامنے رکھا ہے۔ اس وجہ سے بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ کچھ عنوانات کا حق صرف چند سطروں میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حکیم بایزید نے فصول میں اکثر امراض کی بحث میں ایک باب قصص و حکایات کا قائم کیا ہے۔ جو غیر طبیب اہل علم کے واسطے بھی بہت کارآمد ہے۔ اس باب میں آخری عہد مغلیہ سے متعلق سوانحی سماجی تاریخی اور علمی و ادبی معلومات ہے۔ چونکہ فنی طبی کتابوں کا عام طور پر تاریخی ماخذ کے بطور مطالعہ نہیں کیا جاتا۔ اسی وجہ سے اس کتاب کا یہ اہم حصہ اہل علم کی نظر سے پوشیدہ ہے۔ اور پوری کتاب میں موتیوں کی طرح بکھرا ہوا ہے۔ مصنف نے اپنے حسب و نسب کے بارے میں دیباچہ میں صراحت کی ہے۔

حکیم محمد بایزید خلف حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ رحمت اللہ گنگوہی ابن شاہ حافظ برخوردار از اولاد قطب عالم شاہ عبد القدوس گنگوہی :

بایزید کا خاندان کئی صدیوں تک تصوف و طب میں بہت ممتاز رہا۔ جن کا مختلف کتابوں میں ذکر ملتا ہے۔ خاص طور پر بایزید کے نواسے ڈاکٹر شاہ محمد حسن صابری کام سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تصانیف میں تاریخ آئینہ تصوف اور حقیقت گلزار صابری بہت مشہور ہیں۔ شاہ محمد حسن صاحب غیر ثقہ راوی اور عجوبہ پسند مصنف تھے۔ ڈاکٹر اسلم لاہوتی نے ان کی تصانیف کو داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا کی طرح محض افسانوی قرار دیا ہے۔ پھر بھی ان کی تالیفات سے بایزید اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ مفید معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔

شاہ محمد حسن صاحب کی کتب تصنیف حافظ برخوردار کی کتاب نقشہ قدسیہ تحریر کردہ کے حاشیہ ماخوذ میں محمد حسن لکھتے ہیں:-

"پنجاب کے علاقہ گجرات میں شاہ دولہ نامی ایک بزرگ تھے۔ جن کی لڑکی قمر النساء بیگم کا عقد حافظ برخوردار سے ہوا۔ جن سے شاہ رحمت اللہ پیدا ہوئے"

—— حافظ صاحب نقشہ قدسیہ میں تحریر کرتے ہیں :-

(میرے فرزند شاہ رحمت اللہ کی شادی ۱۰۹۵ھ اختر فاطمہ بنت حضرت سید

احمد آنوزدائے سے ہوئی۔ جن کے بطن سے ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں حکیم بایزید تولد ہوئے صاحب

اولاد ہیں۔ ان کی اولاد رام پور میں ہے)

محمد حسن صاحب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:-

"حافظ محمد عبداللہ بن حضرت شاہ نعمت اللہ کا نکاح ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں خدیجہ بیگم بنت حکیم بایزید سے ہوا۔ جن سے فقیر محمد حسن مؤلف تاریخ[۸] آئینہ تصوف پیدا ہوا"

حکیم بایزید ایک صوفی خاندان میں محض طبیب تھے۔ ان کی پوری زندگی خدمت طب میں گذری۔ غالباً اسی وجہ سے کبھی تذکرہ صوفیا میں ان کا ذکر نہیں آیا۔ البتہ ان کے نواسے شاہ محمد حسن صابری نے دیگر متبرک اہل طریقت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید بھی تصوف سے متاثر تھے۔ انھوں نے ورق ۳۶۴ ب پر امراض نسواں میں ایک تعویذ اس وضاحت کے ساتھ تحریر کیا ہے کہ اس مرض میں ہمارے مشائخ یہ نقش دیا کرتے تھے۔

خاندان بایزید کی طبی خدمات کو سراہتے ہوئے مفتی عبدالقادر ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء نے روزنامچہ میں تحریر کیا ہے[۹]

"اس شہر رام پور میں فن طب میں ملا فقیر اخوند کا خاندان سب پر سبقت لے گیا ہے۔ ملا بایزید نے عمل جراحی کو کہ عرصہ سے اطباء اس سے عاجز تھے اور ابلہ فریبی سے اس کام کو ذلیل بتاتے تھے۔ باوجود طبیب ہونے کے از سر نو اس فن کو حاصل کیا۔ اب ان کا بھائی نعمت اللہ اس نواح میں اس فن میں یکتائے زمانہ مشہور ہے۔ اب بھی اس گھرانے میں بیماروں کا علاج جاری ہے۔ ملا مرحوم کے جانشین اس کے لڑکے ملا احمد سعید ہیں"[۱۰]

علامہ نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں نواب فیض اللہ خاں کے عہد کے مشائخ و علما کے ذیل میں حکیم بایزید کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کو حکیم کوثر چاند پوری نے اطبائے[۱۱] عہد مغلیہ میں کچھ تسامحات کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

چونکہ حکیم بایزید نے اپنے بھائی ملا فقیر اخوند (ولادت ۱۱۴۳ھ) کو ان کے زہد و تقوی کی وجہ سے ہر جگہ تعظیمی کلمات سرکار صاحب سرتاج وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ جبکہ ملا صاحب بایزید

سے سلسلے ملتے تھے۔ اس وجہ سے نجم الغنی خاں نے حکیم بایزید کو چھوٹا بھائی تصور کیا ہے۔ کرنر صاحب تحریر کرتے ہیں:-

"حکیم بایزید حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی کا بیٹا تھا۔"

کرنر صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے۔ حکیم کبیر علی انصاری بایزید کے استاد تھے۔ ان سے زیادہ تعلق کچھ نہیں تھا۔ تذکرہ کاملان رام پور اور حقیقت گلزار صابری وغیرہ میں خاندان بایزید کا جو شجرہ ہے وہ حکیم کبیر علی انصاری کے خاندان سے نہیں ملتا۔ حکیم بایزید کو غالباً روزنامچہ نویسی کا شوق تھا یا ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا۔ جو انھوں نے آخری عمر میں ابتدائے شباب کے واقعات تفصیل سے تحریر کر دیئے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مفصول میں (۱۱۶۱ھ - ۱۷۴۷ء) سے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء تک کے واقعات کہیں کہیں تعین سنہ کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں۔ یہ منتشر واقعات بھی تاریخ طب کا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔

واقعات طاعون میں بایزید تحریر کرتے ہیں جب میں نواب فیض اللہ خاں کے ساتھ سرہند میں تھا۔ اس دوران وہاں طاعون پھیلا جس میں سیکڑوں افراد مر گئے۔ میں نے کچھ مریضوں کا جدوار، پیاز وغیرہ سے علاج کیا۔ وہ ٹھیک ہو گئے۔ چنانچہ ورق-۲۲ پر کچھ مجربات طاعون تحریر کئے ہیں۔ سمیات میں بایزید لکھتے ہیں:-

"سرہند میں میں نے ایک فقیر کو دیکھا۔ جو سیماب خام کھاتا تھا اس نے پارا کھانا میرے اور نواب فیض اللہ خاں کے سامنے کیا۔"

ایک جگہ احمد شاہ درانی کی غیر معمولی توانائی کا تذکرہ ہے۔ ان واقعات سے ثابت ہے کہ حکیم بایزید ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۷ء سے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء تک پنجاب اور افغانستان میں نواب فیض اللہ خاں کے ساتھ رہے۔ تاریخی مقامات کے ذیل میں بایزید نے ملتان، سرہند، افغانستان، الموڑہ، سنبھل اور پیلی بھیت وغیرہ کا کثرت سے ذکر کیا ہے۔ جن سے ان مقامات پر بایزید کی آمد و رفت ثابت ہوتی ہے۔ بایزید روہیل کھنڈ کی پہلی جنگ آزادی میں حافظ رحمت خاں کے ساتھ تھے جب اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت خاں شہید ہوئے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں نے رام پور کو پایۂ تخت قرار دیا۔ اور دیگر مشاہیر کے ساتھ حکیم بایزید بھی رام پور میں آگئے یہیں انتقال کیا۔ وہ مرض خناق میں استعمال چائے کا ایک دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں۔

ہے کہ:

"ابتدائے تشکیل رام پور میں نواب فیض اللہ خاں نے اطبائے دربار سے چائے کے مزاج اور نفع و نقصان کی بابت استفسار کیا۔ جس کا جواب میں شدید اختلاف رائے تھا اور حکیم مرزا بو علی اپنی اس رائے پر اڑ گئے کہ چائے درجۂ سوم میں گرم و خشک ہے۔ نواب صاحب کو اس کا استعمال ہرگز نہ کرنا چاہیئے۔ یہ زہر کا کام کرے گی۔ جبکہ نواب صاحب انگریزوں میں متعدد بار چائے نوش کر چکے تھے۔ نواب صاحب نے انچارج مطاعفات شاہی حکیم عطاء اللہ عمیں کاشمیری کو حکم دیا کہ وہ اپنی والدہ سے چائے بنوا کر لائیں۔ مرزا بو علی کو اپنی بات خراب ہونے کا احساس ہوا اور انھوں نے چائے میں خربق سیاہ (کٹکی) شامل کرادی۔ جس کے پینے سے نواب صاحب کو خناق ہو گیا۔ دوسرے روز حالت بہت بگڑ گئی۔ اطبائے دربار کو جمع کیا گیا۔ جن کے نام بایزید نے یہ تحریر کئے ہیں۔

حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی، حکیم احمد علی انصاری، حکیم محسن خاں شاگرد حکیم شریف خاں، حکیم دیدار علی تدین، حکیم عزالدین میرٹھی، حکیم حافظ محمد یار خاں شاہ جہاں پوری، حکیم محمد زماں خاں، حکیم واجد علی خاں، حکیم منیر علی، حکیم حافظ محمد یار خاں، حکیم عطاء اللہ عمیں۔"

یزید لکھتے ہیں:

"اطبا نے چائے میں زہر کی آمیزش کا خبر ظاہر کیا۔ نواب محمد علی خاں کی تفتیش سے لال دیپ چند عطار نے بتایا کہ والدہ حکیم عمیں نے خربق سیاہ منگائی تھی۔ جو حکیم مرزا بو علی کے اشارے پر چائے میں ڈالی گئی۔ اس انکشاف کے بعد مرزا بو علی تو فرار ہو گئے۔ فصد کھول کر اور تبرید سے فیض اللہ خاں کا علاج کیا گیا۔ نواب صاحب نے ٹھیک ہو کر انعامات سے نوازا۔"

یہی نصوص میں بایزید نے تحریر فرمائی ہے۔

اس ایک واقعہ کے ذیل میں بایزید نے دربار رام پور سے وابستہ ۱۴ اطبا کا ذکر کیا ہے نصوص

فصول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہر چھوٹا اور بڑا رئیس کسی نہ کسی طبیب کا کفیل تھا۔ جس کی وجہ سے عوام کو طبی سہولت مفت حاصل تھی۔ بایزید نے کئی دولت مند خواتین کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس میں بیگم نواب سعد اللہ خاں بھی شامل ہیں۔ جو طبیبوں کو تنخواہ دیا کرتی تھیں۔ بایزید نے کامیاب معالجہ پر ملنے والے انعامات اور اس عہد کے رئیسوں کی علم دوستی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ وہ پیچش کی بحث میں لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ نواب محمد علی خاں کو پیچش ہو گئی۔ میں نے اور حکیم احمد علی نے علاج کیا۔ جب وہ صحت یاب ہو گئے تو نواب فیض اللہ خاں نے دونوں کو نقد انعام و جاگیر سے نوازا۔ جس میں ۵۰۰ روپے اور ۵۰ بیگھہ پختہ اراضی بشارت نگر میں حکیم بایزید کے حصے میں آئی۔"

بایزید اپنے ہم عصر اطبا میں حکیم احمد علی انصاری سے بہت متاثر ہیں۔ انھوں نے اپنے اور اپنے خاندانی معالج کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے۔ فصول سے اطبا کے آپس میں خوش گوار روابط اور مشترکہ علاج و معالجہ کے بہت سے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں کئی غیر مسلم معالجین کا بھی ذکر ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خاں ولد حافظ رحمت خاں کی بیوی حکیم بھاگیرت مصرا اور حکیم منوہر مصرا کے زیر علاج رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ ان کے علاج سے طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی، تو نواب فیض اللہ خاں نے مجھے ان کا علاج کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بایزید کو امراض دماغیہ اور سرجری میں خصوصی مہارت تھی۔ انھوں نے ان امراض میں اپنے جوہر دکھائے ہیں اور قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔

فصول میں بایزید نے اپنے چند شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے جن میں حکیم شاہ نواز خاں بھی شامل ہیں۔ یہ اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں بایزید کے پاس گئے۔ جوان زیرک اور ذہین تھے۔ بایزید نے جوہر قابل کو پرکھ لیا۔ اور ان کو خدمت خلق اور تعلیم طب کی طرف متوجہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ نواز خاں کو ایک ماہر طبیب بنا دیا۔ یہ ایک دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ملا نظام الدین ولایتی یوسف زئی سالار خیل بہت با اثر رئیس تھے۔

کاملان رام پور وغیرہ میں مذکور ہے کہ جب شاہ نواز خاں نے مطب شروع کیا تو والد اور استاد نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ اللہ کا دیا معاش تمھارے پاس کافی ہے۔ طب خدمت خلق کا ذریعہ ہے۔ دنیاوی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں۔ اگر اتفاق زمانہ سے دنیاوی مصائب آجائیں تو نقار

ن کا خیال رکھنا۔ علما، سادات اور اہل خدمت سے کوئی رقم مت لینا۔ حکیم شاہ نواز خاں کا ساری عمر استاد کی اس نصیحت پر عمل رہا۔ اور ان کی نسل سے قدرت نے ہر دور میں کامیاب معالجین پیدا کیے۔ جن میں حکیم عبدالرحمٰن خاں ان کے بھائی حکیم عبدالرحیم خاں اور حکیم عبدالرحیم خاں کے لڑکے ڈاکٹر عبدالحکیم خاں اور ان کے لڑکے ڈاکٹر خالد خاں ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ اور ڈاکٹر عبدالرشید کا بھی اسی خاندان سے تعلق ہے

رام پور کے اکثر اطبا کا سلسلہ حکیم بایزید تک پہونچتا ہے۔ جن میں حکیم محمد اعظم خاں اور حکیم نجم الغنی خاں بھی شامل ہیں۔ بایزید خدمتِ خلق تزکیہ نفس اور اخلاقی اقدار کی پابندی کو طبیب کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے (وصایائے طبیب) میں ان اصولوں پر زور دیا ہے۔ تاریخی و تہذیبی واقعات کے ساتھ فصول میں بہت سے مشاہیر کا بھی تذکرہ ہے۔ جن میں ملا نیاز اخوند، ملا احمد، سید اعظم شاہ گنگوہی، مولوی مغل، ملا عبدالرحمٰن قوہستانی، قاری نسیم، حافظ رحمت خاں، حکیم غلام رسول حکمت، حکیم مرزا عاشور بیگ، حکیم بھولا ناتھ، حکیم محمد افضل خاں، حکیم دوست محمد خاں، حکیم عبدالرسول، حکیم محسن خاں کاشمیری، حکیم محمد ساجد جھنجھانوی ثم رام پوری، حکیم شاہ باز خاں، حکیم محمد امان خاں، حکیم اللہ داد خاں وغیرہ شامل ہیں۔

بہت سے رئیسوں کے آپس کے تعلقات اور ان کے مصاحبین کی تفصیل بھی فصول سے معلوم ہوتی ہے۔ بایزید نے جہاں کامیاب معالجات کا تذکرہ کیا ہے۔ وہاں بعض امراض میں اطبا کی ناکامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ بحثِ سوزاک میں لکھتے ہیں۔

> "جناب قاضی سند صاحب کو سوزاک ہو گیا تھا۔ یہ نواب فیض اللہ خاں کے مصاحب خاص تھے۔ ان کے علاج کے سلسلہ میں نواب صاحب نے خود دلچسپی لی۔ اور حکیم غلام رسول حکمت سے علاج کرایا۔ لیکن قاضی صاحب اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے اور ان کا انتقال ہو گیا۔"[۱۳]

قاضی سند صاحب کا تذکرہ سوانح حافظ جمال اللہ صاحب "مجمع الکرامات" میں امام الدین خاں اور فرزند غوث الاعظم"[۱۴] میں میکش اکبر آبادی صاحب نے کیا ہے۔ قاضی صاحب کو حافظ شاہ جمال اللہ اور شاہ عبداللہ بغدادی صاحب کے درمیان ایک جھگڑے کا بانی قرار دیا ہے۔

فضول سے بعض مشاہیر کے ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں۔ جن کا کسی اور نے تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بایزید نے بحثِ دردِ سر اعانیون میں شاہ عبداللہ صاحب بغدادی کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت شاہ عبداللہ بغدادی کا نبیرۂ حضرت غوث الاعظم عرف بنّے میاں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے شہر بھوپال میں ایک جوان صحت مند خوش خوراک فقیر کو دیکھا۔ جو بہت بڑا افیون کا گولہ دونوں وقت کھاتا تھا اور سانپ سے کٹواتا تھا۔ لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ تاریخ ہند کا اورنگ زیب کے بعد کا عہد کافی پیچیدہ ہے اس دور میں مختلف ملکی اور غیر ملکی گروہوں نے خاندانِ مغلیہ کی جانشینی کی جدوجہد کی، جن میں روہیلے بھی شامل ہیں۔ بدقسمتی سے روہیلوں کو مغل سید مرہٹوں اور انگریزوں نے ہدفِ ملامت بنایا ہے۔ بایزید نے روہیلہ عوام اور خواص کی صحیح نبّاضی کی ہے۔ وہ روہیل کھنڈ کی دوسری جنگِ آزادی کے سپہ سالار مصطفیٰ خاں عرف بجّو خاں شہید (۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء) کے فیملی معالج تھے۔ انھوں نے بجّو خاں کے خاندان کے کئی افراد کا ذکر کیا ہے۔ بحثِ "حمّیات" میں لکھتے ہیں:۔

> "ایک مرتبہ بجّو خاں کو بخار آگیا۔ جو حکیم دوست محمد خاں کے علاج کے باوجود کافی عرصہ چلتا رہا۔ ایک روز بجّو خاں کے مصاحبین جمع تھے۔ جن میں محمد خاں جمعدار، بخشی مرتضیٰ خاں قلندر خاں جمعدار، مانڈی خاں جمعدار، بشارت اللہ امروہی، میر محمد قائم، میاں تفضل حسن خاں اور حکیم سیّد ضیاء الدین عبرت بھی شامل تھے۔ حکیم عبرت نے کہا کیا شہر میں اور کوئی طبیب نہیں ہے۔ جو خان صاحب کا علاج کر سکے۔ اس پر حکیم دوست محمد خاں نے فرمایا خان صاحب کے ٹھیک نہ ہونے کا سبب علاج کی خرابی نہیں۔ خان صاحب کی بدپرہیزی اور علاج میں تساہلی ہے۔"

بایزید کا خیال ہے کہ روہیلوں کو دوا تو پلائی جا سکتی ہے لیکن پابند پرہیز کرانا آسان نہیں۔ فضول کے ادبی لطائف میں نواب محمد یار خاں امیر اور حکیم کبیر علی کبیر انصاری سنبھلی کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ امیر اپنے عہد کے بہت بڑے رئیس تھے اور ان کی دولت کا بڑا حصہ اہلِ علم و فنکاروں کی خدمت میں صرف ہوتا تھا۔ سودا، مصحفی، قائم چاندپوری بھی ان کی دولت سے مستفید

ـتے رہتے تھے۔ بانیٔ پیا امرافتی چشم میں لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ امیر کی آنکھ میں سال کی لکڑی کا ایک ریزہ پڑ گیا۔ چونکہ حکیم کبیر مستقل تنخواہ دار ملازم تھے۔ انھوں نے علاج شروع کیا۔ پہلے محمد حیات جراح سے ریزہ نکلوایا۔ پھر زخم و ورم اور دیگر تکلیفوں کی دوا دی۔ جب امیر ٹھیک ہو گئے تو انھوں نے اس خوشی میں جشنِ صحت منعقد کیا اور اپنے اکثر مصاحبین کو جن میں سید حسن شاہ، میر ضیاء الدین عبرت، میر محمد قاسم شاعر میاں عزالدین وغیرہ شامل تھے، خلعت اور نقد و جنس سے نوازا۔"

لیکن حکیم کبیر کو بالکل نظرانداز کر دیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ ان کی مستقل ملازمت ہو۔ حکیم صاحب ـاس بات کو محسوس کیا۔ اور ذیل کی رباعی لکھ کر نوازی نامی خیاط کے ہاتھ نواب محمد یار خاں امیر کو بھیج دی۔

جنابِ عالی کرا آج غسلِ صحت کا ہر ایک ندیم کے تئیں عطر اور پان ملے
بجائے خلعتِ پارچہ و اسپِ عراق حکیم جی کو بھی کہتے ہیں تین تھان ملے

فصول کا یہ مخطوطہ تاریخِ طب، آخری عہدِ مغلیہ کی تہذیب اور حالاتِ روہیل کھنڈ سے ـچسپی لینے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔ اس قسم کے قیمتی مخطوطات کی اشاعت ہر طبقہ کے لیے ـید ہے۔ رام پور کے ملی ذخیرے میں اس قسم کے جواہر پارے اور بہت سی بیاضیں محفوظ ہیں۔

••

حوالے

۱- فصول فیض اللہ خانی ۔ فہرست فارسی مخطوطات فن طب نمبر ۱۳۸۶

۲- فصول فیض اللہ خانی ۔ نسخہ دہلی ہمدرد لائبریری تغلق آباد دہلی ۔ (یہ مصنف کی اصل کاپی ہے)

۳- تذکرہ کاملانِ رام پور از حافظ احمد شوق مطبوعہ ۱۹۲۹ء صفحہ ۷۶

۴- فہرست زرد فارسی قلمی صفحہ ۴۵ مرتبہ مولوی عبید اللہ بسمل و مہدی علی خاں طب نمبر ۲۲ سابق

۵- تاریخ آئینہ تصوف مولفہ شاہ محمد حسن صاحب صابری مطبوعہ ۱۳۱۱ھ صفحہ ۴۹۴

۶- حقیقت گلزار صابری ” ” ” ” مطبوعہ ۱۹۲۷ء صفحہ ۳۴۹

۷- پروفیسر محمد اسلم لاہوری کا تبصرہ "شریف التواریخ شاہی" برہان دہلی جنوری ۱۹۸۳ء

۸- شاہ دولہ کا تذکرہ رسالہ صاحبیہ مؤلفہ شہزادی جہاں آرا مرتبہ محمد اسلم لاہوری صفحہ ۶۱

۹- وقائع عبد القادر خانی مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری مطبوعہ علم و عمل ۱۹۶۰ء مرتبہ ایوب قادری صفحہ ۸۲

۱۰- اخبار الصنادید جلد اول مطبوعہ ۱۹۱۸ء مؤلفہ حکیم نجم الغنی خان صفحہ ۶۰۱

۱۱- اطبائے عہد مغلیہ از حکیم سید کوثر چاند پوری مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۸

۱۲- حیات حافظ رحمت خاں مؤلفہ الطاف حسین بریلوی مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۸۵

۱۳- مجمع الکرامات مرتبہ امام الدین صفحہ ۵۴

۱۴- فرزند غوث الاعظم از مینکش اکبر آبادی مطبوعہ ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۵۲

۱۵- منظومات جنگ درج بر مخطوطات فارسی وارد رضا لائبریری و صولت لائبریری

۱۶- کشکول مولوی لطیف رام پوری قلمی مملوکہ کتب خانہ مدرسہ فرقانیہ

۱۷- "الفرقان" الشیخ المحدث مولانا زکریا نمبر دسمبر ۱۹۸۲ء مضمون نور الحسن راشد

حکیم وسیم احمد اعظمی

رسالہ ارسطاطالیس ـ ایک تعارف

نام مخطوطہ:- رسالہ ارسطاطالیس، مصنف:- ارسطاطالیس، مترجم:- نامعلوم، ہینڈ لسٹ نمبر ۳۰۱۲، خدابخش، سائز:- ۱۰×۱۸، ۱۸×۲۴ سینٹی میٹر، سطور:- ۱۵ خط:- نستعلیق، کاتب:- نامعلوم، سنہ کتابت:- تقریباً تیرہویں صدی ہجری، کیفیت:- کرم خوردہ، عمدہ۔

آغاز:- ھذہ رسالۃ الذہا ارسطاطالیس فی دقائق الحکمۃ من الطب وغیرہ، وھی مشتملۃ علی اربعۃ وثمانین مسئلۃ، الخ

اختتام:- لم صار من بہ قواق اذا سمع خبر ایولمہ ویفزعہ سکن فواقہ؟ لان النفس اذا تحرکت تحرک معہا البدن واذا تحرک عرض، والحرارۃ بتحلل السبب المحدث للفواق۔

زیر تعارف مخطوطہ خدابخش لائبریری پٹنہ کے ایک طبی مجموعہ ہینڈ لسٹ۔ ۳۰۱۲ کے ضمن میں موجود ہے۔

مخطوطہ میں مترجم، کاتب اور سنہ کتابت وغیرہ کی توضیحات نہیں ملتیں۔

مصنف کی تحقیق: اس مخطوطہ کا مصنف واقعی طور پر ارسطو ہے یا یہ ارسطو کی کسی کتاب سے اخذ شدہ مواد ہے، اس کا جواب مخطوطہ کی ابتدائی عبارت کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہ ہوسکا۔

ھذہ رسالۃ الفہا ارسطاطالیس	نکتہ ہائے حکمت پر مبنی یہ رسالہ ارسطو نے

فی دقائق الحکمۃ من الطب وغیرہ وھی مشتملۃ علی اربعۃ وثمانین مسئلۃ

تالیف کیا تھا جو طب وحکمت سے متعلق چوراسی مسائل پر مشتمل ہے۔

یہ بھی پتہ نہیں چلتا ترجمہ یا ترتیب کس کی ہے اور کس زبان کی ہے۔ لیکن یہ خیال قائم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہے کہ یہ تصنیف اسی دور کی یادگار ہے جب حنین ابن اسحٰق مترجم دارالحکمۃ نے اپنے لڑکے اسحٰق اور داؤد کے لئے جالینوس کی بعض کتابوں کو سوال وجواب کے انداز میں ملخص کیا تھا۔

چونکہ یہ اس زمانے کا رجحان تھا اس لئے جالینوس کی طرح ارسطو کے نکات کو بھی ملخص کیا گیا۔ چنانچہ ذخیرۃ الاسکندریہ (ارسطاطالیس) بھی سوال وجواب کی شکل میں ارسطو کی تحقیقات کا مجموعہ ہے جس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بحوالہ کیٹلاگ جلد ۵ صفحہ ۲۲۴ و ۲۲۵ موجود ہے کیٹلاگ میں مجموعہ کے تمام رسائل کا اول وآخر مذکور نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ رسالہ ارسطاطالیس اسی مجموعہ میں سے ہو۔ مخطوطہ کی داخلی اہمیت:۔

فلسفہ، طب، طب عملی اور جنرل سائنس سے متعلق یہ چوراسی سوال وجواب نہ صرف پرکشش ہیں بلکہ آج کے دور میں بھی چونکا دینے والے ہیں۔

اس مخطوطہ میں بعض ایسے مسائل کا ادراک کرایا گیا ہے جن پر ہم اس لئے غور وفکر نہیں کرتے کہ وہ ہمارے روزمرّہ کے عادی مسائل ہیں۔ مثلاً (۱) حیوانات اناث میں صرف عورت اور چمگادڑ کو ہی حیض کیوں ہوتا ہے؟ (۲) تمام زبانوں میں آشوب چشم سب سے زیادہ کیوں عام ہے؟ (۳) موت ہونے پر سب سے پہلے آنتیں کیوں بگڑ جاتی ہیں؟ (۴) برف ٹھنڈا ہے تو اس سے بدن کیوں جلتا ہے؟ (۵) بخار میں پسینہ سے شفا اور غشی میں پسینہ سے ہلاکت کیوں واقع ہوتی ہے؟ (۶) راس الفخذ حق الورک سے ہٹ جانے پر کبھی بیٹھتی ہے اور کبھی نہیں بیٹھ پاتی، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ (۷) شہد شیریں ہے لیکن زخم میں سوزش کا احساس کیوں پیدا کرتا ہے؟ (۸) استسقا میں پیٹ پانی سے مملو ہونے کے باوجود پیاس کیوں لگتی ہے؟ (۹) گندہ دہن کو شراب نوشی کی حالت میں گندہ دہنی کیوں کافور ہو جاتی ہے؟ (۱۰) دیگر حیوانات کے بچے پیدا ہونے پر رینگنے لگتے ہیں، انسان کا بچہ ایک عرصہ بعد کیوں چلنا شروع کرتا ہے؟ (۱۱) جسے تشنج کا مرض ہو دوران بخار اس کا تشنج کیوں کافور ہو جاتا ہے۔ (۱۲) جب مرۃ سودا کی قے ہو تو مریض پر کیوں الٹا دیتا ہے؟ (۱۳) پیشاب بکثرت کے بعد پاؤں کیوں کانپ جاتے ہیں؟ (۱۴) دائرہ والے زخم

دیرے کیوں سندل ہوتے ہیں؟ (۱۵) عصبی یا دماغی چوٹ سے مرارہ کی قے کیوں آتی ہے؟ (۱۶) مرغ کا گوشت تمام گوشتوں میں زیادہ سریع الہضم کیوں ہوتا ہے؟ (۱۷) طحال والے کا ذائقہ کیوں خراب ہوتا ہے؟ (۱۸) آنکھ کے زخم میں صرف منقی دواؤں سے اندمال کیوں کر ہو جاتا ہے؟ (۱۹) دخت زدہ کو بو کا حس کیوں نہیں ہوتا؟ (۲۰) پانی جلد نہیں سڑتا ہے لیکن ترمیوے جلد سڑ جاتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ (۲۱) سر کے بل گر جانے سے آواز کیوں بند ہو جاتی ہے۔ (۲۲) آگ کا جلا نسبتاً دیر میں کیوں اچھا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

سوالات و جوابات میں موضوعاتی ترتیب موجود نہیں ہے مثلاً ابتدا میں جنرل سائنس کے چند سوال و جواب ملاحظہ ہوں۔

(۱) لم صار من غم یبکی۔

م ـــ لان الغم هو مرض الروح یکون بانقباضة وغورة الی داخل فاذا انقبض الروح متراجعاً نحو الدماغ عصر تعشیشاً من الرطوبات المحصورة فیه

(۱) غم لاحق ہونے پر آنسو نکل آنے کی وجہ کیا ہے؟

م۔ غم روحانی انقباض کے باعث واقع ہوتا ہے یہ انقباض دماغ کی جانب منتقل ہو کر دماغ میں محصور رطوبات کو نچوڑ دیتا ہے۔

(۲) لم صار من به عطش اذا دخل الحمام سکن عطشه ومن لا عطش به یعطش له الحمام۔

م ـــ لان من به عطش فلان بدنه ایبس یجذب الرطوبات من الماء الداخل بالمسام الخفیه ومن لا عطش به فلان بدنه ارطب یستفرغ بالعرق فیعطش۔

(۲) پیاس کی حالت میں حمام جانے پر پیاس بجھ جاتی ہے اور سیرابی کی حالت میں پیاس لگنے لگتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

م۔ پیاس میں بدن خشک ہوتا ہے۔ خشکی کے باعث حمام میں موجود رطوبت کو جذب کر لیتا ہے جس کے باعث پیاس بجھ جاتی ہے لیکن سیراب آدمی کا بدن مرطوب ہونے کے باعث مرطوب ماحول میں پہنچ کر عرق ریز ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اسباب مرض سے متعلق چند عبارتیں ملاحظہ ہوں:۔

(۳) لم صار اذا عرض للاصبع وجع تورم الحالب منه۔

ج ــــ لانه یکون حس الوجع فی الاصبع الذی فیه ورم الغالب اذا لم یکن طریق المشارکة للاعصاب التی تنحدر الی الرجل محضا یشتد به الاحساس لوجع الاصبع

(۴) لم صار ینال المرأة التی بها علة الرحم غشی ۔

ج ــــ لان الرحم عضو عصبی و یشارک فی العصبة المنحدرة والدماغ من حیث ینحدر الیه ۔

(۵) لم صار یتقدم الوباء اول ما یعرض فی اکثر الامر الرمد؟

ج ــــ لان الوباء انما یکون من فساد الهوا والهوا اذا فسد فانما یفسد الروح الذی فی البدن لانه اشد مشاکلة ولانه الطف و العینین خاصة من بین سائر الاعضاء اذ فیها ارواح کثیرة والطف واصفی فلذلک یکدر هذا الروح فیلحقها الرمد ۔

(۶) لم صار المستسقین بطونهم مملوءة من الماء یعطشون دائما؟

ج ــــ لان الماء الذی یشربونه لیس ینفذ فی المجری الذی یجب علی المجری الطبیعی الذی یجری الیها لکنه تیرشح الی حیث لا یجری فلذلک صار ینالهم العطش مثل لا ینال من لم یشرب الماء

(۷) لم صار من به تشنج اذا حدثت به الحمی سکن عنه التشنج؟

ج ــــ لان التشنج الذی یعرض للاعضاء انما هو من فضل رطوبة یجتمع فی الاعصاب ۔ فالحرارة تحللها والحمی حادة ۔

(۸) لم صار حمیات الربع اطول؟

ج ــــ لان الربع ما یتولد من مادة غلیظة والغلیظ ابطا استفراغا ۔

(۹) لم صار العصب اذا انقطع ورم اذا یبرا یکون احداثه للورم اقل؟

ج ــــ لانه اذا انقطع یبقی متصلا ببعض الاتصال فیمتد من اجل الثقل دو لیولم و بسبب الالم یمیل الیه المواد و یزید الورم واذا

تبرالم يقدده ولم يولم كثيرالم، ولهذا الك ايضا لا ينجذب اليه
مادة ولا يحدث فيه الورم -

(۱۰) لم صار اذا اثقبت المواضع التى فيها البهق الابيض والقوعنها
البرص لم يجرح منها الدم ؟

ج ـــــ لان حدوث هذه الامراض من خلط بلغمى ابيض فعلت
فى هذه المواضع ويحيل لون الدم واللحم الذين فيها الى لونه -

حاصل بحث :

یہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس مخطوطے کے مسائل کوئی نیا انکشاف ہیں لیکن یہ اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ کلیات کے ضخیم دفتروں میں بکھرے ہوئے مسائل کو چند صفحات میں جمع کر دیا گیا ہے۔

●●

حکیم شجاع الدین حسین ہمدانی

تحریم الدفن
(جالینوس کا ایک نادر مخطوطہ)
مختصر تعارف

جالینوس[1] کا یہ رسالہ جس کا ترجمہ قسطا[2] ابن لوقا نے "تحریم الدفن" کے نام سے کیا ہے، راقم الحروف کے آبائی کتب خانہ میں عرصہ سے محفوظ ہے۔ موجودہ سیمینار کے موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ صاحبان فن کو اس سے روشناس کرایا جائے۔

"سکتہ موت" تمام دنیا کے لیے ایک سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ یعنی مرض کی ایک مخصوص کیفیت ایسی بھی ہوتی ہے جس میں مریض کو مردہ سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ وہ زندہ ہوتا ہے۔ جالینوس کے مطابق ایسے مریض کو دفن کرنا حرام ہے۔

جالینوس نے غالباً سب سے پہلے اس امر کی نشاندہی کی ہے اور اپنی تحقیق "تحریم الدفن" کے ذریعہ معالجین کو متوجہ کیا ہے۔

رسالہ تحریم الدفن: ایک جائزہ:۔ مؤلف: جالینوس، مترجم: قسطا بن لوقا البعلبکی، سائز: کتاب - ۱۶ × ۲۴/۲ سنٹی میٹر حومتن - ۹ × ۱۷ سنٹی میٹر، سطور: تیرہ[13]

---

[1] اپنے عہد کا ایک نامور اور جلیل القدر حکیم تھا، یہ فن طب کے آٹھ اماموں میں سے آخری امام تھا، مشرقی ایشیا کے جزیرہ گیموس یا تارموسا میں ۱۳۱ء میں شاہ بیڈرمن کے عہد میں پیدا ہوا تھا۔ اس کی تصانیف کی تعداد تقریباً چار سو تک پہنچتی ہے۔ ۲۰۰ء میں فوت ہوا۔

[2] قسطا بن لوقا شام کے مشہور علمی شہر بعلبک کا رہنے والا تھا، اس کی پیدائش ۸۳۰ء کے قریب ہوئی، اور تقریباً ۹۱۲ء تک با حیات رہا۔ ابن ندیم کے قول کے مطابق یہ علم طب، فلسفہ، ہندسہ، ہیئت، حساب، اور موسیقی میں کامل مہارت رکھتا تھا۔ یونانی لسانیات کے عالم اور سریانی و عربی زبانوں کے ماہر کی حیثیت سے مسلم تھا۔

باقی ص ۲۲۱ پر

خط: نفیس عربی نسخ، سنہ کتابت: تحریر نہیں ہے تقریباً بارہویں صدی اور محمد شاہ بادشاہ کے دور کا معلوم ہوتا ہے، دوسرے نسخے: (۱) کتب خانہ دارالعلوم دیوبند (یوپی) (۲) ذاتی ذخیرۂ کتب حکیم سید ظل الرحمان علی گڑھ (یوپی) (۳) آصفیہ حیدرآباد (۴) رضا لائبریری رام پور

آغاز کی عبارت:۔ کتاب جالینوس الذی سماہ "تحریم الدفن" واخراج قسطا بن لوقا، قال جالینوس انی وصفت کتابی ھٰذا اربع مقالات المقالۃ الاولی.... الخ

اختتام کی عبارت: فاما انا فرغنا من المقالۃ الرابعۃ وھی آخر کتابنا فقد بلغنا ما یحتاج الیہ من غرضنا فلنکمل کتابنا ھٰذا بحمد ذی القدرات، تمت ھٰذہ الرسالۃ بعون الملک الوھاب۔

مخطوطہ کی داخلی اہمیت:۔ مخطوطہ کا موضوع موت سے مشابہ ان کیفیتوں کا بیان ہے جن میں انسانی جسم کو دفن کر دینا طبی اعتبار سے ممنوع ہے، کیونکہ ان پر موت کا تسلط نہیں ہوتا بلکہ سکتہ کی سی کیفیت ہوتی ہے، زندگی ان میں موجود ہوتی ہے۔ جالینوس کہتا ہے:

"روم میں بہت سے بادشاہوں اور عوام کو اس عارضہ کے نتیجہ میں کسی قدر عجلت پسندی کی وجہ سے قبل از وقت دفن کر دیا گیا" [۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ کا) بیت الحکمت کے ایک مترجم کی حیثیت سے حنین ابن اسحاق العبادی کے بعد اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس کی تصانیف اور دیگر زبانوں سے تراجم کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، ابن ابی اصیبعہ نے باسٹھ کتابوں کے نام بتائے ہیں (طبقات الاطباء ج ۱ ص ۲۴۴ و ص ۲۴۵) ابن القفطی نے تقریباً بائیس کتابوں کی نشاندہی کی ہے (تاریخ الحکماء ص ۳۶۲ فارسی ترجمہ) قاضی ابو القاسم صاعد ابن احمد الاندلسی نے پانچ کتابوں کا ذکر کیا ہے (طبقات الامم ص ۴۳ ۔ اردو ترجمہ) ابن ندیم نے چونتیس کتابوں کا نام لکھا ہے (الفہرست ص ۲۹۵) خیر الدین الزرکلی نے سولہ کتابوں کا تذکرہ کیا ہے (الاعلام ج ۶ ص ۳۰) ولیس معلوف الیسوعی نے متعدد تصانیف کے وجود کا اقرار کرتے ہوئے صرف دو تصانیف کا ذکر کیا ہے (المنجد فی الادب والعلوم) حکیم عبد الحئی کے خیال میں قسطا بن لوقا نے ترجمہ، شرح اور تفسیر کے علاوہ چونتیس مستقل کتابیں لکھی تھیں (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند ص ۲۰۵ ۔ اردو ترجمہ)

[۱] [illegible]

سکتہ کی بعض کیفیتیں موت سے اتنی مشابہت رکھتی ہیں کہ صحیح صلاحیت کے حکیم اور ڈاکٹر ہی امتیاز یقین کر پاتے، اس مخطوطہ میں ان کیفیتوں کی تفصیل اور ان کی علامتیں بتا کر انسان کو زندہ درگور ہونے سے بچانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ موضوع دلچسپ بھی ہے، کارآمد اور اہم بھی، نیز ہمارے جنگی حالات کو دیکھتے ہوئے اس موضوع کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

مصنف کی وضاحت :۔ جالینوس اور قسطا بن لوقا کے عہد میں تقریباً آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے اس لئے پیش نظر مخطوطہ جالینوس اور قسطا بن لوقا کی اصلی تصنیف نہیں ہے بلکہ قسطا بن لوقا نے جالینوس کے اس رسالے کو اپنے تشریحی اضافوں کے ساتھ متعارف کرایا ہے، چنانچہ مخطوطہ کی ابتدائی عبارت سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔

کتاب جالینوس الذی سماہ تحریم الدفن واخراج قسطا بن لوقا [1]	یہ جالینوس کی تصنیف جس کا نام "تحریم الدفن" ہے، اس میں قسطا بن لوقا کے اضافات شامل ہیں۔

مواد کی اہمیت :۔ تاریخی اعتبار سے زیادہ مخطوطہ کی اہمیت مواد کے اعتبار سے ہے، نہایت مختصر اور صاف ستھری تحریر، جس میں کوئی عبارت آرائی نہیں پھر اتنا اہم قیمتی اور مفید مطلب مواد، جو جالینوس کے زمانے میں جتنا کارآمد تھا آج بھی اتنا ہی ضروری اور کارآمد ہے۔

مخطوطہ چار مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ اپنے جلو میں معلومات کا ایک عظیم ذخیرہ رکھتا ہے تفصیل درج ذیل ہے۔

المقالۃ الاولی فیمن دفن من الاغماء وھو حی [2]	پہلا مقالہ ان افراد کے بارے میں ہے جو اغمار کی وجہ سے مردہ تصور کر کے دفن کر دیئے جاتے ہیں۔

اغمار دماغ میں پیش آتا ہے۔ جالینوس کہتا ہے:

یہ ایسی کیفیت ہے جس میں انسان چھ سات دن تک سکتہ کی حالت میں رہتا ہے، اغمار کی یہ قسم حواس میں اس قوت نفسانیہ کے رک جانے کے نتیجہ میں عارض ہوتی ہے جو قلب اور دماغ کے درمیان مربوط ہوتا ہے، یہ عوارض حجاب صدر کے

---

[1] تحریم الدفن ۔۔۔ ورق ۱ الف

[2] تحریم الدفن ۔۔۔ ورق ۱ ب

پھٹ جانے اور عروق قلب کے مسدود ہو جانے سے پیدا ہوتے ہیں جو ان مجاری میں اعصاب جلتے ہیں تو ان میں جذب ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے قلب کی حرکت بند ہو جاتی ہے۔ حرکت بند ہونے کی وجہ پشت کے پٹھوں مہرے سے پہنچنے والی قوت کا فقدان ہے، اور اسی طرح قوت نفس کا کوئی کام نہیں رہ جاتا۔ نتیجے کے طور پر قلب کی عروق پھیل جاتی ہیں اور کہیں سے بھی اس قدر حرارت بھی نہیں ملتی جو قلب کو متحرک رکھ سکے، گویا حرارت قلب میں رہ جاتی ہے اور ناواقف اطبا اس مخصوص کیفیت کو موت تصور کر لیتے ہیں اور دفن کرا دیتے ہیں۔[1]

غمار کی مذکورہ کیفیت کی وضاحت قسطا بن لوقا اس طرح کرتا ہے:

"شخص کی آنکھوں کا سیاہ حصہ ختم ہو جاتا ہے، پیشانی خشک ہو جاتی ہے۔ ناک زرد پڑ جاتی ہے، بعض اوقات سبز بھی ہو جاتی ہے، کان کی لو سخت ہو جاتی ہے، سانس بند ہو جاتی ہے اور نبض ڈوب جاتی ہے، قضیب سکڑ جاتے ہیں اور تمام کیفیتیں تقریباً وہی ہوتی ہیں جو حقیقی موت میں پائی جاتی ہیں"[2]

زندگی کی پہچان: — مذکورہ بالا کیفیت میں زندگی کی علامتوں کی شناخت کے لیے جس ایک طبی اور فنی مہارت کی ضرورت ہے وہ عام طور سے مفقود ہے۔ چند علامتیں درج ذیل ہیں:۔

۱۔ خصیوں کے درمیان اور احلیل میں موجود ہوا کو چھونے سے قریب کا احساس زندگی کا پتہ دیتا ہے۔

۲۔ معالج اپنی انگلی کو روغن نیلوفر میں ڈبو کر مریض کی دبر میں ایک تہائی تک داخل کر کے چھوڑ دے تو اس رگ کی حرکت کو محسوس کرے گا جو پشت کے قریب ہوتی ہے۔

۳۔ مریض کا چہرہ پشت کے مقابلے میں زیادہ سفید ہوگا اور ناخنوں میں سرخی کا اثر ہوگا۔

اس مقالہ میں زندگی کی علامتوں کی شناخت کے بعد موسم اور عمر کے اعتبار سے علاج کے مختلف طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

المقالة الثانية فيمن يدفن من   دوسرا مقالہ ان افراد کے بارے میں ہے جو خوف

---

[1] تحریم الدفن   ورق ۲، ب   [2] تحریم الدفن   ورق ۲، ب

وجع القلب من الرعب وهو فی (ورق-۳)	کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جن پر موت کا گمان ہوتا ہے اور وہ دفن بھی کر دیے جاتے ہیں۔

دوسرا مقالہ خوف کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے دردوں کی کیفیت، جس میں موت کا گمان ہوتا ہے، پر مشتمل ہے، مخطوطہ کے اس مقالہ کا دائرہ کار بہت وسیع ہے۔
اس عارضہ کا سبب سودا کی زیادتی اور قلب میں اس کا حد درجہ تغذیہ اور تیز اخلاط کا اندرونہ اجتماع ہے، جس کی وجہ سے قوت حیوانیہ وہاں تک نہیں پہنچ پاتی، چنانچہ

"متاثرہ شخص میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی لیکن مریض کا رنگ زندہ لوگوں کا سا معلوم ہوتا ہے اور ہاتھ پیروں کے روئیں اور بال کھڑے ہوتے ہیں اور زبان کے نیچے کی رگ بھی زندگی کا پتہ دیتی ہے" (ق ۴)

خوف کے نتیجے میں قلبی صدمات کی اور بھی کئی شکلیں اور علامتیں ہیں جن کو مصنف نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور اسباب اور زندگی کی علامتوں کو بتا کر علاج تجویز کئے ہیں۔

"مریض کو چہرہ کے بل لٹا دیں اور پیشانی یا دونوں کنپٹیوں (صدغین) یعنی جن مقامات پر عروق حملی پائی گئی ہوں ان میں لمبائی میں شگاف دیں، خون فوراً نکلنا شروع ہوگا جس سے قلب پر دباؤ کم ہو جائے گا اور روح حیوانی کو روکنے والے مواد جو قلب میں ہیں، تحلیل ہو جائیں گے اور مریض میں حرکت پیدا ہو جائیگی"
(ق ۵)

یہ چیدہ چیدہ اقتباسات ہیں جن کی پوری اہمیت اس وقت واضح ہوتی ہے جب اسے مصنف کی ترتیب کے ساتھ دیکھا جائے، ہر کیفیت کے متعدد علاج، مختلف عمروں کے اعتبار سے درج ہیں، ایک کیفیت کے مختلف اسباب، اور اسباب کی مختلف کیفیتیں بھی لکھی گئی ہیں، لیکن پورے مخطوطہ میں نہ کوئی پیچیدگی ہے نہ کوئی رطب و یابس۔

المقالۃ الثالثہ فیمن یدفن وھو حی من الغم المفرط والمفرح	تیسرا مقالہ ان افراد سے متعلق ہے جو غم مفرط یا زیادہ خوشی کے نتیجہ میں موت کی سی کیفیت سے دوچار ہوتے

المغسوط (ق - ٦)

ہوں اور انھیں زندہ درگور کر دیا گیا ہو۔

بقول جالینوس کے:

"اگر کسی مریض کو ایسے مرض کے نتیجہ میں دفن کر دیا گیا ہو جس میں حمی کے علاوہ
کوئی دوسری علت لازمہ نہیں پائی جاتی تھی اور اس کے دفن کے ۲۰، گھنٹے گذر
چکے ہوں تو ایسے شخص کو گویا زندہ درگور کر دیا گیا ہے۔" (ق - ۷)

اس طرح کی موت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، پہلا یہ کہ غضب، غم یا خوشی کا عارضہ تندرست انسان میں پیش آیا ہو یا کوئی دوسرا ایسا عارضہ جس کے نتیجہ میں قلب میں استغلاغ ہو کر روح حیوانی جسم میں معطل کر دی گئی ہو۔ ــــــ ایسے مریض کی تشخیصی علامت یہ ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں، مریض کو تاریک کمرے میں رکھ دیں اور چراغ کا فتیلہ مریض کے سامنے لائیں اگر چراغ کا عکس مریض کی آنکھوں میں دکھائی دے تو زندہ ہے ورنہ مردہ۔

مخطوطہ میں لکھا ہے کہ اسے کچھ واقعات بھی درج ہیں، مثلاً "قرماطاس" بادشاہ نے ناطوس نامی ایک فلسفی کو حیلہ سازی کے ذریعہ موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے اسقلاخارس المتطبب سے مشورہ کیا تو متطبب نے کہا:

"شہنشاہ اس شخص کو ایک تاریک مقام میں قید کر کے اچانک سورج کی
روشنی دکھائیں، تو مر جائے گا، بادشاہ نے اس کا انتظام کیا، اور فلسفی کے
ساتھ ۸۰ آدمی بھی رکھے گئے، اور انھیں ایک تاریک ترین غار میں قید کر دیا گیا،
جب دوپہر ہوئی تو اچانک غار کا منہ کھل گیا۔ سارے لوگ روشنی دیکھ کر گر پڑے،
لیکن فلسفی نے اپنی آنکھوں کو ڈھانک لیا اور آفتاب غروب ہو جانے کے بعد آنکھوں
کو کھولا، پھر ان اسّی مردہ تمام انسانوں کا علاج کیا اور ساٹھ (۶۰) آدمیوں کو بچا لیا، گویا
اسّی مردہ تصور کئے گئے انسانوں میں ساٹھ زندہ نکلے۔" ق - ۷

المقالة الرابعة فيمن يدفن وهو من قبل الادوية المخدرة السمية (ق - ۸)

چوتھا مقالہ ان افراد کے بارے میں ہے جو مخدر سمی دواؤں کو کھا لیتے ہیں اور ان پر موت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ دفن کر دیے جاتے ہیں۔

چوتھا مقالہ ان کیفیتوں کی تفصیل اور معالجہ پر مشتمل ہے جو زہریلی دواؤں کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہیں، کچھ دلچسپ علامات زندگی ملاحظہ ہوں:۔

"اس عارضہ میں مبتلا شخص بائیں طرف چہرہ کئے ہوگا عضو تناسل کے اندرون میں رگ متحرک ہوگی" (ق۔م)

ایک اور کیفیت:

"غذا اور کیموس قلب کی طرف مائل ہوجاتے ہیں جس کے نتیجہ میں قلب کے پردے بند ہوجاتے ہیں، اس کی علامت یہ ہے کہ متاثرہ شخص کی عروق بھری بھری (ممتلی) معلوم ہوتی ہیں، زبان کے نیچے کی رگ متحرک رہتی ہے۔" (ق۔م)

اس کا معالجہ یہ ہے کہ فوراً اس عرق کی فصد کھول جائے اور جب خون نکلنے لگے تو خونیز، حلتیت، فرفیون اور شحم حنظل کا طلا کیا ہوا کپڑا رکھا جائے، مریض فوراً اس کیفیت سے نجات پا جائے گا۔

بہر نوع مخطوطہ کی اہمیت، افادیت اور دلچسپی ثابت کرنے کے لئے مذکورہ بالا تعارف کا[illegible] ہے۔ یقیناً اس مخطوطہ کی ترتیب و تدوین اور اشاعت نہ صرف ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہوگی بلکہ[illegible] فن کو نہایت قیمتی مواد فراہم کرے گی۔

نائب سید محمد احمد

نجیب الدین سمرقندی کے مخطوطات

(احمد حسن کلیکشن جے پور میں)

ابوحامد محمد بن علی بن عمر جو کہ نجیب الدین سمرقندی کے نام سے مشہور ہے اور فخر الدین رازی کا معاصر ہے اور مشہور فاضل طبیب ہے جسے تاتاریوں نے فتح ہرات کے وقت ۶۱۸ھ مطابق ۱۲۲۲ء میں قتل کر دیا تھا۔

اس طبیب کی سب سے زیادہ مشہور کتاب "الاسباب والعلامات" ہے جس پر علامہ نفیس نے شرح لکھ کر مقام رفیع حاصل کیا ہے۔ اس طبیب کی اور بھی تصنیفات ہیں مثلاً رسالہ "تشریح العین" اور "کتاب السموم" وغیرہ لیکن مندرجہ ذیل پانچ تصنیفات زیادہ مشہور ہیں۔ اطباء میں محمد نجیب الدین سمرقندی کے نام سے متعارف ہیں۔

(۱) قرابادین نجیب الدین سمرقندی　　(۲) رسالہ فی اصول التراکیب

(۳) رسالہ الاغذیہ والاشربہ للاصحاء　　(۴) رسالہ الاغذیہ والاشربہ للمرضیٰ

(۵) الادویہ المفردہ

ان میں سے اس وقت چار مخطوطے پیش نظر ہیں ۱۔ قرابادین ۲۔ رسالہ فی اصول التراکیب ۳۔ رسالہ اغذیہ والاشربہ للاصحاء ۴۔ رسالہ ادویہ مفردہ

ان میں کی پانچویں کتاب رسالہ الاغذیہ والاشربہ للمرضیٰ مجھے نہیں مل سکی ہے اس لئے اس وقت ان چاروں مخطوطوں کا مختصر تعارف پیش کرتا ہوں۔

قرابادین نجیب الدین سمرقندی

سمرقندی مذکور کی مشہور تصنیف ہے اور بہت مفید اور کارآمد ہے۔ امراض کے اعتبار سے

اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ اولاً امراض راس جیسے صداع، فالج، لقوہ، پھر امراض عین امراض انف امراض اسنان امراض اذن امراض لسان امراض صدر و ریہ امراض قلب امراض معدہ امراض کبد و طحال امراض امعاء امراض کلیہ و المثانہ امراض ثدیین و الخصیتین و الذکر امراض نقرس و جع مفاصل و عرق النساء و علاج الحیات باقسام ہا امراض جراحات امراض شعر وغیرہ وغیرہ۔

ہر عنوان کے تحت مرکبات جیسے الاطریفلات جوارشات، سفوفات، معاجین، اضمدہ، نطولات وغیرہ وغیرہ کا بیان ہے۔

مخطوطہ مذکور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ علل و امراض کے لیے بہترین مرکبات کا انتخاب کیا گیا ہے۔ مرکبات کی تعداد نو سو نناوے ہے۔

اس قرابادین کا مخطوطہ ٹونک کے مشہور کتب خانہ میں بھی موجود ہے اور زیر پیش نظر مخطوطہ حکیم احمد حسن خاں صاحب ٹونکی حال مقیم جے پور کے کتب خانہ کا ہے بلکہ موصوف کے کتب خانہ میں اس کے دو مخطوطے موجود ہیں اور ان میں تھوڑا سا اختلاف بھی پایا جاتا ہے اور کتابت کی بھی بہت سی غلطیاں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ صاحب عیون الانباء نے سمرقندی کی دو قرابادین بتائی ہیں (۱) قرابادین کبیر (۲) قرابادین صغیر۔

لیکن موجودہ مخطوطوں میں مطلق قرابادین نجیب الدین سمرقندی لکھا ہوا ہے اور کبیر یا صغیر لکھا ہوا نہیں ہے۔ بہرحال اس کا فیصلہ تو سب مخطوطے دیکھنے کے بعد ہی ایک تحقیق ہو سکے گا۔

زیر مخطوطے کا سائز ۵ × ۱۰ اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحات ہیں۔

اس طرح شروع ہوتا ہے:

الحمد للہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین کتاب القرابادین علیٰ ترتیب العلل ادویۃ علل ۱۲ امراض۔

اس عبارت پر ختم ہوتا ہے:

وقد یسقی والنقاعی الذراریح مع دانق من العدس المقشر بماء فاترید ان نضج الذراریح فی الرائب یوما و لیلۃ و یستعمل ثلث مرات فیکون کا ...

الاغذیۃ والاشربۃ للاصحاء

یہ بھی نجیب الدین سمرقندی کا رسالہ ہے۔ زبان عربی ہے جس میں مصنف نے بہت تفصیل سے اغذیہ اور اشربہ سے بحث کی ہے۔ قدیم حکما بقراط اور جالینوس کے اقوال سے بھی استفادہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کس قسم کے مزاج والے شخص کو کس قسم کی غذا استعمال کرنی چاہیئے۔ جفاکش اور محنتی آدمیوں کو کس قسم کی غذا لینی چاہیئے اور آرام طلب اور کم محنت کرنے والوں کی غذا کیسی ہونی چاہیئے۔

جو اشیا انسان کے لئے غذا کے طور پر کام آتی ہے انھیں چھ قسموں پر منقسم کیا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے الاغذیۃ التی یتغذی بہا الانسان ستۃ انواع۔ الحبوب واللحمان والالبان والثمار والبیض والبقول۔ کہ غذائیں چھ طرح کی ہوتی ہیں۔ حبوب اور غلے۔ گوشت۔ دودھ۔ پھل۔ انڈے اور سبزیاں۔

پھر حبوب اور غلے کی پوری تفصیل اور کون کون سے حبوب کھانے میں غذا مستعمل ہیں اور کس عمر اور کس مزاج کے لوگ کب اور کس طرح کھا سکتے ہیں۔

اسکے بعد گوشت کا بیان ہے۔ تمام قسم کے گوشت بتائے ہیں جو کھانے میں استعمال ہوتے ہیں یا ہوسکتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تفصیل سے بتایا ہے کہ جانوروں کے گوشت کے کون کون سے حصے کیا کیا خصوصیات رکھتے ہیں۔ مثلاً دماغ، قلب، کلیجی وغیرہ وغیرہ۔

جانوروں میں اہلی جانوروں کا بھی ذکر کیا ہے اور صحرائی جانوروں کا بھی ذکر کیا ہے جو شکار کرکے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اور جن جانوروں کا گوشت انسانی صحت کے لئے مضر ہے اس کا بھی ذکر ہے۔

اسی طرح دودھ کس کس جانور کا کام آتا ہے۔ اور کب اور کس طرح پورے منافع اور مضار کے ساتھ۔ اس کے بعد پھلوں کا ذکر ہے پھر انڈوں کا اور سب سے آخر میں سبزیوں کا غرضکہ ہر نوع سے سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

چونکہ ہر غذا ہر انسان کے لئے مفید نہیں ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کے مزاج سے موافقت رکھتی ہو اور وہی غذا دوسرے شخص کے لئے مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہو۔ چنانچہ لکھتا ہے۔ قد یکون الغذاء الواحد ضاراً نافعا معاً مثلاً فانہ بنہضم فی الابدان الباردۃ فیصیر دما و فی الابدان الحارۃ الیابسۃ یستحیل صفراء کہ کبھی ایک ہی غذا

غذائیت پہنچانے والی بھی ہوتی ہے اور نقصان دینے والی بھی۔ دست آور بھی ہوتی ہے اور قابض بھی جیسے شہد کہ وہ ابدان باردہ میں بہت آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور خون بن جاتا ہے لیکن ابدان حارہ یا بر حی صفرا میں مستحیل ہو جاتا ہے

اور بعض غذائیں ایسی ہوتی ہیں جن میں متضاد قوتیں جمع ہوتی ہیں جیسے کرنب اور مسور کہ یہ ایسے اجزا سے مرکب ہیں جو متضاد قوتیں رکھتی ہیں کہ ان کا جرم تو قابض ہوتا ہے لیکن ان کا پانی دست آور ہوتا ہے۔ اور جب پانی کے ساتھ کھائی جائیں تو اگر طبیعت سریع الانطلاق ہو تو دست لاتی ہیں اور اگر طبیعت اس کے برخلاف ہو تو قبض کرتی ہیں ... اسی لیے غذائے واحد کسی شخص کی تندرستی میں ممد و معاون ہوتی ہے اور کسی کو اور بیمار کر دیتی ہے۔ جیسا کہ مصنف لکھتا ہے: ومثل الکرنب والعدس لانہما مرکبا الاجزاء فیہما قوتان متضادتان فماؤہما مسہل وجرمہما قابض ومتی اکلا مع ماءہما فان وجد الطبع سریع الانطلاق بالطبع اطلقا وان وجدا علی خلاف ذالک امسکا ..... ولذالک قد یوجد غذاء واحدا مصحا للبدن ومرضا للآخر۔

انسانی غذاؤں کے تفصیلی بیان کے بعد پانی کے ذکر اور تفصیلی بحث میں آتا ہے کہ پانی کی کتنی قسمیں ہیں اور کونسا پانی مفید ہے اور کونسا مضر ہے۔ پانی میں کیا کیا خصوصیات ہیں۔

خالص پانیوں کے ذکر کے بعد پھلوں وغیرہ کے پانیوں کا ذکر کرتا ہے۔ مثلاً انار کا پانی سیب کا پانی۔ انگور کا پانی وغیرہ۔

پانیوں کا بیان اس طرح شروع کرتا ہے قد جرت العادۃ بان یسمی کل ما یشرب شرابا والشراب بالحقیقۃ ہو الشیء الذی اذا طبخ لم ینعقد منہ شیء وصار جمیعہ بخارا ولم یبق لہ طعم او کیفیۃ اخری وشانہ ان یرقق الطعام ویہیئہ لہ مرکبا فقط کالماء فاما ما یبقی لہ ثفل او ینعقد منہ شیء اذا طبخ او لہ کیفیۃ اخری فہو الی الطعام اقرب منہ الی شراب وبالدواء شبیہ لماء کالالبان ورُبوب الفواکہ ومیاہہا وما یتخذ من الحبوب والثمار وان کانت ہی تیسر مسدّا فی بعض الاحوال ویقوم مقامہ فالماء ہو من الاشربۃ کما ہو سماہ اللہ تعالی شرابا وجعلہ قواما لکل ما انشاہ فی ہذا العالم وہو شرابا مشترکا لجمیع الحیوان الذی لا یستغنی عنہ شیء منہا فی قوام حیاتہ [illegible]

ے کام آتی ہے اسے اشربہ میں سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ اصل اشربہ وہ چیز ہے کہ جب آگ پر پکائی جائے
سب کی سب بخارات بن کر اڑ جائے اور اس کے کچھ بھی اجزا جم کر ثفل نہ بن جائیں اور نہ اس میں مزا ہو نہ
دوسری کیفیت۔ اس کا کام یہ ہو کہ وہ غذا کو پتلا کرے اور یہ صفت صرف خالص پانی میں پائی جاتی ہے
بلکہ جس چیز میں پکانے پر ثفل باقی رہے یا کچھ اجزا جم جائیں یا اس میں کوئی دوسری کیفیت پیدا ہو جائے
وہ اشربہ کے بجائے غذا اور کھانے کے زیادہ قریب ہو جاتی ہے اور پانی کے مقابلہ میں دوا سے زیادہ
قریب ہو جاتی ہے۔ جیسے دودھ، رب، فواکہ اور میووں پھلوں اور حبوب کے پانی تو یہ اگرچہ بعض
کام پر خالص پانی کے قائم مقام ہو سکتے ہیں لیکن اصل پانی جو کہ اصل اشربہ ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے
سب کا نام دیا ہے اور جس سے اس عالم کی پیدا کردہ ہر چیز کا باعث قوام بتایا ہے اور جو کہ انسان، حیوان ہر ایک
پینے کی چیز ہے جس سے کوئی بھی مستغنی نہیں ہو سکتا وہ صرف خالص پانی ہے۔

اغذیہ اور اشربہ کے تفصیلی اور سیر حاصل بیان کے بعد مصنف مذکور مشمومات اور خوشبوؤں کا
ذکر کرتا ہے کہ خوشبوئیں تقویت اور غذائے روح میں داخل ہیں۔ مشمومات کے فوائد دلائل سے ثابت
کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ فلذالک رای الاطباء ان یستعینوا فی حفظ الصحۃ واعادتھا
بالمشمومات والمشموم تاثیر عجیب فی الابدان والانفس۔ اسی لئے اطبا نے حفظ
صحت اور اعادہ صحت کے سلسلہ میں مشمومات سے مدد حاصل کی ہے کہ مشمومات عجیب تاثیر رکھتے ہیں۔
ابدان اور انفس کے لیے۔ اور لکھتا ہے کہ والعلیل انے تقویۃ طبیعتہ بالروائح الطیبۃ
احوج من الصحیح کہ بیمار اپنی طبیعت کی تقویت کے لئے مشمومات اور خوشبوؤں کا زیادہ ضرورتمند
ہے تندرست کے مقابلہ میں۔

مصنف مذکور اغذیہ اشربہ اور روائح کے تفصیلی بیان کے بعد شہد، سرکہ اور سکنجبین کا بیان
کرتا ہے۔

زیر نظر مخطوطہ بس یہاں تک ہی ہے اور رسالہ بالکل ختم نہیں ہوا ہے بلکہ عبارت ادھوری رہ گئی
لیکن چونکہ جن عنوانوں پر یہ رسالہ مشتمل ہے وہ سب ہی پورے ہو چکے ہیں۔ اس لیے خیال کیا جاتا ہے
کہ صرف آدھا صفحہ ہی باقی بچا ہے پھر بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ زیر نسخہ ناتمام ہے لیکن یہ مخطوطہ چونکہ
کتب خانہ میں نایاب ہے اور دوسری کتب خانوں میں بھی مل جائے گا جس سے یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

ہمیں اس رسالہ عجیبیہ کے تعارف سے مقصود یہ ہے کہ یہ رسالہ ایسا ہے جسے ہر طبیب کو پڑھنا چاہیئے۔ اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا ہے۔ اگر عربی سے اردو ترجمہ کرکے شائع کیا جائے تو بہت مفید ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ فی زمانہ ہمارے اطباء خاص طور سے جدید نوجوان اطباء اور آئندہ ہونے والے اطباء عربی زبان سے بہت حد تک نابلد ہیں بلکہ فارسی سے بھی کماحقہ واقفیت نہیں رکھتے اس لیے ہمارے لئے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم قدیم طبی ذخیرہ کو عربی اور فارسی سے اردو میں منتقل کریں اور اس طرح قابل استفادہ بنائیں۔

کل پٹنہ پہنچنے کے بعد پھلواری شریف جانا ہوا تو وہاں خانقاہ مجیبیہ کی لائبریری دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا تو معلومات میں اس طرح اضافہ ہوا کہ ہم نے دیکھا کہ وہاں اس کا فارسی ترجمہ موجود ہے اور یہ ترجمہ تراب علی ابن سید علی کریم رضوی بلگرامی نے ۱۲۵۷ھ میں کیا ہے جو کہ ۱۲۹ صفحات پر مشتمل ہے اور غالباً آخر سے مکمل نہیں ہے۔

ہمارے پیش نظر مخطوطہ جسے مطالعہ کرکے یہ تعارف پیش کیا نہ مولوی حکیم احمد حسن خاں صاحب ٹونکی حال مقیم جے پور کے کتب خانہ کا ہے۔

یہ رسالہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے: الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولنا المصطفیٰ وآلہ اجمعین وبعد فان اللہ تعالیٰ لما خلق نوع الانسان اعدل مزاجا من جمیع الحیوانات وجعل ذالک الاعتدال عریضا غیر محصور فی حد ضیق فخالف اختلاف صورهم وطبائعهم وامزجتهم واخلاقهم بخلاف سائر الحیوانات وجب ان یکون اغذیتهم بنفسه کثیرة الاصناف۔

اور یہ عبارت اس کی آخری عبارت ہے: الفقاع۔ قد تغیر اسم اتخاذ الفقاع عما کان فی القدیم لانهم قد اتخذوه من خبز الجواری ومن الارز ومن دقیق الشعیر فاما ان اکثروا فیه من الافادیة ولذالک وصف فریق منهم وهم المکثرون بانه حار یابس۔

رسالہ اصول تراکیب

یہ رسالہ ادویہ مرکبہ اور ترکیب ادویہ مرکبہ کے سلسلہ میں نجیب الدین سمرقندی مذکور کی تصنیف

...

ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ دو دوا سے مرکب کی کب اور کس حالت میں ضرورت ہوتی ہے اور کس طرح۔
جب ایک دوا کو دوسری دوا سے ترکیب دی جاتی ہے تو ان میں کن کن امور کے خیال کی ضرورت
ہے اور اس کے اصول و ضوابط کیا ہیں۔

یہ رسالہ بھی عربی زبان میں ہے اور ۱۹ بابوں پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اشربہ اور ربوب میں دوسرا
معجون اور جوارشات میں تیسرا حبوب و ایارجات میں چوتھا مطبوخات اور نقوعات میں پانچواں حقنہ
اور شیافات میں چھٹا ادویات مقیات میں ساتواں لعوقات میں آٹھواں اقراص میں نواں سفوفات میں
دسواں اطلیہ اور ضمادات میں گیارہواں روغنیات اور ادھان میں بارہواں ادویہ عینیہ کشیافات،
ذرورات، ذرورات، قطورات میں تیرہواں مراہم و رذرورات میں چودھواں سنونات میں پندرہواں
غرغرے میں سولہواں مربیات میں سترھواں سعوطات عطوسات بخورات اور شمومات میں اٹھارہواں
حمولات میں انیسواں ادویہ شعر میں۔

ہماری معلومات کی حد تک یہ رسالہ اب تک طبع نہیں ہوا ہے اور اس لائق ہے کہ اردو میں ترجمہ
کر کے طبع کیا جائے۔

زیر نظر مخطوطہ سائز ۵½ × ۱۰ کے صفحات ۵۸ پر مشتمل ہے اور حکیم مولوی احمد حسن صاحب
ٹونکی مقیم بجے پور کے کتب خانہ کا ہے اور یہ مخطوطہ ٹونک کے مشہور کتب خانہ میں بھی موجود ہے۔ پھلواری
شریف کی خانقاہ مجیبیہ میں بھی بہت اچھے خط میں ابوالحسن ابن ابوالغازی کا ۹۵۳ھ کا مکتوبہ موجود ہے
یہ مخطوطہ اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی خیر البریۃ محمد وآلہ الطیبین
الطاہرین قال العلامۃ نجیب الدین السمرقندی قدس اللہ روحہ العزیز ان
الواجب علی کل ذی لب ان یتقرب الی اللہ تعالی ویتوسل اللہ بکل ما تیسر لہ
من القربات وحسنی الوسائل۔

رسالہ ادویہ مفردہ

یہ بھی نجیب الدین سمرقندی کا عربی زبان میں رسالہ ہے جس میں صفات و خواص ادویہ مفردہ کا
بیان حروف ابجد کی ترتیب سے ہے مثلاً حرف الف میں اکلیل، آس، اقاقیا، اسقیل وغیرہ وغیرہ

حرف با میں بلسان بعض بلاد حرف جیم میں جنطیانہ جوز ہندی غرضیکہ خواص ادویہ بہت بہتر طریقہ سے بیان کئے ہیں اور اس کے بعد ــــــــ اور یہ مسہل کا تفصیل سے بیان ہے کہ کون کونسی دوا کس مقدار تک مسہل ہے اور اس میں کیا منافع اور کیا مقدار ہیں اور کس مزاج میں کونسی دوائے مسہل استعمال ہو سکتی ہے۔ ادویہ مسہل ۲۹ ذکر کی گئی ہیں اور ادویہ مفردہ کل ۴۰ ذکر کیا ہیں۔ یہ رسالہ اس لائق ہے کہ اردو میں ترجمہ ہو کر شائع ہو۔

جو مخطوطہ میرے پیش نظر ہے وہ حکیم احمد حسن خاں صاحب مفتی کے کتب خانہ کا ہے جس کا سائز ۱/۲ ۵ × ۸ اور ۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔

اوّل اس طرح ہے:

"الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ علی نبیہ محمد وآلہ اجمعین ذکر الادویۃ المفردۃ المستعملۃ وخواصہا وافعالہا الخاصۃ بہا المنسوبۃ الیہا المشہورۃ بہا۔"

آخر اس طرح ہے:

"لو انشر مع قشرۃ زعصر بالید مع شحمہ واخرج ماءہ اخرج الصفراء وینبغی ان یکون المعتصر منہ الحلو والحامض معاً لانہ ابلغ فی الاسہال ولطیفۃ الحرارۃ واللّٰہ اعلم بالصواب۔"

(۲)

ٹونک کے چند اہم مطب اور رسالے

مطب حکیم سید علی حسن صاحب امروہوی

یوپی کا وہ مقام جہاں طب یونانی کے ماہر و اعلیٰ حکیم پائے جاتے تھے۔ اسی شہر کے ایک نہایت فاضل و کامل تھے جسے علمی دنیا میں حکیم سید علی حسن امروہوی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو خاندان سادات کے فرد فہیم اور حکیم بزرگ تھے جسے مسلم ریاست ٹونک راجپوتانہ میں بزمانہ نواب ابراہیم علی خاں صاحب رئیس چہارم بطور طبیب خاص اور بیماران شہر کے طبیب بنے رہنے کا بہت طویل زمانہ تک

ٹونک میں قیام کا وقت ملا ہے جن کا مطب کثرت رجوعات کے سبب نہایت مشہور تھا۔

حکیم سید علی حسن صاحب امروہوی حکیم سید نثار علی صاحب کے صاحبزادے تھے (جن کا مطب۔ قرابادین، رسالہ امراض نسائی اور طریق مطب مخطوط موجود ہیں)۔ ان کے اجداد میں حکیم سید غلام عسکری ابن حکیم سید الٰہی بخش اللہ ابن مولوی سید محمد ابن سید شاہ میر وغیرہ ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم صاحب امروہوی کا خاندان پشتوں سے طبی خاندان تھا۔

حکیم صاحب کے بہت شاگرد و تلامذہ تھے۔ خاص طور سے ہمارے حقیقی نانا حکیم مولوی قاضی عبدالحلیم صاحب بھی تھے اور مطب حکیم سید علی حسن صاحب مذکور موصوف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

مطب حکیم صاحب مذکور بہت اہم مطب ہے اندر شکل قرابادینی امراض کی ترتیب سے مرتب و مدون ہے اور چند بابوں پر مشتمل ہے جیسے امراض سر۔ امراض چشم۔ امراض اذن و انف وغیرہ وغیرہ۔

ہر باب میں مرکبات معمولہ۔ اطریفل۔ حبوب۔ سفوف۔ معجون۔ ضماد۔ طلا۔ مطبوخ اور نقوع وغیرہ وغیرہ کا ذکر ہے اور مجرب و معمول نسخے درج ہیں۔ اس زمانہ کی روش کے حساب سے ترکیب نسخہ فارسی زبان میں ہے۔ مطب مذکور اب تک چھپا نہیں ہے۔ میرے خیال میں اہم مخطوطہ قابل اشاعت ہے۔

زیر نظر مخطوطہ سائز ۷ × ۴½ انچ ہے۔ صفحات ۳۱۲ ہیں اور حکیم مولوی عبدالحلیم صاحب مذکور کے دست مبارک سے لکھے ہوئے مخطوطے سے خود میرا نقل کردہ ہے۔

مخطوطہ مذکور اس طرح شروع ہوتا ہے:

"ایارج فیقرا نافع بلغوہ ز فالج و استرخاء و تمامی امراض سر و ثقل زبان و وجع مفاصل و درد معدہ و قولنج۔"

اور اس عبارت پر ختم ہوتا ہے۔

معجون معصفر جہت صفا خون و سودا و بلغم و جوشش سر نافع و سر جادہ اطفال وغیرہ نافع مجرب۔ حمولات پوست ہلیلہ زرد پوست ہلیلہ کابلی پوست ہلیلہ ہلیلہ سیاہ آملہ منقے شاہترہ کشنیز خشک گل معصفر برنج ملی برگ حنا صندل برگ سنا ہر یا گلوئے سبز زیرہ سفید کشمش سبز برابر ہمہ عسل خالص دو چند بدستور مرتب سازند و بقدر مناسب استعمال کنند و تا یک نیم تولہ بخورند۔

مطب ہفت روزہ

طب یونانی کا وہ نادر و مفید مخطوطہ ہے جسے آج سے تقریباً ایک صدی پہلے ترتیب دیا گیا تھا۔ جس کے مطالعے سے کامیاب علاج کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ مرض کی تشخیص کا سراغ ملتا ہے۔ تجویز نسخہ کا ڈھنگ جانا جاتا ہے۔ "مطب ہفت روزہ" کا تعلق حکیم سید علی حسن صاحب امروہوی سے ہے جن کے مختصر حالات مطب علی حسن صاحب کے ضمن میں پہلے ذکر کئے ہیں۔ چونکہ آپ کا مطب کثیر الرجوع تھا اور آپ کے مطب میں خواص و عوام کا جمگھٹا رہتا تھا۔ خداوند تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی تھی مطب میں نسخہ نویسی کا کام حکیم صاحب موصوف کے ذریعہ فارغ شدہ حکما انجام دیتے تھے اور صاحبانِ علم و حکمت اس ذاتِ گرامی سے وابستگی اپنے لئے حصولِ کمال کا ذریعہ سمجھتے تھے جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی اس وقت اس سردارِ طب کے مطب میں متعدد طلبا نسخہ نویسی کی خدمت انجام دیتے تھے جن میں حکیم محمد صاحب، حکیم مہدی میاں اندوری۔ حقیقی نانا حکیم مولوی قاضی عبدالحلیم صاحب وغیرہم حضرات ہیں جو اس مطب کی بدولت اپنے وقت کے مشاہیر شمار ہوتے ہیں۔ قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مشہور علمی دینی اور طبی خانوادے کے فرد تھے جو پیڑیوں اور نسلوں سے علم سے مالا مال رہا ہے۔ حکیم صاحب کے عالم دین فاضل طبیب اور صاحب قلم شاگرد نے مطب کی حاضری کے دوران اپنے حصہ میں آئے ہوئے اور لکھے ہوئے مریضوں کے نسخے مع حالات مرض اپنے اس رسالہ میں جمع کئے ہیں لیکن یہ صرف سات روز تک یہ سلسلہ چلا ہے اور مطب مذکورہ میں صرف سات دن کے مریضوں کے حالات و نسخے درج ہیں۔ اس لئے اس مطب کا نام ہی ہفت روزہ رکھ دیا ہے۔

۵۰ صفحات میں مختلف النوع ۱۱۲ بیماریوں کا علاج بتاتے ہیں جن میں تقریباً ایک صد مرکب نسخہ جات درج ہیں۔ آج کے زمانے میں جوش دینے بھگونے اور مرکب تیار کرنے کی زحمتوں کا استعمال بارِ گراں ہے۔ اس الجھن و پریشانی کو دور کرنے کا عمل اس امروہی قاضی کے مطب میں سو سال پہلے مطلوبہ الکمال نظر آتا ہے۔ یکم جمادی الاوّل ۱۳۱۲ھ روز شنبہ سے یہ رسالہ شروع ہو کر سات دن پورے ہوتے ہی ۷ جمادی الاول بروز جمعہ ختم ہو جاتا ہے۔ موسم گرما کے امراض عموماً اور دیگر موسموں کے بیماریاں اس وقت میں علاج پذیر ہوئی ہیں۔ فساد خون اور سوداوی امراض کا کامیاب علاج کیا گیا حوالی و غیر حوالی کے استعمال کو روکا گیا ہے۔ حمل کو اسقاط سے بچا کر ولادت کا وقت تک پہنچانے کو عمل میں لایا

[illegible]ہے۔ آتشک، جریان، سوزاک، اورام احشاء، وجع المفاصل، مزمن، حمّی مرطوبہ، بلغمی، ضعف دماغ [illegible] دستقاء، ضعف بصر، فالج، شقہ، شقیقہ، حصبہ، جدری، اسہال اور دیگر خطرناک بیماریوں کو ختم کر کے [illegible] صحت سے ہم کنار کیا گیا ہے۔

اس رسالہ میں مفید، مجرب و مزمل نسخہ جات جنہیں لوگوں نے مخفی کیا ہوا تھا بے کم و کاست [illegible]دیا ہے۔ شربت زرشک کیوڑہ والا۔ شربت زرشک تمری۔ شربت گاؤزبان۔ شربت نزلہ بارد۔ [illegible]شربت گوندی۔ کاڑھا خس والا۔ کاڑھا بجیٹھ والا۔ کاڑھا چھالوں والا۔ نوشدارو جدواری۔ دوائے اتاقیا۔ دوائے معجزہ معجون میاں البدن خاص نسخے ہیں۔

زیر نظر مخطوطہ کا سائز ۷×۱۰ اور صفحات ۷۵ ہیں۔ مرتب رسالہ حکیم قاضی عبدالحلیم [صا]حب کے دست مبارک سے لکھے ہوئے مخطوطہ سے میرا خود کا نقل کردہ ہے۔

اس طرح شروع ہوتا ہے:

"بعد حمد و صلوٰۃ فقیر عبدالحلیم کمترین شاگردان مولانا و مرشدنا جناب حکیم سید علی حسن صاحب مدظلہ [illegible]مر بوی می گوید دریں جزو زمان کہ تاریخ یکم جمادی الاول ۱۳۱۲ ہجری ہست"۔

ختم اس طرح ہوتا ہے:

"روز چہارم ما ء الجبن ۱۰ ماشہ شربت سکنجبین ۱۵ ماشہ روز پنجم ماء الجبن ۱۵ ماشہ شربت سکنجبین ۱ تولہ بدستور واللہ اعلم [بالصواب] و علمہ اتم۔"

کمالی بیاض موسوم بہ مطب حکیم سید دائم علی خاں صاحب

ٹونک کے مشہور حکیم الامت ہند حکیم سید برکات احمد صاحب کے خاندان کی مشہور بیاض ہے جو [کما]لی بیاض کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بیاض حکیم صاحب کے والد حکیم سید دائم علی صاحب نے جمع کی تھی اس [کے] بعد حکیم سید برکات احمد صاحب نے کافی اضافہ کر کے قرابادین کی شکل میں تیار کیا جس میں ان کے صاحبزادے [ح]کیم سید محمد احمد صاحب عرف حکیم محمد میاں نے چند نسخوں کا اضافہ کیا اور اس کے نسخے ایسے معمولات [بن گ]ئے کہ حکیم سید صاحب کے پاس جو بھی اطبا مطب میں فارغ ہوتے حکیم صاحب اس بیاض کی نقل کی [ا]نہیں اجازت دیتے اور وہ اس بیاض کی نقل کر کے اپنے اپنے شہروں میں لے جاتے اور اس سے مطب [چلا]تے۔ اس لئے اس زمانہ میں اسے خاص شہرت حاصل ہو گئی۔ چونکہ حکیم صاحب کے تلامذہ کا سلسلہ

پورے ہندوستان بلکہ بیرونِ ہندوستان، افغانستان و ایران وغیرہ تک پھیلا ہوا تھا۔

زیرِ نظر مخطوطہ کا سائز ۶½ × ۸½ ہے تقریباً ۴۵۰ صفحات پر مشتمل ہے جیسا اس زمانہ میں رواج تھا نسخہ کی ترکیب فارسی زبان میں ہے۔ حروفِ تہجی کی ترتیب سے اطریفلات، معجونات، سفوفات، لبوبات، حبوبات وغیرہ کے ہزاروں معمول مطب نسخے درج ہیں۔

علامہ حکیم سید برکات احمد صاحب کے شاگرد حضرت حکیم مولوی عرفان صاحب نے حکیم صاحب سے فراغت کے بعد حکیم صاحب کی اجازت سے اصل نسخہ سے نقل کیا اور حسبِ دستور سابق جب میں نے حضرت موصوف سے فراغت طب حاصل کی جو رشتہ میں میرے حقیقی ماموں بھی ہوتے تھے تو مجھے بھی اس بیاض کی نقل کی اجازت ملی۔ زیر نظر یہ بیاض نسخہ ہے جو خود میں نے اپنے قلم سے نقل کیا ہے اس بیاض میں بہت سے نسخے ایسے ہیں جن میں مادہ کا اشارہ ہے۔ یہ نسخے بہت مجرب و کامیاب ہیں۔

اس بیاض میں جتنے نسخوں میں جن کے نام آئے ہیں وہ یہ ہیں:۔

۱ حکیم عزیز اللہ خاں مرحوم والد حضرت حکیم ذکاء اللہ خاں ۲ حکیم شریف خاں ۳ داؤد انطاکی ۴ حکیم علوی خاں ۵ حکیم ارشد ۶ حکیم غلام نجف خاں ۷ حکیم نور عالم خاں ۸ حکیم میر ماشاءاللہ خاں ۹ مولوی نجف صاحب ۱۰ حکیم عبدالہادی صاحب شاہجہاں آبادی ۱۱ میر نادر علی ۱۲ پریم عطار ۱۳ حکیم غلام نقشبند خاں ۱۴ شیخ محمد یار دہلوی ۱۵ سید شیر محمد خاں ۱۶ حکیم عسکر علی خاں شہید ۱۷ شیخ الرئیس ۱۸ حکیم محمد رضا ۱۹ حکیم فتح اللہ خاں ۲۰ عابد سرہندی ۲۱ حکیم قدرت خاں ۲۲ حکیم محمد ارزانی ۲۳ حکیم نقی لاہوری ۲۴ خواجہ میر درد ۲۵ حافظ داؤد خاں ۲۶ حکیم واصل خاں ۲۷ حکیم شرف الدین خاں ۲۸ ثابت ابن قرہ ۲۹ محمد زکریا ۳۰ جالینوس ۳۱ حکیم سکندر علی ۳۲ اشرف یار خاں ۳۳ حکیم بھیروں سنگھ ۳۴ مولانا شمس الدین و دیسلی ۳۵ حکیم عماد الدین ۳۶ حکیم صادق علی خاں ۳۷ حکیم جلال الدین ۳۸ حکیم انور علی صاحب (۳۹) حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی ۴۰ حکیم نور عالم ۴۱ حکیم سعد اللہ گیلانی ۴۲ حکیم نصیر الدین ۴۳ والد حکیم شریف خاں ۴۴ حکیم محمد جعفر مرحوم اکبر آبادی۔

اس بیاض میں جن کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱ شرح عابد سرہندی ۲ علاج الامراض ۳ معمولات حکیم صادق علی خاں ۴ قرابادین جلالی

۵ قرابادین کبیر ۶ شرح حکیم علی گیلانی ۷ ———— ۸ معالجات قانون ۹ ـــ
بیاض قدیم ۱۰ تالیف قدما ۱۱ منہاج ۱۲ قانون ۱۳ مخزن الفوائد ۱۴ ذخیره
۱۵ مجربات معتمد الملک ۱۶ ———— ۱۷ قرابادین حکیم علوی خان ۱۸ دستور الاطبا،
۱۹ طب حکیم کاظم علی خان ۲۰ سدیدی ۲۱ ذخیرہ اکبرشاہی ۲۲ طب ہندی ۲۳
طب شہریہ ۲۴ شفاء الاسقام ۲۵ مفید الاجسام ۲۶ خلاصة الطب ہندی ۲۷ قرابادین قادری
۲۸ طب اکبر ۲۹ مجربات حکیم داؤد انطاکی ۳۰ قرابادین عربی علوی خان ۳۱ جمع الجوامع
۳۲ بیاض ۳۳ تحفہ ۳۴ کتاب الایسر ۳۵ مجموعہ ۳۶ قرابادین کرامت الشفا ۳۷ قرابادین
قادری ۳۸ ترویح ۳۹ گنج بادآورد ۴۰ معالجات حسینی ۴۱ قرابادین قلانسی ۴۲ حفظ صحت
۴۳ مجربات حکمائے قدیم ۴۴ مجربات قدیمی ۴۵ بیاض بعض حذاق ۴۶ زاد غریب ۴۷
شرح قرابادین قانون ۴۸ طب شاہی ۴۹ حاوی کبیر ۵۰ طب اکبر ۵۱ قرابادین معصومی
۵۲ جامع ابن بیطار ۵۳ قرابادین ابن تلمیذ ۵۴ شرح اسباب والعلامات ۵۵ تالیف
مولانا شمس الدین رودیلی ۵۶ تذکرہ ۵۷ معدن ۵۸ ذکائی ۵۹ غنا منی ۶۰ مجموعہ بقائی
۶۱ کامل الصناعة۔

کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے:

"علم الکتاب مرکبات کہ در سر مستقل می شوند طریقہ نسخ تالیف حکیم ذکاء اللہ خان در
دفع خفقان حار دفع بخارات صاعدہ از معدہ و مراق و تقویت دل و معدہ"

اختتام اس طرح ہے:

"یاقوتی مفرح بارد معتدل، از قرابادین قادری یادداشت تغیر مروارید بدسوخت کہربائے
شمعی یاقوت سرخ یشب سبز الی آخرہ"

••

حکیم علیم الدین بلخی

ادویہ تریاقیہ پر ایک نادر مخطوطہ

تحفۂ سلیمانی

تعارف رسالہ : زیر بحث و نظر رسالہ جس کا نام "تحفۂ سلیمانی" ہے ایک اہم اور نادر مخطوطہ ہے، جو دار المطالعات بلجیہ فتوحہ پٹنہ کی زینت ہے۔ یہ کسی قدر کرم خوردہ ہے مگر اس کی ضروری اور کارآمد عبارتیں باسانی پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے اوراق سفید اور دبیز ہیں۔ اس کا حجم طول ۷ ۱/۲ انچ اور عرض ۴ ۱/۲ انچ ہے۔ اوراق کی تعداد ۱۴ ہے۔ یہ رسالہ ایک اور ماقبل کے رسالہ سے وابستہ اور جڑا ہوا ہے جس کا نام "عین الحیوٰۃ" ہے۔ چونکہ دونوں رسالوں کا کاغذ اور روشنائی ایک ہی ہے اور اوراق کی تعداد بھی دونوں رسالوں کی کل ملا کر (جو ایک ساتھ مجلد ہیں) ۱۷ ہے، قدیم خط میں لکھی ہوئی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ دونوں رسالے ایک ہی کاتب کے دست قلم کے مرہون منت ہیں۔ ہر دو رسالوں کا خط پاکیزہ اور نستعلیق ہے۔ دونوں رسالوں کا مصنف ایک ہی ہے جس کا نام محمد ہاشم بن محمد طاہر طہرانی ہے۔

ندرت رسالہ : مذکورہ بالا دونوں رسالوں میں سے بحیثیت "تحفۂ سلیمانی" کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ یہ رسالہ قدیم ترین نسخوں میں سے ہے جس کی طباعت ابھی تک عمل میں نہیں آئی ہے۔ مصنف نے شروع رسالہ میں حمد و صلوٰۃ اور چند تمہیدی کلمات کے بعد اس رسالہ کو ایران کے مشہور بادشاہ شاہ سلیمان صفوی الموسوی کے نام سے ہدیہ پیش کرتے ہوئے اس کی مقبولیت کی درخواست کی ہے اور اس رسالہ کا سن تصنیف ۱۰۷۹ھ لکھا ہے، جو بقول مصنف "تحفۂ سلیمان" (تحفہ آخر کلمہ میں تا کے ساتھ) کے اعداد سے نکلتا ہے۔ شاہ سلیمان صفوی کا دور ۱۰۷۷ھ سے ۱۱۰۵ھ تک کا ہے۔ اس رسالہ پر کاتب کا نام درج نہیں ہے۔ مگر سنہ کتابت ماقبل کے منسلک رسالہ "عین الحیوٰۃ" پر اس طرح درج ہے :

"این رسالہ موسوم بعین الحیوٰۃ در روز یکشنبہ ہشتم ماہ ذیقعدہ الحرام سال ششم از عشر دہم، بعد از الف از ہجرت نبوی علی مہاجرہا الف الف الثنا و التحیۃ سمت

صورتِ اتمام پذیرفت" (یعنی ۸ ذی قعدہ ۱۰۹۶ھ)

مصنف کے سالِ تصنیف، رسالہ کے سنِ کتابت، اور شاہ سلیمان صفوی کے دور کو غور کرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تینوں سنہ ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہیں اور سال پر جبکہ کاتب کا نام درج نہیں ہے اور پھر سنہ تالیف اور سنہ کتابت کے درمیان صرف ۷ ماہی سال کا فرق ہے تو کیا عجب کہ یہ رسالہ خود مصنف ہی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بھی ہو۔ اس رسالہ کے دیگر نسخوں کا سراغ مجھے ٹھیک طرح پر نہیں مل سکا۔ صرف دو نسخوں کا علم ہو سکا ہے۔ ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔ مگر اس پر سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ اور دوسرا نسخہ انڈیا آفس لندن میں ہے، جس پر سنہ کتابت ۱۱۲۹ھ لکھا ہوا ہے، جو بہرحال زیرِ بحث نسخہ کے بعد ہی کا ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے مصنف کے حالات کا پتہ تلاش و تفحص کے باوجود نہ مل سکا۔ انڈیا آفس کے کیٹلاگ میں اس مصنف کے متعلق صرف "ایران کا ایک طبیب" لکھا ہوا ہے۔

اہمیتِ رسالہ: (۱) مصنف نے جدوار اور فادِ زہر سے متعلق اس رسالہ میں بحث کرتے ہوئے سببِ تالیف یہ بیان کیا ہے:

"ادویہ تریاقیہ میں کوئی اور دوا ان کے مقابلہ کی نہیں ہے۔ اور ان دونوں دواؤں کے بعد مومیائی کا بھی درجہ ہے مگر افسوس ہے کہ ان ادویہ پر فارسی زبان میں ایسا کوئی رسالہ موجود نہیں ہے جس سے خواص و عوام سب ہی مستفید ہو سکیں۔ اس لئے میں اس رسالہ کو انہیں نفع پہنچانے اور ثوابِ دارین حاصل کرنے کے لئے لکھ رہا ہوں"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں اس موضوع پر یہ پہلا نفع بخش رسالہ ہے۔

(۲) مصنف نے اس رسالہ میں مستند ماخذ کے بھی حوالے دیئے ہیں۔ چنانچہ شیخ الرئیس بو علی سینا کی "القانون" یحییٰ بن جزلہ کی "منہاج البیان" ابن بیطار کی "کتاب الجامع فی الادویۃ المفردہ" شیخ یوسف بغدادی کی "جامع بغدادی" ابن التلمیذ کی "المغنی" وغیرہ جیسی اہم کتابوں کے جا بجا حوالاجات دے کر رسالہ کو بہت وقیع اور اہم بنا دیا ہے۔

(۳) مصنف نے بعض بعض مقامات پر ذاتی تجربات بھی بیان کیے ہیں چنانچہ ایرانی جدوار کے سلسلہ میں "کندہ حدیبیہ" اور ہندی جدوار کے سلسلہ میں "نیز بعضے از جدوار ہندی ما بر این

وصف دیده و تجربہ نمودہ نفع واثر تمام اندادملاحظہ کردہ" یا بعض دوسری دواؤں کے سلسلہ میں "من مکرر تجربہ کردہ" یا "اکثر اینہا بہ تجربہ معلوم شدہ" وغیرہ جیسے جملے تحریر کر دیے ہیں جن سے پوری طرح یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی بہت سی باتیں ذاتی تجربات و مشاہدات پر مبنی ہیں، نہ کہ سُنی سنائی باتوں پر۔

مشتملاتِ رسالہ: مصنف نے اپنے رسالہ کو تین بابوں پر مشتمل قرار دیا ہے۔

(۱) **پہلا باب:** جدوار کے بیان میں جس کی مندرجہ ذیل فصلیں ہیں۔ (۱) جدوار کی حقیقت و ماہیت اور مزاج کے بیان میں۔ (۲) جائے پیدائش کے بیان میں اور اس سے متعلق اختلاف کا ذکر۔ (۳) جدوار کے نیک و بد سے متعلق۔ (۴) اس کے اصلی ہونے کی شناخت کے متعلق (۵) اس کے ان خواص کے متعلق جو زہروں کے تریاق ہیں (۶) اس کے ان خواص کے متعلق جو قلب کے لئے مفرح و مقوی ہیں۔ (۷) دیگر افعال و خواص کا ذکر۔ (۸) جدوار کے ذریعہ کسی افیون کے عادی کو افیون چھڑانے سے متعلق۔ (۹) بیش کے متعلق (جس کا اہم تریاق جدوار ہے)۔ (۱۰) بیشِ موش کے متعلق۔

(۲) **دوسرا باب:** فادر زہر کے بیان میں جو پانچ فصلوں پر منقسم ہے:۔ (۱) فاد زہر کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم کا ذکر (۲) فادر زہر حیوانی کی تمام قسموں اور منافع کا بیان (۳) فادر زہر معدنی کے متعلق (۴) حجر الحیّۃ کا ذکر (۵) نارجیل دریائی کا ذکر۔

(۳) **تیسرا باب:** مومیائی سے متعلق ہے جس کی تین فصلیں ہیں:۔ (۱) مومیائی کی اقسام کا ذکر (۲) اس کے نیک و بد کا ذکر (۳) اس کے افعال و خواص کا ذکر۔

اس جگہ اس مختصر سے مقالہ اور مختصر سے وقت میں ہر ایک باب اور ہر ایک فصل پر تفصیلی بحث ممکن نہیں۔ اس لئے چند خاص باتیں جو اخذ کر سکا ہوں وہ پیش خدمت ہیں۔

(۱) **بیان جدوار:** اس باب سے متعلق خصوصی امور تلخیص کے ساتھ ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ اس لفظ جدوار کو زَددار (فارسی) کا معرّب بتاتے ہوئے اور دیگر مختلف نام گناتے ہوئے مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ اسے ہندی میں "نِربِسی" اس لئے کہتے ہیں کہ یہ "دافع سم" ہے جو اس لفظ کا بعینہ ترجمہ ہے۔ نیز بیش کے قریب ہی جدوار پیدا ہوتی ہے جو بیش کی خصوصی تریاق ہے۔

(۲) سعد کوفی اور بیش سے اسے شکلاً مشابہ قرار دیتے ہوئے ہر سہ ادویہ کے شناختی فرق کو بہت ہی تفصیل سے بیان کیا ہے۔

(۳) صاحب منہاج البیان، صاحب تقویم الابدان اور شیخ الرئیس بو علی سینا کے اقوال کی تائید کرتے ہوئے اسے درجۂ سوم میں گرم و خشک قرار دیا ہے۔

(۴) منبتِ جدوار کو بیان کرتے ہوئے مصنف نے سب سے بہتر خطائی (علاقہ چین) کو قرار دیا ہے۔ اس کے بعد تبتی اور پھر اس کے بعد ہندوستانی کو۔ اپنے علاقہ کی خراسانی جدوار کو بھی مصنف نے استعمال کیا ہے مگر اسے عمدہ قرار نہیں دیا ہے۔ اس جگہ مصنف نے سختی سے اس خیال کی بھی تردید کی ہے کہ بیش کا پودا چونکہ جدوار کے قریب ہی اُگتا ہے اس لئے جدوار اس مقام کے بیش کے سمی افعال کو بے اثر یا کمزور بنا دیتا ہے۔

(۵) اصلی و نقلی جدوار کے فرق کو بہت ہی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ نقلی جدوار جو رنگ بڑھا کر یا دوسری مشابہ جڑیں جو بازاروں میں اصلی کے نام پر بیچی جاتی ہیں ان کے امتحان کا طریقہ بھی بتا دیا گیا ہے۔

(۶) اہم ترین اور سب سے زیادہ تفصیلی بحث جدوار کے افعال و خواص سے متعلق ہے۔ مصنف لکھتا ہے کہ یہ بالخاصہ مفید ہے اور صورت نوعیہ سے اثر کرتی ہے۔ اس لئے یہ ہر قسم کے سموم میں خواہ وہ حار ہوں یا بارد نافع ہے۔

یوں تو مصنف نے اس کے بہت سے منافع گنائے ہیں اور کئی تجرباتی نسخے مختلف بزرگوں کے ساتھ متعدد امراض میں پیش کیے ہیں۔ مگر دو مواقع میں اس کے استعمال کو بہت ہی زیادہ نفع بخش قرار دیا ہے۔ ایک تو اس کو ہر قسم کے سموم خوردہ نیز عقرب گزیدہ و مار گزیدہ اور دوسری قسموں کے کرم گزیدہ وغیرہ کے لئے نافع بتایا ہے۔ نیز وبائی امراض و فساد و عفونت ہوا کے موقعوں پر بطور حفظ ماتقدم اس کے استعمال کو مفید قرار دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ جدوار کو امراض قلب میں نہایت ہی نفع بخش قرار دیا ہے اور اس جگہ شیخ الرئیس کی کتاب "ادویہ قلبیہ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ زہر خوردہ کے اثرات کو یہ دوا اس لئے بھی زائل کرتی ہے کہ یہ انسانی حرارتِ غریزی اور قوتِ حیوانی میں مزید طاقت بہم پہنچاتی ہے۔ یعنی ایک جانب یہ بالخاصہ

دافع سموم ہے تو دوسری جانب قلب و نبض کو بھی ساقط ہونے سے روکتی ہے۔ امراض دماغیہ میں بھی اس دوا
مفید قرار دیا ہے۔ جیساکہ لکھتا ہے کہ ــ" مرض ادوام الصبیان میں میں نے ذاتی اور متعدد تجربوں کے ذریعہ
اسے مفید پایا ہے"۔

(۷) مصنف نے جدوار کے ذریعہ کسی افیونچی کی افیون کی عادت چھڑانے کی ترکیب بھی لکھی ہے۔ پھر
فصل میں ایک بحث ضمناً بیش پر بھی اس لئے کردی ہے کہ جدوار کے قریب میں بیش کا پودا اُگتا ہے جس کا
تریاق جدوار ہے۔

(۲) **بیان فادزہر:** اس باب میں فادزہر حیوانی اور فادزہر جمادی دونوں کو علیحدہ
کیا گیا ہے۔ پورے مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج ہے:

(۱) بقول مصنف فادزہر حیوانی یوں تو مختلف جانوروں کے شکم سے نکالا جاتا ہے لیکن ان
بھی سب سے بہتر حجر التیس ہے۔ یعنی جو بکرے کے شکم سے نکالا جاتا ہے اور ان میں بھی سب سے عمدہ
ہے، جو مصنف کے وطن علاقہ شبانکارہ میں پایا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد فادزہر گاؤ ہے۔ یہ
فادزہر جانوروں کے پتوں اور تھنوں میں ہوتا ہے۔ مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر اوائل میں شکم سے
نکال لیا جاتا ہے، تو وہ صحیح وسالم رہتا ہے۔ ورنہ پھر بعد میں کرم خوردہ ہو کر نکلتا ہے، جو ناقابل استعمال
ہو جاتا ہے۔

(۲) فادزہر حیوانی مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا ہے۔ جو مقام اور وضع کے لحاظ
سے خاص خاص شکل و رنگت اختیار کر لیتا ہے۔

(۳) فادزہر کے اصلی و نقلی ہونے کی شناخت پر بھی مصنف نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

(۴) فادزہر حیوانی کے متعلق اس کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ بہت سے سموم کا تریاق ہونے کے
باوجود اگر اس کو بے محل اور بے موقع اور عمر و موسم کا خیال نہ کرتے ہوئے زیادہ مقدار میں یا زیادہ
دنوں تک دیا جائے تو یہ مہلک بھی ہو سکتا ہے۔

(۵) فادزہر معدنی جسے زہر مہرہ خطائی کہتے ہیں، متعدد قسموں کو بیان کیا ہے۔ افلاطون
ارسطو، ابن جلجل، بغدادی اور زکریا رازی کی کتابوں کے حوالوں سے یہ بتاتا ہے کہ یہ مختلف رنگ
کا پایا جاتا ہے۔ بعض مور کے پر کی طرح بھی خوشنما ہوتا ہے، مگر سب سے بہتر وہ ہوتا ہے جس کا رنگ

زرد اور کچھ سیاہی مائل ہو، اور وہ چین، تبت یا کشمیر کے علاقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ نیز وہ نرم ہو، دھوپ میں رکھنے سے اس سے کسی قدر پانی چھوٹے، بلکہ دھوپ کی تپش سے وہ ملائم بھی ہو جائے۔

(۶) یوں تو فاد زہر حیوانی کے متعلق یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ فقیر کے استعمال میں برابر آچکا ہے۔ مگر وہ زیادہ زور فاد زہر معدنی ہی کے استعمال پر دیتا ہے اور یہ لکھتا ہے کہ تمام قسم کے سموم مفردہ و مرکبہ حیوانیہ، نباتیہ اور معدنیہ کے لئے تریاق ہے۔ بلکہ بعض متقدمین کے اقوال کو نقل کرتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے کہ ان کے خیال میں زہر مہرہ تمام تریاقات سے بڑھ کر ہے۔

(۷) ضعف قلب میں اور بعض دیگر امراض میں اسے وہ مفید قرار دیتا ہے۔

(۸) اس کی انگوٹھی کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ جو شخص اپنی انگشتری میں اس کا نگینہ رکھتا ہے، زہر آلود کھانا کھانے کے بعد زہر کا اثر اس پر کمتر ہو جاتا ہے اور ایسا شخص بچھو کے ڈنک سے بھی محفوظ رہتا ہے، بلکہ بچھو اس کے پاس بھی نہیں جاتا۔

(۹) ایک اور فصل میں حجر الحیّہ جسے سانپ کا مہرہ کہتے ہیں، کی خاصیت و منفعت کو بھی تریاقی بتاتا ہے۔ مگر اس کے متعلق اپنی کوئی رائے نہیں دیتا ہے کہ یہ پتھر واقعی سانپ کے سر سے نکلتا ہے یا کسی اور جگہ سے۔

(۱۰) ایک چھوٹی سی فصل "نارجیل دریائی" سے متعلق بھی ہے۔ اس دوا کو مصنف نے نہ صرف ہیضہ میں مفید بتایا ہے بلکہ دیگر سموم میں بھی اس کے استعمال کو تریاقی بتاتا ہے اور آب و ہوا کی مضرتوں کو دور کرنے کے لئے بالخصوص اسے نفع بخش قرار دیا ہے۔

(۳) **بیان مومیائی** :- اس عنوان کے تحت مومیائی کی قسموں اور اس کے افعال کو مختلف فصلوں میں بالتفصیل پیش کیا ہے۔ جس کا ملخص ذیل میں درج ہے :

(۱) پہلی قسم معدنی کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ یہ قیر سے مشابہ ہوتی ہے۔ جس میں زفت کے جیسی بو آتی ہے۔ یہ پہاڑوں کے شگافوں اور دروں سے نکل کر اور بہہ کر ایک مقام پر جمع ہو جاتی ہے۔ سب سے بہتر دارابی اور اس کے بعد اصفہانی ہوتی ہے، ایک خاص مقام کا ذکر بھی مصنف کرتا ہے کہ جہاں سے ہر سال ۱۵ مثقال (ایک مثقال = ۴½ گرام) حاصل کی جاتی ہے۔ مگر اب وہاں سے صرف ۷۰ مثقال حاصل ہوتی ہے۔ مصنف اس خصوص میں لکھتا ہے کہ میں خود تو اس جگہ پر نہیں گیا ہوں مگر ایسے ثقہ اور قابلِ اعتماد

لوگوں سے سنا ہے جو وہاں جا چکے ہیں اور جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس مقام کو دیکھا ہے۔ معدنی مومیائی کے مزاج پر بحث کرتے ہوئے اور مختلف مصنفین کے اقوال پیش کرتے ہوئے وہ اپنا فیصلہ یہ دیتا ہے کہ حق یہ ہے کہ مومیائی درجہ دوئم کے آخر میں گرم اور درجہ دوئم کے اوّل میں خشک ہے۔

(۲) دوسری قسم حجری مومیائی کو بیان کرتا ہے۔ اس کے بارے میں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یہ خاص طرز پر پتھروں کے چٹانوں سے نکالی جاتی ہے۔ اس لئے اسے بھی پہلی ہی قسم میں شامل کرنا چاہیئے۔

(۳) تیسری قسم کی مومیائی جو انسانی لاش سے حاصل کی جاتی ہے اس کو وہ بیان کرتا ہے کہ یہی وہ مومیائی ہے جسے لوگ "قبوری مومیائی" بھی کہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ آج سے ہزاروں برس قبل مصری اور رومی سلاطین کی لاشوں میں کچھ ادویہ مثلاً شہد اور صبر سقوطری اور کچھ دوسری ادویہ جن کا مجھے علم نہیں، لگا دی جاتی تھیں جن کی بنا پر لاشیں متعفن نہیں ہوتی تھیں اور محفوظ ہو جاتی تھیں۔ پھر مصنف لکھتا ہے کہ اس قسم کی دواؤں کا نام انھوں نے "ادویہ شریفہ الہیہ" رکھ چھوڑا تھا۔ اس "قبوری مومیائی" کے متعلق آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ "لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا اثر و فائدہ معدنی مومیائی سے بڑھ کر ہے۔ حالانکہ مردہ انسانوں کی کھال، گوشت، ہڈی کسی مصرف کے لائق نہیں۔ نہ داخلی نہ خارجی۔ یہ تو نہایت ہی نقصان دہ ہے۔ لوگ چھپے چوری بڑی بڑی قیمتوں کے عوض اسے بیچتے ہیں جبکہ اس کا کوئی فائدہ ہی نہیں اور یہ حرام الگ ہے۔" پھر مصنف لکھتا ہے کہ اس "قبوری مومیائی" کا کچھ حصہ جس میں مختلف اعضاء کے اجزا تھے۔ میں نے خاص مکہ معظمہ میں خریدے تھے۔ میں نے اسے استعمال بھی کیا مگر مجھے ذرہ برابر بھی اس سے فائدہ محسوس نہیں ہوا۔" مصنف پھر لکھتا ہے کہ "اس قسم کی ادویہ کے متعلق عام تصور تھا کہ چونکہ یہ "ادویہ الہیہ" ہیں اس لئے ان کے استعمال سے بہت بڑی طاقت و قوت حاصل ہوتی ہے اور عمر میں درازی بھی آتی ہے۔ دراصل یہ عقیدہ نومسلم یہودیوں، نصاریٰ اور مجوسیوں نے مسلمانوں میں پھیلا رکھا ہے۔ یہ وہ نومسلم ہیں جن کے اسلام لانے کے بعد بھی ان کے عقائد میں تبدیلی نہیں آئی ہے اور یہ اپنے دین پر قائم ہیں۔

اس جگہ مصنف اس انسانی مومیائی کو بھی بیان کرتا ہے جو کسی زمانہ میں تیار کی جاتی اور جس کا ذکر مختلف قدیم کتب و رسالوں میں ملتا ہے۔ مصنف اس عجیب و غریب تیار کردہ مومیائی کے متعلق لکھتا ہے کہ پہلے زمانہ میں کسی ایسے جوان کو جو خوبصورت اور سرخ ہوتا تھا اور اس کے بال بھی سرخ اور آنکھیں نیلگوں ہوا کرتی تھیں، اژدھا سانپ سے سارے اعضا میں ڈسوا کر متورم بنا لیا جاتا تھا اور پھر اس کے مردہ ہو جانے

کے بعد اس کی لاش میں مُصبر سقوطری اور شہد مل کر اسے کسی شیشہ کے تابوت میں رکھ کر اس کا ڈھکن مضبوطی سے بند کر دیتے تھے اور ۴۰ سال کے بعد اس لاش کو مومیائی کے کام میں لاتے تھے۔ درمیان میں بھی ۱۲، ۱۳ برسوں پر لاش میں دوائیں دیا کرتے تھے۔

مصنف نے اس جگہ ان لاشوں کا ذکر نہیں کیا ہے جو گرم خطوں اور ریگستانی علاقوں میں قدرتی مومیائی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یا وہ جانور جو زمین کے اندر مومیائی کی صورت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مومیائی گلیکہ (گٹے کی مومیائی) جن کا استعمال بھی دوا کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اس مصنوعی مومیائی کا بھی ذکر نہیں کیا جو خاص طور پر بھلانواں، عنبر، مشک اور آدمی کے سر کے بال کو تیل میں پکا کر تیار کی جاتی ہے اور وہ ویدک نسخوں سے ماخوذ ہے اور ان دونوں یہی مومیائی اصلی کے نام سے بازاروں میں بکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس طرح کی مصنوعی مومیائی ایران میں رائج نہ ہو۔

مصنف نے مومیائی کے اصلی و نقلی ہونے کی شناخت کے کئی طریقے درج کیے ہیں۔ ان میں سب سے مشہور طریقہ یہ درج کیا ہے کہ کسی مرغ کی ٹانگ کو کسی قدر توڑ کر اسے کچھ مومیائی کھلا دی جائے اور کچھ شکستہ ہڈی کے مقام پر لگا کر مالش کر دی جائے۔ اگر ۲۴ گھنٹے کے اندر اس ہڈی کی شکستگی جاتی رہے اور مرغ کی ٹانگ پھر حالت اصلی پر آ جائے تو مومیائی اصلی ہے ورنہ نقلی۔ بلکہ بعض اوقات تو کل چھ، سات گھنٹوں ہی میں مرغ کی ٹانگ درست ہو جاتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ مومیائی بہترین ہے۔

چند لائق توجہ امور: اس جگہ کتاب کی تاریخی و فنی حیثیت کو بیان کر دینے کے بعد میں بعض بات چاہتا ہوں کچھ اپنے ذاتی و ناقص خیالات جو اس رسالہ کے مطالعہ سے حاصل ہوئے ہیں وہ چند سطروں میں پیش خدمت کر دوں:

(۱) مصنف نے جدوار کو شیخ الرئیس بوعلی سینا کی کتاب "ادویہ قلبیہ" کے حوالہ اور بعض دیگر اکابر مؤلفین کی کتابوں کے حوالوں سے نیز ذاتی تجربوں کی بنیاد پر امراض قلب میں اعلیٰ درجہ کی مفید دوا بتایا ہے اور بعد کے ہندوستانی قابل اعتماد اطبا نے بھی اسے فشار قلب میں نافع لکھا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے کہ یہ قلب کے کن کن امراض میں مفید ہے؟ اگر یہ فساد قلب میں مفید ہے تو اسے فشار الدم قوی (HIGH BLOOD PRESSUS) اور فشار الدم ضعیف (LOW BLOOD PRESSUSE) دونوں ہی میں مفید ہونا چاہیئے۔

(۲) جدوار کو مصنف نے امراض دماغیہ میں بھی مفید بتایا ہے اور دوسری مستند کتابوں میں بھی

نزلہ وزکام میں نفع بخش قرار دیا گیا ہے۔ وہ نزلہ وزکام جو ورم غار الانف (SINUSITIS) کی وجہ سے ہو جاتا ہے اور جس کا علاج مزمن صورتوں میں بذریعہ عمل جراحی کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر بھی تحقیق کی جائے کہ جدوار ورم غار الانف (SINUSITIS) میں مفید ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس عاجز کے ہاتھ بعض مزمن نزلہ وزکام کے مریض جو کسی اطریفل یا جوشاندہ کے نسخوں سے شفایاب نہیں ہوئے ہیں وہ حب جا جشمہور قرابادینی مرکب دوا ہے' اسے دینے سے صحت یاب ہوئے۔

(۳) زہر مہرہ کو تمام سموم کا تریاق بتایا ہے اور اسے قلبی امراض کے لئے خصوصی دوا بتایا ہے' اگر استعمال ہم محلول شکل میں تو کرتے چلے آئے ہیں' مگر ضرورت ہے کہ ہم اس کا مکلس (کشتہ) بھی استعمال کریں اور اس کو عام کر کے دیکھیں کہ یہ کس حد تک سریع النفوذ اور سریع التاثیر ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بہت ہی افسوسناک امر ہے کہ ہمارے یہاں علاجی دواؤں — CURATIVE MEDICINES کی تو کوئی کمی نہیں ہے مگر وقائی (PROVENTIVE MEDICINES) کا ذکر ہماری کتابوں میں یا تو سرے سے ہے ہی نہیں' یا ہے بھی تو وہ نہیں کے برابر ہے۔ اس دور میں جبکہ بہت سے وبائی امراض (EPEDIMIC DESEASES) میں جراثیم کے ٹیکوں (VACCINES) سے کام چلایا جاتا ہے اور جن کی افادیت سے انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ضرورت ہے کہ مصنف نے جس طرح جدوار' زہر مہرہ اور نارجیل دریائی کو حفاظتی ادویہ (PREVENTIVE MEDICINES) بتایا ہے اور تنہا ان کے علاوہ کو مرکب نسخوں' تریاق فاروق اور تریاق مثرودیطوس سے بڑھ کر وبائی امراض کے زمانہ میں بتایا ہے ضرورت ہے کہ ہم بھی وقائی حیثیت سے ان دواؤں کے استعمال کو اپنی تحقیق کا موضوع بنائیں۔

● ●

جناب سیّد ریاض علی پرواز

امان اللہ خاں فیروز جنگ کی طبّی تالیفات

(سترہویں صدی عیسوی)

سولھویں صدی عیسوی ہندستان کی علمی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ مغل حکمراں شوق جہانبانی کے ساتھ ساتھ مختلف علوم و فنون کی ترویج و اشاعت کا بھی خصوصی ذوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلیہ دور حکومت شروع ہونے کے ساتھ ہی فن طب میں تحقیق و تلاش کے نئے باب کھلنا شروع ہوئے۔ اس دور کے دانشور، علماء اور مترجمین نے صرف فارسی و عربی ماخذ پر ہی تکیہ نہیں کیا بلکہ قدیم ہندستانی اطباء کے کارناموں کو بھی پیش نظر رکھا اور چرک، شاناق، واگبھٹ وغیرہ کے طبّی و علمی ذخائر کا فارسی میں ترجمہ کیا کیوں کہ فارسی اُس زمانہ کی سرکاری زبان تھی۔ اس طرح طب یونانی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ نہ صرف یہ کہ عوام نے اس فن کی طرف توجہ کی بلکہ درباری اُمراء اور اس وقت کی دیگر اہم شخصیتوں نے بھی طبّی کتب کا عمیق مطالعہ کیا اور تالیف و تصنیف کی طرف توجہ مبذول کی۔ اُس زمانہ کو تراجم کا زمانہ کہنا مناسب ہوگا۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغل حکومت کے زیر سایہ بہت سی ممتاز طبّی شخصیتیں ہندستان کی سرزمین میں پیدا ہوئیں اور اپنے علمی کارناموں کی بدولت زندہ جاوید ہوگئیں ایسی ہی لافانی طبی ہستیوں میں حکیم امان اللہ خاں کا نام شامل ہے۔

اس کا پورا نام مرزا امان اللہ خاں بہادر فیروز جنگ مخاطب بہ خان زماں تھا۔ وہ مہابت خاں خانخاں سپہ سالار کا، جس کا اصل نام زمانہ بیگ تھا، بیٹا تھا اور امانی تخلص کرتا تھا۔ مہابت خاں اکبری عہد کا ایک منصب دار تھا جسے جہانگیر کے زمانہ میں عروج حاصل ہوا۔ اگرچہ مؤلف قاموس المشاہیر نے خاں زماں امان اللہ خاں کا تعارف عہد جہانگیر اور شاہجہاں کے ایک اعلیٰ منصب دار، مورخ اور شاعر کی حیثیت سے کرایا ہے۔ لیکن کسی بھی طبّی تالیف و تصنیف کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً ان کو کوئی ایسا تاریخی ماخذ نہیں ملا جس میں ان کی طبی تالیفات و تراجم کا ذکر ہوتا۔ فاضل طبیب و مصنف علی کوثر چاند پوری نے بھی اپنی کتاب "اطباء عہد مغلیہ" میں ان کے حالات و تصانیف کا ذکر نہیں کیا۔ غالباً امان اللہ خاں کی طبی تالیفات

موصوف کی نظر سے نہیں گذریں جن کے پیش نظر وہ ان کی علمی صلاحیت کا ذکر کرتے اور ان کو اطباے عہد مغلیہ میں شامل کرتے۔

مورخین نے ان کے عہدے اور مناصب کے بارے میں یا ان کی عسکری مہموں کے سلسلہ میں بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن ان تذکروں میں ان کی علمی کاوشوں خاص طور پر طبی تالیفات کے بارے میں تفصیل نہ ہونے کے برابر ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ ان کی منصبی اہمیت، عسکری بصیرت اور سماجی جاہ و حشمت نے ان کی علمی تخلیقات کو چشم مردم سے اوجھل کر دیا تھا۔ صمصام الدولہ شاہنواز خاں نے "مآثر الامراء" میں امان اللہ خاں کی عسکری سوجھ بوجھ، انتظامی صلاحیت اور سیاسی بصیرت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اُس کی جنگی مہمات پر بھرپور تبصرہ کیا ہے اور ساتھ ہی اس کی شخصی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "وہ شجاعت اور سپاہ گری میں یگانۂ روزگار اور غیرت مند تھا۔ بردباری اور تواضع کے ساتھ اس نے ایسا رتبہ پایا کہ جو لوگ اس کے باپ کی جان کے دشمن تھے وہ بھی اس سے محبت اور خلوص برتتے تھے۔ .... وہ عقل و دانش کے اعتبار سے بھی زمانہ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔"

(اردو ترجمہ مآثر الامراء۔ جلد اوّل، مطبوعہ لاہور ۱۹۶۸ صفحہ ۲۰۰)

اس قسم کے بیانات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امان اللہ خاں اپنے دور کی فرزانہ ترین شخصیتوں میں سے ایک تھا۔ اگر ایک طرف وہ اعلیٰ پایہ کا ادیب اور شاعر تھا تو ساتھ ہی وہ ایک مورّخ، فرہنگ نویس، شاعر اور عالم طبیب بھی تھا۔ چھوٹی بڑی تقریباً بارہ کتابیں اس کے علمی ذوق اور ہمہ جہت شخصیت کی آئینہ دار ہیں۔ انشاپردازی میں اس کی دو کتابیں "رقعات امان اللہ حسینی" اور "انشائے خانہ زاد خاں" اس کی رواں دواں اور شگفتہ نثر نگاری کی شاہد ہیں۔ رقعات صوفیانہ خطوط پر مشتمل ہیں۔ یہ کتاب ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مصنف کی صوفیانہ جہت کو ظاہر کرتی ہے۔ "انشائے خانہ زاد خاں" اس کے سیاسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے بھی اس کا پایہ کافی بلند ہے جس کا ثبوت اس کا دیوان ہے جو اس وقت مکمل شکل میں آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری کی زینت ہے۔ امان اللہ خاں کی "چہار عنصر دانش" اس کی فرہنگ نویسی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ یہ عربی فارسی کی ایک اچھی ڈکشنری ہے جس میں طبی مصطلحات بھی موجود ہیں۔ اس کتاب کی تمہید میں مصنف نے جہانگیر کے نظم و حکومت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور اس بات کا ذکر کیا ہے کہ وہ علم و فضل کی ترویج و اشاعت کا کس قدر خواہش مند تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تمہید کی بنا پر جو تاریخی واقعات

ہے پہنچے، بعض فہرست نگاروں نے اسے بلا تکلف تاریخ کی کتاب قرار دیدیا ہے جو کسی بھی اعتبار سے درست نہیں۔ ایک مورخ کی حیثیت سے وہ "تاریخ سلاطین عالم" نام کی ایک تاریخی کتاب کا مؤلف ہے جس کا ذکر ڈی۔ این۔ مارشل نے اپنی کتاب Moghals in India میں کیا ہے۔ نیز مآثر الامراء میں بھی جس کا یک سطری بیان موجود ہے۔ اس تاریخی کتاب میں ان تمام بادشاہوں کے حالات درج ہیں جو اس کے زمانۂ حیات سے قبل حکمراں رہ چکے تھے۔

اوپر پانچ کتب کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ امان اللہ خان کی تخلیقی اور فکری صلاحیتیں ہمہ جہتی تھیں۔ لیکن موجودہ مقالہ میں امان اللہ خان کی محض اس علمی اور تخلیقی جہت کا ذکر مقصود ہے جس کا ذکر اس کی طبی تصانیف میں ہوا ہے۔ ایسی سات کتابوں کا اب تک پتہ چل سکا ہے۔ (۱) ام العلاج (۲) مفتاح الحدود مع مقدمہ مفتاح الحدود (۳) عشرہ کاملہ خانزمانی (۴) رسالہ در طریقۂ مسہلات (۵) مقدمہ بر مرآت الجواہر (۶) دستور الہنود یا ترجمہ مدن بنود (۷) قرابادین خان زمانی یا گنج بادآورد صاحبقرانی۔

پہلی کتاب "ام العلاج" ۱۸۷۳ میں مطبع نولکشور کانپور میں طبع ہو چکی ہے اور ادویۂ مسہلہ کے باب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔

دوسری کتاب مفتاح الحدود معالجات کے نام معنون ہے۔ ۵۳ اوراق پر مشتمل یہ کتابچہ نیشنل میوزیم دہلی میں بخط نستعلیق نمبر $\frac{1778}{55.73}$ پر موجود ہے۔ مارشل نے اپنی ببلیوگرافی میں اس کی موجودگی خدا بخش لائبریری پٹنہ میں دکھائی ہے (ملاحظہ ہو مارشل جلد اول صفحہ ۶۹، مطبوعہ بمبئی ۱۹۶۷)۔ لیکن خدا بخش کیٹلاگ نمبر ۱۰ صفحہ ۴۸ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مفتاح الحدود نہیں بلکہ "مقدمہ مفتاح الحدود" ہے۔ معالجات کی یہ کتاب زمانۂ جہانگیر میں لکھی گئی۔ خدا بخش لائبریری میں اسے نادر طبی کتب کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

امان اللہ خان کی تیسری طبی کتاب کا نام "عشرہ کاملہ خانزمانی" ہے۔ جس کی موجودگی کا پتہ اب تک نہیں چل سکا ہے۔ اس کتاب کا ذکر خود امان اللہ خان نے ۱۰۵ کتب پر مشتمل اس ببلیوگرافی میں کیا ہے جو اس نے اپنی ضخیم طبی انسائیکلوپیڈیا "گنج بادآورد صاحبقرانی" کے تمہیدی اوراق میں پیش کی ہے۔

ان کی طبی تالیف "رسالہ در طریقۂ مسہلات" کا بھی پتہ چلا ہے جس کا قلمی نسخہ صرف

یونانی ریسرچ انسٹیٹیوٹ لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہے، جس کی کتابت ۱۰۷۶ھ میں بخط نستعلیق ہوئی اس نام کی کوئی کتاب اور کسی معروف فہرست کتب میں نہیں پائی جاتی۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اس حقیقت کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ مسہلات کے ترکیب استعمال اور ان کی تیاری کے سلسلے میں امان اللہ خان کو تخصص حاصل تھا۔

خدا بخش لائبریری پٹنہ کے کیٹلاگ نمبر ۱۰ صفحہ ۳۸ پر امان اللہ خان کی ایک اور مختصر طبی رسالے کا نام موجود ہے جسے آج کل کی زبان میں مقالہ کہنا مناسب ہوگا۔ اس کا نام "مقدمہ مرآت الجواہر" ہے یہ بھی مجموعہ نمبر ۲۱۰۸ میں شامل ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس کو دیکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ اسے بھی خدا بخش کے ارباب علم وفضل نے نادر کتب کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔

امان اللہ خان کی مندرجہ ذیل دو طبی کتابیں مخطوطہ کی شکل میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ دہلی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ انہیں دو خطی نسخوں پر تفصیلی تبصرہ زیر نظر مقالہ میں پیش خدمت ہے۔

چھٹی طبی کتاب کا پورا نام: مفردات کتاب دستور الہنود یا ترجمہ مدن بنود ہے۔ یہ فارسی میں ہے اور ۸½ × ۵½ سینٹی میٹر کے ۱۱۹ صفحات پر محیط ہے۔ اس نسخہ کی کتابت تیرہویں صدی ہجری میں ہوئی۔ کتاب میں کوئی ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے سال تالیف معلوم نہ ہوسکا۔ یہ کتاب بھی خان زماں امان اللہ خان فیروز جنگ کی مقبول اور پسندیدہ تالیف ہے جو شاہجہان کے دور حکومت لکھی گئی اور اپنی اہمیت وافادیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہے۔ اس میں ہندی ادویہ کے استعمال پر زور دیا گیا ہے اس لئے کہ وہ ہندستانیوں کے مزاج کے مطابق ہوتی ہیں۔ اسی خیال کے زیر اثر حکیم امان اللہ خان نے دستور الہنود مرتب کیا ہے جس میں ادویہ اور معدنیات کو جو ہندستانی وید صاحبان باشندگان ہند کو ہر قسم کے امراض میں استعمال کراتے تھے، وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، نیز ان کے متبادل فارسی اور یونانی نام بھی دیے ہیں۔ یہ دستور الہنود کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔

یہ نسخہ مختصر ہونے کے باوجود نافع اور جامع ہے ادویہ مفردہ نیز مشروبات کی تحقیق کے سلسلے کی ایک [illegible] ہے۔ اختصار کے ساتھ اس کے جامع ہونے کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ۱۱۹ صفحات میں تقریباً سات سو مفردات وادویہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ گویا مؤلف نے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے جس سے اس

ادویہ سے ہر وہ شے مراد لی جائے گی جس کو بطور دوا استعمال کیا جاسکتا ہو۔ خواہ وہ جڑی بوٹیاں ہوں یا روزانہ کام آنے والی سبزیاں اور پھل ہوں۔ اِن میں حیوانی ادویہ بھی شامل ہیں جیسے مختلف جانوروں اور پرندوں کے گوشت کے طبی خواص وغیرہ۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوگا کہ دھاتیں اور معدنیات بھی طبی دنیا میں اہم کردار ادا کرسکتی ہیں۔ گھی اور مختلف قسم کے روغن بھی اپنی اپنی جگہ پر مذکور ہیں۔ جانوروں کے دودھ کی تشریح کے ساتھ پیڑ پودوں کے دودھ کے طبی خواص بھی فاضل مصنف کے قلم سے نہیں بچ سکے ہیں۔

تالیف کتاب ہٰذا کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ادویہ کے طبی خواص اور ان کے فوائد و نقصانات غیر ضروری تفصیلات سے ہٹ کر کم سے کم الفاظ میں پیش کردیے جائیں۔ جیسا کہ طب یونانی کی کتابوں کی مشترک خصوصیت ہے سب سے پہلے ادویہ کا مزاج، گرم و سرد، خشک و رطب وغیرہ، دیا گیا ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ طب یونانی اور آیورویدک کے بہت سے اصول مماثل ہیں۔ اصل کتاب شروع کرنے سے قبل مؤلف نے پندرہ صفحات پر مشتمل اس کی تمہید لکھی ہے جس کو نو مختصر ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے اور لفظ "فائدہ" باب کا قائم مقام ہے۔ اِن تمہیدی اوراق میں اسباب امراض، دھاتوں، کھانوں، تدبیر ماکولات و مشروبات، فاقہ، خواب و بیداری، حرکت و ریاضت، استفراغات، مسہل، حقنہ، فصد، اسباب زینت اور دیگر طبی تدابیر کا بیان کافی دلچسپ انداز میں کیا گیا ہے۔

اسی طرح موجودہ مخطوطہ میں پانی کا بیان تمام ضروری تفصیلات پر محیط ہے۔ بارش کے پانی، دریاؤں اور جھرنوں کے پانی، تالابوں، نہروں اور کنوؤں کے پانی اپنے طبی خواص اور محل استعمال کے اعتبار سے مذکور ہیں۔ دریائے گنگا کے پانی کے بعض فوائد قابل غور اور تحقیق طلب ہیں۔ پانیوں کے خواص کی وضاحت کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے عرق بھی ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں۔

خاتمہ کے عنوان سے مخطوطے کے اختتامی پانچ صفحات مفید طبی تراکیب کی تشریح پر مشتمل ہیں۔ جیسے دھات، معدنیات اور سمّی ادویہ کو مُدبّر کرنے کا طریقہ، کشتہ جات کی تیاری اور استعمال پر نسبتہً تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ادویہ کا بیان دو ابواب پر پھیلا ہوا ہے۔ پہلے باب میں مفرد ادویہ کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں متفرق کھانوں کا بیان ہے یہ کافی مختصر ہے۔ ادویہ کے نام سرخ روشنائی سے مرقوم ہیں۔

دستورالہنود کا دوسرا مخطوطہ کیلی فورنیا یونیورسٹی ٹیو یارک کی لائبریری میں موجود ہے ۔ یہ مجموعہ نمبر ۵۹ میں شامل ہے اس میں ۸۶ اوراق ہیں اور سنہ کتابت ۱۱۳۰ھ ہے ۔

جیسا کہ خدابخش سمینار منعقدہ ۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۴ میں پیش کردہ ایک فہرست سے ظاہر ہے، پاکستان کے کسی کتب خانہ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے جس کی کاپی مستقبل قریب میں حاصل کی جاسکتی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان خطی نسخوں کی مدد سے ایک صحیح متن مرتب کیا جاسکتا ہے ۔ تعجب ہے کہ مارشل نے اپنی ببلیوگرافی میں امان اللہ خاں کی کتابوں کے ذیل میں اس اہم اور نادر مخطوطہ کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ یہ کتاب تاحال طبع نہیں ہوئی ۔ چونکہ یہ فارسی زبان میں ہے اس لئے ہمارے اطبا اس کتاب پر توجہ نہ دے سکے ۔ اگر دستورالہنود کا اردو ترجمہ اصل متن کے ساتھ شائع کردیا جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ موجودہ سمینار کے سلسلے میں ارباب لبست وکشاد کی مساعی رائگاں نہیں گئیں ۔

(۲)

قرابادین خان زمانی یا گنج بادآورد صاحبقرانی :۔

فارسی زبان میں یہ ضخیم طبی قرابادین خان زمانی امان اللہ خاں کی بیش قیمت تالیف ہے ادویہ کی شناخت، مرکب ادویہ کی اقسام اور ان کی تیاری نیز مختلف امراض کے پس منظر میں ان کے متنوع استعمالات پر ایک مبسوط طبی دستاویز ہے ۔

گنج بادآورد ہندوبیرون ہند کی متعدد لائبریریوں میں موجود ہے جیسے : رضا لائبریری رامپور، آصفیہ لائبریری حیدرآباد، آزاد لائبریری علی گڑھ اور ادارہ تاریخ وتحقیق طب دہلی کی لائبریری وغیرہ اسی طرح بیرون ہند کی بہت سی لائبریریوں میں موجود ہے جن میں سے نجف اشرف کا نسخہ سب سے اچھا اور مکمل ہے جس کا سنہ کتابت ۱۰۵۸ھ ہے اور جو ۱۱۴۰ اوراق پر مشتمل ہے ۔

اس نسخہ پر تفصیل سے بحث کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اس کے بارے میں پھیلی ہوئی ایک غلط فہمی کو دور کردیا جائے ۔ برٹش میوزیم کے فارسی کیٹلاگ جلد دوم میں صفحہ ۴۸۹ پر رسالہ تحلیلیہ مؤلفہ احمد بن علی بن محمد خلیل جونپوری کا ذکر ہے جسے کتاب شجرہ نہال یا نسخہ گنج بادآورد کا خلاصہ ظاہر

ہے۔ اسی ماخذ کا حوالہ دیکا۔ این مارشل نے بھی اپنی ببلیوگرافی میں دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس خلاصہ میں بستان
پیدا ہونے والے پھل پھول، سبزیاں، اناج اور دیگر پودوں کی نگہداشت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے،
بت ہے کہ رسالہ مخلبندیہ کتاب شجرہ نہال کا خلاصہ ہے لیکن اسے گنج بادآورد کا خلاصہ کہنا قطعی لایعنیات
اسی غلط فہمی کا شکار انڈیا آفس کا فہرست نویس بھی ہوا ہے اور لکھا ہے کہ "یہ کتاب کاشتکاری پر ہے"۔
صرف اس قدر ہے کہ گنج بادآورد کے اختتامی جزو یا Epilogue میں کاشتکاری کے نام سے
ذیلی عنوان قائم ہے۔ امان اللہ خاں نے کتاب کے تمہیدی باب میں اپنے ۵۰ ماخذ کی جو فہرست دی
ن میں ایک کتاب شجرہ نہال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اختتامیہ میں کاشتکاری سے متعلق مواد اسی کتاب
نہال کا رہین منت ہے، لہٰذا ہم اندرونی شہادت کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ مذکورہ غلط فہمی کا ازالہ
سکتے ہیں۔

مؤلف نے کتاب کا نام گنج بادآورد رکھا ہے جو یقیناً معنی خیز ہے۔ بظاہر تو یہ خسرو پرویز کے
خزانے کا نام تھا جس کو دوسرے الفاظ میں گنج شائیگاں بھی کہتے ہیں۔ یہ قیصر روم کا قیمتی اور
انہ تھا جسے باد مخالف خسرو پرویز کے ملک کی طرف لے آئی تھی۔ اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے
ب بھی اتنی ہی قیمتی ہے۔ خزانہ کی اہمیت یہ ہے کہ آدمی کی بڑی سے بڑی مادی ضرورت اس سے پوری
ہے۔ مؤلف کے خیال میں موجودہ کتاب سے ایک عام طبیب کی کم و بیش تمام ضروریات پوری ہو سکتی
خزانہ کا دوسرا وصف یہ ہے کہ اس میں گوناگوں قسم کے اور بوقلموں رنگوں کے جواہرات ہوتے ہیں۔
اور یکا اس خوبی کو بدرجۂ اتم ظاہر کرتی ہے جس میں طبی نسخہ جات، علم الامراض معالجات، کلیات اور
تجربات کے ساتھ ساتھ متفرق فنون اور صنعتی اعمال کا بھی صراحت کے ساتھ بیان موجود ہے جیسے
سازی یا روشنائی بنانے کی ترکیب وغیرہ۔ گنج بادآورد کا ایک تیسرا مفہوم "اچھے" اور "وہبی" مال
۔ یہ مفہوم بھی اس کتاب پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ امان اللہ خاں نے اس کتاب کے تمہیدی
یں اپنے ماخذ کی ایک طویل فہرست دی ہے جیسے اختیارات بدیعی، مرکبات شفائی، طب جلالی،
اسکندری، طب فارسی، کتاب القانون، طب ابراہیم شاہی، رسالہ چوب چینی، ذخیرہ خوارزم
کامل الصناعہ، کفایہ منصوری، طب فیروز شاہی، خلاصۃ التجارب، صحاح الادویہ، مفتاح الحدیقہ
عشرہ کاملہ، خانزمانی، الحاوی، شرح الاسباب والعلامات، اقسرائی، ذخیرہ سکندر ذوالقرنین،

ترجمہ، خود خانہ نسخۂ شمو و نہاں مفتاح الخزائن وغیرہ۔ گویا اس ایک کتاب کا پڑھنے والا فن کی ۲۰۰ اساسی کتب سے مفت میں بہرہ ور ہو سکتا ہے۔

ماخذ کی اس فہرست میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مؤلف نے اس میں خود اپنی تالیفات کو شامل کر لیا ہے اور جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کیا گیا ہے اس کی کتاب "عشرۂ کاملہ" کا نام اس فہرست کے علاوہ کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی اندرونی شہادتیں محققین کے لیے تحقیق کا سرمایہ بہم پہنچاتی ہیں۔

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ دہلی کی لائبریری کا مکمل اور واحد نسخہ ۱۴×۲۲ سنٹی میٹر سائز میں دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں ۴۳۵ اور دوسری جلد میں ۴۳۸ اوراق ہیں۔ خوبصورت خط نستعلیق میں مرقوم ہے۔ شروع کے چند اوراق غائب تھے جنہیں دوسرے نسخے سے بعد میں نقل کر لیا گیا ہے۔ پوری کتاب تین حصوں پر منقسم ہے۔

(۱) تمہیدی حصہ (۲) متن (۳) اور اختتامیہ

تمہیدی حصہ مقدمہ کے نام سے موسوم ہے جو سولہ ذیلی عنوانات اور ان کی تفصیلات پر محیط ہے، جیسے: غذا کی تعریف اور حد بندی، ادویہ کو محفوظ رکھنے کی تراکیب، دواؤں کے مزاج اور منافع کا بیان، صحیح دواؤں کا انتخاب، ادویہ کی جانچ اور تیاری، ان کا استعمال، مرکبات کے درجات کی شناخت ان کی ناپ تول اور اوزان متعلقات، ابدال ادویہ، دواؤں کی عمر، یا ہندی و فارسی زبانوں کے لحاظ سے اُن کے ناموں کی تحقیق، بعض اساسی مرکبات اور ادویہ مفردہ کا بیان وغیرہ۔

اس کے بعد کتاب کا اصل متن شروع ہوتا ہے جو مجموعی طور پر تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ ہر جزو کو کتاب کے نام کی رعایت سے لفظ "گنجور" سے موسوم کیا گیا ہے۔ ہر گنجور کا موضوع وہ مفردات و مرکبات ہیں جو واضح طور پر مخصوص امراض کے لئے متعین ہیں۔ یہ حصہ نو ابواب پر منقسم ہے یہاں لفظ "نقد" باب کا مترادف قرار پاتا ہے۔ ان ابواب کے ذیلی عنوانات کو "عقد" کا نام دیا گیا ہے۔

پہلے گنجور میں درج ذیل مضامین شامل ہیں:-

امراض سے متوافق مفردات و مرکبات، مخصوص امراض کے لئے متعینہ ادویہ، امراض چشم

کی دوائیں، سربرجات، سونگھنے اور ناک میں ڈالی جانے والی دوائیں، امراض دہن کی دوائیں، سنونات، ادویہ برائے بواسیر و نواصیر، ادویہ برائے استفراغات، اجابت، پیشاب اور پسینہ کی کثرت کو روکنے والی دوائیں، لوازمات زینت و خضاب، آواز کو کھولنے والی ادویہ، بیدار رکھنے والی اور خواب آور دوائیں، مقویات برائے حافظہ، موٹاپا کم کرنے والی ادویہ، مقویات باہ اور اس سے متعلق ادویہ (اور جیسا کہ طب یونانی کی کتابوں کی خاصیت ہے یہ باب خاصہ طویل ہے)، ادویہ برائے امراض النساء، ایذا دینے والے کیڑوں اور جانوروں کے کاٹنے کا علاج، زہریلے اثرات کو دور کرنے والی دوائیں، آگ اور حرب سے پیدا ہونے والے زخموں کا علاج وغیرہ۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں درج ذیل عنوانات ہیں:۔

مرکب ادویہ کی مختلف اقسام جیسے تریاق، نشاآور ادویہ، معجونات، مفرحات، حبوب، لوق، جوارش، قرص، سفوف، اشربہ، سکنجبین، روغنیات، عرق وغیرہ تیار کرنے کا مکمل بیان ہے۔ اس میں مختلف قسم کے چورن، پادزہر، چوب چینی، مومیائی، چائے اور قہوہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بعض ہندی کا ادویہ خصوصاً ان مرکبات کی تفصیل جو ہندوستان کے نامور حکماء کے تجربہ میں آئیں۔ زہروں کا بیان، آیورویدک اصطلاحوں کے مطابق ان مرکب ادویہ کی تشریح جو رس وسائن کہلاتی ہیں، پارے کو کھانے کے قابل بنا کر مرکبات میں استعمال کرنا، طلا، اور ضماد کی تیاری، مختلف شربت، مختلف مربے تیار کرنا، جڑی بوٹیوں، بیجوں اور پھولوں سے عرق کشید کرنا، ان عرقوں کے ساتھ ہی مار الجبن، مار اللحم و ماء العسل کا بیان بھی شامل ہے۔ سرکوں کی تیاری اور مختلف جانوروں کے دودھ کے طبی خواص پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ان تیلوں کا بھی ذکر ہے جو ہندی اطبا نے بطور دوا استعمال کئے۔ دیسی علاج کے لئے چند مخصوص طریقوں کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے جیسے جلد یا چوٹ سے متاثر جسم کے حصہ کو ایک خاص طریقے سے دبانا یا مالش کرنا یا دوائیں ایک پوٹلی میں باندھ کر اس کی سینکائی کرنا یا دوا ملے پانی کو اس حصہ پر دھارنا، مریض کو بخورات کا دھواں دینا وغیرہ۔

اس کے بعد کتاب کا تیسرا مجموعہ شروع ہوتا ہے جو عطریات کے استعمال، عطروں کی تیاری، مختلف دوائی نمک اور کھار تیار کرنا، زہروں کی تفصیل اور بے ہوش کر دینے یا جسم کو سُن کر دینے

والی دواؤں کی تشریح پر مشتمل ہے۔ اس حصہ میں مریض اور صحت مند حضرات کی غذاؤں پر خصوصی روشنی ڈالی گئی ہے۔

گنج باد آورد کا اختتامیہ لفظ طلسم سے موسوم ہے۔ یہ حصہ بعض اعمال، مختلف فنون اور صنائع پر مشتمل ہے جن میں علم کیمیا کی تعریف، اس کے اعمال، اس فن میں مستعمل اصطلاحات کی تشریح، اشیاء کے خواص و مزاج، ان پر سیاروں کے اثرات، کیمیا سازی کے اوقات کی تفصیل، فلزات کا بیان، جواہر کے گوناگوں اثرات اور دواؤں میں ان کا استعمال، زیورات و جواہر کی جلاکاری، صابون سازی اور دوسری صنعتوں کا بیان موجود ہے۔

اس حصہ کا ایک ذیلی عنوان کاشتکاری بھی ہے جس میں ہندستان میں پیدا ہونے والے بہت سے پودوں کا بیان ہے۔

مذکورہ بالا تمام موضوعات کے ساتھ ساتھ مؤلف نے جادو ٹوٹکے، شعبدہ جات اور نیرنگ پر حاصل شدہ مواد کو اپنی کتاب میں شامل کر کے اسے انسائیکلوپیڈیا کا درجہ دینے کی کوشش کی۔ دنیا کی متفرق لائبریریوں میں اس کتاب کے متعدد نسخے ہونے کے باوصف گنج باد آورد ابھی طبع نہیں ہوئی۔ اگر ضروری حد تک اس کا خلاصہ مع اردو ترجمے کے شائع کر دیا جائے تو یہ طب یونانی کے احیا کی طرف ایک مثبت قدم ہوگا۔

عبدالحی فاروقی
سینئر ریسرچ آفیسر
INMHR

مجموعِ ضیائی

عہدِ تغلق کا ایک نادر طبی مخطوطہ

برصغیر کے بیشتر کتب خانوں اور ذاتی ذخیروں میں آج بھی طب یونانی کے نادر و نایاب مخطوطات محفوظ ہیں۔ ہندوستان کے قدیم اطبا نے اپنے مطب اور علاج و معالجہ کے ذریعہ جہاں اپنے ملک کے عوام کی خدمت کر کے انھیں صحت و تندرستی کی دولت سے ہمکنار کیا تھا۔ وہیں انھوں نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے اطباء کے علمی و عملی کارناموں سے بھی واقفیت حاصل کر کے اور ان کے طبی تجربات سے فائدہ اٹھا کر آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا عظیم علمی ورثہ چھوڑا ہے، جس سے آج کے محققین اور اہل فن بیش از بیش فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ ان سیکڑوں برسوں کے جمع شدہ طبی ذخائر میں کچھ ایسی ادویات اور طریق علاج معلوم ہو جائیں جن سے آج کی دنیا میں اُن تمام مہلک اور خطرناک امراض کا تدارک ہو سکے جن پر قابو پانے کے لئے ابھی تک کوئی قابل اعتبار پیشرفت نہیں ہو سکی ہے، چنانچہ ہم اِس 'دُرِ مقصود' اور 'گوہرِ مطلوب' کو صرف اُسی وقت حاصل کر سکتے ہیں، جبکہ اپنے اسلاف کے فنی متروکات اور ان کے علمی ورثہ کو کھنگالیں، ان کا جائزہ لیں اور آج کے ترقی یافتہ دور میں جدید طبی تحقیقات کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ دیکھیں کہ ہماری قدیم دیسی طب موجودہ زمانے کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کر سکتی ہے۔ خاص طور سے اُن میدانوں میں جہاں جدید طب ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہیں کر سکی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ آج ہم ان چیزوں سے کہاں تک فائدہ اُٹھا سکتے ہیں، چنانچہ انہی طبی زر و جواہر کے ڈھیر میں ہمیں ایک اہم اور نادر فارسی طبی مخطوطہ حاصل ہوا ہے جس کا مختصراً تعارف کرانے کی سعادت آج حاصل کی جا رہی ہے۔

ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی کے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُسے آج کے دور کے محسنِ طب جناب حکیم عبدالحمید صاحب بانی ہمدرد دواخانہ دہلی

کی سرپرستی حاصل ہے۔ اسی انسٹی ٹیوٹ کی طبّی لائبریری میں عہدِ تغلق کا ایک اہم مخطوطہ "مجموعِ ضیائی" کے نام سے محفوظ ہے، اس کے مصنف خاندانِ تغلق کے دوسرے بادشاہ سلطان محمد بن تغلق شاہ (۱۳۲۵ء تا ۱۳۵۱ء - ۷۲۶ھ تا ۷۵۲ھ) کے ایک درباری طبیب تھے جن کا نام ضیا محمّد مسعود رشید زنگی عمر غزنوی المعروف بہ "مبارکباد" تھا، انھوں نے اپنی اس تصنیف کو ۷۳۷ھ میں لکھ کر مکمل کیا تھا، مخطوطہ کا سائز ۱۶ × ۲۶ سنٹی میٹر ہے جو ڈھائی سو اوراق پر مشتمل ہے جس کے ہر صفحہ پر ۲۳ سطریں ہیں۔ جو نسخ کے صاف اور روشن رسم الخط میں مکتوب ہے۔ عنوانات سرخ روشنائی اور جلی قلم سے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ نسخہ اپنی قدامت کے دیکھتے ہوئے خاصی اچھی حالت میں ہے اور زیادہ بوسیدہ اور کرم خوردہ نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ استفادہ بھی ہے۔ مخطوطہ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، العلم عند اللہ الشافی هو اللہ حمد و ثنا و شکر متکاثر مر خالقی را که صورتِ لطیف آدمی را از جملہ مصنوعات بہتر آفرید که لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم و صلواتِ بے پایان و تجلیاتِ شایان مر حضرت نبوی را صلی اللہ علیہ وسلم بدان ...."

مخطوطہ کے آخری صفحہ پر آخری عبارت اس طرح درج ہے :

"بجہت دفع زہر مار، تلخۂ آہو، تلخۂ جھوجھوندری و تلخۂ طاؤس و تلخۂ ماہی رو ہو۔ درین ہر چہار تلخہ فلفل گرد تر کنند و بدارند مار خوردہ را ناس دہد نیکو شود ببارد نخ لوبی، و کدو تلخ را شگاف کنند و آب نخ بیندازد تا آنکہ کدو خوشک شود و بعد صوبکشند بدارند"

آخری ڈیڑھ سطروں میں بطور ترقیمہ کے یہ عبارت تحریر ہے :

"تم الکتاب الطب فی الیوم پنجشنبہ وقت الفجر بتاریخ ۳ ماہ ذی القعدہ ۱۰۵۸ھ (مطابق ۱۶۴۸ء) العبد کاتب الحروف مخدوم حسین"

سببِ تالیف : جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس مخطوطہ کے مصنف ضیا محمّد مسعود رشید زنگی محمّد بن تغلق (وفات ۱۳۵۱ء) کے درباری طبیب تھے، ان کے حالاتِ زندگی کسی معتبر و مستند تذکرہ میں دستیاب نہیں ہو سکے۔ حتیٰ کہ "تاریخ فیروز شاہی" کے مصنف

ضیاء الدین برنی نے بھی اُن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، ان کے مختصر حالات صرف اسی قدر معلوم ہو سکے ہیں۔ جو خود انھوں نے اپنے بارے میں لکھے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق نے اپنے دورِ حکومت میں دارالسلطنت دہلی کو دولت آباد منتقل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ اسی کے حکم سے دہلی کی آبادی کا ایک بڑا حصہ جس میں علما، حکما، صوفیہ اور عوام کے ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ اُفتاں و خیزاں دکن کی جانب روانہ ہونے لگے۔ اس نقل مکانی اور سفر طولانی کے درمیان بیشمار افراد سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لاکر راستہ ہی میں فوت ہو گئے، اور جو باقی ماندہ وہاں پہنچے تو وہاں قحط اور مختلف النوع بیماریوں کے شکار ہونے لگے۔ خود مصنف "مجموع ضیائی" بھی انہی سفر کرنے والوں میں سے تھے جن کو سلطان محمد بن تغلق نے دولت آباد جانے کی ہدایت دی تھی۔ چنانچہ یہ بھی کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے اس شہر کو بہت حسین اور خوب صورت پایا، جہاں طرح طرح کی نعمتیں، لذیذ میوے، نہریں اور خوبصورت تالاب وغیرہ تھے لیکن اُسی سال دولت آباد میں مختلف وبائی بیماریاں پھیل گئیں جن سے بہت سے باشندے لقمۂ اجل بن گئے۔ مصنف ضیاء محمد مسعود راشید زنگی دولت آباد میں دو سال اور چار ماہ مقیم رہے۔ اس عرصہ میں یہ خود بھی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا اور صاحبِ فراش رہے، ہر چند اُنھوں نے اپنا علاج کرایا، مگر کوئی افاقہ نہ ہو سکا۔ بلکہ مرض میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا رہا۔ چنانچہ ایک شب خدائے شافی و دافی کی بارگاہ میں دست بدعا ہوئے اور صحت کی درخواست کی، اُسی شب اپنے عم بزرگوار خواجہ شمس مستوفی کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک کتاب ترتیب دی ہے جس کا نام مجموع شمسی ہے۔ اس میں تم اپنے مرض کا علاج تلاش کرو اور صحت حاصل کرنے کے بعد علم طب حاصل کرو اور اس کے ذریعہ عوام الناس کی خدمت کرو۔ لہٰذا انھوں نے اس ہدایت پر عمل کیا اور پھر صحت یاب ہوئے اور حسب ہدایت علم طب حاصل کر کے یہ کتاب "مجموعِ ضیائی" مرتب کی۔ اس کی ترتیب و تسوید میں جن کتب معتبرہ سے اُنھوں نے استفادہ کیا تھا اس کی ایک فہرست بھی انھوں نے اپنے مقدمہ میں منسلک کی ہے جس میں حسب ذیل کتابیں ہیں:

(۱) القانون فی الطب شیخ بوعلی سینا (۲) مقرون جالینوس (۳) فردوس الحکمہ علی ابن ربّن طبری (۴) کامل الصناعہ علی بن عباس المجوسی (۵) کتاب الصیدنا البیرونی (۶) ذخیرۂ خوارزم شاہی شیخ اسماعیل گورگانی (۷) مجموع طبی (۸) شفاء الملوک (۹) مقاصد الابدان (۱۰) بستان العطار

علامت علاج - (۱۲) مخزن الشفا (۱۳) مجموعۂ شمسی (بعض ہندوستانی اطبا کی کتابوں کا فارسی ترجمہ (۱۴) طب گیلانی (۱۵) مجموعۂ محمدی (تالیف خواجہ تاج الدین فیروزکوہی حکیم) (۱۶) سِرِّ مکنون (خواجہ محمود حرکان رازی و مرسی حکیم (۱۷) نکت الاصول فی فوائد الخیول (۱۸) کتاب سلطان بخرشاہ لغتہ البیطرہ (گھوڑوں کے معالجات سے متعلق) (۱۹) نصرۃ الظاہر فی معدن الجواہر (۲۰) نزہت الغذا حدیقۃ البستان (۲۱) منافع الفناس الانسان۔

زیر بحث مخطوطہ میں کل ۴۳ ابواب ہیں اور چند ابواب کو چھوڑ کر باقی ہر باب کے ذیل میں متعدد فصلیں ہیں۔ جن کی تفصیل مندرجہ ذیل فہرست مضامین میں اس طرح دی گئی ہے:

(۱) در معرفت ارکان و اجناس و الوان از مجموعۂ محمدی۔ ۱۵ در معرفت ارکان اجسام۔ عدد امور طبیعی و معرفت اجناس۔

(۲) در معرفت اخلاط (۳) تشریح ابدان، (۴) نبض (۵) در شناختن دلیل بول (۶) در علامت و علاج تبہای مفردہ و مرکب (۷) در قوت نفس باہ (۸) در کلپ و خضاب (۹) در معرفت روغنہا جہت ہر علتی خارج آنکہ در باب خواص نبشتہ شدہ (۱۰) سنگ مثانہ و درد گردہ و سیلان (۱۱) در معرفت زنان و مباشرت ایشان (۱۲) صحبت درد سر و نیم سر و زکام و صرع (۱۳) در علت ہای چشم و علاج آن (۱۴) در معالجت تحت گوش (۱۵) در بازداشتن خون بینی و گوی تباہ آن (۱۶) در معالجت پختگی دہن و زبان (۱۷) در معرفت درد سینہ و دل (۱۸) در اندرو صفرا علامت آنکہ تشنگی بسیار باشد (۱۹) در سرفہ و دق و سل و عفونت (گستگی آواز) (۲۰) در دانستن اشتہا انچہ نقصان میشود (۲۱) در اسہال و آوردن قے و قبض۔

باب بست و دوم (۲۲) :- در نحت شکم و علاج آن۔

در معنی آنکہ شکم بسیار رود۔ در علاج کہ درد شکم افتد، در علاج درد شکم، در معنی استسقا، در معالجت طولہ و پیچیدہ و سختی شکم، در معالجت کدال و دانستن علت آن۔ (۲۳) در معرفت یرقان (۲۴) در معرفت باسور و ناسور شش نوع است (۲۵) در معرفت باد خشک و تر و صفت اندام، صباد خشک و تر، در باد لقوہ و پیچیدگی زبان، بادی کہ در پای ہا فرو افتد (۲۶) در معالجت چیچک کہ در وجود آدمی پیدا میشود:- در علاج و علامت آن چہار نوع باشد؛

درجراحت و زخمہا ؛ درعلاج ترقیدتہای و نظم آن ؛ بجہت ترقیدان دنبل و ماندن خون ؛ درعلاج
لیت (دنبل صفراوی) ؛ درسیاہی و سوختگی و آتشک ؛ (۲۷) درسہ نجا بادکہ آنرا بجندوی گرت
باد گویند (۲۸) در برص و بہق سفید و سیاہ — درمعالجت ؛ درمعالجت برص ؛ درمعالجت داد ؛
درمعالجت کچہ داد خارش و بہق ؛ درمعالجت کلف (جھائیں) ؛ درمعالجت بہق سپید و آماس
ناخن ؛ درپنگی تعقیب و آماس خایہ — (۲۹) درمعالجت زہر مار و کژدم و زہر جانوران (۳۰)
درعلت جنونیت و دیوگرفتہ (۳۱) درعقیت نار (۳۲) درعلاج اطفال و دفع سرفہ (۳۳) در
شربتہا ؛ درشربتہا فرحت دہندہ ؛ درشربتہای خنک ؛ درشربتہای دفع تشنگی زحمتہا ؛
درآب حوض و چاہ (۳۴) درمفرحات، جوارشات، معجونات، اطریفل (۳۵) در آسامی ادویہ
و ماہیت و شناخت آن — درشناختن گیاہ و آسامی آن ؛ درمعرفت حبوب و پختن طعام گوشت مسکر
جزات ؛ درمنافع حیوانات (۳۶) در تقدیر ملکولات (۳۷) درکیفیات اسباب آمیختن
ادویہ و اختلاف و وزن آن (۳۸) درمعرفت قوانین فصد و حجامت (۳۹) درمعرفت استفراغ بر عضو
جدا (۴۰) درکیفیت علاج بدستکاری از داغ کردن و سد بستن (۴۱) از گفتار رنگ ادویہ
دیگر جوگیان درکشتن سیماب و زر و نقرہ و درخوردن آہن (۴۴) منافع زخم رسیدہ و مورخ
بریدہ (۴۵) درماہ دال دقت باشد کہ دارو ہای مفرد یا مرکب یافتہ نشود —

موازنہ : اب تک کی تحقیقات کے مطابق دنیا میں دو ہی جگہ "مجموعِ ضیائی" کے نسخے پائے
جاتے ہیں ایک نسخہ ہمدرد (HMMR) کی لائبریری میں اور دوسرا کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہے۔
دونوں نسخے ایک دوسرے سے سائز، صفحہ، سطر اور اوراق کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن ابواب اور
ان کی ترتیب تقریباً یکساں ہے۔ اگرچہ یہ دونوں نسخے اپنی فہرست کے اعتبار سے نامکمل معلوم ہوتے
لیکن اس کے باوجود آصفیہ کے مقابلہ میں ہمدرد (HMMR) کے نسخہ میں تقریباً کئی ابواب زائد
آصفیہ کے نسخہ میں کل ۴۲ ابواب ہیں جبکہ ہمدرد (HMMR) کے نسخہ میں ۴۱ ابواب ترتیب وار
پھر ۴۴ واں اور ۴۵ واں باب بھی موجود ہے۔ مزید برآں ایک فصل بھی۔ درخوردن آہن
و نقرہ کے نام سے پائی جاتی ہے۔ اس مخطوطہ میں ۴۲ واں اور ۴۳ واں باب موجود نہیں ہے۔ آخری
[illegible] باب ترقیمہ والا نسخہ موجود ہے [illegible] خیال ہوتا ہے کہ درمیان

کے اوراق غائب ہونے کے بعد جو باقی صفحات رہ گئے ہوں گے۔ انھیں جوڑ کر محفوظ کر لیا گیا ہوگا۔ ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ آصفیہ اور ہمدرد (HMMR) والے دونوں ہی مخطوطے فہرست مضامین کے لحاظ سے ناکمل ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اپنی اہمیت کے پیش نظر بہت اہم ہیں۔ فہرست مضامین کے اعتبار سے جو ابواب اس مخطوطہ میں اب موجود نہیں ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے :

(۴۲) در معرفت کواکب و تنجیم و تسخیر آن از کتاب سرکنوز و از گفتار حکیم مع سہ فصول

(۴۳) در معرفت جواہر و خواص آن از کتاب زہرۃ الجواہر (۴۶) در علاج اسپاں از کتاب نکتۃ الاصول فی فوائد الخیل و از کتاب سلطان سنجر ملک شاہ مع چہل و چہار فصول

اس طرح سے نجوم و کواکب اور جواہرات کے خواص اور علاج و معالجہ میں ان کی افادیت سے متعلق جو ابواب اور فصول تھیں اب وہ اس مخطوطہ میں باقی نہیں رہیں۔ اسی طرح اُس عہد میں گھوڑے بڑی جنگی اہمیت کے حامل تھے اور سواری و باربرداری کے کام میں بھی لائے جاتے تھے اس لئے ان کے علاج و معالجہ پر بھی خاص توجہ دی جاتی تھی۔ اس مخطوطہ میں بھی اس سلسلے میں پورا ایک باب تھا جس میں ۴۴ فصلیں تھیں۔ لیکن اب وہ سب مفقود ہو چکی ہیں۔ لہٰذا ان دونوں مخطوطات کا یہ دلچسپ اور اہم حصہ اب نہ تو کتب خانہ آصفیہ کے نسخہ میں ہے اور نہ ہی ہمدرد HMMR کے نسخہ میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ دونوں ہی نسخے آخر میں ناقص ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا جتنا حصہ بھی محفوظ رہ گیا ہے اس کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخی حیثیت : "طب یونانی" کے نام سے جو طب آج ہندوستان میں رائج ہے وہ حقیقتاً اب "یونانی" نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مسلمانوں نے یونانی کتابوں ہی سے اس فن کو حاصل کیا تھا مگر اس طرح حاصل کیا کہ بالکل ہی اس کو اپنا لیا۔ انھوں نے اس طب میں اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اتنے اضافے اور تغیرات کیے کہ اس کی ہیئت ہی بدل گئی۔ ان اضافوں اور تبدیلیوں کے باوجود مسلم اطباء کی یہ فراخدلی اور وسعت نظری تھی کہ انھوں نے اس طب کا نام تک تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی چنانچہ وہی یونانی نسبت اب تک برقرار چلی آ رہی ہے۔ مسلمانوں نے جہاں یونانیوں سے طبی علوم حاصل کیے وہیں انھوں نے ہندوستانی ویدک طب سے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا۔ طب یونانی اور طب ہند کا یہ باہمی ملاپ دور عباسی میں خلیفہ منصور (وفات ۷۷۵ء) کے وقت ہی سے شروع ہو چکا تھا جس کے نتیجہ میں بہت سے ہندوستانی جیوتش اور ویدک کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہو چکی تھیں چنانچہ بغداد میں ہندوستان سے ویدک اطباء کو [illegible] سلسلہ شروع ہوا

ہو چکا تھا۔ اہم ویدک تصانیف کے تراجم عربی میں ہو چکے تھے اور اطبا اسلام ہندی طب کو اپنا کر پوری فراخدلی اور علمی بے تعصبی کے ساتھ ویدک تصانیف کے حوالے اپنی کتابوں میں دینے لگے تھے جن میں طبری، رازی، اور ابن سینا جیسے طبیب قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنی تصانیف بالترتیب فردوس الحکمہ، الحاوی اور القانون میں ہندی اطبا کے اقوال کا حوالہ کثرت دیا ہے۔

آیورویدک اور یونانی طب کا باہمی تال میل: ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد جب مسلم سلاطین نے یہاں کے علوم و فنون کے ترجمہ کی جانب توجہ دی تو خاص طور سے آیورویدک کتابوں کے بھی تراجم کئے گئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جہاں ایک نئی تہذیب کی بنیاد رکھی وہیں ایک نئی طب کی بھی داغ بیل ڈالی۔ انھوں نے اپنی لائی ہوئی "یونانی" طب کو آیورویدک طب سے اس طرح ممتزج کیا کہ اب طب یونانی، یونانی نہ رہی بلکہ ایک قسم کی دیسی طب بن گئی۔ مسلمانوں نے مقامی آب وہوا اور جغرافیائی حالات کی روشنی میں یہاں پیدا ہونے والے امراض و علل کا مطالعہ کیا اور ان کے تدارک کے لئے ہندوستان میں پائی جانے والی ادویہ کا ہی انتخاب کیا تاکہ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کے مزاج کے موافق ہو جائیں اور زیادہ سے زیادہ فائدہ دے سکیں۔ اس طرح مقامی لین دین کے نتیجہ میں جو کتابیں یہاں لکھی گئیں ہیں ان میں طبی نقطۂ نظر سے "مجموعہ ضیائی" اوّلین اور اہم کتابوں میں سے ایک ہے۔ محمد بن تغلق (وفات ۷۵۲ھ) جس کے عہد میں یہ کتاب لکھی گئی تھی خود بھی ایک عالم اور علم دوست بادشاہ تھا۔ وہ فلسفہ اور معقولات میں کافی درک رکھتا تھا۔ اس کے عہد کے بہت سے علما اور ان کی تصانیف کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُس دَور میں طبی سرگرمیاں کیا تھیں۔ اس بات کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

"مجموعہ ضیائی" کے آصفیہ والے مخطوطہ کا تعارف کراتے ہوئے حکیم عبدالوہاب پھلوری صاحب نے جو اظہار خیال کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد تغلق کے عہد کی طبی سرگرمیوں کا تذکرہ کسی جگہ نہیں ملتا ہے چنانچہ "مجموعہ ضیائی" آٹھویں صدی ہجری کے ابتدائی دَور کا ایک ایسا طبی مخطوطہ ہے جو ہندوستان کی تاریخ طب میں ایک اہم طبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور عہد تغلق کی طبی سرگرمیوں پر پہلی بار اس کے ذریعہ روشنی پڑتی ہے[1]۔ اس لحاظ سے "مجموعہ ضیائی" عہد تغلق کی غالباً واحد طبی

---

[1] ماہنامہ ہمدرد صحت دہلی نومبر ۱۹۵۱ء

تصنیف معلوم ہوتی ہے جو آج زمانے کی دست برد سے بچ کر ہم تک پہنچی ہے۔

آیورویدک ماخذ: آیورویدک طریقِ علاج سے استفادہ کرنے اور اسے یونانی طب میں بروئے کار لانے کی کوشش اسلامی ہند میں شروع ہی سے کی جانے لگی تھی چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد کتابوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں جن میں آیورویدک سے کسبِ فیض کر کے یونانی کو مالامال بنایا گیا ہے اس ضمن میں ایک طبی کتاب تو وہی ہے جو "مجموعۂ شمسی" کے نام سے موسوم ہے جس کے مصنف صاحب "مجموعۂ ضیائی" کے عم بزرگوار تھے جن کا نام خواجہ شمس مستوفی تھا۔ یہ کتاب بعض ہندی اطبا کی طبی تصانیف کا فارسی ترجمہ تھی۔ اس کتاب کا حوالہ خود "مجموعۂ ضیائی" ہی میں ملتا ہے۔ مصنف نے خود اس سے استفادہ کیا تھا۔ دوسری طبی کتاب کا پتہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"شیخ ضیاء الدین نخشبی (وفات ۷۵۱ھ) جو دراصل بداؤں کے باشندے تھے۔ ان کو طب اور موسیقی میں بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ ابن سینا کی طبی کتاب کلیات کے مقابلہ میں آپ نے ایک کتاب "الکلیات والجزئیات" نامی لکھی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یونانی دواؤں کے ساتھ ساتھ خاص اُن دواؤں کا بھی تذکرہ التزام کے ساتھ کیا گیا ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہر جگہ اُن دواؤں کے نام کو درج کیا ہے جس نام سے وہ ہندوستان میں مشہور ہیں۔[1]"

"مجموعۂ ضیائی" ۷۳۰ھ میں تصنیف کیا گیا تھا اس کے تقریباً ۵۳ سال کے بعد یعنی ۷۸۳ھ میں ایک منظوم طبی کتاب لکھی گئی تھی جس کا نام "طب شہابی" المعروف بہ "شفاء المرض" تھا، اس کے مصنف حکیم شہاب الدین تھے جو ناگور کے رہنے والے تھے۔ یہ کتاب کلیات و معالجات سے متعلق تھی۔ یہ کتاب اگرچہ چھپ چکی ہے لیکن اس کا ایک مخطوطہ ہمدرد (IHMMR) کی طبی لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس میں بھی جتنی دوائیں مصنف نے ذکر کی ہیں ان کے متعلق اس کا دعویٰ ہے کہ وہ تمام کی تمام اس کی آزمودہ ہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام دوائیں اس زمانے میں ہندوستان میں بآسانی پائی جاتی تھیں۔ "طب شہابی" کے منظوم دیباچہ اور کتاب کے آخری صفحات میں مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ اس نے ہندی اطبا اور ان کی کتابوں سے بھی براہ راست استفادہ کیا ہے۔

---

[1] ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، صفحہ ۲۱۴، دہلی ۱۹۶۶ء

"مجموعۂ ضیائی" کی ترتیب و تدوین کے تقریباً ۸۰،۵۰ سال کے بعد سلطان جلال الدین ابوالمظفر سکندر شاہ لودی کے حکم سے حکیم بھوہ بن خواص خاں نے ۹۱۸ھ میں معدن الشفا سکندر شاہی کی تالیف بھی اسی نہج پر کی تھی۔ حکیم بھوہ خاں نے تو نہایت واضح الفاظ میں یہاں تک لکھ دیا کہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکمت یونان ہندوستان کی آب و ہوا اور یہاں کے لوگوں کے مزاج کے موافق نہیں آتی ہے اور جو دوائیں فارسی زبان میں مذکور ہیں ان کی اصل حقیقت اور خواص ہمارے ملک میں معروف نہیں ہیں۔ لہٰذا اس نے حکمائے ہند کی تصانیف کو فارسی میں منتقل کر دیا ہے اور ہندی طب کی تمام خصوصیات کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ حکیم بھوہ خاں نے "معدن الشفا" کی تصنیف میں جن ہندی حکما کی کتابوں سے استفادہ کیا تھا ان میں سشرت، چرک، یادیوکرت، بھوج، سارنگدھر، چنتامنی، چکردت اور کبی دت وغیرہ شامل ہیں[1]۔

ہر دور میں اس طرز پر طبی کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں۔ مغل دورِ حکومت میں تو بکثرت ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ داراشکوہ نے بھی حکیم عین الملک شیرازی کے ذریعہ ایک اسی طرح کی طبی کتاب مرتب کرائی تھی جو "طب داراشکوہی" کے نام سے مشہور ہوئی تھی[2]۔ چنانچہ "مجموعۂ ضیائی" بھی اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہے جس کے ذریعہ محمد بن تغلق کے زمانے کے ایک طبی سرمایہ کا سراغ ملا ہے جو طب یونانی اور آیورویدک کا حسین امتزاج ہے، انھیں اسباب کی وجہ سے طب یونانی کو آج دیسی طب کہنا بالکل حق بجانب ہو گیا ہے۔

"مجموعۂ ضیائی" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد تغلق میں طب یونانی کے ماہرین ہندوستان کی مقامی طب یعنی آیورویدک طریق علاج سے کافی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ انھوں نے آیورویدک تعلیمات ان کے اصل ماخذ سے حاصل کی تھیں۔ اور اس وقت کے نامور مشہور ویدوں اور جوگیوں سے کسب فیض کیا تھا اس مقصد کے لئے انھوں نے سنسکرت زبان بھی سیکھی تھی۔ لہٰذا یونانی طب کو ہندوستان کی آب و ہوا اور یہاں کے مقامی ماحول کے مطابق بنانے کے لئے بڑی حد تک تبدیلیاں کی گئیں، نئے نظریات اپنائے گئے، مقامی دواؤں سے واقفیت حاصل کی گئی اور اس وقت کے ہندوستان میں مروج مخصوص طریق علاج اپنائے گئے۔ طب یونانی اور طب ہندی کے اس لین دین سے یونانی میں بے شمار دوائیں داخل ہونا شروع ہوئیں جو خالص ہندی تھیں۔ مثلاً اطریفل (جو معرب ہے تریپھلا کا) جسے مسلمانوں نے اپنی طبی دواؤں

---

[1] معدن الشفا سکندر شاہی۔ حکیم بھوہ بن خواص خاں ص۳۔ نول کشور ۱۹۱۵ء۔ [2] تاریخ طب اسلامی ایران و پاکستان حکیم نیر واسطی ص۱۱۱

میں شامل کرکے نئی نئی ترکیبوں کے ساتھ استعمال کیا اور فائدہ اٹھایا۔ بعض خالص ویدک ترکیبوں کو بھی اپنایا گیا۔ بعض وہ دوائیں جو اگرچہ پہلے سے بھی یونانی میں مستعمل تھیں۔ مگر ان کی اصل ویدک ترکیب کے ملی حالت باقی رکھا گیا جیسے چترنج (یعنی چہار تخم: ہالوں، کلونجی اور اجوائن) چترجات (یعنی تج، تیز پات، الائچی اور ناگ کیسر) ترکٹہ (یعنی سونٹھ، مرچ سیاہ اور پیپل)، پانچ کھار (یعنی قلیات خمسہ) پانچ لون (یعنی نمک) اور پانچ مول (یعنی پانچ جڑیں) وغیرہ جیسی بہت سی ویدک ترکیبوں کو یونانی کی نسخہ نویسی میں داخل کیا گیا۔ ادویہ مفردہ کے علاوہ ویدک قرابادین میں سے بھی بہت سے مرکب دوائیں اپنے رنگ میں اپنائی گئیں۔ چنانچہ معجون سپاری پاک، کردھونج، معجون گوگر راج اور چیون پراش جیسی وہ مشہور دوائیں ہیں جو آج بھی ہمارے یہاں معمولات مطب میں سے ہیں۔ جو بیشتر کشتوں کے استعمال سے ناواقف تھے مسلمان اطبا نے ہندوستان آکر ہی اس فن کو سیکھا اور اپنی طب میں داخل کیا۔ اسی طرح بہت سی دواؤں کے کھار نکالنے، مدبر کرنے، جلانے اور روغن نکالنے کی ترکیب جو آج ہمارے یہاں مروج ہے وہ سب آیورویدک دواسازی سے ہی ماخوذ ہے[۱]۔ "مجموعہ ضیائی" کا یہ مخطوطہ مذکورہ بالا بیان کی زندہ شہادت ہے۔ اس کا ہر صفحہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ مسلم اطبا نے اپنی طب کو ہندوستانی طب سے اس طرح ہم آہنگ بنا دیا کہ آج اس کا امتیاز مشکل سے ہوتا ہے۔

"مجموعہ ضیائی" کا مصنف ضیا محمد مسعود رشید زنگی کے متعلق یہ یقین ہے کہ وہ سنسکرت زبان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے ہندستانی ویدوں اور جوگیوں کی کتابوں سے براہ راست مطالعہ کرکے ان کے نسخہ جات کو اپنی کتاب میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مثلاً اس نے معاجین کی فصل میں معجون سگندھ رادت، معجون آملہ یعنی چیون پراش اور معجون امرت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح خالص آیورویدک اصطلاح دواسازی یعنی "رس" کا بھی تذکرہ بہ کثرت کیا ہے جیسے پربھاوتی رس، اگنی کمار رس، بھیروں رس، روگ ناتھ رس اور پنج امرت رس وغیرہ۔ ضیا محمد مسعود نہایت مذہبی قسم کے طبیب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مذہبی احتیاط کے پیش نظر شراب کے بارے میں ایک مقام پر انھوں نے لکھا ہے کہ:

"اگرچہ در دین اسلام حرام است ولیکن چوں در جلت ہا دیگر مباح بودہ است اطبا منفعت و مضرت آں در کتب آوردہ اند" (ورق ۱۴۴)

---

[۱] ماہنامہ "تحفہ" حیدرآباد ۱۹۵۵ء

اسی طرح اکثر نسخہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ فائدہ میشود یا اللہ تعالیٰ بکرم رحمت شفا دید۔ اس طرح کے جملوں سے کمال عبودیت ظاہر ہوتی ہے۔

اس مخطوطہ کا ۲۵ واں باب خاصیت ادویہ سے متعلق ہے۔ اس باب کو "کتاب الصیدنہ" اور "بستان الاطباء" جیسی کتابوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ تمام دواؤں کے نام سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور ان کی ترتیب حروفِ ابجدی کے بجائے حروفِ تہجی کے لحاظ سے قائم کی گئی ہے۔ جن مفرد دواؤں کو اس مخطوطہ میں ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی تعداد تقریباً ساڑھے گیارہ سو ہے۔ ہر دوا کا اصل یونانی نام پھر مروجہ ہندی نام۔ مزاج اور دستیاب ہونے کی جگہ اور پھر خواص وغیرہ بیان کیے گئے ہیں۔ دواؤں کے جو ہندی نام دیئے گئے ہیں آج بھی وہ دوائیں انھیں ناموں سے جانی پہچانی جاتی ہیں جیسے، ہلیلہ، بلیلہ، پلپل، دار پلپل، تخم کتان کے لئے السی، تشمیزج کے لئے چاکسو، حب النیل کے لئے نیل پری، خل کے لئے سرکہ، شونیز کے لئے کلونجی، کحل کے لئے سرمہ، قطران کے لئے روغن چالو، اور لسان العصافیر کے لئے اندرجو تحریر کیا گیا ہے۔ اسی طرح جواکھار، بکائین، سنگھاہولی اور گوکرو کو انہی ناموں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک مستقل فصل حیوانات کے خواص سے متعلق ہے جس میں ہندوستان میں پائے جانے والے حیوانات، پرندے، چرندے، درندے اور مختلف قسم کے کیڑے مکوڑوں کے بھی خواص گنائے گئے ہیں۔ مزید برآں ایک علیحدہ فصل ہے جس میں مختلف جانوروں کے گوشت اور ان کے دودھ، دہی کے خواص بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک مستقل فصل روغنیات سے متعلق بھی ہے۔ ایک فصل ــــ در خوردن زر و نقرہ ــــ میں مختلف چیزوں کے کشتہ جات کی ترکیب لہسن کے خواص ہندوستانی ویدک کتابوں سے اخذ کرکے لکھے گئے ہیں۔ اس دور میں لوگوں کے اندر ضعیف الاعتقادی زیادہ تھی اور وہ طلسمات بھوت پریت اور دیو پریوں کے بھی قائل تھے چنانچہ اس مخطوطہ میں بھی مختلف امراض کے لئے تعویذات، نقوش اور جھاڑ پھونک کے عملیات بھی تحریر کیے گئے ہیں اور جن بھوتوں و دیو پریوں کو قابو میں کرنے کے لئے متعدد دعائیں بھی لکھی گئی ہیں۔

غرض کہ مجموعہ ضیائی عہد تغلق کا ایک ایسا مخطوطہ ہے جس سے اس دور کی ایک واحد طبی تالیف کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ طب یونانی کو اہمیت

ملانے کی کوشش ہندوستان میں ابتدائی دور ہی سے شروع ہو چکی تھی۔ طب یونانی نے، طب ہندی سے بہت کچھ سیکھا اور اپنے دامنِ علم کو مقامی گل بوٹوں سے بڑی ہنرمندی کے ساتھ سجایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب طب یونانی کو کوئی ذی فہم اور ذی علم بیرونی طب نہیں کہہ سکتا۔ اب وہ بالکل دیسی اور ہندوستانی طب ہے، جو یہاں کے مزاج اور آب و ہوا سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ آج اس میں وہی تمام دوائیں استعمال کرائی جاتی ہیں جو اسی ملک کی پیداوار ہیں اور یہاں کے لوگوں کے مزاج کے موافق ہیں۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مجموعۂ ضیائی کے آصفیہ اور تغلق آباد والے دونوں نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک تنقیدی ایڈیشن تیار کیا جائے اور اس طرح ایڈٹ کر کے اس کو شائع کیا جائے اور اگر ضرورت محسوس ہو تو اس کا اردو میں ترجمہ بھی کیا جائے۔

••

الد جاوید شمسی
پٹنہ

کتاب المشجر

خدابخش کا ایک اہم طبی مخطوطہ

صنف کے بارے میں:-

خلیفہ ہارون رشید، مامون رشید، المعتصم اور الواثق کے دور کا مشہور عیسائی طبیب اور
صنف ابوزکریا یوحنا ابن ماسویہ جو یورپ میں MESUA کے نام سے مشہور ہے دار الترجمہ بغداد
پہلا افسر اعلیٰ تھا۔

جیسا کہ قفطی اور دیگر مورخین نے بھی لکھا ہے، ہارون رشید کے وقت سے متوکل کے عہد تک
غاری غذاؤں اور صحی تدابیر کا ہمہ وقتی مشیر تھا۔[1]

اس کا ہمعصر و پیشرو اور خلیفہ معتصم باللہ عباسی کا طبیب خاص سلویہ ابن بنان گو اس سے ذہنی
ر رکھتا تھا تاہم جب ابن بنان مرض الموت میں مبتلا ہوا اور المعتصم نے اس سے معالج میں اس کا جانشین
یافت کیا تو ابن بنان نے یوحنا ابن ماسویہ کا نام ہی تجویز کیا لیکن یہ بھی کہا کہ وہ بڑا فضول گو ہے جو کچھ
لئے اسے سوچ سمجھ کر استعمال کیجیئے گا۔[2]

پیش نظر مقالے میں اس کی پیشہ ورانہ مہارت سے زیادہ اس کی بے مثال تصنیفی برتری کو اجاگر
مقصود ہے اس لئے ہم اس کی طبیبانہ زندگی سے صرف نظر کرتے ہوئے اس کی علمی کمالات کی طرف
توجہ ہوتے ہیں۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں اسے جو امتیاز اپنے طویل دور میں حاصل رہا اس کا

---

[1] تاریخ الحکماء قفطی ترجمہ فارسی از قرن یازدہم ہجری ص ۵۱۳ -

[2] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۷۵

اندازہ بھی اس کے ہمعصر نا قدابن بنان ہی کی زبانی کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

"یوسف بن ابراہیم نے بیان کیا ہے کہ میرے اور سلویہ بن بنان کے درمیان ایک روز یوحنا ابن ماسویہ کا تذکرہ بحیثیت معالج کیا تو میں نے یوحنا کی تعریف کچھ زیادہ ہی کردی تھا تو سلویہ بن بنان نے جواب دیا کہ یوحنا ہر اس شخص کے لئے ہیبت ہے جو اس کو اپنا معالج بنائے اور اس کے کتابیاتی علم سے مرعوب ہو جائے اور اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجائے" [1]

اس کے ورثۂ علمی کے باقیات میں جو مجلّد مقرر شان نظر آتی ہے۔ اس سے یہ بات حرف بحرف ثابت ہو جاتی ہے کہ اس کی تصانیف کی ندرت واقعی طور پر اس کے ہمعصروں کے لئے ہیبت اور مرعوبیت کا سبب رہی ہوگی۔

کتاب کے بارے میں:

ابن ماسویہ کے سوانحی حالات مولوی عظیم الدین نے کتاب المشجر کا تعارف کراتے ہوئے خدا بخش لائبریری کے کیٹلاگ جلد چہارم میں تلخیص کئے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ کی بیشتر کتابوں میں اس کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے [2]۔ اس لئے مناسب ہے کہ مصنف اور کتاب کے بارے میں صرف اضافی اور اختلافی مسائل سے ہی بحث کی جائے۔ اس سلسلہ میں عظیم الدین کا مندرجہ ذیل اقتباس قابل نظر ثانی ہے۔

"ابن ماسویہ کی تصنیفات میں اس کتاب کا علم ابن ابی اصیبعہ اور ابن خلکان کو نہیں تھا۔ لیکن ابن القفطی نے (تاریخ الحکماء، ص ۳۸۱) میں کہا ہے:

---

[1] طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۷۶ و ص ۱۶۸ ابن ابی اصیبعہ۔ [2] ملاحظہ کریں۔ فہرست ابن ندیم طبقات الامم، تاریخ قفطی، مختصر الدول، طبقات الاطباء وغیرہ۔

"وکتاب المشجر کناش له قصد"

عظیم الدین (اعزاز الحق کیٹلاگ) کا یہ خیال کہ کتاب المشجر کا تذکرہ صرف جمال الدین قفطی نے کیا اور ابن ابی اصیبعہ (یا دیگر مورخین) کی نظر سے یہ کتاب نہیں گزری قدرے تفصیلی جائزے کا محتاج ہے۔

چنانچہ ہم طب کی چار بڑی تاریخوں کو بہ ترتیب ادوار زیر بحث لاتے ہیں۔

(۱) فہرست ابن ندیم۔ زیر بحث چاروں کتابوں میں قدیم ترین ہے۔ اس میں مذکور ۲۹ تصانیف میں کتاب المشجر نام کی کوئی کتاب نہیں ہے لیکن نمبر ۲ پر حمیات مشجر کے نام سے ایک کتاب ملتی ہے۔[1]

(۲) طبقات الامم میں ابن ماسویہ کی ۴۰ کتابوں کی فہرست ہے۔ کتاب الحمیات مشجر نام کی کوئی کتاب نہیں اور نہ کتاب المشجر نام کی کوئی کتاب ہے۔ البتہ نمبر ۷ پر کتاب الحمیات اور نمبر ۱۱ پر زابادین معروف بالمشجر مذکور ہے۔[2]

(۳) تاریخ الحکماء (قفطی) میں مذکور ۲۸ کتب میں نمبر ۱۱ پر کتاب الحمیات اور نمبر ۷ پر کتاب المشجر موجود ہے۔[3]

(۴) طبقات الاطباء (ابن ابی اصیبعہ) نے ۴۲ کتابوں کا تذکرہ کرتے ہوئے نمبر ۱ پر حمیات مشجر کا تذکرہ کیا ہے اور کتاب المشجر نام کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔[4]

مذکورہ جائزے سے ابھر کر سامنے آنے والی حقیقت یہ ہے کہ چاروں کتابوں میں [illegible] پر کتاب حمیات کا نام مشترک ہے۔ لیکن ابن ندیم اور ابن ابی اصیبعہ نے کتاب الحمیات کے ساتھ مشجر کا اضافہ کیا ہے اور ان دونوں نے کتاب المشجر کا علیحدہ نام نہیں لکھا ہے، اس کے مقابلہ میں صاعد اندلسی (طبقات الامم) اور قفطی نے کتاب الحمیات کے ساتھ لفظ مشجر کا اضافہ نہیں کیا بلکہ مشجر نام کتاب کو علیحدہ نمبر دیا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ ابن ندیم نے جو ترتیب میں سابق الاول ہے نقل

---

۱ کتاب الفہرست ص ۲۹۶ لابن ندیم مطبوعہ ۱۳۴۸ھ ۲ طبقات الامم ص ۹۵ صاعد اندلسی (اردو ترجمہ) ۳ تاریخ الحکماء ص ۵۳۷ قفطی (فارسی ترجمہ) ۴ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۸۳ لابن ابی اصیبعہ

کرتے وقت ص۱۳ پر کتاب المحیات کے ساتھ المشجر کو جو علیحدہ کتاب ہے اور جیسا پانچویں نمبر پر آنا چاہیئے تھا کتاب المحیات سے متصل کر دیا ہے اور گڈ مڈ ہو کر یہ دو کتابوں کی ایک کتاب بن گئی ہے۔ ابن ابی اصیبعہ نے آنکھیں بند کر کے ابن ندیم کی تقلید کر لی ہے لیکن ساعد اور قفطی نے ص۱۳ پر کتاب المحیات لکھ کر کتاب المشجر کو علیحدہ کر دیا ہے۔ اس طرح المشجر کا تذکرہ چاروں کتابوں میں ہے لیکن دو کتابوں میں کتاب المحیات سے خلط ملط ہو گیا ہے اور خواہ مخواہ ایک عالم کا سہو عالم کا سہو بن گیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ کتاب المشجر کے بارے میں مورخین کی روایات بہرحال متواتر ہیں۔

کتاب کی سب سے نمایاں اہمیت یہ ہے کہ جدول (TABLE) کے طرز پر لکھی جانے والی یہ طب کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ مولوی عظیم الدین نے جدول نگاروں میں صرف تین نام: ابن ماسویہ، ابن جزلہ اور نجیب الدین سمرقندی علی الترتیب گنائے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن ماسویہ اب تک کی دریافت میں طبی جدول نگاری کا موجد ہے اور اس کے بعد جدول نگاری کا سلسلہ ایک طویل شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے لئے ایک علیحدہ مقالہ درکار ہے۔ تاہم اتنی نشاندہی خارج از بحث نہیں ہے کہ جدول نگاری کی تاریخ میں ابن ماسویہ کے بعد ابن بُطلان کا نام آنا چاہیئے نہ کہ بقول عظیم الدین ابن جزلہ کا۔ بلکہ مولوی عبدالرحمان خان مصنف "قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی علمی خدمات" نے تو "تقویم الصحۃ"[۱] کے مصنف ابن بُطلان (متوفی ۱۰۶۳ء) کو جدولی طب کا موجد تصوّر کیا ہے[۱]۔ لیکن ابن ماسویہ (متوفی ۸۵۷ء) ابن بُطلان سے بہت قبل "کتاب المشجر" کے نام سے طب کی مکمل کتاب لکھ چکا تھا۔

عظیم الدین (خدابخش کیٹلاگ) نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے تفصیلی فہرست امراض نقل کر دی ہے۔ اس لئے اس کا اعادہ کئے بغیر یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ جس طرز کی جامع اور مختصر کتاب ہے اس کی افادیت آج کے ہنگامی دور میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ فلسفۂ طب کی طولانی بحثوں میں ڈوب کر حرفِ مطلب تلاش کرنا آج کے دور میں کارے دارد کا مصداق ہے لیکن کتاب المشجر میں حرفِ مطلب کو چھوڑ کر اور کچھ نہیں۔ مثلاً "کلیات" کے مسائل کو ابن ماسویہ نے صرف ایک باب میں محدود کر دیا ہے۔

---

[۱] "قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی علمی خدمات" مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۰ء حصہ اوّل ص۲۰۳-[۱] تقویم الصحۃ کا لاطینی نام TOBAL SANITA ہے۔

ابتدا الفاظ ہو:

الطب ينقسم العلم العمل والعلم ينقسم لمعرفة الاشيا الطبعية ولمعرفة العلل ۔

اس طرح علم کی تقسیم ورق ۵ ب تک پوری ہوگئی ہے ۔ نمونہ کے لئے چند سطریں بلا انتخاب نقل کی جاتی ہیں ۔

والقوى النفسانيه

منها مدبرة وهى	ومنها محركة وهى	ومنها مخسة وهى
الوهم ۔ والفكر ۔ والحفظ	التى تكون عنها الحركة الارادية والانتقال	السمع والبصر والشم والذوق واللمس

والارواح وهى

الروح الطبعية	والروح الحيوانيه	والروح النفسانيه
الكائنه فى الكبد وهى المنفذه للقوى الطبعية من الكبد فى الاوردة الى الاعضاء	الكائنه فى القلب وهى المنفذة القوى الحيوانيه من القلب فى العروق النابضه الى الاعضاء	الكائنه وهى المنفذه للحس والحركة من الدماغ فى العصب الى سائر الجسد

ورق ۵ ب پر العمل کی تقسیم اس طرح شروع ہوتی ہے ۔

والعمل ينقسم

لحفظ الصحة فى الاجساد الصحيحة	ولاكتساب الصحة للاجساد المرضى
ويكون ذالك بالاشياء المشاكلة	ويكون ذالك بالاشيا المضادة

اس حصہ کا آخری نمونہ یہ ہے :

الوجوه التى عليها مدار القصد لانواع المعالجات والماخذ اليها عشرة

اولها	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

کتاب الامراض زیں ورق سے شروع ہوتا ہے۔ ابتدا میں فہرست امراض باعتبار ابواب موجود ہے ہم اس فہرست کو مخطوطے کے اندرونی اعداد و شمار کا اضافہ کرتے ہوئے ناظرین کی خدمت میں موضوعات کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ امراض سر کا بیان:

- ۱ تا ۲۶:۔ فی داء الثعلب (باب اول) ـــــ فی الارتعاش (باب ۲۶) ق ۹ ـ ۳۰ ـ اس میں کل ۲۶ باب گنے جا سکے ہیں جبکہ عظیم الدین صاحب (خدا بخش کیٹلاگ) نے ۲۹ باب لکھے ہیں۔
- ۲۷:۔ فی اوجاع العین (ق ۳۰ ـــ ۳۹) ایک باب
- ۲۸-۲۹:۔ فی تورم اللہاۃ والحنک واللوزتین والخوانیق (ق ۳۹ ـ ۴۲) امراض حلق سے متعلق ۲ باب
- ۳۰:۔ فی السعال (ق ۴۲ ـ ۴۴) ۔ ایک باب ۔
- ۳۱ تا ۳۴:۔ فی الوجع المسمی فریقو لوموینا (ق ۴۴ ـ ۴۹) چار باب امراض حلق صدر اور ریہ کے بیان میں۔
- ۳۵:۔ فی اوجاع القلب (ق ۵۰) ایک باب ۔
- ۳۶:۔ فی اوجاع الثدی (ورق ۵۲) ایک باب ۔
- ۳۷:۔ فی تغیر روایح العرق الصبیان ۔ (ورق ۵۳)
- ۳۸:۔ فی اوجاع التی تعرض للمعدۃ ۔ (ورق ۵۳)
- ۳۹-۴۲:۔ فی اوجاع الکبد تا فی علاجات الاستسقا (ق ۶۸ ـ ۸۶) چار باب امراض کبد سے متعلق [1]۔
- ۴۳ تا ۴۶:۔ فی الاختلاف تا فی الدیدان (ق ۸۶ ـــ ۱۰۳) چار باب نزرب و خلفہ سے متعلق
- ۴۷:۔ فی اوجاع الکلی (ورق ۱۰۳ ـــ ۱۰۷)

---

[1] مخطوطے میں الباب التاسع والثلاثین کا اندراج کاتب نے غلطی سے اوجاع کبد کے علاوہ ہر قال پر کیا ہے۔ جو در اصل ۴۰ واں باب ہونا چاہیئے۔ مخطوطہ خدا بخش ورق ۶۳ الف ـ یہ غلطی آخر تک برقرار ہے۔ ناظرین ملحوظ رکھیں۔

۔ ۴۸ تا ۵۰:۔ فی تقطیر البول تا فی الوجع المسمّٰی دیابیطس (ق ۱۰۰ - ۱۰۹) تین باب امراض مثانہ سے متعلق۔

۔ ۵۱ تا ۵۵:۔ فی سیلان المنی تا فی الوجع الذی یعرض فی الذکر (ق ۱۰۹ - ۱۱۳) ۵ ابواب امراض مخصوصہ بمردان سے متعلق۔

۔ ۵۶:۔ فی الرحم و اوجاعہ (ق ۱۱۳ - ۱۱۴) ۔

۔ ۵۸ - ۶۱:۔ فی القوبا الکائن فی بسیط الجسد تا فی الحمرۃ (ق ۱۱۶ - ۱۱۷) چار باب امراض جلد سے متعلق ۔ اور یہیں مخطوطہ ناتمام طور پر ختم ہو جاتا ہے۔

ورق ۹ کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ ذیل چار باب ضائع ہوئے ہیں۔

۔ ۶۲:۔ فی الخدر الذی یعرض بالاصابۃ البرد الشدید

۔ ۶۳:۔ فی الوجع المسمّٰی (غیر واضح)

۔ ۶۴:۔ فی الجذام۔

۔ ۶۵:۔ (عبارت جلد سازی کی مرمت کاری سے چھپ گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا نسخہ المشجر الکبیر (کناش یحییٰ) کے نام سے رضا لائبریری کا رام پور میں محفوظ ہے۔[۱] کیٹلاگ کی اطلاع کے مطابق رضا لائبریری کا نسخہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ کلیات اور دوسرا معالجات پر مشتمل ہے۔ کیٹلاگ نے شروع کی عبارت مندرجہ ذیل اقتباس سے کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ کناش علل الامراض ودلائلہا وعلاجہا ۔ وھو کناش المعروف بالمشجر ۔ الباب الاول فی ان داء الثعلب ۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ مخطوطہ کا مواد پہلی جلد میں اور ورق ۹ سے آگے دوسری جلد میں کر دیا گیا ہے۔ رضا لائبریری کے نسخہ کی ابتدائی عبارت خدا بخش کی عبارت سے مل جاتی ہے، لیکن رضا کی عبارت میں کتاب کا نام الکناش المحرر وفیہ

---

[۱] ہینڈ لسٹ کیٹلاگ آف عربک مینوسکرپٹس۔ رضا لائبریری از امتیاز علی عرشی جلد ۵ صفحہ ۱۶۶ نمبر ۳۸۲۳۔

یالمشجر کا اضافہ ہے۔ طبقات الامم میں غالباً اسی کتاب کو قرابادین المشجر کے نام سے لکھا ہے۔ ناموں کے اختلاف کو ناقلوں کے اختلاف روایت پر محمول کیا جا سکتا ہے۔

حاصل کلام:۔ مندرجہ ذیل وجوہات سے یہ کتاب اشاعت کے لئے قابل ترجیح ہے

(۱) یوحنا ابن ماسویہ طبی جدول نگاری کا موجد ہے اس کی زیر تبصرہ کتاب سے طب جدول نگاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس لئے طب کی علمی تاریخ میں یہ کتاب اہم تاریخی انفرادیت کی حا[مل] ہے جو اب تک شائع نہ ہو سکی۔

(۲) یہ کلیات اور امراض و علاج کی ایک مکمل کتاب ہے جو جدول کے انداز میں اختصار اور جامعیت کے ساتھ ترتیب دی گئی ہے اور اس جیسی کوئی مطبوعہ کتاب استفادے کیلئے موجود نہ[یں]

(۳) یوحنا ابن ماسویہ بیت الحکمت کے مصنفین طب میں تصنیفی برتری کا حامل تھا جیسا اوپر مذکور ہوا۔ زیر تبصرہ کتاب کی اشاعت سے کچھ ایسے نکات سامنے آنے کی توقع ہے جن کا تعلق یوحنا کی امتیازی شان اور انفرادیت سے ہوگا۔

(۴) مرتب کی نظر سے جو جدولی مخطوطات ۔ مثلاً تقویم الابدان (ابن جزلہ) اور تقویم الطب۔ (فخر الدین الخجندی) وغیرہ گزرے ہیں۔ ان میں زیر بحث کتاب کم سے کم بیانیہ ہے جس میں صرف یادداشت رکھنے اور بار بار CONSULT کرنے والی چیزیں محفوظ کی گئی ہیں۔ ابن ماسویہ کی جدولیں مخصوص ... سے بنائی گئی ہیں جیسا کہ نمونوں سے ظاہر ہے۔

جناب نظام الدین احمد کاظمی

حکیم علوی خاں کی تالیفات کا تحقیقی جائزہ

حاذق الحکما، رئیس الاطبا، میر محمد ہاشم علوی خلف استاذ الحکما میر محمد ہادی علوی شیرازی کا وطن اصلی دارالعلم شیراز تھا۔ نسباً علوی اور مذہباً حنفی تھے۔ ١٠٨٠ھ/١٦٦٩ء میں شیراز میں ان کی ولادت ہوئی۔ ١١١١ھ/١٦٩٩ء میں تقریباً ٣١ سال کی عمر میں ہندوستان آئے۔ اس وقت شاہجہاں آباد (دہلی) شیرازی حکیموں اور طبیبوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ ان کے والد ماجد میر محمد ہادی، خالِ بزرگ میر محمد صالح، برادرِ بزرگ میر ابوالحسن مسیح الزمانی، برادرِ اوسط میر محمد جعفر علوی۔ شاہجہاں بادشاہ صاحبقران ثانی اور عالمگیر کے عہد حکومت میں شیراز سے ہندوستان آکر مصب شاہی کے حاذق اطبا میں شامل ہو چکے تھے۔ حکیم میر محمد ہاشم علوی اورنگ زیب عالمگیر کے دربار کے اطبا میں شامل ہوئے اور علوی خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔ یہ خطاب اتنا عام ہوا کہ لوگ ان کے اصل نام کو بھول گئے۔

١١١٩ھ/١٧٠٧ء میں ہندوستان کی تقسیم کے بعد عالمگیر نے اپنے تیسرے فرزند محمد اعظم شاہ کو دہلی کا تاج و تخت سپرد کیا، تو حکیم علوی خاں اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مگر یہ تعلق بہت کم مدت میں محمد اعظم شاہ کے قتل ہو جانے کے بعد ختم ہو گیا۔ جب اورنگ زیب عالمگیر کا دوسرا لڑکا معظم شاہ مسند آرائے حکومت ہوا، تو اس نے سابقہ اعزاز کے ساتھ حکیم علوی خاں کو شاہی اطبا کے زمرے میں شامل کر لیا۔ محمد معظم شاہ جو بہادر شاہ اور شاہ عالم (اول) کے لقبوں سے بھی مشہور ہے، ٢١ محرم ١١٢٤ھ/١٧١٢ء میں ٧١ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔

محمد اعظم شاہ اور محمد معظم شاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان طوائف الملوکی اور خانہ جنگی کا شکار ہو چکا تھا۔ محمد معظم شاہ (بہادر شاہ اول) کی وفات کے بعد اس کے چاروں بیٹے تخت سلطنت کے لئے معرکہ آرا ہوئے۔ قسمت نے سب سے پہلے معز الدین جہاندار شاہ کو تخت و تاج کا مالک بنایا۔ اس کے بعد فرخ سیر تخت پر بیٹھا، پھر سادات بارہہ کی بادشاہ گری کا دور دورہ ہوا اور چند سال کی مدت میں یکے بعد دیگرے خاندانِ مغلیہ کے چند افراد بادشاہ بنے۔ بالآخر محمد شاہ جو رنگیلے بادشاہ کے نام سے مشہور ہے، ذی قعدہ [illegible] میں دہلی

سکے تخت پر بیٹھا۔ اسی بادشاہ کے زمانہ میں حکیم علوی خاں کو عروج حاصل ہوا اور معتمد الملوک کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ چاندی میں تولے گئے اور شش ہزاری کے منصب پر فائز ہوئے۔ تین ہزار روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ جاگیریں اس کے علاوہ تھیں۔ مختصر یہ کہ علم و فضل، دربار شاہی میں اعزاز و اکرام، طبی قابلیت تامہ اور ماہرانہ حذاقت میں نہ صرف اُن کے دور میں بلکہ آج تک کوئی حکیم و طبیب اُن سے ہمسری کی جرأت نہ کر سکا۔ مشہور مؤرخ مسٹر ٹامس ولیم بیل، مؤلف مفتاح التواریخ نے ان کی اعلیٰ حذاقت اور بہترین معالجاتی قابلیت کا تذکرہ عبارت ذیل میں کیا ہے :

"حذاقت و حسن تداوی اُو در اطراف و اکناف شہرت یافتہ بُود۔ شعرای در تعریف اُو بسیار گفتہ اند۔ چنانچہ محتشم علی خاں حشمت تخلص در وصف اُو گفتہ :

ای دست تو دستگیر ہر شاہ و گدا | از فیض تو دردمند طلبان کار روا
خلق گوید کہ میکنی کار مسیح | من میگویم کہ میکنی کار خدا

لاریب کہ اس رباعی میں شاعر نے نغز گوئی اور نکتہ سنجی کے ساتھ حکیم علوی خاں معتمد الملوک کی تعریف و توصیف کا حق ادا کر دیا ہے۔ مذکورہ بالا رباعی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف بادشاہوں کے معالج خاص نہیں بلکہ غریبوں اور فقیروں کے بھی دستگیر و مددگار تھے۔ اُن کے بیت الشفا کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ان کے فیض مسیحائی سے تمام دردمند طلبوں کو فیض پہنچ رہا ہے اور عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ وہ مسیحا کا کام کر رہے ہیں۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ خدا کا کام کر رہے ہیں۔"

تذکرہ نویسوں نے خدمتِ عوام کے اس اہم پہلو کو حکیم علوی خاں کی زندگی سے خارج کر دیا ہے حالانکہ یہی وہ پہلو ہے جس نے اب تک ان کے نام کو زندہ رکھا۔ ورنہ بہت سے شاہی اطبا اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے، اور آج اُن کے نام اور کام سے بہت کم اہل علم واقف ہیں۔

عبد الکریم کشمیری مؤلف "بیان واقع یا (تاریخ نادری یا نادر شاہ نامہ) نے حکیم علوی خاں کا سالِ وفات ۱۱۶۰ھ لکھا ہے لیکن مسٹر ٹامس ولیم بیل نے اس سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا سالِ وفات اصلاً ۱۱۶۲ھ / ۱۷۴۹ء جو مندرجہ ذیل معروف تاریخ سے برآمد ہوتا ہے، بیان کیا ہے :

"بر فلک رفت مسیحای جدید" ۱۱۶۲ھ

بیشتر تذکرہ نویسوں نے معتمد الملوک حکیم علوی خاں مغفور کا سال وفات ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء لکھا ہے۔ اس لئے کہ ان کا

ماخذ عبدالکریم کی کتاب بیان واقع (تاریخ نادری) ہے لیکن از راہ تحقیق مسٹر ماس ولیم کا بیان صحت ہے۔ عبدالکریم کشمیری نے معتمد الملوک کی صرف ایک تصنیف جامع الجوامع کا ذکر کیا ہے۔ مسٹر ماس ولیم بیل نے بھی صرف اسی تصنیف کا تذکرہ کیا ہے اور اس کی ہمہ گیر جامعیت وافادیت کا بالفاظ ذیل اظہار کیا ہے

"میگویند کہ از جملہ تصنیفات او کتابیست مسمیٰ بہ "جامع الجوامع" کہ اگر فی المثل تمام کتب طب مفقود شوند، مسائل طبیہ از جامع الجوامع مستنبط می تواں نمود"

مذکورہ بالا عبارت کے پیش نظر جامع الجوامع کی عدیم المثال اہمیت وافادیت کا اندازہ لگایئے اور جائزہ لیجیے کہ حکیم محمد حسین خاں کی کتاب مجمع الجوامع یا قرابادین کبیر کو جامع الجوامع کہنے اور سمجھنے والے محققین نے کس قدر سہل انگاری سے کام لیا ہے۔

راقم السطور عرض کرتا ہے کہ جامع الجوامع اور مجمع الجوامع، دو الگ الگ کتابیں ہیں۔ دونوں کے مصنف الگ الگ ہیں۔ انداز بیان اور اسلوب ترتیب میں نمایاں فرق ہے۔ پھر مجمع الجوامع کے ساتھ "جامع الجوامع" لکھنا سراسر غلط ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ مجمع الجوامع کی اساس وبنیاد جامع الجوامع پر رکھی گئی اور اس کا بہت بڑا حصہ جامع الجوامع سے منقول وماخوذ ہے۔ خود مؤلف مجمع الجوامع نے اپنی اس عظیم وضخیم کتاب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ حکیم علوی خاں معتمد الملوک کی کتاب جامع الجوامع غیر مکمل رہ گئی تھی۔ اس لئے مجھ سے میرے پیر ومرشد نے فرمایا کہ اس کتاب کی تکمیل اسی انداز پر کرو۔ مدعا یہ تھا کہ جامع الجوامع میں جو خلا باقی رہ گئے ہیں ان کو حکیم علوی خاں کی مقرر کردہ ترتیب کے مطابق پُر کر دیا جائے۔ لیکن حکیم محمد حسین خاں مؤلف مجمع الجوامع اُس انداز پر جامع الجوامع کی تکمیل نہ کر سکے (بقول خود اپنی بیچارگی اور بے بضاعتی کی وجہ سے) اس لئے انھوں نے عام رواج کے مطابق اپنی الگ قرابادین کو جو مجمع الجوامع کے نام سے وہ لکھ رہے تھے۔ مکمل کرنا زیادہ بہتر اور آسان سمجھا اور اس کا نام بھی مجمع الجوامع یا قرابادین کبیر رکھا۔

اس وضاحت سے میرا مقصد یہ ہے کہ مجمع الجوامع کو جامع الجوامع سمجھ کر مطبوعہ کہنا بڑا گمراہ کن مغالطہ ہے اور اسی مغالطہ نے اہل علم اور ریسرچ اسکالرس کو حکیم علوی خاں کی گراں قدر اور نادر تصنیف کی تلاش وجستجو اور اس کی طباعت واشاعت کی طرف سے غافل رکھا۔ ورنہ جامع الجوامع ایسی کتاب ہے اس کو ڈیڑھ سو سال پہلے شائع ہو جانا چاہیئے تھا۔ اگر یہ کتاب اب اپنی اصل شکل وصورت جس میں اس کی عمدہ ترتیب وتدوین بھی شامل ہے۔ شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے تو طبی دنیا میں اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

احقر نے اس کتاب (جامع الجوامع) کی اب تک ۶ جلدیں دیکھی ہیں۔ ان میں سے چار رضا لائبریری، رام پور میں اور دو میڈیکل لائبریری I.H.M.M.R تغلق آباد دہلی میں موجود ہیں۔ یہ چھ جلدیں بڑے سائز ۲۰×۲۰ ½ کے تقریباً دو ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ کتابت بمبئی میں صدی ہجری کی ہے۔ کتابت خوشخط ہے۔ ان جلدوں کے علاوہ اور جلدیں بھی ہو سکتی ہیں۔ لیکن احقر کو فی الحال ان کا علم نہیں۔ تلاش و جستجو جاری ہے۔

حکیم علوی خاں کی تصنیفات میں سے ایک کتاب خلاصۃ التجارب بھی بتائی جاتی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ "خلاصۃ التجارب" شاہ بہاء الدولہ، سراج الدین حسن بن میر قوام الدین قاسم متوفی ۹۲۶ھ/۱۵۱۹ء کی بڑی مستند اور جامع طبی تصنیف ہے جو ہندوستان میں طلبۂ نصاب تعلیم میں شامل رہی اور اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ نول کشور پریس کے مطبوعہ نسخے اب بھی مل جاتے ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مصنف نے اپنا نام بہاء الدولہ لکھا ہے اور اس کا سنِ تالیف ۹۰۷ھ/۱۵۰۱ء لکھا ہے۔ مصنف کا پورا نام تحریر نہیں ہے۔ لیکن خدا بخش لائبریری پٹنہ اور میڈیکل لائبریری کیلیفورنیا میں خلاصۃ التجارب کے قلمی نسخے موجود ہیں۔ احقر نے ان دو کتب خانوں کی مطبوعہ فہرستوں سے مصنف کا پورا نام اور ولدیت اس مقالہ میں درج کی ہے اور اب یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ خلاصۃ التجارب حکیم علوی خاں کی تصنیف ہرگز نہیں، بلکہ بہاء الدولہ سراج الدین حسن کی تصنیف ہے۔ ہمارے ریسرچ اسکالر اس کو نوٹ فرمالیں۔

تیسرے نمبر پر جناب حکیم علی کوثر چاند پوری اور جناب نیر واسطی "عشرۂ کاملہ" کو حکیم علوی خاں کی تصنیف لکھا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ کتاب خان زماں امان اللہ خاں فیروز جنگ مؤلف "گنج بادآورد" (قرابادین خان زمانی) کی تالیف ہے جس کا ذکر انہوں نے گنج بادآورد کے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس لئے عشرۂ کاملہ کو علوی خاں کی تالیفات میں شامل نہ کیا جائے۔ چوتھے نمبر پر "قرابادین علوی خاں" کا نام لکھا ہے۔ لیکن یہ وہی جامع الجوامع ہے جس کا ذکر صفحہ ۱ پر آچکا۔

جناب حکیم علی کوثر اور پروفیسر نیر واسطی نے حکیم علی خاں کی جن چار کتابوں کے نام "اطبائے عہد مغلیہ" اور "رود الطب کی ایران و پاکستان میں" تحریر فرمائے ہیں، ان پر احقر کا تحقیقی اور تنقیدی بیان اس جگہ ختم ہوتا ہے۔ اب حکیم علوی خاں کی ان تالیفات و تصنیفات کا ذکر کیا جائے گا جن کا مطالعہ احقر نے براہِ راست کیا ہے اور ان کے مخطوطہ نسخے میڈیکل لائبریری (I.H.M.M.R) اور رضا لائبریری رام پور میں [illegible] یہ تمام کتابیں غیر مطبوعہ ہیں اور ان میں سے اکثر کتابوں کا صرف ایک ایک نسخہ مذکورہ بالا کتب خانوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کی

تفصیل درج ذیل ہے:-

(۱) جامع الجوامع محمد شاہی	۲ جلد	یہ چاروں کتابیں
(۲) مطب حکیم علوی خاں	مکمل	I. H. M. M.R کی
(۳) رسالہ امراض الاطفال	"	میڈیکل لائبریری میں
(۴) رسالہ قوانین علاج	"	موجود ہیں

یہ مطب حکیم علوی خاں جو نمبر ۲ پر درج ہے۔ اس کتاب سے الگ ہے، جو نول کشور پریس نے چند مرتبہ مطب حکیم علوی خاں کے نام سے شائع کی ہے۔ اس کا اصل نام دراصل "رسالہ قوانین علاج" ہے۔ مطب علوی خاں کے نام سے اس کو شائع کرنا، ناشر کی قابل گرفت اور مغالطہ انگیز غلطی ہے۔ اس رسالہ میں کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہیں۔ اس لئے اس کا از سر نو مرتب ہو کر شائع ہونا بہت ضروری ہے اور مطب حکیم علوی خاں کے نام سے یہ مکمل نسخہ جو میڈیکل لائبریری I. H. M. M. R میں موجود ہے تصحیح اور فٹ نوٹس کے ساتھ چھاپا جائے۔

بچوں کے امراض اور معالجات سے متعلق جو رسالہ ہے اس کو بھی اپنے اصل نام کے ساتھ جداگانہ شائع کیا جائے۔ فی الحال مطب حکیم علوی خاں کے مخطوطہ نسخے میں شامل ہے۔

(۵) جامع الجوامع محمد شاہی	۲ جلد	یہ تینوں کتابیں
(۶) رسالہ دستور علاج سوء القنیہ و استسقا		رضا لائبریری، رام پور میں
(۷) علاج الحمیٰ (رسالہ)		موجود ہیں

اب اس مقالہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیلات کے ساتھ انشاء اللہ جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ میں آپ حضرات کا پُر خلوص شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ایسے خشک مضمون کو پوری توجہ سے سماعت فرما کر احقر کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

●●

حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

اختیاراتِ قطب شاہی

[اختیاراتِ بدیعی کا تنقیدی مطالعہ]

اختیارات قطب شاہی دراصل قطب شاہی عہد (۹۸۹ - ۱۰۲۰ء) کا ایک مایہ ناز فارسی زبان میں لکھا گیا شاہکار ہے جو یونانی فارماکولوجی اور میٹریا میڈیکا پر مشتمل ہے۔

اس کے دو نسخے (ایک نسخہ عمومی دوسرا شاہی نسخہ) سالار جنگ میوزیم لائبریری حیدرآباد کی زینت ہیں، ایک اور نسخہ پاکستان میں موجود ہے۔

سالار جنگ میوزیم کا شاہی نسخہ ع ۱۲ کے تحت محفوظ ہے اور یہی ہمارے مقالہ کی بنیاد ہے۔ یہ نسخہ مشملات کی ایک طویل فہرست کے ساتھ اس طرح شروع ہوتا ہے: "آاطریلال اسم یونانی ست وبعضی گویند بریرلیست ....." مشملات کے اختتام پر رب ذوالجلال کی حمد وستائش کے ساتھ اصل کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: "سپاس بحید وستائش بے عدد حکیمی را جلّت حکمتہ سزاوار است کہ انوار غرایب حکمت از ہر ذرہ از ذرات موجودات ظاہر است"۔

مکمل مخطوطہ ۱۴۵۲ اوراق پر مشتمل ہے، جس میں سے اول ۳۳ اوراق ادویۂ مفردہ کی فہرست پر مشتمل ہیں۔ دواؤں کا تذکرہ حروف تہجی کے انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ دراصل کتاب میں متذکرہ ادویۂ مفردہ کی مکمل فہرست ہے، اوراق یا صفحات کے نمبر کے اندراج کے بعد ایک مفید اور کارآمد فہرست مدون کی جاسکتی ہے۔ تقریباً ۲۷۰۰ دوائیں بیان کی گئی ہیں۔

مخطوطہ کا سائز درج ذیل ہے:

۸ء ۲۸ × ۲ء ۱۷ ؛ ۹ء ۱۷ × ۳ء ۸

ہر صفحہ پر تقریباً ۱۰ سطور ہیں۔

شاہی نسخہ کے مشملات کے اوّل دو صفحات اور اصل متن کے اوّل دو صفحات یعنی ۲۲ اور ۲۴ خوبصورت نقش و نگار سے مزین کیے گئے ہیں اور ساری کتاب سنہرے حاشیوں سے آراستہ

گئی ہے۔ کاغذ اور جلد نہایت عمدہ ہے۔ ابتدائے مخطوط میں نواب حیدر یار خان، ۱۱۶۵ھ کی ایک مُہر بھی ثبت ہے۔

کاتب:۔ اختتامیہ کے مطابق زیر بحث شاہی نسخہ ۱۶۳۰ء میں لکھا گیا۔ کاتب کا نام محمد مومن بن عرب الشیرازی ہے جو عرب الشیرازی کے نام سے مشہور تھا۔ کاتب کی رہائش گولکنڈہ میں تھی۔ فارسی زبان کا یہ مخطوطہ نستعلیق کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔

مصنف:۔ یہ معرکۃ الآرا کارنامہ نہ صرف تنہا میر محمد مومن بن علی الحسینی الاسترابادی نے بلکہ چند دیگر مشاہیر اطبا کے تعاون سے انجام دیا۔

قطب شاہی عہد تقریباً دو سو سال تک گولکنڈہ میں بام عروج پر رہا (۱۴۹۵ء تا ۱۶۸۶ء)

"میر محمد مومن ممتاز اور ماہر معالجین کی صف میں سب سے زیادہ ممتاز ہے جو تقریباً ۱۵۵۲ء میں پیدا ہوا۔ اسے شاہ طہماسپ کے بیٹے کا اتالیق ہونے کا بھی فخر حاصل رہا ہے۔ وہ ۱۵۸۱ء میں ترک وطن کرکے گولکنڈہ پہنچا۔ اس کی خداداد صلاحیت اور انسانی دلکش کردار نے بہت جلد اسے ایک ممتاز اور ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا، جس کے نتیجے میں جواں سال حکمراں سلطان محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۸۶ء) بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ گولکنڈہ پہنچنے کے بعد پانچ سال کے اندر اندر "پیشوا" جیسے باعزت اور با اختیار منصب پر فائز ہوا۔ قطب شاہی عہد کے مشہور ہسپتال "دار الشفا" سے بھی وہ ممتاز معالج کی حیثیت سے وابستہ رہ چکا ہے۔[1]

اختیارات قطب شاہی کے علاوہ میر محمد مومن نے ایک رسالہ "رسالہ مقداریہ" بھی مدون کیا، جس میں طبی اوزان اور ان کے تسامحات کو درست انداز میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ اس مفید رسالہ کا فقط ایک نسخہ سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ (دوسرے نسخے "میزان المقادیر یا اوزان و مقادیر" کتاب خانہ گنج بخش اور کتاب خانہ راشدی، پاکستان میں موجود ہیں۔)

میر محمد مومن کا انتقال ۱۶۲۴ء میں ہوا اور دائرہ مومن حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی۔

مقصد تالیف:۔ اختیارات قطب شاہی دراصل مشہور کتاب "اختیارات بدیعی"

---

[1] بگی: [illegible]

کا جامع تنقیدی مطالعہ ہے، اس مقصد کے لئے اس کا انتخاب خود حکمران وقت نے کیا تھا۔ چنانچہ مصنف اس کے وجہ انتخاب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے:

"نسخۂ بدیع "اختیارات بدیعی" کہ در جمیع اقطار کالشمس فی نصف النہار شایع و مستفیدات مشمول نظر کیمیا اثر فرمودہ در اکثر اوقات اور با در جوع میفرمود، چہ جمیع اکثر ادویۂ مفردہ و مرکبہ مذکورہ در کتب معتبرہ متداولہ این فن مانند قانون، منہاج و جامع ابن بیطار و جامع و تقویم الادویہ و امثال اینہا بود"۔

اختیارات بدیعی :۔ یہاں "اختیارات بدیعی" کے بارے میں بھی کچھ لکھنا غالباً بے محل نہ ہوگا۔ اس کا مصنف حاجی زین الدین عطار الانصاری، شیراز میں ۱۳۲۹ء میں پیدا ہوا تھا۔ عہد مغلیہ کا یہ عظیم ماہر صیدلہ و علم الادویہ شاہ شجاع کا منظور نظر درباری طبیب تھا۔ اس کی سابقہ تصنیف "مفتاح الخزائن" کے نام سے موسوم تھی جو ۱۳۶۶ء میں مکمل ہوئی۔ یہ تین حصوں پر مشتمل تھی "اوّل ادویۂ مفردہ، دوم ادویۂ مفردہ کی اصلاح و شناخت، سوم ادویۂ مرکبہ۔ لیکن نظر ثانی کے بعد یہ کتاب باعتبار مواد بڑھ جانے کے بعد صرف دو حصوں تک ہی محدود رہ گئی یعنی ادویہ مفردہ اور ادویہ مرکبہ۔ اس نظر ثانی شدہ کتاب یعنی "اختیارات بدیعی" کو شہزادی بدیع الجمال کے نام سے معنون کیا۔

مفرد و مرکب ادویہ کے سلسلے میں معیاری اور صحیح معلومات کے لئے "اختیارات بدیعی" ماہرین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ادویہ مفردہ میں دواؤں کے افعال و خواص، مختلف زبانوں میں اُن کے نام اور ابدال وغیرہ جو اس کتاب میں مذکور ہیں، دراصل متقدمین کی معیاری کتابوں کا عطر ہیں، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت سی خامیاں ماہرین کے سامنے آتی گئیں، مثلاً اس میں ذاتی تجربات و مشاہدات کا فقدان نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قلی قطب شاہ نے محمد مومن بن علی الحسینی کو حکم دیا کہ وہ دیگر چند ماہر اطبا کی معاونت سے اصل ماخذات کو دیکھ کر متعدد مفرد دواؤں کے سلسلے میں موجود غلط فہمیوں کا ازالہ کریں تاکہ یہ کتاب اپ ٹو ڈیٹ ہو جائے، چنانچہ محمد مومن ان امور کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے:

"جملہ بنا بر قلت تدرب و ممارست مولف فی الجملہ از بعضی مساہلہ و مسامحہ خالی نبود۔ این بندۂ دیرین محمد مومن بن علی الحسینی عفی عنہما باتفاق حکما معتبرین

مامور گشت کہ ہر یک دیگرے را نامزد معین بودہ رجوع بکتب ماخذ نمودہ ہرچہ
موافق ہم باشد اشارہ بموافقت کند و ہرچہ موافق بعضے و مخالف بعضی باشد
ذکر مخالفت نمود و اشارات بموافقت نمود و اگر موافق ہیچ یک ازاں کتب نباشد
ذکر مخالفت بکند و اگر در حل عبارت ماخذ مساہلہ شدہ اشارہ بحل کند"۔

پوری کتاب دیکھنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مصنف نے چند رہنما اصول تحقیق مقرر کیا
اور اُن پر آخر تک پوری پابندی سے عمل پیرا رہا جیسا کہ اُس نے خود اشارہ کیا ہے:۔

"و آنچہ اصل اختیارات است از تعاویذ ملحقات مختارہ مذکورہ پیش نقل ہر
عبارت از اختیارات بنوشتن لفظ "اصل" کہ بسرخی مرقوم کردہ اشارہ باین معنی
خواہد بود و پیش از ذکر آنچہ متعلق آں اصل گردیدہ ملحق است بسرخی لفظ "ملحق"
خواہد بود"

وجہ تسمیہ اختیارات قطب شاہی: مولف اپنے مربیّ اور فرماں روائے
وقت سے جو حسن عقیدت رکھتا تھا اُس کا برملا اظہار اس نے حمد و منقبت کے بعد کیا ہے۔ جس کا تھوڑا
بہت اندازہ اقتباس ذیل سے ہو سکتا ہے۔

"بنا بر نہایت حظ وافر از جمیع علوم منقول و معقول و غایت مہارت در مسائل
فروع و اصول اکثر اوقات شریف صحبتِ افاضل و تحقیق مسائل مصروف بود"۔

میر محمد مومن نے اس کتاب کو "اختیاراتِ قطب شاہی" اپنے ممدوح فرماں روا کے نام منسوب
کیا تاکہ اصل بدیعی سے یہ کاوش ممیز و ممتاز ہو سکے، چنانچہ وہ رقمطراز ہے: "و بجہت آنکہ بحسب اسم
نیز این مولفِ ابداع را ازاں اصل امتیاز باشد بنام اعلیحضرت آمر لازال نفوذ امرہ و علو قدرہ ترکیب جستہ
این مولف مجسمہ "اختیارات قطب شاہی" گردید"۔

تنقیح و تحقیق کے رہنما اصول: جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے
کہ محمد مومن نے اختیارات بدیعی کے فقط اس مقالہ کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے، جو اودیۂ مفردہ پر

مشتمل ہے۔ سب سے پہلے اس نے اس میں درج ادویۂ مفردہ کی ایک باضابطہ فہرست مرتب کی ہے۔ جسے آغاز کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ یہ مشکلات کی غرض سے بھی استعمال کی جا سکے۔ اس کے بعد کتاب کے اصل متن میں اختیارات بدیعی میں مذکورہ ادویہ کے نام درج کر کے دیگر معیاری کتب کے حوالے سے موافق یا مخالف انداز میں بحث کی گئی ہے، چنانچہ سب سے پہلے وہ "اصل" کے زیر عنوان بدیعی کا اقتباس پیش کرتا ہے اور پھر "ملحق" کے زیر عنوان دیگر معیاری کتب کے حوالے سے تحقیقی مواد درج کرتے ہوئے قول فیصل کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ اقتباس ذیل سے اس کی علمیت، سائنٹفک انداز فکر اور تنقیدی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے:

"اصل: باب الالف آطریلال ..... الخ

"ملحق: در جامع گفتہ کہ در اول والفست کہ اول ہمزہ ممدودہ است و در مختار الادویہ کہ مبنی بر دو الفست یکی ہمزہ ممدودہ و دیگری سوائیہ و بعد ازاں طاء مہملہ مکسورہ و راء مہملہ مکسورہ و یاء ساکن و لام الف ساکن و در اعراب الادویہ گفتہ کہ اسم یونانیست ہمزۂ اول مفتوح و دوم ممدود باقی موافق جامع است۔

..... اصل: طبیعت آطریلال گرم و خشک است در آخر درجہ دوم۔

ملحق: موافق جامع است۔

اصل: در مداوای برص و بہق بغایت سودمندست و بعض تنہا بکار دارند و بعض یکدرم ازاں با دانگی عاقر قرحا بسایند و با عسل سرشتہ لعوق نمایند و یکساعت یا دو ساعت در آفتاب بنشینند چنانچہ عرق کنند و گاہ باشد کہ ہماں زماں آبلہ زند و گاہ باشد کہ روز دیگر یا شبانہ آبلہ زند و بعد ازاں آب زرد بسیار ازاں روانہ شود و بقدرت حق جل و علا گوشتمند بود زود و تر و آسانتر زایل شود و ایں تجربت و مکررات جامع ایں کتاب امتحان کردہ ایں سرے عجیب است اما بشرط آنکہ اول تنقیہ کردہ باشد آں گاہ ایں دوا استعمال کند و باید کہ در تابستان بود در وقتی کہ آفتاب بنشیند چنداںکہ عرق کند و اگر بسایند آطریلال تنہا بعسل کف گرفتہ بسرکہ سرشتہ و ہر روز دو مثقال باب گرم بیاشامند پانزدہ روز متواتر البتہ برص کلی زایل شود

باذن اللہ تعالیٰ دیگر اطریلال کو فتہ و بیختہ در بینی نن زنند بچہ بیند اند۔

ملحق : تا آخیر وانق جامع است و در منہاج و قانون و سدیدی مسطور است
کہ چون بیخ آطریلال بجوشانند و بیاشامند اسہال کہن را نافع بود و یونس
گویا تو بیخ را نافع است و عمل سورنجان میکند بصفت و در جامع از زہراوی نقل
کردہ کہ آشامیدن شحم این گیاہ بیخ شکمی را نافع است۔"

دوا کے ذکر کے ساتھ ساتھ میر محمد مومن اس کے نام کے ادبی و لسانی پہلو کو بھی اجاگر کرتا جاتا ہے، جس کی مثال اطریلال میں گذر چکی ہے۔ وہ دوا کے نام کا ماخذ و مصدر بھی پورے اعتماد کے ساتھ بتاتا ہے۔

جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص مزاج، جائے پیدائش، ترکیب استعمال، مضر اثرات، مصلحات و ابدال ادویہ نہ صرف بدیعی بلکہ دیگر متفق علیہ کتب کے حوالے سے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ چونکہ اصل بدیعی کا ماخذ عربی کتب ہیں، اس لئے مصنف کو دوران اخذ و ترجمہ تسامحات سے دوچار ہونے کے امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ میر محمد مومن نے اس کی ایسی بہت سی خامیوں کو نہ صرف درست کیا بلکہ درست سمت میں کام کرتے ہوئے تعبیری غلطیوں کی بھی اصلاح کی ہے، جس کا اشارہ اس نے دیباچہ میں کیا ہے۔ اس سے عربی زبان پر اس کی دسترس بھی مسلم ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام: یہ کتاب دراصل متقدمین و متاخرین کے دستیاب لٹریچر کے تحقیقی مطالعہ کا ثمرہ اور یونانی ادویہ مفردہ کی قابل قدر اور حسین دستاویز ہے۔ اس کی روشنی میں ایک معیاری اور عصری یونانی مٹیریا میڈیکا مدون کی جا سکتی ہے۔ سالار جنگ میوزیم لائبریری کا شاہی نسخہ نہ صرف حیدر آباد فرخندہ بنیاد بلکہ پورے ملک کے لئے وجہ افتخار ہے۔ ••

حکیم مرزا عبد اللہ ربیگ لکھنؤ

تلخیص الطب

بارہویں صدی ہجری کا ایک اہم مخطوطہ

کاکوری (ضلع لکھنؤ) کے ایک ذاتی ذخیرہ میں تلخیص الطب نامی ایک طبی مخطوطہ محفوظ ہے جو ضلع اناؤ (یو پی) کے حکیم مرزا ظفر اسماعیل کی تصنیف ہے۔ یہ مخطوطہ بارہویں صدی ہجری کے اواخر یا تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں لکھا گیا تھا۔

یہ فارسی کا ایک ضخیم مخطوطہ ہے، ۴۶۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس پر تکمیل الطب کالج کے بانی حکیم عبد العزیز کی ایک مہر بھی ثبت ہے۔ اس تصنیف میں مصنف نے تمام طبی معلومات جو اس عہد کی طبی کتابوں میں محفوظ تھیں اکٹھی کر دی ہیں۔

دیباچے میں کتابیات کی ایک طویل فہرست بھی دی گئی ہے جس سے ان ماخذ کا پتا چلتا ہے جن سے مصنف نے اس ضخیم کتاب کی تصنیف میں مدد لی ہے۔ یہ کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- الحاوی فی الطب ۲- القانون فی الطب ۳- موجز ۴- کفایہ منصوریہ ۵- ذخیرہ خوارزم شاہی ۶- رسالہ الذہبیہ فی الطب ۷- التحفہ فی الطب ۸- تقویم الابدان فی تدبیر الانسان ۹- زبدۃ الطب ۱۰- کتاب الجامع لمفردات الادویہ ۱۱- تذکرہ داؤد انطاکی ۱۲- تحفۃ المومنین ۱۳- اختیارات قاسمی ۱۴- اختیارات بدیعی ۱۵- اسرار الاطباء ۱۶- غیاثیہ ۱۷- قانون اطباء ۱۸- التوضیح والاحتباس ۱۹- الاغراض الطبیہ ۲۰- کتاب المغنی ۲۱- کتاب الکلیات لابن رشد ۲۲- مجموعہ طب ضیائی ۲۳- قوانین الادویہ ۲۴- کتاب الکلیہ والمثانہ ۲۵- معالجات بقراطیہ ۲۶- کتاب فی حفظ الصحت و ازالۃ الامراض - ۲۷- کتاب الماۃ فی سنۃ الطبیہ۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ مصنف نے اپنے ماخذ کی فہرست میں ابن رشد کی مشہور کتاب "کتاب الکلیات" کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اب تک کی اطلاع کے مطابق ابن رشد کی اس کتاب کے صرف چار نسخوں کا علم تھا (ایک اسکوریال میں، دو میڈرڈ میں اور ایک لینن گراڈ میں) —— لیکن اب اس حوالے کے بعد

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ (اگر مصنف نے اس کا مطالعہ بنفس نفیس کیا ہے) تیرہویں صدی ہجری کے آغاز تک ہندوستان میں بھی محفوظ تھا اور غالباً اودھ میں۔

کتاب کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں بنیادی اصولوں یعنی کلیات سے بحث کی گئی ہے دوسرے حصے میں ادویہ یعنی معالجات پر بحث ہے اور تیسرا حصہ صرف مفردات کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ ہر حصے کو پھر متعدد ابواب اور فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ نو ابواب پر مشتمل ہے جن میں عناصر، مزاج اور اس کے اقسام پر بحث ہے۔ دوسرا حصہ ۴۵ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سر سے پیر تک کی مختلف بیماریوں سے بحث کی گئی ہے۔ تیسرا حصہ ۱۲۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں مختلف مفردات پر بحث ہے۔ اس حصہ میں اوزان اور پیمائش اور ان کے آپسی متبادلات کی ایک فہرست بھی دی گئی ہے۔

مصنف نے بڑے منظم انداز میں پہلے بیماریوں کی تعریف بیان کی ہے پھر اس کے اسباب پر بحث کی ہے اس کے بعد بیماریوں کی علامتوں پر بحث کرتے ہوئے ان کے تدارک کے طریقے زیر بحث آئے ہیں پھر آخر میں 'مفردات' کو بنیاد بنا کر ان کے طریقۂ علاج پر بحث کی گئی ہے۔ (تلخیص) ●●

مطبوعہ جامع ابن بیطارؒ کے اغلاط

مخطوطات ابن بیطار کی روشنی میں

ضیاء الدین ابو محمد عبداللہ المالقی النباتی المعروف بہ ابن بیطار کی مشہور تصنیف "جامع المفردات الادویہ والاغذیہ" چار جلدوں میں قاہرہ سے ۱۲۹۱ھ میں طبع ہوئی تھی۔ لیکن یہ طبع شدہ نسخہ بہت سے اغلاط کا حامل ہے لہٰذا ضرورت ہے کہ دیگر خطی نسخوں سے مقابلہ کے بعد از سر نو اس کتاب کو شائع کیا جائے۔

طبع شدہ نسخے کی پہلی جلد کے چند اغلاط بطور مثال یہاں پیش کئے جاتے ہیں:۔

ص۳۔ اس صفحہ سے جو باب شروع ہوتا ہے اس کی پہلی لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "(آنوسن) اسم یونانی اوله الفان منهما مهموزة ممدودة والثانية هو انية" اس جگہ لفظ 'هو انية' صحیح نہیں۔ غالباً یہ 'هوئية' ہے۔

۔ اسی صفحہ کی تیسری لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "هو الدواء المعروف اليوم بالشام بحشيشة النجاة وحشيشة السلحفاة" یہاں لفظ 'نجاة' صحیح نہیں۔ دیگر حوالوں کے مطابق یہ لفظ 'لجاة' ہے۔

۔ اسی صفحہ کی چوتھی لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "وهو في المجس الا الخشونة ما هو ذو ساق واحدة" دوسرے خطی نسخوں میں 'في المجس' کی جگہ 'في الخشن' ہے جو مناسب ہے۔

۔ اسی صفحہ کی چھٹی لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "فيه بزر صغير الى العرض ما هو ذو ساق واحدة" خط کشیدہ الفاظ جملے کی مناسبت میں نہیں ہیں کیونکہ کسی بیج کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ 'زیادہ وسیع ہوتا ہے اور ایک تنے والا ہوتا ہے' غیر معقول بات ہے یقیناً طباعت کے وقت کچھ رہ گیا ہے۔ مذکورہ بالا جملہ اس طرح ہونا چاہیئے تھا: "فيه بزر صغير الى العرض وما هو ينبت

فی مواضع جبلیۃ"

ــــ اسی صفحہ کی ساتویں لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "مسکن البرد اذا کان بلا حمی واذا امسک بالید اونطل الیہ فعل ذالک ایضا" یہاں لفظ 'البرد' غلط معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس سے قبل 'مسکن' کا لفظ آیا ہے غالباً یہ لفظ 'الحرد' ہے۔

دیاسقوریدس کی کتاب کے انگریزی ترجمہ میں اس کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ 'الحرد' کے ہی ہم معنی ہے۔ اسی طرح دیاسقوریدس کی کتاب کے انگریزی ترجمہ میں 'اونطل اللہ' کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ قطعی مختلف ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ صحیح لفظ کو تلاش کیا جائے۔ اسی طرح اور بھی بہت سے اختلافات ہیں۔

لک

ص۴ : اس صفحہ کی دوسری لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "وتجلوا ایضا جلاء لیسیرا ولذا صار یسقی الکلیتین ویذھب الکلف من الوجہ" اس جملے میں لفظ 'الکلیتین' (گردے) زائد ہے۔ اس جملے کو اس طرح ہونا چاہیئے تھا: "ولذالک صار یسقی و یذھب الکلف من الوجہ"

ــــ اسی صفحہ کی تیسری لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "ابوالعباس قال بعض شیوخنا انما سمی عندھم فارۃ لان القلب یفر منہ الخفقان اذا شرب ھذا" اس جملے میں لفظ "فارۃ" صحیح نہیں، اسے 'قارۃ' ہونا چاہیئے تھا۔ یہی نام 'حرف القاف' (جلد چہارم ص ۴) میں مذکور ہے۔ آگے کا جملہ اس طرح ہونا چاہیئے تھا: "لان الکلب یفر منہ اذا شم ھذا" چنانچہ فارۃ، قلب، خفقان اور شرب یہ تمام الفاظ جو طبع ہوئے ہیں غلط ہیں۔

ــــ اسی صفحہ کی چوتھی لائن اس طرح ہے: 'واکثر شوکا لکمایذور'۔ یہاں لفظ 'لکمایذور' مشکوک ہے۔ گذشتہ سطروں میں جملے کے آخر میں یہ جملہ ہے: "ھوالدواء المسمیٰ بالیونانیۃ سطاخنوس وسیاتی ذکرہ فی حرف السین" لیکن حرف السین میں سطاخنوس کا تذکرہ نہیں ہے۔ لیکن ایک مفردہ سطاخیس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سطاخنوس غلط ہے یہاں بھی سطاخیس ہی ہونا چاہئے تھا۔

ــــ اسی صفحے کی دسویں لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "وذکر الغافقی دواء اخر وسماہ عشبۃ

السباع... وذكرته في حرف العين في مفرده 'عشبة السباع' کا جو بیان ہے وہ اس طرح طبع ہوا ہے: "هو نبات له قضبان كقضبان المنتان" چنانچہ لفظ منتان کو حرف المیم میں تلاش کیا گیا۔ لیکن اس کے بجائے 'مغتنان' ملا جس کے بیان میں بھی کافی غلطیاں پائی گئیں۔ جنھیں دیگر نسخوں سے مقابلہ کے بعد درست کیا جانا چاہیئے۔

ص۵ اس صفحہ پر ایک مفردہ 'آکشار' کا بیان ہے۔ اس مفردہ کے بیان کی چوتھی لائن اس طرح طبع ہوئی ہے: "نبات جزری الشکل في رقه" اس جملہ میں لفظ 'رقه' غلط ہے۔ اسی طرح اسی مفردہ کے بیان کی گذشتہ سطروں میں بھی متعدد غلطیاں ہیں۔

ص۶ اس صفحہ پر مفردہ 'الميلس' کا بیان اس طرح طبع ہوا ہے: هو شجر يعلو فوق القامت ويتدرج" اس جملے میں لفظ 'یتدرج' صحیح نہیں غالباً یہ 'یتدوح' ہے جس کی توثیق دیگر نسخوں سے کی جا سکتی ہے۔

● اسی صفحہ پر ایک دوسرا مفردہ 'ابهل' کا بیان ہے۔ اس کے بیان میں بھی بہت سی غلطیاں ہیں جنھیں دیگر نسخوں سے مقابلہ کے بعد درست کرنا ضروری ہے۔

نمونہ کی مندرجہ بالا اغلاط کی روشنی میں ضروری ہے کہ تصحیح متن کے بعد اس اہم تالیف کی ازسرنو اشاعت کی طرف توجہ دی جائے۔

(ملخص) ●●

جناب سکندر حسین
حیدرآباد

معالجات بقراطیہ

'معالجات بقراطیہ' دسویں صدی عیسوی کا ایک نادر مخطوطہ ہے جس کے چار نسخے ہندوستان میں محفوظ ہیں۔ پہلا نظامیہ طبی کالج حیدرآباد میں، دوسرا اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش میں، تیسرا مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں اور چوتھا خدابخش لائبریری پٹنہ میں۔

اس کا مصنف ابوالحسن احمد بن محمد طبری ہے جو ابو ماہر بن موسی کا شاگرد تھا۔ تذکروں میں اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نہیں ملتی۔ یہ طبرستان کے بادشاہ رکن الدین کا شاہی طبیب تھا۔ اس کا تذکرہ نجم الدین سمرقندی (۸۶۵-۹۲۵ء) کی مشہور کتاب 'کتاب الاسباب والعلامات' میں ملتا ہے۔

نظامیہ طبی کالج میں اس مخطوطہ کا جو نسخہ محفوظ ہے وہ ۲۰۵ صفحات پر مشتمل ہے اور خط نسخ میں ہے۔ کتاب کے سرورق پر تین مکمل اور دو نامکمل مہریں ثبت ہیں جو ناقابل قرأت ہیں۔ یہ مخطوطہ نورالدین محمد الموسوی کی ملکیت تھا جیسا کہ سرورق پر تحریر ہے:

"من جملۃ الکتب نورالدین محمد الموسوی ... ینتقل
ھذا الکتب منی الی ولدی احمد شھود... ۱۰۵۴ھ حرر نورالدین محمد"

آغاز کتاب سے صفحہ ۱۱ تک صفحہ نمبر نہیں ڈالا گیا ہے لیکن ورق ۱۲ تا آخر کتاب اردو میں نمبر ڈالے گئے ہیں۔ متعدد صفحات کے حاشیہ پر متعدد تصحیحات بھی درج ہیں۔

مخطوطہ دس مقالات پر مشتمل ہے اور پھر ہر مقالہ مختلف فصلوں اور ابواب میں منقسم ہے۔ کتاب مندرجہ ذیل عبارت پر ختم ہوتی ہے:

"وانما یستخرج ھذا من قوۃ کلام جالینوس... ومتی وقع تقصیرہ فی تامل شئ ذالک وقع بحسبہ النقصان فی المعالجۃ"

کاتب کا ترقیمہ درج ذیل ہے:

"تمت المقالۃ العاشرۃ من الکناش المعروف بالمعالجات

البقراطیہ علی یدالعبد الضعیف المحتاج الی رحمۃ اللہ الملک
الغنی صابن بن شیخ کبیر المرشدی وفرغ من کتابتہ فی
یوم السبت بحمد اللہ وتوفیقہ آمین۔"

دیباچہ میں مصنف نے اس کتاب کی تصنیف کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی ہیں:۔

۱۔ قدیم اطباء نے بیماریوں کی درجہ بندی صحیح ڈھنگ سے نہیں کی تھی۔

۲۔ انہوں نے عملی معالجات کے اصول و ضوابط کی پیروی صحیح ڈھنگ سے نہیں کی تھی۔

۳۔ ان میں سے بیشتر نے علمی حقائق سے زیادہ خیالی باتوں پر اپنی بحث کی بنیاد رکھی تھی۔

۴۔ اعلیٰ علوم سے بے توجہی برتی گئی تھی اور اس عہد کے لوگوں سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا تھا۔

۵۔ غیر طبی علوم مثلاً علم ہیئت، علم کائنات، علم طبیعیات وغیرہ پر قدیم طبی کتابوں میں صحیح ڈھنگ سے بحث نہیں کی گئی تھی۔

۶۔ معالجات کے متعدد مفید طریقے لاعلمی کی وجہ سے ترک کر دیئے گئے تھے۔ مثلاً فصد (Venesection) کھولنے کا طریقہ۔

۷۔ زخم کے مقام اور علاج کو پہلے کبھی تفصیل سے نہیں بیان کیا گیا تھا۔

اس کتاب کا مصنف معالجات کے بقراطی نظریہ کا حامل تھا۔ بقراط جو معالجات کا استاد مانا جاتا ہے، مشاہدہ (Observation) اور جانچ پڑتال (Verification) کا قائل تھا، چنانچہ مصنف نے اپنی اس کتاب میں معالجات کے صحیح رخ کو پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کتاب کا نام 'معالجات البقراطیہ' رکھا ہے۔

مندرجہ بالا خصوصیات کے علاوہ یہ کتاب متعدد ایسی باتوں کی حامل ہے جو پہلی بار منظر عام پر آئیں، مثلاً

۱۔ پہلی بار ان وجوہات کا بیان سامنے آیا جو خارش کا سبب بنتے ہیں۔

۲۔ پہلی بار اثیر (Ether) کا اور کائنات میں اس کی اہمیت کا واضح تصور سامنے آیا

۳۔ پہلی بار نزول الماء (Pathology of cataract) کا بیان سامنے آیا۔

۴۔ پہلی بار تپ دق (Tuberculosis) اور تپ محرقہ (Consumption) کا ایک

سائنٹفک درجہ بندی سامنے آئی۔

۵۔ پہلی بار پت (Bile) اور کیلوس (chyle) کے اثرات کی تفصیل سامنے آئی۔

۶۔ پہلی بار قلت الدم (Pernicious anemia) اور اس کی علامات کی طرف رہنمائی ملی

۷۔ پہلی مرتبہ دل کی (Ischamic) کی تفصیل سامنے آئی۔

کتاب جہاں امراض کی تحلیل و درجہ بندی اور اپنی سادگی زبان میں ایک ندرت کی حامل ہے وہیں اس میں چند کمیاں بھی ہیں۔ مثلاً پہلے مقالے کے مختلف ابواب کی ترتیب میں کوئی منطقی نظم نہیں ہے۔ ہڈیوں (Bones) شریانوں (Arteries) اور رگوں (veins) پر کوئی علیحدہ تفصیل نہیں دی گئی ہے۔ وضع حمل (Obstetrics) اور امراض نسواں (Gynaecology) کے مسائل پر گفتگو نہیں کی گئی اور نہ ادویہ اور ان کے تیاری پر کوئی تفصیلی گفتگو ہے۔ کتاب کے مشتملات درج ذیل ہیں:۔

پہلا مقالہ: اس مقالہ میں علم ہیئت، علم کائنات، علم نجوم، علم طبیعات، علم کیمیا یہاں تک کہ علم مابعد الطبیعات کے ساتھ طبی سائنس کے روابط پر بہت اچھے ڈھنگ سے بحث کی گئی ہے۔ مصنف صرف اخلاق طب پر ہی تفصیلی بحث نہیں کرتا بلکہ انسانی جسم پر سحر، ادعیہ، اعتقادات اور دیگر کاموں کے اثرات بھی بیان کرتا ہے۔ چنانچہ مختلف موضوعات مثلاً رنگ، روشنی، آواز، ذہنی ردعمل، جذبات و احساسات، حیات بعد الممات اور جزا و سزا کا فلسفہ زیر بحث آ گئے ہیں۔ اس مقالہ کے آخر میں سیاسیات کے اصول پر بھی بحث کی گئی ہے۔

دوسرا مقالہ: اس مقالہ میں سر اور چہرے کے جلدی اثرات پر بحث کی گئی ہے۔ ایک غیر متعلق موضوع "دردسر" پر بھی زیر بحث ہے۔ کان کی بیرونی بیماریوں پر بھی ایک بحث شامل ہے۔

تیسرا مقالہ: اس مقالہ میں 'دردسر' کی مختلف قسموں اور نزلہ و زکام پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

چوتھا مقالہ: اس مقالے میں آنکھوں کی بیماریوں پر بحث کی گئی ہے۔

پانچواں مقالہ: اس مقالہ میں کان اور ناک کی بیماریوں پر بحث کی گئی ہے۔

چھٹا مقالہ: اس مقالہ میں منہ، دانت، مسوڑھے، گلے اور ہونٹ کی بیماریوں پر بحث کی گئی ہے۔

ساتواں مقالہ: اس مقالہ میں مختلف قسم کے جلدی امراض پر بحث کی گئی ہے ساتھ ہی

فائلیریا اور بواسیر بھی زیر بحث آگئے ہیں۔

آٹھواں مقالہ : اس مقالہ میں تنفس اور دل کی بیماریوں پر بحث کی گئی ہے ساتھ ہی سینہ جگر اور پھیپھڑے کی بیماریاں بھی زیر بحث آئی ہیں۔

نواں مقالہ : اس مقالہ میں پیٹ کے تمام امراض پر بحث کی گئی ہے۔

دسواں مقالہ : اس مقالہ میں گردہ، تلی (spleen) اور آنت کی بیماریوں پر بحث ہے ساتھ ہی یرقان، امراض جگر، تشمع الکبد اور اسی طرح کی دوسری بیماریوں پر بھی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ "

(تلخیص)

ڈاکٹر احمد عبدالحیٰ
پٹنہ

کتاب التصریف

فن جراحت پر ایک معرکہ آرا تصنیف

فن جراحت کی ابتدا عربوں سے ہوئی، چنانچہ عرب ہر قسم کے اعمال بالیدمیں مہارت تامہ رکھتے تھے اور سیکڑوں قسم کے آلات جراحی کے موجد تھے۔ اطباء عرب میں[۱] ابوالقاسم الزہراوی کے علاوہ شیخ سدید (م ۵۹۲ھ[۲])، عمر بن عبدالرحمٰن الکرمانی (۳۶۸-۴۵۸ھ[۳])، رشید الدین بن الفارس ابو حلیفہ (۵۹۱-۶۶۰ھ[۳])، سدیدالدین انشیبانی، ابن رقیقہ (۵۶۴-۶۳۵ھ[۴]) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں جنہوں نے فن جراحی کو فروغ دیا۔

ابوالقاسم خلف ابن عباس الزہراوی الاندلسی کا فروغ پانچویں صدی ہجری میں ہوا[۵]۔ فن جراحی (سرجری) میں یکتائے روزگار ہونے کے علاوہ وہ بعض اعمال جراحی کا موجد بھی تھا۔ اس کی تصنیف "کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف" فن جراحی پر ایک ایسا شاہکار ہے جس پر زمانہ حال تک یورپ کے مدارس طبیہ کا دارومدار رہا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں جز علمی کا بیان ہے اور دوسرے حصہ میں جراحی، آلات جراحی اور فن دایہ گری کا تفصیلی بیان ہے چنانچہ ہر قسم کے اعمال بالید یعنی چیرنے پھاڑنے، ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑنے، فصد کھولنے وغیرہ پر ایک مستند دستاویز ہے۔ اس کتاب میں ۲۰۰ آلات جراحی پیش کرکے ان کے طریق استعمال پر بحث کی گئی ہے۔ یہ آلات جراحی موجودہ آلات جراحی کے مقابلہ میں کسی قدر بھدّے ضرور ہیں تاہم یہی اہل یورپ کی سرجری کی بنیاد ہیں چنانچہ الزہراوی کو موجودہ سرجری کا استاد ہونے کا فخر حاصل ہے

---

۱ الاعلام ۱۰۵/۴ ۲ الاعلام ۸۰/۵ ۳ الاعلام ۲۳/۳ ۴ الاعلام ۱۷۸/۷

۵ الزہراوی کے حالات بہت مختصر ملتے ہیں یہ ہسپانیہ کے مشہور شہر الزہرا میں پیدا ہوا۔ اس کے عہد کے متعلق کافی اختلاف ہے۔ بقرینہ اغلب ۴۰۴ھ میں اس نے وفات پائی۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو طبقات الاطباء جلد ۲ ص ۵۲

الزہراوی کی اس کتاب کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یورپ میں اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے[1] بارہویں صدی کے اواخر میں سب سے پہلے اس کتاب کا لاطینی زبان میں ترجمہ ہوا جو ۱۴۹۷ء میں وینس سے طبع ہو کر شائع ہوئی پھر اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ پندرہویں صدی کے اواخر میں اس کتاب کا ترکی میں ترجمہ ہوا۔ ترکی زبان میں اس ترجمہ کے ساتھ جو آلات جراحی کی تصویریں پیش کی گئیں ان میں آلات جراحی کے طریق استعمال کو بھی مریضوں کی تصاویر کے ساتھ آپریشن کرتے ہوئے واضح کیا گیا تھا، اس بنا پر ترکی زبان کا یہ ایڈیشن کافی مقبول ہوا۔ لاطینی زبان میں عربی متن کے ساتھ پہلا جدید ایڈیشن آکسفورڈ سے ۱۷۷۸ء میں شائع ہوا جس کے بھی متعدد ایڈیشن شائع ہوئے اس کے بعد ۱۸۶۱ء میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ پیرس سے شائع ہوا۔ انگریزی زبان میں عربی متن کے ساتھ تازہ ایڈیشن لندن سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا ہے جس کی ایک کاپی خدابخش لائبریری میں بھی موجود ہے۔ اس نسخہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے متن کی تدوین میں اس کتاب کے چودہ میسر مخطوطات پیش نظر رکھے گئے ہیں ان میسر مخطوطات میں سے ایک مخطوطہ خدابخش لائبریری کا بھی ہے جو میسر مخطوطات میں سب سے قدیم مخطوطہ ہے۔ جس کی کتابت ۵۸۴ھ/۱۱۹۰ء میں ہوئی ہے۔ کتابت قدیم خط نسخ میں ہے اور آلات جراحی کی رنگین تصویروں سے مزین ہے۔ (تلخیص)

••

---

[1] یورپ کی مختلف زبانوں میں تراجم کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو برٹش میوزیم کیٹلاگ جلد ۱ ص ۸۴۲

صیانت اللہ گلشن

کے

اہم مخطوطات

حکیم صیانت اللہ: امروہہ کے مشہور خاندانی طبیب ہیں۔ ان کے والد حکیم فرحت اللہ صاحب بھی نامی طبیب تھے، آپ کا خاندانی ذخیرۂ طب کافی اہم کتابوں پر مشتمل ہے ان میں سے اہم ترین کا تعارف پیش ہے

از

حکیم صیانت اللہ (امروہہ)

فارسی

۱. منتخب الاطباء

تاریخ طب کا اگرچہ یہ موضوع نہیں ہے مگر اتنی بات شاید بے محل نہ ہو کہ طب یونانی جس حیثیت سے بھی ہندوستان میں داخل ہوئی وہ اس شکل میں آئی کہ جس شکل میں اس کی نشاۃ ثانیہ بغداد میں ہوئی تھی جہاں اطراف واکناف سے محققین طب جمع کئے گئے اور متقدمین کے نظریات کی روشنی میں از سر نو اس کی تدوین ہوئی۔

یہاں یہ بات بھی عجائبات سے ہے کہ جب مغربی سامراجیت کی تیز و تند آندھیوں نے تمام دنیائے طب کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا تھا اور اس فن کے مولد اولی و نشاۃ ثانیہ کے روشن چراغ تک بجھ گئے تھے تو متحدہ ہندوستان نے اس عظیم فن کو ان آندھیوں کے مقابلہ میں نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس کی عظمتوں میں اور اضافات کئے اور یہ ملک اس عظیم فن کا ولی ثالث بنا۔ حتی کہ ہندوستانی عظمت کے احترام میں اس فن کی بعض کتب کو 'تذکرۃ الہند' جیسے ناموں سے موسوم بھی کیا گیا۔

ہندوستان میں بھی یہ طب اور غایت طب اپنے نظریات کے تحت اگرچہ حفظ صحت و ازالۂ سبب و مرض کے بطور عوامی فلاح ہی کے لیے برقرار رہی مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہاں یہ فن امراء رؤساء، مہاراجگان اور نوابین و شاہوں کی نازک مزاجی میں زیادہ دخیل رہا۔ اس اعتبار سے ہمارے نسخہ جات میں زر و سیم، مشک، عنبر، زعفران اور دیگر بیش قیمت جواہرات جزو اعظم بن گئے اور عوامی فلاحیات و اقتصادیات پیش نظر نہ رہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسے بھی در مند و صاحب نظر گزرے ہیں جنھوں نے عمومی فلاح کے تحت اس گراں باری کو عمومی کیا اور محقق اعظم "زکریا رازی" کی "من لا یحضرہ الطبیب" کی اقتدا میں "منتخب الاطباء" جیسی تالیفات پیش کیں۔ زاد غریب اور علاج الغربا' بھی ان ہی اقتصادی محسوسات کا حصہ ہیں۔

"منتخب الاطباء" حکیم خیر اللہ، الہ آبادی کی مؤلفہ ہے۔ جو قلیل الاجزا نسخہ جات اور سہل الوجود مفردات پر مشتمل ہے۔ یہاں مثالاً صرف دو نسخہ کافی ہوں گے جو تپ محرقہ کے لئے تجویز ہوئے۔

۱۔ پیادہ تخم ریحان بوزن یک فلوس اودرا در شربت قند یا مصری انداند چون تخم مذکور در آں گداز شود بنوشند تا سہ روز تپ برطرف شود۔

۲۔ ہمدریں شربت لیمو تا سہ روز نخورد و نفع شود۔ و طریق ساختن او این است۔ در یک جام

بقدرے نمک سنگ آمدہ ساختہ بینداز دو دو ماب حل کنند و بالائے آں شیرہ لیموں کاغذی انداز د
ذ شند تا سہ روز تپ دفع شود۔

اسی طرح پوری کتاب امراض جزیہ کے تحت کم سے کم اجزا اور آسانی سے فراہم ہو جانے والے مفردات پر مشتمل ہے۔ اس دور میں جبکہ بازار میں مفردات کی فراہمی آسان نہیں ہے۔ گرانی دکانداروں کی ہوس نے طب یونانی کی روایاتی اور زلف کو متاثر کیا ہے۔ اس قسم کی کتابیں احیائے فن میں معاون ہو سکتی ہیں۔

ابتدائے کتاب میں نبض و قارورہ کے جو طریقے بیان کیے گئے نہ البتہ طب یونانی کے اصول نظریات کے مطابق نہیں ہے۔

کتاب کے کل اکتیس اوراق ہیں۔ سطریں پندرہ و چھبیس کے درمیان ہیں۔ خط جلی اور شیخ سعد اللہ متوطن سرکار سنبھل کاتب ہیں۔ سائز ۷، ۲۲ طول اور ۴ ۱/۲ ۹ عرض ہے۔ مجھے یہ کتاب سید خورشید مصطفےٰ رضوی مؤلف جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، اور حیات ذاکر حسین اور تذکرہ سید چشت نے عطا کی ہے۔

۲۔ مفردات معصومی:

کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ادویہ مفردہ کی ماہیت، مزاج، فوائد اور مقدار شربت پر مشتمل ہوگی جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب بھی 'منتخب الاطبا' کی طرح امراض جزیہ کے تحت کم سے کم اجزا نسخہ اور آسانی سے فراہم ہونے والی ادویہ مفردہ پر مشتمل ہے۔

مؤلف کا نام محمد معصوم بن سید صمصام خدشتی تبریزی ہے۔ کتاب کے چونتیس اوراق ہیں۔ ہر صفحہ کی تیئیس[۲۳] سطریں ہیں۔ کاتب و سنہ کتابت درج نہیں۔

۳۔ قرابادین معصومی:

معصوم بن کریم الدین الشوستری الشیرازی کا مرتبہ ہے۔ مقدمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ قرابادین بھی کتب متداولہ ہی سے ماخوذ ہے لیکن موصوف کے تجربات میں جو مرکبات آئے ہیں ان کا ذکر کر کے دیگر قرابادینوں سے مستغنی کرنے کی کوشش ہے۔

کاغذ کتابت سے شاید از یک صدی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ انانوے اوراق ہیں۔ ہر صفحہ کی سترہ سطریں ہیں۔ سائز ۲۸، ۲ طول ۱۸، ۱ عرض ہے۔

۴۔ خلاصۃ الطب

مولف کا نام احمد اللہ اور لقب حکیم مسیح الزماں خاں ہے۔ حکیم امام بخش سے کافی شہرت ملی۔ آخر میں حکیم امام بخش کرت پوری سے متعارف ہوئے تھے۔

حکیم ذکاء اللہ صاحب "مجموعہ ذکائی" کے والد حکیم اسحاق خاں ابن اسماعیل صاحب دہلوی کے شاگرد ہیں۔ ایک طویل عرصہ شاہجہاں آباد (دہلی) میں رہکر درجات طب میں شریک رہے اور اپنے استاد سے کسب فیض کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور راجہ ٹکیت رائے سے منسلک ہوئے اور عزت ملی۔ راجہ صاحب موصوف کی فرمائش پر ہی اس کتاب کی تالیف ہوئی۔

طب کے اصول کلیہ یعنی اصلاح ستہ ضروریہ؛ استعمال الادویہ؛ علاج مابعد۔ کے مطابق اس کتاب میں اول الذکر دو نسخوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے لیکن موخر الذکر کو مختصراً صرف نصف تک محدود رکھا ہے۔ حفظ صحت علاج بالدوا پر فوقیت حاصل ہے۔ موصوف نے بھی اس اہم مسئلہ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ حفظ آلات تنفس کے بیان میں دورہ دموریہ کا ذکر بھی آیا جو یقیناً بعض متقدمین کی اقتدا و پیروی ہے۔

علاج بالدوا، کے بطور جن ادویہ مفردہ و مرکبہ کا ذکر کیا گیا ہے وہ مشہور اور سہل الوجود ہیں پھر بھی بدل ادویہ کا ذکر کر دیا ہے۔

علاج بالغذا میں مغزیات و حبوبات نیز ترکاریوں اور پھلوں کا اچھا انتخاب ہے۔ ان سب کے فوائد وخواص، مزاج اور زمانہ استعمال کو بھی موثر انداز میں ترتیب دیا ہے۔

کہیں کہیں حاشیہ پر دیگر اطبا کے بعض مجربات بھی درج ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو سالہ نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ باسٹھ اوراق ہیں۔ ہر صفحہ کی سطریں اکیس ہیں۔ کاغذ بہت عمدہ کتابت روشن ہے۔ سنہ کتابت و کاتب کا نام درج نہیں۔ سائز طول ۲۷ عرض ۱۶ء۵ سینٹی میٹر ہے۔

۵۔ شفاء المریض

محمد نور عالم طبیب کی تالیف ہے۔ مقدمہ میں وجہ تسمیہ یوں درج ہے۔

محمد نور عالم طبیب خواستم کہ کتابے در فن طب کہ جامع نسخہائے مطب
کہ از خدمت اساتذہ خود مستفید شدہ بودم دریں مختصر بقید ضبط آوردم
بمند و کردم تا کہ طالبان این فن را معالجہ آسان بود و نامش شفاء المریض نہادم

اطبائے ہند کا جو طریقہ مطب رہا ہے اسے اپنے اصحاب کے معمولات کی روشنی میں جامعیت کی
کامیاب کوشش ہے۔ امراض سر سے لیکر تا آخر جن معمولاتِ مطب کو جمع کیا گیا ہے فنی اعتبار سے ان کی اہمیت ہے۔
دو سو تینتالیس ۲۴۳ اوراق ہیں۔ صفحۂ آخر موجود نہیں ہے۔ ہر صفحہ پر ۹ سطریں ہیں۔ کتابت جلی زرد کشش
کاتب کا نام و سنہ کتابت درج نہیں۔ سائز طول ۲۶ ۱/۲ — عرض ۱۹ ۱/۲ × ۸ ہے۔

مفردات امامی

اطبائے ہند میں حکیم غلام امام امروہوی کا نام ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ موصوف کی ایک دوسری
تالیف "علاج الغربا" کو ہندوستان میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اور جس کے اصل تراجم کے جتنے اڈیشن شائع ہوئے
کسی دوسری طبی تالیف کو ایسا درجہ کم مل سکا ہے۔

مولف نے اگرچہ فرمودات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی ازل و ابد میں اس کا نام "معالجات النبوی"
موسوم کیا ہے مگر مفردات امامی سے بھی اسے شہرت ملی۔

مفردات میں قابل قدر تالیف ہے اور ادویہ مفردہ کے بیان کا اچھا ذخیرہ ہے۔ جدی حکیم حکمت اللہ
صاحب نور اللہ مرقدہ جب ریاست رام پور میں افسر شفاخانہ جات کے اہم عہدہ و بلند مرتبہ پر فائز تھے اس
وقت آنجناب نے اسے نقل کرا کے اپنے کتب خانہ میں جمع کیا تھا جو تقریباً ایک صدی سے آج تک محفوظ ہے۔ اس
کتاب کا ترقیمہ بایں طور ہے۔

> تمہ ہذا الکتاب المسمی بالمفردات امامی در مصطفی آباد عرف رام پور بپاس
> خاطر حکمت مآب حکیم حکمت اللہ خاں امروہوی بتاریخ نوزدہم شہر محرم الحرام
> ۱۲۸۹ھ تحریر یافت۔

کاتب کا نام درج نہیں۔ تین سو اڑتیس ۳۳۸ اوراق ہیں۔ صفحات کی سطریں گیارہ ہیں۔ سائز طول ۲۰ × ۱۳
عرض ۸ ہے۔

عربی

مفتاح الطب

ابو الفرج علی بن الحسین بن ہندو کی مشہور کتاب ہے۔ ابو الفرج فلسفہ و طبیعیات کا مشہور عالم

ادب شعر و نظم کا ادیب شہیر گزرا ہے۔ طب میں ابوالخیر حسن بن سوار کا شاگرد تھا۔ یہ کتاب ابوالفرج نے اپنے تلامذہ کے لیے تالیف کی اور حسب ذیل دس ابواب قائم کئے۔

۱۔ طب کی تعلیم میں عمومی و خصوصی طور پر کن علوم کی ضرورت ہے۔ ۲۔ علم طب کا اثبات۔ ۳۔ طب کی تعریف ۴۔ طب کا شرف۔ ۵۔ طب کی قسمیں۔ ۶۔ طب کے فروق۔ ۷۔ ایسے طریقہ کار جن سے علم طب کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ ۸۔ ایسے علوم کا شمار جن کے ذریعہ طبیب کامل ہو سکتا ہے۔ ۹۔ ایک متعلم طب کے لیے درجہ بدرجہ، مرتبہ بمرتبہ جن کتب کی ضرورت پڑتی ہے۔ ۱۰۔ طبی حدود و عبارات۔

عصر حاضر میں نصاب تعلیم و طریقہ تعلیم بے حد اہمیت کا موضوع ہے اور بعض اعتبارات سے وجہ نزاع بھی ہے۔ مذکورہ بالا موضوعات و ابواب مبادیات طب کے لیے بہترین رہنما اصول ہیں اور ان نزاعات کے ازالہ کے لیے لائق مطالعہ بھی ہیں۔ ان ابواب عشرہ کی تلخیصاً تین عبارتیں یقیناً لائق توجہ ہیں۔

۱۔ کذالک الطبیب لایکون طبیبا ان لم یعرف تشریح الابدان والداء والدوا علی الاطلاق۔

۲۔ من لم یحسن الهندسه لاید خلن مجلسنا۔

۳۔ یجعل الفیلسوف طبیباً اولیٰ من ان یجعل الطبیب فیلسوف۔

۱۔ یعنی کوئی طبیب طبیب نہیں ہو سکتا اگر جسم انسانی کی تشریح سے ناواقف ہے اور علی الاطلاق بیماری اور اس کی دوا نہیں جانتا۔

۲۔ جس کسی کی ریاضی بہتر نہیں وہ ہماری محفل میں ہرگز داخل نہ ہو۔

۳۔ ایک فلسفی کا طبیب بن جانا طبیب کے فلسفی بن جانے سے بہتر ہے۔

اس کتاب کا سائز بھی $\frac{12 \times 18}{8}$ ہے۔ پچپن[۵۵] صفحات ہیں اور ہر صفحہ میں اکیس[۲۱] سطریں ہیں۔ کاغذ، کتابت اور روشنائی سے یہ کتاب بھی کتاب المسائل حنین کی طرح تقریباً تین سو[۳۰۰] سالہ معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ جوامع کتاب جالینوس فی البول

جالینوس کے رسائل میں یہ مختصر ترین رسالہ ہے جو کتاب المسائل حنین بن اسحاق کے ساتھ اسی سائز، کاغذ، کتابت کے اعتبار سے ایک ہی دور میں لکھی گئی اور صرف آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ مصطلحات بول کی تقسیم بھی تشجیراً ہی کی گئی ہے۔

طب قدیم کے اعتبار سے کلیات طب اور ذرائع تشخیص کے اصول و قوانین میں بول و براز کی
[اہم]یت رہی ہے اور آج جدید کیمیاوی تجزیہ کے دور میں بھی اہمیت ہے۔ اس میں عملاً قارورہ دیکھنے کے طریقے
[بیا]ن کئے گئے ہیں اور ہر ہر مرض کے پیشاب کی علامات کو شیشی کا نقشہ بنا کر ان سب علامات کو طبی اصطلاحات
[کے] ساتھ دکھایا گیا ہے۔ شیشی کہاں سے اور کیسے پکڑی جائے۔ اوپر، درمیان اور نیچے قارورہ میں کیا کیا رنگ بول
[میں] کہاں صفائی ہوگی اور کہاں کدورت، قارورہ دیکھتے وقت روشنی کا رخ کیا ہو؟ ان سب امور کو شیشی
[کے] نقشہ میں دکھایا گیا ہے۔ آج ان نقشوں کو درادو درس بلیک بورڈ پر لکھ کر دکھایا جا سکتا ہے۔ ابتدائی درجات
[میں] عملاً یا ترجمۃ انسب کتاب ہوگی۔

[۱]۔ کتاب المائتہ ابوسہل مسیحی

ابو سہل عیسیٰ بن یحیٰی المسیحی گورگان کا ساکن اور طب کی علمی و عملی نصاب میں یگانۂ روزگار طبیب
[تھ]ا۔ اس کے علمی مرتبہ میں ایک یہ چیز بھی سند بنے گی کہ وہ شیخ الرئیس بو علی سینا کا استاد رہا ہے۔ سلطان خراسان
[ک]ے یہاں افسر الاطباء رہا اور صرف چالیس سال کی عمر پائی۔ کتاب المائتہ اس کی مشہور کتاب ہے۔ چونکہ یہ
[ا]یک سو مقالوں پر مشتمل ہے اس لئے اسی نسبت سے اس کا نام کتاب المائتہ رکھا گیا۔

"کتاب المائتہ" میں ابوسہل مسیحی نے بطور مقدمہ طب کے اہم مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے اور
[بط]ور مبادیات طبی تعلیم کے لئے کن کن علوم کی ضرورت ہے اس پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ اس اعتبار سے
[ا]ن کا ایک جملہ یقیناً محتاج توجہ ہوگا۔ کہ

> طبیب جتنا امور طبعیہ سے واقف ہوگا اتنا ہی طب میں افضلیت
> کا مالک ہوگا۔ کیونکہ علم طب طبیعیات سے ماخوذ ہے۔

[عل]م طبیعی و طبیعیات آج بھی فزکس کے نام سے میڈیکل کالجوں میں معیار داخلہ ہے اور ہم بھی اپنے طبیہ
[کا]لجوں میں طبیعیات کے بجائے فزکس ہی سے متعارف ہیں۔

"کتاب المائتہ" کے ان نو مقالوں میں نظری و عملی طب کے تمام موضوعات کا ذکر موجود ہے۔
[ت]شریح اعضا، منافع الاعضا، علم الاغذیہ، علم الادویہ، ادویہ مفردہ و مرکبہ اور تمام امراض کلیہ و
[ج]زئیہ کا الگ الگ عنوانات کے ساتھ ضروری حد تک احاطہ کیا گیا ہے۔

ابوسہل مسیحی منافع الاعضا کے ساتھ ساتھ دوران خون سے بھی واقف تھا جو بعد میں متاخرین

کے لئے حصہ تحقیق بنا۔

کاغذ و کتابت کے اعتبار سے یہ ایک قدیم نسخہ ہے۔ نو سو آٹھ[۹۰۸] صفحات ہیں۔ ہر صفحہ پر اکیس[۲۱] سطریں ہیں۔ ہدایت علی چشتی نے کتابت کی۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ ۲۰ سم طول۔ ۱۲ سم عرض سائز ہے۔

۴۔ معالجات ایلاقی

ایلاقی کی اس دوسری کتاب کا نام کتاب الاسباب و العلامات ہے جو معالجات ایلاقی سے مشہور ہوئی۔ "کلیات ایلاقی" میں "کتاب القانون" کو جس حد تک ملخص کیا ہے "معالجات ایلاقی" میں اتنا اختصار نہیں ہے بلکہ امراض کے اسباب و علاج کے بیان میں خاصا شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ خاصی ضخیم کتاب ہے اور دو سو اٹھہتر[۲۷۸] صفحات پر مشتمل ہے اور تقریباً نصف نصف کتاب دو کاتبوں نے نقل کی ہے۔ کتاب کا سائز طولاً ۲۵ سینٹی میٹر عرضاً ۱۶ سینٹی میٹر ہے اور ہر صفحہ میں تئیس[۲۳] سطریں ہیں۔ کاتبین کا نام کہیں نہیں ہے۔ کہیں کہیں ایک تیسرے قلم سے حاشیہ بھی درج ہے جس پر نام یا دستخط نہیں ہے۔

۵۔ حقائق اسرار الطب

مسعود بن محمد السنجری کی مصنفہ ہے۔ صاحب کتاب کے ابتدائیہ کے مطابق یہ کتاب قاسم بن عراق بن جعفر کے لئے لکھی گئی ہے اور تین فنون پر مشتمل ہے۔ فن اول کو بھی تین اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فن ثانی کو دو اقسام، اور فن ثالث کی چار اقسام بیان کی گئی ہیں۔

ابتدا میں کلیات و موضوعات طب اور اُن کی تعریفات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے اس کے بعد امور طبعیہ، اسباب، ارکان، مزاج، اخلاط کا تلخیصاً بیان ہے۔ اعضائے بسیطہ و اعضائے مرکبہ کی اجمالاً تشریح بھی ہے۔ نبض و بول و براز اور امراض کی تعریفات کے بعد حمیات کا اجمالی ذکر ہے۔ غذا کی ضرورت، اس کی تعریف، اس کی اقسام، ادویہ مفردہ و مرکبہ اور ان کی جزئی تفسیر، ادویہ نباتیہ، معدنیہ، حیوانیہ کا انتخاب اور اُن کی حفاظت کے طریقے، ادویہ مفردہ و مرکبہ کی عمریں، ان کی اصلاح، تدبیر، احراق، غسل، تصفیہ وغیرہ کے اچھے کیمیاوی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

آخر کتاب میں اعداد کے اعتبار سے طب کی تقسیم استفسارات و جوابات کی شکل میں کی گئی ہے مثلاً ثنائیات کی حیثیت سے ایک سوال قائم کر کے اس کا اس طرح جواب دیا گیا۔ "الی کم قسم ینقسم الطب؟ الطب ینقسم الی جزئین نظری و عملی" اسی طرح ثلاثیات، رباعیات، خماسیات اور عشاریات تک سوالات

قائم کرکے جوابات دیئے گئے۔ مسائل کو ذہن نشین کرنے کا یہ بھی ایک اچھا طریقہ ہے۔

کتاب کے اکہتر اوراق ہیں۔ ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں۔ ۱۹ طول، ۱۲ x ۱۱ عرض، ۵ سائز ہے۔

۶۔ معیار الاطباء

حکیم احمد سعید صاحب امروہوی کی ایک ضخیم تالیف ہے۔ صاحب کتاب ۱۸۴۰ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ امروہہ و رام پور میں تحصیل علم کیا۔ تعلیم طب کی تکمیل کے بعد اپنے والد حکیم اکبر علی اور چچا حکیم نثار علی سے مطب عملی حاصل کیا۔ حیدرآباد دکن میں جب ایک عالی شان پہلا یونانی شفا خانہ قائم کیا گیا تو اس کے پہلے افسر الاطبا حکیم احمد سعید ہی تھے۔ موصوف کئی اہم طبی کتابوں کے مولف تھے۔ جن میں 'رسالہ جذام'، 'تسکین الانفس فی تحقیق ذیابیطس' اردو اور 'تشخیص کامل' عربی (تیرہواں مقالہ) میں شائع ہو چکی ہیں۔ باقی مقالے شائع نہ ہو سکے۔ معیار الاطبا برسوں کی محنت کے بعد تسوید سے تبییض کے قالب میں ڈھل سکی۔ یہ اہم و ضخیم کتاب ہے اس کا جزاول ہی زیر تبصرہ و تعارف ہے۔

تحمید و تسبیح کے بعد مؤلف نے اپنا تعارف اس طرح کرایا ہے:

وبعد فیقول العبد المتمسک بذیل عفو ربه الحمید احمد سعید
ابن الحکیم الحاذق والطبیب الفائق المؤید بالتائید الازلی حکیم محمد
اکبر علی ابن مستند الحکما استاذ الاطبا المشتہر فی العالم بالحذق
الاتم الفاضل اللوذعی الحکیم ابی محمد الحسن العسکری الامروہوی
وطنا والحسینی نسبا ۔ الخ

موصوف کا خیال تھا کہ شیخ الرئیس نے کتاب القانون میں قوانین کلیہ پر خاصی بحث کی ہے لیکن طوالت کتاب کے باوجود بھی یہ کم ہے اور یہ قوانین کلیہ ابواب قائم کرتے ہیں اس طرح متفرق ہو گئے کہ انھیں شئے مفقود ہی کہا جا سکتا ہے اور جس دروازہ کی ہمیں تلاش تھی وہ بند نظر آتا ہے۔ اس لئے میں نے ان ضروری مسائل کو فصول و ابواب میں اس طرح جمع کر دیا ہے کہ اہل بصیرۃ کے لئے فوائد کثیرہ فراہم ہو جائیں۔ ایک اعتماد کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں وہ راستہ اختیار کیا ہے جس پر میرے علاوہ کوئی اور قدم نہیں رکھ سکا ہے اور میں نے اس میں ایسی تحقیقات کی ہیں کہ وہ مجھے کتب رائجہ میں نہیں ملتیں۔ ایک ادبی بلکہ غرور آمیز انداز میں یوں بھی کہا کہ

ورأیت بتحقیقات لم اجدها فی الکتب المتداولۃ واشرت الی تدقیقات لم تحوھا المصحف المتطاولۃ مع نکات عذراء کانھا الخرائد الشھلاء

کتاب کی ترتیب وتدوین اس طرح ہے کہ پہلے متقدمین کے نظریات کی روشنی میں فصلوں کی ترتیب کے ساتھ قوانین کلیہ بیان کئے ان میں اگر کہیں وضاحت کی ضرورت ہوئی تو ھھنا مباحث کہکر بہرحال بحث کی۔ کوئی مسئلہ محل نظر آیا تو اس پر اعتراض کیا، اور کسی پر اعتراض وارد ہوا تو خود بالوضاحت جواب بلکہ جوابات دیئے۔ مسائل کے بیان کے بعد کہیں کہیں 'تبصرہ' و 'ہدایت' کے عنوانات قائم کرکے اشکال واغلاط رفع کیا۔ جہاں کہیں ضرورت لاحق ہوئی ہے فروق الامراض کے بیان کو استدلال کے ساتھ لائق توجہ جاذب نظر بنایا ہے۔ اس پر نظر بھی گہری ہے۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ کتاب جس دور میں مدون ہوئی مولف کی عمر اس وقت صرف پچیس سال تھی۔ جیساکہ خود صاحب کتاب نے مقدمہ میں کہا ہے کہ

قد شرعت فیہ ولم اجاوز عن ثلثین بل عن خمسۃ وعشرین

اتنی کم عمری میں ادق مسائل میں بالغ نظری یقیناً ایک وجہ امتیاز ہے۔ موصوف کا انتقال ۱۸۹۰ء میں ہوا۔

کتاب کا کاغذ دبیز قلم جلی، ساخر ۳۲×۵ طول ۲۰ عرض سینٹی میٹر ہے۔ چار سو ستانوے ۴۹۷ صفحات ہیں ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں۔

حکیم سید ایوب علی
ڈاکٹر نعیم احمد خاں
حکیم فضل الرحمٰن

دار العلوم دیوبند کے اہم طبی مخطوطات کا تعارف

ہندوستان کے اعلیٰ علمی اداروں علیگڑھ، پٹنہ، رامپور، کلکتہ، حیدرآباد اور دیوبند کے کتب خانوں میں جو مختلف علوم و فنون پر مشتمل قلمی نسخوں کے مؤقر ذخائر موجود ہیں ان میں طب و حکمت سے متعلق بھی بعض ایسے نوادرات ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے کتب خانے کے مخطوطات کی تعداد ہزاروں تک ہے، اور ان میں طبی مخطوطات سیکڑوں تک پہنچ چکے ہیں۔ بہت سے مطبوعہ شکل میں سامنے آ چکے ہیں، پھر بھی چند اہم ایسے مخطوطے بھی ہیں جو آج تک طبع نہیں ہو سکے ہیں۔ دار العلوم دیوبند کے ایک طالب العلم کی حیثیت سے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ اس طبی سیمینار میں ان مخطوطات میں سے مندرجہ ذیل مخطوطات کا تفصیلی تعارف پیش کروں۔

مجربات ابن بیطار المعروف بہ کتاب المغنی فی الادویۃ المفردۃ: - عبد اللہ بن احمد المالقی، ابو محمد ضیاء الدین المعروف بہ ابن بیطار ساتویں صدی ہجری کا مشہور و معروف امام النباتیین ذالاعشاب جس کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ دیسقوریدوس کے بعد علم الادویہ کے ذخیرے میں قابل قدر اضافات اسی جلیل القدر مصنف کی دین ہیں۔ مفردات ابن بیطار کے بعد کتاب المغنی مصنف کی دوسری اہم تصنیف ہے۔ یہ عربی مخطوطہ دار العلوم دیوبند کی طبی مخطوطات کی زینت ہے۔ صرف ۶۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ ۱۲۳۱ھ کا مرقومہ ہے۔ مقدمہ کتاب ہی میں مصنف کا نام عبد اللہ بن احمد بن محمد مالقی المعروف بہ ابن بیطار درج ہے۔ مصنف کی شخصیت اس کتاب کی حیثیت کے تعین میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ مخطوطہ اگرچہ ادویہ مفردہ پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کا بنیادی اور مرکزی نقطہ علم العلاج سے وابستہ ہے۔ اس میں مختلف نظامہائے جسمانی میں پیش آنے والے امراض کے تعلق سے مفرد ادویہ کا انتخاب عمل میں لایا گیا ہے۔ اور متقدمین کے اقوال و احوال کو سامنے رکھ کر دواؤں کے سلسلے میں ذاتی تجربات کی روشنی میں اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چنانچہ ابن بیطار نے خود ان الفاظ کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ "میں نے سابقہ ماہرین علم الادویہ

اور استادان علم العلاج کے اقوال و احوال سے پورے طور پر استفادہ کر کے اپنے ذاتی تجربات میں ان اقوال واحوال کو درست سمجھ کر اس کتاب کو مرتب کیا ہے اور ترتیب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد کسی دوسری کتاب کے دیکھنے اور مطالعہ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس بنا پر میں نے اس کا نام "کتاب المغنی" رکھا۔

ابن بیطار نے اس کتاب کا انتساب امیر المؤمنین ناصر الدین محمد بن سلطان الملک العادل سیف الدین کے نام کیا ہے، انتساب کے بعد اصل مضمون شروع کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کو بیس ابواب پر مشتمل کیا ہے۔ باب اوّل کے تذکرے سے پہلے ادویہ مفردہ کے ماخذ کا مختصر تذکرہ ہے، اس کے بعد باب اوّل فی الادویۃ المفردۃ النافعۃ من امراض الراس" سے پہلا باب شروع ہوا اور عام مصنفین کے معمول کے مطابق امراض راس سے ابتدا کی ہے۔ دوسرے باب میں امراض عین اور اس کے متعلقات، تیسرے میں امراض اذن، چوتھے میں امراض انف ... انیسویں باب میں سموم و تریاق اور آخری باب میں دواؤں کے مختلف احوال و خواص کا اصولی تذکرہ ہے۔

باب اوّل میں امراض راس کے ذیل میں سب سے پہلے مرض صداع اور اس کی اقسام کا بیان ہے، اس سلسلے میں استعمال ہونے والی ادویہ مفردہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ مثلاً صداع بارد کے لیے اکلیل الملک کے سفوف کو سرکہ اور روغن گل کے ساتھ ملا کر سر پر بہانے کی سفارش کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ اس عمل سے انتہائی سکون حاصل ہوگا۔ اسی طرح افیون کا بخور بھی صداع بارد میں سریع النفع ہے۔ صداع حار میں افیون کو روغن گل کے ہمراہ استعمال کرنا بالخاصہ مفید ہے۔ اسی ذیل میں جالینوس کی کتاب "الترياق الى قيصر الافيون" کے حوالے سے لکھا ہے کہ صداع مزمن میں جس کے ساتھ سہر شدید کا شکایت بھی ہو اور مریض مرض کی شدت کی بنا پر موت کے قریب بھی پہنچ گیا ہو تو بھی افیون کے استعمال سے نجات ہو جائے گی۔ جالینوس اور دیسقوریدوس کے علاوہ رازی کا الحاوی، شیخ کی معالجات عقلیہ سے جگہ جگہ استفادہ کیا ہے۔

اس مخطوطہ کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس سے نہ صرف ادویہ مفردہ کی معنویت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ دوا ئے مفردہ سے معالجے کی طرف رجحان پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ امام سویدی اور ابن قوبی نے اسی طرز

اپنا اصول بنا یا اور تذکرہ امام سویدی اور ابن تومی میں ہر مرض کے لئے کسی ایک دوا کو مناسب بدرقہ کے ساتھ استعمال کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

باب اول میں نہ صرف صداع بلکہ سر کے تمام ہی امراض میں مستعمل ادویہ کا تفصیلی تذکرہ ہے چنانچہ شقیقہ اور اس کے اقسام، بیضہ وخوذہ، لیثرغس، عطاس، نزلات وزکام، فزع فی النوم، سکر، احلام، دوار، مالیخولیا، سدر و دوار، کابوس، صرع، سکتہ، فالج ولقوہ، تشنج، رعشہ، خدر وغیرہ کوئی ایسا مرض نہیں ہے جس کو بیان نہ کیا گیا ہو۔ اسی طرح بہ ترتیب تیسرے، چوتھے پانچویں ابواب میں مختلف اعضاء کے امراض اور مناسب علاج کو بیان کیا گیا ہے۔

کتاب المغنی کا انداز بیان اور ترتیب اس درجہ اہم ہے کہ ان معلومات سے دواؤں کے متعلق ریسرچ اور کھوج کے میدان میں بڑی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

کتاب المغنی کا یہ مخطوطہ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود بہت سے نقائص کا آئینہ دار بھی ہے یہ نسخہ ناقص بھی ہے اور انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ اس کے اوراق مرتب ہیں، جن کی وجہ سے مطالعہ میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ انتہائی جستجو کے بعد چند ابواب مکمل ملے۔ چنانچہ پہلا، دوسرا، تیسرا اور چوتھا باب مکمل ہیں۔ پانچواں باب ناقص ہے اور چھٹا باب جو امراض صدر ودریہ کی دواؤں پر مشتمل ہے، اس میں ابتدائی اوراق غائب ہیں۔ اس باب کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں شیخ الرئیس کی بیان کردہ ادویہ قلبیہ کا بہ ترتیب تذکرہ ہے۔ اور حروف ابجد کے لحاظ سے دواؤں کی ترتیب قائم کی ہے۔ چنانچہ اولاً ابریسم، بحر اسلو، درونج الف سے اور آخر میں غاریقون غین کی دواؤں میں شامل کیا ہے، ادویہ قلبیہ کے سلسلے کا یہ تذکرہ کتاب المغنی کی بڑی تختی کے آٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، ان دواؤں سے متعلق افعال وخواص اور نوعیت اعمال کا خصوصی ذکر ہے۔ ساتویں باب میں امراض معدہ وکبد وطحال جیسے اہم اعضاء کے امراض کا بیان ہے، لیکن اوراق کی بے ترتیبی اور نقص نے اس باب کو تکمیل سے محروم رکھا۔ اس مخطوطہ میں اوراق کی بے ترتیبی کی بنا پر ابواب کی تعیین میں بھی انتشار کی کیفیت ہے اور بے جا تقدم وتاخر پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ ساتویں باب کے بعد پانچواں، پھر تیسرا اور اس کے بعد دوسرا باب مذکور ہے۔ اس مخطوطہ سے استفادے کے لئے اوراق وابواب کی ترتیب دوبارہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

ساتویں باب کے بعد پھر کسی بھی باب کو بطور عنوان تحریر نہیں کیا بلکہ مسلسل عبارت جاری ہے،

حتی کہ آخر کتاب میں تریاق وسموم جس کو فہرست میں انیسویں باب کی زینت بنایا ہے، اور آخر میں بیسویں باب سے متعلق احوال ادویہ و خواص اجناس غیر علاج کے ذیل میں ادویہ معدنیہ کا تذکرہ ہے اور الماس، رصاص، ذہب وفضہ کے تذکرے سے یہ کتاب تمام ہو گئی۔

اس مخطوطے کے آخری صفحے پر تین مہریں ہیں۔ ایک "وکیل احمد سکندر پوری"، دوسری "مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن خاں بہادر" اور تیسری مہر "مظفر حسین قدوسی" کی ہے۔ ابتدا میں کتاب میں بھی سرورق پر وکیل احمد سکندر پوری اور علی حسن خاں کی مہریں ہیں۔ کاتب کا نام درج نہیں۔ کتابت نہایت عمدہ ہے۔

اس کتاب المغنی کو بطور حوالہ تذکرہ العلاج میں حکیم علوی خاں نے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اور جگہ بہ جگہ اس کے حوالے پیش کیے ہیں۔

مفردات اختیارات ظفر خانی: مصنفہ ابو الظفر حسام الدین مخاطب بہ خطاب ظفر یار خاں، قدوۃ الفقرا، رئیس الفضلا۔ مجد الدین محمد افلاطون تیرھویں صدی ہجری کا قابل قدر فارسی مخطوطہ ہے، ادویہ مفردہ سے متعلق تمام احکامات مثلاً مزاج، افعال، مضرت و اصلاح، بدل، مقدار خوراک کا تذکرہ ہے، دواؤں کے علاوہ غذا کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کی گئی ہے۔ چنانچہ ابتدائے کتاب ہی میں تعارف کے طور پر مصنف کے مندرجہ ذیل الفاظ بطور سند پیش کیے جاتے ہیں۔ "این نسخہ ایست در علم تحقیق اشیاء و دریافت مزاج و منفعت و مضرت ادویہ و اغذیہ فرمودہ و اختیارات ظفر یار خانی و مفردات تعلیم العلاج نام دارد"۔ اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس مخطوطے کو مفرداتِ اختیاراتِ ظفر خانی کے ساتھ ساتھ مفردات تعلیم العلاج بھی کہا جاتا ہے[1]۔ یہ مخطوطہ دو سو بتیس اوراق پر مشتمل بڑی تختی میں ہے۔ مصنف چونکہ متاخرین میں ہے اس لئے مفردات کے سلسلہ میں اپنے ذاتی علم و تجربہ کے علاوہ متقدمین کی تحقیقات اور معلومات سے بھی پورے طور پر مستفید ہیں۔ چنانچہ خود اس کا اقرار کیا ہے کہ علم حقائق اشیاء کو مکمل طور پر تمام افعال و منافع کے ساتھ بچشم خود مطالعہ کرنا اور منفعتوں کا مشاہدہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے سابقہ ماہرین علم الادویہ کی تحقیق کو پیش نظر رکھ کر اس ضخیم کتاب کو مرتب کرنے کی سعی کی ہے۔

ابتدا میں اختصار کے ساتھ علم الادویہ سے متعلق اصول کلیہ کا تذکرہ ہے، چنانچہ دواؤں کے حصول و تحفظ پر بحث کی ہے۔ آخر میں دوا کی شکل کے اعتبار سے اس کی مقدار کا تعین بھی کیا ہے۔ مثلاً لکھا ہے کہ سفوف یا حبوب کی شکل میں جو دوائیں بقدر یک درہم یعنی تقریباً ساڑھے تین گرام کا

---

[1] تعلیم العلاج ظفر یار خاں کی دوسری تصنیف ہے، اوراق دو سو، تصانیف کے نسخے مدرسہ عالیہ، کلکتہ میں موجود ہیں۔ (ادارہ)

جاتی ہیں، اگر انھیں دواؤں کو جوشاندے کے طور پر یا خیساندے کے طور پر استعمال کیا جائے تو مقدار تھوڑا کم تین گنا ہونی چاہیئے۔ اسی ذیل میں "اسماعیل جرجانی" صاحب ذخیرہ خوارزم شاہی کے حوالہ سے بطور جوشاندہ چار گنی مقدار کی سفارش کی ہے۔

ان کلی مباحث کے بعد کتاب کا اصل موضوع یعنی ادویہ مفردہ کا تذکرہ شروع ہوا اور حروف تہجی کے اعتبار سے الف کی تختی سے ابتدا کی گئی۔ سب سے پہلے آطریلال کا تذکرہ ہے، ماہیت، ماخذ، مزاج، مدر، مصلح، بدل اور خصوصی افعال کی طرف تفصیلی اشارات میں لکھا ہے کہ آطریلال برص و آثار سیاہی کے لئے نہایت مجرب ہے۔ اس بات کا بھی خصوصیت کے ساتھ التزام کیا گیا ہے کہ دواؤں کے مختلف نام، مختلف زبانوں میں لکھے ہیں اور دوا کے مزاج، متقدمین کے حوالے اور اپنے ذاتی تجربات سب بے کم و کاست تحریر کئے ہیں۔ آبریشم کے سلسلہ میں متقدمین کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ آبریشم کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اس کو قینچی سے کاٹ کر باریک کر کے استعمال کرانا مناسب نہیں ہے۔ اس سے معدے کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ ان کے خیال میں آبریشم کے باریک اجزا معدے کی سطح پر چپک جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اشتہائے طعام باطل ہو جاتی ہے۔ لہذا بہتر یہ ہے کہ آبریشم کو خوب جوش دے کر استعمال کرایا جائے۔ مصنف کی یہ تحقیق محل نظر ہے۔

صاحب کتاب نے اس ضخیم کتاب میں اس بات کا پورے طور پر اہتمام کیا ہے کہ دواؤں کے غیر معروف نام لکھ کر سرخ روشنائی سے معروف و مشہور نام تحریر کر دیئے ہیں۔ اور تفصیلی تذکرہ عام فہم ناموں کی تختی میں کیا گیا ہے۔ مثلاً "الف" کی تختی میں غیر معروف نام "اذن الغزال" یا "اذن الجدی" کا ہے، تذکرہ اس کا عام فہم نام "لسان الحمل" سرخ قلم سے لکھا ہے اور اسی دوا کو اس عام فہم نام کے ذیل میں "لام" کی تختی میں پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔

انداز بیان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کسی دوا کے مختلف اجزاء مستعملہ کو بیان کرنے کے لئے اس کے تمام اجزا کو ایک ہی مقام پر ذکر نہیں کیا، بلکہ حروف تہجی کے اعتبار سے ہر ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ بیان کر دیا ہے۔ مثلاً یہی لسان الحمل "لام" کی تختی میں مکمل پودے کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے ایک جزو تخم کو "با" کی تختی میں بذر لسان الحمل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ اسی انداز پر تمام دواؤں کے مختلف اجزا، بیج، برگ، گل، شگوفہ وغیرہ کو الگ الگ حروف تہجی کے اعتبار سے لکھا ہے، اس طرح ایک ہی

لہذا مختلف انداز سے متعدد بار نظر سے گذرتی رہتی ہے ۔

صاحب کتاب نے متقدمین کے مشاہدات سے استفادہ کی طرف ابتدا ہی میں اشارہ کیا ہے، جس کا تقاضا تھا کہ کتاب اپنی ضخامت کے اعتبار سے متقدمین کے حوالوں سے پر ہوتی جیسا کہ مفردات ابن بیطار میں حوالجات کی کثرت نظر آتی ہے، اور تقریباً ڈیڑھ سو مصنفین کا تذکرہ کسی نہ کسی دوا کے ذیل میں ابن بیطار کی کتاب میں ملتا ہے ۔ اس کے برخلاف اس مخطوطے میں حوالجات کم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر رازی اور شیخ کے حوالوں پر اکتفا کیا ہے، ان کے علاوہ اسمٰعیل جرجانی اور تالیف شریفی سے بھی استفادہ کیا ہے ۔

یہ مخطوطہ جس قدر مفصل ہے مکمل بھی ہے ۔ اور "الف" سے لیکر "یا" تک تمام مفرد ادویہ جو مصنف کے دور تک ذخیرہ معلومات کا جزو بن چکی تھیں مذکور ہیں ۔ مخطوطے کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ خط اگرچہ نستعلیق نہیں اور بعض جگہ شکستگی بہت بڑھ گئی ہے ۔ پھر بھی صاف ستھرا اس قدر ہے کہ پڑھنے میں کسی قسم کی کوئی دقت نہیں ۔ انداز بیان اگرچہ بہت مفصل ہے لیکن اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے کہ ان تفصیلات کی وسعتوں میں نفس مفہوم کھو نہ جائے مجموعی اعتبار سے یہ مخطوطہ علم الادویہ کے ذخیرہ میں خصوصی اضافہ ہے ۔

مخطوطے کا کوئی صفحہ کرم خوردگی سے محفوظ نہیں ہے، لیکن اس کا کوئی اثر نفس مفہوم کو سمجھنے پر نہیں پڑتا ۔ حتیٰ کہ دو سو تیرہویں ۲۱۳ ورق سے دو سو سولہویں ۲۱۶ ورق تک اوراق بہت زیادہ کرم خوردہ ہیں وہ بھی اخذ مطلب میں رکاوٹ نہیں ۔ ان اوراق میں "میم" کی تختی کی دواؤں کا تذکرہ ہے ۔

اس مخطوطے پر اوّل و آخر کوئی مہر نہیں ہے، صرف ایک چوکور مہر کاتب نظام الدین ولد جلال الدین از شاگرد نواب مقرب خان کیرانوی درج ہے ۔ مخطوطے پر مالک کی حیثیت سے حکیم نجیب الرحمٰن کیرانوی لکھا ہوا ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں ہے ۔ انداز کتابت اور حوالجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کا مخطوطہ ہے ۔

ریاض عالمگیری، مصنفہ محمد رضا الطبیب :۔ تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل فارسی مخطوطہ ہے ۔ مصنف نے مقدمہ میں ہی اس کا نام "ریاض" تحریر کیا ہے سنہ ۱۱۰۲ھ محمد شاہی اس کا ترقیمہ ہے، مقدمہ کی عبارت اور کتاب کی آخری تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ "رضا فوٹو" رباعی

انی ہے، ریاض اولی اس سے قبل لکھی جا چکی ہے اور اس میں ریاض ثانی کا تذکرہ، ریاض اولی میں بھی کیا گیا
ہے؛ دیوبند کے کتبخانے میں صرف ریاض ثانی کا مخطوطہ ہے، آخر کتاب میں یہ تحریر درج ہے: تحریر مل
سحون تا نزدہ شب موجب شفاء عرق النساء است "تم الریاض الثانی" ۔ کاتب کی حیثیت سے
یم محمد سعید ولد حکیم محمد نافع خاں مرحوم کا نام درج ہے۔ یہ مخطوطہ جو ریاض ثانی کے نام سے موسوم ہے
مکمل ہے۔ ریاض ثانی کا مقدمہ بہت مختصر ہے۔ جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ ریاض اولی میں مفصل مقدمہ لکھا
جا چکا ہے۔ اس مخطوطے کو ریاض ثانی عالمگیری بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مخطوطہ ادویہ مرکبہ کے تذکرہ میں ہے۔ لیکن
زابادین کے طرز پر نہیں، بلکہ مختلف نظام ہائے جسمانی میں امراض کے تعلق سے استعمال ہونے والے مرکبات
تذکرہ ہے۔

کتاب کی ابتدا میں تقریباً دس صفحات پر دواؤں کو مرکب بنانے کے مقتضیات، مرکبات میں مفرد
دواؤں کی شمولیت اور ان کی مناسبت، مرکب کا مزاج، اوزان کا تعین، تخریج درجات مرکبات اور
مقدار خوراک کے سلسلہ میں اصولی بحث ہے۔ شیخ، رازی، جالینوس اور دیگر متقدمین سے استفادہ بھی کیا ہے۔
اس کلی بحث کے بعد امراض راس میں استعمال ہونے والی دواؤں کا ذکر ہے، اور کتاب کے گیارہویں صفحے
پر عنوان سے "جملۃ الادویۃ الراس" ابوالفضل محمد بن یحیی کے قول سے شروع کیا ہے۔ ہدایت کی ہے کہ
بدن کے مرض کو اخلاط ردیہ فضلیہ سے پاک رکھنا ضروری ہے، ورنہ خلط غلیظ دماغ میں عفونت پذیر ہو کر سر میں تبخیر
باعث ہوگا۔ ترتیب اس طرح قائم کی ہے کہ کسی بھی مرض کے سلسلے میں ادویہ مرکبہ جن جن طریقوں سے استعمال کی
سکتی ہیں ان کا بتفصیل تذکرہ ہے۔ ایسی تمام ادویہ مرکبہ جن کا ذکر شروع ہوا ہے ان کا نام کاتب نے حاشیہ پر بھی لکھ دیا ہے۔
لاغون ایارج، حب ایارج، ایارج کبیر، ایارج مرکب، گویا ایارج سے متعلق تمام مرکب صورتوں کا تذکرہ ہے۔ مرکبات
ذیل میں اس کتاب کی تمام ادویہ مفردہ کو بیان کر دیا ہے اور ساتھ ہی مقدار خوراک بھی تعین کر دی ہے مثلاً حب ایارج
نسخ علیل راس از بلغم و صفرا۔ اس کے بعد حب ایارج کے اجزا ترکیبیہ پھر ان کا استعمال اور
خوراک۔ اسی طرح اسطوخودوس اور دوسری دواؤں کے بارے میں مختلف مرکبات کا
تذکرہ ہے اور اسی نہج پر ریاض ثانی کو مکمل کیا ہے۔ اس مخطوطے میں امراض راس، چشم،
انف، اذن، حلق، صدر و ریہ، جگر، گردہ و مثانہ، اعصاب اور اعصابی درد وغیرہ سب
تفصیلی جائزہ ہے اور جگہ جگہ صرف شیخ، رازی اور جالینوس کے حوالے ہیں۔ چنانچہ

سرطان میں اسرب محرق کو جالینوس کے حوالے سے عجیب الفعل لکھا ہے۔

مخطوطے کی کتابت صاف ستھری، کاغذ سادہ اور ملائم اور باریک استع
ریاض شاہی کو مختلف اطبا نے اپنے لئے بنیاد بنایا ہے۔ تذکرۃ العلاج میں علوی
بیشتر مقامات پر ریاض عالمگیری کے حوالے دیئے ہیں اور اسی کے حوالے سے سہر
علاج میں بنفشہ، اصل السوس اور بابونہ کے جوشاندہ سے نطول مفید بتایا ہے۔

تذکرۃ العلاج :- ہندوستان کی طبی تاریخ کی گرامی منزلت شخصیت حکیم علوی خاں
(وفات ۱۱۶۰ھ) جن کے معالجے کی دھوم دربار شاہی سے لیکر عوام الناس تک رہی اور جن کے درس وا
سے بیشمار تلامذہ نے فیض پایا۔ اور وہ اپنے وقت کے مشاہیر میں شمار ہوئے۔ طبی تلمذ اور طبی سلسلہ
کی تاریخ میں بھی علوی خاں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بحیثیت مصنف بھی انھیں اہم
حاصل ہے۔ ان کی متعدد کتابوں میں غالباً سب سے اہم "تذکرۃ العلاج" ہے۔ اس کے نام سے اگرچہ
ہوتا ہے کہ یہ عام معالجات کی کوئی کتاب ہے لیکن دراصل (۶۶۸) صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب بجا
عمومی کے بجائے معالجات خصوصی میں صرف امراض راس سے متعلق ہے۔ طب کے پورے ذخیرے میں ک
ایک نظام پر اس سے زیادہ مبسوط اور ضخیم کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس کی حیثیت بلاشبہ ایک
شاہکار کی ہے۔ ذاتی تجربات و اضافات کے علاوہ اس میں متقدمین اور متاخرین اطباء کے
بکثرت حوالے پیش کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں سر کے اجزاء ترکیبیہ اور اس کی مفصل تشر
تجاویف، مجاری، درز، اغشیہ دماغیہ اور ان کے فوائد پر مکمل گفتگو کی گئی ہے۔ دماغ اور اس
حصے اور ان کے افعال، احساسات دماغیہ اور اعصاب دماغی پر بھی سیر حاصل بحث ہے
ان امور کے علاوہ مقدمے میں اوزان اور ادویہ کو اصولی انداز میں بیان کیا ہے۔ نیز دماغ کا مزا
اور اس کی علامات بھی ظاہر کی ہیں اس کے بعد ورم دماغ اور اس کی علامات کی تفصیلات ب
باب اوّل میں مرض صداع اور اس کے اقسام، اسباب، علامات اور علاج نیز

بڑی تشریح اور تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ اس کے بعد علاج کے ذیل میں ادویہ مفردہ کی اہمیت اور دواؤں کے مقابل غذا سے علاج کی افضلیت پر مدلل گفتگو ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دوا کے مقابل غذا کو بطور علاج استعمال، انسانی طبیعت اور جسم کے مماثل ہونے کی وجہ سے زیادہ موضوع ہے۔ نجیب الدین سمرقندی اور جالینوس کے اقوال سے اپنے اس دعوے کو مدلل بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ادویہ مرکبہ کے مقابلے میں مفرد اور کم سے کم دواؤں کا استعمال زیادہ بہتر ہے۔

صداع اور اس کے اقسام کے ساتھ ساتھ اصول علاج پر بھی گفتگو ہے۔ اور جیسے مختلف قوانین کے تحت بیان کیا ہے۔ مرض صداع کے علاج میں بالخاصہ اثر انداز ادویہ بھی درج کی گئی ہیں۔ مرجان اور ہُد ہُد کے سر کی جلد کو کپڑے میں باندھ کر لٹکانا مفید بتایا ہے۔ اسی طرح حجر الحیۃ، جیسے لسان الفرس (گھوڑے کی زبان) اور سداب وغیرہ بھی بطور تعلیق مفید ہیں۔ صداع کے آخر میں ادویہ مفردہ، جو مرض صداع اور اس کے اقسام میں مستعمل ہیں، کی مفصل فہرست پیش کی ہیں۔ اس سلسلے میں بقراط، جالینوس، زکریا رازی، شیخ بو علی سینا، سمرقندی اور دوسرے متقدمین اطباء سے استفادہ کیا ہے۔

مخطوطے کا پہلا جزء، جو تقریباً (۲۵۰) اوراق پر مشتمل ہے اسمیں صداع کے بیان کے بعد ۱۱۱ ورق سے سرسام کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ صداع اور اس کے اقسام کی جس قدر تفصیل اور تشریح اس کتاب میں ملتی ہے۔ کسی دوسرے مصنف کے یہاں اس کی مثال نظر نہیں آتی۔ صداع کی طرح سرسام اور اس کے اقسام پر بھی مکمل بحث کی گئی ہے۔ اسباب، علامات، علاج، ادویہ مفردہ دواؤں کے استعمال کی مختلف شکلیں اور انتخاب ادویہ پر بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ لیثرغس کے علاج میں ادویہ مفردہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کتاب کا جزء اوّل تمام ہوا ہے۔ سبات کے دس اصناف بیان کئے ہیں اور ہر صنف کے اسباب و علامات پر مفصل بحث کی ہے۔ ۲۱۵ ویں ورق پر ادویہ منومہ مفردہ و مرکبہ کا تذکرہ ہے۔ ان ادویہ کو ضماداً اور شرباً استعمال کرایا گیا ہے۔ ان دونوں قسم کی دواؤں کی ایک طویل فہرست ہے جس میں خشخاش، خس، بزر البنج، باقلا، مرماخور، لفاح، حماما، جوزماثل، عصارۃ القرع، بیخ یبروح، زہر العصفر، شیلم، لاجورد، جوار کی روٹی وغیرہ ہیں۔ ۲۵۸ ویں

ورق سے مالیخولیا کا بیان ہے اور جنون و عشق کے بیان پر مخطوطہ ختم ہوا ہے۔ عشق کے علاج میں جہاں اور معمولات بیان کیے گئے وہاں "غیر" کیطرف توجہ (اشتغال بالغیر) کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ شطرنج، شکار اور ذکر محبوب سے اجتناب وغیرہ کو بھی بطور تدبیر لکھا ہے۔ امراض اور اس کی طرح اس کتاب میں تمام امراض بدن کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی تو شاید اس انداز کی بیسوں جلدیں درکار ہوتیں۔ جیسے غالباً کسی ایک مصنف کے لئے آسان نہیں سمجھا جائے گا۔

۶۶۸ صفحات کی اس فارسی کتاب کا مخطوطہ دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ کی زینت ہے۔ کتابت صاف ستھری ہے۔ بڑی تختی کے ہر صفحہ پر ۱۲ سطریں ہیں۔ مخطوطہ کے آخر میں علی مظفر خان نا محمد شاہ بادشاہ کی مہر ہے۔ کتاب کی ابتدا اور انتہا میں نقص عبارت سے مصنف کا نام ظاہر نہ ہوتا البتہ ابتدا میں کتاب کا نام "تذکرۃ العلاج" تحریر ہے۔ مخطوطے میں جگہ جگہ کچھ جگہیں خالی ہیں عنوانات کو علی قلم سے لکھنے کے لئے چھوڑی گئی ہیں بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ کاتب کو موقع نہیں ملا حکیم عزیز الرحمٰن لکچرر جامعہ طبیہ دیوبند نے ان عنوانات کو اکثر مقامات پر متعین کرنے اور جگہ جگہ کتابت تصحیح کی کوشش کی ہے۔

ابرقوہی: قطب الدین، ابوالفضل محمد بن اسحاق بن محمد المؤید الہمدانی الابرقوہی ثم المصری (۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء) ۱۳ ویں صدی عیسوی کے نہ صرف فاضل طبیب بلکہ زبردست محدث تھے بڑی تعداد میں لوگوں نے ان سے حدیث کی سماعت کی ہے۔ معالجات طب ایران کی جو کسی نام کے بجائے مصنف کے نام سے مشہور ہے اور طب کی اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

پوری کتاب تقریباً (۳۷۰) ابواب میں تقسیم ہے اور ہر باب کے ذیل میں جسم کے کسی مرض یا مرض کی ذیلی اقسام کا تذکرہ ہے۔ ہر مرض کے سلسلے میں متعلق دواؤں کو مختلف شکل اور طریقوں سے استعمال کرانے کی نہایت کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مفرد دوائیں جو مختلف امراض میں مذکور ہوئی ہیں انھیں مناسب بدرقات کے ساتھ استعمال کرایا گیا ہے۔ مرض کی ماہیت علامات نیز دوسرے احوال سے صرف نظر کر کے بطور علاج صرف ادویہ مفردہ کا تذکرہ کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ ادویہ مفردہ میں بھی مصنف نے اس امر کی کوشش کی کہ تنہا ایک مفرد دوا استعمال کی جائے۔ دواؤں کی کثرت متاخرین کا طریقہ ہے متقدمین کے یہاں کم سے کم دوا

استعمال پر زور دیا گیا ہے یہ کتاب اس کی بہترین نمائندہ ہے۔ اس قسم کی دوسری کتابوں میں مثال
کے طور پر کتاب المغنی اور تذکرہ امام سویدی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

مخطوطے کی ندرت یہ ہے کہ اس میں نہ صرف مرض کو دفع کرنے والی دواؤں کا تذکرہ ہے بلکہ
امراض کو پیدا کرنے والی دواؤں کا بھی خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ مثلاً صداع اور
اس کی اقسام کے ذیل میں بھی ایسی دواؤں کا ذکر ہے جو ادویہ مصدع یعنی درد سر پیدا کرنے والی ہیں مثلاً
ب، کراث، کندر، کبر، خردل، ریحان، توت، عوسج، حرجیر وغیرہ۔

بہت سے امراض کے ذیل میں بالخاصہ اثر انداز ادویہ کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً صداع میں تعلیق مرجان،
صرع میں تعلیق عود صلیب اور زنخ اسطوخودوس نیز حجر العتیق کی تعلیق وغیرہ۔

مانع حمل دوائیں بھی بکثرت بیان کی گئی ہیں چنانچہ جھنگا دڑ کے پتے کا حمول، تخم حماض کا حمول
مانع حمل بتایا ہے۔ اس کے مطابق بخور مریم کو عورت کے بازو پر لٹکا کر جماع سے حمل قرار نہیں پاتا ہے اور اس
کی بکثرت دوائیں اس میں ملتی ہیں۔ جنہیں خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں تحقیق کا موضوع بنایا جا سکتا
مخطوطہ میں سر، آنکھ، ناک، کان، حلق، سینہ، پھیپھڑہ، قلب، معدہ، جگر، آنتوں، گردہ و مثانہ اور
رحم کا مفصل تذکرہ ہے۔ امراض جراحیہ مثلاً ضربہ، سقطہ، کسر و خلع پر بھی خاصی معلومات فراہم کی
گئی ہیں۔ سموم و تریاق اور حشرات الارض سے پیدا شدہ سمی اثرات اور ان کے مناسب تدارک پر بھی
روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں نسخوں متفرقہ کے عنوان سے مختلف امراض سے متعلق مجرب، سریع الاثر،
فوری اثر انداز، بلیغ النفع جیسے الفاظ کے ساتھ بکثرت دواؤں کو درج کیا گیا ہے۔ ۴ صفحات
پر پھیلی ہوئی اس قسم کی کم و بیش ۱۵ دوائیں ذکر کی گئی ہیں۔ مثلاً آطریلال کو برص میں مجرب لکھا
ہے زرنیخ احمر کو سرکہ میں حل کر کے اس کی کلیاں خرص میں بلیغ النفع بتائی ہیں۔ جرب العین میں زعفران
ذخیرہ کے لئے صبر سقوطری کا بطور سرمہ استعمال مجرب تحریر کیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ادویہ مفردہ کے بدل بیان کئے گئے ہیں۔ یہ ایک نیا عنوان ہے جس کا
بیان زکریا رازی کے رسالہ ابدال ادویہ کے مانند ہے۔ یہ ۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں
سو سے زیادہ دواؤں کے بدل کا تذکرہ ہے۔ آخری صفحات میں دواؤں کے درجات مزاج

کے لحاظ سے بھی منضبط کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ پوری کتاب نہ صرف معالجات کے نقطۂ نظر سے بلکہ علم الادویہ کے لحاظ سے بھی نہایت قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

مخطوطہ کی کتابت ۱۸۷۵ء میں کی گئی ہے۔ یہ (۲۱۶) اوراق یعنی (۴۳۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ مخطوطہ اگرچہ مکمل ہے مگر صفحات بہت بے ترتیب مجلّد ہیں۔ ابواب کی نشاندہی جلی اور رنگین قلم سے کی گئی ہے۔ کتابت میں کافی غلطیاں ہیں اور بسا اوقات معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے یہ نسخہ بہ عجلت تمام لکھا ہے۔ اس کتاب کے ساتھ یوسفی کا رسالہ 'ماکول و مشروب' بھی مجلد ہے۔ مخطوطہ لکھنؤ کے نامور طبیب حکیم مظفر حسین خاں کی ملکیت رہ چکا ہے اور اس پر ان کی مہر کندہ ہے۔

••

جناب محمد ظفیر الدین
(دیوبند)

کتب خانہ دار العلوم دیوبند کے اہم طبی مخطوطات

یہ کتب خانہ دار العلوم دیوبند ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ میں بانی دار العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ایماء سے قائم ہوا، تاکہ اساتذہ، طلبہ اور دوسرے اہل علم اپنی علمی پیاس بجھا سکیں۔ یہاں مخطوطات کا ذخیرہ بھی اچھا خاصا پایا جاتا ہے، اور اس ذخیرہ میں دوسرے فنون کی طرح طبی ذخیرہ بھی بہت اچھا ہے۔ آج کی اس علمی مجلس میں انہی طبی مخطوطات میں سے چند کتابوں کا تعارف پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جا رہی ہے، شاید کہ کچھ کام کی باتیں سامنے آ جائیں۔ وہ کتابیں جو خاکسار کے علم میں اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں، ان میں سے اہم کتابوں کا تعارف پیش کرنا بہت ضروری بھی ہے اور مفید بھی، یوں کتب خانہ دار العلوم دیوبند کے مخطوطات کا تعارف دو جلدوں میں بہت پہلے خاکسار کے قلم سے شائع ہو چکا ہے۔

التحفة السعدیة۔ شرح کلیات القانون — بو علی سینا کی کتاب القانون کی یہ شرح جو تحفہ سعدیہ کے نام سے علمی حلقوں میں مشہور ہے، اب تک غالباً طبع نہیں ہو سکی ہے۔ شارح کا نام قطب الدین شیرازی (م ۷۱۰ھ) ہے۔ تاریخ میں پورا نام اس طرح لکھا گیا ہے۔ محمود بن مسعود بن مصلح الفارسی قطب الدین الشیرازی۔ شارح موصوف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مجھ سے پہلے اس کتاب القانون کی شرح بارہ[۱۲] نامور علما و طلبہ لکھ چکے ہیں، اور ان شرحوں کا میں نے بغور مطالعہ کیا ہے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک مزید شرح کی اب بھی ضرورت باقی ہے، جس میں جامعیت کی شان ہو، اور کتاب القانون کو پورے طور پر حل کرتی ہو، اور بکھرے ہوئے طبی مسائل کو یہ شرح اپنے اندر سموئے۔ شارح یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس شرح کے لکھتے وقت میں نے یہ تمام شرحوں کو سامنے رکھا ہے، اور بہت سے مسائل جو خوب واضح نہیں تھے اپنے زمانہ کے نامور علما و طلبہ سے مذاکرہ و بحث کر کے ان کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ تاکہ جو کچھ لکھا جائے وہ سمجھ کر اور پوری بصیرت کے ساتھ لکھا جائے۔ بے سمجھے ہوئے کوئی بات صرف کسی کی تقلید میں نقل نہ ہونے پائے۔

انھوں نے ۶۸۲ھ میں اپنی یہ شرح لکھنا شروع کی تھی، اور ۷۱۰ھ میں جا کر اس کی ان کے قلم سے تکمیل ہوئی، گویا اس شرح پر شارح نے اٹھائیس[۲۸] سال مسلسل محنت کی، جس قدر محنت کر سکتے تھے انھوں نے کی، اپنی کد و کاوش، بوجھ تاچھ اور بحث و مباحثہ میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔

اس شرح کا جو نسخہ کتب خانہ دار العلوم میں ہے اس کی پہلی دو جلدوں کی ضخامت (۶۴۵) اوراق ہیں، یعنی

یہ دو جلدیں (۱۲۹۰) صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں ہر جلد کی یہ ہے کہ ایک ایک صفحہ میں (۲۱) (۲۱) سطریں ہیں۔ خط بار یک ہے سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ لیکن اندازہ ہے کہ کئی سو سال پہلے کی کتابت شدہ ہے۔ چوتھی اور پانچویں جلد یں بھی کتب خانہ میں قلمی صورت میں موجود ہے۔ چوتھی جلد کی ضخامت (۳۲۶) اوراق، ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں۔ پانچویں جلد کی ضخامت ۲۱۲ اوراق ہیں اور ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں۔ اس کی تیسری جلد نہیں ہے۔

شرح القانون للمصری — کتاب القانون لابن سینا کی چوتھی قلمی شرح کتب خانہ دارالعلوم میں قطب الدین ابراہیم بن علی المصری (م ۶۱۸ھ) کی تالیف کردہ ہے۔ قطب الدین مصری اپنے دور کے ایک ماہر، ذی استعداد طبیب تھے، موصوف امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کے تلامذہ میں داخل تھے، اور اپنے دور کے بڑے عالموں میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی یہ شرح بھی قیمتی کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ شارح کا نسلی تعلق مغرب سے تھا، یہ وہاں سے منتقل ہو کر مصر آگئے تھے، اور ایک مدت تک یہاں مقیم رہے۔ اسی وجہ سے المصری کے نام سے مشہور ہو گئے، اخیر زمانہ میں خراسان چلے گئے تھے، یہیں نیشاپور میں آپ کا قیام تھا کہ وہاں دفعۃً تاتاریوں کا حملہ ہوا، اس حملے میں جہاں دوسرے علماء، صلحاء اور عوام و خواص قتل کیے گئے یہ بھی قتل ہوئے۔ شارح کی متعدد تصنیفات ہیں۔ شرح القانون کا یہ قلمی نسخہ جس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے وہ ۶۷۹ھ کا لکھا ہوا تھا۔ یعنی شارح کے زمانہ سے قریب تر عہد کا تھا، زیر نظر نسخہ کی کتابت ۱۱۹۶ھ میں ہوئی ہے۔ اس کی ضخامت (۲۱۱) اوراق، اس شرح کی صرف یہی جلد موجود ہے۔ ان کے حالات کے لیے دیکھئے معجم المولفین (ج ۱، ص ۴۲) عیون الانباء فی طبقات الاطباء، ج ۲، ص ۳۰ -

شرح القانون المعروف بشرح جدید — شرح جدید کا زیر نظر قلمی نسخہ بھی کتاب القانون کی ہی شرح ہے شارح کا پورا نام اس طرح ہے۔ محمود بن مسعود بن محمود بن محمد۔ اخیر میں مصنف نے صراحت کی ہے کہ یہ شرح انھوں نے ۹۷۳ھ میں مکمل کی ہے۔ گویا یہ کتاب القانون کی پانچویں شرح ہے، جو کتب خانہ دارالعلوم میں قلمی صورت میں پائی جاتی ہے۔ یہ شرح دو جلدوں میں مجلد ہے۔ ہر جلد کی ضخامت دو، دو سو اوراق ہوگی، سنہ کتابت درج نہیں ہے -

شرح القانون للجیلانی — کتاب القانون کی چھٹی شرح جو قلمی صورت میں کتب خانہ دارالعلوم میں پائی جاتی ہے، وہ حکیم جیلانی کی شرح ہے۔ جو غالباً چھپ چکی ہے، اس کی تین جلدیں ہیں۔ دو جلدوں کی ضخامت (۴۸۱) اوراق، جلد ثالث کی ضخامت (۲۹۲) اوراق، جلد خامس کی ضخامت (۱۰۳) اوراق، چوتھی جلد نہیں ہے۔

شرح موجز القانون للحکیم ارشد خان الدہلوی — کتاب القانون کی تلخیص علامہ قرشی (م ۶۸۷ھ) نے کی تھی۔ جس کا ذکر آ چکا ہے۔ اس کا نام الموجز رکھا گیا۔ یہ تلخیص الموسوم بالموجز بھی کافی مقبول ہوئی، اور اس کی بھی بہت

سے علمائے طب نے شرحیں لکھیں۔ ان میں ایک شرح علامہ نفیس بن عوض کرمانی (م ۸۴۱ھ) کے قلم سے ہے۔ اس کا بھی قلمی نسخہ موجود ہے۔ مگر چونکہ وہ طبع ہو چکی ہے، اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اس تلخیص کی ایک دوسری شرح ایک ہندوستانی عالم طب نے کی جو غالباً ابتک نہیں چھپی ہے، اور اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں پایا جاتا ہے۔ ان ہندوستانی طبیب کا نام حکیم ارشد خان دہلوی (م ۱۲۳۰ھ) ہے۔ جو اپنے زمانے میں حکیم شفائی کے نام سے مشہور تھے۔ اور فن طب سے بڑا شغف رکھتے تھے جن کا مطالعہ تحقیق اور نظر وسیع اور گہری تھی، اور یہ واقعہ ہے کہ اس شرح کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس قدر ذہین اور وسیع المطالعہ تھے۔ یہ پوری شرح چار جلدوں میں ہے۔ مگر کتب خانہ دارالعلوم میں اس کی صرف پہلی تین جلدیں ہیں۔ چوتھی جلد نہیں ہے۔ اس شرح کا نام انھوں نے "الفوائد الشفائیہ" تجویز فرمایا ہے۔ مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں۔

"اردت ان اکتب علیہ شرحا لعبارۃ سالکۃ وبیانات واضحۃ لیصیر القاری لہ مستغنیا عن جمیع الکتب المصنفۃ فی ھذا الفن وسمیتہ، بالفوائد الشفائیۃ" یعنی میں نے چاہا کہ اس کتاب کی ایک شرح سلیس اور عام فہم عبارت میں لکھ دوں تاکہ جو اس شرح کو پڑھ لے، وہ طب کی بقیہ تمام مصنفات سے مستغنی ہو جائے۔ اور میں نے اس کا نام الفوائد الشفائیہ رکھا۔

حکیم ارشد خان دہلوی دہلی میں پیدا ہوئے، یہیں نشو و نما پائی۔ اور اسی شہر میں تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوئے اور شہرت حاصل کی لیکن جب احمد شاہ درانی دہلی آیا تو یہ اس زمانہ میں دہلی سے فیض آباد منتقل ہو گئے۔ فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ نے ان کی آمد کو اپنے لئے اور اپنے دربار کے لئے غنیمت جانا، اور کافی اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا۔

فن طب پر انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں صاحب نزہۃ الخواطر نے لکھا ہے "شروح و تعلیقات علی الکتب الطبیۃ" اور چند کتابوں کے نام اور بھی دئے ہیں۔

۱۲۳۰ھ میں حکیم صاحب موصوف نے لکھنؤ میں وفات پائی۔ اور وہیں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ عمر کوئی اسی سال پائی۔ موجودہ تین جلدوں کی ضخامت (۱۲۱۸) صفحات ہیں، ہر صفحہ میں (۲۱) سطریں ہیں، سنہ کتابت چوتھی جلد کے آخر میں ہوگی۔ جو اتفاق سے یہاں موجود نہیں۔ ان کے حالات کے لیے دیکھئے نزہۃ الخواطر ج۷ ص۲۲۔ شارح کی ایک دوسری تصنیف جراحۃ المعالجہ کے نام سے ہے۔ اس پر ایک صاحب نے تنبیہ المجانین کے نام سے نقد کیا ہے۔ تنبیہ المجانین کا قلمی نسخہ بھی موجود ہے۔

شرح فصول لبقراط لابن ابی صادق نیشاپوری۔ فصول بقراط نامی کتاب کافی مشہور ہے اور طبی دنیا میں

ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتاب مشہور حکیم بقراط (قبل مسیح ۳۵۷) کی طرف منسوب ہے، اس کتاب
کی شرح پر متعدد علماء طب نے محنت کی ہے، اس کتاب میں سات مقالے ہیں اور ہر مقالے میں متعدد فصلیں ہیں، اور ہر
فصل میں ایک بیماری اس کے آثار و علامات کا بیان ہے، پھر اس کی دواؤں اور ان کے خواص کی تفصیل ہے، بعض علماء
کا بیان ہے کہ اس چھوٹے سے رسالہ میں حکیم بقراط کی تمام تصانیف کا نچوڑ آگیا ہے۔ اور علم طب کا کوئی اصولی مسئلہ باقی
نہیں رہ گیا ہے۔ اس کتاب کی شرح لکھنے والوں میں ابو القاسم عبد الرحمن بن احمد بن ابی صادق نیشاپوری (م ۴۷۰ھ) بھی ہیں،
جو علوم طب میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ اور جالینوس کی کتابوں کے شائق تھے۔ اصول و حکمت کی جستجو ان کی فطرت میں داخل تھی۔
فصیح البیان اور بلیغ الکلام مانے جاتے تھے۔ مصنف کا بیان ہے کہ ابن ابی صادق شیخ الرئیس بو علی سینا کے ساتھ رہ چکے
ہیں۔ بلکہ ان سے باضابطہ درس لیا ہے۔ اس طرح یہ شیخ کے تلامذہ میں تھے۔

فن طب میں انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں ایک کتاب شرح فصول بقراط بھی ہے۔ یہ کتاب
سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ ہر مقالہ میں بیس پچیس فصلیں ہیں، اور ہر فصل میں الگ الگ بیماریوں اور ان کی دواؤں
کا بیان ہے۔ اس طرح پورے طبی مسائل اس میں آگئے ہیں۔

شارح اپنے زمانے میں بقراط ثانی کے نام سے مشہور تھے۔ اس قلمی نسخہ پر سنہ کتابت ۷۷۵ھ درج ہے۔
درج ہے۔ ضخامت (۱۱۲) اوراق یعنی ۲۲۴ صفحات ہیں ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں۔ حالات کیلئے دیکھئے عیون الانباء
فی طبقات الاطباء شارح نے اسّی سال سے زیادہ عمر پائی۔

الذخیرۃ فی المعالجات — یہ کتاب مشہور طبیب ثابت بن قرہ حرانی (م ۲۸۸ھ) کی تصنیف ہے۔ طبقات الاطباء
کے مصنف نے لکھا ہے کہ اپنے زمانہ میں علم طب میں یہ اپنا کوئی مماثل نہیں رکھتے تھے۔ ابتدا میں صرافی کا کام کرتے تھے۔
پھر علم کا شوق دامنگیر ہوا، تو صرافی چھوڑ کر پڑھنے لگے۔ اور اپنے وقت کے بڑے طبیب ہو گئے۔ اور ان کی کافی شہرت
ہوئی۔ یہ پیدا حران میں ہوئے۔ ان کا سنہ پیدائش ۲۲۱ھ ہے۔ مگر پھر یہ بغداد منتقل ہو گئے، وہیں رہ کر پڑھا لکھا،
اور فلسفہ اور علم طب میں کمال حاصل کیا۔ اور مختلف فنون میں بہت ساری کتابیں لکھی منطق، ریاضی، علم نجوم، ہیئت
وغیرہ سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ کئی زبانیں جانتے تھے اور ان زبانوں سے عربی میں ترجمہ کا ملکہ تامہ رکھتے تھے، سریانی
زبان سے خصوصی شغف تھا۔

انھوں نے علم طب کے مختلف موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں ان کی ایک کتاب کا نام
"الذخیرہ فی علم الطب" ہے۔ زیر بحث کتاب اس کا قلمی نسخہ ہے۔ مورخین لکھتے ہیں "عالم، حکیم، طبیب، بارع فی الطب

والفلسفہ، والّف فی انواع من العلم، کالمنطق والحساب، والھندسۃ، والنجوم والھیئۃ، من تصانیفہ الکثیرۃ الذخیرۃ فی علم الطب" (معجم المؤلفین ص۱۱/۳۵)

صاحب طبقات الاطباء نے لکھا ہے "لم یکن فی زمن ثابت من یماثلہ فی صناعۃ الطب ولا فی غیرہ وله تصانیف مشہورۃ بالجودۃ" (عیون الانباء)

یہ کتاب ہمارے کتب خانہ دار العلوم میں "الذخیرہ فی المعالجات" کے نام سے درج رجسٹر ہے۔ اس کتاب میں اکتیس[۳۱] مقالات ہیں۔ علم طب سے متعلق تمام ضروری چیزوں کو انہوں نے اپنے ان مقالات میں جمع کر دینے کی سعی کی ہے۔ ان مقالات میں تمام انسانی امراض اور ان کے علاج کا تذکرہ آگیا ہے۔ یہ نسخہ ۱۱۸۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔ ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں۔ اور ضخامت ۳۰۴ صفحات ہیں۔ کاتب کا نام میر حسن ہے۔

کتاب المنصوری ۔ کتاب المنصوری کا یہ قلمی نسخہ مشہور طبیب ابو بکر محمد زکریا رازی (م ۳۱۱ھ) کی تصنیف ہے۔ کتاب المنصوری انھوں نے امیر منصور بن اسحاق حاکم خراسان کے نام پر تصنیف کی ——— اس کی عبارت بہت چست اور جامع مانع ہے۔ الفاظ کم اور معانی زیادہ ہیں۔ گویا اختصار کے ساتھ معانی کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لینا چاہا ہے۔ پوری کتاب دس مقالات پر منقسم ہے پہلے مقالہ میں طب کے فضائل و فوائد بیان کئے گئے ہیں، اور ساتھ ہی اعضائے انسانی کی شکل و صورت بیان کی گئی ہے۔ اور اس کی تحقیق کا ندرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا مقالہ مزاج انسانی کے پہچان و تعارف اور بدن کی ہیئت پر مشتمل ہے۔ اس میں اخلاط کا بھی بیان ہے کہ کس وقت کون سا خلط غالب ہوتا ہے۔ اور اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں۔ استدلال میں بڑی جامعیت ہے تیسرا مقالہ غذاؤں اور دواؤں کی قوتوں کے بیان پر حاوی ہے۔ چوتھا مقالہ حفظان صحت پر ہے۔ پانچواں مقالہ زینت انسانی پر ہے۔ چھٹا مقالہ مسافروں کی تدبیروں کے بیان میں ہے۔ ساتواں مقالہ پھوڑے، پھنسی اور زخموں کے سلسلہ کی دواؤں اور علاج پر مشتمل ہے۔ آٹھواں مقالہ زہریلے اثرات اور زہریلے جانوروں کے سلسلہ میں ہے۔ نواں مقالہ امراض پر مشتمل ہے جو کہ ان انسان میں پیدا ہوتے رہتے ہیں سر سے لیکر قدم تک کے تمام امراض کا تذکرہ ہے۔ اور دسویں مقالہ میں بخاروں کی پہچان اور ان کے علاج کا بیان ہے۔

ان مقالات میں ہر مقالہ متعدد فصلوں میں منقسم ہے، مجموعی طور پر کتاب بڑی جامع ہے۔ یہ مخطوطہ (۲۹۶) اوراق پر پھیلا ہوا ہے، گویا یہ پانچ سو صفحات کی اچھی خاصی کتاب ہے ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں۔ زیر نظر مخطوطہ ۱۰۸۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔ مصنف کے حالات کے لئے دیکھئے عیون الانباء فی طبقات الاطباء ص۳۰۹/۱ ۔

الطب الکلی — اس کتاب کا مصنف ایک مسیحی طبیب ہے۔ اس کا نام ابو سہل عیسیٰ بن یحییٰ الجرجانی (م ۴۰۱ھ) ہے۔ علم طب سے اس کو بڑا شغف تھا۔ علمی اور عملی دونوں اعتبار سے یہ طب کا ہو کر رہ گیا تھا۔ زبان پر قدرت تھی، عبارت سلیس اور فصیح لکھتا تھا۔ خط بھی اس کا پاکیزہ تھا۔ مصنفین کی صف میں یہ کافی شہرت رکھتا تھا۔ جرجان میں پیدا ہوا اور وہیں نشو و نما کے دن گذارے۔ جب شعور بیدار ہوا تو بغداد جا کر تعلیم کی تحصیل میں مشغول ہو گیا۔ اور تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد خراسان جا کر بود و باش اختیار کر لی۔ وہاں کے سلطان کے دربار میں جگہ مل گئی۔ اور اس کا حاشیہ نشیں بن گیا۔ عمر کم پائی یعنی چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گیا۔ مگر پھر بھی کئی کتابیں اس نے لکھیں۔ اور اپنے زمانے کا مشہور طبیب کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کی۔ یہ بو علی سینا کا استاذ تھا۔ لیکن ابن سینا اپنے اس استاذ پر فوقیت لے گئے تھے۔ اور علم طب کی استاذ سے زیادہ خدمت کی۔

اس مسیحی مصنف کی کتابوں میں الطب الکلی نامی کتاب فن طب میں ایک عمدہ کتاب سمجھی گئی ہے۔ مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میری خواہش ہے کہ اپنی اس کتاب میں طب سے متعلق تمام بنیادی مسائل اس طرح یکجا کر دوں کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ باقی نہ رہنے پائے۔ تاکہ اس علم سے دلچسپی رکھنے والے اور اس فن کے طالب تمام کلیات طب سے اچھے واقف ہو جائیں۔ اور اس فن میں انھیں پوری بصیرت حاصل ہو جائے۔ ایسی بصیرت کہ اس کی مدد سے دوسرے جزئی مسائل پر خود حاوی ہو جائیں۔ اور پیش آمدہ جزئیات کا حل کرنا ان کے لئے سہل ہو جائے۔

یہ پوری کتاب دو مقالوں پر منقسم ہے۔ پہلے مقالہ میں طب کی بنیادی چیزوں اور ان کی ضرورت و اہمیت کا بیان ہے۔ اور دوسرے مقالہ میں امراض اور ان کے علاج و معالجہ کی تفصیل ہے۔ طرز بیان بڑی حد تک دلچسپ اور دلنشیں ہے۔ پہلے مقالے میں مصنف نے انتالیس ابواب قائم کئے ہیں۔ اور یہ ابواب (۷۹) اوراق یعنی ۱۵۸ صفحات میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دوسرے مقالہ کی ضخامت (۱۷۱) اوراق ہیں یعنی ۳۴۲ صفحات میں یہ مقالہ پھیلا ہوا ہے۔ اس مقالہ میں امراض اور ان امراض کی دواؤں کا بیان ہے۔ ہر ہر مرض کو الگ الگ کر کے بیان کیا گیا ہے۔ اور تمام اعضائے انسانی کی تفصیل الگ الگ دی ہے کہ ان میں کیا کیا بیماریاں ہوتی ہیں۔ اور ان کا علاج کن دواؤں سے کیا جائیگا۔ الطب الکلی کا یہ قلمی نسخہ ۱۰۰۸ھ کا کتابت شدہ ہے۔ کتاب اچھی ہے۔ ہر صفحہ میں پندرہ سطریں ہیں۔ مصنف کے حالات کے لئے دیکھئے الاعلام ص ۲۹۷ ج ۵۔ مصنف کی موت ۴۰۱ھ میں واقع ہوئی۔

المعالجات البقراطیہ — علم طب کا یہ مخطوطہ ابو الحسن احمد بن محمد الطبری (م ۳۶۶ھ) کا تالیف کردہ ہے۔ مصنف طبرستان کے رہنے والے تھے۔ بڑے عالم و فاضل تھے۔ علم طب سے بڑا لگاؤ تھا۔ اور اس میں مہارت

رکھتے تھے۔ امیر رکن الدولہ کے طبیب خاص تھے۔ ان کی اس کتاب المعالجات البقراطیہ کے متعلق طبقات الاطباء
میں لکھا ہے "ھو من اجل الکتب وانفعھا" یعنی طب کی کتابوں میں ممتاز کتاب ہے۔ اور بہت نفع بخش ہے۔ اس
کتاب میں امراض اور ان کے علاج کا ذکر بڑی جامعیت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان کے حالات کے لئے دیکھئے عیون الانباء فی طبقات
الاطباء ص ۳۲۱/۱۔ الاعلام ص [illegible]۔ پوری کتاب دس مقالات پر مشتمل ہے۔ ہر مقالہ میں متعدد فصلیں ہیں۔ اور ہر فصل میں کسی نہ کسی
بیماری اور اس کے علاج کا ذکر ہے۔ اس کی ضخامت ۳۰۰ اوراق ہیں۔ ہر صفحہ میں ۳۲ سطریں ہیں۔ کتابت غنیمت ہے۔
یہ قلمی نسخہ ۱۰۵۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔

مجموعہ رسائل سمرقندیؒ — نجیب الدین محمد بن علی بن عمر السمرقندی (م ۶۱۹ھ) ایک مشہور مصنف گزرے
ہیں جن کو علم طب میں بڑا دخل اور شغف تھا۔ یہ مجموعہ موصوف کا ہی تصنیف کردہ ہے۔ موصوف امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ)
کے معاصرین میں شمار ہوتے ہیں۔ تاتاریوں کا جب ہرات پر حملہ ہوا، تو اور علماء کے ساتھ یہ بھی اس فتنہ تاتار میں شہید ہو گئے۔
طبقات الاطباء میں لکھا ہے "طبیب فاضل بارع" انھوں نے مختلف فنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں علم طب
میں بھی آپ کی بہت سی کتابیں ہیں۔ قرابادین کبیر اور قرابادین صغیر ان کی مشہور کتاب ہے، ان کے حالات کے لئے دیکھئے عیون الانباء
فی طبقات الاطباء، ص ۳۱/۲ ۔

یہ مجموعہ رسائل ۱۰۱ اوراق میں پھیلا ہوا ہے۔ ۱۰۲۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔ گویا چار سو [۴۰۰] سال پہلے اس کی کتابت
ہوئی ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۷ سطریں ہیں۔ کتابت عمدہ ہے۔ مصنف کی قرابادین کا قلمی نسخہ بھی کتب خانہ دار العلوم میں موجود ہے جس
کی ضخامت (۷۹) اوراق ہیں۔ اور ہر صفحہ میں ۲۱ سطریں ہیں۔ یہ قلمی نسخہ ۱۲۵۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔

کتاب الادویۃ المفردۃ موسوم بہ مجربات ابن البیطار — ابو محمد عبداللہ بن احمد المالقی النباتی (م ۶۴۶ھ) کی
کتاب الادویۃ المفردۃ بڑی اہم کتاب ہے۔ یہ کتاب ہمارے کتب خانہ میں مجربات ابن البیطار کے نام سے درج رجسٹر ہے
مصنف ابن البیطار کے نام سے علمی دنیا میں شہرت رکھتے تھے۔ مورخین ان کو امام النباتیین کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔
مالقہ ایک شہر کا نام ہے، جہاں یہ پیدا ہوئے، اور جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کو مالقی وطن کی ہی نسبت کی وجہ
سے لکھا جاتا ہے۔ اور نباتی اس لئے لکھتے ہیں کہ نباتات کے بہت بڑے عالم اور طبیب گزرے ہیں۔ جڑی بوٹیوں کی تحقیق و
تفتیش اور ان کے تجربہ و مشاہدہ کا ایسا شوق تھا کہ وہ کبھی چین سے بیٹھنا نہیں جانتے تھے، بلاد روم اور دوسرے
ملک کا چکر لگایا کرتے جس کا مقصد ایک ہی تھا کہ جڑی بوٹیوں کا علم رکھنے والوں سے ملاقات ہو۔ ان کے تجربات
مشاہدات سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اور ان کے ذریعہ نباتات کے فوائد معلوم کئے جائیں۔ ان کو یہ بھی معلوم کرنے کا شوق

تھا کہ کونسی جڑی بوٹی کس موسم میں لگائی جائے۔ اور اس موسم کے اس پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر کون سی جڑی بوٹی کہاں اور کس ملک میں پائی جاتی ہے۔ اور سب کے کیا خواص ہیں۔

چنانچہ دوران سفر ایسے تمام لوگوں سے ملے جو جڑی بوٹیوں کا تجربہ اور علم رکھتے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ اچھا خاصا وقت گزارا۔ تاکہ ان کے تجربات سے پورا فائدہ حاصل ہو سکے۔ بطور خود جڑی بوٹیوں کے بونے، اگنے کو بھی دیکھا کرتے تھے۔ اور ان کی ماہیتوں کی تحقیق میں کافی وقت صرف کیا کرتے تھے۔

ابن البیطار المالقی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد اپنے دور میں فن نباتات کے امام بن گئے تھے، اور علم النباتات کے سب سے بڑے عالم کی حیثیت سے شہرت حاصل کر لی تھی۔ یہ اپنی خوش اخلاقی اور ملنساری میں بھی کافی مشہور تھے۔ جو ان سے ملتا ان کا گرویدہ ہو جاتا، عوام و خواص ان کے مکارم اخلاق اور جود و کرم سے کافی متاثر تھے۔ دمشق سے باہر انھوں نے نباتات کا ایک باغ لگا رکھا تھا، جہاں نباتات کی پرورش کیا کرتے تھے۔

علم طب میں انھوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں کتاب الادویۃ المفردۃ کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس قلمی کتاب میں مصنف نے اپنی پوری صلاحیت صرف کی ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ مفرد دواؤں، ان کے فوائد، خواص سے ہر طبیب کے لئے واقف ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ دوا ایک جنس ہے جس کی تین نوعیں ہیں۔ حیوانات، معدنیات اور نباتات۔ اس کتاب میں ان تینوں انواع سے بحث کی گئی ہے۔ زیر نظر قلمی نسخہ کی ضخامت (۱۳۴) صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں ۲۲ سطریں ہیں۔ کتابت اچھی ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۳۱ھ کا کتابت شدہ ہے۔ ان کی وفات دمشق میں ۱۲۴۸ء میں ہوئی۔ مصنف عرصہ تک مصر کے دربار شاہی کا طبیب بھی رہا ہے۔ سلطان ملک الکامل ان کا بڑا قدردان تھا۔ پہلے اس کے پاس تھے۔ اس کے انتقال کے بعد قاہرہ آ گئے، اور نجم الدین ایوب کے طبیب خاص بن گئے تھے۔ طبقات الاطباء میں ان کا نام اس طرح لکھا ہے "الحکیم الاجل العالم ابو محمد عبد الرحمن بن احمد المالقی النباتی یعرف بابن البیطار اوحد زمانہ وعلامۃ وقتہ فی معرفۃ النبات وتحقیقہ"۔ حالات کے لئے دیکھئے عیون الانباء ص ۱۳۳/۲ اور اعلام ص ۱۹۲/۴

شرح فصول بقراط از جالینوس — فصول بقراط کی ایک تیسری شرح جالینوس کی طرف منسوب ہے۔ اس شرح کا قلمی نسخہ بھی کتب خانہ دارالعلوم دیوبند میں پایا جاتا ہے۔ طبی دنیا میں بقراط کے بعد جالینوس ہی کا نام آتا ہے۔ جالینوس کی پیدائش ۱۹۵ء کی ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ فن طب میں کوئی اس کے برابر نہیں گزرا ہے۔ اس نے اس فن میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں، اور اس فن کے حقائق اور اسرار بیان کئے ہیں۔ ان کا جملہ ہے "ولم یجئ بعدہ من الاطباء من ہو دونہ فضلاً عن منزلتہ وتعلم منہ"۔ اس کی کل عمر ۸۷ سال تھی جس میں ۱۷ سال ان کے بچپن اور پڑھنے میں گزرے، اور پورے ستر سال انھوں نے

بحیثیت معلم اور مصنف کے گزارا۔ ان کے حالات کے لئے دیکھئے عیون الانبار فی طبقات الاطبار ج ۱ ص ۱۱۵ -

تحریم الدفن جالینوس — ایک مختصر قلمی رسالہ "تحریم الدفن" کے نام سے ہے۔ اور یہ بھی جالینوس (المتولد ۱۲۹ء) کی طرف منسوب ہے۔ دیباچہ میں مصنف لکھتا ہے کہ میں نے اپنے اس رسالہ کو چار مقالوں میں مرتب کیا ہے۔ پہلے مقالہ میں ان مریضوں کا تذکرہ ہے جن کو بے ہوشی کی وجہ سے مردہ سمجھ کر دفن کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ زندہ ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقی موت نہیں ہوتی۔ دوسرے مقالہ میں ایسے مریضوں کا ذکر ہے جن کو درد القلب کی وجہ سے قرار دیدیا جاتا ہے حالانکہ ان پر بھی حقیقی موت طاری نہیں ہوتی۔ تیسرے مقالہ میں ان لوگوں کا بیان ہے جن پر زیادہ غم یا زیادہ خوشی کی وجہ سے موت کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی مردہ نہیں ہوتے۔ چوتھے مقالہ میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے، جن پر زہریلی دواؤں کے استعمال کی وجہ سے موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور عوام و خواص اسے مردہ قرار دیتے ہیں، حالانکہ حقیقتاً وہ مردہ نہیں ہوتے۔

ان چاروں بیماریوں کی تفصیل اور ان کا علاج بتایا گیا ہے۔ یہ رسالہ صرف بارہ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور ہر صفحہ میں ۸ اسطریں ہیں۔ ۱۱۶۰ھ کا کتابت شدہ ہے۔ جالینوس کے حالات کے لئے دیکھئے عیون الانبار فی طبقات الاطبار ج ۱ ص ۷۱ -

●●

جناب کاظم علی خاں
(لکھنؤ)

کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ کے چند اہم طبی مخطوطات

لکھنؤ کے دیارِ علم و دانش میں ایسے کئی کتب خانے موجود ہیں جہاں فنِ طب کے بہت سے قدیم مخطوطات ملتے ہیں۔ محلہ جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں واقع کتب خانۂ ناصریہ بھی ایک ایسا علمی مخزن ہے جس میں مختلف علوم و فنونِ اسلامیہ کی دس ہزار قدیم و نادر قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا گراں قدر علمی سرمایہ دور دور سے آنے والے دانشوروں کو دعوتِ مطالعہ دیتا رہتا ہے۔ کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ میں مخطوطاتِ طب کا بھی ایک ایسا ذخیرہ محفوظ ہے جو اس علمی محفل میں شریک ہونے والے دانشوروں کے لیے دلچسپی کی شئے ثابت ہو سکتا ہے۔ یہاں فارسی، عربی اور اردو کے کم و بیش تین درجن قدیم مخطوطاتِ طب اہلِ علم کو دعوتِ تحقیق دینے کے لیے موجود ہیں۔ ان میں قدیم ترین مخطوطہ سلخ محرم ۸۸۸ھ کا مکتوبہ ہے جس کی عمر آج ۱۴۰۲ھ میں ۵۱۶ سال ہو چکی ہے۔

کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ کی داغ بیل ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ کے حقیقی دادا مولانا مفتی سید محمد قلی خاں صاحب (متوفیٰ ۱۲۶۰ھ) نے ۱۲۶۰ھ سے قبل اپنی زندگی ہی میں ڈالی تھی۔ مفتی محمد قلی خاں صاحب کے فرزند علامہ سید حامد حسین صاحب (متوفیٰ ۱۳۰۶ھ) نے بھی اس کتب خانے کے علمی ذخیرے میں قابل قدر اضافے فرمائے تھے۔ علامہ حامد حسین صاحب کے فرزند ناصر الملت مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ (متوفیٰ ۱۳۶۱ھ) جن کے نام نامی سے کتبخانہ ناصریہ لکھنؤ کو موسوم ہونے کا شرف حاصل ہے اپنے بزرگوں کے وہ "فخرِ اسلاف" خلف تھے جو اپنے بزرگوں کے جمع کیے ہوئے اس علمی ذخیرے کو ایک نادر الوجود کتب خانے کا پیکر دینے میں

کامیاب ہوئے ناصر الملت کے بعد اُن کے فرزند سعید الملت مولانا محمد سعید صاحب قبلہ (متوفی ۱۹۶۷ء) نے اس کتب خانے کی توسیع و ترقی میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ اب ۱۹۶۷ء سے کتب خانہ ناصریہ لکھنؤ کی تعمیر و توسیع کی ذمہ داری کا بار سعید الملت مرحوم کے فرزند روح الملت مولانا سید علی ناصر صاحب کے شانوں پر آ گیا ہے اور سعید الملت کے سگے بھانجے مولانا سید مظفر حسین صاحب طاہر جرولی اس کام میں روح الملت کو اپنا پورا تعاون دے رہے ہیں۔

ہم نے اپنے مقالے کو سردست کتب خانے کے رجسٹر میں مندرج مخطوطاتِ طب تک ہی محدود رکھا ہے اور مطبوعاتِ طب پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ مقالے کے آخر میں ہم نے کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ کے غیر اہم مخطوطاتِ طب کی صرف نشاندہی کر دی ہے اور فقط اہم مخطوطات پر قدرے تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ مقالے میں ہم نے ہر مخطوطے کے عنوان کے بعد قوسین ( ) میں وہ نمبر بھی لکھ دیا ہے جس کے ماتحت وہ قلمی نسخہ کتب خانے کے مخطوطات کے رجسٹر میں درج ملتا ہے۔

۱۔ بازنامہ (۱) [مخطوطے پر اوراق کے نمبر سیاہ روشنائی کے علاوہ پنسل سے بھی درج ہیں اور ہم نے مقالے میں پنسل سے مندرج نمبروں کے حوالے دیئے ہیں]۔

رجسٹر میں اس فارسی مخطوطے کا اندراج بہ عنوانِ "بازنامہ" ملتا ہے مگر پشت ورق ۱۵ کی عبارت سے انکشاف ہوتا ہے کہ کتاب کا نام "شکاریۂ ایلخانی" ہے۔ مخطوطے میں شکاری پرندوں اور درندوں کے خواص، اُن کے اعضا و جوارح اور اُن کے متعدد امراض و ادویات کا بیان ہے۔ ورق ۱۱ پر مصنف نے اپنے مآخذ کے حوالے دیے ہیں اور آگے اپنے مصادر کا اجمالی تعارف بھی کرایا ہے۔ نسخہ خاصا قدیم ہے اور عجب نہیں کہ یہ غیر مطبوعہ بھی ہو۔

یہ قدرے کرم خوردہ اور مجلد مخطوطہ فارسی زبان میں ہے۔ اس کی ضخامت بیاسی (۸۲) اوراق ہے۔ جلد کی ناپ "۱۰×"۶ (اِنچ) اور عرض کی ناپ "۷×"۴ ہے۔ مسطر کہیں ۱۱ سطری ہے اور کہیں ۱۲ سطری۔ نسخہ خوش خط نستعلیق میں سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ کہیں کہیں شنگرفی روشنائی سے عنوانات اور غلط کی عبارتیں مرقوم ہیں۔ سرورق پر مہریں بھی ثبت ہیں اور دستخط بھی ہیں۔ سرورق پر ۱۱۹۵ھ، ۱۱۹۸ھ اور ۱۲۳۱ھ کے سنین مرقوم ملتے ہیں۔ ان شواہد سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۱۹۲ھ سے قبل تحریر ہوا ہوگا۔

رجسٹر کتب خانہ اور مخطوطے کے سرِ ورق پر مصنف کا نام موجود نہیں لیکن ورق ۹ کی پشت
نیز ورق ۱۰ کے مندرجات سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کے مصنف کا نام علی بن منصور الحلوائی
ہے۔ اور مصنف کے عہدِ شباب میں طغا [بطغان] تیمور خاں حکمراں تھا۔ قاموس المشاہیر (جلد دوم۔
بدایوں طبع ۱۹۲۶ء ص ۴۵) سے پتا چلتا ہے کہ طغان تیمور خاں ایرانی بادشاہوں کے اخلاف میں
جرجان کا حاکم تھا اور ۱۶ ذی قعدہ ۷۵۴ھ [مطابق دسمبر ۱۳۵۳ء] کو وہ قتل ہوا تھا۔ دیباچے
میں حمد، نعت اور منقبت میں مصنف کے بیانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا مصنف
علی بن منصور الحلوائی شیعہ اثنا عشری عقیدے کا پیرو تھا۔

۱۲ رسالہ راحۃ الارواح و شفاء الاشباح (۱۲) : یہ مجلّد مگر ناقص الاوّل فارسی مخطوطہ اوسط
درجے کے خط میں سیاہ روشنائی سے تحریر ہوا ہے۔ جلد کی ناپ "½۸ x "۵ ہے اور حرفی کی ناپ
"۶ x "۳ ہے۔ تعداد اوراق ۲۰ ہے۔ ترقیمہ نہ ہونے کے باعث مصنف، کاتب یا سنہ کتابت
نامعلوم ہے۔ نسخے کے غیر مطبوعہ ہونے کا امکان ہے۔

مخطوطے کے جو اوراق دستیاب ہیں اُن میں سے پہلے ورق پر مندرج عربی عبارت سے
اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں لکھا گیا تھا۔ اب اس مخطوطے کو کس محمد شاہ
کے عہد کا مانا جائے یہ سوال اپنی جگہ برقرار رہتا ہے۔

ابتدائی اوراق میں مصنف کے بیانات سے پتا چلتا ہے کہ یہ علم طب کے سلسلے میں ایک
مختصر رسالہ ہے جس میں مختلف امراض اور ان کی دواؤں کا بیان ہے۔ کتاب بہ تفصیل ذیل دس مقالوں
پر مشتمل ہے۔

پہلا مقالہ امور طبیعی، غیر طبیعی اور امور خارج از طبیعت کے بیان میں ہے۔ دوسرے
مقالے میں تشریح اعضا ہے۔ تیسرے مقالے کا موضوع صحت ہے۔ چوتھے مقالے میں اقسامِ
مرض پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچواں مقالہ نفس کے بیان میں ہے۔ چھٹے مقالے میں امراضِ سر پر روشنی
ڈالی گئی ہے۔ ساتویں مقالے میں سینے سے زیرِ ناف تک کے امراض کا بیان ہے۔ آٹھواں مقالہ
بقیہ اعضا کے بیان میں ہے۔ نویں مقالے میں مفردات ادویہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ دسواں مقالہ
مرکبات کے بیان پر مشتمل ہے۔

۲۔ رسالۂ طب (۱۳): یہ مجلد فارسی نسخہ چھبیس (۲۶) اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کی جلد کی ناپ "۸×۴½" ہے اور حوض کی ناپ "۶½×۳" ہے۔ اوسط درجے کے خط میں یہ سیاہ روشنائی سے لکھا ہوا ہے۔ فصلوں کے عنوان اور سرخیاں شنگرفی روشنائی میں ہیں۔ پشتِ ورقِ آخر سے اس کے مصنف و کاتب کا نام شمس الدین بن حسن بن شمس اللہ عاشق معلوم ہوتا ہے۔ مزید یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ اس مخطوطے کی کتابت سلخ محرم ۸۸۸ھ کو مکمل ہوئی تھی۔

مخطوطے پر مولانا حامد حسین (المتوفی ۱۳۰۶ھ) کی مہر ثبت ہے۔ بعض اندراجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قدیم قلمی نسخہ تصدیق حسن علی صاحب سے کتب خانۂ ناصریہ کو منتقل ہوا تھا۔ اس مخطوطے کا غیر مطبوعہ ہونا خارج از امکان نہیں۔ اس میں بعض مفردات و مرکبات کے خواص و فوائد کا حال کتب معتبرہ سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن میں غلّے، گوشت، مچھلی، دودھ انڈے اور پھلوں کے خواص و فوائد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۳۔ سفینۂ خواص الدّوابّ والطیور و دیگر مطالب (۱۴): اٹھارہ اوراق پر مشتمل یہ قدیم کرم خوردہ مجلّد مخطوطہ عربی زبان میں ہے۔ یہ خطِ نسخ میں سیاہ روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ عنوانات شنگرفی روشنائی میں ہیں۔ اس کی جلد کی "۹×۶¼" ہے۔ اس میں ترقیمہ موجود نہیں۔ سنہ کتابت نامعلوم ہے۔ ورق اٹھارہ تک نثر مشتمل ہے ورق ۱۹ سے عربی اشعار شروع ہوتے ہیں جن کی پیشانی پر شنگرفی روشنائی سے "للحامدی عفی عنہ" درج ہے۔

مخطوطے کی شکل بیاض جیسی ہے۔ اس میں چوپایوں اور پرندوں کے خواص کا ذکر ہے اور ان کے اعضائے جسم سے تیار ہونے والی دواؤں کا بیان ہے۔ احتمال ہے کہ نسخہ شاید غیر مطبوعہ ہے۔

جلد میں بعض دوسرے موضوعات پر بھی کچھ اجزا موجود ہیں جن میں پتھروں کے خواص اور ان سے بننے والی بعض دواؤں کا بھی ذکر شامل ہے۔

۵۔ رسالۂ حدود الامراض (۱۰): عربی زبان کا یہ کرم خوردہ مجلّد رسالہ نستعلیق خط میں سیاہ روشنائی سے تحریر ہوا ہے مگر ذیلی عنوانات شنگرفی روشنائی سے مرقوم ہیں۔ جلد کی ناپ "۸×۵" نیز حوض کی ناپ "۵½×۳" ہے۔ مسطر ۱۲ سطری ہے۔ اوراق کی تعداد ۴ ہے۔

اس قلمی کتاب کے کسی مطبوعہ نسخے کا پتا نہ چل سکا۔ حقائق اسرار الطب کے نام سے یہ رسالہ خدابخش
اصفیہ، رضا، صیانۃ اللہ اور مڈیکل میں بھی موجود ہے۔

مخطوطے کے ورق ۴، پر ترقیمہ ہے جس سے اس نسخے کا مندرجہ ذیل مکمل نام معلوم ہوتا ہے:

"حدود الامراض سنجری مسمیٰ بحقائق اسرار الطب"

ترقیمے سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ یہ قلمی نسخہ ھار رمضان المبارک ۱۲۳۱ھ کو بمقام میرٹھ بخط کرم علی بن مہر علی تمام ہوا تھا۔ خاتمے پر سیاہ روشنائی کی مہر میں ہدایت علی کا نام ہے اور ۱۲۳۱ھ کا اندراج بھی واضح ہے۔ سرورق کے اندراج سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ یہ مخطوطہ شعبان ۱۲۵۸ھ میں ذوالفقار علی مہدی پسر ہدایت علی کی معرفت خرید اگیا تھا۔

پشتِ سرورق کی عبارت بتاتی ہے کہ یہ رسالہ مسعود بن محمد السنجری کی تصنیف ہے۔ مصنف کا بیان ہے کہ وہ حکیم ہے اور وہ مولانا قاسم بن عراق بن جعفر کے ساتھ زندگی کا ایک بڑا حصہ گزار چکا ہے۔ اس نے مولانا قاسم سے کافی استفادہ بھی کیا ہے اسی لئے مصنف نے اس کتاب کو مولانا قاسم کے نام معنون کیا ہے۔ قاموس المشاہیر (جلد اوّل طبع ۱۹۲۴ء ص ۳۶) میں نجم الدین ابو القاسم جعفر بن موید ساکن حلہ (عراق) متوفی ۶۷۶ھ کا بھی ذکر ملتا ہے جو ابوالقاسم الحلی کے نام سے مشہور رہے تھے۔ ضعیف سا احتمال ہوتا ہے کہ مصنف نے جن مولانا قاسم کے نام یہ قلمی کتاب معنون کی ہے کہیں وہ مشہور شیعہ عالم ابوالقاسم الحلی ہی نہ ہوں۔ اس قیاس کی تصدیق مزید تحقیق ہی سے ہو سکے گی۔

طب سے متعلق یہ رسالہ تین فنون پر مشتمل ہے اور اس میں امراض، ادویہ اور طبی اصطلاحوں کا بیان ہے۔

۷۔ کتابِ طب از قطب الدین (۲۱): فارسی زبان میں یہ مجلد مخطوطہ خاصا ضخیم اور قدیم ہے۔ اوراق کے نمبر مخطوطے پر درج نہیں ہیں۔ رکابوں کا پرانا طریقہ موجود ہے۔ جلد کی ناپ ۷ × ۴½ / ۵ ہے۔ حوض کی ناپ ۶ × ۳ ہے نیز مسطر ۱۲ سطری ہے۔ یہ اوسط نستعلیق خط میں ہے۔ متن کی روشنائی سیاہ ہے مگر عنوانات وغیرہ شنگرفی روشنائی میں ہیں۔ ورقِ آخر کی پشت پر مخطوطے کی تاریخِ تکمیل ہفدہم رجب ۱۲۰۲ھ مرقوم ہے۔ فہرستِ کتب خانہ میں ۲۱۲ھ غلط درج ہوا ہے۔ کتاب علم طب کی تعریف، قواعدِ طب اور امراض و ادویہ وغیرہ کے بیان میں ہے۔ کتاب کے کسی مطبوعہ نسخے کا پتا نہ چل سکا۔

۷۔ مسئلہ استنشاق الہواء: رجسٹر کتب خانہ میں یہ مخطوطہ درج نہیں ہو سکا ہے۔ یہ قدیم کرم خوردہ اور مجلّد مخطوطہ عربی زبان میں ہے۔ یہ سیاہ روشنائی میں ہے اور اس کا خط نستعلیق مائل بہ شکست ہے۔ اس کی جلد "½ ۹ × "½ ۶ ہے، حوض "½، "½ ۴ نیز مسطر ۱۲ سطری ہے۔ اس کے اوراق کی تعداد ۲۵ ہے۔

پشتِ ورق ۹ کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سالِ تالیف ۱۲۴۸ھ ہے اور اس کے مؤلف کا نام شیخ علی ہے۔ بہ ظاہر مخطوطے کی جزبندی اور جلد سازی میں اوراق کی ترتیب درست نہیں رہی ہے۔ اوراق کے نمبر اصل کاتب نے نہیں لکھے ہیں کسی نے بعد کو پنسل سے لکھے ہیں۔ کاتب رکابوں کے پرانے طریقے پر کار بند ملتا ہے۔ اس جلد میں زیرِ بحث موضوع کے علاوہ چند اوراق ایک رسالے کی شکل میں الگ سے شامل ہیں۔ جن میں عنب الثعلب [INAB-US-SAALAB] کے سلسلے میں گفتگو ہے۔

اس مخطوطے میں ہوا اور اس کو ناک میں کھینچنے کے متعلق گفتگو ہے۔ نیز ہواؤں کے متعلق بھی کافی معلومات ہیں۔ اس میں ہواؤں کی آلودگی کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہوا کی آلودگی سے پیدا ہونے والے امراض و علاج کا بھی بیان ہے۔

۸۔ رسالہ چوب چینی وغیرہ از قاضی محمد یزدی بن کاشف الدین (۹): زبان = فارسی مجلد، قدرے کرم خوردہ۔ جلد = "۱۲ × "۸۔ حوض = "۹ × "۵۔ مسطر = ۱۹ سطری۔ خوشخط کتابت۔ سیاہ روشنائی۔ کہیں کہیں شنگرفی روشنائی سے اقتباسات وغیرہ شاہ عباس صفوی کے عہد کی تصنیف۔ شاہ عباس صفوی کا دورِ حیات یکم رمضان ۹۷۸ھ سے ۲۴ جمادی الاول ۱۰۳۸ھ تک کی درمیانی مدت کو محیط تھا [بہ حوالہ قاموس المشاہیر جلد دوم ص ۵۵]

۹۔ رسالہ در ادویۂ مفردہ (۱۱): زبان = فارسی۔ مجلد اور بہت زیادہ کرم خوردہ۔ جلد "۱۲ × "۸۔ حوض = "۹ × "½ ۴۔ مسطر = ۲۰ سطری۔ تعدادِ اوراق = ۱۰۔ ترقیمہ ندارد۔ مصنف، کاتب و سنہ کتابت نامعلوم

۱۰۔ علاج الامراض (۱۳۰): [جلد پر نمبر ۳۰ مندرج ہے مگر رجسٹر کتب خانہ میں اندراج نہیں]۔ زبان = فارسی۔ تالیف حکیم شریف خان دہلوی۔ مجلد و قدیم خط نستعلیق۔ متن کی روشنائی

سیاہ۔ عنوانات کی روشنائی شنگرفی۔ جلد = "۱۳ × "۹۔ جوف "۹ × ½۵۔ مسطر = ۲۱ سطری۔ اوراق پرنمبروں کا اندراج ہے۔ تعداد اوراق = ۳۰۲۔ پشتِ ورق ۳۰۲ پر ترقیمہ موجود ہے جس سے انکشاف ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ جمعہ ۱۴ رجب ۱۲۴۵ھ کو مکمل ہوا تھا۔ اِس کے مؤلف حکیم شریف خان دہلوی کا سنہ وفات ۱۲۳۱ھ ہے۔ [بہ حوالہ قاموس المشاہیر جلد دوم ص ۱۹] لہٰذا یہ نسخہ اپنے مؤلف کی وفات کے ۱۴ سال بعد کا مکتوبہ ہے۔ کتاب چوں کہ چھپی ہوئی مل جاتی ہے لہٰذا مخطوطہ زیادہ اہم نہیں۔

اس کتب خانے میں متعدد ایسے نادر و قدیم مخطوطات موجود ہیں جو دنیا کے کسی دوسرے کتب خانے میں مشکل ہی سے ملیں گے۔ ان نوادر میں ابو جعفر بن حبیب بغدادی (متوفی ۲۴۵ھ) کی کتاب "المنمق" کا وہ قلمی نسخہ بھی شامل ہے جس کی کتابت وفاتِ مصنف سے بارہ سال قبل ۲۳۳ھ میں ہوئی تھی اور آج ۱۴۰۴ھ میں اس مخطوطے کی عمر ۱۱۷۱ سال ہو چکی ہے۔ تیسری صدی ہجری کی طرح کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ میں چھٹی، ساتویں، آٹھویں، نویں، دسویں، گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کے مخطوطات کی تعداد بھی قابلِ لحاظ ہے۔

اس کتب خانے میں متعدد ایسی کتابیں بھی ملیں گی جن پر سلاطینِ سابق کی مہریں ثبت ہیں۔ ان حکمرانوں میں شاہ جہاں، اورنگ زیب، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

اس کتب خانے کے نوادر میں بعض قدیم مطلا و مذہب مخطوطات بھی شامل ہیں جو مینا کاری کی صنعت کا قابلِ دید نمونہ ہیں۔

اس علمی مخزن میں بہت سی ایسی قلمی کتابیں بھی ہیں جن کی تصحیح بعض مشہور عالموں نے کی ہے۔

یہاں متعدد ایسی کتابیں بھی موجود ہیں جن پر بعض مشہور عالموں کے قلم کے اندراجات یا حاشیے وغیرہ ملتے ہیں۔

اس کتب خانے میں ایسے قلمی کتابیں بھی ملتی ہیں جو نسخۂ مصنف سے نقل ہوئی ہیں۔

کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ کے مختصات میں وہ مخطوطات بھی شامل ہیں جو خود مصنف کے تصحیح کردہ نسخے سے منقول ہیں۔

یہاں ایسے مخطوطات بھی ہیں جن پر مصنف کے قلم کی تحریریں پائی جاتی ہیں۔

کتب خانۂ ناصریہ لکھنؤ کے علمی سرمائے میں بعض ایسے قدیم و نادر مخطوطات بھی شامل ہیں جو بہ خطِ مصنف لکھے گئے ہیں۔

پروفیسر حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی
چیرمین شعبہ کلیات
اجمل خان طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

جلالی کلیکشن کے چند نادر طبی مخطوطات

جلالی ضلع علی گڑھ میں میرے جد امجد حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی (۱۲۲۷ھ) کا جمع کردہ قدیم طبی کتب کا ایک گرانقدر ذخیرہ موجود ہے، جس میں چند اہم مخطوطات ایسے ہیں جو ہنوز طبع نہیں ہوئے۔ ان مخطوطات کا تعارف پیش خدمت ہے۔

۱۔ معدن تجربات :- یہ بزبان فارسی علم طب کی ایک جامع و مستند قرابادین ہے اور ضروریات مطب کے لحاظ سے ایک گرانقدر طبی کشکول ہے۔ یہ قدیم مستند طبی تصانیف کا ایک نادر خلاصہ اور بے نظیر لب لباب ہے۔ اس کتاب کا تعارف مصنف نے مقدمہ کتاب میں حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"اما بعد فقیر حقیر محمد مہدی بن محمد جعفر طبیب بن محمد حسن طبیب عرض میدارد کہ اکثر نسخہائے مرکبات وغیرہ از کتب معتبرہ و مجربات حکمائے قدیم و جدید متفرق بودند خواست کہ اینہا را جمع کردہ در سلک تحریر درآرد تا خلائق از و منتفع شوند و محتاج بقرابادینات، و مرکبات بفضل ایزد کارساز صورت انتظام یافت۔ الخ

معدن تجربات کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ کتاب مندرجہ ذیل مصنفین اور مصنفات سے ماخوذ ہے۔

اسمعیل جرجانی، بحر الجواہر، نفیسی، شیخ الرئیس، صاحب ذخیرہ صاحب مفتاح الطب، صاحب ریاض، صاحب تحفہ، میمونی، جامع ابن بیطار تقویم الصحۃ، صاحب الفاظ، حاوی، زبدہ، جامع بحر المنافع۔ صاحب مختار، عماد الدین محمود، کناش محمد زکریا، حکیم کمال الدین حسین شیرازی، قادری، حکیم محمد باقر، محمد بیگ یزدی کامل الطبیب، کامل الصناعت، قرابادین معصومی، قلانسی، غنی منی،

جالینوس، تحفۃ المومنین، شفاء الاسقام، معالجات بقراطیہ وغیرہ۔

مذکورہ مصادر و مراجع کی رو سے کتاب معدن تجربات کی طبی افادیت واضح ہوجاتی ہے نیز مصنف کتاب حکیم میر محمد مہدی کی مہارت فنی اور وسعت نظری بھی آشکار ہوجاتی ہے۔

کتاب معدن تجربات دو مقالوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

مقالہ اوّل چار رسالوں پر مشتمل ہے

رسالہ اوّل:۔ مقدمات و تراکیب ادویہ و طریق احراق و تکلیس و مدبر کردن و مخوی نمودن و کشتن فلزات وغیرہ۔ **رسالہ دوم:۔** در تحقیقات اسامی مرکبات بترتیب حرف تہجی۔ **رسالہ سیوم:۔** در تحقیقات اسامی الفاظ کہ مصطلح اطباء است۔ **رسالہ چہارم:۔** در تدبیرات مزورہ و ادویہ ثمانیہ کثیر المنفعت۔

مقالہ دوم:۔ در مرکبات بترتیب حروف تہجی موسوم بہ مرکبات معدن۔

خاتمہ:۔ یہ تین فصول پر مشتمل ہے۔

فصل اوّل:۔ در اوزان و مقادیر۔ **فصل دوم:۔** در بیان غذا ہائے کہ مصطلح اطباء است۔ **فصل سوم:۔** در ابدال و منافع و خواص ادویہ مفردہ بترتیب حروف تہجی۔

مذکورہ فہرست کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ علم الادویہ پر یہ ایک منتخب و مستند کتاب ہے اور جملہ قرابادینی موضوعات پر حاوی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کتاب علم الادویہ پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

سنہ تصنیف:۔ اس کتاب کا اس کے نام معدن تجربات سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ اس کتاب کا تاریخی نام ہے جیسا کہ مصنف نے مقدمہ میں واضح فرمایا ہے ـــــ "برین کتاب کہ موسوم بہ معدن تجربات و استخراج اعداد سال ہم از آن میگردد" الخ، اس بنا پر اس کتاب کا سن تصنیف ۱۱۷۰ھ/۱۷۵۶ء ہے۔

کاتب و تاریخ کتابت:۔ اس نسخہ کے کاتب حکیم سید نقی علی ابن سید ہادی علی ساکن قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ ہیں جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہوتا ہے جو آخر کتاب میں ہے ـــــ

"تمت تمام شد نسخہ معدن تجربات بید العبد المذنب سید نقی علی ابن سید ہادی علی جلالوی غفرلہٗ بنا بر پاس خاطر قبلہ و کعبہ سید نقی علی صاحب بتاریخ ۸ ربیع الاوّل ۱۲۶۱ھ فقط"۔

یہ نسخہ آگرہ میں نقل کیا گیا ہے جیسا کہ کاتب صاحب کے اس جملہ سے واضح ہوتا ہے ———

"کتاب معدن تجربات مرتبہ حکیم سید نقی علی ابن سید ہادی علی بپاس خاطر سید تقی علی برادر حقیقی ۸ اربیع الاول سنہ ۱۲۶۶ھ بمقام اکبر آباد (آگرہ) جمع کردہ صورت اتمام یافت۔"

کیفیت:۔ اس کتاب کے مضامین اور ضمنی سرخیاں سرخ روشنائی سے لکھی گئی ہیں۔ قلم جلی اور کتابت معمولی ہے۔ کتاب کرم خوردہ ہے کہیں کہیں الفاظ اور جملے کرم خوردہ ہو کر غائب ہیں صفحہ ۱۷۵ تا ۱۹۲۔ بادامی کاغذ کا جوڑ لگا دیا گیا ہے جس کی بنا پر ان صفحات کی عبارت ناقص ہے جسے دیگر نسخوں کی مدد سے مکمل کیا جا سکتا ہے جو ہندوستان کے دیگر کتب خانوں میں موجود ہیں۔

ضخامت:۔ یہ کتاب ۶۹۳ صفحات پر مشتمل ہے اس کی لمبائی ۱۱½ انچ اور چوڑائی ۷½ انچ ہے۔

معدن تجربات کے دیگر نسخے:۔

۱۔ معدن تجربات کا ایک مکمل نسخہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ دو جلدوں میں مجلد ہے۔ جلد اول ۱ تا ۲۲۴ اوراق پر اور جلد دوم ۲۲۵ تا ۴۵۲ یعنی ۲۲۸ اوراق پر یعنی کل ۴۵۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ بھی جگہ بہ جگہ کرم خوردہ ہے۔ میں نے اس نسخہ کو بنظر خود دیکھا ہے۔ اس کے کاتب رستم علی بلگرامی ہیں سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ لیکن یہ نسخہ بارہویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ معدن تجربات کا وہ حصہ جو قرابادین سے متعلق ہے اور قرابادین معدن کے نام سے موسوم ہے کتب خانہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہے یہ ۲۵۵ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ معدن تجربات کا وہ حصہ جو ادویہ مفردہ سے متعلق ہے۔ اس کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری مسلم لائبریری یونیورسٹی علی گڑھ اور دوسرا نسخہ حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کے پاس موجود ہے۔

حکیم محمد مہدی اکبر آبادی کا نے معدن تجربات کے علاوہ علم ادویہ سے متعلق دو کتابیں اور تالیف فرمائی ہیں جو بصورت مخطوطہ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں موجود ہیں۔

۱۔ **مفردات ہندیہ** (بزبان فارسی): اس کتاب میں آپ نے دواؤں کے افعال خواص بلحاظ حروف تہجی ترتیب دیئے ہیں اس میں بعض ایسی ہندی جڑی بوٹیوں کے افعال و خواص بھی موجود ہیں

جو مفردات سے متعلق دیگر کتب میں نہیں ملا مثلاً آتالو، امل بید، ارقی ، امرت پھل، چھچھڑا، رواسن، راشا، بیدا بھاگن، ہیجر، سہدیوی وغیرہ۔ یہ مخطوطہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔ شرح ادویہ ہندیہ (اسامی الادویہ) : یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں تصنیف کیا ہے اور ادویہ متعارفہ پر حاوی ہے۔ اسمیں آپ نے ادویہ کے ہندی ناموں کی وضاحت فرمائی ہے اور ان کے فارسی مترادف نام بھی درج فرمائے ہیں اور ہر ادویہ کے خواص بھی اس میں درج ہیں۔ اسامی الادویہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ ایک نادر رسالہ ہے۔

معدن تجربات، مفردات ہندیہ اور شرح ادویۂ ہندیہ کے مطالعہ کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ حکیم محمد مہدی نے علم الادویہ پر تحقیق عمیق کی ہے اور جملہ متقدمین کی مستند کتب کا احاطہ فرمایا ہے۔ اور علم الادویہ سے متعلق ایک نادر ذخیرہ بزبان فارسی ان کتب میں پیش کر دیا ہے۔ ان کتب کے تراجم بزبان اردو بھی ضروری ہیں تاکہ اردو داں طلبا و اطبا بھی اس نادر ذخیرۂ علم الادویہ سے فیضیاب ہو سکیں۔

حکیم محمد مہدی نے علم طب پر مجموعی حیثیت سے ایک نہایت جامع اور ضخیم کتاب بنام "مخزن اسرار اطبا" بزبان فارسی تالیف فرمائی ہے جو علم طب کے مختلف شعبوں کلیات و معالجات وغیرہ پر مشتمل ہے اس کتاب میں بھی آپ نے جملہ متقدمین کی کتب سے استفادہ فرمایا ہے۔ کتاب کے نام سے سال ۱۱۷۲ھ اخذ کیا گیا ہے۔ اس کے نسخے آصفیہ اور خدابخش لائبریری میں موجود ہیں۔ آصفیہ کا نسخہ مکمل لیکن خدابخش کا نسخہ نامکمل ہے۔ خدابخش کے نسخے کا ہینڈ لسٹ نمبر ۱۰۰۵ اور کیٹلاگ نمبر ۱۰۰۷ ہے۔ اسپر حکیم مظفر حسین ابن مسیح الدولہ لکھنوی کی تحریر اور مہر "برا علاے دیں شد مظفر حسین" ۱۲۷۷ ثبت ہے۔ اوراق کی تعداد ۲۲۱ اور ہر صفحہ میں ۲۵ سطریں ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ بھی بزبان اردو ضروری ہے۔

۲۔ احوال الجواہر

جواہر و فلزات پر یہ رسالہ محمد بن منصور نے بزبان فارسی تصنیف کیا ہے۔ یہ رسالہ سلطان ابو النصر حسن کی فرمائش پر لکھا گیا۔

منصور بن محمد کی ایک تصنیف کتاب التشریح کا ذکر ایڈورڈ جی براؤن نے اورینٹل میڈیسن میں کیا ہے (جس کا اردو ترجمہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی نے طب عرب کے نام سے کیا اور یہ ترجمہ لاہور سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے)۔ اس کے صفحہ ۱۲۱ پر منصور بن محمد کی کتاب التشریح کا ذکر موجود ہے جو ۱۳۹۲ء میں لکھی گئی۔

رسالہ احوال الجواہر ایک مقدمہ اور دو مقالات پر مشتمل ہے۔

مقدمہ :۔ در مواد اجسام معدنی و کیفیت تکون ایشان و امور متعلقہ بآن۔

باب اوّل :۔ در دُر۔ باب دوم :۔ در یاقوت۔ باب سوم :۔ در زمرد۔ باب چہارم :۔
زبرجد۔ باب پنجم :۔ در الماس۔ باب ششم :۔ در عین الہر۔ باب ہفتم :۔ در لعل۔ باب ہشتم :۔ در فیروزہ
باب نہم :۔ در بازہرد (زہر مہرہ) و سائر احجار کہ متکون در حیوانات۔ باب دہم :۔ در عقیق۔ باب یازدہم :۔
اشباہ یاقوت باب دوازدہم :۔ در جزع باب سیزدہم :۔ در مقناطیس باب چہاردہم :۔ در سنبادہ (سنباذج)
باب پانزدہم :۔ در بیجادہ باب شانزدہم :۔ در لاجورد باب ہفدہم :۔ در مرجان باب ہشدہم :۔ در یشم
(یشب) باب نوزدہم :۔ در بلور باب بستم :۔ در جمست۔

خاتمہ :۔ در احوال جواہر متفرقہ و نسبت جواہر بایکدیگر۔

مقالہ دوم :۔ در فلزات و در وے ہفت باب است و خاتمہ

باب اوّل :۔ در طلا۔ باب دوم :۔ در نقرہ۔ باب سوم :۔ در مس۔ باب چہارم :۔ در
...۔ باب پنجم :۔ در اسرب۔ باب ششم :۔ در آسن۔ باب ہفتم :۔ در خارصینی۔

خاتمہ :۔ در مرکب از فلزات و نسبت اشیا بایکدیگر۔

ضخامت :۔ اوراق ۷۶۔ آخر چند اوراق غائب ہیں۔ لمبائی ۱۶ انچ، چوڑائی ۴½ انچ قلم
... اور عناوین سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ حاشیہ سنہری مخطوط دیدہ زیب ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ رسالہ احوال الجواہر محمد بن منصور نے ماثر دولت عباسیہ سلطان ابو النصر
... کی فرمائش پر لکھا۔ سلطان ابو نصر حسن بیگ معروف بہ اوزون حسن وہ سلطان تھا کہ جس نے
آق قونیلو خاندان کی بنا ڈالی جس کی حکومت ۸۷۲ھ/۱۴۶۸ء تا ۸۸۲ھ/۱۴۷۵ء جاری رہی (ملاحظہ ہو لغت نامہ
دہخدا فارسی)۔

احوال الجواہر کا ایک مکمل مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ یہ
... شفاء الملک حکیم مظاہر احمد صاحب کے کتب خانہ سے حاصل کیا گیا ہے۔ جن کی حسب ذیل تحریر
... نسخہ کے سرورق پر ہے۔

"تالیف سید الحکما امیر صدر الدین محمد الشیرازی الشہید ۹۰۳ھ بن میر غیاث الدین منصور الشیرازی"

والاستاذالشہیر خاتم الحکمار غوث العلماء الامیر غیاث الدین منصور الشیرازی المتوفی ۹۴۸ھ پر تحریر محل النظر ہے۔ اس نسخہ کے آخر میں صفحہ ۱۸ پر تحریر ہے:

اختتام۔ کتبہ علی سبیل الاستعجال ھذا الکتاب الموسوم بجواھر یوم الخمیس سنہ خمس وتسعمائتہ ھجریہ من مصطفویہ علیہ السلام۔

اس تحریر سے واضح ہے کہ یہ نسخہ بروز جمعرات ۹۰۵ھ میں اختتام پذیر ہوا۔

احوال الجواہر، جواہر نفیسہ و فلزات کے متعلق ایک نہایت مختصر جامع اور مفید رسالہ ہے اس میں جواہر و فلزات کے احوال و خواص اور استعمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے مزید برآں ان کے معدن کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ علم طب و طب کیمیاوی کی رو سے یہ رسالہ نہایت گرانقدر ہے اور علم طبقات الارض و معادن جواہر و فلزات کے متعلق مصنف کے علم کو واضح کرتا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس کا ترجمہ زبان اردو میں شائع کیا جائے تاکہ طلبا و اطبا کو اس سے فائدہ پہنچے۔

۳۔ فوائد المجربات

یہ رسالہ حکیم قاضی رحم علی صاحب ساکن بلرام تحصیل کاسگنج ضلع ایٹہ کا تالیف کردہ ہے۔ یہ رسالہ آپ نے نصرت خاں و محمود خاں بنگش کی فرمائش پر بزبان فارسی تصنیف فرمایا اور متعدد کتب معالجات سے استفادہ فرمایا۔ آپ نے متعدد مشاہیر حکماء کے مجربات حاصل فرمائے اور ذاتی تجربات کے بعد جملہ مجربات کو اور اکثر امراض کے نسخے از سرتاپا ترتیب دیے۔

اس کتاب کے دیباچہ میں حکیم قاضی رحم علی صاحب ارقام فرماتے ہیں ——— اما بعد عرض میدارد کہ بندہ ہیچمدان حکیم قاضی رحم علی ولد قاضی عتیق اللہ بن قاضی نصر اللہ از اولاد حضرت خواجہ جنید بغدادی متوطن قصبہ بلرام سرکار کول (علی گڑھ) مستقر الملک اکبرآباد (آگرہ) از حکمائے دہر و علمائے صاحب علم و عاقلان صاحب عقل کہ فقیر از چند سال بخدمت حکمائے شاہجہان آباد فیض اندوز میداشت از سبب توجہ آن صاحبان چیزے دریں فن حصول نمودہ در وطن خود بعد سی سال آمدہ اشتغال مواظبت مینمودم و اکثر موافق استعداد خود در علاج مریضان میکوشیدم ہمدران وقت از اوقات بخدمت خانصاحب بلند اقبال فخر الاقبال صاحب شجاع والا قدر معدن سخاوت ظفر غمخوار

دردمنداں از دل وجان خانمہربان نصرت خان ولد خان صاحب وقبلہ حاتم زمانہ فتح محمود خان بخش
سلمہ اللہ اتفاقیہ ملازمت نمودم ارشاد فرمود کہ چندے نسخہائے از مجربات حکمار متقدمین ومتاخرین
در دفع ہر مرض چیزے مختصر ترجمع باید نمود کہ وقت حاجت بکار آید بموجب فرمائش آنعالی منزلت
یا رسالہ راحقیر از کتب ہائے حکمائے مذکور را بجز نسخہائے مجرب دیدہ ودر تجربہ بندہ آمدہ بود۔
تا زین رسالہ بر دو باب وچند فصل مرتب ساختہ ونام این رسالہ فوائد المجربات نہادہ۔

فہرست فوائد المجربات۔

باب اوّل :۔ در نبض وقارورہ ۔ باب دوم :۔ در بیان امراض، یہ پچاس فصول پر مشتمل ہے۔

مذکورہ کتاب کے خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

تمام شد کتاب فوائد المجربات من تصنیف حکیم قاضی رحم علی بتاریخ دہم ماہ رجب المرجب
سنہ ١٢٥١ ہجری بروز شنبہ بمقام قصبہ اٹیر در پلٹن مہاراج کرنل جاکوب صاحب بہادر۔

مذکورہ کتاب ٥٢ اوراق پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب مطب کے طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں امراض بدن انسانی سے متعلق مفید ومجرب
نسخہ جات مشاہیر اطبار اور ان کے مصنفات سے حاصل کئے گئے ہیں۔ اور اس بنا پر ضروریات مطب
کے لئے یہ ایک نہایت مفید اور گرانقدر انتخاب ہے۔ یہ کتاب زبان فارسی میں ہے اگر اس کا ترجمہ زبان
اردو زبان میں شائع کیا جائے تو اردو داں طلبار اور اطبار دونوں کے واسطے مفید ہوگی۔

آخر میں صفحہ ٥٣ تا ٩٩ اوراق پر مشاہیر اطبار کے مجربات مختلف امراض کے متعلق درج
ہیں جن اطبار کے مجربات کا انتخاب حکیم قاضی رحم علی صاحب نے فرمایا ہے۔ ان کے اسمار گرامی حسب
ذیل ہیں۔

حکیم علوی خان، حکیم ذکار اللہ خان، حکیم میرن صاحب فیروز آباد، مولوی صادق علی، حکیم
محمد افضل، حکیم وارث علی خان دھولپوری، حکیم منظہر علی، حکیم امام بخش اکبر آبادی۔

اس بیاض کا آخر ناقص ہے۔ اس کتاب کے آخر ورق پر حسب ذیل عبارت درج ہے:۔
جائزہ واقع تاریخ بست وچہارم ماہ رمضان المبارک سنہ ١٢٧٧ ہجری مطابق چہارم ماہ اپریل
سنہ ١٨٦ء اس عبارت کے ذیل میں نوازش حسین کی مہر ١٢٧٧ھ کی ثبت ہے، جس کے ذیل میں دستخط ہیں

نوازش حسین عفی عنہ ۔ خط شکستہ ہے ۔ عناوین سرخ روشنائی سے اور باقی عبارت سیاہ روشنائی سے لکھی ہے ۔ تقطیع حسب ذیل ہے ۔

لمبائی ۸ ½ انچ ، چوڑائی ۶ انچ

چونکہ نسخہ کرم خوردہ ہے لہذا الفاظ کہیں کہیں غائب ہیں اور پڑھنے میں نہیں آتے ۔

۴۔ شافی الاوجاع

یہ مخطوطہ ناقص الطرفین ہے اس بنا پر مصنف کے نام کا علم نہ ہو سکا ۔ یہ معالجات پر ایک نادر نسخہ رسالہ ہے جس میں جملہ امراض انسانی کے اسباب و علامات اور علاج نہایت اختصار کے ساتھ مختلف خانوں میں پیش کئے گئے ہیں ۔ معالجات کے بیان میں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غربا اور امرا کے لئے علاجات جداگانہ درج کئے گئے ہیں ۔ حاشیہ سنہری و رنگین کا قد سبز اور عناوین سرخ ہیں ۔ تعداد اوراق ۴۵ پیمائش ۱۰ × ۸ انچ

۵۔ بیاض حکیم سیّد شاہ خیرات علی ہمدانی

یہ ایک ضخیم قلمی بیاض ہے جو حکیم سیّد شاہ خیرات علی ہمدانی ہی کی تحریر کردہ ہے ۔ اس میں حکمائے متقدمین کے معمولات و مجربات کا انتخاب ہے ۔ ہر صفحہ پر بعض نسخے سیاہ بعض ترچھے تحریر کئے گئے ہیں ۔ جملہ نسخہ بزبان فارسی تحریر کئے گئے ہیں ۔ اس بیاض پر سید شاہ خیرات علی ہمدانی الجلالوی کے دستخط سرورق پر ہیں ۔ یہ بیاض آپ کے خاندانی اطباء حکیم سید بہاء الدین حسینی ، حکیم سید جعفر حسینی ، حکیم سید زائر حسینی حکیم سید شجاع الدین حسینی (اوّل) حکیم سید فخر الدین حسینی ، حکیم سید کمال الدین حسینی (اوّل) ، حکیم سید ضیاء الدین حسینی ، حکیم سید محمد ریاض الدین حسینی کے معمولات میں شامل رہی ہے اور اب آپ کے فرزندان حکیم سید محمد کمال الدین حسینی اور حکیم سید محمد شجاع الدین حسینی اس بیاض سے استفادہ کرتے ہیں ۔

۶۔ اصول علاج

یہ رسالہ حکیم سید بہاء الدین حسینی ابن حکیم سید شاہ خیرات علی ہمدانی رح کا تصنیف کردہ بزبان فارسی ہے ۔ آپ علم جفر میں بھی مہارت کامل رکھتے تھے ۔ حکیم واجد علی موہانی نے کتاب مطلع العلوم و مجمع الفنون بزبان فارسی میں آپ کی مدح فرمائی ہے ۔

جناب میر کرامت علی
حیدرآباد

آصفیہ کے مخطوطات

آندھرا پردیش گورنمنٹ اورینٹل مینسکرپٹس لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹیٹیوٹ سابق میں اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش کا ایک صیغہ تھا۔ ۱۹۷۵ء میں اس صیغہ کو ایک علیحدہ نظامت میں تبدیل کر دیا گیا اور اسٹیٹ سنٹرل لائبریری (کتب خانہ آصفیہ) کے زائد از سترہ ہزار قیمتی و نادر مخطوطات O.M.L کی تحویل میں دے دیے گئے۔

حکومت آندھرا پردیش طب یونانی پر ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ستر ہزار روپے سالانہ خرچ کرتی ہے۔

یہ سترہ ہزار مخطوطات ۷۴ فنون میں منقسم ہیں۔ ان میں طب یونانی پر زائد از ۵۰۰ مخطوطات اردو عربی و فارسی زبانوں میں ریسرچ اسکالرس کے استفادہ کے لیے دستیاب ہیں۔

طب یونانی کے مخطوطات کی زبان وار تعداد حسب ذیل ہے۔

عربی ۳۰۹، فارسی ۱۶۸، اردو ۱۱، اس طرح ۴۸۸ مخطوطات ہیں، اور فن تجدید کے تحت تقریباً ۱ مخطوطات السنۂ مذکورہ میں دستیاب ہیں۔ ان قیمتی و نادر مخطوطات میں سے چند مخطوطات کا اس مقالہ میں مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

۱۔ جامع الکحالین فصول بقراط مصنفہ حنین بن اسحاق متوفی ۲۶۴ھ

ہماری اس لائبریری کا یہ سب سے قدیم نسخہ جو عربی زبان میں ہے۔ اس مخطوطہ کا نمبر ۶۸ طب یونانی ہے۔ یہ ماہ شعبان ۵۲۷ھ میں کتابت کیا گیا۔ اس میں دو رسالے ہیں۔ یعنی جامع الکحالین

اور نشوول لبقراط ۔ اس میں چند اوراق آب رسیدہ ہیں ۔ یہ عربی میں واضح خط میں مکتوب ہے ۔ یہ بڑا قابل قدر و تحقیق طلب نسخہ ہے جس سے استفادہ حاصل کرنے کی ضرورت ہے ۸۷۷ سالہ یہ نسخہ ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔

۲۔ خواص الادویۃ المفردہ (طب یونانی نمبر ۔ ۶۶)

یہ نسخہ عربی زبان میں ہے ۔ مخطوطہ کا پہلا صفحہ موجود نہیں ہے ۔ غالباً یہ ابوالصلت امیہ بن عبدالعزیز الاموی المتوفی ۵۲۹ھ کی تصنیف ہے ۔ یہ مخطوطہ انیون کی خواص سے شروع ہو کر ی پر ختم ہوتا ہے یعنی یہ نسخہ بلحاظ حروف تہجی مرتب ہے ۔ بخط حنظلہ بن عبداللہ عتیق الشیخ الامیر شرف الدین ابوالفضل یحیٰ بن المقلد بن سلطان بتاریخ ۲۱ صفر ۵۹۲ھ لکھا گیا ۔ اس طرح طب یونانی کے جملہ مخطوطات جن کی تعداد ہمارے یہاں ۵۵۰ سے زیادہ ہے اس میں یہ مخطوطہ دوسرا قدیم نسخہ ہے جو ۸۱۱ سالہ قدیم ہے ۔ اس مخطوطہ میں جملہ (۴۵) اوراق ہیں جن میں مفردہ ادویہ کے خواص بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کی قدامت ہی اس کی بڑی اہمیت ہے ۔

۳۔ طبِ محمود شاہی، ترجمہ ویاگ بھٹ سنسکرت (طب یونانی نمبر ۔ ۱۸۱)

یہ ایک نہایت ہی قیمتی قدیم و نایاب ۔ نادرالوجود نسخہ بزبان فارسی ہے ۔ اصل سنسکرت کتاب مسمیٰ "ویاگ بھٹ" کا فارسی ترجمہ ہے ۔ اس کتاب کا دیباچہ وغیرہ نہیں ہے اور سن کتابت اور نام کاتب بھی نہیں ہے ۔ البتہ باب دہم علاجِ زحیر یعنی پیچش کے مطالعے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب ۹۷۲ھ سے قبل لکھی گئی ہوگی ۔ اس طرح یہ کتاب ۴۲۱ سالہ قدیم ہے ۔ اس کتاب کے تین حصے ایک ساتھ مجلد ہیں دوسرے حصہ کے پہلے صفحہ پر حکیم سید محب حسینی صاحب کی حسب ذیل تحریر نوشتہ ہے ۔

"باب دوم کتاب محمود شاہی ترجمہ ویاگ بھٹ طب محمود شاہی نادرالوجود ترجمہ ویاگ بھٹ از کتاب خانۂ محمود شاہ بہمنی حسب الحکم شاہ مذکور ترجمہ است" ۔

یہ مخطوطہ خوش خط بہ جدول طلا ہے ۔ اس میں چار مقالے ہیں ۔ مقالہ اوّل وجہ تالیف

اب۔ دوم تشریح جسم۔ سوم ادویہ شناسی۔ چہارم تشخیصِ امراض۔ حصہ اول ورق نمبر ا تا ۱۱۵۔
حصہ دوم ۱۱۶ تا ۲۲۷۔ حصہ سوم ۲۲۸ تا ۲۴۰ ورق۔

۴۔ معالجاتِ بقراطیہ

اس کتب خانہ میں معالجاتِ بقراطیہ کے تین نسخے ہیں۔ نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد کے
[کتب]خانہ میں معالجاتِ بقراطیہ کا ایک نسخہ ہے جس کا نمبر ۵۰۷۸ جملہ صفحات ۲۰۷، سنہ کتابت
۱۰۵۰ھ نام مصنف شیخ ابوالحسن احمد طبری ہے۔ منتظمین کتب خانہ N.T.C. کتاب کے اندرونی
[سرو]رق میں ایک پرچی پر نوٹ لکھا ہے، جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

"یہ اپنی نوعیت کا نادرالوجود اور شاندار نسخہ ہے جس میں یونانی طریقہ علاج کے بنیادی
[اصول]یات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس کی اہمیت یوں ظاہر کی گئی ہے کہ ہندوستان بھر میں اس
[کتاب کے ص]رف تین نسخے ہیں۔ ایک اجمل خان طبیہ کالج علی گڑھ کے کتب خانہ میں اور ایک اسٹیٹ
[سنٹ]رل لائبریری حیدرآباد میں اور ایک نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد میں۔"

اس سلسلہ میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ہندوستان بھر میں اس کے
[ص]رف تین ہی نسخے ہیں، صحیح نہیں ہے، بلکہ ہمارے ہی کتب خانہ میں یعنی O.M.L. میں اس کے تین
[نسخے ہ]یں۔ پہلا نسخہ مخطوطہ نمبر ۱۲۸ طب یونانی، بنام کناش معروف بہ معالجاتِ بقراطیہ، نام مصنف
[ابوالحسن] احمد بن محمد طبری رکن الدولہ دیلمی المتوفی ۳۸۰ھ ہے۔ اس نسخہ پر سن کتابت اور نام کاتب
[نہیں] ہے۔ جملہ صفحات ۶۷۳ ہیں۔ نسخہ نہایت خوش خط ہے۔

دوسرا نسخہ ۲۱۴ معالجاتِ بقراطیہ بقلم سید مصطفےٰ بہ عہد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کتابت
[ہوا]، [ج]س میں جملہ ۸۷۲ صفحات ہیں۔ کتاب پر ایک مہر حکیم سید محب حسینی خان بہادر سردارالحکمار
[کی] پائی جاتی ہے۔

تیسرا نسخہ ۱۴۴ بقلم ابن نفیس امیر ہے، جس کے جملہ ۱۰۴۸ صفحات ہے سن کتابت
[۱۰۹۴ھ] ہے۔ اس طرح یہ نسخہ نظامیہ طبیہ کالج کے نسخہ سے ضخیم و قدیم ہے۔ اس مخطوطہ پر ایک مہر
[نظام ا]لملک مسیح الدولہ بہادر ۱۱۷۲ھ پائی جاتی ہے۔ انڈین انسٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

دہلی ۸۰-۱۹۷۹ء اور ۲- سنٹرل یونانی ریسرچ حیدرآباد نے اس کی فوٹو کاپی ۱۹۸۲ء میں حاصل کی ہے

۵- شفاء العلیل (نمبر مخطوطہ ۷۹)

یہ نسخہ فارسی زبان میں ہے۔ اس طرح مظفر بن محمد الحسینی شفائی نے یونانی مرکبات پر بڑی جامع کتاب مرتب کی ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۵۶ھ ہے یعنی یہ مخطوطہ ۳۵۰ سالہ قدیم ہے اس مخطوطہ میں ۲۳۳ صفحات ہیں۔

۶- جامع الاطبا (طب یونانی ۱۳۰ فارسی)

یہ کتاب بزبان فارسی بحکم شاہجہاں شہنشاہ دہلی، حکیم نورالدین محمد عبداللہ عین الملک شیرازی نے تصنیف کی۔ کتاب ہذا کو انھوں نے چودہ فتوح پر تقسیم کیا ہے یعنی بجائے ابواب و فصول کے لفظ فتوح استعمال کیا ہے۔

چودھویں باب میں فارسی اور ہندی ادویہ کے نام مع تلفظ اعراب کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب سن سات جلوس شاہجہاں یعنی ۱۰۴۴ھ میں لکھی گئی۔ جملہ صفحات ۱۳۴ ہیں صفحہ اول پر عباس علی کی مہر ۱۲۳۶ھ اور ایک دوسری مہر ۱۲۶۲ھ ثبت ہے۔

۷- مخزن اسرار الاطبا (مخطوطہ نمبر ۷۴۳/۷۴۴ دو جلد)

یہ کتاب حکیم محمد مہدی بن جعفر بن محمد حسن کی ۱۱۷۲ھ کی تصنیف ہے۔ ۲۳۲ سالہ قدیم ہے یہ ایک ضخیم نسخہ بزبان فارسی تحتی کلاں پر مشتمل ہے اور ابتدا مقدمہ ہے۔ مقالہ اول چار ابواب دس فصول پر مشتمل ہے۔

مقالہ دوم ایک مقصد دس فصول پر مشتمل ہے۔

مقالہ سوم گیارہ فصول پر مشتمل ہے اور خاتمہ تین فصول پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں حدود طب و موضوع، منفعت و اسباب ملائی صحت۔ بیان ارکان۔ بیان ارواح۔ اخلاط و اعضا و تعریف اعضا و تقسیم اعضا۔ اعضاء المفردہ و مرکبہ۔ بیان مزاج۔ بیان

ان اکل وشرب ۔ بیان حرکت وسکون نفسانی ۔ بیانِ نوم وبیداری ۔ بیان استفراغ ۔ علاماتِ مزاج ۔
ن نبض وقارورہ ۔ تدبیر مولد ۔ تدبیر ماکول ومشروب ۔ تدبیر پیران ومسافران ۔ تدبیر لعاب دہان ۔
یر حمام وجماع ۔ منفعت جماع ومضار افراطِ جماع ۔ اشکال ادا ومضارِ جماع ۔ در احوالِ منی ۔
یر فصد وحجامت ۔ تدبیر مسہل ۔ تدبیر حقنہ ۔ تدبیر شیاف ۔ تدبیر تکمید ۔ تدبیر اخراج جنینِ میت
یر سل ودق ۔ تدبیر جراحت مثانہ برائے اخراجِ پتھری ۔ تدبیر دفع مضر سموم وغیرہ وغیرہ ۔

بہر حال ایسے کئی عنوان پر یہ کتاب معلومات آفزا اور قابلِ تحقیق ہے ۔ یہ کتاب اصحاب
لم وفنِ طب وارباب تحقیق وتدقیق کو دعوت مطالعہ دیتی ہے ۔ یہ تذکرہ جلد اوّل نمبر ۴۳ ۷ کا تھا
س کے ۱۰۰ صفحات میں ہیں ۔ دوسری جلد نمبر ۴۴ ۷ پر دستیاب ہے ۔

تقویم الادویہ (یونانی مخطوطہ ۔ ۲۸۸)

مصنف محمد بن علی طبیب ۔ یہ کتاب خوش خط ہے اور پہلا صفحہ مطلّا ہے ۔ عربی زبان میں
فردات پر بڑی قابلِ قدر اور عمدہ کتاب ہے ۔ اس کتاب میں بشکلِ تقویم ادویہ کا بعنوانِ ذیل
تفصیل بیان کی گئی ہے ۔

(۱) الادویہ (۲) التعریف (۳) الانواع (۴) المختار (۵) المزاج (۶) الاشربہ
(۷) المنافع (۸) المضرات (۹) المصلحات (۱۰) الابدال ۔

مفردات کا حصہ ختم کرکے انھوں نے مختلف تقریباً تیس سے زائد اقسام کے لحوم پر نوٹ
لکھے ۔ مثلاً اونٹ ۔ گائے ۔ بکرا ۔ مرغ ۔ پرندے مچھلی وغیرہ ۔ اس کے بعد کی فصل میں شحوم
یعنی چربی، مختلف قسم کے چربی پر نوٹ لکھا ہے مثلاً سانپ ۔ شیر ۔ گدھا ۔ گائے ۔ مرغ ۔ مچھلی
وغیرہ وغیرہ ۔ اس کے بعد کی فصل میں جبن کے اقسام بیان کی گئیں ہیں ۔

اس کے بعد البان یعنی مختلف قسم کے دودھ مثلاً عورت، اونٹ، بکری، گائے وغیرہ ۔
بعد کی فصل میں پانی کے اقسام بیان کئے گئے ہیں ۔ مثلاً سمندر کا پانی، چشموں کا پانی، آب جاری، بارش
کا پانی، برف کا پانی ۔ نمک کا پانی، جڑی بوٹیوں کا پانی، شہد کا پانی، گوشت کا پانی، میووں کا
پانی وغیرہ ۔ اس کے بعد ایک باب دیا گیا ہے جس میں ادویہ مرکبہ مثلِ شربتیں، قرص، حبوب،

سفوف، سنون، غرغرہ، معجونات، اطریفلات، مراہم، کحول، ضماد، شیاف وغیرہ پر نوٹ لکھا گیا ہے۔ جملہ صفحات ۲۱۵ سن کتابت نادارد کاغذ اور طرز تحریر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب تقریباً ۲ سو سالہ قدیم ہے۔ کتاب پر ایک مہر ہے جسے میٹ دیا گیا ہے لیکن اس میں کندہ سنہ ۱۲۵۹ پڑھا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس سے پہلے کی تصنیف ہے۔

یادگار رضائی (مخطوطہ نمبر ۱۶۴) طبع شدہ

حکیم رضا علی خاں بن حکیم محمود خاں حیدرآبادی نے یادگار رضائی تذکرۃ الہند لکھی جو نہایت ہی مفید اور اطباء کے لئے کارآمد ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے ادویۂ ہندیہ از قسم حشائش نباتات و عقاقیر وغیرہ جو اطباء ہندی جنھیں وید کہا جاتا ہے اور جو ان کو علاج میں استعمال کرتے ہیں ایک ایک جڑی بوٹی کو مخزن الادویہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ یعنی پہلے دوا کا نام مع ماہیت پھر اس کے افعال اس کے خواص اس کی مقدار پھر اس کا بدل اور اگر ان دواؤں کا نام طب یونانی میں موجود ہو تو وہ نام بھی لکھ دیا ہے۔

مصنف نے اپنے خطبہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ ان کے والد حکیم محمود بن حضرت اللہ نے ادویۂ ہندیہ کو جو ان کے تجربہ میں پہنچے تھے ان کے تمام نام حالات و کیفیات خواص کو عربی میں متفرقاً بطور مسودہ لکھا تھا اسی لئے بعد وفات والد، مصنف نے اس کو بہ عہد نواب اکبر علی خاں سکندر جاہ نظام حیدرآباد سنہ ۱۲۳۵ھ میں تحریر کیا اور اس کا نام تذکرۃ الہند یادگار رضائی رکھا اور اس کو تین تذکروں اور ایک خاتمہ پر مرتب کیا۔ تذکرہ اول میں احوال بدن وغیرہ بطور طریقہ ہندیہ یعنی ویدک طریقہ کے لحاظ سے بیان کیا۔ تذکرہ دوم: فوائد و مضر اثرات ادویہ و اغذیہ وغیرہ۔ تذکرہ سوم: ادویہ و اغذیہ ہندیہ کے نام۔ ماہیات، مزاج، افعال و اصلاح و مضر و خواص بیان کئے گئے ہیں۔

یہ نسخہ طب یونانی ۱۶۴ خوشخط نستعلیق۔ تختی کلاں۔ بخط محمد غوث الدین سنہ ۱۲۵۰ھ میں حسب فرمائش نواب شرف الدولہ کتابت کیا گیا۔ جملہ اوراق ۲۲۸ ہیں۔ یہ کتاب پہلی بار سنہ ۱۲۸۲ھ، دوسری بار سنہ ۱۲۹۱ھ حیدرآباد میں چھپی۔ تیسری بار اپنی افادیت کے لحاظ سے بربناء رائے مشاہیر حکماء مثل حکیم مقصود جنگ حکیم ابوالفدا حکیم اعظم صاحب بحکم فرمان نواب میر عثمان علی

خاں نظام حیدرآباد دکن جلدوں میں بزبان مصنف یعنی فارسی میں نہایت عمدہ کاغذ پر شائع ہوا۔ تین بار یہ نسخہ حیدرآباد ہی میں چھپا لیکن اب یہ نسخہ حیدرآباد ہی میں نایاب نہ سہی کمیاب ضرور ہو گیا ہے۔ غالباً حیدرآباد کے چند مشہور کتب خانوں کے علاوہ اس کا دستیاب ہونا مشکل ہے۔ ہندوستان کی جڑی بوٹیوں پر جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں پائی جاتی ہیں۔ اُن پر جنوبی ہند کے ایک یونانی حکیم کی فارسی تحقیق و ترتیب نہایت حیرت انگیز اور انتہائی قابل قدر کارنامہ ہے۔ ہندوستانی دواؤں کا یا ویدک دواؤں کا بلحاظ مفردات یقیناً ایک عمدہ انسیکلوپیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا ہندوستانی کی دوسری زبانوں میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔

نیز مصنف علام نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ اس نے ہندی اور دیگر کا صحیح تلفظ بھی لکھ دیا ہے مثلاً صحیح تلفظ کے لئے اعراب کی وضاحت کی ہے۔ یونانی حکیم کا یہ شاندار کارنامہ ہے ——— سینکڑوں مخطوطات کا تذکرہ کرنا محال ہے۔ اس لئے چند مخطوطات کا تذکرہ کیا گیا اور چند اہم و نادر مخطوطات کے نام مع اسم مصنف و سن تصنیف بیان کئے جاتے ہیں تاکہ تحقیق کرنے والوں کو مخزن کا پتہ معلوم ہو جائے۔

آصفیہ (ONLRI) میں طبّ یونانی کے قدیم و نایاب مخطوطات کی فہرست

نمبر مخطوطہ	زبان	نام کتب یعنی مخطوطہ	نام مصنف	سنہ تالیف تصنیف	کیفیت
۱۳	عربی	شرح قانون شیخ الرئیس بو علی سینا	———	۷۴۱ھ	
۲۰	〃	شرح قانونچہ	عبدالفتاح ابن سید اسمعیل الحسینی	۱۰۸۸ھ	
۲۲	〃	خواص الادویۃ المفردہ	ابو الصلت امیہ بن عبدالعزیز	۵۹۳	قدیم نسخہ
۲۱۰	〃	طب ابراہیمی	نامعلوم	۱۰۵۴ھ	
۲۲۶	〃	عین الحیات	محمد بن یوسف طبیب	۹۳۹ھ	
۱۹۱	〃	الکافی	عدنان بن نصر بن منصور شیخ موفق الدین ابوالنصر		
۲۱	فارسی	تحفۃ الاطباء منظوم	شیخ احمد قنوجی	۱۲۰۷ھ	سن کتابت

مخطوطہ نمبر	زبان	نام کتاب یعنی مخطوطہ	نام مصنف	سنہ تالیف تصنیف	کیفیت
۱۰۰	فارسی	جامع الاطبار	یمن الملک نورالدین محمد عبداللہ	سن ۰ جلوس محمد شاہ بادشاہ	
۲۰۹	״	دستورالعلاج	———	سن ۱۹ جلوس عالمگیر میں مقابلہ کیا گیا کتاب اس سے قبل لکھی گئی ہے۔	
۳۵۷	״	رسالہ افیون	عمادالدین محمود بن مسعود طبیب	۱۰۹۵ھ	
۰۹	״	شفاء العلیل	مظفر بن محمد الحسینی الشفائی	۱۰۵۴ھ	
۴۴۰	״	طب فاروقی	فخرالدین طبیب	۱۱۸۰ھ	
۳۹۳	״	فوائد عمدہ فی تدبیر ضعف معدہ	حکیم ہاشمی خاں قطب الدین	۱۰۵۰ھ	ناقص الطرفین ہونے کے باوجود اسکی اہمیت یہ ہے کہ یہ مخطوطہ حسب الحکم اکبر مغل بادشاہ لکھا گیا
۴۷۷	״	فوائد الانسان منظوم کتاب	———	۱۰۴۰ھ	حسب الحکم شہنشاہ اکبر تصنیف کی گئی اور اس کا نام تجویز فرمایا گیا
۲۸۷	״	فرہنگ ادویہ	نامعلوم	نامعلوم	مع فوائد افضلی و رسالہ قلع آثار از کتب خانہ شاہ اودھ وزیر حکیم مظفر حسین خاں خلف حکیم مسیح الدولہ لکھنوی
۴۸۰	״	فرہنگ حکیم شہابی	حکیم شہاب		
۲۹۳	״	صحیفۂ فرہنگ	نامعلوم		

عہد مغلیہ کے چند طبی مخطوطات

مخطوطہ نمبر	زبان	نام کتاب	نام مصنف	سن تالیف یا تصنیف	کیفیت
۲۹۲	فارسی	فوائد معدہ فی تدبیر ضعف معدہ	حکیم امنی خان قطب الدین	۱۰۵۰ھ	حسب الحکم اکبر بادشاہ تصنیف کیا گیا۔
۴۷۷	؍؍	فوائد الانسان منظوم کمیاب	———	۱۰۴۰ھ	بحکم مغل شہنشاہ اکبر تصنیف ہوئی اور نام کتاب تجویز فرمایا گیا
۳۱	؍؍	تحفۃ الاطبا	شیخ احمد قنوجی	۱۲۰۷ھ	
۱۳۰	؍؍	جامع الاطبا	عین الملک نورالدین شیرازی		سن ساتے جلوس محمد شاہ میں لکھا گیا
۹۴	؍؍	تجربات ناصری	———		مکتوبہ سن ۴۱ جلوس شاہ عالم

اس طرح تحقیق کرنے پر قطب شاہی۔ بہمنی۔ عادل شاہی اور آصفجاہی دور کے طب یونانی پر مخطوطات دستیاب ہو سکتے ہیں۔

چند نادر مخطوطات جن کے ایک سے زائد نسخے دستیاب ہیں

نمبر	زبان	نام کتاب	نام مصنف	سن	کیفیت
۱۴	عربی	معالجات بقراطیہ	احمد طبری ابوالحسن		
۲۱۴	؍؍	؍؍	؍؍	؍؍	بعہد بہادر شاہ بادشاہ دہلی کتابت کی گئی اس پر حکم محب حسن کی مہر ہے جس کا سن ۱۲۲۲ھ ہے
۸۷۷	؍؍	؍؍	بقلم ابن نفیس امیر	۹۵۲ھ	مخطوطہ پر مہر حکیم الممالک مسیح الدولہ بہادر ۱۱۷۲ھ دیکھی جا سکتی ہے۔

شرح فصول بقراط

نمبر	زبان	نام کتاب	نام مصنف	سن
۱۵	عربی	شرح فصول بقراط	از علی ابن الحزم القرشی	۷۴۱ھ
۶۰	؍؍	؍؍	امین الدولہ یعقوب بن اسحاق	

مخطوطہ نمبر	زبان	نام کتاب	تصنیف	سن تالیف یا تصنیف	کیفیت
۲۰۴	عربی	شرح فصول بقراط	عبداللطیف بن یوسف بغدادی		کمیاب

شرح قانون بوعلی سینا جس کو مختلف مصنفوں نے تصنیف کیا ہے

مخطوطہ نمبر	زبان	نام کتاب	تصنیف	سن تالیف یا تصنیف	کیفیت
۱۹۹	عربی	شرح قانون بوعلی سینا	علی گیلانی		
۲۳۰	"	شرح قانون بوعلی سینا جلد رابع	"		
۲۳۱	"	" " "	"		
۲۳۲	"	" " "	"		
۲۳۳	"	" " "	"		
۱۳	"	" " "	محمد شیرازی علامہ قطب الدین	۷۰۸ھ	
۲۰۲	"	" " "	"		
۲۴۱					
۲۴۴	"	" " "	"	۱۱۰۵ھ	
۲۹۱					
۹۲۶	"	" " "	مصنف نامعلوم		
۹۲۷					

مختصر یہ کہ برسوں سے حیدرآباد طب یونانی کا مرکز رہا ہے جہاں کے حکماء ہندوستان کے مشہور حکماء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان حکماء کے کتب خانوں میں اور با ذوق و اہل علم حضرات کے یہاں صدہا قلمی و مطبوعہ کتابیں طب یونانی پر دستیاب ہیں۔ جو اہل زمانہ کی ناقدری کی وجہ سے اب تلف و برباد ہونے کے قریب ہیں۔ اس لئے میں اس سمینار میں ایک تجویز پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ، طب یونانی کے ریسرچ اور مخطوطات کی تصنیف و تالیف اور چھپوائی کے لئے ایک پراجکٹ اور مخطوطات کی خریدی کے لئے ایک کمیٹی قائم کرے۔

۵۵

جناب سید قاضی الاسلام (ٹونک)

ٹونک کے چند مخطوطات کا تعارف

ٹونک میں مختلف طبی خاندان تھے جنھوں نے کئی کئی پشتوں تک اس فن کی خالصتاً لوجہ اللہ خدمت کر کے غیر معمولی شہرت و عظمت حاصل کی۔

مولانا حکیم سید انور علی رامپوری، حکیم عابد علی کوثر خیرآبادی، حکیم عبدالعلی، حکیم سرور شاہ مسیح الملک، مولانا حکیم سید دائم علی خاں، علامہ حکیم سید برکات احمد، حکیم سید سعید احمد، مولانا حکیم سید محمد احمد برکاتی، حکیم امیر حسن سہا، حکیم نذر احمد خاں، حکیم مظفر علی، حکیم مولوی قاضی خیر عرفان خاں، حکیم ظہیر الدین اور حکیم محمد یوسف خاں، کا شمار ایسے ہی اطبا اور حکما میں ہوتا ہے۔ جو نہ صرف مطب کے ذریعہ عوام الناس کی خدمت انجام دیتے تھے، بلکہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا شغل بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔

علامہ سید برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ٹونک کا معزز ترین طبی اور علمی خاندان تسلیم کیا جاتا تھا، اس خاندان کی علمی اور طبی خدمات اباً عن جد بحمد للہ آج بھی چلی آرہی ہیں۔ آپ نے ٹونک میں تقریباً چالیس پچاس سال مسلسل علم و حکمت اور درس و تدریس کی جس ذوق و شوق اور انہماک کے ساتھ خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

آپ کے تلامذہ کا بڑا حلقہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف صوبوں، راجستھان، گجرات، یوپی، پنجاب، بہار اور کشمیر وغیرہ میں پھیلا ہوا ہے۔ بلکہ ہندوستان سے باہر بخارا، سمرقند، کوقند، ترمذ، تبت، کابل، قندھار اور اشنو تک طالبان علوم اس آفتاب علم و حکمت سے اکتساب نور کر کے اپنے اپنے علاقوں حلقوں اور مقامات میں نیلے علم پھیلائے ہوئے ہیں۔ اب چند نادر طبی مخطوطات کا تعارف پیش ہے۔

خلاصۃ الطب، از حکیم علوی خاں۔ فارسی۔ صفحات ۳۴۰۔ اس کے سبب تالیف میں مصنف رقم طراز ہیں:

کمترین بندہ عبودیت التیام علوی خاں کہ خاطر فاتر راغب علم دارد بہنگام سیر نسخے طبی دید کہ کتب مقررہ ترجمہ اکثر ادویہ را بعربی و فارسی و بعضے را بزبان ہندی نمودہ بنا برآں خواست کہ بحسب ادراک ناقص بندان کہ بسیر ہائے چشم ازیں گلزار ہمیشہ بہار اسم ہر ادویہ کہ بتبع تعین اندور احاطہ جستجو درآید ترجمہ ہندی کردہ مطلب مقرر نماید کہ اول اسم ہر ادویہ بزبان ہندی و بعدہ تلفظ عربی و فارسی و یونانی و سریانی و ترکی بہ ترتیب

حروف صورت نصیب باید تا طالبان ایں امور را وقت ضرورت آسانی تمام باشد۔

یہ کتاب چار مقالوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ اول مشعر با پنج باب، مقالہ دویم در بیان اعمالے کہ متعلق است بادویہ مفردہ مخصوصہ واستعمال بعضے ادویہ۔

فوائد نصاب المسمیٰ تلخیص الطب، از حکیم علی یار خاں جیو۔ صفحات ۴۹۔ پیش نظر نسخہ دوسری جلد معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ نسخہ فن دویم کے عنوان سے شروع ہے۔ فن دویم در امراض مختصہ بعضو عضو بائیس ابواب پر مشتمل ہے۔ ترجمہ ایں کتاب مستطاب فوائد نصاب کہ مسمیٰ بہ تلخیص الطب من تصنیف خان والا شان علی یار خاں جیو بہم صفر ۱۲ جلوس والا عالی گوہر۔ مطابق یک ہزار دو صد و چہاردہ ہجری ۱۲۱۴۔

ترجمہ دولت نامہ (طب حیوانات)۔ اصل مصنف اور ترجمہ نگار کا نام کاتب نے درج نہیں کیا۔ کاتب قاضی شجاع الدین۔ یہ کتاب مہاراجہ ظالم سنگھ والی جھالاواڑ کی فرمائش پر تصنیف ہوئی۔ اوراق ۵۷ ہیں۔ یہ مخطوط دولت نامہ عہد فیروز شاہ ۶۸۰ کے عہد کا مصنفہ ہے۔ یہ مخطوطہ ۴۵ ابواب پر مشتمل ہے۔

باز نامہ۔ یہ مہاراجہ ظالم سنگھ کا تحریر کردہ ہے۔ کاتب قاضی شجاع الدین۔ ۲۵ فصلوں پر مشتمل ہے۔

••

جناب سید منظور الحسن برکاتی (ٹونک)

ذخیرہ ٹونک کے چند طبی مخطوطات

آج سے پون صدی قبل بہار کے ایک شہر میر نگر کے سید زادہ میر سید دائم علی صاحب چشمۂ علم سے سیراب ہونے ریاست ٹونک تشریف لے گئے تھے جہاں علوم کی تحصیل و تکمیل کے بعد انھوں نے مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی وہیں اُن کی شادی غازی ولی محمد صاحب بہاری کی دختر فرخندہ سیرت سے عمل میں آئی۔ غازی ولی محمد صاحب مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور جماعت مجاہدین کے امیر تھے جنھیں ریاست ٹونک کے دوسرے فرماں روا وزیر الدولہ نے مجاہدین کے قافلہ کے ساتھ ٹونک بلا کر آباد کر لیا تھا۔ حکیم دائم علی صاحب نے اپنی لیاقت علمی، سیادت ذہنی اور عنایت الٰہی سے ریاست ٹونک کے چہارم فرماں روا نواب ابراہیم علی خاں خلیل کے طبیب خاص کے عہدے پر سرفرازی حاصل کی۔ اور ان کے صلب اور غازی صاحب کی دختر کے بطن سے وہ مہر منور طلوع ہوا جس کو دنیائے علم حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کے نام سے جانتی ہے اور جس کے فیوض و برکات سے آج بھی دنیائے علم فیضیاب ہے اور اس کی زندہ مثال اُن کے سعید و فرید نبیرہ مولانا حکیم محمود احمد ہیں جو ہماری آج کی اس بزم میں علم طب کے درخشندہ کوکب بنے جگمگا رہے ہیں۔ پٹنہ اور ٹونک کا یہ رشتۂ وطنیت اس کے علمی و ثقافتی رشتہ ہی کی طرح مضبوط ہے اور آج ہم اس کی یاد کو از سر نو تازہ کر رہے ہیں۔ بہار کی مرز بوم سے اس فطری تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر میں یہ عرض کروں تو کوئی بے جا بات نہ ہوگی کہ ٹونک اور پٹنہ مسافت بعیدہ کے باوجود اپنی علمی و ثقافتی مماثلت کی وجہ سے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ یگانگت و محبت کے علایق اس اتحاد معنوی کو کبھی جدا نہیں ہونے دیں گے۔ بلکہ اس رشتۂ اتحاد کو مزید مستحکم و مضبوط بنانے کا سبب بنیں گے۔

علمی رشتہ اور وطنی نسبت کا یہ کرشمہ ہے کہ ایک بین الاقوامی ادارہ خدا بخش لائبریری پٹنہ

میں ایک عالمگیر شہرت کے حامل ادارہ عربک پرشین ریسرچ انسٹوٹ ٹونک کی طبی سوغات لیکر میں دور دراز کی مسافت طے کرکے پٹنہ حاضر ہوا ہوں اور تنہا نہیں آیا ہوں بلکہ ٹونک کے اصحاب علم وفضل کا وہ نایاب قافلہ بھی ہمراہ لیا ہوں، جو عہد حاضر میں مغتنمات زمانہ کہلائے جانے کے لائق ہے۔ میری مراد ہے اس سیمینار میں شرکت فرمانے والے ٹونک کے علماء وحکماء جناب سید قامتی الاسلام صاحب، قاضی شہر جناب مولانا حکیم محمد عمران خانصاحب اور جناب مولانا حکیم سید محمد احمد صاحب نیز مولانا محمد عمر خاں صاحب ندوی۔

یہ سب حضرات گرامی علم طب کے نمائندگان کی حیثیت سے یہاں تشریف فرما ہیں اور اپنے مقالات پیش فرمارہے ہیں۔

یہ علمی سوغات جو ہم ٹونک سے لائے ہیں چند طبی نوادرات اور مخطوطات پر مشتمل ہے یہ نوادر زیادہ تر اُس خزینۃ العلم سے متعلق ہیں جسے حکومت راجستھان نے عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹوٹ کے نام سے قایم کر رکھا ہے جو حکومت راجستھان کی علم دوستی کی بے نظیر مثال ہے اور جہاں ہزاروں مخطوطات وملفوظات ارباب علم کی ضیافت طبع کے لیے بڑے سلیقہ اور طریقہ سے محفوظ ہیں۔ مختلف علوم وفنون کے بے نظیر نسخ اس میں موجود ہیں۔ یہاں ان کے بارے میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہاں تو مجھے سیمینار کے موضوع کی مناسبت سے فن طب کے چند مخطوطات پر روشنی ڈالنا ہے۔

فن طب میں جو مخطوطات ہیں وہ قدامت اور ندرت کے لحاظ سے تو بیش بہا ہیں ہی لیکن ان میں چند مخطوطات ایسے ہیں جو نادر حواشی، منہیات اور مبیضیات کی وجہ سے نایاب ہیں ان میں سے چند ایسے نسخ بھی ہیں جو گو طبع ہو چکے ہیں لیکن ان کے حواشی اور مخطوطات کے خالی صفحات پر حکماء عصر اور اطباء وقت کے سینہ بہ سینہ نسخے ان پر مرقوم ہیں جو بجائے خود ایک اہم ترین علمی نوادر ہیں اسی طرح دوسرے علوم وفنون کے بیشتر مخطوطات پر علماء وحکمائے وقت نے مطالعہ کتب کے دوران اپنے دست خاص سے طبی رموز ونکات سے متعلق حواشی اور تعلیقات درج کیے ہیں وہ بھی اپنی جگہ نادر اور اہم ہیں اگر ایسے تمام نسخ سے وہ تمام تعلیقات اور حواشی ایک علیحدہ مجموعہ کی شکل میں مرتب کر لیے جائیں تو طب کا ایک اہم ترین اور بیش بہا ذخیرہ مدون

ہوسکتا ہے اس لیے اس مقالہ میں منفرد مخطوطات کے علاوہ چند ایسے نسخ کی نشان دہی کی گئی ہے جو اگر چہ طبع بھی ہو چکے ہیں لیکن تذکرہ خصوصیات کے حامل ہیں:

۱- **اقوال الاطبا**، عربی - مولانا نجم الدین عمر بن الفتاحی کی فرمائش پر یہ کتاب تصنیف کی گئی ہے - کتاب ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے - ہر باب میں خاص خاص امراض کے متعلق مختلف اطبا کے اقوال نقل ہیں اور ان کے مجوزہ نسخے۔

کتاب کا صحیح نام معلوم نہ ہو سکا، کیونکہ کتاب اطبا کے اقوال سے شروع ہو رہی ہے - غالباً اس وجہ سے اس کا نام اقوال الاطبا رکھ دیا گیا ہے - مصنف اور کاتب کا نام بھی درج نہیں ہے۔

۲- **تقویم الادویہ**، عربی مصنفہ محمد بن علی الاسفرائنی، دو ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے - باب اول میں ادویہ اور اغذیہ سے بشکل مفردات بحث کی ہے - باب دوم میں مرکبات سے بحث کی ہے، اور ہر ایک دوا کے خواص مصلحات، بدل، بدرقہ وغیرہ کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے - یہ نسخہ ۱۰۹۱ھ کا مکتوبہ ہے۔

کاغذ دامی اسرخی مائل کرم خوردہ خط عربی، جدولیں شنجرفی ہیں۔

۳- **مباحث الاطبا**، عربی - حکیم درویش محمد بن حافظ عالم خان المعروف بہ مولانا نجم اللہ الصدیقی سے نے رسالہ اپنے فرزند اسد علی اور مولانا محمد نذیر خیر آبادی کے لیے تصنیف کیا ہے - ۱۲۱۹ھ تاریخ تصنیف ہے۔

اس کا نسخہ رضا لائبریری میں بھی ہے۔

۴- **شفاء المرض، یا شفاء المریض** - شہاب الدین ناگوری کا مصنفہ ہے - ۱۶۸ ابواب پر مشتمل ہے - ہر باب کے تحت چند فصلیں ہیں - اخلاط اربعہ کی کیفیت و حالات دریافت کرنے کے اصول و قواعد اور شناخت کا تفصیل سے بیان ہے - حاشیہ پر متن منظوم شکل میں تحریر ہے - آخر میں فرس نامہ ہے جس میں گھوڑوں کی بیماریوں اور ان کے علاج کا بیان ہے - **کتابت مایقرأ**۔

۵- **طب صدیقی** - شہاب الدین ناگوری کا منظوم رسالہ ہے - ۱۶ ابواب ہیں، کاتب شیخ طالب ولد شیخ لبیب - سن کتابت ۱۱۰۲ھ ہے - کتاب کے آخر کی عبارت سے ظاہر ہے کہ سن تصنیف ۷۹۰ھ کے بعد ہے۔

۶- **احسن المجربات**، مرتبہ حکیم احسن اللہ خاں بن حکیم عزیز اللہ مشہور بہ مسیح الزماں دہلوی کی تصنیف ہے - عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا یہ نسخہ خود مصنف کا قلمی ہے - جو ایک طویل مقدمہ سے مزین ہے - ابتداً ۱۲۷۰ھ میں حکیم صاحب نے اس کو مکمل کرنا چاہا تھا چنانچہ مرزا غالب نے تاریخ تصنیف بھی کہہ دی تھی، لیکن چند وجوہ کی بنا پر اس وقت یہ مکمل نہ ہو سکا اور ۱۲۸۸ھ میں اس کی ترتیب و تصنیف سے مصنف فارغ ہوئے۔

آخر سے ناقص ہے۔ نواب محمد علی خاں تیسرے فرماں روائے ٹونک نے اس کو دہلی سے حاصل کر کے اپنے کتب خانہ میں داخل کیا۔

۷۔ **شرح موارد الحکم**، فی علاج الامراض من الراس الی القدم (جلد ثانی)۔ اول حصہ قدرے آب رسیدہ ہے۔ کتاب کافی ضخیم مع حواشی کثیرہ ہے۔ جس میں ۳۶۰ اوراق ہیں۔ اس نام کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں بھی ہے جس کے شارح کلیم اللہ بن صبغۃ اللہ الطبیب ہیں۔

ترجمہ میں بیان کیا ہے کہ یہ نسخہ نواب احمد علی خاں کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ رام پور میں اس کا نصف اول ہے۔ اور عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں نصف آخر، دونوں مل کر مکمل نسخہ ہو جاتا ہے۔

رام پور کا نسخہ تیرہویں صدی ہجری کا مرقومہ ہے اور ٹونک کا یہ نسخہ بارہویں صدی ہجری کا مکتوبہ ہے۔ اس میں ضروری حواشی بھی تحریر ہیں۔

۸۔ **منتخب الاطبا**، خیر اللہ الہ آبادی کا مصنفہ ہے۔ چند معتبر کتابوں سے معالجات و مجربات انتخاب کر کے اس رسالہ میں درج کر دیے گئے۔ یہ رسالہ ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ کاتب محمد حسین ہیں۔ سن کتابت ۱۱۸۷ھ

••

جناب محمد عمران خاں ٹونکی
(ٹونک)

ٹونک کے طبّی نوادر

اس وقت چونکہ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے اطباء حضرات کی کافی تعداد یہاں موجود ہے، جن کے مفید اور اہم مقالوں سے اس وقت استفادہ کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ اس اہم موقع پر میں آپ حضرات کو دکھانے کے لئے چند نادر تحفے ساتھ لایا ہوں۔

دو کتابیں ہندوستان کے مشہور طبیب حکیم علوی خاں کے خود کے قلم سے ہیں۔ ان کا خط اور ان کے قلم کی پختگی آپ حضرات کو دکھاتا ہوں۔ ایک کتاب منحۃ الشفا خود حکیم ارزانی کے قلم سے لکھی ہوئی ہے اسے بھی آپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ خط شکست کا بھی بہترین نمونہ ہے۔ ان کے علاوہ ان کتابوں کے ساتھ قدیم اطباء کے کچھ رسائل بھی شامل ہیں۔ جن کے ناموں کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں سے کون کون سے رسائل طبع ہو گئے۔ بہر حال ضروری معلومات پیش ہیں۔ باقی مشورہ اطبا حضرات دینگے۔

ان میں مزید دو کتابیں خود میرے دادا صاحب کی تصنیف کردہ ہیں۔ جو اطبا حضرات کے لئے بہت مفید ہیں۔ ایک اردو میں ہے اور ایک فارسی میں۔ فارسی کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کتابوں پر تفصیلی نوٹ تیار کیا گیا ہے۔

○ حکیم علوی خان کے قلم سے لکھے ہوئے دونوں رسالوں کی تفصیل سن لیجئے۔

ان میں پہلا رسالہ کتاب جالینوس کا ایک مقالہ ہے جو فرق الطب پر ہے۔ جس کا حنین بن اسحٰق نے ترجمہ کیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۰ ورق پر مشتمل ہے اور حکیم علوی خان کے خود کے قلم سے نقل کیا ہوا ہے۔ اس رسالہ کے آخر میں تاریخ کتابت درج نہیں لیکن شامل دوسرے رسالہ میں کاتب کی صراحت اور تاریخ کتابت درج ہے۔ البتہ اس رسالہ کے ورق اوّل پر تین نوٹ اسی دور کے اس طرح درج ہیں۔

"عنایت حضور" ـــــ "بخط حکیم علوی خان مرحوم المخاطب بہ حکیم معتمد الملک"۔ اور "رسالہ مسائل طبی بخط نواب علوی خان المالک ہو اللہ"۔

اس کے علاوہ والد صاحب مرحوم، قبلہ حکیم قاضی محمد عرفان خان صاحب کے لکھوائے ہوئے دو نوٹ کتاب اور کاتب کے سلسلے میں درج ہے

ابتداء: کتاب جالینوس فی فرق الطب ترجمہ حنین بن اسحق وھو مقالۃ واحدۃ، قال جالینوس ان قصد الطبیب التماس الصحۃ وغایتہ احراز الصحۃ و والطبیب مضطر الی ان یعلم الاشیاء التی تفید الصحۃ - الخ -

اختتام: ویتوھمون ان بینہ وبین الورم الذی یسمونہ مرکبا فرقا دینسون قولھم الذی لایزالون یرفعونہ -

دوسرا اسطقسات پر ہے - یہ رسالہ بھی حکیم علوی خان کے قلم سے لکھا ہوا ہے اور ۲۰ ورق پر مشتمل ہے - کتاب شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کتاب فی الاسطقسات لجالینوس علی رای بقراط ترجمہ حنین بن اسحق -

ابتدائی عبارت اس طرح ہے: "قال جالینوس لما کان الاسطقس اقل جزء مما ھولہ اسطقس وکان الجزء الذی ھو اقل الاجزاء فیما یظھر للحس لیس ھو الجزء الذی ھو اقل الاجزاء الحقیقۃ" - الخ -

اختتام: "فھذا ما اردناہ من شرح القول فی الاسطقسات علی رای بقراط"-

ترقیمہ کاتب: تم کتاب جالینوس فی الاسطقسات علی رای بقراط ترجمہ حنین بن اسحق بحمد اللہ ومنہ بید عبد مولی العالم ابن میر محمد ھادی ابن ھاشم فی عاشر شھر رجب سنہ ۱۱۴۳ھ"

○ اب حکیم ارزانی کی تصنیف نسخہ الشفا کے سلسلے میں نوٹ سن لیجئے - یہ کتاب طبع ہوئی یا نہیں اور کہاں کہاں اس کے نسخے ہیں، میں تحقیق نہیں کر سکا اصل کتاب ۱۴۴ ورق پر مشتمل ہے - اوّل و آخر میں کاتب کے قلم سے دو ایک ورق میں کافی یادداشتیں ہیں - یہ قلمی نسخہ ہمارے خاندانی کتبخانہ سے متعلق رہا ہے - آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو خط کی پختگی کا اندازہ کر سکتے ہیں - خط شکست پختہ کا بہترین نمونہ ہے - الحمد للہ ہم لوگوں کو اس کے نقل کرنے کی توفیق بھی ہوئی ہے - حالانکہ اس خط کا پڑھنا بہت مشکل تھا - لیکن والد صاحب مرحوم کی نگرانی میں اسے نقل کیا اور اس کی تکمیل ہوئی -

نقل بھی ساتھ میں موجود ہے۔ کتاب اس طرح شروع ہوتی ہے:

"ھذہ نسخۃ شریفۃ من مجربات السید میر محمد مہدی المخاطب بحکیم الملک ارزانی وسمیتہا منحتبا لشفا ۔ فی کتاب الرحمۃ لیس للطبیب ان یُبرِئ المریض علتہ لکن ان ینظر فی حال المریض فان وجد سبیلا الی العلاج عالج"۔ الخ

اختتام: "یدق وینخل ویحبب بقدر الحمصہ یما اقتراح ویبلع و یترب علیہ ماءً فاتر اًمرۃ بعد اخری"

ترقیمہ کاتب: تمت ھذہ النسخۃ الشریفۃ بید الفقیر الحقیر الاحقر محمد اکبر بسوعۃ التمام المسمیٰ والمخاطب حکیم علی خان۔ اکثر نسخہ کہ درین کتاب نوشتہ شدہ بخط اوست"۔

اس کتاب کے ساتھ مزید، مندرجہ ذیل قدیم رسائل شامل ہیں۔ اس وقت صرف فہرست دی جا رہی ہے۔ آئندہ ان شاء اللہ تفصیلی نوٹ بھی تیار کرکے پیش کیا جائے گا۔

- (۱) کتاب الاکتفا بالدواء شرح خواص الاشیاء۔
- (۲) رسالہ شیخ الرئیس فی مسائل معدودہ۔
- (۳) رسالہ فی اصلاح الادویۃ المسہلہ من کتاب المنصوری۔
- (۴) مقالۃ فی النبض والقارورۃ۔ لمحمد بن زکریا الرازی
- (۵) رسالۃ فی الادویۃ القلبیۃ ۔ للشیخ۔
- (۶) رسالۃ فی اعمار الادویہ ۔ للاندلسیہ۔
- (۷) رسالۃ فی الاسمائی ۔ نوح القمری

○ دادا صاحب کی دو کتابوں میں پہلی کتاب تدبیر الحوائل والصبیان فارسی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حاملہ اور بچوں سے متعلق جتنے امراض اور ان کی تدابیر ہو سکتی ہیں ان سب کا ذکر اس کتاب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ حاملہ کو ابتدائے حمل سے لیکر وضع حمل تک جو امراض ہو سکتے ہیں اور اس سلسلہ کی جو تدابیر اطباء کرام نے اپنے تجربات کے بعد لکھی ہیں۔ ان

سب کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح وضع حمل سے لیکر جس عمر تک بچہ صبی کہلاتا ہے اس وقت
تک کی تمام تدابیر، امراض، ان کے اسباب و علامات اور ان کا علاج مرضوں کے سلسلہ میں تمام تدابیر اور
احتیاط کا اس کتاب میں ذکر ہے۔

موضوع کے لحاظ سے کتاب نہایت اہم اور نادر ہے حالانکہ ہمارے دیگر اطبار نے
بھی اس موضوع پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن جامعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بڑی نادر ہے۔
کتاب کا اصل مخطوطہ مؤلف علام کے قلم کا لکھا ہوا کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

کتاب کے آخر میں مرض موتی جھرہ سے تفصیلی بحث کی گئی ہے جس کا ذکر چیچک کے ذیل میں
مذکور ہے۔ اس مرض کی حقیقت کیا ہے۔ یہ مرض کیوں پیدا ہوا اور کب سے پیدا ہوا۔ اس کی تدابیر
کیا ہیں۔ مؤلف علام نے اس سب باتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس کی تدابیر بھی بتائی ہیں۔
بلکہ آپ کا اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ بھی ہے۔

○ دادا صاحب کی دوسری کتاب "نصاب الطب" منظوم اردو ہے، جو اپنی نوعیت
کی واحد اور بڑی دلچسپ کتاب ہے۔ طب کے طلبار اور مبتدیوں کے لئے بہت ہی مفید اور نافع
نظر آتی ہے۔ آپ اس کا مطالعہ کریں گے تو اس قابل نظر آئے گی کہ اسے طبی نصاب میں داخل کیا
جائے۔ بلکہ اسی مناسبت سے اس کا نام بھی نصاب الطب رکھا گیا ہے۔

اس کے مرتب میرے جد امجد حکیم قاضی عبدالحکیم صاحب ٹونکی المتوفی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء
ہیں۔ جو امروہہ کے مشہور طبیب حکیم علی حسن صاحب ٹونکی کے شاگرد رشید تھے۔ دادا کو اللہ تعالےٰ
نے دوسری صلاحیتوں کے علاوہ فارسی و اردو، نظم و نثر میں تصنیف و تالیف کا بھی بڑا ملکہ عطا
فرمایا تھا۔ طب میں بھی آپ کی کئی تصنیفیں ہیں، جن میں سے بعض کا تعارف برادر محترم حکیم سید
محمد احمد صاحب ٹونکی نے اپنے مقالوں میں پیش کیا ہے۔

کتاب ہذا کی افادیت کے پیش نظر اگر یہ کہا جائے تو زائد نہیں ہوگا کہ یہ کتاب نہ صرف طلبار
اور مبتدیوں کے لئے مفید ہے بلکہ اطبار اور طب سے شغف رکھنے والے تمام حضرات کے لئے بھی
اسی طرح مفید اور اہم ہے۔ اس لئے کہ اس میں طب کی اصطلاحات کو، طبی الفاظ کو اور مفردات
و مرکبات کو اس بہتر انداز میں نظم کیا ہے کہ بعض اہم باتیں اسی طرح زبان زد ہو جاتی ہیں جو کوشش

کرنے پر بھی آسانی سے یاد رہیں۔

ابتدا میں مؤلف علام نے ایک مفصل مقدمہ شامل کیا ہے جس میں سبب تالیف بیان کیا گیا ہے اور اس میں اسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔ پھر علم حکمت کا مختصر بیان ہے۔ علم طب کے مبدا سے بحث کی ہے۔ علم طب کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ پھر اپنے تلمذ کا ذکر کر کے اپنے اساتذہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نظم شروع ہوتی ہے۔

مقدمہ میں یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ مؤلف نے اس نظم میں نصاب الصبیان کا طرز اختیار کیا ہے۔ لیکن اس طرز پر صرف ہدایات طبی، اقوال حکما، مفردات ادویہ وغیرہ ہی کو بیان کیا گیا ہے اور ہر باب میں چند مشہور و متعارف نسخے بھی نظم کئے گئے ہیں تاکہ ان کے اجزا کو یاد رکھنے میں آسانی ہو۔

اس کتاب کو ترتیب دیتے وقت چونکہ حروف تہجی کی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا ہے اس لئے حروف کی مناسبت سے اٹھائیس باب مرتب ہوئے۔ پھر ہر باب کے لئے علیٰحدہ بحر کا بھی انتخاب کیا گیا اور ابتدا باب میں، وزن کر کے بھی بتایا گیا ہے۔

اس وقت ہر باب میں سے کچھ اختصار کر کے نمونۃً کچھ اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن سے مؤلف کی قادر الکلامی کے ساتھ ساتھ کتاب کی اہمیت کا اندازہ بھی سامعین کرام کو ہو سکے گا۔

باب الالف کی ابتدا کرتے ہوئے کتاب کو اس طرح شروع کیا گیا ہے۔

طب سے ہے مقصود علم و خدمتِ خلقِ خدا   نے تفاخر نے امیروں کا تقرب مدعا
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات   یاد کر وزن رمل نے گوہر بحر حیا

اصطلاحات و مفردات کا ذکر کرتے ہوئے ایارج فیقرا کے لئے لکھتے ہیں:۔

ایَل اللہ و ایارج اشرف و مسہل دوا   تلخ و نافع مسہل و مصلح ایارج فیقرا

اس کے بعد ہی بقراط کے حوالہ سے اس کا نسخہ بھی دیکھئے، کس قدر مختصر اور جامع انداز میں نظم کیا گیا ہے:۔

حب بلساں عود بلساں مصطگی اور بالچھڑ   دار چینی ریح تگر کیسر مضاعف، ایلوا

اصطلاحات کے سلسلہ میں مزید چند شعر اس باب کے سن لیجئے:۔

معنیٔ آنا تا بسیلکے آیم و بہتر کتم   یا مغتریا دوار الذئب والماغرتا

لفظ یونانی ہے ایلاؤس یہی تو سچ ہے　　ترجمہ اس کلمے رب ارحم عنایت کر خدا
اور بخشدے۔

اسکنجبین بزوری طب شرع اختناق بول ورواز　　الیعان اکل ومثلہ دا بردان مجیع وسا

باب الباء شروع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

رعونت اور حمق میں مبتلا ہے کیوں تو اے جوان　　علوم منطق وطب سیکھو یہ ہیں جوہر انسان
مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن　　ہزج سالم مثمن کی تو کر تقطیع ہے آسان

اسی باب میں برشعثا کا نسخہ بحوالہ الشیخ الرئیس اس طرح لکھتے ہیں:-

ہے بزر البنج وفلفل جیس کیسر پانچ انیون دنا　　ہے عاقر قرحا سنبل فرفیون اک شہد سر چنداں

باب التاء اس طرح شروع ہوتا ہے:-

عروض وقافیہ سے گر نہیں ہے تو آگاہ　　تری لیاقت علمی میں نقص ہے واللہ
مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن　　یہ بحر کہتے ہیں مجتث اسے سخن آگاہ

اسی باب میں تریاق اربعہ کا نسخہ اس طرح نظم کرتے ہیں:-

یکساں بید زراوند مر وحب الغار　　عسل سہ چند بنا رکھ بوقت کار نگاہ

باب الجیم اس نصیحت سے شروع ہوتا ہے:-

اس وصیت پر کیا بقراط نے حکم عمل　　حاملہ کو تو نہ دے دارو کے اسقاط حمل
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات　　تو لغایت طب سے ہر دم یاد رکھ بحر رمل

اسی باب میں جوارش کے معنی اور جوارش مصطگی کا نسخہ کس بہتر انداز میں نظم کیا گیا ہے:-

گر جوارش کو کہیں تازی تو کیسا لفظ ہے　　اس کے معنی ہیں مسنحق تذکرہ سے منتقل
یا جوارش ہے معرب لفظ ہاضم ترجمہ　　اصل اس کی ہے گوارش ہے یہ قول منفصل
جیسے یہ نسخہ جوارش مصطگی کا مختصر　　مصطگی رومی وماء الورد وسکر یا عسل

باب الحاء میں کچھ نمونے دیکھئے:-

مفردات ادویہ سے تو نہیں واقف ذرا　　پھر کبھو تسلیم حکمت کو تری کس نے کیا

نسخہ حب الشفا

نسخہ حب الشفا تخم دھتورہ زنجبیل　چینی کی ریوند عرب کا گوند جدوار خطا

نسخہ حب قوقایا

حب قوقایا یعنی حب سر نسخہ عجیب　صبر وا فتنتین، حنظل مصطگی سقمونیا

نسخہ حب شبیار

حب شبیار دو رفیق اللیل یہ ہے حب صبر　اس کا وجہ تسمیہ کھانا ہے محقق رات کا
تربد افتیمون و غاریقون ہلیلہ کابلی　عود ہندی اسطوخودوس وایارج فیقرا

نسخہ حب اسکندریہ

حب اسکندر مجرب واسطے مصروع کے　ایلوا اگو گل ہے یک یک ربع جز سقمونیا

باب الدال اس نصیحت اور کلئے سے شروع ہوتا ہے:۔

دودھ مچھلی، سرکہ چاول، اپلے انار اک جا نہ کر　تجربہ اس کے ضرر پر ہے دلیل معتبر
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات　ہے یہی بحر رمل گر شک ہے تو تقطیع کر

نسخہ دبید الورد

دار چینی حب بلسان نک طباشیر و تگر　زعفران قسط و زراوند اذخر و فانت اگر
بالچھڑ تخم کشوث و کاسنی تخم کرفس　سیل فوتہ مصطگی ورد عسل خالص مگر

باب الراء اس نصیحت سے شروع ہوتا ہے:۔

چربی ملاؤ ترشی و شیریں خشک و تر کھانے کھا　کیونکہ ہے تکثیر الوان طبع کو حیرت فزا

دیودار اور روغن دیودار کے لئے لکھتے ہیں:

دیودار اک چوب ہے قسم چیڑ روغن دیودار　ہے یہ پیلا تیل بادی موچ گھٹیا چوٹ کا
راہ کابل میں علی گیلانی اس کا مخترع　فیل خاصے کے جس دم کرا کبر بادشاہ
دیودار وزرد چوب اصل سوس و دار بلد　روغن کنجد و حوا النسر آب شیریں انتہا

باب الصاد کی ابتدا سنئے:۔

پہلے کر نیت مطلب شافی مطلق کی ثنا　دل میں پڑھ آیت سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا

فاعلاتن فعلاتن فعلن　　یاد کرو زن رمل پھر مجھے تقطیع سنا

باب العین کی نصیحت سنئے:۔

جس جگہ پانی سفر ہے اس کے ہیں اتنے مقام　　میوہ، باسی منہ، ریاضت، اول و بعد طعام

اسی باب میں مفردات کی تشریح کے چند شعر سنئے:۔

عود ہے نام اگر لکڑی یہ خوشبو دار ہے　　عود غرقی ہے سیہ، مائل بہ زردی عود خام

لکڑیاں لانبی ہیں عشبہ اور عرعر سرو کوہ　　عوسج اک پھل سرخ قسم بیر ہے عناب نام

عشق پیچاں، عشقہ اور لبلاب ہے مشہور بیل　　عشق از حد درگذشتن در محبت والسلام

غرض اسی طرح حروف ہجا کی ترتیب پر ابواب قائم کر کے طبی اصطلاحات مفرد الفاظ اور مرکب نسخے بیان کئے گئے ہیں۔ جس قدر اس وقت بیان کئے گئے وہ مشتے از نمونہ خروارے کافی ہیں۔

نصاب الطب کا اصل نسخہ، ناظم کتاب کا لکھا ہوا الحمد للہ محفوظ ہے۔ یہ کتاب ۳۶ مرکب نسخوں اور ۱۰۳۱ اشعار پر مشتمل ہے۔ ۱۳۱۷ھ کی تصنیف ہے اور ان دعائیہ اشعار پر اسے ختم کیا گیا ہے

الٰہی انت بالرحم المحقق　　دانی بالخطیات المسلم

فاصلح سوء حالی واعف عنی　　ذنوبی، المؤخر والمقدم

مؤلف کتاب نے اسی طرز پر ایک کتاب "احکام الصلوٰۃ" کے نام سے فقہ میں نظم کی تھی جو بہت مقبول ہوئی۔ ایک بار ہندوستان میں طبع ہوئی اور ایک بار پاکستان میں بھی۔ ابتدائی دور میں کرناٹک وغیرہ کے علاقوں میں داخل درس بھی رہی ہے۔ اس میں نماز کے احکام "نصاب الطب" کی طرح بہت اچھے انداز میں نظم کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس کی ایک مفصل شرح تیار کی۔ جس کا نام "کاشف الروایات" رکھا۔ اس میں احکام الصلوٰۃ میں ذکر کئے ہوئے تمام مسائل سے متعلق روایات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ شرح بھی مؤلف کے قلم سے لکھی ہوئی ہمارے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

جناب محمود فیاض (دہلی)

ٹونک کے کچھ مخطوطات

فرح نامہ جمالی: Ac.No.2268 ابوبکر المطہر بن ابی القاسم بن ابی سعید الجمالی معروف بالیزدی نے یہ کتاب خود ان کے قول کے مطابق دس سال کی عمر میں تصنیف کی تھی۔ یہ کتاب نزہت نامہ کے مقابلہ میں تحریر کی اور فرح نامہ جمالی اس کا نام رکھا۔ اس کتاب میں سولہ مقالات ہیں۔ جن میں آٹھ مقالات کی مختصر فہرست بھی تحریر کی ہے تاکہ پڑھنے والا اس کو آسانی سے پا سکے اور بقیہ آٹھ مقالات فہرست میں درج نہیں کئے ہیں۔ ان میں فلکیات اور تجربیات سے متعلق مضامین ہیں۔ نسخہ قدیم اور نایاب ہے۔ اس کے کاتب محمد بن ابراہیم الہروی نے شعبان ۹۵۵ ہجری میں اس کو مکمل کیا۔

شرح فصول بقراط: Ac.No.2226 حکیم ابو سہل سعید بن عبدالعزیز النیلی نے یہ شرح اس طرح پر لکھی ہے کہ شرح فصول بقراط مصنفہ جالینوس کا اختصار ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کے بیان کردہ نکات بھی آجائیں۔ ۱۱۶۵ھ سنہ کتابت ہے۔

فردوس الحکمۃ:۔ ابوالحسن علی بن ربّن الطبری کی تصنیف ہے۔ طبرستان میں پیدا ہوئے۔ پہلے یہودی تھے بعد میں مسلمان ہوئے۔ خلیفہ متوکل کے ندیموں میں سے تھے۔ اسی کے زمانے میں یہ کتاب تصنیف کی۔ موصوف طب میں محمد بن زکریا رازی کے استاد تھے اور خود اپنے والد کے شاگرد۔ موصوف نے اس کتاب کو سات نوع پر مرتب کیا جس میں تین سو ساٹھ باب ہیں۔ سنہ کتابت تحریر نہیں ہے۔ کاتب کا نام کریم افضل لکھنوی ہے۔

بیاض نسخہ جات متفرقہ: فارسی۔ Ac.No.2246۔ حکیم امام الدین خاں صاحب دہلوی کی بیاض ہے۔ موصوف نواب وزیرالدولہ بہادر والی ٹونک کے معالج خاص تھے۔ اس میں مختلف امراض سے متعلق نسخہ جات درج ہیں۔ اس کے علاوہ کشتہ جات وغیرہ کی تراکیب بھی ہیں۔ سنہ کتابت موجود نہیں ہے۔

تقویم الادویہ: عربی۔ Ac.No.2211 محمد بن علی الطبیب الاسفرائینی اس کے مصنف ہیں۔ اس کتاب میں ادویہ واغذیہ اور مفردہ کا بطور کل بیان کیا گیا ہے جو کہ باب اوّل پر مبنی ہے۔ باب ثانی میں ادویہ مرکب کا ذکر ہے۔ ہر دوا کے خواص، منافع، نقصانات، متبادل و مصلحات کا ذکر ہے۔ موصوف آٹھویں صدی کے عالم تھے۔ ۱۰۹۰ھ کا لکھا نسخہ ہے۔ کاتب کا نام نہیں ہے۔

●●

ڈاکٹر سید وحید اشرف
شعبۂ عربی فارسی اور اردو دانشگاہ مدراس

گورنمنٹ کتبخانۂ مخطوطات مدراس

کے

کچھ اہم مخطوطات علم طب میں

مدراس میں فنِ طب کی طرف باقاعدہ توجہ حکیم احمداللہ خاں کے ذریعہ سے ہوئی جو دلی سے منتقل ہو کر مدراس میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ زمانہ امیر الہند والاجاہ اول (؟) کا زمانہ تھا۔ حکیم احمداللہ خاں یہاں شاہی طبیب کی حیثیت سے تھے۔ اسی زمانہ میں یہاں مغل شہزادہ میرزا علی بخت اظفری قید سلطانی سے فرار ہو کر ۱۲۱۲ھ میں مدراس آگیا تھا۔ وہ خود مختلف علوم و فنون کے ساتھ علم طب میں بھی اچھی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے مدراس میں طبیبوں کا مذاق اڑایا ہے لیکن حکیم احمداللہ کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ ان کے بارے میں وہ لکھتا ہے کہ وہ حکمت اور طبابت میں بے مثل ہیں۔ یہاں کے بعض اور اچھے اطبا کا بھی اس نے ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ دلی اور لکھنؤ کے بھی چند اچھے معاصر اطبا کا ذکر کیا ہے۔

علم طب میں حکیم احمداللہ خاں کی کئی تصانیف ہیں۔ لیکن اُن کے صرف چند رسالے راقم الحروف کی نظر میں آسکے جو گورنمنٹ کتبخانہ مخطوطات مدراس میں محفوظ ہیں۔ کچھ کتابیں مخطوطات کی شکل میں دیوان صاحب باغ مدراس میں ہیں۔

حکیم احمداللہ خاں کی چند تصانیف دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اختصار سے کام لیتے ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور متقدمین کی کتابوں پر اُن کی نظر ہے۔ اس کے ساتھ حذاقت اور ذاتی تجربے نے ان کی تصانیف کو نہایت مفید بنا دیا ہے۔ مندرجہ ذیل رسالے اگرچہ مختصر ہیں لیکن نہایت جامع ہیں۔

(۱) نام مخطوطہ:۔ **شفاء المجدور** تعداد ورق ۲۶، فی صفحہ ۸ سطر، سائز ½" ۵×۹، فی سطر اوسطاً دس الفاظ، خط نستعلیق، خوشخط، کتاب کرم خوردہ ہے لیکن کسی فارسی داں طبیب کی مدد سے اب بھی لائق استفادہ ہے۔ کیٹلاگ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب خاص جسمانی امراض پر ہے لیکن یہ درست نہیں

ہے۔ یہ رسالہ صرف مرض چیچک پر ہے اور یہ نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔
مصنف لکھتا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ طلبا اس موضوع پر دوسری کتابوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ وہ لکھتا ہے:۔

"میگوید فقیر بیچاره امیدوار عفو خداوند بہمہ دان کہ جدری کہ از امراض عامہ کثیر الوقوع بود، اراده نمود کہ احتیاج طالبان از کتب دیگر بر دو رسالہ مالجدری و حصبہ بود، امید از جناب مجیب الدعوت آنکہ نزد ناظرین علم طب مرزوح و مقبول گردد"۔

یہ کتاب چند فصلوں پر مشتمل ہے۔

پہلی فصل علامات و اسباب و اقسام جدری کے بارے میں ہے، دوسری فصل حصبہ کے بارے میں، تیسری فصل جدری اور حصبہ کے علاج کے متعلق ہے۔
چوتھی فصل میں یہ بتایا گیا ہے کہ جدری اور حصبہ میں مریض کے اعضاء مثل آنکھ، حلق، قلب، امعاء کو کس طرح سے ضرر سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔
پانچویں فصل در قلع آثار جدری یعنی چیچک کے داغ کے علاج میں ہے۔ مصنف کہتا ہے کہ چیچک کا داغ مرض سے شفایاب ہونے کے بعد ایک سال تک علاج پذیر ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد قابل علاج نہیں۔
مصنف نے چیچک سے بچنے کے لئے جو طریقہ بتایا ہے وہ بالکل وہی ہے جو موجودہ دور میں چیچک کے ٹیکے کی شکل میں ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ اپنے علمی خزانوں کی طرف توجہ نہ دینے کے سبب ہم اس کے فائدوں سے کس قدر بے بہرہ رہ گئے اور یورپ والوں نے ان سے کتنا فائدہ اٹھایا ورنہ کم از کم چیچک کی ہلاکت سے بہت پہلے لوگوں کو بچایا جا سکتا تھا۔ مصنف لکھتا ہے کہ ٹیکہ کا طریقہ حفظ ما تقدم کے لیے حتمی ہے اور عقل سلیم اس کا انکار نہیں کر سکتی۔ یہاں مصنف کے الفاظ نقل کیے جاتے ہیں۔
"فاضل گیلانی در شرح قانون فرموده کہ اہل رستاق را برای جدری معالجات مجربہ است کہ قبول و انکار او از صنیعہ ارباب عقول سلیمہ نباشد مثل آنکہ چون جدری بعضی یا حصبہ ظاہر شود در پر از یا بستر گردند، ذات ای از دانہ ہای او نیشگافتند، مائیت او در ایر باطن طفل صحیح دیگر کہ جدری باو بروز نکرده قریب رسیخ می مالند و در آنجا چند سوزن بخلانند تا کہ آن مائیت بر طوبات باطنی جلد او مختلط شود پس بعد ساعات قلیل بر وحمی ظاہر میگردد و از جدری علۃ قلیلی در آن موضع دیر سایہ بدن بروز میکند و بی غائلہ صحت می یابد"۔

مصنف نے ایک تدبیر اور لکھی ہے، جو یہ ہے:-

"واز آن جملہ آنست کہ بگیرند بعضے دانۂ بعد از زیر سانیدن آبلہ طفل مجدور و در پارچہ کہنہ بستہ بر گردن طفل صحیح کہ ہنوز جدری نہ برآوردہ می آویزند پس او تپ می کند، تپ خفیف و موافق عدد دانہ ہای بر گردن ہای جدری سلیم بر می آید و در ایام قلیل صحت می یابد۔"

مذکورہ بالا دونوں طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے نظریہ کے مطابق ٹیکہ کا طریقہ دیہاتوں میں زیادہ مفید ہے۔ دوسرے یہ کہ ٹیکہ اسکو لگانا چاہیے جس کو چیچک نہ نکلی ہو، یعنی جس کو ایک بار چیچک نکل چکی ہو وہ پھر چیچک کے خطرہ سے باہر ہو جاتا ہے۔ تیسرے گردن میں چاول لٹکانے سے چیچک کے دانے چاول کے مطابق ہوں گے۔ لیکن ان باتوں کی تصدیق اور ان میں مزید اصلاح تجربہ سے کی جا سکتی تھی اور پہلے نظریہ پر عمل کر کے آج چیچک پر قابو پا لیا گیا ہے۔

مصنف نے چیچک کی مختلف علامات اور ان کے علاج کے جو طریقے بتائے ہیں، وہ آج بھی بہت مفید ہو سکتے ہیں کیوں کہ اگرچہ چیچک کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے لیکن خسرہ اور اس کی دوسری شکلیں پائی جاتی ہیں اور یونانی طریقہ علاج ان کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔

(۲) نام کتاب:- تحقیق البحران

مصنف حکیم احمد اللہ خاں - تعداد صفحات ۴۲، فی صفحہ ۱۳ سطر۔

سبب تالیف یہ بتایا ہے کہ بحران کو طب میں نہایت درجہ اہمیت حاصل ہے اور اس موضوع پر مصنف کی نظر سے سوائے قدوۃ المتاخرین حکیم محمد ارزانی کی کتاب نظر سے نہیں گذری تھی اس لیے اس موضوع پر شرح و بسط کے ساتھ یہ رسالہ ترتیب دیا اور نواب محمد علی خاں امیر الامراء والاجاہ کے نام معنون کیا۔

(۳) نام کتاب رسالہ فی تحقیق النبض، مصنف حکیم احمد اللہ خاں

یہ رسالہ عربی زبان میں ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نبض پر ہے۔ اپنے موضوع پر نہایت جامع رسالہ ہے۔

(۴) نسخہ جات

تاریخ کتابت ۱۲۳۲ھ، صفحات ۱۶۴، سائز ۷"×۱۱"، فی صفحہ ۱۹ سطر

کتاب کا اصل نام نہیں لکھا ہے۔ ورق ۳ پر از طفیل زمانی کے تحت لکھا ہے کہ "تالیف حقیر کہ مسمیٰ

باسم والد خود ساختہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف مشہور حکیم زمانی کے فرزند ہیں۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ بہت سے اطبا کے مجربات اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں۔

حکیم میر محمد ہادی، حکیم فضل علی، حکیم نواب علوی خان، حکیم عماد الدین محمود، حکیم نواب معتمد الملک حکیم میر محمد ہادی پدر محمد ہاشم، حکیم کمال الدین حسین شیرازی، حکیم میر محمد ہاشم مصنف جامع الجوامع، حکیم [illegible]

(۵) **ریاض الطب**، مصنف محمد رضا الطبیب، تاریخ تصنیف ۱۰۹۶ھ (۱۶۸۰ء) تاریخ کتابت ۱۱۹۲ھ، صفحات ۱۵۰، فی صفحہ ۱۵ سطر۔

مصنف ابتدا میں لکھتا ہے کہ میں نے انھیں نسخہ جات کا ذکر کیا ہے جنکو تجربہ کے بعد نافع پایا ہے۔ اس میں سر سے پاؤں تک سبھی بیماریوں کا علاج بتایا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مصنف کے آخر عمر کی تالیف ہو سکتی ہے۔

(۶) **زبدۃ قوانین العلاج** مصنف محمد بن علاء الدین بن ہبۃ اللہ سبزواری صفحات ۱۹۰، فی صفحہ ۱۲ سطر ہے خط نستعلیق۔

یہ کتاب ۱۰۷۸ھ میں لکھی گئی۔ پیش نظر نسخہ ۱۱۰۱ فصلی میں مکمل ہوا۔ کتاب امراض و علاج پر ہے۔ ۱۴۰ ابواب پر مشتمل ہے۔

(۷) **تشخیص الامراض** مصنف لاری الموسوی، صفحات ۲۷۰، فی صفحہ ۱۷ سطر خط نستعلیق۔ اس میں بعض امراض کے اسباب و علاج بتائے گئے ہیں۔

(۸) **کتاب الطب** مصنف یونس بیگ، صفحات ۱۰۸، فی صفحہ ۱۷ سطر خط نستعلیق

مصنف کی تحریر کے مطابق ایسا معلوم پڑتا ہے کہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ (۱) تشریح الاعضا مصور (۲) امراض و علاج (۳) آلات جراحی و طبابت۔ لیکن تیسرا حصہ اس مسودہ میں نہیں ہے۔ آخر کے صفحات بیاض ہیں۔

مصنف کے دعوے کے مطابق یہ تنہا کتاب ایسی ہے جس میں عبرانی، کلدانی اور لیٹن سے زبر کیا گیا ہے اور متقدمین میں سے کسی نے بھی ان زبانوں کے آخذ سے فائدہ نہیں اٹھایا ہے۔

(۹) جامع الفوائد:

مصنف یوشع بن طبیب، صفحات ۱۵۸، فی صفحہ ۱۲ سطر، خط شکستہ۔

یہ کتاب امراض و علاج میں ہے۔ مصنف خوش گو شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ہر مرض کے علاج کے لئے پہلے جو نسخہ تجویز کرتا ہے اس کو رباعی یا قطعہ میں لکھتا ہے۔ پھر اُسے نثر میں بھی بیان کرتا ہے۔ غالباً مقصد یہ ہوگا کہ اس کے نسخے زبان زد ہو جائیں۔ رباعیاں صاف اور رواں ہیں۔

(۱۰) خلاصۃ التجربات:

صفحات ۱۸۲، فی صفحہ ۱۰ سطر، خط نستعلیق

اس میں وہ نسخے دیئے گئے ہیں جو اطباء کے تجربات سے رہے ہیں اور سارے نسخے مرکبات ہیں۔

(۱۱) زبدہ منظومہ:

صفحات ۴۸، فی صفحہ ۱۵ سطر، خط نستعلیق

یہ کتاب خواجہ محمد پارسا کے مزار کے جوار میں لکھی گئی۔ تاریخ کتابت یکشنبہ صفر ۷۷۰ھ پایان کتاب یہ ترقیمہ ہے:

ہر کہ خواند دعا طمع دارم   زانکہ من بندۂ گنہگارم

کتبہ العبد ناصر محمد بن خواجہ محمود دیلران الھروی۔

گمان ہوتا ہے کہ ناصر محمد ہی اس کا مصنف ہے[1]

یہ رسالہ بالخصوص آنکھ کی بناوٹ، حفاظت اور اس کی بیماریوں کے علاج میں ہے۔ کتاب منظوم ہے۔ مصنف نے کتاب کا مقصد یہ بیان کیا ہے تاکہ لوگ بالعموم اپنی آنکھوں کی حفاظت کر سکیں اور اگر آنکھوں میں کوئی مرض لاحق ہو جائے اور فوری طور پر کوئی معالج دستیاب نہ ہو سکے تو ان دواؤں اور تدبیروں کو کام میں لائیں۔

منظوم لکھنے کا سبب یہ ہے کہ تاکہ لوگوں کو آسانی سے تدبیر و علاج زبان زد ہو سکے۔ اس میں بعض ان امراض کے علاج بھی درج ہیں جن کے سبب آنکھوں کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ آخر میں یہ بھی بتایا

---

[1] فہرست مخطوطات مدراس لائبریری میں اس کے مصنف کا نام شاہ علی بن سلیمان الکحال لکھا ہے۔

گرمی حالات میں آنکھ کے علاج میں توقف کرنا چاہیئے۔

(۱۲) جامع الاشیاء

مصنف نور محمد خراسانی و حکیم باقر حسین، صفحات ۲۰۸، فی صفحہ ۱۹ سطر

ملک ہند میں انگریزوں کو یہاں کے پھلوں، پھولوں، جانوروں وغیرہ کے جاننے کی خواہش ہوئی تو انگریزوں نے نواب غلام غوث خاں سے ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ نواب والاجاہ کے معتمد عظیم نواب معتمد خاں بہادر نے اس کام پر رضا صاحب المخاطب بحکیم باقر حسین خاں بہادر کے سپرد یہ کام کیا انھوں نے کتاب لکھ دی مگر مرتب شکل میں نہ تھی۔ مواد بے ترتیب تھے۔ اس درمیان ہی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد یہ کام نور محمد خراسانی کے سپرد ہوا۔ انھوں نے اس کی ترتیب و تکمیل کی کہیں کہیں کتاب میں حکیم باقر حسین نے سرخی لگا دی۔ پھلوں اور جانوروں کے طبی خواص بھی بیان کئے ہیں۔ مثلاً چوہے کے شکم کو چاک کرکے گرم گرم مار گزیدہ یا کژدم گزیدہ کے عضو گزیدہ پر لگا دیا جائے تو زہر کھینچ لیتا ہے۔

(۱۳) طب سراجی: مصنف حکیم کمال الدین

صفحات ۴۲، فی صفحہ ۱۲ سطر، بہت کرم خوردہ ہے

۱۱۷۷ھ میں نواب انور الدین خاں کی خدمت میں لکھ کر یہ رسالہ پیش کیا گیا۔ یہ مختصر رسالہ عام بیماریوں کے علاج پر مشتمل ہے۔ اکثر ایک مرض کا ایک ہی علاج علامت کے مطابق بتایا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مصنف نے وہی علاج بتایا ہوگا جو اس کے نزدیک سب سے زیادہ مؤثر تھا یا یہ کہ بے ضرر ہوگا۔

(۱۴) تحفۂ خانی:

مصنف محمود بن محمد عبد اللہ بن عبید اللہ بن محمود، صفحات ۲۴۴، فی صفحہ ۲۳ سطر، خط نسخ۔

مصنف ۹۰۲ھ میں شیراز گیا جہاں جلال الدین دوانی سے کلام، حکمت اور حدیث پڑھی اور مولانا عماد الدین محمود سے طب سیکھی، خصوصاً ان کتابوں کا نام لیا ہے جو انھوں نے استاد سے پڑھیں:۔

کلیات قانون، شرح موجز مولانا نفیس، ایضاح، مجرب السلاح طاہر محمود سجزی، تشریح جالینوس۔

اس کتاب کو ابو الغازی سلطان سعید بہادر خاں کے نام سے معنون کیا ہے۔

(۱۵) طب فریدی: صفحات ۳۲۳، فی صفحہ ۱۵ سطر، خط نستعلیق

سرورق پر تاج الامراء نواب محمد علی والاجاہ کی مہر ہے۔ سرورق ہی پر کسی نے کتاب کا نام طب فریدی لکھدیا ہے۔ ممکن ہے کتاب کے اندر کہیں یہ نام ہو۔

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مرض کا علاج مفردات سے کیا گیا ہے اور ایک ہی مفرد دوا کا اندرونی اور خارجی استعمال بتایا ہے۔

(۱۶) مختصر الطب:

صفحات ۱۸۸، فی صفحہ ۱۵ سطر، خط نسخ، نام کاتب احمد بن ابی بکر محمد الکاتب اس کی کتابت ۸۸۲ھ میں ہوئی۔ اس میں صحت کے اصولوں، بیماریوں کے اسباب اور علاج پر بحث ہے۔

جناب رئیس نعمانی ــ لکھنؤ

کتب خانہ شبلی نعمانی دار العلوم ندوۃ العلماء کے طبّی مخطوطات

کتب خانہ شبلی نعمانی میں مختلف علوم سے متعلق مختلف زبانوں کی موجودہ کتابوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہے، جن میں پونے چار ہزار خطی نسخوں کا گرانقدر ذخیرہ بھی شامل ہے۔ موجودہ مخطوطات کی زبان وار تقسیم اس طرح ہے: عربی مخطوطات ۲۰۰۶، فارسی مخطوطات ۱۵۱۷، اردو مخطوطات ۲۲۶ (کل تعداد ۳۷۴۹)۔

فارسی مخطوطات

مکررات کو حذف کرنے کے بعد فارسی زبان میں موجودہ مخطوطات طبیہ کی تعداد ۴۴ ہے جن کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: اول، ان کتابوں کے خطی نسخے جو طبع ہو چکی ہیں ان کی تعداد ۱۵ ہے۔ یہاں ان میں سے چند کا ذکر کرنا اس لئے ضروری ہے کہ مطبوعہ ہونے کے باوجود کمیاب ہیں۔ اس صورت میں اگر کوئی طبی ادارہ یا اسکالر ان میں سے کسی کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا چاہے تو اس کو معلوم رہے کہ اس کا نسخہ کتب خانہ شبلی میں بھی موجود ہے اور بہر حال اس کا قوی امکان ہے کہ وہ نسخہ تمام مطبوعہ اور خطی نسخوں سے زیادہ صحیح ہو۔ ایسی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ اختیارات بدیعی از علی بن حسین انصاری معروف بہ زین العطار متوفی ۸۰۶ھ، مکتوبہ ۱۰۹۷ھ

۲۔ اختیارات قاسمی (طب قاسمی = طب فرشتہ) از محمد قاسم استرآبادی ثم ہندوستانی معروف بہ فرشتہ متوفی بعد ۱۰۱۵ھ، مکتوبہ ۱۰۷۹ھ

دوسری قسم میں وہ خطی نسخے شامل ہیں جو راقم کی معلومات موجودہ کی حد تک ہنوز کہیں طبع نہیں ہوئی ہیں، ان کی کل تعداد ۲۹ ہے۔ ان کے تین گروپ بنائے جا سکتے ہیں:

(الف) مجہول المؤلف اور غیر موسوم بیاضیں اور رسائل:

۳۔ سفینۂ طب ۔ ۴۴ اوراق مختلف سطور، نستعلیق خوش خط، قبل ۱۲۲۰ھ۔ بگمان غالب اہم نسخہ

پر کسی باذوق شخص نے یہ عنوان مطلقاً بیاض کے معنی میں لکھ دیا ہے۔ یہ بیاض عبدالغفور شرر اندروی کے زیر استعمال رہی ہے۔ شرر کے ۱۳۲۰ھ کے دستخط اس پر موجود ہیں۔ عام طبی کتابوں کی ترتیب سے نسخے درج ہیں، لیکن زیادہ تر نسخے امراض باہ سے متعلق ہیں۔

ابتدا:۔ "الله۔ باب اول در صداع و شقیقہ و ....." انتہا:۔ " .... نسخہ حب الشفاء.... بقدر مزاج بخورند"۔

۳۔۱۷ تجربات عمدۃ العصر۔ ۲ اوراق، مختلف سطور، معمولی نستعلیق خط کسی عمدۃ العصر کی دو ورق کی بیاض ہے۔

ابتدا:۔ "بنا بر بواسیر مجرب است ...." انتہا:۔ " .... بیار د خراطین .... آزمودہ است"

۳۔۱۸ رسالہ .... ۔ ۱۰۷ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق خط قبل ۱۲۹۲ھ۔ شروع میں بغیر کسی عنوان کے امراض سر کے نسخے ہیں، پھر ۴ فصلوں میں امراض چشم و گوش و دہان و بینی کا علاج درج ہے۔ آخری (پانچویں) فصل کا عنوان ہے "در امراض سینہ تا بزانو" مولف نے خود کو مولوی امیر علی کا شاگرد لکھا ہے۔ کتاب میں مولوی امیر علی کے علاوہ ۱۵ دوسرے علماء و اطباء کے نام بھی ملتے ہیں جن کی بیاضوں سے یہ نسخے ماخوذ ہیں۔ ان میں مولوی احمد جونپوری، سلامت علی خان جونپوری، تراب علی وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ رسالہ آخر سے ناقص ہے۔

ابتدا:۔ "برای دفع درد سر و تپ و نزلہ و ...." انتہا:۔ " .... ایضاً پوست خشخاش ...."

۴۔۱۹ رسالہ .... ۔ ۸۹ اوراق، ۱۱ تا ۱۵ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط، عام طبی کتابوں کی ترتیب کے مطابق ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں کاتب نے لکھا ہے "تمام شد نسخہ شفائی خانصاحب" لیکن حکیم مظفر بن محمد شفائی اور حکیم فضل علی شفائی کے جو کتب و رسائل میری دسترس میں تھے اس کے ابواب و عبارات ان سے نہیں ملتے۔ (ممکن ہے حکیم شفائی شاہجہاں پوری ثم حیدر آبادی متوفی ۱۲۵۷ھ کا کوئی رسالہ ہو)

ابتدا:۔ "باب اول در امراض سر و دماغ و ...." انتہا:۔ " .... حصبہ و جدری .... و علاج اقسام دیگر در کتب مبسوط است"

۵۔۲۰ رسالہ .... ۔ ۱۷ اوراق، ۱۸ سطور، نستعلیق طفلانہ ۱۲۴۴ھ۔ ۱۲ فصلوں پر مشتمل ہے۔ ۹ فصلیں عام طبی کتابوں کی ترتیب کے مطابق، باقی تین فصلوں میں جراحات، دفع زہر، اور متفرق دواؤں کا بیان ہے۔

ابتدا :- "فصل در امراض راس یعنی درد سر و سرسام و..." انتہا :- "..... برای قوت باہ و ..... از سلطان سکندر راست"

۲۱-۶ رسالہ ..... ۵۷ اوراق، ۲۰ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔ طبی کتب کی عام ترتیب کے مطابق ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر میں متفرق نسخے ہیں۔

ابتدا :- "باب اول در امراض راس: صداع حار گل بنفشہ ..." انتہا :- "... صندل صاف ..... باریک نمودہ غازہ سازند"

۲۲-۷ رسالہ ..... ۷ اوراق، ۱۱ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔ کسی کتاب یا رسالے کا اول و آخر سے ناقص صرف درمیانی حصہ ہے۔

ابتدا :- "..... نوع دیگر برای عنین نوشتہ شد فی الحال تماشہ بیند ..."

انتہا :- "..... کہ از کار رفتہ باشد ..... از ترشی و بادی پرہیز کند ..."

۲۳-۸ مطب ..... ۱۴۸ اوراق، مختلف سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔ ابواب و فصول کی سرخیوں کے بغیر ورق ۱۰۵ تک عام طبی کتابوں کی ترتیب ہے، اس کے بعد غیر مرتب، مختلف امراض کے نسخے درج ہیں۔ آخر سے ناقص ہے۔

ابتدا :- "صداع حار سازج کہ از گرمی آفتاب و ... پیدا شود ..." انتہا :- "..... امراض دماغی بلغمی، منبغج دھند ..."

۲۴-۹ نسخہ ہای متفرقہ ۲۱ اوراق، مختلف سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔

ابتدا :- "نسخہ معجون دافع بلغم و رطوب ..." انتہا :- "..... بر زیستن اینقدر نیاید مردالت"

۲۵-۱۰ یادداشتہای پراگندہ ۳ اوراق، مختلف سطور، معمولی نستعلیق خط۔

ابتدا :- "ترکیب قایم کردن سیماب ..." انتہا :- "..... نسخہ برای جربات ..... از ترشی و بادی پرہیز نماید"

(ب) معروف اطبا کی بیاضیں اور معمولات مطب

۲۶-۱ انتخاب بیاض عبدالحی - ۲۳ اوراق، ۱۷ تا ۲۰ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط قلمی ۱۲۲۱ھ انتخاب کرنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا، سرورق پر "انتخاب از بیاض حکیم عبدالحی مدظلہ" لکھا ہے۔ حکیم

عبدالحی ۱۳۴۱ھ تک بقید حیات تھے۔

ابتدا :- "صداع حار : پوست بار تمر ہندی ....." انتہا :- "..... غراب گندھک آمیختہ چورن سازند"

۲۷-۲ بیاض عبدالحی - ۱۳۲ اوراق، مختلف سطور، نستعلیق و شکستہ آمیز خط قبل ۱۳۴۱ھ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی متوفی ۱۳۴۱ھ کی خود مولف کی دست نویس بیاض ہے اس کی غیر منظم ترتیب میں مجربات حکیم قدرت اللہ و امیر اللہ، رسالہ عطری خان، بیاض نواب صدیق حسن خان قنوجی اور بالخصوص حکیم محمد اعظم خان رامپوری متوفی ۱۳۲۰ھ کی کتاب محیط اعظم سے مدد لی گئی ہے۔ حکیم عبدالحی کے اپنے بعض مجربات بھی شامل ہیں :

ابتدا :- "انتخاب از تجربات حکیم قدرت اللہ و امیر اللہ ....." انتہا :- "..... در امراض ..... این ہمہ اندر یہ اسہال میکنند"

۲۸-۳ بیاض مجربات - ۵۵ اوراق ۱۷، اسطور، نستعلیق خوش خط۔ یہ اصلاً حکیم مولوی امجد علی (کاکوروی متوفی ۱۳۳۳ھ؟) کی بیاض ہے جس میں انھوں نے اپنے اساتذہ اور دیگر اطباء کے مجربات جمع کئے تھے۔ یہ بیاض غیر مرتب تھی، بعد میں حکیم امجد علی کے ایک عزیز شاگرد حکیم چودھری قیام الدین نے استاد کے حکم سے اس کو مرتب کیا۔ موجودہ نسخہ آخر سے ناقص ہے اور امراض الرأس سے امراض مثانہ تک پر مشتمل ہے۔

ابتدا :- "الحمد لولیہ والصلوۃ علی نبیہ ..... اما بعد بندۂ مسکین ..... بگویم کہ ....."

انتہا :- "برای تحریم قضیب ..... حبوب بقدر کنار دشتی ....."

۲۹-۴ مطب حکیم حیدر حسین - ۲۲۶ اوراق، ۱۴ تا ۱۸ اسطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔ حکیم حیدر حسین نقوی رائے بریلوی متوفی ۱۲۵۷ھ کے معمولات مطب کا غیر مرتب مجموعہ ہے۔ آخر کے ۵ اوراق میں کسی دوسرے طبیب کے متفرق نسخے درج ہیں۔

ابتدا :- "معجون برای کثرت احتلام و سوء مزاج حار ....." انتہا :- "..... معجون سنگدانہ ..... مقدار شربت ۹ ماشہ"

۳۰-۵ مطب حکیم محمود خان - ۱۰۰ اوراق، ۱۷ تا ۲۰ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط۔ مسیح الملک

حکیم اجمل خاں کے والد حکیم محمود خاں بن حکیم محمد شریف دہلوی جو خود بھی معروف طبیب تھے، ان کے معمولات مطب کا آخر سے ناقص مجموعہ ہے۔ غالباً اصل بیاض کے چند ابتدائی اوراق ہیں۔

ابتدا :- "۱- برای نزلہ حار و درد سرد...." انتہا :- "..... ۱۲۶- روغن برای فالج و قسط، فلفل...."

۳۱-۷ معمولات حکیم یعقوب - ۹ اوراق، ۱۸-۱۹ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط - حکیم محمد یعقوب کشمیری ثم لکھنوی متوفی ۱۲۸۹ھ کے معمولات مطب کا مختصر سا مجموعہ ہے۔ حکیم یعقوب صاحب جوائی اور لکھنؤ کے معروف طبیب تھے اور تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے اکثر اطبائے لکھنؤ کے استاد تھے

ابتدا :- "روغن برای دمازی مو و...." انتہا :- "... جب سل .... در یہی دار لدو"

(ج) مرتب و منضبط تالیفات :

۳۲-۱ تحفۃ الاطبا (فن چہارم) ۱۷۰ اوراق، ۱۷ سطور، معمولی نستعلیق خط ۱۱۹۱ھ - یہ شیخ احمد تنوجی متوفی بعد ۱۱۲۸ھ کی ضخیم منظوم طبی تالیف تحفۃ الاطبا کا صرف ربع چہارم ہے، اس میں ۷ باب ہیں:
۱- ذکر اجناس حمیات ۲- در اورام و بثور ۳- در امراضی کہ بر ظاہر جلد و سایر اعضاء پدید آید ۴- در آنچہ تعلق بہ زینت دارد ۵- فی علل الاظافیر ۶- در کسر و خلع -

ابتدا :- "فن رابع در امراضی کہ مخصوص بعضو دون عضو یا عضو" فن رابع ز چار فن کتاب متضمن بود بچند ابواب

انتہا :- "..... آمد اندر دلم ز غیب سرور
سخ کردم ز نظم شافی دور"

۳۳-۲ ترجمۂ رسالۂ ابن سینا - ۴۹ اوراق، ۱۵ سطور، نستعلیق خوشخط ۱۱۹۹ھ - یہ شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن عبداللہ ابن سینا متوفی ۴۲۸ھ کے عربی رسالے "دفع المضار الکلیۃ عن الابدان الانسانیۃ" کا فارسی ترجمہ ہے مترجم مجہول ہے اور یہ ترجمہ شیخ حسین انصاری کے معلوم ترجمے سے الگ اور اس سے بہتر ہے۔ رسالے کا موضوع آب و ہوا، ماکولات و مشروبات، حرکت و سکون، احتباس و استفراغ وغیرہ کے مضر اثرات سے بچنے کی تدابیر ہے -

ابتدا :- "افتتاح سخن سزاوار بنام حکیمی است کہ...." انتہا :- "..... واللہ عاقبۃ الامور وصلی اللہ علی ..... اجمعین"

٣٤-٣ خلاصۃ الطب - ٦٧ اوراق ١٤-١٥ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط ١٢٢٠ھ۔ حکیم احمد اللہ کرتپوری ثم دہلوی ثم لکھنوی متوفی بعد ١١٧٧ھ کی تالیف ہے۔ دو بابوں اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔ پہلا باب اسباب ستۂ ضروریہ سے متعلق ٧ فصلوں میں منقسم ہے دوسرا باب "حفظ صحت اعضای رئیسہ از سرتاپا" سے تعلق رکھتا ہے اس میں ١٦ فصلیں ہیں ضمیمہ اناج، روئی، پھل اور گوشت کی مختلف قسموں اور معالجات کے بیان میں ہے جو ٧ فصلوں پر مشتمل ہے۔

ابتدا:- "حمد نامتناہی و مدح کما ہی مر احدی را ست کہ از بحث احدیت متجلی گشتہ ..."

انتہا:- "..... نمک اقسام است ..... و چسپیدگی بلغم بزداید و دہن را صاف نماید"

٣٥-٤ شفاء الصبیان - ٥٩ اوراق، ١٤-١٧ سطور، معمولی نستعلیق خط ١٢٦٨ھ۔ حکیم محمد اکبر ارزانی متوفی ١١٣٠ھ کی تالیف ہے۔ کتاب دو مقالوں پر مشتمل ہے۔ پہلے مقالے میں ٦ فصلیں ہیں جن کا موضوع تدبیر حمل سے ایام شیر خوارگی تک ہے۔ دوسرے مقالے میں ٥٤ فصلیں ہیں اور ان کا موضوع "امراض اطفال و علامات و معالجات آن" ہے۔

ابتدا:- "این رسالہ از بیماری طفلان مرتب گشت ..." انتہا:- "..... و بقولی پرہیز شش ماہ از .... کہ مبادا ... شکم عارض شود"۔

٣٦-٥ صحۃ الانسان - ١٨ اوراق، ٢٠-٢١ سطور، معمولی نستعلیق خط۔ کسی انگریزی رسالے کا فارسی ترجمہ ہے جو انگریزی نہ جاننے والے عیسائی لڑکوں کی تعلیم کی غرض سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مؤلف اور مترجم دونوں کا احوال اور اصل رسالے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ یہ رسالہ ١٩ فصلوں پر مشتمل ہے جن میں مختلف قسم کے ورموں اور زخموں کے علاج بیان کئے گئے ہیں۔

ابتدا:- "الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ علی خیر المنجبین ..." انتہا:- "..... و از صفراو... اکثر زیادہ حدت میکند، واللہ اعلم بالصواب"

٣٧-٦ طب صدیقی - ٦٧ اوراق، ١١ تا ١٤ سطور، معمولی نستعلیق خط ١١٨٣ھ۔ حکیم ابوبکر صدیقی ناگوری متوفی بعد ١٠٢٤ھ کی منظوم تالیف ہے۔ کتاب ١٩ عنوانات پر مشتمل ہے۔ دیباچے کے بعد نعت رسول ص اور منقبت خلفائے راشدین رض ہے، اس کے بعد امراض کی مہینوں سے نسبت کا ذکر ہے، پھر عام کتابوں کی ترتیب پر امراض و معالجات نظم کئے گئے ہیں، آخر میں امراض اطفال کا ذکر ہے۔ معالجات سب

کے سب ویدک طب سے ماخوذ ہیں۔

ابتدا :- "کشایم زبان را بحمد حکیم
کہ او ہست خلاق عرش عظیم
......"

انتہا :- "...... دہد یک مثقول با بش اگر
زود بہ نماند بہ تن او اثر"

۷-۳۸ طب مصطفوی (مقالہ چہارم) ۱۰۶ اوراق، ۱۹ سطور، معمولی نستعلیق خط۔ حکیم غلام مصطفی متوفی ...... کی تالیف ہے۔ یہ اس کتاب کا مقالۂ چہارم ہے جس کو مؤلف نے ۲۸ کتابوں پر تقسیم کیا ہے، پھر ہر کتاب میں ابواب کی تقسیم ہے۔ پہلی کتاب امراض سر کے بیان میں ہے، اس میں ۲۰ ابواب ہیں۔ دوسری کتاب امراض چشم سے متعلق ہے اور اس میں ۱۳ باب ہیں۔ زیر نظر نسخہ صرف اسی کتاب دوم کے باب سوم کے آغاز تک ہے۔ تمام ابواب میں مزید ذیلی تقسیم فصل کے عنوان سے کی گئی ہے۔ زبان مؤلف کے ہندوستانی ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

ابتدا :- "المقالۃ الرابعۃ من طب مصطفوی فی المعالجات و در این مقالہ ہشت کتاب اند۔"

انتہا :- "...... باب سوم (از کتاب دوم) در امراض طبقہ نحیفہ لطیفہ عینیہ کہ ......"

۸-۳۹ قرابادین اسلمی - مولانا حکیم عبدالحی حسنی کے دادا کے چچازاد بھائی حکیم سید محمد اسلم حسنی نصیر آبادی متوفی ۱۲۷۶ھ کی تالیف ہے۔ آخر سے ناقص ہے۔

ابتدا :- "(آسو) پوست نیل پوست کنار صحرائی ......" انتہا :- "...... حرف الشین ...... (شربت) کیوڑہ ...... موافق ترتیب شربت سازند ......"

۹-۴۰ طب کیمیا و کیمیای با سلیقا - یہ دو رسالوں کے ترجمے کا مجموعہ ہے جو عام طور پر کیمیای باسلیقا کے نام سے فہرستوں میں درج ہے۔ یہ دونوں رسالے کسی دوسری زبان سے پہلے عربی میں ترجمہ ہوئے تھے، پھر فارسی میں ترجمہ کئے گئے۔ پہلے رسالے کا مؤلف براکلسوس ہے اور دوسرے کا غرولیوس ہے۔ مترجم کا نام زین العابدین طباطبائی ہے جو مشہد سے ہجرت کرکے ہندوستان آگیا تھا اور ۱۱۸۸ھ کے بعد وفات پائی۔ یہ فارسی ترجمہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ پہلے جزو میں ایک مقدمہ اور چار مقالے ہیں جن میں امور طبیعیہ سے بحث کی گئی ہے، دوسرے جزو میں معالجات جزئیہ و کلیہ بیان ہوتے ہیں، تیسرا جزو جو مترجم نے ذخیرہ اسکندری سے اقتباس کرکے اضافہ کیا ہے اکاسیر و تریاقات وغیرہ کے متعلق ہے۔

ابتدا :- "سپاس وستائش بیرون از حد فہم وحواس ..... مرآفریدگار مبدع ..... رواست..."

انتہا :- "..... وایں است آخر کتاب ..... کہ در اواسط ۱۱۸۸ باتمام رسانید"

۱۰-۴۱ گنج باد آورد صاحب قرانی - ۱۳۷ اوراق، ۱۰ تا ۲۰ سطور، نستعلیق شکستہ آمیز خط نواب امان اللہ خان حسینی کابلی ثم ہندوستانی ملقب بہ خانزمان فیروز جنگ، متخلص بہ امانی متوفی ۱۰۴۶ھ کی گرانقدر تالیف ہے۔ اس کی ترتیب میں مولف نے چند دیگر کتابوں کے علاوہ پانچویں صدی ہجری سے دسویں صدی ہجری تک طب کے موضوع پر فارسی اور عربی میں لکھی جانے والی ان تمام کتابوں سے استفادہ کیا ہے جو سلطنت مغلیہ کے کتب خانے میں موجود تھیں ماخذ کی مجموعی تعداد ۱۰۹ ہے۔ مؤلف نے جملہ طبی علوم کا استقصا کرنے اور متقدمین کی دستیاب کتابوں کے تمام مطالب کو ملخصاً یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے قریب ۲۰۰ عنوانات کی فہرست کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ علوم طبیہ اور بالخصوص علم الادویہ کے باب میں یہ کتاب ایک انسائکلو پیڈیا کا درجہ رکھتی ہے۔ پیش نظر نسخہ اس کا صرف ابتدائی حصہ ہے اور اس میں بھی کئی جگہ درمیان سے اوراق غائب ہیں۔ مکمل کتاب میں ۵۰۰ سے کم اوراق نہیں رہے ہوں گے۔

ابتدا :- "گنج باد آورد حکمت ترکیب ہیولائی انسانی است کہ نقد روای او نفس روان است..."

انتہا :- "..... ایضاً از حکیم شرف الدین شیرازی قرص جہت استسقای طبعی و لحمی ....."

۱۱-۴۲ مفتاح الخزائن (رسالہ سوم) ۳۰ اوراق، ۲۱ سطور، معمولی نستعلیق خط ۱۱۳۸ھ - علی بن حسین انصاری شیرازی معروف بہ زین العطار متوفی ۸۰۱ھ کی تالیف ہے۔ موجودہ رسالے کا موضوع اور ترتیب تقریباً وہی ہے جو اسی مؤلف کی دوسری کتاب "اختیارات بدیعی" کے مقالہ دوم کی ہے۔

ابتدا :- "الحمد للہ رب العالمین ..... بدانکہ این رسالہ سوم است از مفتاح الخزائن ....."

انتہا :- "..... و در معرجارقشیشا و اقلیمیا باشد، مغسول باید، خواہ دارو چشم باشد خواہ مرہم"

۱۲-۴۳ منتخب الاطبا - ۱۴۰ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق خط قبل ۱۳۴۰ھ - خیر اللہ الہ آبادی متوفی ۱۸۵۰ھ کی تالیف ہے۔ پوری کتاب ۲۹ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب در شناختن نبض، دوسرا در شناختن قارورہ، تیسرا در علامات تپ و لرزہ، اس کے بعد مختلف اعضا کے امراض اور ان کے علاج کا ذکر ہے۔ آخری باب جانوروں کے علاج پر ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے۔ پہلا ورق بھی غائب ہے۔

ابتدا :- "بنا بر آنکہ بست و نہ باب ترتیب دادہ بہ منتخب الاطبا موسوم ساختم ....."

انتہا: "..... پیاز و ہلیلۂ سندھی وانگوزہ ونمک سیاہ ...."

١٢-٤٤ منتخبات حیدری - ١٣١ اوراق، ١٧ سطور، نستعلیق خوش خط قبل ١٣٢١ھ - غازی الدین حیدر شاہ اودھ متوفی ١٢٤٣ھ کی یہ ترتیب بیاض تھی جس کو حکیم محمد علی لکھنوی نے ١٢٢٧ھ میں مرتب کرکے کتابی شکل دی۔ زیادہ تر نسخے قوت باہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کا امراے اودھ کو خاص شوق تھا۔ کتاب کے آخر میں ٤ ورق کا ایک رسالہ بعنوان "رسالہ در باب نسخہ جات مجربات" ملحق ہے جو غالباً خود حکیم محمد علی کے مجربات کا مجموعہ ہے۔ اس کے خاتمے پر کسی مجہول مؤلف کا ایک ایک ورق کا رسالہ ازراق طبی بھی منقول ہے۔

ابتدا: "حمد بیحد وثنای لاتحصی ولاتعد شایان حضرت حکیم مطلقی کہ ..."

انتہا: "... تغییب گاؤ را خشک کردہ ونیم برشت نمودہ بخوانند دریک ہفتہ ملازمت نمایند"

عربی مخطوطات

اس کتب خانہ میں مکررات کو حذف کرنے کے بعد طب کے موضوع پر عربی کے ١٩ مخطوطات ہیں ان کو دو قسموں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ اول، ان کتابوں کے خطی نسخے جو شائع ہو چکی ہیں، ان کی تعداد ٨ ہے۔ دوسری قسم میں وہ کتابیں داخل ہیں جن میں کچھ یقیناً اور کچھ بگمان غالب ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ اور یہ تین نوع کی ہیں۔

(الف) ناشناختہ رسائل وکتب:

١-٢-٥٢ **رسالۃ فی الحمیات** - ١٨ اوراق، ١٥ سطور، معمولی نستعلیق خط۔

ابتدا: "الفصل فی اقسام الحمی ومعنی القشعریرۃ ... فاعلم ان الاجناس الاولیۃ الحمی ثلاثہ ...."

انتہا: وقد یعالج الحمی الیومیۃ الحادثۃ منها بالفصد ایضاً۔

٢-٢-٥٤ **رسالۃ فی الحمیات** - ٦٢ اوراق، ١٥ سطور، معمولی نستعلیق خط، آخر سے ناقص۔

ابتدا: "فصل، اعلم ان الحمیات الخلطیۃ علی خمسۃ اقسام ... القسم الاول الدمویۃ ..."

انتہا: "... واذا اجتمع الحمی البلغمیۃ مع الصداع الصفراوی ووجع القلب کذلک ..."

٣-٢-٥٥ **رسالۃ فی الطب** - [illegible] سی ایم سائز، ٩ اوراق، ٢١ سطور، معمولی نستعلیق

خط، اوّل اور آخر سے ناقص۔

ابتدا:۔ "... فی سقی السموم من خاف ان یسقی سماً فیجب ان یحترز من الاغذیۃ والاشربۃ الخالیۃ الطعوم ..."

انتہا:۔ وربما کفی فیہ استعمال الملح والخل ..."

۴-۲-۵۶- شرح علی الفن الاول والثانی من الکتاب الرابع من القانون لابن سینا ۲۰٫۴ × ۱۰٫ ۲۶ سی ایم سائز، ۱۲۷ اوراق، مختلف سطور، معمولی نستعلیق خط، آخر اور وسط سے ناقص (کتبخانہ شبلی میں موجود شروح قانون سے نہیں ملتی)۔

ابتدا:۔ "الفن الاول من الکتاب الرابع من کتب القانون کلام کلی فی الحمیات ..."

انتہا:۔ "... قولہ البول اللطیف ... والا لما کانت تندفع من ذاتہا، و لذلک اذا کان البول یکون الدم ..."

۵-۲-۵۷- کتاب فی الطب - ۱۶٫۴ × ۲۶٫۱ سی ایم سائز، ۱۰۰ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق خط، درمیان اور آخر سے ناقص، خطبۃ الکتاب غیر مکتوبہ۔

ایک مقدمہ اور ۶ حدیقوں پر مشتمل ہے۔ مقدمے کا عنوان مؤلف نے "فی تعریف الطب وتقسیمہ وضبط موضوعاتہ" لکھا ہے۔

الحدیقۃ الاولی میں نظری مباحث ہیں یہ ۳ دوحات پر منقسم ہے اور ہر دوحہ چند لوحات پر تقسیم ہے۔ الحدیقۃ الثانیہ کے دو دوحات اور متعدد لوحات میں عملی مباحث ہیں۔ الحدیقۃ الثالثہ ادویہ واغذیہ کے بیان میں ہے اس میں بھی ۲ دوحے اور ہر دوحے میں متعدد لوحات ہیں۔ الحدیقۃ الرابعۃ کا عنوان "فی امور ینبغی ان یزاول الطبیب [illegible] فی اسبابہا وعلاماتہا وادویتہا" ہے۔ اس میں ایک مقدمہ اور ۶ دوحات ہیں اور ہر دوحے میں متعدد لوحات ہیں۔ جن میں امور طبیعہ، قوانین علاج، احکام کلیۃ مفردات، کیفیات اخلاط، بحارین، امراض مرکبہ، اسباب ستہ ضروریہ، سقطہ وکسر وخلع وجراحات وحرکات، سموم، لسع، حرق، غرق اور تشریح اعضا کا بیان ہے۔ الحدیقۃ الخامسۃ کا موضوع "فی تشریح الاعضاء الآلیۃ وامراضہا واسبابہا وعلاماتہا ومعالجتہا" درج ہے۔ اس میں ۱۲ دوحات اور ہر دوحے میں متعدد لوحات ہیں۔ الحدیقۃ السادسہ

نسخے میں موجود نہیں الحدیقۃ الثالثہ کا آخری حصہ بھی غائب ہے ۔

ابتدا :۔ "... اما المقدمۃ ففی تعریف الطب وتقسیمہ وضبط موضوعاتہ ..."

انتہا :۔ "... ولب حب القرطم والبسلق وورقۃ (وصرقۃ) الدیک الہرم والدجاج ..."

(ب) معروف اطبا کے رسائل :

۵۸-۲-۱ رسالۃ فی الحمیات :۔ ۱۶۰۷ x ۲۶۰۸ سی ایم سائز، ۱۶ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق خط، اول سے ناقص ۔ مرزا علی شریف بن محمد زمان اللکھنوی المتوفی ۱۲۳۱ھ کی تالیف ہے ۔

ابتدا :۔ "... اعلم انہ یسقی فی الیوم الاول من الغب اللازمۃ والدائرۃ حلیب ..."

انتہا :۔ "... ایضاً یلزم من السادس فی کل مسہل لتقویتہا المحدۃ"

۵۹-۲-۲ رسالہ فی الطب : ۱۶۰۰ x ۲۶۰۸ سی ایم سائز، ۵ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق خط، کسی غیر معلوم شخص نے حکیم محمد شریف خان الدہلوی المتوفی ۱۲۲۲ھ کے معمولات مطب اوراق کے حواشی علی شرح "الاسباب والعلامات" سے چند غیر مرتب معالجات جمع کئے ہیں ۔

ابتدا :۔ "فی اول الیوم حلیب ... حب القرع من درھمین الی ثلثۃ دراھم ..."

انتہا :۔ "... اللھم اغفرہ (راجعل) سعیہ مشکورا ۔ عبدہ فقط ۔"

۶۰-۲-۳ رسالۃ فی الطب : ۱۶۰۷ x ۲۶۰۸ سی ایم سائز، ۱۲ اوراق، ۱۵ سطور، معمولی نستعلیق، خط ۱۲۶۰ھ ۔ حکیم درویش محمد بن عالم خان الرامپوری المتوفی ۱۲۳۳ھ کی تالیف ہے جو حکیم نجم اللہ الصدیقی کے نام سے مشہور تھے ۔ یہ حکیم صاحب کے کسی بڑے رسالے کا صرف آخری حصہ ہے، لیکن اپنے موضوع و مشتملات کے اعتبار سے بجائے خود ایک رسالہ ہے ۔ یہ رسالہ چار فصول پر مشتمل ہے : ۱ ۔ فی امور یجب استحضارھا قبل المداوات ۲ ۔ فی قانون ترکیب الادویۃ ۳ ۔ فی تصرفات الطبیب عند المداوات والمعالجات ۴ ۔ فی قوانین اوزان الادویۃ

ابتدا :۔ "... خاتمہ رسالۃ فی الادویۃ المرکبۃ وما یتوقف علیھا وفیھا فصول ..."

انتہا :۔ "... سفوف تقطیر البول من ضعف المثانہ وبرودتھا ... وینحل ..."

مرتب و مدون اور غیر مطبوعہ اہم کتابیں

۱-۲-۱۱-۶ خزینۃ العلاج :

حکیم عبدالکریم خان المخاطب بمرزا خان بن حکیم محمد یوسف خان المتوفی بعد ۱۱۷۲ھ کی قابل قدر تالیف ہے۔ مؤلف کا حال کسی کتاب میں نہیں ملا۔ دیباچۃ الکتاب میں مؤلف نے بیان کیا ہے کہ وہ بچپن سے اپنے والد کی خدمت میں علم طب حاصل کرتے رہے نیز اہل کمال کی کفش برداری میں عمر صرف کرتے رہے ہیں ——— ——— اور اہل کمال کی تقلید کے شوق نے ہی ان سے یہ کتاب تالیف کرائی ہے۔

خزینۃ العلاج کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب کی وفات ۱۱۷۲ھ کے بعد ہوئی ہوگی۔

خزینۃ العلوم کے مآخذ یہ ہیں: القانون، الاسباب والعلامات، شرح الاسباب والعلامات، الموجز، شروح الموجز، المغنی، تذکرۃ الھادیۃ، تحفۃ المومنین۔ تالیف شریف، قرابادین قادری، معدن تجربات اور مجموعہ بقائیؒ۔ کتاب کی ترتیب میں مؤلف نے جدت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس کی طرف دیباچے میں یہ اشارہ کیا ہے۔ "وباعتبار العبارات وتجدید الترتیب لایزعمون خالیاً من الحداثۃ والغرابۃ"۔

کتاب ایک مقدمے، چار فصلوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمے کا عنوان مؤلف کے لفظوں میں "فی المبادی التی وجب تقدم ذکرہا" ہے۔ فصول کے عناوین اس طرح ہیں:

الفصل الاوّل منہ شروع للادویۃ والاغذیۃ المفردۃ التی کلھا مندرجۃ فی ھذا المختصر باسمائھا الیونانیۃ والعربیۃ والفارسیۃ والھندیۃ علی ترتیب حروف التہجی سے بیان افعالھا الکلیۃ وطبایعھا ومقدار شربا تھا بکمال الاختصار۔

الفصل الثانی مشتمل علی بیان اقسام الاغذیۃ وانواع الادویۃ الموصوفۃ بافعالھا الکلیۃ التی یحتاج الیھا فی معالجۃ جمیع الامراض فی کل حال۔ اس فصل کے ذیلی عنوانات یہ ہیں:۔ المعدلات، المنضجات، الملینات، المسھلات، منقیات الراس، المعطسات، المدمعات، منقیات الرحم، المقیات، المدرات، الموقات، القابضات، الرادعات، المحللات، المرخیات، منضجات الاورام، المفجرات، المدملات، الملحمات، المسخنات، المرطبات، المبردات، المجففات، المجلیات، الملطفات، المغلظات،

المفتحات، المقطعات، المزلقات، المخزیات، المفشیات للریاح، المفتتات للحداة،
المفرحات، المحذرات، المسکرات، المنومات، مسکنات الوجع، حابسات ترف الدم
لاعضا الباطنة، منقیات الجراحات والقروح، المانعات لصعود الابخرة الی الدماغ
لجذابة للمواد من الدماغ الی الاسفل فی الباشونج۔

الفصل الثالث مشتمل علی معالجة الامراض لکل واحد منها مشتملا بقواعد
لیة وادویة مخصوصة مع تعریفه او اسباب ونبذ من علامتها الفارقة
فی الغیر۔ اس میں سر سے پاؤں تک اعضا کے متعلق ۲۷ ذیلی عنوانات ہیں۔

الفصل الرابع محتوی علی اصلاح بعض الاعضا بالادویة الی افضل احوالها
بزما کان المریض، علی الترتیب المرعی فی الفصل الثانی فی بروز الاسنان ومجلیاتها
... والمسودات الشعر ومبیضاتها ....

خاتمے میں متفرق فوائد ہیں جن میں الطیر والحشرات والهوام، معرفة الاوزان، معرفة
ضیمة والحبلی وغیرہ موضوعات شامل ہیں۔
پیش نظر نسخہ ۱۸ × ۲۹٫۵ سی ایم سائز پر معمولی نستعلیق خط میں ۱۲۴۹ھ سے قبل کا لکھا ہوا ہے۔
وراق کی تعداد ۲۶۷ ہے، ہر صفحے میں ۱۸ سطور ہیں۔ نسخے پر حسین محمد علوی کی ۱۲۴۹ھ اور اس سے
ل کی مہریں ثبت ہیں۔ آخر کا ایک آدھ ورق غائب ہے۔ کتب خانۂ شبلی میں موجود مراجع کی حد تک
ں کا دوسرا نسخہ مکشوف نہیں۔

ابتدا: "الحمد للّٰہ الذی خلق المولید بتجلیات قدرته واودع فیها
خواص والتاثیرات لاشرف مخلوقاته ....."

انتہا: "ومنها معرفة الحاملة بالذکر والانثی.... وایضاً اللبن الذی
حلب من ضرع ذات الذکر یکون غلیظا لزجا..."

۲۰۱-۶۲- السبع الثوابت

مؤلف نے اپنا نام خیر اللہ لکھا ہے، کتاب کی تاریخ تالیف سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی
ات ۱۱۱۹ھ کے بعد واقع ہوئی ہے۔ نزہۃ النواظر وغیرہ میں بارہویں صدی ہجری کے خیر اللہ نام کے

جن علماء کا ذکر آیا بظاہر یہ ان کے علاوہ کوئی خیر اللہ ہیں ۔ کتاب کا نام خود مؤلف نے " السبع الثوابت" رکھا ہے اور کسی " السبع السیارات " کے مقابلے میں اس کو تالیف کیا ہے ۔ خاتمے پر مؤلف نے ابن الحاجب کا ایک شعر لکھا ہے " ھذا الشعر الذی ختمت بہ کثیرا من رسائلی " ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے اور بھی کئی رسالے لکھے تھے ۔

یہ کتاب ۷ ابحاث پر مشتمل ہے :- ۱- فی تعریف الصداع و... ۲- فی تحقیق معنی الدواء ۳- فی تعریف الخلط و... ۴- فی مقدار الاخلاط ۵- فی بیان اعضاء المرکبۃ والمفردۃ ۶- فی تحلل القحف والیافوخ ۷- فی بیان سن الکھولۃ وزیادۃ التحلیل - درمیان کتاب میں جا بجا معروف طبیب و مصنف علاء الدین علی ابن حزم القرشی المتوفی ۶۷ ھ کی آراء کا ابطال کیا ہے ۔

پیش نظر نسخہ ۱۲×۱۸ سی ایم سائز پر معمولی خط نسخ میں ۱۱۱۹ھ کا لکھا ہوا اور بظاہر مسودہ مؤلف ہے ۔ کئی جگہ متن کی عبارات قلم زد کر کے حاشیے پر مؤلف کے قلم سے تصحیح ہے اور اسی خط میں پہلے صفحے پر " مصنفہ الفقیر خیر اللہ " لکھا ہوا ہے ۔ بظاہر نسخہ وحید ہے ۔

ابتدا :- " الحمد للہ الذی ارسل رسولہ الی الخلق شاھدا و بشیرا و نذیرا وآتاہ الحکمۃ .... اما بعد فھذہ ابحاث قراتہ فی علم الطب وسمیتہ بالسبع الثوابت ..."

انتہا : "... رسالتی تبقی واننی اکسی   ثوب الفناء وکل شیئی فان "

۳-۲-۶۳ المنھل الروی فی طب النبوی

مؤلف کا نام زیر نظر نسخے یا کسی اور مصدر سے معلوم نہ ہو سکا ۔ اور یہ جلال الدین سیوطی کی اسی نام کی کتاب سے یقینی طور پر الگ ہے جس کا ذکر کشف الظنون ج ۲ اور ہدیۃ العارفین ج ۱ میں آیا ہے ۔ سیوطی کی کتاب کی ابتدا کی جو عبارت کشف الظنون میں نقل ہوتی ہے وہ اس کتاب کی ابتدا کی عبارت سے نہیں تھی ، علاوہ بریں اس کتاب کے مؤلف نے اس موضوع پر دوسرے مؤلفین کا ذکر کرتے ہوئے سیوطی کا ذکر " شیخنا " کے لفظ کے ساتھ کیا ہے ۔ درمیانی کتاب میں قال ابن القیم اور قال الذہبی کی طرح قال السیوطی کئی جگہ لکھا ہے ۔ مؤلف نے دیباچے میں بھی ذکر کیا ہے کہ وہ خود بھی اسی موضوع پر ایک دوسری مفصل کتاب تالیف کر چکا ہے ۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کتاب کا موضوع وہ احادیث ہیں جن میں طبی فوائد و نکات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں ۔ لیکن یہ کتاب اس موضوع پر مرتب کی جانے والی عام کتابوں سے ممتاز ہے

جن کا اندازہ اس کے مضامین کے عنوانات سے ہوتا ہے جو بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

الحث علی تعلیم الطب - ذکر ابتداء الطب - ذکر الارکان الاربعة والاخلاط والمزاج - ذکر الاعضاء - ذکر تکوین الاعضاء من المنی - ذکر العظام والمفاصل - ذکر العصب والعضل - ذکر العروق - ذکر الاعضاء الرئیسة والخادمة - ذکر الحواس وغیرها - تدبیر المسکن والهواء - تدبیر الماکول والمشروب - تدبیر الحرکة والسکون البدنیین - تدبیر الحرکة والسکون النفسانیین - تدبیر الاحتباس والاستفراغ - القول فی الحمام - القول فی الجماع - القول فی النلاج - تناول المریض ما تحمی عنه - ذکر الحجامة والفصد والاسهال والقیٔ - ذکر الادویة والاغذیة وهو مرتب علی حروف الهجا - القول فی علاج الاعضاء المختصة الصداع، الفالج - النزلة والزکام - وجع الاسنان - وجع الصدر - ذات الجنب - الاستسقاء - وجع البطن، الاسهال - دود البطن - عرق النساء - عرق الکلیة - الباسور - الباه فی ذکر ما لا یختص منها: الحمی، السل والجرح والحکة ونحو ذلک، القروح والبثور والجذام - التنبیه فی ذکر الجدری - ذکر ما قیل فی العین - الزینة وقطع الرائحة الکریهة ونحو ذلک - السموم وعلاجها - نوع الهوام وعلاجها وطردها - عضة الکلب - الغیل - الطاعون والوباء - ذکر الطبیب - فضل المریض وعیادته - هل التداوی افضل ام ترکه - فی النهی عن التداوی بالنجاسات - فی الطعام المزورة - فی الحمیة -

ان سب موضوعات کے لیے مؤلف نے احادیث فراہم کی ہیں اور ان کے مطالب لکھے ہیں - اس طرح کی باتوں میں اکثر ضعیف بلکہ جعلی حدیثیں رسول معصومؐ سے منسوب ہوا کرتی ہیں - مؤلف کی تلاش بہرحال قابل داد ہے۔

ابتدا: "الحمد لله الذی اعطی کل نفس هداها وعلمها منافعها ومضارها....."

انتہا: "....وقال السوادی: حب الرشاد یولد الرطوبة، والماء الحار یرخی المعدة، والاهلیلج یرق المعدة - بل، ان تقعد من الطعام بشهوة، وتقوم وانت تشتهیه - والله سبحانه وتعالی اعلم."

حکیم حافظ سید خورشید علی
(حیدرآباد)

سالارجنگ میوزیم کے منتخبہ مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست جس میں انیس عربی مخطوطات اور اسی قدر فارسی مخطوطات، اسی طرح جملہ ۴۲۸۰۹ مخطوطات شامل ہیں، ہم مقالہ کے آخر میں پیش کر رہے ہیں۔ مگر ان اڑتیس کے منجملہ چند اہم مخطوطات کا تفصیلی ذکر کریں گے تاکہ بحور و فکر ان مخطوطات کو اشاعتی پروگرام میں شامل کرنے میں سہولت ہو۔

عربی مخطوطات میں ہماری نظر سب سے پہلے طبی رسائل کے ایک مجموعے پر پڑتی ہے جس کا نمبر (طب عربی/۳۴) ہے، اور جو (۶۶) ورق پر مشتمل ہے۔ یہ مجموعہ چھ نادر رسائل پر محتوی ہے، جن میں نہایت مختصر مفید اور جامع انداز میں مسائل طبیہ پر بحث کی گئی ہے۔ مخطوطہ تقریباً بے نقط خط نسخ شکستہ میں لکھا گیا ہے اور تاریخ کتابت ۴۵۷ھ م ۱۰۶۵ء ہے، اور کاتب کا نام محمد بن عبدالمجید لکھا ہے۔ اس مخطوطے کے سرورق پر کئی ایک اطبار سابقین کے آٹوگراف اور مہر موجود ہیں، جو کسی زمانے میں اس نسخہ کے مالک رہے ہوں گے، چنانچہ محمد بن ہبتہ اللہ شیرازی جو ایک مشہور طبیب گزرا ہے اس نے اپنے قلم سے یہ عبارت لکھی ہے: "من متملکات العبد المذنب الی النھایۃ الحسیب محمد بن ھبۃ اللہ بن لطف اللہ بن لقمان الطبیب المعروف باختیار الشیرازی"۔ مخفی مبادکہ سالارجنگ میوزیم میں محفوظ تاریخ والے مخطوطات میں یہ سب سے قدیم ترین نسخہ ہے۔ یوں دیگر اس سے بھی قدیم مخطوطات موجود ہیں مگر ان پر تاریخ ثبت نہیں، صرف رسم الخط سے ان کی قدامت پہچانی جا سکتی ہے۔ مذکورہ

ـائل کی تفصیل اس طرح ہے :-

(۱) بدن الانسان وتشریح الاعضاء البسیطة ومرضها وصحتها واسبابها
ـشریح الأعضاء المرکبة وأمراضها وعلاجها (۳) الاطلیة (۴) الأمراض
ـردة وعلاجها (۵) الحمّی (۶) التریاقات

اب ہم ہر رسالہ کی ابتداء سے کچھ عبارات نقل کریں گے تاکہ طرز بیان کے سمجھنے میں سہولت ہو اور اہمیت
ـاہو جائے :-

(۱) پہلا رسالہ "بدن الانسان" اس طرح شروع ہوتا ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم
رب أنعمت فزد. الطب علم یعرف منه أحوال بدن الانسان من جهة ما یصح ویزول
عنها لیحفظ الصحة حاصلة ولیسترد زائلة، فان قلت: الطب قسمان
علمی وعملی، وقد جعلت کلها علماً قلنا المراد بالعملی العلم بالعمل، فیدخل فی
الحد، وفی مباحثه أربع فصول، الفصل الأول فی الامور الطبیعیة، وفیه
مسائل... الفصل الثانی فی المرض والسبب والدلیل، وفیه ثلاثة مباحث.....
الفصل الثالث فی حفظ الصحة وفیه ثلاثة أبحاث... الفصل الرابع فی
المعالجات، والأصل فیه ثلاثة - طوالت سے بچنے کے لئے ہم نے اس کے ترجمے سے گریز کیا
ہے۔ اگر ضرورت سمجھی جائے تو ترجمہ پیش کیا جائے گا۔ اس رسالے کے آخر میں دماغ کے ذریعہ علاج کا بیان ہے۔

(۲) دوسرے رسالے "تشریح الأعضاء المرکبة وامراضها وعلاجاتها"
کا ابتدا اس طرح ہوتی ہے: بسم اللہ الرحمن الرحیم. بعد حمد الله والصلوٰة علی رسول
اللہ نذکر تشریح الاعضاء المرکبة وأمراض کل عضو بأسبابها وعلاماتها
وعلاجاتها، ولنبتدء بالدماغ، وهو جسم متخلخل، شکله قریب من
المثلث بحیث یکون قاعدته قدام، ویستدق الی أن ینتهی، فهو فی العرض
ینقسم الی ثلاثة أقسام، ویسمی بطون الدماغ، ثم ینقسم فی الطول إلی
قسمین لیکون المجموع ستة اقسام، والأعصاب تنبت منه إلا أن الجزء
المقدم من الدماغ ألین، ومنه عصب الحس، والجزء المؤخر أصلب ومنه عصب

الحرکۃ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ عربی عبارت کا ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، فاضل مصنف نے اعضاء مرکبہ میں سب سے پہلے دماغ کا ذکر کیا ہے۔ عبارت مندرجۂ بالا میں دماغ کی ہیئت ترکیبی بیان کی گئی ہے، پھر ایک ایک کرکے دماغ کے امراض اور ان کی علامتیں اور اسباب، پھر علاج بیان کیا ہے۔

(۳) تیسرا رسالہ "اطلیہ" پر مشتمل ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے، طلاء للحکۃ: ماء الکرفس والخل ودھن الورد، ویلقی علیہ شئی من مردا سنج، یضرب ویطلی بہ ویغسل بدقیق الحمص۔ طلاء للبھق الاسود: بزر الفجل عشرۃ دراھم کندش درھمین، قسط درھمین یطلی بالخل بعد الاستفراغ والحجامۃ۔ اس طرح کئی قسم کے طلاء، ضماد اور مرہم بیان کئے گئے ہیں۔

(۴) چوتھے رسالہ میں متفرق امراض کا ذکر ہے جیسے ترحّل المثانہ، مثانہ اور گردے کی پتھری ورم قضیب وخصیتین، حبس البول، ادرار البول، بواسیر، رحم کے امراض وغیرہ، پھر ان سب کا علاج تجویز کیا ہے۔ بعد ازاں ضبط تولید کے لئے نسخہ بیان کیا ہے جو آج کے زمانے کی اہم ضرورت ہے۔ اور بالخصوص اہل ہند کے لئے

(۵) پانچواں رسالہ "بخار" کے بیان پر مشتمل ہے، ابتداء میں حمد وصلاۃ، اور بخار کی تعریف اور کیفیت بیان کرنے کے بعد یہ لکھا ہے: والحمی ثلاثۃ أقسام، حمی یوم وحمی خلط وحمی دق، لأن جمیع ما فی البدن ثلاثۃ: الروح والخلط والعضو، فان تعلقت الحرارۃ أولاً بالروح فھی حمی یوم، وان تعلقت بالخلط فھی حمی خلط، وإن تعلقت بالعضو فھی حمی دق، ومثّل ذلک بالحمام، فان فیہ ثلاثۃ أشیاء: الھواء والماء والحیطان فالھواء کالروح والماء کالخلط، والحیطان کالعضو، ویمکن تعلق الحرارۃ أولاً بکل واحد وسرایتہ إلی الآخرین ——— [illegible] اقسام کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھانے کے بعد ان اقسام پر تفصیلی بحث کی ہے اور ان کا علاج بتایا ہے۔ پھر ضمناً اسی بیان میں نزلہ، کھانسی، مرض سل، امراض قلب، امراض معدہ، استسقاء، ہچکی، امراض طحال، تولیخ، اسہال، امراض گردہ، مرض جذام، برص بہق، سرطان اور اسی قسم کے تمام ایک امراض اور ان کے اسباب وعلامات کا ذکر کرنے کے بعد ان کا علاج تجویز کیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ رسالہ [illegible] کا خزانہ ہے۔

(۶) اس مجموعے کا چھٹا اور آخری رسالہ تریاقات پر مشتمل ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ یہ رسالہ آخر میں ناقص ہے، اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الترياق الفاروق: اجل الادوية المركبة للسموم والنواهش والكلب الكلب والامراض البلغمية والسوداوية والرياح الخبيثة والفالج والسكتة والصرع واللقوة والرعشة والجنون والجذام خاصة بالبرص۔ یعنی سب سے پہلے تریاق فاروق کا ذکر کیا ہے، اور اس کو امراض بلغمی اور سوداوی، اور خاص مرگی جیسے عسیر العلاج امراض کے لیے، اور خاص طور پر مرض جنون اور جذام کے لیے مفید بتایا ہے۔ اس نسخہ میں شہد کے علاوہ جملہ (۶۵) ادویہ شامل ہیں، جن کی تفصیلی ترکیب کا ذکر ہے۔

اس کے علاوہ تریاق صغیر، اطریفل کبیر، معجون انوش دارو جو ایک ہندوستانی مقوی قلب دوا ہے، نیز معجون فلاسفہ جو شہرۂ آفاق معجون ہے، اور معجون نوتجی جو سوء ہضم کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ معجون النجاح امراض سوداوی کے لئے، اور اسی طرح مختلف قسم کے جوارشات کے مکمل اصلی نسخہ بیان کئے ہیں، جو اس قابل ہیں کہ موجودہ مروجہ نسخوں سے ان کا تقابل کیا جائے، موجودہ نسخوں میں اگر کچھ کمی بیشی ہے تو ان کی اصلاح کر لی جائے، کیوں کہ نسخہ جب تک کامل نہ ہوگا اس کا اثر بھی پائیدار اور کامل نہ ہوگا۔ لہٰذا احقر کی طب یونانی کے ارباب حل وعقائد سے یہ درخواست ہے کہ اس قدیم ترین نسخہ کو تحقیقی پروگرام میں شامل فرما لیا جائے تو مقصد کے حصول میں ممد ومعاون ثابت ہوگا۔ اور اس طرح متعدد مذکورہ پیچیدہ اور لاعلاج سمجھے جانے والے امراض کا کامیاب علاج دریافت کیا جا سکتا ہے۔

فارسی مخطوطات میں سب سے قدیم ترین نسخہ "ترجمۂ منهاج البيان فيما يستعمله الانسان" ہے

جس کو خود مصنف یعنی مترجم نے ۶۷۹ھ/۱۲۸۰ء میں لکھا تھا، اصل عربی نسخہ منهاج البيان جو يحيى بن عيسىٰ بن جزله المتوفى ۴۹۳ھ/۱۱۰۰ء کی تصنیف ہے وہ بھی ہمارے ہاں محفوظ ہے، لیکن ہر دو نسخوں میں تھوڑا سا نقص ہے، عربی نسخے کے آخر میں ایک صفحہ کے مقدار عبارت متروک ہے اور فارسی نسخہ اگر چہ مترجم کے قلم سے لکھا ہوا ہونے کی حیثیت سے اہم ہے، اور اس کو ایک مالک نے ساڑھے تین ہزار دینار میں فروخت کیا تھا جیسا کہ آخری صفحہ پر تحریر سے معلوم ہوتا ہے، مگر اس کے شروع میں، عربی نسخہ کو ملا کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیس ورق کم ہیں۔ اگر چہ دونوں نسخوں کو ملا کر عبارت کی پابجائی کر لی جا سکتی ہے مگر اس کو ہم نظر انداز کرتے

ہیں کیوں کہ اصل عربی نسخہ طبع ہو چکا ہے ۔ اور ایک انتہائی اہم نسخے کا یہاں ذکر کریں گے جو تحقیق اور ترجمہ کے لئے زیادہ بہتر ہوگا۔

مزید چند نادر طبی مخطوطات

عربی

کتاب الحمیات: (طب/۸۴، کیٹلاگ نمبر: ۲۲۵۷) مصنف: اسحاق بن سلیمان الاسرائیلی المتوفی ۳۲۰ھ/۹۳۲ء، ورق: ۱۶۷، کاتب: محمد بن اسرائیل الطبیب، تاریخ کتابت: ربیع الثانی ۶۳۰ھ م ستمبر ۱۲۳۲ء۔ ورق ب/۴۳-۴۴، اور ب/۴۵-۴۶، اور ب/۴۸-۴۹ پر جسم انسانی کے خاکے بنائے گئے ہیں۔

الطب الکلی: (طب/۶۷، کیٹلاگ نمبر: ۲۲۶۲)، مصنف: ابو سہل عیسیٰ بن یحییٰ بن ابراہیم المسیحی المتوفی ۳۹۰ھ/۱۰۰۰ء تقریباً، یہ حکیم بو علی سینا کا استاد تھا، ورق: ۲۱۴، کتاب چالیس ابواب پر مشتمل ہے، کاتب: سلطان محمد ولد آقا عبدالکریم سوداگر، تاریخ کتابت: ۲۵ صفر ۱۱۵۴ھ م یکم مئی ۱۷۴۱ء، یہ نسخہ حکیم محمد ساقی کے لئے لکھا گیا تھا۔ بخط نستعلیق شکستہ۔

مقالۃ فی الفصد: (طب/۴۶/۲، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۱۸)، ورق: ۶، مصنف: امین الدولہ ابو الحسن ہبۃ اللہ بن سعد التلمیذ، المتوفی ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء، یہ مقالہ دس ابواب پر مشتمل ہے، کاتب: حسین بن محمد البیطار المکی الرفاعی الحسینی الحصکفی۔ تاریخ کتابت: غرہ ربیع الاول ۱۲۸۳ھ م ستمبر ۱۸۶۶ء۔

کتاب الرحمۃ فی الطب والحکمۃ: (طب/۳۰، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۲۲)، ورق (۵۲)، مصنف: محمد مہدی بن علی بن ابراہیم الصنبری الیمنی المہجمی الہندی المتوفی ۸۱۵ھ/۱۴۱۲ء، کاتب: نبہان بن قاسم الکاظمی الشیرازی، تاریخ کتابت: ۶ شوال ۱۳۷۵ھ م ۱۸ جولائی ۱۹۵۶ء۔ بخط نسخ چھوٹی تقطیع، مختصر مفید رسالہ

شفاء الاسقام ودواء الآلام: (طب/۴۷، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۳۳)، ورق: ۳۷۸، مصنف: خضر بن علی بن الخطاب المعروف بہ حاجی پاشا المتوفی بعد ۸۱۶ھ/۱۴۱۳ء۔ کتاب

دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول = نظری، حصہ دوم = عملی، جن میں چار مقالات ہیں، کاتب: محمد فاضل العطا الطباطبائی
تاریخ کتابت: ۱۳۱۱ھ م ۱۸۹۳ء، رسم الخط: نسخ خفی، مفردات و مرکبات، امراض عامہ، امراض خاصہ
اور ان کے علاج کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ (خدا بخش میں موجود ہے)۔

کتاب الکحل: (طب: ۵/۱، کیٹلاگ نمبر ۲۳۴۲)، ورق: ۴۸، مصنف: نورالدین
علی المتطبب المصری، نسخہ اواخر گیارہویں صدی۔

کتاب الکحل: (طب: ۵/۲، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۴۳) ورق: ۴۱، مصنف:
فتح الدین ابوالفتح من القاضی جمال الدین عثمان بن ہبۃ اللہ۔ کتاب ستر۷۰ ابواب پر مشتمل ہے۔ نسخہ:
اواخر گیارہویں صدی ہجری۔

العقائد الرفیعۃ: (طب: ۸/۱، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۴۶) ورق: ۳۹۹،
مصنف: محمد رفیع بن مومن القزوینی، نسخہ بارہویں صدی ہجری، نہایت ضخیم اور بڑی تقطیع والی کتاب
ہے جو ایک مقدمہ، تین باب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں دو بیان ہیں، اور باب اول میں چار بیان،
اور باب دوم میں تین فصل، باب سوم میں بیس۲۰ مقالات اور خاتمہ دو فصلوں پر مشتمل ہے۔

معیار الاطباء: (طب: ۸/۱، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۴۹) ورق: ۳۶۴، مصنف
احمد سعید امروہوی، نہایت ضخیم کتاب ہے جو ایک مقدمہ اور چار مقاصد پر مشتمل ہے، پھر ہر مقصد میں کئی ابواب
اور ہر باب میں کئی فصلیں ہیں۔ نسخہ: اوائل تیرہویں صدی ہجری۔

کتاب الازرق فی الطب: (طب/۷۲، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۵۴) ورق: ۱۶۳،
کاتب: علی بن ابی بکر الجنید بن عمر، تاریخ کتابت: ۲۴ر شوال ۱۰۶۷ھ م ۲۶ر جولائی ۱۶۵۷ء۔

کتاب خواص الحشائش ومنافع الحیوان: (طب/۱۲۰، کیٹلاگ نمبر ۲۳۶۰)
ورق: ۷۲، منسوب بہ جالینوس۔ مترجم کا نام ندارد۔

بلغۃ الطبیب ونزہۃ الادیب: (طب/۱۲۰، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۶۰)،
ورق: ۴۲/ب تا ۹۹/ب، مصنف: حکیم بدرالدین محمد بن القاسم الحریری المرادی، کاتب: ابوالبقاء
بن ادہیان بن ابراہیم۔ تاریخ کتابت: ۲۷ر شوال ۶۷۹ھ م ۱۹ر فروری ۱۲۸۱ء (کتاب خواص الحشائش)
۱۷ر ذی الحجہ ۶۸۱ھ م ۱۲ر فروری ۱۲۸۳ء (کتاب بلغۃ الطبیب)، یہ نسخہ (۱۸) رنگین تصاویر پر مشتمل ہے۔

منهاج البیان فیما یستعمله الانسان: (طب/۹۲، کیٹلاگ نمبر: ۴۳۶۱)

ورق: ۳۰۷، مصنف: ابوعلی یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ المتوفی ۴۹۳ھ / ۱۱۰۰ء، انتساب: مقتدی باللہ خلیفہ عباسی (۴۶۷ھ / ۱۰۷۵ء تا ۴۸۷ھ / ۱۰۹۴ء)۔ اس کا فارسی ترجمہ ۶۷۹ھ / ۱۱۰۰ء میں محمد بن محمد بن الرضی الطبیب نے کیا تھا۔ خود مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ میوزیم کے شعبۂ مخطوطات میں محفوظ ہے۔ ملاحظہ ہو طب فارسی ع۵۴ (خدا بخش میں موجود ہے)

الفتح فی التداوی من جمیع الامراض والشکاوی: (طب/۵۵، کیٹلاگ نمبر: ۲۳۷۱)

ورق: ۸۹، مصنف: ابوسعید ابراہیم المغربی، نسخہ: اواخر بارہویں صدی ہجری، امراض کا مختصر اور آسان طریقۂ علاج بیان کیا ہے، اور ادویہ اور اس کے خواص بطور جدول لکھے گئے ہیں۔ (خدا بخش میں موجود ہے)۔

(فارسی)

تجربات المجربات غیاث شاہی: (طب/۳۱، کیٹلاگ نمبر: ۳۹۹۴)

ورق: ۱۲۷، مصنف: سعد اللہ نظامی زنجانی، بزمانۂ غیاث الدین خلجی سلطان گجرات (۸۷۳–۹۰۶ھ / ۱۴۶۹–۱۵۰۰ء)

کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے جو کفایۂ مجاہدیہ اور الفاظ الادویہ اور اختیارات بدیعی کا خلاصہ ہے۔

رسالۂ طب: (طب: ۱/۲، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۳۰)

ورق: ۳۴، مصنف: محمد بن علی الطبیب شاگرد قطب محمد آدم جن کی وفات نظام الدین علی شیر متوفی ۹۰۶ھ / ۱۵۰۱ء کے دور میں ہوئی۔

تحفۂ الصفویہ: (طب/۳۳، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۳۱)

ورق: ۶۸، مصنف: محمد علی بن محمد موسیٰ، انتساب: سلطان محمد شاہ صفوی (۹۸۵–۹۹۴ھ / ۱۵۷۷–۱۵۸۶ء)، کاتب: سید محمد اسماعیل، تاریخ کتابت: شعبان ۱۲۵۳ھ م نومبر ۱۸۳۷ء۔

رسالۂ شرفیہ: (۲۸۰/۷، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۳۲)

ورق: ۵۴، مصنف: محمد مسیح بن محمد امین طباطبا، زمانۂ کتابت: اوائل گیارہویں صدی ہجری، اس رسالہ میں صحت کے اصول، امراض کا علاج اور خاص طور پر سفر کرنے والوں کے لئے نصیحتیں ہیں۔

اختیارات قطب شاہی: (طب/۱۳، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۳۵)

ورق: ۴۱۹، مصنف: میر مومن بن علی الحسینی الاسترابادی، بزمانۂ سلطان محمد قلی قطب شاہ (گولکنڈہ)

۹۸۹-۱۰۲۰ھ (۱۵۸۱-۱۶۱۱ء) کاتب: محمد مومن المعروف بہ عرب شیرازی، نستعلیق خوشخط، مطلا مذہب اس کا دوسرا نسخہ بھی موجود ہے۔

میزان الطبائع قطب شاہی: (طب/۳۶۶، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۷۱)، ورق: ۱۲۷، مصنف: تقی الدین محمد بن صدرالدین علی۔ انتساب: سلطان محمد قطب شاہ (گولکنڈہ) ۱۰۲۰-۱۰۳۵ھ (۱۶۱۲-۱۶۲۶ء) تاریخ کتابت: ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء)، بمقام حیدرآباد۔ بیشتر بہا نسخہ جات و مجربات کا ذکر ہے۔ دوسرا نسخہ بھی ہے۔

ریاض عالمگیری: (طب: ۲۲۱/۱، کیٹلاگ نمبر ۴۰۶۳)، ورق: (۶۴)، مصنف: ابن محمد رضا شیرازی، زمانۂ تصنیف: (۱۰۸۰-۱۰۹۰ھ / ۱۶۷۰-۱۶۸۰ء)، کاتب: محمد بازید، تاریخ کتابت: ۵ محرم ۱۱۴۵ھ م ۱۷ جون ۱۷۳۲ء، بمقام اورنگ آباد، (خدا بخش میں بھی موجود ہے)۔

مختصر در طب: (طب: ۲۳۱، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۶۸)، ورق: ۱۲، مصنف: ہاشم طبیب، تاریخ کتابت: ۱۹ رمضان ۱۰۷۱ھ م ۸ مئی ۱۶۶۱ء۔

مجرب الشفاء (علوم سریہ) (۲/۷۷، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۷۶)، ورق: ۲۲، مصنف: محمد ملتان گجراتی، کاتب: شیخ محمد شریف بن شیخ انبیا رہانسوی، تاریخ کتابت: ۸ صفر ۱۱۱۳ھ م ۲۵ جون ۱۷۰۱ء بمقام حیدرآباد۔ اس کتاب کے اندر ہندوستانی جڑی بوٹیوں سے علاج معالجے کے مختلف نسخہ جات کا ذکر ہے۔

کفایۃ الاطباء: (طب: ۱۹۳، کیٹلاگ نمبر: ۴۰۷۸)، مصنف حکیم ابوجی بن حسام الدین بلخی، یہ نسخہ صرف (۱۳) کتاب پر مشتمل ہے جس میں (۳۹) ابواب کا ذکر ہے، جب کامل نسخہ (۲۰) کتاب پر مشتمل ہے۔ یہ نسخہ ۲۴۹ ورق اور ۲۵ کے درمیان ناقص ہے۔

مادۃ الشفاء: (طب/۲۱۷، کیٹلاگ نمبر: ۴۱۳۴)، ورق: ۲۸۲، مصنف: رضائی حکیم حضرت اللہ، کاتب: غلام محمود، برائے حکیم وزیر علی، تاریخ کتابت: ۲۵ رجب ۱۲۷۳ھ م ۲۱ مارچ ۱۸۵۷ء۔

بدائع الاسرار: (طب ۲۳، کیٹلاگ نمبر: ۴۱۳۶)، ورق: ۳۱، مصنف: احمد المتطبب اللاہجی الحسینی۔ تاریخ کتابت: ۲۴ شوال ۱۲۵۸ھ م ۲۸ نومبر ۱۸۴۲ء،

اس کتاب میں چائے، کافی، تمباکو کے فوائد و نقصانات وغیرہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

قوت لایموت: (طب/۱۸۳، کیٹلاگ نمبر: ۲۱۲۷)، ورق: ۸۸،
مصنف: سید فضل علی الملقب بہ شفائی خان معتمد الملک المتوفی سنہ ۱۲۵۴ھ م سنہ ۱۸۳۸ء،
یہ کتاب مصنف نے مہاراجہ چندو لال بہادر وزیر اعظم حیدرآباد کی خدمت میں پیش کی تھی
مصنف کا تعلق شاہجہان پور سے ہے جو حیدرآباد منتقل ہو کر راجہ صاحب کے درباری حکیم
مقرر ہوئے۔ یہ حکیم احمد اللہ خان بہادر کے شاگرد تھے۔ کتاب سات فصلوں پر مشتمل ہے،
مختلف امراض کے پرہیز اور مختلف غذاؤں کے فوائد بتائے گئے ہیں۔

سراج الطب: (طب/۱۴۰، کیٹلاگ نمبر: ۲۱۳۹)، ورق: ۲۳۱،
چھوٹی تقطیع حمائل سائز، مصنف: اشرف علی بن رجب علی عظیم آبادی۔ انتساب: سراج
الملک المتوفی سنہ ۱۲۶۹ھ / ۱۸۵۳ء وزیر اعظم حیدرآباد بزمانۂ ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم۔ کتاب
(۱۲) ابواب پر مشتمل ہے۔ کاتب: بخط مؤلف و امین المؤلف میر منور علی، تاریخ کتابت:
۴ رجب سنہ ۱۲۵۹ھ م ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۴۳ء۔

اسرار مسیحا: (طب/۱۶، کیٹلاگ نمبر: ۲۱۴۰)، ورق (۲۸)، مصنف:
مسیح الزماں خان بن حکیم محمد باقر خان بن صالح خان المخاطب بہ مسیح الدولہ بہادر حکیم الممالک،
انتساب: ناصر الدولہ آصف جاہ رابع، اس کتاب میں سبزیوں، میوہ جات، خوردنی غلہ
جات، گوشت وغیرہ کے طبی فوائد بیان کئے گئے ہیں۔

مجموعۂ رسائل: (طب/۲۲۲، کیٹلاگ نمبر: ۲۱۹۳) من کتاب المجربات
شامل ہے۔ جو (۸۰) ورق پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف امراض کے لئے مجرب ادویہ کا تذکرہ
ہے، خط شکستہ، تاریخ کتابت: ۲۰ رجب سنہ ۱۲۰۵ھ م ۲۵ مارچ سنہ ۱۷۹۱ء، سرورق
سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عماد الملک مبارز خان المتوفی سنہ ۱۱۳۷ھ م سنہ ۱۷۲۴ء کی تصنیف ہے۔

نوٹ: علاوہ ازیں شعبۂ مخطوطات میں کئی ایک مجامیع موجود ہیں۔ جن کے
تتبع و تلاش کے لئے وقت درکار ہے۔

جناب محمود حسن قیصر امروہوی
علیگڑھ

مولانا آزاد لائبریری میں علم طب کے چند نادر مخطوطات

میں ان چند مخطوطات کے بارے میں مختصراً عرض کروں گا جو ہمارے فاضل محقق حکیم ظل الرحمان صاحب کی نظر سے ازخجل رہ گئے ہیں۔

۱۔ **المعالجات البقراطیہ** (عربی)۔ اس کا مؤلف شیخ الرئیس ابن سینا کا استاد ابوالحسن احمد بن محمد الطبری ہے۔ اس کا سنہ وفات ۳۲۰ اور ۳۶۶ھ کے درمیان ذاتی ہے۔ اس مخطوطہ کی کوئی تفصیل تو مجھے نہیں بیان کرنی ہے اس لئے کہ اس کے نسخے کثیر تعداد میں ملتے ہیں البتہ مولانا آزاد لائبریری کا جو نسخہ ہے وہ صرف اس لحاظ سے اہم ہے کہ ۹۰۱ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور مکمل ہے۔ اس بنا پر اگر اس کا تحقیقی ایڈیشن شائع ہو تو اس نسخہ سے تصحیح و مقابلہ میں مدد ملے گی[1]

۲۔ دوسرا اہم مخطوطہ **کتاب المائہ فی الطب** ہے جس کا مؤلف ابوسہل عیسیٰ بن یحییٰ المسیحی (متوفی ۳۹۰ھ یا ۱۰۰۰ء) ہے جس کے بارے میں یہ امر محقق ہے کہ وہ شیخ الرئیس ابن سینا کا استاد تھا۔ اس نسخہ کا کاتب محمد بن علی القطب الشیرازی ہے جس نے ۱۰۶۶ھ میں اس کو نقل کیا اور مہذب الدین عبدالکریم[2] بن علی حامد الدمشقی معروف بہ دخوار متوفی ۶۲۸ھ/۱۲۳۰ء کے مکتوبہ نسخہ سے اس کی تصحیح اور مقابلہ کیا۔ یہ دخوار ایک فاضل طبیب تھا جس نے دمشق میں نشو و نما پائی۔ اس کی تصانیف میں مختصر کتاب الحاوی فی الطب، مختصر کتاب الاغانی، مقالہ فی الاستفراغ اور شرح تقدمۃ المعرفہ کے نام ملتے ہیں (معجم المؤلفین ۵: ۲۰۹)

یہ ترقیمہ حسب ذیل ہے جس سے اس نسخہ کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"قد حرر ھذا الکتاب الف و ستہ و ستین (۱۰۶۶ھ) محمد بن علی القطب الشیرازی و نقل اکثرہ من النسخۃ التی کتب فی حاشیتھا "بلغت مقابلتہ) و تصحیحھا فی مجالس آخرھا السابع

---

[1] اس کا پہلا حصہ طبع ہو چکا ہے [2] صحیح نام "عبدالرحیم" ہے (الاعلام ج ۳ ص ۳۴۴، معجم المؤلفین ج ۵ ص ۲۰۹)

والعشرين من شعبان سنة تسع وستين وستمائة والنسخة المقابل بها بخط الشيخ الحكيم الفاضل العلامة مهذب الدين عبد الكريم المعروف بالدخوار وقرأها على ابن مطران وقرأ ابن مطران كتاب المائة على ابن النقاش وقرأ ابن النقاش على امين الدوله وقرأه امين الدوله ابن التلميذ على عبد الله الحاجري وقرأه الحاجري على الشيخ الرئيس ابن سينا قدس الله روحه وقرأه الرئيس على مؤلفه ابي سهل المسيحي۔

دفع المضار الكلیه عن الابدان الانسانیه

صحت ابدان پر یہ ایک بڑا مفید رسالہ ہے۔ اس کے مؤلف کا نام پورے متن میں اوّل سے آخر تک کہیں مذکور نہیں البتہ دیباچہ میں سبب تالیف کے تحت مؤلف کا حسب ذیل بیان ملتا ہے:

"ولما كان الشيخ الجليل احمد بن محمد السهلى .... وهو ممن عرف بعلو الهمة وسمو الارومة ومحبة العلوم الحقيقية والاخذ منها بالحظ الاوفر وارتباط المبرزين فيها وتحصيلهم عنده من حيث كانوا واحداً بعد واحد امرني ان اعمل كتاباً في دفع المضار الكلية عن الابدان الانسانية"

اس عبارت سے اولاً کتاب کا عنوان (ٹائٹل) معلوم ہوجاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ مؤلف نے اس کو احمد بن محمد السہلی کے حکم سے لکھا۔ اس عنوان کو لیکر جب ہم نے کشف الظنون (حرف د) کی طرف رجوع کیا تو اس میں اس عنوان کے تحت مؤلف لکھتا ہے شیخ الرئیس ابن سینا الفہ للوزیر احمد بن محمد السہلی۔ صاحب کشف الظنون کا یہ بیان خود ابن سینا کے بیان سے بالکل مطابق ہے جو ابن ابی اصیبعہ (۲: ۴) اور قفطی: ۴۱۷ دونوں نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ثم مات والدى وتصرفت بي الاحوال ــــــ ودعت الضرورة الى الارتحال عن بخارى والانتقال الى كركانج وكان ابو الحسين السهلى المحب لهذه العلوم بها وزيرا۔

اس کا ترجمہ یہ ہے: میرے باپ کے انتقال کے بعد جب حالات نے کروٹ لی تو بخارا چھوڑ کر میں کرکانج آیا۔ یہاں ابو الحسین السہلی نے جو ان علوم کا شیدائی تھا۔ میری سرپرستی کی۔

اس کے بعد حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس کا مؤلف ابن سینا ہے جس نے ابوالحسین سہلی کے حکم سے اس کو لکھا جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

بروکلمان (۱: ۶۴۲) کے سامنے معلوم نہیں اس کا کونسا نسخہ تھا یا کونسی المطبوعہ فہرست تھی کہ اس نے اس کا مؤلف ابو جعفر علی بن محمد الغافقی متوفی ۵۶۰/۱۱۶۵ کو لکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بروکلمان جہاں اور متعدد اغلاط کا شکار ہوا ہے اور اس نے مطبوعہ فہرستوں کے بیان پر اعتماد کر کے بطور خود کوئی تحقیق نہیں کی تو یہ اس کے لئے ممکن تھا۔ اور جس طرح اس کو فہرستوں میں کوئی بیان ملا اسی طرح درج کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں غافقی کا نام کہیں کاتب یا مصحح وغیرہ کی حیثیت سے آیا ہو اور کیٹلاگر نے اس کو مؤلف سمجھ لیا ہو۔ لیکن یہ امر بالکل مستبعد ہے کہ اس عنوان کی دو کتابیں ہوں۔ اس لئے کہ یہ ایسا عنوان ہے جو مشترک نہیں ہو سکتا۔ یہ رسالہ حسب ذیل سات مقالوں پر مشتمل ہے:

المقالۃ الاولی	فی تعدیہ انواع الخطا	ورق ۱ ب -- ۱۰ الف
المقالۃ الثانیہ	فی الھواء	ورق ۱۰ الف - ۱۷ ب
المقالۃ الثالثہ	فی الحمام	ورق ۱۷ ب - ۲۴ ب
المقالۃ الرابعہ	فی الطعام	ورق ۲۴ ب - ۳۵ ب
المقالۃ الخامسہ	فی المشروبات	ورق ۳۵ ب - ۴۴ ب
المقالۃ السادسہ	فی الحرکات الکثیرہ	ورق ۴۴ ب -- ۵۰ الف
المقالۃ السابعہ	فی امر الاستفراغ	ورق ۵۰ ب - تا ختم

اس کے اوراق کی کل تعداد ۵۱ ہے یعنی ۱۰۲ صفحات؛ سائز ۷×۱۳، ۱۱×۸ سم سطر: ۹۔ خط نستعلیق خفی صاف اور روشن۔ ابتدا

الحمد للہ حق حمدہ والصلوٰۃ علی رسولہ وغیرہ

کشف الاشکالات (عربی)

یہ کتاب نفیس بن عوض الکرمانی کی شرح الاسباب والعلامات کے مشکل مقامات کی شرح ہے جو ایک ہندی عالم اور طبیب محمد ہاشم بن حکیم محمد محسن بن محمد افضل کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے افسوس ہے کہ اس بلند پایہ فاضل کے ذکر سے کتب مراجع یکسر خاموش ہیں۔ صرف دیباچہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف نے یہ کتاب ۱۱۸۴/۱۷۷۰

میں مکمل کی۔ اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زمانہ بارھویں صدی ہجری رہا ہے۔ کتاب کا عنوان کشف الاشکالات تاریخی عنوان ہے جس سے ۱۱۸۴ سال تصنیف برآمد ہوتا ہے۔ جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے معلوم ہوتا ہے۔

وسمتیها بکشف الاشکالات لانها یکشف بما فیه من المشکالات ومن العجائبات ان ینکشف عن هذا تاریخ اتمام تلك الرسالة عن قیاس السنة المقدسه الهجریه المصطفویه۔

دیباچہ کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تالیف مؤلف کے ریعان شباب کی تالیف ہے۔
اس کے اوراق کی کل تعداد ۱۳۸ ہے۔ سائز ۱۱×۲۱، ۱۷×۲۹؛ سطر ۲۳ نستعلیق صاف و پاکیزہ اوراق مصفح یہ کاغذ رقیق۔ نسخہ مکمل۔ تاریخ کتابت ۱۲۶۸ھ

ابتدا: الحمد لله الذی هدانا صراط المستقیم وهو نعیم عطانا فیه تمامه النعیم
ابتدا متن: بسم الله الرحمن بحث فی امراض الراس لما شرع المصنف رحمه الله تعالیٰ فی امراض الراس۔

اس کا دوسرا نسخہ اس لائبریری کے سبحان اللہ کلکشن میں نمبر $\frac{616}{3}$ کے تحت محفوظ ہے جس کا کاتب نقلی رسول ہے اور سنہ کتابت ۱۲۶۱
تیسرا نسخہ بانکی پور میں ہے جس کی تاریخ کتابت مذکور نہیں۔

حسان نگرامی
لکھنؤ

نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ میں

اہم طبی مخطوطات

انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں فارسی اور عربی کے ۳۵ طبی مخطوطات ہیں جن میں ۱۴ اہم مخطوطات ایسے پائے گئے ہیں جن پر یا تو اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا اور اگر ہوا بھی ہے تو منظر عام پر نہیں آسکا ہے۔ ذیل میں ہم ایسے مخطوطات پر تعارفی نوٹ پیش کر رہے ہیں :

۱۔ معالجات بقراطیہ : علاج و معالجہ سے متعلق اس کتاب کو علامہ ابوالحسن احمد بن محمد طبری نے تصنیف کیا تھا خط نسخ میں اس کی کتابت محمد امین ولد محمد باقر نے ۱۰۹۸ھ میں کی ہے۔ دو جلدوں اور ۲۳ × ۱۲ سنٹی میٹر سائز کے ۹۸۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۱۰ مقالات شامل ہیں اگرچہ تمہیدی عبارت میں ۲۰ مقالات کا تذکرہ ہے مگر فہرست میں صرف ۱۰ مقالات کے عنوانات دیئے گئے ہیں اور یہی ۱۰ مقالے دونوں جلدوں میں مذکور ہیں۔

آغاز : " الحمد للہ المنفرد بوحدانیتہ الخ ثم انی رأیت الاوایل من افاضل الاطباء سے ہوتا ہے اور کتاب کا اختتام تمت المقالۃ العاشرۃ من الکناش المعروف بالمعالجات البقراطیہ بعون اللہ وحسن توفیقہ فی العشر الاخیر من شہر رمضان المبارک لعام ثامن وتسعین والف من الہجرۃ النبویہ پر ہوتا ہے۔ فن معالجات پر انتہائی اہم کتاب ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کے اردو میں ترجمہ کا کام سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے زیر نگرانی جاری ہے۔ کتاب کا لائبریری کارڈ نمبر BUQ-M0A / AN/615 (195-96) ہے۔

۲۔ کتاب المغنی : ادویہ مفردہ سے علاج پر مشتمل ضیاء الدین ابن بیطار ۱۲۴۸ء نے اسے تصنیف کیا تھا۔ کتاب ۳۰ × ۲۱ سائز کے ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ کاتب کا نام معلوم

نہیں ہو سکا۔ خط نستعلیق میں لکھی گئی ہے۔ ۲۰ بابوں پر مشتمل کتاب میں سر سے پیر تک کے جملہ اعضا کے امراض کے علاج کا تذکرہ بڑے اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔

ابتدا : " الحمد للّٰہ الذی انزل لکلّ داءٍ دواء " سے اور اختتام " عن المکان الّذی فیہ " پر ہوتا ہے۔ مخطوطہ اگرچہ کرم خوردہ ہے تاہم پڑھا جا سکتا ہے موضوع اور انداز بیان کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ لائبریری کارڈ نمبر ۰۰۷ ہے۔

۳ ۔ زبدۃ الطب : تشریح اور معالجات پر مشتمل ابو ابراہیم اسمٰعیل جرجانی کی شاہکار تصنیف ہے۔ ۲۹ × ۱۹ سنٹی میٹر سائز کے ۴۰۲ صفحات کی اس کتاب کی کتابت خط نستعلیق میں عطاء اللہ نے ۱۱۹۸ھ میں کی ہے۔ کتاب کا آغاز " بسم اللّٰہ الخ فاعلموا ان مبنی علم الطب ومدارہ علی معرفۃ حالۃ بدن الانسان " سے اور اختتام " فان زاد المرض فینبغی ان یراد الدواء " کی عبارت پر ہوتا ہے۔ کتاب جامع ہے۔ اس پر کام کی ضرورت ہے۔ لائبریری کارڈ نمبر ABU - ZAB $\frac{AM}{615}$ (7006) ہے۔

۴ ۔ المنصوری : ابوبکر محمد بن زکریا رازی (۸۶۰ - ۹۳۲ء) کی ۲۴۴ سے زائد تصنیفات کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے۔

زکریا رازی کی تقریباً ۱۰ کتابوں کے ترجمے لاطینی اور انگریزی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اگرچہ اس کی بیشتر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تاہم اس کی بہت سی کتابیں جن میں " المنصوری حفظ الصحۃ للاعضاء موجودۃ ووردھا مفقودۃ " اور " رسالۃ فی الجدری والحصبۃ " اب بھی طباعت کی محتاج ہیں۔

ذیل میں ہم عربی زبان کے ایک اہم طبی مخطوطہ کتاب المنصوری پر تبصرہ پیش کر رہے ہیں۔ ۲۶ × ۱۳ سنٹی میٹر سائز کے ۲۸۵ صفحات پر مشتمل اس مخطوطہ کی کتابت خط نستعلیق میں ۱۱۱۱ھ میں محمد علی نے کی ہے۔ مخطوطہ کی عبارتِ ابتدائی : " الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین الفہ الحکیم ابوبکر محمد بن زکریا الرازی للامیر منصور بن اسحٰق بن اسمٰعیل بن احمد صاحب خراسان " سے پتہ چلتا ہے کہ اس کتاب کو رازی نے حاکم خراسان منصور بن اسحٰق کی ایما پر تصنیف کیا تھا۔

دس مقالات پر مشتمل اس مخطوطہ میں فن طب کے جملہ موضوعات سے متعلق ایجاز و اختصار کے ساتھ بڑی عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ اگرچہ اختصار غالب ہے، تاہم چھوٹے چھوٹے مختصر جملے زبردست فنی

اہمیت کے حامل ہیں۔

پہلا[۱] مقالہ ۴۴ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں طب کے مبادیات اور جسم انسانی کے تمام اعضا کی تشریح سے بحث کی گئی ہے۔ علیحدہ علیحدہ عنوانات کے ذریعہ تمام اعضا کی شکل و وضع کا تذکرہ آسان اور عام فہم انداز میں کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ مخطوطہ کے صا تا ص۵۵ پر محیط ہے۔

دوسرا[۲] مقالہ ۵۹ فصلوں پر مشتمل ہے اس میں مزاج طبعی اور غیر طبعی کی علامات اور تمام اعضا کی طبعی و غیر طبعی علامات مختصر مگر بعید جامع انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔ ص۵۶ تا ص۷۹

تیسرا[۳] مقالہ ۲۴ فصلوں پر مشتمل ہے اس میں ادویہ اور اغذیہ کے ذیل میں تمام حبوب و بذور جملہ اقسام شراب، لحم، اعضا حیوانات، روغنیات، خوشبوئیات، میوہ جات کوامخ و صبوغ کو مختصر طور سے بیان کیا گیا ہے۔ اعضاء حیوانات، دودھ اور انڈوں کا تذکرہ انفرادی خصوصیت کا حامل ہے (ص۸۰ تا ص۱۳۷)

چوتھا[۴] مقالہ ۱۰۵ فصلوں پر مشتمل ہے۔ حفظان صحت کے زریں اصولوں سے بحث کرتا ہے۔ تمام جسمانی افعال کے طبعی حدود کے ساتھ ساتھ اعتدال سے تجاوز سے پیدا شدہ نقصانات اور تمام اعضاء کی حفظ صحت سے متعلق تدابیر علیحدہ علیحدہ عنوانات کے تحت تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔ مقویات و مضعفات اعضا کا تذکرہ بیجا افادیت سے بھرپور ہے (ص۱۳۸ تا ص۱۶۶)

پانچواں[۵] مقالہ ۲۵ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ میں زینت سے متعلق بڑی خوبصورتی سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ تمام اعضاء زینت خاص طور سے بالوں کے رکھ رکھاؤ سے متعلق بیان انتہائی جامع ہے، اعضاء زینت میں پیدا ہونے والے عوارض کے ازالہ کی تدابیر کافی تفصیل سے تحریر کی گئی ہے۔ ص۱۶۷ تا ص۱۹۵)۔

چھٹا[۶] مقالہ ۲۰ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں سفر سے متعلق ہدایات، پیدل چلنے کے نقصانات اور موسمی اثرات سے تحفظ کے طریقے بیان کیے گئے ہیں (ص۱۹۶ تا ص۲۱۰)۔

ساتواں[۷] مقالہ ۲۵ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں زخموں اور جراحتوں کے علاج کے طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ ہڈیوں کے کسر و خلع، جبیرہ باندھنے کی تدابیر، فصد، علق وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے (ص۲۱۱ تا ص۲۳۵)

آٹھواں[۸] مقالہ ۵۵ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تمام سموم حیوانی، معدنی و نباتاتی

کی علامات و علاج سے بحث کی گئی ہے۔ زہریلی ادویہ کی اصلاحات کے طریقے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ (ص ۲۳۶ تا ص ۲۶۳)۔

نواں (۹) مقالہ ۸۹ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس مقالہ میں سر سے پیر تک کے جملہ امراض کے اسباب، علامات اور علاج کو مختصر طور پر لکھا گیا ہے۔ (ص ۲۶۳ تا ص ۳۲۵)۔

دسواں (۱۰) مقالہ ۲۸ فصلوں پر مشتمل ہے جس میں حمیات کی جملہ اقسام، علامات اور بحران کی علامات و علاج کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے (ص ۳۲۶ تا ص ۳۸۵)۔

کتاب کا اختتام "وقد انتہی علی جمیع المقالات و تم ھذا الکتاب و للّٰہ الحمد وکتبہ محمد علی فی عام ۱۱۸۱ھ بعون اللّٰہ" پر ختم ہوتا ہے۔ زیر بحث مخطوطہ کا لائبریری کلاذ نمبر ABU - MAN / $\frac{A.M}{615}$ (700B) ہے۔ اگرچہ مخطوطہ کے صفحات کہیں کہیں کرم خوردہ ہیں تاہم بحیثیت مجموعی مخطوطہ بہتر حالت میں ہے۔

اگرچہ لابر المنصورم کے نام سے لاطینی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ تاہم کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اگر انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ کیا جائے تو جدید سائنس کے دور میں طب قدیم کی ایک اہم کتاب منظر عام پر آئے گی اور اس طرح طب یونانی کی افادیت کے بہت سے روشن پہلو سامنے آئیں گے۔

●●

ڈاکٹر تنویر احمد علوی (دہلی)

طبی مخطوطات مخزونہ خانقاہ ابوالخیر

خانقاہ ابوالخیر شاہجہاں آباد (دہلی) کی ممتاز خانقاہوں میں سے ہے۔ یہیں حضرت شاہ غلام علی اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں کے مزارات مقدس ہیں۔ یہ درگاہ چتلی قبر سے ترکمان دروازہ کی جانب آگے بڑھنے والی سڑک کے ایک گوشہ میں واقع ہے ۔۔۔ اس کے سجادہ نشین و متولی حضرت زید ابوالحسن فاروقی النقش بندی ہیں جو اپنے علم و فضل کے اعتبار سے مغتنمات روزگار میں سے ہیں۔ خانقاہ میں واقع اس کتب خانے کی عمارت ابھی نئی بنی ہے اور اس کی بیاض پیشانی پر مزین کتبہ فیہا کتب قیمہ سے آراستہ ہے۔

قرابادین ذکائی اور قرابادین شفائی کے دو قلمی نسخے اس کتابخانہ کے قلمی مخزونات میں شامل ہیں جن کا تعارف ذیل میں کیا جاتا ہے:

قرابادین ذکائی محررہ ۱۲۶۱ھ تقطیع ۱۰×۶/۴ ہے، اوراق ۲۲۲۔

آغاز: این عجالہ ایست نافع کہ بندۂ کمترین و گوشہ نشین و مسکین ذکاء اللہ ابن اسحٰق ابن اسماعیل الطبیب المشہور بین دیار الدہلی، الطبیب خاقان محمد بقا خان غفر اللہ لہٗ ولیا و احسن اللہ لہٗ ولیما در سلک جمع و تالیف و حیز تہذیب و ترتیب در آمدہ نسخہ مجربہ جد بزرگوار و والد نامدار کہ در قرابات جسیم و سطولات عظیم در بیاضہائے متفرق بود کہ آن را بر باد می داد دریں سفینہ خالی از جیبہ نہاد و نام آن را بہ لفظ ذکائیہ منتخب از مجموعہ بقائیہ بر طبق الہام خداوند علام بہ افواہ خواص و عوام در داد۔

قرابادین شفائی تقطیع ۵½×۸/۴ ہے مسطر بارہ سطری متن ۱۴۲ اوراق پر مشتمل ہے نشانات شمار موجود نہیں۔ اسی ورق پر اس کا اختتامیہ تحریر ہے۔

"تمام شد کتاب قرابادین طب فرمائی حکیم شفائی بستم ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۶۸ھ روز سہ شنبہ پیر اسوج برلسے (ماہ) جیٹھ سمبت ۱۹۰۹ بکرمی تمام شد کار من نظام شد فقط"

اسکے نیچے کسی سرخ روشنائی سے مالک جودھیا پرشاد عطار ساکن صاحب آباد محلہ چھپر والہ بعد ازاں زیریں سطر میں یہ شعر درج ہے ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

نیز اجودھیا پرشاد دیا لگ رام کے دستخط ہیں اور ان سے بیشتر یہی نام لکھے گئے ہیں۔

آغاز: این کتاب نسخہ بستغوذ عجائب و غرائب مجرب است نوشتہ شد۔ اس میں کل ۲۴ نسخے ہیں۔ مناسبہ موشوقہ معقول علیہا حکمائے متقدمین و متاخرین۔ منتخب و مترجم نمودہ بآن ــــ منتظم کردہ تا کتاب جامع از سائر قرابادینات باشد در ترتیب حروف ہجی مرتب ساختہ مامول کرم کرام اگر چوں بر سہو اطلاع یابند برقم شفقت اصلاح فرمایند۔

اس سے پیشتر ۱۲ اوراق طب اکبری فہرست مضامین سے متعلق ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ فن طب شریف ترین ہے اور اس کے ساتھ ذہن انسانی کے بیحد لطیف اکتسابات وابستہ رہے ہیں مخطوطوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے طبیب فلسفہ و منطق تو عام طور پر جانتے ہی تھے عربی اور فارسی میں بیشتر درجہ فضیلت رکھتے تھے۔ نیز فن موسیقی اور دوسرے متداول سلسلہ ہائے علمیت سے بھی وہ گہری دلچسپی اور واقفیت رکھتے تھے۔ فن دواسازی کے اکتسابات کو تو انھوں نے فائق آرٹس کے درجہ میں لاکھڑا کیا تھا اور یہ ان کی علمی دیانت تھی کہ اس فن کا مرتبہ اپنی کوششوں سے انھوں نے ایسی اونچی محراب پر سجایا جہاں اب ہر ایک کا ہاتھ پہنچنا مشکل ہے پھر بھی وہ اسے طب یونانی کہتے رہے۔

آگے چل کر سبب تالیف کے سلسلہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ میرے دل میں یہ ہوا کہ میں ایک ایسا نسخہ مجامع الفوائد ترتیب دوں جو اس خاص فن سے متعلق کتب طبیہ اور صحت ... پر حاوی ہو۔

اس کے بعد مؤلف نے اس کا اظہار کیا ہے کہ اس فن کے رسائل معتبرہ میں اسباب علامات مع الکلیات مذکور ہیں لیکن جیسا کہ کتاب نفیس انتساب شرح اسباب العلامات والمعالجات میں بتوضیح ان کا ذکر آیا ہے کہیں اور نہیں ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شرح اسباب فنی قدر و قیمت اس دور میں مؤلف مترجم کی نگاہ میں کیا وہ اس مجموعہ کو کثیر النفع کہتا ہے اور بکمال متانت و اعتبار سے ... قرار دیتا ہے۔

بایں ہمہ اس نے دلائل زائدہ کو اپنے یہاں شامل نہیں کیا اور ان میں سے گویا بعض دلائل کو ترک کرنا اور درست تصور کیا اور بعض مواضع میں اضافہ و ایزد درمن جملہ لوازمات قرار دیا۔

اپنے ان اضافی ماخذ کے ذیل میں صاحب ترجمہ نے قانون اقسرائی، سدیدی، موجز، ذخیرہ مانند کتاب مجاہدیہ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے علمی اور فنی نقطۂ نظر سے جو فائدے مترجم نے اٹھائے ہیں وہ اپنی جگہ پر ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس نے ترجمہ اور اضافوں سے متعلق اپنے طریق رسائی کی وضاحت کر دی ہے۔

حکیم انیس الزمان (سہسرام)
حکیم محمد ابراہیم خاں سعیدی (سہسرام)

ذخیرہ سہسرام

(۱)

حکیم انیس الزمان

مفید المعالجین کو سہسرام کے مولوی حکیم حسن علی ولد حکیم یار محمد مرحوم بن حکیم غلام علی بن حکیم حکیم محمد مسعود نے ۱۲۷۷ ہجری میں مرتب کیا اور سہسرام ہی کے محمد علی ولد حکیم سراج مرحوم نے ۲۹ رجمادی الاولیٰ ۱۲۸۲ ہجری میں دوشنبہ کے دن کتابت تمام کی۔ صفحات ۱۹۸، کتابت خط نسخ میں، عنوانات سرخ روشنائی سے۔

کتاب کی زبان سادہ فارسی ہے۔ البتہ کہیں کہیں ہندوستانی زبان کے الفاظ بھی استعمال ہو گئے ہیں۔ مثلاً "علاج شقاق ایڑی"، "علاج ایرس وچھاجن"، "علاج جراحت تیغ وتبر وگولی"، "علاج سوختگی زبان از چونہ، ننقدری بارچہ لیپ نمودہ"، "موافق ناسور بتی ساختہ" وغیرہ۔ بعض دواؤں کے نام بھی ہندی یا مقامی ہیں مثلاً دوب، ہلدی، برگ کنگھی وغیرہ۔

مؤلف نے بسم اللہ سے شروع کر کے حمد و نعت کے چند جملے لکھے ہیں اور اس بیت پر ختم کیا ہے۔

ای شافی امراض شفا می بخشا   این درد مرا جز کرمت نیست دوا

مفید المعالجین درحقیقت مؤلف کی طبی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ لکھتے ہیں۔ "از آنجا کہ بر تجربہا حاصل شدہ بود و ہم اصرار واعادۂ بعض احباب واعزہ میشی نظر داشتم ہمچناں گذاشتن دریغ آمد در ۱۲۷۷ھ یک ہزار دو صد ہفتاد و ہفت ہجری بہ عرق ریزیہای تمام فراہم آوردہ بہ مفید المعالجین موسوم گردانیدم و بر شش تشخیص مرتب ساختم۔"

تشخیص اول در بیان نبض، تشخیص دوم در بیان بول، تشخیص سوم در بیان معالجات، تشخیص چہارم در مرکبات، تشخیص پنجم در طریق و دستور استعمال و ساختن و تصعید و احراق و غسل بعض ادویہ مفردہ دیگر، تشخیص ششم در امتحان بعض ادویات۔

منابع و مراجع کے ضمن میں لکھتے ہیں "تفصیل اسامی کتب مستنبط منہا ۱۔ مجربات سجادیہ کہ تالیف افلاطون دوراں استاذی مولوی حکیم حیدر علی صاحب از بیاض استاذ الاستاذ حکیم غلام سجاد فراہم آوردہ بنام آں

آں مبرور مغفور موسوم گردانیدہ اند ۲۔ دستور العمل مسیح ثانی استاذی مولوی غلام جیلانی مصنف صاحب ۳۔ مجربات حکیم راحت علی ۴۔ علاج الابدان ۵۔ مجربات التداوی ۶۔ ذخیرہ خوارزم شاہی ۷۔ موجز القانون ۸۔ شرح اسباب ۹۔ سدیدی ۱۰۔ رسالہ حنفی ۱۱۔ کفایہ منصوری ۱۲۔ مجربات عجیب ۱۳۔ مجربات احسانی ۱۴۔ منتخب الاطبار ۱۵۔ مغنی العلاج ۱۶۔ طب اکبر ۱۷۔ مفرح القلوب ۱۸۔ میزان طب ۱۹۔ قرابادین قادری ۲۰۔ قرابادین شفائی ۲۱۔ رسالہ ترجمہ جالینوس ۲۲۔ مجموعۃ الصنائع ۲۳۔ سر دلبر الفوائد۔ ۲۴۔ نہج التحفات ۲۵۔ رسالہ نار فرنجیہ ۲۶۔ قرابادین بقائی ۲۷۔ تحفۃ المومنین ۲۸۔ مخزن الادویہ ۲۹۔ طب یوسفی ۳۰۔ رسالہ تریاق اکبر ۳۱۔ رسالہ تریاق فاروق ۳۲۔ معالجات النبوی ۳۳۔ رسالہ جعفری ۳۴۔ رسالہ علاج الصبیان ۳۵۔ قرابادین کبیر۔

حکیم حسن علی مرحوم نے ۱۹۸ صفحوں کی مفید المعالجین میں مذکورہ ۳۵ کتابوں کا نچوڑ قلمبند کر دیا ہے۔ نبض اور بول پر کافی توجہ مبذول کی ہے۔ کئی صفحے نبض کے نقشے کے ساتھ تحریر کئے ہیں اور اسی طرح بول کے موضوع کو قارورہ کے شیشے کی تصویر اور اس میں بول کی کیفیت کی نشان دہی بھی کی ہے۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ انسانی اور حیوانی بول کی تفریق کے گر بھی بتائے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں (۱۲۸۶ ہجری) طبیب بھی عوام کی آزمائش سے گذرتا تھا۔

مرض کا نام دیگر نسخہ تحریر کیا گیا ہے۔ شاذ و نادر ہی مرض کی علامات قلمبند کی گئی ہیں اور اگر کسی جگہ یہ نیک کام کیا بھی گیا ہے تو بہت اختصار سے جہاں جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے زبان زبان تصویر میں بھی بتادی گئی ہیں۔ مثلاً عرق نمک کشید کرنے کا طریقہ اور نقشہ، عطر گلاب اور عطر کیوڑہ کا طریقہ تصویر کے ساتھ۔

تشخیص ششم کے تحت دواؤں کی پہچان کے طریقے دلچسپ ہیں مثلاً مشک کی پہچان کے متعلق لکھتے ہیں: آنچہ در نافہ باشد ریسمان را بہ سوزن اوّل از نافہ گذرانیدہ پس از وسطِ سیر گذرانند۔ اگر بوی سیر نہ دہد خالص است۔

فوائد المبتدی: حکیم رحمت اللہ صاحب (م ۱۱۸۵ھ) نے اپنے بیٹوں کے لئے مرتب کیا تھا۔ جن کے نام یہ ہیں حکیم سراج علی، حکیم مراد علی، حکیم یاد علی اور حکیم زاہد علی۔ یہ ہر ایک فرزند اپنے اپنے دور کے نامی گرامی طبیب گزرے ہیں اور اپنے شہر کے علاوہ راجہ مہاراجاؤں کے دربار میں رہ کر عوام کو فائدہ پہنچاتے رہے۔

ناچیز کے پاس جو نسخہ ہے اس کے کاتب و مالک زاہد علی ولد حکیم رحمت اللہ یعنی میرے جدامجد تھے۔

فوائد المبتدی جس کی تاریخ اختتام ۱۲۶۳ فصلی ہے اور جو ۱۰۴ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے چار مقالوں پر مشتمل ہے :-

مقالہ اوّل میں ۹ فصل، مقالۂ دوم میں ۲۲ فصل، مقالۂ سوم میں ۷ فصل اور مقالۂ چہارم میں دو فصلیں تحریر کی گئی ہیں۔ ان فصلوں کے کچھ موضوع یہ ہیں (۱) چاروں خلطوں کی علامتیں اور خواص (۲) سال کی چاروں فصلیں (۳) مفصودہ رگیں (۴) امراض کے درجات (۵) دواؤں کے درجات (۶) یعنی مفرد دواؤں کی خاصیت۔

فوائد المبتدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں بعض ضروری الفاظ اور اصطلاحات کے معنی بھی دے دیئے گئے ہیں۔

فوائد المبتدی کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکیم رحمت اللہ مرحوم نے اس کتاب کو لکھنے میں کسی اور کتاب کی مدد نہیں لی تھی۔ نسخوں سے پتہ چلتا ہے کہ ذاتی تجربے میں آئے ہوئے تھے۔

بیاض مثلث: حکیم بدرالدین صاحب نے اپنے ذاتی تجربہ میں جو نسخے آئے اور آخر عمر تک معمول مطب رہے ان تمام نسخوں کو بیاض مثلث میں ۲۹ صفحات پر مشتمل بزبان فارسی درج کیا ہے۔ اس کا اختتام ۱۳۳۰ میں ہوا۔

حکیم بدرالدین صاحب کے تین لڑکے تھے۔ ایک حکیم ہوئے جن کا نام حکیم عبدالوحید تھا۔
———— دوسرے حکیم اجمل صاحب کا تھا چنانچہ حکیم بدرالدین صاحب نے ————
حکیم عبدالوحید صاحب کو حکیم اجمل خاں صاحب کی شاگردی میں دہلی بھیجا وہاں سے وہ فارغ ہوئے۔ اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ حکیم بدرالدین صاحب زیادہ تر راجہ صاحب امبیکا پور میں مہاراجہ کے دربار میں طبیب بن کر رہے اور مہاراجہ کے ساتھ ساتھ تمام سلطنت میں رہنے والوں کے معالج رہے۔

کتاب کی تحریر شروع سے آخیر تک خوشخط ہے۔ طغریٰ بسم اللہ کے نیچے یہ لکھتے ہیں فہرست کتاب مثلث کہ ہر نسخہ اش نایاب است فصل در امراض راس سے شروع کر کے فصل ایک سے فصل ۱۱۲ پر ختم کیا ہے جس میں تمام امراض میں کتابت بہت عمدہ کی ہے۔ روشنائی چائنل والی استعمال کی ہے۔

حکیم محمد ابراھیم خاں سعیدی

(۲)

مفید المعالجین: مفید المعالجین کو سہسرام کے مشہور نثار و شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف مولانا حکیم حسن علی ابن حکیم یار محمد سنہ ۱۲۲۲ھ میں تصنیف فرمایا اور سہسرام ہی کے مولوی حکیم ابو صالح محمد سعید خاں سہسرامی ابن شفاعت علی خاں نے دو جلدوں میں مرقوم فرمایا۔ جلد اوّل کی کتابت یکم محرم الحرام ۱۳۲۵ھ یوم دوشنبہ کو تمام ہوئی اور جلد دوم کی کتابت ۲۴ ربیع الآخر روز دوشنبہ ۱۳۲۵ھ کو اختتام پذیر ہوئی۔ جلد اوّل کے کل صفحات ۲۴۹ جلد دوم کے صفحات ۱۳۹۔

کاتب نے اس کتاب کو خط شکستہ میں تحریر کیا ہے۔ جلد اوّل میں عام عبارت اور عنوانات سبز روشنائی سے نمایاں کئے گئے ہیں۔ کتاب کی زبان فارسی ہے۔

بیاض حکیم علی الزماں خاں سہسرامی: تصنیف کا آغاز ۱۶ صفر المظفر ۱۳۱۶ھ سے ہوا اور اختتام یکم ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ کو ہوا۔ مرقومہ حکیم رشید الزماں بن حکیم علی زماں خاں ۱۹۳۵ء۔

حروف شکستہ زبان فارسی، کہیں کہیں بعض الفاظ اردو کے بھی آگئے ہیں۔ روشنائی سیاہ اور سبز کاغذ پرانا اور رولدار۔

کتاب کے دو جز ہیں۔ ۴۲ صفحات کا پہلا جز نسخہ جات پر مشتمل ہے اور ۔ صفحات کا دوسرا جز اور دوسرا معالجات پر۔ پیش لفظ یہ ہے:۔

باید دانست کہ ہمہ نسخہ جات بر صدہا مریضان آزمودہ است، خطا ہرگز ہرگز نہ کند بشرطیکہ تشخیص صحیح و درست بود و ہمہ نسخہ جات مذکور دماغی اند کتابی نیست شاید ہم بگذرند کہ کتابی نسخہ جات اند ہرگز ہرگز نیست۔

بیاض حکیم شمس الدین سہسرامی: شکستہ حالت میں ایک قلمی بیاض میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے جس کا تفصیلی مطالعہ ابھی نہیں کیا جا سکا ہے۔ البتہ اس کے ایک صفحہ پر ذیل کی عبارت ہے:۔

"الحمد للہ و المنۃ کہ نسخہا متفرقاتی من مجربات حکیم ابراہیم صاحب و حکیم یعقوب صاحب و عبدالحمید صاحب عظیم آبادی بہ ترتیب حروف تہجی از دست عاصی خادم الاطبا محمد شمس الدین عفا عنہ بتاریخ بستم ماہ ذی الحجہ یوم جمعہ مبارک ۱۳۱۵ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رقم گردیدہ"۔ راقم الحروف کا خیال

ڈاکٹر معین الدین اعظمی حیدرآباد

اورینٹل لائبریری حیدرآباد میں اہم طبی عربی مخطوطات

اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، جو پہلے آصفیہ لائبریری کے
نام سے موسوم تھا، یہاں ۳۰۷ طبی قلمی نسخے موجود ہیں۔

۱۔ اساس الطب / جامع الشفاء:۔ مصنف کا نام ہے جالینوس۔ دوسری صدی ھ میں حنین بن اسحاق[1]
(۱۹۴-۲۶۰ھ) نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔ کتاب ۳۶۹ صفحات پر مشتمل ہے ہر ورق پر سترہ سطریں ہیں۔
(اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں اس کا نمبر ۴۲۳ ہے)۔ اس میں نادر کئی
مشہور حکیموں کے رسائل بھی ہیں جو بہت کمیاب، نایاب اور اہمیت کے حامل ہیں جیسے
(۲) زکریا رازی (۳) طاہر بن ابراہیم السجزی (۴) محقق الطوسی (۵) محمد الخجندی (۶) ابوسہل عیسیٰ (۷) ابن
یحیی المسیحی۔

اس کتاب کو حکیم سید محب حسین افسر الاطباء حیدرآباد نے جامع الشفاء سے تعبیر کیا ہے۔ کتاب کی
اہمیت کا اندازہ اس کے مصنف و مترجم سے ہو سکتا ہے۔ نیز اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے
ایک طبیب کو یہ نسخہ امیر کابل سے ۱۰۰۲ یعنی گیارہویں صدی کے آغاز میں ملا تھا۔

جالینوس نے اپنے اس رسالہ میں انسانی جسم کو لاحق ہونے والے مختلف امراض کو بیان کیا ہے۔

۲۔ جوامع الکحالین:۔ مصنف کا نام بقراط ہے (۴۶۰-۳۷۷ ق-م) اور مترجم کا نام حنین بن اسحاق ہے۔
کتاب ۴۸۸ صفحات پر مشتمل ہے، ہر ورق پر ۱۵ سطریں ہیں (اورینٹل مینسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں
یہ کتاب نمبر ۸ طب کے تحت درج ہے) مترجم کا نام موجود نہیں ہے مگر دوسرے مقالہ میں لکھا ہے کہ
للمقالة الثانية من فصول بقراط نقل حنين بن اسحاق، یعنی فصول بقراط کا دوسرا مقالہ حنین بن
اسحاق کا ترجمہ کردہ ہے۔ گویا سارے کتاب حنین کا ترجمہ کیا ہوا ہے۔

فصول بقراط کی اور شرحیں ہیں جیسے علامہ قرشی، ابن القف اور عبد اللطیف بغدادی کی
کا نمبر ۱۵، ۱۷۰ اور ۲۰۴ ہے۔

---

(۱) [illegible] طبقات الاطباء ص ۲۶۳ [illegible] مقالات حکیم ۶۵ ص ۱۴

اس کتاب میں آنکھوں کے امراض کا بیان ہے۔ کتاب کئی مقالوں پر منقسم ہے ہر مقالہ میں مختلف ابواب ہیں۔ جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کحال آنکھ کے ڈاکٹر کو کہتے ہیں اور جوامع کے معنی خیال کے ہیں۔ یعنی آنکھ کے ڈاکٹروں کی رائیں جمع کی ہیں۔

۳۔ **عین الحیات**: مصنف کا نام محمد بن یوسف الطوعی ہے (۹۳۹ھ) کتاب ۱۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۱۸ سطریں ہیں (یہ کتاب نمبر ۲۲۶ طب کے تحت درج ہے) مصنف نے اس کو ۹۳۹ھ میں تصنیف کیا، طب کی مشہور کتابوں سے ماخوذ ہے جیسے ابن سینا کی القانون، التذکرہ، ابن جزلہ کی المنہاج، ابن ہبل کی المختارات۔ کتاب چند مقاصد پر مشتمل ہے پہلے مقصد میں حرارت طبیعی کی تحقیق ہے۔ دوسرے مقصد میں ان چیزوں کا بیان ہے جو حرارت طبیعی کو طاقت بخشتی ہیں اور عمر دراز کرتی ہیں۔ اس میں پھل ترکاری اور مختلف قسم کے پودوں کے خواص اور فوائد و نقصانات بیان کیے گئے اور ان کو ابجدی طریقہ سے ترتیب دیا ہے یا بیان کیا ہے۔ تیسرے مقصد میں ان چیزوں کو بیان کیا ہے جو عمر کو کم کرتی ہے ان میں ۲۵ چیزوں کا ذکر ہے۔ قدیم حکماء جیسے جالینوس، حنین بن اسحاق کے اقوال سے استدلال کیا ہے۔ جماع کے فوائد و نقصانات سے خاص طور پر بحث کی ہے اس طرح یہ کتاب زندگی کے لیے چشمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۴۔ **مجموعۃ الرسائل الطبیۃ**: یہ کتاب آٹھ مشہور اطباء کے رسائل پر مشتمل ہے جیسے بوعلی سینا، ابوبکر زکریا رازی اور مسعود بن محمد سنجری۔ مگر کس نے ان کو جمع کیا ہے یہ معلوم نہیں۔ یہ کتاب ۲۱۵ صفحات پر مشتمل ہے ہر صفحہ پر ۱۵ سطریں ہیں (اس کتاب کا نمبر اندراج ۲۲۴ ہے)۔

پہلا رسالہ بوعلی سینا (۹۸۰-۱۰۳۷) کا ہے جو رسالہ فوائد کے نام سے جانا جاتا ہے اس کا دوسرا نام تدارک الخطا بھی ہے۔ یہ ۲۵ صفحات پر مشتمل ہے اس کو ابوالحسن احمد بن محمد السہلی کے حکم سے جمع کیا گیا۔ مذکورہ رسالہ سات مقالوں پر مشتمل ہے۔ چھٹے مقالہ میں جنسی امراض و علاج سے بحث کی ہے۔ اس رسالہ میں ان چیزوں کا ذکر ہے جو صحت کے لیے مفید و مضر ہیں۔

دوسرا رسالہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ زید بن احمد بن سہل البلخی کا ہے۔ تیسرے رسالہ کا نام حفظ الادویہ علماء و احوالہا ہے۔ اس میں ۲ ابواب ہیں۔ دواؤں کا ذکر ابجدی طریقہ پر کیا ہے۔ چوتھے رسالہ کا نام حقائق اسرار الطب ہے جو مسعود بن محمد السنجری کا ہے جس کو قاسم بن عمران بن جعفر کے لیے تصنیف کیا گیا تھا۔ یہ رسالہ ۱۰ مضمون پر مشتمل ہے اور تین فن پر منقسم ہے۔ ہر فن میں چند قسمیں ہیں تیسری قسم میں دوا سازی کے طریقہ کا ذکر ہے۔

پانچواں رسالہ تقراط کا ہے جو رسالہ تقراطیہ کے نام سے جانا جاتا ہے اس کا مترجم کون ہے معلوم نہیں۔
بقراط نے بہت سے امراض کی نشانیاں اور علامتیں بتائی ہیں اور بتایا ہے کہ کس قسم کی علامت کے
کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ رسالہ چھپ گیا ہے
چھٹا رسالہ شیخ بو علی سینا کا ہے جو رسالہ الہندیا کے نام سے موسوم ہے۔

الکافی فی صناعۃ الطب :- مصنف کا نام ابن العین زربی ہے (۵۴۸ھ م) آپ فن طب
کے ماہر تھے۔ اور اس زمانے کے امراء و حکام آپ سے طبی مشورہ کرتے تھے۔ ابن ابی اصیبعہ نے عیون الانباء
فی طبقات الاطباء[1] میں ان پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ الکافی[2] ان کی مشہور کتابوں میں سے ہے۔ یہ کتاب ۲۰۸ صفحات کی
ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۶ سطریں ہیں۔ آپ نے آنکھ، ناک، کان، بال اور جنسی امراض سے بحث کی ہے۔
آخر میں بخار کی قسموں اور اس کے اسباب و علاج کا ذکر کیا ہے۔ مرض کی تحلیل و تفصیل اور بہت
ہی محققانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں۔

المعتمد فی الادویۃ المفردۃ :- مصنف کا نام عمر بن یوسف ہے آپ یمن کے بادشاہوں میں سے
تھے ۶۹۶ھ میں آپ کی وفات ہو گئی۔
یہ کتاب ۲۹۷ صفحوں پر مشتمل ہے۔ ہر صفحہ پر ۲۸ سطریں ہیں (۱۸ فن طب اس کا مطبوعہ نسخہ ہے)۔ یہ
ابن بیطار مغربی اور دوسرے اطباء کی کتابوں کا خلاصہ ہے۔ جیسے ابن جزلہ کی المنہاج اور زہراوی کا
جیسا کہ مصنف خود مقدمہ میں فرماتے ہیں "اختصرت ہذا الکتاب من کتب جمعت... میں نے
اس کو ان کتابوں سے جمع کیا ہے جن میں تفصیل و اطناب تھا وسمیتہ بکتاب المعتمد فی الادویۃ المفردۃ۔
اس کتاب میں مصنف نے غذاؤں اور دواؤں کے فوائد و نقصانات کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں
المقصود من کتاب المعتمد المختصر من کتاب الجامع لقوی الاغذیۃ والادویۃ
الف بائی طور پر مرتب ہے "و رتبتہ علی ترتیب حروف المعجم لیکون اقرب متناولا و افہم"
مثلاً اگر دودھ اور گوشت کے فوائد و نقصانات یا خواص کو دیکھنا ہے تو لبن اور لحم میں دیکھنا ہوگا۔
یہ کتاب اس لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس میں سبھی قسم کی غذاؤں کے خواص و فوائد ہیں اور یہ کہ کون سی
غذا کس قسم کے مرض میں مفید ہے۔

تحفۃ الملوک فی الطب[؟] :- مصنف کا نام ابوالحسن احمد بن محمد الطبری ہے۔ اس کتاب

[illegible] ہم نے بتایا ہے کہ صاحب [illegible] کے یہاں [illegible] اور [illegible] ہیں

کے دو نسخے ہیں ایک کا نمبر ۱۲۸ ہے جو خط نسخ میں خوشخط لکھا ہوا ہے۔ یہ ۲۷۰ صفحوں میں ہے ہر صفحہ پر ۲۱ سطریں ہیں۔ دوسرے نسخے کا نمبر ۲۱۴ ہے جو نستعلیق عادی میں لکھا ہوا ہے۔ یہ ۱۸۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔ کتاب کا دوسرا نام المعالجات البقراطیہ بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں فرماتے ہیں تمت المقالہ العاشرہ من الکناش المعروف بالمعالجات البقراطیۃ۔"

مصنف حاکم وقت رکن الدولہ دیلمی (۳۸۰ھ) کے حکیم و معالج رہے ہیں۔ اور اپنے زمانے کے بقراط و جالینوس شمار کیے جاتے تھے۔ آپ ابو ماہر موسیٰ بن سیار کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ مصنف نے اس کتاب کو بقراط کے طریقہ علاج پر لکھا ہے۔ فرماتے ہیں "واسلک فیہ سبیل البقراطی فی صحۃ المعالجۃ" یعنی علاج کے سلسلہ میں میں نے بقراط کا طریقہ اختیار کیا ہے۔

ابن اصیبعہ تحریر فرماتے ہیں[1] "کہ کناش جو المعالجات البقراطیہ کے نام سے جانی جاتی ہے بہت نفع بخش کتابوں میں سے ہے۔ کتاب دس مقالوں پر منقسم ہے۔ ہر مقالہ میں ۳۰ سے لے کر ۵۲ باب ہیں۔

پہلے مقالہ میں ان چیزوں کا بیان ہے جن کا ایک طبیب کو جاننا ضروری ہے۔ دوسرے مقالہ میں سر کے امراض سے بحث کی ہے۔ تیسرے مقالہ میں باطنی امراض کو بیان کیا ہے۔ چوتھے مقالہ میں آنکھ کے امراض کو بیان کیا ہے۔ پانچویں میں ناک اور کان کے امراض کو بیان کیا ہے چھٹے میں منہ اور دانت کے امراض کو بتایا ہے۔ ساتویں مقالہ میں سینہ اور دل کے طریقہ تنفس کو بتایا ہے۔ آٹھویں میں معدہ اور شکم کے امراض کو بیان کیا ہے۔

۲۔ المغنی: ابوالحسن سعید بن ہبۃ اللہ (م ۴۹۰ھ) ص ۳۱۰، کتاب کا نمبر ۴۷۔

عباسی خلیفہ المقتدی بامراللہ (۴۶۷۔۴۸۷ھ) کے لیے تصنیف کی گئی۔ مقدمہ میں فرماتے ہیں:
"جب میں نے اپنے مخدوم و آقا کا روشن و تابناک زمانہ اور عظیم فضائل و مناقب دیکھا تو خیال ہوا کہ ان کے لیے طب میں ایسی کتاب تصنیف کروں جس میں امراض اور ان کے اسباب و علل کے جاننے کا طریقہ اور علاج ہو۔

سر اور قلب کے امراض، جنسی امراض، بخار کی مختلف قسموں کا بیان اور ان کے علاج پر روشنی ڈالی ہے۔ مرض کے ذکر کے بعد اسباب و علامات اور آخر میں علاج بتاتے ہیں۔

●●

---

(۱) [illegible] ص ۲۹۲

پروفیسر محمد حسن رضوی علیگڑھ

مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے طبّی مخطوطات

مولانا آزاد لائبریری میں طبی مخطوطات مسلم یونیورسٹی کلکشن کے علاوہ ذخیرہ جات جواہر یونیم، سبحان اللہ، حبیب گنج، احسن، عبدالحیٔ، آفتاب، سلیمان، قطب الدین، منیر عالم، شیفتہ، عبدالسلام پر مشتمل ہیں۔ زبان کے اعتبار سے تعداد یہ ہے:

عربی (۲۰۱)، فارسی (۲۶۶)، اردو (۴) = کل ۴۷۱ طبی مخطوطات

(مقالے سے متعلقہ اقتباس)

مقالہ نگار کے مقالہ کا بقیہ حصہ سدید الدین گازرونی (۷۰۹ھ)، بوبکر محمد بن زکریا الرازی، برھان الدین نفیس بن عوض الکرمانی، علی بن لعباس المجوسی، ابو ساھل عیسی بن یحیی المسیحی، محمد بن محمد یوسف العلاقی، نجیب الدین محمد بن علی السمرقندی (م ۶۱۹ھ)، بوعلی سینا، منصور بن محمد بن احمد بن یوسف، یوسف بن محمد بن یوسف لطبیب، ضیاء الدین عبداللہ ابن بیطار المغربی، شیخ داؤد بن عمر الانطاکی کے احوال پر مشتمل ہے۔

••

اے۔ حبیب خاں (دہلی)

ہمدرد انسٹی ٹیوٹ کے چند اہم طبی مخطوطات

ادارہ تاریخ و تحقیق طب کی لائبریری کے چند اہم اور نادر مخطوطات پیش کرنے سے پہلے اس ادارے کے بارے میں ایک تعارفی نوٹ پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کب عالم وجود میں آیا۔ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں اور کن مفید شعبوں پر مشتمل ہے۔

اس ادارے کا سنگ بنیاد ہمارے محبوب رہنما اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم مرحوم پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۵ر نومبر ۱۹۶۲ء میں دہلی سے تقریباً پندرہ کلو میٹر کے فاصلے پر تغلق آباد جیسے تاریخی مقام پر رکھا۔ اس ادارے کے وسیع پروجکٹ میں سب سے پہلے لائبریری اور میوزیم کی عمارت تیار ہو جانے پر ۱۲ر فروری ۱۹۷۰ء کو ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے لائبریری اور میوزیم کا افتتاح فرمایا۔

یہ انسٹیٹیوٹ ایک وسیع اور کثیر المقاصد پروجکٹ ہے جس میں لائبریری اور میوزیم کے علاوہ فارمیسی کالج، یونانی میڈیسن کالج، ریسرچ لیبوریٹریاں، ڈرگ فارم، ہربریم، ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی، مجیدیہ ہوسپیٹل، پرنٹنگ پریس وغیرہ شامل ہیں۔ یہ عظیم پروجکٹ جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی اولوالعزمی، جہد مسلسل اور عمل پیہم کا زندہ اور تابندہ شاہکار ہے۔ ادارے کے تمام شعبوں میں گذشتہ ۱۲ سال کے قلیل عرصہ میں جو ترقی ہوئی ہے اس کا اعتراف ہر ابن البصیرت نے کیا ہے،

ادارے کا کتب خانہ بھی جناب حکیم صاحب کے ذاتی گرانقدر اور نایاب مخطوطات اور قیمتی مطبوعات سے قائم ہوا جو حکیم صاحب نے ادارہ کو بطور عطیہ عنایت فرمائے۔ انسٹیٹیوٹ کے کتب خانہ میں ابتک تقریباً چالیس ہزار کتابوں اور رسائل کا قابل قدر ذخیرہ جمع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ فن یونانی طب کے چار سو نادر مخطوطات عربی اور فارسی میں جمع ہو چکے ہیں جو ادارہ کی لائبریری کو دوسری لائبریریوں

ممتاز کرتے ہیں۔ ان میں چند اہم اور نادر مخطوطات کا ذکر اس مختصر وقت میں کیا جا سکتا ہے:-

(۱) **الکافی فی الطب (عربی)**: یہ نادر و نایاب کتاب محمد الماز ندرانی متخلص بہ امانی کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ اصلاً یہ کتاب مصنف نے چھ جلدوں میں لکھی ہے لیکن I.H.M.M.R کی لائبریری میں اس کی تین جلدیں موجود ہیں (جلد ۴-۵-۶) جلد ۴ اور ۵ میں سر سے پاؤں تک واقع ہونے والے امراض، ان کی علامتیں اور اسباب وعلل بیان کئے ہیں۔ پھر امراض لاحقہ کے معالجات تحریر کئے ہیں۔ یہ دو جلدیں امراض جزئیہ وکلیہ وعامہ کا بسیط وجامع انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ جلد چھ آخری جلد ہے جس پر کتاب الکافی ختم ہوتی ہے۔ یہ جلد علم السموم سے متعلق ہے اس میں سمیات اور ان کے اثرات سے بچاؤ کے زود اثر طریقے اور علاج لکھے ہیں۔ کتاب الکافی کی یہ آخری تین جلدیں صرف I.H.M.M.R. کی لائبریری میں موجود ہیں۔ کسی اور لائبریری میں محمد الماز ندرانی کی اس کتاب کی موجودگی کسی کیٹلاگ نے ظاہر نہیں کی۔ اس اعتبار سے کتاب الکافی کا یہ نسخہ گویا دنیا میں واحد نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ اس نسخے کی کتابت وسجاوٹ بھی نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے، ہر صفحہ طلائی جدولوں سے آراستہ ہے اور ہر جلد کے شروع کے دو صفحے خاص طور پر طلائی لوح اور گلکاری سے مزین ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف نے کسی شاہی کتاب خانے کے لئے خاص اہتمام سے اپنی نگرانی میں لکھوایا ہے۔ چنانچہ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ حکیم مسیح الزماں خاں اور حکیم جعفر علی خاں کے کتب خانوں میں رہا۔ ان دونوں کا تعلق اورنگ زیب عالمگیر اور مہاراجہ جے سنگھ والیٔ جے پور کے درباروں سے تھا۔ ممکن ہے کہ اس کتاب کی جلد ۱-۲-۳ بھی کسی پرائیویٹ کلکشن یا غیر مشہور لائبریری میں موجود ہوں۔ لیکن ہم کو تلاش وجستجو کے باوجود کتاب الکافی کی ابتدائی تین جلدوں کا سراغ نہیں مل سکا۔ اگر تینوں جلدیں بھی مہیا ہو جائیں تو یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہمارے اطباء کرام اور محققین اس پر مقالے لکھیں۔ اس طرح اس نادر اور گرانقدر کتاب کی افادیت سامنے آ جائے گی اور طالبان علم وفن محمد مازندرانی کی پوری کتاب سے استفادہ کر سکیں گے۔

I.H.M.M.R. کے ہر سہ مخطوطہ جلدوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

(۱) الکافی جلد چہارم مکتوبہ ۱۱۴۲ھ جمادی اوّل بخط عبد اللطیف حیدر آبادی۔ اس جلد کا ترقیمہ مصنف نے خود لکھا ہے۔

(۲) الکافی جلد پنجم مکتوبہ [illegible] نقل از نسخہ مصنف کاتب عبد اللطیف حیدر آبادی۔

اس جلد کا ترقیمہ کاتب نے لکھا ہے۔

(۳) السادس جلد ششم مکتوبہ ۱۲۳۸ھ نقل از نسخہ مصنف کاتب محمد مقیم المازندرانی۔ اس جلد کا ترقیمہ بھی کاتب نے لکھا ہے۔

(۲) شفاء الصالح (قرابادین، فارسی):۔ شفاء الصالح فارسی زبان میں حکیم محمد صالح خاں بن حاجی محمد طاہر بیگ شیرازی کی معتبر و مستند تالیف ہے۔ جناب حکیم علی کوثر چاند پوری نے اپنی تالیف "اطباء عہد مغلیہ" میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ حکیم فتح اللہ شیرازی کے بھائی تھے اور عہد شاہجہانی میں (۱۰۴۷ھ/۱۶۳۷ء) شیراز سے ہندوستان آئے۔ اپنے زمانے کے مشہور و مقبول اطباء میں ان کا شمار تھا۔ ان کے معاصرین اور بعد کے اطباء کرام نے قرابادین شفاء الصالح سے استفادہ کیا ہے اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔

حکیم محمد صالح خاں اگرچہ اصلاً شیرازی تھے لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں گزرا اس لیے ہندوستان ان کا دوسرا وطن بن گیا۔ انہوں نے باشندگانِ ہند کے امراض کا علاج ہندوستان میں پیدا ہونے والی ادویہ سے کیا اور دوسرے اطباء کو بھی یہ مشورہ دیا کہ وہ یہاں کی دواؤں سے ہندوستانی باشندوں کا علاج کریں کیونکہ مزاج اور آب و ہوا کے لحاظ سے وہی ان کے لیے مفید اور پراثر ثابت ہوتی ہے۔

شفاء الصالح کی موجودگی کا ذکر کسی کیٹلاگ نے نہیں کیا اس لیے اس کتاب کی ندرت و اہمیت مسلمہ ہے۔ R.M.M.H.I. کی لائبریری کا یہ خطی نسخہ ۲۲×۲۹ سنٹی میٹر سائز کے ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت پختہ اور نستعلیق ہے۔ سنہ کتابت مرقوم نہیں ہے۔ اندازاً تیرہویں صدی ہجری کا مرقومہ ہے۔

(۳-۴) **تعلیم العلاج اور اختیارات ظفر خانی** (فارسی) یہ دونوں کتابیں عہد اورنگ زیب عالمگیر کے مشہور و معروف طبیب ظفر یار خاں خلف محمد الدین افلاطون کی اہم اور مفید تالیفات ہیں۔

تعلیم العلاج محمد شاہ بادشاہ کے آٹھویں سنہ جلوس (۱۱۴۰ھ/۱۷۲۷ء) میں مرتب ہوئی اور اسی بادشاہ کے نام سے معنون ہے۔ ظفر یار خاں حکیم علوی خاں معتمد الملک کے معاصر تھے لیکن ان کی قرابادین تعلیم العلاج حکیم علوی خاں کی قرابادین جامع الجوامع محمد شاہی سے پہلے مرتب ہو چکی تھی اس لیے عہد محمد شاہی کے اطباء میں ظفر یار خاں کو کچھ تقدم حاصل ہے۔ چنانچہ حکیم علوی خاں نے اپنی قرابادین

جامع الجوامع میں متعدد نسخہ جات تعلیم العلاج سے نقل کیے ہیں۔

میڈیکل لائبریری I.H.M.M.R. میں تعلیم العلاج کا مکمل خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ (۶۳۴) صفحات پر مشتمل ہے۔ خط شکستہ ہے لیکن مالایقرأ نہیں ہے جس سے بہ آسانی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

حکیم ظفر یار خاں کی دوسری کتاب اختیارات ظفر خانی بھی ہماری میڈیکل لائبریری میں موجود ہے جو بخط نستعلیق (۸۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ تعلیم العلاج اور اختیارات دونوں کا شمار نادر طبی کتابوں میں ہوتا ہے۔ احمد منزوی اور رمارشل نے ان کا ذکر نہیں کیا۔

اختیارات ظفر خانی کا ایک خطی نسخہ دار العلوم دیوبند کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔

(۵) سرّ العلاج (فارسی): - مؤلف کتاب حکیم ہدایت اللہ بارہویں صدی ہجری کے ایک نامور طبیب حاذق تھے۔ انہوں نے یہ تالیف لطیف قرابادین مرتب فرمائی اور کافی مدت کے تجربات و معالجات کے بعد اطباء حاذق کے مجربہ نسخوں کے ساتھ اپنے مجربات بھی لکھے ہیں۔ حکیم ہدایت اللہ کی قرابادین کے معتبر اور مستند ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے معاصرین اور بعد کے جید اطباء نے ان کی قرابادین سرّ العلاج سے استفادہ کیا ہے اور وہ اسکو ایک لائق اعتماد و استناد ماخذ سمجھتے ہیں۔

اس قرابادین میں اصول حفظ صحت تشخیص امراض اور کامیاب معالجات کا تفصیلی بیان ہے معالجات میں ادویہ مفردہ کے ذریعہ علاج کرنے کی تاکید کی ہے اور اس کو قابل اطمینان بتایا ہے۔

یہ قرابادین ۱۱۴۱ھ / ۱۷۲۸ء میں مرتب ہوئی۔ اس میں کوئی ترقیمہ یا خاتمہ نہیں ہے اس لیے سال کتابت اور کاتب کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ کسی کیٹلاگر نے سرّ العلاج کی موجودگی ظاہر نہیں کی۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ I.H.M.M.R. کی لائبریری کا یہ نسخہ واحد نسخہ ہے۔ سرّ العلاج کا یہ مخطوطہ ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت اندازاً بارہویں صدی ہجری کے اواخر کی معلوم ہوتی ہے۔ سائز اس نسخہ کا ۸×۲۰ سنٹی میٹر ہے۔

(۶) عین الشفاء (فارسی): - عین الشفاء طبیب کامل و حاذق میر درویش حسینی نقشبندی کی ضخیم و جامع قرابادین ہے اس نادر و مستند قرابادین میں بہت سے متعارف امراض کے لیے مجرب علمی نسخے سالہا سال کے آزمودہ اور زود اثر فراہم کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی روحانی علاج کے لیے تیر بہدف عملیات بھی لکھے ہیں۔

میر بابا نے چھوٹے بڑے امراض کے لیے جو نسخہ جات جمع کئے ہیں ان سے اکثر کچھ لیا گیا ہوں

لکھا ہے کہ وہ خود ان کے پرتاثیر اور مفید ہونے کا تجربہ کر چکے ہیں۔ یہ دسویں صدی ہجری کے ایک درویش صفت حکیم تھے۔ انہوں نے صرف خدمت عوام کے لیے پیشہ طبابت اختیار کیا تھا۔ شاہی درباروں سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا۔ انہوں نے بیان کیا ہے کہ جو طبیب شاہی درباروں اور امرائے وقت سے وابستہ ہوتے ہیں وہ عوام الناس اور غریب لوگوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ وہ اکثر و بیشتر جڑی بوٹیوں اور مفرد ادویہ سے علاج کرتے تھے۔ اور مرکب دواؤں کے مقابلہ میں مفرد دواؤں کے استعمال کو زیادہ مفید اور اطمینان بخش سمجھتے تھے۔ بہرحال قرابادین معین الشفا اپنے مقصد اور غرض و غایت کے اعتبار سے بہت عمدہ اور جامع قرابادین ہے آج بھی ہمارے ہندوستانی اطبا اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکتے ہیں۔

I.H.M.M.R. کے اس مخطوطہ کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان یا بیرون ہند کی کسی لائبریری میں اس کی موجودگی ثابت نہیں ہوئی۔ یہ قرابادین ۲۶ × ۲۰ سائز ۱۰۵۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب صاف ستھری ہے۔ سنہ کتابت اور کاتب کا نام مرقوم نہیں۔

(۷) مسیح الملک حکیم ارشد خاں شفائی دہلوی کی دو اہم تالیفات

(۱) شرح کلیات قانون (عربی):۔ شیخ الرئیس ابو علی سینا کی کتاب القانون کے حصہ کلیات کی صاف اور سلیس عربی میں حکیم ارشد شفائی نے یہ شرح لکھی ہے۔ جو اب تک طبع نہیں ہوئی اور بہت نادر و کمیاب ہے۔ اس شرح کا ایک نسخہ خدابخش لائبریری میں اور ایک ہمارے یہاں ہے۔

اس مخطوطہ کی اہمیت اس اعتبار سے کچھ زیادہ ہے کہ دہلی کے ممتاز و معروف طبیب حکیم محمود خاں مرحوم نے مصنف کے اصل نسخہ سے اس کو نقل کیا ہے اور مدت دراز تک اُن کے مطالعہ میں رہا۔ اس لیے اس کی صحت پر پورا اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

(۲) مطب حکیم شفائی خاں (فارسی):۔ مسیح الملک حکیم شفائی خاں بن عبدالشافی خاں متوفی ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۵ء کے معمولات و تجربات کا یہ نادر و اہم ترین مخطوطہ بھی I.H.M.M.R. کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مخطوطہ بھی تاحال شائع نہیں ہوا اور صرف اسی لائبریری میں موجود ہے کسی اور لائبریری میں اس کی موجودگی نہیں پائی جاتی۔ اگر ہمارے ریسرچ اسکالرس اس مخطوطہ پر کام کریں اور اس کو تشریحات اضافی کے ساتھ مرتب کر کے طبع کرائیں تو یہ علم طب کی ایک بڑی خدمت ہوگی۔ ●●

ڈاکٹر ملک محمد ادریس خاں (دہلی)

طبیہ کالج دہلی کے اہم طبی مخطوطات

عربی و فارسی کے اہم طبی مخطوطات جو اس کتابخانہ کی زینت ہیں درج ذیل ہیں:

عربی مخطوطات

۱۔ المعجون فی الطب (الحسن الفیلسوف): اس پر حکیم اجمل خاں کا لکھا ہوا حاشیہ بھی ہے۔
۲۔ شرح القانون (محمود ابن مسعود) ۳۔ فوائد ملکیہ (غیاث الدین شیرازی) ۴۔ منافع الاعضاء (عبداللہ ابن الفتح) ۵۔ الشامل فی الصناعتہ الطبیہ (علاء ابی نعیم) ۶۔ قاموس الطبیہ (شیخ مدین بن عبدالرحمٰن) ۷۔ طب عربی (علاء الدین) ۸۔ قاموس الطب (القراطی کتاب کا عربی ترجمہ) ۹۔ معالجات ایلاقی (سید محمد بن یوسف ایلاقی) ۱۰۔ کتاب دیاسقوریدوس فی الادویہ ۱۱۔ رسالہ معالجات ۱۲۔ حیلۃ البرء (جالینوس) ۱۳۔ ۲ غلوقن (جالینوس)۔

فارسی مخطوطات

۱۔ کنز الادویہ فی علم الطب (برہان الکمال بن محمد صالح) ۲۔ مجربات حکیم علوی خاں (حکیم علوی خاں) ۳۔ مطب فیروز شاہی ۴۔ رسالہ نبض و قارورہ ۵۔ مجمع الطب (نواب سید الملک) ۶۔ مختصر الفوائد ۷۔ رسالہ تشریح الاعضاء ۸۔ مبادی التشریح ۹۔ دستور العلاج (حکیم محمد قاسم علی)

(مقالہ سے متعلقہ حصہ کی تلخیص)

●●

جناب محمود فیاض (دہلی)

طبیہ کالج دہلی کے کتابخانہ کا ذخیرہ اس اعتبار سے توجہ طلب ہے کہ اس کی بیشتر کتابوں پر خود حکیم اجمل خاں کے حاشیے لکھے ہوئے ہیں۔

اس کتابخانہ میں جامع الکبیر کا ایک نسخہ محفوظ ہے، جامع الکبیر کے اس نسخہ کا پہلا حصہ ۹۳۲ھ میں لکھا گیا اور دوسرے حصہ کی کتابت بعد میں ہوئی۔ اس نسخے میں ادویہ کے نام ان کے فوائد و نقصانات ان کی اصلاح، استعمال کی مقدار، ان کی تاثیر اور ان کا بدل تحریر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جس میں دیاسقوریدوس اور جالینوس کے علاوہ بھی دوسرے اطبار اور حکمار کے اقوال جمع کئے ہیں۔ ماہرین طب کے اقوال ان کے تجربات متقدمین اور متاخرین کے مشاہدات اور ان کے نتائج کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نسخے کے کاتب کا نام شہاب الدین ہے، جس نے اس کو ۱۲ رمضان المبارک ۹۹۴ھ میں مکمل کیا۔ (اقتباسات)

خدابخش لائبریری کی تازہ مطبوعات

علی گڑھ تحریک : سیّد حامد کا خطبہ خدابخش Rs. 5/-

ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینے میں: پہلی جلد علیگڑھ تحریک Rs.50/-

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل از سیّد حامد Rs. 30/-

رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت : چھٹی جلد: خوشتر منگرولی کے ماہنامہ 'زبان' (۱۹۲۶-۱۹۲۸) کی مکمل عکسی اشاعت (تفصیلی اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ) اسلام، تاریخ ہند، تاریخ و تنقید زبان و ادبیات اردو، ناولٹ، طویل افسانے، مختصر افسانے، ایسّے، نکات ملا رموزی، نظمیں، غزلیں، رباعیات، مکاتیب مشاہیر، تذکرہ مشاہیر، تصاویر مشاہیر، تذکرۂ رسائل، تذکرہ کتب و اخبار علمیہ جیسے موضوعات پر نو سو صفحات پر پھیلی ہوئی تحریروں کا قیمتی مرقع۔ Rs. 50/-

تذکرہ کاملان رامپور (حافظ احمد علی خاں شوق) : روہیل کھنڈ کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ Rs. 50/-

برصغیر میں نادر طبی مخطوطات (روداد طب سمینار خدابخش لائبریری) کے پہلے جنوب ایشیائی علاقائی سمینار کی مکمل روداد، اہم طبی مخطوطات پر تفصیلی مقالات اور برصغیر کے مختلف نجی و سرکاری ذخیرہ کتب میں محفوظ اہم و غیر مطبوعہ طبی مخطوطات کا تعارف اور ان کی جامع فہرست۔ Rs. 50/-

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات
مطابق فارم نمبر ۴، قاعدہ نمبر ۸

۱۔ مقامِ اشاعت : خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۲۔ وقفۂ اشاعت : سہ ماہی

۳-۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام : محبوب حسین

قومیت : ہندستانی

پتا : رمنا روڈ، پٹنہ-۴

۵۔ ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ-۴

۶۔ ملکیت : خدا بخش لائبریری، پٹنہ-۴

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے ساتھ درست ہیں۔

دستخط پبلشر : محبوب حسین

۲۵ فروری ۱۹۸۵ء

خدا بخش لائبریری

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر :	۳۳۴۴۴/۷۷	قیمت فی شمارہ :	پچیس رُپے
شمارہ :	چھیالیسواں	سالانہ :	۱۰۰ رُپے (ہند)
قیمت :	پچیس رُپے		۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۴۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

۱۹۸۸ء

محبوب حسین صاحب نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ ۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

رقعاتِ رشید صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے خطوط پروفیسر مسعود حسین کے نام

مرتبہ

پروفیسر مسعود حسین

علیگڑھ

● ڈاکٹر مسعود حسین. (پ ۱۹۱۸ء) : مشہور ماہر لسانیات پروفیسر رشید احمد صدیقی کے شاگرد خاص اور ان کے رفیق کار، متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے وزٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں پروفیسر ایمے ریٹس کے عہدے پر فائز کیا ہے. مزید تفصیلات کے لیے خدا بخش لائبریری جرنل کے شمارے ۱۹، ۲۷۔ ۲۹ ملاحظہ ہوں۔

●●

طبع دوم کے بارے میں

١. طبع ثانی میں کتابت کی غلطیوں کی صحت کی گئی ہے۔

٢. بعض مقامات پر اصل خطوط کو دوبارہ دیکھ کر متن میں جزوی (لفظی) اضافہ یا ترمیم بھی کی گئی ہے۔ بعض مقامات پر لفظ نہیں پڑھے جا سکے تھے، کوشش کر کے انھیں پڑھا گیا ہے۔

٣. بعض حواشی میں بھی اضافے اور ترمیمات کی گئی ہیں

٤. پیش لفظ کی زبان کی نوک پلک جابجا درست کی گئی ہے۔

(م - ح)

رشید صاحب! چند یادیں

میں شاگردِ رشید ہوں۔ یہ کلمۂ توصیفی نہیں کلمۂ اضافی ہے۔ اس کو کلمۂ توصیفی کہنا میرے اختیار کی بات نہیں: یہ اختیار تو رشید صاحب کو تھا یا دیگر اہلِ نظر کا ہے۔

۱۹۳۹ء میں رشید صاحب کی شاگردی کے رشتے میں منسلک ہونے سے بہت پہلے، میں اُن کے بارے میں پڑھ اور سُن چکا تھا، ایک تو ان کا میرے عم بزرگوار ڈاکٹر ذاکر حسین سے خصوصی تعلق، دوسرے اُن کے چٹ پٹے فقرے اور بلیغ مطائبات جو میرے گھرانے میں در آئے تھے ان سے ایک غائبانہ قرب کا باعث بن چکے تھے۔ چنانچہ جولائی ۱۹۳۹ء میں جب میں سابق اینگلو عربک کالج دہلی سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد ایم۔ اے میں داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچا تو رشید صاحب سے پہلی مڈ بھیڑ ہوئی۔ یہ ان کے نئے تعمیر شدہ مکان کے مردانہ حصے میں، کمرے سے باہر پھوس کے چھپر کے نیچے، بے کمر اور با کمر سرکنڈوں کے مونڈھوں پر۔ میرا ان کا پہلا سامنا غالب کے مشہور شعر "روکے" اور "کھینچے" سے بخوبی تعبیر کیا جا سکتا ہے، عرضِ حال سن لی اور بولے کل شعبۂ اُردو میں تشریف لائیے، اور اس کے ساتھ ملاقات یک لخت ختم کر دی

لوٹتے وقت ایسا محسوس ہوا نہ تماشا کامیاب آیا اور نہ تمنّا بے قرار، داخلے کی
حاجت مندی سوار تھی اس لیے دوسرے دن شعبۂ اُردو میں جا دھمکا۔ بغیر توجہ کیے
انھوں نے میرے ہاتھ سے داخلہ کا فارم لے لیا اور آیئے حضرت کہہ کر میرے ساتھ ساتھ
جا نکلے اسٹریچی ہال میں، جہاں ان دنوں داخلہ کا بازار لگتا تھا۔ کلرکوں سے
لے کر پرووسٹ اور دیگر ارباب داخلہ تک، بے شمار میزیں یہاں اندراج کرایئے،
یہاں ہال اور ہاسٹل کا انتخاب کیجیے، یہاں فیس داخلہ جمع کیجیے، ہر میز پر ٹھٹ
کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے، پیروکار عام طور پر سینیر طلبہ یا رشید صاحب جیسے
بعض اساتذہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ رشید صاحب کا جس میز کی طرف رُخ ہوتا ہے
پرے کا پرا ہٹ جاتا ہے، کلرک ہو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایک ہلکی سی اٹھک بیٹھک
لگاتا ہے اور اُن کے فقرے کی تاب نہ لا کر جھٹ ان سے فراغت حاصل کرنے
کی کوشش کرتا ہے۔

اس دن رشید صاحب کے وار بھرپور پڑ رہے تھے اور شاید ہی کوئی
مردہ دل ہو جو اس سوَدا اور ان کے غنچہ کے کام سے پہلوتہی کرنے کی ہمت کرتا
ہو، لیجیے جو کام گھنٹوں میں ہونا تھا وہ منٹوں میں ہو گیا۔ اس درمیان میری
طرف سے مسلسل تجاہلِ عارفانہ رہا۔ ایک دھچکا اور لگا جب آخر میں مجھے داخلہ کا
فارم تھماتے ہوئے انھوں نے کہا لیجیے حضرت! باقی کام آپ کا ہے فیس وغیرہ
داخل کیجیے اور شعبۂ تاریخ (میں نے پہلے ایم اے تاریخ میں داخلہ لیا تھا) کا
رُخ کیجیے۔

میں نے تاریخ کے مضمون کا انتخاب کچھ تو اس وجہ سے کیا تھا کہ مرا بی۔ اے۔
میں یہ اختیاری مضمون تھا اور کچھ اس سبب سے کہ مرے خاندان میں مورخین کی
تعداد اچھی خاصی تھی۔ داخلے کی تمام تر تگ و دو میں رشید صاحب نے مجھے

یہ سوال نہیں کیا کہ یہ مضمون میں نے کس لیے انتخاب کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ مجھے اُردو کی گوں کا نہ سمجھتے ہوں یا میری عاقبت انھیں عزیز ہو۔ ابھی میرے قدم شعبۂ تاریخ میں جمنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک مورخ ہی کے ورغلانے پر (میری مراد پروفیسر مجیب سے ہے جو ان دنوں علی گڑھ آنکلے تھے) اکھڑ گئے اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی تبدیلیٔ مضمون کی درخواست لے کر سہما سمٹا شعبۂ اُردو میں صورتِ سوال کھڑا ہوا تھا۔ جب رشید صاحب سے میں نے اپنی"اِس" نیت کا تذکرہ کیا تو بولے " خوب! یہ میں نے کب کہا تھا کہ آپ مجھ پر نازل ہوں"۔ پھر ٹھوک بجا کر پوچھا "کیا بالکل طے کر لیا ہے ؟" میں نے کہا"جی ہاں ایک مورخ ہی کے کہنے پر" کہا " اچھا تو لائیے درخواست " اور ایک شانِ بے نیازی سے دستخط کر دیئے۔

لیجیے اب میں شعبۂ اُردو کا طالب علم بن گیا یعنی شاگردِ رشید! شعبۂ اُردو میں اس وقت کئی حضرات درس دیتے تھے، لیکن ایم۔ اے۔ کے درس کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب کے سر تھی۔

شعبۂ اُردو میں آجانے کے بعد بھی رشید صاحب مجھ سے اور میں ان سے عرصے تک قدرے فاصلے سے رہے ــــــ میں احتراماً اور وہ احتیاطاً۔

رشید صاحب ابتدا سے خواص پسند تھے۔ طالب علموں سے وہ اپنا رشتہ یا تو درس تک محدود رکھتے تھے یا چلتے چلاتے ایک آدھ فقرے تک۔ ان کی اس خواص اور خلوت پسندی کی وجہ سے اکثر حضرات کو شاکی پایا۔ ان کا مکان ان کا حصار تھا۔ اس کا احاطہ کچھ اس قسم کا تھا کہ ملنے والا یا تو مردانے دروازے

سے ٹکریں مار کر رہ جاتا یا زنانے دروازے پر چیخ کر چلا جاتا۔ ان کی رہائش کا کمرہ دونوں دروازوں سے اس قدر محفوظ فاصلے پر تھا کہ ان کے وفادار ملازم سکندر کے توسط کے بغیر آپ کی کوئی صدا یا پیغام ان تک نہیں پہنچ سکتا تھا اور سکندر نہ صرف وفادار تھا، تربیت یافتہ اور مردم شناس بھی تھا۔ وہ نہایت خوش اسلوبی سے حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کر دیتا تھا۔ بس یہیں سے سماجی رشتوں کی نزاکتیں پیدا ہوتی تھیں۔ جمیع خلائق کو معلوم تھا کہ رشید صاحب ہر وقت علی گڑھ اور اپنے مکان میں موجود رہتے ہیں اور یہ صرف سکندر کی سکندری ہے جو اس خضر ادب کو غائب اور حاضر بنائے رکھتی ہے۔ اتفاق سے مجھے اس قسم کی نزاکت سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ اس لیے کہ میں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں ان کا اعتماد حاصل کر لیا تھا اور چوں کہ ہمیشہ "باادب ہوشیار" کا انداز رکھا اس لیے باریابی بھی ہمیشہ حاصل رہی۔

باریابی کا یہ مقام تعمیر کا ادھورا نقش تھا جس کا زنانہ حصہ مکمل اور مردانہ نامکمل تھا۔ اس نامکمل حصہ کی قلندرانہ شان وہ چھپر تھا جو سائبان اور مردانہ ڈرائنگ روم دونوں کا کام دیتا تھا اور جس کے زیر سایہ عظیم ادبی شخصیتیں آتیں، بیٹھتیں اور کبھی کبھی ٹھہرتی تھیں۔ خواجہ غلام السیدین مرحوم نے اس مکان کے بارے میں کتنا بلیغ جملہ کہا تھا کہ یہ اپنے مکین کی شخصیت سے کتنی گہری مناسبت رکھتا ہے۔ باہر سے ناہموار لیکن اندر سے باغ و بہار! رشید صاحب معاشرتی و جمالیاتی دونوں اعتبار سے بیرونِ خانہ سے زیادہ اندرونِ خانہ کی زیبائش کے قائل تھے۔ چنانچہ جب کہ مکان کے باہری حصہ میں خاک دھول اڑتی تھی اندر ایک لہلہاتا چمن اور سبزہ زار تھا اور پھولوں کی و

بھر مارکہ پریاں قطار اندر قطار۔ قلم کے بعد صرف کھرپی کو یہ شرف حاصل تھا کہ اُن کے دستِ مبارک میں دیکھی جاتی جس سے وہ کیاریوں میں قلم کاری کرتے "بہ شوقِ فضول" (   ) ان کی صحت کی ضمانت اور طمانیتِ قلب کا باعث تھا۔ ضمناً غیر کی نظروں سے محفوظ وہ پھولوں میں گم رہتے اور ناخواستہ ملاقاتیوں کے لیے ان کے وفادار سکندر کا یہ مستقل عذرِ لنگ ہے

ہر چند کہیں کہ ہیں، نہیں ہیں!

پھولوں ہی کی نسبت سے انھیں جانوروں سے چڑ تھی، میں نے کبھی ان کے مکان پر کوئی کُتّا پلا ہوا نہیں دیکھا۔ انھیں سالانہ چوریاں گوارا تھیں لیکن کتّا پالنا منظور نہیں تھا۔ اکثر کہتے کہ انسان سے بہتر جانور ہوتا ہے لیکن سب سے بہتر یہ خاموش پھول پودے ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے قیمتی تحفہ گلاب کا پھول ہوتا اور سب سے بڑی مرحمت گلاب کی پود، جسے وہ دوسروں پر اعتبار نہ کرتے ہوئے اپنے خاص مالی سے آپ کے مکان میں لگوا دیتے۔ لیکن اس کے ساتھ قدرداں کی ضرورت تھی ورنہ مجھ جیسے ناہنجار گلاب کو گوبھی بنا دیتے تھے۔ وہ اپنے مکان سے دید باز دید کے لیے بہت کم باہر نکلتے۔ میرے یہاں جو کبھی کبھی چل کر اچانک آجاتے تھے تو یہی دیکھنے کہ میں نے ان کے گلابوں کا کیا حشر بنا دیا ہے! ایک دن کہنے لگے میں دیکھنے نہیں صرف ان کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔ دیکھ کر دکھ ہوگا۔

رشید صاحب کا طریقۂ درس منفرد اور نرالا تھا۔ مطالعہ کی طرح درس کے میدان بھی مخصوص اور محدود تھے، یعنی بیشتر غالب اور اقبال۔ یا جدید شعرا میں حسرت، فانی، اصغر اور جگر۔ انھوں نے تمام شعرا کے بارے میں اپنے

انداز میں سوچا تھا۔ ان کی یہ سوچ ان کے بلیغ فقروں کی شکل اختیار کرلیتی تھی جن میں ندرت اور اپج ہوتی اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ کسی اور کی ٹکسال سے ڈھل کر نہیں نکلے ہیں۔ ہم لوگ اکثر آپس میں مختلف اساتذہ کے طریقۂ تدریس اور علمیت کا موازنہ کرتے اور عام طور پر یہ رائے قرار پاتی کہ علمِ کتابی رشید صاحب کا میدان نہ تھا۔ لیکن ایک تو رچے ہوئے ذوقِ ادب اور دوسرے خداداد طباعی کی وجہ سے ان کی تحسین شناسی دوسروں سے بالکل مختلف انداز کی ہوتی۔ سونے پر سہاگہ ان کا منفرد انداز بیان جو صرف تحریر تک محدود نہ تھا بلکہ ایک ایک فقرے سے جھلکتا تھا۔ جب کہ دوسرے اساتذہ کی تقریر یاد رہ جاتی ان کی یادگار بن جاتی۔

غالب رشید صاحب کے محبوب شاعر تھے۔ اقبال سے وہ مرعوب تھے۔ لیکن ان کے ادبی ذوق کی تربیت غالب کے زیرِ سایہ ہوئی تھی جس کا کلام ان کے منفرد اسلوب کا سب سے بڑا ماخذ تھا۔ اصغر اور جگر سے ان کا ذاتی تعلق تھا لیکن اصغر کی تراشیدہ شاعری کے وہ زیادہ قائل تھے۔ شعر سے شغف کے باوجود یہ عجیب و غریب بات تھی کہ انھیں شعر بالکل یاد نہیں رہتے تھے۔ وزن کا احساس بہت کمزور تھا۔ کبھی آدھے مصرعے سے آگے نہیں بڑھ پاتے اور ہر بار اہلِ حلقہ میں سے کسی کو شعر اٹھانا پڑتا یا بڑھ جاتے تو بحرِ ہزج میں ڈال کر بحرِ رمل چلے، کی سی صورت پیدا ہو جاتی۔ لیکن شعر کا مفہوم حیرت ناک طریقے پر ان کے ذہن میں محفوظ ہوتا تھا جس سے وہ انتہائی محظوظ ہوتے اور بے ساختہ اس شعر کے کچھ الفاظ ان کی نوکِ زبان پر آجاتے۔

غالب سے وہ متاثر تھے خود انھوں نے ایک ادبی نسل کو متاثر کیا ہے۔ ادب کا کوئی بانکا جس کا تعلق علی گڑھ سے رہا ہو ایسا نہیں نکلا جو شعوری

یا غیر شعوری طور پر ان کے اسلوب کی زد سے باہر رہ سکا ہو۔ جو رہا وہ محروم رہا یا لائقِ اعتنا نہ سمجھا گیا۔ لیکن ان کے اسلوب کی نقل بہت مشکل تھی ع نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب کی صورت ہر مقلدِ رشید کے پیشِ نظر رہی۔ ہاں تھوڑا تھوڑا آب و رنگ سب نے اُڑائے ع ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرؔ ہوئے۔

۱۹۴۱ء میں میں نے مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ اے (اردو) کی سند حاصل کی۔ بیروزگاری کے احساس کو کم کرنے کے لیے آبائی وطن جاکر ہندی اور سنسکرت میں گریز کیا۔ وہاں سے آل انڈیا ریڈیو دہلی کی ملازمت میں چلا گیا۔ پطرس بخاری ڈائرکٹر جنرل تھے انھوں نے انتخاب تو کرلیا لیکن چند ماہ بعد بولے کبھی "آپ ریڈیو ٹائپ" نہیں لگتے۔ ن۔م راشد اور میراجی نے اس کی تصدیق کی۔ مجھ پر بھی بہت جلد ہی انکشاف ہوا۔ چنانچہ چھ مہینے ریڈیو کی ملازمت کرنے کے بعد پھر علی گڑھ آکر درِ پیر مغاں کھٹکھٹایا۔ رشید صاحب اس بار خنداں نہیں، انگشت بدنداں تھے۔ کہنے لگے آپ کو کیا پڑی ہے کہ اچھی خاصی ملازمت چھوڑ کر پچاس روپے کے ریسرچ وظیفے پر آنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا زندگی میں مراجعت اور بازگشت کے وجوہ نہیں ہوتے۔ بس یہی اب کہانی ہے۔ کہنے لگے آجائیے اور کوئی دن یہ زندگانی بھی کر لیجیے۔ میں آگیا۔ یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد عارضی جگہ پر بحیثیت جونیر لکچر کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اب رشید صاحب کا اور میرا ہمہ وقت کا ساتھ تھا۔

اس وقت شعبۂ اُردو کی ہیئت ترکیبی آج کل سے بالکل مختلف تھی۔ یہ سرسید ہال میں سابق لٹن لائبریری کے بازو والے تین متصل اور ایک غیر متصل

کمرے پر مشتمل تھا۔ سامنے کے رخ کا بڑا کمرہ اساتذہ کی بیٹھک تھا جس کے درمیان متوسط سائز کی ایک میز اور گھومتے ہوئے شلف پر حاضری کے رجسٹر رہتے۔ تین طرف دیوار سے لگی ہوئی آرام (ہیڈک) کرسیاں رہتیں۔ دروازہ کے قریب کی آرام کرسی رشید صاحب کے لیے مخصوص تھی باقی سب غیر محفوظ۔ کوئی شخص اگر اپنے حصہ اسفل کو بلندر رکھنے کا خواہش مند ہوتا تو وہ مرکزی میز کے ساتھ کی آفس کرسی پر متمکن ہو جاتا۔ رشید صاحب گوشہ نشین رہتے، جسے ان سے گفتگو کرنا ہوتی پاس کی خالی کرسی پر جا بیٹھتا۔ جب ہجوم شوق زیادہ ہوتا تو ان کی کرسی کے اردگرد ایک ہلالی دائرہ بن جاتا جس سے گھبراکر کبھی کبھی وہ حاضری کا رجسٹر ہاتھ میں لے کر یک لخت اٹھ کھڑے ہوتے اور سیدھے مکان کا رخ کرتے۔

رفقائے شعبہ کے ساتھ رشید صاحب کی ہم نفسی اور ہم سخنی باہمہ اور بے ہمہ قسم کی تھی۔ وہ فقروں اور مطائبات میں کھلتے تھے لیکن ان کے "عالم بسط" کے بارے میں یہ پتہ چلانا سخت دشوار تھا کہ کب یہ "عالم قبض" میں تبدیل ہو جائے گا۔ وہ مجمع کو بالکل انگیز نہیں کر سکتے تھے (اگر تاج پوش ہوتے تو دربارداری کے رسم سے بالکل ناآشنا رہتے) اشخاص کو بھی صرف اسی وقت تک انگیز کرتے تھے جب تک ان کا جی چاہتا تھا۔ مکان ہو یا شعبہ کسی بھی بھاری بیٹھنے والے کو اچانک رخصت ہو جانے کا مشورہ دے دینا ان کے معمولات میں سے تھا۔ کم یابی کے ساتھ ان کا یہ معمول بھی بعض حضرات کے لیے تکلیف دہ رہا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ رشید صاحب کو اپنی کوتاہیوں کا علم نہ تھا۔ وہ اپنی کم سخنی، کم یابی، کم انگیزی اور اس سے پیدا شدہ بعض اوقات کی سماجی نزاکتو

پر نفریں بھی کرتے تھے۔ اس وقت خاص طور پر غالب کا یہ مصرع وردِ زبان ہوتا ع

غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

ایسے موقع پر میں ہنس کر کہتا کہ "رشید صاحب! غالب نے ایک ہی مصرعہ تو خلافِ محاورہ کہا ہے وہ آپ پر کس طرح چسپاں ہو سکتا ہے" پوچھتے کیونکر؟ میں کہتا "اس مصرع میں "اپنی اوقات" ہونا چاہیے" کہتے "یہ تو آپ نے پھر لسانیات کی اوقات بڑھا دی" بات جہاں کی تہاں رہ جاتی ان کا موڈ بدل جاتا۔

انسانوں، عزیزوں اور رفیقوں کو آنکنے کی رشید صاحب کے پاس صرف ایک کسوٹی تھی اور وہ ان کے ایک پسندیدہ لفظ "نامعقول" میں مضمر تھی، یہ ان کا تیر بھی تھا نشتر بھی تھا اور آئینہ بھی "کوئی نامعقول میرے دسترخوان پر نہیں بیٹھ سکتا" "۔۔۔۔ ایسا نامعقول کہ دماغ میں ہر وقت جوتے لگتے رہتے ہیں" وہ اس ایک لفظ سے اپنے لیے انسانوں کے وجود کو ختم کر دیتے۔ نامعقول شاعر کی شاعری کے منکر ہو جاتے "کوئی نامعقول انسان اچھا شاعر نہیں ہو سکتا" کلیات قائم کرتے اور خود اپنے گرد ایک حصار کھینچ لیتے۔ نامعقول اور نامعقولیت کے لیے ان کی تعزیرات میں کوئی معافی نہیں تھی۔

میرا رشید صاحب کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک شدید انفرادیت، داخلیت پسند اور حساس طبیعت رکھنے والے فنکار کا ہے۔ وہ غیر معمولی، غیر تعقلی ذہانت اور بصیرت کے مالک تھے۔ ایک مخصوص طبقے اور عہد کی اقدار اور وضع داریوں کو عزیز رکھتے تھے اور انھیں پیمانوں سے ان سب کو ناپتے جو ان کی رہگذر

حیات پر آنکلتے۔ وہ بُت شکن سے زیادہ خدا ساز تھے۔ جن قدروں یا شخصیتوں کو عزیز رکھتے ان کو ادبی تخلیق کا ہالہ عطا کر دیتے۔ جو ان کی نظروں سے کسی نامعقولیت کی بنا پر گر جاتے وہ مسلسل ان کے اغماض کا شکار رہتے۔ اپنی ستائش سے گھبراتے لیکن دوسروں کی ستائش جی کھول کر کرتے۔ کہتے تھے "مرا اس میں کیا خرچ ہوتا ہے دوسرے کا جی خوش ہو جاتا ہے"۔ باہر کے بزرگ ادیبوں کے سامنے اپنے شعبے کے نوجوانوں اور ان کے کارناموں یا ناکارناموں کی تعریف اس انداز میں کرتے کہ مہمان گھبرا جاتا اور ممدوح شرما جاتا۔ انسانی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہر ایک کی حاجت روائی کرتے۔ سیکڑوں پر ان کے خاموش احسان ہیں۔ بعض احسان فراموش ہیں۔

علی گڑھ ان کی سب سے بڑی کمزوری اور طاقت دونوں تھا۔ اس سے ان کی والہانہ عقیدت کو نظر انداز کرتے ہوئے بعض اوقات میں اس مسئلے پر ان سے الجھ جاتا۔ وہ اس کی نسبت سے سارے ہندوستان کی تاریخ اور مقدر دیکھتے تھے۔ میں اسے ایک دجلہ کا قطرہ کہتا تھا۔ میری جرات انکار پر بُرا ماننے سے زیادہ افسوس کرنے اور اپنی بات پر اصرار۔ ان کی علی گڑھ پرستی بڑھ جاتی اور میں متشکک کا متشکک رہ جاتا۔

رشید صاحب طبعًا ایک مذہبی ذہن کے مالک تھے۔ خاص طور پر اسلام کی عظمت اور فوقیت کے مقر اور قائل۔ لیکن طاعت و زہد کی جانب عملی رجحان بہت کم تھا۔ اس لیے انھوں نے مذہبی مباحث اور فرائض سے بیشتر خود کو دور رکھا۔ لیکن ہندی مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور معاشرت سے انھیں گہری دلچسپی تھی جو ان کی تحریر و تقریر دونوں سے ظاہر ہوتی ہے

سرسید کو وہ مسلمانوں کا مسیحا سمجھتے تھے اور علی گڑھ تحریک کو ان کی نشاۃ ثانیہ۔ سیاست میں وہ وسط سے دائیں طرف تھے۔ اس لیے وہ ادبی تحریکیں جن کا ماخذ کعبہ و کاشی سے دور ہوتا ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے۔ بنیادی طور پر وہ انسان اور قوم پرست تھے۔ اس لیے گاندھی، نہرو، محمد علی، اقبال، اور ذاکر حسین جیسی شخصیتیں ان کے تخیل کو گرماتی تھیں۔ ذاکر حسین سے ان کی عقیدت اب اُردو ادب کی ایک علامت بن چکی ہے۔ ان سے وہ بدظن اور خفا (جہاں تک مجھے علم ہے) صرف ایک بار ہوئے تھے جب وہ اچانک علی گڑھ چھوڑ کر بہار کی گورنری پر چلے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علی گڑھ چھوڑ کر جانا تھا تو جامعہ بازگشت کرتے جہاں ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے انھوں نے اپنی پیش کش کی تھی۔

جنوری ۱۹۷۳ء میں رشید صاحب کی تحریک پر میرا انتخاب جامعہ اُردو کے شیخ الجامعہ کے اعزازی عہدے کے لیے ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میری نامزدگی عمل میں آئی۔ میرے لیے رشید صاحب کا مشورہ اور آشیرباد ضروری تھی۔ ملا تو کہا بڑی ذمہ داری سر پر آگئی ہے ضرور قبول کیجیے۔ میں نے کہا یہ کیا ظلم ہے کہ پہلے تو آپ نے ایک پٹھان کو شیخ بنادیا اب چاہتے ہیں کہ ڈبل 'شیخ' ہو جائے۔ کہنے لگے کہ لطیفہ کو سنگین نہ بنائیے، اس سے لطف اٹھائیے اور کمر باندھ لیجیے۔

علی گڑھ سے تقریباً پانچ سال باہر رہا لیکن جامعہ اُردو کے ناتے سے ہر ماہ دو ماہ میں ایک چکر ضرور ہو جاتا۔ رشید صاحب کے درِ دولت پر میرے لیے حاضری ناگزیر تھی۔ ان کا قلم ابھی تک نہیں تھکا تھا۔ تابڑتوڑ وہ علی گڑھ

اور اس سے متعلق موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ یہ تحریریں جا بجا چھپتی بھی رہیں، لیکن اب وہ مزاح اور طنز نگار نہیں تھے۔ خاکہ نگاری بھی چھوڑ دی تھی وہ اب علی گڑھ نگار تھے۔ کچھ ماضی کی یادیں، کچھ حال کے مناظر اور کچھ مستقبل کے بارے میں پیش گوئیاں۔ موجودہ علی گڑھ کی طرف سے مضطرب رہتے۔ اسی شدت سے ماضی کے علی گڑھ کی جانب بازگشت کرتے۔ اس کے حالِ زار پر ان کا اُس زمانے کا محبوب شعر یہ تھا ؏

کیسے کیسے ایسے ویسے ہو گئے
ایسے ویسے کیسے کیسے ہو گئے

ان کے مکان کے اندر کے سبزہ زار، گل و گلزار اسی طرح شاداب اور شگفتہ تھے۔ لیکن مالی بوڑھا ہو چکا تھا۔ عمر اسّی سے تجاوز کر چکی تھی مگر حوصلۂ قلم و رقم اب تک باقی تھا۔ ان کے انتقال سے قبل میں اکتوبر ۱۹۷۶ء میں آخری بار علی گڑھ گیا اور پہلی بار ان کے یہاں بعض مصروفیات کی بنا پر حاضری نہ دے سکا۔ جنوری ۱۹۷۷ء میں اچانک خبر ملی کہ علی گڑھ کے چمن کا بلبل بھری بہار میں پرواز کر گیا!

؏ مجنوں جو مر گیا ہے تو صحرا اداس ہے

رقعاتِ رشید! چند باتیں

رشید صاحب کے "ادبِ ممنوع" کو برسرِعام لانے کی یہ جرأت رندانہ ان کی ہدایت اور اپنی شرافت کو خطرے میں ڈال کر کی جارہی ہے۔ تمام دوستوں اور عزیزوں کو سخت اور مسلسل ہدایت تھی کہ ان کے خطوط ہرگز ہرگز ان کی حیات میں یا ان کے بعد شائع نہ کیے جائیں۔ اس ہدایت کی زد پر وہ بعض اوقات مکتوب الیہ کی شرافت تک کو لے آتے تھے۔

رشید صاحب، جہاں تک خطوط نویسی کا تعلق ہے۔ بسیار و زود نویس تھے۔ خطوط کا جواب جلد از جلد دینا ان کی عادت تھی۔ اس کے لیے انھوں نے ایک 'تکنیک' بھی ایجاد کر لی تھی۔ عام طور پر رقعوں اور پوسٹ کارڈوں کا استعمال، فوراً مکتوب الیہ کے خط کو پھاڑ کر اس سے نجات حاصل کرنے کی عادت (یہی وجہ ہے کہ ان کے گھر سے جو سامان نکلا ہے اس میں اچھے سے اچھے مکتوب نگاروں کے خطوط مفقود ہیں!) اور پھر فوری طور پر انھیں پوسٹ کر دینے کی ہدایت۔ اس طرح ان کی "پابندی رسم نیم ملاقات" دمِ آخر تک جاری رہی جب کہ ان کی بینائی جواب دے چکی تھی، ہاتھ میں رعشہ آچکا تھا اور دماغ کی شریانوں میں دورانِ خون کی کمی کی وجہ سے مسلسل لذتِ غشیہ کی سی کیفیت محسوس کرتے رہتے تھے۔

میں نے ان کے مکاتیب کو جان بوجھ کر 'رقعات' سے موسوم کیا ہے۔
اس لیے کہ ان میں سے بیشتر رقعوں اور پرچوں پر لکھے گئے ہیں کچھ اس وجہ
سے کہ مکتوب الیہ مقامی تھا اور اس کا مکان ان کے دولت کدہ سے بہ مشکل ایک
فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور کچھ اس سبب سے کہ رشید صاحب اپنے خطوط کے
لیے مخصوص اسٹیشنری یا ڈاک کا بے جا خرچ اٹھانے کے قائل نہ تھے۔ جب ڈاک
کے ذریعہ ترسیل خط منظور ہوتی تو پوسٹ کارڈ کا استعمال کرتے۔ اس میں
کفایت کے علاوہ سہولت بھی تھی۔ ایک دفعہ کی گفتگو سے یہ بھی اندازہ ہوا
کہ وہ پوسٹ کارڈ کو لفافے (بند یا کھلے) کے مقابلے میں زیادہ پائدار سمجھتے
تھے۔ انھیں اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ان کی ہدایت کے علی الرغم میں ان
کے خطوط کو حرز جاں سمجھ کر محفوظ رکھتا ہوں اور نیت بھی خراب ہے۔
نہیں کہہ سکتا کہ غالب کی طرح رشید صاحب اس بارے میں کہاں تک
محتاط قلم ہو گئے تھے۔ لیکن یہ مسلم ہے کہ ان کے تمام خط قلم برداشتہ ہیں۔ بہت
کم مقامات پر انھوں نے کسی لفظ یا جملے کو قلم زد کیا ہے۔

اس مجموعہ میں ان کا سب سے پہلا خط ۱۹۴۴ء کا ہے جب میں شعبۂ اردو
میں نیا نیا لکچرر مقرر ہوا تھا یہ رسیدی قسم کا ہے لیکن قدامت کے پیش نظر
شامل کر لیا گیا۔ ۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۲ء کے بیشتر رقعات زائل ہو گئے۔ تعداد
بھی کچھ زیادہ نہیں تھی۔ میں علی گڑھ ہی میں تھا اور رشید صاحب سے
مراسلت کا کاروبار ابھی نہیں کھلا تھا۔ ان کے خطوط کا باقاعدہ سلسلہ ۱۹۶۲
کے بعد شروع ہوتا ہے جب میرا عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی
حیثیت سے تقرر ہوا اور میں علی گڑھ سے چھ سال کے لیے باہر چلا گیا۔ خطوط
کی بڑی تعداد انھیں چھ سال سے تعلق رکھتی ہے۔ اس دوران میں مختلف تعلیم

کاموں کے سلسلے میں رشید صاحب نے دوبار حیدرآباد کا سفر میری خاطر اختیار کیا۔
۱۹۶۸ء میں میں دوبارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کی پروفیسری پر آگیا۔
ہرچند کہ رشید صاحب سے سو قدم کے فاصلے پر رہتا تھا لیکن اگلے پانچ سالوں میں رقعات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ رشید صاحب ان دنوں رٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کے اندر مزاح نگار مر چکا تھا۔ اب وہ مسلسل سنجیدہ مسائل بالخصوص علی گڑھ کے بارے میں لکھ رہے تھے۔ علی گڑھ ان کے لیے کچھ ماضی کی یادوں سے عبارت تھا، کچھ حال کے تشویشناک حالات سے اور کچھ نامعلوم مستقبل سے! اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی مجلے 'فکر و نظر' کا میں ایڈیٹر بھی ہو گیا تھا۔ ان کے اکثر رقعات میں اپنے ان مضامین کا تذکرہ ملے گا جنھیں وہ اس مجلے کے صفحات میں شائع کرانا چاہتے تھے۔ یا ان اداریوں کا تذکرہ جو میں نے اسی زمانے میں 'ہماری زبان' کے عارضی ایڈیٹر کی حیثیت سے لکھے تھے۔ نومبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا وائس چانسلر ہو کر میں پھر پانچ سال کے لیے علی گڑھ سے غائب ہو گیا۔ کچھ میری منصبی مصروفیات، کچھ ان کی گرتی ہوئی صحت۔ خطوط کم تر آنے جانے لگے، اور موضوعات گفتگو بھی سمٹ کر رہ گئے۔ میں کاروباری بنتا گیا اور وہ گراں قلم۔ رشید صاحب سے بہتر مکتوب لکھوانے کے لیے انھیں 'برانگیختہ' کرنا ضروری ہوتا تھا۔ ان کی فکر مصرعوں اور فقروں کی فکر تھی۔ اس لیے دوسرے کے بھڑکتے ہوئے جملے یا برمحل نقل شعر کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اکثر لکھتے مجھے یہ کیوں نہیں سوجھا اور اس کے ساتھ ان کے ذہن کا دبستان کھل جاتا۔

رشید صاحب بنیادی طور پر ایک 'دروں بیں' شخصیت کے مالک تھے۔
ایسی شخصیت اپنے نجی رشتوں اور تحریروں میں احتیاط اور دیر سے کھلتی ہے۔

خاص طور پر اگر مکتوب الیہ اس کا ہمدم وہمراز نہ ہو۔ رشید صاحب کی نسبت سے مجھے یہ درجہ کبھی حاصل نہیں ہوا۔ گو وہ مجھ پر طالب علمی کے زمانے سے شفقت کرتے تھے اور ادبی وعلمی معاملات میں میں ان کا معتمد علیہ تھا۔ زندگی کا بڑا حصہ ان کی رفاقت میں گذرا۔ لیکن ہمیشہ "باادیم" میں ایک 'نہایت دوری' قائم رہی جیسا کہ خطوط میں الفاظ خطاب سے ظاہر ہے۔ "مکرم" جو مکتوب نویسی میں ایک غیر جانب دار، بے رنگ اور رسمی خطاب ہے۔ انھوں نے زیادہ تر مجھے اسی لفظ سے یاد کیا ہے۔ کبھی کبھی 'وفور کرم' میں 'محترم' بھی لکھ جاتے تھے جس پر میں محجوب ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح ان کے خطوط کا خاتمہ ہمیشہ لفظ 'مخلص' پر ہوتا جسے پھر میں رسمی سمجھتا ہوں۔

مکتوب نویسی میں ان کے اس رویے کے باعث رشید صاحب اپنے رقعات میں بہت کم بے پردہ ہوئے ہیں۔ صرف کبھی کبھی ذاتی غم کی لہر پر جیسا کہ خط نمبر ۲ میں اپنی چھوٹی اور عزیز بیٹی منّی کی جواں میری پر بلبلا اٹھے ہیں۔ ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۸ء کے بعض خطوط میں اپنی گرتی ہوئی صحت اور بڑھاپے کے عوارض کا ذکر نہایت پژمردگی سے کرتے ہیں اور "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو" کے آرزومند ہیں۔

سماجی نقطۂ نظر سے رشید صاحب کی شخصیت کا سب سے مثبت پہلو جو ان رقعات سے بخوبی ظاہر ہے چھوٹوں کے ساتھ ان کی کریم نفسی ہے۔ ان کی فیض بخشی سے بہرۂ وافر مجھے بھی ملا تھا۔ ہماری زبان کی عارضی ادارت کے زمانے میں انھوں نے ہر ادار یے پر جو رقعات مجھے لکھے ہیں وہ کسی بھی لکھنے والے کے لیے باعثِ فخر ہو سکتے ہیں۔

علم وادب کے معاملات کے لیے وہ مجھ پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے

تھے جیسا کہ ۱۹٦۸ء تا ۱۹۷۲ء کے خطوط سے ظاہر ہے۔ اس دوران جو بھی لکھتے
شائع کرنے سے قبل میری نظر سے ضرور گزارتے۔ دہلی یونیورسٹی کے توسیعی خطبے
کے لیے انھوں نے غالب اپنا موضوع منتخب کیا تو میری مدد چاہی اور یہ
میں نے بھرپور دی۔ اس دوران جو خطبے تحریر کیے مجھ سے بار بار مشورہ
کرتے رہے۔ وہ ایک نہایت ذہین انسان تھے 'تھوڑے' کو 'بہت' کر دینا
ان کے قلم کا کھیل تھا۔ وہ صحیح معنیٰ میں ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے
یہی وجہ ہے کہ ان کے رقعے اور پرچے آج تک ہمیں عزیز ہیں۔

ا

۲۹ر ستمبر ۴۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب،

مٹھوں کا بہت بہت شکریہ، جو سرور[1] صاحب کی معرفت موصول ہوئے۔ اتنے بڑے بڑے دانے میں نے کم دیکھے تھے اور پھر اس کثرت سے۔ مدت ہوئی ایک بار ذاکر صاحب[2] بہت سارے لائے تھے تو لطف اٹھانے کا موقع ملا تھا۔

سرور صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ بنارس سے واپس آ گئے۔ امید ہے آپ کی منشا کے مطابق وہاں مواد مل گیا ہوگا۔

ذاکر صاحب کی بچی اب تک علیل ہے۔ اللہ فضل فرمائے۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور، جو اس وقت شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، لکچرر تھے۔
[2] ڈاکٹر ذاکر حسین
[3] بنارس میں اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں مواد تلاش کرنے گیا تھا۔

۲

ذکاء اللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ
۲؍اپریل ۱۹۵۹ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

خط ملا۔ آپ نے جس محبت سے اس سانحے میں ہم سب کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمایا اس کے لیے شکر گزار ہوں[1]۔ کیا کہوں کہ کیا گزر گئی اور گزر رہی ہے۔ کتنی بے شمار باتیں یاد آتی ہیں اور طبیعت بے قرار ہو جاتی ہے۔ وہ باتیں جو اس کی زندگی میں کبھی نہیں یاد آئیں۔ کیسی کیسی معذوریوں کے باوجود اس کے لیے کیسے کیسے منصوبے بنا رکھے تھے! صبر کس طرح آئے اور غم کا خوگر کس طرح بنوں، جب وہ ہر بار نئے سرے سے یاد آتی ہے۔ اسی طرح کی باتیں کہنا چاہتا تھا لیکن اس کا سلسلہ بھی دیر تک قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے خدا حافظ۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] یہ تعزیتی خط میں نے امریکہ سے رشید صاحب کی سب سے چھوٹی بچی اسماء رشید عرف منّی کے انتقال پر لکھا تھا۔

۳

۲۵ر جنوری ۱۹۶۱ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

کچھ معلوم نہ ہوا آپ نے اپنا تفصیلی خاکہ[1] مرتب کر لیا یا نہیں تاکہ سب لوگ مل کر اس پر گفتگو کر لیتے۔ پرسوں احسان کے ہاتھ ایک خط اس مقصد کے سلسلے میں بھیجا تھا، لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ معلوم نہیں آپ کو ملا بھی یا نہیں۔ کام جلد شروع کر دینے میں فائدہ یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ اکثر احباب بڑے تقاضے اور خوشامد کے طلبگار ہوں گے، اس کی بھی تو گنجائش رکھنی ہے۔ خاکے کی تفصیل اس لیے چاہتا ہوں کہ اس طرح ہر شخص کے سپرد فیصلہ شدہ موضوع مع ابواب وفصول کے کر دیا جاتا اور لوگ نادانستہ طور پر ایک دوسرے کی حدود میں داخل نہ ہو سکتے۔ یوں جیسے آپ کی مرضی ہو۔

آپ کا

رشید صدیقی

---

[1] اشارہ "علی گڑھ تاریخ ادب" کی جانب ہے جس کا خاکہ رشید صاحب کی!! سے میں نے تیار کیا تھا۔

۴

۱۲؍جون ۱۹۶۲ء
ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، آداب

نوازش نامہ مورخہ ۱۵؍ پرسوں صادر ہوا جس میں احسان[1] کے نام ایک خط بھی ملفوف تھا۔ میں نے ان کو دونوں دے دیئے کہ وہ پڑھ لیں لیکن وہ ان بے وقوفوں میں ہیں جو خط کا بروقت جواب دینے میں اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں یا کاہلی کو سندِ جواز مانتے ہیں اور یہ دونوں باتیں نالائقی کی دلیل ہیں۔ یہ معلوم کرکے خوش ہوا، گو یہ خوشی غیر متوقع نہ تھی کہ آپ حیدرآباد کے اپنے اس نئے منصب، نئے رفقارِ کار، نئی جولاں گاہ اور نئے لیل و نہار سے خوش و مطمئن ہوں گے[2]۔ مکان مل گیا اور اب وہاں کی خوشیاں اپنے متعلقین کے ساتھ منائیں گے۔ اس

---

[1] پروفیسر احسان رشید صدیقی، رشید صاحب کے دوسرے صاحبزادے۔ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔

[2] میں نے جون ۱۹۶۲ء میں پروفیسر و صدر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی کا چارج لیا تھا۔

کی اور زیادہ خوشی ہے۔ زندگی کی بڑی نعمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے
۔ مجھے یقین ہے حیدرآباد میں آپ نام وری بھی حاصل کریں گے اور
نیک نام بھی رہیں گے۔ آپ کو اللہ نے وہ نعمتیں دی ہیں کہ کم ظرفوں
یا حاسدوں کی ریشہ دوانیاں آپ کی دلچسپی کا موجب ہوں گی غلطیاں
نہیں۔ آپ حیدرآباد میں اپنے لیے ایسا مقام بنالیں گے جو
آپ کی خاندانی روایات اور ذاتی صفات کے عین مطابق ہوگا۔ اس
سے علی گڑھ کا بھی نام روشن ہوگا۔ یہاں کے دنی الطبع لوگوں کا
خیال بالکل دل سے نکال ڈالیے، ایک فارسی شاعر نے بھی اس کی ہدایت
کی ہے، جس نے کہا ہے: بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی!
اس دفعہ کا فکرونظر[۱] اپنے مقررہ معیار کے مطابق نہیں نکلا۔
اس کے لیے تھوڑا سا وقت اِدھر اُدھر سے بچا کر کچھ لکھ دیا کیجیے۔
آپ نے غالبؔ کا ایک شعر لکھا ہے، دوسرا مجھ سے سنیے، کچھ اس طرح
کا احساس ہے جیسے آپ اسے quote کر رہے ہوں:

کعبے میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کُنِشت کو

آپ کا
رشید صدیقی

---

[۱] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا تحقیقی سہ ماہی مجلہ

۵

ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۳ ستمبر ۶۲ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

خیال ہے کہ ستمبر میں دو تین ہفتے کے لیے آپ یہاں تشریف لائیں گے جیسا کہ فرما گئے تھے۔ اگر آسانی سے ممکن ہو تو ایک ٹوکری میں چند پودے حیدرآباد کے عمدہ قسم کے پپیتے کے لیتے آیئے گا، یہاں وہ قسم ناپید ہے۔ ذاکر صاحب یہاں تھے تو حیدرآباد کے بڑے عمدہ اور غیر معمولی سائز کے پپیتے لایا کرتے تھے یا کوئی بھیج دیتا تھا۔ اس طرح کی مستند پود کہاں اور کیسے ملے گی اس بارے میں ممکن ہے سروری[1] صاحب آپ کی مدد کر سکیں، عبدالغفار شکیل[2] بلائے ہوئے آئے ہیں، دیکھو ڈپارٹمنٹ میں کیا مقام ملتا ہے اور ملتا بھی ہے یا نہیں! ایک شام ملنے آئے تو اسی طرح کی گفتگو کرتے رہے میں نے اکثر

۱۔ پروفیسر عبدالقادر سروری، سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی

۲۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

انھیں بتایا کہ ان کی حیثیت بظاہر اُس شخص کی معلوم ہوتی ہے جو دوسروں کے لیے "بسترگرم" رکھنے کے لیے مامور ہوتا ہے۔ سب کو سلام دعا

آپ کا
رشید صدیقی

یوسف صاحب کے خلاف Blitz وغیرہ نے زہر اگلنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا تو نہیں کہ موصوف کے لیے کوئی اچھی جگہ کا بندوبست ہونے والا ہو۔

۶

۱۶/اکتوبر ۶۳ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، آداب

آپ کا ۱۰/ کا نوازش نامہ کل ۱۵/ کو ملا ۔ چھٹے دن! حیدرآباد سے اتنے دنوں میں پہلے کبھی ڈاک نہیں ملی تھی ۔ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ خط تو اِدھر اُدھر نہیں ہوا جو حال ہی میں آپ کو میں نے لکھا تھا کہ شیروانی کے کپڑے (ہمرو) کا خیال ترک کر دیا گیا، اب تو وہ اسکارف یا چھوٹی چادر درکار ہے جس کو خواتین کام میں لاتی ہیں اور بالعموم بطور زیبائش شانوں پر ڈال لیتی ہیں ۔ ہمرو کا جو نرخ آپ نے لکھا ہے اور جو نمونے بھیجے ان سے تو یہی اندیشہ ہوتا ہے کہ سروری صاحب نے اس بار جو ٹکڑا لاکر دیا تھا جس کا قصہ آپ کو معلوم ہے وہ اس تخمینی قیمت سے زیادہ کا ہے جو میں نے آپ کی معرفت بھیجی ہے ۔موصوف کا یہ تکلف کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ صحیح قیمت کے بجائے بہت گھٹا کر اس کی قیمت بتاتے ہیں اور جب وہ روپے ادا کیے جائیں تو قبول کرلیں۔ یاد آتا ہے کہ بڑے اصرار پر انھوں نے اس ٹکڑے کے دام کُل ۱۵/ بتائے تھے ۔ حالاں کہ نرخوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دس

روپے سے زیادہ کا ہے۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔

بڑی خوشی ہے کہ آپ عنقریب دہلی آئیں گے اور وہاں کے بعد یہاں کا بھی ایک چکر لگائیں گے، ممکن ہے اس وقت تک احسان بھی آجائیں ان کا پروگرام مکمّل ہو چکا ہے۔ احسان ۲ر کو چلے گئے اب وہاں سب ٹھیک ٹھاک کرکے آئیں گے، ممکن ہے آپ سے یہاں ملاقات ہو جائے۔ علی گڑھ کے حالات اب یہیں آکر دیکھئے سنیئے گا۔

آپ کا
رشید صدیقی

۷

۲۰ اکتوبر ۶۲ء

ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب، محترم

گرامی نامہ مورخہ ۱۶ اکتوبر۔ ہرو کے پیچھے تو میں آپ کے لیے وبالِ جان بن گیا۔ میرا پچھلا خط ملا ہوگا جس میں عرض کیا گیا ہے کہ شیروانی کا خیال ترک کر دیا گیا اب تو صرف ایک زنانے اسکارف کی ضرورت ہے جو سیاہ نہ ہو، کسی اور گہرے اور ہلکے رنگ کا ہو اور اس کی قیمت ۲؎ اور ۳/۱؎ کے درمیان ہو۔ پچھلی بار سروری صاحب نے جو فراہم کر دیا تھا اس کی قیمت میرے اصرار پر صرف ۳۰؎ بتائی تھی۔ واللہ اعلم! بہرحال اتنا تو دریافت فرما ہی لیجیے گا کہ ہرو کا ایک عمدہ زنانہ اسکارف (یا مختصر چادر) کس قیمت کا ملتا ہے۔ احسان ابھی آئے نہیں، آتے ہوں گے لیکن پھر جانے کے لیے۔ ان دنوں میری طبیعت بحال نہیں ہے۔ لیکن اس کا شکوہ کیا!

آپ کا

رشید صدیقی

۸

ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۲۳ر اکتوبر ۶۲ء

مسعود صاحب مکرم، آداب

کوئی صاحب حیدر آباد کے احمد جلیس[1] یہاں آئے تھے اور پرسوں یا نرسوں مجھ سے ملنے دوبارہ گھر پر تشریف لائے۔ ایک رات پہلے سے میری طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے مل نہ سکا۔ چلتے وقت ایک شکایتی فقرہ لکھ کر واپس حیدر آباد ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں مل نہ سکا۔ اگر وہ کبھی آپ سے ملیں تو میری طرف سے معذرت کر دیجئے گا۔ ملنے ملانے اور دیر تک گفتگو کرنے سے بچتا ہوں تاوقتیکہ کوئی شناسا، بے تکلف اور مخلص دوست نہ ہو۔ "یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ" قسم کا آدمی میں نہ ہوں، نہ بننا چاہتا ہوں۔ اس لیے حتی الوسع ملاقات، دید بازدید وغیرہ سے بچنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس دفعہ تو طبیعت ہی نہیں اچھی تھی۔ رات کو کئی دست اور قے، بغیر کسی بے احتیاطی کے ہو چکے تھے، طبیعت نڈھال تھی اس لیے نہ مل سکا۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] احمد جلیس صاحب جو بعد کو آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں چلے گئے تھے۔

۹

۱۲ر نومبر ۶۲ء
ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

آپ کے رجسٹرار صاحب کے دفتر سے ۸ر کا لکھا ہوا خط مجھے کل ملا جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ نسخۂ مطلوبہ[1] ۱۶ر نومبر کو وہاں پہنچ جائے یہ ممکن کیسے ہے؟ زرا آپ ان صاحب کو سمجھا دیجیے کہ مفوضہ فریضہ میں دماغ پاشی کرنی پڑتی ہے گھاس کاٹنا نہیں ہوتا میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ جلد سے جلد اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی کوشش کروں۔

ان صاحب[2] کا سوال نامہ مع آپ کے خط کے مجھے مل گیا۔ ان کا طریقہ اور لب ولہجہ مجھے پسند نہیں آیا۔ ان کے نام کی ڈاک

---

[1] انتخاب اُردو، برائے پری یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی

[2] ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید جو اس وقت رشید صاحب پر اپنا ایک تحقیقی مقالہ میری نگرانی میں تصنیف کر رہے تھے اور اس سلسلے میں علی گڑھ کا بھی چکر لگایا تھا۔

بھی میرے نام سے آنے لگی ہے۔ اسے بھی میں اچھی بات نہیں سمجھتا۔
آپ تو جانتے ہی ہیں انٹرویو لینے اور دینے سے کس قدر بچنے کی
کوشش کرتا ہوں۔ اسی طرح جو شخص اس پر اصرار کرتا ہے اس
کے بارے میں میرا ردعمل کیا ہوگا

آپ کا
رشید صدیقی

۱۰

۱۵ر نومبر ۶۲ء
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
میں نے پرچہ بنا کر آج بھیج دیا۔ مقررہ میعاد سے دو ایک دن دیر میں ملے گا لیکن اس سے مفر نہ تھا یہ یونیورسٹی کے دفتر کی غلطی ہے کہ خط ۸ر کو لکھتے ہیں اور پوسٹ ۱۲ر کو کرتے ہیں اور ستم یہ کہ ۱۶ر کو پرچہ طلب کرتے ہیں۔

اطہر جاوید صاحب کی کارگزاری کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر چکا ہوں۔ پورے طور پر نہ تو میں نے ان کا خط پڑھا تھا نہ آپ کا۔ آج کاغذوں میں مل گیا تو حالات معلوم ہوئے۔ یہ میری غلطی تھی کہ یہ کاغذات پاکر اتنی طبیعت منغص ہوئی کہ بذریعہ تار جواب نہ دے سکا کہ موصوف تکلیف نہ فرمائیں۔ حالاں کہ اگر اس وقت دے دیتا تو ان کو بر وقت مل جاتا۔ اب تو ان کے نام کے خطوط بھی میرے توسط سے آنے لگے ہیں۔ یہ بے تکلفی بھی مجھے پسند نہ آئی۔ انھوں نے اپنی تحقیقات

کے سلسلے میں میرے سارے خاندان کو لپیٹ لیا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے کرے لیکن ہر شخص اس پر تو مجبور نہیں ہے کہ وہ اس کی تائید کرے۔ آپ کو اٹھارہ روپے کا ایک منی آرڈر عرصہ ہوا بھیجا تھا مل گیا ہوگا۔ رسید نہ آئی۔

آپ کا
رشید صدیقی

۱۱

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۰ر نومبر ۶۲ء

مسعود صاحب مکرم، آداب

۱۷ر کا والا نامہ ملا۔ کل سلمان اطہر جاوید صاحب آئے اور مہرو اور دام حوالے کیے۔ کپڑا بہت پسند آیا۔ اطہر جاوید صاحب بھی۔ آپ نے میری طرف سے ان کو اس درجہ سہما دیا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے خول سے باہر نکلنے کی جرأت کرتے تھے۔ اس سے میری نظر میں اپنی نا لائق اوقات سے نفرت بڑھ گئی، لیکن میں نے اطہر صاحب کی مشکل آسان کر دی یعنی ان کو حقوق شہری rights of citizenship دے دیا ہے یعنی جب جہاں چاہیں مجھ سے مل سکتے ہیں اور بے تکلف ہو سکتے ہیں۔ کیا کرتا!

دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے!

نسیم لکھنوی کا پہلا مصرعہ آپ کو یاد ہوگا یعنی:

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑ یو!

"دیوانے" سے مراد آپ نہیں، یہ اس لیے لکھنا پڑا کہ واقعی جو دیوانہ

ہے یعنی میس۔ اس کی طرف آپ کا ذہن منتقل نہ ہو۔ ذاکر صاحب نے اطہر جاوید سے ملنے کے لیے ۲۳ نومبر مقرر کیا ہے۔ پرچہ اب تک رجسٹرار صاحب کی خدمت میں پہنچ چکا ہوگا۔ احسان یہیں ہیں۔ ان کے پروگرام کی شاید ان کو بھی خبر نہیں ہے۔ البتہ انھوں نے اطہر صاحب کی مدارات میں ہر طرح کی کوشش کی۔ یوسف صاحب[1] خیریت سے ہیں اور خوش و خرم۔ ان کی بیگم صاحبہ اور صاحبزادی سلمہا دہلی گئی ہوئی ہیں۔ ہاں ایک بار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ مرسلہ ہمرو کا اسکارف بہت عمدہ ہے ہر اعتبار سے جس کے لیے آپ کا شکر گذار ہوں۔

آپ کا
رشید صدیقی

۱؎ ڈاکٹر یوسف حسین خاں جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر تھے۔

(۱۲)

ذکار اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۸ دسمبر ۱۹۶۲ء، شنبہ

مسعود صاحب، مکرم

کئی دن ہوئے نوازش نامہ ملا تھا جس میں آپ نے سلیمان اطہر صاحب کے واپس حیدر آباد تک پہنچ جانے کی اطلاع دی تھی اور اس امر کا بھی اظہار کیا تھا کہ یہاں آپ کے مکان کا کرایہ حسب دل خواہ طے ہو گیا۔ سلیمان صاحب سے کئی موقعوں پر مختلف مباحث پر گفتگو کا سلسلہ رہا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ انھوں نے کوئی گفتگو نہ کی، میں ہی کرتا رہا۔ اس سے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ میں اپنا مطلب واضح کر سکا یا نہیں اور خود انھوں نے ان باتوں کے صحیح import کو سمجھا یا نہیں۔ میں تو اپنے ذاتی تاثرات یا عقائد کا ذکر کرتا رہا اور "تاثرات اور عقائد کو آج کل "متاعِ کاسد" سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی جب کوئی شخص (وہ بھی ایک معصوم طالب علم) اس طرح مسلط ہو جائے! آپ کو یہ باتیں اس لیے بتانا پڑیں کہ آپ ان کے کام کے نگراں ہیں۔ آپ کے ذہن میں یہ بات رہے کہ کون سی بات کس سیاق و سباق میں کی گئی ہے۔ ہر بات باضابطہ ضبطِ تحریر میں لانے کی نہیں ہوتی چاہے وہ براہِ راست سننے

میں آئی ہو۔ آپ جانتے ہیں اپنے "محاسن" سے آراستہ ہوکر نہ کتابوں میں جگہ لینا مجھے پسند ہے نہ اپنے "معائب" کو طشت از بام کرنے یا ہونے دینے کی جرأت ہے۔ میں وہیں رہنا چاہتا ہوں جہاں ہوں۔ ٹیلیویژن کی زد میں آنا نہیں چاہتا۔ یہی درخواست عزیزوں اور دوستوں سے ہے۔ زندگی میں نہیں تو امید ہے مرنے کے بعد اس کا خیال رکھیں گے۔ اگر سلیمان اطہر صاحب نقطہ بہ لفظ "بین الاوین" وہ باتیں لکھ ڈالیں جو ان کی خاطر میں کہتا گیا تو یہ بھدّی بات ہوگی۔ یہ تو ان کی ذہنی فضا یا افق کو واضح اور روشن تر کرنے کے لیے کہی گئی تھیں۔ نہ کہ "بیان استغاثہ" یا "جوابِ ملزم" کے طور پر!

میرے پاس مضامین کا جو غیر مرتب گڈمڈ پلندہ تھا وہ میں نے ان کے مطالعہ کے لیے دے دیا تھا۔ اس میں سے ایک حصّہ تو انھوں نے یہیں واپس کر دیا، بقیہ کے لیے کہا کہ آپ کی معرفت بھیج دیں گے۔ آپ مارچ میں تشریف لائیں تو ہمراہ لا ییے گا۔ ڈاک سے بھیجنے کا انتظام نہ کیجیے گا۔ میرے پاس بھی تو وہ یوہنی کباڑ کے طور پر پڑا رہے گا ——— آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا، لیکن نہ غمِ عشق کی نہ غمِ روزگار کی بلکہ ویسی ہی جو برسبیلِ تذکرہ سامنے آجاتی تھیں جب آپ یہاں تھے اور ملاقات ہوا کرتی تھی ان کو نہ لکھنے کی سکت نہ ضرورت۔ احسان یہیں ہیں، کسی وقت تقریب کے سلسلے میں چلے جائیں گے۔ آپ کا خط ملا نہیں رہا ہے شاید پڑھنے کو ان کو دے دیا تھا۔ ان سے کون پوچھے کہ وہ کہاں ہے یا کدھر گیا۔ غالباً آپ نے ایسی بات نہیں لکھی تھی جس کا جواب دینے سے رہ گیا۔

خواجہ مجید[1] صاحب گذشتہ اتوار کو رحلت فرما گئے، یہاں کے مسلمانوں کے لیے بڑی تقویت کا باعث تھے، اب کوئی نہیں رہا۔ لیکن اس کا ماتم کیسا؟ یہ تو روز ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ لیکن جب یہ حادثہ کسی اپنے پر گذرتا ہے تو دل کا عالم ہی عجیب ہوتا ہے۔ زندگی یا زمانہ کسی کے غم یا خوشی کے پابند نہیں وہ کسی کا احترام نہیں کرتے لیکن وہ غریب بھی کیا کریں وہ بھی تو مجبور ہیں، وہ کب گزرنے اور گزرتے رہنے سے باز رہنے دیے جاتے ہیں۔

سردی کچھ چمک گئی تھی اب اعتدال پر ہے، سب کو دعا

مخلص

رشید صدیقی

فکر و نظر کے لیے کچھ لکھ ڈالیے۔ اب تو کچھ سکون ہو گیا ہو گا۔ یوسف صاحب سے کل شام ہی ملا تھا۔ خوش و خرم ہیں اتنے کہ اپنے آزار کے علاج کی طرف متوجہ ہونے سے بھی بے نیاز!!

---

[1] عبدالمجید خواجہ صاحب

۱۳

۲۷ر دسمبر ۶۲ء
ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

محبت نامہ کل ملا۔ ان دنوں viva کے سلسلے میں سروری صاحب تشریف لائے تھے۔ مختلف باتوں پر گفتگو رہی جس کا حال انھوں نے سنایا ہوگا۔ میں نے انوار کو سروری صاحب کے بارے میں عابد صاحب[1] کو خط لکھ دیا تھا، وہ منگل سے پہلے ان کو ملا نہ ہوگا۔ لیکن خود سروری صاحب عابد صاحب سے انوار کو مل لیے ہوں گے اور مؤخرالذکر کو ردِّ عمل بھی معلوم ہوگیا ہوگا۔ ممکن ہے دو ایک دن میں عابد صاحب کا بھی خط آتا ہو۔ ہمارے قبیلے کی دقت تو یہی ہے کہ کتنی ہی معقول بات کیوں نہ کہیں اس کو ملاءِ اعلیٰ تک پہنچائیں کیسے؟ آپ نے جس ۔ ۔ ۔[2] ۔ ۔ طرف اشارہ کیا ہے ممکن ہے اس کے لیے قرائن موافق ہوں لیکن کیا معلوم کہ آخر وقت میں کیا پیش آجائے۔ مثلاً "قران السعدین"

---

[1] ڈاکٹر سید عابد حسین

[2] اصل میں صرف نقطے

ہی نہ ہو پائے۔ "اشٹ گرہ" کی ساعت آنے میں کیا دیر لگتی ہے جب کہ وہ ایک طور پر نازل بھی ہو چکی ہو۔ بہر حال۔۔۔۔۔

ان دنوں کراچی سے اقبال[۱] آ گئے تھے۔ ۸۔ ۹ دن بعد کل وہ بھی جائیں گے۔ میں ان سب کے آنے اور ملنے سے گھبراتا ہوں اس لیے کہ پھر جلد یا بدیر ان کی جدائی کا کرب ساری خوشیوں کو پامال کر جاتا ہے اور اپنے اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ احسان بھی عنقریب ہی چلے جائیں گے۔ آپ کا خط ان کو دکھا دیا ہے۔ علی گڑھ کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہوگا وہ صحیح ہوگا۔ لیکن نظرِ بد لگنے میں بھی دیر نہیں لگتی، کیا معلوم کب ہوا کا رُخ کدھر جائے۔ اِدھر آ کر کیا کیجیے گا۔ جب آنے کا مقصد حاصل ہو چکا ہو۔ زندگی ہے تو مارچ میں ملنے کا اتفاق ہوگا۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔

آپ کا

رشید صدیقی

۱؎ اقبال رشید صدیقی۔ رشید صاحب کے بڑے صاحب زادے۔

۱۴

۲۲ر جنوری ۶۳ء

ذکاءاللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

۱۸ر کا نوازش نامہ پرسوں ملا۔ اتفاق سے اسی دن سروری صاحب سے بہ ہمرہی ڈاکٹر نذیر احمد صاحب[۱] غریب خانے ہی پر ملاقات رہی اور تا دیر ہر طرح کے مسائل اور وسائل پر گفتگو رہی۔ کل صبح واپس گئے ہوں گے اور اس خط سے پہلے غالباً حیدر آباد پہنچ جائیں گے۔ ان سے مل کر آپ کو صورت حال معلوم ہو گی جب تک کوئی مربی نہ ملے کام چلتا نہیں اور ہم کو، آپ کو جیسے مربی ملتے ہیں اور مل سکتے ہیں وہ بھی کوئی راز نہیں۔ اور کیا لکھوں، زندگی کا کام چل رہا ہے اور چلتا رہے گا، اس لیے کہ اس کو چلانے والے کی ضرورت نہیں۔ "قاطع اعمار" نجوم ہی نہیں امراض و اشخاص بھی ہوتے ہیں جن کی علی گڑھ میں کیا کہیں کمی نہیں۔ امید ہے آپ خوش و خرم

---

[۱] پروفیسر نذیر احمد جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں صدر شعبۂ فارسی تھے۔

ہوں گے۔ بیوی بچے بھی۔ احسان ابھی یہیں ہیں۔ عید کے چاند میں انشاء اللہ تقریب[1] ہوگی۔ اب تک تو یہی معلوم ہے اور توقع بھی ہے۔

آپ کا

رشید صدیقی

کچھ فکر و نظر کے لیے نہ لکھیے گا؟

---

[1] اشارہ ڈاکٹر احسان رشید کی شادی کی جانب ہے جو سر راس مسعود کی صاحبزادی نادرہ مسعود سے ہوئی تھی۔

۱۵

ذکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

مسعود صاحب مکرم ومحترم۔ آداب
بعض احباب میرے نجی خطوط جو وقتاً فوقتاً میں نے ان کو لکھے ہیں یا میرے فراموش شدہ مضامین، نیز میری سیرت و شخصیت کے خدو خال کو منظر عام پر لانے کی غرض سے رسائل یا اخبارات کے خاص نمبر شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جہاں تک پتہ لگ سکا ان عزیزوں کو بڑے ادب و اخلاص سے ممانعت کے عریضے لکھ دیئے ہیں۔ قرائن سے پتہ چلا ہے کہ یہ کافی نہیں ہے۔ اس لیے آپ کے موقر اور کثیر الاشاعت اخبار یا رسالے سے اعانت کا خواستگار ہوں چنانچہ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ:

(۱) میرے نجی خطوط، نجی تحریریں یا متذکرہ بالا مضامین کی کسی بہانے اشاعت کی جائے۔ ان کو کہیں منتقل یا محفوظ کر دیا جائے بلکہ ان کو یکسر تلف کر دینا میری عین شکرگذاری کا موجب ہوگا

(۲) میری حیات میں یا مرنے کے بعد اخبارات و رسائل کے خصوصی نمبر شائع کیے جائیں۔

(۳) میری یادگار قائم کرنے یا منانے کے لیے کسی قسم کا چندہ یا عطیہ قبول کیا جائے یا پیغامات منگانے یا شائع کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ میری اس درخواست کے خلاف جتنی دلیلیں پیش کی جاسکتی ہیں ان سے میں ناواقف نہیں ہوں، لیکن یہاں اس طرح کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا صرف اتنی التجا کرتا ہوں کہ ان کو قبول فرمایا جائے۔

بایں ہمہ اگر کسی نے اس گزارش کو ناقابلِ اعتبار قرار دے کر وہ کیا جس کے نہ کرنے کی میں نے التجا کی ہے تو میں ان کو اپنے نزدیک شریف آدمی نہیں سمجھوں گا اور شاید وہ لوگ بھی نہ سمجھیں جو مجھے یا میری اس استدعا کو آج یا مرنے کے بعد بھی چند دنوں قابلِ لحاظ خیال فرمائیں گے۔

ہندوستان اور پاکستان کے جملہ اُردو اخبارات و رسائل کے

یہ خط دراصل ایک "ٹائپ شدہ گشتی مراسلہ کا مسودہ ہے جو "ایک معروضہ" کے عنوان سے رشید صاحب نے اُردو کے موقر اخبارات و رسائل کے مدیروں کی خدمت میں بھیجا تھا۔ تھوڑی سی تبدیلی کر کے اسی کو نجی خط بنا کر مجھے ارسال کیا تھا۔ اس کے ساتھ ملفوف اگلا خط بھی تھا جس میں رشید صاحب رقم طراز ہیں "میں نے اس کو بعض اُردو اخبارات میں چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن احسان نے سختی سے مخالفت کی......"

مہتمم اور ایڈیٹر صاحبان سے گزارش ہے کہ اس معروضے کو بجنسہٖ ورنہ اس کا خلاصہ شائع فرماکر مجھے ممنون کرم فرمائیں، گو ان کے کرم کو صرف اپنے ممنون ہونے سے بدرجہا ارفع سمجھتا ہوں۔

خاکسار

رشید احمد صدیقی

۱۶

۲۴ر جنوری ۱۹۶۳ء
ذکاراللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
کل ڈاکٹر محمد حسن[1] نے یہ خبر سنائی کہ اخوت نامی کوئی اُردو اخبار کلکتے سے شائع ہوتا ہے جس کے ایڈیٹر کوئی ایسے صاحب ہیں جو یہاں کے طالب علم رہ چکے ہیں۔ اسی اخبار میں وہ انٹرویو شائع ہوا ہے جو آپ کے سلیمان اطہر جاوید صاحب نے (غالباً یہی نام ہے) ذاکر صاحب سے میرے متعلق دہلی میں لیا تھا۔ ظاہر ہے اطہر صاحب کی ایما سے یہ ہوا ہوگا ورنہ کسی اور کو اس انٹرویو کی تفصیل کی کیا خبر تھی اور اس کو اخبار میں شائع کرنے کی کیا پڑی تھی! یہ کام اطہر صاحب نے نہایت قابل اعتراض کیا۔ آپ کے تعارف و توسل سے میں ان کو حیدرآباد کے کسی اچھے گھرانے کا شریف و سعادت مند نوجوان سمجھتا تھا اس لیے ان کی پذیرائی میں نے اور احسان نے بڑے تپاک سے کی اور وہ جو کچھ چاہتے تھے (تحریر و تقریر سے) وہ کیا لیکن اپنے نام اور کام کو اچھالنے

---

[1] پروفیسر محمد حسن، شعبۂ اُردو، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی

کی خاطر ذاکر صاحب کو اور مجھے جس طرح منظر عام پر گھسیٹ لائے اس کے بارے میں معمولی سے معمولی الفاظ بھی استعمال کروں تو وہ بھی سخت ہوگا اس لیے اس سے احتراز کرتا ہوں۔ انھوں نے میری توہین کی۔ جسے معاف کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ میں آپ پر مطلق احسان نہیں جتاتا اور آپ محسوس کرتے ہوں گے کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا واسطہ نہ ہوتا تو میں ان کو اپنے دروازے میں گھسنے نہ دیتا۔ انٹرویو جانے والوں کی میں نے کبھی ہمت افزائی نہ کی۔ جب چڑیاں کھیت چگ چکیں تو پھر کیا جاسکتا ہے لیکن چاہتا ہوں کہ جو میٹریل تحریر وتقریر یادستاویز کی شکل میں میں نے ان کے حوالے کیے وہ سب کا سب مجھے واپس کردیں کیوں کہ جو کچھ وہ پوچھتے گئے اُسے میں نہایت تفصیل سے بتاتا گیا اور وہ سب قلم بند کرتے گئے۔ یہ سب اب ناممکن معلوم ہوتا ہے البتہ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ میں اطہر صاحب کو کس ٹائپ کا آدمی سمجھتا ہوں۔

ملفوظہ ٹائپ شدہ عبارت پڑھ کر اپنے پاس رکھ لیجیے اور مرے مرنے کے بعد یا ضرورت ہو تو اس سے پہلے بھی اس کے مطابق عمل درآمد کیجیے گا۔ میں نے اس کو بعض اُردو اخبارات میں چھپوانے کا ارادہ کیا تھا لیکن احسان نے سختی سے مخالفت کی انھوں نے جو دلائل دیے وہ یقیناً پوچ تھے، لیکن کچھ عرصہ سے میں نے اپنا دستورالعمل بنا رکھا ہے کہ دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ ہو اپنے لڑکوں کی بات مان لوں تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ کمّا بڈھا نہ خود مرتا ہے نہ ہم سب کو جینے دیتا

ہے۔ میری مشکل یہ ہے کہ مقررہ وقت سے پہلے خودکشی بھی نہیں کرسکتا۔ پھر کیا کروں۔ یہ لڑکے کم عقل سمجھنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ بوڑھے ذی حس نہیں ہوتے۔ بہر حال اس خط کو تلف کر دیجیے گا۔ ٹائپ شدہ ورق رکھ لیجیے گا۔ ممکن ہے سرور صاحب[1] اور اس قبیل کے لوگ کبھی میرے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کریں اور آپ یہ دستاویز پیش کرسکیں۔

مخلص

رشید صدیقی

---

[1] پروفیسر آل احمد سرور، سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۱۷

۲۹ جنوری ۶۳ء
بتم
ذکاراللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہنیت نامہ صادر ہوا۔ آپ نے بہت سی باتیں بڑے موقع اور بڑے مزے سے کہی ہیں۔ آپ کی محبت کی باتوں سے بہت متاثر اور مسرور ہوا۔ دفعتاً زکام میں گرفتار ہوگیا۔ تمام عمر اس سے سابقہ نہیں ہوا تھا۔ اب ہوا تو اسے نہایت ناہنجار پایا۔ یوں بھی اب ہر جسمانی آزار کو آخری آزار سمجھنے کی طرف ذہن مائل ہوتا ہے جو نہایت نامعقول ذہنی افتاد ہے۔ احسان ابھی یہیں ہیں لیکن جلد یا بدیر ہوگا وہی جو ہونے والا ہے۔ صرف دیر سویر کی بات ہے۔ سروری صاحب، عابد صاحب اور سرور صاحب کے مثلث متساوی الاضلاع کی عقدہ کشائی ناممکن ہے لیکن انجام ظاہر ہے اور اصل چیز تو انجام ہی ہے۔ اپنے مجلس[۱] سے عہدہ برآ ہونے کا حال بڑا جامع، دل چسپ اور مختصر لکھا جو کچھ

---

[۱] مجلس سے عہدہ برآ ہونے کا واقعہ میرے ذہن میں نہیں رہا۔

کیا وہ آپ ہی کر سکتے تھے:

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

شاید اقبال بھی اس طرح گوشے نہ ملا سکتے اچھا خدا حافظ، اس وقت جتنا ہے، کیا اس کو غنیمت جانیے۔

آپ کا
رشید صدیقی

۱۸

۲۵ر فروری ۶۳ء
ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
آج صبح احسان سے معلوم ہوا کہ سروری صاحب کشمیر میں اُردو کے پروفیسر ہو گئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ ان کو میری طرف سے دلی مبارکباد پہنچا دیجیے۔ مکان کا پتہ نہیں معلوم اس لیے براہِ راست ان کو نہ لکھ سکا۔ کل عید ہے۔ آپ دونوں کو اس کی تہنیت بھی پیش کرتا ہوں۔

آپ کا
رشید صدیقی

۱۹

۶ر مارچ ۶۳ء
ذکاءاللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
۲ر مارچ کا نوازش نامہ کل ملا۔ ان دنوں اپنے یہاں کے موسم کو شاہانِ گولکنڈہ کے شب و روز سے خوب ہی co-relate کیا۔ سروری صاحب کے تقرر سے خوشی ہوئی اور زیادہ یوں کہ غیر متوقع تھا۔ مجھے امید ہے کہ وہ "کشمیر جھیل جائیں گے"۔ ایک زندگی وہ بھی تو ہوتی ہے جہاں شاعر نے کہا ہے:

ایک ہی شب گو رہے لیکن گلوں میں ہم رہے

ذاکر صاحب سے انٹرویو کا میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے بتایا نہیں۔ اگر آپ کا خیال ہے کہ اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی تو اطمینان ہو گیا۔ پھر بھی معمولی باتوں میں ان کے نام کو گھسیٹ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ انتخابات کا حال معلوم ہوا۔ یہ تو ہوتا رہا

ہے اور ہوتا رہے گا: باآں کساں کہ یاور دنا مرنداشتند!

آپ نے دلّی کی بڑھیوں کی مثال خوب لکھی۔ پورب میں بنگال کے بارے میں اسی طرح کی بات (کہی) جاتی ہے۔ فرق اتنا البتہ ہے کہ ادھر کی راوی دلّی کی بڑھیا نہیں۔ پورب میں بیوی اپنے جوان شوہر سے کہتی ہے۔

احسان اب جانے والے ہی ہیں۔ مری تنہائی کو کیا پوچھتے ہیں بس آخری تنہائی کے قریب ہوں جس کو غالبؔ نے اپنے طور پہ کہا ہے:
ایک مرگ ناگہانی اور ہے!

اب تو حیدرآباد کا تحفہ آپ خود رہ گئے ہیں ارر آپ آنے والے ہیں: پھر کیا چاہیئے؟

آپ کا
رشید صدیقی

۲۰

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
یکم مئی ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم
آپ کا ۲۷ اپریل کا خط کل مل گیا۔ نظامی[1] صاحب کی پروفیسری کے بارے میں آپ کا غائبانہ لیکن نہایت صحیح جائزہ حیرت انگیز ہے، اگر وائس چانسلر صاحب نے حسبِ معمول علم دوستی، انصاف پسندی اور دلیری سے کام نہ لیا ہوتا تو یہ اسامی ڈوب چکی تھی۔ میں آخر وقت تک بیم و رجا میں مبتلا رہا۔ اس لیے کہ جانتا تھا کہ ریشہ دوانیوں کے کتنے دروازے اور دریچے مخالفوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور نیازمندوں کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ بہر حال حق، حق دار کو پہنچ گیا جس کی خوشی ہے اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ معلومہ پروفیسری کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے۔ موہوم سی ایک امید یہ بھی ہے کہ شاید موجودہ اسامی میں کچھ توسیع ہو جائے۔ دراصل بہت سے وجوہ کی بنا پر اب علی گڑھ سے طبیعت بہت اچاٹ ہے۔ مصروفیت یا تفریح کا خواہاں نہیں ہوں۔ گمنام اور گوشہ نشین ہونے کی بڑی آرزو ہے

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی، صدر شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

طرح طرح کے منصوبے ذہن میں آتے ہیں لیکن ان کو پورا کرنے کی سبیل نہیں میسر ہے۔ لیکن رہیں کہیں آخر "کھائیں گے کیا" اب معلوم ہوتا ہے غالب کتنے بڑے شاعر تھے جہاں انھوں نے کہا ہے۔ "رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"۔۔۔۔ الخ[ا] میری موجودہ ذہنی کیفیت کی ترجمانی اس خوبی سے کوئی اور نہیں کر سکتا تھا جس میں خود اپنے کو بھی شامل رکھتا ہوں۔ آخر مئی سے یہاں موسم بہت تکلیف دہ ہو جاتا ہے کیا کیجیے گا آکے۔ بارے خیال آیا کہ انجمن ترقی اردو اور تاریخ کے ایڈیٹر ریل بورڈ سے مستعفی ہو جاؤں لیکن کائی بھرے تالاب میں ایک کنکری پھینکنے کا نتیجہ معلوم، اس لیے انگریزی کے مقولے کو پیش نظر کر لیتا ہوں -- Let things take their own course

احسان اور احسان کی والدہ اسی عشرہ میں کراچی پہنچ جائیں گے انشاء اللہ، دونوں پا بہ رکاب ہیں۔

(جگہ کی تنگی کی وجہ سے دستخط ندارد)

[ا] اصل میں نقطہ اسی طرح۔

۲۱

۷ر جون ۶۳ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

خیال تھا کہ ہادی صاحب[۱] کی رحلت کے سلسلے میں ان کے بھائی جعفر حسن صاحب[۲] شاید علی گڑھ آئیں تو رسم تعزیت بجا لاؤں گا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نہیں آئے ورنہ ضرور ملنے آتے۔ مشکل یہ ہے کہ جعفر صاحب کا پتہ معلوم نہیں ورنہ براہِ راست خط لکھتا اب میری طرف سے یہ آپ پورا کردیں تو شکر گزار رہوں گا اور میری اس معذوری کا بھی حال بتا دیجیے گا کہ پتہ یاد نہیں رہا تھا ورنہ براہِ راست لکھتا۔

ہادی صاحب مرحوم سے تقریباً چالیس سال سے یاد اللہ تھی، کبھی یہ بات ذہن میں بھی نہیں آئی تھی کہ مفارقت میں وہ پہل کریں گے اور میں ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے زندہ رہوں گا۔ جیسے زندگی کا ایک بڑا آباد گوشہ سونا ہو گیا ہو۔

آپ کا
رشید صدیقی

احسان ۳۰رمئی کو چلے گئے تقریب غالباً محرم اور صفر کے مہینوں میں ہو۔

---

[۱] پروفیسر ہادی حسن، سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
[۲] پروفیسر جعفر حسن، سابق صدر شعبۂ عمرانیات، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد

۲۲

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۱۸ رجون ۶۳ء

مسعود صاحب محترم، تسلیم
آپ کا ۱۲ رجون کا خط کل ملا۔ جعفر صاحب کو تعزیت کا خط لکھ دیا، سوچتا ہوں غریب جان پر کیا نہ گزر رہی ہو گی جس کو مرحوم کی پیدائش سے لے کر وفات تک کی باتیں یاد آتی ہوں گی اور کس کس طرح بے تاب کرتی ہوں گی۔ اپنے بارے میں کیا کہوں کیسے کیسے بزرگوں، دوستوں اور جگر گوشوں کی مفارقت دیکھنا پڑتی ہے۔اب اپنی مفارقت اور دیکھنی رہ گئی ہے اور وہ بھی دور نہیں معلوم ہوتی۔ ذہنی اضطراب اور جسمانی تکالیف کے اعتبار سے وہ منزل بہت قریب آگئی ہے۔ احسان کے بارے میں آپ نے اپنے اور اس سے زیادہ میرے تاثرات کی ترجمانی کی ہے۔ جہاں تک سانحات کا تعلق ہے میری طبیعت روز بروز کچھ ایسی مریضانہ سی ہوتی جا رہی ہے کہ ہر غم بجنسہ تازہ رہتا ہے چاہے اس پر سالہا سال گذر چکے ہوں تازہ ہی نہیں تازہ تر ہوتا رہتا ہے اب اس منزل میں ہوں جب اپنی صلیب خود ہی لیے چلنی پڑتی ہے اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے اس میں نہ دوسرا

ہاتھ لگانے کی فکر کرتا ہے۔ نہ ہمدردی کرتا ہے۔ زندگی اور زمانے کا یہی دستور ہے۔ کلکتہ والی کمیٹی[1] کو میں نے ہی آپ کا، ذاکر صاحب کا، قاضی عبدالودود اور ڈاکٹر تاراچند کا نام لکھا تھا۔ شاید ایک کوئی اور تھا جس کا نام یاد نہیں آتا۔ Judgue کے اسمائے گرامی معلوم ہوئے۔ اس سے اُردو کی طرف سے اطمینان ہوگیا۔ واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے۔ دعا ہے آپ خوش ہوں اور دوسرے بھی آپ سے خوش رہیں۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] اشارہ گیان پیٹھ کی اُردو ایڈوائزری کمیٹی کی جانب ہے۔

۲۳

۱۱ر جولائی ۶۳ء
ذکاراللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

دعا ہے کہ آپ مع متعلقین مسرور و مع الخیر ہوں۔ کل شہریار صاحب[1] کا صبح ایک دستی خط ملا اور شام خود ملنے آئے وہ اب علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہو گئے ہیں۔ فرمائش یہ ہے کہ میں کوئی مضمون لکھ دوں۔ وہ تو خیر میں نپٹ لوں گا۔ سنا ہے انھوں نے مجھ پر لکھنے کی آپ سے فرمائش کی ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ مجھ سے متعلق کچھ نہ لکھیں کسی اور موضوع پر جو چاہیں لکھ دیں۔ آپ کو تو معلوم ہے گورکھپور سے زخمی صاحب[2] جو اپنے میگزین کا نمبر میرے نام سے نکالنا چاہتے تھے اس کی میں نے کتنی مخالفت کی تھی آپ کا میرے بارے میں یونیورسٹی میگزین میں کچھ لکھنا جب وہ صورتِ حال ہو جس سے آپ واقف ہیں کسی طرح مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ اور جس موضوع پر چاہیے ضرور لکھ کر بھیج دیجیے۔

کیسی خراب قسم کی اور کتنی شدید گرمی سے ان دنوں ہم سب کو سابقہ ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] ڈاکٹر شہریار، ریڈر شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
[2] پروفیسر محمود الٰہی زخمی، صدر شعبۂ اُردو، گورکھپور یونیورسٹی

۲۴

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۲ر اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
اس وقت نہ سروری صاحب کا پتہ یاد رہا نہ اُن کی بچی ڈاکٹر ثمینہ[۱]
شوکت کا۔ دونوں کو آپ کا ضامن قرار دے کر یہ خط لکھتا ہوں۔ ضامن
البتہ کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو خود امام ضامن، دوسرے عدالتی،
تیسرے حقہ کا ضامن۔ ان میں اپنا درجہ خود متعین کر لیجیے۔ ہرو کے بارے
میں آپ نے سروری صاحب سے بات کرلی ہوگی۔ ان کا خط آیا تھا
جس میں بہت کچھ اظہار تکلف کے بعد بتایا کہ زیادہ سے زیادہ اتنے[؟]
جو صریحی مبالغہ ہے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ آپ سے بات
کریں گے۔ اس صنعت کا مرکز غالباً اورنگ آباد ہے، لیکن اس کے اچھے

---

[۱] ڈاکٹر ثمینہ شوکت جواب حیدرآباد یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں ریڈر ہیں، پروفیسر عبدالقادر سروری کی عزیز طالب علموں میں تھیں جنھیں سروری صاحب حیدرآبادی روزمرہ کے مطابق ہمیشہ "بچی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔

نمو نے حیدر آباد کے کسی اچھے امپوریم میں مل جائیں گے۔ اب شیروانی
کے لیے درکار نہیں رہا۔ بلکہ خواتین ایک طرح کا اسکارف یا چادر آسائش
کی خاطر اتنا نہیں جتنا نمائش یا زیبائش کے لیے شانوں پر ڈال لیتی ہیں
ویسی ہی ایک چیز درکار ہے۔ عمدہ قسم کی یہ چیز کتنے میں ملے گی؟ زرد
اور سالے رنگ کے سوا، کھلتا رنگ، ڈزائن نازک اور texture عمدہ
ہو، رنگ گہرا ہو تو حرج نہیں۔ اس کی کیا قیمت ہو گی مثلاً فی گز؟
جلدی بالکل نہیں ہے۔ اگر یہ چیز واقعی اورنگ آباد ہی میں سب سے
اچھی ملتی ہو تو وہیں سے منگا لیجیے گا۔ پیپیتے کی پود کی زحمت نہ اٹھایئے
گا۔ یہاں انتظام ہو گیا۔ ابھی نئے ۷۔C سے نہ سابقہ ہوا نہ سامنا۔
دونوں وائس چانسلروں کو یوسف صاحب نے ۸ رکو بڑا شان دار ڈنر
دیا۔ تقریباً ستّر، اسّی آدمی تھے۔

آپ کا
رشید صدیقی

۲۵

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۴ر اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

میرے مطبوعہ مضامین کا وہ پلندہ جو آپ کے طالب علم[1] یہاں سے لے گئے تھے آپ کے پاس محفوظ ہوگا۔ ان سے غالباً مقصد براری ہو چکی ہوگی۔ اس لیے اگر آپ ان کو بذریعہ ڈاک رجسٹری کرا کے بھیج دیں تو شکر گزار ہوں گا۔ ان دنوں یوسف صاحب علیل ہو گئے تھے۔ ہفتہ عشرہ صاحب فراش رہے، لیکن اب بفضلہ بہتر ہیں۔ مفوضہ فرائض انجام دینے لگے ہیں۔ گو strain زیادہ ہو جائے تو حرارت آجاتی ہے۔ یہ کمزوری کے سبب سے ہے۔

ان دنوں طبیعت میں پراگندگی اور انتشار ہے۔ نہ گھر میں جی لگتا ہے نہ باہر۔ کبھی وطن جانے کا قصد ہوتا ہے تو دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا کا مصداق ہوتا ہوں۔ بہر حال بقول اصغر: "تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی" کا سا عالم ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

---

[1] سلیمان اطہر جاوید۔

۲۶

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۱۹ر اکتوبر ۶۳ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

عنایت نامہ صادر ہوا، جو لکھا ۱۶ر کو لکھا اور پوسٹ کیا گیا ۱۷ر کو، کوئی حرج نہیں جب آیئے تو مسودے لیتے آیئے لیکن مسودے لایئے یا نہیں، آیئے ضرور۔ ۲۷ر کو انجمن ترقی اُردو کی بھی تو میٹنگ ہے۔ آپ ممبر رہے یا نہیں۔ مولانا صاحب[1] کے بڑھاپے پر نہ جایئے "کشش کاف کرم" ان کو "پیہم دواں ہر دم جواں" رکھتی ہے۔ ذاکر صاحب کے یہاں بھی ہو آئے۔ اور کبھی اِدھر اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں تو خواب و خیال و عمل سب میں 'ہر پھر کے دائرے ہی میں قدم' پڑتا ہے۔ تقدیر کچھ اس طرح کی معلوم ہوتی ہے کہ علی گڑھ سے نکلا تو پھر یہاں واپس نہ آؤں گا۔ جی بھی یہی چاہتا ہے۔ عارضی طور پر اِدھر اُدھر جانا اس وقت اچھا معلوم ہوتا ہے جب مستقل قیام علی گڑھ میں ہو اور وہ قیام اچھا بھی معلوم ہوتا ہو۔ طبیعت یہاں سے اچاٹ

---

[1] مولانا عبدالماجد دریابادی

ہو گئی ہے اس لیے نکلوں گا تو ہمیشہ کے لیے تا آنکہ "گوبند فلاں ثانذ"
یا "رشید رفت"! یوسف صاحب بفضلہ اچھے ہیں۔ پنڈت جی سرسید
ڈے کی تقریب میں تشریف لائے، وہ سب ہوا جو ایسے موقع پر ہوا
کرتا ہے۔ یونیورسٹی میں آج سے تعطیل سرما شروع ہو گئی ہے۔ بہت
سی اور باتیں لکھنا چاہتا تھا، کچھ کتابیں پڑھی تھیں ان پر اظہارِ خیال
کرنا چاہتا تھا لیکن کارڈ بھی ختم ہو گیا اور لکھنے سے بھی جی اکتا گیا،
اس لیے فی الحال خدا حافظ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۲۷

زکاء اللہ روڈ
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
یکشنبہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۶۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

۱۴ر کا نوازش نامہ کل صادر ہوا۔ آج اتوار ہے۔ معلوم نہیں یہ خط آپ کو کب ملے۔ عمرو کے مسئلے نے "سنگین شکل" ضرور اختیار کرلی لیکن فائدہ میں میں ہی رہا آپ نہ رہے! اسے آپ کے کرم پر محمول کرتا ہوں۔ نذیر صاحب دفعتہً کئی دن کے لیے باہر چلے گئے اور بتائے بغیر۔ مجھے یونیورسٹی پریس والوں کے لیے سپرد کر گئے۔ آپ کا خط آیا تو سروری صاحبہ کی "بچی[1]" کے مضمون کا پروف دیکھ رہا تھا۔ موصوفہ نے فٹ نوٹ میں جو حوالے دیے ہیں اصل میں ان کی numbering اور ہے اور proof paging میں مختلف ہو گئی ہے جیسا ہونا لازمی تھا، لیکن وہ کچھ اس طرح الٹ پلٹ گئے کہ دیر تک سر کھپاتا رہا چول نہ بیٹھی مجبور ہو کر کمپوزیٹر کو ہدایت لکھ دی کہ وہ اپنی عقلِ سلیم سے کام لے: ما سپر انداختیم! گو نہ میرے پاس سپر ہے نہ اس کے پاس عقلِ سلیم! احسان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم کہ

---

[1] ڈاکٹر ثمینہ شوکت (دیکھیے ص ۸۰)

کب آر ہے ہیں۔ ان دنوں یہاں دس دن کی حسبِ معمول چھٹی ہے۔ آپ کے دلّی نہ آنے سے اس گردن زدنی چینی کی طرح "دل گرفتہ" ہوا جس کا ذکر اقبالؔ نے کیا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ چینی واقعی گردن زدنی ہیں۔ انفرادی طور پر تو روز دھاندلی ہوا کرتی ہے، لیکن بین الاقوامی پیمانے پر دھاندلی کرتے انھیں کو دیکھا۔ آخر کار فتح ہندوستان ہی کی ہوگی اور تمام دنیا کے ردّعمل کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اخلاقی فتح ہندوستان کے حصہ میں آگئی۔ البتہ ایک دانش مند کا قول یاد آتا ہے کہ نہ تو کسی سے اتنی دوستی بڑھاؤ کہ وہ کسی وقت دشمن ہو جائے تو پچھتاوا ہو نہ ایسی دشمنی کرو کہ دوستی ہو جائے تو شرمندگی اٹھانی پڑے! لیکن اس خاکسار سے ہندوستان اور چین دونوں عقل مند ہیں۔ اس لیے خدا حافظ کے کہنے پر عمل کرتا ہوں: گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش!

نئے V.C آ گئے۔ سابق V.C چلے گئے۔ اس طرح کے انقلابات اتنے دیکھے ہیں کہ سب کو: "مرے دریائے بے تابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی" سمجھتا ہوں۔ سب کو سلام دعا۔

آپ کا

رشید صدیقی

پھر و کی جلدی نہیں ہے، کبھی بھیج دیجیے گا۔

۲۸

یکم نومبر ۶۳ء
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گذشتہ ماہ کے آخر میں آپ کے اِدھر آنے کی توقع تھی جیسا کہ آپ نے لکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ پروگرام ملتوی ہو گیا۔ آج حکیم عبداللطیف صاحب کا دہلی سے خط ملا کہ ممدوح ۴؍ کو کسی کانفرنس کے سلسلے میں حیدرآباد پہنچیں گے اور آپ سے مل کر وہ مسودے (میرے منتشر مضامین کا پلندہ) ہمراہ لائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ ان سے کام لیا جا چکا ہوگا۔ موقع اچھا ہے، حکیم صاحب لیتے آئیں گے، پھر مجھے کسی وقت مل جائے گا امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا
رشید صدیقی

حکیم صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ۱۴؍ نومبر کو واپسی ہوگی۔ غالباً آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی کوئی تقریب حیدرآباد میں ہوگی۔

رشید صدیقی

۲۹

۱۱ردسمبر
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

حکیم عبداللطیف صاحب[۱] دہلی سے حیدر آباد تشریف لے گئے۔ آپ کے یہاں گئے تو معلوم ہوا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہ وسط نومبر کی بات ہے، غالباً تو پھر مضامین کا وہ پلندہ کیسے ملے؟ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

ظہیر علوی صاحب[۲] پر پھر قلب کا دورہ پڑا۔ ادھر محنت شاقہ کی تھی۔ اب بھی آرام سے بستر پر نہیں رہتے۔ اٹھنے کی کوشش میں پھر دورہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال پہلے سخت محنت کی اب بے احتیاطی کر رہے ہیں۔ حامد صاحب[۳] کا بھی دفعتاً پیرس میں انتقال ہو گیا۔ لیکن ان کی میت کی تدفین جامعہ میں ہو گئی ہے۔ یونسکو والوں نے اس کا اہتمام کیا۔ یہ بڑا غمناک حادثہ ہوا۔ کیسی کیسی یادیں مرحوم کے ساتھ وابستہ ہیں، جب جامعہ قرول باغ میں تھی۔ اللہ کی مرضی۔

ڈاک ہی سے وہ سارے مضامین بھیج دیجیے۔ ایک انتخاب میں ان سے کچھ مضامین لینے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۔ حکیم عبداللطیف صاحب، پرنسپل طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲۔ سید ظہیر الدین علوی، سابق استاد شعبۂ اردو اور رجسٹرار جامعۂ اردو، علی گڑھ

۳۔ حامد علی خاں صاحب، سابق مینجر مکتبہ جامعہ، دہلی۔

۳۰

۲۹ر جنوری ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
گرامی نامہ مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۶۴ء آج صادر ہوا۔ آپ کا یہ خط جامعہ کے دفتر میں بھیج دیا ہے۔ ادیب[1] کا علوی نمبر نکالنے والے ہیں اس میں اس کو شائع کر دیا جائے گا۔ فی الحال نورالرحمٰن صاحب کو رجسٹرار مقرر کر دیا گیا ہے۔ اس وقت جامعہ خاصے نازک دور سے گزر رہی ہے۔ یوسف صاحب شیخ الجامعہ ہیں۔
دس بارہ دن ہوئے آپ کا ایک اور خط ملا تھا۔ اسی دن آپ کو لکھ چکا تھا اس لیے جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ عمرالدین صاحب[2] ان دنوں علیل ہیں۔ اور بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ غذا بالکل نہیں ہوتی، نیند بھی نہیں آتی، پچھلی تمام تکالیف شدت پکڑ گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے۔
ان دنوں ادھر سردی کی غیر معمولی شدت رہی۔ امید ہے اب موسم بہتر ہو جائے گا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ اردو کا تدریسی رسالہ
[2] پروفیسر عمرالدین صاحب، صدر شعبۂ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۱

۴ر فروری ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
معلوم ہوتا ہے کہ ان ذاتِ شریف[1] نے آپ کو میرے مضامین کے مسودے نہیں دیے ورنہ آپ اب تک ضرور بھیج دیتے۔ ان کے ایسا کرنے سے میرا بڑا نقصان ہوا۔ آپ کا بیچ نہ ہوتا تو مسودے دنیا درکنار میں ان کو اتنے نزدیک بھی نہ آنے دیتا۔ ان کا نام اور پتہ بھی یاد نہیں رہا ورنہ رجسٹرار کو لکھتا شاید ان کے کہنے سے کام بن جاتا۔
آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] اشارہ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی جانب جو رشید صاحب پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے اور جن سے اُن کے مسودات کی واپسی میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے رشید صاحب برگشتہ تھے۔

۳۲

۱۴ر فروری ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
کیا بات ہے، ادھر کئی خطوط بھیجے کسی کا جواب نہ آیا۔ آپ تو ایسا نہ کرتے تھے۔ اُنھیں مضامین کی واپسی کے لیے یاد دہانی کرتا رہا جو وہ طالب علم لے گئے ہیں جن کا نام یاد نہیں رہا[1]۔ ایسا تو نہیں کہ وہ مضامین اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں۔ مگر یاد آتا ہے آپ نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ ان کو آپ نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اس لیے ضائع جانے کا امکان نہیں ہے بلکہ آپ کا ارادہ بیگم صاحبہ کے ہمراہ قائم گنج بھیج دینے کا تھا وہاں سے کسی کی معرفت یہاں آجاتا، لیکن احتیاط کی خاطر آپ نے ایسا

---

[1] سلیمان اطہر جاوید صاحب جو رشید صاحب پر پی۔ ایچ ڈی کا مقالہ میری نگرانی میں لکھ رہے تھے اور اس غرض سے علی گڑھ بھی گئے تھے۔

نہیں کیا۔ دراصل ایک پبلشر سے طے ہوا تھا کہ ایک انتخاب اپنے مضامین کا شائع ہونے کے لیے دوں گا لیکن جب یہ مضامین نہ ملے تو وہ معاہدہ سوخت ہوگیا۔ یہی سبب ہے کہ واپسی کے لیے آپ کو لکھتا رہا۔ خیر یہ قصّہ تو آیا گیا ہوگیا۔ یہ تو معلوم ہو کہ صحیح صورتِ حال کیا ہے۔

کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے۔ عمرالدین صاحب البتہ اِدھر زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں اور تقریبًا صاحبِ فراش ہیں۔ عید کی اپنی تہنیت قبول فرمایئے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۳۳

۱۱/ اپریل ۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم
عنایت نامہ ملا، آپ یہیں تھے جب میں نے آپ کی دعوت احسان کو پہنچا دی تھی۔ مئی میں ان کا آنا نہ آنا یقینی نہیں ہے۔ حالات دیکھتے ہوئے جی نہیں چاہتا کہ آئیں۔ فضا سازگار نہ ہو تو عزیزوں کا آنا جانا میرے لیے بڑی تشویش کا باعث رہتا ہے اور ان کی موجودگی سے جو خوشی ہوتی ہے وہ یکسر تشویش سے بدل جاتی ہے۔ عزالدین صاحب کا آپ نے صحیح نقشہ کھینچا مجھے اس کا اندازہ ہے اس لیے کہ خود اسی عالم میں ہوں یہ اور بات ہے کہ ہاتھ پاؤں نے جواب نہیں دیا ہے اور کسی سے خدمت لینے کا بفضلہ محتاج نہیں اس سے بڑی تقویت رہتی ہے۔ سالہا سال سے کچھ اس طرح کا حال ہے جیسے کسی نے زندگی کے سارے ہرے بھرے درخت کاٹ کر گرا دیے ہوں اور ان میں آگ دے دی ہو۔ آپ جانتے ہیں گیلی لکڑی کتنے دھیرے دھیرے کتنے دنوں تک سلگتی رہتی ہے اور اس سے کیسا تاریک دم گھٹنے والا دھواں اٹھتا رہتا ہے۔ کشمیر اور شیر کشمیر کا ذکر آپ نے بڑے مزے سے کیا ہے۔ زندگی اور زمانے کے رُخ کو دیکھتا ہوں لیکن اتنی بصیرت نہیں کہ ان پر صحیح حکم لگا سکوں، دکھ اور دشواری

کے دور کرنے کے دو ہی طریقے ہیں یعنی آپ کو صحیح طور پر سمجھ سکے اور بہتر بنانے کی استعداد اور حوصلہ ہو۔ مجھ میں یہ دونوں نہیں۔ اتنی بات البتہ سمجھ میں آئی ہے کہ تنازعہ میں سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں دونوں یہ فرض کر لیتے ہیں اور اس پر اڑ جاتے ہیں کہ حق صرف آپ کے ساتھ ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ اچھی مفاہمت وہ ہوتی ہے جب دونوں فریق سمجھیں کہ وہ خسارہ میں رہے۔ ایک لطیفہ سنیے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے دو لڑکوں میں تقسیم کا مسئلہ پیش آیا۔ اعلان کرنے والے نے کہا مرحوم نے اتنی نقدی چھوڑی وہ کس کی؟ بڑے بھائی نے کہا میری۔ اسی طرح تمام ملکیت کا نام لیا گیا اور بڑے بھائی صاحب بولتے رہے میری۔ آخر میں اعلان کرنے والے نے پکارا مرحوم نے اتنا قرض چھوڑا ہے وہ کس کا؟ بڑے بھائی صاحب نے فرمایا، کیا ہر مرتبہ میں ہی بولوں؟ اب کوئی اور بولے!

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۳۴

۴ر جولائی ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

نوازش نامہ مورخہ ۲ر آج سہ پہر میں موصول ہوا۔ اور باتوں کے علاوہ اس کی بھی خوشی ہوئی کہ دوسرے ہی دن آپ کا خط مل گیا۔ احسان کو آپ نے میرے بلانے کے سلسلے میں جو خط لکھا ہے اس کا ذکر انھوں نے مجھ سے پرسوں ہی کیا۔ جب وہ خط ان کو موصول ہوا تھا چاہتا تھا کہ اس کا جواب براہِ راست آپ کو لکھوں، پھر کچھ ایسے مکروہات پیش آئے کہ لکھنے کا جی نہیں چاہا۔ ادھر کی برسات کا نقشہ جو آپ نے کھینچا ہے میرے ذہن کی فضا ویسی ہی ہوگئی تھی ایسے میں خط لکھنا گوارا نہ ہوا۔ کل اتوار ہے پرسوں لکھوں گا۔ اس کارڈ کو اپنے خط کی محض رسید سمجھیے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۳۵

۷ر جولائی ۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب۔ سلام شوق

خط ملا، آپ نے برسات کا واسطہ دلا کر حیدرآباد آنے کی دعوت دی ہے کل سے یہاں بھی برسات کا کچھ اس طرح کا عالم ہے:

سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند!

کاش "مے و مشکبو" کی ناند کے بجائے چمن میں کوئی دسہری اور چونسے کی ناند بھر کر رکھ دیتا پھر دیوار پھاندنے کا بھی لطف دیکھتا۔ یہ سب اس لیے کہنا پڑا کہ مۓ و مشکبو کا سوال نہیں اور آم کی فصل اس سال اِدھر بڑی کمزور ہوئی، سوچتا ہوں کہ اس فصل میں ملیح آباد کی دسہری اگر جنّت میں پہنچادی جائے تو سیب سے کہیں زیادہ انقلاب آفریں ثابت ہو۔ سجاد انصاری اور مہدی افادی زندہ ہوتے تو آپ نوجوانوں سے دسہری سے متعلق اس موقع پر کچھ اور بھی کہتے۔

نصاب سے متعلق جو کمیٹی آپ نے بنائی ہے اس میں مرے فائدے کی جو صورتیں نکالی ہیں ان کے لیے دل سے آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ تو ہمیشہ مرے فائدے کی باتیں سوچتے رہتے ہیں۔ کاش اس قابل ہوتا

کہ خاطر خواہ آپ کا شکریہ ہی ادا کر سکتا۔ اپنی معذوری کے سلسلے میں بہت سے خرافات لکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی بھی سکت نہیں رہی۔ بقول شخصے: "اے اجل کس زندگی کے واسطے!" بن پڑا تو پھر کبھی لکھوں گا۔ آنکھ میں تناؤ ہے جس سے سر میں بہت درد ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں چھوٹا موٹا آپریشن ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا ابھی بلائیں تمام نہیں ہوئیں اس لیے مرگ ناگہانی کا بھی متوقع نہ رہنا چاہیئے۔

ہفتہ دس دن میں احسان واپس جائیں گے۔ آئے تھے تو اسی ساعت کے خیال سے تکلیف ہوئی تھی جو برابر بڑھتی رہی۔ ممکن ہے کہ احسان آپ کو علاحدہ لکھیں۔ بچوں کو دعا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۲۶

۷؍اگست ۱۹۶۴ء
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

کل معلوم ہوا کہ ایک غلط فہمی کا شکار ہوں جس کی اطلاع جلد سے جلد لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیج دینا چاہیے تاکہ دفتر میں آپ اطلاع دیدیں۔ پری یونیورسٹی pre-university کے اردو نصاب پر نظر ثانی کے لیے جو کمیٹی آپ کے وائس چانسلر صاحب نے مقرر فرمائی ہے اس کا ایک ممبر میں بھی ہوں۔ اس کی طرف آپ نے احسان کے ایک خط میں اشارہ کیا تھا اور میرا عندیہ دریافت کیا تھا۔ مجھے معذور رکھا جائے۔ پھر ایک مراسلہ آپ کے رجسٹرار صاحب کا آیا کہ میں اس کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا ہوں، شرکت منظور ہے یا نہیں، غلطی سے میں نے یہ سمجھا کہ یہ کوئی دوسری کمیٹی ہے اور اس میں خط و کتابت سے کام چل جائے گا، چنانچہ جواب میں عرض کر دیا کہ منظور ہے۔ کل کمال[1] سے تذکرہ آیا تو وہ اس قصہ سے واقف تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کمیٹی کا ممبر منظور ہونا قبول کیا ہے جس کے بارے میں سب سے پہلے احسان کو لکھا تھا۔ سخت شرمندہ ہوا۔ چنانچہ آج صبح پہلا کام یہ کر رہا ہوں کہ معذوری کا یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں کہ میں حیدرآباد نہ آسکوں گا اور مجھے ممبری سے معذور سمجھا جائے۔

عمرالدین صاحب کی وفات سے طبیعت بڑی مغموم ہے اس وقت اتنا ہی۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر کمال الدین، رشید صاحب کے بھانجے اور ریڈر شعبۂ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

۳۷

۱۴ اگست ۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
ذکاء اللہ روڈ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

۱۱ و ۱۲ کے دونوں عنایت نامے کل شام ایک ساتھ ملے۔ عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے میری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہ ہوئی باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور احسان کا بھی اصرار رہا، جس کو زندہ، ہنستا، بولتا محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔

عمرالدین صاحب سے ان کی طالب علمی کے زمانے سے آشنا رہا۔ رفیقِ باصفا تھے۔ آپ اور احسان کو تو شاید وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ظاہر کتنا کھردرا اور ناقابلِ التفات، باطن مہر و وفا سے کیسا مزین و معطر! اس سے اندازہ کر لیجیے کہ وائس چانسلر صاحب نے ان کی وفات پر اخلاص و احترام سے جتنے الفاظ جس صدقِ دل سے کہے شاید اور کے لیے کبھی کہے ہوں۔ مسعود صاحب، شاید ہر دولت لٹنے پر کسی نہ کسی طرح فراموش کی جا سکتی ہے یا ہونے لگتی ہے اس کی تلافی کی امید ہوتی ہے۔ لیکن جو دولت موت لوٹ لیتی ہے وہ کسی طرح دل سے محو نہیں ہوتی۔ عزیز و رفیق کی موت کی کوئی تلافی نہیں۔ یہ باتیں آپ کے اس مصرع سے بے اختیار دل میں

آئیں :

حیات اب نہ کبھی پائے گی سُراغِ دوست[۱]

ستمبر یا اکتوبر میں حیدر آباد جانے میں آپ کا ساتھ ہو جائے تو سفر کی ہم بہت آسان ہو جائے گی۔ آپ کے سہارے چلا چلوں گا۔ اندازاً وہاں کتنے دن لگ جائیں گے اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مجوزہ نصاب کی ایک نقل مل جائے؟ اب رجسٹرار کو کچھ نہ لکھوں گا۔ احسان کا پتہ یہ ہے۔

آپ کا
رشید صدیقی

اس خط کے پہنچنے کی اطلاع دے دیجیے گا اس سے اطمینان ہو جائے گا کہ سفر کا پروگرام علی حالہٖ ہے۔

[۱] مرحوم پروفیسر عزالدین کی وفات سے متاثر ہو کر چند اشعار "بیادِ دوست" کے عنوان سے لکھے تھے اور رشید صاحب کی خدمت میں بھیجے تھے یہ انھیں میں کا ایک مصرع ہے:

اندھیری رات میں یوں گُل ہوا چراغِ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سُراغِ دوست
بس ایک یاد ہا کہ روشن ہیں جس سے دیدہ و دل
مژدہ یہ ہے یہ ستارہ تو دل میں داغِ دوست

وغیرہ

۳۸

ذکاء اللہ روڈ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۴؍ستمبر ۱۹۶۴ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

۲۱؍ کا نوازش نامہ کل شام ملا۔ کوشش کرتا ہوں کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں دہلی سے رزرویشن مل جائے۔ اس حساب سے اپنے ہاں میٹنگ کی تاریخ رکھ دیجیے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کام ختم ہوتے ہی پہلی ٹرین سے حیدر آباد سے واپس ہونا چاہتا ہوں اس لیے کہیں بھی چائے یا کھانا یا "خیر مقدم" وغیرہ کی تقریب نہ مقرر ہونے دیجیے گا اس لیے کہ کسی میں شرکت نہ کرسکوں گا۔ اس پروگرام کو جو سنے گا ناپسند کرے گا لیکن اس معذوری کو کیا کہوں جس نے ایک مدت سے خود مجھے اپنی اوقات سے متنفر کر رکھا ہے۔ آج خورشید عالم خاں صاحب[1] کو لکھتا ہوں کہ وہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں ۴؍ سے ۷؍ تک کسی تاریخ میں رزرویشن کرادیں، لیکن یہ بھی دیکھوں گا کہ اگر علی گڑھ ہی سے رزرویشن کا انتظام ہو جاتا ہے تو پھر خورشید عالم صاحب کو کیوں زحمت دی جائے۔ نتیجے سے آپ کو بذریعہ تار مطلع کروں گا۔ بقیہ انشاء اللہ زبانی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] بڑے داماد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

۳۹

یونیورسٹی علی گڑھ، یکم اکتوبر ۶۴ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

نامہ گرامی مورخہ ۱۸ ستمبر کل شام صادر ہوا۔ سفر کا "پرچہ ترکیب استعمال" آپ نے لکھ بھیجا، خوب کیا، دیکھیے اس کی نوبت بھی آتی ہے یا نہیں۔ ایک صاحب کو جو رزرویشن وغیرہ کاموں سے بخوبی واقف ہیں روپے دے دیے ہیں کہ یہ مرحلہ طے کرادیں ان کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا ہے۔

آپ کے نواح میں طلبا اور پولیس میں "ڈھول دھپا" ہوتا معلوم نہیں ہوتا یا یونیورسٹی دسہرا منانے لگتی اور میں اپنی خیر مناتا گھر بیٹھا رہتا! کیا وہاں کوئی سراپا ناز یا غالب نہیں۔ طبیعت کہیں آنے جانے پر مائل نہیں ہوتی۔ کاش احباب، اعزا یا آب ودانہ اور نئے ارض سما یہیں گھر بیٹھے میسر آجایا کرتے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴

یکم اکتوبر ۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
آج صبح ایک خط بھیج چکا ہوں۔ ابھی ابھی بدھ ۷ اکتوبر کا
رزرویشن موصول ہوا جس کی خبر آپ کو بذریعہ تار دے دی ہے۔ آپ
فرسٹ کلاس کی ایک نچلی سیٹ شنبہ ۱۰ اکتوبر کے لیے محفوظ کرا دیجیے۔ خدا
کرے آپ ایسا کرا سکیں اور خدا کرے میں اس سے فائدہ بھی اٹھا سکوں۔
طبیعت کئی دن سے اعتدال پر نہیں اس لیے قوت ارادی پر اعتماد بھی کچھ
کم ہی سا ہے: دعا ہے کہ آپ مع متعلقین مسرور و مع الخیر ہوں۔
آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۴

۱۵/اکتوبر ۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

میرا تار اور خط ملے ہوں گے۔ اب تک تو اللہ نے ارادہ پر قائم رکھا ہے اور جب تک ایسا ہے انحراف کا کوئی امکان نہیں۔ دو باتیں عرض کرنی ہیں، ایک تو یہ کہ حق الوسع میٹنگ ground - floor پر رکھیے گا تاکہ زینہ طے کرنے کی صعوبت نہ اٹھانی پڑے۔ دوسرے یہ کہ میں ہر موسم میں مچھر دانی استعمال کرنے کا عادی ہوں۔ یہ علی گڑھ کے بارہ ماسی مچھروں کا فیضان ہے۔ اس لیے اپنے ہمراہ مچھر دانی لاؤں گا آپ ان کے لیے (ڈنڈے) poles فراہم رکھیے گا۔

کیسے کیسے اہتمام ایک جان ناتواں کے لیے ہیں۔ اے وائے برایں جانِ ناتواں یا لعنت ایسی جانِ ناتواں پر!

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴۲

۱۴ راکتوبر ۱۹۶۴ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ خدا آپ کو خوش رکھے
کل شام آپ کے مشورے کے مطابق پسنجر سے علی گڑھ پہنچ گیا۔ بہت آرام و اطمینان سے۔ قاضی پیٹھ پر نہ صرف میری "محفوظ سیٹ" ملی بلکہ چار سیٹوں کا ایک مکمل کوپے خالی ملا۔ اس کوپے میں بیٹھ کر آرام سے کل دس بجے دن دہلی پہنچ گیا۔ ذاکر صاحب سے ملاقات ہوئی اور اِدھر اُدھر کی مفصل گفتگو رہی۔ اس دن حیدر آباد سے روانگی کس طرح ہوئی اس کا خیال کرتا ہوں تو عجب کیفیت ہوتی ہے اس پر پھر کبھی گفتگو ہوگی۔ سب سے زیادہ متاثر میں جاوید سلمہٗ[۱] سے ہوا۔ کتنا شریف اور سنجیدہ یہ بچہ ہے۔ میں نے ایسا لڑکا اب تک نہ دیکھا تھا، اس دن ہم سب کے discomfiture پر میں نے سب سے زیادہ مغموم، لیکن مستعد جاوید کو پایا۔ کس مستعدی سے وہ ٹیکسی لانے اور سامان اِدھر اُدھر کرنے پر تیار رہتے تھے! اللہ اس کو اپنی نعمتوں سے ہمیشہ مالا مال اور والدین کی آنکھ کا تارا بنا رکھے، سکندر، جاوید سے کس درجہ متاثر ہے کیا بتاؤں۔ بیگم صاحبہ کی خریدوائی چیزیں یہاں سب کو بہت پسند آئیں۔ بیوی دعا کہتی ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[۱] جاوید حسین، میرا لڑکا۔

۴۳

۱۷ اکتوبر ۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب
آپ کا ۱۲ کا لفافہ کل صبح ملا جس میں آپ نے سیاست کا تراشہ بھی رکھ دیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر نذیر صاحب اور عظیم صاحب[1] آئے۔ سرور صاحب نے آپ کو جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر نذیر صاحب خوش بھی ہوئے اور متعجب بھی۔ کچھ اس طرح کی کیفیت تھی:

ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

نذیر صاحب نے اس سلسلے میں رجسٹرار صاحب سے بھی گفتگو کی جو ہر اعتبار سے قابلِ اطمینان ہے۔ بہرحال یہاں سب خوش ہیں کہ:

یوسفِ گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور

میری رائے کیا پوچھتے ہیں آپ تو میرے لیے بمنزلہ اقبال اور احسان ہیں۔ آپ کے علی گڑھ میں موجود ہونے سے مجھے جو خوشی ہوگی اور تقویت رہے گی اس کا اندازہ میرے علاوہ اور کون کر سکتا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ آپ کو آنا ہے لیکن رائے یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی اس پروفیسر شپ کو آفر کرے۔ اس

---

[1] پروفیسر عبدالعظیم موجودہ صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔

سے علی گڑھ کی قدر دانی کے ساتھ ساتھ عثمانیہ یونیورسٹی اور دوسروں
نظر میں آپ کی منزلت اور اہمیت متعین ہو گی۔ نذیر صاحب برابر دوڑ دھوپ
کر رہے ہیں کہ یونیورسٹی سے یہ آفر آپ کو جائے۔ سرور صاحب کو آپ
لکھ سکتے ہیں کہ باوجود چند در چند موانع کے مادرِ درسگاہ کی خواہش
سر آنکھوں پر، لیکن اپنے فرزندِ معنوی کو طلب کرنے کے جو آداب ہیں وہ
بھی اسے ملحوظ رکھنے پڑیں گے وغیرہ۔ کئی دن سے طبیعت اچھی نہیں
ذرا سنبھل جائے تو اس سلسلے میں یوسف صاحب سے ملوں۔ سفر اور
آپ کے یہاں قیام پر آپ کو مفصّل خط لکھنا چاہتا تھا لیکن طبیعت ٹھیک
نہ ہونے کے سبب سے معذور رہوں۔ انشاء اللہ دو چار دن میں لکھ
سکوں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[۱] یہ خط تمام تر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لسانیات کی پروفیسری سے متعلق ہے جس کے بارے میں مجھ سے سلسلہ جنبانی کی جا رہی تھی۔

۴۴

انوار ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
آپ کے عنایت نامے کے جواب میں کل ایک خط لکھ چکا ہوں۔
آج ایگزیکٹو کونسل کی میٹنگ ہے۔ اس لیے شاید ہی یوسف صاحب سے ملاقات ہو سکے۔ موصوف آپ کی علالت کی طرف سے متردد تھے کہ ایک خط لکھنے کے بعد پھر آپ نے کچھ نہ لکھا۔ بہرحال اطمینان دلادیا گیا ہے۔
یہ کارڈ ایک خاص غرض سے لکھ رہا ہوں۔ غالباً آپ قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کی صاحب زادی فاطمہ صاحبہ سے واقف ہوں گے جو ڈاکٹر (؟) عالم علی صاحب کی اہلیہ محترمہ ہیں۔ پچھلے مہینے وہ کشمیر جاتے ہوئے ملنے آئی تھیں تو بیوی نے ان کو روپے دے تھے کہ ایک حیدرآبادی پان دان اور ناگردان خرید کر بھیج دیں گی۔ موصوفہ کا پروگرام یہ تھا کہ کشمیر سے ۱۵ اکتوبر کو حیدرآباد پہنچیں گی۔ قیاس ہے کہ اب وہ حیدرآباد میں تشریف رکھتی ہوں گی۔ اہلیہ کی فرمائش ہے کہ آپ مسز فاطمہ عالم علی کو contact کریں اور ان سے روپے لاکر ایسا ہی ایک

پان دان خرید لیں جیسا کہ آپ کی بیگم صاحبہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ ناگردان کی ضرورت نہیں صرف پان دان درکار ہے۔ کل معلوم ہوا کہ تاباں صاحب[1] کے صاحبزادے میاں افتخار[2] آپ کی خدمت میں عن قریب پہنچیں گے ان کی معرفت وہ پان دان یہاں بھیج دیجیے گا۔ مجھے امید ہے کہ بیگم مسعود ایک بار اور میرے لیے یہ زحمت گوارا فرمائیں گی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

زینت ساجدہ صاحبہ[3] نے اپنی کچھ کتابیں دی تھیں جو میں یہاں نہ لا سکا؟ یا محض میرا خیال ہے؟

---

[1] غلام ربانی تاباں صاحب

[2] افتخار عالم خاں صاحب، لکچرر جنرل ایجوکیشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[3] ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ، ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

۴۵

۴ر اکتوبر ۱۹۶۴ء
ذکاءاللہ روڈ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ سلام شوق

سلیمان صاحب[۱] کے مقالے کا وہ جز جو ساتھ لایا تھا واپس کرتا ہوں۔ صرف دو چار جگہ نہایت مختصر الفاظ میں بعض واقعات کی تصحیح یا اضافہ کر دیا ہے۔ مقالہ نگار نے خود میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں کہیں ہاتھ نہیں لگایا ہے۔ ایسا کرنا غلط طریقۂ کار ہوتا۔ ایک خط مقالہ نگار کے نام ان کے حوالے کر دیجیے گا۔ انھوں نے اپنا تعارفی خط دیا تھا وہ کہیں ادھر اُدھر ہو گیا۔ معلوم نہیں نام بھی ٹھیک یاد ہے یا نہیں۔

فرحت میموریل فنڈ کے بارے میں میرے خط کے جواب میں سرور صاحب[۲] نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بعینہٖ ارسال ہے۔ سجاد مرزا صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجیے گا۔ سرور صاحب مزید جو کچھ کہیں گے یا کریں گے اس کی تعمیل کروں گا۔ امید ہے کہ یہ کام بغیر کسی زحمت کے روبراہ ہو جائے گا۔

---

۱ سلیمان اطہر جاوید صاحب

۲ رشید صاحب کا حاشیہ میں اضافہ "مل گیا۔"

معلوم نہیں میرا وہ خط آپ کو ملا یا نہیں جس میں بیگم فاطمہ عالم علی صاحبہ (قاضی عبدالغفار مرحوم کی صاحب زادی) کے بارے میں عرض کیا تھا کہ میری بیوی نے ان کو ایک عدد حیدرآبادی پاندان خریدنے کے لیے پچپن روپے دیے تھے جب موصوفہ اوائل ماہ گذشتہ میں کشمیر جاتی ہوئی علی گڑھ ٹھہر گئی تھیں۔ تاباں صاحب کے صاحبزادے میاں افتخار حیدرآباد پہنچے ہوں گے ان کی معرفت وہ پان دان (بغیر ناگردان کے) بھیج دیا جائے یا بیگم مسعودہ روپے لے کر خود ویسا ہی پان دان خرید کر بھجوا دیں جیسا موصوفہ نے میرے لیے خرید دیا تھا۔ بیگم فاطمہ کا پتہ نہیں معلوم ورنہ ان کو "راست" لکھتا۔

شیخ نیازی[۱] کا ایک نسخہ ملفوف ہے اسے قتیل صاحب[۲] کی خدمت میں ہدیۃً میری طرف سے پیش فرما دیجیے۔ پری pre یونیورسٹی کے مجوزہ نصاب میں وہ اس کتاب کی کوئی تلخیص یا اقتباس اپنی صوابدید سے بقدرِ ضرورت رکھ دیں گے۔ امید ہے موصوف یہ بیگار میرے لیے "شاد یا ناشاد" گوارا فرمائیں گے۔ مجوزہ نصاب کے ساتھ اس تحریر کا مسودہ بھی بھیج دیجیے گا جس میں میری طرف سے اس کا اقرار ہوگا کہ "شیخ نیازی" کا جو حصہ شاملِ نصاب ہے وہ ہدیۃً عثمانیہ یونیورسٹی کی نذر ہے اور اس کا معاوضہ وصول کرنے کا آج یا آئندہ نہ مجھے کوئی حق ہوگا نہ میرے اعزا کو

۱ھ رشید صاحب کی تصنیف جس میں ان کے تیسرے صاحبزادے نیازی رشید کے بچپن کا مزاحیہ حال۔

۲ھ ڈاکٹر حفیظ قتیل جو اس وقت عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔

(یا جو کچھ مضمون ہوتا ہو) اس دستاویز پر دستخط کرکے بھیج دوں گا تاکہ
"شامل مثل" رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"

بیگم زینت ساجدہ اور بیگم رفیعہ صاحبہ[1] (موخرالذکر کا نام صحیح ہے یا نہیں؟)
نے میری تواضع و تکریم میں جس لطف و کرم سے کام لیا اور اول الذکر نے
بالخصوص جیسی زحمت اور زیر باری اٹھائی اس کے لیے شکر گزار ہوں۔
آئندہ کبھی حیدرآباد جانے کا مسئلہ سامنے آیا تو بڑی رکاوٹ اس احساس
سے ہوگی کہ حیدرآباد کے احباب اور عزیزوں کی مہربانی و مہمان نوازی کی
یہ "جانِ ناتواں"، متحمل بھی ہوگی یا نہیں! کئی دن سے یوسف صاحب سے
ملنے کے پھیر میں ہوں ملاقات نہیں ہو پاتی۔ آپ کے بارے میں گفتگو کرنا
چاہتا تھا۔ نذیر صاحب کی تگ و دو کا نتیجہ نہیں معلوم ہوا۔ یوسف صاحب
کی بیگم صاحبہ کی علالت کا سلسلہ جاری ہے۔ ان دنوں آگرہ لے جا کر
دکھانے کی فکر ہے۔ اس طویل اور ہنوز قابو میں نہ آنے والی بیماری سے
یوسف صاحب خاصے فکرمند ہیں، یونیورسٹی کے آلام اوپر سے! کل آپ
کا خط ملا جس پر کوئی تاریخ نہ تھی۔ زیادہ سے زیادہ ۲۳ کا چلا ہوگا۔
آپ نے اپنے یہاں آنے کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ مناسب
ہیں۔ جہاں تک مسلم یونیورسٹی سے تعلق تھا آپ "جام و سبو" توڑ چکے۔
اب تو آپ کے لیے "آسمان سے بادۂ گلفام" کے علاوہ کچھ اور برسے
تو آپ اپنے رویے پر نظرِ ثانی کریں گے۔ اس وقت معلوم کیوں اور کیسے
ایک آوارہ شعر ذہن کے دام میں آگیا سرور صاحب غور فرمائیں!
اظہارِ حسرت و غم اب کیوں مری لحد پر گو اب نہیں ہوں لیکن پہلے تو تھا کبھی میں

---

[1] ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر اردو، عثمانیہ یونیورسٹی۔

ممکن ہے اس گرفتاری میں کہیں کہیں سے شعر کے پر و بال کی شکست و ریخت ہوگئی ہو، آپ ٹھیک کر لیجیے گا۔

روس کی حالیہ اکھاڑ پچھاڑ کے مقابلے میں آپ نے جو مثال (حال ہی کی) انگلستان کی دی اس سے کتنی باتیں تازہ ہوگئیں جن کو یادوں کے کباڑ خانے میں پھینک چکا تھا۔ گذشتہ نصف صدی میں کمونزم (نجات موعودہ) کے نام سے کیا کیا نہ ہوا۔ کون نہیں جانتا۔ لیکن بقول فانی ع بہلا نہ دل نہ تیرگیِ شامِ غم گئی! اکثر یہ بات ذہن میں آئی ہے کہ "آج ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم، کا جو سماں نظر آرہا ہے کیا عجب کہ اس کا بڑا سبب وہ عمل ردِ عمل ہو جو روس کا لایا ہوا ہے۔ اقدار کی یکسر اور یک بیک جو شکست و ریخت روس میں ہوئی ہے اس سے ساری دنیا کے اخلاقی بندھن ٹوٹ چکے ہیں۔ معاشرے میں بدچلنی اور بدامنی کی کیسی قیامت برپا ہے۔ روس ایک طرح کا پریشر بلٹ بن گیا ہے جس کی وجہ سے سارا فضائی نظام درہم برہم ہوتا رہتا ہے۔ یہ کیسی بدبخت حکومت اور مظلوم قوم ہے جہاں دوست اور عزیز پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ قہرِ الٰہی اور کسے کہتے ہیں۔

آپ کے جاوید کے ساتھ اقبالؔ کے جاوید کا کبھی کبھی خیال آتا ہے۔ اقبالؔ کے جسمانی جاوید چاہے جیسے ہوں۔ ان کے عینی جاوید تو آپ کے جاوید ہیں "قبیلے کی آنکھ کا تارا" خدا میری پیشین گوئی کی لاج رکھے۔ آمین۔

ذرا ان صاحب کا پتہ لکھیے گا جو حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن کے انچارج ہیں[1]

---

[1] پورا نام یاد نہیں رہا "فاروقی" نام کا آخری جزو تھا۔ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن پر اردو پروگرام

اسٹیشن پر مجھے رخصت کرنے بھی آئے تھے۔ علی گڑھ ہی کے پڑھے ہوئے ہیں اور مقامات پر بھی ان سے ملاقات ہوئی تھی مثلاً رات کی دعوت پر ڈاکٹر رفیع کے مکان پر۔ غالباً فاروقی ان کے نام کا جزو ہے لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ کی عدم موجودگی میں حیدر آباد کے اسٹیشن پر ان سے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔

اللہ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴۶

علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
شنبہ ۱۰ نومبر ۶۴ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

۶ر نومبر کا گرامی نامہ آج ملا۔ حیدر آباد کے ڈاکخانے کی مہر (حسب معمول) پڑھی نہیں جاتی۔ پان دان کئی دن ہوئے مل گیا اور توقع سے بہت اچھا۔ یوسف صاحب، نذیر صاحب، نظامی صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ آپ کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔ آپ کے دوستوں اور بزرگوں کی تو دلی تمنا ہے کہ آپ یہاں آئیں لیکن ہر قیمت پر نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ قیمت پر۔ لیکن آپ تو جانتے ہیں ہم سب کے اختیار میں تو صرف دعا ہے، دوا اور قیمت دونوں دوسروں کے اختیار میں ہے۔

موسم اچھا ہو تو اور نہ اچھا ہو تو اسی طرح صحت بہتر ہو یا بدتر!

بادِ یارِ مہرباں آید ہمی

بیگم صاحبہ، جاوید اور بچوں سب کو دعا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

کہیں کے ڈاکخانے کی مہر شاید ہی کبھی صاف پڑھی جاسکتی ہو۔ آپ کے یہاں کے ایک امتحان کا آفر کل ۹ر کو موصول ہوا جس میں لکھا ہے کہ ۱۰ اکو پرچہ بھیج دو۔ خط پر ۲۷ر اکتوبر اور ۲ر نومبر کی تاریخ درج ہے۔

۴۷

جمعہ، ۲۷ر نومبر ۱۹۶۴ء
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ادھر عرصے سے یوسف صاحب سے ملاقات ہوئی نہ ڈاکٹر نذیر صاحب سے۔ پچھلی بار اول الذکر سے ملا تھا اس کی روئداد آپ کو لکھ بھیجی تھی۔ ان دنوں مختلف ملاء اعلیٰ میں کچھ دامن اور گریباں کی آویزش پیدا ہو گئی ہے:

"خدا شرمائے ہاتھوں کو"

تعطیل سرما میں ادھر کا قصد ہے یا نہیں، یہ بھی تو نہیں معلوم کہ وہاں اس قسم کی کوئی تعطیل ہوتی بھی ہے یا نہیں۔ ڈاکٹر عمر خاں صاحب[1] کا ایک خط آیا تھا جس میں بڑی سچائی اور فخر سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ پڑھ کر جی خوش ہوا، نوجوانوں کے دلوں کو اس طرح گرم و گداز رکھنا بڑی نعمت ہے۔ یاد آتا ہے کچھ دن ہوئے آپ کی یونیورسٹی کے امتحان کا پرچہ بنانے کا آفر آیا تھا پھر کچھ نہ معلوم ہوا کہ اس کا کیا رہا۔ اخبار (Statesman) دیکھا ہوگا ایک کالم نگار کی مسلم یونیورسٹی سے متعلق گل فشانی اور ہارون خاں شروانی کا جواب، چھاگلا صاحب کی بارگاہ میں علی گڑھ اور بنارس یونیورسٹیوں سے ہندو مسلم کا "سابقہ" نکال دینے کا مسئلہ درپیش ہے۔ بقول غالب:

مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر غلام عمر خاں، ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی۔

۴۸

شنبہ ۱۵ دسمبر ۶۴ء
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ سلام شوق

۹ کا گرامی نامہ کل شام صادر ہوا۔ pre - Ph. D. کا پرچہ بھیجے ہوئے بہت دن ہو چکے تھے اب تک کوئی مقالہ یا اس قسم کی کوئی اور خبر نہ آئی، تو خیال آیا آپ سے دریافت کروں ممکن ہے کوئی امیدوار شریک امتحان نہ ہوا ہو۔ pre-university کے اُردو نصاب کا کام جس طرح ہو، جب تک ہو، رہے مجھے کوئی فکر نہیں۔ آپ نے تو ساری باتیں بڑی تفصیل سے لکھ ڈالیں جن کی ایسی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ مجھے اپنے بورڈ آف اسٹڈیز میں شریک کرنا چاہتے ہیں تو کر لیجیے۔ مجھ سے کیوں دریافت کیجیے۔ آپ اور آپ کے رفقائے کار مجھ سے جو چاہیں گے وہ انشاء اللہ حتی الوسع کروں گا

تو پھر آپ دسمبر میں رات کو "آگ تاپنے" اور دن میں "دھوپ کھانے" علی گڑھ تشریف نہ لاسکیں گے۔

کاش ایسے میں "گریۂ نیم شبی و نالۂ سحری" کے لیے میں ہی حیدرآباد آسکتا، لیکن یہاں کا رساول کھانے کے بجائے وہاں کا کھٹا کھانے کیوں آئے، مگر کیا کیجیے جی یہی چاہتا ہے کہ آپ آسکتے۔ اپنی مرضی اور دوسروں کے خرچے سے۔ خدا کرے "یوں بھی" ایسا ہو سکے اور "دوں بھی"

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۴۹

۴ مئی ۱۹۶۵ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
عنایت نامہ ملا۔ علی گڑھ کے حادثہ[1] کو آج ایک ماہ ہونے کو ہے لیکن اس کا اثر کچھ اس طرح کا ہے جیسے وہ سانحہ گذر نہ چکا ہو بلکہ بعنوانِ دیگر برابر پیش آرہا ہو۔ معلوم نہیں اب اپنی زندگی میں اس کا ختم ہونا کبھی دیکھ پاؤں گا یا نہیں۔ ہارون خاں صاحب سے آپ نے جو کچھ سنا وہ صحیح ہے لیکن طبیعت کا کچھ ایسا حال ہے کہ اس پر نہ تو تفصیل سے گفتگو کرسکتا ہوں نہ جی چاہتا ہے۔ آپ نے جس دکھ اور درد سے اس قصّے کو چھیڑا ہے اس کا ایک فائدہ یہ ضرور محسوس کرتا ہوں کہ جلد ہی اس پر آپ سے گفتگو کروں گا۔ اب تک سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جس الم میں مبتلا ہوں اس کا اظہار کس کے سامنے کروں۔
معاوضے کی اطلاع آپ کی یونیورسٹی نے کچھ دن ہوئے دی تھی، پھر کچھ نہیں ہوا۔ یونیورسٹی بند ہے۔ ممکن ہے پتہ صحیح نہ لکھنے سے گڑبڑ ہو۔ ڈپارٹمنٹ کے پتے سے میرے خطوط اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں۔ سب کو دعا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] تشدد کا وہ واقعہ جس میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا نے وائس چانسلر نواب علی یاور جنگ کو زدوکوب کیا تھا۔

۵۰

۲۸ مئی ۶۵ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کے بھیجے ہوئے کاغذات پر دستخط کر کے واپس کر چکا ہوں۔
آج تفصیل سے حالات لکھنے کا ارادہ کیا جیسا کہ خط میں اشارہ کر چکا ہوں، لیکن تردّد کی کچھ ایسی باتیں پیش آ گئیں کہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ عجب وقت آ گیا ہے کہ ہر طرف سے ہر وقت تکلیف و تردّد کی باتوں کا سامنا رہنے لگا ہے۔ اللہ رحم فرمائے، اور کیا عرض کروں۔ جو بات دفعتًا پیش آ گئی ہے وہ نجی ہے۔ ادارے سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ سب کو دعا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

گذشتہ سال پی۔ ایچ۔ ڈی (ابتدائی) کا ایک پرچہ بنا کر بھیجا تھا جس کی ایک کاپی بھی آ گئی تھی۔ ایسا ہی ایک پرچہ اس سال بھی بنا کر بھیجا لیکن پھر کچھ نہ معلوم کہ کیا ہوا۔

شنبہ، ۱۵ جون ۱۹۶۵ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
آپ کے پچھلے خط کی رسید تو پہلے بھیج چکا ہوں لیکن اس میں آپ نے جن اور باتوں کا ذکر کیا تھا ان کا جواب نہ دے سکا۔ گفتگو جس اطمینان سے کرنا چاہتا تھا وہ اب تک نصیب نہیں ایک طور پر مدتوں سے نہیں اور اب کیا نصیب ہو گا۔

"سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا"

کاش یہ سفینہ غالب کا نہیں محمد بن قاسم کا ہوتا۔ لیکن مایوسی کا محل نہیں۔ محمد بن قاسم کا سفینہ ہمیشہ سے آپ نوجوانوں کا حصہ رہا ہے۔ آپ کا تو نہیں، تو جاوید کے حصے میں آئے گا۔ اللہ ان کو اس کا حق ادا کرنے کا موقع، حوصلہ اور خوشی دے آمین۔ بایں ہمہ آپ کے خط کا مفصل جواب ضرور دوں گا۔ بشرطیکہ زندہ رہا اور تھوڑا زندہ دل بھی۔

آپ کی یونیورسٹی کا خط آیا کہ پانسو روپے کے چک کی رسید بھیج دو۔ رسید بھیجے ہوئے تو عرصہ ہوا۔ آپ نے سب کچھ مکمل کر کے بھیج دیا تھا میں نے دستخط کر کے وہ کاغذات آپ کے نام پوسٹ کر دیے۔ پچھلے سال pre - Ph. D. کا پرچہ بنایا تھا اور ایک کاپی بھی جانچی تھی اس کا کیا رہا۔ سب کو دعا

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۵۲

جمعہ ۱۵ر جولائی ۱۹۶۱ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

گرامی نامہ مورخہ ۱۱ر کل ۱۴ر کو موصول ہوا۔ پروفیسر نجیب اشرف[1] صاحب کا کارڈ بھی۔ ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ان دنوں وطن گئے ہوئے تھے کل اتفاقاً راستے میں ملاقات ہوگئی تو وعدہ کیا کہ شام کو گھر آئیں گے۔ نہ آسکے۔ گھر آیا تو آپ کا خط ملا۔ آج صبح آپ کا خط اپنی تحریر کے ساتھ بھیجا اور ساری صورت حال عرض کردی۔ جواب کا بھی خواستگار ہوا جواب تک نہیں آیا۔ ممکن ہے شام کو تشریف لائیں تو گفتگو ہو۔ بذات خود میں بہت شرمندہ ہوں کہ اس viva کے سلسلے میں آپ کو کس عذاب میں مبتلا کردیا۔ کچھ دن ہوئے ضیاء صاحب کی فرمائش موصول ہوئی کہ طالب علم علی گڑھ بلا لیے جائیں!! آج شام کو نذیر صاحب سے جو طے ہوگا وہ عرض کروں گا، لیکن میری وہی رائے ہے جو پہلے تھی یعنی عثمانیہ یونیورسٹی کوئی تاریخ مقرر کردیتی آپ واپسی

---

[1] پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

واپسی کا (اسی دن کا) رزرویشن کرادیتے۔ دہلی سے رزرویشن صرف روانگی کا ہو سکتا ہے واپسی کا نہیں اور آسانی سے شارٹ نوٹس پر ہو جاتا ہے۔ اب ایک دقت یہ بھی ہے کہ چوں کہ سید صاحب وہاں پہنچ چکے ہیں اس لیے کسی نہ کسی طرح موصوف کی موجودگی میں ہم سب کو پہنچنا چاہیئے۔ دیکھیے ہم تینوں کیسے متفق ہوتے ہیں لیکن آپ میرے اس خط کا انتظار فرمائیں جو نذیر صاحب سے مل کر کل بھیج سکوں گا۔ انشاءاللہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۳

شنبہ ۱۴ر جولائی ۱۹۶۶ء
ذکاء اللہ روڈ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

آپ کے خط کی رسید کل بھیج چکا ہوں۔ کل شام ڈاکٹر نذیر صاحب سے گفتگو آئی۔ طے یہ ہوا کہ ۲۵ر جولائی سے ۱۲ر تک جو تاریخ آپ مناسب خیال فرمائیں مقرر کر دیں۔ نذیر صاحب ۱۸ر سے ۲۵ تک اپنے ہاں کے کسی viva میں پھنسے ہوئے ہیں کیوں کہ کوئی تاریخ متعین نہیں ہوئی ہے بلکہ باہر کے ممتحن کے اوپر منحصر ہے۔ دہلی سے نشستیں آسانی سے رزرویشن کرائی جا سکتی ہیں۔ دقت حیدر آباد سے محفوظ کرانے میں ہوگی۔ جیسا کہ آپ نے اکثر فرمایا ہے کہ کم سے کم ۲۰ دن کا نوٹس دینا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں اور نذیر صاحب دونوں حیدر آباد پہنچیں گے اسی روز شب کی گاڑی سے واپس آئیں گے۔ viva کا بندوبست اس لحاظ سے فرمایا جائے۔ تیسرے یہ کہ یونیورسٹی بذریعہ تار ہم کو مطلع کر دے کہ فلاں تاریخ مقرر کر دی گئی ہے تاکہ اسی حساب سے ہم دہلی سے نشستیں محفوظ کرا سکیں۔ پانچویں یہ کہ حیدر آباد سے ہماری واپسی کا ٹکٹ آگرہ تک کا ہو تاکہ وہاں سے

بذریعہ بس ہم آسانی سے ۱۱ بجے دن تک علی گڑھ پہنچ جائیں۔ دہلی تک پہنچنے اور شام کی گاڑی سے علی گڑھ واپس آئے ہیں بڑی طوالت، زحمت اور زیر باری ہے۔ چھٹے یہ کہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب کا ممکن ہے حیدرآباد کا پروگرام کچھ اور ہو یعنی کچھ دن پہلے حیدرآباد پہنچنا چاہیں یا مزید چند یوم قیام کریں یا سفر کے لیے کوئی اور کلاس پسند کریں وغیرہ۔ اس لیے یونیورسٹی ان سے علاحدہ خط و کتابت کرے۔ آپ کی یونیورسٹی سے اب تک کوئی اطلاع نہیں آئی۔ اس خط کی رسید سے ضرور مطلع فرمائیے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کیا کارروائی ہو رہی ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۴

جمعہ ۲۳ر جولائی ۱۹۶۶ء
ذکاء اللہ روڈ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم
کل شام ڈاکٹر نذیر احمد صاحب تشریف لائے اور اپنی یہ دقت سنائی
کہ ان کی صاحبزادی جو فارسی کے ام ۔ اے فائنل میں اس سال شریک تھیں اور
امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو رہی تھیں ان کا نتیجہ شائع ہونے سے روک لیا گیا ہے
اور اس سلسلے میں یونیورسٹی تحقیق کر رہی ہے کہ کوئی بے قاعدگی تو نہیں ہوئی ہے
نذیر صاحب یوں تو مطمئن ہیں کہ کوئی بے عنوانی نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ
نہ ممتحن ہوئے نہ پیپر سیٹر ۔ نہ ماڈریشن میں شرکت کی اور نہ viva voce میں ۔
اور اس کی باضابطہ اطلاع وقت سے رجسٹرار کو اپنی تحریر سے دیدی
تھی، پھر بھی وہ فرماتے تھے کہ معلوم نہیں کس کس طرف سے کس کس وقت
کیا وقوعہ ظہور میں آئے ۔ اس لیے وہ دو تین ہفتے علی گڑھ چھوڑنا نہیں چاہتے ۔
آپ تو جانتے ہیں کہ وہ کتنے دنوں سے کیسی کیسی پریشانیوں میں مبتلا ہیں اس لیے
چاہتے ہیں کہ ۱۴ / ۱۵ اگست تک کے لیے اپنا سفر حیدرآباد ملتوی رکھیں ۔
اس طور پر اب میرا اور ان کا ساتھ ان ہفتوں میں نہیں ہو سکتا ۔ اگر کوئی
نزاکت نہ ہو تو ۱۵ اگست تک میرا viva بھی ملتوی فرما دیجیے ورنہ کوئی تامل
نہیں، آپ جب فرمائیں حاضر ہو جاؤں گا ۔ اطلاعاً عرض ہے ۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۵۵

علی گڑھ

۲۳ر جولائی ۶۶ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

کل ایک عریضہ بھیج چکا ہوں۔ رات کنٹرولر کے دو تار آئے کے ویوا کے لیے ۲۹ر جولائی رکی جاتی ہے۔ میں نے اسی وقت تار سے جواب دیا کہ منظور ہے۔ تار ہی سے بواپسی تصدیق کی جائے۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب[1] کو (دہلی) مطلع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نذیر صاحب ہمراہ نہ آسکیں گے اس بارے میں کل عرض کر چکا ہوں۔ سکندر ہمراہ ہوگا۔ آپ ایسا کیجیے کہ ۲۹ر کو واپسی کا رزرویشن مل جائے۔ یہاں یوسف صاحب سے عرض کیا ہے کہ ۲۷ر کو ایک سیٹ محفوظ کرا دیں۔ دہلی کا مرحلہ تو آسان ہے۔ دشواری آپ کے ہاں کی ہے۔ نہ صحت معتدل نہ موڈ بہتر۔ اس لیے جلد سے جلد واپس آنا چاہتا ہوں۔ دید باز دید۔ تواضع، تقریر سب سے محفوظ رکھیے، اس لیے اور چاہتا ہوں کہ جلد سے جلد واپسی ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، سابق صدر شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جو اس وقت دہلی میں مقیم تھے۔

۵۶

۲۶ر جولائی ۶۶ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
آپ کی یونیورسٹی سے ۲۲ر کو تار ملا کہ ۲۹ر تاریخ امتحان کے لیے
قابلِ قبول ہو تو اطلاع دو تاکہ دوسرے ممتحنوں کو اطلاع دی جائے
۲۲ر ہی کو میں نے تار جواب دیا کہ ۲۹ر منظور ہے براہِ کرم تاریخ پکی
کر دی جائے اس کا کوئی جواب کل تک نہیں آیا۔ آج صبح پھر اسی
مضمون کا تار ملا جو ۲۲ر کو ملا تھا کہ ۲۹ر موزوں ہو تو بذریعہ تار مطلع کر
تاکہ ...... وغیرہ۔ یہ جوابی تار ہے اس کا مفصل جواب آج دیا ہے کہ
۲۹ر کی منظوری تار سے دیے ہوئے آج چار دن ہوئے۔ ۲۹ر کو آرہا ہوں
اور اس کی اطلاع آپ کو دیدی جائے۔ ۲۷ر کو میں نے دہلی سے سیٹ
رزرو کرالی۔ آپ کی یونیورسٹی سے کوئی جواب نہ آیا تو کیا کرتا آپ کو
بھی مسلسل لکھتا رہا ہوں۔ ضیاء صاحب کے بارے میں بھی آپ کو مطلع
کرتا رہا۔ غرض یہ کہ کاروبار بڑا گڑبڑ رہا۔ اب اسی میں فائدہ دیکھتا ہوں

کہ وہاں پہنچ جاؤں۔ سید نجیب اشرف صاحب موجود ہوں گے۔ امیدواروں کو بھی اطلاع دے دی گئی ہوگی۔ ممکن ہے تمام مراحل طے ہو جائیں۔ اور سب سے بڑی دقت تو اس کی ہے کہ آپ کے ہاں رزرویشن کا کیا رہا۔ اس بارے میں برابر آپ کو تکلیف دیتا رہا ہوں۔ ظاہر ہے کام ختم ہو جانے پر میں اولین گاڑی سے واپس آنا چاہوں گا۔ بہرحال ۲۹ (جمعہ) کو حاضر ہو رہا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۵۷

۱۱راگست ۶۶ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
نوازش نامہ ملا۔ آپ نے مولانا[1] سے بعض صفات تبدیل کرنے کی جو نیک خواہش ظاہر کی ہے اس کے درست ہونے میں کیا شبہ۔ لیکن برنارڈ شا کا مشہور لطیفہ بھی غالباً یاد ہوگا۔ اپنے عہد کی کسی مشہور ترین حسینہ نے شا سے فرمائش کی کہ مجھ سے شادی کر لو۔ اولاد میری طرح حسین اور تمھاری جیسی ذہین ہوگی اور یہ کتنا اچھا ہوگا۔ شا نے جواب دیا یہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر تمھاری جیسی احمق اور میری جیسی ہونق ہوئی تو؟ بہرحال میں ممدوح کی طہارت کے تصور اور تصویر کو جس میں دسترخوان کو آلودہ کرنے کی بھی طہارت شامل ہے اپنی کسی عادت سے بدلنے

---

[1] مولانا ضیاءالدین احمد بدایونی جنھوں نے ایک امتحان کے سلسلے میں میرے ہاں رشید صاحب کے ساتھ قیام کیا تھا۔

پر آمادہ نہیں ہوں۔

جی ہاں ان دنوں آپ اس گھریلو تقریب کے انتظام و انصرام میں مصروف ہوں گے جس کے لیے یوسف صاحب تشریف لے گئے ہیں اللہ تعالیٰ دو لھا دولھن کو اپنی بے شمار نعمتوں و برکتوں سے بہرہ مند فرمائے اور رکھے آمین۔ کبھی اس موقع پر کیا ہوتا اور کس کس طرح ہوتا آج کیا ہو رہا ہے اللہ کی مرضی۔ اس دفعہ وہاں کے قیام میں آپ سے رسمًا بھی گزشتہ سانحہ کے ذکر کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔[۱] اللہ حافظ و ناصر رہے۔

آپ کا

رشید صدیقی

---

[۱] کچھ قبل برادر محترم امتیاز حسین خاں کا انتقال ہو گیا تھا اس کی جانب اشارہ ہے۔

۵۸

۲۰ مارچ ۱۹۶۷ء

ذکاراللہ روڈ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا، کیسی خوشی ہوئی کہ آپ کہا مان گئے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی یہی کیا[1]۔ خدا آپ دونوں کو خوش رکھے۔ تو پھر یہ طے ہوا کہ مرنے کے بعد جب میں خدا کے سامنے اپنے گناہوں کی جواب دہی کر رہا ہوں گا آپ دنیا میں میرا ذکر خیر کیجیے گا کیا عجب اللہ تعالیٰ آپ سے خوش ہوکر مجھے بخش دے! اس کے یہاں کا حساب کتاب اسی طرح کا ہے جسے گنہ گار ہی سمجھتے ہیں۔

آپ اور آپ کی طرح دوسرے دوست اور عزیز میری جیسی عزت و محبت کرتے ہیں اس سے بے اختیار ہو کر اکثر سوچنے لگتا ہوں (اور کیسی حسرت ہوتی ہے) کہ اب سے پہلے اس خوش نصیبی کا گمان ہوتا تو کتنے مناہی سے بچتا اور اوامر کو اپناتا ایسا ہوا ہوتا تو آج آپ کی محبت کا سزاوار بننے پر کتنا فخر کرتا۔ دوستوں کے ہر کرم پردہ فروگذاشتیں یاد آتی ہیں تو کتنا افسردہ اور شرمندہ ہوتا ہوں۔

---

[1] یہ اس تہدید کے بارے میں ہے جو وہ اپنے مراسلات کے شائع نہ کرنے کے سلسلے میں اپنے دوستوں اور عزیزوں کو لکھتے رہتے تھے اور انھیں ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی تھی۔

یہ سن کر خوش ہوا کہ لسانیات کی اسامیوں کے تقرر کے سلسلے میں آپ کے تشریف لانے کا امکان ہے۔ خدا کرے ایسا ہو اور جلد ہو۔ ذرا پہلے سے مطلع کر دیجیے گا۔ یہ اس لیے کہ آپ کا قیام میرے ہاں ہوگا۔ رہا حالیہ الکشن پر گفتگو اسے اسی وقت کے لیے ملتوی رکھیے۔ مجھے تو ذاکر صاحب کا خیال ہے کہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ موجودہ set-up میں صدر جمہوریہ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے اس لیے دل نہیں چاہتا کہ ذاکر صاحب کی صحت کو ایسے فشار سے سابقہ ہو۔ صدارت کے ضمن میں ذاکر صاحب کا نام جن حلقوں سے پیش کیا اور جن اصحاب نے پیش کیا اس سے تو میرے نزدیک ذاکر صاحب صدر جمہوریہ ہو گئے۔ یوں چاہے جو ہو۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ذاکر صاحب میں جو چیز آج سے ۵۲ سال پہلے میں نے دیکھ لی تھی دوسرے آج دیکھ پائے! کیوں، غلط کہتا ہوں؟

چند دن ہوئے ایک ڈائری موصول ہوئی تھی خیال آیا کہ آپ کی نذر کروں باوجود اس یقین کے کہ اس سے بہتر ڈائریاں آپ کے پاس ہوں گی اس لیے کچھ دن پس و پیش میں گزر گئے لیکن بالآخر دل یہی چاہا کہ آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔ آپ کے نہیں تو میاں جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ کے کام آئے گی۔

حیدرآباد کے دوستوں اور عزیزوں کو دعا و سلام شوق

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۵۹

یونیورسٹی، علی گڑھ
۲۴ر مئی ۱۹۶۷ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کے نوازش نامے کے جواب میں خیریت کا خط لکھ چکا ہوں۔ آپ شمس اللہ قادری مرحوم کے صاحبزادے سے واقف ہوں گے جو پچھلے سال موٹر سے ہم سب کو آپکے مکان سے اپنے دولت خانے پر لے گئے اور وہاں سے اسٹیشن پہنچا آئے تھے۔ کل ان کا خط آیا، صاحبزادی مس حکیمہ قادری یہاں امتحان دینے آئی ہیں ان کی خیریت دیر سے نہیں معلوم ہوئی اس لیے گھر والے پریشان ہیں۔

موصوف کا خط سکندر کو دیا کہ ویمنز کالج و حیدریہ ہوسٹل جا کر پتہ لگا ئیں۔ صاجزادی نے میرا اور اپنے والد (قادری صاحب) دونوں کے خطوط رکھ لیے اور یہ سلپ بھیجدی جو منسلک ہے اسے موصوف کے نام بھجوا دیجیے گا۔ مشکل یہ آن پڑی کہ مجھے نہ قادری صاحب کا نام یاد رہ گیا نہ گھر کا پتہ، ورنہ براہِ راست ان کو مطلع کرتا کہ صاجزادی بفضلہ ٹھیک ہیں تشویش نہ فرمائیں۔ لیکن یہ آپ فون پر قادری صاحب کو مطلع فرمادیں بے چارے بہت متفکر ہوں گے۔ صاجزادی نے یہ بھی فرمایا کہ انھوں نے اپنے والد کو خیریت کا (خط) لکھ دیا تھا جس کا جواب بھی آگیا!! پھر قادری صاحب کو کیوں تردد ہے؟ شکریہ

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۰

ذکار اللہ روڈ[1]
علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
خبر گرم ہے کہ اورینٹل کانفرنس میں آپ آخر ہفتہ اکتوبر میں علی گڑھ تشریف لا رہے ہیں۔ ظاہر ہے آپ کا قیام و طعام میرے ہاں ہوگا۔ کچھ پہلے مطلع کر دیجیے گا تاکہ "بوریے" کا انتظام رہے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکخانے کی مہر کے مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۷ء کا خط ہے۔

۶۱

۲۴ر جنوری ۶۶ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

گرامی نامہ مورخہ ۲۶ر جنوری ابھی ابھی موصول ہوا۔ شکر گزار ہوں کہ آپ نے کلکتہ والوں کو مطلوبہ معلومات فراہم کر دیں۔ ایک عرصہ سے یوسف صاحب[1] کی خیریت نہیں معلوم ہوئی تھی خوش ہوں کہ آپ کے خط سے تردّد دور ہوا۔ میں نے تو سمجھا تھا کہ اتنے دنوں علی گڑھ رہ کر موصوف "سرد و گرم چشیدہ" ہو گئے ہوں گے۔ لیکن شملہ کی سردی سے بچنے کے لیے حیدرآباد کی پناہ لینی پڑی جہاں ہمیشہ "تفاوت نہ کند لیل و نہار" کی فضا رہتی ہے۔

لسانیات کی پروفیسری جس طرح سے[2] معلّق ہو گئی اس کا حال معلوم

---

[1] پروفیسر یوسف حسین خاں، سابق پرو وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جو اس وقت میرے یہاں حیدرآباد میں مقیم تھے۔

[2] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں چند سال سے لسانیات کی پروفیسری کے قیام کی تجویز تھی اس سلسلے میں ارباب حل و عقد مجھ سے گفت و شنید کر رہے تھے۔

ہوا ایک sports man نے کسی کمینے کی حرکات پر ایک موقع پر کہا تھا ''میں
تم کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنی گولی ضائع کروں۔'' اسی طرح میں نہیں
گوارا کر سکتا کہ اس پر لعنت کا ایک حرف زائل کروں۔ میں وہ سب
کچھ کروں گا جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اللہ مالک ہے۔
یوسف صاحب کی خدمت میں آداب۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

خانۂ مسعود میں ''قران السعدین'' کا فقرہ خوب لکھا[1]

---

[1] اشارہ ہے میرے مکان پر پی۔ ایچ۔ ڈی کے ... کے سلسلے میں رشید صاحب
اور پروفیسر ضیاء الدین بدایونی کا بیک وقت مہمان ہونے کی جانب۔

۶۲

یکشنبہ ۲۸ ؍ اپریل ۶۳ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

تین چار دن ہوئے کلکتہ کے بھارتیہ جنن پیٹھ Bhartaya Jnanpith والوں نے ایک گشتی مراسلہ بھیجا ہے کہ انعام کے لیے اُردو کے کسی اہلِ قلم کی سفارش کی جائے۔ مطبوعہ ایک فارم ہے جس کی خانہ پُری کی جائے گی۔ آپ کو بھی یہ کاغذات ملے ہوں گے۔ میں تو یوسف صاحب کا نام پیش کرنا چاہتا تھا۔ اُردو میں ان کی تصانیف روحِ اقبال، غزل، فرانسیسی ادب اور حال کی چند مطبوعات ایسی ہیں جو اُردو ادب میں مسلمہ حیثیت رکھتی ہیں۔ آج تک سخت سے سخت تنقید نگار نے بھی ان کی تصانیف کو مستند مانا ہے۔ سرسید، شبلی، حالی اور سید سلیمان ندوی کے بعد لیکن ان سے کسی طرح کم نہیں، یوسف صاحب کی تصانیف کا درجہ ہے۔ موصوف کی کتابوں کا مزید امتیاز یہ ہے کہ وہ موجودہ دور کے تنقیدی معیار پر بھی پوری اترتی ہیں۔ اوّل الذکر مصنفین کی تصانیف کسی حد تک مذہبی یا نیم مذہبی ہیں۔ باستثنار حالی۔ یوسف صاحب کی مطبوعات تمام تر علمی و ادبی ہیں۔ آپ میری تجویز کو ذہن میں رکھیے گا۔ آئندہ چند دنوں میں ملاقات کی صورت نکلی تو اس پر مزید گفتگو ہو گی۔

امید ہے کہ مزاج مع الخیر اور حالات سازگار ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۶۳

شنبہ ۲۹ جون ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسود صاحب مکرم۔ تسلیم
کچھ نہیں معلوم آپ یہاں کس حال میں ہیں اور کس محفل میں ہیں۔
اس سے اندازہ کرسکتا ہوں کہ وہاں آپ پر کیا گزر رہی ہوگی!
رات دن گردش میں آسمان ہی نہیں مسلمان بھی ہیں۔ ذرا بتایئے گا M.O.L. کے پرچے بنانے اور کاپی دیکھنے کا معاوضہ آپ کی یونیورسٹی میں کیا مقرر ہے۔ نرخ نامے میں سارے امتحانوں کے نرخ درج ہیں سوا M.O.L. کے۔ دعا ہے کہ آپ مع الخیر ہوں۔
مخلص
رشید احمد صدیقی

۶۴

۱۳ر جولائی ۱۹۶۱ء
ذاکر باغ یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
۱۰ر جولائی کا نوازش نامہ ملا۔ ہاتفِ شیراز بہت پہلے سے "یوسفِ گم گشتہ" کے کنعان واپس آنے کی بشارت دے رہے تھے لیکن کیا کیجیے اس "قمر در عقرب" یا "اشٹ گرہ" کو (معلوم نہیں سنسکرت کا صحیح مترادف استعمال کر رہا ہوں یا نہیں، بہت دن ہوئے یہ لفظ سننے میں آیا تھا) جس کی نحوست و نجاست یونیورسٹی پر مسلط ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ آپ کی خدمت میں تقرر کا اطلاع نامہ (باضابطہ) جلد سے جلد بھجوادیں تاکہ آپ یہاں پہنچنے کا انصرام بروقت اور آسانی سے کر سکیں۔ ابر و باد و باراں کی بے دریغ بخشی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیر مقدم کے لیے میگھ دوت نے حیدر آباد کے موسم کو علی گڑھ منتقل کر دیا ہو۔ کچھ اور نہیں تو وہ "سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب"! نہ سہی "وہ نازنینِ بتانِ خود آرا" یا "وہ بادہ ہائے نابِ گوارا کہ ہائے ہائے!"

۸ر کو احسان آگئے ہیں۔ آپ بروقت آسکے تو ملاقات ہو جائے تو کیا عجب۔ سلام کہتے ہیں "نذرِ ذاکر" میں آپ کا مضمون کیوں نہیں؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ کا مضمون بھی ہوگا۔ عزیزوں کو دعا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۵

جامعۂ اُردو، علی گڑھ
۲۱ اگست ۱۹۶۸ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
۸ ستمبر کو جامعہ[1] کا جلسہ تقسیم اسناد ہے۔ خطبہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب دینے والے تھے لیکن بوجوہ نہ دے سکیں گے۔ براہِ کرم اس موقع پر ایک خطبہ پڑھ دیجیے۔ آپ کے لیے یہ جتنا آسان ہے اتنا ہی ہم سب کے لیے آپ جیسا آدمی تلاش کرنا اور پانا مشکل ہے۔ ممکن ہے کل پروفیسر ڈاکٹر سید محمد طاہر رضوی (نائب شیخ الجامعہ) نے اس کے لیے آپ سے درخواست کی ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

آپ جلد لکھ لیں گے تو کوشش کی جائے گی کہ چھپ جائے ورنہ اس کے بعد شائع کیا جائے گا۔ ابھی چھپ جانا ممکن ہے۔

---

[1] جامعۂ اُردو، علی گڑھ

۶۶

جامعہ اُردو، علی گڑھ
یکم ستمبر ۶۵ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
کل ایک عریضہ آپ کی خدمت میں بھیج چکا ہوں جس میں درخواست کی ہے کہ ۸؍ کو جامعہ کا جلسہ تقسیم اسناد ہے اس میں آدھے گھنٹے ۴۵ منٹ کا خطبہ پڑھ دیجیے۔ یہ خطبہ علیم صاحب دینے والے تھے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔

اخلاقاً طاہر صاحب نے علیم صاحب سے کہہ دیا تھا کہ مسعود صاحب آپ سے مل لیں گے اور آپ جو کچھ فرمائیں گے اسے وہ (مسعود صاحب) اپنے خطبہ میں شامل کر لیں گے۔ کل طاہر صاحب سے معلوم ہوا کہ علیم صاحب نے ان سے (طاہر صاحب) سے کہا کہ "مسعود صاحب نہیں آئے"! یہ قصہ آپ کو نہ معلوم ہوگا چاہتا ہوں کہ آپ کوئی وقت نکال کر علیم صاحب سے ضرور مل لیں تاکہ جو نزاکت پیدا ہو گئی ہے وہ دور ہو جائے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۷

۱۲ ستمبر ۱۹۶۸ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

اس دن تقریب کی ہڑتم میں آپ کو مبارکباد نہ دے سکا۔

آتش لکھی وہ تو نے غزل عاشقانہ کیا![1]

خیال تھا جلد ہی بعد ملنے کا موقع مل سکے گا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔

کچھ آلامِ روزگار اکٹھا ہو گئے ہیں آپ سے مل کر ان کو "غمِ جاناں"

بنانا ہے یا اس کے برعکس۔ کب اور کیسے ایسا ہو سکے گا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] وہ خطبہ جس کا تذکرہ خط نمبر ۶۶ میں ملتا ہے۔

۶۸

۱۷ ستمبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔
براہِ کرم اِن اوراق پر ایک نظر ڈال لیجیے اور بتایئے کہ جس معیار کا ہونا چاہیے وہ ہے یا نہیں۔
مثلاً (۱) محض لفاظی عبارات اور طبع آزمائی تو نہیں ہے؟
(۲) کوئی ضروری بات کہنے سے تو نہیں رہ گئی۔
(۳) کوئی بے موقع بے موقع اور بے ضرورت تو نہیں کہی گئی ہے
(۴) طوالت پر نہ جایئے صرف جہاں تہاں سے مناسب اقتباسات پڑھ دوں گا اور یہ عمل زیادہ سے زیادہ ۲۰ - ۲۵ منٹ میں ختم ہو جائے گا۔ پورا خطبہ جو چاہے گا گھر جاکر اطمینان سے پڑھ لے گا۔

(۵) repetitions تو نہیں ہیں، خیالات، الفاظ اور فقروں کے۔

(۶) آپ کے نزدیک کون سے پیراگراف حذف کر دیئے جائیں ان پر pencil سے نشان لگا دیجیے گا۔

(۷) آپ کا حصہ، factual حصہ کب تک ملے گا؟ اسے کہاں شامل کر دیا جائے؟ اس کی نشان دہی کر دیجیے گا۔ مثلاً ص ۱۰ اور ۱۱ کے درمیان؟ اس وقت عجلت میں ہوں۔ اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ بقیہ بروقت ملاقات۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۶۹

۱۸ اکتوبر ۶۸ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
کل آپ تشریف لائے بہت خوش ہوا۔ غالب پر گفتگو کرنے سے بہت سے نکتے واضح ہو گئے لیکن ان کو ضبطِ تحریر میں لانا میرے لیے آسان نہیں۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے۔ ذمہ داری لے لیتا ہوں۔ عزیزوں کا اصرار رد نہیں کر پاتا اس کے بعد واویلا کرنے لگتا ہوں۔
اس خط کے لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ ایک بات کل سے بار بار دل میں کھٹکتی ہے کہ کل دورانِ گفتگو میں جامعہ اُردو کے محاسب دستخط کرانے آئے تو میں جلدی سے ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور کام کرنے لگا اور آپ سے معذرت چاہے بلکہ مخاطب ہوئے بغیر آپ کو رخصت کر دیا، جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ ایسا سلوک تو میں معمولی سے معمولی آدمی سے بھی نہ کرتا اور نہ کرنا چاہیے۔ جب سے اب تک اپنی نادانستہ لیکن نازیبا حرکت پر نادم ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ اس یونیورسٹی میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کی عزّت و محبت میرے دل میں آپ سے

سوا ہے۔ ستم یہ ہے کہ جامعہ کے محاسب کو میں نے سمجھا کہ وہ کاتب ہے
جس کو میں نے اپنا مسودہ خوش خط لکھنے کو دیا تھا، سوچا تھا مسودہ آپ
کو دکھاؤں گا وغیرہ۔

بہر حال اس واقعہ کا خیال نہ فرمائیے گا گو کچھ دنوں سے ایسا
محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس طرح کی باتیں بغیر ارادہ مجھ سے سرزد
ہو جایا کرتی ہیں۔

آپ سے معافی کیا مانگوں آپ کے لیے دعا کرتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۷۰

منگل ۱۰ دسمبر ۱۹۶۸ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
جب کبھی دہلی جانا ہوتا ہے تو "موصوف"[1] کچھ نہ کچھ فواکہات (فتوحات) ساتھ کر دیتے ہیں بالعموم پھل یا شہد۔
میرے بعد ان تبرکات پانے کا حق آپ کو ہے چاہے موصوف سے براہِ راست ملیں یا بقول حکیم صاحب[2] "میرے through سے"۔
شہد کا یہ ڈبہ آپ کی نذر ہے۔ میٹھے میں شاید شہد ہی کو آپ کے مزاج میں زیادہ درخور ہو۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] اشارہ ہے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی جانب جو اس زمانہ میں صدر جمہوریہ ہند تھے۔
[2] حکیم عبداللطیف صاحب، سابق پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۷۱

۲۴ر دسمبر ۱۹۶۸ء

زکاءاللہ روڈ، ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم - آداب

سلیمان اطہر جاوید کے مطبوعہ مقالے[1] پر آپ نے جو تعارف لکھا ہے وہ اتفاقیہ میری نظر سے گزرا۔ مقالے کو پڑھنے کے لیے کمال کو دے دیا تھا اس کے احسان بڑے مشتاق تھے۔ ایک خاتون کراچی جا رہی تھیں، میں نے کمال سے کہا کہ مقالہ احسان کو بھیج دیں۔ انھوں نے کہا کہ مسعود صاحب نے جو تعارف لکھا ہے وہ بے نظیر ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ نے کوئی تعارف بھی لکھا ہے اب جو پڑھا تو حیرت میں رہ گیا۔ میں آپ کے مزاج اور manners سے واقف ہوں۔ آپ کسی حال میں اعتدال سے متجاوز ہو کر جذبات یا خیالات کا اظہار نہیں کرتے خواہ کوئی غیر معمولی حادثہ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بھی جانتا تھا کہ آپ کے دل میں میرے لیے بڑی عزت و محبت ہے لیکن اس کی خبر نہ

---

[1] رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن - حیدرآباد ۱۹۶۸ء

تھی کہ اتنی تھی اور آپ اس کا اظہار اس موقع پر اس حد تک کریں گے۔ اس کا بھی اندازہ نہ تھا کہ اس طرح کے جذبات و خیالات کا اظہار آپ اس خوبی و اختصار سے اتنے دل کش الفاظ و عبارت میں کر سکتے ہیں۔ آپ کے اس ہنر کا معترف ہوں اور آپ کی بے پایاں ارادات و شرافت کا شکر گزار۔ اس لیے اور کہ آپ میری کمزوریوں سے واقف تھے اور ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس طرح کی اور اس سے بھی بڑھ کر اپنی بڑائیوں کے اظہار کا موقع دے۔ آمین

مخلص

رشید احمد صدیقی

۷۲

دوشنبہ ۳۰ دسمبر ۱۹۶۸ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسود صاحب مکرم۔ تسلیم

مسودہ اب تک صاف نہ کر پایا۔ ۔ ۔ [1]۔ ۔ اس طرح گڈمڈ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ ان کی کھتونی مشکل ہو گئی۔ بارے کچھ نہ کچھ ہو گیا۔ اس دن شام کی گفتگو کے پیش نظر سیرت و شخصیت کے assesment میں جو pit-falls ملتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے ۴۔ ۵ صفحات میں یہ تحریر فرما دیجیے کہ جدید ترین اہل فکر و نظر سیرت و شخصیت پر کن اصولوں کو پیش نظر رکھ کر حکم لگاتے ہیں۔ ۲۲۔ ۲۳ صفحات لکھ چکا ہوں ان میں digressions بھی ہیں جن کو یکسر موقوف کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ آخری چند اوراق سے جو کلیتہً "مبنی بر حقائق" ہوں گے ان کی تلافی ہو جائے گی۔ زندگی کیسی ہی رہی ہو خاتمہ برحق ہونا چاہیے۔ اس میں آپ کی تائید درکار ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] الفاظ پڑھے نہ جا سکے۔ اشارہ دہلی یونیورسٹی کے نظام توسیعی خطبہ۔ غالب کی جانب ہے جس سے رشید صاحب اس زمانے میں دست و گریباں تھے۔ مزید دیکھیے خط نمبر ۶۸

۷۳

۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
نوازش نامہ ملا۔ غالب کے جن اشعار کو سامنے رکھ کر آپ نے عنایت نامہ لکھا ہے شاید خود غالب اتنا اچھا خط نہ لکھ سکتے جو بغیر اشعار کے بہت اچھے خطوط لکھتے تھے یا غالب کے خطوط میں سب سے کم اشعار ملتے ہیں جو ملتے ہیں وہ انھیں کے ہیں لیکن سب کے سب دعائیہ یا سائلانہ۔ ہزار برس سلامت رہے رہنے کا جو شعر انھوں نے بار بار لکھا ہے اور جب سے اب تک ہزار بار سے زیادہ دوسروں نے استعمال کیا ہوگا اب کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ شعر اور زندگی دونوں سے طبیعت اکتا گئی۔
آپ دروازہ کیوں کھٹکھٹائیں، چلے آیا کیجیے۔ آپ سے کس کا پردہ ہے، یہ تو میں نے آپ سے بار بار عرض کیا ہے۔
ان دنوں طبیعت متفکر رہتی ہے پاکستان میں جو ہل چل ہے اور جیسے بہیمانہ واقعات اخباروں سے روز معلوم ہوتے رہتے ہیں وہ بڑے تکلیف دہ ہیں۔ اقبال، احسان، نیازی، عذرا اور بھیا سب وہیں ہیں۔ ڈاک اور تار میں بھی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے۔ دس بارہ دن سے کسی کی خبر

معلوم نہیں ہوئی۔ نہ تار نہ خط۔ اس کے علاوہ اور مکروہات ہیں جو مدتوں سے زندگی کا جز بنے ہوئے ہیں۔ دو ایک چیزیں لکھنے کا جی چاہتا تھا وہ کر نہیں پاتا۔ اچھا نہ کر پائے۔ برے سے چھٹکارا نہ ملے۔ کیسی بے بسی اور بدنصیبی ہے۔ خاص طور پر عمر کی اس منزل میں جس میں کہ میں ہوں!

بقرعید میں "موصوف"[1] سے ملاقات نہ ہوئی وہ تشریف نہ لائے میں جا نہ سکا۔ اس لیے مجوزہ اسکیم جہاں کی تہاں رہی۔ یوں بھی اس شخص سے ملنے کا جی نہیں چاہتا جو ایسے لوگوں کو "درخورِ اعتنا" نہیں سمجھتا جس سے نہ کوئی امید ہو نہ اندیشہ۔ کاش آپ خود مل سکتے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا کہا مان لیا جائے گا۔ کان میں بات ڈال دینے میں کیا حرج ہے۔ آپ جو کہیں گے موصوف اسے آسانی سے نظر انداز نہ کر سکیں گے۔ ذرا طبیعت یکسو اور مطمئن ہو جائے تو آپ سے ملوں گا۔ معلوم نہیں کب آپ ڈپارٹمنٹ آجاتے ہیں اور کب آپ کے classes ہوتے ہیں۔

امید ہے اب تک آپ نے نزلہ زکام پر غلبہ پا لیا ہوگا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر عبدالعلیم۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب اشارہ۔

۷۴

26.3.69

علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل آپ کو خط بھیج چکا ہوں کہ تھوڑی دیر بعد ڈاکیہ آیا اور حیدرآباد
کے پرچوں کا پارسل حوالے کر گیا۔ چاہتا ہوں کہ آپ اور ڈاکٹر مختارالدین
صاحب جگہ، دن اور وقت طے کرلیں وہیں پرچے لے کر آجاؤں
تا اور کام شروع کر دیا جائے گا۔ جگہ سرکاری ہونا چاہیے، یعنی یا تو
اپ کا شعبہ یا مختارالدین صاحب کا۔ اپنے گھر پر پرچے کھولنا، ماڈریٹ
رنا اور پھر دوسرے دن کے لیے محفوظ رکھنا (اگر کام پورا نہ ہو) مناسب
نہیں سمجھتا۔ کھلنے کے بعد پرچہ کسی سرکاری ہی آفس میں سربمہر رکھ دیا
جائے گا۔ یہ سب اس لیے کہ رجسٹرار صاحب عثمانیہ یونیورسٹی کو ان
تمام امور کا تصدیق نامہ پرچوں کے ساتھ بھیجوں گا۔ یہ خط ڈاکٹر مختارالدین
صاحب کو دکھا دیجیے۔ موصوف کو علاحدہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

۷۵

ذاکر باغ، یکم جولائی ۱۹۶۹ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ لوٹ پوٹ کر فی الحال اچھا ہو گیا ہوں۔ بیمار ہو کر اپنے پر ترس کھاتا رہا کہ کیسے عظیم الشان کام کرنے سے رہ جاتے ہیں۔ اچھا ہو گیا تو محسوس ہوا کہ مر کر کیا کر لیتے، جیتے ہیں تو کیا کر لیں گے، بقول اصغر مرحوم یہ سب "فریبِ عاشقی" ہیں۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب[1] کا خط میرے نام بھی آیا تھا۔ کس محبت اور عزت سے انھوں نے سنگِ بنیاد رکھنے کی فرمائش کی تھی۔ جی بھر آیا۔ کچھ دنوں سے اسی طرح کی انفعالی کیفیت کا شکار ہوں۔ کیا کرتا معذوری لکھ بھیجی۔ آپ ہی بتائیے باوجود خواہش کسی دن بھی جاوید منزل[2] تک نہیں پہنچ سکا تو حیدر آباد کیسے پہنچ جاؤں گا۔ ایک زمانہ تھا کہ ایسا آفر

---

[1] پروفیسر حبیب الرحمٰن، حیدر آباد کے اُردو کالج اور انجمن ترقی اُردو کے روحِ رواں۔

[2] غریب خانہ۔

آتا تو حوصلہ بڑھ جاتا کہ کیا کیا نہ کروں گا۔ آج کچھ نہیں کر پاتا، باوجود اس کے کہ پَر بھی کھلا ہے اور قفس کا در بھی۔

یہ تو سب ہے لیکن باوجود بزدل ہونے کے یا اسی سبب سے ایک امر معلومہ میں انتقام کی آگ برابر سلگتی اور بھڑکتی رہتی ہے کاش زندگی میں یہ حساب چکایا ہوتا! سوچتا تھا کہیں سے تحفے میں قائم گنج[1] کے آموں سے بہتر آم آجاتے تو جاوید[2] اور بچیوں کے لیے بھیجتا۔ دوسرے درجہ کی چیز آپ کے لیے بھیجنا گوارا نہیں۔ خود میں نے اب تک آم نہیں چکھے۔ ان دنوں وہ عزیزانِ گرامی نہیں جن کے ساتھ آم یا کوئی اچھی چیز کھانے میں خوشی اور امتیاز محسوس کرتا تھا یعنی نہ تو کمال[3] ہیں اور نہ احسان[4]۔ غالب آم کے جیسے شائق تھے اس کا ذکر انھوں نے بڑی تفصیل سے بار بار اور شوق سے کیا ہے۔ تعجب ہے ان جیسا شراب کا اداشناس یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ آم کھانے میں لذتِ طلب اور کثرت ہی نہیں دیکھتے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ آم کھانے والے ساتھی کیسے ہیں۔

---

[1] مرتب کا وطن مالوف جہاں کے آموں کی شہرت ہے۔

[2] مرتب کا بڑا لڑکا، پروفیسر جاوید حسین

[3] ڈاکٹر کمال الدین: رشید صاحب کے بھانجے، ریڈر شعبۂ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[4] ڈاکٹر احسان رشید، رشید صاحب کے دوسرے فرزند، سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی

گھر میں چوری ہو گئی ایک ۲ر جون کو، دوسری کل ۲۰ر کو۔ کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا، لیکن خفت ضرور محسوس ہوئی۔ جیسے چھینکے میں کسی پکّی عمر کے Don Juan (ڈان جوان) کے مصنوعی دانت گر کر کسی خاتون "پرائما ڈونا" کے آغوش میں پناہ لے۔ طبیعت موزوں رہی تو کیا عجب کسی دن آپ سے نہیں جتنا جاوید اور بچیوں سے ملنے جاوید منزل[۱] تک پہنچ جاؤں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[۱] مرتب کا مکان

۷۶

۳ر جولائی ۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ان اوراق پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس دن غالب کے علم پر جو گفتگو آئی تھی اس پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے ان کو نظام لکچرز[1] میں شامل کر دینے کا قصد ہے۔ بشرطیکہ فاروقی صاحب[2] کے اندیشہ ہائے دور دراز مانع نہ آئیں۔ میرے لیے بڑے اطمینان کا موجب ہوگا اگر آپ ان سطور کا مطالعہ بغیر کسی تکلف کے کریں گے اور کوئی بھی بات یا بحث یا اندازِ گفتگو کسی اعتبار سے کھٹکے

---

[1] شعبۂ اُردو دہلی یونیورسٹی کے نظام خطبات جس کے لیے رشید صاحب نے غالب کا موضوع منتخب کیا تھا۔

[2] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی جو اس وقت صدر شعبۂ اُردو تھے اور جن کی دعوت پر رشید صاحب نے نظام خطبات کی ذمہ داری لی تھی۔

اسے قلم زد فرمادیں گے۔ باتیں پھیلا کر بیان کی گئی ہیں اس لیے اگر مختصر کر دی جائیں تو کوئی حرج واقع نہ ہوگا۔ یہ فرمائش اس بنا پر کر رہا ہوں کہ آپ علمی، ادبی اور اخلاقی مسائل پر اظہارِ خیال کرنے میں کسی قسم کی رو رعایت سے کام نہیں لیتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جو یہ نعمت ملی ہے میں اس وقت خاص طور پر ان سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

جامعۂ اُردو کا دفتر جاوید منزل سے قریب ہے جواب لکھ کر آپ وہاں بھیجدیں گے تو مجھے آسانی سے مل جائے گا۔ دفتر جامعہ کو اس کی ہدایت فرما دیجیے گا۔ شکریہ

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۷۷

اتوار ۶ر جولائی ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
مسودہ[1] ملا۔ شکریہ۔ آپ نے جو مشورے دیے ہیں اور جن مصالح کی بنا پر بعض عبارتیں قلم زد کردی ہیں (اور یہی میری خواہش اور فرمائش تھی) ان سے مجھے پورا اتفاق ہے۔ سوچتا ہوں اس بحث ہی کو کیوں اٹھاؤں جس پر یہ اوراق مشتمل ہیں۔ پھر خیال آتا ہے کہ غالب پر جو دو فلم تیار کیے گئے ہیں وہ بڑی اہم دستاویزیں ہیں اس اعتبار سے کہ ان سے عوام نسلاً بعد نسلٍ غالب کی سیرت و شخصیت کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہوتے رہیں گے اور وہ سب کیا دھرا اکارت جائے گا جو غالب کو بطریق شائستہ روشناس خلق کرنے کے لیے اب تک کیا جاتا رہا ہے۔
اس بنا پر ضروری ہو جاتا ہے کہ غالب شناس اپنا verdict

[1] غالب پر رشید صاحب کے نظام خطبے کا مسودہ جس کا ذکر پہلے خط میں ملتا ہے۔

ضروری ہے یہ کیا معلوم اس کی تائید ملے اور ایک سنگین غلط فہمی پھیلنے سے رک جائے سب سے بڑی رکاوٹ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ فاروقی صاحب پر اس بحث کا ردِ عمل اور ان کے ہاتھوں ان اوراق کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس لیے بھیج دیتا ہوں جو کچھ ہوگا وہ دیکھا جائے گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

مومن اور خدا کی طرف آپ نے جو اشارہ کیا ہے اس کا شکریہ۔ لیکن اے وائے ایسا مومن جیسا کہ میں ہوں اور اے وائے وہ خدا جس کو آپ نے Visualize کیا ہے!!

۷۸

۲۵۔۷۔۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

کل یکے بعد دیگرے آپ کے دونوں نوازش نامے ملے۔ اس سے اطمینان ہو گیا کہ ہم دونوں ۲۹ر کو ساتھ سفر کر سکیں گے۔ شام کے قریب تار والا میرے نام تار لایا جس میں فاروقی صاحب نے پروگرام کی تصدیق کی تھی اور وقت کو ½ ۱۱ سے بڑھا کر ۱۲ کر دیا تھا جب بالعموم اپر انڈیا دہلی پہنچتا ہے۔

تار والے نے آپ کے نام کا تار دے کر پوچھا کہ یہ صاحب تو ذاکر باغ میں ملے نہیں کیا کروں؟ میں سمجھ گیا کہ یہ تار میرے تار کا منشی ہے اس لیے اپنے پاس رکھ لیا اب بھیج رہا ہوں۔

دہلی لیٹ پہنچنے کی فکر نہ کیجیے۔ امید ہے وہ انتظار کریں گے۔ ایسا اکثر ہوا ہے۔ اور علی گڑھ سے دہلی آنے والوں کے لیے یہ رعایت رکھی جاتی ہے۔ آج میں نے اسحاقؔ[1] کو مطلع کر دیا ہے کہ ہم دونوں

---

[1] ملازم خاص ڈاکٹر ذاکر حسین۔

آپ انڈیا سے ۲۹ر کو دہلی پہنچ کر براہِ راست ٹیکسی سے یونیورسٹی چلے جائیں گے اور وہاں سے فارغ ہو کر ½۱ - ۲ بجے تک بیگم صاحبہ[1] کو سلام کرنے حاضر ہوں گے اور کھانا کھائیں گے۔ ڈی لکس کا ہم دونوں کے پاس ٹکٹ ہوگا۔ اس سے شام تک علی گڑھ واپس آجائیں گے۔ کسی اور اہتمام کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ کم سے کم میرے لیے ضروری تھا کہ بیگم صاحبہ کی خدمت میں حاضری دوں۔ کہیں اور کھانا کھانے سے بہرحال میں بیگم صاحبہ کے ہاں کھانا پسند کروں گا۔

امید ہے آپ کو یہ پروگرام پسند ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] بیگم ڈاکٹر ذاکر حسین۔

۷۹

یکشنبہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

مضمون حاضر ہے۔ ۴۔ ۵ صفحے یا کم اور لکھوں گا۔ چاہتا ہوں کہ اسے آپ بے لاگ طور پر دیکھیں اور جہاں جس قسم کا سقم نظر آئے اسے حتی الوسع خود ٹھیک کردیں یا مطلع فرمائیں۔ مضمون خاصا طویل ہو گیا ہے۔ آپ کو اختیار کامل ہے جہاں سے چاہیں جتنا چاہیں قلم زد کردیں۔ معیار یہ ہونا چاہیے کہ جتنا غیر معمولی طویل ہے اتنا ہی مناسب اور معقول بھی ہے یا نہیں۔

الفاظ، فقرے، اور عبارات کو بھی بہ نظر اصلاح دیکھیے گا۔ کہیں سہو ہو یا کسی اعتبار سے متوازن نہ رہا ہو تو اُسے اپنی صواب دید کے مطابق بے تکلف درست کردیجیے گا۔ ایک خیال ہے کہ میرا لکھا ہوا شاید کاتب سے نہ پڑھا جائے۔ اس طور پر تصحیح کا کام بڑا مشکل ہو جائے گا۔ اگر کوئی اسے خوش خط لکھ دے تو کاتب کے لیے بڑی آسانی ہو گی۔ اُجرت کا حساب بھیج دیں۔ ادا ہو جائے گا۔

میں اس مضمون کو لکھتے پڑھتے اکتا چکا ہوں۔ ایسا کیجیے کہ مجھے اب کم دیکھنا پڑے۔ مضمون کے ٹائیٹل کے بارے میں سوچ لیجیے گا۔ اس بارے میں کل کے رقعے میں عرض کر چکا ہوں۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۸۰

شنبہ ۹ راگست ۱۹۶۹ء

ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

عذرا[1] نے ڈھاکے سے دو عدد چٹائیاں بھیجیں۔ ایک میرے دوسرے کوکو[2] کے لیے۔ یہ وہاں کی گھریلو صنعت ہے۔ آپ اس نواح میں رہ چکے ہیں۔ اس لیے ان کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف ہوں گے۔

اسی دوران ایک عزیز نے کیرالا کی دوہری بُنی ہوئی چٹائی تحفے میں لا کردی۔ اس لیے ڈھاکے کی ایک چٹائی مدِ زائد میں آگئی۔ وہ آپ کے کوکو (جاوید میاں سلمہ اللہ تعالیٰ) کی نذر ہے۔ وہ چارپائی پر بچھا لیا کریں گے۔ ورنہ آپ اپنے بالاخانے پر اس کے لیے کوئی گنجائش نکال لیں گے۔ میرے نزدیک زنانے کی نشست گاہ میں گدے دار تخت پر اس کو مستقلاً ڈال رکھنا چاہیے۔ دیکھنے میں ستھری معلوم ہوگی

---

[1] عذرا رشید صدیقی۔ رشید صاحب کی دوسری صاحبزادی جن کی شادی ڈھاکے میں ہوئی تھی۔

[2] رشید صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے کی عرفیت

اور بیٹھے رہنے سے اور زیادہ چکنی اور چمک دار ہو جائے گی۔ اس کے ایک طرف کھردرے حصے پر بھی سُرخ پٹی لگا دی جائے تو نقص دور ہو جائے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ اچھے گلاب، اچھے قالین اور چینی کے اچھے ظروف جمع کرنے کا شوق تھا۔ کراکری چوری ہو گئی، گلابوں کا شوق کمال[1] کو منتقل ہو گیا۔ قالین کے بجائے اب چٹائیاں سمیٹنے لگا ہوں۔ خانہ آرائی کے لیے دیدۂ یعقوب کی سپیدی اور کیا جلوۂ سر کنعاں! بارش بڑے مزے کی ہو رہی ہے لیکن "عقل سے شرمساری" کے دن کہاں سے لائے جائیں!

مخلص
رشید احمد صدیقی

چٹائی کو کئی دن بچھائے رکھا کہ اس کی تہیں ہموار ہو جائیں۔ کچھ تو ہوئیں کچھ آپ کے یہاں ہو جائیں گی۔

---

[1] ڈاکٹر کمال الدین۔ رشید صاحب کے بھانجے۔

۸۱

۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

ہماری زبان کا پچھلے ہفتہ کا اداریہ[1] خوب تھا۔ ترتیب، مقدمات، عبارت، اور لب و لہجہ ہر اعتبار سے مبارکباد دیتا ہوں۔ خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی تو زبانی تہنیت پیش کروں گا۔

کل ڈاکٹر محمد حسن[2] کا خط آیا تھا وہ بھی اس اداریہ کے معترف ہیں۔ ام۔ او۔ ایل (M. O. L.) کے پرچوں کا تکملہ ہو گیا۔ آپ نے رجسٹری اور بیمہ پر جو صرف کیا اس کا بل کتنے کا تھا۔ غالباً میرے باب میں شامل ہوگا۔ ایسا ہے تو آپ رقم بتا دیجیے میں ادا کر دوں۔ مجھے میرے بل کے ساتھ وصول ہو جائے گا۔ امید ہے کام زیادہ ہوگا اور آپ پیش از بیش خوش۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] یکم اکتوبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ "سنسکرت اصطلاحات علمیہ اور اردو زبان"۔ ستمبر ۱۹۶۹ء پروفیسر آل احمد سرور، سکریٹری انجمن ترقی اردو اور ایڈیٹر ہماری زبان کے امریکہ چلے جانے کے بعد تقریباً نو ماہ کے لیے دونوں ذمہ داریاں مجھے تفویض ہوئیں۔ اگلے چند ماہ تک رشید صاحب کے جو بھی رقعات میرے پاس آتے رہے وہ ازراہِ شفقت افضل التفضیل کے صیغے میں میرے لکھے ہوئے اداریوں کے بارے میں بار بار تذکرہ کرتے رہے ہیں۔

[2] ڈاکٹر محمد حسن جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے۔

۸۲

۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ سلام شوق

ہماری زبان میں آپ کا تازہ ترین اداریہ[1] خوب ہے۔ جی خوش ہو گیا۔ کتنا مختصر پُر مغز اور دل کش۔ عبارت کیا۔ اشارت کیا، ادا کیا۔ اور یہ سب ہو (linguistic) ہونے کے باوجود۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ آپ لنگوئسٹ ہونے کو انشا پرداز ہونے کا منافی قرار دیتے ہیں۔ اس سے پہلے جتنے مضامین تھے وہ مبنی بر حقائق تھے۔ یہ ہمارے تہذیبی تقاضوں (غیرت و حمیت) کا اقرار اور اعلان ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے، کارے کردی۔

آنکھوں نے زچ کر رکھا ہے۔ اپنے مضمون[2] کے پہلے ۲۰۔ ۲۲ صفحے

---

[1] 'اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت' (اداریہ ۸ر نومبر ۱۹۶۹ء)

[2] رشید صاحب کے ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی "اردو ادب" کے لیے لکھے تھے جس کا میں اس زمانے میں قائم مقام مدیر تھا۔

کی کتابت دیکھ کر واپس کر چکا ہوں۔ کل بقیہ صفحات آگئے ہیں ان کو دیکھ رہا ہوں۔ کاغذ پر پیلی دھندلی روشنائی سے لکھی ہوئی گنجان خفی تحریر کا مقابلہ میری کمزور بینائی نہیں کر پاتی لیکن نہ دیکھوں تو کتابت کی بڑی فاحش غلطیاں راہ پا جائیں۔ کل تک واپس کر دوں گا۔ ہاں سات صفحات اور لکھ لیے ہیں آپ کی نظر سے گزر جائیں تو وہ بھی کاتب کے حوالے کر دیے جائیں۔

سب سے مشکل کام اس کا خاتمہ لکھنا ہے اب تک ذہن میں نہیں ہے خدا کرے وہ بھی اطمینان سے ہو جائے۔ آپ تو انجمن کی میٹنگ کے بعد واپس آئیں گے۔ کانگریس میں جو اختلال ہے۔ دہلی کے پنڈت اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

رمضان المبارک سے قطع نظر امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۸۳

۱۴ نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم
ان اوراق کو اور ملاحظہ فرما لیجیے اور کاتب کے حوالے کر دیجیے
جہاں کہیں کسی قسم کا سقم نظر آئے اسے بے تکلف دور یا درست
کر دیجیے ۔ شکر گذار ہوں گا، اس لیے کہ یہ آپ کا احسان ہوگا۔
اب سب سے مشکل حصہ رہ گیا ہے، یعنی اس کو ختم کیسے کروں۔
ہفتہ عشرہ سے سوچ رہا ہوں کہ دو ایک صفحے اور کیسے ہو جائیں۔
پریشانی یہ ہے کہ اب تک کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۸۴

۱۰ نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

پرسوں ہماری زبان میں آپ کا اداریہ (اُردو وسیلۂ تعلیم[1])
دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مدلل و مسلسل مضامین سب و شتم اور
جزع و فزع سے پاک اُردو کی حمایت میں کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔
ہماری زبان ہندوستان میں بالخصوص یو پی کے تمام اُردو اخبارات
کو جانا ہوگا۔ کہیں اور نہیں تو دعوت دہلی، سیاست کانپور،
قومی آواز لکھنؤ، اور عزائم لکھنؤ کو ضرور بھیجیے۔ الجمعیۃ کو تو جاتا ہے۔
حیدرآباد کے اخبارات کو بھی بھیجا جائے۔

اپنے مضمون کے ۷۔ ۸ اوراق کئی دن ہوئے بھیج چکا ہوں۔
امید ہے آپ نے ایک نظر ڈال کر کتابت کے لیے دے دیا ہوگا۔ اس
سے پہلے کاپیوں کی دو قسطیں تقریباً ۴۳ صفحات تصحیح کر کے براہِ راست
کاتب کے پاس بھیج دی تھیں۔ انھوں نے نظرِ ثانی کے لیے نہیں

---

[1] صحیح عنوان "اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم" (اداریہ ۱۵ نومبر ۱۹۶۹ء)

بھیجا۔ مضمون کا آخری صفحہ بھیجتا ہوں۔ اس کے پہلے حصّے میں "سوئی" لگے گی تاکہ واضح طور پر بقیہ سے علاحدہ اور نمایاں رہے۔ جیسا چاہتا تھا ویسا نہ ہوا۔ کیا کروں کیسے کیسے غیر متوقع مکروہات پیش آجایا کرتے ہیں اور وقت عزیز اور فرصتِ مغتنم ان کی نظر ہو جاتی ہے۔

آپ کے آفس سے متصل مہر الٰہی صاحب جنرل ایجوکیشن میں کام کیا کرتے تھے۔ کچھ دن ہوئے سنا تھا علیل ہو گئے۔ اب کیسے ہیں؟ عرصہ سے ان کا حال معلوم نہیں ہوا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۸۵

۲۰ر نومبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

کل ۱۲ بجے کے قریب میں نے اپنے مضمون کا پورا پروف (دیکھنے کے بعد) آپ کی خدمت میں ڈپارٹمنٹ بھیج دیا تھا۔ آپ کلاس لے رہے تھے اس لیے سکندر[۱] چپراسی کو دے آیا تھا امید ہے کہ مل گیا ہوگا۔ درخواست یہ تھی کہ ایک سرسری نظر ڈال لیں گے تو اطمینان ہو جائے گا۔ آنکھوں کی تکلیف کے سبب سے میں کاپی اچھی طرح دیکھ نہیں پاتا تھا۔ دوسری بات یہ عرض کرنے کی تھی کہ پریس والے "آف پرنٹ" کا خیال اور لحاظ رکھیں۔ یعنی میرے مضمون کے کتنے نسخے مجھے مل سکیں گے۔ یہ میرے یافتنی معاوضے کے حساب آجائے گا۔ نسخے جلد مل جائیں گے تو خوش ہوں گا۔ گو ان کی release اس وقت کروں گا جب "اُردو ادب" اچھی طرح شائع ہو جائے گا۔ اس کے مقررہ آداب یہی ہیں جن کو میں ملحوظ رکھوں گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[۱] انجمن ترقی اردو (ہند) کا سہ ماہی رسالہ، جس کا اس وقت قائم مقام مدیر تھا۔ رشید صاحب کے اس زمانے کے بیشتر مضامین اسی سہ ماہی میں شائع ہوتے تھے وہ ان کی طباعت و اشاعت کا بڑی بے چینی سے انتظار کرتے تھے اور مسلسل مراسلت کرتے تھے۔

۸۶

۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب
ایک دوست ڈھاکے سے آئے ہوئے ہیں۔ عید کے فوراً بعد واپس جائیں گے چاہتا ہوں کہ کچھ آف پرنٹس ڈھاکہ اور کراچی کے عزیزوں اور دوستوں کو بھیج دوں ورنہ بھیجنے کی کوئی اور صورت نہیں ہے۔ اُردو ادب کا سب سے پہلا مضمون میرا ہی ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ عید سے قبل مجھے آف پرنٹس مل جائیں۔ ظاہر ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اُردو ادب تمام وکمال شائع نہیں ہوا اور اس کا آف پرنٹ منظر عام پر آگیا اس لیے کہ ہندوستان اور پاکستان اپنی اپنی مطبوعات کے اعتبار سے اب water - light compartments بن گئے ہیں کسی کو خبر نہ ہوگی، کہ اردو ادب کس کو پہلے ملا اور کس کو بعد میں۔ آف پرنٹس کی لاگت میرے معاوضے میں وضع کی جائے گی۔ ایسا کیجیے کہ تین چوتھائی آف پرنٹس کی لاگت کے لے لیجیے اور ¼ اپنے دفتر کی امانت میں دے دیجیے تاکہ میں ان کو پتے لکھ کر دے دیا کروں۔

اور وہ محصول ڈاک ادا کر کے مختلف پتوں پر بھیج دیا کریں۔ اس میں مجھے بہت سہولت ہو گی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آف پرنٹس عید سے پہلے مل جائیں۔ کوئی دقت نہ ہونی چاہیے اس لیے مضمون تمام ضروری مراحل طے کر چکا ہے اب صرف چھپنے کا مرحلہ باقی ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے اور میری درخواست کے مطابق ایک نظر کاپیوں پر ڈال لی ہو گی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۰ - ۱۵ نسخے اقبال[1] کو بھی بھیج دوں گا۔ وہ بذریعہ ڈاک میرے دیے ہوئے پتوں کو کراچی اور دوسرے مقامات پر بھیج دیں گے۔

حفیظ الدین صاحب[2] کی جگہ جو صاحب انجمن کے دفتر کے انچارج ہوئے ہیں کا پورا نام کیا ہے؟

---

[1] رشید صاحب کے بڑے صاحبزادے۔ اقبال رشید صدیقی

[2] سابق اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)

۸۷

۱۴ر دسمبر ۱۹۶۹ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ آف پرنٹس کی طرف سے اطمینان ہوا۔ ذرا اس کا ضرور خیال رکھیے گا کہ عید کے دن یا اس سے قبل ہی مل جائیں ورنہ جانے والے صاحب اگر فوراً ہی عید بعد رخصت ہونے والے ہوئے تو وہ نسخے بھیجے نہ جاسکیں گے ——— آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اُردو رسم خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلہ پر اس جامعیت وقابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گزرا، پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب ولہجہ اپنے نزدیک یہ مضمون اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ اس سے آپ کی علمیت ہی نہیں شخصیت و شرافت کی بھی تصدیق ہوتی ہے۔ ایسی بے مثل خدمات کے لیے خدا آپ کو تا دیر صحت مند اور خوش وخرم رکھے۔ آمین

ان دنوں طبیعت خراب ہے باوجود انتہائی احتیاط کے۔ کیا کیجیے احتیاط سے کہیں ناگزیر سے نجات ہوتی ہے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۸۸

پنجشنبہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۹ء
یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
کل انجمن کے دفتر سے پندرہ نسخے آف پرنٹ کے مل گئے۔ آپ کے اس کرم کا شکر گزار ہوں۔ یہ نسخے مل نہ جاتے تو عزیزوں اور دوستوں کو جلد اور آسانی سے نہ بھیج سکتا جس کا افسوس رہتا۔
پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اُردو کی مرکزیت و لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کیے ہیں۔ اُردو کے معرکہ آرا مسائل پر اس اختصار اور جامعیت کے ساتھ ایسے خوب صورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی مضمون کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔
بار بار اس طرح کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے اور خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا بہرحال اولیٰ ہے۔ خدا مبارک کرے پیشگی عید کی تہنیت بھی۔ آپ کو اور متعلقین کو بھی۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۸۹

۱۸ اردسمبر ۱۹۶۹ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

ہماری زبان کی ۱۵ اردسمبر کی اشاعت میں آپ نے اداریہ[1] حسب معمول لکھا ہے۔ جب سے انجمن[2] کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے ہماری زبان کے اداریے ہر اعتبار سے وقیع ہونے لگے ہیں۔ زیرِ بحث مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر عام طور سے اچھے اچھے لکھنے والے جذباتی سطح یا سطحی جذبات سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ کام کی بات کم کہتے یا کہہ پاتے ہیں۔ اس لیے ایسے مضامین کا اثر کم ہوتا ہے، ان لوگوں پر بھی جو ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ آپ کی تحریر حقائق پر مبنی ہوتی ہے اور زبانوں کی ابتدا، عروج اور زوال سے متعلق جتنے لسانی، عمومی، تاریخی اور تہذیبی عوامل ہوتے ہیں ان پر بھی نظر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا اثر ایسے لوگوں پر ہوتا ہے جو اس زبان کے بولنے اور عزیز رکھنے والوں سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ عناد رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر اداریے

---

[1] اداریہ "گرو گرنتھ صاحب اور اردو" (۱۵ اردسمبر ۱۹۶۹ء)

[2] انجمن ترقی ہند (اردو) (علی گڑھ)

میں آپ نے پہلے ہی پیراگراف میں جتنی باتیں اسلام اور ہندومت کے اتصال سے جو فکری، لسانی اور مذہبی currents and cross- currents نمودار ہوئے جن کو شاعرانہ زبان میں کہیں گے کہ جو رشتۂ موج و کنار پیدا ہوا یعنی دم بہ دم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" پورا شعر آپ کو معلوم ہوگا یہ ہے۔

با من آویزش او الفت موج است کنار
دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من

کا جس ایجاز و اعجاز سے اظہار کر دیا ہے وہ کسی اور سے ممکن نہ تھا۔ اس پیراگراف[1] پر تو کتنے "خطبۂ صدارت" تصنیف کیے جا سکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ جب تک ہماری زبان آپ کی ادارت میں نکلتا ہے اسی طرح کے مسائل پر آپ وقتاً فوقتاً ایک سے ایک فکرانگیز مضامین لکھتے رہیں گے۔ اس طرح سے اُردو کے مسائل پر سوچنے کا ایک نیا اور صحت مند شعور پیدا ہوگا یہ آپ کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ ان مضامین کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیے[2]۔ آپ کے اداریوں کو لکھنؤ

---

[1] پیراگراف کا حوالہ دینا بھول گئے۔ غالباً مراد اس اداریے کے پہلے پیراگراف سے ہے جس میں اس تمدنی موج و کنار کا ذکر کیا ہے جس نے رام اور رحیم اور کعبہ و کاشی کے امتیازات مٹنے لگے" تھے۔

[2] رشید صاحب کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں ان کو "اردو کا المیہ" کے نام سے یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ (مرتبہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ)

کا اردو ہفت روزہ عزائم بھی شائع کرنے لگا ہے۔
کچھ نام بھیجے تھے مثلاً خورشید[1] عالم خاں، یوسف صاحب وغیرہ۔
اور درخواست کی تھی کہ ان کو ذاکر نمبر[2] بھیج دیجیے۔ نقوی[3] صاحب نے
بتایا کہ وہ میرے reprints بھیجنا چاہتے تھے۔ میں نے عرض کیا
reprints تو میرے ہیں۔ متذکرہ اصحاب کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ وہ
انجمن کی طرف سے پورا ذاکر نمبر پائیں۔ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کو
بھی ایک نمبر بھیج دیجیے گا۔ ذاکر صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے
تھے اور ڈاکٹر قدوائی بھی جان نثار کرتے تھے۔ مجھے اب تک
reprints کے چالیس نسخے مل چکے ہیں۔ دس بقیہ امانت دفتر میں جمع
ہیں، اس طرح مجھے کل پچاس نسخے موصول ہوئے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] بڑے داماد ڈاکٹر ذاکر حسین

[2] انجمن ترقی اُردو کے سہ ماہی 'اردو ادب' کا خاص نمبر

[3] ڈاکٹر سید نامر نقوی، اسسٹنٹ انجمن ترقی اُردو (ہند)۔ علی گڑھ

۹۰

۵ر جنوری ۱۹۷۰ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ[1] پیشِ نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی، لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دل نشیں انداز میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے اسے میں اظہار و ابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں۔ اس اداریے میں پہلا اور آخری پیراگراف حسنِ بیان اور خاتمۂ کلام میں بے مثل ہے۔ اعلیٰ انشار پردازی کا ایک بڑا مشکل اور نازک ہنر یہ ہے کہ مضمون شروع کیسے کیا جائے اور ختم کیوں کر ہو۔ اتفاق سے ہماری زبان کا ۲۲ر نومبر ۱۹۶۹ء کا اداریہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا جس کا عنوان ہے "ہندوستانی پر چار سبھا" سبھا کی وکالت آپ نے کتنی اچھی کی ہے۔ میرا مستقل خیال یہ ہے کہ آپ کے اداریوں کا آخر میں انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے۔ یہ طلبا، نیز ان لوگوں کے لیے بڑا مفید اور قیمتی مطالعہ ہوگا جو اُردو کے مسائل سے دلچسپی

---

[1] "اردو بنام ہندی"

رکھتے ہیں۔ اس سے اُردو کی تائید اور وکالت کرنے والوں کا لب و لہجہ اور بات کہنے کی سطح اونچی ہو جائے گی جس کا اُردو کے حق میں بڑا اچھا اثر ہوگا۔ ان اداریوں سے ام۔ اے اُردو کے امتحانات کے لیے بڑے اچھے پرچے بنائے جا سکتے ہیں۔ اس طرح امتحانات کے پرچوں کا معیار بڑھ جائے گا۔

میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ جب سے آپ نے ہماری زبان کی ادارت کا کام اپنے ذمہ لیا ہے آپ کی تحریر میں اردو سے متعلق امید و عزم کی وہ تازگی و تابناکی آگئی ہے جس کا میں ہمیشہ متمنی رہا اور آپ پس و پیش کرتے رہے۔ اکبر کا ایک شعر یاد رکھیے:

ہر چند بگولا مضطر ہے، اک جوش تو اس کے اندر ہے
اک رقص تو ہے، اک وجد تو ہے، بے چین سہی برباد سہی

اسی رقص اور وجد کے طفیل "زندہ ہیں اقوام" اور یہی ہے "رازِ تب تاب ملتِ عربی" ہم آپ ملت عربی سے مستثنیٰ سہی!

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۹۱

دوشنبہ، ۱۹ر جنوری ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

اس دفعہ آپ نے اترپردیش کے اردو پر احسانات کی قلعی خوب کھولی۔[1] اس پر ایک واقعہ یاد آتا ہے ممکن ہے آپ نے سُنا ہو۔ آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پہلے جون پور گرد و نواح میں آتش بازی کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ شہر سے متصل ایک پرانا بڑا اونچا قلعہ ہے فصیل سے ملا ہوا دریائے گومتی بہتا ہے۔ کرسمس کے زمانے میں صاحب کمشنر دورے پر آتے تھے۔ جون پور کے اکابر کی طرف سے قلعہ کی فصیل پر ضیافت کا انتظام ہوتا۔ حکام عالی شان وہاں سے دریا کے کنارے آتش بازی کا تماشا دیکھتے۔ آتش بازی ہی نہیں حکام رسی اور دوسرے بہت سے ناگفتہ بہ ہنر کے ایک فن کار تھے۔ جاڑے میں ننگ دھڑنگ مرض اور فاقے میں مبتلا آتش باز اپنی اپنی آتش بازی دکھاتے۔ حکام عالی مقام چیرز دیتے۔ فن کار صاحب

---

[1] اداریہ "اترپردیش سرکار کا اردو بورڈ" (۱۵ر جنوری ۱۹۷۰ء)

سوٹ بوٹ سے لیس آگے بڑھ کر کورنش بجا لاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ نقد انعام اور سرٹیفکٹ تو یہ لے جاتے۔ آتش باز بے چارے ویسے ہی محروم گھر واپس آجاتے۔ اردو مکاتب اور مدارس کو قائم کرانے اور چلانے والوں کا انجام اس رپورٹ سے یہی معلوم ہوا۔ خدا آپ کو آبرو سے رکھے اور تندرست کہ آپ نے اس پردے کو فاش کیا۔

یہ تحفہ[1] قبول فرمایئے۔ اس سے تندرستی میں یقیناً اضافہ ہوگا اور توانائی رہی تو آبرو پر کبھی آنچ نہ آئے گی۔ انشاءاللہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] غالباً گلاب یا موسمی پھولوں کا عطیہ۔ جو رشید صاحب اکثر بھیجا کرتے تھے۔

۹۲

۲۱ر جنوری ۱۹۷۰ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
تحریک (دہلی) میرے نام آیا کرتا ہے۔ گوپال متل اس کے اڈیٹر ہیں۔ کمیونسٹ اور کمیونزم کے دیرینہ مخالف۔ اُردو کے حق و حمایت میں جو بات صحیح سمجھتے ہیں اس کو ہمدردی سے اور برملا کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے بھی خیر طلب رہتے ہیں۔ تحریک کا حالیہ شمارہ بھیجتا ہوں۔ اس میں بمبئی کے اُردو کنونشن سے متعلق اڈیٹر کا نوٹ اور ہندی کے ایک اسکالر کا مضمون ہے۔ دونوں کو ایک نظر ملاحظہ فرما لیجیے۔ چاہتا ہوں کہ ہماری زبان میں آپ اس پر اپنے انداز کے دو تین اداریے لکھ دیں جس سے مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔ اس سے اُردو سے الفت رکھنے والوں کو تقویت پہنچے گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ رہبری ملے گی۔ اس موضوع پر آپ سے بہتر لکھنے والا دوسرا نہیں۔ ایسے مضمون کی بڑی ضرورت ہے اور ایسے ہی مضامین کی وقعت ہوگی۔ یوں بھی بمبئی کے اُردو کنونشن کا انجمن کو نوٹ لینا ضروری ہے۔

عجیب مصیبت ہے اردو اور اُردو سے متعلق ہر بات خواہ وہ علمی و تہذیبی

ہو یا جان و مال اور آبرو سے متعلق یتیم کا مال بن گئی ہے۔ ہر کس و
ناکس جس طرح چاہتا ہے طبع آزمائی اور دست درازی کرتا رہتا ہے۔
اس وقت ملک کی ایک بڑی جماعت کو اس فکر میں مبتلا دیکھتا ہوں
کہ کسی طرح مسلمان نامسلمان بنا دیے جائیں۔ ناگفتہ بہ کر دیے جائیں۔
جب سے کانگرس میں افتراق ہوا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد اور
نفرت کی مہم اور تیز ہو گئی ہے۔ اس وقت مسلمان ہی ایسا عنصر ہیں
جن کے خلاف تمام سیاسی پارٹیاں خواہ وہ ایک دوسرے سے کتنی
ہی مختلف اور متضاد کیوں نہ ہوں متحد ہو جائیں گی۔ مہاسبھا، جن سنگھ
اور آر۔ ایس کا وجود اور اہمیت تمام تر اسی بنا پر ہے۔ بہر حال یہ
ایک غیر متعلق بات تھی۔ دراصل آپ سے درخواست کرنا ہے کہ
"تحریک" کے متذکرہ مضمون کو سامنے رکھ کر یا اس کے حوالے سے
چند اداریے ہماری زبان میں لکھ دیجیے۔ ظاہر ہے آپ جو کچھ لکھیں
گے وہ فرقہ وارانہ، سیاسی اور صحافتی بالکل نہیں بلکہ تاریخی، تہذیبی
علمی اور واقعاتی ہوگا۔ آپ کے ان اداریوں کو اُردو اخبارات بالضرور
نقل کریں گے۔ صحیح صورتِ حال سامنے آئے گی اور سنجیدہ طریق کار
کو لوگ اپنائیں گے۔ خدا کرے آپ اس کے لیے کچھ وقت نکال سکیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۹۳

ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

۴ر فروری ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب مکرم، تسلیم

اس سے پہلے ایک خط بھیج چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن سے معلوم ہوا تھا کہ آپ ماڈریشن کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے اور انھیں کے ساتھ واپس آئے۔ آنے پر وہ خط ملا ہوگا۔

ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمارہ و اعداد کے فن یا فنون کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے۔ کتنا بلیغ یہ جملہ ہے۔ "جمہوریت اعداد و شمار کی بازی گری ہے[1]" آپ کے اداریے پڑھتا ہوں تو آتش کا یہ مصرع یاد آجاتا ہے ؎

آتش لکھی یہ تو نے غزل عاشقانہ کیا!

کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جب تک مردم شماری ختم نہ ہو جائے۔ ہماری زبان کے ایک مستقل د inset) (ان سٹ) میں زیرِ نظر اداریے کا آخری فقرہ درج ہوتا رہے جو شروع ہوتا ہے: "اگر اردو والے ...... سے

---

[1] اداریہ "۱۹۷۱ء کی مردم شماری اور اُردو"

اور ختم ہونا ہے اس پر .... وہ قلم ہوگا۔“ [۱]

یا اسی طرح یاد دہانی کا کوئی پیغام یا تاکید۔

آخر میں یہ نوٹ بھی ہو کہ اردو کو دوست رکھنے والے اخبار و رسائل سے درخواست ہے کہ وہ اس طرح کی یاد دہانی اپنے صفحات میں تا مردم شماری مسلسل شائع کرتے رہیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[۱] مکمل جملہ یہ ہے: ”اگر اردو والے اپنی مادری زبان اُردو لکھوانے میں تساہل یا گریز سے کام لیں گے تو کم از کم اگلے دس سال تک ان کے قامت کی درازی انھیں اعداد و شمار سے ناپی جائے گی۔ مردم شماری کو اصطلاحاً سر شماری بھی کہا گیا ہے۔ یاد رہے جو سر شمار نہیں ہوگا وہ قلم ہوگا۔“

۹۴

۱۱ر فروری ۱۹۷۰ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
کل ہماری زبان کا پرچہ وصول ہوا۔ اداریہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ چاہتا تھا اور جس کی بشارت آپ پہلے دے چکے تھے۔ آپ کا ذہن عنوان[1] کی طرف کیسا منتقل ہوا اس کی داد نہیں دے سکتا۔ بے مثل ہے۔ بڑھاپے کی جہاں اور بہت سی بدتوفیقی ہے، ایک اس کا برخود غلط بھی ہونا ہے۔ یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ذہن میں یہ بات آئی کہ یہ عنوان مجھے کیوں نہ سوجھا! خیر یہ ایک جملہ بطور اعتراف تھا۔ کہنا یہ تھا کہ اس ذہانت اور خوش مزاقی سے جس کا اظہار عنوان کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے۔ میں اس بات کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبہ اور معیار کا ہے۔ کبھی کبھی خیال آیا ہے کہ انجمن اور ہماری زبان کا جو چارج آپ کو ملا ہے اس میں اللہ کی کوئی بڑی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے۔ کتنا ہی گنہ گار رہا ہوں اللہ تعالیٰ

---

[1] اداریہ کا عنوان تھا "دل اور دے ان کو ...." (۲۸ر فروری ۱۹۷۰ء)

کا مجھ پر جو فضل رہا ہے اس کے طفیل تھوڑے بہت یقین کے ساتھ
خدا کے احسان کی دوسروں کو بشارت دے سکتا ہوں۔ اس لیے آپ
کے لیے چاہتا ہوں کہ اس طرح کی "چتاونی" (معلوم نہیں کہ اس
لفظ کا یہ محل ہے بھی یا نہیں) برابر شائع ہوتی رہے follow up کی
بڑی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم نہیں کہاں کہاں سے کیسے کیسے
راستے نکلتے ہیں۔ ہر چہار طرف جو ذلت اور ظلم پھیلا ہوا ہے اس کا نہ
کسی کو غم ہے نہ شرم۔ بس ایک کارِ خیر رہ گیا ہے کہ اقلّیت پر (جس کا
عملاً اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے) عرصۂ حیات تنگ سے تنگ ہوتا رہے۔
اور کتنی بڑی حماقت یہ ہے کہ اقلّیت کہہ دینے سے مسلمانوں پر ظلم
ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ آپ کے اداریے اب لکھنؤ کے موقر ہفت روزہ
عزائم میں بھی شائع ہونے لگے ہیں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۹۵

۱۴ار فروری ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

ہماری زبان کا حالیہ پرچہ نظر سے گزرا۔[ل] انگریزی کے بارے میں آپ
نے جن خیالات کا ذکر کیا ہے اس سے اختلاف نہیں۔ لیکن آپ کے
اس نظریے سے اتفاق کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ انگریزی
کی جگہ مقامی یا ریاستیں زبانیں لی گیں۔ انگریزی کے بین ریاستی یا
بین اقوامی زبان کی حیثیت کو مقامی زبانیں کیسے اختیار کرسکیں گی؟
انگریزی کی میں یہاں وکالت نہیں کررہا ہوں بلکہ جو صورت حال
ہے اس کا اظہار کرتا ہوں۔ انگریزی جاننے والوں کا پرتا شمار
واعداد کے اعتبار سے کتنا ہی ناقابلِ اعتبار کیوں نہ ہو اس کی
جامع حیثیات اس کی اتنی بڑی صفت ہے جو اس کی ہندوستان اور
عالمگیر دونوں حیثیات کو تمام دوسری حیثیات پر بھاری کردیتی ہے تعصب
تنگ نظری اور خود غرضی سے قطع نظر تہذیب اور علوم ہر اعتبار سے

ل اداریہ "انگریزی اور ہم" (۱۵ار فروری ۱۹۷۰ء)

ہم کو حقیقت پسندی کے جبر کا ہمت اور خلوص سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔
اس پر کبھی پھر مفصل ہو گی۔

M.O.L.[1] کے ماڈریشن کے سلسلے میں جو بل گیا ہے اس کا کیا حشر ہوا۔ اس سلسلے میں آپ کا ڈین دار ہوں 'ڈین دار' کے لفظ میں احتیاط مدنظر رہے۔ M.O.L. کے امتحانات تو ہو چکے۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] عثمانیہ یونیورسٹی کا ایک اُردو کا امتحان جس کے پرچوں کے ماڈریشن کے لیے رشید صاحب اور میں مقرر ہوئے تھے۔

۹۶

جمعہ ۱۳؍مارچ ۷۰ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
ہماری زبان ۸؍مارچ کا اداریہ "اردو! علاقائی یا دوسری سرکاری زبان" اس اعلیٰ پایے کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں۔ تنقیح، توضیح، زبان اور زور ہر اعتبار سے اتنے مختصر مضمون میں آپ نے جیسے explosive (آتشگیر) مسئلہ پر جس سنجیدگی اور بالغ نظری سے اظہار خیال کیا ہے وہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ آپ کا شمار ان چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں جو ہندوستان میں ان دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں۔

چاہتا ہوں کہ آپ کے اداریے یا ان کا خلاصہ ہندوستان کی بیشتر قابلِ لحاظ زبانوں (بشمول انگریزی) کے کالموں میں جگہ پائے۔ یہ اداریے ان تحریروں اور تقریروں سے کہیں زیادہ مفید اور موثر ہیں جو عام طور پر اخبارات میں شائع اور پلیٹ فارم سے سنی جایا کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں اس تجویز پر بھی غور فرمائیے کہ آئندہ مردم شماری میں اُردو کو مادری زبان لکھانے پر ہم کو اصرار کرنا چاہیے اور کسی طرح کے خوف

وخط کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ ان کو ہماری زبان میں متواتر یا تھوڑے تھوڑے وقفوں سے شائع کرتے رہنا چاہیے اور کسی اخبار کے کسی صفحے میں بطور inset اس کا اندراج ہو۔ عام نظروں کے سامنے یہ ہدایات مسلسل آتی رہیں گی تو اس کا خاطرخواہ اثر ہوسکتا۔ کیا تعجب اس کی تقلید دوسرے اردو اخبارات بھی کریں جو اُردو کے مسئلے پر ہمارے ہم نوا ہوں inset کی عبارت وقتًا فوقتًا بدلتی رہے تو اور اچھا ہوگا inset پوسٹ کارڈ سائز کا ہو اور تحریر نسبتًا جلی اور پرکشش وغیرہ۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۹۰

جمرات ۲۶ مارچ ۷۰ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

ہماری زبان کل ملا۔ اداریہ "زبان کا عروج وزوال" بہت اچھا ہے۔ ایسے اداریے ایک سے ایک اچھے آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ اس سے کتنوں کی ڈھارس بندھتی ہوگی اور میدان میں جمے رہنے کا حوصلہ پیدا ہوگا جیسا محسوس کرتا ہوں۔ یقین کریجیے کہ اچھے لوگ اسی طرح محسوس کرتے ہوں گے اس لیے کہ مجھ میں اس طرح کی مہارت تین چار پشتوں تک شریف اور ذی استعداد مسلمان نوجوانوں اور ادارہ کی اعلیٰ روایات میں بسر کرنے کے بعد پیدا ہوئی، اس لیے اس کے غلط ہونے کا امکان بہت کم ہے۔

لیڈری اور پلیڈری جیسے فقرے نہ لکھا کیجیے یہ آپس کی بے تکلف گفتگو میں، وہ بھی کبھی کبھی لطف دے جاتے ہیں۔ ایسی تحریروں میں بالخصوص جیسے کہ آپ کی ہوتی ہیں ان کا کوئی مقام نہیں۔ اس طرح کے فقرے مولانا ماجد صاحب کی اخباری تحریروں اور لب ولہجہ میں کھپ سکتے ہیں۔ زبان سے بے تکلفی برتنے یا اس کے آداب سے غافل ہو جانے میں یہ قباحت ہے کہ لکھنے کا معیار غیر شعوری طور پر گرنے لگتا ہے۔ دوسری طرف

محتاط رہنے اور ریاض کرنے سے اس کا معیار دیر میں اور دقت سے اونچا ہوتا ہے۔ کیا کیجیے اس دیس کی یہی ریت یا اس وادی کا یہی gradient ہے۔ بگاڑ یا سدھار کی طبعیات یا نفسیات یہی ہے۔ اس شمارے میں قیصر عثمانی کا مضمون اور اس کا رنگ و آہنگ کا معیار تو نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کبھی کبھی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض ذہنیتیں اسی اندازِ گفتگو کی مستحق ہوتی ہیں۔ کیا حرج ایوان ادب اور میدانِ مصاف ہی میں نہیں کبھی کبھی مخالفوں کا مقابلہ بازار میں بھی کر لیا جایا کرے۔

مسعود صاحب یہ سب تو ہو اور ہوتا ہی رہے گا۔ ایک درخواست ہے ایک نوجوان ہے نہایت ہی مفلوک الحال لیکن شائستہ، محنتی، دیانتدار تھوڑی بہت اُردو پڑھا ہوا، نان شبینہ کا محتاج ہے، آپ کی انجمن میں اس کو چپراسی وغیرہ کی کوئی جگہ مل جائے گی؟ ایسا ہو جاتا تو کتنا خوش اور شکر گزار ہوتا اتنا وہ نہیں جتنا میں!

سلاد اور لیموؤں کا بہت بہت شکریہ!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۹۸

بدھ، ۱۵ اپریل ۷۰ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب۔ تسلیم

ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں جو اداریہ "۔۔۔۔۔۔اپنے عمل کا حساب" کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ پچھلے ۲۰۔۲۲ سال میں اُردو دوستوں کی رفتار و روش کا بڑا حقیقت پسندانہ جائزہ ہے۔ ذاکر صاحب سے متعلق مایوسی و ملامت کی ایک زیریں لیکن واضح لہر بھی ملتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم نے یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور خود اپنی حیثیت سے جو کسی دوسری حیثیت سے کمتر نہ تھی اُردو وفد کی جو قیادت کی تھی وہ موقع و محل کے اعتبار سے مناسب اور ضروری تھی۔ دوسری طرف انھوں نے گورنر، نائب صدر اور صدر کی حیثیت سے اُردو کے لیے جو کچھ نہیں کیا وہ بھی مصلحت اور منصب دونوں اعتبار سے درست تھا۔ آئینی گورنر، نائب صدر اور صدر وہی کر سکتا ہے، کرے گا اور کرنا چاہیے جس کا متعلقہ کابینہ اس کا مشورہ دے۔ ایسے مسئلے میں جیسا کہ اُردو کا تھا وہ اپنی ذاتی، انفرادی یا کسی اور حیثیت کو کام میں نہیں لا سکتے تھے، کوئی ایسا اقدام بہت بڑے اور خطرناک حد تک سیاسی crisis کا موجب ہوتا اور صورتِ حال بد سے بدتر ہو جاتی۔ میرا خیال تو یہاں تک ہے کہ ایسا کرنے سے ملک کے

سنجیدہ اور صلح پسند عناصر کا تقویت پہنچنے کے بجائے اشرار کو قتل و غارت گری کا بہانہ مل جاتا۔ اس طرح اُردو کو نفع سے کہیں زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔ اردو سے زیادہ مسلمانوں کے ناموس جان اور مال کو۔ جیسا کہ آزادی کے ملنے کے بعد سے اب تک دیکھنے میں آرہا ہے۔ کچھ تعجب نہیں اُردو کو اس وقت جو تائید غیر مسلموں سے مل رہی ہے وہ معدوم نہیں تو متنزلزل ہوجاتی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں اقلیت کے حق میں یہ بڑا المناک حادثہ ہوتا۔

مسلمانوں کی غلط اندیشی، غلط روی یا سہل انگاری کے بارے میں آپ نے جو خیال ظاہر کیا ہے وہ بظاہر بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ہم آپ اس صورتِ حال کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتے کہ جہاں تک اُردو کی حمایت یا اُردو سے نامنصفی پر احتجاج کا تعلق ہے مسلمانوں کی پوزیشن یا strategy جارحانہ نہیں مدافعانہ ہے (منافقانہ یا نامنافقانہ بھی) مخالف قوتیں اقتدار، طاقت، تعداد اور تاریخ غرض وہ تمام حربے جو ہماری زبان، مذہب، تہذیب اور معاشرت کو مسخ یا معدوم کر دینے کے لیے برسرِ کار لائے جاسکتے ہیں۔ بڑی دھاندلی، بے باکی اور سفاکی سے کام میں لائے جارہے ہیں۔

آزادی کے فوراً بعد سے مسلمان کبھی اُردو کے اپنے ادارے (تعلیم گاہیں) قائم کرنے کے لیے بھاگے پھرے ہیں اور کبھی ہندی کی طرف دوڑے ہیں کہ کہیں ان کے بچے ہندی سے ناآشنا رہ کر ہندی کی دنیا میں پیچھے رہ کر پامال نہ ہوجائیں۔ ہندی سیکھنے کی طرف سے کچھ مطمئن ہوتے ہیں تو معاً اُردو کا خیال آتا ہے اور بے اختیار دوڑے ہوئے واپس آتے ہیں کہ اس سنگلاخ زمین کو کہاں تک کار آمد بنا سکیں۔ آپ

سعیٔ صفا و مروہ کی روایت سے واقف ہوں گے کہ جو ارکانِ حج کا بڑا اہم رکن ہے۔ یعنی کس طرح حضرت اسماعیلؑ کی ولادت پر ان کی ماں حضرت ہاجرہ پانی کی تلاش میں بے اختیار بھاگتی ہوئی دور تک چلی جاتیں۔ مگر حضرت اسماعیلؑ کی تنہائی، تشنگی اور تحفظ کا خیال آتا تو بے قرار و بے اختیار ان کی خبر گیری کے لیے واپس آتیں۔ اُردو کے تحفظ کی تنظیم اور ہندی کی بالادستی کی تنظیم جن فرقوں کے ہاتھ میں ہے ان سے آپ واقف ہیں۔ مسلمان انہی دونوں صفا و مروہ کے درمیان بھاگتے نہ پھریں تو کیا کریں۔ حضرت اسماعیلؑ کے ایڑی رگڑنے سے آبِ صافی کا چشمہ ابل پڑا تھا دیکھیے اُردو کے پاؤں یا ناک رگڑنے سے کیا برآمد ہوتا ہے۔

آزادی کے بعد سے اُردو والوں پر جو مصیبت اور ذمہ داری آئی ہے اس کا ہم سب کو احساس ہے۔ اس لیے عام مسلمانوں کے جس رویہ کی آپ نے شکایت کی ہے وہ قابل معافی ہو یا نہیں سمجھ میں آتی ہے۔ اُردو کے چھوٹے بڑے ادارے قائم کرنے کے لیے جس طرح ہم کوشش کر رہے ہیں وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ بدلے ہوئے حالات اور "بانذک حیلہ" مشتعل ہو جانے والی فضا کو دیکھتے ہوئے قابلِ لحاظ بھی نہیں ہے۔ جیسی مجبوریوں اور محرومیوں کا سامنا ہے وہ معمولی نہیں ہے۔ ایسا کرنا مناسب نہ ہوگا کہ جب تک اُردو میڈیم کی چھوٹی بڑی تعلیم گاہیں قائم نہ ہو جائیں مسلمان بچے بچیاں جہاں کی تہاں رہنے دی جائیں۔ اُردو کے لیے ساری سہولتیں فراہم کر دی جائیں جب بھی مسلمان لڑکوں لڑکیوں کو ہندی نہیں علاقائی زبان میں بھی مہارت

مہارت پیدا کرنی پڑے گی۔ سہ لسانی فارمولے میں اگر اردو کی تعلیم کی گنجائش نہیں نکلتی یا گنجائش نکلنے نہیں دی جاتی تو جن کی مادری زبان اُردو ہے ان کو اپنے بچوں کے لیے اُردو کی تعلیم کا بندوبست اپنے طور پر کرنا پڑے گا۔ یہ پوزیشن کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو لازم مفر نہیں قیمت چاہے جتنی دینی پڑے!

(بقول غالبؔ ...... یہ عریضہ چھاپنے کے لیے نہیں چھپانے کے لیے ہے)

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۹۹

۱۵ اپریل ۷۰ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

یہ خط اور پھول صبح سے رکھے ہوئے تھے کوئی لے جانے والا نہ ملا۔ آج کل ہمارے یہاں خانساماں اور مالی دونوں من مانی چھٹی پر ہیں۔ ہماری زبان کا اسپیشل نمبر[1] تھوڑی دیر ہوئی ملا۔ واقعی ایسا ہی ہے بلکہ اس سے بڑھا ہوا جتنا آپ نے بتایا تھا۔ آزادی کے بعد کی اردو کا یہ کاغذی پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا۔ خدا آپ کو اجرِ نیک اور ہم سب کو آپ کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی عقل اور ہمت دے۔ بقیہ پھر کبھی عرض کروں گا۔ انشاءاللہ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

---

[1] ۱۵ اپریل ۷۰ء جس میں اداریہ "اُردو کا محضرنامہ" شائع ہوا تھا۔

۱۰۰

۲۴ر اپریل ۶۰ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

کل شام خط ملا۔ پڑھ کر نادم بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ سمجھا تھا کہ بمصداقِ "عطائے تو بہ لقائے تو" بہ عمل کر رہا ہوں، لیکن ہوا یہ کہ کس کس کا لباس آپ کی قامت پر چست یا تنگ ہوا کیا۔ ایسے میں غالب "نامہ بر سے کیا کہیے" کہہ کر یکسو ہو گئے تھے۔ آپ بھی جامعہ کے پوربی پٹھان[1] یا پوربیے پٹھان کو معاف کر دیجیے میں اس سے بازپرس کروں گا۔ اپنی یا نامہ بر کی فروگذاشت کی تلافی بہ ہزشکل میں انشاءاللہ چند دنوں میں کر سکوں گا۔ آج شعبے میں آپ کس وقت ۱۵ ۔ ۲۰ منٹ کے لیے کم معروف ہوں گے تاکہ اسی وقت مل سکوں۔ ممکن ہے موسم کی آڑ پکڑ کے نہ بھی آؤں۔ لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ اس لیے کہ موسم کی آڑ یا پناہ پکڑنا ان دنوں سب سے خطرناک ہے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ اُردو کے ایک پوربی پٹھان چپراسی جو پہلوان کے نام سے معروف تھے۔

۱۰۱

۱۰ر اپریل ۱۹۷۰ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

ہماری زبان میں "ایک ادارہ ایک زبان"[1] کے عنوان سے ایک اداریہ پیشِ نظر ہے۔ علی گڑھ کا جو مسلک سرسیدؒ سے لے کر رہا ہے اس کے بارے میں آپ نے جس فاضلانہ اور فن کارانہ انداز سے اظہارِ خیال کیا ہے اس کی داد غالبؔ کی زبان میں اس شعر سے دی جا سکتی ہے جس سے انھوں نے اپنے کلام کی داد دی ہے ؎

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل!

علی گڑھ میں اردو کے ساتھ جو سلوک اب تک وقتاً فوقتاً ہوتا رہا وہ مختلف محرکات و مقتضیات کی بنا پر ہوا۔ سرسیدؒ نے اردو کی حمایت انھی محرکات کی بنا پر ابتدائے کار سے ورنہ کیولر یونیورسٹی کے منصوبے سے دست بردار ہونے تک کی۔ غدر کے بعد جو شکست و ریخت اور درد و بست ہوئی اس میں مسلمان گھاٹے میں رہے۔ معیشت، تجارت، سیاست

---

[1] ۱۲ر اپریل ۱۹۷۰ء

تعلیم، تنظیم ہر اعتبار سے ابنائے وطن کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ در ماندہ و پسماندہ اور ان سب پر مستزاد انگریز اور انگریزی حکومت کی نظر میں مقہور و مغضوب تھے۔ مسلمانوں کی آبادکاری کے لیے سرسید ہر سطح پر ہر جہت میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ جیسی تشویشناک ایمرجنسی میں انھوں نے مسلمانوں کو پایا تھا اس میں کسی اسکیم یا پروگرام کے ترک و قبول کا مسئلہ طویل میعادی نہیں ہوتا بلکہ بدلتے ہوئے حالات و حوادث کے پیشِ نظر جلد جلد بدلتا رہتا ہے۔ سرسید نے ورناکیولر یونیورسٹی کا مسئلہ تقاضائے وقت سے ترک کر دیا تھا اس لیے کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی طرزِ فکر کو جلد سے جلد مسلمانوں میں مقبول بنانا چاہتے تھے۔ اردو یونیورسٹی ان مصالح اور مقاصد کو پورا نہیں کر سکتی تھی جن کا پورا کیا جانا لازم آتا تھا۔ تقدیر کے جن کن فیکون کے دوراہے پر سرسید کھڑے تھے اس میں انگریزی کو اردو پر ترجیح دینے میں وہ یقیناً حق بجانب تھے۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ وہ صورتِ حال آج تک قائم ہے۔ سوا اس کے کہ سرسید کے بعد بھی علی گڑھ میں اُردو یونیورسٹی قائم نہیں ہوئی یا اردو کو وسیلۂ تعلیم نہیں بنایا گیا، اُردو کی ترقی میں علی گڑھ نے قابلِ فخر نہیں تو قابلِ اطمینان حد تک ضرور کوشش کی ہے۔ میرا تو یہاں تک خیال ہے کہ علی گڑھ نے اُردو کے لیے جو کچھ کیا اس کو بہت آسانی کے ساتھ ان خدمات کے مقابلے میں رکھ سکتے ہیں جو حیدرآباد نے انجام دیں ــــــ اور حیدرآباد حکومتِ ہند کے بعد ہندوستان کی سب سے بڑی حکومت تھی۔

علی گڑھ یونیورسٹی کو اُردو یونیورسٹی بنانے میں جو موانع یا نقصانات

یم ملک سے پہلے تھے اس سے بدرجہا زیادہ اب ہیں اور آپ
ازہ کرسکتے ہوں گے۔ آزادی کے بعد اردو کے ساتھ جو سلوک ہر سطح
جس بے باکی اور بے رحمی سے مسلسل کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے۔
ن کے پیشِ نظر آج موجودہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا کیا حشر ہوتا
ر کیسی تباہی آئی ہوئی ہوتی۔ اگر جامعہ عثمانیہ کی طرح اردو یونیورسٹی
تی۔ آپ تو واقف ہیں ابنائے وطن مسلم یونیورسٹی کے مکمل اور معیاری
یورسٹی ہونے کے باوجود یہی پروپگنڈا کرتے رہے کہ اس کا اسٹینڈرڈ
را ہوا ہے!! جیسے فرسٹ کلاس انگریزی یونیورسٹی ہوتے ہوئے
ہی مسلم یونیورسٹی "ورناکیولر" تھی۔ ہم میں سے کس کو خیال تھا کہ
لک تقسیم ہوگا اور نوبت یہاں تک پہنچے گی کہ مسلمان اور ان کے
دارے کس مپرسی اور کس مخز ہو جائیں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ہم جو ایک
وسرے پر طرح طرح کے الزام دھرتے اور پیچ و تاب کھاتے رہتے
یں اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ آزادی یوں ملے گی، ملک
س طرح تقسیم ہوگا۔ مسلمانوں کے ادارے، ان کی زبان، ان کے
ذہبی و معاشرتی مسائل، ان کی جان، مال، آبرو کا وہ حال ہوگا
جو دیکھنے میں آرہا ہے۔ کس کو معلوم تھا کہ آزادی کے بعد ہندوستان
کے مسلمان اور جن چیزوں کو وہ عزیز رکھتے ہیں اس حالت کو پہنچ
جائیں گے یا پہنچا دیے جائیں گے جن میں وہ مبتلا ہیں۔ مسلم یونیورسٹی
اس وقت قائم ہی اس بنا پر ہے کہ وہ ورناکیولر یونیورسٹی نہیں تھی اگر
ملک تقسیم نہ ہوا ہوتا تو صورتِ حال بالکل جداگانہ ہوتی ——— یہاں
تک کہ جو چیزیں آج خطرے میں نظر آتی ہیں وہ اس وقت سب سے

زیادہ محفوظ، معتبر اور دانش مندانہ سمجھی جاتی ہیں۔ رہا یہ کہ ہم سب وہ باتیں اب کیوں نہیں کرتے۔ اس کے بارے میں کہنا یہ ہے کہ اسی طرح جس طرح حضرت ہاجرہ کرتی تھیں جب وادی غیر ذی ذرع میں حضرت اسماعیلؑ کی ولادت ہوئی تھی ــــــــ آپ نے کالج کے ترانے کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں ملامت اور استہزا کی جھلک آگئی ہے ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ ترانہ طلبا کا جوش دروں ہے اور نیک علامت ہے۔ معلم کو اپنے شاگردوں کے اس طرح کے خیالات سے بدگمان یا بدحظ نہ ہونا چاہیے۔

میری باتوں سے آزردہ نہ ہو جیئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ موقع آئے گا تو آپ جاوید سے اسی طرح کی باتیں کریں گے۔ اخبار تو کوئی لے گیا۔ مضمون کا صرف مبہم سا خیال رہ گیا ہے۔ ممکن ہے آپ نے کچھ کہا ہو میں نادانستگی میں کچھ کہہ گیا ہوں۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۰۲

۱۸ مئی ۸۰ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

اڑتی سی ایک خبر ہے زبانی پٹھانؔ کے۔ کہ آپ واپس تشریف لائے۔ سیمینار
کی مختصر روئداد جو بمنزلہ خبر کے تھی اخبارات میں دیکھی۔ آپ سے انشاء اللہ
ور کسی وقت تفصیل معلوم ہو گی۔ امید ہے کہ وقت اچھا گزرا ہوگا۔

آپ کے دواداریوں پر میں نے بطور حاشیہ کچھ لکھ بھیجا تھا۔ اگر ان کو
پ نے تلف کر دیا ہو تو فبہا۔ لیکن اگر رکھ لیا ہو یا اس کی ایک بات ذہن میں
حفوظ رہ گئی ہو تو اس کی تصحیح کر لیجیے گا۔ میں نے لکھا ہے کہ حضرت اسمٰعیلؑ
بی بی سارہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے حالاں کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ
بی بی ہاجرہؓ تھیں۔

مقابلے کا کیا رہا۔ دوسری طرف سے گفتگو تو ہے لیکن پائے سخن یا جائے
سخن درمیان نہیں کا انداز ہے۔ پس چہ باید کرد۔

کشمیر کے موسم کا درد تہہ جام تو آپ لائے، ہے غضب "ہائے ہائے"
اور صرفِ نظر کا بھی سامان رہا؟

مخلص
رشید احمد صدیقی

سارہ اور ہاجرہ کی تصدیق آپ خود بھی کر لیجیے گا۔ شکریہ

۱۰۳

۸ر جون ۷۰ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

تکلیف فرمائی کا بہت بہت شکریہ۔ اسے ایک نظر دیکھ جائیے تو ٹائپ کرا دوں۔ کیا معلوم تھا کہ آپ کی طبیعت ناساز تھی لیکن اس کی خوشی ہے کہ میرے دعا مانگنے سے پہلے آپ صحتیاب ہو گئے جیسے خدا نے میری دعا کو anticipate کر کے آپ کو اچھا کر دیا ہو! کیا ایسے برگزیدہ یا برخود غلط بندے نہ ہوتے ہوں گے؟!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۰۴

۱۸؍ جون ۷۶ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
گئودان اور اس کے ترجمے سے متعلق ہماری زبان کے پچھلے شمارہ میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے اور حالیہ اشاعت میں اس کی مزید توضیح کی ہے وہ میں نے بہت شوق سے پڑھا اور اتنا ہی خوش ہوا۔ گئودان کے اُردو اور ہندی ٹیکسٹ میں diction کا جو فرق ہے اور ایک موقع پر کاف بیانیہ کی جس بلاغت کی آپ نے نشان دہی کی ہے وہ لاجواب ہے۔ اُردو کے لسانی ہی نہیں ادبی و علمی مسائل کی بحث کے اونچے معیار کا التزام رکھتے ہوئے آپ گفتگو کو جس حسن ادا سے ختم کرتے ہیں وہ بھی آپ ہی کا حصہ ہے۔ آج کے مضمون کا ایسا ہی ہوا ہے۔ کوئی بھی جو اس سے پچاس فی صدی درجے کا اختتامیہ لکھتا تو مبارکباد کا مستحق ہوتا۔
امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

جنرل ایجوکیشن کے مبین صاحب[1] ملنے آئے تھے انھوں نے آپ کے یہاں کسی اسامی کے لیے درخواست دی ہے اور مجھے بطور ریفری لکھا دیا ہے۔ میں ان کو بہت دنوں سے اور بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑے محنتی، بردبار، ذہین اور وفا شعار ہیں۔ آپ ان سے اور ان کے کام سے بہت خوش ہوں گے۔ ساتھ یا ماتحتی میں کام کرنے والوں کو جن صفات کا عامل ہونا چاہیئے وہ ان میں کافی ملتی ہیں۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] مبین احمد خاں، موجودہ لکچرر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۰۵

۱۲؍اکتوبر ۷۶ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

احسان آپ کے یہاں سے دعوت سے واپس آئے تو آج کل کا جون کا شمارہ اور ہماری زبان کے وہ مضامین بھی لائے جو آپ نے اردو کے مسئلہ پر اپنے عہد ادارت میں وقتاً فوقتاً لکھے تھے۔ اول الذکر کا مجھے علم نہ تھا اس لیے کہ آج کل میرے پاس نہیں آتا۔ آپ نے خوب کیا کہ اپنی ادارتی تحریروں کی فائیل احسان کو پڑھنے کے لیے دیدی۔ یہ مضامین ان کو ہمیشہ inspiration دیں گے اور وہ اس سے خاطر خواہ استفادہ کر سکیں گے۔

"غبارِ کارواں"[1] کے تحت آپ کا مضمون بہت پسند آیا۔ آپ بیتی یا اپنا اعمال نامہ لکھنے کا یہ بڑا اچھا تقریباً بے مثل نمونہ ہے۔ کیسے کیسے اخلاقی واکتسابی صفات اور ہنر اس طرح کے مضامین لکھنے میں درکار ہوتے ہیں اس کا اندازہ مضمون پڑھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ مجھے تعجب تھا کہ آپ کی تحریر میں فلسفیانہ گہرائی اور حالات وحوادث سے اس کی

---

[1] یہ خود نوشت سوانحی خاکوں کا سلسلہ تھا جس کے تحت مدیر آج کل نے مختلف حضرات سے مضامین لکھوائے تھے۔

تطبیق کہاں سے آئی۔ پھر یہ کہ اس میں فلسفہ کی خشکی کا نام نہیں۔
تو احسان نے بتایا اور مجھے یاد آگیا کہ آپ نے اُردو Ph.D کرنے
کے بعد شریف صاحب[1] مرحوم کے ساتھ فلسفہ کا مطالعہ شروع کر دیا تھا
اس کے بعد پروگرام بدل گیا اور آپ ہندوستان سے باہر چلے گئے۔
دوسرے یہ کہ آپ کی اور عابد صاحب[2] کی تحریروں میں حشو وزوائد کا
نام نہیں ہوتا۔ عابد صاحب کے مضمون بالعموم علمی ہوتے ہیں اس
میں حشو وزوائد سے بچنا آسان ہے لیکن ایسے مضامین جیسے کہ آپ
کے ہوتے ہیں ان میں قلم کی رعنائیوں کو قائم رکھتے ہوئے زوائد سے
بچنا آسان نہیں ہے musings and jottings میں fade out کے مراحل
قدم قدم پر پیش آتے ہیں اس لیے مصنف vague, hazy and
indifferent ہو جاتا ہے۔ آپ کے ہاں یہ بالکل نہیں ہے اور یہ آپ
کا کارنامہ ہے۔ آپ نے اپنے کو پیش کرنے میں عہدِ طفولیت کے
جو محرکات و موثرات لکھے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ آج سے پچاس
سال پہلے کے متوسط مسلمان شریف گھرانوں کا یہی نقشہ تھا۔ آپ کی
تحریر سے وہ زمانہ وہ لوگ یاد آگئے اور دیر تک یاد آتے رہے۔
ذاکر صاحب پر آپ نے چند سطروں میں جو کچھ اور جس طرح لکھ دیا
ہے وہ اوروں کے طویل مضامین پر بھاری ہے۔ کیسی اور کتنی عجیب
بات ہے کہ آپ کے مضمون کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے آپ کو اور آپ کی تحریر

---

[1] پروفیسر محمد شریف صدر شعبۂ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

[2] ڈاکٹر سید عابد حسین

کو بھول گیا۔ صرف مرحوم یاد آتے رہے۔

اس کا بھی تعجب ہے کہ آپ کے مضمون کا یہ حصہ پڑھتے ہوئے آپ کو اور آپ کی زبان سے جو کچھ سنتا رہا ہوں اس سے مختلف اس مضمون میں پایا۔ یہ فن کار کی شرافت اور عظمت کی نشانی ہے۔ مبارک ہو۔

دیر تک لکھتے رہنے سے تھک جاتا ہوں۔ بڑھاپے میں جب قویٰ جواب دینے لگے ہوں، لیکن خیال اور فکر کی طغیانی بڑھنے لگی ہو یہ صورتِ حال بڑی المناک ہوتی ہے۔ دست و پایم بشکستند و کمانم دادند! رہے نام اللہ کا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۰۶

۲۷ر جنوری ۷۱ء

ڈاکٹر صاحب مکرم۔ آداب

معلوم نہیں آپ کا مزاج اب کیسا ہے۔ موسم اعتدال پر نہیں ہے۔ اس لیے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اب بھی تکلیف باقی نہ ہو۔ ۱۰ روز سے میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ اس لیے دہلی کا جانا ملتوی کرنا پڑا۔

خواجہ صاحب کو دلی تار دیدیا ہے کہ جمعہ کے دن مذاکرے میں شریک نہیں ہو سکوں گا۔ ایسا ہی اگر معذور نہ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

میں نے جو مضمون بھیجا ہے اس کی ایسی جلدی نہیں۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ کی نظر سے گزر جائے پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ اس لیے کہ بہت سی ایسی باتیں محض بحث آ گئی ہیں جو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں بالخصوص دکنی زبان۔ دکن کی تاریخ اور دربار دکن کے احوال۔

میری دشواری یہ تھی کہ کلام میں[1] مطلقاً جان نہیں ہے۔ کس بات کو

---

[1] کلیات اردو حضور نظام میر عثمان علی خاں جو رشید صاحب کے پاس حیدر آباد سے پیش لفظ کے لیے بھیجی گئی تھی۔

سراہا جائے اور سراہا بھی جائے تو کب تک۔ ہر طرف کی مثالیں کثرت سے دینی پڑیں تاکہ کچھ توستائش کا پہلو کہیں سے نمایاں ہو جائے۔ کچھ ایسی باتیں لکھنی پڑیں جو کلام سے نہیں صاحب کلام سے متعلق ہیں تاکہ موصوف ہی کا نام اونچا ہو جائے۔ کہیں کہیں فن پر کچھ باتیں آگئی ہیں۔ بہر حال جو کچھ سمجھ سکا کر دیا۔ بے ضرورت اجزاء کو حذف کر دیجیے گا۔ کہیں آپ کو ستائش کا پہلو مل جائے تو اضافہ فرما دیجیے گا مگر سب سے مقدم یہ ہے کہ آپ اچھے ہو گئے ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۰۷

۱۸ فروری ۷۱ء

مسعود صاحب

اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ مرسلہ اوراق ملے۔ ان ریشم کے ٹکڑوں پر ٹاٹ کے پیوند کیسے لگاؤں اور کہاں کہاں لگاؤں متن اور حواشی میں جابجا تضاد ملتا ہے اس کا ہموار کرنا آسان نہیں ہے۔

ایک مدت سے کراچی اور ڈھاکہ سے بچوں کی خیر و عافیت کا کوئی خط نہیں آیا اس سے بڑے تردد میں رہنے لگا ہوں کام کرنے میں جی نہیں لگتا، کچھ کرنے لگتا ہوں تو جلد تھک جاتا ہوں۔

آپ فاروقی صاحب کو کہہ دیں کہ وہ اپنا مضمون (رسم خط پر) بھیج دیں، میرا حاضر ہے جب چاہیئے گا منگا لیجیے گا۔

میرا وہ خط تو ملا ہو گا جو پرووائس چانسلر[1] کے خط کی پشت پر

---

[1] جناب فضل الرحمٰن صاحب

میں نے لکھ دیا تھا۔ بلگرامی صاحب[1] آپ کے ساتھ کام کریں گے یا ان کا دفتر پرووائس چانسلر صاحب کی کوٹھی میں حسب دستور رہے گا۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی ادارت میں پہلا شمارہ[2] نکلے تو اس میں رسم خط کے مسئلے پر آپ کا ایک مضمون ضرور ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] شریف الحسن بلگرامی صاحب جو اس وقت فکر و نظر کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔

[2] اشارہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سہ ماہی تحقیقی مجلہ فکر و نظر کی جانب ہے جس کا میں امسال ایڈیٹر مقرر ہوا تھا۔

۱۰۸

جمعہ ۱۲/اپریل ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

یکم اپریل کے ہماری زبان میں آپ کا مضمون پروفیسر سروری مرحوم پر نظر سے گذرا۔ بہت پسند آیا اور متاثر ہوا۔ اتنے سے مختصر مضمون میں آپ نے وہ تمام حقوق ادا کر دیے جو مرحوم کی طرف سے آپ پر اور خود آپ کی طرف سے آپ پر عائد ہوتے تھے! یہ ایک غیر معمولی بات ہے جو کہیں کم دیکھنے میں آتی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ میں اس طرح کی صلاحیت اور قدرت ہمیشہ بیدار اور بالیدہ رکھے۔ آمین۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۰۹

۱۵ اپریل ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

تقریباً دو ہفتے ہوئے ایک خط لکھا تھا جس کا جواب نہ آیا۔ گو اس میں ایسی ضروری باتیں بھی نہ تھیں جس کا جواب مطلوب تھا۔ دریافت یہ کیا تھا کہ رسم خط والے مضمون کے کچھ reprints مل سکیں گے یا نہیں؟ انہی شرائط پر جن پر ذاکر صاحب والے مضمون کے ملے تھے۔ دوسرے یہ کہ فکر و نظر کے دوسرے شمارے میں ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم والے مضمون کے لیے کم و بیش ۳۰ صفحات کی گنجائش نکل سکے گی یا نہیں؟ چاہتا ہوں کہ ایک ہی شمارے میں نکل جائے۔ بالاقساط شائع کرنا ٹھیک نہ ہوگا۔

انجمن ترقی اُردو کے کن چار ناموں کو ووٹ دیئے جائیں۔ یوسف صاحب، نظامی صاحب، محمود الٰہی صاحب اور حبیب الرحمٰن صاحب کے نو امیدواروں میں سے کسی ایک کو دینا چاہتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ آج شام چھ بجے علیم صاحب سے جامعہ اُردو سے متعلق کچھ باتوں پر گفتگو کرنی ہے۔ امید ہے آپ سب مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۱۰

۲۸ مئی ۷۱ء

مسعود صاحب محترم ۔ تسلیم

آج انجمن ترقی اُردو کی ادبی اور عاملہ کی میٹنگ ½ ۸ بجے سے غالباً ساڑھے بارہ ایک بجے تک ہو۔ میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ اب اس طرح کے اجتماع سے تھک اور اکتا چکا ہوں۔ کل شام مالک رام صاحب سے ملاقات ہوئی ان کی رائے ہے اور مجھے بھی اتفاق ہے کہ اس سال جامعہ کے کنوکیشن کو ڈاکٹر سید عابد حسین (جامعہ ملیہ دہلی) خطاب فرمائیں۔ مالک رام صاحب سے کہہ دیا ہے کہ وہ عابد صاحب سے عرض کردیں گے کہ اربابِ جامعہ کی یہ درخواست ہے۔ امید ہے آپ کو بھی اتفاق ہوگا۔ مالک رام صاحب کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ انجمن ترقی اردو کی خدمات کو قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے اس کا اظہار وہ آج کسی میٹنگ میں کریں گے۔

ڈاکٹر یوسف صاحب انجمن ترقی اُردو کے ممبر منتخب ہو گئے اس کی بڑی خوشی ہے۔ ان کے ہونے سے انجمن کی ساکھ بڑھے گی۔ امید ہے آپ مسرور مع الخیر ہوں گے

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۱۱

۲؍جون ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
مسودہ ارسالِ خدمت ہے۔ آپ نے جہاں جہاں نشان دہی کی تھی اسے درست کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر مقامات پر پورے پورے پیراگراف حذف کر دیئے ہیں۔ جہاں تہاں کچھ اضافے بھی ملیں گے لیکن نا ایسے کہ محلِ نظر ہوں۔
البتہ ص ۳۹ کو جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ factual نہیں تو فجائیہ ہے ایک آدھ جگہ اس کی بھی گنجائش رکھی جائے تو ایسا کوئی حرج نہیں۔ اگر بہت زیادہ زحمت نہ ہو تو ایک نظر پھر دیکھ جائیے گا۔
اب بحیثیت مجموعی یہ تحریر ہموار ہوگئی ہے یا نہیں۔ شکریہ
مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۱۲

۲۶ جولائی ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ڈاکٹر فریدی صاحب کے مسودہ پر آپ کے notes کا شکر گزار ہوں جن کو میں نے بجنسہٖ موصوف کے پاس بھیجدیا۔ فریدی صاحب کو ایسے مخلص اور مبصر کہاں ملتے ہیں جیسے کہ آپ ہیں۔ ان کے notes میں رفعت آگئی۔

رسم خط کے ۲۵ reprints مجھے مل گئے تھے بلگرامی صاحب نے بتایا تھا کہ دس روپے کا بل بھیجدوں گا۔ لیکن اب تک بھیجا نہیں۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ جب ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد والے مضمون کا معاوضہ دیں تو اس کے ۵۰ reprints اور رسم خط کے اس عنایہ کی رقم کے bills اس میں وضع فرمالیں۔ میرے لیے یہ سہولت ہوگی۔ خدا کے فضل سے اچھا ہونے لگا ہوں لیکن نہ ایسا کہ کچھ پڑھ لکھ سکوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۱۳

۲۳راگست ۷۱ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم

آج کل یو پی اسمبلی میں اُردو یونیورسٹی کے قیام کا تقاضا پیش ہے۔ اُردو کے بہی خواہ اپنے طور پر جو کر پاتے ہیں خواہ وہ کتنی ہی غیر موثر اور صدا بصحرا کیوں نہ ہو۔

اک نالہ تو بھی پیش کش صبح گاہ کر

یونیورسٹی اسٹاف کلب سے اس کی تائید میں ایک رسمی رزولیشن بھجوا دیجیے۔ اُردو کے ایک ممتاز خدمت گزار ہونے کے سبب سے یوں بھی لوگ متوقع ہوں گے کہ آپ اس طرف توجہ فرمائیں۔ اس رزولیشن کے لیے دھوم دھام کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ نہایت خاموشی سے بالکل رسمی طور پر رزولیشن بھیجدیجیے اس کو بعد میں ratify کرا لیجیے گا[1]

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] میں اس وقت یونیورسٹی ٹیچنگ اسٹاف کلب کا صدر تھا۔

۱۱۴

دوشنبہ ۲۰ر ستمبر ۱۹۷۶
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب

پرسوں شام مبین آئے تھے۔ ان کے بارے میں کچھ عرصہ ہوا آپ سے عرض معروض کر چکا ہوں۔ وفادار، محنتی اور ذہین نوجوان ہیں۔ ممکن ہے کچھ موانع ہوں جن سے وہ واقف نہیں۔ یوں مستحق معلوم ہوتے ہیں۔

ہماری زبان کے پچھلے شمارہ[1] میں یا اس سے پہلے آپ کا مضمون دیکھا تھا، بات صحیح تھی اور آپ ہمیشہ صحیح ہی بات پر زور دیتے ہیں۔ لیکن جز سیاق و سباق میں (اور خلاف معمول تلخ لہجہ میں) آپ نے گفتگو کی تھی اس سے تکلیف ہوئی۔ ہر چہار طرف سے یوں ہی کیا کم لعنت کی بارش ہو رہی ہے کہ اس میں ہم آپ بھی اضافہ کرنے لگیں۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] میرا مضمون: کفارہ۔ یکم ستمبر ۱۹۷۱ء

۱۱۵

بدھ ۲۲ر ستمبر ۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

عنایت نامہ موصول ہوا۔ آپ کی اصابت رائے کا قائل ہوں۔ آج سے نہیں بہت سے دنوں سے۔ حال ہی میں آپ نے اُردو پروفیسر کے تقرر سے متعلق ایک نہایت ہی سچی اور اونچی بات کہی تھی۔ یعنی کسی مسلم ادارے میں اُردو میں پروفیسر ہونے کے لیے پیشہ ورانہ استعداد اور زبان وادب سے متعلق اس کے اسناد اتنے ضروری نہیں ہیں جتنی اُردو سے اس کی جذباتی وابستگی۔ اپنے مضمون کی تائید میں جن صاحب کا قول نقل کیا ہے ان کو روایتی طور پر ان اقدار سے بَیر رہا ہے جن کو ہم نے آپ نے اپنا رکھا ہے اور باتوں کے قطع نظر ان کو اُردو سے جذباتی ہم آہنگی نہیں ہے۔ وہ اس قیامت صغریٰ سے اس لیے متاثر ہیں کہ ہم آپ متاثر ہیں بلکہ زیادہ تر اس لیے اس سے حکومت کو اختلاف

---

[1] یہ خط اور خط نمبر ۱۱۱ ایک ہیں صرف چند سطروں کا فرق ہے۔

ہی نہیں عناد ہے۔ ممدوح نے اُردو کی شکایت میں دشمن کا ہم زبان ہی نہیں ہم طرح بننا قبول کرلیا ہے۔ حکومت کی تائید اور ہماری دل آزاری میں وہ تمام اخلاق و اقدار کے محافظ اور مبلغ بن جائیں گے۔ ا قبیلہ نے مسلمانوں کو جیسے جیسے نقصان پہنچائے ہیں تاریخ ان کی گواہ ہم آپ بھی ہر روز یہی دیکھتے آئے ہیں۔ میرے نزدیک انھوں نے آپ کے مضمون کی جو تائید کی ہے اس سے آپ کی اتنی نہیں جتنی میرے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔

اردو والے جس طور پر اُردو کو ایک غیر رضا مند طبقے یا خطے پر تھوپنا چاہتے ہیں اس کو میں کب پسند کرتا ہوں۔ آپ ایسوں کی مخالفت میں جو کچھ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں۔ بات سب صحیح کہی ہے لیکن بے موقع اور بے ضرورت کہنے سے فرق پڑ گیا ہے۔ اُردو کتنی ہی بے وقعت اور کس میرس کیوں نہ ہوگئی ہو اس کی تائید کی جائے گی۔ چاہتا ہوں کہ اُردو سے آپ کی جذباتی ہم آہنگی قائم رہے۔ ہر موقع پر نہیں تو خاص خاص موقعوں پر ضرور جیسا کہ یہ تھا۔ کبھی ملاقات ہوئی بتاؤں گا۔ آپ کا یہ مضمون کیسے کیسے لوگوں نے پسند کیا ہوگا اور ان کی bonafides کیا ہیں۔ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا۔ لیکن شخص یا فن کار کا کمال یہ ہے کہ وہ سچ کڑوا نہ معلوم ہو اور دل میں اُتر جائے۔ سچ کو کڑوا بنائے رکھنا کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے۔ خدا کا فرمان چاہے کڑوا ہوتا ہو لیکن وہی رسولؐ کی زبان سے گوارا ہو کر دل میں اتر جاتا ہے۔ ہم کو آپ کو رسالت مآبؐ کی پیروی کرنا چاہیے۔ بقیہ پھر کبھی۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

اس صبح خط کے ساتھ آپ نے اپنے باغ کے خوش رنگ، خوشبودار اور خوب صورت لیموں بھیجے تھے۔ ایسے لمبوترے لیموں کو غالبًا طب کی اصطلاح میں ترنج کہتے ہیں ان کو جب کبھی آپ نے مرحمت فرمایا۔ میرا ذہن بے اختیار غالبؔ کے مشہور شعر کی طرف گیا۔

تھا ترنج زر دیک خسرو کے پاس

کل بھی ایسا ہی ہوا۔ ہر شعر کو کوٹ کرنے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ کہیں پہلے یہی بات نہ لکھ چکا ہوں اس طرح کے سانچے سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بلگرامی صاحب[1]، ڈاکٹر ضیاء الدین والے مضمون کے پانچ reprints دے گئے بڑی خوشی ہوئی۔ ان پر ٹائٹل پیج نہیں لگا ہے لیکن اس کا کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا کام چل گیا بہت بہت شکریہ۔

رشید احمد صدیقی

اس خط کو پڑھ کر فورًا تلف کر دیجیے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں ذرا سی غفلت سے یہ کتنے فتنے کا باعث ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر یہ درخواست کر رہا ہوں۔

---

[1] شریف الحسن بلگرامی۔ اسسٹنٹ ایڈیٹر فکر و نظر

۱۱۶

۲۴ر ستمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
آپ سے درخواست ہے کہ آج کلاس جاتے ہوئے وہ تحریر لیتے آئیں جس کے بارے میں کل شام گفتگو آئی تھی. تمام رات اسی طرف ذہن منتقل ہوتا رہا اور نیند نہیں آئی۔ میں اسے بمدست واپس کردوں گا۔ صرف ان فقروں کو قلم زد کرنا چاہتا ہوں جن کو قلم زد ہونا چاہیے۔ آپ اسے ہرگز کسی اور بات پر محمول نہ کریں۔ آپ کا جی ہو تو میں فکرمند نہیں ہوں گا۔ صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب خلش دور ہو سکتی ہے تو اسے کیوں نہ دور کردیا جائے۔ بہت بہت شکریہ۔ قلم زد تحریر کردیے جانے کے بعد وہ تحریر بجنسہٖ واپس کردوں گا۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

آپ ذرا دروازہ کھٹکھٹائیں گے میں آجاؤں گا۔ آپ کو انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

۱۱۷

جمعرات، ۲۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ[1]

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
عنایت نامہ موصول ہوا۔ آپ کی اصابت رائے اور دیرینہ اخلاص وکرم کا قائل ہوں۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے۔ حال ہی میں دورانِ گفتگو میں آپ نے اُردو پروفیسر کے تقرر سے متعلق ایک نہایت سچی اور اونچی بات کہی تھی یعنی کسی مسلم ادارے میں (مثلاً جامعہ ملیہ دہلی) اردو کا پروفیسر مقرر کیے جانے کے لیے پیشہ ورانہ استعداد اور زبان وادب سے متعلق اس کے اسناد اتنے ضروری نہیں ہیں جتنا اُردو سے اس کی وابستگی۔ آپ نے جن صاحب کا قول اپنی تحریر کی تائید میں نقل کیا ہے اس سے میں کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا۔ اس لیے کہ انھوں نے جن حادثات کے context میں یہ بات کہی ہے وہ اُردو سے ہمدردی کا اظہار کرنے کے لیے فی الجملہ سازگار نہ تھے۔

---

[1] یہ خط اور خط نمبر ۱۱۵ ایک ہیں۔ صرف چند سطروں کا فرق ہے۔

مشرقی بنگال میں جو قیامت برپا ہوئی اس کی فضا میں اُردو کے لیے کلمۂ خیر کہنا آج کل نہ مناسب ہے نہ ممکن۔

اردو والے جس طور پر اُردو کو ایک غیر رضامند طبقے یا خطے پر تھوپنا چاہتے بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا ہوں ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ کہتے تو بہتر تھا۔ اُردو کتنی ہی بے وقعت اور کس مپرس کیوں نہ ہو اس کی تائید کرنے والے اپنے کو بے وقعت نہیں سمجھتے۔ سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔ چاہتا ہوں کہ اردو سے آپ کی وابستگی بہرحال قائم رہے۔ ہر موقع پر نہیں تو خاص موقعوں پر ضرور۔ سچ کڑوا ضرور ہوتا ہے لیکن بڑے شخص اور بڑے فن کار کا کمال یہ ہے کہ سچ کڑوا نہ معلوم ہو اور دل میں اتر جائے۔ سچ کڑوا بنائے رکھنا کوئی قابلِ تعریف بات نہیں ہے۔ خدا کا فرمان چاہے کڑوا ہوتا ہو لیکن وہی فرمان رسولؐ کی زبان سے شیریں بن کر نکلتا ہے اور دلوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ ہم آپ کو اس کو اس معاملے میں رسالت مآبؐ کی پیروی کرنا چاہیے۔ اس رمز کو اللہ نے ہمارے رسولؐ کو بڑے اصرار سے بتایا ہے یوں بھی میرا خیال ہے کہ پیغمبر کے بعد کڑوے کو شیریں بنانے کا فرض پروفیسر پر عائد ہوتا ہے۔

آپ نے خط کے ساتھ اپنے باغ کے خوش رنگ، خوشبودار اور خوبصورت لیموں بھیجے تھے۔ ان کو جب کبھی آپ نے عنایت فرمایا میرا ذہن غالب کے مشہور شعر کی طرف گیا۔

تھا ترنج زرِ یک خسرو کے پاس

اس دفعہ بھی ایسا ہی ہوا لیکن کوٹ کرنے میں یوں تامل ہوا کہ کہیں پہلے بھی یہی نہ کیا ہو اس طرح کے سانچے سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہمارے ہاں گرمی اور برسات میں دودھ کے بجائے لیموں ہی کام میں لایا

جاتا ہے لیکن ایسے تازہ اور رسیلے کہاں ملتے ہیں۔

بلگرامی صاحب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم والے مضمون کے پانچ reprints دے گئے، بڑی خوشی ہوئی۔ ان پر ٹائیٹل پیج نہیں لگائے گئے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرا کام چل گیا۔ بہت بہت شکریہ۔

مکرر۔ اپنی بدحواسی سے نادم اور آپ کے کرم کا شکرگزار ہوں![1]

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] جیسا کہ اس سے قبل فٹ نوٹ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ خط اور خط نمبر ۱۱۷ ایک ہیں ان کی شانِ نزول یہ ہے کہ میں نے یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کو میرا صفحہ (ہماری زبان) میں "کفارہ" کے عنوان سے جو مضمون مغربی پاکستان کے مشرقی پاکستان پر (موجودہ بنگلہ دیش) سیاسی و لسانی ظلم کے بارے میں لکھا تھا رشید صاحب اس مضمون کے لہجے اور خیالات سے متفق نہیں تھے۔ چند ہی روز بعد اس مضمون کی تائید میں خواجہ غلام السیدین کا یہ مختصر سا مراسلہ مجھے موصول ہوا۔

عزیزی۔ تسلیم

میں نے یکم ستمبر "ہماری زبان" میں آپ کا مضمون "کفارہ" پڑھا مجھے مضمون اور اس کا طرز بیان دونوں بہت پسند آئے۔ بات کہنے کی تھی اور خوشی ہے کہ اس کو آپ نے مضبوطی اور سلیقے سے کہا۔

مخلص غلام السیدین

(۹ ستمبر ۱۹۷۱ء)

رشید صاحب کے مذکورہ بالا دونوں خطوں میں خواجہ غلام السیدین صاحب کے اس خط کا ردِ عمل ملتا ہے جو میں نے ان کے ملاحظے کے لیے بھیج دیا تھا۔ پہلا خط لکھنے کے بعد انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک عزیز دوست کے بارے میں قدرے سخت لہجہ اختیار کر گئے ہیں تو پیچھے سے ترمیم شدہ خط

۱۱۸

۲۷ ستمبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل فکر و نظر کا ایک نسخہ مجھے ملا تھا۔ اس میں میرے مضمون (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) کا ص ۳۴ - ۳۵ غائب تھا اور وہی سب سے ضروری تھا۔ حالاں کہ اس سے پہلے reprints کی پانچ کاپیاں موصول ہوئی تھیں اس میں یہ صفحہ موجود ہے۔

بلگرامی صاحب سے دریافت کرایا تو انھوں نے فکر و نظر کی ایک اور کاپی بھیج دی جس میں وہ صفحہ موجود تھا۔

معلوم نہیں بھید کیا ہے۔ فکر و نظر کے جتنے نسخے شائع ہوئے ہیں اس میں یہ صفحہ موجود ہے یا نہیں اور کیا اتفاق ہے کہ جو نمبر مجھے ملا اسی سے یہ صفحات غائب تھے۔

کل ساہتیہ اکیڈمی کا ایک رجسٹرڈ مراسلہ ملا جس میں انعام کے لیے کتابوں کی فائنل مجوزہ فہرست ہے اور کتابوں کے ذیل میں میرے

وہ توسیعی نظام خطبات بھی ہیں جو دہلی یونیورسٹی میں غالب کی شخصیت و شاعری پر دیے گئے تھے۔ بڑا تعجب ہوا اس لیے کہ اردو سکشن کے جو اصحاب کرتا دھرتا ہیں وہ میرے۔ جتنے دوست ہیں وہ معلوم ہے، آج نہیں سالہا سال سے۔

نتیجہ جو ہوگا وہ معلوم ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کس نے اس خطبہ کو شامل کیے جانے کی سفارش کی۔ میرا ذہن تو رہ رہ کر آپ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو آپ کا بہت بہت شکریہ۔ ایسا محسوس ہوا جیسے انعام مجھ کو مل گیا ہو۔

کئی سال سے ساہتیہ والوں سے معذرت کرتا رہا ہوں اور آج بھی کروں گا کہ مجھے کتابوں کے انتخاب کرنے یا انعام کے لائق کتاب کی سفارش کرنے کے فریضے سے محفوظ رکھا جائے۔ تین چار سال سے زائد ہوئے کہ میں نے یہ فرض انجام نہیں دیا ہے اور نہ اب دوں گا۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۱۹

شنبہ ۲۶ راکتوبر ۱۹۷۱ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
کل ہماری زبان[1] میں سرسید پر آپ کا مضمون پڑھا۔ دل بہت خوش ہوا۔ کتنے مختصر مضمون میں کتنی ساری باتیں آپ نے واضح کر دیں۔ یہ تحریر اور صاحبِ تحریر دونوں کی بہت بڑی صفت بتائی گئی ہے جو آپ کے حصے میں آئی اور برابر آتی رہتی ہے۔ موضوع پر مکمل عبور ہونے کے علاوہ لب ولہجہ میں اعتبار و اعتقاد کی جو زیریں لیکن طاقتور لہر ملتی ہے وہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس تقریر کو محفوظ کر لیا جائے اور جس کسی کو سرسید اور اس ادارے سے دوستی یا دشمنی ہو اس کو ضرور فراہم کیا جائے۔ خدا آپ کو اس طرح کی باتیں کہنے کرنے اور کرانے کے لیے تا دیر خوش رکھے۔ آمین۔
میں نے فرمائش کی تھی کہ فکر و نظر کی حالیہ اشاعت کا ایک

---

[1] میرا صفحہ: ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

نسخہ ہدیتہً مولانا عبدالماجد دریابادی کی خدمت میں بھیج دیا جائے
پروفیسر حبیب الرحمن، اردو ہال حیدر آباد کو بھی اس کا حق پہنچتا ہے۔
یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ ایشوع کس کس کو بھیجا گیا۔ عزیز احسن بتا سکیں
گے؟ اشاعت بڑھانے کی ذمہ داری کس، کے سپرد ہے؟ آپ کی
ادارت میں رسالہ آیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ اس کی اشاعت
بھی بڑھے۔

امید ہے آپ خوش و خرم ہوں گے

مخلص

رشید احمد صدیقی

یوسف صاحب کو فکر و نظر کا نسخہ بھیجا وہ ایک طور پر فکر و نظر
کے بانی رہے ہیں۔

۱۲۰

۲۵ر نومبر ۱۷ء

مسود صاحب مکرم ۔ تسلیم

۲۱ر نومبر کے ہماری زبان میں آپ کا مضمون " لسانی انفرادیت کی تلاش " پڑھا ۔ اُردو کے مسئلہ اور متعلقین کا آپ کا جائزہ اور تجزیہ حسبِ معمول بڑا عالمانہ ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے یہ مضمون عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے گا۔ اکثر خواص کے بھی نہ آئے تو عجب نہیں۔ بہت سے ایسے ہوں گے جو اس کے خواہش مند ہوں گے کہ ان کو بتایا جائے کہ اس سلسلے میں ان کو کیا کرنا چاہیے۔ اس لیے اگر دوسرے نمبر میں آپ ایک پروگرام بھی پیش کر دیں تو بہت اچھا ہو گا۔ مثلاً کن لوگوں کو کس سطح پر کہاں کیا کام کرنا چاہیے، اس سے دوسرے لوگوں کو والوں کو رہبری ملے گی اور ہمت افزائی بھی ہو گی یا پھر اس عنوان سے مفصل مضمون فکر و نظر کے لیے لکھ ڈالیے یہ سب سے بہتر ہو گا۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۱

۱۵/دسمبر ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم ۔ آداب
یہ رنگین پنسلیں حسب ذیل دو مقولوں کے ساتھ بھیجتا ہوں۔

(۱) اگر پدر نتواند پسر تمام کند

یا

(۲) اگر پسر نتواند پدر تمام کند

آپ کا
رشید احمد صدیقی

غالباً اس طرح کی پنسلیں دیکھ کر اقبال نے وہ شعر کہا ہوگا جو پورا یاد نہیں آرہا ہے۔ کچھ نیلے پیلے یادوں سے متعلق ہے[1]۔

---

[1] بالِ جبرئیل کی غزل کے ایک مصرع کی جانب اشارہ ہے ؎
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

۱۲۲

۱۵ اردسمبر ۱۹۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
یہ مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ جلدی بالکل نہیں ہے۔ یہ ایک گونہ افتتاحیہ ہے۔ اس کے بعد عزیزانِ علی گڑھ سے خطاب کے اقساط ہوں گے جو بہت طویل ہو گئے۔ تقریباً سو صفحات۔ کسی وقت اسے بھی بھیجدوں گا۔ کچھ اور کرنے کو نہ ہو تو ان کو بھی دیکھ لیجیے گا۔ یہ بالکل ضروری نہیں کہ یہ اول سے آخر تک (افتتاحیہ سمیت) "فکر و نظر" میں شائع ہوں۔ ممکن ہے لوگ اکتا جائیں۔
بہرحال یہ تمام تر آپ کی صوابدید پر منحصر ہے کہ اس پر کیا کارروائی مناسب ہو گی۔ مجھے قطعاً عذر نہ ہوگا اور آپ جانتے ہیں کہ میں تصنع سے کام نہیں لے رہا ہوں۔
ہم رشتہ دو لفافے خود وضاحتی ہیں۔
سادے اوراق رکھ دیے ہیں۔
دعا ہے کہ آپ بالکل تندرست ہوں۔ کل سکندر سے اس کی تصدیق کر لی تھی۔ کبھی ملاقات ہوئی تو پھر گفتگو ہو گی۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۲۳

۱۷ر دسمبر ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں 'میرا صفحہ'[لہ] کے تحت آپ کا مضمون پڑھا۔ ڈھاکہ یا بنگال کی آپ نے جتنی سچی اور دل کش مصوری کی ہے اس سے دل خوش ہوگیا۔ اتنا خوش کہ جی چاہتے لگا کہ جو کچھ ہوا وہ نہ ہوا ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ تفصیل سے کچھ کہنے کی ان دنوں سکت نہیں بڑی خواری محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے ڈھاکہ کا جیسا بدیع و بے مثل طبعی و تمدنی نقشہ کھینچا ہے اس میں شعر و ادب اور فنون لطیفہ سب کا بڑا دل کش نقش و رنگ ملتا ہے۔ ہر فن کا کمال یہی ہے کہ اس میں ہر فن کی کشید ملے۔ ظاہر ہے انشا پردازی بھی کوئی معمولی فن نہیں ہے۔ اس مضمون میں آپ کی تخیل اور فکر کی بڑی دل کش کشید و کشش ملتی ہے۔ اور خلاصۂ کلام میں تو آپ نے جیسے بنگال اور بنگالی دونوں کی تاریخ اور تقدیر کی وضاحت کر دی ہو۔ غالی ہونے کا انجام یا ٹریجڈی اس سے بہتر فقرے میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ "وعید" بھی اسی طرح کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ اس طرح کے مضامین کبھی کبھی ضرور لکھ دیا کیجیے۔ یہ ذہن اور تخیل دونوں کو تازہ کار رکھتا ہے اور توانائی بخشتا ہے اور فن کار کو rigid and stale ہونے سے بچاتا رہتا ہے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

لہ ڈھاکہ: (یادوں کی غلام گردش میں)۔ ۵ار دسمبر ۱۹۷۱ء

۱۲۴

یکم جنوری ۷۲ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔
مسودہ اور نوازش نامہ ملے۔ طبیعت ناساز ہونے کے باوجود آپ نے جس توجہ سے مسودہ کا مطالعہ فرمایا اس کے لیے نادم بھی ہوں اور شکر گزار بھی۔ اللہ تعالیٰ صحت یابی بخشے اور سالِ نو مبارک فرمائے۔ آمین۔
آپ نے جہاں تہاں حاشیے پر جو نوٹس لکھ دیے ہیں وہ صاف پڑھے نہیں گئے۔ نوازش نامہ میں جو باتیں تحریر فرمائی ہیں وہ بھی پورے طور پر سمجھ میں نہیں آئیں۔ سوچتا ہوں کسی وقت جو آپ کے لیے ناسازگار نہ ہو آدھ یا پون گھنٹے کے لیے آجاؤں تو ساری باتیں واضح ہوجائیں گی۔ ایسا فی الحال نہ ہوسکے گا تو دو چار روز بعد ہی۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۵ر جنوری ۷۲ء

مسعود صاحب محترم۔ آداب

کل جس افتتاحیہ یا تعارف پر گفتگو ہوئی تھی اسے مسترد کر دیا گیا۔ جو اجزا ص ۲۸ تا ۶۸ دے آیا تھا اس کا بقیہ حصہ ص ۶۹ سے ۹۲ تک آج بھیج رہا ہوں۔ اس طرح خطبہ ص ۲۸ سے ص ۹۲ تک محیط ہے۔ بیچ میں ۷۔۸ اوراق زائد ہیں۔ آپ کے پاس مکمل شکل میں پہنچ گیا۔ خیال آیا کہ پورا خطبہ آپ کے سامنے ہوگا تو رائے قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ اپنے notes علیحدہ کاغذ پر درج فرمالیجیے گا اس پر گفتگو ہو جائے گی۔ جلدی نہیں ہے لیکن چاہتا ہوں کہ یونیورسٹی کھلنے سے پہلے آپ فارغ ہو جائیں تاکہ اس سے بہتر کاموں کی طرف توجہ مائل کر سکیں۔ اگر مناسب سمجھیے گا تو ایک پرزہ جامعہ[1] کے دفتر میں میرے نام بھجوا دیجیے تاکہ کس دن کس وقت آجاؤں۔ مجھے مل جائے گا۔ شکریہ

مخلص

رشید احمد صدیقی

[1] جامعہ اُردو۔ علی گڑھ

۲۰ رجنوری ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ کل مل گیا تھا۔ کوئی جلدی تو ہے نہیں۔ جمعہ کو دس بجے دن کے بجائے اتوار دس بجے کیوں نہ رکھیے تعطیل ہونے کی وجہ سے آپ کو فرصت اور یکسوئی ہوگی۔ میرے ہاں تشریف لانے کی زحمت نہ فرمائیے۔ میں خود آجاؤں گا۔ گھر سے باہر نکلنے کا کوئی تو بہانہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ ۱۵ - ۲۰ منٹ صرف ہوں گے۔

ہماری زبان میں آپ کا مضمون بنگلہ دیش اور اردو سے متعلق پڑھ گیا۔ کچھ دنوں سے مشرقی پاکستان کے عروج وزوال کے سلسلے میں غریب اردو پر جناح صاحب اور عبدالحق صاحب مرحومین کے واسطے سے جیسی لعنت پڑ رہی تھی وہ سب ذہن میں تھا اس لیے پڑھنے کا جی نہ چاہا۔ لیکن چوں کہ آپ نے لکھا تھا اس لیے پڑھنے پر اپنے آپ کو آمادہ کرلیا۔ مضمون کا آخری حصہ آپ نے جس note پر ختم کیا ہے اس سے دل بہت خوش ہوا۔ بڑا آدمی وہ ہے جو خوف اور مایوسی میں نہ تو خود خائف اور مایوس ہو نہ دوسروں کو مرنے دے۔ آدمی کی تخلیق خوف اور مایوسی پر نہیں ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ آمین۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[۱] ہماری زبان: ۱۵ رجنوری ۷۲ء

شنبہ ۸ر اپریل ۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی

مسعود صاحب مکرم۔ سلام شوق
میرے صفحہ کے تحت ہماری زبان میں آپ کا مضمون[1] نظر سے گزرا۔ آپ نے اُردو کے نقشے اور فیصلے پر جیسی نظر ڈالی ہے اور جیسا تجزیہ جس تفصیل اور وضاحت سے کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں وہ آپ ہی کا حصّہ ہے۔ یعنی بہت ہی اچھا۔ لیکن آپ کا کام محض فرض شناسی کا نہیں ہے کہ اپنی رپورٹ مریض کو دے دی یا اس کے معالج کو دے دی اور کام ختم ہو گیا۔ آپ معالج بھی ہیں اور تیمار دار بھی۔ آپ یہ بھی بتائیں کہ صحت اور توانائی کی بازیافت کی یہ تدابیر ہیں جس پر سب کو عمل کرنا پڑے گا۔ آپ کا یا میرا کام اتنا نہیں ہے کہ نعش کو چیر پھاڑ کر دریافت کریں کہ موت کیوں کر واقع ہوئی۔ پیتھالوجی اور اناٹمی یا تغذیہ (علم غذا) کو مدنظر رکھ کر پرہیز، غذا، تفریح، چلنا پھرنا سب تجویز کرنا پڑے گا۔ ہماری زبان کے اس شمارے میں

---

[1] میرا صفحہ: "اردو ایک ہرجائی" ۱۵ر اپریل ۷۲ء

اداریہ کے تحت معقول باتیں کہی اور تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ اور دوسرے احباب ایک پروگرام مرتب کر دیں جن میں تفصیل سے یہ درج ہو کہ کن اور کیسے لوگوں کے ذمے کس طرح کا کام ہونا چاہیے تاکہ اردو کے تحفظ و ترقی کا ایک سونچا سمجھا متفقہ پروگرام مختلف محاذوں پر کام میں لایا جا سکے۔ مثلاً سیاسی، تعلیمی، علمی، صحافتی، تصنیفی اور سب سے اہم مشاعرہ اور فلم کا۔ مشاعرہ مختلف انداز کی شاعری کا اتنا نہ ہو جتنا روایتی غزل کا جو کتنی ہی بدنام کیوں نہ ہو، اب بھی قبولِ عام ہے۔ ہر محاذ اور پروگرام کے تجربہ کار اراکین اپنے حلقہ میں اردو کا کام بہترین طور پر انجام دے سکیں گے۔ وغیرہ۔

بقیہ آپ جانیں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۲۸

شنبہ ۸ راپریل ۷۲ء
ذاکر باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم
شاعر بمبئی میں آپ کے ایک انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ "بعنوان "اردو زبان اور اس کے رسم خط" کا مسئلہ نظر سے گزرا جو ۱۹۷۱ء میں یونیورسٹی کے کسی انگریزی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ خوب ہے۔ ایسے مختصر مضمون میں اُردو کے مسئلے پر آپ نے جتنی اور جیسی باتیں واضح کردی ہیں کوئی اور اس کو پوری کتاب میں مدتوں نہ سمیٹ سکتا۔ نہ کہیں حشو زوائد ہیں۔ نہ سب و شتم، نہ بے دلی یا بیزاری۔ میرا خیال ہے کہ موجودہ دور میں اردو کے ہر طالب علم اور بہی خواہ کو یہ مضمون اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیئے اس سے صحیح صورت حال کا اندازہ اور سوچنے سمجھنے اور کام کرنے کا طریقہ واضح ہوتا ہے۔ ایسا مختصر اور جامع و مانع مضمون (اردو کے مسئلے پر) مشکل سے کہیں اور نظر آئے گا۔ آپ ہم سب کی تہنیت کے مستحق ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

لہ انگریزی میں یہ مضمون علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے جرنل میں اسی سال [illegible] ،پرابلم آف اُردو)

۱۲۹

۲۷ر اپریل ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

میرے خطبہ کی بندش توڑنی ہی پڑے گی اس لیے کہ ایک ہی مضمون کو کئی کمپوزٹرس کمپوز کرتے ہیں۔ اس لیے اوراق کو جلدی سے علیحدہ سے کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی کمپوزٹر بھی ہو تو وہ کسی طرح سو سوا سو کی جلد کو handle نہیں کرسکتا۔ ایک وقت میں ایک علیحدہ ورق مناسب رہتا ہے۔ آپ کلاس جاتے ہوئے ایسا اندازہ لگائیں کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میرے ہاں صرف کرنے ہیں۔ اس میں بندش توڑ کر ضروری اوراق اور حصص علیحدہ کر لیے جائیں گے اور ان اوراق پر نئے صفحے ڈال دیے جائیں گے پھر چاہے جتنے کمپوزٹرس کام کریں۔ کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی اور پوری جلد بھی soiled ہونے سے محفوظ رہے گی۔

دوسرے یہ کہ آپ نے خطبہ کے وہ اوراق بھی ملاحظہ فرما لیے ہوں گے جو سرور صاحب نے آپ کی خدمت میں میری طرف سے پڑھنے کے لیے بھیج دیے تھے اب وہ سرور صاحب کے پاس ہیں اور تقریب میں شاید ذوقی صاحب[1] پڑھ

---

[1] مسعود علی ذوقی صاحب، سابق لکچرر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

دیں۔ کیا وہ بحث ایسی نہیں ہے جو فکر و نظر کے مجوزہ شمارے کے لیے موزوں ہو۔ مجھے اصرار بالکل نہیں ہے صرف یاددہانی کے طور پر عرض کر رہا ہوں ورنہ واقعہ یہ ہے کہ میری خواہش یہی ہے کہ وہ اوراق شامل کیے جائیں جس کا ذکر کل شام کر چکا ہوں۔ یعنی غالب، حالی اور اقبال سے متعلق۔

آپ بغیر دستک دیے بے تکلف گھر میں آجائیں۔ بیوی ایک تقریب کے سلسلے میں بھوپال گئی ہیں۔ کمال اپنے ڈپارٹمنٹ جا چکے ہوں گے۔ "خانۂ خالی" صرف میری گرفت میں ہوگا۔ پندرہ منٹ سے زیادہ اوراق کو علیحدہ کرنے اور علیحدہ منسلک کرنے میں صرف ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۰

۲۲ مئی ۶۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

یہ چیز بے بتائے دفعتاً نازل ہوئی اور میری عدم موجودگی میں رکھ لی گئی اس لیے واپس کرنے میں محصول ڈاک کی ایک بڑی رقم بطور تاوان مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

آپ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یونیورسٹی بند ہوجانے کے بعد غالباً (گرمی دیکھتے ہوئے) گھر میں "قلعہ بند" ہوں گے۔ کاش جوانانِ ملّت کے ساتھ نعرے لگاتے ہوئے میری طرف آنکلتے لیکن کیسے کہوں رات تو گرمی کا یہ عالم تھا کہ ایک پرانے شاعر کا مصرعہ یاد آگیا۔

آج کی رات بچیں گے تو سحر دیکھیں گے

دیباچہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ان اوراق میں کیسے کیسے کرامات ملفوف ہوں گے۔ آپ ہوں نہ ہوں تو کسی وقت آجاؤ۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۳۱

شنبہ، ۲۷ مئی ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

ہماری زبان کے ۲۲ مئی ۷۲ء کے شمارے میں آپ کا مضمون "میرا صفحہ" سامنے ہے۔ اُردو کے سیاسی اور سماجی مسائل پر آپکے مضامین بڑے واضح اور دل نشین ہوتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر سطح کے لوگوں کی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ انجام کیا ہوتا رہتا ہے اس کے اسباب دوسرے ہیں اور ہماری آپ کی دسترس سے تقریباً باہر۔ ایک بات جو ممکن ہے وہ یہ کہ ان مضامین کی اشاعت کثرت سے ہو اور مسلسل۔ اس کا اثر دیر میں ہوگا لیکن ہوگا بڑا پائیدار۔ یہ مضمون اور ایسے مضامین اردو کے اچھے اخبار اور رسائل میں کچھ دنوں اسی طرح شائع ہوتے رہیں تو اردو کی بڑی اچھی وکالت ہوگی۔ مقدور ہوتا تو قیمت ادا کر کے اس مضمون کو اردو اخبارات میں شائع کراتا رہتا جس طرح اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے اطمینان ہے کہ جو کچھ میری قدرت میں ہے وہ مختلف کرنسی میں آپ کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور اطمینان بخشے کہ آپ ایسا کرتے رہیں۔ آمین۔

لہ میرا صفحہ: یہ یادہ؟

اب چند دنوں کے مہمان ہیں۔ ان کی بہارِ
جانفزا دکھانے کے دن تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ اب تو غنچے بن کھلے
مرجھانے لگے ہیں۔ اور آپ کے زیرِ نظر مضمون کے بعض فقرے بڑے
برجستہ ہیں۔ خلوص نہ ہو تو یہ نہیں آتے۔

پرسوں آپ تشریف لائے لیکن اتفاق سے کچھ ایسا ہو گیا
اور بحث ایسی چھڑی کہ کیا کہوں۔ ایک تو موسم خراب دوسرے
موضوعِ بحث اور اندازِ گفتگو نے اس کو اور زیادہ Sullen and Sultry
کر دیا۔ میں اس موضوع پر بحث کرنے اور سننے دونوں سے ہمیشہ
بچنا چاہتا ہوں لیکن اس میں ضرور ناکامی ہوتی ہے بالخصوص اس
لیے کہ بدنصیبی سے صدرِ محفل میں ہوں۔ معلوم نہیں ایسے پشتارے
سے آپ کہاں تک بدحظ ہوئے۔ آپ سے خاص طور پر گفتگو کرنا چاہتا
تھا۔ میں اس کے lock and barrel سے مطمئن نہیں ہوں۔ کچھ اس طرح کی
کیفیت ہے کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں۔ ہو تو کیوں کر ہو! خدا حافظ

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۳۲

۱۳ر مئی ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

آپ کا عطیہ عاشور نامہ موصول ہوا۔ گرامی نامہ بھی۔ شکریہ۔ خدا آپ کے اس کام اور ایسے کاموں میں برکت اور شہرت دے۔ یہ دعا میری ہو یا کسی اور کی آپ کے لیے بہت پہلے مقبول ہو چکی ہے اس کے بعد دعا مانگنا اس امر کی شہادت ہے کہ آپ کے لیے میرا وظیفہ "دعا گفتن" لاشعور تک پہنچ چکا ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ قدیم اردو پر تعداد اور استناد کے اعتبار سے آپ کی خدمات سب سے زیادہ بھی ہیں اور سب سے وقیع بھی۔ یہ دیکھتے ہوئے اور یہ کہ آپ عمر میں اپنے پیشروؤں سے کہیں کم ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا ماہر لسانیات ہونا اس طرح کے کاموں کا محرک اعظم ہے اور شاید اس طرح کے کاموں سے دل چسپی آپ کے ماہر لسانیات ہونے کا باعث ہو۔ آپ کا دونوں سے شغف اردو کے لیے نہایت مبارک فال ہے۔

میرے آلام و آزار کی فکر نہ کیجیے۔ اس عمر اور صحت میں اس سے

زیادہ سہنا پڑتا ہے البتہ اس سے تکلیف ہوتی ہے اور شرمندہ ہوتا ہوں کہ یہ تکالیف سکت سے آگے بڑھ کر ساتھیوں کی راحت و عافیت میں خلل انداز ہوتی ہیں اور اپنے جتنے کام پہلے خود کر سکتا تھا اب اس کا بار دوسروں پر پڑے گا۔ از کار رفتہ بوڑھوں اور مریضوں کا تندرست اور خوش و خرم عزیزوں پر بار ہونا اور گھر کی فضا کو بوجھل اور دھندلا رکھنا بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ چوں کہ تمام زندگی ایسی درماندگی کبھی پیش نہیں آئی اس لیے اس کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ پشتارہ آپ کو مل گیا یا نہیں جو کچھ دن ہوئے پہلوان کی معرفت آپ کی خدمت میں بھیجا تھا اور اس کے ساتھ ایک خط بھی تھا۔ آپ کے کسی خط میں اس کا ذکر نہ تھا اس لیے دریافت کرنا پڑا۔

خطبات کا مسودہ اپنے ہی پاس رہنے دیجیے وہاں زیادہ محفوظ ہوگا جب ضرورت ہوگی منگالوں گا۔ ۱۵ - ۲۰ اوراق اور بھی ہیں ان کو بھی بھیجدوں گا۔ مسودہ مناسب جگہ دے دیجیے گا۔ فکر و نظر ابھی پڑھ نہ سکا۔ آنکھیں بھی جواب دینے لگیں۔ اس لیے لکھنے پڑھنے کا وقت گزاری کا جو شغل تھا وہ بھی تیزی سے محدود ہوتا جاتا جارہا ہے۔ لکھنے پڑھنے کے لیے آنکھوں سے اجازت لینی پڑتی ہے اور وہ دیر میں اور مشکل سے ملتی ہے اس لیے کبھی کبھی عدول سے بھی کام لینا پڑتا ہے حالیہ فکر و نظر کی پذیرائی کیسی ہوئی؟ یونیورسٹی بل کی بشارتیں دیکھ لیں۔ کوئی امید افزا بات کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔ اللہ کی مقہور

قوم کے فرد فروغ دیکھ رہے ہیں۔ اس کے بندوں کی مقہور قوم (ہم مسلمانوں
کو) بھی نظر میں رکھیے۔ اس کے بعد ہندوستان کے بدنصیب مسلمانوں
کو کیا کہیں۔ کس کس کی اور کہاں کہاں کی کرنی ہم سب کو بھرنی۔

میاں جاوید کس عالم میں ہیں اور اپنے بارے میں کیا سوچ رہے
ہیں۔ خدا ان کو قبیلے کی آنکھ کا تارا بنائے اور رکھے۔ آمین۔

آپ کا

رشید احمد صدیقی

۱۲۳

۶ر جون ۷۲ء

ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ کل ملا اور ایسی ہی خوشی ہوئی جیسے کسی کا ہل الوجود کو ہو سکتی ہے۔ شام ہوتے ہوتے کرفیو بھی نافذ ہو گیا۔ ادھر یونیورسٹی بل کے سلسلے میں جو کچھ ہوا اور ہو رہا ہے اس کی بقول آپ کے دھمک اب شروع ہوئی ہے لیکن اس کی بھنک بہت پہلے سے مل رہی تھی اب دھماکے کا انتظار ہے۔ زلزلے کے یہی لوازم ہیں۔

حادثہ سخت ہو یا جان عزیز۔ رعایت لفظی ہم آپ سے نہ چھوٹے گی! مسعود صاحب ایک بات کہتا رہا ہوں اور کہتا رہوں گا کہ ہم جس متاع کو عزیز رکھتے ہیں یا ہم کو رکھنا چاہیئے، اس کی وکالت، حمایت اور حفاظت سے باز نہیں آ سکتے۔ فرد کا یہی مقام ہے۔ یہی فرد مرد مومن کہلاتا ہے۔ یہ لڑائی حق کے لیے لڑی جاتی ہے۔ ہارنے جیتنے کے لیے نہیں۔ اس کا انجام یا انعام شہادت اور سعادت ہوتا ہے جس کے لیے زندہ ہیں اور زندہ رہنا چاہتے ہیں اس کے لیے مرنے میں کیا ہرج!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ کچھ اور باتیں بھی تھیں لیکن ان کو کسی فرصت کے لیے ملتوی کرتا ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۴

۱۵/جون ۷۲ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب
یورپ کی ایک مثل ہے "بیٹھا بنیا کیا کرے، اس کوٹھی کا دھان اس کوٹھی کرے" یہی حال میرا ہے کچھ کرنے کو نہیں تو خیالات ہی کو ادھر اُدھر کرتا رہتا ہوں۔ اس میں چالیس صفحے اور ہو گئے۔ اس تعطیل میں معلوم نہیں آپ کتنے آفات ارضی وسماوی کی زد میں ہوں گے ان میں ایک میں بھی ہوں۔ کرفیو منڈلا رہا ہے اور منڈلاتا رہتا ہے۔ سامانِ صد ہزار شکنجے کیے ہوئے۔ معلوم نہیں یہ قافیہ وزن میں ہے یا نہیں۔ گھر میں نظر بند رہ کر ایک نظر ان اوراق پر ڈال لیجیے۔ شکر گزار ہوں گا۔ آپ اس درجہ مصروف رہتے ہیں کہ آپ کے پاس وقت کی کمی ہی ہو گی، کبھی جامع المتفرقین ملائیے گا تو مزید گفتگو ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ ملفوفہ اوراق کو آپ کتر بیوت کر کے فکر و نظر کے شمارہ معیار کا بنا سکیں گے اور ان کی پذیرائی خاطر خواہ ہو گی۔ ممکن ہے کہ آپ کو یہ نزاکت محسوس ہو کہ اتنا معاوضہ ایک ہی شخص کو ایک ہی مضمون پر دینا مصلحت اندیشی کے خلاف ہو۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن میرا آفریہ ہے کہ

میں معاوضہ کو بالکل ہی نظر انداز کرتا ہوں ۔ مجھے یہ رقم قطعاً درکار نہیں ۔ خواہش صرف اتنی ہے کہ خطبہ کا زیادہ حصہ فکر و نظر میں شائع ہو جائے ۔ اس لیے کہ اس خطبہ کا کہیں اور چھپنا نہ ممکن ہے نہ مناسب ۔ لیکن ایسا نہ ہو سکے تو آپ مطلق تردد نہ کریں ۔ کسی دوسرے وقت اور موقع کا انتظار کروں گا ۔

ایک بات پوچھنا ہمیشہ بھول جایا کرتا ہوں وہ یہ کہ ساہتیہ اکاڈمی کے اوارڈ کے لیے میرا نام اور نظام خطبات کس نے پیش کیا تھا؟ آپ نے ؟ فکر و نظر وقت پر آگیا ۔ یا ایک آدھ نمبر ابھی پیچھے ہے ؟ شکریہ ۔

ص ۱ سے ۶ تک میں جو تجویز پیش کی گئی ہے ۔ چاہتا ہوں کہ موجودہ حالات میں وہ جلد سے جلد علی گڑھ کی طرف سے پبلک کے سامنے آجائے ۔

آپ کا
رشید احمد صدیقی

۱۳۵

۳۰ رجون ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم . تسلیم
میری خواہش ہے (لیکن آپ کے صوابدید کو ہر حال میں ترجیح ہوگی)
کہ فکر و نظر کی آئندہ اشاعت میں خطبے کا وہ حصّہ شائع فرمائیں
جو غالب، حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق ہے اور آپ کی تحویل
میں ہے۔ اس میں مشکل سے ۲۔ ۳ صفحہ کا اضافہ کروں گا۔ مجھے
کوئی اندازہ نہیں کہ اس کا حجم کیا ہے۔ قیاس ہے کہ شاید ۲۰۔ ۲۲
صفحات پر پھیلا ہوا ہو۔
دراصل چاہتا تو یہ تھا کہ علی گڑھ تحریک ثانی والی تجویز جلد
لوگوں کے سامنے آجاتی لیکن فکر و نظر کے صفحات محدود ہیں اس لیے
مجبوری ہے۔ ایک طرح کی تعمیری اور اصلاحی تحریک علی گڑھ کے محاذ
سے پیش ہو جاتی تو موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے مناسب حال
ہوتا۔ غیر مساعد حالات کو counter (کرنے) کے لیے کچھ کرنا

ضروری ہے۔

ابھی تو فکر و نظر کے چھپنے میں دیر ہے۔ اگر آپ کو میری تجویز پسند ہے تو کسی وقت غالب، حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق اوراق بھیجد یجیے گا اس پر نظر ثانی کر لوں گا...... کی کتاب ...[1] پر اسلوب[2] صاحب کا ردّ عمل بہت سخت ہے وہ اسے خبث نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ کسی کام سے دور دراز کا سفر چند دنوں کے لیے اختیار کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ سفر میں کتاب غور سے پڑھیں۔ میں نے آپ کی طرف سے اجازت دے دی ہے، کتاب محفوظ ہے۔ دیر یا سویر سے آپ کو مل جائے گی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] یہاں نقطے رشید صاحب نے چھوڑے ہیں۔

[2] پروفیسر اسلوب احمد انصاری، شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۱۳۶

۴/۷/۷۳

مسعود صاحب محترم ۔ آداب
اپنے پچھلے خط میں عرض کر چکا ہوں کہ فکر و نظر کی آئندہ اشاعت میں خطبہ کا وہ حصہ شائع کیا جائے تو مناسب ہوگا جو غالب، حالی اکبر اور اقبال سے متعلق ہے۔ اس حصّہ کے آخری اوراق میں وہ واقعہ آگیا ہے جو اکبر کے چار اشعار اور ذاکر صاحب کی کالج سے علیحدگی سے متعلق ہے اور کچھ اشارہ جامعہ ملیہ کی طرف بھی ہے۔ چاہتا ہوں کہ اس حصہ کو آپ چند دنوں کے لیے واپس کر دیں تو میں ان پر نظر ثانی کر دوں جن کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ان اوراق کے چھپنے کی نوبت ابھی کچھ دنوں میں آئے گی۔ تین اوراق مزید بھیجتا ہوں۔ یہ علی گڑھ تحریک ثانی کا تتمہ ہیں ان کو شامل کر لیجیے۔

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان حال میں جو مفاہمت ہوئی ہے۔ کاش اب سے بہت پہلے ہوئی ہوتی۔ کتنی خواریوں، ہلاکتوں اور محرومیوں سے نجات رہتی۔ عقل کتنی آسانی سے اور کتنا جلد ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور کیسے کیسے دردناک "تاوان" لینے کے بعد واپس آتی ہے۔

اللہ ہم کو عقل، سلامتی اور شرافت کے راستے پر رکھے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۳۷

جمعرات، ۶ر جولائی ۱۹۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

مضمون کے چند اوراق اور نوازش نامے ملے تھے۔ اوراق پر نظرِ ثانی کر کے واپس کرتا ہوں۔ انھیں اوراق کے آس پاس حالی پر مضمون ملے گا۔ ایک جگہ اس میں کچھ اضافہ کرنا ہے۔ اس کے بعد جلد اور بجنسہٖ واپس کر دوں گا۔

فکر و نظر کے کس شمارے میں کتنے اوراق اس خطبے کے اور کس بحث سے متعلق کب شائع کیے جائیں گے اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ یہ بات کلیتہً آپ کی مرضی اور صوابدید پر منحصر ہیں۔ جو چاہے کیجیے گا۔ ملفوفہ کتاب اور اس پر اسلوب صاحب کے کچھ ریمارکس آپ کو مل گئے ہوں گے۔ کل شام بھجوائے تھے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۳۸

۱۶راگست ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
نوازش نامہ ملا۔ لکھنؤ کے معرکے[1] میں آپ نے جو باتیں جس طرح کہی ہوں گی۔ ان کے وزن اور وقعت کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ اس اعتبار سے اس کے ردّ عمل کا بھی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔

میرے مضمون کا عنوان وہی رہے گا جو آپ کی رائے ہے۔ یعنی "عزیزانِ علی گڑھ"! شکریہ۔

پچھلے مضمون کے reprints کا بِل اب تک نہیں آیا۔ بھجوادیجیے انتظار ہے۔ لکھنؤ میں کمیشن کے سامنے آپ نے جو بیان دیا ہے وہ پڑھنے کو مل سکے گا؟

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] گجرال کمیٹی کے سامنے میرے بیان کی جانب اشارہ ہے۔

۱۳۹

شنبہ۔ ۲۹ راگست ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

امید ہے کہ میرا خط آپ کو مل گیا ہوگا۔ جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ عرض کیا تھا کہ مجھے آپ کے اس خیال سے کلی اتفاق ہے کہ آئندہ اشاعت میں میرا مضمون فکر و نظر میں آئے گا اس کا عنوان بدلا نہ جائے گا۔ "عزیزانِ علی گڑھ" نمبر ۲ رہے نہ کہ "علی گڑھ تحریک ثانی"۔
دوسری بات یہ عرض کروں گا کہ کسی طرح محولہ بالا مضمون گھنٹے بھر کے لیے مجھے مل سکتا ہے۔ ایک آدھ جگہ نظرِ ثانی کردینی ہے۔ ایک آدھ فقرے شامل کرنے ہیں اور اتنے ہی حذف کردوں گا۔ کمپوزیٹرس کے کام میں حرج واقع نہ ہوگا۔ آپ جہاں چاہیں گے میرا آدمی فوراً پہنچا دے گا۔ آپ کا دفتر کہاں ہے؟ تا کہ اسی کو contact کرلوں۔ اگر آپ کی مرضی ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۰

۲۶ راگست ۷۲ء
ذاکر باغ، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
ہماری زبان کی حالیہ اشاعت میں آپ کا مضمون[1] نظر سے گزرا۔
ہندوستانی اکیڈمی میں ہندی کے جس ممبر کے بیان کا حوالہ دیا ہے اس کا
ایک چشم دید گواہ میں بھی ہوں۔ اکیڈمی کے اس اجلاس کے بارے
میں نہیں کہہ سکتا کہ تقسیم ملک کے بعد جس اولین میٹنگ میں یہ واقعہ
پیش آیا اس میں آپ تھے یا نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ سید ضامن علی مرحوم
اور مولانا عبدالماجد دریا بادی موجود تھے اور میں نے ہی یہ کہا تھا کہ
جب تک ہندوستانی اکیڈمی ہندوستانی کہلائے گی۔ اس وقت تک
اردو اور ہندی کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے اس لیے کہ یہ نام
دونوں کو یکجا کرنے اور رکھنے کے لیے ہی مقرر کیا گیا تھا۔ اس پر ایک
صاحب جو شاید ریاستی مجلس واضعانِ قانون کے ممبر تھے کچھ اس انداز
سے تالی بجا کے انگلیاں مٹکا کے اور ایسے لب و لہجہ میں یہ فقرہ کہا تھا
کہ کیا کوئی اور کرے گا یا کہے گا۔ اجلاس کے صدر ہائی کورٹ کے کوئی

---

[1] میرا صفحہ: اردو کا المیہ۔

جج تھے ان سے رجوع کیا گیا تو کیا بتاؤں کہ ان کا انداز کیا تھا
اتنا کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ نہ جج کی شایانِ شان تھا نہ اکیڈمی
کے۔ اجلاس کے صدر کے پیچھے مڑ کر دیکھا تو سید ضامن علی اور مولانا
عبدالماجد اور دوسرے حضرات جو اُردو کے نمائندے تھے اس طرح
سر اور نظر نیچی کیے ہوئے تھے۔ جیسے ان کے ایک ساتھی سے بڑی
ہی بے عزتی کی بات سرزد ہو گئی تھی! میرے علٰحدہ ہو جانے کے بعد
غالبًا آپ یونیورسٹی کے نمائندہ ہوئے تھے اور آپ کے ساتھ
بھی یہی حادثہ پیش آیا۔

اس مضمون میں آپ کا وہ crisp and poignant ساتھ ہی ساتھ
علمی و ادبی انداز پہلے کی طرح نہیں ملتا۔ ایسا تو نہیں کہ اُردو کے
cause سے مایوس ہو گئے ہوں۔ یہی وقت نبرد آزمائی کا ہے۔ تعداد
کی فکر مت کیجیے۔ یکے مرد جنگی بہ از صد ہزار!

اُردو کی محافظت پر آپ "مامور" من اللہ بھی ہیں اور عندالناس
بھی۔ طبیعت اچھی نہیں ہے ورنہ کچھ اور بھی عرض کرتا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۱

شنبہ ۹/ستمبر ۷۲ء

مسود صاحب مکرم۔ تسلیم
لفافہ واپس ہے اس میں تو بڑا کام رفو کا نکلا۔ بروقت یا بے وقت۔ آپ کی مدد شامل حال نہ ہو جاتی تو میں اس جھنجھٹ میں کبھی نہ پڑتا۔ میں نے نشانات لگا دیے ہیں۔ ہدایتوں پر ایک نظر ڈال جائیے گا۔ حوالہ جات کا خاص طور پر لحاظ رکھیے گا ایک نظر ورق گردانی ضرور کر جائیے گا۔
بہت بہت شکریہ

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۲

انوار ۱۷ر دسمبر ۷۲ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم
فکر و نظر کی تیسری سہ ماہی کا ایشوع اور میرے مضمون کے ۲۵ ریپرنٹس چند دن ہوئے ملے تھے۔ بہت بہت شکریہ۔ اب اس سال کا آخری شمارہ رہ گیا ہے۔ خطبات کا آخری حصہ (تقریباً ۴۵ صفحات آپ کے پاس ہیں) یہ اقبال، حالی اور اکبر کے کلام کی مخصوص اہمیت سے متعلق ہے اور زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ طالب علموں کے ذہنی، علمی اور اخلاقی تہذیبوں کی اصلاح اور استواری کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔ اگر یہ اوراق شائع کیے جا سکے تو میرا خیال ہے کہ ان کو کوئی بے ضرورت یا ناقابلِ التفات نہ سمجھے گا۔ مجھے اطمینان اور خوشی ہو گی کہ باوجود طرح طرح کی معذوریوں کے آپ کے غیر معمولی تعاون اور توجہ کے سہارے اس ادارے کی حمایت و حفاظت میں کچھ کہہ سکا۔ مضمون طویل ضرور ہے لیکن آپ چاہیں گے تو فکر و نظر کے دامن کو آسانی سے اتنا کشادہ کر سکیں گے جو سارے رسالے کے مفید اور مقبول ہونے اور رکھنے میں معین ہو۔

اس خطبے کے ابتدائی ۳۰ - ۳۵ صفحات کے شائع کیے جانے کی
کوئی اور سبیل کروں گا۔ مجھے آپ کے اس خیال سے پورے طور پر اتفاق
ہے کہ فکر و نظر میں کوئی ایسی بات شائع نہ ہونی چاہیے جس میں اس
ادارے اور اس کے منتظمین کو کسی طرح کی دشواری میں مبتلا ہونے کا
امکان نکلتا ہو۔ اکثر اس امر کا بھی اعادہ کر چکا ہوں کہ مضمون کے
معاوضے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ اگر اندیشہ ہو کہ لوگ آپ پر
پاسداری کا الزام لگائیں گے کہ میرے لیے زیادہ صفحات وقف
کیے گئے تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ زیادہ اخراجات کی تلافی
اس معاوضے کی رقم سے کر دی گئی جو مجھے دی جانے والی تھی۔ لیکن
یہ گفتگو اسی وقت قابلِ لحاظ ہوگی جب مضمون معیاری ہو۔ دوسرے
اور تیسرے درجہ کے مضامین کے لیے یہ دلائل دور از کار ہیں۔ اگر
آپ تیسری قسط چھاپنا نامناسب نہ سمجھتے ہوں تو ان اوراق کو میرے
پاس بھیج دیجیے گا میں ان پر ایک نظر ڈال لوں گا۔ اس سے وہ
اور بہتر ہو جائیں گے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۳

جمعہ ۲۲ ستمبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

پچھلے خط میں کچھ باتیں عرض کی تھیں۔ فکر و نظر میں اپنے خطبات کے ایک حصہ کی اشاعت کے بارے میں کہاں تک وہ قابلِ قبول یا اس کے برعکس پائی گئیں۔ خیال تھا کہ اگر وہ چھپنے کے لائق ہیں تو فکر و نظر کی آخری سہ ماہی میں شائع کر دی جائیں۔ سلسلہ منقطع ہو جانے سے اور کبھی آئندہ چھپنے سے ان کا اثر زائل ہو جائے گا۔ لیکن یہ سب باتیں پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں۔ اس بارے میں میری درخواست ہے۔ مطلق کوئی نزاکت نہ محسوس فرمائیں یہ میرے لیے تکلیف دہ بات ہوگی جو میں کسی قیمت پر گوارا نہ کر سکوں گا۔

خیال تھا کہ اگر وہ اجزا چھپنے والے ہوں تو دو چار روز کے لیے میرے پاس بھیج دیئے جائیں جہاں تہاں سے ان کو اور بہتر بنانے کی کوشش کروں گا۔

آپ ان دنوں کہیں باہر تو تشریف نہیں لے گئے تھے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

جہاں تک لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے فکر و نظر میں خطبے کے یہ اقتباسات پسند کیے گئے۔

۱۴۴

بدھ، ۱۱؍اکتوبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

(۱) آپ کے اسسٹنٹ کے بارے میں بالآخر کیا طے ہوا؟

(۲) فکر و نظر کے تحقیقی یا غیر تحقیقی رکھے جانے کے سلسلے میں کیا ہوا؟

(۳) فکر و نظر کی آخری سہ ماہی شمارے کے حجم کے بارے میں آپ نے فرمایا تھا کہ کم و بیش سو صفحات کا ہوگا۔ میرے مضمون کے بارے میں آپ نے مشورہ دیا تھا کہ ۴۰ کے بجائے نصف یعنی ۲۰ صفحے کا کر دیا جائے وہ میں تے کر دیئے۔ آپ نے یہی فرمایا تھا نہ؟ جب طلب کیجیے گا حاضر کر دوں گا۔ میرا مضمون حسب معمول رسالے کے آخر میں ہوگا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۵

۱۸ اکتوبر ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

دعوت (دہلی) میں آپ کی تقریر زبان دہلوی کا خلاصہ نظر سے گزرا۔ اچھی رپورٹنگ تھی۔ اس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب علم وفن میں کس قدر مقبول ہوئی ہوگی۔ مبارک ہو۔

آپ کے مضامین یا تصانیف پر کسی حلقے میں کسی سطح پر سوا تعریف کے اب تک کچھ اور بات سنی نہ پڑھی. یہی بات یوسف صاحب کی تحریروں میں بھی پائی۔ ذاکر صاحب کے بارے میں کچھ کہنا ہی نہیں۔ بعض اصحاب سے کل سرسید ڈے کے موقع پر آپ کی مختصر تقریر کی بھی بڑی تعریف سنی اور ایسے لوگوں سے سُنی کہ جو نہ آپ سے بہت زیادہ واقف تھے نہ سرسید سے۔ یہ اور ایسا خراج تحسین بڑا بیش قیمت ہوتا ہے۔ گجرال کمیشن کو انجمن نے جو یادداشت پیش کی تھی اس کا اردو ترجمہ اور اس پر آپ کا اداریہ بہت اچھا رہا۔ اُردو کی بیوگی کا استعارہ ذرا طویل ہوگیا۔ شعر وادب ہو، زندگی ہو، رنج وراحت کے مواقع ہوں مجھے "بیوگی" کا استعارہ یا strain, اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اس میں متداول مرثیہ کو بھی شامل کرتا ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا اس بارے میں

اکثر میں نے آپ کو ٹوکنے کی جسارت کی ہے۔

سرسید ڈے کے سلسلے میں ایک خیال اکثر آیا کہ اس موقع پر
آپ سرسید اور علی گڑھ تحریک پر مقرر خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے
یہ چیز بڑی مفید اور مستند ہوتی ہے۔

آپ نے جون میں علی گڑھ چھوڑا۔ اس کے بعد ہی میں نے آپ کو
خط بھیجا تھا۔ اُسی دن معلوم ہو گیا تھا کہ آپ باہر گئے ہوئے ہیں اور کچھ
دنوں بعد واپس تشریف لائیں گے۔ اس میں چند باتیں دریافت کی تھیں۔

(۱) آپ کے اسسٹنٹ کا کیا رہا؟

(۲) فکر و نظر کے تحقیقی یا تنقیدی رکھے جانے کا مسئلہ؟

(۳) فکر و نظر کے اس آخری سہ ماہی شمارے کے بارے میں آپ نے
بتایا تھا کہ صفحات کی گنجائش کم ہے اور امیدیں بھی زیادہ نہیں اس
لیے مجھے اپنے خطبے کا حجم کم کر دینا ہوگا۔ چنانچہ اسے نصف کر دیا گیا۔
یعنی اب زیادہ سے زیادہ بیس ۲۰ صفحات پر آجائے گا۔ جب منگائیے
گا بھیجدوں گا۔ زبان دہلوی "فکر و نظر" میں شائع ہوگا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۴۶

۲۰ر اکتوبر ۶۷ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

والا نامہ ملا۔ حالی اور اقبال سے متعلق مضمون بالکل تیار ہے اس کو فوراً آپ کی خدمت میں بھیج سکتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ ایک بار اطمینان سے آپ اس کو بھی دیکھ لیں۔ تاکہ کوئی ایسی بات شائع نہ ہو جائے جو کسی اعتبار سے نامناسب یا بے موقع ہو۔ آپ دیکھ لیں گے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا۔ آپ نے لکھا ہے کہ شملہ جانے کے لیے پابہ رکاب ہیں۔ ایسے میں ظاہر ہے کہ مضمون آپ کی خاص توجہ سے محروم ہو جائے گا اس لیے اسے نہیں بھیجتا۔ لیکن اگر آپ یہ کر سکیں کہ امانت میں رکھ لیں اور سفر سے واپسی کے بعد دیکھ لیں گے تو بھیج دوں گا۔ خدا کرے آپ کی شملہ کی مہم پوری طرح کامیاب ہو جیسی کہ ایسی ہوتی رہی

انجمن کے الکشن کا نتیجہ دعوت میں شائع ہوا تھا اور نظر سے گزر چکا ہے۔ میں سب سے زیادہ یوسف صاحب کے میں تھا اور وہ ہو گئے۔ خوش ہوا۔ خدا مبارک کرے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

آپ کس تاریخ کو علی گڑھ چھوڑ رہے ہیں۔

۱۴۷

۷ر نومبر ۶۷۲

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

کیسا مزاج ہے اور کس عالم میں ہیں؟ آپ تو باہر کسی سیمینار
ں شرکت کے لیے گئے تھے اور آپ کے ساتھ شاگردوں کی ٹیم
ں تھی۔ دعوت میں پڑھا کہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی اس لیے مقالہ
ھ نہ سکے۔ اس دوران ڈاکٹر اطہر صدیقی صاحب نے ایک خاتون
ا مقالہ فکر و نظر میں شائع ہونے کے لیے بھیجا۔ اسے آپ نوٹ
ے ساتھ آپ کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے کیا فیصلہ
یا۔ چاہتا ہوں کہ آپ کی خیریت کی خبر ملے جس سے تردد دور ہو۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۸

۱۹/۱۱/۷۲

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

آپ کے پاس حالی، اکبر اور اقبال سے متعلق خطبے کے کچھ اوراق ہوں گے۔ اکبر کے بیان میں ایک پیراگراف کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں۔ معلوم نہیں کہ متذکرہ صدر شعرار میں سے آپ فکر و نظر میں کب کس کو جگہ دے سکیں گے یا نہ دے سکیں گے۔ اس لیے کہ اس کا بھی احساس ہے کہ اوروں سے کہیں زیادہ فکر و نظر کے اوراق میں مجھے حصہ ملتا رہتا ہے۔ نیز تحقیقی اور تخلیقی انداز کے مضامین کے تناسب کا مسئلہ بھی سامنے آ گیا ہے وغیرہ۔ بہر حال اکبر سے متعلق اوراق مل جائیں تو اس میں ایک پیراگراف کا اضافہ کردوں۔ ایسی کوئی جلدی نہیں ہے۔ آسانی سے کہیں مل جائیں تو بھیجد یجیے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۴۹

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

(۱) آپ دوبارہ حیدرآباد گئے اور واپس آ گئے یا نہیں؟

(۲) جامعہ اُردو کے حالیہ جلسوں کی تفصیل ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے معلوم ہوئی تھی اب کیا ہوگا؟ شاید ۲۴ر کو پھر جلسہ ہے آپ اس میں شرکت فرماسکیں گے؟

(۳) لسانیات کے افق پر جو نیا ستارہ طلوع ہوا ہے اس کی جہورت ایک high priest نے کرا تو دی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عشاق کیا فیض پاتے ہیں[1]

(۴) فکر و نظر کے سال تمام نمبر میں اگر میرا مضمون حالی اور اقبال سے متعلق شائع ہوا ہو تو بلگرامی صاحب سے فرمادیجیے گا میرے لیے reprints کا انتظام رکھیں گے۔

(۵) ایک موقر رسالہ میں حوالی موالی لکھا دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ اسے اہالی موالی ہونا چاہیے۔ کوئی مستند اردو لغت ہو تو دیکھ کر مطلع فرمایے گا۔

امید ہے آپ خوش و خرم ہوں گے۔ متعلقین بھی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] میرا صفو: نوآم چامسکی، ۸ر دسمبر ۷۲ء (ہماری زبان)۔

۱۵۰

۴ر جنوری ۷۲ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

اتوار ۷ر جنوری کو جامعہ اردو کی عاملہ میٹنگ ہو۔ بہتر ہو اگر آپ بعض امور بحث طلب پر ڈاکٹر نذیر صاحب اور سرور صاحب سے گفتگو فرمالیں۔ اچھا ہوگا اگر مسائل متنازعہ پر متفقہ فیصلہ ہو۔ جامعہ اردو کے مستقبل اور بہترین اغراض ومقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہی طریق کار ہوگا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

میرے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ اگر کشمیر کے چیف منسٹر میر قاسم صاحب کو امیر جامعہ منتخب کیا جائے تو بہت مناسب ہوگا۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب اس بارے میں کوشش کردیں گے کہ اس منصب کو قبول فرمالیں میٹنگ سے پہلے آپ سرور صاحب اور نذیر صاحب سے مشورہ کرلیں تو بڑا اچھا ہوگا۔

میرا پہلا عریضہ بھی ملا ہوگا امید ہے آپ میری فرمائش قبول فرمائیں گے۔

۱۵۱

۸ رجنوری ۱۹۷۳ء

مسعود صاحب مکرم و محترم۔ آداب

کل شام کی گفتگو کے سلسلے میں عرض ہے۔ بعض معذوریوں کے سبب جن سے آپ واقف ہیں جامعہ اُردو کے کسی منصب سے منسلک نہیں رہنا چاہتا ہوں وہ منصب کتنا ہی اعزازی یا نمائشی کیوں نہ ہو۔ اس میں سب سے بڑی اور حال کی نزاکت جس کا مجھے غیر معمولی احساس ہے وہ یہ کہ جامعہ اُردو کے انصرام و انتظام میں ڈاکٹر رضوی صاحب کے ساتھ ایک مدّت تک کام کر چکا ہوں۔ موصوف نے ہر موقع پر میرا بڑا لحاظ رکھا ہے اور تعاون کیا ہے۔ وائس چانسلرشپ کے لیے میں نے ان کا نام تجویز کیا جو کسی نہ کسی سبب سے قابلِ قبول نہیں ہوا۔ اس بارے میں مجھے کوئی شکایت نہیں۔ آپ سب جامعہ اُردو کی نیک نامی کے خواہاں ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ۔ اس کا میں احترام کرتا ہوں صرف اپنے بارے میں عرض کروں گا کہ میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں جامعہ سے وابستہ رہوں اور ڈاکٹر رضوی صاحب کلیتہً علاحدہ کر دیئے جائیں۔ میں نے آپ صاحبان کے اصرار کو برابر پیشِ نظر رکھا۔ آپ کی اور دوسرے دوستوں کی رفاقت مجھے عزیز ہے۔ ایسے میں مجبور ہو جاتا ہوں تو اپنی معذوری کا اظہار کرتا ہوں۔ لیکن یہ بھی گوارا نہیں کہ مجھے خوش کرنے کے لیے آپ کوئی ایسا راستہ

اختیار کریں جسے آپ پسند نہ کرتے ہوں۔ میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ مولوی حاجی عبیدالرحمٰن خاں صاحب شروانی کو پرو چانسلر منتخب فرمائیں۔ موصوف کی خدمت، شخصیت، تجربہ، شہرت اور ان کا مقامی ہونا سب اس کے متقاضی ہیں۔ ہم میں سے وہ سب کے لیے خاص طور پر مالک رام صاحب کے لیے قابلِ قبول ہوں گے۔ اس خط کی نقل میں سرور صاحب اور ڈاکٹر نذیر صاحب کی خدمت میں بھیجنے کی سکت نہیں رکھتا اس لیے کہ صبح سے آنکھوں میں درد شروع ہو گیا ہے چاہتا ہوں کہ فیکلٹی میں دونوں اصحاب مل جائیں گے۔ آپ ان سے اس عریضہ پر بحث کر کے مجھے مطلع فرمادیں۔ اس کے بعد مالک رام صاحب کو مطلع کردوں گا۔ لیکن اس میں بھی کوئی قباحت نہیں دیکھتا ہوں کہ ان کو (مالک رام صاحب کو) اپنی معذوری لکھ بھیجوں۔ آپ صاحبان کے فیصلے سے آگاہی ہو جائے تو رفیق زکریا صاحب کو خط لکھوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ پروفیسر سرور صاحب اور ڈاکٹر نذیر صاحب کو مطلع کر رہا ہوں کہ میں نے آپ کو خط لکھا تاکہ آپ سب اس پر گفتگو فرمالیں۔ خط کی نقل نہیں بھیجی ہے۔ مجھے قوی امید ہے بلکہ آپ صاحبان سے درخواست ہے کہ میری مشکل آسان فرمائیں۔ شکریہ

۱۵۲

۲۸؍جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل شام ڈاکٹر نذیر صاحب تشریف لائے ان سے حالات معلوم ہوئے میری درخواست ہے کہ آپ جامعۂ اُردو کی وائس چانسلری قبول فرمائیں اس کے بعد جیسی کچھ پیش آئے گی یا صورتِ حال ہوگی دیکھا جائے گا اور وہی کیا جائے گا جو آپ چاہیں گے۔

ایک بات کی طرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ موجودہ صورت یہ ہے کہ دو مقتدر ہندو عہدہ داروں (پنڈت راج ناتھ کنزرو مرحوم چانسلر اور پنڈت آنند نرائن ملا پرو چانسلر) کے بجائے دو مسلم عہدہ دار لانا چاہتا ہیں۔ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ طریقہ مصلحت اور دور اندیشی کے خلاف ہے۔ جامعہ اُردو نیز مسلمانوں کے خلاف ایک سستا لیکن موثر حربہ فتنہ پردازوں کے ہاتھ آئے گا۔ اس لیے پنڈت آنند نرائن ملا صاحب کو جوں کا توں پرو چانسلر رہنے دینا چاہیے۔ اس بارے میں سرور صاحب کو بھی لکھا ہے۔ اطلاعاً آپ کی خدمت میں بھی عرض ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۳

۳۱ جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

عنایت نامہ ملا تھا آپ کی صحت کی بحالی کی خبر سن کر تردد رفع ہوا۔ اللہ کا شکر ہے۔ میرا خیال ہے یہ مسلسل اور طویل سفر کا strain تھا۔ بلڈ پریشر کو کم کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے اور موثر ثابت ہوئی ہے وہ یہ کہ دو تین دن کوئی پیشاب آور دوا استعمال کر لی جائے۔ ایسی انگریزی دوائیں عام ہیں اور کوئی بھی ڈاکٹر بتا دے گا۔ اب غالباً اس کی ضرورت نہیں رہی ہو گی لیکن اس کو ذہن میں رکھیے۔

آپ نے جامعہ کی سربراہی کا منصب قبول فرما کر مجھ پر احسان کیا ہے اس کا مجھے بڑا خوش گوار احساس ہے۔ میں جانتا ہوں اس طرح کے کاموں کے لیے آپ کے پاس نہ وقت ہے نہ کوئی دلچسپی۔ اس سے کہیں زیادہ ذمہ داری، منفعت اور اقتدار کے مناصب آپ نے یونیورسٹی میں نہیں قبول کیے۔

ٹرژرر کے انتخاب سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ منتظمین میں کچھ افراد ایسے ہیں جو اس ادارے کے بنیادی اور بہترین مقاصد کو ثانوی اور شخصی اغراض پر ترجیح نہیں دینا چاہتے۔ موجودہ رجسٹرار کے

طریقہ کار سے ایسے عناصر کو شہ ملے تو عجب نہیں۔ دعا ہے کہ آپ ان قباحتوں کو دور کر سکیں۔ ڈاکٹر رضوی صاحب کی رپورٹ پر جو کارروائی جس طور سے ہو رہی ہے اس کی بھی سمت و رفتار اندیشے سے خالی نہیں۔ اس لیے جامعہ کی صحت مندی اور اچھی شہرت کی طرف سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

دعا ہے کہ آپ ان تمام دشواریوں پر قابو پائیں اور جامعہ کی کشتی موافق آب و ہوا میں ساحل مراد کی طرف بڑھتی رہے۔

میں نے فکر و نظر میں خطبات کے بعض حصوں کو شائع کرنے کے سلسلے میں جو باتیں عرض کی تھیں ان کی طرف سے آپ بالکل فکر مند نہ ہوں ان کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں کسی طرح نہ چاہوں گا کہ رسالے کے عام مفاد اور مصالح کے راستے میں میری فرمائش کسی طور پر بھی حائل ہو وہی کیجیے صرف اتنا کیجیے کہ آپ تردد میں نہ پڑیں۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ہوگا۔

پریشر کی شکایت کے سلسلے میں اس کی احتیاط تھوڑی بہت ضرور ملحوظ رکھنی چاہیے کہ طویل زینوں پر ہر روز چڑھنے اور اترنے کا مشغلہ نہ ہو۔ آپ کا شعبہ غالباً تیسری منزل پر ہے اور یہ یقینی ہے کہ ہر روز دو ایک بار ضرور چڑھنا اترنا ہوتا ہوگا۔ یہ مشقت زیادہ ہے۔ بچنے کی کوئی صورت نکالیے۔ خدا حافظ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۴

اتوار، ۱۱ر فروری ۷۲ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
دونوں نوازش نامے ملے۔ ایک کل دوسرا آج۔
ہماری زبان سے متعلق میری تحریروں کو کام میں لانا یا نہ لانا کلیتہً آپ کی صوابدید پر منحصر ہے جس طرح چاہیے کام میں لائیے البتہ یہ عرض کروں گا کہ چوں کہ یہ تقریبًا تمام کسی نہ کسی شکل میں آپ کے context میں لکھی گئی ہیں یا یوں کہیے کہ آپ کے محور پر گردش کرتی ہیں اس لیے آپ کا حوالہ صراحتہً یا کنایتہً ضروری ہے۔ اس پر آپ کے ریسرچ اسکالر اصرار کریں تو عجب نہیں جب کہ میں بھی ان کی تائید کرتا ہوں۔

پہلے خط میں آپ نے اپنے چک اپ کی جو تصویر بھیجی تھی بحیثیت مجموعی ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر بھی یہی کہتے ہوں گے۔ پریشر کا ایک طرف سے ۱۰۵ ہونا جب کہ دوسری طرف سے ۸۰ ہو ڈاکٹروں کے نزدیک قابلِ لحاظ نہ ہوگا۔ لیکن چاہتا ہوں کہ ۱۰۵ کے بجائے زیادہ سے

یادہ ۱۵۰ اور ۱۴۰ کے درمیان رہے تو اچھا ہوگا dieting
ھیک ہے۔ لیکن اس کا ضرور لحاظ رکھیے کہ تن و توش کی کمی کے ساتھ
انائی میں کمی نہ آنے پائے۔ خاص طور پر جب کمیں گاہ میں خنکر
، موجود ہونے کا احتمال ہو۔ فیکلٹی میں زینوں پر اترنے چڑھنے کا
سئلہ بڑے تردد کا ہے۔ جو قوت آپ کئی دن میں آرام، غذا
ر پرہیز سے جمع کر پائیں گے وہ طویل زینے پر ایک بار چڑھنے
زنے سے زائل کردیں گے۔ یہ جمع خرچ کسی طرح قابلِ اطمینان
ہیں ہے۔ کمزوری کا اتنے دنوں کا اس طرح persist کرنا کر
زیادہ گفتگو سے بھی تکان محسوس ہونے لگے ٹھیک نہیں۔ معالج سے
س کا ذکر کیجیے اور سیب سنترے سے رجوع کیجیے۔ انشاء اللہ
سارا کشٹ دور ہو جائے گا۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۵۵

۲۵/۲/(ـــــ؟)

مسعود صاحب محترم ۔ آداب

مسودہ (   ) کو میں نے صاف کرلیا ہے ۔ اب یہ آسانی سے پڑھا جا سکے گا ۔ چاہتا ہوں کہ تکلیف فرما کر آپ اس پر ایک نظر ڈال لیں ۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسی باتیں راہ پاگئی ہوں جو غلط یا غیر ضروری ہوں یا تاریخی اعتبار سے مقدم موخر ہوگئی ہوں اس لیے محلِ نظر ہوں ۔ اس کی تیاری میں میں نے اتنی کانٹ چھانٹ کی ہے کہ اب اس پر نظر ڈالنے کو نہ دل چاہتا ہے نہ ہمت ہوتی ہے آپ دیکھ لیں گے تو مجھے اطمینان ہو جائے گا ۔ شکریہ

جب فرمایئے گا مسودہ بھیج دوں گا ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۵۶

۱۵؍ مارچ ۷۳ء

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
۱۲؍ کو آپ کی مجلسِ منتظمہ[1] کی میٹنگ ہے۔ اس میں رفیق زکریا صاحب شرکت کے لیے بمبئی سے آرہے ہیں۔ پروگرام یہ ہے کہ ۱۲؍ کو میل سے دہلی آئیں گے اور ریکم کو میل سے (شام کو) دہلی واپس ہوں گے۔ ویسے تو حکومت کی سطح پر ان کے قیام کا بندوبست علی گڑھ کے سرکٹ ہاؤس میں ہوگا۔ لیکن خود زکریا صاحب اس کو ترجیح دیں گے کہ ان کا قیام یونیورسٹی گسٹ ہاؤس میں ہو۔ یہ آسان ہے اور بہتر بھی ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۳؍ کو منتظمہ کی میٹنگ ہوگی اس میں اراکین کے لنچ کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے اب کے یہ لنچ ذرا بہتر پیمانے پر کر دیا جائے جو ایک طور پر معزز مہمان کے شایانِ شان ہو۔ اس پر کچھ زیادہ بھی صرف ہو جائے تو خیال ہے کہ اس کی تلافی خاطر خواہ ہو جائے گی۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ زکریا صاحب کو ایک ایڈریس بھی اس تقریب میں دے دیا جائے جس میں ہم کچھ عرضِ مطلب بھی کر سکیں۔ یہ تقریب زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہو جائے

---

[1] جامعہ اردو

گی اور اس کا وقت گیارہ بجے سے دو بجے تک نکالا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں چاہتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لیے آپ سے گفتگو ہو جائے۔ یعنی یہ کہ محترم مہمان کا پروگرام کیا ہوگا۔ وائس چانسلر صاحب سے کیا گفتگو ہو کہ ایک طور پر یونیورسٹی کی طرف سے پذیرائی ہو جائے۔ informal or formal کسی طور پر زکریا صاحب نے جب جامعہ سے دائمی دلچسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے تو مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم سے بھی جو کچھ ہو سکے اس سے دریغ نہ کریں۔ اس لیے آپ کی گفتگو وائس چانسلر صاحب سے ہونا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ صفائی وغیرہ کا انتظام علی گڑھ میونسپلٹی (جامعہ کے اردگرد) خود کرا دے گی۔ اس کا انصرام نثار صاحب کرا سکیں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

محترمہ بیگم زکریا بھی ساتھ ہوں گی۔

۱۵۷

۲۰ مارچ ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل دہلی کے روزنامہ دعوت میں یہ خبر پڑھی کہ اردو بورڈ[1] کی طرف سے آپ کو ۱۷۰۰/ انعام ملا۔ بہت خوش ہوا۔ اللہ مبارک کرے۔ ساتھ ہی یہ محسوس ہوا کہ ۲۰۰۰/ کا کیوں نہیں۔ جہاں آپ کے علمی اور ادبی مرتبے کی بحث آئے گی اس طرح کا سوءِ ظن پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں۔

آج سلمیٰ کے آنے کی توقع ہے آجائے تو مسعود محل charges کا معاملہ روبراہ کر لیا جائے۔ بیٹھے بٹھائے کیسی زیر باری جامعہ کو اٹھانی پڑ رہی ہے، سوءِ اتفاق کو کیا کہیے۔

بلگرامی صاحب کو ہدایت کر دیجیے گا کہ مجھے اپنے مضمون کے حسب دستور ۲۵ آف پرنٹس درکار ہوں گے جن میں سرورق نہ لگایا جائے احتیاطاً میں نے ان کو ایک خط لکھ دیا ہے۔ والسلام۔ خیر طلب

رشید احمد صدیقی

کچھ دن ہوئے معلوم ہوا تھا کہ یوسف صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ پتہ نہیں معلوم تھا اس لیے سعیدہ کو لکھا لیکن انھوں نے خط کا جواب نہیں دیا۔ کچھ آپ کو معلوم ہے؟

---

[1] اردو اکیڈیمی (اترپردیش) ورشید صاحب نے نام غلط لکھا ہے)۔

۱۵۸

جمعہ ۱۶ اپریل ۷۳ء -

مسعود صاحب مکرم - تسلیم

نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ آپ تو جیسے اقبال کے کلام کا جامع اشاریہ ہوں۔

یونیورسٹی پر جو کچھ گزری اور گزرنے والی ہے اس کے بارے میں کیا کہوں۔ سالہا سال سے دور اور نزدیک کے مسلمان جس خواری میں مبتلا ہیں اس کو سن یا دیکھ کر ہمیشہ اور ہر وقت زاری کی ہے اور دعا مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس مرحلے میں خیریت سے گزار دے ورنہ وہ نہ ہو جس کا اندیشہ ہے۔ لیکن ہوا وہی جس کے نہ ہونے کی بارگاہ باری تعالیٰ میں دعائیں مانگا کرتا تھا۔

کیا کہوں اور کیسے کہوں کہ علی گڑھ میں جو ہوا یا خدانخواستہ اور ہونے کو ہے اس میں ہمارا قصور نہیں ہے۔ جن طلبا کی ہوا خواہی اور عیب پوشی میں زندگی اور زندگی کی دی ہوئی نعمتوں کو وقف رکھا، خوش ہوا اور فخر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اچھے کام کرنے کی توفیق دی۔ ان کے طرزِ عمل کو دیکھ کر جیسا رنج پہنچا اور خواری ہوئی اس کو کیسے ظاہر کروں۔ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ ناگفتنی ہر اس جگہ ملتی ہے

ہاں مسلمان کسی نہ کسی حیثیت سے آباد ہیں۔ اس وائرس کو پہچاننے
کے لیے مسلم وائرس کا طبی نہیں اخلاقی نام دیا جا سکتا ہے۔
کیسی کیسی امیدیں ان بدنصیب اور گمراہ لوگوں سے ان کے
فلوک الحال اور قابلِ رحم والدین اور سرپرستوں نے لگا رکھی ہوں
گی کہ امتحانات سے فارغ ہو کر روزی روزگار سے لگ جائیں گے۔
لڑکیوں کا سامان ہو جائے گا وغیرہ۔ اور کیا نتیجہ سامنے آ رہا ہے۔
ادھر ۲ ½ ماہ سے دیکھتا ہوں آپ کی صحت اعتدال پر
نہیں آ رہی ہے اس لیے کوئی خاص اقدام کرنا پڑے گا وہ کیا
ہو، وہ بھی آپ ہی کو طے کرنا پڑے گا۔ احتیاط، غذا، تفریح
وغیرہ۔ دواؤں سے صرف اور اس وقت اور اسی وقت تک
کام لینا چاہیے۔ جب تک ناگزیر ہو۔
اللہ تعالیٰ صحت اور خرمی بخشے۔ آمین

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

١٥٩

جمعرات ٢ / مئی ۷۳ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم ۔ سلام شوق

آپ کا عطیہ "اردو کا المیہ" کے دو نسخے پرسوں موصول ہوئے۔ یہ کا
بہت اچھا ہوا۔ جی خوش ہو گیا۔ آپ کے قیمتی مضامین کتابی شکل میں آکر محفو
ہی نہیں ہو گئے بلکہ ان کی فیض رسانی عام اور مسلّم ہو گئی۔ مستند علماء کے اف
عالیہ طالب علموں کے لیے بڑی نعمت ہوتے ہیں۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ آج کا
طالب علم عطائیوں کے سستے اور خطرناک بیوپار سے محفوظ رہتا ہے۔ اس مجمو
مضامین کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اردو کے طالب علم کو اردو کے مسائل
معمولی قسم کی کتابوں کے مطالعہ کی محتاجی نہیں رہے گی۔ یقین ہے ا
گراں قدر مجموعہ کی پذیرائی غیر معمولی ہوگی۔

دوسری بات یہ کہنے کی تھی کہ آپ نے جو خدمت میرے سپرد کی تھی
کو پورا کرنے کے لیے ایک ہفتہ سے سر مارتا رہا ہوں لیکن ایک پیشر
گئی اتنا ہی اب شرمندہ اور مایوس ہوں کہ کچھ کر نہ پایا۔ مجھے معاف کر
تو اطمینان ہوگا اور بہت خوش ہوں گا۔

امید ہے آپ خوش ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۶۰

۲ر مئی ۷۲ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب
میرا کل خط ملا ہوگا۔ ایک تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ کل ۵ر کی میٹنگ میں غالباً یہ طے ہوگا کون خطبہ دے کمیٹی سے authorization کیوں نہ لے لیجیے کہ آپ کسی موزوں شخص کا انتخاب کریں گے۔ ممکن ہے چند دنوں بعد اپنی معذوریوں پر غلبہ پا سکوں۔ مشکل یہ ہے کہ آپ کی فرمائش پوری نہ کرنے میں بڑی بے غیرتی محسوس ہوتی ہے اور جی یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح تعمیل کر سکوں۔ لیکن ایسا نہ کر سکا تو آپ کسی اور کو منتخب کرلیں گے۔ اب کے کوئی خاتون کیوں نہیں۔ مثلاً بیگم حامدہ حبیب اللہ لکھنؤ یا بیگم انیس قدوائی دہلی وغیرہ۔ خود گجرال صاحب سے کیوں نہ درخواست کی جائے۔ مصلحت بھی اس کی متقاضی ہیں۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ شاید اردو بورڈ کی کوئی عہدہ دار یا ممبر ہیں۔

معلوم نہیں گجرال صاحب اُردو میں نوشت و خواند کر سکتے ہیں یا نہیں؟

آج شام کچھ اور کرنے کو نہ ہو تو کچھ دیر کے لیے تکلیف فرمائیے۔ مصرحہ بالا مسائل پر گفتگو ہو جائے گی۔ مگر یہ ضروری بالکل نہیں ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۶۱

۸ مئی ۷۳ء

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

(۱) خطبہ دینے والوں کی فہرست کیا ہے؟

(۲) سرسید بکڈپو نے مصنفین کی رائلٹی نہیں دی۔ بکڈپو کا مالی سال تو مارچ تک ختم ہوگیا۔ اب مئی ہے۔

(۳) اردو کی کوئی مختصر تاریخ نہ مل جائے گی جو صرف ایک جلد میں ہو۔ شرط یہ ہے کہ اس میں وہ تمام باتیں بھی مل جائیں جو میں چاہتا ہوں

امید ہے آپ خوش وخرم ہوں گے۔

میں انجمن ترقی اُردو کے جلسوں میں نہیں شریک ہوا۔ کوئی لاک چارج یا آفسو گیس؟

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۲

۲۵ر مئی ۷۳ء

مسعود صاحب محترم تسلیم

پرسوں فکرو نظر ملا۔ شکریہ۔ آپ کے غیر معمولی کرم کا شکر گزار ہوں کہ اس میں "عزیزانِ علی گڑھ" کی اتنی طویل قسطیں شائع ہوائیں۔ یہ سلسلہ اب ہمیشہ کے لیے ختم کیا جاتا ہے۔ ناظرین فکرو نظر نے جس صبر و تحمل سے کام لیا ہے اس کو میں اپنا اور ان کا دونوں کا کارنامہ سمجھتا ہوں جس میں آپ کا حصہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ البتہ اس بار ٹائپ کی فاش غلطیاں راہ پا گئی ہیں۔ مثلاً مفاسد کو مقاصد، قوی کو قومی وغیرہ۔ اس سے مطلب کچھ کا کچھ ہو گیا۔ جہاں کا ما لگنا چاہیے وہاں بڑی پابندی سے فُل اسٹاپ یا ڈیش لگا ہوا وغیرہ۔ با ایں ہمہ خوش ہوں کہ بہت کچھ ہو گیا

کل ہماری زبان میں آپ کا مضمون نظر سے گزرا۔ اس سے انکار نہیں کہ سب زبانیں تشکیلی اعتبار سے یکساں طور پر اہم ہیں۔ البتہ ماہرین لسانیات سے ہمدردی کروں گا جن کی نظر میں ادنیٰ اور اعلیٰ زبان کا مفہوم عام ہے اور عربی و عجمی کی اصطلاحیں بے معنی ہیں۔ جزو کے ماہرین کی یہی محرومی ہے۔ زبان کی ابتدا کسی طور پر ہوئی ہو فرق اس وقت سے پڑنے لگتا ہے جب وہ تہذیب اور ثقافت کے دائروں کے قریب ہونے لگتی ہے۔ اس کی اہمیت بدلنے لگتی ہے اور بالآخر بہ

کچھ ہو جاتی ہے۔ اُردو کے مقدمہ کی وکالت میں مایوسی اور بے دلی کا اظہار اس بنا پر درست نہیں کہ وہ ناسازگار حالات سے دوچار ہے۔ اس کی حمایت اس لیے ضروری ہے کہ فرائض میں داخل ہے کہ وہ ایک ایسی قوم، ملک و تہذیب اور صحت مند تقاضوں کی آوردہ ہے جو اپنی حیثیت اور خدمات کے اعتبار سے عزت اور منزلت کی سزاوار رہ چکی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمان جس خواری میں مبتلا ہو گئے ہیں جس میں ان کا قصور کچھ کم نہیں ہے اس سے ہم اس درجہ پسپا اور مایوس ہو گئے ہیں کہ اپنے کو اپنے کارناموں کو ساقط الاعتبار سمجھنے لگے ہیں۔ اُردو کی حیثیت صرف اس سے متعین نہیں ہوگی کہ اس سے کام میں لانے والوں کی تعداد کسی خطہ میں قابلِ لحاظ ہے یا نہیں بلکہ اس سے متعین ہوگی کہ اس کو کام میں لانے والوں کی تعداد کتنی اور کس حیثیت کی ہے اور اس زبان کا حق اس ملک اس کے حکمرانوں اور اس کے باشندوں پر کیا اور کتنا ہے۔

آپ ہی بتائیں جن اضلاع اور مقامات پر مسلمانوں کی (تکلف برطرف) جو تعداد اور حیثیت ہے اور وہی ہے اور اردو جس طرح کام میں لائی جاتی ہے اور اس کی جو نفس الامری حیثیت ہے اس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے وہ حق بجانب ہے....!

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۳

۴ر جون ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

(۱) آپ کو جون کا رسالہ جامعہ دہلی ملا ہوگا۔ اس میں آپ کے کسی انگریزی مضمون کا اُردو ترجمہ شائع ہوا تھا۔ اُردو کے لسانیاتی ادب کا جائزہ' کے عنوان سے۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ ابتدا میں سوا صفحے (۲۸۷ - ۲۸۸) کا جو نوٹ ہے وہ آپ کا لکھا ہے یا اس کا اضافہ مترجم نے کیا ہے؟

(۲) فکر و نظر کے حالیہ شمارے میں میرے مضمون کا reprints نہ ملا۔ دس بارہ دن ہوئے بلگرامی صاحب نے بتایا تھا کہ جلدی مہیا کر دیا جائے گا۔

(۳) اس ماہ سے غالباً بلگرامی صاحب سبکدوش ہو رہے ہیں۔ ان کی اسامی کسی کے حصے میں آئی۔

(۴) حبس گرمی سے سابقہ ہے۔ میرا خیال ہے آخرت میں اس کا ہم کو آپ کو کوئی نہ کوئی اجر ضرور ملے گا۔ کچھ اور نہیں تو دوزخ کی آنچ میں تخفیف سے۔

مندرجہ بالا کے پیشِ نظر آپ کی خیریت اور عافیت کا خاص طور سے طالب۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۶۴

دوشنبہ، ۱۱ جون ۷۳ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ تسلیم
مسعود صاحب مکرم

۸ - ۱۰ روز ہوئے ایک رقعہ آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ کوئی اہم بات جواب طلب نہیں تھی۔ پھر بھی خیال آتا ہے کہ کیا بات ہے جیسا علی گڑھ کا موسم اور جہان گزران کی رفتار ہے اس سے دل میں وسوسوں کا پیدا ہونا تعجب کی بات نہیں۔ کیا بلگرامی صاحب بالکل علاحدہ ہو گئے۔ یعنی کام کرنا بند کر دیا۔ کم و بیش تین ہفتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ میرے مضمون کے reprints مل جائیں گے وہ اب تک نہ ملے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی جگہ پر کوئی مستقل انتظام تا حال نہیں ہوا ہے۔

خیر طلب
رشید احمد صدیقی

۱۶۵

علی گڑھ - ۱۲ر جون ۶۷۳

مسعود صاحب محترم تسلیم
کل آپ کا خط بھی ملا اور reprints بھی بہت بہت شکریہ۔
اپنے پچھلے سے پہلے خط میں دریافت کیا تھا کہ جامعہ ملیہ کے حالیہ
رسالہ میں آپ کے جس مضمون کا ترجمہ شائع ہوا ہے اس میں اردو
سے متعلق ایک صفحہ کا تعارف ہے یہ آپ کا لکھا ہوا ہے یا کسی اور کا۔
بلگرامی صاحب سے تاکید فرما دیجیے کہ وہ ان reprints کا بل
میرے پاس جلد سے جلد بھیج دیں اس کو ادا کردوں گا بڑا اطمینان ہوگا۔
ذرا دیر کی معمولی سی بات ہے جس کو وہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔
خدا کرے خربوزہ اور آم کا درمیانی فصل امن چین سے گزر جائے۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱٦٦

۱۴ر جون ۶۷۲

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

خط کل ملا۔ رسالہ جامعہ دہلی میں آپ کے مضمون کا پہلا ٹکڑا کچھ اس طرح ختم کیا گیا ہے اور اس کے تحت حوالہ بھی دیا گیا ہے کہ مجھے یہ وسوسہ ہوا کہ شاید بطور تعارف کسی اور نے اضافہ کر دیا ہو اب اطمینان ہوا۔ اردو کے ابتدائی اور ارتقائی دور کو بڑے سلیس، مختصر اور جامع انداز سے پیش کیا گیا ہے جس کو ماننے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو۔ ارادہ ہے کہ آپ کے حوالہ سے اُسے کام میں لاؤں reprints کے بارے میں آپ نے جو بشارت دی ہے اس سے گھلوے کا مزہ آگیا۔ معلوم نہیں پورب کی اصطلاح اور روایت سے آپ واقف ہیں "کمیشن" سے اس کا مفہوم ادا ہوتا ہے لیکن وہ مزہ کہاں؟

...[1]... صاحب سے آپ کی جیسی گفتگو ہوئی اور جس موضوع پر

---

[1] نقطے رشید صاحب نے دیے ہیں۔

ہوئی اسے سن کر متعجب بالکل نہیں۔ بدحظ بہت ہوا۔ کیا کیجیے جب corruption, اس طرح پھیلا ہو۔ جیسے آج کل کی گرمی، گرد، اُمس اور لو۔ کس کس بھیس میں کیسے کیسے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ مواخذہ کا ڈر نہ ہو تو جو کچھ ہو جائے تھوڑا ہے۔ اُردو گھر کی تعمیر اور تیاری کی جو اہمیت . . .[1]. کے نزدیک ہے وہ کوئی راز نہیں ہے۔ اس میں لغت کی تدوین کا کوئی مقام نہیں۔ اسلام میں حیا کا بڑا درجہ بتایا گیا ہے اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ بے حیائی کیسی لعنت قرار دی گئی ہوگی۔ فکر و نظر کے دروبست کو بھی اس فتنے سے علاحدہ رکھ کر کیوں دیکھیے یونیورسٹی کیا پوری دنیا اس مصرعہ کے محور پر گردش کر رہی ہے۔

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

ہم اپنے آپ کو اس سے بچا رکھیں گے تو دنیا ہماری احسان مند ہوگی!! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے کاموں میں ایسا نشاطِ کار بخشے گا کہ آپ کو کسی کے التفات کی محتاجی نہ رہے گی۔ انشاء اللہ۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

باایں ہمہ ہر کام کے لیے اپنے کو تیار رکھیے اس شرط کے ساتھ کہ وہ کام اپنے terms پر کریں گے۔ دوسرے کے ٹرم پر نہیں۔ جب اس درجہ افراتفری پھیلی ہوئی ہو جیسی کہ دیکھنے میں آ رہی ہے اس وقت اسی اصول پر عمل کرنا چاہیے۔

---

[1] نقطے رشید صاحب نے دیئے ہیں۔

کبھی یاد آئے تو مطلع فرمایئے گا کہ مرزا خلیل احمد بیگ[1] آپ کے شاگرد وہی طالب علم ہیں جنھوں نے بھٹناگر صاحب کی ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج[2] کا اُردو ترجمہ کر ڈالا تھا لیکن نظامی صاحب نے اس طرف کوئی توجہ نہ کی اور کتاب جہاں کی تہاں رہ گئی۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب نے مجھے ایک خط بھی لکھا تھا اگر وہ اس طرح آپ کے ساتھ کام میں لگ گئے ہیں تو مجھے اس کی بڑی خوشی ہے۔

---

[1] ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ، استاد شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

[2] اسے ہسٹری آف ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ

۱۶۷

شنبہ، ۷ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

خطبہ تیار ہے۔ آخر کا ایک صفحہ finale بڑھانا ہے۔ اس کی ایسی
کوئی جلدی نہیں ہے۔ کافی دن باقی ہیں۔ خیال یہ ہے کہ مسودہ کو کسی
شخص سے جس کا خط اچھا ہو اور آسانی سے پڑھا جا سکے نقل کرا لیا
جائے۔ اس سے کمپوزیٹر کو بڑی آسانی ہوگی اور پروف ریڈنگ کا مسئلہ
بھی آسان ہو جائے گا۔ ٹائپ کرانے میں خواہ مخواہ کا خرچ زیادہ
ہوگا۔ صاف خط میں نقل کرا لینا آسان بھی ہے اور سستا بھی۔ میرے
ہاتھ کا لکھا ہوا خط تقریباً ۲۵ - ۲۶ صفحات پر محیط ہے جو خطبہ کے
سائز کے ۲۰ - ۲۵ صفحات لے لے گا۔ اس طور پر اگر ۳۰ یا ۴۰ روپے
نقل نویس یا خوشنویس کو دیا جائے تو زیادہ نہ ہوگا اور ٹائپسٹ
کم سے کم ایک روپیہ فی صفحہ لے گا۔ یہ میرا تخمینہ ہے ممکن ہے زیادہ
ہو۔ لیکن مجھے مسودہ کے نقل کرانے پر اصرار بالکل نہیں ہے۔ ممکن

ہے جامعہ اُردو متحمل نہ ہو تو مزید باریکیوں ڈالا جائے۔ ممکن۔
جامعہ کے کنوکیشن سے متعلق پروفیسر فاروقی (دہلی) کل آپ سے
ہوں۔ مجھ سے ملنے آئے تھے اور رفیق زکریا صاحب کی اسکیم
متعلق گفتگو کی تھی۔ میں نے وہی رائے دی جو نظامی صاحب
دی تھی۔ آپ نے بھی غالباً safety first کے اصول پر گفتگو کی ہوگی۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

چاہتا ہوں کہ خطبہ کا مسودہ صاف ہونے کے لیے اس وقت
دیا جائے جب آپ اس پر ایک نظر ڈالیں۔

۱۶۸

۱۲ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

خطبہ کا مسودہ حاضر ہے۔ آخر کا صفحہ کسی دن لکھ کر بھیج دوں گا
انشاءاللہ۔ اس سلسلے میں کچھ معروضات یہ ہیں۔
آپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ جہاں چاہیں اور جس طرح
چاہیں، حذف، اصلاح اور اضافہ سے کام لیں۔ یہ کچھ نیازمندی کے
سلسلے میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ اس طرف سے مطمئن ہو جانا چاہتا ہوں
کہ یہ خطبہ جامعہ کے بہترین مقاصد کے مطابق ہے اور بحیثیت شیخ الجامعہ
آپ اسے پسند کرتے ہیں۔ آپ نے اشارہ کیا تھا کہ اس میں ایک جگہ
لب و لہجہ communal ہو گیا ہے وہ فقرہ یا جملہ مجھے نہیں ملا۔ آپ کو
مل جائے تو بدل دیجیے گا۔ ص ۱۴ یا ۱۵۔ ۱۵ پر رسالہ جامعہ دہلی کا
ایک طویل اقتباس ملے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ مناسب حال ہے۔
لیکن آپ چاہیں تو اس کو بالکل نکال دیں یا کتر بیونت کر دیں مجھے مطلق
عذر نہ ہوگا۔ خطبے کی ابتدا کن حضرات کو مخاطب کرنے سے ہوگی وہ
آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ خانہ پُری کر دیجیے۔ خطبہ میں جا بجا بزرگو،

عزیزو، ساتھیو، دوستو کی جگہ چھوٹ ہوئی ہے اُسے آپ بھر دیجیے مجھ سے نہ ہوسکا۔ خطبہ کے صفحات ۲۳ نہیں ہیں ۲۵ ہیں۔ ایک جگہ آ نے بتایا تھا کہ انگریزی کی بحث بے ربط ہوگئی ہے اسے درست ہے، آپ اطمینان کر لیجیے گا۔

مختصر یہ کہ آپ اسے اطمینان سے ایک بار پڑھ جائیں اور جہا کہیں کسی قسم کی خامی یا کمی پائیں اسے درست کر دیں مجھ سے مشو کر نے کی ضرورت نہیں ہے۔

تقرر کمیٹی میں[1] دہلی میں جو کچھ پیش آیا کبھی ملاقات ہوئی تو سے سنوں گا۔ معلوم ہوتا ہے خاصا دل چسپ مشغلہ رہا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اردو کے پروفیسر کی پہلی انتخاب کمیٹی کی جانب اشارہ

۱۶۹

۱۲ر جولائی ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

دریافت کرنے پر ہم نفسانِ رفتہ[1] کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے یہاں دستیاب ہوا۔ یہ پہلے پہل معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپا۔ جلد یا کسی صفحہ پر یہ تحریر نہیں ہے کہ یہ ایڈیشن کب شائع ہوا۔

میں نے جس تحریر کے ساتھ کتاب کا ایک نسخہ خلیل صاحب کو پیش کیا ہے۔ اس میں میرے دستخط کی تاریخ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۰ء ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ کتاب ۱۹۶۶ء کے بعد شائع ہوئی۔ اطلاعاً عرض ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] تصنیف پروفیسر رشید احمد صدیقی

۱۷۰

۲۹ر جولائی ۱۹۷۳ء

مسعود صاحب مکرم ۔ تسلیم

کئی دن ہوئے خورشید عالم خاں صاحب کا خط آیا تھا کہ یوسف صاحب پر فالج کا حملہ ہوا تھا اور داخل ہسپتال ہیں۔ اس کے بعد کوئی خبر آپ کو ہے۔ اللہ حفظ و امان میں رکھے ۔ آمین۔

ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب نے جامعہ کے کنوکیشن کی کوئی تاریخ مقرر کی ہے؟ آپ کی فرمائش کے مطابق میں نے بمبئی یاد دہانی کرا دی ہے۔

خطبے میں شامل ہونے کے لیے آخری صفحہ لکھ کر میں نے بھیج دیا تھا ضرور ملا ہوگا۔ آپ نے اُسے پسند کیا۔

اس کے بعد اسی صفحہ میں ایک لفظ کی تبدیلی کی فرمائش کی تھی وہ پرچہ بھی ملا ہوگا۔ اگر خطبہ آپ کے یا جنیدی صاحب[1] کے پاس ہو تو آ

---

[1] عظیم الحق جنیدی مرحوم جو اس وقت اعزازی خازن جامعہ اردو تھے۔

میں تبدیلی کر دیجیے پھر اس کا اندیشہ نہ رہ جائے گا کہ یہ تبدیلی درج ہونے سے رہ گئی۔

آخری صفحات زیادہ سے زیادہ کب تک کمپوزٹرس کے ہاتھ میں آئیں گے چاہتا ہوں کہ صفحہ ڈیڑھ صفحہ کا اضافہ کر دوں۔ گو اس پر اصرار مطلق نہیں ہے۔ اب تک لکھا بھی نہیں۔ معلوم ہو جائے تو پھر سوچوں۔

معلوم نہیں جامعہ ملیہ میں ہوا کا رخ کیا ہے۔ اس طرف دل لگا ہوا ہے۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۱

منگل ۲۱ جولائی ۷۱ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

نوازش نامہ کل مل گیا تھا۔ بہت بہت شکریہ۔ یہ معلوم کرکے اطمینان ہے کہ خطبے کے چھپنے میں اتنی دیر لگے گی کہ میں بآسانی سے کوئی تحریر اضافہ کرنے کے لیے بھیج سکتا ہوں۔ بشرطیکہ وہ آخری صفحہ ہو۔

ایک بات ذہن میں آئی ہے کہ خطبہ کا آخری صفحہ جو میں نے سب سے آخر میں بھیجا تھا اور دو جگہ سے جڑا ہوا ہے اُسے میرے پاس بھیجدیا جائے اس میں ایک جگہ اصلاح کرنی مقصود ہے اور ہو سکا تو ایک آدھ صفحہ کا اضافہ کردوں گا۔ آخر تک پہنچنے میں ابھی کمپوزٹرس کو کافی دن لگیں گے۔ اس لیے آسانی سے اصلاح یا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۲

۲راگست ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

چاہتا ہوں کہ آپ خطبہ کا آخری صفحہ (جس میں تلے اوپر تین ٹکڑے چسپاں ہیں) میرے پاس ذرا دیر کے لیے بھیج دیتے۔ میں ایک لفظ بدل کر اُسے بمدست واپس کردیتا۔

پریس یا جنیدی صاحب سے اس کو منگاکر اپنے ہاں رکھ لیتے میرا آدمی جاکر کسی وقت آپ سے مانگ لیتا۔

یوسف صاحب کے بارے میں خبر آئی تھی کہ بفضلہ روبصحت ہیں۔ ہسپتال میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ اللہ کا شکر ہے۔

کچھ جامعہ ملیہ کی بھی خبر ہے کہ حالات کا رُخ ورفتار کیا ہے۔

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ عوارض کا ہجوم ہے جن میں سے ہر ایک کو وقتاً فوقتاً اپنی موجودگی جتانے پر اصرار رہتا ہے۔

دعا ہے آپ مع الخیر ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۳

مسعود صاحب مکرم ۔آداب

(۱) گجرال کمیٹی سے آپ کے وفد کی ملاقات ہوئی یا ریلوے کی گڑبڑ سے تقریب ملتوی کردی گئی؟

(۲) خطبے کی طباعت کس منزل میں ہے؟ یہ اس لیے نہیں پوچھتا کہ اس کے جلد طبع ہو جانے کی خواہش ہے بلکہ بے کاری میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کوئی ٹھکانے کی بات ذہن میں آئے تو اس کو شامل کردینے کا کہاں تک امکان ہے وغیرہ۔

اگر خطبہ کا آخری صفحہ آپ کے پاس ہو اور آسانی سے مل سکے بھیج دیجیے گا۔ ممکن ہے کہیں کچھ اصلاح کرسکوں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ زحمت ہو تو جانے دیجیے۔

(۳) کل یوم آزادی بھی منایا جا چکا اور ریڈیو انے منتظر' ہو' ۔ میٹھے رہے

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۴

6. 9. 73

مسعود صاحب مکرم ۔ آداب

ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب کے پروگرام کا کچھ اور علم ہوا یا نہیں، اتنا تو معلوم ہے کہ شنبہ ۵ ستمبر کو وہ جامعہ کے کنوکیشن کی صدارت فرمائیں گے۔

یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ دہلی سے کب اور کس ٹرین سے تشریف لائیں گے یا سفر موٹر سے ہوگا۔ کہاں قیام فرمائیں گے۔ بیگم صاحبہ بھی ہمراہ ہوں گی یا نہیں۔ خوشونت سنگھ اور عابد صاحب[1] پہلے کی طرح ساتھ ہوں گے یا کیا؟ کہاں قیام ہوگا۔ قیام تک کی تقریبیں کہاں کہاں ہوں گی۔ واپسی کب اور کیسے ہوگی۔

میرے ہاں ایک وقت کھانے کی گنجائش رکھیے گا، جیسا پچھلی

---

[1] عابد علی خاں صاحب، ایڈیٹر "سیاست" حیدرآباد

بار ہوا تھا مثلاً ڈنر کا، ارباب یونیورسٹی موصوف کی تشریف آوری کا کوئی نوٹس لیں گے یا نہیں وغیرہ۔

مختصر یہ کہ مجھے اپنے یہاں کی تقریب کی فکر ہے۔ اس طرف سے یکسو ہونا چاہتا ہوں۔

خطبہ زیورِ طبع سے آراستہ ہوا یا نہیں؟

احباب اور اعزہ کو بھیجنے کے لیے مجھے اس کے 25-20 نسخے درکار ہوں گے۔

اترپردیش کے بعض قابلِ لحاظ روزناموں کو اگر دو چار روز پہلے ایک ایک نسخہ بھیج دیا جائے تو بہتر ہوگا۔

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۵

۷ر ستمبر ۱۹۷۲ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

یہ معلوم کرکے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب ۱۶ (اتوار) کو تشریف لا رہے ہیں۔

یونیورسٹی گسٹ ہاؤس میں قیام بہرگونہ بہتر ہوگا۔

معلوم نہیں لنچ کہاں تناول فرمائیں گے۔ جامعہ کی طرف سے تو شاید ایٹ ہوم ہو۔ ڈنر میرے ہاں طے ہے۔

کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے خطبے کا ایک نسخہ محض جزو بندی کے ساتھ (یعنی ہر قسم کے زیورِ طبع سے محروم و مبرّا) مجھے کل تک مل جائے۔ محض یادداشت کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

خطبہ کتنا پڑھا جائے گا۔ کہاں کہاں سے پڑھا جائے گا۔ یہ سب آپ کی صوابدید پر منحصر ہے۔ میں اس میں بالکل حصہ نہ لوں گا۔ اس لیے مجھ سے مشورہ فرمانے کی ہرگز زحمت نہ فرمائیے گا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۶

۱۰ ستمبر ۷۶ء

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل کے خطبے کا بہت بہت شکریہ۔ کام چل گیا۔ بہت عمدہ چھپا ہے۔ سرورق لکھنے کے بعد اور دیدہ زیب ہو جائے گا۔

اس امر کا اظہار کر چکا ہوں کہ یہ کلیتہً آپ کے صوابدید پر منحصر ہوگا کہ خطبے کے کون کونسے حصے پڑھے جائیں گے۔ اس پر کتنا وقت صرف کیا جائے گا۔ اس بارے میں آپ میری مرضی کو اپنی مرضی سمجھیں۔

آج رات تک دو ایک نسخے اسی شکل میں نہ مل جائیں گے جن میں کل آپ کا بھیجا ہوا نسخہ تھا۔ ٹائیٹل پیج کی ایسی ضرورت نہ ہوگی۔

امید ہے مزاج مع الخیر ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۷۷

جمعرات، ۴؍اکتوبر ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

یہ خط[1] قاضی محمد یونس صاحب کا ہے جو کبھی اکنامکس ڈپارٹمنٹ
کے رکن تھے اور ایک خاص مسلک کے غالی پیرو۔ پھر سرکاری ملازمت
میں ہو کر شملہ، دہلی، افغانستان ہوتے ہوئے پھر دہلی آ گئے۔
مسلک میں بھی کچھ لچک آ گئی ہے۔ موصوف کو لکھ دیا ہے کہ آپ ان دنوں
علی گڑھ سے باہر ہیں۔ آنے پر خط مل جائے گا۔ خط کے بین السطور
میں جو کچھ ملتا ہے اس میں بظاہر بدگمانی کا دخل نہیں معلوم ہوتا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] قاضی محمد یونس صاحب نے یہ خط رشید صاحب کو میری جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری
پر نامزدگی کی خبر سن کر لکھا تھا جس میں اُن کے توسط سے اپنی "خوشی" اور "تردد"
دونوں کا اظہار کرتے ہوئے کچھ ناخواستہ مشورے دیئے تھے۔

۱۷۸

شنبہ ۲۲ دسمبر ۷۳ء
ذاکر باغ، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
۷ / کا گرامی نامہ ابھی ابھی موصول ہوا۔ اتنی دیر میں ملا۔ اسے
اسٹرائک کا کرشمہ کہیے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ کیا معلوم ایسے بھی دن
دیکھنے پڑیں کہ کاتب اور مکتوب الیہ کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے! فریاد
از تطاول مشکیں کمند تو!
اکیڈمی[1] کے انعامات کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے یا
کر دیا ہے وہ میرے لیے غیر متوقع نہ تھا۔ آپ نے ہمیشہ ایسا ہی کیا
ہے اور کامیاب رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے ۴۔ ۵ ممبروں میں آپ
کو تائید کہاں کہاں سے ملتی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ مولانا عبدالماجد
دریابادی کوشاں ہیں اور آپ نے جن صاحب کو لکھنؤ لکھا ہے
ان کا میلان شاید موصوف کی طرف ہے۔ علی گڑھ کے بزرگ کے
بارے میں حسنِ ظن رکھنے میں پس و پیش ہے۔ ماضی کا مسلسل
تجربہ سامنے ہے۔ کچھ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مُلّا صاحب کا

---

[1] اُردو اکیڈمی، اترپردیش

رجحان فیصلہ کن ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ موصوف کا اثر (انجمن کے راستے سے)۔۔۔[1] صاحب پر مسلم ہے۔ آپ سے کبھی مُلّا صاحب کی ملاقات ہوتی ہے۔

یہ بڑا اچھا کیا کہ سرما کی تعطیلوں میں متعلقین کو دہلی بلا لیا۔ میرا خیال ہے کہ بیوی بچے پورے طور پر لطف اندوز ہوں گے۔ اس تعطیل اور تفریح کے وہ مستحق بھی ہیں۔ آپ نے زمان و مکان کا لطیفہ بڑا اچھا لکھا۔ زندگی آج کل جس فساد و فشار میں مبتلا ہے۔ اس میں اس طرح کے لطائف پیدا کر لینا بڑے صحت مند جسم و جان کی دلیل ہے۔ جامعہ اُردو کے بارے میں آپ جو کچھ طے کریں گے وہی بہتر ہوگا۔ میں تو بالکل خالی الذہن ہوں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے ربط قائم رکھیے۔ کچھ اور نہیں تو خط و کتابت ہی سے۔ معلوم نہیں اس بارۂ خاص میں کچھ پیش رفت ہوئی یا نہیں۔ جامعہ بکڈپو لمیٹڈ والوں (احمد ولی صاحب نے) مطلوبہ آٹھ جلدیں لکھنؤ بھیج دی ہوں گی۔

کام اور خدمت کرتے عمر گزر گئی۔ کتنی طویل عمر جو میری جیسی معتبر صحت والے کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ پورے ۸۱ سال! س دوران میں کبھی اس کی طرف خیال نہیں گیا کہ میری بھی کوئی خدمت کرتا ہے یا نہیں۔ اب جب کہ جسم کے سارے اعضا "زوال مادہ" ہیں۔ معمولی آدمی کی طرح flesh کی کمزوری spirit کی توانائی

---

[1] نقطے رشید صاحب کے ہیں۔

پر تیزی سے غالب آنے لگی ہے۔ جی چاہتا ہے کوئی قریب ہو۔ اس
کی رفاقت سے وہ چیز بالیدہ ہوگی جس نے میری کلفت میں ہار نہیں
مانی۔ کاش احسانات پاس ہوتے۔ لیکن Poor Ehsan خدا ان کو
خوش رکھے۔ آمین۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

مسعود صاحب میری استدعا ہے کہ اس خط کو تلف کر ڈالیے گا۔
رشید احمد صدیقی

۱۷۹

شنبہ ۱۹ جنوری ۷۳ء

مسعود صاحب مکرم تسلیم

سلمیٰ کا ابھی ایک خط ملا جس کی مفصلہ ذیل عبارت ملاحظہ فرمائیے۔

''آپ کی تصنیف ہمارے ذاکر صاحب کے بارے میں لکھنؤ
والوں نے بتایا کہ اس اوارڈ کے لیے پبلشر کی طرف سے
کتاب اور سفارش کا آنا ضابطے کی اہم کڑی ہے۔ لہٰذا پبلشر
سے ضرور کہیے کہ وہ کتاب کو اپنی پرزور سفارش کے ساتھ
وہاں ضرور بھیجدیں''

غالباً اس سے یہ مراد ہوگی کہ پبلشر کی طرف سے ایک تفصیلی نوٹ تعارف کا ہونا ضروری ہے۔ حالاں کہ یہ کام اکیڈمی کے ریویو کرنے والوں کا ہونا چاہیے۔ بہرحال آپ جیسا مناسب خیال فرمائیں مینیجر صاحب جامعہ بکڈپو لمیٹڈ کو ہدایت فرمادیں۔

وہ تحریک جو آپ نے اٹھائی تھی اس میں کچھ پیش رفت ہوئی؟

میرے آپ بفضلہٖ مع الخیر ہوں گے۔

میرے پچھلے عریضہ کو امید ہے، آپ نے میری درخواست کی بنا پر تلف کردیا ہوگا۔ یہ آپ کا مجھ پر کرم ہوگا۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۸۰

شنبہ ۶؍ اپریل ۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔ آداب

آج دعوت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ آپ کو یوپی اکیڈمی سے "اُردو کا المیہ" پر دو ہزار کا انعام منظور کیا گیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے اور آپ کو بہت بہت مبارکباد۔

خورشید عالم خاں صاحب[1] کو حکومتِ ہند سے جو اعزاز ملا ہے اس پر ان کو اور آپ دونوں کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کبھی جواب لکھیے تو یوسف صاحب کی صحت کے بارے میں ضرور لکھ دیا کیجیے۔ اس لیے کہ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں محمود صاحب احسان سے اکثر دریافت فرماتے رہتے ہیں۔

امید ہے آپ اپنے اور اپنے کام سے بیش از بیش خوش ہوں گے

مخلص

رشید احمد صدیقی

---

[1] ڈاکٹر ذاکر حسین کے بڑے داماد جو راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے تھے۔

۱۸۱

۲۰/اپریل ۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب
گرامی نامہ مورخہ ۱۸/اپریل صادر ہوا اور بہت خوش ہوا۔ اس لیے
خاص طور پر کہ انعام ملنے پر آپ کا جو "ردِّ عمل ہجوم" کی طرف
ے ہوا، بجنسہٖ میرا بھی تھا۔ تفصیل سے بعد میں لکھوں گا۔ اس وقت
ت یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ۔۔ ۔[1] ۔۔ صاحب کو فی الفور
، دیں کہ مجھے اس رقم سے معاف فرمایا جائے جو علاج معالجہ کے
ے مریض اور بیمار مصنفین کو دی جاسکتی ہے۔ بفضلہٖ میری حالت اتنی
ارونزار" نہیں ہے۔ وغیرہ۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

---

[1] رشید صاحب نے نام حذف کر دیا ہے۔ لیکن اشارہ خورشید عالم خاں صاحب کی جانب

۱۸۲

جمعہ، ۱۲ رجولائی ۷۴ء
یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

کل معلوم ہوا کہ ۲۲ رجولائی کو ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب جامعہ اُردو
کی میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو
کہ ۲۰ رکو کانگرس کی کسی میٹنگ میں دہلی میں ہوں گے۔ معلوم نہیں یہاں کا
موصوف کا پروگرام کیا ہے۔ غالباً وہی ہوگا جو برسوں سے یہاں کا ر
ہے۔ حفیظ الدین صاحب اُردو ڈکشنری کے کام سے شاید بمبئی منتقل ہو گئے
لکھا تھا کہ انھوں نے اُردو بورڈ کی ملازمت اختیار کر لی اور آخر جون تک
بمبئی چلے جائیں گے۔ موصوف نے اطلاع دی تھی کہ میری کتابوں پر کمیشن
جو سالانہ آمدنی ہوگی وہ مینیجر صاحب جامعہ بکڈپو لمیٹڈ سے دلوا دیں گے
یہ کام سالہا سال سے انھیں کے سپرد تھا۔ کاغذ کی مہنگائی کا جبر
پریشر ہے اس کی وجہ سے لکھا تھا کہ جامعہ بکڈپو کی دشواریاں بہت
بڑھ گئی ہیں لیکن مینیجر صاحب بمبئی سے آجائیں گے تو دیکھا جائے گا معلوم
ہوتا ہے کہ مطلب براری نہ ہو سکی۔ آپ کچھ کر سکتے ہوں اور مناسب ہو تو
کہ دیجیے گا ورنہ کوئی بات نہیں۔

اینہم اندر مفلسی بالائے غم ہائے دگر

خیر طلب
رشید صدیقی

۱۸۳

۲۱ر جولائی ۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسعود صاحب محترم۔ آداب

عرصہ ہوا گرامی نامہ ملا تھا جس میں آپ نے لکھا تھا کہ جامعہ اُردو کی مجلس عاملہ میں شرکت فرمائیں گے لیکن عدیم الفرصت ہونے کے سبب سے شاید ملنا نہ ہو۔ آپ نے میری فرمائش پر یہ بھی لکھا تھا کہ کتابوں کی رائلٹی کے بارے میں جامعہ بکڈپو لمیٹڈ کو کھڑ کھڑائیں گے لیکن صدائے نہ برخاست۔ یہ کام حفیظ الدین صاحب کرادیا کرتے تھے۔ بمبئی جا کر انھوں نے مطلع کیا تھا "۔۔۔۔ کو بمبئی پہنچ گیا۔ نکلنے سے پہلے مکتبے کے کارکن متعلقہ سے معلوم کیا تھا۔ چک بن گیا تھا۔ دستخط باقی تھے۔ غالباً پہلی دوسری (جولائی) تک انھوں نے بھیج دیا ہوگا۔" آج جولائی کی آخری تاریخ ہے اب تک کوئی چک نہیں ملا۔ حفیظ الدین صاحب کا یہ خط بمبئی سے لکھا ہوا ۲۱ر جولائی کا ہے۔

جامعہ اُردو کے عہدہ داروں کا بہت اچھا انتخاب ہوا

اور سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ آپ نے جامعہ کی مزید خدمت
کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے گفتگو
آئی تھی۔ موصوف نے بڑی خوشی سے اس کا اظہار فرمایا تھا کہ انھوں
نے آپ کو مزید تعاون پر آمادہ کرلیا ہے۔ طبیعت اچھی نہیں ہے۔
اس پر طرح طرح کے آلام کا ہجوم! دعا ہے کہ آپ خوش و خرم ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

۱۸۴

شنبہ، ۷/ستمبر ۸۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی، علی گڑھ

مسود صاحب مکرم۔ تسلیم

اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی[۱]

اور خبر میں "تواتر" بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ راس لائے۔ ذاکر صاحب اور یوسف صاحب کی خدمات کے علاوہ خود اپنی خدمات، تجربہ، شہرت، ادارے سے الفت وارادت ان سب کے ہوتے ہوئے آپ کے مقابلہ میں کوئی صاحب فہم کسی اور کو نہیں پیش کرسکتا! کیا میں صحیح نہیں کہتا؟!

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۵

۲۸ر نومبر ۱۹۷۴ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم۔
آپ کے ۲۷ر اکتوبر کے نوازش نامہ کا جواب دینے کی آج نوبت آئی۔ ان دنوں اسی طرح اوقات رہ گئے ہیں۔ آپ سرسید ڈے پر تقریر کرنے تشریف لائے تھے۔ کمال نے شرکت کی تھی۔ آکر تفصیل سنائی۔ آپ مجھے پہلے سے مطلع فرما چکے تھے کہ وقت تنگ ہونے کے باعث ملاقات نہ ہو سکے گی اور یہی ہوا۔ میرے لیے اتنا بہت ہے کہ آپ خیریت سے ہیں اور اپنے مشاغل سے مطمئن اور خوش و خرم۔ میری دعا ہے اور یقین کہ حالات معمول پر رہے تو آپ علی گڑھ واپس آئیں گے۔ "آب رفتہ آید بجو" انشاء اللہ۔
فکر و نظر جب تک ذاتی اور شخصی ذمہ داری میں رہا۔ کامیاب رہا۔ اب منصبی اور دفتری routine میں چلا گیا۔ انجام معلوم۔ گرد و پیش اور دور و نزد کو جن احوال میں پاتا ہوں اس سے طبیعت پست رہتی ہے اس پر عمر اور طرح طرح کی تکالیف اور معذوریوں کا فشار۔ اور کسی ہمدم دیرینہ کے ملنے کا کیا سوال جب تقریباً تمام ہمدم دیرینہ مفارقت کر چکے۔
احباب کو پرسش و سلام۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۶

اتوار، ۲۹ ر دسمبر ۷۴ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
نہ عید کی تہنیت بھیج سکا نہ بڑے دن کی۔ ذرا کہیں ایسا نہ ہو کہ سالِ نو کی بھی نہ بھیج سکا تو کیا ہوگا۔ اس موقع کو غنیمت سمجھتا ہوں اور سالِ نو کی تہنیت بھیجتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے محترم جاننے والوں کو سالِ نو مبارک فرمائے آمین۔ کئی سال ہوئے ذاکر صاحب مغفور کی صدارت میں جامعہ ملیہ کا کنوکیشن ایڈریس میں نے دیا تھا۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب جانتے ہیں۔ اس خطبے کی بڑی ضرورت ہے، اردو ایڈیشن کی (اس کا انگریزی ترجمہ نہیں) ممکن ہے عبداللطیف اعظمی صاحب کی کوشش سے مل جائے۔
ہم سب بفضلہٖ مع الخیر ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۷

ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ[1]

مسعود صاحب مکرم۔ تسلیم

کل دفعتہً الجمیعۃ سے محمود صاحب[2] کی رحلت کی خبر ملی۔ کیا کہوں کیا گزری اور ان سب پر کیا گزری ہو گی جو مجھ سے بدرجہا زیادہ مرحوم سے قریب ہیں۔ ذاکر صاحب کی وفات پر ان کا بے اختیار دہلی آنا، صدمہ کی تاب نہ لاکر قلب کی شدید تکلیف میں مبتلا ہو جانا، پھر کراچی کو واپسی، کس محرومی اور بےبسی کے عالم میں۔ سب جانتا ہوں ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ذاکر صاحب مرحوم اور بیگم صاحبہ کے کتنے شیدائی تھے اور بیگم صاحبہ تو خاص طور پر شفقت فرماتی رہی ہیں۔ تقسیم ملک کے بعد مرحوم کو نہیں دیکھا۔ لیکن اس وقت ۱۹۱۵ء اور ۱۷ء کا زمانہ یاد آرہا ہے جب وہ تقریباً طفل معصوم تھے اور ذاکر صاحب سے ملنے کچی بارک آیا کرتے تھے۔ یوسف صاحب ساتھ ہوتے۔

---

[1] محمود صاحب کا انتقال اپریل ۱۹۷۵ء میں ہوا تھا۔ یہ خط اس کے بعد کا ہے۔

[2] ڈاکٹر ذاکر حسین کے برادر خُرد اور مرتب کے چھوٹے چچا۔ سابق وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی۔

بڑھاپے میں مرحوم عزیزوں کا بچپن کس حسرت سے یاد آتا ہے اور کیسا قلق ہوتا ہے، کیا بتاؤں۔ اور کیسی حیرت اور عبرت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور بچے، بیوی اور متعلقین کو صبرِ جمیل دے۔ آمین۔ مسلمانوں کے کسی مرحوم کے لیے اس سے بڑی دعا اب تک سننے میں نہیں آئی۔ اس وقت اسی کا سہارا پکڑتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں کہ آپ بھی ایسا ہی کریں۔ اللہ توفیق دے۔ آمین

دہلی جائیے گا؟

آپ کی محرومی اور قلق میں شریک

رشید احمد صدیقی

۱۸۸

بدھ، ۲۴ ستمبر ۷۵ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
۲۲ر کا گرامی نامہ کل شام صادر ہوا۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ اہلیہ کی طبیعت بفضلہ روبصحت ہے۔ زندگی کے معمولات پورے کرنے لگی ہیں اور معالج مطمئن ہیں۔ اس دن کا اضطراب یاد ہے جب آپ سے سہ پہر میں ملاقات ہوئی تھی اور اس کا ردِ عمل بھی مجھ پر نہیں رہا جو آپ پر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ حالات رو براہ ہیں لیکن وقت اور حادثہ اپنے تقریباً مستقل حادثات چھوڑ گیا ہے۔ جن حالات میں ہوں اس میں عموماً یہی ہوا کرتا ہے۔ آپ کی طبیعت کے ناساز ہونے کا حال معلوم ہوا۔ کیوں اور کیسے؟ بہرحال اللہ کا کرم ہے کہ وہ تکالیف باقی نہیں رہیں۔
دعا کرتا ہوں کہ آپ اور متعلقین بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

۱۸۹

اتوار ۲۹ ستمبر ۷۵ء
ذاکر باغ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم

رمضان شریف اور مزاج شریف۔ ماہ صیام میں پرسش احوال کی ترتیب اسی طرح کی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صفی احمد جو اس خط کو آپ تک پہنچائیں گے اسی یونیورسٹی کے ساختہ پرداختہ ہیں۔ ان کے اسناد سے جو ہم رشتہ ہیں، آپ ان کی گونا گوں علمی اور فنی اکتسابات اور صلاحیتوں کا اندازہ فرما سکیں گے۔ اور بالمشافہ صحت، شرافت اور شخصیت کا۔ ممتاز گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے ہاں کے شعبۂ تاریخ کی ریڈرشپ کے امیدوار ہیں۔ کیسی خوشی ہوگی ہم سب کو اگر یہ آپ کے سایۂ شفقت میں پہنچ جائیں گے اور فائز المرام ہوں گے۔

ان سے مجھے جو خاص طور پر انس ہے وہ اس بنا پر ہے کہ یہ ہمارے ایک بڑے مخلص اور عزیز دوست ڈاکٹر عارف صدیقی صاحب کے عزیز قریب ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے ڈاکٹر صاحب کا شمار ہمارے

میڈیکل کالج ہسپتال کے صفِ اوّل کے ماہرینِ امراضِ قلب میں ہوتا ہے۔ میرا قلب جب کبھی صراطِ مستقیم سے ہٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو میں بیک وقت اللہ تعالیٰ اور ڈاکٹر عارف اور ڈاکٹر مہدی حسن[1] صاحبان سے رجوع کرتا ہوں اور خدا کے فضل سے معاملہ روبراہ ہوجاتا ہے۔ اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میرے ان ڈاکٹروں سے میرا خدا کتنا راضی رہتا ہے۔

دعا کرتا ہوں کہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں۔

مخلص

رشید احمد صدیقی

[1] جواہر لال میڈیکل کالج (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے پروفیسر صاحبان اور رشید صاحب کے معالج۔

۱۹۰

۲۲ر جنوری ۷۶ء
ذاکر باغ، یونیورسٹی علی گڑھ

مسعود صاحب مکرم تسلیم
گرامی نامہ جس پر تاریخ درج نہیں ہے۔ ابھی ابھی موصول ہوا۔ کل مجھے عبداللطیف اعظمی صاحب کا تفصیلی نوازش نامہ ملا تھا۔ جو باتیں میں نے دریافت کی تھیں۔ اس کا نہایت مفصل جواب موصوف نے دیا تھا جس سے صورت حال معلوم کر کے مطمئن ہو گیا۔ اعظمی صاحب کو علاحدہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ یہی عریضہ حوالہ کر دیجیے گا۔ ان کو رسید مل جائے گی۔ ان دنوں بڑے تشویش میں گزارنے پڑے۔ شاید اب اسی مصرف کا رہ گیا۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی۔
آپ کی مصروفیتوں کا حال سن کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ اچھا کام اچھے ہاتھوں انجام پا رہا۔

آزمائش ہے نشانِ بندگانِ محترم

دعا ہے کہ متعلقین مع الخیر ہوں، بالخصوص جاوید سلمہ اللہ تعالیٰ جو ہم سب سے دور ہیں۔

مخلص
رشید احمد صدیقی

حیدرآباد اردو لغت

جناب حسن الدین احمد
حیدرآباد

● **جناب حسن الدین احمد**۔ (پ: حیدرآباد ۱۹۲۳ء) ۱۹۴۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم۔اے کی تکمیل کی۔ ۱۹۴۷ء میں اوقافی امور کی بابت ممالک یورپ اور ترکی میں تربیت حاصل کی۔ ۱۹۵۴ء میں بین الاقوامی مذہبی کانگریس اور بین الاقوامی امن کانفرنس (ٹوکیو۔ جاپان) میں بحیثیت مندوب شرکت کی۔ ممبر انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس۔ (I.A.S)

چند اہم تصانیف۔ ہندوستان کا معاشرتی نظام ۱۹۴۶ء۔ اردو ترجمہ بھگوت گیتا ۱۹۴۷ء۔ فطری علاج ۱۹۵۴ء۔ اردو الفاظ شماری ۱۹۷۲ء (اس کتاب پر یوپی اردو اکیڈمی نے خصوصی ایوارڈ دیا) جامع العطیات ۱۹۷۴ء۔ انجمن ۱۹۷۴ء وغیرہ۔

ممالک غیر۔ جاپان، چیکوسلواکیہ، اسرائیل اور روس میں اردو کتب خانے قائم کیے۔

صدر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز۔ صدر ولا اکیڈمی۔ **جنرل سکریٹری** قومی کمیٹی سات سو سالہ تقریبات امیر خسرو۔

انڈین ایڈمنسٹریٹیو سروس (I.A.S) سے ریٹائر ہو کر آجکل حیدرآباد ہی میں مقیم ہیں اور علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔

●●

اردو زبان ایک طویل دریا کے مانند ہے، جو ایک عظیم زبان کی حیثیت سے ہے تو ایک اکائی لیکن ہر علاقہ
میں اس کا بہاؤ ایک علیحدہ انداز اور انفرادیت رکھتا ہے۔ اردو زبان کی کوئی عظیم لغت مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس
میں علاقائی رنگ و روپ کے ساتھ اردو لغت کے رنگا رنگ دھنک کو پیش کئے جانے کا منصوبہ نہ ہو۔ یہ بات خوش آئند
ہے کہ عظیم تر خدا بخش اردو لغت کے منصوبہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے الفاظ کو شامل کرنا طے پایا ہے۔

حیدرآباد اردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں خود زبان اردو کے وسیع کینوس کا تعین ضروری ہے۔

ماضی میں اردو کے کاروان کو تلاش کرنے پر پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں بہت قدیم زمانہ سے عوام کی زبان
اور اونچے طبقہ کے خواص اور مذہبی رہنماؤں کی زبان کی کشمکش جاری ہے۔

اب سے کم و بیش چار ہزار سال پہلے آریہ نسل کے لوگ ہندوستان آئے تو اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی زبان
کو جو ایک معین معیاری زبان کی شکل میں نہیں بلکہ متعدد بولیوں کے ایک گروہ کی حیثیت سے متفرق آریہ قبیلوں کے
ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی تھی، یہاں کے رہنے والوں پر فاتحانہ شان سے مسلط کیا۔ ان میں سے صرف ایک ابتدائی
بولی ویدوں کی زبان ہونے کی وجہ سے محفوظ رہی۔ خود آریہ بھی یہاں کے رہنے والوں سے متاثر ہوئے اور دیسی
بولیوں کے الفاظ و محاورات کو قبول کیا۔ کچھ عرصہ یہ آزادانہ میل جول قائم رہا۔ اس کے بعد برہمنوں نے اونچے ادبی
معیار پر ویدوں کی زبان مدون کی۔ اس طرح سنسکرت پیدا ہوئی جس کے معنی ہیں شستہ۔ یہ خواص کی زبان تھی۔
قدیم ہند آریائی دور جو پندرہ سو سے پانچویں صدی قبل مسیح تک قائم رہا سنسکرت کے عروج کا دور ہے۔ عوام
کا کام پراکرتوں سے چلتا رہا۔ جین مذہب اور اس کے بعد بدھ مذہب کے پیشواؤں نے برہمنیت کے خلاف زبردست
آواز اٹھائی تو اپنی تعلیم عوام کی زبان میں دی۔ اشوک اعظم نے تبلیغ کا سارا کام پراکرت کی ادبی شاخ پالی میں کیا۔ اس
طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سب سے پہلے بدھ مذہب کے پیروؤں نے سنسکرت کو چھوڑا اور پھر بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے

دسویں صدی عیسوی سے میں علاقہ واری زبانوں میں مذہبی لٹریچر کو رائج کیا! ۵۰۰ قبل مسیح سے ۱۰۰۰ عیسوی تک پراکرت زبانوں نے رواج پایا۔ ۶۰۰ عیسوی کے لگ بھگ ہندوستان میں بیس سے زیادہ پراکرتیں بولی جاتی تھیں، جن میں پالی، اجینا، مہاراشٹری، شوراسینی اور مگدھی زیادہ مشہور تھیں۔ اس دور کے قواعد نویسوں نے عوام کی بولیوں کو اپ بھرنش یا اپ بھرشٹ (بگڑی ہوئی زبان) کہہ کر پکارا۔ راجپوتوں کے دور میں اس زبان کی ادبی شاخ شورسین دیس (متھرا اور اس کے اردگرد کے علاقے) کی اپ بھرنش "شورسینی اپ بھرنش" کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۰۰۰ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے اپ بھرنش کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اس دور میں جسے جدید ہند آریائی دور قرار دیا جاتا ہے جدید ہندوستانی زبانیں پنجابی، گجراتی، مراٹھی، راجستھانی، اُوڑیہ وغیرہ اُبھرنے لگی تھیں۔ ان میں سے ایک مغربی ہندی بھی تھی جو شورسینی پراکرت سے نکلی۔ یہ گنگا اور جمنا کے دوآبہ میں صدیوں سے بولی جاتی رہی تھی۔ مغربی ہندی کی ایک شاخ کھڑی بولی تھی جس پر اردو کی بنیاد قائم ہے۔

جس طرح بدھ مذہب کی اشاعت کے ساتھ پالی جو بہار کی زبان یا بالائی دوآبہ کی زبان تھی ایک چھوٹے سے علاقہ سے نکل کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئی تھی اس طرح مسلمانوں کی آمد کے بعد کھڑی بولی بھی تمام ملک میں پھیل گئی۔ کھڑی بولی زیادہ تر ہندوؤں کی زبان تھی جو دہلی سے بہار تک کے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔

پھر ایک بار میں اردو زبان کے بہاؤ کو دریا کے بہاؤ سے مشابہت دوں گا۔ یہ بہاؤ طویل عرصہ پر حاوی رہا۔ کبھی اس کو کچھ نام دیا گیا اور کبھی کچھ۔ اس دوران اس کے بہاؤ میں چشموں نالوں کا پانی شامل ہوتا رہا۔ کسی چشمہ کے پانی کے ملنے سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ ایک نیا دریا وجود میں آ گیا۔ مسلمانوں نے نہ تو کسی نئی زبان کی داغ بیل ڈالی اور نہ ان کے ہندوستان آنے کے بعد ان کے اور مقامی باشندوں کے اختلاط سے کسی نئی زبان نے جنم لیا جیسا کہ عام طور پر سطحی انداز میں خیال کیا جاتا ہے۔

آل سبکتگین کے زمانہ میں (۹۲۳ء تا ۱۱۷۲ء) ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے گہرے تعلقات قائم ہو گئے تھے اور مسلمانوں نے ملکی زبان کو قبول کر لیا تھا اور ملکی زبان نے مسلمانوں کی زبانوں یعنی فارسی اور ترکی کے الفاظ کو قبول کر لیا تھا۔ اس کے سو سال بعد انھوں نے جنوب کا رخ کیا۔ علاء الدین خلجی ایک صاعقہ کی طرح دیوگری پر نازل ہوا اس سے زیادہ تخریبی حملہ ملک کافور کا تھا، اس کے بعد ایک بڑا سیلاب محمد تغلق کے زمانہ میں اٹھا۔ جب ۱۳۲۷ء میں پایہ تخت کو دہلی سے کھڑکی منتقل کیا گیا۔

اردو کی پیشرو کو ہندوی کا نام اس وقت ملا جب وہ مسلمانوں کے ساتھ ملک کے دوسرے حصوں تک

بنی اور برصغیر کے ہر علاقہ میں اس کو تہذیبی اور ادبی زبان کی حیثیت ملی۔ حضرت امیر خسروؒ اور شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۱۴۹۶ء) اردو کی پیشرو کو ہندوی کے نام سے پکارتے ہیں۔

تیرھویں صدی کے اواخر اور چودھویں صدی کے اوائل میں دہلی کا اثر جنوب میں کرناٹک تک، مشرق میں بنگالہ تک اور مغرب میں گجرات تک پھیل گیا۔ اردو کی پیشرو ہندوی دکن اور گجرات میں علیحدہ علیحدہ خوب پروان چڑھی۔ دکن میں یہ دکھنی کہلاتی اور گجرات پہنچی، تو وہاں کے مقامی خصوصیات کی وجہ سے گجری کہلانے لگی۔

یہاں دکن کی اصطلاح کی صراحت ضروری ہے۔ دکن کی اصطلاح سنسکرت لفظ دکھشن سے نکلی ہے، جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں۔ جب آریہ شمال مغربی درّوں کو عبور کر کے پنجاب پہنچے تو ان کے سیدھے ہاتھ کی جانب جو وسیع قطعہ نظر آیا اُسے انھوں نے دکھشن کا نام دیا۔ اس لفظ کا اطلاق خیرات پر بھی ہوتا ہے جو سیدھے ہاتھ سے دی جاتی ہے۔ اور پھر اس سمت کو دکھشن دا کہنے لگے۔ پراکرت میں یہ لفظ دکھن ہو گیا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کے دو حصے قرار پائے، آریہ ورت جس پر آریوں کا قبضہ تھا اور دوسرا دکھشن دا پیٹھ۔

دکن میں شمالی بولی کے رواج پانے کے کچھ ہی عرصہ بعد یعنی ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت قائم ہوئی جس میں اس زبان کو ترقی کے پورے مواقع ملے۔ بہمنی سلطنت کے قیام سے پہلے ہی مسلمان مبلغوں اور اولیاء کرامؒ نے دکن آکر اپنے اصولوں کا پرچار شروع کر دیا تھا اور شعوری طور پر اس زبان کی بھی ترویج کر رہے تھے جس کا انھوں نے انتخاب کیا تھا۔

دکن میں دیسی اور پردیسی دونوں نے اس کو استعمال کیا۔ دیسیوں نے اردو کی پیشرو کو حکمرانوں کی زبان قرار دیا۔ چنانچہ تلگو میں اس زبان کو آج تک "ترکا ماٹا" یعنی ترکوں کی زبان کہا جاتا ہے۔ اس طرح دکن بھی اس بولی کا مرکز بن گیا جو شمالی ہندوستان میں بولی جاتی تھی اور یہاں اس کو آزادانہ نشوونما پانے اور دوسری علاقہ واری زبانوں سے استفادہ کرنے کے مواقع ملے۔ دوسری علاقہ واری زبانیں اس درجہ پر نہ تھیں جو اردو کی اس پیشرو کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ بنتیں۔ اس طرح جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا۔ دکن میں اردو کی پیشرو کو دکھنی لہجہ اور مقامی الفاظ کے داخل ہونے سے دکھنی کہنے لگے۔

زین الدین دولت آبادی جو عربی اور فارسی کے عالم تھے، ان کا انتقال ۱۳۰۸ء میں ہوا۔ انتقال سے کچھ دیر پہلے عالم نزع میں جب مریدان نے ان کو جگا کر جانشینی کا مسئلہ طے کروانا چاہا تو ان کی زبان سے نکلا "مجھے مت ستاؤ"

اردو زبان شمال میں سترھویں صدی کے آخری دہے تک محض بات چیت اور کاروبار تک محدود رہی اس کے برخلاف دکھنی زبان نے چودھویں صدی عیسوی ہی سے ادبی صورت اختیار کر لی تھی اور اس میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس سلسلے میں شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالے سب سے قدیم ثابت ہوئے ہیں۔ ان رسالوں اور 'معراج العاشقین' سے اردو نثر کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔

موجودہ تحقیق کی روشنی میں امین الدین علی اعلیٰ کی نثری کتاب 'کلمۃ الاسرار' کو اردو کی پہلی مستند نثری کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔'

اس نوبت پر تاریخ ادب کی ایک گتھی سامنے آتی ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا شمالی ہند سے پہلے دکن میں کیونکر ممکن ہو سکی۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام اہل نائط نے کیا جو حضرت عبداللہ بن جعفر طیارؓ کی اولاد سے ہیں اور ۵۲۳اء سے ۱۲۹۸ء کے درمیان ہجرت کر کے ساحل مالابار آئے اور کوکن وغیرہ میں مقیم ہوئے۔ اہل نائط فن جہاز رانی سے واقف تھے اور سمندروں میں مسلمانوں کی سیادت انہی کے توسط سے قائم تھی۔ دیرینہ تعلقات کی وجہ سے وہ جنوبی ہند سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لئے انہوں نے یہاں مستقل توطن اختیار کیا اور یہاں آنے کے بعد تجارت کے علاوہ تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا۔ علم کی ترویج میں بھی اہل نائط کا حصّہ رہا۔ دکھنی جو اس وقت جنوبی ہند کے مسلمانوں کی زبان بن گئی تھی اس کو اہل نائط نے اختیار کیا۔ مسلمانوں کی ایک قابل لحاظ جماعت نے جب اس اجنبی زبان کو ملکی اور مادری زبان قرار دیا تو یہ ایک اہم اقدام تھا۔ شمالی ہند کے حکمرانوں کیلئے یہی قومی زبان علاقہ داری زبان بھی تھی۔ اس کے برخلاف اہل نائط کیلئے اس زبان کے علاوہ علاقائی زبان کا سیکھنا ضروری تھا خواہ وہ مراٹھی ہو یا کنڑی، تلگو ہو یا تامل یا ملایالم۔ عربی زبان کو بھی وہ چھوڑ نہ سکتے تھے۔ فارسی زبان سے واقفیت بھی لازم تھی۔ اہل نائط نے چار زبانوں کو اپنایا۔ یہ اقدام بڑے مضرات اور دوررس اثرات کا حامل ہوا۔

اہل نائط ہی اردو کی پیشرو کو ادبی زبان بنانے کے موجب ہوئے۔ شمالی ہند میں عوامی بولی کے خلاف پڑھے لکھے لوگوں کا تعصب اور اس کو حقیر سمجھنا فطری بات تھی کیونکہ یہ زبان محکوم طبقہ کی زبان تھی۔ ایسا کوئی تعصب دکن میں نہ تھا، جہاں یہ بولی اجنبی ہونے کی وجہ سے علاقائی بولیوں پر فوقیت رکھتی تھی۔ جب اہل نائط نے اس کو قبول کر لیا تو وہ پھر جلد ہی ادبی زبان بھی بن گئی۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء) نے جو شہنشاہ اکبر کا ہمعصر تھا ہندوی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ اس کی مشہور تصنیف کتاب "نورس" ہندوی گیتوں کا مجموعہ ہے۔

ابراہیم قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء تا ۱۵۸۰ء) کے دور میں دکھنی زبان کی ابتدائی اثرات ملتے ہیں لیکن اس کے بیٹے محمد قلی قطب شاہ (۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء) نے اس کی خاص سرپرستی کی۔ محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے دیوان میں ہندی الفاظ کو فارسی عربی الفاظ کے ساتھ ایک خاص انداز سے سمو کر زبان کے ارتقا میں خاص حصہ لیا۔ عبداللہ قطب شاہ (۱۶۱۴ء تا ۱۶۲۶ء) بھی دکھنی زبان میں شعر کہتا تھا۔ اس کے عہد میں وجہی، غواصی اور دوسرے ممتاز شعرا اور نثر نگاروں نے دکھنی زبان کو فروغ دیا۔

اردو نے برصغیر کے ہر علاقہ سے دل کھول کر فیض اٹھایا ہے لیکن دکن کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں سے اردو کے پہلے دور کی ابتدا ہوئی اور شمالی زبان کی بول چال کی زبان نے یہاں تحریری جامہ پہنا اور علمی اور ادبی وقار حاصل کیا۔

اردو زبان کے آغاز کے متعلق صحیح نتائج اخذ کرنے میں دکھنی کے قدیم ذخائر کی کھوج سے بڑی مدد ملی۔ اسی لیے ان ذخائر کی بازیافت لسانی اعتبار سے اہم ہے۔

قدیم الفاظ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے اولین شاعر اور ادیب الفاظ کو کس املا سے لکھتے تھے۔ اور کس تلفظ سے ادا کرتے تھے اور ان کے اصول و قواعد کیا تھے؛ برصغیر کی علاقائی زبانوں کا اردو کی تشکیل میں کیا حصہ رہا ہے اور اردو زبان کن کن مراحل سے گزری ہے۔

آج بھی قدیم اردو کے کئی ہزار الفاظ علاقائی زبانوں میں موجود ہیں اور علاقائی اردو بولنے والے بھی ان کو استعمال کرتے ہیں۔ ان خوابیدہ الفاظ کو دوبارہ استعمال کر کے اردو کو برصغیر کی علاقائی زبانوں سے قریب کیا جاسکتا ہے۔

یقین ہے کہ حیدرآباد اردو لغت شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ لسانیات، قواعد اور علم الانسان کے ماہرین کے لیے نئے فکری راستے کھولے گی۔

دکھنی کی اہم تصنیفات کی بازیافت اور تدوین میں مستشرقین کا اہم رول رہا ہے۔ فرانسیسی مستشرق گارساں دی تاسی، انگریز مستشرق ڈبلیو۔ بی۔ کیر، جرمن مستشرق اسپرنگر، انگریز مستشرق جان شیکسپیئر، انگریز مستشرق بلوم ہارٹ، انگریز مستشرق اسمتھ اور مستشرق اسٹوارٹ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان علما نے اردو تصانیف کو شمالی ہند اور جنوبی ہند میں تقسیم کیا۔ بقول پروفیسر

اکبرالدین صدیقی ؒ گراہم بیلی پہلا مصنف ہے جس نے اپنی تاریخ ادب اردو میں دکھنی کے مصنفین کا تفصیل سے ذکر کیا ہے"، دکھنی کے تعلق سے ماہرین لسانیات میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ بعض دکھنی اور اردو کو زبان کی دو علٰحدہ شاخیں تصور کرتے تھے لیکن دکھنی کے محققین عبدالجبار ملکاپوری، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، نصیرالدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری اور پروفیسر اکبرالدین صدیقی کے قابل قدر کارناموں نے ان شبہات کو ہمیشہ کیلئے دور کردیا۔ دیگر جامعات کے دکھنیات سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیئے ہیں۔

جب کسی موضوع پر مختلف انداز سے اور مختلف پہلوؤں سے بڑے پیمانہ پر لکھا جاتا ہے اور تنقیدیں کی جاتی ہیں تب یہ سب ذخیرہ ایک باضابطہ علم کی حیثیت حاصل کرلیتا ہے۔ قریبی زمانہ میں دو عظیم شاعروں غالبؔ اور اقبالؔ کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا، ان تمام تحریرات کو علی الترتیب غالبیات اور اقبالیات کا نام دیا جاتا ہے۔ جب حضرت امیر خسروؒ کی سات سو سالہ تقریبات منائی گئیں تو میں نے تحریک کی کہ خسرویات کو ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت اور علم کی حیثیت سے ترقی دی جائے اور اس کی افادیت کو پوری طرح واضح کیا جائے۔

اب وقت آگیا ہے کہ دکھنیات کو علم کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اب تک علم لسانیات میں دکھنیات سے ویسا استفادہ نہیں کیا گیا جیسا کہ اس کا حق تھا۔ ضرورت ہے کہ دکھنی ادب پاروں کا بڑے پیمانہ پر علمی تجزیہ کیا جائے جو مخطوطے اس وقت تک ایڈٹ نہیں ہوئے ہیں انھیں ایڈٹ کیا جائے۔ جو کتابیں ایڈٹ ہو کر سامنے آچکی ہیں ان پر مزید تحقیقی نظر ڈالی جائے۔ ایسا کرنے سے تاریخ اردو ادب کے نئے گوشے سامنے آنے کا قوی امکان ہے۔ اس وقت تک دکھنی الفاظ کی چھان بین اور ان کے مآخذ کی تلاش کا کام خاطر خواہ نہیں ہوا ہے۔ یہ سب کام دکھنیات کا جز قرار پاتے ہیں۔

حیدرآباد اردو لغت بیک وقت علاقائی اردو لغت بھی ہوگی اور قدیم اردو لغت بھی۔ روایت و اثرات کے اعتبار سے اردو زبان اور اس کے ادب کے تین بڑے ادوار میں سے یہ لغت پہلے دور کی تخلیقات کا احاطہ کرے گی جو نویں صدی ہجری سے تحریری شکل میں نظر آتا ہے۔ اس دور میں گجرات کو چھوڑ کر صرف دکن ہی میں شاعری اور نثری ادب کی ابتدا ہوئی۔

اس دور میں بقول جمیل جالبی "زبان وادب ہندوی زبانوں کے الفاظ، تلمیحات، اساطیر، علامات تشبیہات اور اصناف و اوزان سے استفادہ کرتے رہے۔ یہ عمل مسعود سعد سلمان (۱۱۲۱ء) سے لے کر امیر خسرو

(۱۴۲۵ء/۱۶) سے ہوتا ہوا گجرات اور دکن میں دسویں صدی ہجری تک جاری رہتا ہے۔"

حیدرآباد اردو لغت کی تدوین کے سلسلہ میں پہلا کام یہ ہوگا کہ اس وقت تک دکنی اردو لغت پر جو کام ہوئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ یہاں مختصر ذکر پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

○

شاہان سلف کسی شخص کو اراضی نقد رقم یا رعایا سے نقد رقم وصول کرنے کا حق عطا کرتے تھے تو اس کو انعام کہا جاتا تھا۔ دکن میں انعام یا عطیات کے تعلق سے بے شمار الفاظ رائج ہیں۔ اسی طرح مالگذاری کے تعلق سے سینکڑوں الفاظ ہیں جو دوسرے علاقوں میں مروج نہیں

میرے جد امجد شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولاؔ نے ریاست حیدرآباد کے ۶۳۹ اصطلاحات ملکی سررشتہ مال و عدالت و کوتوالی و فوج وغیرہ کو یکجا کر کے ان کی تعریفات بیان کی ہیں۔ یہ کتاب "مصطلحات دکن" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی۔ حضرت ولاؔ نے اپنی دیگر تصانیف "مجموعہ قوانین مالگزاری"، "اعظم العطیات"، "سیاق دکن" وغیرہ میں بھی دکن کی اصطلاحات ملکی کی تعریفات شامل کی ہیں۔ حضرت ولاؔ کو اس اہم کام کی حد تک اولیت حاصل ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے دکنیات کی طرف خاص توجہ مبذول کی۔ دکنی ادب پاروں "سب رس"، "قطب مشتری"، "گلشنِ عشق" کو مرتب کر کے شائع کیا اور "پھول بن" کو بھی شائع کیا جسے شیخ چاند حسین (محکمہ تعلیمات پونے) نے مرتب کیا تھا۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری نے "پھول بن" اور "کلیات سراج" کو اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ نے "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کو مرتب کر کے شائع کیا۔ ان میں ہر دکنی لفظ کے نیچے بین السطور معنی درج کر دیئے ہیں۔ علٰحدہ فرہنگ ترتیب نہیں دی۔

پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے "ارشاد نامہ"، "کلمۃ الحقائق"، "چندر بدن و مہیار"، "پھول بن" اور "انتخاب کلام محمد قلی قطب شاہ" کو بعد تدوین شائع کیا ہے۔ ہر کتاب کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عبدالرحمن پارکر نے "نقش دلپذیر" کی جلد اوّل میں ۴۲ اردو شاعروں کے کلام کا انتخاب شامل کیا ہے۔ اس میں سات دکنی شاعروں کے کلام کا انتخاب محمد اکبر الدین صدیقی نے کیا۔ اس کتاب کی تحقیق و تدوین حکومت ریاست ہائے متحدہ کی مالی امداد سے تکمیل کو پہنچی۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر نے دبستان گولکنڈہ کی پہلی مثنوی "یوسف زلیخا" بعد تدوین شائع کی تو اس کے آخر میں ۳۸ صفحات

پر مشتمل فرہنگ کو شامل کیا ہے۔

سید مبارز الدین رفعت نے بیجاپور کے آٹھویں عادل شاہی فرمانروا سلطان علی عادل شاہ ثانی شاہی تخلص کے دکنی، ہندی، فارسی کلام کا مجموعہ شائع کیا تو اس کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے دکنیات میں دلچسپی لی، اور شاہ تراب کی کتاب "من سمجھاون" کو ایڈٹ کیا۔ موصوف نے قدیم دکنی لغت بھی تیار کی ہے جس کو مسلمانوں کی بول چال کی زبان کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر حمیرا جلیلی نے "کلمۃ الاسرار" اور "سب رس" کی تنقیدی تدوین کی اور مقالوں کے آخر میں فرہنگ کو شامل کیا ہے۔ دکنی اردو کی لغت پروفیسر مسعود حسین خاں اور غلام عمر خاں نے مرتب کی۔ اس میں چھ سات ہزار الفاظ شامل ہیں۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد کی اردو مشاورتی کمیٹی نے پروفیسر مسعود حسین خاں کی تیار کردہ اسکیم کی مکمل تائید کی اور جب یہ لغت مکمل ہوئی تو آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے اس کو ۱۹۶۹ء میں شائع کیا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"یہ قدیم دکنی اردو کی لغت ہے جس کا تمام تر مواد اس زبان کے مخطوطات اور مطبوعات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس قسم کا کوئی کام اب تک تجویز ہوا نہ مکمل کیا گیا۔ تاہم مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس کی حیثیت نشان راہ کی ہے منزل کی نہیں۔"

اس لغت میں دکنی لفظ کے ساتھ اردو میں اس کے معنی دیئے گئے ہیں۔ پھر اصل متن کا جملہ یا شعر درج ہے جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور مطبوعہ کتاب یا مخطوطہ کا مخفف حوالہ دیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۶۸ مطبوعات اور مخطوطات اور ان کے مخففات کی فہرست دی گئی ہے۔ یہ لغت تین سو اکیاسی ۳۸۱ صفحات پر مشتمل ہے

ڈاکٹر جمیل جالبی کی کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد مرتب کی ہوئی "قدیم اردو کی لغت" مرکزی اردو بورڈ لاہور کی جانب سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ لغت قدیم اردو کے تقریباً گیارہ ہزار الفاظ اور ان کے معنی پر مشتمل ہے۔

اشفاق احمد نے تعارف میں لکھا کہ "مولف نے دسویں گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے وسط تک کے قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو جانچ کر ان میں سے ان الفاظ اور تراکیب کو بطور خاص اس لغت میں ش کیا ہے جن کے مطالب اور معنی قدیم اردو ادب کے استادوں اور طالب علموں پر آسانی سے کھلتے نہ تھے۔"

اس لغت میں وہ الفاظ بھی شامل ہیں جو اردو زبان کی پہلی باقاعدہ تصنیف "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں استعمال ہوئے ہیں اور وہ الفاظ بھی جو گجری اردو کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ وہ الفاظ بھی جو عادل شاہی اور قطب شاہی دور کی تصانیف میں نظر آتے ہیں اور وہ بھی جو پاکستان اور شمالی ہند میں لکھی جانے والی تصانیف میں ملتے ہیں۔

اس لغت کی تیاری میں جہاں کم و بیش قدیم ادب کی ساری مطبوعہ کتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں سیکڑوں قلمی بیاضوں اور مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

پیش لفظ میں لائق مرتب لکھتے ہیں کہ "ہر وہ لفظ جو قدیم ادب میں استعمال ہوا ہے اسے معنی اور حوالہ کے ساتھ ایک کارڈ پر لکھ کر رکھ لیتا یہ کام ۱۹۶۱ء میں شروع ہوا تھا اور ۱۹۷۱ء میں ختم ہوا تھا جب کام ختم ہوا تو تقریباً اٹھارہ ہزار الفاظ کا ذخیرہ میرے پاس تھا۔ اس ذخیرہ کو دیکھ کر میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر ان الفاظ کو مرتب کر دیا جائے تو یہ لغت ان لوگوں کے لیے یقیناً مفید ثابت ہو گی جو قدیم اردو کی مطبوعہ کتب مخطوطات اور قلمی بیاضوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں"۔

پیش لفظ کے آخر میں جمیل جالبی نے نہایت بلند حوصلگی سے اعتراف کیا ہے کہ دنیا میں کسی کام کو حرف آخر نہیں کہا جا سکتا۔

انجمن ترقی اردو کراچی کی جانب سے لغت کبیر کا کام ہو رہا ہے جس میں دکنی الفاظ کو شامل کرنے کا منصوبہ ہے۔

لکھے ہوئے الفاظ کے علاوہ بولے جانے والے الفاظ کی بھی اہمیت ہے۔ دکن کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی دکنی الفاظ بولے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شری رام شرما نے کرناٹک اور مہاراشٹر کے مختلف اضلاع میں گھوم پھر کر کہانیوں اور گفتگو کو صدا بند کیا۔ ان کیسٹوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور اسی طرح مزید بول چال کی زبان کو محفوظ کر کے دکنی الفاظ کو جمع کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر شرما نے اپنی کتاب "دکنی زبان کا آغاز و ارتقاء" کے ضمیمہ میں "دکھنی کے مادوں کا مطالعہ" کے زیر عنوان ۴۹۵ مادوں کی فہرست دی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ غلام رسول نے کیا۔
اسی طرح دکنی اور جدید پنجابی کے الفاظ اور قواعد میں جو یکسانیت ہے اس پر علمی اور تحقیقاتی توجہ کی ضرورت ہے۔
دکنی گیتوں اور مزاحیہ شاعری میں بھی دکن کے الفاظ ملتے ہیں اور ان کا خاص استعمال معلوم ہوتا ہے۔ ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ بنیادی کام کی حیثیت سے مطبوعات اور مخطوطات کی جامع فہرست مرتب کرنی ہوگی۔

یہاں چند فہرستوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

دکنی ادبیات کے ماہر نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ لائبریری اور کتب خانہ آصفیہ کے مخطوطات کی وضاحتی فہرست مرتب کی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی نے ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر نے دکنیات پر مرتب شدہ کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے۔

افسر امروہی نے انجمن ترقی اردو کراچی کے مخطوطات کی فہرست چھ جلدوں میں مرتب کی رضا لائبریری رامپور کے مخطوطات کی فہرست بھی مرتب ہوئی ہے۔ ساری فہرستوں سے دکنی مخطوطات کی فہرست مرتب کرنی ہوگی۔ برصغیر سے باہر جو دکنی مخطوطات ہیں ان کی فہرستیں بھی مرتب کرنی ہوں گی۔

● ●

ڈاکٹر ارکان ترکمان
رئیس شعبہ اردو، سلجوق یونیورسٹی قونیہ (ترکی)

یونس امرہ

ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر

قونیہ میں میرام کے باغوں میں جب مولانا جلال الدین کی مثنوی کے اثر سے لوگ دیوانوں کی طرح مست ہو کر حال کھیلنے لگتے تو سادہ لوح ترک جن کو فارسی نہ آتی تھی وہ مایوسی کے ساتھ ان کے جوش و خروش کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہ جاتے تھے۔ خدا کی رحمت نے ان پر بھی ترس کھایا اور عام لوگوں کی زبان ترکی میں عشق خدا پر شعر لکھنے والے ایک ولی کو بھیجا جن کا نام امرہ اور تخلص یونس تھا۔ یونس کے ترکی اشعار میں اللہ کی محبت اس قدر صاف اور ستھری زبان میں پیش کی گئی ہے کہ سادے سے سادہ انسان بھی ان کے کلام کو سمجھ سکتا ہے۔

آج جب کہ سلجوقیوں کا فارسی زمانہ بہت پیچھے رہ چکا ہے ان کی ترکی شاعری نے اللہ والوں کے دلوں میں عشق خدا کی چنگاری کو زندہ رکھا ہے۔ ترکی میں کوئی ایسا گھر نہ ہوگا جس میں ان کے اشعار پڑھے نہ جاتے ہوں۔

یونس کو پیر کامل رومیؒ سے عقیدت تھی اور ان سے فیض بھی حاصل کیا جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں:

"مولانا خداوندگار کی نظریں جب سے ہم پر پڑیں ان کی پر عظمت نگاہیں ہمارے دل کا آئینہ ہیں"[1]

وہ رومیؒ کے ہم عصر اور ترکی کے سب سے پہلے صوفی شاعر ہیں۔ ان کے رسالے "رسالۃ النصیحۃ" کے اختتام پر جو تاریخ ملتی ہے وہ رومیؒ کی ہم عصری کا ثبوت ہے: "اور تاریخ تو سات سو سات ہی تھی (۷۰۷ ہجری) جب یونس نے اپنی جان اس راہ میں فدا کی تھی"[2]

یونس کے حالات زندگی

درویش شاعروں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس لیے ان کی تصانیف میں ان کے حالات زندگی کے متعلق کوئی زیادہ مواد نہیں ملتا۔ یونس کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کی زندگی کے حالات زیادہ تر روایتوں پر مبنی ہیں۔ ہم ان ہی حالات کو یہاں پیش کرتے ہیں۔

یونس رومیؒ کی طرح وسط ایشیا سے کوچ کر کے اناطولیہ آئے اور قونیہ کے گرد و جوار میں گھومتے رہے۔ بڑے عرصے تک ایک جگہ مقیم نہ ہوئے۔ ان کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آذربائیجان، شام، عربستان اور سارے اناطولیہ

۱۔ عبدالباقی گولپینارلی 'دیوان یونس امرہ' استنبول ۱۹۶۵ ص ۱۹۱۔ ۲۔ عبدالباقی 'ایضاً' ص ۷،۳۔

کا چکر لگاتے رہے۔ آپ چونکہ خانہ بدوش ترکمان تھے اس لئے سلطنت سلجوقیہ کے پائے تخت قونیہ کے گرد و نواح میں جہاں جہاں ترکمان سپاہی ملتے تھے آپ وہاں جا ٹھہرتے تھے۔ قونیہ کے قریب ایک شہر جس کا نام قرہ مان ہے یونس کا وطن ہوا یہ وہی شہر ہے جہاں رومی کے والد آ کر رہے تھے۔ رومی کی والدہ بھی یہیں مدفون ہیں۔

عوام میں ایک مشہور روایت

کہا جاتا ہے کہ ایک سال قحط پڑ گیا اور یونس کے گاؤں والے بھوکے مرنے لگے تو یونس اپنے زمانے کے برگزیدہ ولی حاجی بکتاشی[۲] کے پاس گئے اور ان کے حضور میں جا کر سوال کیا تو بکتاشی نے پوچھا "بتاؤ بیٹا آپ کو نظر چاہیئے یا گندم؟" بے چارے یونس نے سوچا کہ نظر کس کام کی چیز ہے گندم ہی کیوں نہ لے لوں جس سے بھوکے لوگوں کا پیٹ بھر جائے۔ تو گندم ہی مانگی۔ جب گھر کا راستہ پکڑا تو رستے میں کسی نے کہا "بھائی گندم کی جگہ ایک ولی کی نظر کئی گنا قیمتی ہوتی ہے" تو پشیمان ہو کر واپس لوٹے اور بکتاشی کی خدمت میں جا کر معافی مانگی اور نظر چاہی تو پیر نے کہا اب جاؤ اور تاپتوک امرہ[۳] کی خدمت میں رہو وہاں تم کو فیض مل جائیگا اس پر وہ ان کی خدمت میں گئے اور وہاں پر چالیس سال کاٹے اور نفس امارہ کو مارنے کے لئے ریاضت شروع کی درگاہ کے لیے لکڑیاں لاتے رہے۔ لکڑیاں کبھی ٹیڑھی نہ لاتے تھے۔ ایک دن ان کے پیر نے پوچھا "کیوں یونس صاحب ٹیڑھی لکڑیاں کبھی نہیں لاتے؟" تو جواب دیا "آقا آپ کے دربار میں کوئی ٹیڑھی چیز نہیں ملتی اسلیے لکڑیاں کیوں ایسی ہوں" ایک دن آپ نے پیر تاپتوک امرہ کی خوبصورت پاک دامن لڑکی کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا تو دل دے بیٹھے لیکن شرم و حیا اس قدر تھی کہ ان سے شادی نہ کی بس عشق میں جلتے رہے۔ ایک اور روایت بھی مشہور ہے جب یونس رومی کے حضور میں گئے تو سوال ہوا "بتائیے کیا آپ کو ہماری مثنوی پسند آئی؟" تو یونس نے جواب دیا "یہ کار آپ نے بات ذرا لمبی کر دی ہے حالانکہ اتنا کہنا کافی تھا گوشت اور ہڈیوں کا لباس پہن کر میں آیا ہوں یہاں یونس ہو کر" یہ روایت درایتہ (ادب) کے لحاظ سے درست نہیں ہے

آپ کی وفات اور مزار شریف

آپ کے کئی مزار پائے جاتے ہیں لیکن سب سے مشہور "قرامان" اور اس شہر کے ہیں۔ آپ کا انتقال ۷۲۰ ہجری میں ہوا۔

۱۔ جابد اوتونالی یونس امرہ انقرہ ۱۹۷۷ ص ۱۲۔ ۲۔ حاجی بکتاشی (۱۲۰۹-۱۲۷۱) خراسان سے ترکی آئے تھے۔ ترکستان کے مشہور ولی احمد یسوی کے مرید تھے۔ ان کا مزار ترکی میں "قرشہر" میں ہے۔ مناقب العارفین میں بھی ان کا ذکر آتا ہے (دیکھیے شمس الدین احمد الافلاکی تحسین یازیجی چاپخانہ انجمن تاریخ ترک انقرہ ۱۹۵۹ ص ۳۸۱، ۳۸۳، ۴۹۸)۔ ۳۔ تاپتوک امرہ بھی ایک ولی کا نام ہے جو یونس کے پیر خیال کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر فواد کوپرولی ترک ادبیاتندہ الک متصوفلار دیانت اشلری بکانلغی انقرہ ص ۲۷۱ -

تصانیف یونس کی سب سے بڑی تصنیف انکا ترکی دیوان ہے۔ اس دیوان میں ۳۵۰ کے لگ بھگ غزلیں ملتی ہیں۔ یونس کا ایک چھوٹا سا رسالہ بھی ہے جس کا نام "رسالۃ النصیحہ" ہے۔

افکار آپ کے اشعار میں زیادہ تر متصوفانہ فکر اور عشق الٰہی بہت ہی سادی ترکی میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ یونس بالکل امی تھے غلط ہے کیونکہ ان کے اشعار میں فارسی اور عربی کے ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو ان پڑھ آدمی کے منہ سے نہیں نکلتے دینی اور متصوفانہ معلومات بھی اتنی بلند پایہ ہیں کہ ان کا ان پڑھ ہونا محال نظر آتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ آجکل بعض مستشرقین خداپرست اور عاشقان رسول کو انسان شناس (HUMANisT) کہہ کر دکھلا کر اسلام سے دور کر دیتے ہیں۔ امریکہ کے ایک مشہور ترکی پروفیسر یونس کو بین الملل شخصیت کا خطاب دیتے ہیں[1]۔ حالانکہ یونس کو خدا اور اس کے رسولؐ کے راستے پر چلنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے کلام میں جگہ جگہ اسلامی تصوف کی بو اور نور محمدیؐ کی خوشبو مہکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہاں یہ بات کچھ اور ہے کہ اسلام خود بین المللی حیثیت رکھتا ہے۔ اب ناظرین کی دلچسپی کے لیے یونس کے ترکی کلام کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

مناجات

پہاڑوں کے ساتھ پتھروں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ
سحر کے وقت پرندوں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ

پانی میں مچھلیوں کے ساتھ، صحرا میں آہوں کے ساتھ
دیوانہ ہو کر یاہو کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ

آسمانوں میں عیسیٰؑ کے ساتھ، کوہ طور پر موسیٰ کے ساتھ
ہاتھوں میں عصا کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

درد بھرے ایوب کے ساتھ، روتے ہوئے یعقوب کے ساتھ
اور محمد محبوبؐ کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

حمد و شکر اللہ کے ساتھ، وصف قل ہو اللہ کے ساتھ
دائم ذکر اللہ کے ساتھ، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

---

[1] - پروفیسر فواد کوپرولی، ترک ادبیاتندہ الک متصوفلار دیانات اشتری بکانلغی انقرہ ص ۲۷۱ ۔ یونس امرہ، طلعت حالمان

جانتا ہوں دنیا کے حال کو، ترک کیا میں نے قیل وقال کو
سر برہنہ اور ننگے پاؤں، تجھے پکاروں میرے مولیٰ

یونس تجھے پکارے زبان سے بلبل اور قمری کے ساتھ
خدا کے چاہنے والوں کے ساتھ تجھے پکاروں میرے مولیٰ

نعت رسولؐ

ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تیرا سراغ مل جائے، تیرے قدموں کی خاک منہ پر پھیروں
خدا کرے تو دیکھوں تیرے چہرۂ مبارک کو، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
ایک ذرہ بھر نہیں ہے میرا حیلہ، صدق کے ساتھ ہوں میں اس راستے پہ نکلا
ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ بھی واقف ہوں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
علی اور حسنؓ حسینؓ جب وہاں ہوں، جب دل میں محبت جان میں الفت ہو
کل محشر کے دن بڑے دربار میں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری
یونس کی زبان نے حمد و ثنا کی تیری، سارے دلوں میں ہے بھری محبت تیری
روتے روتے اس پردیس میں، اے محمد میری جان آرزومند ہے تیری

رومی کی طرح یونس بھی پیار اور الٰہی عشق کو سب سے بڑی عبادت سمجھتے ہیں۔ زہد کو امید اور خوف کے درمیان ایک کشمکش قبول کرتے ہیں۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں: "زاہد کو اپنی عبادت پر ناز ہے لیکن عاشق کے سامنے محبوب کا چہرہ کعبہ کی طرح ہر دم سامنے نظر آتا ہے۔" شعر کا ترجمہ یہ ہے:

عشق ہے امام میرا، دل ہے میرا مسجد — چہرہ جاناں ہے کعبہ مسجد ہے ہر دم یہاں[2]

یونس کا عشق صرف اللہ ہی کے لیے ہے وہ جنت کی حوروں کے بجائے خدا ہی کے طالب ہیں:

تیرے عشق نے مجھے مجھ سے چھینا، مجھے تو ہی چاہیے مجھے تو ہی چاہیے
میں جلتا ہوں ہر دم تیرے ہی لیے، مجھے تو ہی چاہیے مجھے تو ہی چاہیے
ہے مجھ کو نہ دولت نہ ثروت عزیز، نہ فقیری پہ ناز نہ عشرت عزیز
صوفیوں کو ہے ہر دم صحبت مطلوب، درویشوں کو بھی ہے آخرت محبوب

۱۔ ایضاً ص ۹۹ ۲۔ احمد قباقلی یونس امرہ، طوقر یاینلری استنبول ۱۹۷۵ ص ۱۵۰

مجنوں کو ہے لیلیٰ کی جستجو، مجھے تو ہی چاہیئے مجھے تو ہی چاہیئے

جنت چند باغوں کا نام ہے، کوٹھیوں اور حوروں کا مقام ہے

جو طالب ہوں ان کے انہیں بخش دے، مجھے تو ہی چاہیئے مجھے تو ہی چاہیئے

یونس جب سے میرا نام ہے، دل میں میرے سلگتی تیری آگ ہے

دو جہانوں میں ہے مجھ کو تو ہی مقصود، مجھے تو ہی چاہیئے مجھے تو ہی چاہیے[1]

عشق خدا سے جو یونس کی حالت ہوئی وہ یوں بیان کرتے ہیں :۔

میرا دل جب سے گرفتار عشق ہوا، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میرا سر اس راہ میں فدا ہوگیا، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میں چلتا ہوں اس راہ میں جلتے جلتے، عشق نے تیرے مجھے خون سے رنگایا

اب میں نہ عاقل ہوں نہ دیوانہ، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

کبھی گھومتا ہوں ہواؤں کی طرح، کبھی غبار اٹھاتا ہوں راہوں کی طرح

کبھی بہتا چلتا ہوں دریاؤں کی طرح، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا

میں یونس ہوں اور بے چارہ ہوں، سر سے پاؤں تک زخموں کا مارا ہوں

دوستی کی خاطر اس طرح آوارہ ہوں، آ دیکھ عشق نے مجھ پر کیا کیا کیا[2]

عشق خدا کے سامنے اس فانی وجود کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

جان جاناں کو دیکھا، میری جان نکل جائے

ہوا سود و زیاں سے فارغ، میری دوکان جل جائے

میں خودی سے جا نکلا، حجاب چشم کو پھاڑا

وصال یار کی خاطر، میرا گمان ٹل جائے

دو ہونے سے میں اکتایا، وحدت کے گھر لنے میں

شراب عشق کو پی کر، میرا درمان ٹل جائے

۱۔ پروفیسر تیمور تاشش، یونس دیوانی، منسٹر آف کلچر اینڈ ٹورزم انقرہ ۱۹۸۶ ص ۲۰۹

۲۔ شوکت رادو، یونس امرہ، دورغان قردش، ۲ ۱۹۷ م ص ۱۳۱

یونس نے خوب فرمایا، شکر و شہد ہے کھایا

شہد کے شہد دں کو جب پایا، تو یہ چپتا نگھل جائے[1]

دلیاہند و پاکستان کی طرح (مثلاً بابا فرید شکر گنج، بھلے شاہ، نظام الدین اولیا وغیرہ) یونس کے بھی اشعار نصیحت آمیز ہیں۔ یونس غفلت کے خواب میں سونے والوں اور اس دنیا کے مال و متاع میں مگن ہونے والوں کو پکار کر یوں کہتے ہیں :—

کیا کروگے غافلو اس دنیا کے مال کو	کیا اسکو خرچ کر دینا تمہارے خیال میں نہیں؟
ہزار سال بھی جیو تو ایک دن ضرور مرنا ہے	کیا مر کر چلا جانا تمہارے خیال میں نہیں؟
پھر سفیدی آئی ہے تمہارے سیاہ بالوں میں	مرنے سے پہلے توبہ کرو گناہوں سے
مٹی کے نیچے اندھیری قبر میں	ایک دن جا سونا تمہارے خیال میں نہیں؟[2]

ور فرماتے ہیں:—[3]

کوئی مال کا صاحب کوئی ہے ملک کا صاحب	کبھی تمہیں یاد بھی آیا ان کا حقیقی صاحب؟
مال بھی جھوٹا، ملک بھی جھوٹا	آؤ ذرا تم بھی ان سے دل بہلاؤ صاحب

یونس کے اشعار میں جمادات، انسان، والحاصل ساری مخلوقات خدا سے محبت کی تلقین پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ان کے زمانہ میں اناطولیہ کی سیاسی حالت بہت نازک تھی منگولوں نے ملک کو تاراج کر رکھا تھا۔ ترکمان سپاہی ایک طرف منگولوں اور دوسری طرف سے رومیوں[4] سے لڑ رہے تھے۔ یونس بجائے لڑائی کے انسانوں کو صلح اور محبت کا سبق دے رہے تھے۔ یہی حالت مولانا رومیؒ کی تھی۔ یونس فرماتے ہیں۔

"محمدؐ ناراض نہ ہوتے تھے، تم کیوں ناراض ہوتے ہو؟ اگر ناراضگی تیری خصلت ہے تو تو درویش نہیں ہو سکتا۔[5]"

ان کا ایک اور مشہور مصرع یہ ہے "مخلوق خدا سے پیار کر خالق کی خاطر"

یونس انسان اور اس کے احساسات کو اہمیت دیتے ہوئے فرماتے ہیں:—

"یونس امرہ کہتا ہے ملا اگر حج کو جاتا ہے تو جائے ہزار بار لیکن سب سے بڑی بات کسی کے دل کو مول لینا ہے"[6]

اور:— "اگر ایک بار تو نے دل کو توڑا تو یہ تیری نماز نماز نہیں"[7]

۱۔ احمد قبا بقلی، ایضاً ص ۲۴ ۲۔ ۲۲۴ یہ شوکت راددا، ایضاً ص ۵۰ ۳۔ یہ شعر ترکی میں بہت مشہور ہے احمد قبا بقلی، ایضاً ص ۲۰۱ ۴۔ عبدالباقی، ایضاً ص ۱۳
۵۔ ایضاً ص ۱۸۶ ۶۔ ۲۰۰ ۷۔ قدیم اردو شاعر کا مشہور شعر ہے ؎ کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ ۔ یہ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا۔

یونس کا سب سے مشہور شعر جو ترکی میں بچوں سے لے کر بزرگوں کی زبان پر ہوتا ہے وہ ان کا یہ شعر ہے جس میں
ہیں کہ خدا کو باہر کیا ڈھونڈتے ہو وہ تو آپ کے اندر ہی موجود ہے :-

مجھے مجھ میں نہ کہیئے میں خود میں نہیں ہوں — ایک میں ہے میرے 'میں' کے اندر
جدھر دیکھوں ادھر تو ہی بھرا ہے — تجھے کیسے رکھوں میری جان کے اندر
وہ ایک دلبر ہے جس کا کوئی نشان نہیں — نشان کہاں ملتا ہے نشان کے اندر
کوئی تجلی سے اپنا نصیب لے بیٹھا — کسی کا مقصود ہے اس تجلی کے اندر
تیرے عشق نے مجھے مجھ سے لے ڈالا — یہ کیا میٹھا درد ہے اس درمان کے اندر
شریعت اور طریقت ہیں راہیں جاننے والوں کیلئے — حقیقت اور معرفت ہیں نہاں ان سب کے اندر
کہتے ہیں سلیمانؑ جانتے تھے پرندوں کی زبانیں — ایک سلیمان تھا اس سلیمان کے اندر
ترک دین کرنے والوں کا کام ہے کفر — یہ کیا کفر ہے جو ہے ایمان کے اندر

نس امرہ جب عشق کی دیگ میں پک کر گل جاتے ہیں تو وحدت کے سمندر میں ان کو موت کا ڈر نہیں رہتا چنانچہ
ماتے ہیں :-

شربت جو حق سے آیا ہم نے پی لیا الحمد للہ — پھر قدرت کے سمندر کو پار ہم نے کر لیا الحمد للہ
خشک تھے گیلے ہوئے پر لگا کر پرندے ہوئے — ہم دو تھے پھر ایک ہی ہوئے اڑنے لگے الحمد للہ

ل وہند اور ترکی کے ولیوں کے خیالات میں جو مشابہت پائی جاتی ہے وہ سب وسط ایشیا کی پیداوار ہے ۔
کستان کے بڑے صوفی شاعر احمد یسویؒ[2] کے متصوفانہ خیالات حاجی بکتاشیؒ، یونس امرہؒ، جلال الدین رومیؒ بختیار کاکیؒ
یخ نظام الدینؒ جیسے اولیا اکرام پر نمایاں طور پر نظر آتے ہیں یہ سب ایک ہی مثلث کے دو زاویے ہیں جن کی چوٹی ترکستان
ی زمین ہے ۔ پاکستان اور ترکی کے صوفی شعرا کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو ان کے درمیان جو روحانی تعلق ہے
ہ اور بھی روشن ہو جائے گا ۔

۱۔ عبدالباقی، ایضاً ص ۲۰۰۔ ۲۔ خواجہ احمد یسوی گیارویں صدی عیسوی کے آغاز میں چینی ترکستان میں پیدا ہوئے تھے ۔ آپ شیخ
یوسف ہمدانی کے مرید تھے ۔ ۱۱۶۶ م میں آپ کا انتقال ہوا ۔

ایک نادر جنتری

جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل
خدا بخش لائبریری پٹنہ

جناب وارث اسماعیل عظیم آبادی کا عطیہ ایک نادر تحفہ لائبریری میں موجود ہے۔ یہ ایک تفصیلی جنتری ہے جس کا پہلا تقریباً دو تہائی حصہ مطبوعہ ہے اور باقی حصہ قلمی ہے۔ مطبوعہ حصہ ۱۷۶۴ء تا ۱۸۴۷ء کے سنین پر محیط ہے، یہ حصہ مطبع صبح صادق سے شائع ہوا تھا۔ سال طباعت ۱۸۴۷ء ہے۔ قلمی حصہ ۱۸۴۸ء تا دسمبر ۱۸۹۹ء پر محتوی ہے۔

یہ جنتری مندرجہ ذیل چھ سنین پر مشتمل ہے۔ ۱۔ عیسوی، ۲۔ بنگلہ، ۳۔ فصل، ۴۔ ولایتی، ۵۔ سمبت، ۶۔ ہجری، اس کے بعد سال جلوس بھی دیا گیا ہے۔ جنوری ۱۷۶۴ء تا دسمبر ۱۷۹۲ء کی تاریخیں اجمالی طور پر دی گئی ہیں، یعنی ہر ماہ کے لیے صرف چار اندراجات، ۱۷۹۲ء سے مکمل تاریخیں بقید ایام لکھی گئی ہیں، یعنی ہر ماہ کیلئے ایک کالم جس میں ۳۰، یا ۳۱ دنوں کی مختلف تاریخیں اور ان کے مطابق ایام تحریر کیے گئے ہیں۔

ابتدا میں پانچ صفحات پر مبنی ایک دیباچہ ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک جنتری مولفہ جان فلمک، مارٹین ایڈ صاحب حاکم عدالت صدر دیوانی کلکتہ، انگریزی رسم الخط میں طبع ہوئی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ جنتری کے اندر مترجم اور مرتب کا نام نہیں مل سکا، مرتب نے دیباچہ میں تمام متذکرہ سنین کی مختصر تاریخ بھی پیش کی ہے، ساتھ ہی بروج و تحویلات کا تعارف بھی کرایا ہے۔ شاہان مغلیہ (تیمور تا بہادر شاہ ظفر) کی تاریخہائے جلوس بقید مقام درج کی ہیں، پھر ایک جدول میں نام ماہ ہائے عربی، ماہ ہائے (ہندی) مشہور در عوام ہند، نام بروج عربی، بروج ہندی، بروج انگریزی، نام ماہ فارسی، ماہ ہائے رومی، ماہ ہائے ہندی اور انگریزی درج ہیں۔ آخر میں چند غیر متذکرہ مشہور سنین کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے اور سال کبیسہ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اول و آخر مزید ۱۲۔ ۱۲ اوراق ہیں جن پر خاندان کے افراد اور اکابر و اماثل کی تاریخہائے پیدائش، و وفات مرتوم ہیں۔ جنتری کے حواشی پر بھی اس نوعیت کے اندراجات کافی ہیں۔ بعض اہم تاریخی شخصیتوں کے انتقال کی تاریخ بھی تحریر کی ہے۔ مثلاً، نواب ہیبت جنگ بہادر برادر زادہ و داماد نواب مہابت جنگ بہادر، اواخر محرم ۱۱۶۱ھ، نواب شہامت جنگ بہادر برادر زادہ نواب مہابت جنگ بہادر، ۱۳ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ مادہ تاریخ۔ خارش بامرزد۔ ۱۱۶۹ھ۔

یہ نسخہ نواب بہادر سید ولایت علی خاں، رئیس عظیم آباد اور ان کی اولاد و احفاد کی ملکیت میں رہا ہے۔ چند اوراق پر نواب صاحب مذکور کی مہریں بھی ثبت ہیں۔ ان کی اور ان کے وارثوں کی متعدد تحریریں بھی ہیں، جن میں نواب سید اسمٰعیل (م ۱۹۴۷ء) اور ان کے صاحبزادے سید وارث اسمٰعیل م ۱۹۸۷ء خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

●●

اُردُو انٹرنیشنل

اردو ادب اور تنقید کا سہ ماہی مجلہ

ایڈیٹر: اشفاق حسین، ۸۰ اسٹریٹ ویسٹ سوٹ ۲۰۱ ٹورنٹو اونیٹریو، کناڈا

بین الاقوامی سطح اور یوروپ و امریکہ میں اردو زبان و ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ اب ایسے علاقے جہاں اردو بولنے اور لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنے جانے کے قابل ہے اعلیٰ معیار کے رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ اردو انٹرنیشنل کینڈا میں مقیم ترقی پسند نوجوانوں کا ترجمان ہے اور صوری و معنوی لحاظ سے اردو کی بہترین رسالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۸۲ء سے پابندی سے شائع ہونے والا یہ رسالہ اپنے دامن میں فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، شارب ردولوی، ممتاز حسین، قمر رئیس اور شہزاد منظر جیسے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سمیٹے ہوئے ہے۔

مشتملات: جلد ۲ شمارہ ۲ (مئی۔جولائی ۱۹۸۳ء)

افسانے، انشائیے: جوگندر پال، اکرام بریلوی، منیر الدین احمد، احمد داؤد، ہرچرن چاؤلہ، علی حیدر ملک، فہیم اعظمی، انور خلیل، شیخ۔

منظومات: فیض احمد فیض، قتیل شفائی، نیر جہاں، عبدالاحد ساز، عرفانہ عزیز، انور احسن صدیقی، رضی مجتبیٰ، صلاح الدین محمود، امیر الحسن، خالد اقبال یاسر، عذرا احمد، حسنین سید۔

مضامین: جوش و فراق کی یاد میں (فیض احمد فیض) سورج پر دستک۔ ایک مطالعہ (احمد ندیم قاسمی) مرتضیٰ برلاس (وزیر آغا) اردو شاعری میں نئی تحریر (شارب ردولوی)۔

غزلیں: حبیب جالب، شاذ تمکنت، فارغ بخاری، شاہ نور اختر، شاہین، حسن عابدی، اکبر حیدری، جمیل مدنی، اعجاز اعظمی، حامد جعفری، بدر الدین بدر، وقار ناصری، حمیرا رحمن، اختر لکھنوی، علی عباس امید، جوش منذرزئی، غلام حسین ساجد، ظفر زیدی، لیاقت علی عاصم، عارف امام، جاوید صبا، اسما وارثی، جمال زبیری، اشفاق حسین۔

مشتملات: جلد ۲ شمارہ ۳ (اگست۔اکتوبر ۱۹۸۳ء)

افسانے، انشائیے: جوگندر پال، آغا سہیل، زین العابدین، سعید انجم، سائرہ ہاشمی، طاہرہ نقوی، اسماء وارثی ناز،

نظمیں : رئیس امروہوی، وزیر آغا، نازش پرتاب گڑھی، فارغ بخاری، جیلانی کامران، فاروق حسن، شاہد عشقی، منیر الدین احمد
انیس انصاری، واحد بشیر، ابرار الحسن، سحر صدیقی، رضی مجتبیٰ، جلیل حشمی، شاہد نقوی، سلمان سعید۔

مطالعہ : شہر مثال کا دردمند شاعر ۔ افتخار عارف (گوپی چند نارنگ) احمد فراز ۔ بے آوازگلی کوچوں میں (محمد علی صدیقی)
راجہ گدھ ۔ ایک ناول (آغا سہیل) بے ثباتی ۔ لے انت ساگر ، ابرار الحسن کے شعری مجموعہ نا تمام پہ ایک نظر (اشفاق حسین)

تراجم : چند جاپانی نظمیں : شفیع عقیل/ ڈبلیو۔ ایس۔ مہرون/ شاداب احمد، فولکرن فان ٹورنے/ منیر الدین احمد، کارل ووبوہرسکی
منیر الدین احمد، برتھولٹ بریشت/ منیر الدین احمد، اریش فریڈ/ منیر الدین احمد، شیخ ایاز/ نور محمد شیخ، عبدالحکیم ارشد/ نور محمد شیخ۔

غزلیں : احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، انیس انصاری، حامد جعفری، کشور ناہید، شفیع عقیل، شاہین، سلمان اختر، اختر اللہ ماری،
مامون ایمن، عرفانہ عزیز، نیر جہاں، اکبر حیدرآبادی، سوہن راہی، ناصر بغدادی، سعید کوکب، اشفاق حسین۔

مشتملات : جلد ۳، شمارہ ۱ (جنوری ۔ اپریل ۱۹۸۴ء)

افسانے : انتظار حسین، انور سجاد، قیصر تمکین، سرور جہاں، الطاف فاطمہ، فہیم اعظمی، وصی برنی، فرخندہ لودھی۔

نظمیں : فارغ بخاری، عطا شاد، شفیع عقیل، منیر الدین احمد، فاروق حسن، شاہد عشقی، انیس انصاری، قمر ہاشمی، ابرار الحسن
ادیب سہیل، اکبر حیدرآبادی، شائستہ حبیب۔

مضامین : جدید ازبکی شاعری (قمر رئیس) افریقی ادب (کمال مصطفیٰ) اشفاق احمد کے افسانے (میمونہ انصاری) جدید افسانہ
اور علامتی اظہار (ڈاکٹر حامد حسین) پاکستان میں اردو زبان کا احیا (شہزاد منظر) تین خاکے : زیتون بانو
احمد فراز، آغا سہیل (رحیم گل) ابن انشا ـــــ بحیثیت مزاح نگار (کرنل غلام سرور)

غزلیں : احمد ندیم قاسمی، عزیز حامد مدنی، فارغ بخاری، مرتضیٰ برلاس، نازش پرتاب گڑھی، راج نرائن راز، شفیع عقیل
مہدی جعفر، افتخار عارف، ذوالفقار احمد تابش، مامون ایمن، رضی مجتبیٰ، اسرار زیدی، حمیرا رحمان
خالد اقبال یاسر، کلثوم اعجاز محمدی، عبدالاحد ساز، ستار سید، عترت حسین، نیلوفر تیموری، صبا اکرام، شاہین
حضرت شاہ، طارق مرزا، جوش مندوزئی، عابد جعفری۔

مشتملات : جلد ۳، شمارہ ۲ (مئی ۔ اگست ۱۹۸۴ء)

افسانے : بانو قدسیہ، زیتون بانو، مظفر اقبال، کے۔ ایم۔ اشرف۔

مضامین : نشان بے نشانی (حنیف فوق) نوشتہ دیوار (حسن عسکری) افریقی ادب ـــــ رجحانات (کمال مصطفیٰ)
شعری ماہیت، نثری نظم اور آزاد نظم (مصطفیٰ کریم)

یا: فارغ بخاری، علی عباس امید، نیر جہاں، اسرار زیدی، عرفانہ عزیز، فاروق حسن، مامون ایمن، ابرار الحسن،
رشیدہ عیاں، خورشید حسنین، رابعہ برنی، آشفتہ چنگیزی، نزہت صدیقی، خالد سہیل، عذرا احمد۔

یا: فارغ بخاری، حبیب جالب، شاذ تمکنت، شفیع عقیل، نازش پرتاب گڈھی، عبدالقوی ضیاء، افتخار عارف،
شاہد رزاقی، نیر جہاں، سلمان اختر، فخر زماں، خالد بشیر، خورشید حسنین، کلثوم اعجاز محمدی، اسد مفتی، جمیل
مدنی، سوہن راہی، تسلیم الٰہی زلفی، مجیب ایمان، حضرت شاہ، اسمار دارثی، جاوید اقبال ستار، ضیا شبنمی،
خالد سہیل، احمد نوید، وحید دانش۔

لف: ظفر زیدی کی یاد میں خاص گوشہ:

آہ ظفر زیدی (اشفاق حسین) ظفر زیدی ایک سانحہ (مامون ایمن) ظفر زیدی کی یاد میں تقریب (احمد اعجاز)
زندہ زن (حنیف اخگر) ہائے ظفر (منشی کاک) چرن اتر) ظفر کی یاد میں (افتخار سحر) میں کیا لکھوں (حمیرا رحمان)
سایہ (جاوید عادل رشید) مرثیہ ظفر (راجی سیٹھ) نذر ظفر (جمال زبیری) نذر ظفر (اشفاق حسین) انتخاب: ظفر
کی غزلیں، شناخت: ظفر کا افسانہ۔

مشتملات: جلد ۳ شمارہ ۳ (۱۹۸۴ء)

ر علی سردار جعفری: بچپن سے جوانی تک (علی سردار جعفری) پیراہن شبنم (آنند نرائن ملا) خواب اور شکست خواب۔
پیر دیوا خضر) نیلا فرشتہ (عرفانہ عزیز) نذر جعفری (کیفی اعظمی) نومبر میرا گہوارہ (علی سردار جعفری)
مانے: جوگندر پال، جمیل زبیری، ڈاکٹر ابن فرید، سعید انجم، ڈاکٹر خالد سہیل۔
م: کرائے کی کوکھ (مرزا حامد بیگ) ملاپ (ظفر عظیم) سنسکرت کی نظمیں (بیدار بخت/سکندر بخت) مرثیہ
(ڈاکٹر منیر الدین احمد)
مامین: مجروح سلطان پوری کی شاعری (چودھری محمد نعیم) نئی پرانی نظمیں (جیلانی کامران) ادب اور زمینی رشتے
(فخر زماں) اردو شعر و ادب مغربی ماحول میں (باقر حسین ضیاء)
یں/غزلیں: عنایت حسین شاداں، اعجاز اعظمی، فاروق حسن، واحد بشیر، سلمان سعید، شاہین بدر، طلعت اشارت، بخش
لائلپوری، وقار ناصری، آشفتہ چنگیزی، اکبر نوری جرولی، کلثوم اعجاز محمدی، جوش مندوزئی، عابد جعفری۔

مشتملات: جلد ۴، شمارہ ۱ (جنوری۔ اپریل ۱۹۸۵ء)

مامین: پابلو نرودا (علی سردار جعفری) شاعری اور شخصیت (ممتاز حسین) اردو شاعری کا مزاج (رشید ملک)

راجندر سنگھ بیدی اور لاجونتی (مصطفیٰ اکرم)

نظمیں: ظہیر صدیقی، عطا شاد، منظر ایوبی، شاہین، نیر جہاں، انیس انصاری، منیر الدین احمد، سجاد بابر، رضی مجتبیٰ، احمد فقیہ، سیدہ نزہت صدیقی، اشفاق حسین۔

افسانے: رشید امجد، مسرور جہاں، احمد سعید، جتندر بلو، سعید انجم۔

غزلیں: فضا ابن فیضی، اعجاز اعظمی، عابد ودود، رفیق الزماں، سلمان اختر، ضیا شبنمی، حفیظ جوہر، اولاد رسول قدسی، مسلم شمیم، خالد سہیل، عقیل عباس جعفری، احمد نوید، قیوم طاہر، ریاض الوارث۔ ●

اقبال ریویو / اقبالیات

ایڈیٹر پروفیسر محمد منور، اقبال اکیڈمی پاکستان ۱۳۹، اے نیو مسلم ٹاؤن لاہور پاکستان

اقبال اکادمی پاکستان کا یہ رسالہ اقبال کی زندگی شاعری اور فکر پر علمی تحقیق کے لیے وقف ہے اور اس میں علوم وفنون کے ان تمام شعبہ جات کا تنقیدی مطالعہ شائع ہوتا ہے جن سے انھیں دلچسپی تھی مثلاً اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، مذہب، ادب، آثاریات وغیرہ۔

اقبال ریویو مشتملات: جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۱ (اپریل ۔ جون ۱۹۸۶ء)

علم جدید کے مسائل اور قرآن کا فہم (مارٹن لنگس ترجمہ ابوبکر سراج الدین)، مذہب اشعریہ کا تنقیدی مطالعہ: اقبال اور شوون (SCHUON) کے حوالے سے (شہزاد قیصر)، زندگی کے توہمات (رینا گوینن)، جاوید نامہ میں زندہ رود (ڈاکٹر تارا چرن رستوگی)، عالمی اقتدار ——— امن وسلامتی کا راستہ (اے۔ کے بروہی)، علامہ اقبال اور نئی نسل (پروفیسر محمد منور)، اقبال بحیثیت شاعر ومفکر (اے۔ کے۔ انصاری)، نقشبندیہ اور مسلم قومیت کا نظریہ (ڈاکٹر فتح محمد ملک)، اقبال کا اپنی فارسی رباعیات کا انگریزی ترجمہ (ڈاکٹر محمد ریاض)، قرآن کریم کے مطابق اخلاقی فیصلوں کے علمیات (پروفیسر محمد رفیق چوہان)

اقبالیات مشتملات: جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۲ (جولائی ۔ ستمبر ۱۹۸۶ء)

شخصیات: ڈاکٹر رادھا کرشنن اور علامہ اقبالؒ (پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم) داغ کے اثرات اقبال پر (پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

فکریات: انفرادی تہذیب: اقبال کی نظر میں (ڈاکٹر مظفر حسن ملک) خودی (حکیم احمد شجاع پاشا مرحوم)

مطالعۂ خطوط: علامہ اقبالؒ خطوط کے آئینے میں (ڈاکٹر جمیل جالبی)

تحقیق وتدوین: اقبالؒ ایران کی درسی کتب میں (ڈاکٹر محمد ریاض) کلام اقبالؒ میں تذکرۂ حیوانات (ڈاکٹر اکبر حسین قریشی)

تراجم: عقل و وجدان: اسلامی نقطۂ نظر سے باہمی تعلق (مصنف سید حسین نصر، ترجمہ: احمد جاوید)

رپورتاژ: اقبالؒ پر ایک یادگار عالمی اجتماع: حیدر آباد اجتماع (ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

تبصرہ کتب: اقبالؒ یورپ میں (مصنف: ڈاکٹر سعید اختر درانی، مبصر ڈاکٹر صدیق شبلی) مطالب اقبال رح (مصنف: مقبول انور داؤدی، مبصر: تحسین فراقی) گلستان اعظم (مصنف: ڈاکٹر عبدالحسین زرین کوب، مترجمین:

ڈاکٹر نور محمد خاں، ڈاکٹر کلثوم فاطمہ سید۔ مبصر: ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی) اقبالؒ کا تصورِ اجتہاد (مصنف: ڈاکٹر خالد مسعود، مبصر: محمد سہیل عمر) شاعری اور پارسائی: حکیم سنائیؒ کے کلام کا مطالعہ (مصنف: جے۔ ڈی پی ڈی بروئین، مبصر: محمد اطہر طاہر، مترجم: محمد سہیل عمر) مظلوم اقبالؒ (مصنف: شیخ اعجاز احمد، مبصر: ڈاکٹر وحید عشرت)

اقبال ریویو مشتملات: جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۱ (اپریل۔ جون ۱۹۸۷ء)

رسول اللہ کی رحمدلی (مارٹن لنگس)، اقبال کے فلسفہ میں خدا اور کائنات (رفعت حسن)، علوم فلسفہ میں مسلمانوں کا حصہ (محمد معروف) اقبال کا خدا اور گیتا کا دیوتا (LORD) (پروفیسر دستمابیلمو ریا) خودی (عطاالرحیم) دانتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم (شیر محمد سید)، اقبال کا نظریہ علم (خورشید انور)

اقبالیات مشتملات: جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۲ (جولائی۔ ستمبر ۱۹۸۷ء)

فکریات: معقولات زمان ومکان کا اسلامی کونیاتی وجدان میں مقام (عبدالحمید کمالی) خطباتِ اقبال۔ چند بنیادی سوالات (محمد سہیل عمر)

تحقیق: کلام اقبال کے دو قدیم مخطوطے (ڈاکٹر گیان چند جین) قصہ ایک خط کا۔۔۔۔ (ڈاکٹر وحید عشرت)

ثقافت: اقبال کا نظریہ ثقافت (ملک محمد رمضان بلوچ)

تصورات: علامہ اقبال بحضور آدم۔ خلقی و فطری شرف (۲) (پروفیسر محمد منور)

تذکار: دار الاقبال بھوپال میں اقبال کا ورود مسعود (ممنون حسن خاں)

تبصرہ کتب: خدوخال اقبال پر ایک نظر (مصنف محمد امین زبیری، مبصر: سید نظر زیدی)

••

The above approach obliterates the distinction between the basic creed and the social cultural moves of the environment in which Islam was born and developed. It is not realized by the advocates of religious totalism what a large portion of what they hold to be the 'Islamic way of life' is a legacy of the pre Islamic Arab milieu. Now, if pre-Islamic Arab mores (not specifically repudiated by the Quran or the Prophet) could survive, why should not the same be done in the case of other ethnic groups and cultures ? In any case, the traditional culture, national character and historical situation of different recipient groups inevitably colour and shape the cultural or religious system acquired from others. All cultural systems—language, art, morality, religion—are subject to modifications in the process of diffusion. Cultural variations due to time and space are unavoidable. Equally unavoidable are protests against such modifications and innovations and the calls for a return to a golden past exemplified in a sacred personality or personalities. Such being the dialectic of history, ideological tension and conflict are inseparable from the human situation. Now religious totalism grea tly intensifies this conflict and leads to fragmentation of the human family on the basis of religion. Religion, so interpreted, becomes a divisive force. *Religious liberalism, on the other hand, by readily accepting cultural pluralism and* ceaseless growth, encourages the brotherhood of man, ever in the making, rather than of the brotherhood of the strict followers of a sharply defined creed. According to religious liberalism, all truth-seekers and sincere believers are brothers in faith speaking different 'languages .of the spirit.' All must be accorded equal respect and dignity, irrespective of the spiritual language they may happen to speak by virtue of the time and place of their birth.

If. for instance, being a blue-blood Muslim implies (in addition to the five pillars of faith) bearing an Islamic name which is equated with a name belonging to the Arabic or Persian language, wearing a particular dress, living in accordance with a particular life-style pertaining to eating, entertainments, segregation of women, accepting a definite economic system, and so on, those individuals or societies which do not satisfy the above requirements would stand automatically downgraded on the scale of 'true' Islam, Unfortunately, this line of thinking persists among numerous Muslims.

all too easy to substitute selective statistics and defensive rationalization for non-ideological factual analysis, in the name of Islamic research.

This is the problem posed by the glaring divorce between theory and practice, in this matter, in Muslim countries throughout history. Even more significant is the resort to 'juristic deception' *heela* in Muslim Theology enabling the believer to bypass the prohibition of usury. Two of the most common forms of 'juristic deception' are as follows : (a) the lender and the borrower agree on a deadline (pretty early) for returing the sum borrowed and also stipulate a fine or penalty to be paid by the debtor in case he fails to observe the deadline; (b) the borrower sells some article to the lender at a nominal price and subsequently buys it back from the lender at a substantially higher price, thereby enabling the lender to earn a 'profit' without involving usury.

It is noteworthy that Jews and Christians have engaged in precisely similar practices, down the ages, for the same reason.

The conservative view was that even if acceptance of interest on bank deposits differed from charging usury on loans, the banks, in their turn, did charge interest/usury on the sums lent out to others. Thus, the 'profit' they passed on to the depositor was eventually 'tainted money' rather than profit, in the proper sense, from trade or industry.

If the presence of risk be the real criterion for justification of unearned profit by a sleeping partner, while the absence of risk for the non-justification of interest, the concept of profit distribution by Islamic banks to depositors might become questionable since hardly any risk is involved in such transactions.

The prohibition of interest, the institution of *zakat*, the Islamic law of inheritance, severally or jointly, would not suffice, by themselves, to solve our complex problems. The prohibition of interest will not do when acute distress, urgent need of capital, or national defence, etc. make borrowing on interest unavoidable. *Zakat* will not do when savings are almost zero and the consumption and development needs of the society large. The law of inheritance will not do when all there is to inherit be poverty and disease.

Moral exhortations whether in the name of religion or of a secular ideology will also not do if situational factors and constraints have been ignored in the framing of the ideal or in legislation. Thus, even the nationalisation of the means of production will not do when productivity fails to catch up with social needs. No economic system or philosophy will succeed if it entertains a romantic illusion concerning human nature.

Religious totalism, in its extreme forms, includes even such matters as language, food, dress, games, entertainments, social customs and etiquette in the purview of religion. Thus, the true Muslim is expected to conform to the Islamic ideal or norm in all the above matters.

Islamic economists differ among themselves with regard to issues such as nationalization of land and of the means of production. While some, like Ghulam Ahmad Parvez, and others, are inclined towards Islamic Socialism, others like Maududi, Baqir Al-Sadr, are inclined towards a different position. Generally speaking, however, Islamic economists proclaim the necessity for adopting an independent Islamic economic order which, however, has yet to be evolved and tested. See Nijatullah Siddiqi : Survey of Muslim Economic Thinking, Islamic Foundation, Leicester (UK), 1980, pp. 46-53.

To accept or reject, in the name of the Quran, the theories of Darwin, Copernicus and others involves the fallacy of projective interpretation. 'Field-integration' on the other hand, is based upon the principle of creative fidelity and inner consistency in the continual reunderstanding of Scripture, and does not commit any fallacy of projection in the pejorative sense. Re-understanding of Scripture is indispensable for grasping the directive significance of the revealed text in an ever changing human situation.

All understanding or interpretation of any language, culture or religion takes place in an antecedent framework of concepts, values, interests, attitudes of the individual. Differences in the above lead to different perceptions and formulations of theory. The first and foremost task of philosophy is to make one aware of the basic sources of such disagreement rather than the defensive justification of any particular perception or formulation. A mature and balanced philosopher is not precluded from making a final choice of theory or formulation, but he must not cherish the delusion of its demonstrable truth, to the exclusion of all other theories or conceptual formulations.

Many Muslim social scientists are today engaged in an ideological attack upon the evils of interest-based economy (just as others are engaged in an ideological demolition of some other economic doctrine) rather than a neutral analysis of the several aspects and ramifications of the issue of interest. To give an instance, Nijatullah Siddiqi claims to have written his learned paper entitled, Rationale of Islamic Banking, published by the International Centre for Research in Islamic Economics, Jeddah, 1981, as a social scientist rather than as an apologist for Islam. Yet, the learned author does not concede any element of value, whatsoever, to interest as an economic tool.

Edmund Husserl (d. 1938), German philosopher, and one of the founders of Phenomenological Existentialism, first elaborated this concept. No knowledge is possible without first suspending one's antecedent beliefs and adopting the inner posture of 'epistemic openness, without evading or explaining away any possible or actual conflict between antecedent belief and the findings of honest and accurate analysis

All doctrinaire approaches lead to this fallacy. Perhaps, no other doctrinaire oversimplification has caused as much harm, on a global scale, as the early Communist over-simplification of the issue of population planning and the charge that the slogan of over-population was a false Capitalist alarm. I respectfully submit, it is

Luther, (d. 1546) who forcefully pleaded that while usury was morally repugnant, interest on commercial and developmental loans served social needs.

The above approach found ready acceptance in Britain—the first industrialised country in the modern sense and also the country where the seminal work, the Wealth of Nations, published in 1776, by the philosopher, Adam Smith (d. 1790, gave birth to Economics as a social science. Significant contributions by Jeremy Bentham (d. 1832), J. S. Mill (d. 1873), Ricardo (d. 1823) Malthus (d. 1834) and others followed to enrich Economics as a pure social science.

The growth of theoretical Economics and the practical constraints of rapid industrialisation fostered a new outlook on social and religious problems. The legal prohibition against usury was repealed. Soon afterwards, the statutory ceiling on the rate of interest, and the legal penalty for violating the maximum limit, was removed in the early 19th century in Britain and elsewhere under the influence of the philosophy of *laissez faire* liberalism.

The middle of the 19th century, however, saw a reaction against the doctrine of absolutely free and uncontrolled market economy. Several sensitive minds began to think that the much-lauded free market economy had bred numerous social and economic evils—uncontrolled ubranization, poor-house poverty, crime, rootlessness, anonymity, alienation, dehumanization of labour, unemployment, all flourishing in the midst of and despite mass production and affluence. The ideas of cooperative production, state regulation, and finally, of socialism came to the fore in order to remove the grave imbalances created by the free interplay of market forces. There was a spate of social welfare legislation and economic regulations in western countries to protect the weaker sections. Institutional arrangements were made for the supply of cheap credit to the needy and for protecting insolvents. Thus, while the religious prohibition against usury was done away with, its basic objective—the protection of the interests of the weak was sought to be promoted by means of democratic and socialist ideals. Liberal Christian thought contributed to this development but conservative, rather static, quarters within the Church were reduced to the position of preplexed and helpless spectators of the new emerging values.

To complete the picture, a few remarks may be made concerning the ancient Indian approach to usury. The *Dharmashastras* also strongly disapprove of usury on distress-loans. Indeed, one *Dharmashastra* declares that usury, *kuseed*, in the case of a distress-loan, is a greater evil than even the murder of a Brahman, *Brahmhatya*. However, commercial interest is permitted. Different law-givers prescribe different rates of interest bearing in mind different relevant factors and also safeguarding the legitimate interests of the creditor and the debtor and also of the society in general. However, it must be pointed out that there was caste discrimination while fixing the varying rates of interest (the rate being lowest for the Brahman borrower). Moreover, the general rate of interest was much higher than the rate of modern times. The lowest imaginable rate for Brahmans being 15% per annum. Buddhism follows the Hindu practice but without any caste bias.

NOTES AND REFERENCES

. Perhaps this is partly why the contemporary talk of Islamizing the economi system in Muslim countries attracts many educated Muslims in their endeavour t prepare a complete blue-print of the true Islamic way of life. The Muslim liberal of the late 19th century, Sir Syed, Chiragh Ali, Amir Ali, Muhammad Abduh al. on the other hand, had not only ignored the widespread practice of Muslim borrowing money, on interest, from money lenders (both Muslim and non Muslim) but made a theoretical distinction between exploitative usury an commercial interest. The liberals held that the Quranic prohibition referred t usury, in the ancient and medieval sense, and not to interest for commercia purposes. The government of Ottomon Turkey had even legally provided fo the maximum rate of interest.

Though the Quranic command to cut off the hands of the thief is categorical, th traditional Islamic canon law admits of several well known exceptions. Thus, th penalty stands routinely waived when the thief and his victim are close bloo relations, or when the amount stolen is below a prescribed minimum, or in th case of catables, musical instruments and so on. Yet another example of flexible interpretation of the Quranic prohibition of intoxicants is the permissibilit (according to Abu Hanifa, who commands the largest following among th Muslims) of date-wine of a particular type *nabeez*.

. Usury on distress-loans has been universally disapproved and morally condemne because it implies turning the suffering of a fellow human into an opportunity fo material profit. In ancient Babylonia, Hammurabi (app. 2000 B.C) sought t regulate the rate of usury. A new king often declared the cancellation of all debt at the time of his coronation.

Judaism prohibited usury in the strongest possible terms making no distinc- tion between distress-loans and loans for any other purpose, but permitted Jew to charge usury from non-Jews. The Christian canon law made the prohibitio universal. In the middle ages Thomas Aquinas (d. 1274), the greatest medieval Christian theologian, made a distinction between distress and commercial loans but the canon law was not altered. In practice, however, the prohibition was conspicuous by its violation due to economic compulsions.

The religious leaders of the mercantile Italian city-states of the early modern era, Florence, Venice and others (which were the pioneers of modern internationa commerce and banking) were the first to question the ethical and religious validity of the absolute Christian prohibition of interest without distinguishing it from usury when commercial practice had already sharply deviated from canon law. It was, however, John Calvin (d. 1564), the great Swiss Protestant reformer, no less influential than his more internationally famous German contemporary, Martin

too subtle for easy detection—a sense of gradation within the community of believers, assuming they have not been declared outside the pale of Islam.'[4] Shall not the self-appointed judges on the quality of Islamic faith of others fall victims to spiritual pride, whether the judges belong to the dominant majority or to the peripheral sects, sub-sects or microscopic cults ? Therefore, I respectfully submit that no classical definition, nor any attempted redefinition of Islam, be treated as final in a situation where the heresies of yesterday grow into the dogmas of today.

In retrospect, the liberal aproach of the nineteenth century Muslim reformers and statesmen which was in harmony with the broad evolutionary direction of world history towards separating religion and politics, should not be equated with separating morality and politics.

The separation of religion and politics does not mean the separation of morality and politics. While the former disjunction is pre-eminently desireable, the latter has been the recrurring tragedy of man's story from the very beginning. The de-linking of morality and politics produces power-hungry politicians or wielders of power. while their union truly great statesmen. But the chief limitation of the Islamic liberals was that they did not, or rather could not, create a conceptual framework to ensure an orthogenetic evolution of Islamic concepts and values. The Muslim liberal mind was not yet ready to undertake a task of such gigantic magnitude,—a task which has continued presenting a challenge to the religious creativity of Western man ever since the Reformation five centuries ago.

Though the 20th century is drawing to a close, I do not find any mature intellectual and spiritual re-awakening among the Muslims apart from the quest for political and economic power. However, I feel optimistic about good results in the next century from the honest creative efforts of truth-seeking Muslims (specially in democratic and secular India) provided, of course, they combine clear thinking and moral courage to speak out the truth as one sees it.

task. Instead of working for bringing about field-integration between the different dimensions of man's growing experience and insight, the votaries of Islamization address themselves to the task (in itself desirable but totally insufficient) of orthogenetic modification in the *shariat* as a total code of conduct. The way out of the malaise of the Muslim, is nothing less than an insightful redefinition of the nature and function of religion including Islam as such.

In more concrete terms, the solution is to confine the function of religion to the realm of transcendental mystery, and of 'faith in the unseen' with which, however, the believer relates himself through symbolic language having the power to grip well-informed, autonomous minds, while individuals and groups feel free to work out, through the democratic process, rules and regulations of the good life, reflecting the core of the Islamic creed and its value system. The liberation of the Muslim mind from the hold of the unquestioned assumption in regard to the nature and function of religion is the condition of their worldly as well as spiritual advancement. This applies not only to Muslims of mixed secular societies but to Muslims as a whole.

Far from debilitating or destroying Islam, such a liberation would cure an almost all-pervading self-alienation and sordid hypocrisy, and revitalize the Muslims spiritually and intellectually. There is no other way to overcome the chasm between Islam, as an ideal, and the state of Muslims in history—a chasm so frequently lamented upon but rarely conceptually analysed and understood by numerous sincere but conceptually innocent believers in liberalism.

Islam implies (and the implication is crucially important) that Islam must be conceived in plural terms. No particular model of Islam should claim or be given a privileged status of being the norm or standard for judging other professing Muslims who may profess a different model out of inner conviction or whose life-situation may not permit any particular model because of external constraints. An absolutist approach to inter-religious as well as intra-religious dissent leads to intolerance. This evil is easily detected and now rightly condemned. But the absolutist approach leads to an evil

The movement of Islamic Resurgence is an attempt to overcome the inertia and stagnation of the Islamic world for the past several centuries as was also the aim of the liberal reformers of the last century. The later in time is, however, not necessarily or always the more mature or valid.

While the Islamic vision of the liberal Muslim reformers and statesmen was blurred and dim on several counts, it had one outstanding merit which is conspicuous by its absence in the contemporary Islamic movement. And that merit was the realization (a) that the essential nature and function of religion in an ever changing human situation was inspirational rather than legalistic, and (b) that there was a distinction between the Islamic core, as a transcendental creed and value system, and Islam as a cultural *gestalt* moving in social space-time. The contemporary movement, on the other hand, merely distinguishes between the core and the details of the *shariat* and risks to 'adjust' it to meet contemporary needs more effectively, thereby displeasing conservative Muslim opinion. But the contemporary movement is unable to extend the distinction between the core and the periphery, the essential and the contingent, the eternal and the temporary, to the crucial issue of the function of religion from the historical as well as the ideal points of view. Consequently, the contemporary movement accepts, as a self evident truth, the medieval theory of religion as a total conduct of life. From this point of view, they cannot but conclude that the post-eighteenth century liberal Christian tradition in Western Europe and America is nothing but a corrupt and degenerate phase of Christianity. The only lesson such a view could possibly have for Muslims and other religious believers is that they must stick with all their might to the medieval theory of religion as a total code, (as much applicable to the political, economic and cultural spheres of life as to the purely spiritual) if they wish their religion to be spared the catastrophe which overlook Western Christianity in the late eighteenth century. In other words, the contemporary movement seeks to go back upon and undo the considerable work that was done by the liberal Muslims of the previous century, instead of taking up the torch of the great Islamic liberals and going forward with their unfinished

the corridors of power, different standard-bearers of more or less similar values, trample upon those dreams (with pangs of conscience, perhaps, in the beginning, and with, none as power blunts their conscience) in a mad race to reach or to retain their quintessence or their values-power.

It is the above fatal flaw of man, rather than flaws in the different thought and value systems, which is the source of the shattering of man's dreams. We register, even magnify and censure, the lapses of others in their pursuit of power ; . the lapses of our own are hardly noticed, or when noticed hardly bother our conscience. But the tragedy goes deeper Even the common man finds it almost impossible to withstand the seemingly irresistable economic pressures and situational constraints that push him in a direction different from the moral and spiritual values he professes with a fair degree of subjective honesty and sincerity. The few exceptions to this rather tragic situation only go to prove the rule

In the final analysis, therefore, the fault lies in the human clay rather than exclusively in any particular system And, while we can modify or even replace systems, we cannot alter the human clay much as we may educate or 'condition' the human brain and heart. Wisdom lies in continually improving the system in the light of actual experience rather than of priori formulae (religious or secular) and striving to purify the clay without expecting miracles of success and without losing the heart to march along, despite falls and failures, on the endless road to Utopia.

The basic approach of contemporary Islamic Resurgence may be called 'religious totalism' to distinguish it from the 'religious liberalism' of the late nineteenth and mid-twentieth century. 'Religious totalism', affirms that life is an organic unity of the spiritual and worldly concerns of man and religion must regulate this totality.[18] 'Religious liberalism', on the other hand, affirms that the éssential concern of religion is with the transcendental or spiritual dimension of human life.

It may be thought that the values of Islam are so uniquely distinctive that no extra-Islamic search for integral human welfare could ever satisfy the aspirations and ideals of a true Muslim economist. Consequently, he might say, the concept of Islamic economics, as theoretical discipline, is unavoidable for the believer. This approach does not appear to be convincing. Let us examine why.

The basic spiritual and moral values of all universal religions as also secular thought and value systems are essentially similar even when they differ in their theological beliefs, legal systems, practices, customs regulating dress, food, marriage and funeral rites etc. Such differences, however, do not negate their basic agreements which suffice for peaceful coexistence and a sense of harmony. In fact whenever a genuine meeting of minds and hearts takes place between diverse groups, there occurs a process of mutual interaction and learning. Does not this go to show the potential unity of basic values underlying the plural metaphysical beliefs, myths, symbols, rites and rituals of the human family.

The fact of the matter is that liberal humanists, Utopians scientific socialists and Gandhian reformers, no less than Islamic economists, stand for the same values in the long run (despite, obviously, differing on details and on the best means for reaching the values concerned). To suppose that the Marxists or the liberals are oblivious to higher values and that filling the belly is their only aim and objective is to distort the true picture. Thinkers, reformers, teachers, poets and artists of the human family as a whole, have the same dreams and aspirations. However, it is not they, but rather the wielders of power–political and economic–who run the societal machine and pilot the ship of state with scant concern for the dreams and aspirations of noble hearts and enlightened minds yearning to be heard by the powers that be. But alas ! the dreams remain mainly embedded in sacred hearts, though they do cause a flutter in society and make the ship of state slightly change course when the weather becomes too rough to be completely ignored. Even the radical change sometimes brought about by socio-cultural revolutions or break-throughs of history has barely touched the depths of social reality, with a few notable exceptions. Meanwhile

The Islamic economic axioms or fixed coordinates of the economic system are only two : (a) the prohibition of usury and (b) the wealth tax (*zakat*). Now the prohibition of usury has a universal validity, provided the prohibition be interpreted as a total ban on exploiting of human distress for material gain, and not as an indiscriminate and absolute restriction on using interest as an economic tool for mass or micro purposes.

The injunction of *zakat*, again, has a universal validity, if the injunction be interpreted as a recognition of the inalienable duty and responsibility of the state towards the betterment of the weaker sections of society rather than as a fixed and all-sufficient obligatory charity at 2½% of the surplus wealth. In other words, an open interpretation of the Quranic economic axioms in the light of a dynamic approach to Islamic ideal of social justice, might conceivably lead to results which are essentially similar to the results of 'economic rationality' whose aim is not merely maximum economic gain for any particular individual group or even for society as a whole, but which aims at the integral welfare of Society.

Islamic economists appear to assume that economics, as a pure social science, possibly cannot have any concern for values other than maximal growth of material wealth On this assumption Islamic economists understandably try to supplement this lop-sided objective/or concern of pure economic theory with the concern for human welfare as interpreted in Islam. But, as matters stand at present, all contemporary social thought links the idea of 'economic rationality' with the ideal of integral human welfare. Thus their objective is never mere wealth but welfare including material prosperity as one of its ingredients or dimensions. Economists, in their capacity as pure social scientists, may well engage themselves in spelling out the implications or demands of economic rationality (in the restricted sense) under perfect economic conditions. But such conceptual projections and exercises are motivated by scientific curiosity as in the case of logic, mathematics or pure science and do not claim to displace the imperative of social welfare as interpreted by the collective conscience of humanity. If so, hardly any need is left for juxtaposing Islamic Economics *vis-a-vis* the general economics of welfare.

Epiloque

Socio-economic evils do not spring from the vicious root of interest but rather from a combination of economic deprivation, negative or destructive human drives and an unplanned society which is unable to develop the human potential for intelligence, honesty, self-discipline, fraternity and love. These values are upheld by Islam but they are not the monopoly of Islam or any other particular religion or culture

All basic moral and spiritual values operate in an ever changing human situation, and must, therefore, continually be reinterpreted or revised. A perennial aspiration for the better, continuous research, and social and state action should bring about ceaseless growth in our cherished values. Here vociferous slogans for Islamization are no substitute for their genuine growth. The contemporary climate of Islamic politics tends to dissipate the rational and empirical approach to complex problems, ignoring social evils far more serious than the evils flowing from the violation of some well known features of the Muslim canon, law or *shariat.*

Islamic intellectuals and leaders of political opinion must realize the plain truth that the economic directives of the Quran or the economic system of the golden age of the pious *Khalifas* will not suffice in the modern age.'[2] There is no alternative but to follow where the argument of Economics, as a social science, leads us. This implies conceptual analysis, the construction of different models of economic correlations and sequences and formulation of tentative hypotheses or theoretical choices to be finally accepted or rejected in the light of empirical verification. 'Islamic Economics' in the pure theoretical sense is not a valid concept. The concept of an 'Islamic economic system', in the normative sense, is nothing but sophistry and illusion. However, it is a proper and vitally significant question to ask : Are the Islamic economic axioms valid, and can they serve as the fixed coordinates of a developed economic system for the modern age ? Well, the axioms are valid, provided they be interpreted flexible in the light of 'economic rationality' and they can yield a system (which could be termed 'Islamic', if it so pleases Muslims) suitable for modern industrial society. Let me explain this crucial point.

It appears that Islamic economists who point out the moral, economic and social harm flowing from interest just never mention any of its positive advantages or functions. Or is it the case that there is no positive side at all to interest ? This is certainly not the case Indeed, most economists are of the view that interest performs an irreplaceable socio-economic function and that all efforts toeliminate interest from Society are futile.

It is significant that socialist thinkers and reformers as Robert Owen (d 1858) of Britain, Rodbertus (d 1875) of Germany, had condemned interest and advocated its abolition. Marx and Lenin did not hold interest to be the arch evil. Though the Soviet Union had excluded interest, as a cost factor, in the early period just after the Russian Revolution, this practice has been given up. Thus, even Socialist planners who reject the Capitalist system, nevertheless, include interest for computing the total cost of production and for fixing the consumer price despite the state being the sole producer and distributor without any internal competition or market economy.

It appears to me, as a layman, that the failure to eliminate interest at the micro-level in England, France and Germany, and the more recent failure to exclude interest at the macro-level in Soviet Russia as cost factor of production is a significant pointer to the probable necessity of interest, at least, at macro-levels. This, conclusion, however, does not adversely affect the possibility as also desirability of abolishing interest or rather usury in the case of distress loans and also in the case of some specified consumption loans for educational or cultural purposes.

Interest is an economic tool performing several functions only some of which could be taken up by the scheme of profit and loss sharing. Social scientists, almost without exception have concluded after prolonged enquiry that there is no effective substitute for interest just as an overwhelming majority of well informed and independent social philosophers and enlightened statesmen have arrived at the conclusion that despite the evils of democracy no better substitute is available. It is another matter that enlightened despotism may work wonders in the short run.

In short, the morality of interest cannot be settled through an immediate and simple value judgment as in the case of such evils as murder, rape, falsely incriminating an innocent person and the like. The abhorrence with which many Muslims look upon interest (which they judge as the root socio-economic evil) is probably the result of extending their understandable moral repulsion against usury (interest on distress loans) to all types of loans and to all contexts in which interest is charged. But a balanced evaluation of the issue of interest requires committed Muslim, no less than others, to discriminate between usury and interest in the different contexts and functions of interest instead of passing a blanket judgment.

Modern industrial/commercial interest, in the final analysis, is a considerable thin slice carved out of the calculated or expected profit, and its function is to ensure a stable and risk-free but low return to the lender who prefers the stability of return to the possibility of higher profits associated with a partnership. The concept of interest implies mutual concessions and accomodation between the lender and the producer. Far from being an instrument for exploiting the industrialist or the worker, it serves to maintain the balance and smooth running of the industrial/commercial machinery. It is a guaranteed thin slice out of anticipated profits on a bigger scale, and there seems to be nothing morally wrong in the concept of a guaranteed return on a loan or investment provided the guarantee gives a reasonable 'cushion' for the borrower in cases of failure, partial or total.

Interest, it will be seen, adds up to the total cost of productions and thus certainly adds to the price of goods and the rigours of the producer. But then interest protects the legitimate interests of the lender and promotes a proper climate for industrial lending and the circulation of money. Again, while adding to the cost of production, interest promotes a ceaseless concern for reducing production costs in a highly competitive market economy.

We should thus keep in mind the advantages as well as disadvantages of interest as of any other social practice or law in order to arrive at a balanced perspective.

together create the base for the subsequent productive role of labour and management. Once the organism is born and the infant plant becomes an adult organism, the role of the management and the workers also acquire a key role in raising the productivity and quality of the enterprise. But at the initial stages the capitalist and the entrepreneur play the crucial role of conceiving and producing a new social organism as such.

If all the different factors of production were to be supplied by one individual, he could rightly claim to appropriate the entire profit. This is not possible when large investments are made. The need for capital is fulfilled through various mechanisms or modalities : the accumulation of share capital, borrowing on interest from an individual or a bank or the state or some corporation, or by entering into a partnership with a person who can spare his idle money but not his time and energy. Now is there really any conceptual/or ethical difference between the above modalties or situations ?

Are not all the above situations characterized by a common feature—a claim for monetary return on the strength of the monetary contribution towards turning a mere idea or paper project into a productive concern ? And how can this claim judged to be morally repugnant in some cases but right in others ?

It is true that the projects of the sleeping partner are risk-bearing, while the interest (fixed charge of the bank/capitalist) is risk-free. But how does this economic difference amount to any moral difference between 'strictly' unearned profit and interest, rendering the profit of a sleeping partner moral and the fixed charge of the bank/capitalist immoral ? It may be said that the concept of a fixed charge bears an inherent or inbuilt moral evil since the absolute claim of the bank/capitalist to interest, —irrespective of the economic health of the venture and even when the venture is heading toward failure—implies or results in callous avarice on the part of the lender and inequitable exploitation of the borrower. But then this extreme situation is not the normal pattern of the economic process. Moreover equity demands the protection of the legitimate interest not of the borrower alone but of the lender as well.

One conception of interest is that it is the price a borrower is required to pay for satisfying a need he is unable to satisfy from out of his own available money. The excess payment he makes to the lender, over and above the principal amount, is the price of the borrowed money. Another conception is that the excess is the rent for the use of money belonging to the lender. Yet a third conception is that interest is the claim of the lender to be compensated for depriving himself of the actual or possible enjoyment of his own wealth which he places at the borrower's disposal.

In the context of trade and industry, interest is a relatively small fixed charge upon the theoretically larger profit of enterprise. It may be viewed as guaranteed unearned profit whose justification is that the supplier or capital—one of the necessary conditions of enterprise—is entitled to a small but assured return, independent of profit/loss, in return for placing his wealth at the disposal of the producer who is left free to direct the enterprise and who aspires to a relatively much larger return by way of profits.

The other factors of production (apart from capital) are land, technical skill or know-how, management, labour, and last but not least, entrepreneural leadership and organizational capacity. Now each factor of production is severally and jointly essential for the success of the enterprise and each has a rightful claim for just consideration. But entrepreneural leadership and the supply of capital do occupy a unique position or status in the sense that they jointly create the productive space or soil for the inception and future growth of the enterprise. Without such space or a base having been antecendently provided by the capitalist and the captain of industry, the social organism, comprising management and labour, would not have come into being at all. It is, therefore, understandable that the capitalist and the industrialist as founders and directors of the enterprise claim a higher status and appropriate the profits of the enterprise, while the management and labour receive fixed salaries for specified jobs. As between the capitalist and the industrialist, if the former supplies money-capital, the entrepreneur supplies the creative idea, dynamism and organizational initiative—the ideational/volitional capital. The two

problem, since all transactions would involve interest. Since economic isolationism is practically not possible, interest bearing transactions per force would have to be continued thereby creating anomalies and complications at different levels.

Thus there does not appear to be any justification for permitting unearned profit but prohibiting interest'[1]. Consequently, scheme of profit/loss participation by Islamic banks in place of interest-bearing loans to the entrepreneurs is rather a change in nomenclature—substituting the theologically acceptable term 'profit' in place of the theologically repugnant term 'interest' without any really meaningful change in the sphere of industrial or commercial transactions. However, the scheme of advancing interest-free distress loans or consumption loans for specified purposes *qarz-e-hasana* is a meaningful and welcome reform in the sphere of banking.

Modern economists have defined interest in various ways putting forward several theories of interest. These theories are, at bottom, attempts to assimilate or reduce interest to some other concept as profit, rent, price, cost, increment, reward and so on. As a student of philosophy it appears to me, that no theory which is purely reductive could ever provide a complete analysis of the nature and function of interest in every possible context. It seems that, in the context of industry, interest approximetes a factor of the cost of production; in the context of consumption loans, interest approximates price or rent of the borrowed money ; in the context of state bonds, interest approximates reward for waiting ; in the context of distress loans, interest approximates extortion. No single conception of the 'essence' of interest would thus suffice in all cases. Likewise, no ethical or economic appraisal of interest, in a blanket manner, would be valid. To arrive at a proper evaluation one must take into account the context and the exact function of interest in the type of situation under review. The concept of 'increment' which interest logically implies is, ethically, an indeterminate concept. We shall now briefly review some of the different conceptions of interest without attempting any reductive definition.

the concept of a fixed charge upon productive capital independent of the profit/loss incurred by the producer.

(c) Let us now examine the assumption that the abolition of interest would not bring down productive investment and the growth of the economy in general since profit/loss sharing by individual sleeping partners or by banks would do the same job presently being done by the mechanism of interest.

The above assumption is not really warranted by our present state of knowledge and experience. Confirmation of this abstract economic analysis requires empirical verification which is a far cry at present. But whatever may be the final verdict of experience, careful non-ideological analysis does not warrant the optimism of Islamic economists in this regard. The reason is as follows : A sleeping partnership involves full liability without power or the security for the sleeping partner who parts with his capital merely on the basis of active hope in the honest dealings by the managing partner. This, indeed, is the Islamic ideal (as also the ideal of other human religions an human decency in general), but the distance between the ideal and the real is notorious. In case the partner be tempted for some reason or other to cheat or indulge in some sharp practice at the expense of the sleeping partner (such instances being too common in the human family to be ignored by the mature and balanced law-giver) the sleeping partner will ever remain at the mercy of the partner. It is precisely at this point that the economic function of interest appears in a sharp focus. No other economic mechanism appears to serve the same purpose as effectively as does interest.

The possibilities of the active partner misusing the funds of a sleeping partnership would be reduced if Islamic banks exercise proper vigilance both before and after investment. In any case human nature, being what it is, the degree of security of investment, per force would depend upon the accuracy of the producer's balance sheet. Moreover, auditing work would multiply enormously creating scope for concealment and corruption.

International trade, which is unavoidable in view of the interdependence of the human family as a whole, would pose a further

that interest involves a moral evil, while profit/loss sharing does not. There is an element of truth in this contention. But this moral factor becomes relevant only when the producer is close to or actually reaches the state of economic break-down or the rate of interest be so exorbitantly high as to make the profit almost nominal. Otherwise the presence or absence of risk, or the fixity of interest and flexibility of profit/loss makes no ethical difference. In general, claiming a share in unearned variable profits on the basis of supplying capital to a partner is as moral or immoral as claiming interest, as a small but fixed charge, irrespective of profit/loss together with foregoing any share in profit/loss.

Another aspect of the matter deserves as much consideration as the avoidance of undue hardship to the producer when facing rough economic weather—producing the legitimate interests of the lender or sleeping partner. It appears that interest (viewed as a fixed charge paid by the producer) tends to motivate him to keep costs down and earn enough to be able to pay the cost of borrowing the capital, while cost-free capital tends to make the economic cushion much too soft for the entrepreneur and to slow down the rate of growth of the economy. Moreover, keeping the rate of interest on the lower side, implies that the creditor pays a definite price for eliminating the factor of risk and being content with a considerably reduced share in the net profit that would have accrued to him in as a sleeping partner. Choosing a lower share for the sake of security and the elimination of risk does not involve any moral wrong. It is exercising caution and demanding a measure of a security on the strength of the lender's financial contribution to the productive venture. This justified caution might become immoral avarice leading to exploitation of a fellow human being in distress. Only in extreme cases and in such situations the law of liquidation and solvency attempts to do justice to the creditor and debtor alike taking into account all the relevant aspects of a complex matter. If justice requires not merely the protection of the interests of the producer or trader but nominating the economic growth and balance of a complex modern society, the general rule rather than extreme cases ought to be taken into account for making laws or regulations. In the light of this principle no inequity is involved in

insurance, holding that while the function of gambling (namely momentary thrill, excitement or natural gain without giving anything in return to society) is undesirable, the function of insurance (namely protection against unhappy contingencies) is pre-eminently desirable. Now why should not this method of interpretation also be applied to the different types of loans and the issue of interest? Is it not the case that while the charging of interest on a distress loan involves exploiting human misery, this is certainly not true in the case of loan for development of industry or commerce. Again, is not ancient and medieval usury involving penal bonded labour in case of the failure of the debtor to honour his commitment very different, in the functional sense, from interest used as a tool for stimulating the economy and protecting the legitimate interests of the investor, the entrepreneur and society in general?

Analytical discrimination and juristic reflection have, indeed always been practised by Muslim jurists no less than the Prophet and the pious Caliphs. The classical distinction between developed and virgin land, and permitting farming or share-cropping in the case of the former but prohibiting it in the case of the latter is a good example. The same remarks apply to the penalty for theft and many other matters The point is why should not the same approach be followed in the case of the issue of interest.

(b) We now come to the second assumption—unearned profit which is risk-bearing is equitable, but unearned interest which is devoid of risk is inequitable.

Is there really any moral distinction between the risk-bearing nature of profit and the risk-free nature of interest over and above the purely economic difference that while profit is contingent and flexible interest is pre-determined and fixed?

Now it may be thought that interest being an absolute claim of the investor or lender, irrespective of the economic health of the productive enterprize, might cause unmerited hardship to the producer if and when things go badly with his enterprize for no fault of his own. This unmerited suffering is not associated in the case of profit-loss sharing. On this score it might be contended

rates of usury modelled on the rate of biological reproduction or growth. The biological model was quite understandable in an age when theoretical economics, social science and militant class consciousness were non-existent and the rising merchant or trader had to borrow money in what may be termed as a "usurer's market". The general rate of usury for traders and manufacturers was thus pushed up and no exception was made in the case of distress or consumption loans, whose purpose was obviously quite other than increasing his wealth. This state of affairs led to avarice on the part of the already rich and to the exploitation of the poor or the needy whose lot became even worse when they had to undergo bonded labour as a penalty.

Interest in the modern sense is computed as a function of the generally viable rate of profit in a given society. This approach has pushed down interest rates in the modern age though in some situations the state may try to push the bank rate upwards in order to put a brake upon reckless borrowing or wasteful and ill-conceived investments. Furthermore, the law prohibits penal bonded labour if the debtor genuinely be unable to discharge his commitments. Interest in the modern sense is thus quite different from usury. The assumption of their structural and functional identity breaks down in the light of historical and analytical scrutiny.

The modern practice of 'insurance' and the debate among Islamic economists whether insurance involves gambling (which is prohibited) is very relevant for correctly interpreting the Quranic prohibition of *riba*.

Insurance which was not known in early times finds no mention in Islamic jurisprudence, while gambling and games of chance are prohibited. Now since insurance definitely involves the operation of chance, the principle of analogical reasoning *qiyas* led most jurists to conclude that Islam also prohibits insurance. It is only some Muslim social scientists or modern-minded jusists who think on different lines. Let us see what method of interpretation do they adopt when they permit insurance even though it does involve the operation of chance. In the final analysis they make (rightly) a distinction between the function of gambling and the function of

To my mind, most Islamic economists start the exercise of Islamizing the economic system in Pakistan and elsewhere on the basis of three unchecked assumptions which are very far from being self-evident to a dispassionate analyst. The assumptions are: (a) there is no difference between usury and interest so that the Quranic prohibition of usury implies the prohibition of interest; (b) the unearned income or gain from a 'sleeping partnership' is morally right, while unearned gain in the form of interest is morally wrong because of risk being present in the first case and absent in the second; and (c) the abolition of interest would not adversely affect economic activity and growth in general but rather purge it of social evils. Let us now examine the above assumptions in some detail.

(a) Usury, in the ancient and medieval periods, was a charge upon all types of loans including distress loans contracted even by the poorest and weakest sections of society. Avaricious money lenders did not even reduce usury rates in case of distress loans to say nothing of waiving the interest out of sympathy or compassion. In this regard there is no difference between usury and interest, in the modern sense. Yet, it would be quite fallacious to equate the two for the following reason. The rate of usury was fixed on the model of biological reproduction or agricultural growth which follow geometrical proportions, while interest, in the modern sense, is calculated on the basis of arithmetical proportion. The difference between the two models of growth is so enormous that to equate usury with interest becomes like equating the domestic cat with the tiger. The model of biological growth was suggested (quite naturally and understandably) by the average rate of growth in the case of domesticated animals and also of familiar agricultural crops. Their general growth rate comes to approximately 400% per annum, while modern interest rates are deliberately kept, relatively speaking, very low. The reason for this almost startling discrepancy between the rates of usury and of modern interest is that the ancients did not adequately grasp the role of planning and skill of the trader without which the capital borrowed by him would not have grown at all. In other words, the owner of wealth tended to over, value his own role at the expense of the merchant or industrialist, and this scale of valuation was reflected in the high

Society abolishes interest ? Again, how or in what precise way is an interest-free society more desirable than an interest-based society ? The answer to these important questions shonld not be given by way of justifying the Quran or the *Sunnat* but must be based on honest and searching reflection in the light of reliable factual investigation.

The liberal Muslim intellectuals and statesmen of the previous century, among whom S. Khuda Bakhsh occupies an honoured place, did, indeed, attempt this important task. They made a distinction between (a) usury and interest and (b) different types of loans—distress loans, consumption loans and development loans for various purposes. They came to the conclusion that accepting bank interest on deposits and commercial interest were quite permissible.[10] However, charging interest on distress loans or even on consumption loans was un-Islamic.

Accepting bank interest on deposits is very different from charging interest on loans advanced to others. The depositor places his savings at the disposal of the bank which invests them either in the form of loans or purchase of shares in sound industrial concerns etc. The interest given by the bank is, in reality, a slice of the profits which accrue to them on their investments.

Interest-bearing deposits in banks or companies thus promote investment of idle money for the dual purpose of increasing the owner's wealth without diverting him from his actual vocation as also promoting general material prosperity through increased production and employment of the work force.

The Muslim liberals were correct in their basic approach, but their historical and analytical discussion of the nature and function of interest was too inadequate to convince traditional conservative opinion on such matters. They were unable to provide a rationale satisfactory to both reason and Islamic faith. Perhaps this explains how and why the economic content of the contemporary movement of Islamic Resurgence has gained considerable vogue in several Muslim countries. To this theme we now turn.

the highest grade of human ontic excellence. And this authenticity is attainable in theory, both by the autonomous philosopher or seeker of truth, and by the man of faith in the condition of 'blessedness' in the classical spiritual sense. In practice, however, authentic being appears to be more difficult of attainment at the religious level, when the religion concerned tends to impinge upon human autonomy at numerous points and so frequently as to create tremours of 'ontological dissonance'—hidden and unspoken tensions between the believer's inner depths and the directives of his infallible external Authority. However, in theory, as distinct from practice, the autonomous philosopher can not claim any superiority of status over the religious person who freely and authentically submits to an external Authority, provided their degree of authenticity be the same. This measurement is however almost impossible.

The outcome of the above analysis is that the method of epoche is pre-eminently desirable, both philosophically and religiously. Even if one loses one's traditional religious beliefs, this does not mean erosion of religion in the higher sense and of spirituality as such. It is all to the good if the individual becomes aware of his hidden assumptions and his heightened self knowledge or awareness of his existential depths which prompts him to choose one way or the other, thereby making him a fully integrated and mature human being out of a 'mass-man' or undifferentiated member of some human herd of class, no matter what it may be.

The Concept of an Interest-free Economy

An interest-free society is, in theory, as possible as a society free from crime, divorce, fear or hatred. Yet, interest has continued to flourish in the human family despite its being banned by several religions. Is this state of affairs merely or primarily just another instance of the tension or the distance between the ideal and the real, or is it an instance of a contradiction at some other level? In other words, is there some specific socio-economic need which is effectively served by interest in defiance of its official or formal prohibition ?[9] If so, how will that need be served if an Islamic

Suspension of belief for the duration of the enquiry does not logically imply the rejection of the antecedent belief which might, possibly, even get confirmed as a result of the enquiry. If so, no problem of the conflict between faith and reason would arise. If, however, the verdict of the post-epoche reflection conflicts with one's faith, the individual remains free to make a well considered choice. If the person chooses the verdict of faith after the epoche he would not be inclined to 'rationalize' (in the perjurative sense) his choice. He would tend to justify his choice on the ground that this choice gives him a 'total satisfaction' which he values more highly than mere 'rational satisfaction'. And this would be a very valid stand to take, provided, of course, his sense of 'total satisfaction' is not tainted with or a disguised form of fear of some power, wordly, spiritual or Divine. There is nothing intrinsically objectionable in opting for faith rather than reason after passing through the discipline of the epoche. Likewise, there is nothing wrong if the person chooses the verdict of his free enquiry after passing through a struggle between the pull of faith and the pull of a total conviction of which 'rational satisfaction' is one of the components. And there can be no objection to this position also, provided the final choice of the individual is the fruit of his freedom rather than of fear, greed, or some situational constraint that frustrates self-discovery.

The fear of loss of traditional faith should not stand in the way of the person's quest for authentic being—his inner journey to reach 'the truth of his being' rather than 'the truth of his milieu'. Even if the believer loses his traditional faith or rather its traditional interpretation, this is not necessarily to lose his valuational roots or his spiritual identity, unlesss, of course, his free enquiry bring about a total repudiation and rejection of his initial thought and value systems. Should such a total repudiation occur, a person who is really honest to himself would have passed through a profound inner struggle. And this experience would have forged all the more passionately the pure gold of human authenticity in the crucible of spiritual unrest and suffering.

In the final analysis, authenticity or authentic being, irrespective of its contents, is the highest possible mode of human existence, or

concept or practice including usury/interest. I submit even a committed Muslim economist *qua* social scientist, should do the same instead of assuming that interest is the root economic evil.

If I, as a Muslim, am inwardly convinced that interest must be evil, since the Quran prohibits it, and I do not suspend this belief while rationally examining the issue, as a student of ethics or economics my judgement would not be impartial but rather weighted' against interest. Even when I consciously aim to find out the truth rather than to defend any particular view, my perception of the function and utility of interest would be coloured by my antecedent beliefs. Likewise, if I have been conditioned by my milieu to hold all religion or pre-modern ideas as infantile myths and superstitions, I may miss out some crucially relevant consideration or aspect of the problems. Suspension of belief is indispensable for a detached and balanced approach. To the extent I fail I shall become selective—noting and emphasising some features and missing or ignoring others, thereby confirming my initial slant.[6] However, if I could empty or neutralize my ideological affiliations and predilections or 'ideological vested interests' as it were (as far as humanly possible), I would maximize the clarity of my vision for grasping the complex contours of the territory under investigation.

I am not claiming or suggesting that the social scientist ought to or possibly can do away with assumptions about human nature or with moral values. I am also not suggesting that the committed Muslim should lightly treat the Quranic prohibition against usury. The methodology, I am suggesting, is that while analysing and appraising economic concepts and practices, the social scientist must suspend or put in 'brackets' (in Husserl's sense of 'opoche') all one's preconceived notions and endeavour to discover and describe observable events with their correlations and also one's own authentic value judgments.[7] If he does not follow this approach, he most probably, would be advancing bad reasons for justifying what he takes to be the one and only one right interpretation of Scripture. When this happens, all theoretical argumentation with all the imposing methodological tools of social science—figures, charts, graphs, questionnaires etc.—would have gone waste. This danger is common to all utopian or ideological rationalizations.[8]

the Islamic state) was a medieval Iranian practice going back to the Jews in antiquity.

Sovereign Muslim rulers (Sultans) in Central Asia, India and elsewhere felt still more free to adjust and adapt the flexible economic and political culture of early and late early Islam to suit local and ever changing conditions. As and when the orthodox *ulema* tried to arrest this practice, tension and conflict developed between the king and the priest or the state and the church. With a few exceptions, the Indian Muslim kings (even much before the radical and liberal Akbar) asserted the supremacy of the state in wordly matters and consistently refused to treat the opinions and advice of the *ulema* in such matters as binding upon the state.

The so-called Islamic economic/agrarian system cannot, therefore, be given the same sanctity and binding power as the Islamic precept system relating to prayers, fasting etc. or laws relating to marriage, divorce and inheritance found in the Quran.

Economic systems are neither Islamic nor un-Islamic, so long as they do not violate any Quranic imperatives concerning *riba* and *zakat*. There can be, I submit, no Islamic truths of economics any more than there could be Islamic laws of Astronomy, Physics, Chemistry, Biology, or Medicine.[5] Economics must be treated as an empirical social science governed by the standard scientific method appropriate to its nature, scope and limits. As a science all theories, conceptual models, mathematical projections and predictions of mass behaviour, and socio-economic implications of fiscal policies will have to be empirically tested for their validity or truth. All pre-conceived notions, assumptions, untested hypotheses, will hamper the economist's task of analysing the motives, structure and implications of general economic behaviour.

The above task implies a neutral phenomenological analysis of economic concepts, practices and systems (just as a natural scientist analyses natural phenomena) rather than the justification of any pre-rational conviction concerning any particular economic

Sunnat alone without recourse to pure economic thinking and socio-ethical reflection. In the final analysis, therefore, the term 'Islamic Economics' tends to mislead us into seeking and projecting 'Islamic truths' of economics, or saying that Islam demands the true Muslim to accept this or that economic system as pre-condition of professing 'true' Islam. However, 'Islamic economics' in the purely descriptive sense (both historical and geographical) remains valid. Due to semantic confusions several Islamic social scientists, writers and statesmen now find themselves disputing not only with 'secular' economists but among themselves about the identity of the true Islamic system of economics.[4] Paradoxically, the Islamic system which was assumed to be Divinely imposed and an infallible standard for judging man-made system of thought, itself becomes a matter of unending debate. One, therefore, cannot help concluding that the directive thrust of the Quran lies in spiritual beliefs and moral exhortation rather than in the sphere of economic legislation. Anyone who claims that the Quran prescribes any particular economic philosophy or system is as off the mark as one who claims that the Quran supports or affirms any particular theory of Astronomy, Physics or Biology. No system could possibly claim a Quranic mandate such as possessed by the laws of inheritance, divorce, prohibited degrees of marriage etc. which are specifically contained in the Quran. No positive economic system of Islam could be anything more than a rough logical construction based upon two or three economic injunctions viewed as axioms by the believer. The Islamic system of piety and liturgy, falls in a unique category, since its contours and details were structured by the Prophet himself on the basis of abstract Quranic injunctions.

What is being called 'the Islamic economic/agrarian system' was a slow growth which took place in only a marginal sense in the lifetime of the Prophet, who acquired full and effective control of the peninsula only a year before his death. The real contours of the system took shape under Caliph Umar, and the evolution continued for centuries.

The nascent Islamic economic system freely borrowed (quite understandably) from the economic culture of pre-Islamic space-time. Thus, *jizya*, (the tax on protected non-Muslim citizens of

to the task of prescribing economic policy on the basis of conceptual analysis. According to this theoretical approach, the socio-economic environment or polity of a truly Muslim state m reflect and promote the basic Islamic conception of the good life in all its multifarious aspects. However, as soon as we try to spell out the concrete socio-economic features demanded by 'Islamic Economics', we find ourselves faced with conflicting possibilities of choice. And we are thrown back upon common sense, economic theory and actual experience in order to clinch various issues.

This difficulty arises because Islamic values—equality, fraternity, generosity, charity, sympathy, justice, compassion and so on—are all abstract concepts. The moment we try to realize them in the framework of laws and a concrete polity, a plurality of socio-economic blue-prints become candidates for the title 'Islamic' on the ground of best serving the values of Islam. The same difficulty (to a lesser degree) arises in connection with the two or three specific Quranic economic injunctions mentioned previously also in the case of the expression 'Islamic economic system'.

If we take the expression 'Islamic economic system' to mean a normative system which, as an essential part of the Islamic faith, is permanently binding upon all good Muslims, no such system is found in the Quran or the *Sunnat*. Nor can any such system possibly be deduced (logically) or inferred (analytically or analogically) from the Quran and the *Sunnat*. The actual claim by a person, that a particular system is the Islamic norm, is nothing more than the expression of his opinion—possibly very learned and worthy of consideration. To put it in other words, all such claims are essentially recommendations made by some person that his proposed system be accepted as the Islamic norm in the light of what he believes the ultimate Authority would have approved of at the present moment of time. It should be evident that different recommendations reflecting different preferences and views would be made.

Thus, we find that 'Islamic Economics' in the sense of prescriptive economic theory lands Muslims into controversies which, by their very nature, cannot be solved on the basis of the Quran or the

history. At the same time it has been disapproved of in Judaism and Christianty.[8] The explanation is two-fold. First, it meant unearned gains for the lender who did not sweat and toil, but just reaped the advantage of money power; second, (and this is crucially important) the excess demanded by the lender tended to be much too high for the borrower's capacity to pay without great hardship. The demand of compound interest made the situation infinitely worse. On the top of this, the contractual penalty for failure to return the sum due was bonded labour for the borrower for as long as three to seven years. The concept and practice of usury in the ancient and middle ages was, in other worlds, closely tied up with the institution of bonded labour—a form of temporary slavery entered into by mutual contract between the lender and the borrower. This aspect of usury was morally most repugnant in the case of distress loans.

The Jewish moral sensibility and group concern or solidarity led them strongly to disapprove of usury among themselves, though charging usury from non-Jews was permissible. The condemnation of usury in Judaism and its indirect approval by Aristotle (who held that since money did not breed, seeking its increment through interest was unnatural) shaped the ancient and medieval Christian approach, though the New Testament is silent on this issue. The Quran also strongly prohibits usury, and both Christainity and Islam make the prohibition applicable to all human beings. Assuming usury to be wrong, in principle, its universal prohibition by Christianity and Islam is desirable and an advance upon the Jewish ethos.

The Proper Approach to Economics

Does the expression 'Islamic Economics' have any significance apart from economic history or economic geography of the Muslim world, or the contribution of Muslim social scientists to Economics ? It might be thought that 'Islamic Economics' is also a theoretical social science whose subject matter is the best method of material wealth within the parameters. In this sense the scope of 'Islamic Economics' wouldgo beyond the mere description of what is the case

regard to 'interest', the exact meaning of the Arabic term *riba* used in the Quran should be determined, instead of mechanically or blindly equating it with the English word 'interest'. At times words of a living language retain their old spelling and grammar but their functional meaning and practical significance change radically due to various factors. Hence, there is all the more need for caution in this context. The advocates of literal obedience to the Quran also ignore (rather much too readily) the historical fact that the Prophet and the pious Caliphs always resorted to juristic reflection or interpretation of the Quranic text. This naturally led to the admission of qualifications, subtle distinctions in the understanding of the operative or directive meaning of the plain literal texts. For instance, the seemingly categorical Quranic injunction that the hands of the thief be cut off was never applied unconditionally on pain of disobeying the word of God.[3]

It follows that full investigation into the socio-economic conditions of the then Arab society and the present conditions, plus mature reflection on or interpretation of the Quranic text (rather than simplistic literal obedience to the Quran or the Prophet) is the correct approach, not only for secular social scientists but also for the committed Muslim drawing inspiration from the Quran and the example of the Prophet.

The Arabic word *riba*, literally means increase or growth of any thing or entity—physical, biological or spiritual. Thus the Quran refers to *riba* with respect to phenomena like spiritual merit *Sawab* or punishment. In the economic sphere *riba* means the excess expected and demanded by the lender from the borrower over and above the principal amount lent. Prima facie, the demand is similar, if not identical, with the demand for rent or lease, or consideration for some service rendered or temporary transfer of some right or enjoyment. The value of say, Rs. 10,000 as a lump sum at any one point of time, is arithmetically identical with the same amount spread over several years. Yet a consolidated sum has power to purchase an animal, land or tools which, in turn, augment the wealth of the user, while the same sum spread over a long period of time lacks this purchasing power. *Riba* or usury has thus, understandably, been a universal practice in recorded

regulations prescribed in the Quran are the verses dealing with *zakat* (tax on surplus wealth) and *riba* (usury/interest).

The verses are as follows :

"Establish worship, pay the poor-due, and bow your heads with those who bow (in worship)." 2 : 43.

"Those who swallow usury cannot rise up save as he ariseth whom the devil hath/prostrated by (his) touch. That is because they say : Trade is just like usury ; whereas Allah permitteth trading and forbiddeth usury. He unto whom an admonition from his Lord cometh and (he) refraineth (in obedience thereto), he shall keep (the profits of) that which is past and his affair (henceforth) is with Allah. As for him who returneth (to usury)—such are rightful owners of the Fire. They will abide therein". 2 : 275.

'O yo who believe ! Devour not usury, doubling and quadrupling the sum lent). Observe your duty to Allah, that ye may be successful." 3 : 130.

'And of their taking usury when they were forbidden it, and of heir devouring people's wealth by false pretences : We have prepared for those of them who disbelieve a painful doom." 4 : 161.

'That which ye give in usury in order that it may increase on other) people's property hath no increase with Allah ; but that which ye give in charity, seeking Allah's countenance, hath increase manifold." 30 : 39.

The above English translation of the Quranic verses is from Pickthall's famous, 'The Meaning of the Glorious Koran'.

The Quran nowhere gives any further details, as it does in the case of some other matters—inheritance, divorce, remarriage, evidence and even the proper procedure of oaths.

It may be thought that since the Quran prohibits usury/interest and implicit obedience to the Quran—the infallible word of God—is obligatory on the believer, there is no option for him except totally to abjure interest. This line of thinking ignores the methodological principle that prior to drawing any conclusion with

charging of interest on bank loans for industrial commercial purposes have been totally banned since early 1985, though the ban does not yet apply to foreign transactions A new scheme of Islamic profit/loss sharing by bank depositors has recently been started for promoting investment and economic growth without the lever of interest. It is expected that these innovations would not adversely affect the rate of growth or health of the economy. On the other hand, the abolition of interest is expected to promote social justice and general welfare and to remove several social or moral evils inseparable from various non-Islamic politics.

Whatever be the truth of the above claims, the fact is that no attempt has been made, to my knowledge, to present a historical and systematic theoretical analysis of interest or an integrated theory of general economics to show how a totally interest-free world economy would or could work in an admittedly imperfect and imperfectible world.

In what follows I shall first analyse the basic concept of an Islamic economic system, as an integral part of the Islamic faith. I shall then examine the basic thesis that the abolition of interest is the root remedy for man's socio-economic ills.

Quranic Texts Dealing with Economic Matters

Quranic verses dealing with fiscal or economic matters are, with literally two or three exceptions, in the nature of moral exhortations to do the right or the customary and not specific injunctions implying or even pointing to any 'economic system'. Thus, for instance, Quranic verses repeatedly enjoin believers to spend in the way of God, to help the needy, the traveller and the orphan, to avoid extravagance, pomp, avarice and the hoarding of wealth, to be just in weighing and measuring, to fulfil promises and contracts, to avoid bribery and cheating, to be lenient to the debtor, to give honest testimony even when it goes against one's kin, and so on.

It will be seen that all the above verses are ethical maxims rather than economic rules or regulations. The only economic

NTRODUCTION

'he Islamic Resurgence movement has led to a call for Islamizing ociety and polity in several Muslim states. The declared rationale or this call is the view set forth by several Islamic intellectuals, heologians and statesmen that Islam is not merely a system of ıdividual devotion and piety calculated to bring about spiritual alvation in life hereafter, but rather a complete way of life, a blue rint of the good life in its totality including politics and economics. 'he concrete contours and details of this map, so they say, ought to e adjusted with the concurrence of competent *ulema* in view of ıe ever changing human situation. Nevertheless the total map ıust be firmly based upon the Quran and the example of the 'rophet.

The advocates of Islamic Resurgence hold that the Muslim berals of the last and mid-twentieth centuries merely blindly nitated Christain liberalism which viewed religion merely as a ersonal relationship between man and God without regulating uman political and economic concerns The advocates of Islamization hold that Liberalism, Socialism and Communism have all iled to cure man's life in the modern age and that the only hope r mankind lies in a return to the Islamic or Quranic system of onomics and politics[1].

In the sphere of economics, the main thrust of the Islamic esurgence movement is the literal implementation of the Quranic 'ohibition of usury/interest which is seen to be the root evil. It is aimed that *zakat* (the Islamic wealth tax) and the Quranic law of heritance would suffice in an interest-free society to cure all onomic problems. *Zakat*, as a 2½% tax on net wealth at the end the financial year, was made a statutory tax about five years ago Pakistan and is being regularly collected by the state directly om banks in the case of all *Sunni* Muslims who are the dominant ajority in Pakistan. Payment of bank interest on deposits and

DR. JAMAL KHWAJA (b. 1926) : Took his education at Allahabad. Aligarh and Cambridge. In Cambridge his specialised field of study was contemporary western thought under the guidance of world-reputed philosophers namely Broad, Wisdom & Ramsey Appointed as lecturer of Philosophy in the Aligarh Muslim University in 1953, he was elected to the Lok Sabha in 1956 and actively participated in the Indian politics upto 1962. Presently he is a Professor of Pholosophy in Aligarh Muslim University, Aligarh.

His works include :

Five Approaches to Philosophy (1965), Quest for Islam (1977) and Authenticity and Islamic Liberalism (1987)

Khuda Bakhsh Extension Lectures, 1986

The Concept of
The Islamic Economic System

by

Prof. Jamal Khwaja

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press. New Delhi and Patna Litho Press, Patna.
Publisher : Mahboob Husain for Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 5010
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs100-00 (Inland), 20-00 Dollars (Asian countries
0 Dollars (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

46

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۶۳۳/۷۷ | قیمت فی شمارہ : پچیس رُپے
شمارہ : سینتالیسواں | سالانہ : ۱۰۰ رُپے (ہند)
قیمت : پچیس رپے | ۲۰ ڈالر (ایشیا)، ۳۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

۱۹۸۸ء

خدابخش لائبریری نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ-۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔

—— ایڈیٹر: عابد رضا بیدار

آثارِ آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے اوائل عمر کی خود نوشت تحریریں

مرتبہ

پروفیسر سیّد قدرت اللہ فاطمی

اسلام آباد (پاکستان)

پروفیسر سید قدرت اللہ فاطمی (پ ۱۹۱۲ء) خانوادہ صادق پور (عظیم آباد، پٹنہ) کے چشم و چراغ اور شمس العلماء خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کے نواسے۔ آپ کے والد مولوی سید محمد عبداللہ برطانوی حکومت کے تحت انڈین ممبر بورڈ آف اگزامنرز کے عہدے پر فائز تھے جن کی تصنیف "الخلافۃ فی خیر الامۃ رداعلی النبوۃ فی خیر الامۃ" علمی حلقوں میں کافی شہرت کی حامل ہے۔ فاطمی صاحب نے ابتدائی تعلیم پٹنہ میں حاصل کی۔ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب بھی ہوئے لیکن ملی مشکلات مانع آئیں چنانچہ انگلینڈ جا کر اس کے زبانی (Viva) امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اس طرح سرکاری افسری کے بجائے آپ کی زندگی علم و ادب کی خدمت کے لیے جو آپ کا خاندانی ورثہ تھی، وقف ہو گئی۔

تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں ایک مدت تک ترکی ایران پاکستان تنظیم، آر۔سی۔ڈی۔ (ریجنل کوآپریشن فار ڈولپمنٹ Regional co-opration for Deve-lopment) کے کلچرل سنٹر کی پاکستان شاخ کے ڈائریکٹر رہے۔ کئی سال ملیشیا میں پاکستانی اسٹیڈیز کے پروفیسر رہے۔ پاکستانی ٹی وی پر مستقلاً آپ کے علمی ادبی تندرات سننے والوں کے لیے دلآویزی پیدا کر رہے ہیں۔ پاکستان اور برصغیر کی تاریخ پر آپ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ ملازمت سے اب ریٹائر ہو کر اسلام آباد میں مقیم ہیں اور علمی و ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔

مقدمہ

میرے نانا شمس العلما خان بہادر مولانا محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی مرحوم و مغفور کے ذاتی کتب خانہ (واقع محلہ نمہیہ، گلزار باغ، پٹنہ) میں حضرت مولانا ابوالکلام آزادؔ کے اوائلِ عمر کی چند تحریریں محفوظ ہیں۔ آزادی کے بعد ان کے پوتے عزیزم محمد سبحان جعفری ایم بی اے (ابن مولوی محمد حسان جعفری مرحوم) نے نقلِ مکانی کرکے کراچی میں سکونت اختیار کی اور وہیں یہ نادر خزانہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اور از راہِ سعادتمندی یہ کہتے ہوئے انھوں نے اسے میرے حوالے کر دیا کہ "بھائی جان اس کے مستحق آپ ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے اپنے پاس محفوظ رکھیں یا مناسب سمجھیں تو اسے شائع کر دیجیے۔" مجھے اس سے قبل ان تحریروں کا علم نہ تھا۔ ان کے مطالعے سے پتہ چلا کہ ان میں سے اکثر نجی نوعیت کی ہیں۔ بنا بریں حضرت مولانا سے پوچھے بغیر ان کی اشاعت کو میں نے روا نہ رکھا۔ لیکن مولانا سے مشورہ لیا کیسے جائے؟ میں نے اپنے بچپن ہی سے انھیں "آزاد نانا" کی حیثیت سے جانا تھا۔ آزادی سے پہلے بالخصوص انتقالِ اقتدار کے سلسلے میں شملہ مذاکرات کے دوران میں ان سے طویل ملاقاتوں کی سعادت حاصل ہوئی تھی (اس زمانے میں ہم لوگ شملہ میں مقیم تھے) لیکن ۴۷ء کے بعد تو میرے اور مولانا کے درمیان آگ کا دریا حائل تھا! مجھے یقین تھا کہ یہ حالات بہت دیر تک قائم نہیں رہیں گے، دونوں نو آزاد ملکوں کے درمیان ہمسائیگی کے رشتے استوار ہوں گے۔ بالآخر حالات نسبتاً بہتر ہوئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ میں اس سے مستفید ہو کر آزاد نانا کی خدمت میں حاضر ہوتا، وہ وہاں چلے گئے جہاں ان سے رابطہ قائم کرنا ممکن نہ تھا۔ یوں یہ تحریریں میرے پاس امانت پڑی رہیں۔

۶۵-۱۹۶۴ء کی بات ہے کہ آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے مستعد معتمد جناب (اب ڈاکٹر جناب) ابوسلمان شاہ جہاں پوری مولانا غلام رسول مہرؔ کے تعارف کے ساتھ تشریف لائے اور انسٹی ٹیوٹ کی کارگزاریوں اور مستقبل کے منصوبوں کا انھوں نے ذکر کیا۔ میں نے ان کے اصرار پر حضرت مولانا کی تحریروں میں سے منظومات کا بیشتر حصہ

ان کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے کسی مستند مجلّے میں عکسی تصاویر کے ساتھ شائع کر دیں۔ میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنے وعدے کا بخوبی ایفا کیا۔ اور ان منظومات کو انجمن ترقی اردو پاکستان کے سہ ماہی مجلّہ "اردو" میں عکسی چربوں کے ساتھ چھپوایا اور ان پر مفید نوٹ کا اضافہ کیا۔[1]

حضرت مولانا کے انتقال کو تیس سال گزر چکے ہیں۔ ان کی وہ یادداشت جو انڈیا ونس فریڈم کے تیس غیر مطبوعہ صفحات پر مشتمل ہے عنقریب واگزار ہو جائے گی اور مولانا کی جامع سوانح عمری لکھنے کا وقت آئے گا۔ یقیناً اب مولانا کے اوائل عمر کی ان تحریروں کو بھی منظر عام پر آ جانا چاہیے، اس لیے کہ مولانا کے ذہنی ارتقا کے بنیادی مراحل کو سمجھنے کے لیے ان کے فکر کے تشکیلی دور کی ان تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ ضروری ہے۔ وہ تیس صفحات جن کا اتنا کچھ چرچا ہے، انکے ذہنی سفر کے خاتمۃ الکتاب کے اجزا ہیں تو یہ گمنام تحریریں اسی سفر کے فاتحۃ الکتاب کے اوراقِ پریشاں ہیں۔

○

ڈاکٹر عابد رضا بیدار لکھتے ہیں: "۱۴، ۱۵ سال کی عمر تھی کہ کپل وستو کے شہزادے گوتم کی طرح کلکتے کے اس مرشد زادے کو بھی حقیقت کی تلاش نے بے چین کر دیا، جس کے نتیجے میں عقیدے ایک ایک کر کے تار تار بکھر گئے۔"[2] عین اس زمانے میں جب کہ کلکتے کے اس مرشد زادے کے ذہن میں یہ انقلاب آ رہا تھا اس کے پڑوس میں صادق پور کا ایک خاندان آ بسا، جس کے سربراہ محمد یوسف جعفری تھے۔ ان کے والد (مولانا یحییٰ علیؒ شہید انڈمان) حقیقی چچا (مولانا احمد اللہ شہید انڈمان) اور سگے ماموں (مولانا عبدالرحیمؒ اسیر انڈمان) راہِ خدا میں اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ "وہابیت" جس سے اس مرشد زادے کے خاندان کو للّہی بغض تھا وہ اس نئے پڑوسی کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لیے کہ جہاد فی العمل اور اجتہاد فی النظر کی وہ دعوت جو اپنوں اور غیروں ——— بالخصوص غیروں ——— میں "وہابیت" کے نام سے جانی گئی، اس دعوت کے نقیب ہونے کے جرم کی سزا میں اس کے بزرگوں کو کالے پانی کی عمر قید سزا، مکانات کے انہدام اور خاندانی سرمایے کی ضبطی کی شکل میں بھگتنی پڑی تھی۔ وہ اب بھی اپنے اجداد کے دین پر سختی سے عامل تھا۔ وہ یقیناً چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرز کے عہدے پر متمکن تھا اور حکومت برطانیہ کا انتہائی دیانتدار ملازم تھا۔ اتنی بات تو سب جانتے تھے۔ لیکن بیوی بچوں اور مجاہدین کے امیر اور ایک آدھ معتمد بزرگوں کے سوا کسی کو کانوں کان اس کی بھنک نہیں پہنچی تھی کہ وہ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ ان مجاہدوں تک بالالتزام

---

[1] مجلّہ سہ ماہی اردو۔ انجمن ترقی اردو کراچی۔ اکتوبر ۱۹۶۶، ص ص ۱-۱۷ [2] عابد رضا بیدار: مولانا ابوالکلام آزاد ——— انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز رامپور، ۱۹۶۸، ص ۵۵۔

پہنچاتا تھا جو اب بھی شمالی مغربی سرحد پر واقع آزاد علاقے میں چوکیاں قائم کیے کسی مناسب وقت کے منتظر تھے۔ اپنے اجداد کے ساتھ اس کے ظاہر و باطن کی وفاداری اس قدر قابلِ اعتماد تھی کہ جب وہ رخصت لے کر اپنے آبائی وطن پٹنہ آتا تھا تو اس کے ماموں مولانا عبدالرحیمؒ مصنّف تذکرۂ صادقہ جو لارڈ رپن کی عام معافی کے اعلان کے بعد انڈمان سے دہلی اور دوسرے عوارض کی سوغات لے کر لوٹے تھے خاندانی جامع مسجد میں جمعے کے خطبے اور نماز کی امامت کے فرائض اُسی کو سونپتے تھے۔

مولوی محمد یوسف جعفری کی ہمہ جہت شخصیت کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا کہ وہ صرف صادقپوری وہابی نہ تھے بلکہ سیّدی علیگ بھی تھے۔ یعنی پیش نظر تحریروں کے مصنّف کے قول کے مطابق "علی گڑھ کالج کے اولڈ اسٹوڈنٹس میں ایک ممتاز شخص" ص ۲۲ مولوی محمد یوسف جعفری کی شخصیت کا یہ قِرانِ السعدین تاریخ کے جدلیاتی عمل کا عین تقاضا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے بانی نے اپنی سب سے عظیم تصنیف آثارالصنادید میں "جناب ہدایت انتساب 'زبدۂ واصلان' درگاہ حضرت سید احمد صاحب 'طاب ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ' اور محی السنۃ۔ قامع البدعۃ مولانا مولوی محمد اسمٰعیل" کا ذکر اس والہانہ انداز میں کیا ہے جس کی نظیر جماعت مجاہدین کی تصانیف میں بھی نہیں ملتی[1]۔ ان کی تصنیف "راہ سنّت در ردِّ بدعت" تو الطاف حسین حالی کے قول کے مطابق "وہابیت کے جوش کے زمانے" میں لکھی گئی تھی[2]۔ لیکن جب ۱۸۷۱ء میں سر ولیم ہنٹر نے وہابیوں کے خلاف سازش کے مقدموں اور ان کے ظالمانہ فیصلوں کی تائید و استحکام کے لیے OUR INDIAN MUSLIM نامی کتاب لکھی تو انھیں نے اس کا سخت درشت اور مدلل جواب انگریزی اخبار پائینیر میں دیا جس کا اردو ترجمہ "ہنٹر پر ہنٹر" کے برمحل عنوان سے شائع ہوا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس "نیچری" کی وہابیت کا جوش ۱۸۷۱ کے انتہائی پرآشوب دور میں اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ وہابیوں کی کوئی بے ضرر سی تحریر کسی کے گھر سے نکل آتی تھی تو اس کو انتہائی سخت سزائیں بھگتنی پڑتی تھیں۔

۱۔ سید احمد خاں، آثارالصنادید، مطبع سید الاخبار، دہلی، ۱۸۴۷ء ص ۴۴ - ۴۷ و ص ۹۷ - ۱۰۳ ۔ گارساں دتاسی نے اس کتاب کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا۔ سیشن جج ایڈورڈ ٹامس اور کلکٹر آربٹس نے انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا لیکن اس کی ادق فارسی آمیز طرز عبارت کو آسان کرنے کی فرمائش کی۔ ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ کتاب آثار قدیمہ پر ہے، اس میں چوتھا طویل باب بعنوان "شاہجہاں آباد کے لوگوں کا بیان" معاصرین کے بارے میں ہے، یہ انمل بے جوڑ سی بات ہے۔ سید احمد خاں نے دونوں معقول مشورے قبول کر کے آشوب ۵۷ء سے تین سال پہلے کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ (حیاتِ جاوید ص ۶۹) یہ خیال کہ بدلے ہوئے سیاسی حالات کے تحت سرسید نے آثارالصنادید میں ترمیم کی تھی، لاعلمی پر مبنی ہے۔ ۲ الطاف حسین حالی: حیاتِ جاوید، ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء ص ۱۴۵

عین اس زمانے میں برملا اپنی وہابیت کا اعلان کر کے علی گڑھ کے "نیچری" نے جس استقامت کا ثبوت دیا تھا، اس سے اسی کی توقع کی جا سکتی تھی کیوں کہ ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد اسی نے "رسالہ اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اعلانِ حق کیا اور جہاد بالقلم کا حق ادا کیا تھا۔ تلاش حق کے سفر کے راہی کو جواب غلام محی الدین سے محی الدین احمد ہو چکا تھا کیونکہ باپ کے دیے ہوئے نام میں اسے "شرک کی بُو" محسوس ہوتی تھی[1]، محمد یوسف جعفری کی شکل میں ایک شجرِ سایہ دار ملا۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد اور بڑے بھائی (مولانا ابو النصر غلام یٰسین آہ) اور ماموں "عرب صاحب" سے شدید اختلافات پیدا ہو چکے تھے جس کی جھلکیاں آپ کو آئندہ صفحات (ص ۱۸-۲۲) پر نظر آئیں گی۔ محمد یوسف جعفری نے باپ اور بڑے بھائی کا خلا پر کیا۔ ملیح آبادی کی روایت کے مطابق مولانا آزاد فرماتے ہیں: "اس زمانے میں مولوی محمد یوسف جعفری سے جواب شمس العلماء خاں بہادر ہو کر ریٹائر ہوئے ہیں، ملاقات بہت بڑھ گئی تھی اور روزانہ دار الاخبار میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ ابتدا سے وہ احسن الاخبار، انجمن اور دار الاخبار کی تجویز اور انتظام کے ایک شریک اور معاون رہے تھے۔"[2] روزانہ کی ان ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ نصف ملاقات کا سلسلہ بھی جاری تھا جس کے شاہد آئندہ صفحات ہیں۔ محمد یوسف جعفری رنجور اور محی الدین احمد آزاد کی عمروں میں جتنا زیادہ تفاوت تھا، ان کے ذہنوں میں اتنا ہی تطابق تھا۔ اس لیے آزاد اس تعلق کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہ کر پائے۔ چھوٹائی بڑائی اور برابری کے نشیب و فراز سے ان خطوط کے قاری کو قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ بمبئی سے جو خط لکھے گئے ہیں ان میں تو آزاد برابری کی سرحدوں کو بھی پار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اب مولوی محمد یوسف جعفری کے خورد نہیں بلکہ بزرگ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ "بڑا پن" آزاد کے سوانح نگاروں اور ناقدوں کے لیے ان کی نفسیات کا ایک معمہ بن کر رہ گیا ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے کہ کچھ لوگ پیدائشی بڑے ہوتے ہیں، کچھ خود اپنی کوشش سے بڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ پر بڑائی تھوپ جاتی ہے۔ مولانا عظمت کی ایک چوتھی صنف کے مالک تھے۔ وہ پیدائشی بڑے تھے اور بہت بڑے۔ والد مولانا خیر الدین، پردادا مولانا منور الدین ایک عظیم گھرانے کے عظیم ترین سپوت تھے۔ مولانا نے یہ عظمتیں ورثے میں پائی تھیں۔ انتہائی ذہانت اور غیر معمولی علم و فضیلت کے جوہر بچپن ہی میں آشکار ہو گئے تھے۔ وہ بچپن ہی میں پُجنے لگے تھے۔ لیکن اس موروثی عظمت کو ٹھکرا کر انھوں نے اپنے لیے اکتسابی عظمت کی نئی منزل ڈھونڈی اور ساری عمر اس کی تلاش میں

۱۔ ماموں کی یہ اصلاح وہابی تحریک کے ردِ شرک کا ایک حصہ تھی۔ اس اصلاح کی سب سے نمایاں مثال مولانا احمد اللہ شہید الظمان کا نام نامی ہے جو اصلاً احمد بخش تھا۔ ۲۔ عبد الرزاق ملیح آبادی: آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی بہ روایت ملیح آبادی مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی، ۱۹۶۵ء ص ۲۸۰۔

سفر جاری رکھا۔ اس سفر کا نقش اور نشان بنانے کے لیے ان کے پاس صرف ایک نسخہ تھا: نمی روم ز راہے کہ کارواں رفت است۔ تنہائی ایسے مسافر کا مقدر ہوتی ہے۔ وہ برابر تنہا رہے۔ باپ نے لڑکپن میں ان کی شادی کر دی تھی۔ لیکن ایسی خاتون نہیں بلکہ بچی کے ساتھ جن سے ذہنی رفاقت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ ان سے صرف ایک بیٹا ہوا جو بچپن ہی میں فوت ہو گیا۔ مولوی محمد یوسف جعفری نے تقریباً چار سال حق رفاقت ادا کیا۔ لیکن ان کی اپنی بھرپور عائلی زندگی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں پر جان چھڑکتے تھے۔ اپنے جوان بیٹے بنیامین کے مرنے پر انھوں نے رو رو کر اپنی آنکھیں گنوا دی تھیں اور ان کے ساتھ وہی کچھ ہوا تھا جو ان کے ہمنام کی جدائی میں حضرت یعقوبؑ کو پیش آیا تھا۔ یعنی وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ[1] ظاہر ہے یہ رفاقت دیرپا نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے ختم ہونے سے پہلے ہی مولانا شبلی نے خلا کو پُر کر دیا تھا۔ لیکن راہیِ سفر عظمت و عزیمت کا ساتھ مولانا شبلی بھی زیادہ دیر نہ دے سکے۔

تاہم تھوڑے دنوں کی اس رفاقت نے ندوہ والوں کے ساتھ منافست کا در نہیں تو دریچہ ضرور کھول دیا، جس نے شاید آگے کی رفاقتوں کی راہ بند کر دی۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی یا پروفیسر اجمل خاں کی رفاقت کسی بزرگ یا برابری کے درجے کے آدمی کی رفاقت نہ تھی۔ مولانا اس وقت تک اتنے آگے نکل چکے تھے کہ کوئی انکا رفیق نہیں ہو سکتا تھا۔

○

اس پس منظر میں مولانا کے سوانح نگار قاضی عبدالغفار[2] اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار[3] مولانا کی "انانیت" کو ان

۱۔ ترجمہ: "شدت غم سے (روتے روتے) اس کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور اس کا سینہ غم سے لبریز تھا" سورہ یوسف (۸۴:۱۲)۔ ۲۔ قاضی محمد عبدالغفار: آثار ابوالکلام آزاد: ایک نفسیاتی مطالعہ، نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز، بمبئی، ۱۹۴۹ء، ص ۸۳-۸۴۔ ۳۔ بیدار، حوالہ ما قبل ص ۲۲۔ شاید ۳۶، ۱۹۳۷ء کی بات ہے، مولانا کی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم کے بیان ذوالقرنین اور بعض دوسرے مقامات پر اعتراضات نے ہندوستان بالخصوص کلکتے میں شورش کی سی کیفیت اختیار کر لی تھی۔ بعض اصحاب اسے ہوا دے رہے تھے تاکہ کلکتہ میدان میں مولانا عیدین کی نمازوں کی امامت اور خطبہ کے فرائض سرانجام دیتے آئے تھے اس پر خود قابض ہو جائیں۔ مولانا ملیح آبادی کا ہفتہ وار "ہند" کلکتہ مولانا کی مدافعت کر رہا تھا۔ ایک موقع پر مولانا ملیح آبادی نے مولانا کے اپنے وضاحتی بیان کی ضرورت شدت سے محسوس کی اور مولانا سے اس کے خواستگار ہوئے۔ مفسر قرآن نے وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ اور وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا کی ہدایات قرآنی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اس سے انکار کیا۔ ان کے اصرار پر ملیح آبادی راوی ہیں کہ مولانا نے کہا: "مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی میں کیا پرواہ کرتا ہوں"۔ ملیح آباد کے پٹھان کو غصہ آگیا اور ایک تند و تیز اداریہ لکھ ڈالا جس میں مولانا کے "تکبر" پر سخت تنقید تھی۔ حال ہی میں مرحوم I am Henderson Douglas کا تحقیقی مقالہ Abul kalam Azad An Intellectual and Religious Biography ان کے دو فاضل ساتھیوں Gail Minault اور Christian W Troll کی ترتیب، تصحیح اور اضافوں کے ساتھ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان مغربی محققوں کو بھی آزاد کی "انانیت" (egotism) بہت کھٹکتی ہے۔ اس کا انھوں نے تجزیہ کیا ہے۔

کی نفسیات کا محوری نکتہ سمجھتے ہیں۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تحریروں میں بھی اس کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔
میں نے انتقالِ اقتدار کے زمانے کی طویل صحبتوں میں مولانا کی "انانیت" کا ایک اور رُخ دیکھا ہے۔ انتہائی عجز و انکسار کا رخ۔ مولانا نے اپنے ذاتی ملازم عبداللہ کو ہدایت کر رکھی تھی کہ میں جس وقت بھی آؤں وہ مجھے ان کے کمرے میں پہنچا دیں۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے چائے کی پیالی سے تواضع کرتے رہیں۔ (میں نے مولانا کے ہاں گوری چنبیلی" والی چینی چائے کبھی نہیں دیکھی۔ نہ کبھی خود اُن سے اس کی فرمائش کی۔ میں جانتا تھا کہ یہ مشروب مخصوص "ہم مشربوں" تک محدود شئے ہے۔ مولانا زندگی بھر بدل ڈھونڈتے رہے۔ یہ بھی اس کا ایک کرشمہ تھا۔) مجھے ہدایت تھی کہ میں اپنے دفتر کے اوقاتِ کار کے بعد روزانہ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہر دوسرے تیسرے دن حاضری دوں۔ مولانا کے ہاں وفود کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مجھے یہ حکم تھا کہ کسی اور ملاقاتی یا وفد کے آنے پر ایک طرف ہٹ کے بیٹھا رہوں تاکہ انکے چلے جانے کے بعد سلسلۂ کلام جاری رہے۔ انتقالِ اقتدار کی پیچیدگیوں کی بنا پر مہماتِ امور پر مولانا کی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ میں ملاقاتیوں کے رخصت ہونے کے بعد یا دوسرے اہم تر مقامات سے مولانا کی واپسی کے بعد دخل درمعقولات سے نہیں چوکتا تھا۔ ایک تو برخود غلط تھا، دوسرے نوجوانی کا جوش تھا، اور ان پر مستزاد یہ کہ نانا حوصلہ بڑھاتے تھے۔ میں اکثر مولانا کے اپنے خیالات اور اہم سیاسی فیصلوں پر تنقید کر ڈالتا تھا۔ کبھی کبھی یہ تنقید تلخ بھی ہو جاتی تھی۔ لیکن "انانیت" کے اس دلآویز پُتلے کی روشن جبیں پر کبھی شکن نہیں پڑی بلکہ بسا اوقات تنقید جتنی تیز ہوتی اسی قدر ان کی بشاشت میں اضافہ ہوتا تھا۔

پہلے تو میرا خیال یہ تھا کہ ان کی خُلقی فروتنی میری اپنی خلقی فروتنی کا نتیجہ ہے۔ مولانا اتنے زیادہ قد آور ہیں، اور میں ان کے مقابلے میں اتنا بونا ہوں، کہ ازراہِ شفقت مجھ سے ملنے کے لیے انھیں جھکنا پڑتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے اپنی اس توجیہ میں کسی قدر ترمیم کرنے پر مجبور کیا۔ ہوا یوں کہ کانگریسی خیال کے ایک مسلمان ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تحریکِ پاکستان کا زور تھا۔ کانگریسی ہونے کے سبب وہ مسلمانوں میں معتوب و مغضوب ہو چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس جرم کی پاداش میں ان کی دو جوان بیٹیوں کی نسبت توڑ دی گئی تھی۔ کسی باپ کو اس سے بڑی سزا نہیں مل سکتی ہے۔ وہ بچارہ بہت دلگیر تھا۔ مولانا نے اسے تسلی دلاسا دیا۔ جس سے حوصلہ پا کر اس نے مسلم لیگ کے لیڈروں بالخصوص قائدِ اعظمؒ کی شان میں نازیبا کلمات کہنے شروع کیے۔ مولانا کروٹیں بدلنے لگے۔ چہرے پر انتہائی برافروختگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ لیکن وہ اپنی سی کہے گیا۔ آخر مولانا پھٹ پڑے۔ چیخ کر اس سے کہا کہ "اس سارے واقعے کا جناح صاحب سے کیا تعلق ہے؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان کی شان میں گستاخی کر کے میری خوشنودی حاصل کر لو گے؟ مجھے

تمہاری ان کی شان میں بدکلامی سے سخت تکلیف پہنچی ہے۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے جاؤ، دفع ہو جاؤ" وہ روتا دھوتا چلا گیا۔ نانا پر دیر تک انقباضی کیفیت طاری رہی۔ مولانا کے قائدِ اعظمؒ سے سیاسی اختلافات تو تھے ہی، وہ نہ صرف سیاست بلکہ طرزِ معاشرت اور اندازِ فکر میں ایک دوسرے کی ضد تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے اپنے ایک اخباری بیان میں مولانا کو "کانگریس کا شو بوائے" کہکر بظاہر ان کی انا کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔ اس صورت میں "انانیت پسند" ابوالکلام کا یہ ردِ عمل میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔

اس واقعے کا تو میں عینی شاہد تھا۔ ایک دوسرا واقعہ میں نے اپنے استادِ محترم پروفیسر اشتیاق حسین قریشی مرحوم سے سنا تھا۔ وہ اس وقت پاکستانی کابینہ کے رکن تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ مولانا مڈل ایسٹ کے غیر سگالی کے دورے پر روانہ ہونے والے تھے۔ اس زمانے میں اتنے لمبے سفر کے لیے نئی دہلی کے ہوائی جہازوں کو کراچی کے ہوائی اڈے پر پٹرول لینے کے لیے اترنا پڑتا تھا۔ مولانا وزیرِ تعلیم تھے۔ ہندوستانی کابینہ کے سینیئر رکن۔ پاکستانی حکومت کو پیشگی اطلاع بھیجی گئی۔ قائدِ اعظمؒ کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ان کے مزار کے گرد مہاجروں کی جھگیاں تھیں۔ بیرونی ملکوں کے عمائد کے لیے مزار پر حاضری دینا سفارتی آداب (پروٹوکول) میں داخل ہو گیا تھا۔ عمائد کی آمد کے موقع پر جھگیوں کو قناتوں سے چھپا دیا جاتا تھا۔ اور معزز مہمان کے لیے سرخ بانات اور قالین بچھا دیے جاتے تھے۔ سرکاری حلقوں میں عام تاثر یہ تھا کہ قائدِ اعظم سے مولانا کے سیاسی اختلافات سے قطعِ نظر کر لیا جائے تب بھی مولانا وہابی ہیں، مزار پر حاضری ان کے مزعومہ دینی عقیدے کے خلاف ہوگی۔ اس لیے ان کی کراچی تشریف آوری بالکل غیر سرکاری قرار پائی، محض پٹرول بھروانے کے لیے۔ اپنے وقت پر جہاز آیا، ہوائی اڈے پر ہندوستانی ہائی کمشنر (اس وقت دونوں ملک دولتِ مشترکہ کے رکن تھے) موجود تھے۔ مولانا ہوائی جہاز سے اترتے ہی ان کی کار میں سوار ہو کر مزارِ قائد پر حاضر ہوئے۔ فاتحہ پڑھی۔ دعائے مغفرت مانگی اور کچھ دیر مراقبے کی سی کیفیت میں رہے۔ آمد اور واپسی کے موقع پر جھگی نشین مہاجروں سے سلام اور مصافحے سے جلدی ہی میں فارغ ہوئے۔ پھر سیدھے ہوائی جہاز میں سوار ہو کر اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ انانیت پسند ابوالکلام کے اس رویے نے دونوں ملکوں کے عمالِ حکومت کے لیے تھوڑی سی الجھن پیدا کر دی تھی۔

بات چلی تھی مولانا کے بڑے ہونے اور بڑے بننے سے اور درمیان میں ان کے اکیلے ہونے ــــ گھور اکیلا پن ــــ سے ہوتی ہوئی ان کی انانیت اور انکسار کے گرد گھومتی رہی۔ یہ باتیں ان کے کردار کے اہم ترین پہلوؤں کی نشاندہی کرتی

۔ مثلاً محققوں کی محولہ بالا تصنیف میں (رہائیں ص ص ۱۶۴ ـ ۱۶۵) اس موقع کی تصویر موجود ہے (گیارہویں تصویر)۔

ہیں۔اس لیے میں نے کسی قدر درازنفسی سے کام لیا۔

○

اب آیئے اس مجموعۂ آثار پر پہلی نظر ڈالیں۔اس مجموعے میں سب سے پرانی تحریر غالباً ۱۹ اکتوبر ۱۹۰۱ء کے ایک مشاعرے کی باسٹھ اشعار پر مشتمل غزل ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اتنے زیادہ اشعار موزوں کر لینے پر بھی جناب آزاد دہلوی کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔آخری شعر کے بعد ان کے یہاں "وغیرہ وغیرہ" کی تکرار ہے۔نثر کی سب سے پہلی تحریر اس مجموعے میں شاید ۲۸ مئی ۱۹۰۲ء کا مختصر سا رقعہ (ص ۴۷) ہے جس میں وقت موعودہ پر اپنے گھر پر موجود نہ ہونے کی پیشگی اطلاع دی ہے۔مولانا کی بہت سی تحریروں پر تاریخ درج نہیں۔لیکن قیاس یہ کہتا ہے کہ مندرجہ بالا تحریریں ہی اس مجموعے کی قدیم ترین تحریریں ہیں۔اور ندوۃ العلما لکھنؤ سے لکھا ہوا ۴ مئی ۱۹۰۶ء کا خط اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔(ص ۱۰)

نانا ابا مرحوم و مغفور دو سال قبل یعنی ۱۹۰۴ء میں گلوکوما کے مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔آنکھوں کی بصارت زائل ہونے لگی تھی۔بالآخر ۱۹۰۹ء میں وہ حادثہ پیش آیا جس کا ذکر میں اوپر کر آیا ہوں یعنی ہونہار جوان بیٹے کی موت، جس نے بصارت سے یکسر محروم کر دیا۔اغلب یہ ہے کہ یہ المیہ سلسلۂ مراسلت کے منقطع ہونے کا آخری سبب بنا۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ۱۹۰۶ء تک پہنچتے ہوئے آزاد اور رنجور کی فکر کی راہیں جدا ہو چلی تھیں۔

حضرت رنجور عظیم آبادی آخر عمر تک عروسِ سخن کی مشاطگی میں مصروف رہے۔انتہائے غم میں شعر و سخن کی محفلیں ان کے لیے دلچسپی کا سامان فراہم کرتی رہیں۔اس کے برخلاف حضرت آزاد دہلوی غالباً ۱۹۰۴ء کے اوائل میں شعر گوئی ترک کر چکے تھے۔ایک دلچسپ قطعہ اس مجموعۂ آثار میں شامل ہے، جس کے آخر میں وہ لکھتے ہیں کہ "خاک بر سرم باد کہ امروز باز فکرِ شعر کردم، استغفر اللہ استغفر اللہ" (ص ۱۶۰) یوں تو آخرِ عمر میں نانا ابا بھی اپنی شعر گوئی پر نادم ہو گئے تھے اور اپنا کلام نذرِ آتش کروا دیا تھا۔لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔مرحوم کے ضخیم مجموعۂ کلام میں سے صرف چند بیاضیں بچی ہیں۔ایک بیاض جس میں ایک سو انہتر رباعیاں ہیں اور ایک سو انچاس قطعاتِ تاریخ ہیں، یہ چھوٹے ماموں مولوی محمد حسان جعفری کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔اس میں بعض اضافے خالاؤں کے ہاتھ کے ہیں۔یہ نانا مرحوم کی اجازت سے بچا لی گئی تھی۔ماموں مرحوم کے بسلسلۂ ملازمت پٹنے سے باہر رہنے کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مدد لینے کے لیے مختلف لوگوں کو نانا ابا مرحوم نے گھر پر رکھ لیا تھا۔چند بیاضیں ان اصحاب کی کوشش سے محفوظ رہ گئیں۔ ان میں سے اول الذکر بیاض میں بعض قطعات تاریخ مولانا آزاد کے سوانح نگار کے مفیدِ مطلب ہیں۔تین ان کے بڑے بھائی مولانا ابوالنصر آہ کی تاریخ وفات پر ہیں۔ایک سے مولانا آزاد کی ادارت میں اخبار "دارالسلطنت" کے اجرائے ثانی

۱-ملیح آبادی: آزاد کی کہانی- ص ص ۲۹۶-۲۹۷-

کی تاریخ ملتی ہے۔ ایک اور سے ان کے رسالہ "لسان الصدق" کی اشاعت کی تاریخ نکلتی ہے۔[۲] "احسن الاخبار" کا مولانا کی صحافتی اور فکری زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ اس کے دفتر کا نام مولانا نے دارالاخبار تجویز رکھا تھا۔ اس کا ذکر مولانا کے خطوں اور رقعوں میں بار بار آیا ہے۔ اس اخبار کے مالک و مدیر[۲] کے انتقال کی تاریخ پر دو قطعات ہیں۔ آخرالذکر بیاضوں میں سے ایک میں مولانا آزاد کی ایک بیر حاصل غزل پر مولانا رنجور کی تضمین ہے۔

○

مولانا آزاد ۱۹۰۵ء میں مولانا شبلی کی رفاقت اور اس کے بعد اخبار "وکیل" امرتسر کی ادارت کے راستے سیاست سے وابستہ ہو چکے تھے اور اب "برکاتِ حکومتِ انگلیسیہ" بیان کرنے کے لیے "میراتمن کے طرز میں" کتاب لکھنے ص ۵۶ کے برخلاف زمرۂ احرار میں شامل ہو چکے تھے۔ اُدھر حضرت رنجور سرکاری فرائضِ منصبی کو سرانجام دینے میں ابشرطِ استواری منہمک تھے۔ آزاد و رنجور کی راہوں کے جدا ہونے کا یقیناً یہ سب سے اہم سبب تھا۔

○

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا یحییٰ علی رح شہید انڈمان کے فرزند کی رفاقت میں مولانا آزاد صادق پور کے بزرگوں کی تحریکِ جہاد سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ ان کے تعارف کے ذریعہ وہ حضرت مولانا عبدالرحیمؒ سے بھی مل چکے تھے۔ "تذکرۂ صادقہ" پر ان کی تقریظ کو حضرت مولانا نے اپنی کتاب میں شامل کر کے اس تعلق پر مہرِ تصدیق و تحسین ثبت کر دیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد رسالہ "لسان الصدق" میں جناب آزاد نے اس پر ریویو بھی لکھا۔[۳] انگریز حکمرانوں نے صادق پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس کے سرکردہ بزرگوں کو کالے پانی بھیج دیا تھا۔ جو بچ گئے تھے اور جو اس وقت بچے تھے اور اب جوان ہو گئے تھے ان سب کو تالیفِ قلوب کے لیے شمس العلماء کے خطاب سے نوازا۔ لیکن مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُم مَّن قَضَىٰ نَحْبَهُ وَمِنْهُم مَّن يَنتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا۔[۴] کے مصداق صادق پور کے خاندان کی ایک شاخ یعنی مولانا ولایت علیؒ اور مولانا عنایت علیؒ کے چھوٹے بھائی مولانا

۱۔ ایضاً۔ ص ص ۷۷-۲۷۹، ۲۔ ایضاً ص ص ۲۲۵، ۲۵۲، ۲۵۴، ۲۷۶۔ ۳۔ قاضی عبدالودود، "تذکرۂ صادقہ اور لسان صدق" رسالہ آجکل، منسٹری آف انفارمیشن، نئی دہلی جلد ۱۷، ۱۱ر جون ۱۹۵۹ء ص ۳-۵۔ ۴۔ ترجمہ: اہلِ ایمان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور کچھ ان میں کے راستہ دیکھ رہے ہیں اور انھوں نے ذرا فرق نہیں آنے دیا۔" سورۃ الاحزاب (۳۳) ۲۳

عبداللہؒ کی اولاد مِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ (انتظار کرنے والوں میں سے تھی۔ شمال مغربی سرحد کے علاقۂ آزاد میں اسمست اور چمرکنڈ کے مقامات پر ان منتظرین نے مجاہدین کی چوکیاں قائم کر رکھی تھیں جنھیں پٹنہ سے مالی امداد اور ضروری ہدایات ملتی رہتی تھیں۔ "تذکرۂ صادقہ" کے مصنف بدستور رہنمائی کر رہے تھے۔ انڈمان کی اسیری اس میں تبدیلی لا سکی تھی نہ لارڈ رپن کی از راہِ مرحمتِ خسروانہ معافی کی بخشش اور رہائی۔ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب محلہ صادق پور" ڈاکخانہ گلزار باغ" کی جگہ محلہ نصیبیہ' ڈاکخانہ گلزار باغ "مرکز تھا۔ حالات نے بے سروسامانی اور مادی سے کہیں زیادہ روحانی توشے کی کمیابی کو انتہائی حدود تک پہنچا یا تھا۔ لیکن صَدَقُوْا مَا عَاہَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ اپنے پروردگار سے جو معاہدہ انھوں نے کیا تھا اس پر صادق ہونا ہی صادق پور کے بزرگوں کا شیوہ تھا۔ اور مولانا عبدالرحیمؒ ان ہی بزرگوں میں سے تھے۔ مولانا آزاد جیسے ذہین اور غیر معمولی حافظے کے مالک شخص پر مولانا عبدالرحیمؒ سے ملاقات کے نقوش کا مرتسم ہو جانا یقینی تھا۔

یہ نقوش ۱۹۲۱ء میں ابھرے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے ہَاجَرُوْا ثُمَّ جَاہَدُوْا (پہلے ہجرت کرو پھر جہاد) کی سنّتِ نبوی پر عمل کرتے ہوئے برِ عظیم کا طویل سفر ("لانگ مارچ") کر کے سرحدِ آزاد پر اپنے جہاد کے مرکز قائم کیے تھے۔ یہ طویل اور انتہائی پرخطر سفر مجاہدین کی تربیت کے لیے بہت ہی قیمتی ثابت ہوا اور اپنے مرکز کے لیے محلِ وقوع کے انتخاب میں سید شہیدؒ نے جس مجاہدانہ بالغ نظری کا ثبوت دیا تھا اس پر تاریخ شاہدِ عادل ہے۔ مولانا آزاد نے اس سے سبق سیکھا۔ ۱۹۲۰ء میں تحریکِ خلافت و ترکِ موالات میں انھوں نے بحیثیت امام الہند ہجرت کا فتویٰ جاری کر دیا۔[۱] ہندستان بالخصوص پنجاب اور سندھ سے مہاجروں کے قافلے در قافلے سرحدِ آزاد پر پہنچنے لگے۔ مجاہدوں کے مرکزوں نے ان ناخواندہ مہمانوں کا استقبال کیا اور آگے کے سفر کے لیے ان کی راہ ہموار کی۔ لیکن یہ مدد اور رہنمائی انھیں انتہائی مہنگی پڑی۔ ان کی تحریک سراسر انقلابی تھی۔ جب کہ مولانا آزاد کی تحریکِ ہجرت اور اس کی معاون تحریکیں سراسر احتجاجی تھیں۔ مجاہدین کی دعوت کی اوّلین شرط کتمانِ سر (رازداری) تھی اور اس تحریکِ ہجرت کا بنیادی طریقِ کار عوامی تھا اور اعلانی (میرے دادا ابا علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق "اشتہاری") یہ دونوں تحریکیں اپنے مقصد میں متحد لیکن طریقِ کار میں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ مہاجروں کے قافلوں کے ساتھ حکومت کے مخبروں کی فوجِ ظفر موج نے دھاوا بول دیا۔ اس سے مجاہدوں

۱۔ مزید محققوں کی محولہ بالا تصنیف (ص ۱۴۲ تا ص ۱۴۳) سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خود مولانا کے اپنے ذہن میں ہجرت کی یہ تحریک جہاد کے انقلابی اقدام کا پیش خیمہ تھی۔ لیکن ان ہی دنوں خلافت اور اس کے فوراً بعد ترکِ موالات کی احتجاجی تحریکوں نے زور پکڑ لیا۔ یوں مولانا کا اپنا انقلابی لائحہ عمل خوابِ پریشاں ہو کر رہ گیا۔ ہجرت کے فتوے کے بارے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ ہفتہ وار "اہل حدیث" امرتسر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے مدیر مولانا ثناء اللہ امرتسری کے صادق پور کے بزرگوں کے ساتھ روابط کی نوعیت پر الخلافۃ فی خیر الامۃ کے بعض اشاروں سے روشنی پڑتی ہے۔

کے کیمپ کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں۔ مولانا عبدالرحیمؒ اس وقت تک بقیدِ حیات تھے۔ وہ جلالی مزاج کے انسان تھے۔ انھوں نے اپنے بھانجے پر جس شدت سے اپنی خفگی کا اظہار کیا' اس کے قصے میں نے والد مرحوم اور بڑی خالہ مرحومہ کی زبانی سنے ہیں۔ مولانا آزاد کی اپنی زبانی اس خوفناک غلطی پر ندامت کا اظہار میں نے خود سنا ہے۔

○

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ انڈمان سے جو سوغاتیں لائے تھے' ان میں رعشہ بھی تھا۔ اس لیے لکھنے کا کام بیشتر میرے والد مرحوم رضان صاحب مولوی سید عبداللہ افضلی[1]) سرانجام دیتے تھے۔ لکھواتے وقت اکثر حضرت مولانا اپنے بین السطور مافی الضمیر" جانتا ہے جو میں لکھوا رہا ہوں اس سے میرا کنایہ کس بات کی طرف ہے؟" کہہ کر بیان کر دیتے تھے اور پھر خود ہی ہنستے اور محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے والد مرحوم سے کہا "آپ نے وہ یادداشتیں کیوں نہ محفوظ کر لیں؟" وہ میری نادانی پر ناراض ہوئے اور کہنے لگے "کاغذ پر لکھنا الگ رہا۔ میں تو پوری کوشش کرتا تھا کہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اسے نکال دوں۔" دادا ابا علیہ الرحمۃ حضرت مولاناؒ کے راز دار اور مشیرِ کار تھے۔ وہ اکثر کہتے تھے کہ "حضور مجھے وہ ہرگز نہ بتائیے جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں۔ مجھے امتحان میں نہ ڈالیے۔" والد مرحوم کہتے تھے کہ میں تو کس گنتی شمار میں تھا! والد مرحوم کے نام سے مولانا عبدالرحیمؒ نے ایک کتاب شائع کی تھی: "الخلافۃ فی خیر الامۃ ردّ اعلی النبوۃ فی خیر الامۃ" یہ حاجی قمرالدین کے مطبع قیومی کانپور سے طبع ہو کر دسمبر ۱۹۱۴ء میں شائع ہوئی۔ متوسط التقطیع کی اٹھاسی صفحات کی اس کتاب پر بحیثیت مصنف میرے والد کا نام درج ہے اور "بفرمائش حضرت مولانا عبدالرحیم صادقپوری" کا ٹائیٹل پیج پر اندراج اصل حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ کتاب کے شروع اور آخر میں منشی قاسم علی احمدی ایڈیٹر الحق و رسالا احمدی کے رسالے پر تنقید ہے اور "ابطال امامت قادیانی" پر اہلِ سنت کے مختلف مسلکوں کے مشہور علماء کے فتاویٰ ہیں۔ ان حفاظتی دیواروں کے درمیان حکومت الٰہیہ کے مسلک' اس پر قرآن اور حدیث سے دلیلوں اور اس کے حصول کی تدبیروں کا قلعہ تعمیر کیا گیا ہے۔

---

[1] ۔ والد مرحوم اپنے آبائی گاؤں افضل پور (پٹنہ) کی نسبت سے افضلی لکھتے تھے۔ جب میں پیدا ہوا اور نانا ابا مرحوم کی گود میں دیا گیا تو انھوں نے مسرت کے ساتھ کئی بار کہا کہ "جعفریوں کے گھر میں فاطمی"۔ نانا ابا مرحوم حضرت جعفر بن ابی طالب کی اولاد میں سے تھے' جب کہ دادا ابا علیہ الرحمہ کا سلسلۂ نسب حضرت سید راجہ سے ہوتا ہوا حضرت علی بن ابی طالبؓ حضرت فاطمہ علیہما السلام تک جاتا ہے۔ اس امر پر اظہار مسرت نے خانوادۂ صادقپور کے نئے داماد کے دل پر اچھے نقوش چھوڑے۔ جب سرکاری امتحانات کے لیے میرا فارم بھرا جانے لگا تو اس واقعے کو یاد کرتے ہوئے انھوں نے نام کے آگے فاطمی لکھنے کی ہدایت کی یوں یہ نسبتِ عالیہ میرے نام کا جز ہو گئی۔ اور خود والد افضلی رہے۔

حضرت مولانا عبدالرحیمؒ کے اس منشورِ مستور کا مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے رسالہ "منصب امامت" سے تقابلی مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ خیر، اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ والد مرحوم نے ترکِ موالات کیا۔ آئندہ انگریزی کی نوکری نہ کرنے کا عہد کیا۔ پچھلی کمائی کی جمع پونجی پر گزر اوقات ہو رہی تھی کہ انھیں پے در پے صدمے اٹھانے پڑے۔ عبدالرحیم نانا، نانا ابّا اور میری والدہ (حسنیٰ) کا یکے بعد دیگرے انتقال ہو گیا۔ میری والدہ تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھیں جن میں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے بہت پہلے میری بڑی خالہ اماں (نجم النساء) جنھوں نے میری والدہ کی تربیت میں حصہ لیا تھا اور خود مجھے پالا پوسا تھا بیوہ ہو چکی تھیں۔ ان کے دو بچے (سید خلیل احمد اور سید انیس احمد) میرے والد اور والدہی کی کفالت میں تھے۔ بزرگوں کا مشورہ یہ ہوا کہ نکاحِ بیوگان کی سنت جس کا احیاء حضرت سید شہید کی دعوت جہاد و اجتہاد کا ایک اہم مقصد تھا لیکن وہ سنت اب پھر مردہ ہو چلی تھی اسے زندہ کیا جائے۔ مگر یہ سارے بوجھ کیسے اٹھائے جائیں؟ پٹنہ میں رہ کر آزاد پیشہ اختیار کرنے کی راہیں مسدود نہیں تو محدود یقیناً تھیں۔ اس لیے والد مرحوم نے ترکِ موالات کے بعد اب ترکِ وطن کی راہ کا انتخاب کیا۔ اور اپنے ڈیڑھ کنبے کو لے کر دہلی آ بسے۔ یہاں پنجابی سوداگروں کے محلّے میں اقامت گزیں ہوئے۔ سوداگر بچوں کو خط و کتابت کے لیے اردو اور انگریزی، بہی کھاتہ رجسٹر رکھنے کے لیے حساب کتاب، دینی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے واسطے مدرسہ باسطیہ[1] کے نام سے اسکول کھول لیا۔ یہ خوب چل نکلا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ قومی تعلیم و تربیت کے مقاصد بھی پورے ہو رہے تھے اور خود اپنے بچوں کی تعلیم اپنے زیرِ نگرانی جاری تھی۔ آمدنی بھی اچھی تھی، ہم سب بہت خوش تھے۔ والد مرحوم کے قویٰ بہت اچھے تھے، صحت قابلِ رشک۔ لیکن ایک سال ایسا ہوا کہ میعادی بخار (تپِ محرقہ) میں مبتلا ہو گئے۔ اسکول بیٹھ گیا۔ پردیس، چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ اور ذریعۂ آمدنی انتہائی مخدوش۔ آزاد پیشے کی پابندیاں اب سامنے آئیں۔ انگریزی غلامی کے تحفظات یاد آئے۔ لیکن انگریزی ملازمت اصول کی بنا پر ترک کی تھی وہ اصول تو غیر متزلزل تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ والد تو صحت یاب ہو گئے۔ مدرسۂ باسطیہ کو پھر سنبھال لیا۔ کام پھر چل نکلا۔ لیکن میعادی بخار اپنے پیچھے مستقل تذبذب چھوڑ گیا۔ کچھ عرصہ بعد اخباروں میں مولانا ابوالکلام آزاد کے دہلی تشریف لانے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی واقع دریا گنج میں مقیم ہونے کی خبر پڑھی جس نے درد دیا تھا اسی سے دوا لینے والد مرحوم چل پڑے۔ احتیاطاً غروبِ آفتاب کے بعد کا وقت چُنا۔ مجھے ساتھ لیا۔ پرچی پر اپنے نام کے بعد "مع نبیرہ مولانا محمد یوسف

---

[1] اوپر صفحہ ۱ حاشیہ ایم نامول کی تبدیلی کا ذکر آیا ہے۔ دادا ابّا علیہ الرحمہ کا نام کفایت حسین تھا۔ لیکن خاندان صادق پور کے زیرِ اثر آنے کے بعد انھوں نے اپنا نام عبدالباسط رکھ لیا لیکن چلا نہیں۔ لائق فرزند نے مدرسہ باسطیہ نام رکھ کر اپنی دانست میں اس کے احیاء کی کوشش کی تھی۔

جعفری رنجور عظیم آبادی" لکھا۔ میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا کہ والد اپنے آپ کو میرے ذریعہ پہنچوا رہے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی بلند و بالا کوٹھی کی ڈیک کے رُخ کھلنے والی بالکنی میں دو آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ میرے لیے مونڈھا ڈلوا دیا گیا۔ چاندنی رات تھی۔ دور جمنا کی لہروں پر چاند کی کرنیں محوِ رقص تھیں اور میں اس نظارے کے دیکھنے میں غرق تھا۔ والد مرحوم اور آزاد نانا میں بہت طویل گفتگو ہوئی جس میں ظاہر ہے ابو الکلام کا حصہ کہیں زیادہ تھا۔ ایک آدھ بار ایسا محسوس ہوا کہ ان کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ میری طفلانہ حرکت تھی کہ میں نے اس اہم گفتگو کو غور سے نہیں سنا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ دیکھا کہ والد برسرکار ہو گئے، اور وہ بھی بالآخر اپنے خسر کے جانشیں یعنی چیف مولوی بورڈ آف ایگزامنرز بنا دیا گیا (یہ دفتر اب کلکتے سے مستقلاً شملے میں منتقل ہو گیا تھا) کام اس دیانت اور خلوص سے کیا کہ خاں صاحب کا خطاب حاصل کیا۔ عہدہ بڑھا دیا گیا۔ انھیں انڈین ممبر بورڈ آف ایگزامنرز بنا دیا گیا۔ (یہ عہدہ انھیں کے لیے بنایا گیا تھا)۔ اس طرح وہ منصباً انگریز سربراہ کے بہت قریب ہو گئے کہ وہ بورڈ کا ممبر سکریٹری تھا۔ گھر کی زندگی میں اس تبدیلی سے میں خوش نہ تھا۔ خدا مجھے معاف کرے، میں اکثر والد صاحب کے منہ آتا تھا۔ ایسے موقع پر ایک آدھ بار انھوں نے دریا گنج کی کوٹھی والی گفتگو کا حوالہ دیا۔ اس کی تفصیلات دہرائیں۔ جن سے میں نے نتیجہ یہ اخذ کیا کہ آزاد نانا اپنی احتجاجی ترکِ موالات کی تحریک پر سرسید، صادق پور، شمس العلماء مولانا محمد حسن ذبیح اور ان کے بھانجے خان بہادر شمس العلماء مولانا محمد یوسف جعفری رنجور کی انقلابی موالات کو فضیلت دینے لگے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انگریز کی نوکری کرو، ڈٹ کر کرو لیکن ساتھ ہی انگریز کے باغیوں کی خلوصِ دل سے بھرپور مدد کرو۔ روپے پیسے سے، مفید مشوروں سے اور آزادی کی تحریک کو نقصان پہنچانے والی فرنگیانہ تدبیروں کا دفعیہ کر کے۔ اگر آخر الذکر میں ناکامی ہو تو مستعفی ہو جاؤ اور کوئی اور نوکری تلاش کرو۔ (میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ سر ولیم ہنٹر کی کتاب "اَوَر انڈین مسلمانز" میں اس طریقۂ کار کی بھرپور تفصیل اور مکمل تصویر موجود ہے۔) ہجرت کی تحریک کو انھوں نے اپنا عاجلانہ فیصلہ قرار دیا تھا اور اس پر سخت نادم تھے۔

○

احتجاجی ترکِ موالات اور انقلابی موالات کا یہ موازنہ آسانی سے ذہن نشین نہیں ہوتا۔ مجھے اس کے سمجھنے میں بڑی دقت ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے والد مرحوم کی زندگی کا مختصر سا خاکہ پیش کر دیا، کہ سمجھنے میں آسانی ہو۔ خود میں نے اسے اسی طرح سمجھا تھا۔ اس طویل جملہ معترضہ کے بعد آزاد و رنجور کی طرف آئیے۔ ۱۹۲۰ء میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحریکِ ہجرت کی شکل میں دونوں کی راہیں مل گئی ہیں۔ لیکن درحقیقت دونوں ایک دوسرے سے بہت دور جا نکلے تھے۔ آخر، ۷ جون ۱۹۲۳ء کو حضرت رنجور اپنے اجداد سے جا ملے۔ اس کے ڈیڑھ ماہ کے اندر (بتاریخ ۲۴ جولائی) ان

کے حقیقی ماموں حضرت مولانا عبدالرحیم نے سجنِ مومن سے رہائی پائی۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنہم وَرَضُوا عَنہ۔

○

زیرِ نظر مجموعے کے مشمولات کی تعداد ترپن ہے۔ انھیں میں نے حتی الامکان تاریخ وار مرتب کرکے مضامین کے لحاظ سے سات حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں شعر و سخن سے متعلق منظوم اور نثری تحریریں ہیں۔ دوسرا حصہ ان کے دینی عقائد سے متعلق خطوط کے لیے مختص ہے۔ میں اوپر ذکر کر آیا ہوں کہ لڑکپن میں انھیں اپنی وہابیت اور نیچریت کے لیے کتنی مہنگی قیمت دینی پڑی تھی۔ اس کی جھلکیاں دوسرے حصے کے خطوط میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ بالخصوص وہ طویل خط جس پر "پرائیویٹ" لکھا ہے، مولانا کے حزن و ابتلا کی دردناک دستاویز ہے۔ (ص ۱۸-۲۱)

حضرت مولانا کی ذہنی تشکیل کے دو اہم ترین عنصر تھے: عدمِ تقلید اور رواداری۔ ان عناصر کا ظہور ان کے نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی اور سماجی رجحانات میں بھی نمایاں تھا۔ رواداری اور بے تعصبی کا سبق انھوں نے کچھ دیر سے سیکھا تھا۔ روشِ آبائے انحراف کے نئے نئے جوش نے ان میں شروع زمانہ میں عصبیت پیدا کر دی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں "احسن الاخبار" میں ان کے مضمون بہ عنوان "اسلام اور محرّم" کی اشاعت اس کی واضح مثال ہے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی راوی ہیں کہ خود مولانا کو یہ اعتراف تھا کہ انھوں نے یہ مضمون "چونکہ عین جذبات کی برانگیختگی میں لکھا تھا، اس لیے اس میں شک نہیں کہ بحث و نظر کے ایک متحمل اور سازم اسلوب کی جگہ سختی اور شدتِ بیان پر مبنی تھا۔"[1] آگے چل کر محرّم کے مروجہ رسوم کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس مضمون میں "لوگوں کو مخاطب کرکے ایک شدید لب و لہجہ میں اس پر زجر و توبیخ کی تھی۔"[1] لیکن غلطی کے اس احساس کے لیے انھیں کن مرحلوں سے گزرنا پڑا، اس کا کچھ اندازہ دینی عقائد والے حصے کے نصفِ آخر کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس قضیے کو رفع دفع کرنے میں جناب کاظم شیرازی نے اہم خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ فاضل بزرگ بورڈ آف اگزامنرز، کلکتہ میں شعبۂ فارسی کے سربراہ اور نانا ابا مرحوم کے رفیقِ کار اور معترف و ممنون تھے۔

صحافت کے حصے والے خطوط کا پسِ منظر میں نے اپنی بڑی خالہ مرحومہ (نجم النساء)، جن کی شفقت کی گود میں میں پلا بڑھا ہوں، کی زبانی سنا ہے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ "لسان الصدق"[2] کے اجرا کے زمانے میں گھر میں کارخانہ سا کھل جاتا تھا، جس کے دفتری کاموں میں منجھلے ماموں (بنیامین) مرحوم اور وہ خود بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں۔ منجھلے ماموں کی اس ان تھک محنت کی ایک ادبی یادگار ان کے نام کا ایک رقعہ رہ گیا ہے جو اس مجموعے میں شامل ہے (ص ۴۳)

۱۔ ملیح آبادی: آزاد کی کہانی، ص ۲۵۹-۲۶۰۔ ۲۔ ایضاً ۲۷۹-۲۸۱

جناب منظور حسن کا ذکر ان خطوط میں اکثر آیا ہے، میرے بڑے خالو (ڈاکٹر سید منظور احمد) تھے۔ وہ کاکو ضلع گیا کے شمسی خاندان کے چشم چراغ تھے۔ کامیاب معالج تھے۔ شمالی برما (پکوکو) میں خدمت خلق کرتے ہوئے اپنی جان دی۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے۔

حصۂ تعلیم و تصنیف: فنِ شعر میں آزاد دہلوی نے رنجور عظیم آبادی کی شاگردی کا اثر بہت کم قبول کیا تھا۔ اور بجا طور پر انھوں نے اس کا ذکر کہیں نہیں کیا۔ (گرچہ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کو جن منظومات کے عکسی چربے میں نے فراہم کیے تھے، ان میں سے بعض پر حضرت رنجور کی اصلاح کے آثار بہت واضح ہیں) خود حضرت رنجور کے لیے شاعری تفننِ طبع، اظہارِ قادر الکلامی اور اردو زبان و ادب کے غیر ملکی طالب علموں کے لیے اردو روزمرہ، محاورات اور کہاوتوں کے محلِ استعمال اور بنگیاتی اردو کی توضیح اور مثالیں بہم پہنچانے کا ذریعہ تھی۔ حضرت رنجور عظیم آبادی کی انگریزی زبان و ادب پر بھی گرفت بہت مضبوط تھی۔ انگریزی زبان کے وہ ماہر نکتہ شناس تھے۔ اردو اور انگریزی کا تقابلی مطالعہ ان کے فرائضِ منصبی میں داخل تھا۔ بورڈ آف ایگزامنرز کے اردو کے درجۂ اعلیٰ کے نصاب کا انھوں نے انگریزی زبان میں ترجمہ شائع کیا تھا جو انگریز افسروں میں بہت مقبول ہوا۔ مولانا آزاد نے انگریزی انھیں سے سیکھی تھی۔ جس کا ذکر پروفیسر ہمایوں کبیر نے "انڈیا ونس فریڈم" میں کیا ہے[1]۔ اس شاگردی کا شروع ۲ جولائی ۱۹۰۲ء کے لکھے ہوئے خط سے بھی ملتا ہے (ص ۵۱) اس کے ایک سال بعد کے خط میں انھوں نے اپنا صبح پانچ بجے سے شام کے ساڑھے سات بجے تک کا پروگرام درج کیا ہے۔ جسے انھوں نے ترتیب وار لکھ کر اپنی میز کے سامنے آویزاں کر رکھا تھا۔ اس میں انگریزی کے اسباق کا ذکر نہیں ہے (ص ۵۲) جس کا مطلب یہ ہے کہ آزاد و رنجور کے درمیان انگریزی کی تعلیم و تعلم کا سلسلہ صرف ایک دو سال تک چلا۔

اس پروگرام میں ایک اور لائقِ توجہ بات یہ ہے کہ مولانا نے روزانہ شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کا ایک گھنٹہ خطوط نویسی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ خطوط نویسی سے ان کے شغف کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر مجموعے کے اکثر خطوط اور رقعات کلکتے کے ایک محلے سے دوسرے محلے تک بھیجے گئے ہیں۔ میں اوپر مولانا کی تنہائی کا ذکر کر چکا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے خطوط کا سہارا لیا تھا۔ (شام کے چار بجے سے پانچ بجے تک کے وقت کا انتخاب بھی قابلِ غور ہے)۔ لڑکپن میں خطوط نویسی کیلیے ایک گھنٹے کی مشق نے اردو ادب کو "غبارِ خاطر" (اس ترکیب پر بھی غور کیجیے) جیسا قیمتی ادب پارہ دیا۔

۱۔ ہمایوں کبیر: انڈیا ونس فریڈم اورینٹ لانگ مینز بمبئی۔ ۱۹۵۹ء ص ۳

زیر بحث چوتھے حصّے کے آخری خط کی پشت پر مولانا عبدالرزاق مصنّف "البرامکہ" کے نام خط کا پہلا صفحہ ہے (ص ۵۹) اس کا اگلا حصّہ موجود نہیں۔ شاید یہ ان کے نام کے خط کا مسودہ تھا، بیتفیر انھیں بھیج دیا گیا اور مسودہ حضرت رنجور کے علم میں لایا گیا!

مولانا آزاد کو اپنی اولوالعزمی اور آزادہ روی کی بڑی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی جس کا ذکر میں دینی عقائد کے سلسلے میں کر چکا ہوں۔ اس کے سبب مالی لحاظ سے انھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کا اندازہ ان خطوط سے کیا جا سکتا ہے جو پانچویں حصّے ("مالی معاملات") میں شامل ہیں۔

چھٹے حصّے ("قلبی روابط") میں میرے نزدیک اس خزانے کے سب سے بیش بہا جواہر پارے ہیں۔ آزاد ناز بے اندازہ محبّت کرنے والے اور انتہائی رقیق القلب انسان تھے۔ ان میں اثر اندازی اور اثر پذیری دونوں کی بے پناہ صلاحیتیں تھیں۔ اثر پذیری اور حساس طبعی کے آثار چھٹے حصّے کے خطوط میں خصوصیت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ان میں سے دو میں آرہ کے سانحے کا ذکر ہے۔ یہ اشارہ ہے حضرت مولانا ابراہیم آروی کے انتقال کی طرف۔ میری والدہ ماجدہ کے رشتے کے نانا تھے۔ آزاد سوگوار خاندان سے تعزیت کے لیے کلکتے سے سفر کر کے پٹنہ پہنچے تھے۔ غالباً حضرت مولانا عبدالرحیم سے ان کی ملاقات اسی موقع پر ہوئی۔ جناب رنجور نے جب بوقت رخصت ان کے آنے پر اظہار تشکر کیا تو اس کے جواب میں جس والہانہ انداز میں انھوں نے اپنے ردعمل کا اظہار اس حصّے کے تیسرے خط (ص ۶۸) میں کیا ہے وہ ان کی عالی ظرفی کی روشن مثال ہے (مولانا ابراہیم آروی کی تاریخ وفات کے قطعات کلام رنجور کی مذکورہ بالا بیاض میں درج ہیں)

ساتویں حصّے ("متفرقات") میں بیشتر خطوط طرفین کی فرمائشات پر مشتمل ہیں۔ مولانا آزاد کر یہلے تو ماراکرد گستاخ" کی لطافتوں سے بخوبی آشنا تھے۔ خود میں ان کے ساتھ بہت گستاخ تھا اس لیے کہ وہ گستاخی پسند کرتے تھے۔ اس شوخی کی پُر لطف جھلکیاں دیوار کھا ج کی آپس کی نوک جھونک کی شکل میں نظر آتی ہیں جو اس حصّے کے چند خطوط میں موجود ہیں۔

اس حصّے کے دو خطوں میں "بانکی پور لائبریری" (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری) کی فہرست کے لیے اضطراب کا اظہار ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے عنفوان شباب ہی سے انھیں اس عظیم و پرثروت خزینۂ علم سے تعلق خاطر تھا۔ وہ اپنے ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء کے خط (ص ۷۹) میں لکھتے ہیں:

بانکی پور لائبریری کے [کی] فہرست کی تلاش ضروری ہے۔ اسکی مجھے سخت ضرورت ہے اگر نقل ہو سکے تو نقل ہی کرا لیجیے۔ اجرت دے دی جائے گی۔"

تقریباً ایک مہینے بعد ۱۸ جون کے پوسٹ کارڈ (ص ۸۰) میں یاد دہانی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

و بانکی پور لائبریری کی فہرست کا خیال ہے۔ اصل ہے تو بہتر ہے ورنہ نقل کرا کے (معلوس) بھیجے گا۔ مجھے اسکی سخت ضرورت ہو"
حق بحقدار رسید۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے آثار کے اس خزانے کو شائع کرنے کا حقدار یہی ادارہ تھا۔ بحمداللہ اسے
اس کا موقع ملا۔ اس کے لیے اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار مستحق تبریک و تحسین ہیں۔ انھوں نے ان خطوط کو
پڑھنے میں جس ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے اس سے ان کی مہارتِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ اس مخطوطے کے پڑھنے والے
کی راہ میں جو مشکل مقامات آتے ہیں ان کا ذکر خود ان کی زبانی سنیئے گا۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال سطور مندرجہ بالا میں
ہے کہ مولانا ۱۹۰۲ تک یائے معروف و یائے مجہول میں تمیز نہیں کرتے تھے لیکن دلچسپ اور معنی خیز بات
یہ ہے کہ ایک سال بعد ۲۵ جون (۲۴- ۱۹۰) کے مکتوب میں "منشی صاحب" کے یائے معروف کو مجہول لکھنے پر تنبیہ
کرتے دکھائی دیتے ہیں (ص ۴۴)۔ نہ صرف املا بلکہ طرز انشا کے نشیب و فراز (بلکہ نشیب سے فراز) نے اس مخطوطے
کو پڑھنے کی مشکلات بڑھا دی ہیں۔ ان سب پر مزّہ یہ کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں کاغذ جا بجا ٹوٹ گیا ہے۔ جس کی ایک
مثال پھر مندرجہ بالا سطروں میں ہے کہ ایک جگہ مجھے "معلوس" لکھنا پڑا۔ ان مشکل مقامات سے گزر کر قوم کی امانت
انھوں نے جس حسن و خوبی و جاں کاہی سے قوم کو پیش کی ہے اس کے لیے ان کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ وہ اس پر
تعلیقات کے اضافے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس معاملے میں بھی حق احسان ادا کریں گے۔

خدا بخش پبلک لائبریری کے مہمان خانے کے قیام کے دوران میں انھوں نے بیگم بیدار نے اور
عزیزی شائستہ بیدار نے جس محبت، خلوص اور گرمجوشی سے مجھ غریب الدیار کی (جو اپنے ہی شہر میں اجنبی ہو گیا
ہے) مہمان نوازی کی اس کے اظہارِ تشکر کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ:

جزاکم اللہ احسن الجزاء

آخر میں عزیزم محمد سبحان جعفری کے لیے دل کی گہرائی سے تشکر کے جذبات کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں۔ یہ کہہ کر اس
خوشگوار فریضے کو ٹال نہیں سکتا کہ یہ تو گھر کا معاملہ ہے۔ انھوں نے جس طرح اس خزانے کی حفاظت کی اور جس فراخدلی
سے اسے میرے حوالے کر دیا اس کے لیے خدا ان کو جزائے خیر دے۔ سبحان اس وقت اچھے بینکر ہیں۔ امانت کے
تقاضوں سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ انشاء اللہ وہ اور ترقی کریں گے اس لیے کہ وہ "القوی الامین" ہیں۔

سید قدرت اللہ فاطمی
۵۔۷، سٹریٹ ۳۰
سیکٹر جی ۹/۱ اسلام آباد (پاکستان)

آثارِ آزادؒ

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ

کے

اوائلِ عمر کی چند تحریریں

مرتبہ

ترتیب

شعروسخن

دینی عقائد

صحافت

INDIA POST CARD

THE ADDRESS ONLY TO BE WRITTEN ON THIS SIDE.

مولوی محمد یوسف صاحب جعفری

۱۲ تاراچند دت اسٹریٹ

کلکتہ

Calcutta

3

POST CARD.
BYCULLA
BOMBAY
Calcutta
Bhajanlal Govindka Kalbadevi Bombay. All kinds goods can be supld. moderate price.

تعلیم و تصنیف

قطعۂ تاریخ تالیف حیات حکیم خاقانی شیروانی
از تصنیفات صدیقی و حبیبی مولانا محی الدین
احمد صاحب آزاد دہلوی از اثر خامۂ محمد یوسف
جعفری رنجور عظیم آبادی جیف مولوی بور ڈآف اگزامنس کلکتہ

خاقانی باکمال کا حال — اس پر تکلف بیان آزاد
جو لفظ ہے مصری کی ڈلی ہے — کیا شیریں ہے زبان آزاد
صفحے نہیں تختہائے گل ہیں — کہیے اسے گلستان آزاد
گو ہند میں ہیں بہت سخنور — ہے سب سے نرالی شان آزاد
بہرہ ہی نہیں انھیں سخن سے — ہیں جو کہ نہ قدر دان آزاد
آزاد کو حق رکھے سلامت — برباد ہوں دشمنان آزاد
ہو نشو و نما یہ یا الٰہی — دائم فکر جوان آزاد
ہر دم رہے بافتحہ بہر خدایا — آب طبع روان آزاد
تاریخ کی فکر اگر ہے رنجور — لکھدو "ہے ارمغان آزاد"

۱۳۲۰ھ

مالی معاملات

قلبی روابط

متفرقات

باسمہٖ

[illegible]

والسلام علیکم بالمودۃ والوداد

آپ کا مخلص دوست
ابوالکلام آزاد

9/1/43

ڈاکٹر نذیر احمد
علی گڑھ

حیدر آباد کا پرانا نام: بھاگ نگر

——— افسانہ یا حقیقت

قطب شاہی خاندان کا پانچواں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے خاندان کے سارے سلاطین میں ممتاز ہے بلکہ علمی و ادبی لحاظ سے اس کا پایہ سب سے بلند ہے، اور اگر یہ بات کہی جائے کہ تمام دکنی سلاطین میں سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے بعد وہ سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کا مالک ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے، علم و ادب کا بھی بڑا قدرداں تھا۔ اس نے حیدرآباد جیسے ممتاز شہر کی بنیاد ڈالی، کہتے ہیں کہ یہ شہر ابتدا میں بھاگ نگر کہلاتا تھا، مگر اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے، زیر نظر مضمون میں اس مسئلے پر تحقیقی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جا رہی ہے، سب سے پہلے وہ اقوال نقل کیے جائیں گے جن میں بھاگ نگر اور بھاگ متی کا ذکر ہوا ہے۔

(۱) بھاگ نگر کی بنیاد ڈالنے کی تاریخ ۱۰۰۰ ہجری بتائی جاتی ہے، اس سلسلے میں سب سے قدیم بیان دربار اکبری کے ملک الشعرا فیضی[1] کا ہے، جلوس اکبری کے ۳۶ ویں سال وہ خاندیس اور احمد نگر کی سفارت پر بھیجا گیا تھا، وہیں سے اس نے ایک نہایت مفصل عرضداشت روانہ کی تھی، اس میں

---

[1] انشای فیضی مطبوعہ لاہور، ص ۱۴۵-۹۷

نگر، بیجاپور، گول کنڈہ کے سلاطین کے حالات ان کے مشاغل، وہاں کے علما وفضلا، اور بعض دوسرے اہم امور ساتھ ساتھ ایران کے سیاسی و اقتصادی حالات ایرانی نوواردوں سے براہ راست حاصل کرکے اکبر کے پاس بھیجے ہیں۔ اس عرضداشت سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی نے سفارت کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا تھا، عرضداشت اتنی اہم ہے کہ موجودہ دور کے سفیروں کے لیے نمونے کا کام دے سکتی ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے فیضی کی نظر اس امر پر مرکوز تھی کہ کون کون سے ایسے فضلا ہیں جو دربار اکبری کی زینت ہو سکتے ہیں، ان کی سفارش بھی کرتا ہے۔ یہ عرضداشت انشای فیضی میں شامل ہے، اس میں دکن کے بارے میں بعض ضروری باتیں درج ہیں، انہیں بھی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر کو بھاگ متی کے نام پر آباد کیا تھا۔ فیضی لکھتا ہے :

"برہان نظام الملک اپنے کو حضرت عالی کے دولت خانہ کی نعمت کا پروردہ جانتا ہے، چار ماہ ہوئے عادل خاں کی جاگیر پر حملہ کی غرض سے احمد نگر سے ۵، کوس کے فاصلے پر بیٹھا ہے ... عادل خاں ہنوز بیجاپور کے قلعہ میں ہے اور ہزار سوار پر مشتمل ایک لشکر شاہزادہ کی سرکردگی میں مقابلہ کے لیے روانہ کیا ہے، ... دیگر ابراہیم عادل خاں حاکم بیجاپور ۲۲ سال کا ہے، وہ علی عادل خاں کا بھتیجا ہے اور صلاحیت سے خالی نہیں، حضرت کے دربار سے غائبانہ ارادت رکھتا ہے، دلاور خاں جو اس کا تربیت یافتہ ہے مذہب تسنن رکھتا ہے، لوگوں نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی اس وقت نظام الملک کے پاس ہے، محمد قلی قطب الملک شیعہ مذہب کا پابند ہے، اس نے بھاگ نگر نام کا ایک شہر بسایا اور اس میں عمارتیں بنوائیں۔ یہ شہر ایک پرانی قحبہ اور اس کی قدیم معشوقہ بھاگ متی کے نام پر ہے، ولایت دکن کے حالات خواہ وہ حصے جو ان تینوں [نظام شاہی، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین] کے قبضے میں ہیں یا وہ جو دوسرے راجاؤں کے پاس ہیں اور ان کے آپس کے تعلقات، باوجود موانع اور رکاوٹوں کے مبصرانہ طور پر ملاحظہ ہوئے اور اگر کچھ اور مہلت ملی تو حضور کی خدمت میں تفصیلی عرضداشت پیش ہوگی، بندہ یہ ولایت ممالک محروسہ میں شامل سمجھتا ہے، امید ہے یک بارگی قدوم مبارک مع موکب عالی کے ان اطراف میں آپہنچے گا، یہ غزل حسب حال لکھی ہے، چونکہ نہایت مخلصانہ انداز میں نظم ہوئی ہے امید کہ نتیجہ وقوع پذیر ہوگا ؎

نسیم صبح مشک افشاں زگرد راہ می آید　　مگر از کوکب اقبال اکبر شاہ می آید　　الخ"

فی الحال اس عرضداشت کے اس حصے سے تعلق ہے کہ بھاگ نگر شہر محمد قلی قطب شاہ کا آباد کردہ تھا

اور اس شہر کا نام بھاگ متی نامی طوائف کے نام پر پڑا، اور چونکہ یہ عرضداشت ۱۰۰۱ ہجری سے کچھ قبل لکھی گئی، اس لئے اس شہر کی بنیاد ۱۰۰۱[1] ہجری سے قبل ہی پڑی ہوگی۔

عرضداشت کی تاریخ کے سلسلے میں چند امور قابل ذکر ہیں:

(۱) — اکبرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی ۱۰۰۱ ہجری میں واپس ہوا تھا۔

(۲) — ابراہیم عادل شاہ ۲۲ سال کا بتایا گیا ہے، اس کی پیدائش ۹۷۹ھ کی ہے۔ ۱۰۰۱ ہجری سے کچھ قبل وہ ۲۲ سال کا ہو گیا ہوگا۔

(۳) — برہان نظام شاہ اور ابراہیم عادل شاہ کی آویزش کا تذکرہ ہے۔ تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دلاور خاں کی تحریک سے برہان نظام شاہ پہلی جمادی الثانی ۱۰۰۱ ہجری کو عادل شاہی قلمرو میں داخل ہوا تھا، عرضداشت میں لکھا ہے کہ اس واقعہ کو ۴ ماہ ہوئے، اس لحاظ سے عرضداشت کی تاریخ رمضان ۱۰۰۱ ہجری کے قریب ہوگی۔

(۴) — شاہ عباس کی عمر ۲۰ سال کی بتائی گئی، وہ ۱۵ سال کی عمر میں ۹۹۶ ہجری میں تخت نشین ہوا تھا، اس اعتبار سے ۱۰۰۱ ہجری عرضداشت کی تاریخ قرار پاتی ہے۔

(۵) — اسی طرح خراسان پر فوج کشی، شاہ عباس کا اپنے دو بھائیوں ابوطالب مرزا اور طہماسپ مرزا کی آنکھوں میں سلائی پھروانا اور بکتاش خاں کی سرکشی وغیرہ کے واقعات سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ فیضی نے یہ عرضداشت ۱۰۰۱ ہجری کے وسط میں لکھی ہوگی

● دوسرا بیان نظام الدین بخشی کا ہے، وہ طبقات اکبری میں لکھتا ہے:

"ذکر محمد قلی قطب الملک بن ابراہیم ——— محمد قلی اپنے باپ کا قائم مقام ہوا، ایک بھاگ متی نام کی ایک عورت پر عاشق ہوا، اس کے نام پر ایک شہر بھاگ نگر نامی تعمیر کرایا اور اس طوائف کے لئے ایک ہزار سوار نوکر رکھے جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے۔ اس وقت ۱۰۰۲ ہجری اور ۳۸ واں سال جلوس اکبری ہے۔ اس وقت تک اس کو (یعنی محمد قلی قطب شاہ) حکومت کرتے ۹ سال ہو گئے۔"

اس میں اتنی بات درست نہیں کہ محمد قلی کو ۱۰۰۲ تک محض ۹ سال حکومت کرتے ہوئے تھے برہان

---

[1] فرشتہ نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان معروف بہ ملکہ جہاں سے شادی کے موقع پر [illegible] شادی ۱۰۰۶ھ [illegible] بھاگ نگر کا نام موجود تھا۔ (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۵۷)

ثر میں اس کی تخت نشینی ۹۸۹ھ بتائی گئی ہے، اس اعتبار سے ۱۰۰۲ ہجری تک اس کو ۱۳-۱۴ سال حکومت کرتے ہو گیا تھا

● تیسرا بیان مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ کا ہے۔ وہ ۱۰۱۷ ہجری کے قریب اپنے قیام بیجاپور کے دوران لکھتا ہے

" آسمان جلال کا وہ قطب اپنے اوائل حکومت کے ایام میں بھاگ متی نام کی ایک ناچنے والی پر عاشق ہو گیا اور ہزار سوار اس کے ملازم رکاب کر دئے، چنانچہ وہ بڑے امرا کی طرح دربار میں آتی جاتی اور جن دنوں گول کنڈہ کے باشندے وہاں کی آب و ہوا سے پریشان اور متنفر تھے قطب شاہ نے شہر مذکور سے چار کوس کے فاصلے پر ایک شہر کی بنیاد ڈالی کہ پورے ہندوستان میں صفائی اور پاکیزگی کے اعتبار سے کوئی شہر اس کی طرح نہ تھا۔ اس کو اس نے اپنا دارالخلافہ بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، آخر کار اس نام سے پشیمان ہوا اور حیدر آباد نام سے موسوم کیا، لیکن عام لوگوں میں یہ شہر بھاگ نگر نام ہی سے مشہور ہے۔ حیدر آباد نام سے نہیں۔ اس شہر کا دور پانچ کروہ ہے، اس کے بازار نہایت وسیع اور صاف ستھرے ہیں اور آب و ہوا صحت افزا ہے۔ بازار کے دونوں طرف نہریں جاری ہیں، ان کے کنارے سایہ دار درخت ہیں۔ نہایت عمدہ دکانیں اینٹ اور پتھر سے تعمیر ہوئی ہیں اور شاہی عمارتیں ایسی ہیں جن کی مثال دوسرے ملک میں نہیں ملتی "۔ ——————— (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۰۳)

ابراہیم عادل شاہ ثانی کی محمد قلی قطب شاہ کی بہن چاند سلطان معروف بہ ملکۂ جہاں[1] سے شادی کے ضمن میں فرشتہ نے کئی بار بھاگ نگر کا ذکر کیا ہے، یہ واقعہ ۹۹۶ ہجری کا ہے:

" بیجاپور کے مشاہیر کی ایک جماعت محمد قلی قطب شاہ کے دارالملک جو حیدر آباد کے نام سے موسوم اور بھاگ نگر کے نام سے مشہور ہے، بھیجی گئی تاکہ بلقیس مہر سلطنت چاند سلطان جو ملکۂ جہاں کہلاتی ہے بادشاہ کے عقد ازدواج میں لائی جائے "۔ ——————— (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۵۷)

" رسل و رسائل اور محمد قلی قطب شاہ سے گفت و شنید کے بعد خواجہ علی ملک التجار کی سرکردگی میں

۱۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی بیوی کا بھی نام چاند سلطان تھا جو احمد نگر کی تاریخ میں اپنی شہرت رکھتی ہے، سلطان نے اپنی کتاب نورس میں اپنی بیوی کا ذکر گیتوں میں کیا ہے۔ (گیت نمبر ۲۱، ۲۲)

ابراہیم سب سندری دیکھیا یہ پھن ہے کہاں ——— جات چاند سلطان نانو بی بی ملکہ جہاں

(صفحہ ۱۱) چاند سلطان ملکہ ——— اتم سندر نار ایسی کہاں

اعیان بیجاپور شادی کے لوازم کے لیے نقود اور اجناس فراواں کے ساتھ بھاگ نگر روانہ ہوئے"۔ (ایضاً)

" بھاگ نگر کے نزدیک پہنچنے پر جب خیمہ و خرگاہ نصب ہوئے تو اس ملک کے سارے اشراف و اعیان استقبال کے لیے آئے"۔ (ایضاً)

یہی مورخ ...۱ھ کے ذیل میں بھاگ نگر کا ذکر پھر کرتا ہے :

" اوائل ...۱ھ میں عدالت پناہ (ابراہیم عادل شاہ ثانی) کے یہاں ملکۂ جہاں کے بطن سے ایک لڑکا پیدا ہوا، چونکہ پہلی اولاد تھی، لہٰذا شادمانی کے لوازم میں بے حد و حساب اہتمام ہوا اور شاہانہ جشن تزک و احتشام سے منایا گیا، شہزادے کا نام علی رکھا گیا، اور اس کے ماموں یعنی محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر سے تہنیت اور مبارکباد کے لیے درگاہ کے چند خواص سونے کے جڑاؤ گھوڑے مع دوسرے بیش بہا تحائف کے بیجاپور بھیجے۔" (ج ۲ ص ۶۷)

اس سلسلے میں چند امور قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ فرشتہ کے پہلے بیان میں واضحاً یہ بات کہی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اوائل حکومت کے دوران شہر آباد کیا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، یہ نام بھاگ متی کے نام پر رکھا گیا" بعد میں اس کو بدل کر حیدرآباد کر دیا گیا۔

۲۔ دوسرے بیان میں کہا گیا ہے کہ یہ شہر حیدرآباد کے نام سے موسوم ہے، اگرچہ عوام میں بھاگ نگر ہی کے نام سے مشہور رہا ہے، اس واقعہ کا تعلق ۹۹۶ ہجری سے ہے جس تاریخ میں ابراہیم عادل شاہ کی شادی ملکۂ جہاں سے ہوئی تھی، لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ محمد قاسم فرشتہ یہ واقعہ ۱۰۱۱ھ میں قلم بند کر رہا تھا، اس وقت شہر نئے نام حیدرآباد سے موسوم ہو چکا تھا گو عوام کی زبان پر بھاگ نگر ہی چڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے کہ ۹۹۶ ہجری میں نیا شہر حیدرآباد کے نام سے موسوم تھا، اس لئے کہ خود فرشتہ کے پہلے بیان میں واضحاً شہر کی تعمیر کے بعد اس کا نام بھاگ نگر لکھا ہے جو بعد میں حیدرآباد کہلایا، مگر عوام بھاگ نگر ہی کہتے رہے۔ ثانیاً یہ کہ اگرچہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جب کسی جگہ کا ذکر کیا جائے تو اس تاریخ میں اس جگہ کا جو نام ہو وہی لکھا جائے مثلاً ۹۹۶ھ اور ...۱ میں حیدرآباد بھاگ نگر کہلاتا تھا، حیدرآباد کا وجود نہ تھا، اس لیئے اس کا وہی پرانا نام لکھنا چاہیئے، لیکن اس کے بجائے اگر اسے حیدرآباد لکھا جاتا تو اس سے یہ استدلال غلط ہوتا کہ اس تاریخ میں اس شہر کا نام حیدرآباد تھا، مثلاً اگر کوئی یہ جملہ لکھے :

"قدیم زمانے میں رام چندر کے بھائی لچھمن اجودھیا میں رہا کرتے تھے۔"
تو اس سے یہ استدلال کہ رام چندر کے بھائی کا قدیمی نام لچھمن اور ان کے شہر کا اجودھیا تھا، صحیح نہ ہوگا، کون
نہیں جانتا کہ لچھمن لکشمن اور اجودھیا 'ایودھیا' کی صوتیاتی تبدیلی کی شکلیں ہیں۔

اس تمہید کی ضرورت اس بنا پر ہوئی کہ پروفیسر ہارون خاں شروانی نے اگلے زمانے میں ایک مختصر کتابچہ
بھاگ متی کے افسانے پر لکھا تھا، اس کے سلسلے میں اسی طرح کا تسامح ملتا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"اس کتابچے کی طباعت کے بعد یہ اہم انکشاف ہوا کہ خود فرشتہ جس کے چند فقروں پر بھاگ متی اور
بھاگ نگر کے ایوان کی بنیاد رکھی گئی ہے نئے پایہ تخت کے قیام کے صرف پانچ سال بعد اسے
حیدرآباد ہی کہتا ہے، جب وہ اس لڑائی کا ذکر کرتا ہے جو ۱۸-۱۹ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ/۲۶-۲۷
جنوری ۱۵۹۷ء کو دریائے گوداوری کے کنارے مغلوں کی فوج اور چاند بی بی کی متحدہ دکھنی فوج کے
درمیان ہوئی تھی تو لکھتا ہے:

امرائے نظام شاہی و قطب شاہی کہ در روز سابق گریختہ بودند بحال ابتر بہ احمد نگر و حیدرآباد
رفتہ حیات را غنیمت دانستند۔" (تاریخ فرشتہ ج ۲ ص ۱۶۳۔)

شروانی صاحب دوبارہ پھر فرماتے ہیں:

"خود فرشتہ (ج ۲ ص ۱۶۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۰۵/۱۵۹۶ میں شہر کا نام حیدرآباد تھا۔"

جب یہ معلوم ہو کہ فرشتہ نے ۱۰۱۵ھ کے قبل تاریخ فرشتہ لکھنے کے لئے قلم نہیں اٹھایا تھا تو اس سے
یہ استدلال تو صحیح ہوگا کہ ۱۰۱۵ھ میں حیدرآباد وجود میں آچکا تھا، لیکن یہ استدلال کہ ۱۰۰۵ھ میں نئے شہر کا
نام حیدرآباد تھا ایسا ہے کہ جیسا آجکل کی کسی تحریر سے قدیم ناموں کا تعین۔ ہاں اگر تاریخ فرشتہ روزنامچہ ہوتی تو
یہ ماننا پڑتا کہ ۱۰۰۵ھ میں اس نے یہ واقعہ لکھا، اور چونکہ مستقبل کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا، اس سے صاف
ظاہر ہے کہ ۱۰۰۵ھ میں شہر کا نام حیدرآباد ہی تھا، لیکن جب صریحاً معلوم ہو کہ یہ واقعہ دس سال سے زیادہ کے بعد
لکھا گیا تو اس سے استدلال ہوگا کہ لکھتے وقت اس شہر کا نام یہی تھا نہ کہ ماضی میں۔ عالم آرائے عباسی میں شاہ
طہماسپ کے دوران حکومت میں ۹۷۶ ہجری کے ذیل میں حیدرآباد کا نام ملتا ہے، تو کیا اس سے یہ استدلال کیا
جا سکتا ہے کہ اس سنہ میں اس شہر کا وجود تھا، دراصل عالم آرای عباسی ۱۰۲۶ھ کے بعد لکھی گئی اور اس وقت شہر کا

فرشتہ کے بیان سے حیدرآباد کے نام پر استدلال غلط ہے ۔

● **چوتھا** بیان عبدالباقی نہاوندی کا ہے، ۱۰۲۶ھ میں وہ اپنی مشہور تالیف مآثر رحیمی میں لکھتا ہے :

"محمد قلی قطب الملک بھاگ متی نام کی ایک عورت پر عاشق ہوا اس کے نام پر ایک شہر بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، سلطان نے ایک ہزار سوار اس عورت کی خدمت میں نامزد کر دیئے۔ اس کی سلطنت کے اواخر میں حیدرآباد نام کا ایک شہر امیر محمد امین کی سعی سے جس کا تعلق شہرستان اصفہان سے تھا، اور جو بادشاہ مذکور کے یہاں میر جملگی کے عہدہ پر مامور تھا، آباد ہوا، بھاگ نگر سے وہاں آیا اور اس کو دارالسلطنت قرار دیا، کہتے ہیں کہ سارے عالم میں اس طرح کا شہر نہیں۔"

اگرچہ یہ بیان طبقات اکبری کے بیان کے مطابق ہے لیکن اس میں مزید یہ بات ہے کہ بھاگ نگر حیدرآباد سے الگ کوئی شہر ہے (گو ایسا نہیں ہے) اور حیدرآباد کی تعمیر میں میر جملہ اصفہانی کی کوشش کا دخل ہے، میر جملہ کے ورود دکن کی تاریخ ۱۰۱۰ھ کے قریب ثابت ہوتی، خود میر جملہ لکھتا ہے:

چو نُہ بر بست افزوں شد بسالم   بیاید آیت دولت بعالم

روانم کرد سوی ہند اختر   بآب خضر شد کام روان تر

پس از سالیم دولت یار گردید   ز خوابم چشم دل بیدار گردید

میر جملہ کی پیدائش ۹۸۱ ہجری میں ہوئی، ۱۰۱۰ھ میں ۲۹ سال کا ہوتا ہے، اور یہی اس کے ورود ہند کی تاریخ ہوتی ہے، ۱۰۱۱ ہجری میں وہ محمد قلی کا میر جملہ مقرر ہوتا ہے، مآثر الامرا کی یہ روایت کہ وہ ۱۰۱۳ھ میں قطب شاہی دربار پہنچا ہے، درست نہیں معلوم ہوتی، بہر حال حیدرآباد کی تعمیر کی تاریخ ۱۰۱۱ ہجری کے بعد ہوگی۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ فیضی کی عرضداشت اور طبقات اکبری میں صرف بھاگ نگر کا ذکر ہے، اور تاریخ فرشتہ اور مآثر رحیمی میں بھاگ نگر اور حیدرآباد دونوں کا، اس سے یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ ۱۰۰۲ھ تک حیدرآباد کے وجود کا کوئی سوال ہی نہیں ۔

● **پانچویں** شہادت خافی خاں کی ہے، وہ منتخب اللباب میں لکھتا ہے:

"محمد قلی قطب الملک کے عہد میں (گولکنڈہ) کی کثرت آبادی اور ازدحام مردم کی وجہ سے خود سلطان کی خواہش ہوئی کہ تین چار کوس کے فاصلے پر موسی ندی کے کنارے اپنے نام پر ایک شہر آباد کرے، اسی درمیان بھاگ متی نام کی ایک طوائف جو قطب الملک کی معشوقہ تھی اور محمد قلی اس سے ایسا گرویدہ

ہوگیا تھا کہ ہزار سوار اس کے رکاب میں رہتے جن کے ساتھ وہ دربار میں آتی، اس کی خواہش پر نئے شہر کو اس کے نام سے موسوم کر دیا گیا، چند دنوں بعد بھاگ متی فوت ہوگئی، اب سلطان محمد قلی کے دل میں بھاگ نگر نام کا قبح راسخ ہوگیا تو اس کو بدل کر حیدر آباد کر دیا گیا۔"

● منعم خاں ہمدانی نے سوانح دکن تالیف ۱۱۹۷ ہجری میں منتخب اللباب والی روایت جو فرشتہ کے عین مطابق ہے اور دوسرے بیانات سے عموماً مشابہ ہے، دہرائی ہے۔

● حدیقۃ العالم (تالیف ۱۲۱۴ھ) میں تاریخ فرشتہ اور تاریخ محمد قطب شاہ کے متن یکے بعد دیگرے نقل کر دیے گئے ہیں، اگرچہ تاریخ محمد قطب شاہ میں فرشتہ کی روایت کی قولاً تردید نہیں، صرف بھاگ متی کے قصے کا ذکر نہیں، اس لیے ہم مولف حدیقہ کو بھی فرشتہ کا ہمنوا قرار دینے میں حق بجانب ہوں گے۔

● تاریخ فرخندہ (۱۲۴۵ھ) میں منشی قادر خاں بیدری نے بھاگ متی کے متعلق یہ اطلاع دی ہے:

"محمد قلی قطب شاہ شہر حیدر آباد.. در سنہ ۹۹۸ بنا کردہ آباد کرد، تا اینجا در تواریخ قطب شاہی نوشتہ شدہ اما در تواریخ فرشتہ نوشتہ کہ محمد قلی قطب شاہ در ابتدائی بر بھاگ متی نام طوائف کہ تعشق داشت بنام او نام این بلدہ بھاگ نگر نہادہ، بعد ہفدہ سال از نام آن پشیمان شدہ بنام نامی و اسم گرامی حضرت مرتضی کرم اللہ وجہہ موسوم بحیدر آباد گردانید، چنانکہ این مولف در رباعی گفتہ:

بہ نہصد و نود دگر ہشت سال   محمد قلی شاہ فرخندہ فال
بنا بلدۂ حیدر آباد کرد   جہانی چو گل دروی آباد کرد"

اس بیان سے واضح ہے کہ شہر کا نام پہلے بھاگ نگر تھا، ۱۷ سال کے بعد اس کا دوسرا نام حیدر آباد رکھا گیا۔ لیکن اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حیدر آباد کی بنیاد کی تاریخ ۹۹۸ ہے، اس حساب سے بھاگ نگر کی بنیاد ۹۹۸ — ۱۷ یعنی ۹۸۲ ہوگی۔ یہ سارے بیانات کے خلاف ہے، بھاگ نگر کی بنیاد کی تاریخ بعد کی ہے۔

● گلزار آصفی (تالیف ۱۲۵۸ھ) میں ہے:

"در عہد ابراہیم قطب شاہ، پل دریای موسی بسبب تعشق شہزادہ مرزا محمد قلی کہ بر حسن جانفزای بھاگ متی طوایف میل کلی داشت تیار گردید، حقیقت آن این کہ شہزادۂ مذکور برطبق معہود... ہموارہ بوقت شب از قلعہ محمد نگر بخانۂ طوایف مذکورہ در موضع چچلم کہ آبادہ بلدہ حیدر آباد بر زمین ہمان موضع واقعست، آمد و شدمی داشت، روزی موسم باران موافق معمول خود بوقت شب قصد نمودہ چون برسر

دریای موسی رسید، دید کہ طغیانی آب از حد زیادہ است کہ فیل قوی ہیکل ہم توانند قدم اندر و نش گذارد، فوراً در جذبۂ عشق و محبت اسپ سواری خود را بی اندیشہ در تلاطم تموج آب انداخت و بزور حفظ حقیقی بسلامت برآمد" (بحوالۂ محی الدین قادری زور، قطب شاہ ص ۸۱ - ۸۲)

شاہ عبدالقادر بیدری نے اپنے رسالے "بعض احوالات از تواریخ قطب شاہیہ (تالیف ۱۲۶۵ھ)" میں اور سید اصغر علی بلگرامی نے "مآثر دکن" میں اسی قصے کی تفصیل لکھی ہے۔ مولوی عبدالجبار ملکاپوری اپنے تذکرہ "محبوب الزمن" تالیف ۱۳۲۹ھ میں بھاگ متی کے قصے کی تفصیل اپنے ماخذ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نزشتۂ مولف قطب شاہ (مراد منشی عبدالقادر بیدری) نے لکھا کہ ابتدائے سلطنت میں بمقتضائے عالم شباب بھاگ متی طوائف پر فریفتہ و شیفتہ ہوا تھا، ہزار سوار اس کی پیشی میں ملازم کئے تھے۔ وہ روزانہ دربار میں تجمل و طمطراق کے ساتھ آمد و رفت کرتی تھی۔۔۔ حسن و جمال میں رشک زہرہ و مشتری تھی۔۔۔ فقیر مولف نے اس کی تصویر سلطان محمد قلی کے دیوان میں دیکھی، واقعی تصویر کے دیکھنے سے مورخین کی تحریر کی تصدیق ہوتی ہے۔۔۔ تاریخ نظامی قطب شاہی کے مولفین نے لکھا ہے کہ سلطان نے اپنی محبوبہ بھاگ متی کی فرمائش سے گول کنڈہ سے چار کوس کے فاصلے پر موسی ندی کے کنارے ایک شہر آباد کیا اور اس کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کا نام بھاگ نگر رکھا، محبوبہ جب تک زندہ رہی بھاگ نگر بھی زندہ رہا، جب وہ فوت ہو گئی علما و فضلا کی نصیحت سے اس نام کے رکھنے سے پشیمان و شرمندہ ہوا، منسوخ کرکے حیدرآباد نام رکھا۔۔۔ مگر خلائق میں بھاگ نگر ہی رہا نہ حیدرآباد، فی زمانا ہنوز تلنگے و کنڑی اپنی پوتھیوں و بیاضوں میں حیدرآباد کو بھاگ نگر لکھتے ہیں۔"

ڈاکٹر زور نے بھاگ متی کے سلسلے کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے بطور نتیجہ لکھا ہے:

"بہر حال موجودہ معلومات کی بنا پر اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ محمد قلی عنفوان شباب ہی میں بھاگ متی پر عاشق ہوا اور اسی کی خاطر طغیانی رود موسی میں اپنا گھوڑا ڈال دیا، جب اس خطرناک جرأت کی خبر اس کے باپ ابراہیم قطب شاہ کو ہوئی تو اس نے ندی پر پل بنوا دیا، اس کے کچھ دن بعد ہی ابراہیم کا انتقال ہو گیا، محمد قلی نے تخت نشین ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے اعزاز و اکرام میں اضافے کی خاطر ہزار سوار اس کے یہاں متعین کر دیے جو ہر وقت اس کے جلو میں رہتے اور وہ اسی شان و شوکت کے ساتھ موضع چیچلم سے گول کنڈہ آیا کرتی تھی۔۔۔ اسی اثنا میں اس نے اپنی محبوبہ کے گاؤں کو ایک

عظیم الشان شہر میں تبدیل کرنے کی ٹھانی اور جب یہ شہر بن گیا تو اسی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھا"
(محمد قلی قطب شاہ ص ۸۳)

ڈاکٹر زور صاحب پھر لکھتے ہیں:

" بھاگ نگر یا حیدرآباد کی بنا کے متعلق بھی محمد قلی کے موجودہ کلام سے بہت کم علم حاصل ہوتا ہے خاص کر بھاگ نگر کا تو محمد قلی قطب شاہ نے کہیں نام بھی نہیں لیا... اس موقع پر یہ امر واضح کر دینا ضروری ہے کہ ماہ نامہ کے مصنف نے بھاگ متی کے قصے کو غلط بتا کر یہ لکھا ہے کہ اصل میں محمد قلی قطب شاہ کی والدہ کا نام بھاگ رتی تھا اور اس نے اسی کے نام پر شہر بھاگ نگر آباد کیا، اس اختلاف رائے کا تصفیہ اسی وقت ہو سکے گا جب چندا اور قطب شاہی تاریخیں دستیاب ہوں گی اور محمد قلی کا مکمل کلام مل جائے گا۔ بحالت موجودہ اتنا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ماں ہو یا محبوب، بھاگ رتی ہو یا بھاگ متی محمد قلی نے اپنی محبت کی یادگار کے طور پر بھاگ نگر کو بسایا تھا۔" (ایضاً ص ۱۰۰)

" ماہ نامہ" حاجی غلام حسین خاں کی مرتبہ کتاب ہے جو ماہ لقا بائی چندا کی ہدایت پر مکمل ہوئی۔ اس میں سوانح دکن کے مولف خواجہ منعم خاں ہمدانی کی یہ روایت کہ بھاگ متی ایک طوائف تھی اور محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ نگر اس کے نام سے آباد کرایا، غلط ٹھیرائی ہے، اس کا خیال ہے کہ بھاگ نگر محمد قلی کی ماں بھاگیرتی کے نام پر آباد ہوا تھا۔

شروانی صاحب کی تردید میں

پروفیسر ہارون خاں شروانی صاحب نے " بھاگ متی کا افسانہ" کے عنوان سے ۱۸ صفحے کا ایک رسالہ مع ۶ صفحے کے دو ضمیموں کے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک طرف تو بھاگ متی کے قصے کو جعلی بتایا گیا ہے اور دوسری طرف حیدرآباد کے قدیم نام بھاگ نگر کی صحت سے انکار کیا گیا ہے۔ شروانی صاحب کا خیال ہے کہ محمد قاسم فرشتہ نے محض زیب داستان کے لیے یہ قصہ گڑھ لیا ہے اور بعد کے مورخوں نے اس پر خاطر خواہ اضافہ کر کے ایک دلچسپ رومانی داستان تیار کر لی ہے۔ ان کے استدلال حسب ذیل ہیں:

(۱) فرشتہ نے حیدرآباد کی آبادکاری کے ۱۸ سال بعد تک (یعنی تا ۱۰۱۸ھ) کے واقعات درج کئے ہیں، اسکے علاوہ کسی ہم عصر تاریخ میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف اشارہ نہیں۔ برہان مآثر ۱۰۰۳ھ میں تکمیل کو پہنچی، اسکے مصنف علی بن عزیز طباطبا نے گولکنڈہ اور حیدرآباد

کے حالات نہایت شرح وبسط کے ساتھ درج کئے ہیں، لیکن اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کا ذکر نہیں۔ اسی طرح گول کنڈہ کی شاید سب سے مستند تاریخ "تاریخ محمد قطب شاہ" (۱۰۲۵) میں حیدرآباد کی بنیاد اور وہاں کی عمارتوں کا مفصّل ذکر ہے، اس میں بھاگ متی یا بھاگ نگر کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ اسی طرح تاریخ "حدیقۃ السلاطین" (۱۰۵۴) بھی بھاگ نگر کے تذکرے سے خالی ہے اور "حدائق السلاطین" (۱۰۹۲) میں حیدرآباد کے متعلق یہ لکھا ہے:

"شہر حیدرآباد کہ مسکن ارباب علم و ملاذ و مامن اصحاب رشد و ارشاد است از مستحدثات آن والا نژاد است کہ در سنہ ہزار و چہار طرح انداختہ کلمہ سعید آباد بہشت بنیاد بتاریخ موافق افتادہ"

رفیع الدین شیرازی نے بھی لکھا ہے کہ گول کنڈہ سے دو فرسخ کے فاصلے پر نیا شہر آباد ہوا تھا، شہر کیا تھا "گویا تمام شہر یک باغ است"

اس سلسلے میں میری معروضات یہ ہیں:

(الف) بعض تاریخوں کی خاموشی سے ایسے واقعے کا انکار جو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ متعدد تاریخوں اور تذکروں میں پایا جاتا ہو، عموماً قابلِ قبول نہیں۔

(ب) شروانی صاحب کے بعض بیان تصحیح طلب ہیں، انھوں نے برہان مآثر کی تاریخ تالیف ۱۰۳۸ھ لکھی ہے، حالانکہ وہ ۱۰۰۰ ہجری میں لکھی جانی شروع ہوئی اور ۱۰۰۳ھ میں مکمل ہوئی۔ مطبوعہ نسخے کے اردو دیباچے میں ہے:

"تاریخ برہان مآثر برہان نظام شاہ کی فرمائش سے (مولف نے) لکھی، سن تالیف ...۱ھ برہان کے اعداد سے برآمد ہوتا ہے" (ص ۱)

خود مولف نے مقدمہ میں لکھا ہے:

"چون این نسخہ ہمایون بنام ہمایون حضرت خاقان زمان... مرقوم می شود، اورا ببرہان مآثر موسوم ساخت و از نوادر اتفاقات اسم مذکور بلسان عدد از تاریخ سال مبدا این مسطور ایضاح می کند" (ص ۱۰)

خاتمے کی عبارت ملاحظہ ہو:

"و این واقعہ در ۱۲۔ رجب ۹۹۹ھ روی نمود، چون احوال فرخندہ مآل صاحب قران دریا نوال و وقائعی کہ از مبداء طلوع آفتاب بی زوالش از برج ولادت تا حال بوقوع انجامیدہ زیادہ از

آنست کہ این مجلد را مجال گنجائی آن باشد ناچار خامہ بدائع نگار در تحریر آن دفتر علیحدہ خواہد پرداخت" ص ۵۹۲)۔

لیکن بعد میں ۱۰۰۵ھ میں مولف نے احمد نگر کی فتوحات (بوسیلہ خان خانان) پر ایک باب کا اضافہ کر دیا جو ۵۹۳-۶۳۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

دراصل ہارون شروانی صاحب کو ۱۰۳۸ سال تصنیف قرار دینے میں قلمی نسخے کی تاریخ کتابت سے غلط فہمی پیدا ہوئی، ترقیمہ ملاحظہ ہو:

"تمت ہذا الکتاب بعون الملک الوہاب علی ید الفقیر الحقیر المحتاج الی رحمت الملک الغنی ابو طالب ابن سید علی طبا طبا الحسنی بتاریخ ۵ شنبہ بیست و دوم شہر محرم الحرام ۱۰۳۸"

۱۰۳۸ نسخے کی تاریخ کتابت ہے۔ اس نسخے کے پہلے ۵۹۲ صفحات خود مولف کتاب یعنی علی ابن عزیز اللہ کے قلم کے ہیں۔ ان کی کتابت کی تاریخ ۱۰۰۳ھ ہے۔ یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"وقع الفراغ من تالیفہ وتسویدہ فی لیلۃ الاحدی رابع عشر من شہر المبارک المسمی بہ ربیع الاول من شہور سنہ ثلث والف من الہجرۃ النبویہ ... علی ید العبد المذنب المفتقر الی رحمۃ اللہ الولی علی بن عزیز اللہ الطبا طبائی الحسنی ..."

شروانی صاحب کا یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ برہان مآثر میں گولکنڈہ اور حیدرآباد کے حالات شرح وبسط کے ساتھ درج ہیں، دراصل یہ بہمنی اور نظام شاہیوں کی تاریخ ہے اور اس کے مندرجات یہ ہیں:

طبقۂ اول سلاطین گلبرگہ از علاء الدین حسن تا فیروز شاہ بہمنی، طبقۂ دوم سلاطین بیدر از احمد شاہ بہمنی تا محمود شاہ بہمنی، طبقۂ سوم سلاطین احمد نگر از سلاطین احمد شاہ بحری تا ۹۹۹ھ، ضمیمہ (بغیر عنوان) از جملہ مغلیہ تا ۱۰۰۵ھ

اس تاریخ میں عادل شاہی اور قطب شاہی حکمرانوں کا ذکر ضمناً آگیا ہے، محمد قلی قطب شاہ کا حال اس عنوان کے تحت آیا ہے:

"ذکر فوت پادشاہ معدلت دستگاہ ابراہیم قطب شاہ و جلوس مہر سپہر سلطنت و بختیاری قطب فلک حشمت و کامگاری محمد قلی قطب شاہ بر سریر سلطنت و جہانداری"

اس کے ضمن میں جلوس سلطنت اور محاصرہ نلدرگ کا ذکر ہوا ۹۹۰ھ میں واقع ہوا اور اسی وقت

مولف برہان مآثر بھی عراق سے گولکنڈہ پہنچا تھا) کسی قدر تفصیلی ذکر ملتا ہے، اس کے علاوہ اور کسی جگہ نہیں۔ اس بنا پر بھاگ نگر یا حیدرآباد کی تلاش اس کتاب میں بے سود ہے۔ مجھے مطبوعہ کتاب میں نہ حیدرآباد کا ذکر ملا اور نہ بھاگ نگر کا۔ بہرحال اس کی خاموشی کی داستان ذرا طویل ہو گئی، لیکن قارئین اندازہ کریں گے کہ اس کے مولف کے یہاں اس شہر کا ذکر ممکن ہی نہ تھا۔

تاریخ محمد قطب شاہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں، لیکن حیدرآباد کی تعمیر کی تاریخ یعنی ۱۰۰۰ھ مجھے اس کتاب کے رو ٹوگراف میں کہیں نظر نہیں آئی، ثانیاً چونکہ یہ تاریخ ۱۰۲۵ھ میں لکھی گئی اور اس میں بھاگ نگر کے بجائے شہر کا نام حیدرآباد ہی ہوگا اس لیے کہ اس وقت بھاگ نگر نام کی تاریخی حیثیت ہو چکی ہوگی، بس اس آخرالذکر نام کی غیر حاضری سے اس کے عدم وجود کا استدلال زیادہ قوی نہیں۔ یہی بات حدیقۃ السلاطین اور حدایق السلاطین کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ آخرالذکر میں حیدرآباد کی آبادکاری کی تاریخ ۱۰۰۴ھ لکھی اور یہی تاریخ "حیدرآباد بہشت بنیاد" کے اعداد سے بھی نکلتی ہے۔

(۲) شروانی صاحب کا دوسرا استدلال یہ ہے کہ خود محمد قلی قطب شاہ نے ۱۲ پیاروں کا ذکر کیا ہے، ان میں بھاگ متی نام موجود نہیں، اسی طرح بھاگ نگر کا ذکر اس کے یہاں نہیں جبکہ حیدرآباد کا نام تین بار آیا ہے۔ یہ استدلال قوی ہے لیکن کسی اور مضبوط قرینہ کی عدم موجودگی کی بنا پر یہ قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

(۳) شروانی صاحب کا تیسرا استدلال یہ ہے کہ شمالی ہندوستان کے مورخین کا بیان اعتماد کے قابل نہیں

> (۱) "خافی خاں جس کا ماخذ صرف فرشتہ ہو جو سلطان کی محبوبہ کا نام کبھی بھاگ رتی اور کبھی بھاگ متی اور محمد قطب شاہ کو محمد قلی کا بیٹا بتاتا ہو اس کا قول کیوں کر قابل استناد ہوگا" (ملخصاً)

—— بھاگ رتی اور بھاگ متی اختلاف نسخ ہیں، ان کو کتابت کی غلطی پر محمول کیا جا سکتا ہے، مصنف کی غلطی پر نہیں، محمد قطب شاہ محمد قلی کا بھتیجا تھا، بیٹا نہیں، خافی خاں کا بیان یقیناً غلط ہے، لیکن اس غلط بیان سے بھاگ متی والے واقعے کی تردید کیوں کر ہو گئی، کسی ایک مؤلف کے کسی سلسلۂ واقعات کے ایک بیان کے غلط ہونے سے اس کے سارے بیان غلط نہیں قرار دیے جا سکتے، ہر بیان کی صحت و تکذیب کے لیے الگ الگ پیمانے ہوں گے، ایک پیمانے سے سب کو نہیں ناپا جا سکتا۔

(ب) شروانی صاحب مزید فرماتے ہیں:

"طبقات اکبری کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ اس کا مؤلف محمد قلی کے طویل اور شاندار عہد کو صرف ایک فقرے میں ختم کر دیتا ہے: محمد علی (کذا) قطب الملک بن ابراہیم قائم مقام پدر شد دربا تری بھاگ متی نام عاشق شدہ ... قطب شاہی خاندان خصوصاً محمد علی قطب شاہ کی توہین و تذلیل میں وہ فرشتہ سے کہیں بڑھ جاتا ہے ... نظام الدین کو تو بادشاہ کا ٹھیک نام بھی معلوم نہیں (قلی کے بجائے علی) شاہی تو درکنار اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ سلطان ۹۸۸ھ میں تخت پر بیٹھا تھا نہ کہ ۹۹۳ھ میں، تعصب سے بھرے ہوئے ایسے بیان کو تاریخی واقعات کی بنیاد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔"

شروانی صاحب کا بیان منطقی ربط سے خالی نظر آتا ہے، فرماتے ہیں نظام الدین (صاحب طبقات اکبری)، بادشاہ کی تذلیل کرتا ہے، وجہ تذلیل یہ کہ اس نے بھاگ متی کے قصے کا ذکر کر دیا، اسی وجہ سے شروانی صاحب اس کے تعصب سے بھرے ہوئے قول کی تائید نہیں کر سکتے، اگر اس واقعہ کی تصدیق ہو جائے کہ بھاگ متی کا قصہ صحیح ہے تو نہ وجہ تذلیل باقی رہے اور نہ بیان تعصب سے بھرا ہوا رہے۔ یہ طرز استدلال واقعہ کی توثیق یا تکذیب کے سلسلے میں منفی ہے اور اسی بنا پر قابل ترک، اس پر ثبوت کی ضرورت تھی کہ واقعہ غلط ہے اور اس کا پیش کرنے والا متعصب۔

رہا بادشاہ کے نام کے ٹھیک نہ جاننے اور ۱۰۰۲ھ میں اس کی مدت حکومت کے غلط لکھنے کا سوال، تو اس میں پہلی بات تو مطلق قابل توجہ نہیں، وہ فرماتے ہیں کہ نظام الدین اس کا نام "محمد قلی" کے بجائے "محمد علی" لکھتا ہے، دراصل بات ایسی نہیں، طبقات اکبری ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخے میں ہر جگہ اس کا نام محمد قلی ملتا ہے، یہی نام اس کے انگریزی ترجمے میں بھی پایا جاتا ہے، اگر کسی نسخے میں ایک جگہ محمد علی مل گیا تو اس کو مصنف کے سر منڈھنے کا کوئی ادنیٰ جواز نہیں، یہ چھاپے یا کتابت کی غلطی ہے، مصنف کی غلطی اور کاتب کی غلطی میں فرق کرنا ضروری ہے، ورنہ ایسی تحقیق جس میں کاتب کی غلطیاں مصنف کی بتائی جائیں، قابل توجہ نہیں ہو گی۔ دور کیوں جائیے، برہان مآثر میں بھی ایک جگہ محمد قلی کے بجائے محمد علی ملتا ہے، کیا اس کی بنا پر مؤلف برہان پر یہ ایراد ہو سکتا ہے کہ وہ سلطان کے نام سے واقف نہیں؟ برہان مآثر کی عبارت یہ ہے:

"وکالتگاری محمد رسول اللہ المؤید من عند اللہ ابوالمظفر محمد علی قطب شاہ الخ (ص ۷)

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ۱۰۰۲ھ میں محمد قلی کی حکومت کو ۱۴ سال ہو چکے تھے، مگر مطبوعہ نسخے میں ۹ سال درج ہے، بظاہر یہ مصنف کی غلطی ہے، لیکن اس غلطی سے یہ استدلال نہ ہوگا کہ نظام الدین مؤلف طبقات اکبری سلطان محمد قلی کے ذلیل کرنے میں فرشتہ سے آگے بڑھ گیا ہے۔

(ج) انشائے فیضی کے بارے میں شروانی صاحب کا خیال درست نہیں:

"انشائے فیضی کے آصفیہ کے قدیم نسخے میں محمد قلی کا ذکر نہیں ملتا، البتہ سالار جنگ کے جدید اور معمولی نسخے میں یہ اطلاع ملتی ہے: احمد قلی قطب الملک تشیع دارد و مامورہ (کذا) ساختہ و عمارات را پرداختہ بھاگ نگر بنام بھاگ متی فاحشہ کہنہ و معشوق قدیم دوست ... محمد قلی قطب شاہ کے متعلق جو دو فقرے ہیں وہ طنز سے بھرے ہوئے ہیں، تشیع دارد۔ فاحشہ کہنہ۔ معشوق قدیم وغیرہ۔ خط کا لب لباب یہ ہے کہ اکبر کے دکن میں آنے کی دیر ہے۔ یہ خط آصفیہ کے قدیم نسخہ میں نہیں ملتا اور تا وقتیکہ اس کی اصل پتا نہ لگے اس پر حجت کیسے مبنی ہو سکتی ہے۔"

دراصل جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے فیضی شوال ۹۹۹ ہجری میں خاندیش اور احمد نگر کی سفارت پر گیا اور وہاں سے ۱۰۰۱ ہجری کے وسط میں ایک عرضداشت لکھی اس میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر ہے، یہ عرضداشت اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے اکثر سیاسی و علمی و ثقافتی واقعات پر مشتمل دستاویز ہے اور ہندوستان کے دور وسطیٰ کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، انشائے فیضی کے متعدد نسخوں میں یہ عرضداشت منقول ہے، ادھر ڈاکٹر ارشد نے اس کو مرتب کر کے مجلس ترقی ادب لاہور سے ۱۹۷۳ء میں شائع کر دیا ہے، اس میں پانچ لطیفے ہیں:

لطیفۂ اول: چھ عرضداشت پر مبنی ہے جو اکبر بادشاہ کو لکھی گئی ہیں، انھیں میں دوسری عرضداشت میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر موجود ہے، اس کا اردو ترجمہ شروع میں دیا جا چکا ہے، اصل فارسی یہ ہے:

۱۔ اس کتاب میں حیدرآباد کا نام موجود نہیں اور موجود ہوتا کیوں کر اس لیے کہ فیضی کی وفات ۱۰۰۲ھ میں ہو گئی اور اس وقت تک حیدرآباد وجود میں نہیں آیا تھا، مطبوعہ انشائے فیضی کی فہرست میں حیدرآباد ملتا ہے لیکن وہ مقدمہ یا حاشیہ میں مرتب کی طرف سے اضافہ ہے، اصل متن میں نہیں۔

در محمد قلی قطب الملک تشیع دارد و معمورۂ ساختہ و عمارات پرداختہ بھاگ نگر نام او بنام بھاگ متی کہ فاحشۂ کہنہ و معشوقۂ قدیم او ست، بنا کردہ (ص ۱۰۷)۔

ان چہ عرضداشتوں میں سب سے طویل عرضداشت یہی ہے جو ص ۹۷ تا ۱۴۵ پھیلی ہوئی ہے، یہ عرضداشت دربار اکبری میں چھپ چکی ہے اور ص ۲۹ تا ۴۱ تک حاوی ہے، مولانا شبلی شعر العجم ج ۳ میں اس کے ضروری اقتباسات مع اس کی اہمیت کے ص ۳۹ تا ۴۲ درج کر چکے ہیں، ان کے علاوہ علامہ آزاد بلگرامی نے سرو آزاد میں فیضی کی سفارت اور عرضداشت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

شیخ فیضی وقتے کہ از درگاہ اکبری بہ سفارت برہان شاہ والی احمد نگر مامور شد، در عریضۂ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ می نویسد کہ در احمد نگر دو شاعر خاکی نہاد و صوفی مشرب اند و در شعر رتبۂ عالی دارند الخ (ص ۳۲)

دوبارہ پھر لکھا ہے:

شیخ فیضی در عریضۂ خود از احمد نگر بہ اکبر پادشاہ بر می نگارد کہ مولانا ظہوری نقل کرد کہ روزے در باغ یکی از شرفاے کہ معظم مجمعی بود اقسام مردم بر کنار حوض نشستہ صحبتے داشتند الخ (ص ۳۶)

یہ دونوں اقتباس انشای فیضی مطبوعہ لاہور کے ص ۱۲۵ اور ۱۲۷ پر موجود ہیں۔

ان تفصیلات سے یہ بات مسلم ہو گئی کہ فیضی نے احمد نگر سے جو عرضداشت اکبر کی خدمت میں بھیجی تھی اس میں یہ اطلاع تھی کہ محمد قلی قطب شاہ کی محبوبہ بھاگ متی اور ان کے نام پر بھاگ نگر آباد کیا گیا تھا، یہ اطلاع جو ایک سفیر اپنے بادشاہ کے پاس بھیجتا ہے دوسرے ذرائع سے حاصل کی ہوئی اطلاع سے زیادہ اہم ہوتی ہے، شیروانی صاحب تاریخ کے تقاضے سے پوری طرح واقف تھے، اس لیے اس واقعے کی اہمیت کا جتنا ان کو احساس ہوگا ہم سب کو نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر ان کا اصرار یہ تھا کہ دراصل عرضداشت میں محمد قلی قطب شاہ کا ذکر ہی نہیں تھا، اب جبکہ وثوق سے معلوم ہے کہ اس میں وہ واقعہ شامل ہے، اگر ان تک یہ اطلاع پہنچ جاتی تو یقیناً وہ اپنے بیان پر اصرار نہ کرتے۔

یہ بات تو احمد نگر کی عرضداشت کی نسبت سے تھی، شمالی ہندوستان کے مورخوں پر جو اعتراض ہوئے ہیں وہ بھی بڑی حد تک بے بنیاد ہیں، اس وجہ سے شیروانی صاحب کا فیصلہ قابل قبول نہیں۔ فیضی اور

نظام الدین بخشی کے بیان کی بنیاد پر بھاگ متی اور بھاگ نگر کے واقعے ناقابل رد ہیں۔

(۴) شروانی صاحب فرماتے ہیں کہ فرشتہ اور دوسرے دکنی مورخین کے بیانات بے بنیاد ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام کہانی فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ، مؤلف تاریخ فرشتہ) کے ذہن رسا کا ایک کرشمہ ہے، اسے اصلی یا فرضی جنسی کیفیات کے بیان کرنے میں بڑا لطف آتا ہے، دکن کی تاریخ میں اس نے اس فن میں کمال ہی پیدا کر دیا ہے۔ اس نے فیروز شاہ بہمنی کی جنسی کارگزاریاں دکھانے میں جو انتہا کی ہے اس کا ثانی ملنا ناممکن ہے، اسے باغ نگر کا لفظ ملا، اس سے اس نے بھاگ نگر نکالا، جب اس کو احساس ہوا کہ بھاگ نگر بغیر بھاگ متی کے لطف سے خالی ہوگا تو اس نے نہ صرف بھاگ متی کی تخلیق کی بلکہ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے ایک ہزار سوار بھی اس کے جلو میں رکھ دیے، فرشتہ کے زمانے سے لیکر مغل تاریخوں کی قلم بندی تک کوئی جانتا بھی نہ تھا کہ بھاگ متی کون تھی یا کہاں تھی؟ جب مغل آئے تو انھوں نے یہ دیکھ کر کہیں ایک بازاری عورت کا ذکر ہے اور اس کے نام پر ایک شہر بھی آباد کیا گیا ہے تو انھوں نے قطب الملک کے نام کو نیچا دکھانے کے لیے اس کے ماتھے پر ایک اور کلنک کا ٹیکا لگانے کی کوشش کی، اس کوشش کو غلام حسین کے ہاتھوں زک پہنچی مگر یہ زک نہایت کمزور ثابت ہوئی اور فاحشہ بھاگ متی کے رومان میں جو لطف تھا اسے انیسویں صدی اور اسکے بعد کے مورخین نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔" (ص-۱۶۰)

اس بیان کی بنیاد ان چار چیزوں پر ہے:۔

۱۔ فرشتہ کو جنسی کیفیت کے بیان میں بڑا لطف آتا ہے، اس لیے اس نے بھاگ متی کے قصے کی تخلیق کی۔ اس نے باغ نگر سے بھاگ نگر کر لیا۔

۲۔ مغل مورخین نے اس قصے پر بڑی عمارت تیار کی۔

۳۔ بعد کے دکھنی مورخین نے اس پر اور بھی اضافہ کیا۔

۴۔ ماہ نامے کے مؤلف نے اس کی تردید کی مگر وہ زیادہ اثر انداز نہ ہوئی۔

اس سلسلے میں میری معروضات یہ ہیں:

بھاگ متی کے گڑھنے کا الزام محمد قاسم فرشتہ پر لگایا گیا ہے، اس کی تاریخ ۱۰۱۷ ہجری میں لکھی

گئی۔ اور اس سے ۱۶ سال قبل فیضی بھاگ متی اور بھاگ نگر کا ذکر کر چکا ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ فیضی کا بیان
ایک معاصر کا بیان ہے، وہ ہر طرح کے شک و شبہ سے پاک ہے، تو بیچارے فرشتہ پر جس نے ۱۶ سال بعد یہ
بات لکھی ہے، یہ الزام کیوں کر عائد ہوتا ہے، فرشتہ پر مزید جنسی کیفیات کے خواہ مخواہ بیان سے لذت
اندوزی کا بہتان غلط ہے، یہ تو فیضی کے بیان کی صورت رہی، نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری جس میں بھاگ متی
اور بھاگ نگر کا واقعہ مذکور ہے، فرشتہ سے ۱۵ سال قبل کی تالیف ہے، یہ مزید اس بات کی مظہر ہے کہ فرشتہ
پر بھاگ متی کے قصے تراشی کا الزام بیجا ہے۔

باغ نگر سے بھاگ نگر کی تبدیلی کا الزام بھی بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اول باغ نگر رفیع الدین شیرازی
تذکرۃ الملوک میں درج ہے، جو فرشتہ سے مقدم نہیں، دوم یہ کہ رفیع الدین نے شہر کا نام باغ نگر نہیں لکھا بلکہ
کہ گویا تمام شہر یک باغ است، سوم جب فیضی ۱۶ سال قبل اور نظام الدین ۱۵ سال قبل بھاگ نگر نام
لکھتے ہیں اور اس کو بھاگ متی کی طرف منسوب کرتے ہیں تو باغ نگر محض افسانہ تراشی ہے، اور کچھ نہیں۔

فرشتہ پر ایک الزام یہ ہے کہ اس نے بھاگ متی کے جلو میں ایک ہزار سوار کھڑے کر دیے، یہی بیان نظام الدین
بخشی ۱۵ سال قبل دے چکا ہے، بیچارہ فرشتہ بے گناہ ہے۔

شیرانی صاحب کے دوسرے اور تیسرے اعتراض بھی بے حقیقت ہیں، بھاگ متی اور بھاگ نگر
کے وجود کے بارے میں جب شبہ نہیں تو نہ مغل مورخین قابل الزام اور نہ دکھنی مورخین، ممکن ہے جزئیات میں
مبالغہ سے کام لیا گیا ہو، لیکن اصل بات تو اپنی جگہ باقی ہی ہے۔

ماثر نامہ میں بھاگ متی کے عشق کی داستان فرضی بتائی گئی ہے، مگر چونکہ وہ اس واقعہ کے سوا دو سال
بعد کی تاریخ ہے اس لیے تواتر کے ساتھ مرقوم واقعہ کی تردید اس کے بیان سے نہیں ہو سکتی، لطف کی بات یہ ہے
ماثر نامے میں بھاگ نگر کے وجود سے انکار نہیں بلکہ اس کی نسبت بھاگ متی کے بجائے بھاگ رتی کے نام پر جو
محمد قلی کی ماں تھی، بتائی ہے۔

شیرانی صاحب نے حیدرآباد کے وجود کے سلسلے میں ۱۰۱۲ ہجری کا ایک سکہ پیش کیا ہے جس پر
اس شہر کا نام درج ہے، یہ سکہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ یہ شہر ۱۰۱۲ ہجری میں وجود میں آچکا تھا لیکن
اس سے اس نظریہ کی تردید نہیں ہوتی کہ اس تاریخ سے قبل بھاگ نگر شہر بھاگ متی کے نام پر آباد ہو چکا تھا

۵۔ یورپی سیاحوں نے باغ نگر لکھا ہے جو رفیع الدین کے بیان پر مبنی ہے۔

شروانی صاحب نے یورپی سیاحوں کے جو اقتباسات دئے ہیں ان میں برنیر اور تھیونو کے یہاں BAGNAGAR ہے، لیکن ٹیورنیر کے یہاں BAGNAGAR کی تشریح GARDEN OF NAGAR ہے، جو یقیناً غلط ترجمہ ہے، دراصل اس کا منشا CITY OF GARDEN ہوگا، ان سیاحوں کے یہاں کا فقرہ باغ نگر اضافت مستوی نہیں مقلوب ہے، شروانی صاحب کا قیاس ہے کہ ان کے بیانات کی بنیاد رفیع الدین شیرازی کا وہ جملہ ہے جس میں لکھا ہے کہ تمام شہر باغ ہے، وہاں نہ باغ نگر کا فقرہ ہے اور نہ یہ کہ شہر کا نام باغ نگر ہے، بہرحال فیضی کے بیان کی روشنی میں بھاگ نگر یا بھاگ متی کے وجود پر شک نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ شروانی صاحب کے نزدیک محمد قلی قطب شاہ کی کم عمری کا عشق مشتبہ ہے، ان کا خیال ہے کہ اگر فرشتہ کی داستان پر اعتماد کیا جاتا ہے تو ایک عجیب صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کے بقول تخت نشینی کے وقت محمد قلی قطب شاہ کی عمر ۱۴ سال کے بجائے ۱۲ سال کی تھی، پرانا پل ابراہیم قطب شاہ کی وفات سے ۲ سال قبل ۹۸۶ھ میں مکمل ہوا، اور اگر اس کی تعمیر میں دو تین سال لگے ہوں تو معاشقے کی ابتدا میں محمد قلی قطب شاہ کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔

______ کسی اور معاملے میں فرشتہ کا قول جب قابل تسلیم نہیں تو محمد قلی کی عمر ہی کے معاملے میں اس کے بیان کو اتنی اہمیت کیوں دی جائے جب کہ ہمیں معلوم ہے کہ تاریخ محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ ہجری میں وفات کے وقت سلطان محمد قلی کی عمر ۴۹ سال کی تھی! اس اعتبار سے پیدائش کی تاریخ ۹۷۱ھ ہوئی، پس ۹۸۶ ہجری میں پل بننے کے وقت شاہزادہ ۱۵ سال کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ ۱۴ سال کے لڑکے کا عشق بعید از قیاس نہیں، اگر اتنی کم عمر کا عشق قابل قبول نہیں تو ۱۶-۱۷ سال کی عمر کی شادی کیوں کر تسلیم کی جا سکتی ہے۔ محمد قلی کے بہنوئی ابراہیم قلی کی شادی شاہ میر کی لڑکی سے ۹۹۱ھ میں ہوئی، اس وقت محمد قلی کی عمر ۲۰ سال سے کم رہی ہوگی، لڑکی کی عمر یقیناً کافی کم رہی ہوگی، اور یہ بھی قابل ذکر بات ہے کہ یہ لڑکی کی دوسری شادی تھی، اس کی پہلی شادی اس کے بڑے بھائی شاہ قلی سے ہو چکی تھی۔ خلاصۂ گفتگو یہ کہ ۷-۸ سال کی عمر میں تعشق کی روایت زیادہ وزن نہیں رکھتی۔

میری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ فیضی کے واضح بیان کے بعد بھاگ متی اور بھاگ نگر کے واقعہ کی

صداقت ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک ہو جاتی ہے ۔ یہ سرکاری بیان نہایت مصدقہ ہے جو ایک سفیر کے قلم سے اس کے آقا کی خدمت میں پیش ہوا تھا اور اس بیان کو جب طبقات اکبری کے بیان سے ملاتے ہیں تو یہ بات سطے ہو جاتی ہے کہ ۱۰۰۲ ہجری تک نئے شہر کا نام بھاگ نگر ہی تھا ۔ فرشتہ، عبدالباقی نہاوندی مؤلف مآثر رحیمی اور خافی خان مؤلف منتخب اللباب وغیرہ مورخین کے بیان سے صاف طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ بعد میں بھاگ نگر حیدرآباد کہلایا ۔ یہ تاریخی حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ۔ البتہ یہ چیز جانچنے کی ہے کہ نام کی یہ تبدیلی یعنی بھاگ نگر سے حیدرآباد کب عمل میں آئی، شیروانی نے ۱۰۱۲ ہجری کا سکہ پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس تاریخ میں شہر حیدرآباد کہلاتا تھا ۔ بخوبی امکان ہے کہ اس تاریخ سے قبل ہی یہ تبدیلی وجود میں آ چکی ہو، اگر مآثر رحیمی کی یہ روایت تسلیم کر لی جائے کہ حیدرآباد نام تجویز ہونے میں مرزا محمد امین میر جملہ شہرستانی کو دخل تھا تو ۱۰۱۰ھ کے قبل یہ نام وجود میں نہ آیا ہوگا اس لیے کہ میر جملہ اسی سال دربار قطب شاہی میں باریاب ہوا تھا اور ایک سال بعد میر جملہ مقرر ہوا ۔ قرین قیاس یہی ہے کہ میر جملگی کے بعد یعنی ۱۰۱۱ اور ۱۰۱۲ کے درمیان بھاگ نگر کا نام حیدرآباد تجویز ہوا ہوگا ۔ بھاگ متی اور بھاگ نگر کے سلسلے میں شیروانی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل توجہ نہیں ۔

■■

(یہ مقالہ خدابخش لائبریری میں پڑھا گیا)

ضمیمہ — ۱

ڈاکٹر ظہیر نجم الدین علی خاں
حیدرآباد

قصۂ بھاگ متی

حیدرآباد میں جناب احمد خان صاحب درویش بیان فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھاگ متی کے خاندان والوں سے ملاقات کی ہے۔ وہ مسلم ہیں ان لوگوں کے بیان کے مطابق بھاگ متی بھی مسلمان ہو گئی تھی۔ مختلف وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یہ لوگ اپنے آپ کو چھپاتے رہے۔ یہ لوگ نسلاً راجپوت تھے نقل مقام کر کے گولکنڈہ آگئے تھے اور موضع چچلم میں رہا کرتے تھے

درویش صاحب کے بیان کے مطابق انھوں نے ان لوگوں کے پاس ایک تانبے کی تختی دیکھی ہے جس پر بھاگ متی کے باپ، ماں اور بہن کے نام درج ہیں۔ ان لوگوں کا پتہ بتانے سے درویش صاحب تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔

بھاگ متی رقاصہ تھی یا محبوبہ تھی اس کے متعلق صحت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن یاقوت پورہ بڑا بازار کے قریب املی بن کے مشرق میں ایک مقام کیوڑہ بن کہلاتا تھا۔ جہاں نالا بہتا تھا اور کیوڑے کے درخت بکثرت تھے۔ اس کے بیچ میں ایک مقبرہ تھا۔ یہاں سانپ بہت زیادہ پائے جاتے تھے اس لیے اُدھر کا سارا علاقہ ویران گیا تھا۔

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب شکیب کے بیان کے مطابق یہی مقبرہ بھاگ متی کا ہے۔ دلیل میں موضع کا نام، اس کی دیواروں اور کمانوں کی قطب شاہی بناوٹ کو وہ بیان فرمایا کرتے تھے انھوں نے "گولکنڈہ اور ایران کے سیاسی تعلقات" پر کام کیا ہے۔ موصوف کے مقالے کی تیاری کے وقت راقم الحروف نے ان کے پاس ایک زیراکس کاغذ دیکھا تھا جس پر ایک مہر کا نشان تھا اور تحریر تھا

قاضی عساکر دبھاگ نگر

قاضی ظہیر الدین

یہ وہی قاضی صاحب ہیں جن کو عبداللہ قطب شاہ نے محل کی بیگمات کے ہمراہ ایران روانہ کیا تھا۔

ڈاکٹر حمیرہ جلیلی نے قطب شاہی دور کی مثنوی کے چند اقتباسات حاصل کیے ہیں جس میں بھاگ متی کا ذکر موجود ہے لیکن پھر بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ بھاگ متی کی حیثیت کیا تھی۔

بھاگ نگر کے متعلق قاضی صاحب کی مہر جہاں بھاگ نگر ہونے کا یقین دلاتی ہے وہیں مقام و محل بھی بیان کرتی ہے۔ فوج کو جب باہر بھیجنا ہوتا اس وقت اس کو ایک جگہ جمع کیا جاتا تھا یہ مقام چچلم سے لگا ہوا چار مینار سے مشرق کی جانب چار کیلو میٹر کے فاصلے پر ہے جہاں اب درگاہ برہنہ شاہ دیگر قبرستانیں اور بستیاں قائم ہیں بہت ممکن ہے بھاگ نگر بھی اسی چھاونی سے ملحق کوئی موضع رہا ہو۔

Prof. H. K. SHERWANI

(HISTORY OF MEDIEVAL DECCAN)

VOLUME I pp. 457 59

Appendix

THE BHĀGMATĪ LEGEND

The problem connected with a *demi-mondaine*, Bhāgmati, supposed to have been a favourite of Muḥammad-Qulī Quṭb Shāh, has been under discussion almost ever since the Sulṭān's reign, and while some of our chronicles are wholly silent about her, others set her on the pinnacle of the Sulṭān's amours, liken her to the most prominent personages of the reign, and aver that the new capital was originally named Bhāgnagar after her. Before examining the problem it would be well to state the story as it appears in some of our chronicles :—

(1) The name of the woman as well as of the city supposed to be named after her appears for the first time in a petition sent by Faiẓī, the Imperial Resident at Burhānpūr and Ahmadnagar, some time between 1590 and 1594, the period when he was in the Deccan. He says sneeringly that "Quṭbu'l-Mulk" was "steeped in Shī'ism." He calls Bhāgmati "an old prostitute" and mistress of "Aḥmad-Qulī" (*sic.*), and says that he built a city Bhāgnagar after the old whore (*fahishā-i kuhnā*).[1]

(2) About the same time Niẓāmu'd-dīn wrote his *Tabaqāt-i Akbar Shāhī*, in which he has just a few lines for Muhammad-Qulī (whom he incidentally calls Muḥammad 'Alī). In these lines he recounts the love of the Sulṭān to a "prostitute" Bhagmasi (*sic.*) and the founding of a city, Bhāgnagar after her.

(3) Writing in 1018/1609-10, Ferishta also calls the woman "*fahisha*" or whore, and says that she was attended by one thousand horsemen whenever she went to Golkonda. "The Sulṭān called his new capital Bhāgnagar at first but later changed it to Hydarabad."

(4) 'Abdu'l-Bāqī's *Ma'āthir-i Rahīmī*, completed in 1025/1616, and Khāfī Khān's *Muntakhabu'l-Lubāb*, say in so many words that they have relied on Ferishta for the history of the Deccan.

Let us now subject these narratives to a close examination. The originator of the story, Faiẓī, never set his foot beyond Ahmadnagar, and all that he mentions in his despatch is based on just hearsay. He has an inherent dislike for the rulers of the Deccan whom he never mentions with royal titles. The solitary sentence in which Muḥammad-Qulī is named is full of sneers and abuses. The Sulṭān's qualities of head and heart are ignored, and just one aspect of his character brought out, *i.e.*, his liaison with a *fahisha-i Kuhnā* ("old whore"), who incidentally does not appear among his seventeen amours who have been honoured in his odes.[2]

---

1. See *Waqi'at-i Shaikh Faiẓī.*, *E & D*, VI, p. 147; *Tab*, 444; *Fer*, II, 173.
2. It is interesting to note that according to *E & D*, VII, 147 "Faizī cannot be considered a historian, so a memoir of his life would be out of place in this work.....All these letters (of Faizī to the Emperor) were translated by Lieut. Pritchard, and it is to be regretted that they were not more worthy of the task."

The author of the *Tabaqāt-i Akbar Shāhī* was the first to gloss over the story by adding the episode of a thousand horsemen. Coming to Ferishta, it is surprising that the only portion of his monumental work, the *Gulshan-i Ibrāhīmī* about which he is diffident, is that describing the history of Tilang, and he makes clear his own shortcomings so far as that history is concerned. It is no wonder that he has made serious mistakes in the few pages he has devoted to it. Thus he does not give the correct date of the Sulṭān's accession. He makes the envoy of the Shāh of Persia wait for the acceptance of the proposal of the marriage of the Shāh's son with Ḥayāt Bakhshī Bēgam, although she was married to the Sulṭān's nephew in the envoy's presence, and finally he is so keen on the Bhāgmatī story that he calls the capital Bhāgnagar in 1018/1609-10 although we have a number of coins struck at the *Hydarabad* mint as early as 1012/1603-4, and he himself makes the Quṭb Shāhī army fly to *Hydarabad* after the battle of Sōnpat in 1005/1596-7.

Historical appraisal

We now come to the objective evidence regarding the story. The semi-official chronicle, the only near contemporary chronicle written in Hydarabad, *Tārīkh Muḥammad Quṭb Shāh*, completed in 1026/1616, does not have even a passing reference to Bhāgmatī or Bhāgnagar.[1] Some years later, in 1054/1644, Niẓāmu'd-dīn Aḥmad Ṣa'idī wrote *Hadīqatu's-Salāṭīn* which also gives a fairly full description of the new capital and calls it "Ḥaidarābād" all along. About half a century later 'Alī b. Ṭaifūr Busṭāmī wrote *Hadā'iqu's-Salāṭīn* in which a short history of the founding of the city is related, but there is no mention of Bhāgmatī or Bhāgnagar.[2]

Then we have the direct evidence against the story in the Sulṭān's *Kulliyāt*. It contains odes to his seventeen mistresses ranging from one to five, but there is not one in honour of Bhāgmatī who is supposed to be the most favoured of all. There is not an iota of evidence to support the proposition that Bhāgmatī became Ḥaidar Maḥal "after her marriage with the Sulṭān," or that any grave of the woman exists in the royal necropolis at Golkonda.[3] In the same way the new capital is mentioned three times in the *Kulliyāt* and not once is it called Bhāgnagar.[4] An orthodox Shī'ah that the Sulṭān was, and with a Shī'ah divine like Mīr Mu'min, the architect of Ḥaidarābād, by his elbow, it was only fitting that the new capital be named after Ḥaidar, the second name of 'Alī.

1. *QS*, 249-53.
2. *Ḥadā'iq*, MSS. Sālār Jung, Tārīkh Fārsī, 216, fol. 116 b.
3. Not merely that; Bhāgmatī is also said to be the same person as Mushtarī, the Princess of Bengal, in Wajhī's romance! See Zor: *Muḥammad-Qulī Quṭb Shāh*, Introduction, pp. 85-7. The assertion that Bhāgmatī's grave is in the mausoleum of *Kulthūm Bēgam* is not correct; see *EIM*, 1915-16, p. 34.
4. The epithets used are " My City " " City of Ḥaidar " and " Ḥaidarnagar. "

Numismatic evidence also points to the same direction. As has been mentioned above, we have coins struck in 992/1584 at Golkonda and others struck in 1012/1603-4 at "Dāru's-Salṭanat Ḥaidarābād;" but there is no coin which was minted at "Bhāgnagar."

Revival of the Legend

The legend was as good as dead about the end of the Quṭb Shāhī dynasty, but, perhaps in order to spite the Quṭb Shāhīs it was revived during the early Āṣaf Jāhī period. No sooner did it occupy the stage than it was refuted in Ghulām Ḥusain Khān's *Māhnāma*, compiled in 1225/1810. As time passed people began to take interest in the erotic rather than the quasi-historical part of the story, and a sneering sentence of Faiẓī grew into a paragraph, the paragraph into a section and the section into chapters! The mythical Bhāgmatī was created afresh at the end of the eighteenth century and became a tradition with little historical evidence to support her.[1]

The Solution

We have, however, to remember that European travellers who came to Hydarabad about this time speak both of Bhāgnagar and Hydarabad, but, except for Tavernier, they do not give the derivation of the name. Bernier, who was twice in the capital, mentions "Bhāgnagar" twice; Thevenot, who was here in 1666, gives the capital both the names Hydarabad and Bhāgnagar, the former being the "official name" and the latter the name used by "the common people." It is Tavernier who gives the clue to the derivation of the name and says that:

> "Bagnagar was founded by the grandfather of the present King ('Abdu'l-lāh). Here the King had very fine gardens...Bagnagar or the Garden of Nagar."[2]

Tavernier thus asserts that the name Bāgnagar stands for the City of Gardens or Bāghnagar, because the new capital was replete with gardens and groves. In a way he repeats what Rafī'u'd-dīn Shīrāzī had said sixty years previously, that

> "The whole city was just one large garden,"[3]

Bāghnagar became Bhāgnagar at the hands of the sarcastic who chafed at the name, or the romantic who were reminded of the mythical demi-mundane Bhāgmatī.

---

1. We must remember that there is no mention of Bhāgmatī or Bhāgnagar in any of the contemporary Telugu works.
2. Bernier, *op. cit.*, 65, 67; Thevenot, *op. cit.*, 131, 137, Tavernier, *op. cit.*, 132.
3. *Tadhkira*, fol. 61 b.

ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ
شعبہ لسانیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

شمالی ہند میں اردو زبان کا آغاز اور ابتدائی ارتقا

(اب تک دستیاب متون کے حوالوں سے)

(۱)

اردو کے آغاز وارتقا پر گفتگو کرنے سے قبل میں دو باتیں نہایت واضح الفاظ میں عرض کر دینا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ اردو کی پیدائش کے ذمہ دار نہ تو مسلمان فاتحین ہیں اور نہ یہ کوئی کھچڑی زبان ہے۔ ان دونوں باتوں کی وضاحت میں اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اکثر یہ کہا جاتا کہ اردو مسلم حکمرانوں کی بنائی ہوئی زبان ہے، نیز یہ مختلف زبانوں کا مرکب ہے۔ یہ دونوں باتیں اردو کی لسانی تاریخ کو مسخ کر دیتی ہیں، اس لیے ان کی تردید ابتدائے گفتگو ہی میں ضروری سمجھی گئی۔

اردو کی پیدائش ذمہ دار اگر مسلمان فاتحین ہوتے تو انھوں نے اپنے عروج واقبال کے زمانے میں جن جن ملکوں کو فتح کیا تھا وہاں کی زبان آج اردو ہوتی۔ مسلمانوں نے ترکی، ایران اور اسپین فتح کیا، چین اور روس گئے، انڈونیشیا، ملیشیا اور بنگلہ دیش میں وہ آج اکثریت میں ہیں اور وہاں ان کی اپنی حکومتیں قائم ہیں، لیکن ان تمام ملکوں میں اردو نام کی کوئی شے وجود میں نہیں آئی۔ لہٰذا ہندوستان میں اردو کی پیدائش کا ذمہ دار مسلمانوں کو کیونکر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو کی پیدائش کے حقیقی ذمہ دراصل اس دور کے شمالی ہند کے وہ مقامی باشندے ہیں جن میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ان مقامی باشندوں میں کچھ نو مسلم بھی تھے۔ مسلمان جب فاتح کی حیثیت سے یہاں آئے تو انھوں نے دھیرے دھیرے یہاں کی مقامی بولیوں کی اہمیت کو سمجھا۔ ان کا نام "ہندی" اور "ہندوی" تجویز کیا، اور پھر ایک مدت کے بعد انھیں سیکھنے بھی لگے۔ دھیرے دھیرے اس میں ادب پیدا ہونے لگا اور اسے ایک شستہ وشائستہ اور مہذب زبان کا مرتبہ حاصل ہو گیا۔

دوسری بات جس سے مجھے اتفاق نہیں وہ بعض عالموں کا یہ بیان ہے کہ اردو ایک کھچڑی زبان ہے۔ اردو کو جو لوگ ایک کھچڑی زبان تصور کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ گویا چڑیا لائی دال کا دانہ،

چیڈا لایا چاول کا دانہ اور دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔ اگر اردو کو چند فیصد عربی، فارسی الفاظ کی شمولیت کی وجہ سے کھچڑی زبان کہا جا سکتا ہے تو دنیا کی کون سی ایسی زبان ہے جو کھچڑی نہیں۔ تامل تلگو اور کنڑ میں سنسکرت کے بے شمار الفاظ شامل ہیں۔ انگریزی میں یونانی، لاطینی، فرانسیسی اور جرمنی زبانوں کے الفاظ کافی تعداد میں ملے ہوئے ہیں۔ فارسی اور ترکی نے عربی زبان سے بے شمار الفاظ مستعار لیے ہیں تو کیا یہ زبانیں کھچڑی کہی جائیں گی۔ ظاہر ہے اس کا جواب نفی میں ہوگا یعنی یہ کھچڑی زبانیں نہیں کہی جائیں گی۔ یہ دونوں باتیں جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے آگے کی گفتگو میں اور واضح ہوتی جائیں گی۔

اب اصل موضوع پر غور کرنے کیلئے میں تین سوالات زیر بحث لاؤں گا:

(۱) اردو کب پیدا ہوئی۔ (۲) اردو کہاں پیدا ہوئی، اور (۳) اردو کیسے پیدا ہوئی۔

لیکن ان سوالات پر غور کرنے سے پہلے آیئے ذرا ہند آریائی کی تاریخ پر غور کر لیں۔ جس سے اردو زبان کا براہ راست تعلق ہے۔

(۲)

ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ دنیا میں تقریباً سات ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض زبانیں آپس میں مماثلت رکھتی ہیں اور بعض زبانیں دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جن زبانوں میں مماثلت پائی جاتی ہے انھیں زبان کے عالموں نے ایک لسانی گروہ میں رکھا ہے، جسے لسانی خاندان (LANGUAGE FAMILY) کہتے ہیں۔ اس طرح دنیا میں بولی جانے والی زبانوں کو کئی لسانی خاندانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سب سے بڑا لسانی خاندان ہندیورپی (INDO-EUROPEAN) کہلاتا ہے۔ اس خاندان السنہ میں ہندوستان، پاکستان، ایران افغانستان اور یورپی ممالک کی بیشتر زبانیں شامل ہیں۔ یہ زبانیں تاریخی اور لسانیاتی اعتبار سے آپس میں باہم رشتہ ہیں۔ ہندیورپی لسانی خاندان کی گیارہ شاخیں یا ذیلی خاندان ہیں جن میں ہند آریائی جس کا تعلق ہندوستان میں بولی جانے والی زبانوں سے ہے، ایک نہایت اہم اور ممتاز شاخ ہے۔

ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی تاریخ ۱۵۰۰ قبل مسیح تسلیم کی گئی ہے۔ یہ آریوں کی ہندوستان میں آمد کی تاریخ ہے۔ ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ارتقا کا سہرا انھیں آریوں کے سر ہے جو وسط ایشیا میں اپنا وطن ترک کر کے ایران و افغانستان کا سفر طے کرتے ہوئے ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ہندوستان کے شمال مغربی خطے میں نمودار ہوتے ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں بھی تبدیلی واقع ہوتی گئی

اوران کے قیام ہندوستان کے دوران دھیرے دھیرے ایک ایسی زبان پروان چڑھنے لگی جسے سنسکرت کا نام دیا گیا سنسکرت کا ارتقا پورے شمالی ہندوستان میں ایک ہزار سال یعنی ۱۵۰۰ قبل مسیح سے لیکر ۵۰۰ قبل مسیح تک جاری رہا۔ یہ دور ہند آریائی زبان کے ارتقا کا قدیم دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں جیسے جیسے آریوں کا اقتدار شمال مغربی خطے سے وسطی خطے اور پھر مشرقی خطے کی طرف بڑھتا گیا، ان کی زبان میں بھی مغائرت پیدا ہوتی گئی چنانچہ علاقائی خصوصیات کی بنیاد پر آریوں کی زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اُدیچیہ جو شمال مغربی خطے کی بولی تھی آریوں کی معیاری بولی کہی جاتی تھی۔ پراچیہ مشرقی خطے میں رائج تھی لیکن معیاری بولی سے کافی مختلف تھی اور غیر معیاری خیال کی جاتی تھی۔ ادیچیہ اور پراچیہ کے بیچ کی بولی مدھیہ دیش کہی جاتی تھی جو نہ معیاری تھی اور نہ غیر معیاری۔ مدھیہ دیش کا علاقہ دہلی نواحِ دہلی اور مغربی یوپی کا علاقہ تھا۔

۵۰۰ قبل مسیح تک پہنچتے پہنچتے سنسکرت زبان نے جمود کا شکار ہو کر دم توڑ دیا، کیوں کہ اس کا استعمال اعلیٰ ادبی اور مذہبی مقاصد کے لیے ہونے لگا تھا۔ اور یہ ایک مخصوص طبقے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ علاوہ ازیں پاننی جیسے قواعد نویسوں نے اسے قواعد کی زنجیروں میں جکڑ کر ایک نامانوس زبان بنا دیا تھا۔ چنانچہ عوام سے اس کا رشتہ منقطع ہوتا گیا۔ عوام کی بول چال کی زبان اگرچہ سنسکرت کی ہی بدلی ہوئی شکل تھی۔ لیکن یہ تلفظ کے لحاظ سے آسان اور صرف ونحو اور قواعد کے اعتبار سے ایک سادہ و سہل زبان تھی۔ آگے چل کر اس زبان کو مصنوعی زبان سنسکرت کے مقابلے میں فطری زبان یعنی "پراکرت" کہا گیا۔ پراکرت کے اولین نمونے پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانیں ہیں۔ یہ کتبے مشرق میں بنگال اور بہار سے لیکر مغرب میں سندھ تک پائے گئے ہیں۔ انھیں کتبوں سے ہندوستان میں تحریر کا ارتقا ہوتا ہے، ورنہ اس سے پہلے یہاں لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے پراکرتوں نے بھی ادبی شکل اختیار کرنا شروع کر دی اور عوام سے ان کا رشتہ ٹوٹتا گیا چنانچہ قدیم ہند آریائی دور میں شمالی ہندوستان میں مغرب تا مشرق جہاں جہاں ادیچیہ، پراچیہ اور مدھیہ دیشہ بولیاں رائج تھیں وہاں اس دور میں آکر پانچ ادبی پراکرتیں رائج ہو گئیں جن کے نام ہیں: "شمالی مغربی پراکرت، مہاراشٹری پراکرت، شورسینی پراکرت، ماگدھی پراکرت اور اردھ ماگدھی پراکرت۔

ان میں شورسینی پراکرت کا علاقہ وہی ہے جو قدیم ہند آریائی دور میں مدھیہ دیشہ کا تھا یعنی دہلی اور نواح دہلی کا علاقہ پراکرتوں نے جب ادبی اور معیاری روپ اختیار کر لیا تو عوام کی زبان اس کا ساتھ نہ دے سکی۔ لسانی تبدیلیوں کے زیر اثر عوام کی زبان ادبی پراکرتوں سے اس حد تک مختلف ہو گئی یا یوں کہنا چاہیے کہ بگڑ گئی کہ اسے "بھرشٹ"

یعنی مسخ شدہ زبان کہا جانے لگا۔ بعد میں اس کا نام اپ بھرنش پڑ گیا۔ پراکرتوں کا ارتقا ۵۰۰ قبل مسیح تا ۶۰۰ سنہ عیسوی یعنی تقریباً گیارہ سو سال تک جاری رہا۔ ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کا یہ دور وسطی ہند آریائی دور کہلاتا ہے۔

مغرب تا مشرق پورے شمالی ہندوستان میں جہاں جہاں پراکرتیں رائج تھیں وہاں اپ بھرنشیں بولی جانے لگیں، مثلاً ماگدھی پراکرت کی جگہ ماگدھی اپ بھرنش نے لے لی۔ اردھ ماگدھی اور شورسینی پراکرتوں کی جگہ اردھ ماگدھی اور شورسینی اپ بھرنشوں نے لے لی۔ اور اسی طرح دوسری پراکرتوں نے بھی اپ بھرنش کیلئے جگہ خالی کر دی یہ اپ بھرنشیں شمالی ہندوستان میں پورے چار سو سال یعنی ۶۰۰ سنہ عیسوی سے لیکر ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک رائج رہیں۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی تک پہنچتے پہنچتے شمالی ہند کی زبانوں میں ایک بار پھر تبدیلی رونما ہوئی اور یہ تبدیلی جدید ہند آریائی زبانوں کے آغاز و ابتدا کا سبب بنی۔ اس موقع پر مسلمان فاتحین شمالی ہند میں داخل ہوتے ہیں۔ ہند آریائی زبانوں کے عالم اور مشہور ماہر لسانیات سُنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ اس موقع پر اگر مسلمان شمالی ہند میں داخل نہ ہوئے ہوتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا عمل میں آتا۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی میں اپ بھرنشوں کے خاتمے کے بعد شمالی ہند میں چھوٹی چھوٹی بولیوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ شورسینی اپ بھرنش کے بطن سے دہلی اور نواحِ دہلی کے علاقوں میں کئی چھوٹی چھوٹی بولیاں پیدا ہوئیں۔ شروع میں ان میں آپس میں زیادہ فرق نہیں تھا لیکن دھیرے دھیرے یہ فرق بڑھتا گیا۔ اس وقت تک ان بولیوں کا کوئی نام بھی نہیں پڑا تھا۔ مسلمانوں نے جب شمالی ہندوستان کو فتح کیا تو ان تمام بولیوں کو جو شورسینی اپ بھرنش سے ماخوذ تھیں، ہندی اور ہندوی کا نام دیا۔ جارج گریرسن نے جب ہندوستانی زبانوں کا لسانیاتی جائزہ پیش کیا تو مسلم حکمرانوں کی تقلید میں ان بولیوں کو ہندی کہا۔ لیکن لسانیاتی خصوصیات کی بنیاد پر اس کی دو شکلیں متعین کیں۔ ایک کا نام مغربی ہندی رکھا اور دوسری کا مشرقی ہندی۔ مغربی ہندی میں اس نے دہلی اور نواحِ دہلی کی پانچ بولیوں کو شامل کیا، یعنی کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا، بندیلی اور قنوجی مشرقی ہندی میں اس نے جن بولیوں کو شامل کیا ان کے نام ہیں: "اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی"۔ جس طرح ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے آس پاس شورسینی اپ بھرنش کی کوکھ سے یہ بولیاں جنم لے رہی تھیں اُسی طرح بہار اور مشرقی یوپی کے علاقوں میں اردھ ماگدھی اپ بھرنش سے بھوجپوری، میتھلی اور مگہی بولیاں پیدا ہو رہی تھیں۔

(۳)

مغربی ہندی کی پانچ بولیاں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، اپنی لسانیاتی خصوصیات کی بنیاد پر دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں: "بولی (۱) آ (ā) کی آواز پر ختم ہونے والی بولیاں اور دوسری (۲) او (o) کی آواز پر ختم ہونے والی بولیاں

کھڑی بولی اور ہریانی کا تعلق آ د ۃ) پر ختم ہونے والی بولیوں سے ہے، مثلاً اسما جیسے گھوڑا، لڑکا صفات جیسے اچھا، بُرا۔ ضمائر جیسے میرا، تیرا، اور افعال جیسے آیا، گیا وغیرہ آ د ہ) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس برج بھاشا اور مغربی ہندی کی باقی ماندہ بولیوں میں اسما، صفات، ضمائر اور افعال آ د ہ) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً گھوڑا کے بجائے گھوڑو، لڑکا کے بجائے لڑکو۔ اسی طرح اچھو، بُرو، میرو، تیرو، آیو، گیو وغیرہ۔ کھڑی بولی کا یہ جملہ : "میرا گھوڑا مار گیا" برج بھاشا میں یوں ادا کیا جائے گا: "میرو گھوڑو مار گیو"۔ یا ساون آیا کو ساون آیو کہیں گے۔

اردو نے اپنے ارتقا کے کسی بھی مرحلے میں او (ہ) کی آواز پر ختم ہونے والے اسما، صفات اور افعال اختیار نہیں کیے اور اس معاملے میں ہمیشہ کھڑی بولی کا تتبع کیا۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ جدید ہند آریائی زبانوں کا ارتقا ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے بعد سے ہوتا ہے۔ اردو بھی چونکہ ایک جدید آریائی زبان ہے اس لیے اس کے ابھار کا زمانہ بھی یہی ہے۔ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی سے لیکر ۱۲۰۰ سنہ عیسوی تک شمالی ہند میں ہمیں جو مواد دستیاب ہوتا ہے اس میں اردو کے قدیم ترین روپ کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو کی واضح شکل ہمیں ۱۲۰۰ عیسوی کے بعد سے دکھائی دیتی ہے اور یہیں سے اردو کے اصل نمونے بھی ہمیں دستیاب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ زبان کے ماہرین اردو کے باقاعدہ آغاز کی تاریخ ۱۲۰۰ سنہ عیسوی تسلیم کرتے ہیں، مثلاً پروفیسر مسعود حسین خاں نے اُردو کے آغاز کی تاریخ ۱۱۹۳ء تسلیم کی ہے۔ جو مسلمانوں کے فتح دہلی کی تاریخ ہے۔ ۱۲۰۰ سے لیکر ۱۷۰۰ تک کا زمانہ قدیم اردو دور کہا جا سکتا ہے۔ ۱۷۰۰ تا ۱۸۰۰ عیسوی کے زمانے کو ہم اردو زبان کے ارتقا کا عبوری یا وسطی دور کہہ سکتے ہیں۔ کیوں کہ اس دور میں اردو اپنی قدامت کا چولا اُتار کر لسانی ارتقا کے ایک نئے دور میں قدم رکھنے کی تیاری کرتی ہے۔ ۱۸۰۰ سے اُردو کے ارتقا کا جدید دور شروع ہوتا ہے اور فورٹ ولیم کالج کی تصانیف جدید اردو کا اوّلین نقش قرار پاتی۔

(۴)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ۱۰۰۰ سنہ عیسوی کے آس پاس شمالی ہند کی زبانوں میں تیزی کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ اپ بھرنشیں دم توڑ رہی تھیں اور ان کی جگہ چھوٹی چھوٹی بولیاں لیتی چلی جا رہی تھیں۔ اردو کا بالکل ابتدائی روپ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ عیسوی کے زمانے کو ہم پیش اُردو یعنی

(PRE-URDU PERIOD) کہہ سکتے ہیں۔ اس دور کے نمونے حسب ذیل ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں ہیم چندر شبدانوشاسن میں زبان کے ادبی نمونے ملتے ہیں۔ اُس دور کے ایک مشہور عالم ہیم چندر نے اپنی قواعد کی کتاب ہیم چندر شبدانوشاسن میں منزلی اپ بھرنش کے آخری دور کے کچھ ادبی نمونے محفوظ کر دیے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ اس دور کی زبان کس طرح اردو کے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ اس کی ایک مثال یہاں پیش ہے:

بھلا ہُوا جُ مارِیا بہنی مہارا کنتُ
لجےّ جام ت وَسّیاہُ جی بھگا گھر اَنتُ

اس نمونے میں بھلاّ، مہارا اور بھگا علی الترتیب بھلا، میرا، اور بھاگا کی قدیم شکلیں ہیں اور ہُوا کی شکل تو بالکل ہی جدید ہے۔ اس نمونے کی دوسری اہم لسانی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعمال ہونے والا فعل، ضمیر اور صفت تینوں آ (ā) کی آواز پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔

ہیم چند کے ان نمونوں کے بعد اس دور کا دوسرا اہم مواد ہمیں بدھ سدھوں، ناتھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب مذہبی تخلیقات میں ملتا ہے۔ یہ لوگ شمالی ہندوستان کے ایک بڑے حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور اپنی زبان میں مختلف بولیوں کی چاشنی رکھتے تھے۔ ان کی اس مخلوط زبان کو "سدھکڑی" زبان کہا جا سکتا ہے۔ اور اس میں اردو کے ابتدائی روپ کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

اس دور کا تیسرا نمونہ ہمیں ڈنگل اور پنگل کی شاعری میں ملتا ہے۔ راجپوتوں کی شاعری میں اس کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ "راسو" جیسی طویل رزمیہ نظمیں بھی اسی زبان میں لکھی گئیں۔ چند بردائی کی طویل رزمیہ نظم پرتھوی چند راسو کے ابتدائی حصوں میں پیش اردو کے کچھ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔

ان نمونوں کے علاوہ مسعود سعد سلمان کی ہندوی شاعری بھی پیش اردو کا ایک اچھا اور قابل قدر نمونہ فراہم کر سکتی تھی لیکن ان کا ہندوی دیوان دستیاب نہیں۔ سلمان کے ہندوی دیوان کا پتا ہمیں فارسی تذکرے "لباب الالباب" کے مصنف محمدؔ عوفی کے اس بیان سے چلتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اور اسہ دیوانست: یکے بہ تازی و یکے بہ پارسی و یکے بہ ہندوی۔"

سلمان کے ہندوی دیوان کا ذکر خسرو نے بھی کیا ہے۔

بہ حیثیت مجموعی ۱۰۰۰ تا ۱۲۰۰ عیسوی کے نمونوں میں ہمیں اردو زبان کی بہت سی لسانی خصوصیات

کا سراغ مل جاتا ہے۔

● مثلاً اردو کی دو آوازوں لے (च) اور او (औ) کا ارتقا اسی دور میں ہوتا ہے۔ یہ آوازیں سنسکرت میں پائی جاتی تھیں لیکن پراکرت اور اپ بھرنش میں متروک ہو گئی تھیں۔

● سنسکرت، پراکرت، اور اپ بھرنش میں "ڑ" اور "ڑھ" کی آواز نہیں پائی جاتی تھی۔ ان دونوں آوازوں کا ارتقا اسی دور میں ہوا۔ مثلاً لفظ گھوڑا سنسکرت میں گھوٹک تھا۔ پراکرت میں گھوڈا بنا اور اردو میں گھوڑا ہو گیا۔ اسی طرح سنسکرت میں ایک لفظ کیٹ " تھا' اس سے پراکرت میں کیڈ بنا اور اردو میں کیڑا بن گیا۔

● سنسکرت اور پراکرت غیر تحلیلی (SYNTHETIC) زبانیں تھیں۔ اپ بھرنش بھی کافی حد تک غیر تحلیلی زبان تھی لیکن بیش اردو میں غیر تحلیلی شکلیں ختم ہو گئیں اور تحلیلی (ANALYTICAL) شکلیں عام ہو گئیں۔

● ماضی مطلق بنانے کیلئے فعلی مادّے کے ساتھ "یا" کا استعمال بھی اسی دور سے ملنے لگتا ہے۔ مثلاً اس دور کی زبان میں "رہیا" "ملیا" جیسی فعلی شکلیں پائی جاتی ہیں جن کا پورا ارتقا کنی اردو میں ہوتا ہے۔

● اردو ضمائر مثلاً "میں، ہم، تم، مجھ، تجھ، وہ، میرا، جو، ان، اپنے وغیرہ کا ارتقا بھی اسی دور میں ہو چکا تھا

● کا، کی، کے حروف کی مثالیں بھی پرتھوی راج راسو اور بیسل راسو میں مل جاتی ہیں۔

● راسو میں زمانۂ حال بنانے کے لیے فعلی مادّے کے بعد "ت" کا استعمال ہوتا ہے مثلاً سُنت۔ قدیم اردو تصنیف "بکٹ کہانی" میں جو ۱۶۲۵ عیسوی سے قبل کی تصنیف ہے اس قسم کی مثالیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، مثلاً کرت، بھرت، جلت، چلت وغیرہ۔ "بکٹ کہانی" کا ایک شعر ہے جس میں یہ شکل استعمال ہوئی ہے۔

سبھی سکھیاں پیا سنگ سکھ کرت ہیں ہمن سی پاپیاں نت دکھ بھرت ہیں

"بکٹ کہانی" کے ایک اور شعر میں "جلت" اور "چلت" استعمال کیا گیا ہے۔

ہمن اک آگ غم کی میں جلت ہیں علاوہ دوسرے تو واں چلت ہیں

(۵)

...۱تا ۱۲۰۰ عیسوی کے نمونوں اور ان کی لسانی خصوصیات کے جائزے کے بعد اب ہم قدیم اردو کی طرف بڑھتے ہیں۔ قدیم اردو دور ۱۲۰۰ عیسوی سے لے کر ۱۷۰۰ عیسوی تک قائم رہتا ہے۔ اس امر کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ کچھ لوگ اردو کی تاریخ وہاں سے شروع کرتے ہیں جب سے نواحِ دہلی کی بولیوں میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش ہونا شروع ہوتی ہے۔ اور چونکہ ان کے خیال میں عربی، فارسی الفاظ مسلمان فاتحین کے ساتھ یہاں آئے ہیں اسلئے

دو کا آغاز بھی ان کے نزدیک مسلمان فاتحین کے دہلی میں آمد کے وقت سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیوں کہ
بی فارسی الفاظ یہاں کی بولیوں میں مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے سے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اردو کا ڈھول یا کینڈا بھی مسلمانوں
دہلی میں آنے سے تقریباً دو سال قبل ابتدائی اردو کی صورت میں تیار ہو چکا تھا۔ کسی زبان کی تشکیل میں قواعدی ڈھانچے یا
نے کو جو اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ مفرد الفاظ کو حاصل نہیں ہوتی۔ لہٰذا زبان کی تشکیل کیلئے پہلے اس کے قواعدی ڈھانچے
ینڈے کی تشکیل ضروری ہے۔ کسی زبان کی شناخت اس کے قواعدی ڈھانچے سے قائم ہوتی ہے۔ اگر کسی زبان کا قواعدی
ھانچا ابھی تیار نہیں ہوا ہے تو مفرد الفاظ اس زبان کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ جب مسلم فاتحین دہلی آئے تو اردو کا قواعدی
ھانچا کھڑی بولی کی بنیادوں پر تیار ہو چکا تھا۔ دھیرے دھیرے اس میں نکھار پیدا ہوتا گیا اور اس کی ترقی یافتہ شکل سامنے
تی گئی۔ پھر جیسے جیسے ضرورت پڑتی گئی عربی فارسی کے الفاظ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ سید وحید الدین سلیم کی تحقیق کے
طابق اردو میں عربی، فارسی الفاظ کا تناسب صرف ۲۲ فی صد ہے۔ باقی الفاظ یہیں کی بولیوں کے ہیں۔ یہ بھی امر واقعہ
ہے کہ قدیم اردو میں سنسکرت اور پراکرت کے تتسم اور تدبھو الفاظ کا تناسب اردو میں بہت زیادہ تھا۔ مثلاً سنسار، بالک،
سیوک، بھید، دیا، جل، کرودھ، جیون، گیان، اُپکار، پوجا، چت، آتم، نیر، مکھ، جگت، لگن، ادھر، نین، پریت،
پاپ اور اس طرح کے ہزاروں مقامی الفاظ اردو زبان کی زینت بنے ہوئے تھے۔ لہٰذا جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اردو کے
کھچڑی زبان ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ اردو کے اپنے یعنی مقامی عناصر تناسب میں کہیں زیادہ ہیں۔

قدیم اردو یعنی ۱۲۰۰ سے لیکر ۱۷۰۰ عیسوی تک کی زبان پر بحث کرتے وقت حسب ذیل نمونوں
کو سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

(۱) صوفیائے کرام کے ملفوظات (۲) تاریخ کی کتابوں اور دیگر فارسی تصانیف میں اردو کے نمونے
(۳) امیر خسرو کی شاعری (۴) نام دیو، کبیر اور گرونانک کے کلام میں اردو کے نمونے (۵) مستقل تصانیف۔

جہاں تک صوفیا کے ملفوظات کا تعلق ہے ہمیں ان کے مستند اقوال تذکروں میں مل جاتے ہیں جن سے اردو
زبان کی ابتدائی ساخت کا کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان صوفیا میں حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، شیخ حمیدالدین
ناگوری، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ شرف الدین بو علی قلندر، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری وغیرہ خاص اہمیت رکھتے
ہیں۔ اسی طرح تاریخ کی کتابوں اور دیگر فارسی تصانیف میں اردو الفاظ و محاورات اور فقرے جا بہ جا بکھرے ہوئے
اردو کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قدیم اردو کے ابتدائی عہد کے سب سے اہم شاعر خسرو تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے کلام میں الحاقی کلام کافی حد تک

شامل ہوگیا جس سے ان کے اصلی کلام کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا ہے بہرحال ان کے اردو شاعر ہونے سے کسی کو انکار نہیں۔ خسرو سے منسوب تو ایک غزل وہی ہے جس کا مصرعہ ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں

خسرو کا انتقال ۱۳۲۵ء میں ہوا۔ خسرو کے بعد ہمیں تین مختلف جگہوں کے تین ایسے شاعر ملتے ہیں جن کے یہاں کھڑی بولی کے نمونے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ یہ ہیں مہاراشٹر کے نام دیو، مشرقی یوپی کے کبیر داس اور پنجاب کے گرو نانک۔ نام دیو ۱۳۵۰ء میں، کبیر ۱۵۱۸ء میں اور گرو نانک ۱۵۳۹ء میں اس دنیا سے کوچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد سے اردو میں مستقل تصانیف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

شمالی ہندوستان کی شاعری کا سب سے پہلا مستند نمونہ "بکٹ کہانی" کے نام سے دستیاب ہوتا ہے۔ یہ ۱۶۲۵ء سے قبل کی تصنیف ہے، کیونکہ اس کا مصنف افضل ۱۶۲۵ء میں وفات پاتا ہے۔ یہ بارہ ماسہ کی شکل میں ایک طویل مثنوی ہے جس کا بنیادی لسانی ڈھانچا کھڑی بولی کا ہے۔ کہیں کہیں برج بھاشا کے اثرات بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ اس میں فارسی کے فقروں اور مصرعوں کی بھی جا بہ جا آمیزش پائی جاتی ہے۔ "بکٹ کہانی" کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

سنو سکھیو بکٹ میری کہانی　　　بھئی ہوں عشق کے غم سوں دوانی

نہ مجھ کو بھوک دن نا نیند راتا　　　برہ کے درد سوں سینہ پراتا

تمامی لوک مجھ بوری کہے ری　　　خرِد گم کردہ مجنوں ہو رہی ری

"بکٹ کہانی" کے بعد شمالی ہند کی دوسری اہم شعری تصنیف "عاشور نامہ" ہے، جس کا سنہ تصنیف ۱۶۸۸ء ہے۔ یہ شمالی ہند کا قدیم ترین شہادت نامہ ہے۔ اس کا مصنف روشن علی سہارن پور کا رہنے والا تھا۔ اس کی زبان بھی اگرچہ کھڑی بولی ہے لیکن قصباتی عنصر اس میں زیادہ ہے اور ریختہ کی خصوصیات بھی اس میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی زمانے میں دہلی کے چند شاعروں مثلاً صلاح، قربان علی اور قاسم وغیرہ نے کچھ مرثیے لکھے تھے۔ جن کا مجموعہ اب چھپ چکا ہے۔ سترہویں صدی کی آخری اہم تصنیف ایک مثنوی "وفات نامۂ بی بی فاطمہ" ہے جو اسمٰعیل امروہوی نے ۱۶۹۲ء میں قلمبند کی تھی۔ اسمٰعیل کی ایک دوسری مثنوی "معجزۂ انار" ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۷۰۸ء ہے۔ سترہویں صدی کی ایک اور اہم کتاب "خالق باری" ہے، جو ضیاالدین خسرو کی تصنیف ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ سترہویں صدی تک شمالی ہند میں اردو کی کوئی نثری تصنیف دستیاب نہیں

ہوئی۔ شمالی ہند کی نثر کی پہلی کتاب "کربل کتھا" ہے جو ۱۷۳۲/۳۳ء میں لکھی گئی۔ یہ کتاب ملّا واعظ حسین کاشفی کی فارسی تصنیف "روضۃ الشہداء" کا ترجمہ ہے جسے فضلی نے اردو میں منتقل کیا ہے۔ کتاب کو اولین نثری تصنیف کا درجہ حاصل ہے لیکن یہ بہر حال فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ شمالی ہند کی نثر کا پہلا طبع زاد نمونہ ہمیں "قصۂ مہر افروز و دلبر" میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کتاب کا مصنف عیسوی خاں بہادر ہے اور یہ کتاب ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کی زبان کافی حد تک صاف، آسان اور کئی لحاظ سے جدید ہے۔ "قصۂ مہر افروز و دلبر" کی زبان کو خسرو کے عہد کی زبانِ دہلوی کی ترقی یافتہ شکل کہا گیا ہے۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی "نو طرزِ مرصع" منظرِ عام پر آئی۔ جو فارسی قصّے "چہار درویش" کا ترجمہ ہے۔ اسکی عبارت بے حد رنگین اور مرصّع ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں ہی قرآن پاک کے اردو میں دو ترجمے ملتے ہیں۔ شاہ مولوی رفیع الدین صاحب نے ۱۷۸۸ء میں اور مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی نے ۱۷۹۰ء میں قرآن کریم کے ترجمے کیے جن کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔

نثری تصانیف کے علاوہ اٹھارویں صدی کے دوران بے مثال شعری کارنامے بھی سامنے آتے ہیں۔ جس کی ابتدا صحیح معنوں میں ولی کی دلّی میں آمد کے بعد سے ہوتی ہے۔ بیدل، آرزو، فغاں وغیرہ کے بعد آبرو، حاتم، یکرنگ، مضمون، تاجی، اور مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہ شاعری میں شہرت حاصل کرتے ہیں۔ پھر میر و سودا کا دور آتا ہے۔ ۱۸۰۰ عیسوی تک یہ دور بھی ختم ہو جاتا ہے اور ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد سے اردو زبان اپنے ارتقا کے جدید دور میں داخل ہو جاتی ہے۔

اردو کے ارتقا کے سلسلے میں یہ بات نہایت اہم ہے کہ اس کا ارتقا دلی اور نواحِ دہلی کی بولیوں کے بیچ میں ہوا ہے۔ یہ بولیاں ہیں: کھڑی بولی، ہریانی، برج بھاشا اور میواتی۔ اردو نے شروع ہی سے کھڑی بولی کا ڈھانچا اختیار کیا۔ لیکن ابتدائی دور میں اس پر ہریانی بولی کے اثرات بہت واضح ہیں۔ جب آگرہ دار السلطنت بنا تو برج کے بھی کچھ اثرات اردو میں آئے۔ پھر رفتہ رفتہ ہریانی کے اثرات زائل ہوتے گئے اور کھڑی بولی ادبی اظہار کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد نکھرتی گئی۔ اردو کا موجودہ روپ کھڑی بولی کا نکھرا ہوا اور ترقی یافتہ روپ ہے جس کے تجزیے کے بعد اردو کے ارتقا کے دوسرے تمام نظریے پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ ●●

ڈاکٹر (مسز) لئیق النساء
سینیر ریسرچ فیلو
خدابخش لائبریری، پٹنہ

گلدستہ

چہارشنبہ سیوم ماہ ربیع الثانی ۱۲۵۵ھ بمطابق ۱۸۴۲ میلادی کو عبدالوہاب عالمگیر[1] ولد سید منصور خاں نبیرہ سید دلاور خان و نواسہ غیاث الدین خاں بن جملۃ الملک اسلام خاں رضوی مشہدی نے "گلدستہ" کو مرتب کیا۔ کتاب کے شروع میں تحریر ہے کہ یہ "کعبہ عرفان" کا انتخاب ہے۔[2] "کعبہ عرفان" مشہور و معروف جامع ترین تذکرہ "عرفات العاشقین" کا انتخاب ہے۔ یہ دونوں کتابیں استادالزماں، منفردالدوراں، مفخرالشعراء، عمدۃ البلغا جامع کمالات انسانی تقی الدین محمد اوحدی اصفہانی کی تصانیف ہیں جو عہد جہانگیری (۱۰۱۴ھ - ۱۰۳۷ھ) میں آگرہ اور احمدآباد میں لکھی گئیں ان میں قدیم ترین فارسی شعراء سے لیکر عہد جہانگیر تک کے شعراء کے تراجم و کلام درج ہیں۔ انتخاب کنندہ عبدالوہاب عالمگیر نے "گلدستہ" کا آغاز اس عبارت سے کیا ہے:

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بہ نستعین مز نبہ عرفان انتخاب عرفات العارفین (عرفات العاشقین) تصنیف میر تقی الدین حسینی دقاقی بلیانی کہ بموجب حکم نورالدین محمد جہانگیر بادشاہ تذکرۃ الشعراء بقلم آوردہ ... از آں بہارستان قدری گلہای رنگین چیدہ، بگلدستہ موسوم ساخت[3]"

"عرفات العاشقین" و "کعبہ عرفان" دونوں کتابوں کے تخلیق کار کا پورا نام تقی الدین محمد بن معین الدین محمد بن سعدالدین محمد الاوحدی الحسینی الدقاقی البلیانی واصفہانی ہے جو "کعبہ عرفان"[4] کی تکمیل یعنی ۱۰۳۶ھ تک

---

1 سہواً "عالمگیری" تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ص ۸۴۳، ۸۵۵، تاریخ تذکرہ ہای فارسی ص ص ۴۱، ۴۴، ۹۴۴۔

2 "گلدستہ" کے متن کی عبارت جو صفحہ ۲ پر دی گئی ہے صاف ظاہر کرتی ہے کہ جہانگیر کے حکم سے "عرفات العاشقین" کا انتخاب بشکل "کعبہ عرفان" وجود میں آیا۔ نہ معلوم مولوی عبدالمقتدر نے یہ کیسے جان لیا کہ "عرفات العاشقین" کا انتخاب تقی الدین اوحدی نے "کعبہ عرفان" کی شکل میں اپنی مرضی سے کیا اور پھر جہانگیر کے حکم سے "کعبہ عرفان" کا انتخاب بنام "انتخاب کعبہ عرفان" کیا۔ اور زیر بحث مخطوطہ "گلدستہ" اسی "انتخاب کعبہ عرفان" کا اختصار ہے۔ رجوع کنید فہرست عربی و فارسی مخطوطات خدابخش لائبریری پٹنہ ص ص ۷، ۱۱ جلد ۸۔ اس فہرست سے استفادہ کرنے والے مورخین اور مصنفین جیسے استوری و ڈاکٹر علی رضا نقوی وغیرہ نے بھی سہواً اس نوشتہ "انتخاب کعبہ عرفان" کو ہی گلدستہ کا ماخذ سمجھا رجوع کنید- PERSIN LITERATURE A BIO-BIBILOGRAPHICAL SURVEY ص ص ۸۰۸-۸۱۱ تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ص ۱۷۴۔ ۵ ۔ "گلدستہ" میں کہیں بھی تقی اوحدی کی اس تیسری کتاب "انتخاب کعبہ عرفان" کا ذکر نہیں آیا ہے۔ صرف "کعبہ عرفان" اور "عرفات العاشقین" کے حوالے ملتے ہیں۔ ۳۔ ماخوذ از برگ ۱ (ب) "گلدستہ" قلمی نسخہ خدابخش

مدرجہ ذیل کتابیں لکھ چکا تھا۔ ان کتابوں کی فہرست "کعبہ عرفان" و "گلدستہ"[1] میں موجود ہے۔

(۱) مثنوی یعقوب و یوسف۔ (۲۲۴۲ بیت)۔ (۲) ساقی نامہ موسوم بہ نشا یخمار (۶۰۰ بیت)۔ (۳)

مئے دیدار (۳۰۰۰ بیت)۔ (۴) سفینۃ السکینہ (۶۰۰۰ بیت)۔ (۵) کعبۃ الحرمین (۴۰۰۰ بیت)۔ (۶) لوح محفوظ۔

(۷) قلم قدرت۔ (۸) تبصرۃ العارفین، دیوان قصاید (۱۰۰۰ بیت) (۹) تذکرۃ العاشقین، دیوان غزل (۹۰۰

بیت)۔ (۱۰) دیوان تراکیب و ترجیعات۔ (۱۱) دیوان مقطعات و مطائبات، اہاجی و رباعیات، اضافیہ

و اوصافیہ (۱۰۰۰ بیت)۔ "بروش نجوم از وی فال گرفتہ" (بقول مؤلف)۔ (۱۲)۔ دیوان عین الحیات (۵۰۰۰ بیت)

در ہند گفتہ شدہ" در ۱۰۲۳ھ باتمام رسیدہ"۔ (۱۳) دیوان امیر آباد در جواب اشعار امیدی (۱۴) دیوان آدمیت۔

(۱۵) دیوان غزل موسوم بہرام دستان (۱۶) دیوان جواہر زواہر (۱۷) دیوان درر و غرر کہ قصائد محض اند (۱۸)

عرفات العاشقین (۷۵۰۰۰ بیت)۔ (۱۹) کعبہ عرفان "کہ انتخاب عرفات العاشقین است"۔ (۲۰) سرمہ

سلیمانی در لغت فرس (۲۱) کافیۃ القافیہ در روش سخن (۶۰۰ بیت)۔ (۲۲) مفتاح مفاتیح و علینہ در تصوف

(بایک دیوان در قزوین از دست رفت... القصہ آنچہ فوت شدہ قریب بدہ دوازدہ ہزار کم و بیش بود) (۲۳) جفر اوحد۔

چہار شنبہ سیوم رمضان ۹۷۳ھ کو فارس کے قصبہ کازرون میں یہ عظیم مصنف و شاعر ایک معزز خاندان

میں پیدا ہوا۔[2] اس کا باپ شیخ معین الدین محمد تقی کی پیدائش سے پہلے ہی سفر ہند پر چلا گیا تھا اور اپنے اس چشم و چراغ کو دیکھنے

سے پہلے ہی وہ دکن میں انتقال کر گیا۔ تقی کے آبا و اجداد میں شیخ ابو عبداللہ و شیخ ابو علی دقاق جیسے بڑے پایہ کے بزرگ

---

[1] گلدستہ برگ ۹ الف پر مندرجہ بالا کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ کتابوں کے نام کے بعد دی ہوئی ابیات کی تعداد وغیرہ "عرفات العاشقین"

برگ ۷۶ ب، ۶۹۸ الف پر مندرج ہیں۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے تین مزید کتب کے نام "تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان" میں صفحہ

۱۵۴ پر دیئے ہیں جو یہ ہیں: (۱) "انتخاب کعبہ عرفان": یہ کتاب وجود میں آئی ہی نہیں۔ اس سے پہلے متن اور پاورقی میں اس کے بارے میں لکھا جا چکا

ہے۔ تقی اوحدی کی کتابوں کی فہرست "جو گلدستہ میں" ہے اس میں یہ کتاب شامل نہیں ہے۔ (۲) مثنوی شتر گربہ: اس کتاب کا نام بھی

"عرفات العاشقین" یا "گلدستہ" میں دی گئی فہرستوں میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر سید علی رضا نقوی نے جو ریاض الشعرا کا حوالہ دیا ہے اسس میں علی قلی والہ داغستانی

نے تقی اوحدی کے بیان میں صرف یہ لکھا ہے: "در مثنویاتش اشعار شتر گربہ بنظر رسید" برگ ۷۸ ب جلد ا نسخہ خطی خدا بخش۔ (۳) فردوس

خیال اوحدی: تقی اوحدی نے اس کتاب میں بہت سے شعرا کے کلام جمع کئے تھے۔ پھر اس میں ان شعرا کے حالات کا اضافہ کر کے اسی

کو "عرفات العاشقین" میں بدل دیا (عرفات العاشقین برگ ۱ ب جلد ا) اسی وجہ سے یہ کتاب اس نے اپنی

فہرست میں شامل نہیں کی۔ [2] سہوا "سفینۃ السفینہ" تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ص ۱۵۴۔

پیدا ہوئے۔ اس کا سلسلہ نسب زین الاولیا خواجہ حسن ماضی تک پہونچتا ہے[1]۔

بارہ سال کی عمر تک اس بچہ کی پرورش تنہا ماں نے بڑی جانفشانی کے ساتھ کی پھر وہ بھی اس وسیع و عریض دنیا میں اس کو تنہا چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کر گئی۔ بچپن ہی سے تقی بہت ذہین اور بہت زبردست حافظہ کا مالک تھا۔ آٹھ نو سال کی عمر میں ہی اس کو شعر فہمی اور شعر گوئی کا شعور پیدا ہو گیا تھا جس محفل میں جاتا لوگوں کو اپنی ذہانت سے گرویدہ بنا لیتا۔ کمسنی میں ہی اس نے تمام علوم حاصل کر لیے تھے پھر بھی اس کا علمی ذوق و شوق زندگی بھر بڑھتا ہی گیا۔ اس کو بڑے بڑے علما و فضلا کی صحبت حاصل رہی۔ اپنی ذاتی قابلیت اور ہمہ دانی کی بنا پر وہ شاہ عباس صفوی کا مقرب اور سب سے زیادہ پسندیدہ شاعر بن گیا۔ وہ کان بلاغت اور آسمان فصاحت کا اختر تاباں تھا۔ ہندوستان میں شعرا کی ہنر پروری کی کشش نے اس کو وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور وہ یکم رجب ۱۰۱۵ھ کو سفر ہند کیلئے چل پڑا۔ یہاں بھی اس کو بادشاہ جہانگیر کی قربت حاصل ہو گئی۔ ۱۰۲۲ھ میں اس نے مشہور تصنیف "عرفات العاشقین" کو لکھنا شروع کر دیا۔ جس کے بارے میں خود لکھا ہے:

"این نسخہ کہ غرہ ذی القعدہ ۱۰۲۲ھ در دارالسلطنت آگرہ مستقر نمودہ وقتیست کہ بادشاہ جہانگیر غریب نواز دوست فراز دشمن گداز خواستہ کہ نور دیدۂ خود شہزادہ خسرو را از قید اطلاق نماید و بشکار اجمیر عزم کردہ ... بندہ کہ بسبب اتمام این نسخہ شریفہ در شہر آگرہ باز ماندہ ام"[2]

۱۰۲۴ھ میں "عرفات العاشقین" مکمل ہوئی۔ اس میں ۳۴۹۵ شعرا کے تراجم و کلام حروف تہجی کے اعتبار سے درج ہیں۔ پوری کتاب میں ۲۸ عرصات ہیں اور ہر عرصہ میں تین غرفے ہیں جو بالترتیب متقدمین و متوسطین اور متاخرین شعرا کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان ادوار کا تعین کس طرح کیا گیا یہ تقی اوحدی نے کہیں واضح نہیں کیا ہے۔ متن سے پتہ چلتا ہے کہ بہرام گور و حنظلہ بادغیسی وغیرہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری کے قریب تک کے شعرا متقدمین میں رکھے گئے ہیں اور پھر اس کے بعد دسویں صدی کے نیمہ دوم کے قریب تک کے شعرا متوسطین میں ہیں۔ اس کے بعد سے ۱۰۲۴ھ

۱۔ تقی اوحدی کی زندگی کے حالات "گلدستہ" میں نہیں ہیں۔ اس میں صرف اس کے ادبی کارنامے دیئے گئے ہیں۔ البتہ اس نے اپنی پیدائش سے لے کر "عرفات العاشقین" کی تکمیل تک کے مجاہدانہ و مجردانہ زندگی کے مفصل حالات "عرفات" کے دیباچہ میں برگ ۱ (ب) تا برگ ۱۲ (الف) میں دیئے ہیں۔ اوپر دیئے گئے مختصر ترین حالات اسی دیباچہ سے ماخوذ ہیں۔ مصنفین تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان (ص ص ۱۵۱-۱۶۳) و تاریخ تذکرہ ہای فارسی ص ص ۱-۲۵۰ نے بھی اس کی زندگی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے جن کا مآخذ بھی دیباچہ "عرفات" ہے۔ ۲۔ ماخوذ از عرفات العاشقین برگ ۱۴، الف خدابخش۔

محفے تکمیل کتاب تک کے شعرا متاخرین میں رکھے گئے ہیں۔ ہندوستان میں اس کا ایک ایک خطی نسخہ پٹنہ[1] و علی گڑھ[2] اور حیدرآباد[3] کے کتب خانوں میں محفوظ ہے۔

۱۱۳۶ھ جب مصنف نے "عرفات العاشقین" کا انتخاب "کعبہ عرفان" کے نام سے کیا تو ترتیب بدل دی۔ تین رکن "خنّاق" "منّاق" اور "دیّاق" بالترتیب متقدمین، متوسطین اور متاخرین شعرا کیلئے بنائے۔ شعرا کی ترتیب وہی القبا کے اعتبار سے رکھی گئی۔ ہندوستان میں ابھی تک "کعبہ عرفان" کے کسی نسخہ کی موجودگی کا پتہ نہیں لگ پایا۔ البتہ "تاریخ تذکرہ ہائے فارسی" میں احمد گلچین معانی نے دو خطی نسخوں کی نشاندہی کی ہے جو لینڈ زیانہ (ص ۲۲۳، نمبر ۲۱۴ موسح ۲۰۲۶ ق) اور کتابخانہ فخر الدین نصیری، طہران میں موجود ہیں۔

"گلدستہ" جو "کعبہ عرفان" کا انتخاب ہے اس کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ خدا بخش پٹنہ (جلد ۱ نمبر ۲۳۴۲) میں موجود ہے۔ وہ میری نظر سے گذرا۔ عبدالوہاب عالمگیر نے "گلدستہ" میں شعرا کی وہی مذکورہ بالا ترتیب قایم رکھی جو "کعبہ عرفان" میں تقی الدین اوحدی رکھی تھی۔ تینوں ارکان یعنی "خنّاق" (متقدمین) "منّاق" (متوسطین) اور "دیّاق" (متاخرین)، حروف تہجی کے ۲۸ "عرصات" میں منقسم ہیں اور "عرفات العاشقین" کی طرح ہر شاعر کے حال و کلام کو "عرفہ" کا نام دیا گیا ہے۔ کاتب کی غلطی سے بعض جگہوں پر لفظ "عرفہ" لکھنے سے رہ گیا ہے۔ کتاب کا سائز ۱۳×۸۰ سنٹی میٹر ہے، اور صفحات پر ۱۳-۱۵ تک سطریں ہیں۔ نسخہ کو پرکشش بنانے کی خاطر کاتب نے کسی کسی صفحہ پر متن کو ترچھی سطروں میں لکھا ہے۔ خط نستعلیق ہے مگر ہلکی سی خط شکست کی آمیزش کے ساتھ حروف کی ادائیگی میں عموماً "ب" و "پ"، "ج" و "چ"، "ز" و "ژ" اور "ک" و "گ" میں فرق نہیں ہے۔ لیکن "پ" و "چ" اور "ژ" کا استعمال کہیں کہیں دیکھنے میں آجاتا ہے۔ البتہ "گ" کا استعمال بالکل نظر نہیں آیا۔ نقاط کا استعمال خوب کیا گیا ہے۔ حرف "ی" کے نیچے بھی دو نقطے (یِ) لگائے گئے ہیں۔ جب کسی لفظ میں حرف "ت" یا حرف "ق" پہلے یا بعد میں حرف "ف" یا "خ" یا حرف "ن" کے ساتھ آیا تو دونوں کے تین نقطے ملا کر بعد والے حرف پر لگائے ہیں۔ (جیسے شک بجای تنگ، لفظ بجای نقل) اسی طرح جب حرف "ی" پہلے یا بعد میں حرف "ب" یا حرف "ج" کے ساتھ آئی تو ان کے تینوں نقطے بعد والے حرف کے

۱۔ فہرست عربی و فارسی مخطوطات کتب خانہ خدا بخش پٹنہ جلد ۸ نمبر ۶۲۹، ۲۳۰-۲۲۰۔ ۲۔ فہرست حبیب گنج کلکشن مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ جلد اول حصہ دوم ش ۱۱۱۳، سہواً بنا تبصرۃ العارفین۔ ۳۔ فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد ج ۲ ص ۱۶۴ ش ۲۰۹۔ ۴۔ "پ" کو "ب" "عرصہ میں"، "چ" کو "ج" کے عرصہ میں اور "گ" کو "ک" کے عرصہ میں رکھا گیا ہے۔

نیچے کاتب نے لگائے ہیں (جیسے نقیپ بجائے نقیب، رنچیدہ بجائے رنجیدہ) تشدید (ّ) کا استعمال بھی خوب دیکھنے میں آتا ہے۔ عنادین سرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں۔ کل اوراق کی تعداد ۲۴۷ ہے۔ اوراق کا رنگ بدل کر خاکی مایل ہوگیا ہے۔ کتاب کی مرمت ہوئی ہے اور ہر ورق پر ٹمینیشن ہے۔ متن کے چاروں طرف کالی، نیلی اور شنگرفی لائینوں سے بارڈر بنا ہوا ہے۔ جن کے بیچ میں سنہرا رنگ بھرا ہوا ہے۔ حاشیہ صاف ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی باحیثیت اور باذوق ہستی نے اپنے ذاتی کتب خانہ کیلئے تیار کرایا ہوگا۔ برگ ۲۷۱ (ب) پر ایک لال رنگ کی گول سی مہر لگی ہے جس کو سمجھنا دشوار ہے۔ اوراق کے نمبر کہیں نیلی کہیں لال روشنائی اور کہیں پنسل سے ڈالے گئے ہیں جن کی ترتیب صحیح نہیں ہے۔ پورے مخطوطہ میں کاتب کا نام کہیں لکھا نظر نہ آیا اور نہ کتابت کی تاریخ کہیں درج ہے۔ مولوی مقتدر کی رائے[1] میں یہ نسخہ اٹھارویں صدی میلادی کا ہے۔ نسخہ کے شروع یا آخیر میں کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے۔

دراصل اس کتاب میں عبدالوہاب عالمگیر نے "کنز عرفان" میں درج مختلف شعرا کی رباعیات کو جمع کرکے اندران شعرا کا مختصر حال دیگر "گلدستہ" کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جن شعرا کی رباعیات کا یہ انمول خزانہ ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

خزانی (شعرای متقدمین):- (۱) شیخ ابویزید البسطامی (۲) ضیاء الدین علاء الملک ابوبکر بن احمد البخاری (۳) ابوالعمر (۴) ابوالمیامن جلال الدین محمد (۵) ابوحفص (۶) عبداللہ بخبر تاتی (۷) خواجہ ابوبکر بن نظام الملک (۸) خواجہ ابوبکر ترمذی (۹) نجیب امین ابوبکر ترمذی خطاط (۱۰) شیخ ابوبکر بجلی رازی (۱۱) ابوبکر کرمانی (۱۲) ابومحمد یمین الدین غزنوی (۱۳) ابوعلی حسن (۱۴) قاضی ابوطاہر یحیی (۱۵) سلطان علاء الدین بن اتسز خوارزم شاہ (۱۶) اثیر الدین محمد الاخسیکتی (۱۷) ابوسعید سعادت ابن مسعود سعد سلمان (۱۸) شیخ الرئیس ابوعلی (۱۹) شیخ ابوالحسن خرقانی (۲۰) شیخ ابوسعید بن عونش (۲۱) استاد ابوالفرج رونی (۲۲) شیخ احمد غزالی (۲۳) شیخ احمد النافعی الجامی (۲۴) مجد الدین احمد (۲۵) سنادالدین ارقم الفارسی (۲۶) ابوبکر ارزقی (۲۷) سعد الدین سمرقندی (۲۸) تاج الدین اسمعیل باخرزی (۲۹) حکیم شاہ نور اشہری (۳۰) اشرقی سمرقندی (۳۱) حکیم اصمی (۳۲) خواجہ افضل الدین محمد کاشی (۳۳) شیخ امین الدین بلیانی (۳۴) امامی ہروی (۳۵) حکیم اوحد الدین انوری خاوری (۳۶) شیخ ابوحامد اوحد الدین کرمانی (۳۷) شیخ اوحد الدین عبداللہ بن

۱۔ ماخوذ از فہرست عربی و فارسی مخطوطات کتب خانہ خدا بخش پٹنہ ص ۱۱۸ جلد ۸

ضیاءالدین مسعود دبلیانی (۳۸) حکیم بدیع الزماں ترکوہی (۳۹) حسن بن احمد بن بدری (۴۰) بدرالدین
حاجرمی (۴۱) خواجہ کمال الدین بندار رازی (۴۲) تاج الدین (۴۳) مولانا جلال الدین (۴۴) شیخ جمال
الدین ہانسوی (۴۵) شیخ الاسلام حارثی (۴۶) اشرف الدین حسن بن ناصر علوی (۴۷) سید حسینی (۴۸)
ابوالحرث (۴۹) حمید الدین (۵۰) حمید الدین (۵۱) حمید الدین (۵۲) عمر خیام (۵۳) شمس الدین داعی
(۵۴) عزالدین رافعی (۵۵) امام الدین ابوالقاسم رافعی (۵۶) خواجہ رشید الدین ہمدانی (۵۷) رشیق خطی
(۵۸) رضی الدین نیشاپور (۵۹) شیخ رضی الدین (۶۰) رفیع الدین الابہری (۶۱) شیخ رضای گیلانی (۶۲)
رفیع الدین کرمانی (۶۳) رفیع الدین عبدالعزیز (۶۴) رفیع الدین مروزی (۶۵) مولانا رکن الدین (۶۶)
ابوجعفر عبداللہ ابوالحسن محمد الرودکی (۶۷) شیخ روزبہان (۶۸) لطیف الدین زکی (۶۹) عبداللہ زکی
(۷۰) زین الدین (۷۱) زین الدین سنجری (۷۲) سدید الدین الاعور (۷۳) خواجہ سعد سلمان (۷۴)
شیخ سعد الدین (۷۵) سعد وراق (۷۶) سلطان ولد نقد مولانا جلال الدین محمد رومی (۷۷) سلجوق شاہ
(۷۸) سلغر (۷۹) سلطان سلیمان شاہ (۸۰) سلطان شاہ خوارزمشاہ (۸۱) حکیم ثنائی غزنوی (۸۲)
حکیم سنجری (۸۳) حکیم سوزنی (۸۴) شیخ سیف الدین (۸۵) علاءالدین سیلقی نیشاپوری (۸۶) نصرۃ الدین شاہ
کبود جامہ (۸۷) شاہ سجان (۸۸) شاہ شرف بوعلی قلندر (۸۹) شرف الدین علاءالملک (۹۰) شرف الدین محمد بن محمد
فرامی (۹۱) شرف الدین طوسی (۹۲) شرف الدین مینری (۹۳) شمس الدین (۹۴) شمس الدین -
(۹۵) شمس الدین (۹۶) شمس الدین محمد بن نصر (۹۷) شمس الدین مبارک شاہ (۹۸) شمس الدین محمد
جوینی (۹۹) ملک شمس الدین کرت (۱۰۰) شمس الدین نیازی (۱۰۱) شہاب الدین طلحہ (۱۰۲) شہاب الدین
مقتول (۱۰۳) شیخ شہاب الدین ابی حفص (۱۰۴) شیخ صدرالدین نیشاپوری (۱۰۵) خواجہ صدرالدین
خجندی (۱۰۶) شیخ صدرالدین قونوی (۱۰۷) شیخ صفی الدین (۱۰۸) شیخ صفی الدین بن اسحاق اردبیلی (۱۰۹)
ابوسنجر غزنوی صندلی (۱۱۰) ضیاءالدین محمد بن ابی نصر (۱۱۱) ضیاءالدین عمر (۱۱۲) ضیاءالدین محمد (۱۱۳) سلطان
طغرل (۱۱۴) ملک طغان شاہ بن محمد (۱۱۵) حکیم طیان الیمنی (۱۱۶) ظہیرالدین طاہر (۱۱۷) عبدالملک ابونصر (۱۱۸)
عایشہ سمرقندیہ (۱۱۹) عبداللہ (۱۲۰) سید عبداللہ بن ابی عبداللہ (۱۲۱) عبدالواسع جبلی (۱۲۲) حکیم عبدالحمید
(۱۲۳) عبداللہ بن منصور محمد انصاری (۱۲۴) خواجہ عبدالخالق غجدانی (۱۲۵) عبدالعزیز کاشانی (۱۲۶)
ابوالفضل حاجی عثمان بن احمد ہروی (۱۲۷) شیخ عزیزالدین محمد محمود کاشانی (۱۲۸) حکیم ابوالمظفر عبدالعزیز

بن منصور عسجدی (۱۲۹) عبدالرحمٰن بن محمد (۱۳۰) شیخ فریدالدین عطار (۱۳۱) علاؤالدین حسین (۱۳۲) ملک علی شاہ (۱۳۳) حکیم ابوالقاسم حسن بن احمد عنصری (۱۳۴) حکیم غزالی (۱۳۵) مسماۃ فاطمہ (۱۳۶) فریدالدین علی منجم (۱۳۷) خواجہ فریدالدین (۱۳۸) حکیم ابوالقاسم منصور فردوسی (۱۳۹) فرخی (۱۴۰) شیخ فریدالدین شکر گنج (۱۴۱) افضل الدین فضلی (۱۴۲) قابوس (۱۴۳) حکیم قطران بن منصور الاعلی عضدی (۱۴۴) شیخ قطب الدین محمد بن احمد جامی (۱۴۵) قلیج طمغاج خان (۱۴۶) قلیج ارسلان خاقان (۱۴۷) تبریزی بغدادی (۱۴۸) ملک کمال کرتہ (۱۴۹) کمال الدین اسمٰعیل (۱۵۰) کیکاؤس (۱۵۱) حکیم لولوی (۱۵۲) مجدالدین نسوی (۱۵۳) مجدالدین محمد (۱۵۴) مجدالدین محمد بلوچ (۱۵۵) مجدالدین شریف بغدادی (۱۵۶) مجیدالدین بیلقانی (۱۵۷) محمد غزالی (۱۵۸) محی الدین یحییٰ (۱۵۹) محمد ابن بدیع نسوی (۱۶۰) محمد بن محمد عوفی (۱۶۱) پہلوان محمود (۱۶۲) شیخ محمود شستری (۱۶۳) شیخ مختاری (۱۶۴) امیر فخرالدین (۱۶۵) مسعود ابن سعد سلمان (۱۶۶) سعد بن مسعود (۱۶۷) مطربہ سمرقندی (۱۶۸) مسلم الدین قوشنجی (۱۶۹) ملک شاہ بن الپ ارسلان محمد (۱۷۰) نہستی (۱۷۱) امیر ناصرالدین عثمان (۱۷۲) خواجہ ناصرالدین بن قطب الدین سرخسی (۱۷۳) شیخ نجم الدین کبریٰ (۱۷۴) شیخ نجم الدین رازی (۱۷۵) حکیم نجم الدین محمود بن الیاس (۱۷۶) شیخ نجم الدین یعقوب (۱۷۷) نجم الدین سمنانی (۱۷۸) نصیر اللہ الدنیا والدین محمد ابن حسن طوسی (۱۷۹) شیخ نظامی گنجوی (۱۸۰) نظام الدین خالد دہلوی مشہور بہ شیخ نظام الدین اولیا (۱۸۱) نظام محمد بن تاج الدین عمر (۱۸۲) نظام الدین محمد محمود قمری صفاہانی (۱۸۳) ولد شاہ (۱۸۴) ہندو شاہ (۱۸۵) یوسف بن الیاس (۱۸۶) شیخ ابویوسف ہمدانی

منّانی (شعرای متوسطین): (۱۸۷) ابن نصوح (۱۸۸) خواجہ ابوالقاسم ولد خواجہ شہاب (۱۸۹) خواجہ ابوالوفا (۱۹۰) مرزا ابوبکر بن جوگی شاہ (۱۹۱) ابواسحاق شیرازی (۱۹۲) مولانا جلال الدین ابوالخیر عاشق (۱۹۳) شیخ ابوالوجد (۱۹۴) میر ابراہیم قانونی (۱۹۵) شیخ ابوالواسع (۱۹۶) بی بی آتون (۱۹۷) سید احمد رفاعی (۱۹۸) مولانا ادہم کاشی (۱۹۹) شیخ جلال الدین آذری (۲۰۰) مولانا سہمی ہروی (۲۰۱) خواجہ افضل الدین آفاق جلایر (۲۰۲) نظام الدین امیر علی شیر (۲۰۳) امیر سلطان حسین امینی (۲۰۴) مولانا امید رازی (۲۰۵) میرزا بایسنقر بن شاہ رخ میرزا (۲۰۶) سلطان ابوالقاسم بن بایسنقر میرزا ابن شاہ رخ میرزا (۲۰۷) ظہیر الدین محمد بن عمر شیخ بن میرزا ابوسعید بن سلطان محمد بن میرانشاہ صاحبقراں

امیر تیمور گورگان (۲۰۸) بادشاہ خاتون (۲۰۹) سلطان بایزید بن محمد مظفر (۲۱۰) میر برہان الدین (۲۱۱)
بی بی پردہ (۲۱۲) خواجہ بہاء الدین نقشبند (۲۱۳) طالبی ہروی (۲۱۴) مولانا تذوری (۲۱۵) مولانا نوری
(۲۱۶) مولانا نور الدین عبد الرحمن جامی (۲۱۷) مولانا محمد جامی (۲۱۸) خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی
(۲۱۹) سید حسن (۲۲۰) سید حسن شہاب (۲۲۱) سلطان حسین مرزا بایقرا ابن عمر شیخ (۲۲۲)
مولانا حسام (۲۲۳) قاضی میر حسین (۲۲۴) مرزا حیدر گورگانی (۲۲۵) درویش حیدر (۲۲۶) میر دوری
(۲۲۷) خواجہ سیف الدین محمود رجائی (۲۲۸) مولانا رشید (۲۲۹) شرف الدین رضائی (۲۳۰) خواجہ
رکن الدین صاین (۲۳۱) شیخ زین الدین ابوبکر (۲۳۲) شیخ زین الدین خوافی (۲۳۳) خواجہ زین الدین
نسائی (۲۳۴) سراج الدین قمری (۲۳۵) خواجہ سلمان ساوجی، (۲۳۶) حافظ سیستانی (۲۳۷) مرزا شاہ
حسین صفاہانی (۲۳۸) شاہ شجاع (۲۳۹) مولانا شرف الدین علی یزدی (۲۴۰) مولانا شرف الدین
علی (۲۴۱) شکری قندری (۲۴۲) شمس الدین کرمانی (۲۴۳) شمس الدین عبد القادر (۲۴۴) شمس الدین
بدخشانی (۲۴۵) شمس الدین بخاری (۲۴۶) شہاب الدین ساوجی (۲۴۷) شیخ رباعی (۲۴۸) شیخ
زادہ بورانی، (۲۴۹) مولانا صالح بدخشانی (۲۵۰) میرزا صادق (۲۵۱) شاہ صفی الدین محمد رازی (۲۵۲)
ضعیفی سمرقندی (۲۵۳) طالب جاجرمی (۲۵۴) نادر شاہ طاہر (۲۵۵) مولانا عبد الصمد (۲۵۶) عبد اللہ
خان (۲۵۷) عسکری میرزا ابن ظہیر الدین بابر (۲۵۸) مسماۃ عصمتی (۲۵۹) میر برہان الدین عطاء اللہ شیخ
علاء الدولہ سمنانی (۲۶۰) میر سید علی ہمدانی (۲۶۱) بابا علی شاہ ابدال (۲۶۲) مولانا میر علی (۲۶۳) عماد الدین
قزوینی (۲۶۴) قاضی مسیح الدین عیسیٰ ساوجی (۲۶۵) میرزا غیور بیگ (۲۶۶) مولانا غیاث (۲۶۷) مولانا
غیاث الدین مشہدی (۲۶۸) فخری بن امیری (۲۶۹) فخری بغدادی (۲۷۰) فخری (۲۷۱) شیخ فدائی
(۲۷۲) فراہی (۲۷۳) فصیح خواجہ عبد القادر (۲۷۴) فقیہ نجاشی (۲۷۵) شاہ قاسم انوار (۲۷۶) ملک
قاسمی دیلمی (۲۷۷) میرزا قاسم جنابادی (۲۷۸) قاسم خان موجی (۲۷۹) قدسی نقاش گیلانی (۲۸۰) میرزا شیخ
محمد کامران برادر ہمایوں بادشاہ (۲۸۱) امیر خواجہ کلان (۲۸۲) کوکبی (۲۸۳) شہزادہ کیچک میرزا (۲۸۴)
مولانا لطف اللہ نیشاپوری (۲۸۵) شیخ محمود بن شیخ علی عجلانی (۲۸۶) نجم الدین محمود (۲۸۷) مولانا محمد
خراسانی (۲۸۸) خواجہ مسعود (۲۸۹) امیر سلطان مسعود (۲۹۰) مسکین کازرونی (۲۹۱) معشی (۲۹۲)
مولانا معین (۲۹۳) عز الدین محمود نقیب (۲۹۴) شیخ معنی (۲۹۵) درویش مقصود تیر گر (۲۹۶)

خواجہ ملائی کازرونی (۲۹۷) بی بی مہری جلایر (۲۹۸) مولانا امیر سبزواری (۲۹۹) میرم سیاہ (۳۰۰)
ماہر سبزواری (۳۰۱) سید نور الدین شاہ نعمت اللہ (۳۰۲) نزاری (۳۰۳) سید نسیمی (۳۰۴)
شیخ نور الدین عبد الرحمٰن اسفرائنی (۳۰۵) مولانا نیازی (۳۰۶) مولانا یوسف نیازی (۳۰۷) ولی بیگ
(۳۰۸) ہاتفی (۳۰۹) محمد ہمایوں (۳۱۰) ہندال میرزا برادر بزرگ ہمایوں (۳۱۱) مولانا ہوائی (۳۱۲) یار محمد (۳۱۳) یعقوب بن اوزن۔

دیوانی (شعرای متاخرین): (۳۱۴) ملا ابراہیم حسین، (۳۱۵) میر ابو القاسم استرابادی
(۳۱۶) میر ابو الحسن فراہانی (۳۱۷) مولانا احسنی سندی، (۳۱۸) خواجہ میرزا احمد رازی (۳۱۹) احمد
(۳۲۰) خان احمد (۳۲۱) قاضی احمد لاغری (۳۲۲) اختری (۳۲۳) اخگری لاری (۳۲۴) مولانا
آدی (۳۲۵) میر اسد اللہ متولی صفاہانی، (۳۲۶) شاہ اسمعیل بن شاہ طہماسپ (۳۲۷) میر محمد باقر
المدعو بالاشراف (۳۲۸) اشرف گیلانی (۳۲۹) اصدق ہمدانی (۳۳۰) افضل الدین ترکہ اصفہانی
(۳۳۱) مولانا آقا شیخ قزوینی (۳۳۲) جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، (۳۳۳) مولانا آگہی (۳۳۴) میر
آلہی (۳۳۵) مسیح الزمان آلہی (۳۳۶) امامی اردبیلی (۳۳۷) محمد امین نجیب (۳۳۸) امین
(۳۳۹) خواجہ محمد امین گوشہ (۳۴۰) مولانا امینی یزدی (۳۴۱) عبد الرزاق انسی (۳۴۲) حسن بیگ
انسی (۳۴۳) میر قلی انیسی (۳۴۴) مولانا آہنگ (۳۴۵) مولانا ایزدی یزدی (۳۴۶) مولانا
ایرج تبریزی (۳۴۷) مولانا ایاز منجم (۳۴۸) مولانا آیت صفاہانی (۳۴۹) بابا ملا شاہ (۳۵۰)
نور محمد باقر (۳۵۱) محمد باقر (۳۵۲) میرزا باقر (۳۵۳) محمد باقر تبریزی (۳۵۴) محمد باقر خوردہ
(۳۵۵) باقی ماوراء النہری (۳۵۶) باقی کرمانی (۳۵۷) میر بخاری (۳۵۸) قاضی بدیع الزمان (۳۵۹) مولانا بلبلی یزدی (۳۶۰) بنت سالار عقیقہ (۳۶۱) بہرام میرزا (۳۶۲) بہادر خان بن خواجگی (۳۶۳)
بہادر خان (۳۶۴) مولانا بہجت (۳۶۵) شیخ بہاء الدین عاملی (۳۶۶) مولانا بیخودی سمنانی (۳۶۷)
مولانا تجلی کاشی (۳۶۸) ترابی کرمانی (۳۶۹) تسلیم (۳۷۰) میر محمد تقی کاشی (۳۷۱) محمد تقی۔
(۳۷۲) میر محمد تقی ہمدانی (۳۷۳) تقی الدین محمد بن معین الدین محمد بن سعد الدین محمد واعظ الاوحدی الحسینی
الدقاقی البلیانی ثم الصفاہانی (۳۷۴) خواجہ حسین ثنائی (۳۷۵) میرزای جاہی (۳۷۶) میرزا جانی (۳۷۷)
مرزا جانی بیگ (۳۷۸) جذبی (۳۷۹) جری (۳۸۰) جعفر اعور (۳۸۱) میر جعفر مکتب دار (۳۸۲)
جعفر رازی (۳۸۳) میر محمد جعفر مشہدی (۳۸۴) جلال الدین حسین نیشاپوری (۳۸۵) جلیلی بیگ

تبریزی (۲۸۶) جمیلہ قیصہ (۲۸۷) ملا جمشید قصہ خوان (۲۸۸) جمیل بیگ حارثی بدخشی (۲۸۹)
میر جمال الدین کازرونی (۲۹۰) محمد شریف جم (۲۹۱) حکیم حاذق (۲۹۲) قاسم بیگ حالتی (۲۹۳)
حاکم بیگ (۲۹۴) حاتم کاشی (۲۹۵) مولانا حالی تبریزی (۲۹۶) شمس الدین حالی یزدی (۲۹۷)
مولانا حامد شستری (۲۹۸) خواجہ حبیب اللہ (۲۹۹) حرفی صفاہانی (۴۰۰) حزنی قمی (۴۰۱) جذبی تونی
(۴۰۲) حسن بیگ (۴۰۳) قاضی حسین خوانساری (۴۰۴) حسن یزدجرد (۴۰۵) میرزا محمد حسین
ابہری (۴۰۶) میرزا لسانی (۴۰۷) مولانا حسین اردبیلی (۴۰۸) بیگ گرامی شاملو (۴۰۹) میر حسن
(۴۱۰) محمد حسین (۴۱۱) محمد حسین (۴۱۲) مولانا علی بیگ حشمتی (۴۱۳) مولانا حشری تبریزی (۴۱۴)
میر حضوری قمی (۴۱۵) حقی خوانساری (۴۱۶) حقانی (۴۱۷) حکیم اردستانی (۴۱۸) مولانا حمد اللہ
(۴۱۹) میرزا حمزہ بن ملک جلال الدین سیستانی (۴۲۰) مولانا حیاتی کاشانی (۴۲۱) مولانا حیاتی گیلانی
(۴۲۲) مولانا حیدری تبریزی (۴۲۳) حیدر معمائی (۴۲۴) حیدر بیگ بن علی خان بیگ ہمدانی (۴۲۵)
خان زمان (۴۲۶) خان اعظم موسوم بہ عزیز کوکہ (۴۲۷) خان خانان (۴۲۸) خاطری کاشانی (۴۲۹)
خادمی لحصائی (۴۳۰) خاوری سمنانی (۴۳۱) میرزا بیگ خطی (۴۳۲) امیر خسرو قزوینی (۴۳۳)
امیر خسرو قائنی (۴۳۴) سلطان خسرو بن نورالدین جہانگیر (۴۳۵) ملا خصالی کاشی (۴۳۶) خضری
(۴۳۷) مولانا خلقی شستری (۴۳۸) محمد خان شرف الدین اغلی (۴۳۹) داعی انجدانی (۴۴۰) مولانا داعی
ہمدانی (۴۴۱) داخلی صفاہانی (۴۴۲) درویش محمد قصہ (۴۴۳) دیری (۴۴۴) ذوقی (۴۴۵) ذوقی
اردستانی (۴۴۶) مولانا حیدر ذہنی (۴۴۷) رای منوہر (۴۴۸) رستم مرزا (۴۴۹) مولانا رشکی ہمدانی
(۴۵۰) حکیم سعید رشدی (۴۵۱) رشیدا (۴۵۲) رشدی یافقی (۴۵۳) حکیم شاہ رضائی (۴۵۴)
رضی الدین ارتیمانی (۴۵۵) رفعتی تبریزی (۴۵۶) رازی کماچہ شیرازی (۴۵۷) مولانا زاہدی (۴۵۸)
میر محمد زمان مشہدی (۴۵۹) زین خان کوکلتاش (۴۶۰) زین العابدین رمال اعور صفاہانی (۴۶۱) حکیم
زین الدین محمد خان (۴۶۲) سام میرزا (۴۶۳) ساکائی کاشانی (۴۶۴) شیخ ثاقب (۴۶۵) محمد یوسف
صادقی (۴۶۶) سارو خواجہ جویتی (۴۶۷) سیاہی بخاری (۴۶۸) مولانا سحابی (۴۶۹) میر سنجی رازی
(۴۷۰) مولانا سروری (۴۷۱) سری موصلی (۴۷۲) سعیدای اردستانی (۴۷۳) محمد سعید (۴۷۴) بابا
سلطان تبریزی (۴۷۵) سلیم گرگانی (۴۷۶) مولانا سلوقی اردستانی (۴۷۷) میر سنجر (۴۷۸) سنگیو

بیگ شہلای بدخشی (۹۷۹ھ) سوزی لاہوری (۹۸۰ھ) سودائی گجراتی (۹۸۱ھ) میاں حسن صلائی (۹۸۲ھ)
سیری غزنوی (۹۸۲ھ) شانی تکلو (۹۸۴ھ) آقا شاہ پور (۹۸۵ھ) شاہ نظر بیگ قسمۃ (۹۸۶ھ) ملک شاہ
حسین عباس (۹۸۷ھ) میر شجاع الدین محمود صفاہانی (۹۸۸ھ) مولانا شجاع مشہدی (۹۸۹ھ) محمد شریف
آملی (۹۹۰ھ) شریف سہلی (۹۹۱ھ) محمد شریف (۹۹۲ھ) شعوری کاشی (۹۹۳ھ) خواجہ شعیب خوشقانی (۹۹۴ھ)
حسین شفائی (۹۹۵ھ) محمد رضا شکیبی صفاہانی (۹۹۶ھ) شکیبی عطار (۹۹۷ھ) شکوہی ہمدانی (۹۹۸ھ) مولانا حیدر شگونی (۹۹۹ھ) شمسائی
(۵۰۰) بابا شمس (۵۰۱) ملا شمس ہمدانی (۵۰۲) شوکت (۵۰۳) مولانا شہودی (۵۰۴) شیرینی قاینی
(۵۰۵) مولانا حیدر شگونی (۵۰۶) خواجہ محمد میرک صالحی (۵۰۷) صادقی بیگ کتابدار (۵۰۸) صالح بیگ
ہمتی آزادانی (۵۰۹) خواجہ صاین الدین علی ترکہ (۵۱۰) مولانا صبوحی (۵۱۱) امیر روزبہان صبری
(۵۱۲) غضنفر صبری (۵۱۳) صبحی یزدجرد (۵۱۴) پسر زین العابدین وامد العین صفاہانی (۵۱۵) آقا
ضیای صفاہانی (۵۱۶) میر جلال الدین حسن صدائی (۵۱۷) حسن بیگ صلائی (۵۱۸) صلحی مازندرانی
(۵۱۹) سیقلی یزدجردی (۵۲۰) محمد صالح نام ضابطی (۵۲۱) مولانا ضیاء الدین محمد کاشانی (۵۲۲) شاہ
ضیاء الدین کرمانی (۵۲۳) ضیای شستری (۵۲۴) مولانا طاہر نایینی (۵۲۵) محمد طاہر موسوی (۵۲۶)
بابا طالب صفاہانی (۵۲۷) محمد طالب آملی (۵۲۸) میر طرحی شیرازی (۵۲۹) طفیلی گیلانی (۵۳۰) طلوعی
کشمیری (۵۳۱) شاہ طہماسپ (۵۳۲) مولانا ظہوری ترشیزی (۵۳۳) مولانا عادلی ختلانی (۵۳۴)
عاقلی (۵۳۵) حکیم عارف (۵۳۶) ابوالفتح عاملی (۵۳۷) شیخ عارف (۵۳۸) مولانا عاشقی (۵۳۹)
عاصی (۵۴۰) مولانا عاکفی گیلانی (۵۴۱) مولانا عبدالرزاق گیلانی (۵۴۲) مولانا عبدالباقی گونابادی
(۵۴۳) عبدالباقی نہاوندی (۵۴۴) میر عبدالباقی تبریزی (۵۴۵) عبدالباقی ابن معینای صلائی صفاہانی
(۵۴۶) میر عبدالوہاب معموری عنایتی (۵۴۷) عبدالرزاق ختنی (۵۴۸) میر عبدالغفار (۵۴۹) عبیداللہ
خان ازبک (۵۵۰) عبدالوہاب نویدی (۵۵۱) عبیدی قلندر خوانساری (۵۵۲) عبیدی گونابادی
(۵۵۳) عبیدی شستری (۵۵۴) عبادی شیرازی (۵۵۵) شیخ عبدالصمد جبل آملی (۵۵۶) شاہ عباس
(۵۵۷) عبداللہ خان (۵۵۸) قاضی عبداللہ رازی (۵۵۹) عبداللہ قندھاری (۵۶۰) میرزا عبداللہ
جعفری (۵۶۱) مولانا عبداللہ شستری (۵۶۲) میرزا عبداللہ نیشاپوری (۵۶۳) میر عتابی (۵۶۴)
حسن بیگ عجزی تبریزی (۵۶۵) مولانا عرفی شیرازی (۵۶۶) عرفی لاہیجی (۵۶۷) عرب صفاہانی

(۵۶۸) عزیزی تبریزی ۵) میر عزمی (۵۷۰) میرزا جان عزتی (۵۷۱) شیخ عبدالکریم عطائی
جونپوری (۵۷۲) امیر علی اکبر شاہی (۵۷۳) بابا علی جعفر (۵۷۴) مولانا علی کل استرآبادی (۵۷۵) ملا علی
رضای صوفی (۵۷۶) میر سید علی سمنانی (۵۷۷) میر علی قزوینی (۵۷۸) میر علائی یزدی (۵۷۹)
میر عزیز اللہ (۵۸۰) علی بیک ددہ (۵۸۱) میر علی اصغر (۵۸۲) خواجگی عنایت اللہ (۵۸۳) امیر
عنایت اللہ (۵۸۴) مولانا عہدی ساز تخلص (۵۸۵) میر عہدی تونی (۵۸۶) میر عہدی ورایتی (۵۸۷)
قاضی عہدی رازی (۵۸۸) عہدی قراکوئی (۵۸۹) آقا عیسی یزدی (۵۹۰) درویش عیانی (۵۹۱)
حکیم عین الملک (۵۹۲) میرزا غازی وقاری (۵۹۳) ملا غباری (۵۹۴) قاری غباری (۵۹۵)
میر غروری کاشی (۵۹۶) مولانا غزالی مشہدی (۵۹۷) قاضی غضنفر (۵۹۸) عضنفر (۵۹۹) غنی
بیگ ہمدانی (۶۰۰) میر عبدالغنی تفرشی (۶۰۱) ددہ غیری (۶۰۲) میر غیاث الدین نائینی (۶۰۳)
غیاث الدین منصور (۶۰۴) فارغی (۶۰۵) مولانا علی فائیقی (۶۰۶) فتوحی اردبیلی (۶۰۷) شاہ
فتح اللہ شیرازی (۶۰۱) فتح ملکابادی (۶۰۹) ملا فتح اللہ ہروی (۶۱۰) فخرای خراسکانی (۶۱۱)
فردی (۶۱۲) ملا فرج اللہ (۶۱۳) مولانا فرج اللہ شستری (۶۱۴) میرزا فرہاد بخاری (۶۱۵) میر
محمود فردی (۶۱۶) میرزا فصیحی انصاری (۶۱۷) فضولی بغدادی (۶۱۸) فضلی جربادقانی -
(۶۱۹) مولانا فطرتی کشمیری (۶۲۰) حکیم فغفور (۶۲۱) فقیہی ہروی (۶۲۲) درویش فکری (۶۲۳) فکری خراسانی

(۶۲۴) خواجہ محمد رضای فکری (۶۲۵) قاضی احمد فگاری (۶۲۶) فہمی طہرانی (۶۲۷) فہمی کرباس کاشانی
(۶۲۸) فیضی تربتی (۶۲۹) شیخ فیضی مولانا قاطعی ہروی (۶۳۰) قاطعی (۶۳۱) قاطعی طہرانی (۶۳۲) مولانا
قاسمی (۶۳۳) قاسمی اردستانی (۶۳۴) مولانا قاسم صفاہانی (۶۳۵) قاسم (۶۳۶) قاسم دہلوی
(۶۳۷) قیلان بیگ (۶۳۸) حاجی محمد جان قدسی (۶۳۹) قدری شیرازی (۶۴۰) نور الدین محمد قراری
گیلانی (۶۴۱) قریشی خانم (۶۴۲) قناعی قزنی (۶۴۳) قسمتی استرابادی (۶۴۴) قاسم بیگ (۶۴۵)
محمد قطب شاہ (۶۴۶) قلی خان مجرم (۶۴۷) قلیچ محمد خاں (۶۴۸) قوسی شستری (۶۴۹)

قیصری (۶۵۰) مولانا قیدی (۶۵۱) قاسم کاہی (۶۵۲) میرزا محمود کافری (۶۵۳) میرزا کازرونی (۶۵۴)
کامی سبزواری (۶۵۵) ملک سعید خلخالی کامل (۶۵۶) قوام الدین عبداللہ کامل (۶۵۷) مولانا کامل
نظیری (۶۵۸) کاملہ بیگم (۶۵۹) مولانا کاشفی بدخشانی (۶۶۰) مولانا کرمی یزدجردی (۶۶۱)

مولانا کرامی تبریزی (۶۶۲) کسوتی یزدی (۶۶۳) مولانا کسری (۶۶۴) میر محمد حسین کفری (۶۶۵)
گلشنی (۶۶۶) ابوطالب کلیم (۶۶۷) کلب بیگ تبریزی (۶۶۸) مولانا فہدی علی کشمیری لذتی
(۶۶۹) مولانا لسانی شیرازی (۶۷۰) مولانا لطفی تبریزی (۶۷۱) لطفی شیرازی (۶۷۲) مجد الدین
خوافی (۶۷۳) مولانا عبد العلی محوی (۶۷۴) شیخ محی الدین محوی لاہیجی (۶۷۵) مولانا محمد فاضل تمین زری
(۶۷۶) مولانا محمد صوفی مازندرانی (۶۷۷) مولانا محمدی بغدادی (۶۷۸) مولانا محمد حسین خطاط تبریزی
(۶۷۹) حکیم محمد رضای مشہدی (۶۸۰) قاضی محمد رازی اصفہانی (۶۸۱) آقا محمد قمی (۶۸۲) مولانا محمد
جامی (۶۸۳) مولانا محمد علی کاشی (۶۸۴) میر محمود گیلانی (۶۸۵) میر سید محمد (۶۸۶) محب مداح
شیرازی (۶۸۷) محمد بیگ (۶۸۸) شیخ محمد شیرازی (۶۸۹) خواجہ محمد (۶۹۰) میر محمد مسکن سبزواری
(۶۹۱) مولانا محبی شاملو (۶۹۲) محبی شیرازی (۶۹۳) مولانا شیخ محمد حکاک تبریزی (۶۹۴) مولانا
محمد خباز واحد العین صفاہانی (۶۹۵) میر مجازی (۶۹۶) میرزا محمد حکیم (۶۹۷) میر مغیث الدین
محوی ہمدانی (۶۹۸) میرزا محمد رازی (۶۹۹) محمود رازی (۷۰۰) محمد حسین (۷۰۱) محمد حسن رازی
(۷۰۲) محسن خلقی یزدی (۷۰۳) مولانا مزاری (۷۰۴) مولانا محمد مرشد (۷۰۵) شاہ مرتضی ارتیمانی
(۷۰۶) مرشد خان یزدی بروجردی (۷۰۷) میرزا مراد (۷۰۸) مسیب خان تکلو (۷۰۹) حکیم رکن الدین
(۷۱۰) مسعود کاشانی مسیح (۷۱۱) مولانا مسعود یزدی (۷۱۲) نجم الدین مسعود ہروی (۷۱۳) مولانا
مسعود نبکی (۷۱۴) مولانا محمد امین مستغنی (۷۱۵) شیخ ماکہن سنبھلی (۷۱۶) مرزا مشربی تکلو (۷۱۷)
مرزا ملک مشرقی (۷۱۸) میر مصطفیٰ (۷۱۹) منظر کاشی (۷۲۰) مظفر (۷۲۱) منظہری کشمیری (۷۲۲) مولانا معین
(۷۲۳) مولانا معین الدین عبد اللہ شیرازی (۷۲۴) امیر عبد اللہ شیخ معین الدین محمد شیخ سعد الدین محمد
الاوحدی الدقاقی الحسینی البلیانی (۷۲۵) معز الدین آقا ملک (۷۲۶) محمد یحییٰ (۷۲۷) مولانا علی معانی (۷۲۸)
مقصدی ہمدانی (۷۲۹) مقصود بیگ (۷۳۰) ملک قمی (۷۳۱) ملک طیغورا تجدانی (۷۳۲) مولانا ملک
محمد طوفی (۷۳۳) آقا ملک صفاہانی (۷۳۴) میرزا ملکی (۷۳۵) مولانا ملہمی تبریزی (۷۳۶) ملہم برہمن
(۷۳۷) خواجہ ملا کازرونی (۷۳۸) میر منتہی (۷۳۹) شیخ منصور کاشانی (۷۴۰) مولانا عبد الحق منصف
(۷۴۱) موتسی شستری (۷۴۲) محمد مومن سلطان ترکمان (۷۴۳) محمد مومن سبزواری (۷۴۴)
مولانا محمد مومن حسین یزدی (۷۴۵) مومن ابرقوہی (۷۴۶) مہدی قلی سلطان افشار (۷۴۷)

مہابت خان (۷۴۸) میرزا ... (۷۴۹) میرزا میرک بیگ (۷۵۰) میئی (۷۵۱) میر غیاث الدین محمد میر میران (۷۵۲) محمد نادری سیال کوتی (۷۵۳) شمسی نامی (۷۵۴) میر محمد معصوم خاں نامی (۷۵۵) تورانی نامی (۷۵۶) علی خاں نامی (۷۵۷) مولانا ناطق (۷۵۸) ملا ناجی کاشی (۷۵۹) بابا ناجی شروانی (۷۶۰) ناقد گیلانی (۷۶۱) نجاتی شیرازی (۷۶۲) مولانا نظری کاشی (۷۶۳) خواجہ نصیر ہمدانی (۷۶۴) نظام کلاغ قزوینی (۷۶۵) سید نظام غزہ (۷۶۶) میر نظام الملک دست غیب (۷۶۷) حکیم نظام الدین علی (۷۶۸) درویش نظام مشہدی (۷۶۹) مولانا محمد حسین المشہور با نظیری نیشاپوری (۷۷۰) نعیم خیاط (۷۷۱) سید نعمت اللہ (۷۷۲) فقیر نامی (۷۷۳) مولانا نفیسی کاشانی (۷۷۴) شیخ علی نقی کمرہ (۷۷۵) میر نقیب خان قزوینی (۷۷۶) نورالدین جہانگیر بن جلال الدین اکبر بادشاہ بن محمد ہمایوں (۷۷۷) قاضی نورالدین محمد صفاہانی (۷۷۸) نیازی بدخشانی (۷۷۹) واحد صفاہانی (۷۸۰) میر والہی (۷۸۱) محمد امین وجدی کرمانی (۷۸۲) مولانا وجہی گرد (۷۸۳) نورالہدیٰ بن میر محمود شبوشتانی (۷۸۴) مولانا محمد رضای نوعی خبوشانی (۷۸۵) نیکی صفاہانی (۷۸۶) نیکی (۷۸۷) مولانا ولی دشت بیاضی (۷۸۸) مہاسبقلی بیگ وہمی (۷۸۹) محمد ہاشم مروی (۷۹۰) ہجری شمشیر قمی (۷۹۱) وجہی ہروی (۷۹۲) مولانا وحشی بافقی (۷۹۳) میر وحدتی (۷۹۴) مولانا وصفی (۷۹۵) مولانا وصلی صفاہانی (۷۹۶) ولائی استرابادی (۷۹۷) ہمدم کوکہ (۷۹۸) ہمدی شیرازی (۷۹۹) مولانا یاری تردی (۸۰۰) یعقوب میرزای استاجلو (۸۰۱) یقینی مشہدی (۸۰۲) امیر یوسف امم (۸۰۳) یوسف بیگ (۸۰۴) یوسفی زرگر (۸۰۵) میرزا یوسف خان۔

"کعبہ عرفان" میں جن شعرا کے کلام میں کوئی رباعی نہ ملی ان شعرا کو "گلدستہ" میں نہیں رکھا گیا ہے۔ لہذا رکن منافی (شعرای متوسطین) کے عرصہ حرف 'ذ'، 'عرصہ حرف 'ظ' کے ایک بھی شاعر کو شامل گلدستہ نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ عبدالوہاب عالمگیر نے "رباعی ننوشتہ بود" لکھی ہے۔ شعرا کے حالات بیان کرنے میں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں صرف شاعر کا نام لکھ کر ہی اسکا کلام دیدیا ہے جیسے فتوحی اردبیلی[1]، میر عہدی تونی[2]، حکیم عہدی ورائینی[3] و علی بیگ[5] (۵) وغیرہ بہت سے شعرا کے تراجم میں اہم

۱- ماخوذ از برگ ۵۳ (ب) و برگ ۱۶۰ (الف) گلدستہ خطی (خدا بخش)

واقعات کی تواریخ بھی دی گئی ہیں مگر کاتب نے سنین میں صفر کو کہیں بھی نہیں لگایا ہے جیسے برگ ۱۱ (الف) پر ۱۳۶ھ بجائے ۱۰۳۶ھ برگ ۱۳ (الف) پر ۱۱۴ھ بجائے ۱۰۱۴ھ اور برگ ۱۸۹ (الف) پر ۱۲۲ھ بجائے ۱۰۲۲ھ وغیرہ۔

نمونۂ تراجم: حکیم عمر خیّام

"عرفہ حکیم عمر خیام ہمدرس خواجہ نظام الملک طوسی وحسن صباح آخر در علامتیہ درآمدہ سرآمد صاحب کاملان زمان خود بودہ چنانچہ سلطان سنجر سلجوقی اورا با خود یک تخت نشاندہ، ہمیشہ بخود د سرست بودی، گویند بعد از وفات وی والدہ اش بدرگاہ الٰہی بتضرع استدعای مغفرت بجہت وی کردی۔ یک شب در واقعہ این رباعی بما در خواندہ:

ای سوختہ سوختہ سوختنی — وی آتش دوزخ از تو افروختنی
تاکہ گوی کہ بر عمر رحمت کن — حق را تو کی برحمت آموختنی

ولہ:

گویند بحشر گفتگو خواہد بود — وآن یار عزیز تند خو خواہد بود
از خیر محض جز نکوئی ناید — خوش باش کہ عاقبت نکو خواہد بود

گر بادہ خوری با خردمندان خور — یا باصنمی لالہ رخی خندان خور
بسیار مخور فاش مکن دردمساز — اندک خور وگہ گہی خور و پنہان خور

ایزد چو نخواست آنچہ ما خواستہ ایم — کی گردد راست آنچہ ما خواستہ ایم
گرہست صواب آنچہ او خواستہ است — پس جملہ خطاست آنچہ ما خواستہ ایم

آباد خرابات زمی خوردن ماست — خون دو ہزار توبہ در گردن ماست
گر ما نکنیم جرم رحمت کہ کند — آرایش رحمت از گنہ کردن ماست

برخیز مخور غم جہان گذران — برخیز و جہان بشاد کامی گذران
در طبع جہان اگر وفائی بودی — نوبت بتو خود نیامدی از دگران

دانی زچہ روی افتادست وچہ راہ — آزادی سرو سوسن اندر افواہ
کیں دارد صد زبان لیکن خاموش — وآن دارد صد دست ولیکن کوتاہ" (گلدستہ برگ ۱۲)

۱۔ "تانہ رحمی" عرفات العاشقین برگ ۲۱۴ الف جلد ۱ ۲۔ "خرابات" برگ ۱۷ ب ایضاً ۳۔ "برخیزہ" ایضاً ۴۔ این رباعی در عرفات العاشقین نیامدہ

نمونۂ دیگر: **بہرام میرزا**

"عرفہ۔ بادشاہ زادہ کامگار نامدار عالی مقدار ابوالفتح بہرام میرزا بن شاہ اسمعیل حیدر حسینی در نہایت ابہت و جلالت در پرورش فضلا و شعرا و اہل تاریخ میکوشید، قندہار را از برادر بزرگوار خود شاہ طہماسپ یافت، مدتہا خود و فرزندان را انجا سری کردہ اند، لب التواریخ بنام وی نوشتہ شدہ۔ از وست:

بہرام درین خرابۂ پر شر و شور تاکی بحیات خویش باشی مغرور
کردہ ست درین خرابہ صیاد اجل در ہر قدمی ہزار بہرام بگور
افسوس کہ در خیال خوابیم ہمہ پیوستہ[۲] بفکر ناصوابیم ہمہ
در پردۂ ظلمت و حجابیم ہمہ از شوخی نفس در عذابیم ہمہ" (گلدستہ برگ ۹۵)

"گلدستہ" میں میرزا یوسف خاں کے عرفہ کے بعد جس طرح تذکرہ "عرفات العاشقین" ختم ہو جاتا ہے اسی طرح "گلدستہ" میں تذکرہ کا حصہ برگ ۹۷ (الف) پر تمام ہو جاتا ہے۔ اگلا صفحہ سادہ ہے۔ صرف حاشیہ پر یہ شعر درج ہے:

رخت یوسف لبت عیسیٰ خلعت خضر بیک صورت سہ پیغمبر کہ دیدست

اس کے بعد دوسرے صفحہ سے شیخ عمر خیام کا مندرجہ ذیل بیان شروع ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے صفحہ ۲۱ (الف) پر تذکرہ کے متن میں بھی عمر خیام کا بیان موجود ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ در تاریخ قدما مسطور ست کہ وفات ملک الحکما مولانا ی عمر خیام نیشاپوری در سنہ سبع عشر و خمسمایہ بود، او در حکمت یگانہ و عالم زمانہ خود بود، خواجہ[۳] نظامی سمرقندی کہ یکی از شاگردان او بود، حکایت میکند کہ در بلخ امام الحکما مولانا ی عمر خیام را اتفاق افتاد، در اثنا سخن میگفت کہ قبر من در موضعی باشد کہ ہر بہار با شمال بر و گل افشانی کند مرا ازین سخن تعجب آمد، اما دانستم کہ او سخن گزاف نگوید، تا بعد از ان چند گاہ نیشاپور بسر قرار رفتم کہ قبر او در کنار دیوار باغ بود، درختان میوہ دار مرا ز دیوار باغ بر آوردہ چندان شگوفہ گل بر سر قبر او ریختہ بود کہ قبر او در میان نمی نمود، او رباعی بسیار ست، حکمت

۱۔ "گردست" عرفات العاشقین برگ ۱۰۰ (الف) جلد ۱

۲۔ "سرگشتہ بفکر" ایضاً برگ ۱۵۵ (ب)

۳۔ خواجہ نظامی عروضی سمرقندی نے بھی اپنے "چہار مقالہ" میں ان حکایات کو درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ "طربخانہ" تصنیف یار احمد بن حسین رشیدی تبریزی نے بھی ان واقعات کی تفصیل دی ہے۔ رجوع کنید ص ۱۴۰۔ اس کے بعد کتاب "حکیم عمر خیام" تالیف ابوالمکارم سلیم اللہ فہمی (اردو) میں بھی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آمیخته اما در شرع بعضی سخنان او ممنوع میدارند از آن جمله یکسب رباعی نوشته که بعد از
وفات او مادرش بخواب دیده پرسید که ای فرزند حق تعالی با تو چه کرد این رباعی بر مادر خواند
چو مادر عمر از خواب بیدار شد این رباعی یاد داشت۔ بعد از آن مشهور شد و آن رباعی اینست:

ای سوختهٔ سوختهٔ سوختنی — وی آتش دوزخ از تو افروختنی
تا کہ گوئی بر عمر رحمت کن — حق را تو کئی برحمت آموختنی" (گلدستۂ برگ ۱۷۵)

"گلدستہ میں عمر خیام ہی ایک ایسا شاعر ہے جس کا بیان دو مرتبہ آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ
عبدالوہاب عالمگیر کو رباعیات سے بے حد دلچسپی تھی اسی وجہ سے اس نے عمر خیام کی مزید رباعیات
کو حروف تہجی کے اعتبار سے "الف" تا "دال" اوپر دیئے ہوئے بیان کے بعد سپرد قلم کیا ہے۔ رباعیات
کے اس سلسلے کے بعد کچھ اور منظوم کلام بھی ہے۔ جن کے عناوین سرخ روشنائی سے بالحاظ ابتث مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) برق (۲) بادام (۳) بوریا (۴) پستہ (۵) پل (۶) پیری (۷) پیوند (۸) پیمانہ
(۹) پرگار و مرکز (۱۰) تیر و کمان (۱۱) تیغ (۱۲) توکل (۱۳) تمکین (۱۴) تخال (۱۵) ترازو (۱۶) تنور (۱۷)
تاک (۱۸) توبہ (۱۹) جام (۲۰) چین جبین (۲۱) چشم (۲۲) چنار (۲۳) چراغ (۲۴) خاموشی (۲۵) خم و خشت
خم (۲۶) خم افلاطون (۲۷) خانہ زین (۲۸) خضر (۲۹) خواب (۳۰) خط (۳۱) خال (۳۲) دہن (۳۳)
دندان (۳۴) داغ (۳۵) درد (۳۶) دختر رز (۳۷) دام (۳۸) دستار و جبہ (۳۹) دل (۴۰) رشتہ
و گہر (۴۱) روز و شب (۴۲) ریگ روان (۴۳) رگ گردن (۴۴) زنبور (۴۵) زلف و کاکل
(۴۶) زخم و بخیہ (۴۷) سبو (۴۸) سفال و ریحان (۴۹) سیب زنخدان (۵۰) سوختہ و شرر (۵۱)
ساغر (۵۲) سرو (۵۳) سہیل (۵۴) سایل و فقیر و درویش (۵۵) سپند و مجمر (۵۶) سیماب (۵۷)
سیل (۵۸) شمع پروانہ (۵۹) شب آدینہ (۶۰) شبنم (۶۱) شگوفہ (۶۲) شیشہ (۶۳) شیر و نیستان
(۶۴) شہباز (۶۵) صندل (۶۶) طفل و دیوانہ (۶۷) غربال (۶۸) فلاخن (۶۹) فتراک (۷۰) فرہاد و تیشہ
(۷۱) قبلہ و قبلہ نما (۷۲) قلم و خامہ و سخن (۷۳) قد و قامت (۷۴) قلاب و نشست در ماہی و فلس (۷۵)
قافلہ (۷۶) قفس (۷۷) قارون (۷۸) قفل و کلید (۷۹) کعبہ و بتخانہ (۸۰) کاہ و کہربا (۸۱) کبک و کہسار
(۸۲) کنج ویرانہ و چغد (۸۳) کاروان (۸۴) کباب و نمک (۸۵) کمند (۸۶) کشتی و لنگر (۸۷) گردیتیمی
(۸۹) گہوارہ (۹۰) اگری و چوگان (۹۱) گردباد (۹۲) گرداب (۹۳) گل و گلشن و گلاب (۹۴) گہر و صدف

(۹۵) گل رعنا (۹۶) لالہ (۹۷) لیلیٰ مجنوں (۹۸) محراب (۹۹) محمود و ایاز (۱۰۰) موج و سراب (۱۰۱) موسیٰ میاں (۱۰۲) مکافات (۱۰۳) مور و خرمن (۱۰۴) مور و سلیمان (۱۰۵) مدّ احسان (۱۰۶) مہتاب (۱۰۷) مرجان (۱۰۸) مومیائی (۱۰۹) منصور و دار (۱۱۰) نامہ و پیغام (۱۱۱) نگین و خاتم (۱۱۲) نرگس (۱۱۳) نقاب (۱۱۴) نی (۱۱۵) ہلال و آفتاب (۱۱۶) ہما و استخوان (۱۱۷) ہالہ (۱۱۸) یعقوب و یوسف۔

نمونۂ کلام منظومہ: "شب آدینہ"

مستان ز قید شنبہ و آدینہ فارغ اند　　رو در پیالہ پشت... کردہ اند

در جوانی ز مئی ناب گذشتن ستم است　　شنبہ خود شب آدینہ نمیباید کرد

منکہ بودم رونق کوی خرابات این زمان　　آفتاب شنبہ و ابر شب آدینہ ام" (گلدستہ ۲۴۴ الف)

نمونۂ دیگر کلام منظومہ: "ریگ رواں"

شوخ چوں ریگ رواں منزل نمیداند کہ چیست　　موج ایں دریا لب ساحل نمیداند کہ چیست

حال ما راہ رواں آبلہ پائی داند و　　کہ نفس سوختہ در ریگ رواں افتادست

در صراط مستقیم عشق عقل خواجہ بیں　　در دل شب راہ در ریگ رواں گم کردست"

"گلدستہ" کلام منظومہ کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ گلدستہ میں اس کلام منظومہ کے ساتھ ساتھ ۹۵۷ علما، فضلا، حکما، ظرفا، اعلیٰ اور ادنیٰ مرد و زن کی چنیدہ رباعیات کا بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس میں درج شعرائے حالات و تاریخی واقعات کی بنا پر فارسی شاعری کی ابتدا سے لے کر عہد جہانگیری تک کے شعرا پر کام کرنے والے محققین و ناقدین وغیرہ کیلئے "عرفات العاشقین" کے ساتھ ایک مزید اہم نسخہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۰۲۴ھ میں "عرفات العاشقین" مکمل ہوئی اُس کے بعد سے ۱۰۳۶ھ تک یعنی تکمیل "کعبہ عرفان" تک جن مزید شعرا کی دریافت اور ملاقات تقی الدین اوحدی سے ہوئی ان کا اضافہ اس نے "کعبہ عرفان" میں کیا جس کو گلدستہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح "عرفات العاشقین" کے ساتھ "گلدستہ" کا اپنا مقام ہے۔ "عرفات العاشقین" اگر آسمانِ ادب کا درخشاں آفتاب ہے تو "گلدستہ" ماہ تاباں سے کم نہیں۔

یہ نسخہ شریفہ ہمارے اسلاف کے انمول آثار میں سے ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ یہ ہمارا قومی فرض ہے کہ ہم اس کو طباعت کے وسایل جدیدہ کے ذریعہ سدا کے لیے محفوظ کر لیں اور اپنے سنہرے ماضی کی عظمت کو سمجھیں۔ ●●

ڈاکٹر ارکن ترکمان
(رئیس شعبۂ اردو، سلجوق یونیورسٹی، قونیہ، ترکی)

سجّاد حیدر یلدرم اور ان کے ترکی تراجم

سجاد حیدر یلدرم ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ ان کی شہرت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ اردو کے پہلے افسانہ نگار خیال کیے جاتے ہیں۔ اس شہرت میں ان ترکی افسانہ نگاروں کا بھی حصہ ہے جنکے افسانوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اردو شاعری میں بھی وسط ایشیا کے مہاجرین ترکوں نے دل کھول کر حصہ لیا تھا۔ اور اب ہمیں اس بات پر بھی فخر ہے کہ ترکی افسانوں نے اردو کے جدید افسانوی ادب پر بھی اثر ڈالا ہے۔ اور یہ اثر سجّاد حیدر یلدرم کی خداداد قابلیت کے ڈھانچے میں ڈھل کر اور اردو طرز بیان کا لباس پہن کر کامیاب ہوا ہے ورگرنہ ترکی سے لغوی ترجمے پھیکے پھیکے، بے لذت اور مغلق ہوتے۔ حیدر یلدرم نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ترجمان کو صرف ترجمان ہی نہیں بلکہ ادیب بھی ہونا چاہیے۔ حیدر صاحب کے بہت سے افسانے ترکی سے ترجمہ ہیں اس لحاظ سے پطرس بخاری کے اس بیان میں کچھ مبالغہ نظر آتا ہے:۔

"یہ محض ان کا حسن بیان ہے یا محض انکسار جو انھیں ایک نئی تکنیک برتنے کی معذرت کے طور پر برتنا پڑا۔ چند داخلی شہادتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہے کہ یہ تراجم دراصل تقریباً طبعزاد تخلیقات ہیں اور جیسا سمجھا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ اوریجنل واقع ہوئی ہیں" (پگڈنڈی، امرتسر جلد ۹، شمارہ ۵، ۱۹۶۱ء ص ۱۰۴)

میرے ہم کار اور بھائی جناب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی پطرس کا حوالہ دینے کے بعد یوں فرمایا ہے:۔

"یلدرم کی ان نگارشات کا مقابلہ، اصل ترکی تصانیف سے ابھی تک نہیں کیا جاسکا ہے اس لئے قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یلدرم کس حد تک "نرے مترجم" ہیں لیکن اگر محض داخلی شواہد کچھ معنی رکھتے ہوں تو یلدرم کے ان چار "مبینہ تراجم" میں سے کم از کم "صحبتِ ناجنس" کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ پورم پور طبعزاد ہے" (ڈاکٹر سید معین، خیالستان، ص ۱۹)

ہم نے معین الرحمٰن صاحب کے اس بیان کو ایک اشارہ سمجھ کر لسانیات کے ماہر اور صوفی شاعری سے لگاؤ رکھنے کے باوجود یلدرم کی نگارشات کا مقابلہ ترکی متون سے کرنے کا سلسلہ جاری کیا ہے۔ اس سے

پہلے مستقل طور پر میں نے مشہور ادیب احمد حکمت مفتی اوغلو کی اصل تصنیف "لانہ منکسر" (ٹوٹا ہوا گھونسلا یا گھر) اور "ثالث بالخیر" کا مقابلہ انگریزی اور ترکی میں کیا تھا۔ یہ مقابلہ چونکہ طویل تھا اس لئے میں نے اب اور بھی اختصار سے کام لیکر یلدرم کے وہ تین تراجم جو انہوں نے ترکی سے کیے ہیں یعنی (۱) "ثالث بالخیر" (۲) "صحبت ناجنس" (۳) "خارستان وگلستان" کا مقابلہ ایک جگہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں افسانے ایک ہی ادیب کے قلم سے نکلے ہیں اور وہ ہیں احمد حکمت مفتی اوغلو۔ ان تراجم کے بارے میں کچھ لکھنے سے پہلے یہ بجا ہوگا کہ ہم اس مصنف کے متعلق مختصر سی معلومات دیں:

احمد حکمت مفتی اوغلو ۱۸۷۰ء میں استنبول میں پیدا ہوئے[۱] آپ کے والد یحیٰی سزائی آفندی وسط درجہ کے شاعر تھے لیکن آپ بہت ہی نیک اور خدا پرست آدمی تھے۔ سات سال کی عمر تھی کہ والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی نے آپکی پرورش کی۔ تعلیم استنبول کے گلاتا سرائے کے اسکول میں پائی اور اس طالب علمی کے زمانہ میں فرانسیسی سے ترجمے کرنے شروع کر دیئے۔ والد کی طرح جوانی میں اشعار بھی کہے لیکن بعد میں اپنا پورا رجحان افسانہ نگاری کی طرف موقوف کر دیا۔ تعلیم کے بعد آپ قونصل کی حیثیت سے یورپ چلے گئے۔ یورپ جانے سے پہلے کچھ عرصے کے لیے گلاتا سرائے کے اسکول میں پروفیسر بھی رہے تھے۔ آپکا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا[۲]۔

احمد حکمت نے ترکی کے سب سے پہلے ملی رسالہ "ثروتِ فنون" میں حصہ لیا۔ یہ ایک قومی رسالہ تھا۔ چونکہ وہ ترک قومیت کے قائل تھے اس لئے ان کی تصانیف میں یورپین طرز زندگی کی جگہ ترکی طرز زندگی کو اپنایا گیا ہے۔ جگہ جگہ انہوں نے یورپ کی نقالی کی ہجو کی ہے۔

ان کی سب سے مشہور تصانیف یہ ہیں: (۱) خارستان وگلستان (۲) جاغلیانلار (۳) گونل خانم وغیرہ۔ وہ یحیٰی کمال، محمد عاکف، ضیا گوک الپ، عمر سیف الدین جیسے مشہور شاعر اور ادیب نہیں ہیں تاہم ان کا شمار قومیت پرست ادیبوں میں ہوتا ہے[۳]۔ انھوں نے ترکی قوم اور تمدن کے بارے میں بہت سے مقالے بھی لکھے ہیں۔

۱۔ حکمت: زردار اوغلو، مفتی اوغلو احمد حکمت، ترک دل تورومو، آنقرہ ۱۹۶۴ء

۲۔ ڈاکٹر نعمی توت اوغلو، مفتی اوغلو احمد حکمت، ترکش کلچر اینڈ تورزم منسٹری آنقرہ ۱۹۸۶ نمبر ۶۶۹ ص ۳۰

۳۔ نہاد سامی بنارلی، رسملی ترک ادبیات تاریخی، جلد ۲، ص ۱۰۸۲

۱۔ ثالث بالخیر (لڑکی کی کارستانی)

عنوان: ۔ ترکی کے اصل افسانے کا عنوان " لانۂ منکسر" ہے جس کو حیدر صاحب نے بدل کر "ثالث بالخیر یا لڑکی کی کارستانی" میں تبدیل کر دیا۔ یہاں شریر لڑکی سے مراد رعنا ہے جس نے بچھڑے ہوئے ماں باپ کو بڑی عقلمندی (کارستانی) سے پھر ملا دیا۔

کردار: ۔ کہانی کے چار بڑے کردار ہیں ۱۔ نریمان (شوہر) ۲۔ مہربان (بیوی) ۳۔ رعنا (لڑکی) ۴۔ نریمان کی محبوبہ حمرا۔ ان سب کرداروں کے نام جوں کے توں ترجمے میں استعمال ہوئے ہیں سوائے نریمان کے جس کا نام اردو متن میں رمزی ہو گیا ہے۔ یہ نام کی تبدیلی کس بنا پر ہوئی معلوم نہیں۔

کہانی کا خاکہ: ۔ کہانی بہت ہی سادی ہے۔ نریمان ایک قصبے سے آکر استنبول میں رہنے لگتا ہے اور اس شہر میں امیر ہو جاتا ہے۔ اس کی شادی یورپ کے ایک شیدائی کی لڑکی مہربان سے ہو جاتی ہے۔ لیکن نریمان اپنی رشتہ دار لڑکی حمرا، جو بہت جدید طرز کی لڑکی ہے، پر عاشق ہو جاتا ہے۔ اور اپنی سادہ لوح بیگم کو پسند نہیں کرتا حمرا نریمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی اس پر نریمان سکون دل کے لئے یورپ چلا جاتا ہے۔ لیکن اُسے وہاں بجائے خوشی کے درد اور وطن کی حسرت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ کئی سال کے بعد استنبول واپس آتا ہے تو اس کی عقلمند لڑکی رعنا یعنی ثالث بالخیر جس نے ترکی ہی میں اپنی ماں کی نگرانی میں تعلیم پائی تھی بڑی ہوشیاری کے ساتھ بچھڑے ہوئے ماں باپ کو ملا دیا۔ رعنا چونکہ یورپین طرز کی زندگی سے ذرا دور رہی تھی اور پرانے ماحول میں پلی پھولی تھی، اس لئے وہ اپنے ماں باپ کی طرح نمائشی نہ بنی۔

مضمون: ۔ مضمون مترجم اور مصنف دونوں کا ایک ہی ہے لیکن مقاصد میں کچھ تبدیلی نظر آتی ہے۔ یہ کہانی یورپ پرستوں کے لیے نہیں لکھی گئی[۲] بلکہ یورپ پرستی کے خلاف ہے۔ اب چونکہ حیدر یلدرم صاحب کو "ثروتِ فنون" کے مصنفین کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں اس لئے انہوں نے احمد حکمت کو مغربیت پسند خیال کیا حالانکہ بات بالکل الٹی ہے۔ احمد حکمت مغربیت نہیں ترکیت کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ ان کی رعنا وہ صاف ستھری لڑکی ہے جس نے یورپ کے بجائے اپنے آباؤ اجداد سے سبق لیا ہے۔ اس لحاظ سے مترجم نے متن میں جا بجا اصل خیال اور طنز گوئی سے بقدرے گریز کیا ہے۔

۱۔ یہ "لیلی ویا خود مجنون نک انتقامی" کا ترجمہ نہیں ہے جیسے کہ پروفیسر اکمل ایوبی خیال کرتے ہیں (اردو کے ترکی ترجمے " نوائے ادب" بمبئی جلد ۱۳ نمبر ۲ ص ۴۵۔

۲۔ دیکھئے حیدر یلدرم "ثالث بالخیر" لکھنؤ ۱۹۲۲ (مقدمہ ج)

زبان:- احمد حکمت نے جدید ترکی میں نہیں، عثمانی میں لکھا ہے جس میں لاتعداد عربی اور فارسی کے الفاظ اور محاورے ملتے ہیں جیسے:- "رخنہ دار، ساختہ عشوہ "اضمحلال، مرارت ،، "انفعال خودکام" امتزاج" "استہزا، "معذب" "ستم دیدہ" "احتیال،، وغیرہ جو اردو میں بھی استعمال ہو سکتے تھے لیکن حیدر نے انھیں سادی اور سلیس اردو میں نقل کر دیا۔- اسلوب بیان ہندوستانی ہے، ترکی نہیں۔ متن میں جہاں جہاں خالص ترکی طرز یا مناظر آئے ہیں انھیں ہندوستانی انداز میں ڈھال دیا ہے۔ چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔[1]

۱- "سیاہ نقاب کے نیچے تم نے اپنے بالوں کو قید کر رکھا ہے وہ بیچارے تڑپ رہے ہیں" جو ترکی میں یوں تھا، نقاب کے مایوس سیاہ رنگ کے نیچے زرد بال گویا رو رہے ہیں کیا کوئی دوسرا ذرا شفاف نقاب آپ کے پاس نہیں ؟"

۲- "لو میں گڑیا بنی جاتی ہوں،، ترکی کے جملے "مجھے ایک تصویر کی طرح سجا،، کا ترجمہ ہے اور" وہ نیلی آنکھوں کے چاروں طرف ایک سیاہ بالہ بنا" کی جگہ پلکوں کو کھول کر اُن نیلی آنکھوں میں ایک خطِ سیاہ کھینچ دیا" سے یہ ظاہر ہے کہ حیدر صاحب نے وہ تفصیلات جو ہندوستانیوں کے لئے پرائی تھیں تبدیل کر دیں۔ جدید زندگی میں سرمہ آنکھوں میں نہیں بلکہ آنکھوں کے ارگرد لگایا جاتا ہے۔

۳- بعض اوقات مترجم نے کوئی سین گرا دیئے ہیں اور یا تو بالکل ہی بدل ڈالے ہیں مثلاً "اسوقت تم ستم ڈھا رہی ہو، اُف کیا حسن کا عالم ہے!،، یہ ترکی کے اس سادہ جملے کا ترجمہ ہے "اُف اس وقت آپ کتنی حسین ہیں،، اور "جانے کیا بک رہے ہو، چپ بھی رہو" ایک ہندوستانی عورت کے منہ سے نکلا ہوا یہ بے لاگ جملہ ترکی ادب کے لحاظ سے سخت ہے اور اصل میں ترکی یوں ہے" ہاں میں جانتی ہوں اسلیے آپ خاموش رہیے"۔

۴- ثالث بالخیر دوسرے تراجم کے لحاظ سے سادہ، مگر خیالات اور تصویر کے لحاظ سے اصل متن سے ذرا ضعیف ہے۔ تاہم مترجم نے ادبی مزاج کا خیال رکھ کر "لائنہ منکسر" کا ہو بہو ترجمہ نہیں بلکہ ہندوستانی مذاق کے مطابق اقتباس کیا ہے۔ اور کئی جگہ پر اردو کے ایسے الفاظ یا محاورے استعمال کئے ہیں جو ترکی زبان سے کافی مختلف ہیں مثلاً " ناامیدی اور غم کی تصویر بنی رہتی ہے،، "مگر موت مانگے نہیں آتی،، "ہمادرانہ حقوق

۱- تفصیلات کے لیے دیکھئے میرا انگریزی مقالہ

SEJJAD HAYDAR YILDIRIM'S TRANSLATIONS, "KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY, PATNA 1986".

جتائے،، "اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی" "امیدوں پر پانی پھر گیا" یہ وہ اوصاف ہیں جو ہر مترجم میں ملنے چاہیں۔

۲۔ صحبت ناجنس

عنوان:۔ احمد حکمت مفتی اوغلو کے "ایکی مکتوب" (دو خط) کا ترجمہ ہے "صحبت ناجنس" کے ساتھ ساتھ "عذرا دن سلمایہ" (عذرا کی طرف سے سلما کو) کا عنوان بھی ملتا ہے۔ اردو میں اس کے مقابل، "دو لڑکیوں میں خط وکتابت" کا جملہ موجود ہے۔[۱]

کردار:۔ دو لڑکیاں "سلما اور عذرا"۔ ان ناموں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ اتنا ضرور ہے کہ اردو میں ایرانی نوکرانی "دور دانہ خانم" ملتی ہے اور ترکی میں "فتینہ" ایک یونانی عورت ملتی ہے۔

کہانی کا خاکہ:۔ عذرا، سلما کو خط لکھ کر اپنے شوہر کی بری عادتوں کی جو پرانے ترکی رسم ورواج کے مطابق ہیں، شکایت کرتی ہے۔ چونکہ عذرا نے یورپ (فرنچ) کی طرز زندگی گذاری تھی اس لئے وہ اپنے شوہر کو بدمزاج اور ناشائستہ خیال کرتی ہے۔ سلما بھی اپنے شوہر سے خوش نہیں زیرا اُس کا شوہر بالکل یورپین طرز زندگی بسر کرتا ہے۔ ان دونوں خطوط میں یورپی اور مشرقی زندگی کا تصادم موجود ہے۔ مصنف نے جدید زندگی کی ہجو کی ہے۔

مضمون:۔ مترجم نے پھر خطوط کو ہندوستانی رنگ میں ڈھالا ہے۔ خط کے شروع ہی میں "حیدرآباد دکن ۲۴ ستمبر ۱۹۲۵" اور "راولپنڈی ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۵" کی عبارتیں ملتی ہیں۔ اصل خط استنبول سے سلانیک کی طرف لکھا گیا ہے۔ سلانیک اب یونانستان میں ہے۔ ترجمہ میں زبان اور اسلوب بیان کا فرق ضرور موجود ہے مگر مضمون پورم پور وہی ہے۔ دو تین پیراگراف حذف کئے گئے ہیں جن سے متن کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ مترجم نے اس کے علاوہ جگہوں کا نام بھی بدل دیا ہے عذرا کا خط ایک عورت جسکا نام "عادلہ خانم" ہے کے ذریعے بھیجا گیا ہے اور "شادی کی تاریخ آپ کو عادلہ خانم بتا سکتی ہیں" والا جملہ ترجمہ میں نہیں ملتا۔ ترجمہ کی زبان سادہ اور سلیس ہے مثلاً "میری جان میں جان آتی ہے کہ اتنے میں عورتیں ملاقات کے لئے آجاتی ہیں ان سے سر کھپاتی ہوں" جیسے محاورے ترکی میں نہیں ملتے۔ اور "ایک قفس (گھر) سے نکل کر دوسرے قفس (بگھی) میں بیٹھ کر باغ عام کا نظارہ

۱۔ خیالستان، سید سجاد حیدر یلدرم، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، تاج بک ڈپو لاہور ۱۹۸۷

کرتی ہوں" کی جگہ ترکی میں صرف یہ جملہ ہے "اور پھر مہمان آجاتے ہیں" اس کے علاوہ دو باتیں اور ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں اور ان پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے۔ وہ یہ ہیں:۔

۱۔ حیدر نے بڑی مہارت سے فرنچ تہذیب جس کا چرچا استنبول میں ہو رہا تھا کو انگریزی تہذیب میں بدل ڈالا ہے۔ یعنی "BULBUL AND THE ROSE"، "OLD LANGE SYNE" جیسے انگریزی گانے گائے جا رہے ہیں۔ ملٹن کا ذکر ہو رہا ہے۔ ترکی متن میں فرنچ گانا ملتا ہے۔ "DITES MOIS VOS CHAGRINS" (مجھے اپنے درد دل کو سنا)۔

۲۔ حیدر کے متن میں ترکی گانوں کی جگہ ہندی گانے ملتے ہیں۔ ترکی شعرا کی جگہ یعنی فضولی اور نابی کی جگہ اردو شاعر مولانا حالی اور داغ ملتے ہیں۔ ہندی گانوں "دونوں ہاتھوں میں مہندی لگائے پری" میں قربان زلفوں کے لٹکانے والے" "آہمتِ مردانہ جگر تری جا ہے" وغیرہ نے ترکی کے مشہور گانے اور موسیقاروں کی جگہ لے لی ہے۔ اردو میں ترکی موسیقاروں کی جگہ مداری لال اور امانت کا ذکر آتا ہے۔

ان کے علاوہ ایرانی ملا دردانہ خانم، قاتلینہ کا رول لے بیٹھی ہیں۔ دردانہ خانم فارسی بولتی ہیں اور اردو نہیں جانتیں، قاتلینہ یونانی بولتی ہیں اور ترکی نہیں جانتیں۔

حیدر صاحب نے اپنے اسلوب بیان کو اردو کے ڈھنگ میں پیش کرنے کے لئے بہت دلچسپ جملے اور محاورے استعمال کئے ہیں جن کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ چھوٹی چڑیا کی طرح ان کا خون ہو گیا ۲۔ کوئی راگنی کوئی ٹپہ، کوئی غزل ہمارے واسطے ہونا۔ ۳۔ آواز بھاری گویا ہاتھی پی رہا ہے ۴۔ سوچتے سوچتے کبھی میں چلا اٹھی ۵۔ سکون کی خواہش ہے تو اس کے لیے قبر موجود ہے۔

چونکہ عذرا کے شوہر حیدر آباد کے رہنے والے ہیں اس لیے ان کی زبان دکنی ہے۔ ترکی شوہر سادی ترکی بولتے ہیں۔

۲۔ خارستان و گلستان[۱]

یہ بہت دلچسپ کہانی ہے جس میں عورتوں اور مردوں کی جدائی کا ڈرامہ پیش کیا گیا ہے یعنی فطرت کے خلاف انسان کو رہنے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔

عنوان:۔ اس افسانے کے تین بڑے حصے ہیں:۔ ۱۔ گلستان ۲۔ خارستان ۳۔ شیرازہ۔ اردو میں بھی یہی تین

۱۔ احمد حکمت مفتی اوغلو، خارستان و گلستان، قنات کتابخانہ سی، درسعادت نمبر ۲۲۵۔ ۱۳۲۴ ہجری، استنبول

عنوان استعمال ہوئے ہیں۔

کہانی:۔ کہانی میں اختصار سے کام نہیں لیا گیا۔ ایک بڑھیا عورت جو مردوں کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی تھی اس نے اپنی پانچ سالہ بچی (نسرین نوش) کو ایک جنت نما جزیرہ میں (گلستان) ہے جا کر پالنا شروع کر دیا۔ اس جزیرہ میں پھولوں اور پرندوں کے علاوہ دنیا کی ساری خوبصورتیاں اور نعمتیں موجود ہیں لیکن مرد کا نام و نشان نہیں۔ لڑکی جب بڑی ہوتی ہے تو فطری طور پر مرد کو تلاش کرنا شروع کر دیتی ہے۔

ایک اور جزیرہ (خارستان) ہے جہاں ایک لڑکا بچپن سے پلا ہے۔ کشتی کے غرق ہونے پر چند مرد اس بچے (خالد) کو لے کر ایک خشک سنسان جزیرہ میں مشکل سے جان بچا کر پناہ لیتے ہیں۔ کوئی عورت زندہ نہیں رہی تھی اس لئے جوان بچہ عورت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ وہ بھی فطری طور پر عورت کی تلاش میں ادھر ادھر جزیرہ میں پاگلوں کی طرح گھومتا رہتا ہے۔ آخر کار ایک دن چھوٹی سی کشتی بنا کر نسرین نوش کے جزیرے کی طرف آجاتا ہے۔ دونوں جوان بڑے جوش و خروش سے ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ یہ ساری کہانی اردو میں جوں کی توں ملتی ہے۔

مضمون:۔ مترجم نے حسب معمول زبان اور اسلوب بیان کو اردو ادب اور ذوق کے مطابق بدل دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ کچھ مناظر اور ماحول میں بھی تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ جن کی چند مثالیں یہ ہیں:۔

۱۔ "تمام موجودات میں یہ تازگی اور طراوت موجود تھی" کی جگہ اردو میں "تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے" کا جملہ ملتا ہے۔

۲۔ "ایک جزیرہ تھا جواب ناپید ہے" ("جواب ناپید ہے" ترکی میں نہیں ہے)

۳۔ "چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے"۔ (ترکی میں صرف "چاندنی رات سوچ رہی تھی")

۴۔ "ان پر نظر ڈالی، برق تبسم گرا کر" (یہ بھی ترکی میں نہیں ہے)

۵۔ "مزمار، بربط، ستار پر نسرین نوش کے حسن اور ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں۔ گانا بھی وہ گانا جو جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا" اور اسی صفحہ پر "رفتہ رفتہ لالول

۱۔ خیالستان، سید سعید الرحمن، ص ۶۵

اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی۔ اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں،، (یہ جملے حیدر صاحب کے اپنے ہیں)

۶۔ ،،اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے اس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر ہلکے بالوں کے نیچے بھاگتے ہوئے چاند کو پیش نظر کر کے غرض کہ عجب عجب دھوکے دے دے کے نیند اس کی آنکھوں میں چپکے سے آگئی اور گھنی پلکوں کو بلا دیا، جس کی ترکی یوں ہے،، بھاگتے ہوئے چاند کے پیچھے جانے والے بادل کے ٹکڑوں کو خمار بھری آنکھوں سے دیکھتے دیکھتے (نسرین) بے ہوش ہوگئی اور آہستہ آہستہ سوگئی"

جیسا کہ اوپر سے ظاہر ہے حیدر صاحب متن میں روانی اور نشاط پیدا کرنے کے لئے صنعتِ تکرار کا استعمال کرتے ہیں جو ترکی میں موجود ہونے کے باوجود احمد حکمت نے استعمال نہیں کی۔

۷۔ ،، وہ عندلیب جو پنجرے میں بیٹھی رہی تھی چپ ہوگئی ... گھنگرو آہستہ آہستہ اتار ڈالے"۔
حیدر کے یہ اپنے جملے ہیں جن سے متن میں مشرقی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔

۸۔ ،،سوسن، نیلوفر، کبک ادا، طاؤس خرام جیسے الفاظ ترکی میں نہیں ملتے۔ اور اسی طرح ،،گلال اور چاندی کے ذرّے بکھرے ہوئے تھے"، "ہاتھوں میں پھول کے پنکھے،، بھی حیدر کے اپنے خیالات ہیں۔

۹۔ پھلوں کے ناموں میں بھی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ انناس، کیلوں کی جگہ انار انگور جیسے ترکی پھل دیئے گئے ہیں۔ ترکی درختوں کی جگہ تاڑ، برگد، سال، ببول وغیرہ ملتے ہیں۔

۱۰۔ حیدر اس جزیرے کو لنکا کے قریب دکھاتے ہیں حالانکہ ترکی میں اس جزیرے کی کوئی جگہ معین نہیں۔

۱۱۔ ترکی متن میں چیڑ کے درخت سے زخم کی دوا بنانے کا ذکر آتا ہے جو ترکی کے پرانے تمدّن کا حصہ ہے۔ اسے حیدر صاحب نے نکال دیا ہے۔

نتیجہ:۔ یہاں ان تین افسانوں کے مقابلے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر نیرنگ کا بیان بالکل صحیح ہے وہ کہتے ہیں" ان کے بیان میں کہیں کہیں تو انگریزیت کی جھلک ہے اور کہیں غالباً ترکی طرزِ بیان کا چربہ ہے مگر داد کے قابل یہ بات ہے کہ انگریزی اور ترکی کی یہ تقلید علمی طور پر ایجاد کا حکم رکھتی ہے کیونکہ وہ غیر مانوس اور ناخوشگوار نہیں ہونے پاتی[۱]،،

●●

۱۔ میر غلام بھیک نیرنگ، تمہید خیالستان، خیالستان، سید معین، ص ۲۳

جناب رئیس احمد نعمانی
دانش‌پژوه، رشتهٔ تحقیقات زبان و ادبیات فارسی
دانشگاه لکهنؤ

قند پارسی

در مورد عده‌ای از کتابها، دانشمندان و پژوهشگرانی که نسخهٔ چاپی یا خطی‌ای آن را ندیده یا ذکرش در فهرستهای متداول بنظرشان نخورده، معتقد شده‌اند که آن کتابها اصلاً وجودی نداشته یا امروز باقی نیست. درحالیکه حقیقت چنین نبوده و نیست و نسخه‌های خطی یا چاپی یا از هر دو نوع از آن کتابها بجا مانده و هم اکنون در کتابخانه‌های مختلف جهان نگهداری می‌شود. "قند پارسی" گرد آوردهٔ عبدالغفور خان نساخ نیز یکی از این گونه کتابهاست[1] که پژوهشگر معروف معاصر پاکستان دکتر علی رضا نقوی در اثر گرانبهائی خود بنام "تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان" دربارهٔ آن چنین قلمداد کرده است: "اسم کتابهائی زیر در بعضی از تذکره‌ها ذکر شده است، اما چون ظاهراً نسخه‌ای از این کتابها بجا نمانده، بنابراین نمی‌شود بطور حتمی دربارهٔ موضوع آن چیزی گفت. بعضی از این کتابها مجموعهٔ اشعار بوده است:

۱۔ سخن الشعرا تالیف مولوی عبدالغفور خان بهادر نساخ (رجوع شود به شمع انجمن)

۲۔ قند پارسی تالیف مولوی عبدالغفور خان بهادر نساخ، از مآخذ اختر تابان و نگارستان سخن."[2]

محقق نامی ایران آقای احمد گلچین معانی در جلد دوم از تالیف نفیس خود که "تاریخ تذکره‌های فارسی" نام دارد، در زیر عنوان "قند پارسی" نوشته است:

"بعضی از تذکره نویسان متاخر هندوستان قند پارسی را در شمار مآخذ خود مذکور داشته‌اند (رک تذکرهٔ اختر تابان (ص ۴) و نگارستان سخن، ص ۱۶۱) و چون این دو کتاب در بهوپال تالیف و طبع شده است

---

[1] از باب مثال، خریطهٔ جواهر تالیف میرزای مظهر دهلوی را نیز میتوان نام برد که صدها نسخهٔ چاپی آن در کتابخانه‌های دنیا بالفعل موجود است، ولی محقق نامی معاصر ایران آقای احمد گلچین معانی از وجود خارجی آن انکار می‌فرماید. (رک تاریخ تذکره‌های فارسی ج ۱ ص ۲۰)

[2] تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان ص ۱۱۔

بطور قطع تا پایان قرن سیزدهم نسخهٔ آن در آن سامان وجود داشته ولی بالفعل در هیچیک از فهرستها ذکرش نیامده است.»[۳]

خوشبختانه، بنده موفق شدم نسخهٔ چاپی قند پارسی را بدست آورم، و اینک می خواهم اطلاعات لازم در پیرامون این کتاب و مؤلفش به علاقه مندان ادبیات فارسی تقدیم کنم و در ضمن اشاره ای به تسامحات در داستان محقق نامبرده می نمایم:

گردآورندهٔ قند پارسی | ابو محمد عبدالغفور خان بهادر متخلص به مجبور و سپس به نساخ، روز عید الفطر (یکم شوال)، به سال ۱۲۴۹ه در شهر کلکته (بنگال باختری) دیده به جهان گشود. در هفت سالگی در مدرسهٔ عالیه کلکته (یکی از حوزه های علمی معروف آن سامان) شروع به دانش آموزی کرد، ولی بعلت وفات ناگهانی پدرش در ۱۲۵۹ه رشتهٔ تحصیلات او گسیخته شد. اما پس از سه سال از آن سانحه در ۱۸۴۷م به دانشکدهٔ هگلی راه یافت و در ۱۸۵۲م دورهٔ دانشکده ای را در آنجا به پایان رسانید به جست وجوی وسیله ای برای تامین امور معاش به داکا رفت و در دادسرای دوری ای با مواجب ده روپیه ماهانه به استخدام دولت درآمد. بعد چندی در دادگاه دیوانی صدر به سمت مترجمی منصوب گردید و در ۱۸۶۰م به نیابت کلانتری و سپس به نیابت تحصیلداری رسید و برای انجام وظایف منصبی خود در هگلی، بهاگلپور، راجشاهی، باریسال و داکا اقامت داشته و در ۱۲۸۴ه اولین سفرش به دهلی کرد و پس از دو ماه به راه لکهنؤ و اله آباد بازگشت به بنگال نمود. از آن به بعد در سالهای ۱۸۷۰م، ۱۸۷۹م و ۱۸۸۵م سه بار دیگر به دهلی رفت. وفاتش در ۱۳۰۶ه اتفاق افتاد.[۴]

نساخ یکی از دانشمندان و سخن سرایان بارز عصر خود بوده و علاوه بر سرودن شعر به فارسی و اردو، بیش از بیست کتاب نگاشته است، از آن جمله چهار دیوان شعر است بزبان اردو که با عنوانهای مختلف به سالهای ۱۲۸۰ه، ۱۲۹۱ه ۱۲۹۴ه و ۱۳۰۴ه بچاپ رسیده است. چشمهٔ فیض (ترجمهٔ پندنامهٔ عطار) گنج تواریخ، کنز التواریخ، شاهد عشرت، سراپای محبوب، وغیره نیز از آثار منظوم اوست. واما در نثر مهم ترین آثارش عبارت است از: زندگی نامهٔ خود نساخ، انتخاب نقص،

---

[۳] تاریخ تذکره های فارسی ج ۲ ص ۸۰۲. [۴] برای اخذ اطلاعات مفصل در پیرامون زندگانی نساخ باید به منابع زیر رجوع کرد: زندگی نامهٔ خودنوشت نساخ که نسخهٔ خطی آن در کتابخانهٔ انجمن آسیایی بنگال در کلکته نگاهداری می شود. دیباچه "دفتر بی مثال" که یکی از دیوانهای نساخ است و به سال ۱۲۸۰ه توسط مطبع مظهر العجائب کلکته بچاپ رسیده است. دیباچهٔ "انتخاب نقص" تالیف نساخ چاپ در ۱۲۹۲ه توسط مطبع نظامی کانپور. اردو در بنگال (بنگال میں اردو) نوشتهٔ وفا راشدی چاپ حیدرآباد (پاکستان) در ۱۹۵۵م ص ۴ تا ۴۰. اردو در بنگال خاوری (مشرقی بنگال میں اردو) تالیف سید اقبال عظیم چاپ داکا (ڈھاکا) در ۱۹۵۴م ص ۴۵ تا ۶۰. نساخ (حیات و تصانیف) از دکتر محمد صدرالحق چاپ کراچی ۱۹۷۷م. مقالهٔ آقای عقیت الحسن در مجلهٔ "نگار" لکهنؤ شمارهٔ مارس و آوریل ۱۹۵۹م. مقالهٔ سید لطیف الرحمن در مجلهٔ "نوای ادب" بمبئی شمارهٔ اکتبر ۱۹۶۰م. مقالهٔ آقای وحشت کلکته ای در مجلهٔ ماه نو کراچی شمارهٔ مارس ۱۹۵۱م.

قطعهٔ منتخبه، سخن شعرا و تذکرة المعاصرین. شه

نساخ به فارسی نیز اشعاری می سروده که انتخاب آن را میتوان در شمع انجمن (ص ۴۸۷ تا ۴۸۹) دید، و خود او در قند پارسی بعضی از ابیاتش را آورده است که در شمع انجمن وغیره نیست. و آن این است:

خدایا شوخی ارنی عنایت کن زبانم را | بزن آتش ز شمع کن ترانی جسم و جانم را

دل پژمرده ام نساخ داغ گل نمی دارد | بهار تازه باشد در بغل نخل خزانم را

هر سرو که رست از گل ما | آهی است که خاست از دل ما

با تو شکایت غم هجران گناه من | با من بیان وصل رقیبان گناه نیست

چاک بر چاک سینه ام چو کتان | صنم رشک ماه کرد و گذشت

نساخ از این خرقهٔ سالوس که داری | کفار تنگ اند و مسلمان گله دارد

دل نساخ را روز نخستین | برای عشق خوبان آفریدند

هر تار گیسوی ترا تاتار و چین زیر نگین | یاقوت لبهای ترا کوه بدخشان در بغل

رخسار پرنور ترا صبح وطن در آستین | چشم سیه مست ترا شام غریبان در بغل شه

قند پارسی | "قند پارسی" جنگ اشعاری است که ظاهراً نساخ در اواخر ایام جوانی خودش به انتخاب از دیوانهای شاعران و تذکره های فارسی گرد آوری نموده، و بعد س نگارندهٔ همین مجموعه بود، ادر تالیف تذکره شعرای فارسی اساس کار وی قرار گرفته چنانکه اساس بسیاری از تذکره های مهم فارسی وارد و همین گونه جنگها بوده است.

این کتاب در همان آوان که مؤلف آن هنوز لقید حیات بوده واز عمرش چهل سال بیش نرفته بود، توسط مطبع نول کشور در لکهنو به سال ۱۸۷۲م (۱۲۸۹ھ) بچاپ رسیده بود. و همان نسخهٔ چاپی در دست نگارندهٔ این مقال است شه. این نسخه در ۱۱۸ صفحه بقطع وزیری چاپ و نشر گردیده است و در صفحهٔ اولش نام گرد آورنده چنین نوشته شده است:

"جمع کردهٔ مقتدای ادا فهمان سخن، سر آمد سخن شناسان زمن، جناب مولوی عبدالغفور خان بهادر متخلص به نساخ"

در آغاز قند پارسی دیباچه ای جز از "بسم الله الرحمن الرحیم" نیست، و همچنان در پایان کتاب نیز غیر از دو سطر بدست

شه تذکره های شعرای اردو و تذکره نگاری (اردو شعرا کے تذکرے اور تذکره نگاری) ص ۳۵۳ شه قند پارسی ص ۱۰۶ شه قند پارسی لااقل یک بار دیگر توسط همان مطبع نولکشور لکهنو در ضمن مجموعه ای باعنوان "کلیات نساخ" چاپ گردیده است. و این مجموعه شامل این ده اثر نساخ بوده: ۱- شاهد عشرت ۲- سخن شعرا ۳- اشعار نساخ ۴- مرغوب دل ۵- دفتر بیمثال ۶- گنج تواریخ ۷- چشمهٔ فیض ۸- زبان ریخته ۹- قطعه سخن، ۱۰- قند پارسی (و موجود بودن فهرست کتب مطبع نولکشور که در آخر دیوان ظهیر فاریابی چاپ شده است.)

کار مصداق مطلع "حتی کلمه ای از قلم گردآورندهٔ آن نیامده است". و چون کتاب حاضر در زمان حیات مؤلف آن بچاپ رسیده و انتشار یافته است، احتمال نمی رود که در ترتیب و تکمیل آن کاستی و خللی راه یافته باشد، و باید کتاب را کامل دانست.

این مجموعه شامل منتخبات اشعاری از هفت صد و نوزده شاعر متقدم و متأخر ایران و هند و پاکستان و روی هم رفته حاوی بیست و دو هزار و نهصد و هشتاد و چهار بیت برگزیده است. ترتیب کتاب الفبایی است با رعایت الف[الف] ممدوده، و در پاره ای از موارد حرف دوم تخلص شاعر نیز رعایت نشده است. کتاب با بیت زیر از آزاد اصفهانی آغاز می یابد:

دوش آمد ناصحی سوی ملامت خانه ام گفت عاقل می شوی؟ گفتم مگر دیوانه ام؟

و با این بیت میرزا یوسف قزوینی پایان می پذیرد.

چه کوتاه است شبهای وصال دلبران یارب خدا از عمر ما بر عمر این شبها بیفزاید

نساخ در هیچ جایی نشان نداده است که در گردآوری این جنگ اشعار چه منابعی در دست داشته، ولی پیداست که دیوانهای همه هفت صد و نوزده شاعر را در دست نداشته و دقیقاً نخوانده باشد و بحکم ضرورت حتماً از تذکره و جنگهای اشعار دیگر نیز انتخاب زده و ظاهراً در مورد همعصران خودش از جریده و مجله های ادبی آن روز و ارتباطات کتبی و برخوردهای شخصی با معاصران نیز استفاده کرده باشد.

مطالعه تند پارسی می رساند که گردآورندهٔ آن به مثنوی، رباعی و قصیده اعتنایی نداشته است، و همین است که در جمع آوری این مجموعه غالباً از سرایندگان غزل نمونهٔ ابیات آورده است و اگر کسی از سرایندگان مثنوی یا رباعی و قصیده را در دست داشته است، از او نیز یا بیتی از ابیات عاشقانه گوی آورده و یا در یک دو جایی قطعه ای را به انتخاب برداشته است، مثلاً عمر خیام (که به اشتباه با عنوان یک رباعی گو در سراسر جهان شهرت دارد) نساخ قطعه ای از او آورده است با آغاز بیت.

دوش در عقل با سخن بردم کشف شد بر دلم مثالی چند[8]

و یا مثلاً از فرخی سیستانی تنها همین یک بیت را برگزیده است:

ترا چه غم که ترا هر کسی به جای من است مرا است غم که مرا هیچ کس به جای تو نیست[9]

و از نظامی گنجوی قطعه ای با مطلع:

دوش رفتم به خرابات مرا راه نبود می زدم نعره و فریاد کس از من نشنود

اما از غزل سرایان نیز ابیات پراگنده ای برگرفته است غیر از یک دو شاعر که غزل کاملی از او آورده. بارها انتخا[ب]

---

۸ ـ ۹ ـ [illegible]

ابیات چندان سرسری نیست ونشان می دهد که مؤلف از ذوق سخن بی بهره نبوده است، و براثر همین ذوق است که از نزدیک به چهار صد شاعر در قند پارسی تنها یک بیت بنظر می خورد، و از بیش از صد سرانیده تنها دو بیت در این جنگ جای یافته است، و از جمله بیش از هفت صد شاعر فقط از دو بیست از آنها سه یا بیشتر بیت مورد پسند مؤلف قرار گرفته است. و از میان آنها تنها از بیست و نه کس ده یا مزید بر آن بیت انتخاب شده است.

و اما از نظر کثرت ابیات، انتخاب غالب دهلوی از همهٔ دیگران مفصل تر است که به چهل و دو بیت می رسد، و دیگر شاعرانی که ابیاتشان را نساخ بیشتر دوست داشته بدین قراری باشند:

"عاشق اصفهانی (۲۷ بیت)، سعدی شیرازی (۳۶ بیت)، عبدالرحمن جامی (۳۵ بیت)، حافظ شیرازی (۳۵ بیت)، خسرو دهلوی (۲۷ بیت)، نظیری نیشاپوری (۲۶ بیت)، علی قلی میلی (۲۶ بیت)، علی حزین (۲۵ بیت)، شرف جهان قزوینی (۲۲ بیت)، و شاعرانی که ده تا هفده بیت آنها در این مجموعه ایراد شده است، عدهٔ شان از نوزده کس بیشتر نیست."

نوادر قند پارسی | واینک ابیاتی از قند پارسی رو نویس کرده می آید از سرانیدگانی که اشعارشان در منابع دیگر به ندرت آمده و یا هرگز نیامده است و نساخ ظاهراً از مآخذ کمیابی برگرفته است که از بین رفته و یا فعلاً در دسترس محققان نیست:

۱- اختر (؟):

تا نازنوزه کرد کمانی به کمینی — یک صید نیاسود زمانی به زمینی (ص ۴)

۲- ارشاد، مولوی محمد ارشاد دهلوی:

دامن آلوده می روی، زنهار — پاک کن دل ز گرد هستی ها
بگذر از راه این جهان غافل — هوشیاری است به ز مستی ها (ص ۵)

۳- آصف، میرزا محمد باقر شیرازی:

صبح وصل ترا شب آمد نیست — شام وصل ترا سحر، چه علاج؟ (ص ۷)

۴- امین، مولوی امین الدین دهلوی:

خرقهٔ سالوس را ترک بگو زاهدا — بیعت خمار کن، رند قدح نوش باش (ص ۱۰)

۵- امین، محمد امین خان میر جمله:

افتادگان ای به طالعم هست — دریای غمی چرا نسفتم (ص ۱۰)

۶۔ ابتہاج، ملا جگل کشور دهلوی:

به بازارش نبردم زان متاع طاعت خود را کہ می بینم گران آن جا بهای جنس عصیان را (ص ۱۱)

۷۔ اوجی اصفهانی:

قابل ماتم نیم، اما به رغم آسمان گریه از گریه شادی است، بچشمی ترکنید (ص ۱۱)

۸۔ آهی، سید احمد خان دهلوی:

خاکم چو بو نشید به میدان قیامت افتاده به هر گوشه، دامان تو یابند (ص ۱۳)

۹۔ بسمل، پنڈت رام کشن بسمل:

سرشک دیدهٔ غماز کشف رازم کرد فغان که پرده ز روی غم نهان برداشت (ص ۱۵)

۱۰۔ بلبل، پنڈت گوری شنکر لاهوری:

گشت ویران خانهٔ دیوانه ای هر کجا ویرانه ای آباد شد (ص ۱۵)

۱۱۔ تمنا جیپوری:

این قدر آشفتگی هر دم چرا بودی مرا آشنا گر آن بت نا آشنا بودی مرا (ص ۱۸)

۱۲۔ خافی، خانجهان دهلوی:

آن که بد مستیم انکار به بیجامی کرد چشم میگون ترا کاش تماشا می کرد (ص ۲۴)

۱۳۔ خسروی، نایتی:

بر ما خیال زلف تو شبهای تار را چندان دراز کرد که روز از میانه رفت (ص ۲۵-۲۶)

۱۴۔ مولانا رازی (؟):

زدی آتشی به جان ذرمنت خبر نباشد خبرت شود زمانی که ز من خبر نباشد (ص ۴۱)

۱۵۔ رازی، فصاحت خان:

بندگی کیشم تمیز کعبه و دیرم کجاست دیده ام هر جا دری آنجا سجودی کرده ام (ص ۴۱)

۱۶۔ رشکی، اعظم خان:

آخر به هیچ خاطرش آزرده شد ز من رشکی ببین که طالع دشمن چه می کند (ص ۴۲)

۱۷۔ رضی، قاضی رضی الدین اصفهانی:

از خدا قرب تو آن روز که می خواست رقیب   کاش آزادی مانیز تمنا می کرد   (ص ۴۴)

۱۸۔ میر رد می (سید جعفر ؟):

به کیش سخت دلان غم فسردگی ننگ است   گواه این سخن است آتشی که در سنگ است   (ص ۴۵)

۱۹۔ سید (؟):

معماری اقلیم دل مانتوان کرد   چندان که در دو دیده کند کار خراب است   (ص ۵۸)

۲۰۔ صابری، ضیاء الدین محمد:

نه از ناز است اگر حرفش به لب دیر آشنا گردد   سخن را دل نمی خواهد کز آن لبها جدا گردد   (ص ۵۸)

۲۱۔ صالح، محمد صالح گورکانی:

ای به درگاه تو نیاز همه   کرم تست کارساز همه

اگر از چهره پرده برداری   به حقیقت کشد مجاز همه

مه و شان منظر جمال تو اند   بهر آن می کشیم ناز همه   (ص ۵۹)

۲۲۔ عزت (؟):

موسیٰ به کوه طور که جا گرم داشته است   دستی بر آتش دل ما گرم داشته است   (ص ۱۰)

۲۳۔ کاشی (؟):

چشم بر راه صندمی خواران که کی باران شود   ابر می خواهند مستان خانه گو ویران شود   (ص)

۲۴۔ ملک سرکانی:

گر داشتی به قتل کسی تیغ از سری   هر دم هزار سر ز گریبان بر آمدی   (ص ۱۰۱)

اشتباهات نساخ در قند پارسی | متأسفانه بر اثر نقص تتبع اشتباهاتی در قند پارسی راه یافته است که در زیر نشان داده می شود:

۱۔ ابوالفاخر که پیش از ابوالقاسم آورده شده است (ص ۲) ابوالمفاخر است که از سخن سرایان ری بوده۔

۲۔ میرزا اسیر رازی (ص ۶) و امیر قاضی اسیری رازی (ص ۷) که دو کس نشان داده شد، همان یک اسیری رازی است که به هند آمده و باز گشت به ایران نموده بود و همه ابیاتی که زیر این دو نام نوشته شده است از همین اسیری است۔

۳۔ محمد سعید اشرف اصفہانی (ص ۷)۔ اشرف مازندرانی است کہ با نام سید اشرف شہرت دارد۔

۴۔ اصلی مشہدی (ص ۸)، اصلی قمی (ص ۸)۔ ھردو اصیلی ھستند۔

۵۔ ملا اعلی گل تورانی (ص ۸) نامش گل محمد و تخلص اعلی بود، و این ھمان کس است کہ والہ داغستانی در ریاض الشعرا بہ اشتباہ او را اعلی دانستہ و در روضۃ العین مذکور داشتہ است۔

۶۔ مرزا نیاز امید (ص ۹) نام این امید امتیاز بودہ کہ نساخ آنرا نیاز ساختہ، و این امتیاز از مردم بلخ است۔

۷۔ انسی ترشیزی (ص ۱۰) تذکرہ نویسان با اعتبار این انسی را جنابدی نوشتہ اند

۸۔ ادجی نظری (ص ۱۱) نظری (ن ظاری) درست نیست، این ادجی نطنزی (ن ط ن ز ی) است از مردم نطنز۔

۹۔ عبدالقادر ایجاد (ص ۱۳) نام این ایجاد، عبدالعزیز است و وی از تلامذۂ میرزا عبدالقادر بیدل بودہ است۔

۱۰۔ بھای عالمی (ص ۱۵) بھائی یا بھایی عالمی درست است۔

۱۱۔ داعی ہمدانی (ص ۲۸) دامی بہ جای داعی درست است۔

۱۲۔ میر اولاد محمد ذکایی بلگرامی (ص ۴۰) ذکا بدون یای نسبت است۔ آزاد بلگرامی کہ برادر حقیقی پدر ذکا بود تخلص وی را در ہمہ جا ذکا نوشتہ است و بہ شیوۂ ایرانیان ھم بنویسند یا ذکائی یا ذکایی درست نباشد و باید فقط یک یا بہ ذکا اضافہ کردنہ کہ دو یا و یا یک ہمزہ و یا۔

۱۳۔ علی شاہ ذوقی اصفہانی (ص ۴۰) این ذوقی اردستانی است۔

۱۴۔ مرزا سید رضا (ص ۴۲) و مرزا سید رضا اصفہانی (ص ۴۳) ھمان یک رضای اصفہانی است کہ نساخ دو پنداشتہ است۔

۱۵۔ میر رضی ارجانی (ص ۴۳) رضی آرتیمانی درست است۔

۱۶۔ زلالی ادرگیتی (ص ۴۶) و زلالی ھروی (ص ۴۶)۔ این ھردو زلالی یکی است کہ دو پنداشتہ شدہ۔

۱۷۔ سپھری اصفہانی (ص ۴۷)۔ غالب تذکرہ نویسان این سپھری را زوارہ ای نوشتہ اند۔

۱۸۔ سعد کالی شیرازی (ص ۴۸) سعد گل شیرازی درست است۔

۱۹۔ خواجہ جلال الدین محمد سلمان ساوجی (ص ۵۰) جمال الدین بہ جای جلال الدین درست است۔

۲۰۔ مولانا سمری (ص ۵۱)۔ سپھری (با اضافہ پ میان س و ہ) درست است۔

۲۱ - شریف کاشی (ص ۵۴). بیتی که در زیر این نام ثبت گردیده است از شریف تبریزی است ۔

۲۲ - قاضی شمس الدین طبّی (ص ۵۶) طبسی به جای طبّی درست است ۔

۲۳ - صیفری دیلمی (ص ۶۱) و صیفری قزوینی (ص ۶۱) ۔ دو کس نیستند و همان یک صیفری قزوینی پسر ملا ملک دیلمی است ۔

۲۴ - سیقلی یزدجردی (ص ۶۲) ۔ بروجردی (ب ر و ج ر د ی) به جای یزدجردی (ی ز د ج ر د ی) درست است ۔

۲۵ - طوقی تبریزی (ص ۶۴) طوفی (ط و ف ی) به جای طوقی (ط و ق ی) درست است ۔

۲۶ - شاه اسماعیل ثانی صفوی عادل (ص ۶۶) عادلی با اضافه یک ی درست است ۔

۲۷ - عبدالله خان ازبک (ص ۶۹) و عبیدالله خان ازبک (ص ۶۹) ۔ ظاهراً همان یک عبیدالله خان ازبک است که عبیدی تخلص می کرده است ۔ و واله داغستانی بر اثر نسیان خود همین یک کس را در سه محل در ریاض الشعرا مذکور داشته است ۔

۲۸ - عزیز الدین محمد کاشی (ص ۷۱) عزالدین بجای عزیزالدین درست است ۔

۲۹ - محمد مومن عزی شیرازی (ص ۷۲) ۔ هرچند که شیرازی بودن این عزی اشکالی ندارد ولی به بیان تذکره و تاریخ نویسان با عزی فیروزآبادی شناخته می شود (فیروزآباد از نواحی و محلات شیراز است)

۳۰ - خواجه عزیز الدین شروانی (ص ۷۲) ۔ عزالدین بجای عزیزالدین درست است ۔

۳۱ - ملا اشنیانی قمی (ص ۷۴) آشتیانی (آ ش ت ی ا ن ی) به جای اشنیانی (ا ش ن ی ا ن ی) درست است ۔

۳۲ - غضنفر گلناری (ص ۷۹) کلجاری (ک ل ج ا ر ی) به جای گلناری (گ ل ن ا ر ی) درست است ۔

۳۳ - ضیاءالدین فارسی خجندی (ص ۸۱) ۔ مانند بعضی از تذکره نویسان دیگر، نساخ هم، تخلص این ضیا را «فارسی» دانسته و در بند حرف «فا» آورده است ولی این اشتباه فاحشی است و می بایست این ضیا در ذیل حرف (ض) آورده می شد ۔

۳۴ - مرزا نصیر اسفاری هروی (ص ۸۴) ۔ انصاری به جای اسفاری درست است ۔

۳۵ - قایلان بیگ (ص ۸۸) ۔ قبلان بیگ درست است ۔

۳۶ - نضولی نجفی (ص ۸۴) ۔ همه تذکره نویسان معتبر این فضولی را بغدادی نوشته اند ۔

۳۷ - کلوعلی شیرازی (ص ۹۲) ۔ نام درست این شاعر کلب علی و تخلص کلبی است ۔

۳۸ - محسن طوسی (ص ۹۵) ۔ ارباب تذکره این محسن را مشهدی نوشته اند ۔

۳۹ - مرزا ملک مشرقی (ص ۹۸) و مشرقی (ص ۹۸) ۔ همان یک مشرقی مشهدی است که نساخ دو دانسته است ۔

۴۰ - میرزا زین العابدین نشاط مشهدی (ص ۱۰۷) ۔ این نشاط شیرازی بوده است ۔

۴۱ - نزلی جنونی (ص ۱۱۱) - نمبرشانی ذ خ ب و ش ان ی، به جای جنونی درست است -

۴۲ - وحشی یزدی (ص ۱۱۳) - هرچند این وحشی در یزد نیز زندگی می کرده است، ولی موطن اصلی و زادگاهش بافق (از حوالی کرمان) است و محققان وی را با نسبت بافقی مذکور داشته اند -

۴۳ - مولانا هلالی استرآبادی (ص ۱۱۶)، و هلالی شیرازی (ص ۱۱۷) - این هر دو هلالی یکی است -

۴۴ - محمد تیم یزدجردی (ص ۱۱۸) بروجردی (ب ر و ج ر د ی) به جای یزدجردی (ی ز د ج ر د ی) درست است -

تسامحات محققان در شناختن و شناساندن قند پارسی

اشتباهات نساخ را که دیدیم.

باید نگاهی به تسامحات محققان بنام زبان فارسی نیز بکنیم که در معرفی کتاب "قند پارسی" از قلم ایشان سرزده است، اقتباس هائی که در صفحهٔ اول این مقاله رونویس شده است، آنها را باز بخوانید و ببینید که:

"آقای دکتر نقوی نام تذکرهٔ معروف و متداول نساخ را "سخن الشعرا" نوشته و در مورد این کتاب به "شمع انجمن" ارجاع داده است -

بنده به عرض می رسانم که نام این کتاب "سخن شعرا" بدون الف و لام وا ثره "شعرا" است، و این با همین نام در چند چاپ خورده است - "سخن الشعرا" هم از بن درست . درست نیست که سخن وا ثرهٔ فارسی است و "شعرا" وا ثره عربی ، هر چند که به وا ثره های عربی الف و لام برای معرفه ساختن اسم نکره می آید ولی در این صورت که مضاف اسم فارسی ای باشد نمی توان اسم عربی ای را با اضافه الف و لام مضاف الیه آن قرار داد - "سخن الشعرا" هم از این جهت اشتباه فاحشی است که "سخن شعرا" نام تاریخی این کتاب است که به سال ۱۲۸۱ھ سمت تالیف یافته و همین عدد از "سخن شعرا" بدون الف و لام بر می آید ولی از "سخن الشعرا" با الف و لام شمارهٔ ۱۳۱۲ بدست می آید، در حالیکه مؤلف کتاب در ۱۳۰۶ھ وفاتش واقع شده بود -

و اما راجع به ارجاع به "شمع انجمن" اینکه در شمع انجمن ترجمهٔ حال نساخ در ۷ سطر و ۲۶ بیت منتخب از اشعارش (در ص ۴۸۷ تا ۴۸۹) آمده است، ولی در هیچ صفحه ای از صفحات شمع انجمن نام سخن شعرا ثبت نیفتاده است.

هر دو استاد نامور آقای نقوی و گلچین "قند پارسی" را از مآخذ "نگارستان سخن" و "اختر تابان" نوشته اند - نگارنده می گویم: قند پارسی از منابع عمدهٔ "نگارستان سخن" بوده و مؤلف نگارستان سخن (هر که باشد)، اسامی و ابیات غالب سرایندگان را از قند پارسی برگرفته و برای بسیاری از آنها تراجم سانختگی نیم سطری و یک سطری افزوده است، ولی "قند پارسی" حتماً و قطعاً از منابع "اختر تابان" نبوده و نتوانند بود - زیرا که "اختر تابان" تذکره "زنان شاعر" است و شاعران

که اسماء اشعار شان در قند پارسی گردآوری شده است، حتی یک تن از آن بیش از هفت صد شاعر "زن" نیست.

آری، در (ص ۴) از اختر تابان نام قند پارسی بچشم می خورد، اما مؤلف "اختر تابان" هرگز این کتاب را از منابع خود نشمرده است. راستی آن است که این مصدر محقق عصر ما در مطالعۀ دیباچه "اختر تابان" به اشتباه فاحشی درافتاده و به منطوق مؤلف آن پی نبرده اند (و یا اصلاً اختر تابان را ندیده و تحقیقات مغلوط دیگران را در کتابهای خود بدون نشان دادن مرجع خود ثبت فرموده اند)، درحالیکه عبارت آن دیباچه هیچ ابهام و اغلاقی ندارد. اگر این محققان گرامی دیباچۀ اختر تابان را با دقت و بیداری می خواندند، معلومشان می شد که مؤلف اختر تابان ۴۳ کتابی را که در دیباچه خود نام برده است، آن کتابها را هرگز از منابع خود نشان نداده است و به عبارت روشن و ساده و قابل ادراک گفته است که آن کتابها از منابع "شمع انجمن، صبح گلشن نگارستان سخن و روز روشن" بوده و این تذکره های چهارگانه به اقتباس از آن سی و چهل کتاب ترتیب و تالیف یافته است. و با اینکه این چهار تذکره از آن همه منابع مستفاد و ماخوذ است، روی هم رفته ذکر بیش از چهل زن سخنور در این تذکره یافته نمی شود. و اینک اصل عبارت اختر تابان:

"شمع انجمن و نگارستان سخن و صبح گلشن و روز روشن که حاوی ذکر خیر پنج شش هزار شاعر نامدار اند (و این استفاد اربعه، از: سرو آزاد و خزانۀ عامره و ید بیضا هر سه مؤلفۀ میر آزاد مرحوم و آفتاب عالمتاب محمد صادق خان اختر و نشتر عشق حسن علی خان عظیم آبادی و آتشکدۀ آذر و تذکرۀ حسینی و تذکرۀ جوهری دری و لب لباب (لباب الالباب) عوفی و تذکرۀ سامی و دولت شاهی و خلاصة الاشعار میر تقی کاشی و هفت اقلیم مرزا امین رازی و منتخب التواریخ عبدالقادر و مجمع الفضلای ملا بقایی و تذکرۀ مرزا طاهر و مرآة الخیال شیر خان و همیشه بهار اخلاص و حیات الشعرای متین کشمیری و سفینۀ میر عظمت الله بی خبر و ریاض الشعرای علی قلی خان و کلمات الشعرای سرخوش و مجمع النفایس خان آرزو و تذکرۀ تقی اوحدی و بی نظیر دولت آبادی و مردم دیده حاکم لاهوری و نتایج الافکار قدرت و تذکرۀ ناظم تبریزی و تذکرۀ ملا قاطعی و گل رعنا و شام غریبان و جواهر زواهر شفیق اورنگ آبادی و قند پارسی نساخ و گلستان مسرت و نشتر غم و نفایس المآثر و صبح صادق و تذکرۀ باغ ارم و خریطۀ جواهر و گلزار ابرار، و دیگر چند کتب معتبر و جنگهای شعرای نامور و مجامیع و سفاین و اسفار فن ادب و دیگر علوم و فنون که تفصیل اسمای آن بسیار است)، و تراجم اکثر سخنسنجان هم عصر آرایش و پیرایش یافته اند. چون تفحص بکار رفت صرف نام و نشان قریب چهل شاعره زنان برآمد." (ص ۳ - ۴)

---

۵ در ص ۶۱۹ - ۶۲۰ "تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان" و هم چنین در ص ۳۰ جلد اول از کتاب "تاریخ تذکره

های فارسی" نیز این هردو محقق مرتکب همین اشتباه شده اند که حتماً بر اثر همان بی دقتی و شتابزدگی در مطالعه دیباچه "اختر تابان" و تکیه به تحقیقات ناشایسته دیگران بوقوع پیوسته است.[۱۱]

● از محققان شهیر ایران و پاکستان از این گونه صدها اشتباهات سرزده است که ان شاء الله در مقاله های دیگر مورد بررسی و انتقاد قرار خواهم داد.

مراجع این مقاله:

۱۔ قند پارسی، عبدالغفور خان نساخ، چاپ مطبع نول کشور، لکهنؤ ۱۸۷۲م (۱۲۸۹ھ)

۲۔ تذکره های شعرای اردو و تذکره نگاری، دکتر فرمان فتحپوری، چاپ لاهور، پاکستان ۱۹۷۲م

۳۔ تذکره نویسی فارسی در هند و پاکستان، دکتر سید علی رضا نقوی، چاپ تهران (ایران) ۱۳۸۳ھ

۴۔ تاریخ تذکره های فارسی ج ۱ چاپ تهران ۱۳۴۹ش

۵۔ تاریخ تذکره های فارسی، احمد گلچین معانی، چاپ تهران ۱۳۵۰ش

۶۔ اختر تابان، ابوالقاسم محتشم، چاپ بهوپال ۱۲۹۹ھ

۷۔ شمع انجمن، نواب سید صدیق حسن خان، چاپ بهوپال، ۱۲۹۲ھ

۸۔ مجله "اکادمی" لکهنؤ، شماره مارس و آوریل ۱۹۸۶م

۹۔ فهرست کتب، مطبع نول کشور، لکهنؤ، ۱۹۱۶م (۱۳۳۴ھ) / با پیوست دیوان ظهیر فاریابی)

۱۰۔ باغ فکر، عبدالغفور خان نساخ، چاپ بهوپال، ۱۹۸۷م

●●

---

[۱۱] گذشته از دیباچه "اختر تابان"، در قرائت متن این کتاب نیز آقای گلچین دقت را بکار نبرده و مرتکب اشتباهاتی شده است. مثلاً در ص ۲۰ ج ۲ تاریخ تذکره های فارسی می نویسد: "در این تذکره پاره ای از اشعار مخفی رشتی بنام زیب النساء بیگم مخفی دختر اورنگ عالمگیر ثبت شده است از جمله قطعه مشهور او که بر سبیل مطایبه سروده است:

مخفیا دختران خطه رشت — چون غزالان مست می گردند

گز پی مشتری به هر بازار — بند تنبان بدست می گردند"

علاوه بر اینکه تخلص زیب النساء بیگم مخفی نبوده و نسبت این قطعه به مخفی رشتی نیز معتبر نیست، مؤلف اختر تابان این قطعه را بنام زیب النساء هرگز ثبت نکرده و به همان مخفی رشتی منسوب داشته است. (ببینید اختر تابان ص ۱۹).

حکیم وسیم احمد اعظمی
لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونانی)
نئی دہلی

کتاب المنصوری اور اس کے تراجم

کتاب المنصوری، ابوبکر محمد بن زکریا رازی (متوفی ۳۱۲ھ / ۹۲۵ء) کی ایک بلند پایہ تالیف ہے۔ رازی نے یہ کتاب منصور[1] بن[2] محمد بن اسحاق بن احمد بن اسد (عہد ۲۹۰ ـــ ۲۹۶ھ / ۹۰۲ ـــ ۹۰۸ء) کے لیے تالیف کی تھی۔ اس مناسبت سے اس کا نام "المنصوری" رکھا تھا۔

ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی یہ کتاب حسن ترتیب و تبویب اور کمال ابلاغ و ارسال کی وجہ سے بہت اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہے۔

ابن ابی اصیبعہ[3] (متوفی ۶۶۸ھ) نظامی عروضی[4] (متوفی قریباً ۵۵۰ھ) ابن خلکان[5] (متوفی ۶۸۱ھ) اور ڈاکٹر کمال سامرائی[6] وغیرہ مورخین نے اس کتاب کے اسلوب بیان اور اندازِ پیش کش کو بہت سراہا ہے۔ رازی کے عہد میں اس کتاب نے طب کی مطولات سے بے نیاز کردیا تھا۔

المنصوری کے تراجم دنیا کی متعدد زبانوں میں ہوئے ہیں ان میں لاطینی، فرانسیسی اور فارسی زبانیں شامل ہیں ـــ ذیل میں ان تراجم کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

لاطینی: المنصوری کا لاطینی ترجمہ جیرالڈ آف کریمونا (۱۱۳۴ ـــ ۱۱۷۸ء) کے قلم کی یادگار ہے[7] ـــ یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۴۸۱ء میں لیڈن / میلانو سے دوسری مرتبہ ۱۴۹۷ء میں وینس سے اور تیسری مرتبہ ۱۵۴۴ء میں باسل سے شائع ہوا[8] ایک اطلاع کے مطابق ۱۴۸۹ء میں بھی شائع ہوا تھا[9]

۱۔ طب العرب ـــ تنقیدات و تشریحات ص ۳۰۵، مترجمہ نیر واسطی ۲۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱ کمال سامرائی ۳۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء جلد ۱ ص ۳۱۷۔ ۴۔ چہار مقالہ ص ۷۰۔ ۵۔ وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۷۸۔ ۶۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱ ۷۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱۔ ۸۔ طب العرب ص ۳۰۲۔ ۹۔ طب العرب ص ۵۵ مترجمہ نیر واسطی۔

ہی: "المنصوری" کو جزوی طور پر (صرف علم التشریح والاحصۃ) ڈاکٹر پی او وکیننگ نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔[1]

ہی: "المنصوری" کے فارسی ترجمہ کی نشاندہی آصفیہ لائبریری حیدر آباد میں کی گئی ہے۔[2]

ملوم زبان: "المنصوری" کا ایک ترجمہ کتب خانہ حمیدیہ (ترکی) میں اندراج نمبر ۱۰۱۳ کے تحت محفوظ ہے، یہ ترجمہ ۱۵۱ اوراق پر مشتمل ہے، زبان کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے، قوی امید ہے کہ یہ ترجمہ فارسی یا ترکی زبان میں ہوگا۔[3]

بی متن: "کتاب المنصوری" کے عربی متن کی اشاعت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر کمال سامرائی لکھتے ہیں:

"ونشر راسکہ (REISKE) النص العربی فی ہالہ بالمانیا سنۃ ۱۷۷۶ء (المانیا کے مشہور مستشرق ریسکہ (متوفی ۱۷۷۴ء) نے اس کا عربی متن ہالہ المانیا سے ۱۷۷۶ء میں شائع کیا۔

حکیم نیر واسطی (متوفی ۱۹۸۵ء) لکھتے ہیں "اگرچہ اس (کتاب المنصوری) کا اصل عربی متن اب تک نہیں چھپا، لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ شارل کوینز مدیر المعہد الفرنسی نے اصل عربی زبان میں قاہرہ سے شائع کرایا ہے"۔[5]

کتاب المنصوری کے نسخے: "کتاب المنصوری" خطی شکل میں ہند و بیرون ہند کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہے۔ تفصیل درج ذیل ہے۔ ۱۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ ۲۔ مولانا آزاد لائبریری، علیگڑھ ۳۔ رضا لائبریری رام پور۔ ۴۔ آصفیہ لائبریری حیدرآباد ۵۔ نیشنل بوٹانیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ ۶۔ جامعہ حلب (اس کی زیراکس کاپی لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ یونانی میڈیسن نئی دہلی میں فراہم ہے) ۷۔ برٹش میوزیم ۸۔ بوڈلین (آکسفورڈ) ۹۔ اسکوریال ۱۰۔ پیرس ۱۱۔ ایا صوفیہ ۱۲۔ فیض اللہ آفندی ۱۳۔ سلیم آغا ۱۴۔ اسکندریہ ۱۵۔ المجمع العلمی (بغداد)۔

حاصل کلام یہ ہے کہ "کتاب المنصوری" ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی ایک گرانقدر تالیف ہے، پندرہویں صدی عیسوی میں اس کے لاطینی تراجم اور اس کے آس پاس فارسی اور جزوی طور پر فرانسیسی تراجم بھی شائع ہوئے ہیں —— ڈاکٹر کمال سامرائی کے بقول ۱۷۷۶ء میں اس کا عربی متن بھی شائع ہوا ہے حکیم نیر واسطی بھی اس کے عربی متن کی اشاعت کا تذکرہ کرتے ہیں —— لیکن اب یہ مطبوعات ناپید ہیں۔ خوشی و مسرت کا مقام ہے کہ ہند و بیرون ہند میں "کتاب المنصوری" کے تقریباً ۱۵ نسخے موجود ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ "کتاب المنصوری" کا ایک تنقیدی متن مع تصحیفات شائع کیا جائے٭ تاکہ ابوبکر محمد بن زکریا رازی کی اس گرانقدر تالیف سے طبی دنیا مستفید ہو سکے۔ ●●

۱۔ طب العرب ص ۲۰۳ مترجمہ نیر واسطی۔ ۲۔ ہندوستان کے کتاب خانوں میں طبی نوادر ص ۳ شائع کردہ آئی۔ ایچ۔ ایم۔ آر ۳۔ فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیہ والفارسیہ فی مکتبات ترکیا ص ۸ ۱۱ دہلی ۴۔ مختصر تاریخ الطب العربی جلد ۱ ص ۵۱۱۔ ۵۔ طب العرب تنقیدات و تشریحات ص ۲۰۳۔ ٭۔ خدا بخش لائبریری کی اشاعتی اسکیم میں "کتاب المنصوری" کی تدوین و اشاعت شامل ہے (شاہ محمد اسمٰعیل)

حکیم سید محمد حسان نگرامی
لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (یونانی)،
نئی دہلی

"القانون فی الطب" کی گمشدہ جلدیں ــــ ایک جائزہ

شیخ الرئیس بوعلی سینا (متوفی ۱۰۳۷ عیسوی) کی تصانیف کی تعداد کے بارے میں ابھی تک کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکی ہے خود اس کے شاگرد ابو عبید جوزجانی کے ہاتھوں تیار کردہ فہرست بھی حتمی نہیں کہی جا سکتی [1] اس کی تصانیف کی تعداد ۶۲ سے ۲۹۶ تک تجبط ہے[2]۔ جی سی اناوتی نے ۲۹۶ کتابوں کی تعداد بتائی ہے جس میں اس نے بہت سی تصانیف پر اپنے شبہ کا اظہار کیا ہے[3] یحیی مہدوی کے نزدیک ۱۳۱ کی تعداد معتبر ہے باقی ۱۱۰ کے بارے میں وہ بھی مشکوک نظر آتا ہے[4]۔

یوں تو شیخ کی متعدد تصانیف اس کی شہرت و عظمت کا سبب بنی ہیں۔ لیکن مشرق و مغرب میں جو شہرت اسے اپنی کتاب "القانون فی الطب" سے حاصل ہوئی کسی اور سے حاصل نہیں ہو سکی۔

شیخ الرئیس کی کتاب "القانون" طب کی واحد کتاب ہے جس کے متعدد زبانوں میں بارہا تراجم اور ایڈیشن شائع ہوئے ہیں ایک زمانہ تک یہ کتاب یورپ کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل رہی اور آج بھی طب کے لیے ایک عظیم سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس درجہ اہمیت کی حامل کتاب اب تک صرف ۵ جلدوں میں شائع ہوئی ہے حالانکہ اہم ترین مصنفین اسے ۱۴ جلدوں پر مشتمل بتاتے ہیں، حیرت ہے کہ تمام طابعین و ناشرین نے اس مسئلہ پر کسی طرح کی بحث نہیں کی ہے اور تمام انگریزی اردو اور عربی حوالے اس موضوع پر خاموش ہیں۔

ذیل میں "القانون فی الطب" کی ۱۴ جلدوں کی موجودگی، گمشدہ جلدوں کے مشتملات اور مختلف لائبریریوں میں محفوظ "القانون" کے قدیم مخطوطات کی روشنی میں ایک جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

"القانون" کی ۱۴ جلدیں تاریخی حوالوں کی روشنی میں:

تاریخ طب پر لکھی گئی اہم ترین کتابوں میں ابن اصیبعہ (متوفی ۱۲۷۰ء)[5] کی "کتاب عیون الانباء فی طبقات

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام جلد سوم ص ۹۴۱، ای جی۔ برل لنڈن ۱۹۷۱ء ۲۔ خدابخش لائبریری جرنل شمارہ ۲۱ ص ۱۳۵ خدابخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات از وسیم احمد اعظمی ۳۔ C. ANAWATI. ESSA DE BIBLIOGRAPHY AVICENNA CAIRO. 1950.

۴۔ مولفات ابن سینا یحیی مہدوی ص ۱۹۲ تہران ۱۹۵۴ء ۵۔ الاعلام جلد اول ص ۲۰۹ خیر الدین زرکلی

بار" اور ———————— جمال الدین قفطی (متوفی ۱۲۴۸ء)[۱] کی کتاب "تاریخ الحکماء" ہی کو زیادہ تر بطور
پیش کیا جاتا ہے۔

مطالعہ کے دوران معلوم ہوتا ہے کہ عیون الانباء فی طبقات الاطباء[۲] اور تاریخ الحکماء[۳] دونوں میں "القانون فی
ب" کے لیے اربع عشرۃ مجلدۃ (۱۴ جلدوں) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ۱۲۷۰ء تک القانون
۱۴ جلدیں شمار کی جاتی رہی ہیں۔ ان عربی حوالوں کے علاوہ حکیم غلام جیلانی کی کتاب "تاریخ الاطباء"[۴] میں بھی "القانون"
طبوعہ پانچ جلدوں کے قطع نظر ۱۴ جلدوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔[۴]

"القانون" کی بقیہ جلدوں کے مشمولات

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے "القانون فی الطب" بنیادی طور سے ۱۴ جلدوں پر مشتمل
ہے اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا موجودہ "القانون" کے مضامین بھی نامکمل ہیں چنانچہ مطالعہ سے یہ حقیقت بھی
ضح ہوجاتی ہے کہ موجودہ جلدوں میں شیخ الرئیس بوعلی سینا کے معالجانہ تجربات پر مشتمل معلومات شامل نہیں ہیں۔
ابوعبید جوزجانی شیخ الرئیس کی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ بوعلی سینا "القانون" میں اپنے معالجانہ تجربات شامل
باچاہتا تھا[۵] واضح رہے کہ ابوعبید جوزجانی شیخ الرئیس کا سب سے معتمد شاگرد تھا اور اس نے اپنی سوانح عمری جوزجانی
املاء کرائی تھی۔ ان تمام حوالوں سے ثابت ہوجاتا ہے کہ شیخ کی "القانون" کی باقی جلدوں میں شیخ کے معالجانہ تجربات
امل کیے گئے تھے جو موجودہ القانون میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں۔

مختلف لائبریریوں میں "القانون" کے مخطوطات اور سات جلدوں کے مخطوطہ کی نشاندہی:

دنیا کی مختلف لائبریریوں کے کیٹلاگ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ "القانون" کے قدیم مخطوطات کی
مداد نہایت مختصر ہے اگرچہ ان میں بعض بہت قدیم ہیں۔ لیکن وہ ۵ جلدوں پر بھی مشتمل نہیں ہیں۔
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستان کی لائبریریوں میں ۷۲۶ ہجری سے پہلے کا کوئی مخطوطہ موجود نہیں ہے
ہندوستان میں "القانون" کا قدیم ترین مخطوطہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی زینت ہے اس مخطوطہ کا سن کتابت ۶۲۸ھ ہے۔
"القانون" کا جدید ترین عربی ایڈیشن جسے انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ نئی دہلی

۱۔ المنجد ص ۱۹۱ ۲۔ عیون الانباء فی طبقات الاطباء مطبوعہ بیروت ص ۴۴ ۳۔ تاریخ الحکماء (اردو ترجمہ ص ۳۴۸) جمال الدین
قفطی ۴۔ تاریخ الاطباء حکیم جیلانی ص ۱۸۱ مطبوعہ ۱۹۱۲ء ۵۔ آئینہ سرگزشت CRUM ص ۲۴ ۶۔ حوالہ سابق ص ۳

نے شائع کیا ہے وہ بھی ایا صوفیہ لائبریری کے مخطوطہ (۶۱۸ھ) پر مشتمل ہے[1]

مختلف کتبخانوں میں "القانون" فی الطب کے قدیم مخطوطات

نام لائبریری	نمبر مخطوطہ	سن کتابت
ایا صوفیہ	۳۶۸۶	۶۱۸ھ
پیرس[2]	۲۸۸۵ - ۹۱	۵۹۳ - ۹۷ھ
جار اللہ[3]	۱۵۲۴	۵۸۳ھ
مغنیا[3]	۱۷۶۰	۶۱۷ھ
احمد ثالث[3]	۱۹۴۳	۶۳۵ھ
محمد پاشا[3]	۱۷۶	۶۵۳ھ
احمد ثالث[3]	۱۹۳۹/۲	۷۰۳ھ
ایا صوفیہ[4]	۳۶۳۸	۵۲۸ھ
خدا بخش لائبریری[4]	۲۱۶۰	۶۲۷ھ

اس فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایا صوفیا لائبریری کا مخطوطہ نمبر ۳۶۳۸ سب سے قدیم ہے جسے ۵۲۸ھ میں لکھا گیا تھا۔

اس مخطوطہ کی آخری عبارت: والثلثة او ثولات تسعة قراریط القوانوس اوقیہ ونصف۔ تم الکتاب الخامس من القانون فی الطب وھو الاقرباذین وھو المجلدۃ السابعۃ۔

اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرابادین کا بیان اصلاً "القانون فی الطب" کے ساتویں جلد میں شامل ہے اور اسے موجودہ ایڈیشن میں جلد پنجم میں شامل کر دیا گیا ہے۔

یہ بات حیرت ناک ہے کہ اس مخطوطہ کا یہ آخری جملہ "القانون فی الطب" کے پہلے عربی ایڈیشن مطبوعہ روم ۱۵۹۳ء میں شامل نہیں ہے۔

---

[1] القانون فی الطب جلد اول، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری میڈیشن اینڈ میڈیکل ریسیرچ ص ا [2] مولفات ابن سینا، یحیی مہدوی ص ۱۹۳

[3] فہرس مخطوطات الطب الاسلامی باللغات العربیہ والترکیۃ والفارسیۃ فی مکتبات ترکیا ۱۹۸۴ء استانبول ص ۴۳ [4] ایا صوفیہ لائبریری میں القانون کے مخطوطات از نظام الدین مغربی (ہمدرد کلکشن، خدا بخش لائبریری میں ابن سینا کے مخطوطات وسیم احمد خدا بخش جرنل جلد ۲۱ ص ۱۳۳

چنانچہ مذکورہ ایڈیشن میں "القانون فی الطب" کی عبارت درج ذیل جملہ پر ختم ہوتی ہے۔

"یغلی عشر غلیات ویرفع .... خل یخلط بماء الورد وادرس وما ھی شواب یتخذ بعصارۃ الورد مع عسل"[1]

ایسا لگتا ہے کہ بعد کے ایڈیشن میں بھی روم میں طبع شدہ ایڈیشن کی نقل کرلی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اب تک چھپے تمام "القانون" کی آخری عبارت مذکورہ جملہ پر ختم ہوجاتی ہے۔

ایاصوفیا کے مذکورہ مخطوطہ کے علاوہ مخطوطہ نمبر ۲۸۸۵-۹۱ جسے ۵۹۲-۹۷ ھجری میں لکھا گیا ہے وہ بھی سات جلدوں پر مشتمل لکھا گیا ہے تاہم فہرست نویس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے[2]

مذکورہ بالا تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ "القانون فی الطب" بنیادی طور سے ۱۴ جلدوں پر مشتمل ہے اور باقی جلدوں میں بوعلی سینا کے معالجانہ تجربات شامل کیے گئے تھے ایسا لگتا ہے کہ "القانون فی الطب" کے پہلے ایڈیشن کے طبع ہوتے وقت صرف ۵ جلدوں پر مشتمل نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ مذکورہ تجزیہ کی روشنی میں دنیا کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ "القانون فی الطب" کے مخطوطات کی پھر سے تحقیق کرائی جائے تاکہ شیخ الرئیس کے معالجانہ تجربات دنیا کے سامنے پیش کیے جاسکیں اور اس قدر اہم کتاب "القانون فی الطب" کو مکمل سمجھا جائے۔ ●●

۱۔ القانون فی الطب مطبوعہ از روم ۱۵۹۳ء

۲۔ مولفات ابن سینا یحییٰ محمودی ص ۱۹۳

ڈاکٹر سلیم الدین احمد
خدا بخش لائبریری

"القانون فی الطب" کی دستیاب جلدیں

۱ 'القانون فی الطب' کے کئی خطی نسخے خدا بخش لائبریری میں موجود ہیں اس کا ایک مطبوعہ نسخہ بھی جو مطبع عامرہ (قاہرہ) سے ۱۲۹۴ھ میں شائع ہوا تھا یہاں محفوظ ہے۔ قلمی نسخے کا مقابلہ جب مطبوعہ سے کیا گیا تو پتا چلا کہ قلمی نسخے کا خاتمہ مندرجہ ذیل عبارت پر ہو جاتا ہے :

"الثلاث اوثولاث تسعة قراریط القوانوس اوقیة و نصف"

جبکہ مطبوعہ نسخے میں مندرجہ بالا عبارت کے بعد مندرجہ ذیل اضافہ ہے :

"مالی هو العسل مالی قراطون هو ماء العسل وربما کتبوه مالقراطن او ماء القراطن اقو مالی هو ما یموس فیه الشهد ویحتفظ به غیر مطبوخ او درومالی هو عسل وماء المطر العتق منا صفة بشمس الشراب العسل هو متخذ من عصیر العنب الذی فیه قبض خمسة اجزاء ومن العسل جزء واحد یلقی ذلك فی مما یملأ انا واسع به لیتسع لغلیانهما ویلق علیهما ملح قلیلا قلیلا حتی تنقزن الرغوة فاذا سکن الغلیان رفع فی الخوابی شراب العسل شراب عتیق قابض جزآن عسل جید جزء واحد یحزن فی اناء و یترك حتی یدرك الطلاء یتخذ بان یترك العنب فی کرمه بعد ان ینضج زمانا یسیرا او یقطع العنب النضیج فیشمس ثم یعصر ویطبخ آکسومالی هو السکنجبین المتخذ من الخل والعسل والماء وقد یضیف الیه قوم ماء البحر او ملحه ومن جملة نسخ ذلك خل خمس قوطولی والقوطولی سبع اواق ومن ملح البحر منوین ومن العسل عشرة امنا ومن الماء عشر قوطولات یلغی عشر غلیات و یرفع او کسالی خل یخلط بماء اللیروز و مالی شراب یتخذ بعصارة الورد مع عسل"

اس حقیقت سے پتا چلتا ہے کہ مطبوعہ 'القانون' کی طباعت کے وقت 'القانون' کے دستیاب تمام قلمی نسخے پیش نظر رکھے گئے ہیں اور طباعت کے لیے اس نسخہ کو بنیاد بنایا گیا ہے جو مکمل ترین تھا۔

حکیم سید محمد حسان نگرامی نے اپنے مضمون "القانون فی الطب کی گمشدہ جلدیں۔ ایک جائزہ" میں

مختلف کتب خانوں میں "القانون فی الطب" کے قدیم مخطوطات کا ایک جائزہ پیش کیا ہے جس کی رو سے ایا صوفیہ لائبریری میں محفوظ اس کا قلمی نسخہ سب سے قدیم ہے جس کی کتابت ۵۲۸ھ میں ہوئی ہے۔ موصوف نے اس مخطوطہ کی آخری عبارت بھی نقل کی ہے جو عام مخطوطات کی آخری عبارت سے مختلف نہیں ہے یعنی اس مخطوطہ میں بھی مطبوعہ ایڈیشن کا محولہ بالا اضافہ شامل نہیں ہے۔ البتہ اس مخطوطے کی مندرجہ ذیل عبارت نے موصوف کو اس شبہ میں ڈال دیا ہے کہ "القانون" کی مزید جلدیں بھی موجود ہیں جن کی تلاش ضروری ہے۔

"تم الکتاب الخامس من القانون فی الطب هو الاقرابادین وهو المجلدة السابعة"

لیکن اس شبہ کی بظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیوں کہ آغاز کتاب میں مصنف نے جو دیباچہ لکھا ہے اس میں "القانون فی الطب" کے مشتملات کا تذکرہ کرتے ہوئے پوری کتاب کو پانچ کتاب میں تقسیم کیا ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو:

"واما الان فانی اجمع هذا الکتاب واقسمه الی کتب خمسة علی هذا المثال (الکتاب الاول) فی الامور الکلیة فی علم الطب (الکتاب الثانی) فی الادویة المفردة، (الکتاب الثالث) فی الامراض الجزئیة الواقعة باعضاء الانسان عضو عضو من الفرق الی القدم ظاهرها وباطنها (الکتاب الرابع) فی الامراض الجزئیة التی اذا وقعت لم تختص بعضو وفی الزینة (الکتاب الخامس) فی ترکیب الادویة وهو الاقرابادین"

چنانچہ اس روشنی میں اگر پوری کتاب صرف پانچ ہی "کتب" پر مشتمل ہے اور مطبوعہ اور قلمی نسخوں میں یہ پانچوں "کتب" موجود ہیں تو پھر مزید جلدوں کی تلاش بے سود ہے۔ اب اس کے مشتملات جو پانچ "کتب" پر مشتمل ہیں خواہ مخطوطہ کی سات جلدوں میں سما جائیں یا دس جلدوں میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدابخش لائبریری میں اس کا ایک ایسا نسخہ بھی ہے جس میں ایک ہی جلد میں پانچوں "کتب" شامل ہیں بلا اختصار۔

حکیم سید محمد حسان نے "القانون" کی بقیہ گمشدہ جلدوں کے مشتملات کے سلسلہ میں بھی ایک رائے قائم کی ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ "القانون" کی "موجودہ جلدوں میں شیخ رئیس بوعلی سینا کے معالجانہ تجربات پر مشتمل معلومات شامل نہیں ہیں" اور یہ کہ "ابو عبید جوزجانی ... لکھا ہے کہ

بوعلی سینا "القانون" میں اپنے معالجانہ تجربات شامل کرنا چاہتا تھا" تو اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ کہ جوزجانی نے صرف یہ لکھا ہے کہ بوعلی سینا اپنے معالجانہ تجربات بھی اس کتاب میں شامل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا ظاہر ہے کہ وہ ایسا نہ کر سکا کیونکہ اگر شامل کیا ہوتا تو اسے یہ بات لکھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی کہ وہ ایسا کرنا چاہتا تھا۔ جمال الدین قفطی نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ " درچون "شیخ" را در معالجات تجربہ ہای بسیار حاصل شدہ بود، در خاطر داشت کہ آنہا را تدوین و جزو کتاب قانون نماید۔ آنہارا بر اوراق متفرق نوشتہ بود، لیکن قبل از اتمام قانون، آں اجزا از "شیخ" فوت شدند و آنچہ در خاطر داشت فعلیت نپذیرفت "

(تاریخ الحکماء قفطی ص ۳۶۷، ترجمہ فارسی بہ کوشش بہین دارائی، انتشارات دانشگاہ تہران ۱۳۴۷)

جیسا کہ معلوم ہے کہ بوعلی سینا کی یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، ساتھ ہی بوعلی سینا اور ان کی تصنیفات پر تحقیق کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اگر "القانون" کی مزید کسی جلد کی موجودگی کی نشاندہی کہیں بھی ملتی تو یقیناً اب تک اس کا حوالہ کہیں نہ کہیں ضرور مل جاتا۔ ایسی صورت میں سوائے اس کے کہ موجودہ "القانون" کو ہی مکمل سمجھا جائے اور کوئی چارہ نہیں۔

مراسلہ

ڈاکٹر زبیر قریشی
صدر شعبۂ فارسی
پٹیل کے آرٹس کالج، احمد آباد
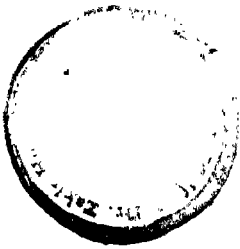
خدا بخش کے چند عربی و فارسی مخطوطات کے بارے میں

عربی مخطوطات ۱۔ الحاشیہ علی شرح التہذیب مصنفہ عبدالنبی بن قاضی عبدالرسول نمبر ۱۹۶۳: فہرست مفتاح الکنوز میں ان کے نام کے ساتھ "الگجراتی" لگا ہوا ہے یہ غلط ہے کیوں کہ خود مصنف "فیقول العبد... وغیرہ" کے بعد اپنے آپ کو احمد نگری کہتے ہیں۔ اس بات کی بھی وضاحت ہو جائے کہ یہ مصنف کے خط میں ہے۔

۲۔ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام، نمبر ۲۲۰۴: فہرست میں مصنف کا نام قطب الدین نہروانی لکھا ہوا ہے جو غلط ہے۔ دراصل نہروالی ہونا چاہیے جو شمالی گجرات کے شہر پٹن کا دوسرا نام ہے۔ قطب الدین یہیں پیدا ہوئے اور بعد میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں عہدۂ قضاۃ پر فائز ہوئے اور یہ کتاب لکھی۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ ہمارے کالج میں ہے اور خدا بخش میں بھی ہے۔

۳۔ النور السافر، نمبر ۲۲۷۶: مصنف کا نام یوں لکھا ہوا ہے عبدالقادر بن شیخ عبداللہ علوی۔ صحیح نام یوں ہے عبدالقادر بن شیخ بن عبداللہ العیدروسی۔ مصنف احمد آباد میں مدفون ہیں سن وفات ۱۰۳۹ھ ہے۔ یہ کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ مطبوعہ نسخہ ہمارے پاس ہے۔ خدا بخش میں بھی ہے۔

۴۔ رسالہ فی حرمۃ شرب الدخان: نمبر ۲۶۳۵/ ۱۷، اس کے مصنف محمد اسحاق بھرچی ہیں۔ یہ علامہ شاہ وجیہ الدین علوی کے شاگرد تھے اور یہ رسالہ انھیں سے منسوب ہے۔ مگر فہرست میں انھیں شاگرد عبدالغنی لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ یہ بزرگ بھروچ (گجرات) میں مدفون ہیں۔ پہلے صفحہ پر تمام گجراتی اور خاص طور پر احمد آبادی کے بزرگوں کا ذکر ہے۔

۵۔ ذیل تشییع فقہاء الحنفیہ لتشییع سفہاء الشافعیہ: نمبر ۲۵۶۸/ ۴۴ مندرجہ بالا عربی مخطوطہ میں ملا علی قاری کے ۵۶ رسائل ایک ساتھ مجلد ہیں۔ فہرست میں مصنف کا نام زین العابدین صدیقی لکھا ہے جو غلط ہے اس کتاب کے مصنف ملا علی قاری ہیں نہ کہ زین العابدین۔

فارسی مخطوطات شرح حقیقۃ المحمدیہ، مصنفہ عبدالعزیز بن ولی، نمبر ۱۳۴۶: مرآۃ العلوم فہرست میں لکھا ہوا ہے کہ اس کے ماتن و شارح ایک ہیں۔ یہ غلط ہے۔ اس کے ماتن حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں متن عربی میں ہے اور مترجم انھیں کے شاگرد رشید مولانا عبدالعزیز بن ولی ہیں۔ یہ دونوں احمد آباد کے بزرگ ہیں۔ شارح کم از کم ۱۰۱۶ھ تک بقید حیات تھے۔

عبدالعزیز نے فتوح الغیب مؤلفہ حضرت عبدالقادر جیلانی پر شرح لکھی ہے جس کا سن تصنیف ۱۰۱۶ھ ہے۔ شرح مذکور کا ایک نسخہ پیر محمد شاہ احمد آباد کے کتب خانے میں بھی ہے۔ ناچیز نے اس کا اردو ترجمہ کر کے ایڈٹ بھی کیا ہے۔

●●

فہرست مخطوطات اردو

مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ، مظفر نگر، یوپی

نور الحسن راشد کاندھلوی

کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں جو مغربی یو پی کا ایک معروف اور قدیم قصبہ ہے، علم و عمل، شعر و ادب، تصنیف و تالیف۔
رشاد و معرفت اور نجی کتب خانے رکھنے کی روایت خاصی پرانی ہے۔ قدیم علما کے متعلق تفصیلی معلومات دستیاب نہیں، مگر تیرھویں
صدی ہجری یا ——— علامہ سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں :

"حضرت شاہ عبدالعزیز کے زمانہ سے آج تک اس قصبہ کا ایک سلسلۂ فیض مسلسل نظر آ رہا ہے۔"[1]

اس عہد پُر بہار کی ابتدا حضرت مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے ذریعہ ہوئی، اور علم و عمل کا یہ گل کدہ شاداب سے شاداب تر ہوتا گیا، اور اس کے پاسبانوں کے ذوق علم نے ارشاد و معرفت، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور علم و ادب کے میدانوں میں نئے نئے گل بوٹے کھلائے، اسی سلسلے کی ایک یادگار مخطوطات و نوادر سے گرانبار ایک وسیع کتب خانہ تھا جس کے باقی ماندہ نقوش کی ایک جھلک یعنی فہرست اردو مخطوطات اور اس کتب خانہ کے اولین جامع و مؤسس حضرت مفتی الٰہی بخش کا مختصر تعارف اور اس کتب خانہ کے ماضی و حال کا کچھ احوال نذر قارئین ہے۔

مفتی الٰہی بخش خلف مولانا محمد شرف حکیم شیخ الاسلام، کاندھلہ کے ایک قدیم علمی صدیقی گھرانے کے فرد،[2] حضرت شاہ عبدالعزیز کے ممتاز شاگرد، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے رفیق درس،[3] شاہ عبدالعزیز،[4] شاہ کمال الدین[5] اور سید احمد شہید کے خلیفہ[6]

۱۔ بذیل تذکرہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی، یادرفتگاں ص۲۱۲ (کراچی: ۱۹۵۵ء)۔ ۲۔ اس خاندان کی ابتدائی معلوم تاریخ، بعض قدیم اہل علم و معرفت اور کاندھلہ میں آمد و قیام کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: راقم سطور کا مقالہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کے اجداد، صحیح نسب نامہ اور حالات۔ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نمبر، الفرقان لکھنؤ: ۱۹۸۲ء
۳۔ شاہ عبدالعزیز کا ارشاد ہے: "از شاگردان من دو کس خوب بودند، چنانچہ مولوی رفیع الدین و مولوی الٰہی بخش" ملفوظات شاہ عبدالعزیز ص (مجتبائی میرٹھ: ۱۳۱۴ھ)۔ ۴۔ عبدالرحیم ضیا نے مقالات طریقت ص (حیدرآباد: ۱۲۹۲ھ) میں، مولانا عبدالحی حسنی نے نزہۃ الخواطر ص۲۹ جلد ۷ (حیدرآباد ۱۳۸۶ھ) میں اور خود حضرت شاہ عبدالعزیز نے مفتی صاحب کے لیے سند میں اس کی وضاحت فرمائی ہے سند کے متن کے لیے ملاحظہ کیجیے: حالات مشائخ کاندھلہ، مولانا احتشام الحسن کاندھلوی ص (دہلی: بلا سنہ)۔ ۵۔ شاہ کمال الدین مفتی صاحب کے پھوپھی زاد بھائی، شاہ عبدالعزیز کے شاگرد اور شاہ ابوالعلی دہلوی خلیفہ مجاز حضرت خواجہ محمد زبیر مجددی متوفی ۱۲۰۸ھ کے خلیفہ اول اور سجادہ نشین تھے۔ سنہ ولادت معلوم نہیں مگر مفتی الٰہی بخش سے چھوٹے تھے، تقریباً ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں وفات پائی۔ شہنشاہ مغل سلاطین کا حاشیہ علمی یادگار ہے۔ مختصر معلومات کے لیے رجوع کیجیے: انوار القلوب شہزادہ منیر بخت خلف شاہ عالم، مؤلفہ ۱۲۵۵ھ (مخزونہ کتب خانہ دارالعلوم، دیوبند) نیز دیکھیے: حالات مشائخ کاندھلہ۔ ۶۔ ملہمات احمدیہ (ملفوظات و تعلیمات حضرت سید احمد شہید) تالیف مفتی الٰہی بخش (آگرہ ۱۲۹۹ھ) نیز سیرت سید احمد شہید اور کاروان علم و معرفت از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجاز شعر و سخن کے ماہر[1]، علم و افادہ میں کامل[2] اور زبان و ادب کے رمز شناس تھے۔ مفتی صاحب نے عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں تصنیفات و تالیفات، شروح و تراجم اور تلخیصات کا ایک وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ تصنیفات کی مکمل فہرست دستیاب نہیں، لیکن اس وقت تک چھیاسی کتابوں کا سراغ ملا ہے، جن میں سے ستر ہمارے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں۔ معلوم تصنیفات میں سے تیس عربی میں، پچاس فارسی میں اور چھ اردو میں ہیں۔ اس وقت تک مفتی صاحب کی کل گیارہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ بعض کتابوں کے متعدد ایڈیشن نکلے، مقبول کتابوں میں سیرت کے موضوع پر 'شیم الحبیب' اور سلوک و ادب کے موضوع پر مشترکہ یادگار 'بکٹ کہانی' شامل ہیں۔ اول الذکر کے چونتیس پینتیس اور موخر الذکر کے کم سے کم سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ مگر جملہ کتابوں میں سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت 'اختتام مثنوی مولانا روم' کو حاصل ہوئی جو متعدد اشارات و بشارات کے بعد ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں وجود میں آیا۔ اہل سلوک و معرفت کی محفلوں اور ارباب فضل و کمال کی مجلسوں میں یکساں باریاب و مقبول و محبوب و دلنواز قرار پایا۔

'اختتام مثنوی مولانا روم' کی نقلیں اور مولف کے حوالے سے اس کی روایت و قرأت مفتی صاحب کی زندگی میں عام ہو گئی تھی، مگر پہلا ایڈیشن ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۶ء میں نولکشور پریس لکھنؤ سے نکلا اور اس قدر مقبول اور مثنوی مولانا روم کے ساتھ اس طرح ملحق ہوا کہ اس وقت سے آج تک برابر شائع ہو رہا ہے، اور مثنوی مولانا روم کے ہندوستانی تمام ایڈیشنوں کے ساتھ شامل ہے۔

مفتی الٰہی بخش (ولادت سنہ ۱۱۶۲ھ/۱۷۴۹ء) نے اپنی تمام زندگی علم و تحقیق، تعلیم و تدریس، ارشاد و تلقین، وعظ و تذکیر، معالجات اور تصنیف و تالیف میں مشغول بسر کی، اور بیاسی سال کی عمر میں ۱۵ جمادی الاخری، ۱۲ دسمبر سنہ ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء کو کاندھلہ میں وفات پائی۔

مفتی صاحب کے گھرانے میں علم اور کتب خانہ متوارث چلا آ رہا تھا۔ علم کی دولت مفتی صاحب اور ان کے برادران والاشان کو منتقل ہوئی، مگر کتب خانہ کاندھلہ پر سکھوں، جاٹوں اور احمد شاہ ابدالی کے فوجی دستوں کی بار بار یورش سے

۱۔ مفتی صاحب کا ذوق سخن محتاج تعارف نہیں۔ مفتی صاحب نشاط تخلص کرتے تھے۔ دیوان بھی مرتب کیا تھا جس پر حضرت شاہ عبدالعزیز کی مفصل منظوم تقریظ تھی۔ یہ دیوان تو غالباً تلف ہو گیا مگر اردو و فارسی کلام کی ضخیم بیاضیں محفوظ ہیں۔ متعدد تذکرہ نگاروں نے مفتی صاحب کے ذوق شعر گوئی کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً ملاحظہ ہو گلشن بے خار، شیفتہ ص۲۳۳ طبع دوم (آگرہ: ۱۸۴۳ء)؛ گلشن ہمیشہ بہار، نصر اللہ خان خویشگی ص۱۱۶ طبع اول (فتح الاخبار کول: ۱۲۷۰ھ)، نیز طبع دوم مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی ص۲۱۶، ۲۱۷ (کراچی: ۱۹۶۷ء)؛ گلستان بے خزاں، قطب الدین باطن ص۲۵۳ (نولکشور: ۱۲۹۲ھ)؛ طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین پانی پتی ص۲۹۳ (دہلی: ۱۸۴۷ء)؛ سخن شعرا، عبدالغفور نساخ ص۵۲۱ (لکھنؤ: ۱۲۹۱ھ)۔ اس کے علاوہ بھی بعض تذکرہ نگاروں نے مفتی الٰہی بخش نشاط کا ذکر کیا ہے۔ نیز دیکھیے: خطبات گارساں دتاسی ص۲۳۲، ص۴۸۱ (اورنگ آباد: ۱۹۳۸ء)۔ ۲۔ مولانا عبدالحی حسنی کا قول ہے: "درس وافاد مدة عمره واخذ عنه خلق لا يحصون بعدد" (الثقافة الاسلامية في الهند ص۱۳۱ (دمشق: ۱۳۷۷ھ)۔ ۳۔ مفتی الٰہی بخش کے والد مولانا حکیم شیخ الاسلام کی عرضداشتوں میں جو قصبہ کے قاضی کی مہر اور معززین شہر کی تصدیقات سے مزین ہیں، اس واقعہ کی تفصیلات درج ہیں۔ کچھ اور دستاویزات سے جو اسی عہد کی یادگار ہیں، جاٹوں اور سکھوں کے کاندھلہ پر بار بار حملوں اور قصبے میں لوٹ مار اور آتش زنی کے واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس بری طرح تباہ و برباد ہوا کہ اس کا ایک ورق بھی محفوظ نہیں رہا[۲]۔ پرانے ذخیرے کی بربادی کے بعد مفتی صاحب نے اپنی ضرورت کے لیے ایک نئے کتاب خانہ کی بنا استوار کی۔ ذخیرۂ الٰہی بخش کی فہرست کتابوں، مفتی صاحب کی تحریرات اور بیاضوں کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے مختلف علوم و فنون کی مفید کتابوں کا منتخب ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔

مفتی صاحب کی وفات کے بعد ان کے اخلاف نے اس ذخیرہ کی قدر کی، سلیقہ سے محفوظ رکھا اور اس کی توسیع و ترقی پر توجہ فرمائی۔ مولانا ابوالحسن[۱] نے طب کے بعض مصنفات بہم پہنچائے۔ درسیات خصوصاً منطق و فلسفہ اور اس کے متعلقات و شروح پر نادر کتابیں نقل کرائیں، اور اپنا تمام ذخیرہ مولانا نورالحسن[۲] کے سپرد فرما دیا، مولانا نورالحسن نے اس ذخیرہ کی حفاظت و نگہداشت اور آبائی کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لیے اپنے تمام وسائل اور زندگی کے بہترین اوقات صرف فرما دیے، ملک کے کونے کونے سے منتخب مخطوطات اور نادر کتابیں مہیا کیں، اور خاندانی ذخیرۂ کتب کو مصنفین کے لکھے ہوئے نسخوں، نامور علما کے رشحات قلم سے مزین کتابوں، نامور خطاطوں کی تحریرات، شاہی کتب خانوں کے آثار و باقیات اور حسین و منقش قیمتی جلدوں سے مالا مال کر دیا اور سخت محنت و کوشش کے بعد مفتی صاحب کے متروکہ کتب خانہ کو ترقی دے کر اس مقام پر لے آئے تھے کہ اگر آج مولانا کا کتب خانہ تمام و کمال محفوظ ہوتا تو اس کو ہندوستان کے اہم ترین کتب خانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

معلوم کتابوں کی تفصیلات سے قطع نظر، مولانا کے کتب خانہ کی اہمیت کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مولانا کے لیے کتب خانوں کی معلومات، اہم کتابوں کی تلاش و انتخاب، نقل نویسوں کا انتظام اور منقول کتابوں کی تصحیح و مقابلہ کے سلسلہ میں اہم اور قریب ترین ذرائع مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی، مولانا امام بخش صہبائی جیسے نادرۂ روزگار افراد تھے۔ بعض اوقات مرزا غالب کے مشورے اور تعاون سے بھی مدد ملی، مولانا کے کاغذات میں ایک یادداشت پر جس میں فارسی کے کتب لغات و منتخبات کے نام تحریر ہیں، "خرید کردہ از دہلی معرفت مرزا غالب" درج ہے۔

مولانا نورالحسن نے ہزارہا مخطوطات مختلف ذرائع سے حاصل کیے، سینکڑوں نقل کرائے، دہلی اور کلکتہ سے تازہ ترین

۱۔ مولانا ابوالحسن خلف حضرت مفتی الٰہی بخش، والد سے تعلیم حاصل کی، بڑے جید عالم، عارف اور طبیب تھے۔ متعدد منظوم و منثور تصنیفات اور مثنویاں یادگار ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، اور متعدد نامور علما کے استاد ہیں۔ ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۶۹ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۸۵۳ء کو کاندھلہ میں وفات ہوئی۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، "حضرت حاجی امداد اللہ کے اساتذہ" مؤلفہ نورالحسن راشد، شمولہ امداد المشتاق، مرتبہ ڈاکٹر نثار احمد صاحب فاروقی ص ۲۴۱ تا ۲۵۱ (دہلی: ۱۹۸۱ء) نیز دیکھیے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ اپریل ۱۹۸۱ء۔ ۲۔ مولانا نورالحسن خلف مولانا ابوالحسن کاندھلوی بن حضرت مفتی الٰہی بخش، ربیع الثانی، ۱۲۲۰ھ کر مئی ۱۸۱۲ء کو ولادت ہوئی۔ ابتدائی کتابیں والد ماجد سے پڑھیں، عربی متوسطات مدرسہ (غازی الدین حیدر) دلی میں، اور معقولات دعیب مولانا مفتی صدرالدین آزردہ، اور مولانا فضل حق خیرآبادی سے اخذ کیے۔ حدیث میں شاہ محمد اسحاق سے شرف تلمذ ہے۔ مولانا نورالحسن آزردہ اور مولانا خیرآبادی کے مخصوص شاگردوں میں شامل ہیں۔ خصوصاً مولانا خیرآبادی سے قربت و اختصاص میں کوئی اور شخص مولانا نورالحسن کا شریک نہیں۔ مولانا کے نام مولانا خیرآبادی کے خطوط سے اس خلوص و یگانگت کا علم ہوتا ہے، مولانا خیرآبادی کے مولانا کے نام اپنے ہی خطوط ایک مجموعہ مکتوبات میں محفوظ ہیں۔ مجموعہ مکتوبات کا باب دوم آزردہ، مولانا فضل عظیم خیرآبادی اور مولانا رحمت اللہ کے مکتوبات پر مشتمل ہے، آزردہ کے خطوط [illegible]

اہم مطبوعات کی فراہمی کا سرو سامان کیا، اور وفات کے وقت بارہ تیرہ ہزار کتابوں پر مشتمل ایک شاندار کتب خانہ جس کا اکثر حصہ مخطوطات سے گراں بار تھا، یادگار چھوڑا۔ ہمارے خاندان میں موجود اور خصوصاً ہمارے زیر تعارف سرمایہ کی بیشتر قلمی کتابیں اسی خزانہ کی باقیات صالحات ہیں۔

مخطوطات کے علاوہ مولانا نور الحسن اور ان کے اسلاف سے وابستہ ایک انمول یادگار، حضرت شاہ عبدالعزیز سے سرسید احمد تک علما، فضلا اور مشاہیر ارباب علم و کمال کے مکتوبات (بنام حضرت مفتی الٰہی بخش، مولانا ابوالحسن اور مولانا نور الحسن وغیرہ) کا ایک بڑا انبار تھا، جس میں صرف سرسید احمد کے ایک سو بچاس خطوط تھے، اسی سے تمام ذخیرہ کی وسعت و ثروت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خزانہ عامرہ جو ہندی ملت اسلامیہ کی دو سو سالہ تاریخ کا مرقع اور بے شمار اہل فضل و کمال کے ذاتی احوال و نظریات کا ترجمان تھا سنہ ۱۹۴۰ء تک محفوظ رہا، اس کے بعد جب اور سب چیزیں ضائع ہوئیں یہ سرمایہ بھی کالعدم اور بے نام و نشان ہو گیا۔

مولانا نور الحسن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادگان نے جو علم و عمل کی خاندانی روایات کے امین اور مطالعہ و تصنیف کے ذوق سے بہرہ ور تھے، کتب خانہ میں ترقی اور اضافات کے لیے اپنے اپنے حسب ذوق نئے نئے گوشے تلاش کیے اور اس کو عربی لغات و ادب کے مختلف عنوانات، تاریخ اسلام اور علوم عقلیہ کی تازہ کتابوں اور مصر و استنبول کی مطبوعات سے زینت بخشی۔

مذکورہ خانوادہ کی تیسری نسل ام۔اے۔او کالج علیگڈھ کے ابتدائی دور کی تعلیم یافتہ، انگریزی زبان و ادب کی ماہر، اور تعلیم و تحقیق کے نئے مغربی رجحانات سے واقف تھی، اس کے زمانہ میں مولانا نور الحسن کا کتب خانہ اسلامیات اور تاریخ پر انگریزی کی عمدہ کتابوں، یورپ کے مطبوعات اور اہم کتب حوالہ سے آشنا ہوا، اور اس کے بعد اس کتاب خانے کو نہ جانے کس کی نظر لگی کہ اس کی توسیع و ترقی کے جذبات پژمردہ، اور موجود بیش بہا سرمایہ آفات و مصائب کا شکار اور سموم حوادث کی نذر ہو گیا، پچھلے پچاس سال کی تاریخ اس کے زوال کی تاریخ ہے، کیا کیا آفتیں آئیں، نادر و نایاب کتابیں کہاں کہاں گئیں، کس کس طرح ضائع ہوئیں، کیونکر لکھوں کس طرح بتاؤں، قلب و جگر زخمی اور روح ماتم کناں ہے، تفصیلات سنانے کا یارا نہیں۔

★ مولانا نور الحسن سینٹ جونس کالج آگرہ میں شعبۂ عربی کے صدر اور مہاراجہ الور کے ملازم رہے۔ مولانا سے کثیر علما کو تلمذ ہے، مولانا عبدالحی حسنی کا قول ہے: "واخذ منہ خلق کثیر من العلماء۔ نزہۃ الخواطر ص۱۱۵ ج ۷۔ تلامذہ میں علما کے علاوہ ممتاز ترین شخصیت سرسید احمد کی ہے۔ سرسید نے اپنی متعدد تصنیفات میں مولانا سے تلمذ و استفادہ کا عقیدت و محبت سے ذکر کیا ہے۔ مولانا سے سرسید احمد کے تلمذ مولانا کے نام سرسید احمد کے خطوط، اور مولانا کے مختصر حالات کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: "حیات سرسید کا ایک گم شدہ ورق" ماہنامہ آج کل نئی دہلی مئی ۱۹۷۵ء۔ بعض اور تلامذہ کیلئے شجرۂ تحقیق علم الٰہی بخش مرتبہ نور الحسن راشد۔ مولانا نور الحسن نے اٹھاسی سال کی عمر میں ۱۱ محرم ۱۲۸۵ھ/۵ مئی ۱۸۶۸ء کو کاندھلہ میں وفات پائی۔

مختصر یہ ہے کہ ہمارے خاندانی یعنی مولانا نورالحسن کے کتب خانے کا تقریباً ایک تہائی حصہ تو ۱۹۴۷ء سے پہلے ضائع ہو گیا تھا جو باقی رہا اس کو مولانا کے اخلاف نے اپنے جد امجد کا ترکہ قرار دے کر میراث کے شرعی اصول کے مطابق مولانا کے ورثاء میں تقسیم کر دیا۔ کتابوں کا ایک قابلِ ذکر حصہ ضائع ہو جانے کے باوجود مولانا کا ذخیرہ مخطوطات سے اس قدر مالا مال تھا کہ مجملہ ۱۳۱ سہام کے فی سہام کم سے کم سو قلمی کتابیں حصے میں آئیں، مطبوعات کا سرمایہ اس کے علاوہ تھا۔ اگرچہ کتابوں کی تقسیم خود اہلِ خاندان کی نظر میں بھی بہتر اور پسندیدہ نہیں تھی، لیکن افسوس کہ اس وقت کے غیر یقینی حالات کی وجہ سے کسی اور تجویز پر اتفاق رائے نہ ہو سکا۔ تقسیم کے بعد اس کتب خانہ کا بھی وہی انجام ہوا جو ایسے مواقع پر ہوتا آیا ہے۔ کچھ شرکاء نے تو اپنی کتابوں کو شاید ایک مرتبہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بعض اصحاب کو وقتی طور پر کچھ دلچسپی رہی لیکن آہستہ آہستہ کتابوں سے ترکِ تعلق ہوتا گیا، آخر میں وہ سب کتابیں یا تو ادھر اُدھر گئیں یا ضائع ہوئیں، کچھ اور سرمایہ بعض مدرسوں اور دینی اداروں کو منتقل ہوا لیکن اس کو بھی بالآخر زوال اور تباہی سے سابقہ پڑا۔ لیکن چند افراد نے اپنے اپنے حصے کی پوری پوری حفاظت کی ضائع ہونے سے بچا لیا اور دوسروں کو بھی ان سے رجوع اور استفادہ کا موقع دیا۔ ایسا ہی ایک حصہ میرے والد ماجد حضرت مولانا افتخار الحسن کاندھلوی مدظلہ کی تحویل میں تھا۔ خاندانی اثاثہ کے علاوہ اس میں کچھ کتابیں ذاتی شوق کا حاصل اور خود خریدی ہوئی تھیں۔

دس بارہ سال پہلے راقم سطور نے اس تمام ذخیرہ پر ایک مفصل نظر ڈالی۔ ایک ایک کتاب بلکہ ایک ایک ورق دیکھا۔ اور حسبِ صلاحیت و ذوق اس کی خصوصیات و محاسن قلمبند کئے اور قدیم کتب خانہ کی یادگار وہ بستے اور بنڈل بھی کھولے جن کو شاید عرصہ سے کھولا نہیں گیا تھا۔ ان کے موجودات کا جائزہ لیا۔ منتشر اوراق مرتب کئے اور تمام چیزوں کی ایک چھوٹی سی فہرست بنا ڈالی۔

جب میرے والد ماجد کو میرے اس ذوق کا علم ہوا تو انھوں نے (بارک اللہ فی حیاتہ) کتب خانہ کی توسیع و ترقی پر، اور اہلِ خاندان میں منتشر کتابوں کو یکجا کرنے، ان کی جلدیں بنانے اور ان کی حفاظت و نگہداشت پر خاص توجہ مبذول فرمائی۔ اولاً اہلِ خاندان سے رجوع کیا اور ان میں سے بعض کی کتابیں قیمتاً حاصل فرمائیں اور دیگر ذرائع سے بھی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ شروع کیا جو اس وقت تک جاری ہے۔ کچھ کتابیں والد ماجد کے متوسلین نے تحفۃً نذر کیں، کچھ اور کتابیں راقم سطور کو اپنے کرمفرماؤں سے حاصل ہوئیں۔ اور خدا کے فضل و کرم سے اس میں ہر لحاظ سے اور ہر سمت میں برابر ترقی ہو رہی ہے، سفر جاری ہے، اور انشاء اللہ رواں دواں رہے گا۔

میرے اولین جائزہ کتب کے وقت ہمارا مخطوطات و مطبوعات کا تمام سرمایہ ایک ہزار سے متجاوز نہیں تھا۔

لیکن اس کے بعد کتب خانہ کی توسیع و ترقی کے لیے والد ماجد مدظلہ کی گہری دلچسپی، دس بارہ سال کی تلاش و جستجو اور کثیر اخراجات کے بعد جس میں بسا اوقات احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا اور اپنے وسائل سے تجاوز کر کے زیر بار بھی ہونا پڑتا تھا، اس وقت ہمارے ذخیرہ میں نو سو پچاس مخطوطات اور تقریباً ساڑھے سات ہزار مطبوعات محفوظ ہیں۔ مخطوطات میں چار سو دس (۴۱۰) عربی میں، تین سو بانوے (۳۹۲) فارسی میں، اور ایک سو تینتیس (۱۳۳) اردو میں ہیں۔ بارہ، پندرہ کتابیں نوادر ہیں۔

میری دلی خواہش ہے کہ اس ادارہ اور لائبریری (مفتی الٰہی بخش اکیڈمی) کا افادہ عام ہو اور اس کے وسیلے سے علم و تحقیق کی راہ میں کچھ اور چراغاں کچھ اور روشنی ہو۔ اردو مخطوطات مخزونہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کی فہرست، اور زیر نظر سطور کی اشاعت اسی احساس کی ترجمان ہیں۔

فہرست مخطوطات اردو کاندھلہ

تفسیر

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تفسیر پارہ عم	مراد اللہ سنبھلی مولفہ ۱۱۸۴ھ			۱۹۱	
۲	تفسیر موضح القرآن جلد ۱	حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی مولفہ ۱۲۰۵ھ	مکرم علی ساکن سراوہ	۱۲۴۷ھ		نقل کردہ برائے مظفر حسین کاندھلوی
۳	تفسیر موضح القرآن	،، ،،				در مدرسہ شاہ محمد اسحاق صورت تحریر یافت آخری ۷ پارے
۴	تفسیر موضح القرآن	،، ،،	غریب اللہ صدیقی نقشبندی		۵۰۱	دیدہ زیب مطلا نسخہ
۵	تفسیر موضح القرآن	،، ،،				نصف آخر مکمل
۶	تفسیر موسوم بہ موضح القرآن	،، ،،		۱۲۳۴ھ		سات جلدوں میں بیگم صاحبہ امت الحبیب کے لیے لکھا گیا یہ وہی تفسیر ہے جس کو سید احمد ولی اللہی اور مولانا اخلاق حسین قاسمی نے جعلی موضح القرآن قرار دیا ہے، مگر ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔
۷	ترجمہ تفسیر عزیزی، پارہ عم	مترجم: مولوی محمد حسین خاں شیدا رامپوری			تقریباً ۳۵۱	

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق یا صفحات	کیفیت
۸	ترجمہ منظوم پارۂ عم (ناقص الطرفین)					نمونۂ ترجمہ: فان اللہ غنی عن العالمین یعنی بے پرواہ بھی وجود خلق سے ہے وہ مستغنی وجود خلق سے۔
۹	مرآۃ حق نما ترجمہ تفسیر سورہ مزمل	مولفہ سید طہ کتانوی ترجمہ: عبدالحق خاطف بن حکیم الٰہی بخش ابن جلال الدین مظفر نگری	بخط مترجم	۱۲۵۷ھ	۳۵۲	یہ کتاب شائع ہو چکی ہے ایک خطی نسخہ صولت پبلک لائبریری رامپور میں ہے۔
۱۰	تفسیر قرآن		مسودہ مؤلف			سورۂ یوسف سے سورۂ زمر تک مختلف اجزاء (یہ تفسیر اسی مسودہ سے شائع ہو چکی ہے حاشیہ پر کاتب ناقل کے استدراکات اور صفحات آیات لکھے ہوئے ہیں)۔
۱۱	التقصیر فی التفسیر (مبیضہ)	مولانا تھانوی	اسعد اللہ رامپوری	۱۳۵۰ھ	۱۴۶ ص	شرح و تسہیل: مولانا اسعد اللہ رامپوری ایک صفحہ حضرت تھانوی کی اصلاحات سے مزین ہے۔
۱۲	التقصیر فی التفسیر (مسودہ)		شرح تسہیل: مولانا اسعد اللہ رامپوری			
۱۳	تحقیقات اشرفیہ	افادات: مولانا اشرف علی تھانوی تالیف: مولوی ناظر حسین تھانوی	مولوی ناظر حسن		۲۲	مختلف آیات کے معانی و مطالب
۱۴	ترجمہ قرآن شریف	شبیر احمد جذبی کاندھلوی	مسودۂ مؤلف	۱۹۵۶ء		فاتحہ سے نحل تک
۱۵	تاویل التنزیل یا تفسیر اشرف "جلد اول"	مولانا اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۱۳ھ	۸۳۲	پہلے نو پارے
۱۶	" " "جلد دوم"	" "	" "	۱۳۱۴ھ		
۱۷	" " "جلد سوم"	" "	" "			تا سورۂ شوریٰ آیت ۳۲۔

تجوید

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
١	سبع طباق	مولانا اشرف علی تھانوی	غالباً مولوی ناظر حسن تھانوی	قبل از ١٩١٧ء		یہ کتاب "تنشیط الطبع فی الاجراء السبع" ہے جو شائع ہو چکی ہے
٢	رسالہ در تحقیق ضاد	مولانا عبد العزیز امروہی	مسودہ مؤلف			

حدیث

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
١	کنز اللطائف تقریب ترمذی	مترجم: مولانا اشرف علی تھانوی	مولوی ناظر حسن	١٣١٣ھ	٢٣٢ ص	مولانا کی اصلاح و تحریرات سے مزین ہے
٢	تحفۃ القاری تقریر درس صحیح بخاری	افادات: شبیر احمد عثمانی، مرتبہ: محمد مالک کاندھلوی	محمد مالک کاندھلوی			
٣	فوائد اشرفیہ متعلقہ موطا امام مالک	افادات: اشرف علی تھانوی، ترتیب: ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	١٣١٢ھ	٣٩	
۴	چہل حدیث (مترجم)			١٢٣٨ھ		
۵	رسالہ گناہ کبیرہ	الٰہی بخش کاندھلوی	امام الدین کاندھلوی	١٢٣٨ھ		

فقہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
١	ازالۃ الکفر (منظوم)	الٰہی بخش کاندھلوی	امام الدین کاندھلوی	١٢٣٨ھ	٢١	
٢	کتاب فقہ (منظوم)					عنایت امور معیشت افزون، رکھو بنا و آخرت میں
٣	مفتاح الجنت	کرامت علی جونپوری				ناقص الآخر
۴	آداب ماں اور باپ کے					ناقص و ناتمام
۵	رسالہ متعلقہ مسائل زنان	عبد الکریم بن مخدوم دریترہ				

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۶	ہدایات	عنایت احمد کاکوروی	محمد یوسف	١٨٨٠ء		
۷	جوابات چند سوالات	نذیر حسین میاں دہلوی	محمد یوسف			
۸	رسالہ در بیان بعض منہیات شرعی	قربان علی				
۹	رسائل متفرق اجتہاد و تقلید وغیرہ	مولوی عبدالکریم، مولوی یسینؔ، مولوی محمد حسین، مولوی عبیداللہ مؤلف تحفۃ الہند		١٢٩٧ھ / ١٨٨١ء		
۱۰	تقریر الصلوٰۃ	شاہ عبدالقادر محدث دہلوی		١٢٤٨ھ		
۱۱	صدوسی مسئلہ (منظوم)	محمد امیر				صدوسی مسئلہ فرض خدا نیہ تم سیکھو ..... (ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات اردو انجمن ترقی اردو کراچی ص ۱۱۴۳ ج ۲ طبع اول)
۱۲	رسالہ فقہ ہندی (منظوم)					سنتیں اب وضو کی دس پہچان جو کرئی چلنے اسکو ہر دے پیچان
۱۳	رسالہ بے نمازاں (منظوم)					
۱۴	رسالہ فقہ (منظوم)					اگر دو عدد تک کریں مینگنیاں شتر کی تر یا بکری کی ہوں عیاں
۱۵	فتاویٰ مولانا رشید احمد گنگوہی	رشید احمد گنگوہی		١٣٢٣ھ		خان آبھا جوابات حضرت گنگوہی
۱۶	معیار الشریعۃ	عبدالحئی لاہوری	غالباً مؤلف کی قلم سے ہے نسخہ مکتوبہ مؤلف	١٩٢٢ء		
۱۷	آداب معیشت	احتشام الحسن کاندھلوی				
۱۸	تقریر الصلوٰۃ	شاہ عبدالقادر محدث		١٢٣٨ھ		(فوٹو اسٹیٹ)

مواعظ یا دینیات عامہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	رسالہ علامات قیامت					
۲	خیر الوصایا	غلام اکبر خاں	محمد یوسف ٹانڈہ			
۳	رسالہ در احوال قیامت و بعض مسائل ضروریہ					ناقص الطرفین
۴	رسالہ ذکر دین (منظوم)	شمس الدین دیوبندی مرید سید احمد شہید	محمد حسن	اواخر تیرھویں صدی	۳۲	ملاحظہ ہو: تاریخ دیوبند سید محبوب رضوی ص، ۲۰۶ طبع دوم
۵	مواعظ حسنہ	افادات: اشرف علی تھانوی	ناظر حسین تھانوی	۱۳۱۵ھ	۳۰	یہ حضرت کے سب سے پہلے ملفوظ مواعظ میں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔
۶	ملفوظ قرآنی	" "	" "	۱۳۱۵ھ		اس میں ایک خاتون کا قصہ ہے جو ملفوظ بآیات قرآنی کیا کرتی تھیں۔
۷	اسلامی معاشرت کیا ہے؟	احتشام الحسن	نسخہ مؤلف	۱۳۸۶ھ		
۸	رسالہ جہادیہ	خرم علی بلہوری		تقریباً ۱۲۴۸ھ		بعد تحمید حمد و نعت رسول اکرمؐ یہ رسالہ بے تبادیر کہ لکھا ہے قلم
۹	رسالہ فضائل علم و عمل		حکیم علی اکبر کیرانوی			
۱۰	رسالہ تذکرہ الجنۃ والنار	نواب قطب الدین احمد دہلوی	" "			

تصوف

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	انوار الوجود فی تحقیق وحدۃ الوجود والشہود	اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۱۵ھ	۳۱	
۲	الوجود والشہود الفوائد فی التذکرہ الاشرفیہ	افادات: "	" "			جس میں برزخ وغیرہ مختلف مسائل پر حضرت کے افادات جمع کیے گئے۔

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۲	وصایا حکیم لقمان		محمد یوسف ٹانڈہ	۱۲۹۷ھ		

مجموعہائے ملفوظات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تذکرۂ اشرفیہ	ملفوظات اشرف علی تھانوی	ناظر حسن تھانوی			
۲	لاریب فیہ	ملفوظات مولانائے روم	شبیر احمد جذبی	۱۳۸۹ھ		ترجمہ فیہ مافیہ
۳	مجموعہ مکتوبات	امداد اللہ مکی، محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمد یعقوب نانوتوی بنام امداد اللہ وغیرہ	غالباً عاشق الٰہی میرٹھی و عبداللہ گنگوہی			فوٹو اسٹیٹ

عملیات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	ترجمہ الیو مجربات دیری	مترجم: بشارت علی بن مردان علی	محمد زکریا بن محمد یوسف بڈھانوی	۱۹۳۲ء	۱۰۴ص	
۲	جواہر خمسہ		" "	۱۳۵۶ھ	۱۶۶ص	

اوراد و وظائف

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	اردو ترجمہ دلائل الخیرات			۱۲۴۰ھ		
۲	قصر العرفان علی بنیان الایمان	عبدالعزیز امروہوی				

ردّ بدعات

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	نصیحۃ المسلمین	خرم علی بلہوری		قبل از ۱۲۴۵ھ	۲۴	آخری صفحہ پر مفتی الٰہی بخش کے قلم سے انکی اپنی ایک نظم تحریر مؤلفہ ۱۲۲۹ھ
۲	ہدایات المومنین	حسن علی قنوجی		تقریباً ۱۲۶۰ھ		
۳	ردّ رسوم	مظفر حسین کاندھلوی (م ۱۲۸۳ھ)	محمد ضامن شہید، ۱۸۵۷ء	تقریباً ۱۲۶۰ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۴	رسالہ تعزیہ داری	شاہ عبدالعزیز محدث رح	حکیم علی اکبر کیرانوی	۱۲۷۹ھ		
۵	رسالہ سیف قاطع منظوم در رد اہل تشیع					
۶	رسالہ در رد عیسائیان				۱۲۵	تقریباً سو سال پرانا نسخہ ہے۔ نفیس کاغذ خوشخط تحریر
۷	مولد شریف				۱۲۷	
۸	وفات نامہ (منظوم)	خان مرادآبادی		تیرھویں صدی		
۹	وفات نامہ					

سیر الصحابہ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تحفۃ السلطان فی فضائل اصحاب رسول الرحمٰن	نواب قطب الدین دہلوی		۱۲۷۰ھ		ناقص الآخر
۲	احوال حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ	شبیر احمد جاذب				

تذکرہ علما و صوفیا

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تذکرۃ الاولیا	محمد زکریا بن یوسف پڈبھانوی م ۱۹۵۳ء			۶۰۱	نسخہ مولف ۱۰۰۰ علما کا تذکرہ
۲	فہرست تذکرۃ الاولیا	" "				نسخہ مولف
۳	ترجمہ تحائف رشیدیہ از شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی ۱۱۴۳ھ در احوال مشائخ سلسلہ قادریہ	مترجم: نصیر الدین احمد عثمانی پانی پتی	نسیم احمد خان	۱۳۹۹ھ	۷۷ ص	صرف اہل کیرانہ سے متعلق
۴	حالات صوفیا و مشائخ کیرانہ	شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی	غالباً پیرجی ناظر حسن مجھانوی	۱۳۶۰ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۵	حالات صوفیا و مشائخ کیرانہ (نقل)	شاہ عبدالرشید قادری کیرانوی	مصطفیٰ علی تھانوی	۱۲۹۳ھ		
۶	حالات مفتی عبدالرزاق تھانوی	ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۳۳ھ	۸۴ص	تتمہ از ناظر حسن (تاریخ تھانہ بھون)
۷	بابینا علماء		محمد زکریا بن یوسف بڈھانوی	۱۳۵۸ھ		

تذکرہ شعراء

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	گلدستہ نازنینان	کریم الدین پانی پتی	امیر بیگ امیر کاندھلوی، برادر زادہ سعادت یار خاں رنگین		۵۰	یہ نسخہ اس لحاظ سے خاصا اہم ہے کہ اس کی ترتیب گلدستہ کے مطبوعہ نسخہ سے کچھ مختلف ہے اور اس میں بعض اضافات ہیں مثلاً رنگین کے حالات میں

تاریخ

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	تاریخ عالم	محمد زکریا بڈھانوی			۳۳۱ ۳۶-۴۰ سطور	نسخہ مولف، تاریخ اولیاء کا پہلا حصہ لیکن موضوع مختلف
۲	خلاصہ تاریخ ہند		امیر بیگ امیر کاندھلوی			
۳	تاریخ قصبہ تھانہ بھون	ناظر حسن تھانوی	ناظر حسن تھانوی	۱۳۳۳ھ	۶۸۰ص	

ادب اردو نثر

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	مذہب عشق (گل بکاؤلی)	نہال چند عشق	امیر بیگ خاں کاندھلوی	۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء	۶۴	
۲	مذہب عشق	" "	سید باقر علی کرنال	۱۲۶۰ھ		
۳	ترجمہ داستان وصال نامہ (مع اضافات و ترتیب جدید)	منور علی ولد شیخ نور علی ایزدی			۱۱۴، ۱۷ سطور	سنہ تالیف ۱۸۲۲ء / ۱۲۳۴ھ مولف نے باغ و بہار دلچسپ نام رکھا ہے۔

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۴	داستان					۱۲۰۴ھ میں واقع بندرابن کے ایک نوجوان کا قصۂ محبت

ادب اور نظم

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	رسالہ حمد و نعت و مناجات		قدیر النساء		۱۲	
۲	انتخاب کلام حمد و نعت	علی و زنگیلا تھانوی، شوکت علی تھانوی، اصغر تھانوی، عارف تھانوی، نوت تھانوی	ایوب علی تھانوی، میکش تھانوی، بیدل رامپوری			
۳	بستان شہادت (ترجمہ منظوم)	علی احمد رازی سرادی	اصغر علی بن منصور علی نیازی	۱۲۶۵ھ	۳۱۸ فی ۲۱ سطور	اس کا ۱۲۲۰ھ کا ایک نسخہ انجمن ترقی اردو کراچی میں بھی ہے فہرست ص۱۱ جلد ششم فہرست میں ۱۲۲۳ھ کو سنہ تالیف لکھا ہے جو درست نہیں ہے۔ تالیف ۱۱۸۲ھ ہے۔
۴	مثنوی دریائے عشق	میر تقی میر		۱۲۰۶ھ		
۵	دیوان رنگین	سعادت یار خاں رنگین	امیر یار بیگ برادر زادہ رنگین			
۶	دیوان امیر	امیر یار بیگ برادر زادہ رنگین	〃			
۷	مثنوی مظہر العجائب و عمدۃ الغرائب	میر ضمیر لکھنوی (م ۱۲۷۲ھ)				در حیات مؤلف ضمیر کو سلمہ اللہ لکھا ہے۔
۸	مثنوی مرغوب القلوب	شاہ غیاث الدین رہتکی	میر اسد اللہ	۱۲۱۶ھ		
۹	مثنوی قصہ سیاہ پوش	شکوہ علی	عبد المجید			اسی نام کی ایک مثنوی شاہ رحمان کی بھی ہے
۱۰	مثنوی قصۂ بدر منیر					ناقص الطرفین درمیان سے بھی کچھ اوراق ضائع ہوگئے ہیں
۱۱	مجمع فیض العلوم مثنوی مولانا روم (ترجمہ منظوم)		الٰہی بخش نشاط و مولانا ابوالحسن کاندھلوی	۱۲۶۳ھ	۱۶۴	(ترجمہ ابتدائی ایک ہزار اشعار) مفتی الٰہی بخش
۱۲	〃 〃		ابوالمنصور گنگوہی (تاریخ سہارنپور ص ۱۹۹)			(ترجمہ دفتر اول) ابوالحسن خلف الٰہی بخش نشاط
۱۳	〃 〃		ابھارا احمد کشمیرانوی	تقریباً ۱۲۷۵ھ		

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱۴	مثنوی گلزار ابراہیم	ابوالحسن کاندھلوی		۱۲۵۲ھ	۱۵۳	نسخۂ مؤلف
۱۵	" "	" "	خلیفہ محی الدین کاندھلوی	۱۲۶۴ھ	۱۲۹	تصحیح کردہ مؤلف
۱۶	مثنوی بحر الحقیقت	" "				نسخۂ مؤلف
۱۷	" "	" "	مولانا حسن			ناقص الطرفین
۱۸	مثنوی سمجھ بوجھ	" "				
۱۹	مرثیہ نہر جمنا شرقی کاندھلہ	محمد احمد رسا کاندھلوی				دو نسخے رسا کاندھلوی غالباً ذوق کے شاگرد تھے
۲۰	ساقی نامہ	حکیم عبدالرحمن حیرت جھنجھانوی (شاگرد صہبائی)		۱۸۸۵ء	۱۲۴	نسخۂ مؤلف تالیف بفرمائش شبلی نعمانی
۲۱	قصیدہ بانت سعاد (ترجمہ منظوم)	شبیر احمد جذبی کاندھلوی				نسخۂ مؤلف
۲۲	قصیدہ بردہ (ترجمہ منظوم)	" "				"
۲۳	معلقہ امرؤ القیس (ترجمہ منظوم)	" "				"
۲۴	مسدس عروج اسلام	" "	خلیق الرحمن کاندھلوی	۱۳۶۴ھ	۱۸۰	(بجواب مسدس مد و جزر اسلام حالی)
۲۵	بیاض اشعار و منتخبات	حکیم محمد نعیم خلف حکیم محمد سعید کیرانوی مہاجر مکی		۱۲۵۳ھ	۱۸۰	
۲۶	محاربات اسلام (جلد اول و دوم)	اولاد علی لکھنوی	امت المعبود بنت حکیم مولانا رضی الحسن کاندھلوی	۱۳۵۸ھ	۳۹۸+ ۳۷۶	
۲۷	مصدر فیوض	شاہ نذیر حسن		۱۲۷۲ھ		
۲۸	تذکرۃ البلاغت	ذوالفقار علی دیوبندی	محمود (؟)	۱۳۳۲ھ		قیاس ہے کہ کاتب نسخہ شاید شیخ الہند مولانا محمود حسن ہیں

طب

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۱	طب نبوی	اکرام الدین احمد داغطاد پوری	حافظ محمد ضامن	تقریباً ۱۲۶۱ھ	۶۰	
۲	طب نبوی تتمہ و تکملہ	نظر محمد خان				نسخۂ مؤلف مرید و مسترشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی

	نام کتاب	مؤلف	کاتب	سنہ کتابت	اوراق	کیفیت
۳	فوائد الطب	حکیم محمد علی اکبرآبادی	حکیم علی اکبر کیرانوی	۱۲۸۳ھ		
۴	کتاب طب نامعلوم الاسم					ناقص الآخر باب اوّل در تعریف صحت
۵	کتاب در تحقیق فلزات و جواہر				تقریباً ۱۰۰۰ ص	اس میں تمام دھاتوں اور اُپ دھاتوں کے بننے ، بنے اور مختلف طریقوں سے انکے متفرق استعمال کا تذکرہ ہے
۶	مفردات یونانی	گنگا پرشاد رونق			۷۸	
۷	تنظیم المسلمین عن موالات المشرکین	عزیز الحسن کاندھلوی		۱۹۳۸ء		نسخہ مؤلف (درجواب مسلک حضرت تھانوی)

Hejazi, *Zangana*, *Zabangir*, *Shahana*, and three others namely *Muzhik*, *Mubki*, *Munawwim*, which induced laughter, weeping and sleep respectively, come in Harf three, Vol. II of *Risail-ul-Ijaz* which contains a long discourse on Music, consisting of three sections, spread over seventeen pages. It relates to the root or fundamentals (*Usul*) of music and the branches or derivatives (*Furu'*) thereof (*Inshi'ab-i-Usul-o-Furu'-i-Musiqi*). These are mainly foreign and Persian. One could not expect the use of the nomenclature or terminology of the Indian system such as *Grama* (Scale), *Jati* (Fundamental harmony), *Srutis*, *Murchhana* (intervals), *Sarigam* (gamut), *Saptak* (Scale of 7 notes), *Svara*, *Tala*, *Laya*, *Dhun* and *That*. But there is nothing to show that Amir Khusrau's *Pardas* and *Maqams* were connected or identical with the 36 Ragas and Raginis and the other modes and melodies of the Indian musicians.

One finds no reference in the *Risail* or elsewhere to the modes or airs of the composite character such as *Qaul*, *Qalbana*, *Naqsh*, *Nigar*, *Aiman*, *Zilaf*, *Khiyal*, *Basit*, *Saham*, *Ghanam*, *Suhaila*, *Gul*, *Ghara*, etc. which are ascribed to him. In *Risail* he does write about the musical contest and the arrival of foreign musicians, real or fictitious, such as the two Abul Farrukhi instrumentalists, one of whom played on *Nay* and the other on *Barbat*, and the two *Goindas* (Singers) named Daud Jabalish and *Sha'aban* Qamarish who came from Bakharz and Farghana and he called upon the Indian artists, led by Kamal-uz-Zaman, the Amir-ut-Tuyar, to challenge and defeat them so that "the dove-pigeon of *Bala* (upper or western region) should know what type of (singing) birds are found in the spring of Hindustan" (*Ke Murgh Chun Buwad andar Bahar-i-Hindustan*). But he is completely silent about his eclipsing and outshining the musical wizard of the South, Gopal Naik, to earn the epithet of Nayak for himself. There is no reference to classical Indian Music or its composition and theorists like Bharata. but Amir Khusrau incidentally mentions Safiuddin Abdul Momin (692/1294), the famous author and the theorist of the systematic school of Eastern Arabs, and makes frequent mention of Barbad and Nikisa, the celebrated ministers of the Sassanid king. Khusrau Parwez (590-628).

(7) Sometimes when the musician himself began to sing, a whole world was drawn to, and became enlivened by the note of *Nawa*. (8) Sometimes when he brought out the *Bu Salik* note, the heart became like a silk-threaded pearl. (9) Sometimes he deludes the silkful artist and makes the area of *Nihawan* too narrow for the music. (10) Sometimes with the musical notes (Naghma) full of fresh modulations, he found his way into the land of *Bākharz*. (11) Sometimes when he hugs the Chang (harp) tightly to his bosom and holds it in his lap the Chang divulges the note of *Ushshāq* (lovers). (12) Sometimes like the grief-affected lover, torn by pangs of separation, the Ṇāi (lute) emitted its plaintive sounds in the way of *Iraq*. note. (13) Sometimes when the player adjusted the adverse (*Mokhālif*) tone he became friendly although he sounded the *Mukhalif* note. (14) Sometimes with the full blow from the palate of the Ṇāi (lute or reedpipe) it gave complete peace and happiness to *Farghāna*. (15) The *Tezi-i-Rāast* note came straight like an arrow and struck the heart of the lover who was fit to be killed. (15) The lance-wielder of Chang who resembled *Tohamtan* (*Rustam*) ran his *Rukhsh* (Rustam's horse) from *Zabul* like *Zaal* (Rustam's father). (16) When the melodious music sent forth its fine, soft and deepest tones (*Zir-o-Bam*), it crossed from *Zir* to *Hussaini*. (17) The concert (Zamzama) of *Sāzgāri* (a soft musical air made up by Iraq and Isfahān note) in Iraq style was in accord with the Persian *Āhang* (modulation) of Iraq. (18) Everybody wanted Sāzgāri and its musical notes reached *Sipāhān*. (19) Wisdom became a traveller from this manufactory (Kargah) and began to traverse rapidly the road towards *Bākharz*. (20) It returned to *Qaul* (a kind of song) sung by the Qawwals, sometimes in *Rāast* (full or straight) tone and sometime in *Neem Rāast* (half tone). (21) The *Zanga* note produced in deep and soft sound by the plectrum became sometimes out of place and emitted the shrill sound of *Nafir* (brazen trumpet). (22) In the face of such a choice *Mantiq-i-Tair* (voice of birds) in *Fakhtah* (dove) in the garden could sing according to *Osul* (principles).

There are more than the twelve traditional melodic notes in the above, and yet some of the important melodic modes mentioned by Amir Khusrau himself in *Ijāz-i-Khusravi*, such as Rehāvi, Muhayyar (wrongly called Mujir and identified with Indian Todi), Chakāwak, Shad-i-Rawān Marwārid, Arab, Ajam,

Sometimes on account of dryness, it becomes very hot, and it will not emit fresh sounds (melodic notes) unless it receives water.

The Indian and Iranian, like the ancient Hebrew music, being melodic and not harmonic, musical modes or melodies called variously as Maqāmat, Parda-i-Sarod, Nawā-i-Wa Lahne, Rāg or Swara are its outstanding features. The seven primary notes of Iran which were perhaps similar to the seven original Jāfis of the Indian musicians became twelve after the time of Khusrāu Perwez (590-628). The Arabs had also their national melodies and modes and their twelve 'Naghmas' stood for notes and modes. But the airs of different countries have some distinctiveness of their own, being a reflex of moods and feelings, and character and emotions of the people to which they belong, and they are sometime named after the places and provinces of their origin. The twelve Maqāms Parda-Rag had become a fixed number of notes and modes in the 13th and the 14th centuries. The famous Persian poet, Badr Chach of the Tughlaq period, who came just a little after Amir Khusrau, says that "the basic modes are none except ten and two" (Asl Parda Bajuz Dah-o-Do-neest) and he fixes each one of them to particular parts of the day and night. Amir Khusrau also speaks of four Usuls, twelve Pardas, six Abraishams. The list given by these two poets and those found in works of lexicons and musical works do not wholly tally. Let us see what Amir Khusrau says in *Qirān-us-Sāadain* about the "description of the musical modes (Parda) and skilled knowers thereof who with every one of their hands brings forth hundreds (immense variety) of notes".

(1) The players on stringed instrument (Rud Zanān) are all measurers of fine delicate sounds and practise diligently on the silken chords. (2) They make the silken chords their life-veins and bring out life from the veins at the harp. (3) This one (Chang) displays double colour, like the cock (produces different kinds of notes). Certainly it is cock (*Murgh*) but it is in the grip of the hawk (player). (4) When that one (Player) emits the note of *Nawa* he becomes *Kunjishk* (sparrow), but he brings down the flying bird from the *Hawa* (air). (5) When he wanted to produce certain melodious notes he swung from the left (*chap*) to the right (*rast*) path. (6) Sometimes when the instrumentalist plays the *Hussaini* note on his strings he displays that in a most beautiful (*Hasan*) manner.

(sweet voice) enchanting snake which becomes coquettish in the hands of others. (5) What a strange black thing has come out from Iraq! It has come but is heart-burnt on account of the pangs of separation. (6) It has no mouth till you make a speech, and it has no speech till you put a note in its mouth. (7) It lays down its head before you (submits) if you breathe or blow into it. It will not blow till you cut out its head. (8) When it feels disposed to produce sweet sounds, it banishes whatever is in its head (9) The musician has control over its breath and works magic. He splits its head and again joins it. (10) Sometimes its speech (note) becomes all tongue and for producing sound its mouth becomes brimful of sweet sounds (*Nawā*). (11) It opens its lips like an orator, but its tongue is in the control of the lips of others (12) With every touch of hand it produces fresh melodies; under every finger there are hundreds of skills. (13) It is like a wooden house with pillars in the middle; but for the passage of the wind inside, it is very niggardly. (14) Through the breath which the musician blows continuously, there is an incessant flow of wind in its head.

We may now consider the descriptive verses relating to *Daff* (small round tambourine), an instrument of vibrating membrane with metal plates. (1) The orbit of *Daff* has an enclosure made of wood and its area or plate is beaten by five fingers. (2) Through its circular motion the Venus comes out (of its orbit) to sing and its dome descends from the celestial globe. (3) It has ringing bells fastened here and there to its waist. Like the girdle of the firmament it displays so many grelots (*Jalājil*). (4) It is seated on the palm of the hand, sometimes being on the hand, and sometimes being under it. (5) It has four tongues, two being in the mouth. It is eloquent in speech, but there is duality in its tongue. (6) All the excellent speech that it makes before its beloved is made from behind the curtain and through the skin (privately and secretly). (7) Apparently it has got two faces (sides). But when it is beaten in the face the artist makes it one face. (8) It has a face both on this side and that, and it sings both from this and that side. (9) The palm of the minstrel, according to the fine principles of the modes and tones brings forth sometimes heavy (*Saqil*) sound and sometimes light (*Khafif*) sound. (10) Sometimes moisture (sweating or perspiring) makes its skin tremble, and sometimes the flame of the sun becomes its friend. (11)

First we get the description of stringed instruments called *Chang* (harp) "whose one leg is devoid of hair, while the hair of the other leg reaches the ground". (2) with its head cast down and also raised above the *Chang* it has its hair skilfully interwoven. (3) It is like a crescent with its head bent down. Thirty nights and thirty days are mixed up with it. (4) It is a half arch and has four bow strings (*Zeh*). The stroke of the plectrum breaks up the hearts. (5) It is a boat of parchment with the river flowing over it, but the parchment does not become wet with the water. (6) Many notes are given birth to by the plectrum but its belly is empty upto its bottom. (7) The cover is of silk and the chord is of hair. Sometimes it has silken strings and sometimes luminous hair.

This is followed by the description of another stringed or bowed instrument, the flat-chested *Rabāb* (Rebec or Lyre). (1) The soothing sound of the bowl-shaped *Rabāb* (Rebec) robs people of their heart and restores life in them. (2) The cup is empty, but it has many gifts or blessings. Many (beggerly) hands are stretched towards its bowl-like palm. (3) They feel its pulse, but it is not ill. They put a screen over it, but it is not veiled. (4) When the sharp plectrum is trimmed, it is the throat and not the sound which is scratched. (5) The strings (rud) from the ruling lines ('Mister') on the surface of its leaf, although melodic sounds ('Sarod') cannot be inscribed or written down. (6) When it draws its sound of high pitch the note of the instrument reaches the Venus. (7) And when it emits its plaintive note which is devoid of loud noise it cannot hear its own voice, although it has its ears. (8) Ass-like it is tied with the chain which is golden; what a wonder that the ass is dumb while the chord is speaking. (9) The ass usually runs away when it is pricked but this ass is sticking to its place although the lancet is running over it. (10) The silken-clad child (Rabāb) has four wires or strings, and out of these come two-six (twelve) notes (Pardas).

We next get the description of the wind instrument *Nāi* (reed pipe, flute or oboe). (1) Every moment when it is blown, the cheek of the minstrel is puffed up with air like a bag or purse. (2) Although the mouth of the *Nāi* is closed, it is very talkative. Don't say it is *Nāi* but call it a snake because of its charm or incantation. (3) The black cobra has made its way through holes. You see one snake, but the holes are ten. (4) It is a sugar-eating

Tumbuk player became its interpreter. (21) The *Ajab-i-rud*[20] (?) showed its teeth from behind the curtain. Its lips were like a *Nāi* and its mouth was all smile. (22) The Indian melodic note (Lahn-i-Hindwi) had caused the Venus to lose its senses and Mars had forgotten its language (of machination). (23) The miracle-working fairy-faced Indian minstrel opened the door of frenzy through her musical melody. (24) While she held the *Tal* (cymbal) in her hand like a cup she became intoxicated by her own singing and not through the use of wine. (25) with pleasant tunes emitting from their lips the beautiful ones moved round and looked up in quick succession, beating their legs on the ground. (26) Their fine ensnaring Deogiri apparel looked like a shadow which captured the figures (bodies) of the fairies. (27) Some were attired in silken garments and their faces were like fine painted silk. It seemed that the silk had entered the body like hair. (28) Merrily engaged in dancing, the beautiful ones were playing with the breeze. It seemed as if they were walking on the sounds.

What the author says about music and dancing that was in vogue in his time in the above poetical piece is well worth our attention. Amir Khusrau was certainly interested in, and was appreciative of, the indigenous art and culture but we have yet to discover the evidence in his own and other contemporary writings to justify the credit generally given to him for making a critical and constructive study of the Indian music, synthesising that with the Arabo-Persian system with which he was thoroughly familiar, and inventing and evolving new styles of singing and new instruments. There are meaningful and graphic descriptions of lovely cup-bearers, dancers, musical instruments, tones, notes, melodies in eight pages of Qirān-us-Sāadain. We may consider some of the verses. The experts who know the forms, structure, functions of music and also the airs or melodic modulations will perhaps be able to understand and assess the value of Amir Khusrau's achievements and contribution better if what has been locked up so far in Persian is placed before them in an English garb.[21]

20. Sometimes it means an instrument and some times musical sounds emitted by such instruments as Chang and Rabāb.

21. It would be interesting to compare the description given by a younger contemporary in Basatin-ul-Uns. (See my paper in J.B.R.S., Patna, 1960.

were brought down. (4) As on account of the sound produced by it the harp (*Chang*) is the king of all musical instruments, it fastened its chord (*Tār*) with hair at ten places. (5) In one of its legs the hair came down to the earth, while the other leg was without hair like the palm of the hand (6) The vein and hair were tied on both sides in such a way that you might say that the hair had grown out of its veins. (7) The whole of *Nāi* (flute) had become throat and windpipe. It was like an organ of Rum made by an Ethiopian. (8) It was black and yellow and a peculiar type of bough. A greenish thing had come out of an ebony wood. (9) The Tambourine (*Daff*) was like a strong fort because of its wall. The enclosure was of wood and its court-yard was made of parchments. (10) It was ever revolving between its handles. It was a peculiarly moving castle. (11) When the Daff player started playing on the instrument he effaced its surface with the stroke of his nails. (12) Look at the clear difference between the harp (Chang) and the barbaton (*Barbat*). One was swollen-headed and the other was meek and submissive. (13) When the string (*Rud*) of the Barbat sent out the sound, the duck-shaped flask was constantly weeping out blood (sounding plaintive notes). (14) The pandora (*Tumbur*) was heavy-headed (self-conceited) owing to its pumpkin. It was wallowing but was neither drunk nor intoxicated. (15) After the fashion of the Hindus a variety of melodic hymns (Mazāmir), assuming several forms, enraptured the souls through the lowest and the highest strings (Bam-o-Zir). (16) The veins (strings) of *Alāwan*[18] (?) were extended beyond its body. The gourd (Kadu) was at the back and the veins were without blood. (17) Mark the novelty that it had placed the gourd on itself but let out blood from the eyes of the audience. (18) There was another brass instrument named *Tāl* (a sort of cymbal with bell metal) handled by the fingers by fairy-faced damsels of ravishing charms. (19) The two brazen bell metals or heroes (*Ruin Tan*) facing each other on the fighting ground looked like the two sides of the scale in Persian Daff, beaten with strokes. (20) When the Hindi '*Tumbuk*'[19] emitted its plaintive notes the

18. The excess wire-strings kept within the instrument.

19. Abdur Razzāq, the Persian envoy of Shah Rukh in the court of Vijayanagar has mentioned some instruments in his book, *Matla-us-Sādain* and these include, Kamāncha, Nāi, Damdama, Kus, Naqqāra, and also Tumbuk. The last appears to have been a type of Persian Tambourine with a shell of body in the shape of oval cup.

ones (swift-paced ones) amongst them (ran fast) learnt it quickly. (5) To some extent they acquired it and thus they added something to their skill (6) Although coming within the boundary of India they stayed here for more than 30 or 40 years. (7) Yet they had not the capacity to warm themselves up (grapple with the principles thoroughly) by a single soft sound (note) on account of their cool temperament. (8) The 9th argument is that the arrow-like swift soft sound strikes the heart of a wild antelope in such a way that it does not realise it. (10) As soon as the refreshing sound enters into the ears of the antelope, it is affected by it without being conscious of it. When it cannot overcome its unconsciousness, the arrow strikes it. (11) It becomes transfixed without the use of bow and arrow and that very moment it gives up its life on account of the musical stroke.

It is unfortunate that Amir Khusrau, despite his great appreciation of Indian Music, gives us little positive information about its nature and elements. Referring to the festivities held in the court of the young voluptuous grandson and successor of Balban, Sultan Qaiqobād, the historian Barani tells us that skilful musicians who were experts in the Persian and the Indian music (Pārsi Wa Hindavi) set their songs so as to be in accord with every melodic note (Parda) to provide tunes and sang the praises of the Sultan. Amir Khusrau refers to the 'Usul' or principles and to the 12 'Pardas' and 6 'Abraishams' (tones or notes or melody or bass string of a musical instrument), but he does not explain what he meant by the 'usul' and 'Furu' nor does he enumerate the 12 Pardas or their offshoots, and says nothing about their nature. But, we get much in his writings about the Arabo-Persian notes and instruments. In fact, we can have an idea of the nature, shape and structure of the musical instruments and the names of the prevalent Persian 'Pardas' or Maqāmāts' some of which may be taken to be analogous to the Indian Ragas, from his writings.

We may begin with some of the verses which occur in the Ashiqa (1) By every melodic note a man may die and may come back to life. for each one of them is capable of killing and restoring life. (2) Rhythmic melody sent forth its voice to the Venus as the *Nawā* (sound or musical note) is such as gives and takes away life. (3) The bass string of the instrument (Abraisham) dispersed *Nawā* (note) in the '*Hawā*' (air) and the birds flying in the air

meaningless and rotten. (9) In this sense the musician who requires sound and listening (Sama or audience) is in need of the verse-maker. (10) Look at the dancer who makes sound but has no speech, and therefore, he is dependent for his speech (singing) on somebody else. (11) Consider poetry to be like a bride and music as her ornaments. There is no blemish if the beautiful bride is without ornaments. (12) I would consider him as a real man who knows (appreciates) what is worthy and valuable and if he does not know this he should ask me about it. If he does not do that he is a donkey.'

Amir Khusrau's claim of proficiency and perfections in both poetry and music may not be questioned. That he wrote at least two other volumes of poetry afterwards gives us an idea[16] of the time, when he penned the above lines. Did he write a book on music and was it lost? Certainly he did not consider music as a 'Malāhi' or the forbidden pleasure as was laid down by the Islamic purists. He was a Sufi and a devoted disciple of Hazrat Nizāmuddin[17] Aulia, who was well known for his fondness for music. Amir Khusrau had very high notions about the attainments of the Indians, including their incomparable skill in music. Among the many points of superiority, enumerated by him in his Masnawi, Nuh Sipahr, which the Indians enjoyed over the people of rest of the world, one was music. He writes (1) The 8th argument is that our sweet melodies are like the fire which burns the hearts and the souls (mind) (2) Nothing in this world known to us is similar to this (music) and this is not hidden from anybody that there is no such thing in the whole world. (3) Many musicians came from every direction and they also brought with them their excellent styles. (4) All of them took up this fine art and the intelligent

16. Of his 5 Diwans, the first three Tuhfat-us-Sighar, Wast-ul-Hayat, Ghurrat-ul-Kamāl were compiled in or about 671, 683, and 693 respectively, while the remaining two, Baqiya Naqiya and Nihāyat-ul-Kamāl are dated in about 716 and 724.

17. Of course Music linked with wine and women was condemned by the orthodox Muslims as Malāhi or the forbidden triple pleasure. But the Chisti, Suhrawardi and Firdausi Sufis favoured *'Sama'* with conditions laid down about time, place, persons, contents and instruments. What to speak of *Mazāmir* (wood-wind instruments) the legality of even the *Dastak* (clapping of hands) was questioned in certain circles. See the quotation from Amir Khusrau's *Malfuz, Afzal-ul-Fawai*, given by Dr. Mirza in his book, p. 228.

sciences including music. Poetry and Music went hand in hand and both evoked emotions. People set poetry to music so as to produce the charming melodic notes and tones.[14] There are many Ghazals in *Qirān-us-Sāadain* and *Ashiqa*, which, according to the author's own statement, were given to minstrels who tuned their verses and sang. Let us see what he says about the two. He had reasons to give preference to poetry above music as we find in the following verses, incorporated in his Khulliāt. (1) The Musician said—'Oh Khusrau, the store-house of poetry'. The science of music is better than the poetic art. (2) For the subtleties of this science are too difficult to be brought within the ken of pen, whereas it is not difficult to put that (poetry) down on paper and in books. (3) I replied that I claim perfections in both, and have weighed and tested them in the scale as is due to them. (4) I have already written three volumes of poetry, and if you believe me, I can write three books on music, too. (5) I may tell you the difference between the two in a way which is reasonable and correct, and this can be justly appreciated by one who has expert acquaintance with both. (6) You should take it that poetry is complete in itself, and does not depend on listening (Samā) or on the voices of the minstrels. (7) If anyone can recite verses with fine soft sounds and have the deepest tone (Zir-o-Bam) it is permissible, for there would be no loss or deficiency either in the meaning or in words. (8) On the other hand, much as the singer may make use of "Haun Haun"[15] and "Hān Hān," as there is no poetic sense or eloquence in it, the whole of that would be

14. "Guft Hami Zahra-i-Barbat Zanash. In Ghazal-i-Tar Ze Zebān-i-Man Ash" (The venus like Barbat player recited the beautiful Ghazal composed by me)". In Ghazal Az Mutrib-i-Mauzun Osul—Yafta Dar Gosh-i-Humāyun Qabul etc.

15. In the preface of Ghurratul Kamāl we get this, among other things. "In order to display the beauty of the bride of poetry, twelve screens (Parda or Musical notes) have been stretched along (extracted from) the fine and thin silken chords fastened to the pegs of the Rabāb. If no trace of poetry is found in the woven structure of the silken chords of the Chang, no one will take it to be complete or perfect, as there will be nothing worth except a simple sound and modulation. How fine is the utility of poetry that the science of silken chord (Music), despite its fineness (intricies) is indescribable by pen, and with out being supplemented by it, it remains a mere melodic note (Lahn). Every song which is not adorned with meaning and significance by poetry is absurd and nothing but Hāan and Hāan, Hun and Hun.

sweet-voiced ones the pen of my master will help me to complete it. It would be quite appropriate if I wrote about all the attributes of (the people of) this region, and it would not be my fault if I display on paper the chief festivities through the ink."

But in his two other Masnawis, *Ishqia* (love episodes of Khizr Khan and Deval Devi) and *Qirān-us-Sāadain* (meeting of the propitious stars) all that we get is the Arabo-Persian descriptive terminology for musical instruments, modes and notes. The Sāz or Ālāt (instruments)[11] mentioned by him are Chang, Daff, Rabāb, Nāl, Tambur, Barbat, Rud, Ud, Tabāl, Tāsa, Nafir, Duhal, Karna, Shahnā,i etc. and the terms 'saut' (sund or verses set to music), 'Lahn' (modal melodies), 'Naghma' (melodic modes) 'Parda' (airs or tones) which he frequently makes use of give us an idea of the foreign culture-sources with which he was saturated. The Hindi term Tāl loses its meaning of time-measurement and becomes, in Amir Khusrau's Āshiqa, a Persian word meaning an instrument[12] which was a sort of cymbal with bell metals and played with a stick. What attracts us more in Ashiqa are a few Indian instruments and artists, but this also does not help us much. As regards the story of Amir Khusrau getting the coveted epithet of Nāyak after he outshone the celebrated Southern musical Wizard, Gopal Nāyak,[13] in a poetic competition held for a number of days in the court of Alauddin Khalji, there is no reliable record to support it. He writes in the Risā,il about musical contests between foreign (of Farghāna, Bākharz and Khorāsān) and Indian artists and hints at the superiority of the latter over the former, but he fights shy of all personal references in this connection.

Amir Khusrau was justly famous for his poetic talents and effusions. He was a man of versatile genius, aesthetic tastes, and many-sided activities. He was undoubtedly well-versed in liberal

11. Some more have been mentioned by Amir Khusrau in the Risā,il, but many of them fell into disuse. See Wahid Mirza's book p. 228, footnote. Hasan Nizami, the author of *Tāj-ul-Maāsir*, and the contemporary poets, Hasan Sijzi and Siraji Khorasani do not go beyond the usual list of the Arabo-Persian instruments nor do Mutahhar Karvi and Ikhtisān of the Tughlaq period help us much in this connection.

12. Digar Sāz-i-Beranjin Nāme-i-Āan Tāl, Bar-Anangushte Pari Ruyān-i-Qattāl, p. 156.

13. Vide two articles on Gopal Nayak in J.I.M.A., Madras.

Khayāl Qaul,[8] Qalbāna, Naqsh, Nigār, Sanam, Basit, Sāzgari, Tarāna, Ghanam, Zilaf, Gul, Ghārā, Aiman Suhaila, Sarparda, Mujir, Farodast etc., which late writers, especially Faqirullah, the author of *Rag Darpan,* attributed to him. Instead of referring even to a single ancient Indian theorist, his principles, practices, ideals and abiding legacies he makes mention of Bārbad and Nikisā, the celebrated court ministrels and composers of the Sāssanid King of Persia, Khusrau Parwez (590-628 A.D.), and there is also a casual reference in the Risā,il[9] to Safiuddin Abdul Momin (D. 692=1294), the famous theorist of the systematic school of Eastern Arabs. Abdul Momin's treatises, *Risālat-i-Sharafia* and *Kitāb-ul-Adwār* have served as their principal authorities by the subsequent musicians.

Amir Khusrau's long discourse in *Risā,il-i-Ijāz-Khusravi* entitled *Inshiāb-i-Usul-o-Furu-i-Mausiqi"* (Ramifications of the musical modes or the roots or the fundamentals of the art of Music and their derivatives), has of course something about men, methods and things essentially Indian, as we shall see hereafter, and in his Masnawi, named *Nuh Sipihr*[10] (Nine spheres) he pours forth his eulogium on Indian music which he considered to be superior to that of the rest of the world. In his fifth Diwān, *Nihāyat-ul-Kalām,* while eulogizing the Deogiri music, he writes "The other thing is the sweet song of *Sarod* for every stroke of the bow or the plectrum emits the pleasing, plaintive notes like those of the harp of the Venus. There is no wonder if by their music a dead man is brought back to life, for the musical expression in the heart of every melodic notes infuses new life. The songs emitted by the Arghanun (organ) come to the ears as if they are songs of separation. This (the song) resembles the melodic notes of the nightingale, while that (sound of organ) is like the (gurgling) noise produced by the throats of cups and goblets (Bat-o-Khād). If I propose to draw the picture of the

8. O. C. Gangoli in his book, *Ragas and Raganis* has ascribed many things to Amir Khusrau on the basis of Shibli's statement Usher-ul-Azam in which Raag Darpan has been quoted.

9. His father Abdul Momin bin Safiuddin (12th century) was also a great Arabian musical theorist.

10. Edited and published by Dr. Wahid Mirza. The Mirza's doctoral thesis entitled *Amir Khusrau, His life and works* gives the traditional view based on Rag Darpan.

also the musical scales increased at the hands of the musicians. The seven sounds or notes of the Saptak originating in the Vedic accents and called the Shudh were augmented with five Vikrit Svaras giving in all 12 Notes. There were also many semi-tones called Murchhanas[5] which were distributed over the various Ragas and were made use of as what is done at the present time with the Thāts, the source of the Rāgas. Then there was the relative position of the series of musical notes and the practice of combining sounds in different pitches, high and low, and sliding from notes to notes. We may also refer in passing to the four principal systems or Matas of music which Mirza Khan, the 17th Century author of *Tukhfat-ul-Hind*,[6] mentions, probably, on the authority of Somnāth who described them in his treatise, *Rāg Vivodha* or the Doctrines of the Musical Modes.

It is for the experts and the learned to say something about the nature, extent and prevalence of all these multifarious developments at the time of Amir Khusrau. We have to ransack his own writings to justify the assumptions about his awareness of the distinctive features of the classical system of Indian music and about his contributions to the composite growth of the Indian culture. Doubtlessly he gives ample proofs of his knowledge of, and infatuation for, the Arabo-Persian system of music, but he is completely silent about his own alleged innovations or assimilative efforts. He makes no mention of Sih-tār[7] (Sitār or the type of guitar with three strings) or Tabla (small tambourine) nor of the Modes and Airs of a composite character such as

5. See Popley's Glossary of Musical Words and Phrases.

6. Cap. C. R. Day: *Music and Musical Instruments*, p. 14. These were of Isvara of Bharata; of Hanuman or Pawan; of Callanath. By the way, he is not fair in his remarks about the responsibility of the Muslims for the deterioration and decay of "music like other arts." K. T. Shah would, however, have us believe that "the one art that the muslims did not destroy was music". (*The Splendour That Was Ind*).

7. On the other hand Nizāmi Ganjawi, the great Persian poet who died in 600 A.D., i.e., about a century and a quarter before his own death in (725) has made frequent use of this three stringed instrument which he calls Seh-ta or Se-ta or Sitar "Se-tā-i-Bārbad Āwāz Midād- Samā-i-Arghanu rā Sāaz Midād" (The Sitar of Bārbad sent out its melodic note. It kept itself in tune or harmony with the Arghanun or organ). "Nikisā Chun Ze Shah Ātash Barangekht- Setā-i-Bārbad Ābe Baro Rekht". Nikisā Chun Zad. In Taiyyār Bar Chang-Setā-i-Bārbad Bardāsht Āhang".

Indian music. Music was regarded by the ancient Hindus as sacred and of divine origin, religious and devotional rather than secular, profane and professional and a mere source of enjoyment which was the case with that of the Muslims and others. Public concert was scarce as the music of India has been essentially individualistic—a solo work. It has existed either as the devotional music of the temple or as music of the aristocratic circles and folk songs. The time-honoured legacy still persists, and we have many relics of the former times in the present system of Indian music, both vocal and instrumental. Sacred verses are still set to music and sung in cadence with beats of hands on cymbals or with plectrums or finger-strokes on other bowed and stringed instruments in temples or on sacred and ceremonial occasions, and in social festivities, functions and performances. One can still get echoes of the old grama, Murchana, Jāti system which evolved out into the Sargam (gamut) Saptak (the scale of 7 Notes), Ragas (melodic modes) Svara or Sur (Tones and Notes) with Tāl (beats and time-measurement), Dhun (tunes), Alāp (slow prelude to singing), Lay (symphonic or rhythmic modulations). Modifications and developments came with the march of time as a result of free and frank initiative enjoyed by the artists in their intellectual progress for melodic improvisations. There was no bar to the creation of new Ragas or melodic modes. The 'Jāti Gāen' of the ancient theorist and composer,[4] Bharat, was replaced by the Ragas of the times of Mātanga, Sārangdhar, Somnāth etc. The 18 Jātis or fundamental harmonies receded into the background and the original 6 Ragas, each with 5 or 6 Ragnis or Bharias, and 48 Putrs or Putris came in. These melodies were composed, fixed and classified according to particular seasons of the year and different periods of the day and night. Not only the melodic notes or Ragas which are a basic feature and an out-standing contribution of Indian music, but

4. The earliest detailed exposition of Indian Musical Theory is found in a Treatise called Natya Shastra, said to have been composed by the Sage Bharat. The date of the book is usually accepted as the early part of the 6th century. It contains a detailed exposition of svaras, Srutis, Grama, Murchana, Jatis, (*Popley's Music of India*, p. 12) Sarandhar the author of *Sangita Ratnakar*, lived in the former half of the 13th century (1210-1247). Matanga flourished in the 5th century A.D. and Somanath's work is dated 1609 A.D.

contemporary sources about the contributions of the early Muslims who are credited by many with having taken a liking for, adopting, patronising and popularising Indian Music. This should especially be the case with the 13th century Turkish noble and savant, Amir Khusrau, who being the son of an Indian mother, was so very eulogistic of men and things Indian and who spoke of himself as the "Parrot of Hind". He was not only "one of[3] the most prolific poets that the world has ever produced" but has also been regarded as the most noted musicologist of the court of Alauddin Khalji, and his immediate predecessors and successors and as one of the earliest and the greatest exponents of a common and mixed culture. A good deal of tradition has gathered round about his musicianship, both on the theoretical and practical sides. Are we justified in accepting at its face value all that the traditional account tells us about his innovations, modifications and contributions?

Let us realise the exact position and assess the extent and value of his achievements in respect of melodic and rhythmic notes, forms and instrumentation in the light of what we find in his own writings, both prose and poetical. To understand better the claims that have been put forward on his behalf for giving an Arabo-Persian orientation to the indigenous Indian system and helping the establishment of what has been called chief features, nature and elements of the classical system of Indo-Islamic music, it is worth-while to consider very briefly, the chief features, nature and elements of the classical system of India which Amir Khusrau is supposed to have influenced to some extent.

Few nations of the world can claim to have such hoary and continuous traditions about the taste for, and contribution to, the science of sweet sounds and the skilled knowledge of, and performance on, musical instruments, invented to enhance the vocal charms, as the Indian. The well-preserved traditions about the Vedic *slokas* chanted in sweet, sonorous, plaintive but dignified voices by the ancient Indians to the accompaniment of the sacred *Vina* which sent forth streams of rhapsodies tell us not only of the antiquity but also of the source and nature of early

3. Elliot and Dowson *History of India as told by its own Historians*, Vol. III.

Amir Khusrau and Music

Indian music has a brilliant history of its own, and is said to have had a continuous development since the Vedic times. But there have been many phases of this development, and Indian music seems to have had undergone many changes before reaching its present stage. What was at first one and the same developed into apparently two separate schools or systems of music known by the names of the Hindustani or Northern school and Karnataki or Southern school. Some say that the ancient or Sanskrit musical heritage has been better preserved in the Southern than in the Northern musical system, because the South was comparatively more immune from the exotic, that is, the Arabo-Persian system, which the Muslims brought with them to India. This is disputed by others and Mr. Alain Danielou goes to the length of questioning the eminence of the foreign culture and denying altogether the Persian influence on Northern Indian Music,[1] "The oft-repeated assumption that Northern music evolved under Persian influence is obviously meaningless for one can vainly search in Persia and the whole of the middle east for anything which could justify the possibility". Perhaps all will not agree with this bold assertion for H. G. Farmer has shown in his books[2] and articles how old and developed Arabo-Persian music was at the time when the foreign and indigenous cultures came into contact with each other. Cultural interchange is usually not one-way process, and it is futile to deny the force of reciprocal influences.

But we have to get down to concreate facts in dispute on the basis of first-hand, original and contemporary or near-

1. Journal of the Indian Music Academy Madras, Vol. XIX, p. 169.

2. Historical facts for the Arabian Musical Instrument; Music and Musical Instruments of the Arabs; the old Persian Musical modes J.R.A.S. 1925. History of Arabian Music; Studies in Oriental Musical Instruments. Papers published in J.R.A.S. London.

12. See Quraishi A.S.D., p. 59 for the office and its functions.

13. See Elliot Vol. II for the traditional account of this reputed Saint-Warrior whose tomb was visited by the Tuglaq Sultans and by Haji Ilyas of Bengal and is still an object of veneration and visitation by both Hindus and Muslims. The 14th century Sufi Saint of Bihar, H. Sharfuddin Yahya Maneri refers in his Malfuz to the myth that had gathered about him.

14. He is not to be confused with his namesake who was sent by Malik Kafur to blind Khizir Khan at Gwaliar about half a century later.

15. Kilokhari (Hisar-i-Nau) was situated at a distance of about 3 miles in the north east of old Delhi on the western bank of Jamuna. Qaiqubad who ascended the throne in 686 had built a place there. The site had existed before and was not founded by Qaiqubad as the author of *Asar-us-Sanadid* would have us believe.

16. See the writer's paper already referred to under 9.

17. Ghayasuddin Ahmad, Yaminuddin Mubarak, Nuruddin Taiyyab, Vol. IV.

18. All these except one or two have been noticed and explained by Quraishi.

19. Those who regard Amir Khusrau as the first and the sure type of Indo-Muslim culture and have read about the glorification of everything Indian in Nuhsipahr for which Mubarak Khalji, the admirer of the renegade Hindu, Khusru Khan, gave him an elephant weight of silver will be struck by such vilification as "*Dau Zakhi Zada Hindu Zada*" and other expressions elsewhere. One can understand the use of opprobrious epithets of "*Malayeen-i-Kaffar*" and "*Hinduwan-i-Palid*" when dealing with "*Hinduwan Sarkash*" (II-57-75) and also the author's ire at petty Hindu officials like Deochand, accountants, scribes, *Khuta*, merchants, shopkeepers, money-changers etc. who were corrupt and dishonest. He could write about "*Dil-i-Ahni-i-Hinduwan-i-Zangar Zirffta*" (I-21) for it was so difficult to make the Hindus, specially of high castes, shake off their old beliefs and creeds. "One may not object very much to such statements as the reverence shown like that of the Brahmins towards the cows and of the washermen to the ass" and also "rubbing the head of humility towards a heap of cow-dung like the Hindus" (E-131). He could make the sword retort against the claim of the pen by saying "Oh you juggling Hindu, you have been playing in the hands of the Hindus, and like Brahmins you have become immersed in the Baid (vedas) and as the idol-worshipper at Benaras you have been rubbing ashes on your body etc." (V-36) But one could not expect the favourite follower of the highly liberal and Indiannized mystic Sufi, H. Nizamuddin Aulia, to describe the stone (Idol) worshipped by the Hindus as '*Wa Jibul Istinja*' (IV-138).

20. Paper referred to under 4.

21. For the perverted tastes of the time see the sixth section of the 5th Risala entitled humour "indecent even to the extent of vulgurity"

22. For his views about women see his letter addressed to his daughter, Mastura, in *Matla-ul-Anwar*, Maqala 22.

others finds his head covered with dust. The carpenter's chisel does not work without its head being rubbed (sharpened), and the teeth of the saw works only when many of the fine and sharp points are handled by more than two. The satiety of the sieve is the result of the magnanimity of the grinding stone or handmill. The discourses (*Maqamat*) can be had from the book of Hamadani and not from the silken (*Hariri*) cloth. For a wise man restrained hand (economical habit) is better than a long turban (pride). For eyes redrose are worse than thorn as nail is better for pupils than thaw or web in the eye. When they asked the pomegranate why it laughed behind the curtain, the counter question came why with every thing was chewed with teeth they chewed all its own teeth (II 191-201).

REFERENCES

1. Vide writers's paper entitled Historical value of the Sufic Hagiographical works of the Sultanate period (170 typed pages; still unpublished).

2. Life and works of Amir Khusrau.

3. Life and conditions of the people of Hindustan.

4. (a) Betel chewing among early Muslim of India, based mainly on Risail ul-Ijaz-(Printed).

(b) Amir Khusrau on Music in *Risail-i-Ijaz-i. Khusravi* (All India Oriental Conference, Aligarh).

(c) Fragmentary information of historical interest from *Risail-ul-Ijaz* (un-published).

(d) Life and conditions as depicted by Amir Khusrau in *Risail-ul-Ijaz*. (All India History Congress, Mysore).

5. O.P.L. Ms.

6. The extent of land tilled by peasants with 10 ploughs and pair of oxen. Sadiq Khan, quoted by Dr. Irfan Habib (Agrarian system of Mughal India), refers to ancient practice of assessing revenue by counting the number of ploughs which prevailed in some parts of the Deccan till the 17th century (p. 195-226-27).

7. *Risail-ul-Iajz* (p. 5-13).

8. Also called *Ariz-ul-Mamlik* who was responsible for the recruitment, payment, and inspection of troops as well as transport and commissiariat (Quraishi's *Administration of the Sultanate of Delhi* (p. 1085-137).

9. See the writer's paper entitled 'Matters of historical interest in *Risail-i-Ijaz-Khusravi* (Ranchi Session of All India History Congress).

10. Alauddin Khalji is credited with the introduction of a systematic branding of the horse brought by the troopers. The system

One who sees himself does not see God (The self-seeing and self-centred person cannot realise God). One should be afraid of him who has no fear of God. The earth is so complaisant as to kiss the palm of the Kings' feet in the same way as that of the beggar. Water is a great bestower for it wets or moistens whatever it comes in contact with. Whosoever is fiery-tempered lives a life without water (lustre or dignity). The head which does not sustain the burden of anyone becomes itself a burden on other's shoulder. They wash all kinds of dirt with water, but the dirt of the water itself cannot be washed off. One can live without bread but not without water. Harsh words break an impudent eye (unkind, ungrateful person) as the almond is broken by stone. One who is content with little remains alive and the goer (*Rawinda*) is one who has a good pace. In thirst thousands of pearls are not worth a drop of water. The fool is mindful of his beard and the wise man of his virtues. Good and beneficent actions brighten the face (lead to good name and celebrity). The adornment of the manly person lies in his face being reddenced in battle, while the woman becomes red-faced by the use of rouge. A man without character has no weight (esteem or reputation). The hands of a manly person itches for giving and those of a miser for taking. The shoemaker chews the smeared leather, but earns his honest food. The closed fist is the lock to paradise and the open finger is the key to Gods' mercy. The fingers of artisan or labourer are the key to his livelihood, while the palm of the unskilled one is like a beggar's bowl. A man who does not fill the belly of others is no better than an animal which looks to its own belly. The yarn-maker (weaver) goes forward, while the rope-maker moves backward. The dark-coloured blacksmith is responsible for the redness (quality) of the iron. The needle does not its work stealthily like a spy, while the sword is a trumpeter of the news. The needle covers the person and the thread is pierced (fitted into) its eye. Generosity should be learnt from the fine sieve which gives out the things swifted and holds back bran or course chaff. The weighing scale is miserly for it bends down as soon as it receives some thing. The bride who hides herself behind the sieve (anything perforated) needs no prying. To cut the arm is better than the arms being cut down (for theft) i.e. the executioner is better than the thief. One who digs the foundation of the houses of

(the boy) with pure and clean robe so as to have the two divine blessing—grace of God and the healing ointment for the wound; and for the satisfaction of carrying out the behests of Mohammad who has shown the way of discharging the Divine Command, both obligatory and optional, I, Your well wishing friend, Musa, who always speak of with praise and details about circumcision, bend my head of service down to the feet and facilitate you on the circumcision of your dear son which is so pleasing to us and annoying to our enemies. I also perform the custom of offering sweets like an orthodox, and hope that he (the boy) will take his bath quite safely after the expiry of one week, and he will shine forth like a full moon under the resplendent auspices of his fathers' affection, and will put on his body a particular kind of dress which has been prepared with his good luck. You would not, however, consider him immune from the effects of the evil eye, and Dirham and Dinar should be given away in charity to serve as a shield against the sun in the sky. Verse : "even one Dirham given in charity acts as a shield against the arrows of calamities". You should also entertain the parties of your sincere friends by providing them with fiery drinks and fragrant wood of aloes so that the evil thinking enemies may be reduced to ashes, and the scar of the wound may disappear completely. I hope that from this virtuous son, on account of the observance of traditional ceremony, further supererogatory acts like circumcision may come to happen. One can bring out from the vast book many such fragmentary information about socio-religious life of the people as can give us an insight into the working of the author's mind, his mode of thinking, his personality, temperament, outlook and prejudices. In some places Amir Khusrau speaks in the first person and relates incidents which happened to him. But for lack of space all these may be left over for a separate paper. We may conclude this paper with a few of the maxims and pithy sayings picked up only from one piece in Volume II (192-201). These may not be quite like those embodying the saturated wisdom of centuries, but they are a reflection of the author's assessments of men and things, and the result of his rich worldly experiences, his association with all sorts of people, and his knowledge of human nature in all its aspects and varieties.

There are references to the way the Muslims of different classes and both sexes were dressed. The garments of women consisted of "*Niqab* (veil) hanging over the face", a distinctive mark of married women of upper classes, '*Chadar*' (scarf) Qasab (woman's head gear) '*Maqna*' (a veil of muslin over the head and reaching to the ground) *Pae, Cha* (drawer or trouser) '*Pairahan*' (loose or close-fitted shirt) '*Sarawil*', 'Izar' *Pancha-i-Shalwar*' (kinds of trouser worn by both women and men) '*Resha-ha-i-Damni*' (women's skirt mounted with fringes) '*Barani*' (an outer garment to keep off ains, used by both), '*Sangchi-i-Zanan*' (Sina-posh or breast-belt), '*Gulband*' (neck cloth). They used cosmetics like *Ghaza* '*Gulguna*', Sandal etc. and many other perfumes, had '*Gulala* (locks of hair hanging loose) '*J'ad*,' ringlets, or curly locks) and they parted the hair just in the middle of the head "*Rahaha Az Farq-i-rast rast karda*" I-21 i.e. track made straight in the centre of the head).

There were great rejoicings when a child, male or female, was born. But the birth of a son was welcomed for prolonging the pedigree of the family. A father was felicitated on the birth of his son who was given a name and a family surname, Shamsuddin Abubakar. Khwaja Ainuddin, the maternal uncle of a child quite in keeping with his high position, showered much gifts and presents '(*Rekhatani*)' with open hands on his subordinates. We also get a reference of some economic importance. Bibi Zubaida, the mother of the child, had very little milk in her breast. Her sister, Khadija, suckled the child for some days, and then had to stop. But she offered 10 silver Tankas in lieu of her milk, and with this she purchased kharida's wet nurse so that the child should get sufficient milk and be at ease (II 151-152).

The following piece is of some importance as it tell us of the ceremonies observed both before and after a boy is circumcised, and also refers to a common belief that the sun in the sky casts an evil influence on some persons down on earth to avert which some money has to be given away in charity :—"For the purification of the orthodox which is both obligatory and optional and ablution or physical wash which lead to the performance of circumcision ; the pleasure of executing the duty, optional or necessary, of investing

faults of one or the other. One Najibuddin had married the fiery-tempered termagant daughter of Khwaja Saleh. Both father and daughter had made his life a hell. He was so much annoyed with the asperity and harsh words of his father-in-law that he decided to break his relations with his daughter. She went over to her uncle, Khwaja Amid, who took her under his care, neglecting his responsibilities towards his other near relations. Ultimately Bibi Barka Khatun and the saintly grandmother of the deserted one with telling beads in her hands intervened and tried to restore the relations between the daughter and her husband, the son-in-law. They told Khwaja, the father-in-law, that his son-in-law was like his son, it was not advisable that he should allow the separation of the and wife from husband to continue, for his son would be left alone and helpless. They hoped that he would give up his apathy and opposition and try to join her with her husband as was the case with Fatimah and Ali, and that he would abstain from causing disturbance like Abu-Jehl, and would not enkindle the fire of enmity like Bu Lahab (II-159).

The following piece shows that though it was permissible for a man to have more than one wife, and for women to be married more than once, yet people like our author perhaps disfavoured such practices. '*Kabin*' or the documentary settlement of marriage portion served as a check on the pronouncement of the Islamic formula "I divorce thee three times". A man having two purses or bags (married two women) is taken by a woman as a coin of double (counterfeit) stamp, and a woman who has contracted two marriages is, in the view of a man, deserving of three divorces. Even if a man is of fiery temperament or of good cool nature, in either case he is under the control of the woman, who with her documentary weapon (*Kabin*) with many rings in the chain (conditions) can get an upper hand over him. '*Mahri*' (bridal money) and '*Mehr*' (affection) are of one form, if there be no '*Zer*'(vowel point 'I'= sabdual) and '*Zabar*' (vowel point, short' a; =domineering) between them, for a woman '*Mehr*' (affection) for the man is better and more valuable than '*Mehr*' (marriage portion); but for a man '*Mehr*' (Infatuation) for woman is worse than the '*Mahr*' (bridal wealth). A man who wants to marry a woman who is sought after (for wealth) will become subjected to the wishes of the woman in this own house (I-1st).

her away to his house. The writer was prepared to disclose the details which might expose him thoroughly (II-158-60). Bibi Nusrat had a son name Hussam. His tongue enabled him to gain a mastery over both speech and writing, and he was very brave and intrepid. He had also asked for the hands of these girls. But he had become notorious for killing people. The writer says that when he came to know of his attitude he kept quiet. Had Hussam been like a mirror even then he would not look at his face. The writer made an alternative suggestion. There was an attendant of that Malik-Ariz named Jauhar, who had virtually adopted him as his son. He was a writer by profession, was himself free, and was born of a free and noble person. In the first place he was a freeborn (*Ahrari*) man and, secondly, for ten years he had been in the service of wise and learned scholars and had been responsible for their correspondence. The writer suggested that the veiled one should be united in wedlock with him so that the couple might enjoy a happy married life. (II- 165).

A certain person while offering his felicitations on the happy nuptial of his friend, showering his blessings like bridal gifts and presents (*Raikhtani-i-Urusi*) on the couple and wishing happy prosperous life for them struck a note of warning. "Now that this veiled one, the choice of your heart, is by your side, you may devote yourself heart and soul to her; but you should not dissipate your youth by indulging in lust according to past practices. You should keep your palate confined to this ripe fruit (confine yourself to your wife) so that you may have the good fortune of children who will bring good name and fame for you. But you should take care not to surrender yourself completely to her will so that all the blissful comforts might not turn into troubles and grief. If some body becomes tied to the palm of the hands of the woman like the Henna (becomes hen-pecked), there would be nothing surprising if his hands would become stained with blood. Whenever the man agreed to listen to the Sermon of the woman and submitted himself to her lectures, the wife would become the husband. If the wife was allowed to lord it over you, you will become the wife and the wife would become the lord"[1].

Sometimes conjugal relations became strained for the

Even if the son gives 30 cities to her for the 30 months of the lying-in and the milking period, he cannot discharge her debts. If he balles at the feet of the mother, he will deserve the adage "Paradise is at the feet of the Mother". Amir Khusrau also writes about the foster-mother who makes the son linked up to her through her milk, and the real mother who is tied to him by blood, and says "when I look at the things closely, I find the milk to be the stronger bond or link than the blood" (IV-50).

We get further glimpses into state of women, marriage, birth, and education of the young children. Polygamy was the prevalent social custom and in disregard of the Islamic Law which makes equal treatment of all the wives imperative upon the husband, partiality was shown to the '*Bibi*' as compared with the 'Jariya', allowing the former to tyrannize on the latter. The prevalent code of matrimony was not very different from what we find today. The parents were approached, sometimes directly by the suitors, for the hands of their daughters. Bakhtiyar Amjad of Delhi contacted the father of the prospective bride and informed him all about his antecedents and his own suitability for the match. He was of high lineage, his grand-father having being a member of the royal family of Kirman, whose excessive generosity had left the family destitute. He was himself highly educated and had become well versed in theology, grammar, and literature by sitting at the feet of masters of Arabic and Persian (II-314).

When proposals were made it was for the father or the guardian to give consent to the marriage. Great care was taken in making the selection and the father had to consult the other members of the family. When the highly virtuous and chaste Saman and Arghawan Khatun, the foster sisters of Wajih Suri, and treated as his own daughters by the good and generous-hearted Khwaja Ariz attained their marriagable age, many suitors came forward from all sides. Besides beauty and virtues they were possessed of some wealth and property. But Shama Gulabi was determined to have one of them, preferably Saman, for his wife. He really coveted their gold and silver. The writer was of opinion that on no account the hidden rose-bud should be tied with the string of the marriage with Gulabi and he should never be allowed to take

(II-164); and at another "Masuma, the queen-mother, may God safeguard and promote her purity, abstinence and good health is always engaged in her religious duties, devotional exercises, and fit and proper prayers (III-67). Amir Khusrau's Fatimah, Khadija, Aisha. Mastura. Zainab and Zahra were models of noble virtues, piety, chastity etc. (I-89) Saman Khatun and Arghawan Khatun, daughters of Bibi Nabat, were so continent, pure, chaste, and secluded that even the wind had not success within their veiled sanctuary (II-89). Though a connoisseur of the art of music, our author looked askance at ladies' indulgence in sensual songs "such and such a daughter has never listened to *Bang-i-Sarod* or melodious music" (II-65). He writes appreciatingly about "the daughter who keeps herself concealed even from the eyes of the mother and father (II-165); the women who is fully amenable to her husband's wishes. may her husband continue to be tied to her by affection and by *Kabin* or marriage contract" (II-164); the father-in-law who is very friendly and affectionate towards his son-in-law for the sake of the peace and happiness of the daughter (II-169). He condemns the sharp tongued wife (*Salita*) and he heaves a sigh of relief at the liberation of her husband from her by his death (II-160).

Our author wanted that women should occupy their proper place in society and recognize, along with their husbands, that they had their rights as well as duties and responsibilities. He insisted upon filial affection and for having special regards and respects for the mother and proper adjustment of relations between husband and wife for a happy household life." The mother gives her milk and brings up the child. The son who rolls at the feet of the mother is one of paradise, and if he shows any warmth (anger and annoyance) he is sure to go to hell. If the son causes any grief and affliction to the parents his face will be blackened. Amir Khusrau quotes the Quranic varses "I have issued a mandate that they should do good to the parents". I pray to God to be kind to and have mercy and graciousness on my parents who have brought me up since childhood". The son has to pay "special regards to the mother who carried on his load with extreme trouble and gave birth to him after an extreme pain". "Even a particle of the pain and trouble she has undergone in giving birth to her son is enough to weigh down the scale in his favour on the judgement Day".

Nayaka had become well known in that region for her refined taste and her nose had made her much too self-conscious.

But we may leave out such things. We have already dealt with Turmati Khatun[20] who because she was highly skilled in music, both vocal and instrumental, had been introduced by the author to the court of the king and had very soon been put in charge of all Persian and Indian Musicians. Another which deserves a passing notice has been named Shamsa Khatun, the beautiful ministrel whose presence in his Tazkir (admonition) assembly was not tolerated by *Malik-ul-Muzakkarin* (the king of Sermonisers), Khwaja Afzal. His sermons drew all sorts of persons, learned, pious, free, and well-born, and also secluded women of the palace (*Mahal*). There were also Indian women or female slaves (*Jawariya-i-Hindiya*). These had separate places allotted to them so that the body of foolish ignorant persons who would like to be equated and seated with the learned and scholarly should keep themselves away from these veiled ones (*Mokhaddarat*). All such persons were made to occupy a place from where they could not interfere with the ladies. Shamsa Khatun, the *Mutriba*, (ministrel) was seen in the midst of these ladies of the Haram, *Malik-ul-Muzzakkarin* gave a hint by uttering alternately the words '*Haza*' (Masculine) and '*Hazehi*' (feminine gender) with the result that she was made to leave the assembly (V-245).

In an age when the general standard of morality was far from satisfactory, and social life was disfigured by many vices,[21] as indicated in the Risail, especially by excessive indulgence in carnal pleasures and too much proneness towards the trinity of joy, wine, women, and music, Amir Khusrau, despite his tendency to laugh at others and also at himself looks like a grave mouth-piece of a puritan,[22] moralizing and emphasizing the need of the suppression of the vices mentioned. He was a strong advocate of seclusion and separation and of all the rights and privileges accorded by Islam to women. Normally respectable ladies did not come out, but they were free to attend, in their veils, the learned discourses of preachers. There is a lack of evidence about female education. At one place we are told "although the mother of your well wisher was unlearned she had in her memory many prayers: my mother was possessed of many virtues which she had cultivated for the sake of God"

he has been bred and brought up to be of a good character he is like a beautiful rose flower of paradise, though he is born of a hellish Hindu. If he is addressed as *Tuba Lak* (what a sweet and delicious fruit of the *Tube* tree of the Paradise) this will remind him of the *Lac* or gum of the Bar tree. Where there is a moon-faced youthful slave there is always a Khwaja ready to purchase him. One slave with pierced ears (obedient) is better than 100 of free run-away ones. Although a youthful Hindu slave is like a make-weight of the scale, yet he is a stone which is worth having for gold. But can a slave remember (be grateful to) his master when he becomes proud of his prosperity ? As soon as such a slave becomes sure of his heel, he would break the heads of men into pieces. Every vein and fibre of a Hindu slave makes him turn back towards his sacred thread. As compared with an old freely-moving slave the newly purchased ones must be closely kept in their places. The ill-natured low-born slave can never be of good conduct. The Khwaja who is enamoured of his slave whose body is as fair and white and as silver but who is gambler should not feel disgusted with him if he spends his money lavishly on the game of dice (II-168-69)

Further on we are told of two types of female slaves, one held dear and kept for pleasure and enjoyment, and the other virtually serving as a maid-servant doing rough domestic works like the drawing of water and grinding the corn. Amir Khusrau points out the difference between them and the *Bibi* (wedded wife) who treated them harshly and kept them half-starved and under her watchful eyes (I-170).

There is a long array of characteristic names of women largely Turkish and Muslim and also some Indians. There are satirical references to some southern women such as '*Didi*' of Deogiri who had made her black face white by coming out from the flour mill to cast glamorous side-glances on people, and 'Uchhaldi', the *Nayaka* (the mistress of a brothel), the typical representative of the *Nayakas* of Hind. The women followers of old *Nayaka* always look youthful amidst men. Her ears were like water-drawing bucket hanging in well and her lips were like raised sides of a reservoir. On one side of her nose a pearl was suspended from the nostril while on the other the snot having frozen on account of cold breeze looked like a hanging pearl superior and better than pearls. This

and stature for they are worth more than the price demanded. But the best of the Turks and plenty of them come from Yamak. They are very grave and sedate. The moon-faced Turkish youth with fine down on their cheeks are iron-bodied. The Chinese are cat-eyed and dog-faced with wrinkles on their foreheads. The Mongols are dog-tongued and have lips like those of the Tartars. The Tibetans are narrow-eyed and their noses are lost in their faces.

As regards the female slaves, some of Turkish extraction who had been brought from Cathay were of very fair complexion, and the brokers readily offered the price demanded when the slave dealers exposed the reflections of their faces and necks through the Chinese mirror. The Chinese slave girls who had been brought by a Khotani had such a musk-scented hair that it may be said that hundreds of Chinese musk pods had been used in their curls. Although Indian and Turkish slave girls are black and white complexioned respectively, yet the blackness which is free from defects is better than whiteness which is full of them. When put under the saddle the Turkish slave girl is different from the Indian mare who has greater fire (passion). I saw a Turkish slave girl in the house of a certain Turk of Gharra tribe who had two moles which were out of place. If they could remove one the other would have enhanced her beauty all the more. The Turkish slave girl is delicate limbed and deserves purchasing, while the Indian slave girl who is like an enkindled fire should be disposed off. The original place of the Turkish is Aas (a place near Qibchaq) but a Hindu slave girl is *Aas* (hope, dependence, and trust) personified. She is a combination of fire and water. If you issue an order to a Turkish slave girl she will flare up like fire but becomes cool like water afterwards. But an Indian slave girl is by nature soft and cool and ready to draw water and perform difficult tasks. This is not the case with the Turkish slave girl, who is all fire when her blood is up. Although the Turkish female slaves are by nature white complexioned, some of them had rubbed their red-coloured face at the feet of black-faced ones thinking that this might be conducive to their honour and happiness. Auctually they became disgraced or black faced (V-165-67).

About the "Hindu slave boy" Amir Khusrau writes : "As

groups. We get descriptive references to such people as were the chief arms of the Turkish bureaucracy and ran the machinery of the government. There are many fictitious names which may be ignored, but the official titles[18] of, and functions performed by such peoples as *Wazir*, *Diwan*, *Qazi*, *Mufti*, *Sadar Jahan*, *Vakil-i-Dar*, *Sipahsalar*, *Amir-i-Hajib*, *Amir-i-Barbak*, *Dabir-i-Khas*, *Nadim*, *Kitab Khan*, *Dadbak*, or *Amir-i-Dad*, *Malik Ariz*, *Mir-i-Bahr*, *Mir-i-Shikar*, *Akhur Bak*, *Mustaufi-ul-Mumalik*, *Mushrif-ul-Mumalik*, *Mutasarrif*, *Muqti Mohtasib*, *Shahna*, *Kotwal*, *Khuta*, *Nazir-i-Mumalik*, *Sar Silahdar*, *Sar Jandar*, *Amir-i-Sadda* etc., cannot but attract our notice. We come across industrial artisans, including many Muslims, such as textile workers and handloom weavers, oil pressers, leather workers, tailers, needle-workers, embroiderers, goldsmith, goldbeaters, makers of swords and bows and arrows, brass and metal workers, blacksmith, carpenters. There are letters about grain merchants, shop-keepers, money-changers, peasants, cultivators, agricultural labourers, menials like barbers, washerman. The professional workers mentioned are cooks, bakers, confectioners, butchers, fishermen, distiller, wood-cutters. painters. Ministrels of both sexes, snake charmers, jugglers, jesters, harlots, old wenches also find a place in the volume. This artisans are both highly skilful and unskilled, good and bad. Men of sueh a large and varied occupational groups earned their livelihood by means fair and also corrupt and deceitful, There are also interesting descriptions of slaves of both sexes, of various ages, and of different races and nationalities, foreign and indigenous, and possessing some special characteristics of their own.

A *Farman* with the royal seal (*Tughra*), dated A.H. 709 and addressed to the merchants of Cambay refers to commodities, fine and of high value, and especially slaves imported in sea vessels from Arab lands, Habsha, Bahrain, Barbar, Maghrib, and Syria. These Abyssinian and Ethiopian slaves (Barda-i-Habshi wa ghulaman-i-Zang) were tall-statured stout and strong, swift-footed and ebony-coloured and had curly and twisted hair on their heads. The large-eyed female slaves of Habsh were of agreeably saltish black colour "The Turks imported from Cathay are very good shots with their arrows and so is the case with the Turkish slaves brought from Bala (Khurasan). Their value cannot be measured by their size

and analyse the contents; take out matter which is or some evidential value by clearing the grain from the husk, and piece together the scanty and scattered information on the life and conditions, progress or deterioration in moral and material sense, of the people of the 13th century, we can get an idea of some aspects of the contemporary society and of the socio-economic, and socio-religious conditions and institutions, despite the colouring given to it by the imaginative mind of the writer.

Amir Khusrau, the foremost creative artist of the age and an idealist of high understanding was also a learned scholar and a man of varied interests, namely, Quranic and scholastic sciences, commentary, traditions, jurisprudence, philosophy, astronomy, poetry, music, etc. and he had studied these subjects from various points (vide passim).

There is much of interest even for a lexicographical researcher in the rhetorical writings of the *Risail.* The book shows in many places the powers of close and acute observation possessed by the versatile author. Though a man of aristocratic birth and position, and one of the greatest intellectuals of the time, he did not keep himself isolated from the main currents of social life. He considered himself a man of the people and moved among the people, high and low, good and bad. His heart was brimming with sympathy for the downtrodden, poor and oppressed people, agriculturists, artisans and labourers. He was conscious of the dignity of labour and has frequently eulogized those who earned their livelihood by honest labour and who provided amenities of life to others by the pearl-like sweat or their brow. His letters to his three sons, especially to the eldest, Ghiyasuddin Ahmed, throw sufficient light on such things, and his advice to his(17) sons about the choice of profession and about the observance of all obligatory duties are also not devoid of interest (IV-256-320). There is nothing marvellous or miraculous in the *Risailul-i-Ijaz*, and its author does not deal with superhuman beings but mostly with men of normal social life.

Those who figure frequently in the various volumes are a variety of people such as *Ulama*, *Mashaikh*, officials of government and men of various functional and occupational

behave like breeze so as to collect all the leaves of this species, wherever they had been lying scattered in the treasury of the writer's book, into a bunch of rose buds and place the same as a bouquet in my hands". "These meaningful matters (*Maniwiyat*) were arranged in a way which is a speciality of this writer. During the course of my writings I had penned down things, simple and compound, prefaces and premises, short and long examples, and big and small epistles and letters of charming significance. These were compiled with extreme pain and labour, physical and mental. I have been able to set all these subjects of thought and care in their proper places so that there should not remain angularities to put strain on men of refined taste. At the end he writes "If in the garden of elegant writing, my sincere friends may find some fanciful pictures, they should take them to have come out unintentionally, and because the gardener while cultivating the golden jasmine and yellow roses could not help breaking the monotony by bringing in some red tulips also. If they see a wrong writing like an ant in a mixture of rose water and syrup (*jullab*) and find a mistaken point like the head of a fly fallen in a cup of honey they should not abstain from it in the manner of Imam Shafi, but follow the way of Noman (Imam Abu Hanifa, Imam-i-Azam) for the two feathers are an antidote to the poison of one feather" (V-169-70).

The book rhapsodically described (V-167) by its author as "annals of the age and of countless dates" (*Tarikh-i-Rozgar wa Tarikh-i-Beshumar*) has its limitations. It was composed to display the authors skill in providing fine and ornate specimens of epistolary compositions for the instructions of the young learners, and was not written or meant for social historians. From such literary works one cannot expect to get a full and accurate picture of contemporary life, especially when the author frankly admits, at times, that his compositions included some fanciful pictures and letters coined or invented by his mind. The case of the letter of Badr Hajib is an instance in point (IV-144-56-18). Some of his references to certain things of domestic life and manners appear to have been deliberately left incomplete and hidden in rhetorical flourishes. The dates and facts mentioned in some of the documents vary from those found in standard historical works. But if we leave aside the rhetorical parts, critically examine

came in 659=1261. Amir Khusrau has confused him with al-Mustakfi Billah who flourished[11] between A.H. 700 and 740.

A short extract, though undated, refers to an incident that happened in A.H. 651-652 in the reign of Nasiruddin Mahmud which is the earliest mentioned in the *Risail* and it also shows the author's self-imposed restraint and profuse use of literary artistry when dealing with some historical personalities who were subjects of controversy. Imaaduddin Rayhan, the Wakil-i-Dar[12] of Sultan Mahmud had temporarily ousted and eclipsed Balban before his own dismissal and removal to Bahraich where he was done to death in 653. The Indian born noble had excited the jealousy of all the members of the Turkish party including the historian, Minhaj Siraj. It also tells us about the wide-spread fame of the martyr-saint[13] of Bahraich of the Ghaznavid period, Masood Salar Ghazi, who had become more of a legendary figure rather than a historical personality in the 13th country. "The fragrance of the aloes-wood of his mausoleum at Bahraich had made the whole of Hidustan aromatic". Sumbul Bihari[14], the addressee, who was having very good and enjoyable time, along with his friends and companions near the mausoleum, was advised to continue his stay there and give up the idea of going to Kala Khari[15] (Kile Khari) of Delhi, because Rayhan, the rebel, had gained great ascendancy there and had become proud and arrogant. He was openly saying that Sumbul Bihari had turned against him and he would soon issue orders to destroy him, root and branch. The addressee was advised to make no move out of the sacred place he was occupying if he considered his position to be strong and unshakeable (II 55-56).

It is interesting to see what Amir Khusrau says about his own composition. He writes that "the authors whose works give them an eternal life are learned theologians, wise philosophers and poets (IV 8-9). But the speculative writing of poets, in prose or poetry, are fanciful premises, unlike the rules and principles of science and philosphy which are based on reason, are real and unalterable. The thoughts (things shaped by the mind) of my humble self are ingenious reflections which are capable of being changed, corrected and refuted (V-169). Elsewhere (IV-22) he writes, "As I am the Solomon of the realm of the speech, I have made my thoughts (reflections)

their weapons like the mouth of the snakes and their proneness to infidelity made them dart their arrows towards the chandelier of *Cibla* ; but fortune ultimately favoured the troops of Nasirul Mulk, as the enemies were burnt like moths in the fire of hell. Those who turned their face towards the house of God, recited the exalted formula, promised to assist the helpers of the faith in keeping the land of Islam burning and throwing the burning wicks in the temples, were spared from the wrath of the Haji. Those who did not do so were treated like the Mongols and had the chains put around their necks. It was a proof of the victory of the Solomon of the King that he had entrusted the task of breaking the idol of Deogiri and helping the cause of the Hanafi faith. The elephants of gigantic size were directed towards the camp of the Haji without much stir. The writer has learnt from the informers in camp about the number of temples of the Hindus which were burnt by that lamp of truth. They have also reported that when the troops of the Rai of Deogiri heard the bugles sounded from the victorious camp they were demoralised. Ramdeo and his followers of Deogir were ordered to take refuge with and find relief in the camp of Sirajul Haque (Khawaja Haji)".

As the noble virtues of the Haji, who is so much favoured by the helper of the commander of the faithful, are too many to be described it is better that I should confine myself only to a petition of mine which has been issued from the most respected caliph, al-Mustansir Billah, for the despatch of horses, and it is hoped that the lamp of truth would have communicated this matter with verbal warmth to Ziyauddaula, suggesting also and at the same time that on the occasion of the branding[10] of the horses in the Diwan of Ariz, he should help me, the writer, as far as he can. Such a help would be like the performance of the Haj. I, who am a neighbonr of the exalted Khawaja Haji expect much help from him and hope that my request would be fulfilled at the first instance and I may return to my humble house wlth an order for Ziya (Ziyaddaula) dated *Zilhijja*, 702. (II 56-60).

Apart from other things, the date and name of the Caliph are obviously wrong. The Abbasid caliph of this name was the last but one of the long line and he ruled from 623=1220 to 640=1242. There was a Cairo Caliph of this name but he

this is the only, though a literary form, of a land grant or *inam* of the 13th century available to us we cannot ignore it. It ends with the hope that the sky-high land might be of some help to the donee by providing for him (in future) a magnificent hall (*Rawaq*) and for the populousness of the edifices of his kingdom. This shows it to be a charitable grant.

Some of the dated entries such as that of 5th *Shawwal*, 680, of the *Fath Nama*[7], composed by our author who had accompained Balban's expedition to Lakhnauti (V5-14) are genuine and valuable, but this cannot be said about others. In some cases what we find in the *Risail* is nothing but mere conjecture about dates and facts and parts of the contents of some letters are definitely wide of the truth.

As an example we may reproduce here a letter in which fact and fiction go together, and the entry recorded does not indicate the correct date. It is addressed to "Nasirul Mulk Sirajuddin Haji Arizul[8] Juyush" and occurs on pp. 56-60 of the second *Risail*. Barani frequently refers to Khawaja Haji Naib (deputy) Ariz-i-Mumalik, who was sent always with Malik Kafur on the southern expedition to Deogiri, Warangal, Dhur Samander and Maabar in A.H. 708, 709 and 710 respectively. He says that the country of Deogiri was laid waste and Ramdeo was carried to Delhi with rich booty "Khwaja Haji was to attend to the administration of the army, the collection of supplies and for securing the elephants and spoils". Now let us see how Amir Khusrau describes the first expedition to Deogiri. Malik Kafur mentioned in another letter, which is supposed to have been written by the Emperor to his son, Farid, containing certain instructions, does not figure in this letter and the whole credit for the campaign appears to have been given to Haji. We are told that the king entrusted from the first the task of mustering and looking after the affairs of the royal troops to him so that he may perform the adventitious, emergent and essential duties efficiently. None else was deemed so competent for the unique office and worthy of the title of Ariz (muster-master) and Nasirul Mulk, and it is this which made the victory inevitable. The infidels were killed in large numbers as camels are sacrificed on the occasion of Haj. The group of infidels put up a stiff fight to show their fortitude. They come forward to display

chronogram '*Zebi*' and '*Tarsil*' which yield the year A.H. 719. But in the preface of the Ghurratul[5] Kamal he gives his correct age which was 34 in A.H. 685. Thus he was born in 651 and was 68 and not 70 in A.H.719. His scribblings continued till two years before his death which happend in A.H. 725, for it comes out in the chronogram given in an epistle by adding the letters of '*Jau*' and '*Gandum*' to that of '*Sare Kha*', that is the letter '*Khe*'. The first is devoid of date, and the third Risala has only two dates A.H. 707 and 708, and of the dated pieces of the 5th Risala only one has A.H. 702 and the rest are between A.H. 684 and 687, indicating that they are the earliest of the whole lot. Only two of the 29 pieces of the second Risala are dated 690 and 697 and the remaining range between A.H. 700 and 716. As regards the 11 dated pieces of the 4th volume only that at the end, mistaken by Dr. Mirza as the date of the compilation of all the four volumes, has A.H. 682, and the rest except one (of A.H. 723) covers the period from A.H. 702 to 716.

This (exceptional) document of some importance and supposed to be a grant by way of *Inam* (gift or assignment of a rent free land) to a warrior chief, described also as "professional village husbandman" is as follows :—I have ordered all the cultivators who break the earth and put the seed therein that they, with the help of natural rains, should grow and produce pearl-like grains. They who are as numerous as the particles of sands, have been made to enjoy my favours and protection so that they can maintain cultivation in proper condition, and I nurse and encourage them in these respects. I have also decreed an Inam grant from the beginning of Rabi, 723, of as many as ten units of ploughable land (Dah-i-Juft[6] wanan)) in the environs of village Dhulkoot to Amir Sipahsalar, favourite of the king............Harisuddin Dahqan-i-Zamin-dawar....so that out of what he gets as proceeds from that barren (short) land he may devote something by way of charity (*Tasadduq*) to the sepulchres of those destitute but pious people whose dishevelled hairs are loaded with dust, who have only two sheets of cloth to cover their body; and who enjoy such high spiritual position that whatever they swear by God is made true by God" (IV 103-4). The *Risail* is replete with analogies, similies, puns and riddles, and in this piece all the words are connected with and derived from land. As

accomplishments. But it has to be admitted that though tl literaity portraits cannot compete with handy manuals of factu information, yet in the field of social history, they are not abs lutely negligible, for the ornate picture that emerges gives perhap some new and more accurate delineation of certain aspects o social life than is found in official records and chronicles. Suc works were not command performances and suffered fro little or no inhibitions.

Dr. Wahid Mirza[2] was the first scholar to draw our atten tion to the "plenty of things scattered in the pages" of th ponderous volumes of *Risail-i-Ijaz-i-Khusravi* (5 in number)that are both interesting and instructive". He found in ther "some useful bits of information about the social condition the state of learning, the scholars, the sciences, and politica atmosphere of the age." He also refers to some impor tant items concerning the poet's biography. "The lat Dr. Muhammad Ashraf went further in his appraisal of thi vast work and in his utilization of matters relevant to the sub ject of his valuable book.[3] He wrote about its contents tha "they yield interesting and instructive information of a varie character, besides many graphic descriptions of various socia phenomena and references to manners and morals." One wh has the patience to go through the book will agree with hin that in it "the spirit of the author has a free and unfettere play." Some of the epistles and discourses of Amir Khusrau in the *Risail* have been already utilized by the present writer and this paper and some others which may follow may b taken to be a supplement to the studies already offered to th readers.[4]

The problem of dating the book and documents and o the credibility of Amir Khusrau's information are not a easy as Dr. Mirza would have us believe. He has been misle by the dates given on pp. 342 and 167 of the 4th and 5tl *Risalas* respectively. He writes that "this voluminous worl had been completed in 710 A. H. when the author was nearl 70 years old", and also that "there are some genuine letter that bear dates". Khusrau writes at the end of the 5th volume "the pen of the writer is like the swift-running Arabian stea of 70 years ; still there are two teeth left, but everyday ther is a faster blackening of both". A little later he gives th

RISAIL-UL-IJAZ OF AMIR KHUSRAU
AN APPRAISAL

S. H. ASKARI

Though the early period of Muslim rule in India is not destitute of historical books, these termed chronicles, are mostly records of political developments, dynastic changes, wars and conquests, and they contain but little about economic factors, civil government and administration, and especially concerning the life and conditions, progress and decadence in cultural patterns, of the people. Sometimes careful and painstaking gleanings from purely literary and non-historical works repay the labour and energy spent thereon, and prove helpful in historical investigations. The information gathered therefrom though scanty, incomplete, dis-connected, uneven and fragmentary, not unoften adds something to our existing knowledge and may provide corrective and corroborative evidence about men and matters of the past. A student interested in social history, a comprehensive and authentic work whereon is still a desideratum, cannot afford to ignore any source-material, and evidence, literary, religious, hagiological[1], numismatic, epigraphic or based on foreign accounts which throw side lights on social organisation and institutions, varied social elements ranging from the highest to the lowest, social usages, and ways of living, manners, customs, beliefs, cultural patterns and cultural performances.

It may be argued that the need of historical accuracy cannot be fulfilled by works written in a rhetorical, exaggerated, over-dramatised and highly flown style, and one needs unimpeachable evidence to reconstruct life in early medieval times in India. There is no denying the need of very cautious and critical approach and carefully weighed conclusions from isolated incidents and allusions to contemporary men and events found in works full of colourful literary devices and written apparently to demonstrate the author's literary abilities and

undred pieces of Russian linen (*katan*) were offered for his master, Prince Khizr Khan, the addressee. He and Bahram Elchi expected to be back in the imperial capital by the last of Shawwal. (IV-144-156)

As compared with the above, most of the miscellaneous pieces of the *Risail* have emanated from the ingenuity of the versatile author, matters and names of places and persons having had no real existence. A few examples will do. Harisuddin Dihqan (peasant) 'Zamindavari' is said to have been granted by the king *inam* lands workable by ten *juftawanan* (ploughs) in the environs of village Dhulkot, since the beginning of Rab crops, 723. Similar are the cases of the fictitious grant of *idrar* to Imam Ja'far Rudbari (p. 102, iv) and of the appointments of Sinanuddin Qiran to the post of *Ashbak-i-Matb'akh* (keeper of the kitchen) and of Amir Nasi muddin Qabul as *Shahna-i-bad* or the officer to watch the effects of wind and climate. The *talazma* of the primary elements, earth, water, fire and air have been used here. But an important thing in the book is to see the context in which such words and expression as were in use in administrative sphere have been brought in. The following terms, offices and designations, are not devoid of interest : *Wajuh-i-Amil, Dagh-i-Aspan, Yal aspa, do aspa, Amir-i-Sadda, Zamindar, Nepal Khut, Dad Begi, Bahr Begi Malik-ul-Bahr, Amir Hajib, Khasadar, Muhtasib, Mustaufi, Mushrif Shikar Bak, Nazir-i-Mamalik, Nazir-i-Diwan, Nazir-i-Moamilat, Diwan-i Ariz, Arizul Mamalik, Sar Silahdar, Sipahdar, Sipahsalar, Shahna-i-Pech Shahna-i-jauhariyan, Shahnagi-i-Runghanfaran, Wali, Muqti, Mutasarrif Muhassil, Kitabdar, Chashngir, Shana-i-Nepala.*

performed their obeisance by bending their knees frequently on the ground. As the purport of the exalted *farman* was that they should be awakened to the reality of the situation by the recital of the *khutba* in the laudable name of Muhammad,[51] it was done and it proved efficacious in bringing back into the fold of obedience those who had broken the bonds of submission and loyalty in that region. The Musalmans of Ghazni who on account of the blows of those base-born fellows had concealed themselves in the mountains made their appearance and the whole region of Ghazni became illumined by the light of the faith. It was on Saturday that the good news of the *khutba* was announced to the *khatīb* (preacher) of Ghazni. He felt so exceedingly glad as to wish that the five intervening days should elapse very soon and was eargerly expectant for the Friday. On the Adina (Friday) day the saints and scholars of Ghazni who had been looking for a long time with the eyes of expectations towards Delhi and the elders and younger people who had vied with one another in expressing their joy at the expected opportunity of hearing the Alai *khutba* assembled. I invested the preacher with the royal *tilsan* (mantle) which had been sent by the Caliph by putting it on his shoulder. The congregational mosque of Ghazni which had decayed and whose walls and doors had fallen down was set right and became an abode of prayer and worship again. Those who had forgotten the fragrance of Islam assembled there and the mosque began to resound with the chanting of God's name in the *azan* and on the *tashbih* (rosary). The *khatib* ascended the pulpit and began to recite the *khutba*. When the name of His Majesty was pronounced I carried the jewels and the gold which I had brought to the pulpit and from that threw them down on the ground. The people fell on them to pick up the precious things. Both the *tilsan* of the *khatib* and the gold plate in my hands were very attractive. The Mongols saw all this from above the walls of the mosque and like dogs were licking or passing their tongues over. By the blessings of this auspicious *khutba*, the coinage of Islam became so current in that region that many infidels sincerely embraced the faith and recited the *kalima* (the Muslim formula).

At the end of the letter Badr Hajib refers to the schism and quarrels that had occurred among the Mongols of Transoxiana and Khorasan and those who were at first one and united were split up into two warring sections. Feuds, wars and anarchy prevailed in their lands. The people in the regions between Ghazni and Sindh river had again fallen in a state of trepidations and the Afghans had fled to Sulaiman mountain and concealed themselves therein. Badr Hajib also refers to the arrival of envoys from Qibchaq (Tartary) to the hellish Ais Bugha and later says that on the eve of his departure he was accorded a special and respectable reception and one thousand Tartar horses, one thousand Turkish salve girls and five

51. Muhammad was the name of Sultan Alauddin Khalji.

will on everybody to such an extent that if the creatures of Manikpur region were to die of thirst he would not allow them a drop of the water from the Ganges. I, the slave, had been demanding from that band of ignorant fellows the surplus revenue but they were referring to me to that Hindu and indulging in derisive remarks. In short,[46] a few useless fellows are swallowing up the whole revenue of the region in partnership with the filthy Hindus. A hundred times I requested them to give me a sheet of white paper but they denied that to me. I wanted to prepare a paper-garment[47] of complaint from what had come out of their own hands for they have sent so many letters stealthily in pursuit of their fraud, and have not cared for destroying them or preventing them from remaining in my possession. They are very soft in the science of calculations but they are an expert in theft and embezzlement. An account of the black deeds of these pen-men (*qalam zanan*) must be brought to the notice of the king and his wazir so that they should be taken out from here with chains being put round their necks (II, 40-49).

We may conclude this paper with an undated letter of Badr Hajib to Prince Shamsuddin, better known as Khizr Khan, the eldest son of Sultan Alauddin entitled Alexander, the second, about the attempts to extend[48] the sway of the Khaljis to Ghazni. It says :- In accordance with the royal orders I embarked on my journey and passed through various stages, levelling the ground, high and low, and clearing the path of the mischievious people so that the royal cavalcade might easily make forward moves. In this way I reached the bank of the river (Indus) after covering the land[49] journey in about two months. I crossed the river on swift-moving boats fitted with nail hooks. It was winter when I arrived in the plains of Ghazni. The season was exceedingly cold. I saw the hellish Ais Bugha[50] in his shell and the other Mongols having heard the sound of the swords of the great Khan were alarmed and terror-stricken on the approach of the army of Islam. When the royal *farman* was read out to them they felt comforted and placed their faces on the ground and according to their customs

---

46. 'حاصل آن مشتی بی حاصل جملگی محصول ولایت را بشرکت آن هندوی پلید پاک می برند و می خورند'۔

47. "می خواهد که پیراهن کاغذین کند"

48. Elliot has noticed this document briefly in volume III (appendix) and says that the history is silent on the question of Alauddin's ascendency at Ghazni. Ferishta speaks olny of plundering expeditions into that and the neighbouring countries

49. 'دیدیم که همه آتش غلطان و دوان دو ماهه راه سوی دریای محیط روی برزمین می نهاد و می رفت'۔

50. It has not been possible to identify this Turk from any other source.

the talk continued in this strain the master servant asked me as to how much silver-coloured things I demanded. When I mentioned thirty lakhs of *jital* he grinned and showed me his 32 teeth. I warmed up and said that if he suffered from constipation or looseness of bowels, I would draw out all the maladies from his stomach which he had stocked with things exacted from people by employing obnoxious methods and obstructive practices, he said: "Don't be non-sensical. You have not been sent by Khwaja Jahan".

A handful of powerful penholders patronise the ryots with their right hand and misappropriate revenue (*mahsul*) with the left, and if one *dirham* is asked of them they show their empty[45] hands. Although they were told that a hundred of thousand which was due to them would be exacted, they talked of paper and pen so as to cover their stealth. Unless the heads of the agents are thrown down, the revenue cannot be realised. They are a group of a people who acquire wealth by corrupt means. But this wealth is unlawful and has no durability. If the *Farman* is referred to, they say that this was not the *Farman* of the Solomon with the royal seal and symbol (*toughra*), but of the Diwan. If I say that they were opposing Khwaja Jahan who wielded supreme authority, they would bring in the name of the Sultan and make mention of his black canopy which was spread over all and was the symbol of the royal justice. But when the turn of action comes, they resort to lies. However much it was said to them that the letter of Khwaja Jahan should have weight with them, they poured ridicule over it and they gave nothing in accord with it. I had considered these clerks to be men of independence but actually they are a sort of people who throw chains round the necks of independent peopl- They did not take into the account my computations and pointed hundreds of flaws in it. They wished to involve me in bribery and then call me into severe accounts. I was between two fires and ran the risk of falling into their clutches here and was also, on the other hand, afraid of being put in chains by Khwaja Jahan.

At this time I laid my grievances before the Malik who listened to them but he referred my affairs to a Hindu named Deu Chand who had gathered his myrmidons around him and was sitting like a serpent on the sandal. He attached no importance to the *shahna* of the Diwani. He was a man of low origin of Kara. Low and behold this ingenious secretary (*dabir-i-Mudabbir*) who had thrown all the secretaries into the background led people into the dark well of his ink-pot. The Muqti who was the adorer of the Hindus gives preference to the inverted script (*Khatt-i-Bazguna*) over the Muslim alphabets and by putting the ink on the point of his pen set fire to the towns of the region, deceived all and imposed his

---

45. 'مشت را بعقد نود و سه می بندند و می گویند که نقش درم اگرچه بسه" می شود بر ما شکل صفر دارد'۔

We can have some idea of the prevalence of corruption in the sphere of public administration, the contours of the evil, the class of persons involved, and the hands of the subordinate Hindu officials in the affairs of big assigness of lands from an important despatch, dated II Rabi', 709, by an unnamed official, deputed to realise the surplus revenue from the Muqti of Manikpur. The latter being in league with the officials of the Financial Department defrauded the Government of their just due. The abstract of the document which forms an interesting reading is as follows .- "On this side through the grace of the king and the wazir every thing is being properly managed and is in order. But owing to the bad transactions of the Muqti of Manikpur and his followers fairness and justice have disappeared. When I, at the instance of *Mushir-i-Mamalik*[41] (chief councillor of the kingdom), went to his subordinates, met the Muqti of Manikpur, and stooped to kiss his hands within his jurisdiction, at village Tanhora,[42] that unmanly person, may God keep him off from His blessing!, though a spendthrift did not take me into account on the occasion. When the *Farm'an* was delivered to him and the surplus revenue was demanded of him, that assignee of these tracts showed me his sword and said: "What to speak of the ears of grain nothing can be had here even in the forms of loans without the sword. There is no army[43] left in this region to prevent havoc being done by the cattle. 'How can the men of the pen do this job? The produce (*hasil*) of these small towns is not so much as to suffice even for the lives of the bands of servants here". Then he folded and twisted the paper in his hands and handed it over to the Master servant (*katkhoda*)[44] of his house and hinted not to act according to the document in a business like manner. The Master servant took me to his house, treated me with due courtesy and asked me to stay there for the day. I said that this would not do; we had to talk of the business and think of the balance (*fazil*). The words of litterateurs which are pregnant with meanings are better than those of clerks which bring out nothing but cypers. When

---

41. It was the title of the Wazir who has been described as *Buzurgi-i-Mihr* of the age. Asaf-i-Sani Khatir-ul-Haq Waddin i.e. Khwaja Khatiruddin who had served under Balban and Jalaluddin and was the first Wazir of Alauddin Khalji. The wazirs were also entitled as *Nizamul Mulk, Muaiyyadul Mulk, Sadrul Mulk, Dastur-i-Dastur-i-Azamat*.

42. It is difficult to locate this village.

43. The meaning of this sentence is not quite clear "*Dar Qita-i-Rah Lashkar Bashad wa hanoz Dar Qita-i-rah-i-Lashkeriyan wa Darin Wilayat Laskare Namund ke Muwwash ra Malish risanad.*

44. See Supra. The word also means Master of a family. As regards the Muqtis or Muqtas were officers in charge of the garrisons. Minhaj has referred to Wilayat-i-Kara and Manikpur. Later perhaps the larger unit was cut up into Iqtas and Manikpur was placed under a Muqti who, as the document suggests, was expected to be responsible to the *Diwan-i-Wizarat*.

A document of different content is a *mithal* (Royal command), dated 700 A.H. which says that a village, named Nasur[38] in the east (Delhi-i-Purb) which had fallen in ruins and had become depopulated, was assigned as '*inam*'[39] to Shaikh Shamsuddin who was directed to repopulate it and make it as shining as the light of the sun and the moon. The thatched houses of the inhabitants should no longer have fissures and holes. He was to extend his cherishing hands over the heads of the raiyyat so as to give them ease and comfort from the heat of distress under the shadow of his protection and enable them to pass their lives in happiness. He had to strive his utmost to increase the cultivation of the area and augment its production. The inhabitants of the village (*Qaria*) were called upon to treat the said Shaikh Shamsuddin as the *mutasarif* and pay to him their revenue (*mahisul*) of the 12 mionths of the year and obey him implicitly(II, 17-18).

A '*parwanah*' addressed to officials of *Ishtinara 'mash'al khana*) issued on the 30th Rabi I, 709, says that Zia-ud-daula[40] Siraj-ud-din who was responsible for the light in the court was also appointed 'Shahna' (superintendent) incharge of the oil merchants and manufacturers of Delhi, the Imperial metropolis and the other regions who were countless in number, each one being more ingenious and evasive in payment of 'Kharaj' than the others. They had repeatedly duped the tax-gatherers (*Muhassil*). There should be no connivance at their activities, however much they might try their oily methods to make him soft and conciliatory so that their trade should continue to flourish. On the other hand, he was to punish them with severity. He was to be specially on his guard against Narain, the oil manufacturer, who was the lamp of the whole community and he should pay no heed to him when he adopted his usual methods. He was so skillful in his manipulation that if the oil distilled by him weighed one dang (six rattis) he so managed as to make it equal to one '*tanka*'. Siraj-ud-dowlah was to find out the evil ways and the nefarious methods of the fat manufacturers or oil-men (*charb karan*) and if they deviated from his orders, even to the extent of one grain sesame (*kunjad-til*), he should throw them into the oil-mill (Jawaz-Kolhu) and let them be squeezed therein and confiscate everything they possessed so that others might take a warning therefrom (II, 19-20).

---

38. It may be also read as 'دیه پورب أسور' or "Sur' which is preferable. Pure Hindi words are not wanting in the *Risail*. These and the Hindi sentence in it will be noticed in another paper.

39. Assignment of rent free land as a reward. *Idrar* meant recurring grant in cash to the learned and the pious persons.

40. The royal household had an officer who was incharge of lights or torches but there are so many similies and analogies drawn from light in the piece that one cannot but suspect the piece to be a mere figment of the author's mind.

he was the Wali[36] and the Qazi had no authority over him. When that man violated the law of the Prophet, how could the dignity of the *Shar i'at* be preserved ? It was hoped that if the tyranny and oppression of that ruler were brought to the notice of the just Sultan, the tyrannical person would be driven out from that place, with ropes tied round his shoulders like the cattle by the foot soldiers. He should be made to disgorge all that he had taken from, and was claimed by, the Muslims and the *Zimmis*, and then he should be hauled up before the house of chastisement (*Dar-us-Siyasat*) and put to death so that others might take warning and nobody in future should venture to impose his will on others (II,21-25).

This is followed by a list of good and bad qazis, furnished by one named Latif Mas'ud, appointed as *qari* (reciter) of the Quran by Shaikh-us-Islam, Rafi'ud-din, on whom he poured forth his eulogium. In this list which was prepared in 690 A.H , we get the names of Qazi 'Ain-ul-Quzzat Zia-ud-din, the pupil of the eye of *shari'a*; Qazi Zahir-ud-din, who was very strict in the administration of justice; Qazi Sadr-ud-din, the greatest of the Sadrs and the second Qazi, Muhammad Yusuf, Jalal-ud-din, the great Qazi 'Ain-ud-din who always followed the path of *shari'at*; Qazi Burhan-ud-din who always adduced proofs for whatever he observed; and Qazi Ahmad, the most trustworthy of the Qazis. There were also Qazis[37] such as Qazi Ja'far Khani, who had no honour and dignity; Qazi Imam-ud-din Razi who was expert in laying the foundation of tyranny; Qazi Kamalud-din who had become notorious for misappropriating the goods of others; Qazi Ya'qub, a man of abundance (May his head be cut off and may his wealth disappear); Qazi Wahid-ud-din who was a dualist; Qazi Razi-ud din who afflicted the hearts of people; Qazi Maudud who had already gone to hell; Qazi Bahai Suqi who had the disposition of the market people (*Qazari*) Qazi Khalid, a liar and a corrupt man who had perished (II,25-28).

36. *Walis* and *Muqtis* or holders of Wilayat and Iqtas into which the kingdom was divided were governors and military commanders respectively. Alauddin Khalji was the Muqti of Kara and Awadh. The Muqti was more than Iqtadar for he had to maintain a body of troops to keep law and order. He had to send the surplus revenue of the area in his charge after meeting the local expenses. He was liable to military service. In financial matters he was responsible to the *Diwan-i-Wizarat*. He had a secretariat headed by one called Dabir. He had also a confidential adviser called Kat Khuda translated here as Master servant of the house. See infra.

37. If Barani is to be believed Qazi Mughisuddin mentioned another such person in his talk with the Sultan "For the post of the Qazi of the realm thou hast appointed Hamid of Multan whose family from the time of his grandfather and father have lived on usury. Nor dost thou carefully enquire into the beliefs of other Qazis, and thou givest the laws of the Prophet into the hands of the covetious, and the avaricious and the worldly. Qazi Mughis referred to the Sultan's responsibility in respect of the ill-starred black-faced learned men sitting in the mosque interpreting, cheating and adopting the ways of swindling. This is not brought to my notice on account of the impious shameless Qazis who stand near the throne".

which came within the purview of the Qazi of Delhi who has been described here as Sadr-i-Sadur-i-Jahan *Zia*-ul Haq[31] waddin Abdur Rahman. The officials were enjoined upon to obey his orders in all such matters as fell within his jurisdiction. Utmost of reverence was to be shown to him.

An important document, described as a paper-case or robe whereby the oppressed ones (*jama-i-kaghzi-i-mazluman*)[32] laid their complaints against privileged people contains the despatch of the chief slave of Baha-i-Suqi, the 'Hakim'[33] of Khitta-i-Nagore, which was addressed on 30th Rabi' I, 709, at the instance of the Qazi of the place, to the Sadr-i-Jahan, *Z*ia-ul-Haq waddin. It relates to the complaint brought in '*Diwan-ul-Mazalim*',[34] against the 'wali' who despite his Muslim name of Malik Islam, indulged in un-Islamic activities and had extended his hand wide for the ruination of a populous region of the realm of Islam. He had misappropriated a hundred thousand and had become proverbially parsimonious. Like many other agents of government (*'ummal*), he always had his eyes on the wealth of others and his stony heart served as the load-stone, drawing to itself the money of the people. Even the shirt (*pairahan*) on his body belonged to others. He had so many claimants at his door but he knew how to deny justice to all. He was not afraid of death. Although the Hanafi Law, which was administered, supported the case of the oppressed ones, he refused to consider the judgement of the Qazis as valid. By dishonest means he had made himself so rich as to leave even Jafar Dwaniqi[35] behind as a poor man. Opening his tongue of criticisms and derision, he contemptuously referred to the Qazi and said that the latter called himself a *faqih* (jurist) but was ignorant of literature and had to be taught manners. Every day a number of seekers of truth put forward before him the plea of *Sharia* but he ignored it and being puffed up and becoming violent, he uttered that

31. Perhaps he was Maulana Ziyauddin of Bayana who rose from the office of Qazi-i-lashkar to the highest judical offices of the realm and was called Sadr-i-Jahan This piece ends significantly with 'کتب بامر امیرالمومنین'

32. This reminds us of the old Persian custom which has been referred to by Ghalib.

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

کاغذی ہے پیراہن ہر پیکر تصویر کا

33. The celebrated 14th century sufi saint of Bihar, Sharafuddin Yaha Maneri has used the words Qazi and Hakim for one who administered justice. Ordinarily in Muslim countries judicial functions were exercised by Qazis and in small villages by Hakims.

34. In Muslim countries outside India (Baghdad, Cordova etc.) there was a special judge called *Sahib-ul-Mazalim* who was appointed by the superior ruler to hear the complaints of breach of privileges or offences committed by big public officials.

35. Abu Jafa'r Ali Mansur, the second Abbasid Caliph, and the creator of Baghdad who reigned for nearly 20 years was notorious for his stingency.

Muhammad). He was to confirm by evidence the rights of God's creature; revive and interpret the revealed command of God; discriminate between the subtleties of things lawful and unlawful; test by experience the conditions and situations of the gentry and the commonalty; make it incumbent upon himself to pay greater attention to the complaints of the oppressed ones; especially those who suffered from the violence and extortion of the official rulers; observe fairness and equality between two contending claimants, especially a rich and a poor person; and should discriminate between false and corrupt and trustworthy and truthful witnesses.

He had also to appoint such agents (*vakil*) in the departments of government as might not have a feeling of fear or fright. Such deputies (*nawwab*) should be appointed in the judicial department in cities (*madain*) in country-sides (*khitats*), towns (*qasbat*) as might follow him in their occupation and in the discharge of their judicial duties. They should be furnished with instruction and enjoined upon not to interfere in the ways (affairs) of government and not to blacken the pages of their papers by their wrong and false judicial decrees. Bribery and corruption had to be shunned and money accruing therefrom should be treated as insignificant and transient as the spider's web, rendering their existence useless. They should remain content with what they received from the State which was bound to shine like the arms of the flies, i.e., it would be lawful. In the Department of religion and judiciary, what is stated in the Quran "They are the tyrants who do not order according to what has been revealed", "Verily the tyrant would suffer from perpetual torment", is to be kept in view. A *qazi* should be guided by the Quranic text (*ayat*), public opinion (*rai akhbar*), discretion (*darayat*), honesty and integrity (*taday yun*).

The king wished that ocean of learning should become so boisterous that the waves of the straight path of Command and Prohibitions should flow like that which was witnessed in the time of the Prophet and therefore he had established *madrasas* and embellished them with learning and not with the stone walls and made them charitable institutions for students seeking knowledge. The Qazi should permit the preachers to deliver their sermons. He should appoint *qaris* (readers of the Quran) who preserve the eternal tablets (*Lauhi Mahfuz*) in their breasts. One of his duties was to appoint such custodians of the endowed properties as might fulfil the conditions of knowledge and honesty. They should not be such as to transgress the laws of Waqf. He should make enquiries and investigations into the conditions of the mosques and the *madrasas*, assemblies, nuptials. All the matters pertaining to judiciary should be regulated in such a manner that might not be the least deviation from the *shari'at*. The king had made some grants of the assignments of land (*iqta'at*), rewards or gifts (*inamat*) mostly from Northern India to some people corresponnding to their position and status and the regulation of these was taken to be a religious duty

'The traders of the port of Kambhayet, who are so opulent and active on the sea, have brought some precious things (*nafais*) by sea for the imperial treasury and they should give their delivery to the *Mutasarrifs* (revenue officers) of Naharwala. They constantly ply their vessels on the waters of those directions and the rarities of Maghrib and Sham (Syria) reach continuously and in succession to this side. They should take their vessels to Jerusalem (*Bait-ul-Muqaddas*) and bring them back. The other merchandise, carried in their vessels from Ethopia and Barbari, include the black slaves of Abyssinia whose services are utilised in guarding the harem and as soldiers. Their salty black colour is attractive in its own way. The negro slaves of Zanjbar (Zanzibar) and Darya (?) are of gigantic size and very swift-footed. They were all recipients of royal favours.

Some idea of the working of the judicial department and the attributes, duties and functions of a *qazi* can be had from a *farman*, dated 716 A.H., conferring the office of the Chief Qazi of Delhi, the imperial metropolis, on Shamsul-'ulama-il-Mujtahidin (the sun of the scholars and of theological doctors) Ziya-ul-Haq waddin Abdur Rahman Usman Ashraf (II, 4-17). The introductory portion deals with the might and majesty of the king ; the suppression of the turbulent and refractory people of Hind, Khata, and Tatar; reduction and submission of the great 'Rais' of the Hindus; protection of the weak against the strong; establishment of peace and tranquillity throughout the realm; adoption of the mo.. "Reverence to God and compassion on His creatures"; consciousness o. the need of carrying out the Quranic behests, "Verily God enjoins upon you to be just and benevolent"; and of administering fair and impartial justice to all, especially to the *zimmis*, (protected non-Muslim subjects) and of *dihqans* (village peasants). He was determined to carry out the *fatwas* (command) of *shari'at* (canon law) that when a king should take up the work of regulating the affairs of the kingdom, he should appoint *qazis* who are possessed of the virtues of justice, purity, piety and sound knowledge of theology so that the weak and the helpless ones and the indigent people who have no support, should remain immune from injury and the learned divines should not suffer from the darkness of oppression and the insignificant should not be trampled under the feet of the elephant.

'The king says that being on the look out for a man, possessed of the requisite attributes, he cast his eyes far and wide, from the extremity of Transoxiana to the shores of the Black Sea and a man of deep scholarship, thoroughly honest and strict follower of the *shari'at* law was not easily available. At last, such a person was found in Maulana Abdur Rahman Usman Ashraf who had the truth of (Abu Bakr) Siddiq. justice of 'Umar, modesty of 'Usman and scholarship of 'Ali. In knowledge of tradition and in the use of discretion he was the second Sharih (the qazi who was appointed by and represented 'Ali, the 4th Caliph) and the third Sahibain (Imam-i-Azam Abu Hanifa had two special pupils, qazi Abu Yusuf and Imam

derveshes on whom rest the foundations of the faith and the Sayids, both Alawis[28] and Fatamis, should be the object of reverence and benediction. They are the pillars serving as the prop of power and authority, kingdom and empires. When the tentpole is damaged, the tent itself falls down.

The independent rulers should be won over by conciliatory methods and favours. The sincere and pious people over there should so behave as to extort respect and admiration for their dignity. When the royal coinage had been made current in that region, the abundance of gold and silver in the shape of satanic[29] coins like '*Achchu*' (yellow gold), '*Padma*' (white silver) and '*Qatam*' (small black coin) should be an object of anxiety and the treasury should be so flooded with royal coinage as to obviate the necessity of other metals. Countless cavalry and infantry should be collected and kept ready to bring under control the distant regions of land and sea. The peasants and the cultivators who pin their hopes on water for irrigation and on their cattle and calves, should receive help and encouragement so that they might bring out increased production. As regards the assessement of the cultivable lands, settlement should be made on a half and half basis. Religion should be the guide in every transaction. The inhabitants of the coastal regions, islands and harbours should be made to acknowledge the imperial suzerainty and if they hesitated to do so, force should be used against them. It was hoped that the Hindu Paiks (foot-soldiers) would give up their mischievous activities and when the demand was made for *kharaj* and *jiziya*, they should be humble and submissive When they accepted such a position of obedience and submission, they should be assured of their safety and security. Strangely enough, this document addressed to the King's son, concludes with the mention of the names and the pompous[30] titles of "-Khwaja Jahan Dastur-i-Sadr Nashin....Naib Mubarak Barbak Kafur as Sultani......".

The next piece is a *Farman Tughra* (with royal titles prefixed), dated 13th Safar, 709 A.H., which was addressed to the merchants of the sea and the ports, regarding the transportation of the gifts and goods of Arabia, Habsha (Ethopia), Bahrain, Barbar, Maghrib and Syria. It is of some significance, showing as it does, the interest taken by Alauddin Khalji in foreign trade and shipping. Unfortunately, it does not specify the articles of import and export and is much too short to provide us with some much-needed information. Its substance is as follows :-

28. The direct descendents of Hazrat Ali by wives other than by Fatima, the daught of the Prophet, are called *Alawis*.

29. This reference to the monetary system obtaining in the south is interesting b the coins mentioned require identification and elucidation in respect of their natu weights and measures.

30. The concluding portion begins with an Arabic text "*Katab-al amir al ghalib* *ghalib Reqab-us-Salatin.*"

nued to ply on the ocean upto Kish and Harmuz (islands on the mouth of the Persian Gulf) and the whole of the coastal region was to be brought under control and possession. The neighbouring islands in the ocean which had been a source of trouble and the coastal regions should be brought under control by means of sword and the idolatrous practices of those areas should be substituted by the laudable customs and obligatory duties of Islam. Whosoever agreed to accept the position of a *Zimmi*, had to be condoned and pardoned.

Although the princely recipient of the *Farman* had enough good sense and foresight to require detailed instructions, the affection of the father dictated the need of showing him light so that he should pursue the straight path and regulate the affairs in such a way as to make all his subjects and the common people enjoy peace and comfort. He should mete out justice to all like Naushirvan. Everyone was to be provided with some work and occupation. Cruelty and oppression on common creatures had to be sternly suppressed. The prince should not allow himself to be defrauded by writers and accountants and collectors of *Zakat*, "whose entry of hundred maunds of gold yielded no cash but only a paper". He had to guard himself against the counterfeiting of coins and discriminate between those who were false and faultless. The Hindu scribes who with their inverted[27] script (*Khatt-i-Bazguma*) sent the affairs of Mussalmans up and down (disturbed and confused) should not be allowed such latitude as to continue plying their pen more swiftly and prove prejudicial to the interests of those who were firm in faith and were virtuous. He had to remain awake about the affairs of his territory and the *Iqta's* so as to avert mischiefs and calamities. He should depute spies and informants in the east and the west so that they might move about constantly from dawn till darkness in the midst of the poor and the destitute, the rich and the wealthy, so that into no retreat and corner oppression and tyranny might find their way. He should regard the lamentations of the oppressed ones to be the clarion call of the Judgement Day and not the musical note, emanating from the Turkish guitar (*tambur*). If a loaf of bread would serve as a shield for the life of an indigent person, that should not be withheld from him. The religious mendicants in the dark narrow retreats and streets, who passed their days in hunger and lived only on restricted diet, should also not be ignored. Punishment should be tempered with mercy and when an oppressive enemy sought mercy and refuge, one should go to the utmost limit to accomodate him and spare the sword. But as regards "the enemies of the country in whose case the pen of *Shari'a* writes the *Fatwa* (judgement) with blood", they should not be spared. The scholars whose occupations dispelled darkness, who lit thousands of lamps of learning for the followers of (Imam) Abu Hanifa and the saintly Sufi

27. This is written from left to right.

end, the hot-blooded inhabitants of the tract of Multan[22] were specially assured of fairness and justice and generous treatment. They were asked to give up their designs of war, their fear and fright, their hatred and antagonism, and also their impossible demands, and to pray for the success of the newly established regime".

This is followed (vol. IV pp. 119-141) by a *Tauqi'* (mandate), conferring on the boy prince Farid Khan,[23] the government of the *iqta'* of Ma'abar[24] and Sawahil (coastal regions). After offering his thanks givings to God for having blessed him with many capable sons and hoping that they would prove to be the aid and support of the community and the country, the Emperor says that it was his duty to survey the affairs of the world ; to see where there was darkness of perverseness and rebellion ; to appoint one of his sons to that part of the country which was devoid of worthy people and he should be capable enough to chastise those who evaded payment of the fixed money. The coastal regions of Ma'abar and the whole tract upto the shores of Malabar, which were equal to Ma'abar in area were conferred on Farid Khan, "the dearest and the happiest son and the pearl of the crown of the kingdom" so that he might take possession of and establish his control over both land and sea on that side. His deputies and *diwans* were ordered to prepare and put down on paper detailed incomes, accruing from sea and land, since Rabi 712 A.H.[25]; to demolish the foundations of idolatory ; to take proper measures against the erring and the rebellious ones and crush the refractory and the seditious people of the frontier regions. Deserving men of sword and the pen and workers, learned and of practical experience, were to be appointed to the post suited to them. They should see that the boats and the ships[26] conti-

22. Multan had become the rendezvous of Jalali princes and nobles headed by Arkali Khan. But they were disposed off, despite the recommendation of the Suhrawardi saint, Shaikh Ruknuddin and the region was brought under control by Qutlugh Khan and Zafar Khan after about a couple of month's investment.

23. Of the numerous sons of Alauddin, Khizr, Shadi, Farid, Shihabuddin and Mubarak Shah, are better known. Others were Abu Bakar, Ali, Baha and Usman. They all suffered blinding and murder at the hands of either Malik Kafur Mubarak, or Khusrau Khan-Khizr and Shadi were murdered by their own step brother Mubarak.Nobody has mentioned the incumbency of Farid referred to here, though there is nothing improbable about the boy-prince being nominally put in charge of the area and being deputized by Malik Kafur.

24. According to Wassaf's *Taj ziat-ul-Amsar* Maabar extended in length from Kulam to Nilawar (Nellor) nearly three hundred farsangs (each about 3 miles) along the sea coast.

25. 'از استقبال ربیع تاریخے همایون تر' The last two words form the chronogram yielding the year 712. But *Khazain-ul-Futuh* which is more reliable says that Malik Kafur set out towards Maabar on 24th Jamadi, 710.

26. This and other such references to the interest taken in sea-borne trade and foreign commerce by the Khalji Sultan is of some importance

have devoured others". It behoves one who sits on the cushion of the state to water the garden of sovereignty from the spring of *Shari'at*; to prevent calamities and dangers from mankind and genii throughout his dominion; to extend his justice and equity far and wide; to root out all mischiefs and tumults; and to so crush the refractory and the blood-thirsty ones as to ensure complete peace and comfort for all.

This is followed by what gives us a clue to the ambitious designs of 'Alauddin to attain the throne by any means, fair or foul, which had been harboured since long. Alauddin appears to have been in league with the discontented Jalali nobles who were anxious and ready to welcome him as a king. "As the kingdom-bestowing exalted and sacred Lord had given the joyful tidings of the dawn of good fortune to the eternal Cradle of the Child of my destiny and had prepared the robe of the attributes, referred to above, so as to fit my sky-like size and stature, the eyes of the stars were on the look-out for the dawn of that day and for that time when the orbit of my black canopy would be witnessed. And the fixed stars by making friends with the angels (*aql-i-kul*) had arranged the affairs and had done what was expedient so that the throne of the empyrean should cast the shadow of my sovereignty and the jealous and the malicious ones should be prevented from creating mischiefs. They were restless to witness the manifestation of my war-like activities and were ready with their gifts to welcome my victory and success. Praise be to God that their expectations did not remain unfulfilled".

The document next refers to the issuance of the new coinage and the reading of the new *Khutba*; to appointments made; to measures adopted for ensuring justice and protection ot the loyal[20] zimmis; to the intended policy of making wars of conquest and expansion, of establishing peace and security, doing justice to all, promoting the welfare of the subjects, rooting out marauders on the roads and highways so that "people with gold and silver[20] in their palm could enjoy a sound sleep in the world"; devising a sound system of intelligence and espionage; befriending peasants, tradesmen and workers, "the sweat of whose eyebrows falling on the ground become pearls"; cheapening things, especially grain; mitigating[21] the severity of the *Kharaj*; helping the indigent and the wayfarers out of the royal exchequer; patronising the saintly mystics and the pious ascetics, and the great scholars, teachers and earnest students. The motto adopted and stressed upon was: "To honour the command of God and to be clement and compassionate towards the creatures of God". In the

---

20. که سیم و زر چو بکف کرده در جہان خسپند

21. سبک کنند و بہرک کلیش باز آرند

became[17] lightened. In mtaters of justice and welfare of his subjects his enlightened nature had devised such laws as could not have been reflected on the mirror of Alexander or in the cup of Jamshed. For cheapening the grains, which is the leaven of life's existence, his sound and balanced judgement had made such regulations that even when the clouds do not send the rains and the wind and the sun do not help the soil to yield green crops, he can keep the common multitude supplied with food from the royal stores.[18] As regards the other requirements of the people, whether rich or poor, things have been made cheaper and more easily accessible. Money which is the elixir of desires and the most wanted and cherised object has been made so cheap, on account of the considerable gifts and abundant charities of the king that no one feels the dearth and dearness[19] of provisions and consequently ease and prosperity prevails all over the kingdom. All the people are leading happy and contented lives, like the sparrows in the gardens, full of ears of corns. There is peace and security every where in the world on account of the efficient management of affairs by the great Sultan. Roads and highways have been made bright, plain and safe for all including veiled women and babes in mother's laps. Robbers have fled away from the shadow of the wealth and household goods and furniture, as shadows flee from the sun, and justice is busy in uprooting tyranny as the lamp dispels darkness. The gigantic elephants cannot trample under their feet the insignificant ants and the hungry lions have not the courage to laugh at the unsteady movement of a lame deer (vol. I pp. 15-22).

Now let us consider the first *Farman*, proclaiming Alauddin's accession to the throne (vol. IV pp. 104-119). The initial passage is not devoid of significance. "Praise be to God who had elevated the position of the king for the exaltation of the faith of Muhammad; made him the lord of a lasting world ; chosen him to sit on the throne to enforce the common law which is valid for ever ; distinguished him with special eminence and excellenc ; given directly from Himself and not through fate (*Falak*); and enabled him to attain a kingdom for which others after him might not be so worthy and deserving. God grants greatness only to those whom He favours. He next goes on to say something about his black standard, his swift-moving armies, his goods and treasures, and also about the utility, duty and qualities of kings. "Had there been no king some people might

17. One may take the author's exaggerations for what they are worth. Alauddin had fleeced both Hindus and Muslims, though he was eminently successful in ensuring peace and also plenty of the consumers' goods.

18. "انبار خاصه"

19. *Khairul Majalis* and *Maktubat-i-Muzaffar Shams Balkhi* of Bihar contain corroborative references. People in the early years of Firuz Tughluq spoke about the comparatively greater peace and plenty that prevailed in Alauddin's time and they even paid reverence to his tomb.

meant the subordination and subjection of all the crown-wearers of the time, including all the refractory infidel chiefs. Many a time he deputed the Rustams of his victorious army to humiliate the Afrasiyabs of Turkistan. The iron chains of afflictions which the headless Mongols used to bring each year from Timur Qiq[15] for the neck of the faithfuls to carry them as prisoners, turned into swords which cut them down and sent them to hell. Some who were spared by the swords or who were put in chains or liberated but tried to raise mischiefs and tumult and break their fetters were ordered to be thrown down from the battlements of the fortress into the river, while the rain of blood was made to pour on the earth from the necks of others and their berry-coloured bodies buried in the ground served as seeds from which sprouted shoots of ruddy-coloured odoriferous basils of Tartary. Thereafter towers[16] were built with the heads of those dogs, inauspicious as red Mars. The towers with many white girdles containing thousands of heads of those red-complexioned ones became lofty as the sky. Similar lofty towers were erected in other regions of the country. The towns and cities which on account of the frequent raids and assaults of the Mongols had become desolate and ruined like deserts became populous again at the expansive hands of the king. The blood-shedding Mongols on the other side of Ghazni were no longer able to cross the Sindh river and the ferocious Tartars from the side of the Jaxartes were not given any quarter or repose. The carpet of peace and tranquility was so admirably spread that from the fortification of Delhi to the territories of Khorasan all disorders and tumults subsided and the mischievous Mongols rolled down on the ground. On one side, the huge hordes of Chingiz Khan had been blown off beyond the oxus by the violent wind of the dread and awe inspired by the king and, on the other side, the powerful Rais of India who with thousand elephants used to trample the ranks of the Turks had no alternative but to offer elephants and treasures and those who dared to offer resistence were crushed. Some of them who placed their heads before the columns of the royal threshold became recipients of royal favours.

The gifts and gratuities of His Majesty were so common that even without written deeds and commands, the houses of the rich and the poor

---

15. Tamar or Timur in Turki language means iron and Qiq implies a mountain surrounding the world. Mangu Timur, father of Pulad, was one of the direct descendents of the renowned Chingiz Khan, through his son Tuji, father of Batu (the other more famous sons of Chingiz being Chaghtai, Oaktai, *and* Tuli)

16. Barani, Badauni and Ferishta have mentioned some of the prominent raids of the Mongol chiefs, that occured from the second year of the reign up to 706. They were defeated at each time, Barani says that once when they invaded Delhi many were slain and others who were captured were trampled to death by elephants and of their heads they formed huge platform (*chabutra*) or made turrets of the Mongol skulls. Again, he says that in Badaun a tower of the their heads was raised before the city gate which 'the town people look at to the present day'.

sed at this, sent 50 elephants with treasures, jewels and choicest goods as a token of his submission and loyalty, and on the following day he came himself to the presence and was assured of the safety of his life and property. A review was taken of his goods and chattels. What he offered was taken and his demands and requests were acceded to. By agreement, he entered into the fold of '*Zimmis*'—those, protected by, and subject to, the Muslim government. When all the affairs of the region were satisfactorily settled, the Emperor returned to the metropolis on the 5th of Shawwal, 680 A.H. (vol. V, pp. 5-13. Nawal Kishore Edition, Lucknow)

The next document that attracts our notice is the brief allusion of the meeting between father and son, Bughra Khan and Kaiqubad, on the banks of the Sarju river in Awadh, a subject dealt with at length in *Qir'an-us-Sa'adain*. In a letter, dated Rajab 1, 687 A.H., wherein all the figures of speech have been derived from the planetary system and which was addressed to Najmul millat waddin Shams (Najmuddin Hasan[13] Sijzi), Amir Khusrau refers to his reunion with his old friends, Shamsuddin Dabir (Balban's Secretary who drafted the Emperor's memorandum for his son Bughra Khan) and Qazi Asiruddin Muhammad, and he also makes mention of his patron (Makhdum), Malik-ush-Sharq Ikhtiyaruddin Ali Beg Sultani (Khan Jahan Hatim Khan) who was appointed governor of Awadh. The Sultan of the East, Nasiruddin Mahmud (Bughra), arrived on the bank of the Saru (Sarju) and from the other side came Muizzuddunya waddin Kaiqubad. On the first day, they remained encamped on either side of the river and on the next day the meeting took place. Amir Khusrau bewails his lot that he could not return with the royal army to his home and was obliged to stay in Awadh. The royal cavalcade was marching on but his patron, the incomparable Malik, turned him back and he had to leave the company of his friends in the royal army and travel back to the darkness of Hindustan (eastern provinces), the realm of Saturn. It was the season of rains, lightning and hails, in the midst of which he had to wend his way back, his eyes raining tears on the parting of his friends.

The other dated epistles and documents belong to the early years of Alauddin Khalji,[14] whose achievements in manifold spheres have been summarized in his own inimitable style in a long Introduction to his first volume. The relevant extracts wherein the Sultan has been eulogized for his wars and conquests, his stern and effective chastisement of the Mongols and the erection of turrets of their heads, his justice and generosity, promotion of the material prosperity and welfare of his subjects, and establishment of peace and security are as follows: His very accession to the throne

---

13. The celebrated poet, a friend of Amir Khusrau, and the author of *Fawaid-ul-Fuad*.

14. The introductory portion contains the names and profuse eulogium on Mubarak Shah, the despicable son and successor of Alauddin Khalji. Could he be described as *Nasib-ul-Wilayat-il-Abbasiya* (I, 28-39)

Barbek Beglar[7] Bek, one of the most trusted officers of the court and deservedly famed for his martial virtues, to reduce the realm of 'Jajnagar and Awadh[8]. These regions, bordering on the deep ocean, on account of the distance and abundance of elephants, cavalry and infantry had remained immune from the hands of those fighting the 'holy wars.' That valiant officer who had been authorised to do all that was necessary, marched quickly to that side, traversing high and low lands, and when he arrived in the vicinity of that realm, the people became nervous and panicky. But Naldeo[9], the chief 'Rai' of Jajnagar and a big 'zamindar' of that frontier, advanced with 50 elephants, 5,000 cavalry, and 10,000 *paik* swordsmen to oppose the imperialists. The lion-like soldiers, thirsty for the blood of the despised wretched fellows, gained an upper hand over them and in the very first attack killed many of them. As they had been instructed to capture as many of the Deccani elephants as they could, they at first desisted from shooting their hill-penetrating arrows but had at last to use them, making four of the elephants look like porcupine. A number of the 'infidels' were put to the sword and as many as 60 elephants were captured.

After this, the victorious army proceeded towards Jahanbar[10] which was the headquarters of the 'Rai'. A blockade was laid around the strong fort of Hargaon,[11] the top of which had been provided with ballistas (*manjaniq*) and many small magazines for throwing heavy stones (*Arrada*), arrows and lances. With a view to capturing the fort, orders were issued to the soldiers to ascend the summit of the fort with the help of ladders and strong ropes. They rushed up and got on the top and took possession of one side of the fort. They were about to raise the whole of it to the dust when Rai Birajit Man,[12] who was distinguished among the Hindus for his foresight and wisdom, realising the impending loss of all the resources of his zamindari to be followed by his overthrow and chastisement, sent some eloquent men to sue for peace. When the imperialists saw that the leader of the enemies, despite his immense resources and previous refractoriness and refusal to pay the *Kharaj* (tribute), had become humble and submissive they accepted his gifts and presents and sent back his men with assurances about his "residence and integrity". The 'Rai' being plea-

7. He is 'Malik Ikhtiyaruddin Barbak Bikrus Sultani' of Barani (pp. 24, 88) who was sent by Balban ahead of him in the direction of Jajnagar in pursuit of Tughril.

8. The manuscript copy of O.P.L., Patna, has given the correct word "Jajnagar Odessa".

9. Can this "Rana-i-Samin" "رانه سامین" be identified with Raja Fa, entitled Manick, of Tipperah who was a great friend and supporter of Tughril? Some scholars are inclined to identify Jajnagar with Tipperah.

10. The Patna Ms. has "Sawad-i-Maha Banares".

11. We get 'Hisar-i-Sargaon" or Sarkano in Patna Ms.

12. The Patna Ms. corrects it as Mall. Barani has mentioned one, Danuj Rai of Sonargaon, who had entered into an agreement with Balban. But Berajit could not be Danuj.

and difficult work but it is worth while to extract from it some matters of political and cultural interest. The length of the *farmans*, *tauqi*, *hukumnamas*, etc. and their highly ornate and verbose style would justly raise doubts about their genuineness. But the substance of their contents, the dates and names of persons and places which are not all fictitious and the sequence of events, as also the fact that Amir Khusrau was a witness of, and a participator in, the affairs and occurrences mentioned, will suggest the importance of their main themes. Perhaps none could give a better idea of the political atmosphere of the age in which he lived than Amir Khusrau. More important is the glimpse we get in it of the social and cultural conditions of northern India at the end of the 13th and the first-quarter of the 14th century. This aspect will form the subject of a separate paper.

The first thing in chronological order is the *Fathnama*[6] or the letter of victory, sent to Delhi by Ghiyasuddin Balban after the conquest of Lakhnauti. Amir Khusrau had accompanied Bughra Khan in his expedition against the rebel, Tughril, who being puffed up with the successful onslaughts on Jajnagar, had assumed the title of Mughisuddin and had caused the *Khutba* to be read and coins to be issued in his name. He had repelled the attacks of the imperialists, led by the ill-fated Amin Khan and Shihabuddin or Bahadur, Governor of Awadh, and invited the wrath and invasion of Bengal by the emperor himself. On the approach of the imperial army, he fled to Jajnagar and for a time eluded the grasp but was eventually overtaken and killed there.

Strangely enough, the *Fathnama* makes no mention of Tughril and is mainly concerned with the activities of the imperialists against the Hindus of Jajnagar and the neighbouring region, bordering on the ocean, whose identity has to be established. The *Fathnama*, composed in 680 A.H., when Amir Khusrau was 31 years of age, opens with the praise of God who had placed the "rightful king" in a position to exercise power and authority, regulate the affairs of the kingdom, promote the interests of the faith, punish the mischievous and the refractory ones, and effect the conquests of forts and realms. Then it says that the king sent Malik-ush-Sharq Ikhtiyaruddin

---

6. Dr. Habibullah, in his book, '*Foundation of Muslim rule in India*' has briefly noticed it in a footnote on p. 167. Prof. Khaliq Nizami has published the text of this *Fathnama*, in an appendix of his work, '*Some aspects of Religion and Politics in the 13th Century* but he has taken it to be a private essay rather than an official document on the ground that Barani has referred to the official despatch of the victory by Dabir Qamruddin and Amir Khusrau was too young at the time to be entrusted with such a responsible task. The subject of the Risail is the 'Science of Epistle-writing' and, therefore, one has to judge the historical value of its various pieces by seeing whether, shorn of their verbosity and literary jugglery, they contain anything which is contrary to, or contradictory of, the established facts of history.

MATERIAL OF HISTORICAL INTEREST IN I'JAZ-I-KHUSRAVI

In a paper[1] published a few years back, the present writer had tried to draw the attention of scholars to the need of gleaning material of historical interest from contemporary literature of professedly non-political character. *Belles lettres*, epistolary[2] compositions containing sometimes copies of official documents, poetic pieces[3], dealing sometimes with historical events, mystic literature and biographical works containing minute details of every-day life of Sufi saints and even books of romance, written in very ornate style, yield fruitful results to a painstaking student of history. That a book of tales and a collection of ancedotes can unexpectedly bring to light something which may serve as a source of political and social history was illustrated by a paper on *Basatin-ul-Uns* contributed to the Poona Session of the Indian History Congress, and may be further shown by a fairly big paper which is shortly to come out on *Jawami-ul-Hikayat wa Lawami-ur-Riwayat* of Muhammad al-Awfi, a contemporary of Qubacha and Iltutmish.

The historical works, including the *masnavis*, of Amir Khusrau, who witnessed the reigns of, and wrote about, several kings from Balban to Muhammad bin Tughluq, have been utilized by many scholars who have found some of his prose works also to be of great historical value for a student of early medieval history of India. But one of his voluminous works on epistography, named *I'jaz-i-Khusravi*,[4] completed in 719 A.H. four of the five parts whereof had been completed in 682 A.H., have scared all except those who are interested in highly ornate style, literary skill and artifices, verbal jugglery and intellectual gymnastics. The style is so stiff, involved and complicated and the few matters of undoubted value for social and political history that are found in it are so wrapped up in puzzles and puns that nobody except the learned author of "The Life and Works of Amir Khusrau",[5] has cared to notice its contents. This is a voluminous

---

1. *Sidelights on Piruz Shah Tughlak and his times* (mainly from literary and religious sources), *P.U. Journal*, XIII-1959.

2. Many such collections like *Dastur-ul-Insha* (letters of Raja Ram Narain), *Dastur-ul-Insha*, *Riyaz-ul-Insha*, *Madan-ul-Insha* etc. have already formed the subject of separate papers by the present writer.

3. Versified accounts in Persian of Islam Shah's campaigns in Assam. (*Current studies*, Patna College)

4. The chronogram "زبی در ترسیل" yields 719 (V.p. 167). The author was at this time about 70 years old "هفتاد ساله شد" (V-157).

5. Dr. Wahid Mirza also edited and published the valuable *masnavi*, "*Nuh Sipihr* -

Tanka (a denomination of silver money) at its end just as the drop of the oil which trickles down as a pound of the size of the *Dāng* (Damri) as it expands and spreads and becomes as big as a *Tanka* (i. e. he makes the little appear to be much). The ways of the greasy vicious oilmen of the time are peculiar. They believe that they can make Serajuddaula a kind exponent and champion of their cause if they make their conditions manifest piece by piece (Kunjad ba kunjad), and even if there be a mole through out their body, they would not conceal it lest, if they deviate even to a point of the Sesame seed-their wheat, (Swarthy) coloured body may be cut into pieces with the sword like Sesame leaves. Instead of the Sesame seed they, should themselves be thrown into the oil mill (Jawāz) and squeezed to death. Every thing that belongs to them should be confiscated so that confidence should be restored to the people of the time. The Sesame seed should become so bitter in their mouth that they may take it to be a poison.

host of people towards a dark well (pit) which is his inkpot. In the black and cold water of the ink-pot he dips his pen. The Hindu-patronising Governor (Muqti-i-Hindu Parast) prefers his script, written in the reverse way (Khatta-i-Bāzguna), over (Arabic) alphabet of the Musalmans, and this fellow is setting fire to all the towns of this region by bringing out smoke from the top of his reed-pipe (taking ink on the top of the pen" (II-46-47).

There is an interesting passage relating to an important industrial class—oilmen—who ran the time-honoured oil Press at Delhi and defrauded the Government and their customers. Ziaul-Mulk Sirajuddaula, (supposed to be) the chief of the department of lightning or illumination, was also put incharge as *Shahna* (Superintendent) of the oil pressers (Raughandārān) i. e. Telligar of Delhi and its environs so that he might bring about a change in the habits and nature of the band of those vicious oily people who are more numerous than the particles of sands, and by penetrating like water into sands he was to bring out oil therefrom (do the impossible). As regards the leaders of those people, each one excels the other in flattering and practising deception upon the *Shahna*, and every one appears to be unique of his time in manupulating the affairs. Many a time they have imposed upon and deceived the collectors (*Muhassilān*) of oil tax with trifles like lees or dregs that remain after squeezing (i. e. Khalli or oil cakes) and they do not let them see to the game, just as they do with bullock by fastening and closing their eyes, and making them go round and round the oil mills. He should not allow them to persist (in their nefarious activities). Although they would try to make an offer of small quantity of oil for his lamp and wish to use him as a wick of cotton and burn him (bribe and exploit him to serve their selfish purposes), he should anticipate them and reduce their bones to cotton by striking them with his wooden stick just as the carder does in the case of the cotton with his comber. After giving them a thorough rubbing he should pour that very oil on their heads which must be placed against the lamp for being burnt so that to every one their real condition may be clearly exposed. This should be specially the case with Narain Raughanagar (oil manufaturer) who is the lamp or light of their race (Duda). If he brings any thing like a rose it should not be touched with the fingers for that flower is like the snuff of the candle made of fire and flame. His way is such that to whomsoever he gives a *Dāng* (a weight, equal to 6 Rattis or fourth part of Drachm) he puts the impression of a

propriated might be recovered. The Hindu scribes who played havoc upon the Muslims with their inverted script (khatt-i-Bāzguna) should not be given so much salary as to make them wear good shoes, for if the blistered skin of their heels stops emitting blood they would use their legs in kicking all the resolute men of faith. They would take out their shoes (to strike them), and their sharp-edged pen which resembles the cobbler's awl would be made use of on the skin of the faithful one's (IV-131)".

There is a small passage (IV-65) which shows that the accounts of the produce were kept by the Hindus who were not very honest in making the entries of the produce of grains brought by the peasants. They used to keep a good portion to themselves by omitting the entries in the register. . Their sharp tongues were like scythes in easily disposing of the complaints. The relevant extracts is as follows—"A particular Hindu scribe (Nawisindah) who supervises and keeps an account of the produce of the grain plies his pen which is two-faced, and what it writes is as important as the corn itself, for it splits asunder the disposition of the poor cultivators, just as the plough tears the fields into pieces. His tongue is like the corn-reaping scythe which tears into pieces whatever litters of things come in the way cf man".

In a section containing letters relating to the officials of the revenue department there is an interesting report, dated 709 A. H. of an auditor detailing his amazing experiences of the notorious writer class. An extracts is, worth consideration "At this stage when my complaint reached the Malik (Muqti of Manikpur), he decided to redress my grievances. But they had left my affairs in the hands of a Hindu named Deochand who had collected around him a few devils (Deos) whom he maintained and patronised. He had acquired a great hold on the Malik just as the *Deo* commands the *Chandals* and the serpent sits tight on the Sandal wood. All persons, big and small, found themselves encircled by these devils. He does not take into account or mind the action of the '*Shahna-i-Diwāni*' (sperintendent of Revenue Department). The people who claim the power to arrest these devils (*Dewāns*) flee from their shadows (dare not approach them). Really this fellow is a man of low origin from Kara, where he used to live in dire adversity in his early life. On account of his proficiency as a writer he managed to acquire great influence over the whole population of Kara. He is such a clever and skilful administrator (Dabir-i-Mudabbir) as to overwhelm all other secretaries, but he is also a such mischievous writer that he leads a whole

own juice, and it is certain that he would try to take the plantation non-contract or lease from the accountant or writer (*Girah Burān*). That scribe or accountant should be thrown into his own sugar mills (Jawāz) before he squeezes us. The police Superintendent (Majlis-i-Shahna) would earn our appreciative sweets if he firmly squeezes him and realises the tax on the sweet juice so as to make a stream of sugar juice flow in the village wherein that most ignoble sordid fellow should be drowned to serve as a warning for other parfidious people. If he happens to get an inkling of this affair he will give sweets (bribe) to every body so as to keep their lips sealed. Till the talk of the sweet (bribe) reaches and becomes bitter (jarring) to the ears of others and the mouth of the bribe-taker are embittered by the delivery of the sweet, this wine seller who lives on the wages of iniquity, should be compelled to taste the bitterness of punishment from the department of censor of Morals, and sweet juice of sugar has to be taken out of the root of his teeth before it goes down his throats" (II-247-49). [*Note* there is a hint here that sugar was used for manufacture of wine. A certain extract metaphorically written clearly shows that wine was made out of grapes and of sugar "The heart of Khusrau resembles grapes, and his pen is like a sugar cane from the juice whereof pure wine is manufactured.] (IV-247-49).

Sultan Alauddin, a keen judge of men and matters, seems to have had a low opinion of certain classes of petty officials. He is supposed to have warned his son, Prince Farid, against "deceitful words and counterfeit activities of those sycophant records-keepers who knew how to polish their writings by using the silvery leaves. Their base silver was nothing but copper. If they wrote about revenue of hundred mounds of gold that would mean a vanishing thing and nothing in the shape of cash could be had except on mere paper. Even if their allies and relations were as pure as gold they should not be let off and the coins of their deeds should be tested for 12 Months on the touch stone. If they were suspected to be dishonest they should be beaten like gold, so that all the gold that they had taken in their belly might come out of it. Even if they came out unscathed they should have to face the financial courts, just as the use of silver is allowed in canon law. As regards the false and fraudulent agents they should be made to have the taste of iron so that they might emit the embezzeled silver as red ruby (blood). If all of them are rice-eating Hindus they should be intimidated and made to tremble with fear so that the capital amount which they had misap-

of a month that the mouths of the horses of the writer are sealed in respect of barley corn (Jaw)........A handful of barley had come from village Barhana, but it was soon eaten up and now barley is not available in the bazar and one has to suffer kicks for trying to get it......There is the pretence of keeping stocks of grains against scarcity (*ambardāri*) but there exists everywhere plenty of cereals like *Mung* (pulse black grain) and *Māsh* (vetch or kidney bean) which are not drawn together (do not get mixed up). They have imitated the ways of the jews. Is there nobody to throw them (hoarders) in the pit in place of grains ?" (V-65).

The agents of big stockists interferred with and tried to exploit honest grain dealers to fulfil their own ultimate ends. "Mohsin Galla Farosh" complained to his master, "Khawaja Ra,Is", that the latter's agents had virtually "lifted him up by the hair like the handle of the scale" and were compelling him "to keep the wheat of the (Government) stock in his custody". He prayed that "before this dirty practice (of higher prices) which was a reminder of the episode of Adam's fall filled up the measure of his age" (ruined him) the addressee should intervene (and get at the true facts) and see that the wheat flour was transferred to the other carriers of burthen, leaving him behind scathless just as it happened in the episode of the thief of fine cloth and thus earn his share of rewards for the store house of Dooms day (IV-334-35).

One of the cash crops of the time was sugar cane. The ripe sugar canes were pressed and crushed in sugar mills, called in the Risāil 'Gharkh' and 'Jawāz', and revenue accrued to the Government from the tax on its juice (*Wajh-i-asri*). The village Hindu official or agent called "Khuta", was expected to help the Government in assessment and realisation of revenue. Maimun Sharābi, the tax gatherer, (Shahna) of village Nepala wrote to Shihab Sumarqandi that "a lady, Shakkar Khatun, had a very rich sugar plantation in village Naisāna on the river side and Neipal Khuta was exceedingly desirous of getting that sugar plantation for himself." Sometimes he says that "such sugar has not been available under the revolving sky, and sometimes giving way to his meanness, he reports that although the time of the seasonal showers has come, the sugar fields have turned into a place where cane reeds grow, and sugar plants are depending on their own moisture. There is no doubt, however, that such kind of sugar plants as we have are not grown anywhere even in tracts within the jurisdiction of Misr (Egypt). This plantator Hindu, who is more inauspicous than saturn, goes up every day to bask under the sun shine of sugar crushing wheel and sits tight stewing in his

Alauddin to promote the well being of the state and the people, corruption was rife in all classes of society, particularly among the business people and the revenue officials, judges, scribes, tax-gatherers and accountants etc. There are interesting passages in the Rasāil about their nefarious practices and the corrupt activities of such people.

A short extract with the heading "control of market chiefs" is of some significance even from historical point of view, for it gives us the author's view and reflections on the fraudulent ways and dishonest behaviour of the shop-keepers and other business men. Here is the relevant passage. "Whenever the market man comes across the chief or the supervisor he begins to whine and lament; and when the question of rules and principles of honesty or integrity crops up, and he has to deal with the faithful believers, he shows his vexation, anger and annoyance. The wicked (corrupt) trader has no ultimate gain except his black face (disgrace). The cloth merchant should learn to be straight (honest) from his straight measuring rod, and the grocer (grain merchant) should learn to be upright from the horizontal beam of the balance which is never crooked (does not lean on one side) as the pair of the scales. The money-changer who is always busy in improving or purifying impure coins is incapable of purifying his own heart (making it good and worthy). The dealers in the market or worldly traders make a profit of one out of ten (i.e. take ten percent annual interest) while the traders of the next world (Darweshes) make ten out of one (will be rewarded 10 times for one good deed). Although a gold-smith weighs gold on his brass scale and the grain hoarder or profiteer (Muhtakir) weighs the rice (birinj) on his golden balance (makes its dear and high priced). If you closely examine the affairs of both you will find that there is no gain or prosperity in the weighing scale of either. A jeweller should not be equated with the grain merchant. Pure gold is not weighed on a balance made out of skin or leather. The weaver (Jolāha) and the man at the shuttle (Taninda) do the same work, and yet one is different from the other, for while one does his work sitting all the while, the other is constantly moving to and from (I-174).

Amir Khusrau exposes contemporary practices of hoarders and profiteers and of corrupt petty local officials and agents such as tax-gatherers and scribes who were Hindus. At times certain essential cereals became scarce in the market; but enough was kept up in pits or *Khattas* by usual methods with a view of enhancing the price. "Today it is about the end

thrown on the problem of the medium of exchange, and many types of coins, current in the country both in the north and south have been referred to. The *Jital*, *Dam*, and the *Dāng* were the lowest units, mostly of copper; the *Dirham* (*Sharai* and *Rikābi*) and *Sikka-i-Nuqra* were silver coins; *Dinār Surkh* (red) and *Tanka-i-Zard* or *Zar*, were gold coins. There is a reference to *Sikka-i-Adali* (*II-321*). All these could be called "*Sikka-i-Sultani*", as distinguished from some of the Tamil coins described in a *Farman* (*IV*-136) as "*Sikka-i-Shailāni*", such as *Acchu* (really accu i.e. yellow gold) *Padam* (white or silver) and *Qatam* (black like fals, small copper coins). Towns and villages, had their own cottage and small scale industries. Some of the main industries produced plenty of textile, goods, leather, sugar, oil, iron, wood, food etc. Various kinds of fine and superfinecloths of cotton, silken and wool were produced, both in the north and south, and some also came from outside such as Katān-i-Rusi, (Russian linen) Jāma-i-Darāz-i-Walāyati (long cloth imported from outside) Leblcha-i-Tabrizi (an apparel of fine cloths made in Tabriz), Yakta-i-Zabadi (a garment of flowered sheet without a lining, produced in the town of Zabad). We get references to fine painted (Munaqqash) or embroidered (Zarkār) garments. Kirpās (long cloth) Khaz (course kind of silk cloth), Debā (brcade) Atlas (satin), Qāqam (fine kind of ermin), Nasij (garments of fine silken texture), Qimāt-i-Hariri (very thin silken cloth). Among other cloths worth mentioning are Yaktā-i-Chambharatali (a kind of very thin cloth), Yakta-i-Parniān (kind of fine silken painted silk), Yaktā-i-Awadhi, Jāma-i-Deogiri, Yaktī-i-Narma Latifi (a kind of fine cloth of delicate texture), Jerma, Mauji (a fine piece of cloth), Yaktā-i-Bahraman (red coloured silken cloth), "*Behāri* or *Katān*-i-Bihar" (long cloth, and Rupīk-i-Bihari=towels of embroidered cloths with gold threads).

Amir Khusrau's observations in the book would have us believe that Alauddin's rule was neither wasteful nor oppressive but benevolent considerate and conducive to the good and the welfare of the people. "The royal characteristics", he writes on page 39 V.I. "are in accord with the canons of wisdom; his anger is like the essence of fire which is good for cooking but does not burn; his forgiveness is like the breeze which blows freely or uninterruptedly but raises not dust; his nature (disposition) is like water that is the source of pleasure but does not drown; and his generosity is like a mine of earth which yields the treasures of livelihood but does not carry it deep down (in the earth)".

But despite the strong rule and stern measures and sincere desire of

sapphires and corals. Upon the whole, all the workers or the artisans had made the saying "contentment is sovereignty" as the Friday oration of their pleasure, and had stamped the inscription of the text "the wage earner is Friend of God." On the coins of their honour; their lives become pure by the labours they put in to earn their wages and just like the lives of the abstemious ones they find pleasure in their works. (IV-172-174).

In the bazars there is so much over-crowding that people rub their chest against one another like their much-folded turbans. Some of them are so adept in the rules and principles of sales and purchases that they have every thing on the tip of their tongues. They higgle and haggle like the disputant religious divines or scholars. Goods and chatteles and all kinds of household furnitures are so cheap that four sets of bridal gifts can be arranged for ten Dirhams. The surging river of the slave-market (*Nakhkhās*) abounds in slave-girls so much so that a well equipped moon-faced slave girl with attendant porter can be had for embracing or ten Tankas or double the amount for 12 months (i.e.10 x 2 x 12=240 Tankas). The wearing apparels are exceedingly cheap. Long cotton cloth (Kirpas) was so fine and delicate that if a turban wearer wrapped his head with the turban of 100 yards his hair from under its fold would be visible from the side like the writing of the letters of the alphabet which come out from inside of the silken paper, and the price of *Khas* silk would wear the complainant's dress (*Jama-i-Kāghazin)* out of envy and spite against that *Kirpās*. A tray-full of such coarse (*Bikabi*) cloth could be purchased for two Dirhams. One can estimate the cost of other cloths on this line for a hundred types of turbans. The fruits which are eaten as food and those which are cooked and whatever is required for eating and cooking, and in fact, all other necessities of life such as the books for the students and the prayer carpets for the mystic saints, are well stocked in shops and in the market town and are cheaper and easily available (IV-173-74).

From the fragmentary information in the Risāil we learn that Ala-uddin's empire was stable and well governed as a result of which the general economic condition of the country was one of peace, plenty and prosperity. Agriculture, trade and industry flourished. Agriculture was the main profession of the people, specially in the rural areas. There are references to both internal and external trade, coastal sea-borne commerce, and movements of Caravans of merchants with their goods. There is little about means of communication and transport but some light is

such an extent and in such a way that he might not have to approach any one else.

In this letter which he terms a long one he prays that what was to be granted should be given without delay so that he might not have to write about it again directly or indirectly. Playing upon the words, sword and pen, he next exhorts the addressee to use his pen quite judiciously so that nothing written by it might be questioned. He further says that the addressee having in view the dictates of expendiency should issue proper written orders so that the conditions of the recipients might be straight-end like the stationary position of the fluent pen, and he would go to the utmost extent in favouring them with oral instructions, and if need be, he might resort to the use of sword also so that with the strength of the chief of the sword and of the pen the revenue of the territory of his jurisdiction might be obtained (regularly) from the hot headed (Saifi) subjects and the recipient might lead a secure and comfortable life like a sword resting in the scabbard. He should always utilise the gratitude of the low-placed people for the gifts granted to them and he might employ them against the mighty powerful ones. He concludes the letter by referring to the addressee as the planet Utārid (mercury) the light whereof emanated from the sun (i.e.king). In the end the writer offers his grateful thanks to "the luminous personality who was near Bihar and was like the sun in the east." He wished for him in his morning prayer a position of glory and elevation higher than what he was already enjoying (338-382).

Turning from matters, political and administrative, to those of economic interests, we first come upon a short passase from which we may have some idea of Amir Khusrau's estimate of the earnest and honest wage earners and of his appraisal of the cheapness and abundance of goods of various kinds in the markets. Relating to lawful occupations (Muhtarifa-i-Halāl Khwrā) he writes "some make the golden flowers blossom through the thorns of their needles; some dig out (split up) the the stones and bring out gold; some provide for themselves their lawful morsel by using the hair of the pigs in a way that not even a hair-brea of unlawfulness is involved in that morsel; and some by their labour at bricks and stones drop lustrous gems from the sweat of their brow, and accept two Dirhams as the wages thereof. Although those gems are valueless in the eyes of the common people, yet in the market of the judgment Day, they are as precious as the pearls hidden in the oysters, for every drop of the pearly sweats resembles an ornament studded with rubies,

Although the robe of justice that has been bestowed upon you by the just king provides sufficient coverings for the lapses in this world, yet the writer is fully confident that there is nothing but the garb of forgiveness which would be decidedly given to you from the treasure of one who hideth things with the veil of forgiveness and mercy. Oh! the one who is above all faults will make him wear the garb of mercy on the day when all persons will be devoid of all clothing" (II-303-306).

There is an interesting letter of recommendation of Amir Khusrau to a high official of the Government who was probably connected with the revenue Department and was vested with authority to grant land and gifts to men of learning and of genuine-piety. The addressee, Sharfuddaulah, was regarded as a great personality to whom the writer offered his countless salutations and described himself as one of his followers...."After expressing the desire to meet him, he begins to eulogize in highly flown language his spiritual chief" Maulana, the sea of excellences, Nizamul-Millat-Waddin, the wearer of the garland of the jewels of meaningful thoughts, whose pearly (scholarly) utterances and compositions, specially in the field of *Fiqh* had dessiminated knowledge far and wide, particularly, in Delhi, situated on the river of Jamuna, which had eclipsed the rivers Tigres of Baghdad and the Nile of Egypt. Many people had derived extensive benefits from the saintly scholar in theological learning. The writer introduces himself also as a man of learning largely because of his associations with him and says that despite his lofty position in learning and piety he had included him amongst his true followers and he had gained perfection in disposition through him.

Then he reverts to the addressee and comes to the main purport of the letter relating to the raiyat and villages. He expresses his hopes at the outset that the addressee would pay due attention to the expectations and aspirations of all classes of human beings (Insān Az Har Nau) and suggests that if any one wanted a town or village (Deh) to earn his lawful bread which was without any suspicion or taint of unlawfulness it should be granted to him and that such a person should be also granted protection by him so that he might remain immune from the oppression of the petty officials of the caliphate and might become free like animals and birds within the precincts of the sacred enclosure. He further says that if any one sought favour in the form of *Idrār* (regularly recurring grant in cash to the learned and the pious) it should be sanctioned to

already gone a long way, and everyone of the oppressed people has become helpless, being neither dead nor alive, under the darkness of their tyranny like the lamp of widowed women. If by your burning flame you illumine them through a little of the warmth of your tongue they would be at once extinguished by the cold breath. The tyrannical people have become so puffed up with pride and recklessness that if they see a lamp burning in the house of a widow, they try to put it out at once.

Praise be to God that the king has appointed such a man of profound learning as *Shahna* (representative) and made him in charge of the Department of canon law. He would let the stream of justice flow without any hindrance and to the fullest extent, and he would wash off the earth and make it clean of all contaminations of oppression. The hail-stricken victims of tyranny who were crying at the top of their voices for divine wrath against the tyrannical ones, who are so numerous, and for help and protection of those who were oppressed, would now remain under the protection of the department of justice without any fear of injury or onslaughts of the tyrannical ones". Verses : "Let not any oppressed person shed tears from his eyes like rains after this, and let not any tyrannical person have a bright smile on his face like lightening hereafter."

The story of tyranny and oppression of the strong-armed and long-handed ones is so long as to defy detailed description, and the scale of the sufferings of the oppressed ones is too heavy to be matched in terms of words on the scale of justice, verses : "The hearts of the creatures of God have been broken to pieces by excesses committed against them, in the same way as the glasses are split asunder by stones which fall upon them. Now that *the reins of justice which means the rope of God* have been placed in the hands of the most just one of the nobles (*Āadal-ul-Umara*), the oppressive hands of the powerful ones should be held fast and bound so as to make their strong clutches too feeble and useless to do any and to be incapable of holding anything in the unlawful grip harm and practising unauthorised severity. Verses : "When they scratch the hearts of God's creatures by their nails the blood trickles out from their nails".

The carpet of your threshold is much-too high for the tapestry advice that your humble well wisher offers but the carpet of the discourse has been spread only because of the long and old association with you, and it is hoped that you would not take it otherwise and will excuse it.

We may also consider the passages which throw some light on the prevalent condition of the judiciary which was far from satisfactory, and on the corruption and injustice which needed effective check and eradication in the following piece. This is a letter which is supposed to have been addressed by a subordinate official to a newly-appointed chief of the court of *Mazâlim*, called here *Dâd Begi*, really *Amir-i-Dâd*, who was above the Qâzi, "Your sincere servant, Hasan Naqib, who is one of your followers offers his felicitations to you and thanks-givings to God, the just, on your well-deserved appointment to the post of *Dâd Begi*, and hopes that you would always be mindful in administering justice in such a way that those who are oppressed might not have any complaint against you. Everybody knows that all that exists is liable to change except *Dâd* (justice) which will be the same even in the reverse order. Since it is so, you should always be very particular in doing justice. When the sense of justice takes firm root in your heart you would adorn the position of the chief of the court of complaints (*Sadrul-Mazâlim*), and for that reason you would not deviate from the path of the men of justice. From every side fissures of disturbances would be opened upon you and you would have to exercise your heavy responsibility and weighty integrity and shut all avenues of bribery and corruption so that those who stealthily cause mischiefs to creep in might not have an occasion for meddling. If the Qâzi opens the door you should set up a wall in your front and deliberately keep yourself aloof so that the foundation of goodness and virtue which would be strengthened afresh by your clean and pure disposition might not be affected by hollow and useless argumentation Since the Qâzis are generally hard-hearted (not amenable to reason), they would start from basis of hostilities. You know that those who build up magnificent gates through bribery would have to see them topple down in deep abyss. If one having known the door to Hell does not turn away from it, he is sure to fall in the lowest depth. And when they make recommendations which are not in accord with the canon law you should turn a deaf ear to them by reason of the light of integrity that is in you, and in telling truth you should be frank and bitter with your words which may be jarring to the ears so that anyone who is mischievous might not extend his scheme (get a long rope) and become firmly entrenched with it.

It may be made clear to you that the oppressions practised by the dark-hearted wealthy persons on the Darweshes of enlightened mind have

was a person who was not very unlike a certified advocate of the present time, though we have got no other evidence in support of this view Another thing which attracts one's notice is that the sun and not a watch or a clock helped the faithful to offer their prayers at the right time. The proverbial un-reliability of witnesses in the court and the pleader's persistent efforts to support a weak or a false case have also been referred to. We are told on page 203 Vol. IV, that the whereever the aforesaid Vakil went he made a great impression because his firy tongue which resembled the shooting stars, put the case he had taken up in the court of the Sadr named Badrul Millat Waddin or the office of the Qāzi with vehemence arguings orally and discussing the claims of different kinds, sorts, and colours, on the strength of case-precedents and complete or incomplete and even undated legal documents (Qabāla-i-Sharayee) of which his heart was full. He made use of whatever mischiefs he was capable of. It seems that he did not know that all complaints (Mudda-yiān) were liers. At any rate, all wisemen knew that it was the characteristic of the complainants to speak lies. The writer says that at first the extent of the knowledge possessed by Maulana Najmuddin was not clearly known to him and was not aware of the height attained by the sun of his learning. It was just like a cloudy day for him which sometimes misled one in ascertaining the prayer times. But when the cloud had been cleared of the wind of his pride, he was exposed and every body came to know the real truth about him that his knowledge was nothing but dregso. The writer tried to impress upon Maulana Badruddin that it was the demand of experiency and justice that the hollowness of the man should be exposed just like the heavy but empty turbans of the sermonisers, by using some appreciative words, so that having received such honour he might rub his proud forehead on the dust. When the man of bad nature was humbled and reduced to dust by such show of leniency and apparant kindness, the opportunity would come to rub his head on polluted earth which comes under the shoes. On no account, however, the aforesaid Maulana was inclined to listen to the suggestion. All the members of the Badr (Qāzi or Judge) were quite at one in the decision on the point that Najim should be brought down from his exalted position of knowledge by means of legal reasons (Hujaj-i-Sharai). They decided to accuse him of the knowledge of astronomy or astrology which is prohibited in matters religious and thus to disgrace him before the students. He must not be allowed to have the courage to impart lessons in a cool atmosphere on this subject.

comes before him. Howsoever much he is asked to have a favourable view of the complaints on the basis of Noamāni (Hanafi) interpretations he does not mind it. He does not accept as correct the judgement of the Qāzi on the subject and always runs after the Malik-Dinar (king of gold). By amassing money, piece by piece, he has become so rich as to consider Jāfar Dawāniqi (Abbasid Caliph) to be a pauper. He opens and rolls his shameless eyes at the time of arguments and wordy disputations, and makes unexplainable matters the basis of his preamble.

This well wishing writer accepts from his *Ādāb-ul-Maluk* (courtsey of the rulers, also the name of a book) but he talks of *Ādāb-ul-Qāzi*. He opens his tongue of satire and sarcasm and says "our Qāzi is a *Faqih* (a theologian lawyer) and is ignorant of the Qāzi's etiquete (adaptability), and therefore he should be taught *Adab* (punched). Every day a number of people demanding right and justice go to him with proper interpretation of religious law (Shara), but he ignores that and takes recourse to mischiefs (Shar). Sometimes he uses force, and sometimes takes recourse to deceit and falsehood. He proudly asserts "I am the *Wāli* (Governor) and the Qāzi has no authority (Walāyat) over me. I have acquired vast knowledge by burning midnight candle, and yet he calls me user of unlawful (hellish) things (i.e. bribe taker). It is unfortunate that the Qāzi with all the greatness of his turban is fated to exercise his judicial functions on this earth and to go to the doors of the tyrant.

The writer has put in a few things before the wisest of the earth in the hope that he would administer justice as Sadr-i-Jahān, would not tolerate such contemptuous attitude with regard to the religious law, and would place every thing before the most just king. First, the aggrieved Qāzi should be given what is justly due to him; then the distressed afflicted people, who have suffered and relied on the Government, should be rendered help because of his strong sense of justice. All this should be fully expiained before the king with the result that the tyrant would be removed from his place with ropes thrown round his neck and he would be carried and paraded like cattle and animals of chase. The rights over Hindus and Muslims which had been infringed upon or misused should be taken away from such people and he should be placed in the *Dārus-Siyāsat* (court of punishment) where blood would be made to flow from his jugular veins so that it may serve as a lesson to all the refractory people and no body would dare to misuse his power in such a manner (II-22—25).

There is an interesting piece which refers to one Maulana Najmuddin who is styled as a Vakil. Perhaps in the 13th century there

vise and investigate into the affairs of the colleges and mosques, congregational assemblies and nuptial ceremony, and every thing appertaining to the administration of justice in such way as not to deviate in the least from the path of Shariat which leads to the meadow of rectitude instead of to the quadrangle of sins. Learned scholars, Saiyids, Shaikhs, Chiefs and nobles, all people, big and small, have to obey the orders of Sadr-i-Jahān Ziaul-Haq-Waddin Abdur Rahman, the sun of learning and administration. He would be the resort of all the oppressed people and decide and settle disputes, simplify and amplify all matters concerning the administration of Justce (II-11-17)

Next to the king, who was the highest court of appeal, there was the chief justice of the empire at Delhi called *Sudr-i-Jahān* who selected and supervised the Qāzis and Sadrs of different parts. Besides his other duties of multifarious nature the Sadr-i-Jahān presided over a special class of criminal court called *Diwān-ul-Mazālim* (court of complaint) which heard the cases against the highest functionaries of the state. Such a court had existed in Baghdad and Cordova, Egypt and Persia, and one can presume its existence even in India of the Sultanate period, though there is no evidence of it. In this connection a letter dated 30th Rabi I, 709, supposed to have been written by "Bahār Suqi", the "*Hakim* of the Khitta of Nagore" to "Sadr-i-Jahān (Ziaul-Haqu Waddin Abdur Rahman bin Usmān) says, among other things, the following. "Some oppressed people who had suffered from the tyranny of the unjust people of the empire have put in an application of complaint in *Diwan-ul-Mazālim*, presided over by "the resplendant light of the faith, ventilating their grievances and explaining the oppressions practised upon them. The un-Islamic (irreligious) *Wāli* (Governor) of this region whom they miscall Malik-Islam;—May God stop his mischiefs in the realm of Islami has extended his hands of ruin and desolation to this populous region. Having misappropriated large amount of money and made it frozen he says that the close fisted (stingy) person is worth lakhs, but we say that the fist is not worth even a *Dāng* (Damri) when it is clinched. He has appointed his stony-hearted agents to serve as magnet for drawing the wealth of the people towards their sides and he draws to himself whatever and wherever particles of gold and silver are found, though he knows that the things belong to others, yet he manages to misappropriate them to himself. He finds so many people at his door to place their complaints a. their grievances but he never tries to remove or redress them. He is not afraid of death. With strange narrow mindedness he overlooks whatever

says that the essential and most approved of the things in a Qāzi are that he has certain knowledge of the rights of the people; discriminates between lawful wealth and that gained illegally; has the closest view or experience of the conditions of the people, high and low; looks into the grievances of the oppressed ones, and gives support and protection to the ruled against the tyranny of the ruler. He has to observe the judicial impartiality and mete out equal treatment to the rich and poor. If there is a callaboration between false witnesses and monied or influential men like the letters of the word *'Sīm'* he should try to sift the matters and separate the truth from false hood like the letters of *Zar*, and if he should find the smallest amount of money to be due from the defendant, he would have to compel him to hand it over to the complainant. He should appoint such agents or representatives (*Wukala*) to the tribunals of the dominion as are not afraid of the orders of Government, and they should not be such as to make things difficult which are easy and simple. He should support and strengthen the position of his substitutes or deputies (*Nuwwāb*) in the courts of the capital (Hazrat) cities, (Madāian), country-side (Khitat), and small town (Qasabāat) in carrying out the provisions of law and orders of the judicial departments. They should instruct and emphatically enjoin upon them not to allow deceit and fraud of the satanic people to interfere with the administrative affairs and blacken the faces of the pages of papers by issuing false decrees. They should not summarily deal with such matters and give such orders as may clearly distinguish truth from falsehood. They should realise that the *Tankas* (Money) gained by bribery will make their existence feeble and futile like the spider's web, and they should have no concern with those the doors of whose houses appear to be white with their transient wealth. They should remain content with their own lawful acquisitions and adhere strictly to all the rules of the faith and of justice so that they might have a place among the Qāzis in paradise and not those in hell......The foundations of college (*Madāris*) should be decorated with gems of knowledge and not with mere stone walls, and such students should be admitted in those free institutions as are heartily and passionately fond of learning, quite unlike those on whose minds lectures and lessons fall flat. Such preachers should be allowed opportunities to deliver sermons as are capable of reciting and repeating the things of the eternal or preserved tablate (*Lawh-i-Mahfuz*) and not those who know nothing about it. Such trustees should be put in charge of the endowed property as are thoroughly acquainted with, and abide by, the conditions of justice and integrity. The Qāzi should super-

hooks why should the washermen shout 'Si Si' at the demand of half of that. They said that they had forsaken the river side for a long time and there was little to be obtained therefrom. The people had no *Dāng* in their purse for having their clothes to be washed with soaps at the bathing place on the river side. Where they used to wash their *Katān*, linen clothes, lots of fine species of linen were lying heaped up like leather straps uncared for and discarded; and where there was at first fine silvery water, nothing was found but froth and foam. Where they used to wash the winding turbans and fine cotton clothes resembling serpents in coils, there was nothing but green scum on the surface of the stagnant pool and outer-skin of snakes. When I saw that they wore clothes of others and practised deceit and deception in respect of their garbs I moved among them incognito (in every kind of dress) and what had been kept in my heart was brought out to mete out ignominious treatment to them and expose them. They began to tremble like the Kitān (which is said to be rent by exposure to moon-light) clothes and at last admitted that they used the habits of others. I washed the washermen who wash the clothes of every body with the help of the (disguising) clothes that I wore. In brief, I put all those occupational groups who were like worms of water to the greatest strain so as to fulfil the impossible task of taking out the oil from sands and fish oil from water and sands. In short, so much wealth accrued from the treasures of the river that the income which the whole of the public ferry yielded in two years was obtained before the close of one month. *Malikul Bahr* (Mir Bahr or the collector of port duty) sent the report of all this affair to him who adorned the cushion of justice. The king sent for me and favoured me with ten desc-like trays of the current coins along with the award of a village of fertile land in the Doab by way of my wages. I had been languishing beyond measure because I was without work and worth; but the great provider of daily subsistence made the Sultan favourable towards me. May God keep Qāzi Jāfar always in the path of canon law, for he has been responsible for providing me with bread and water (II-101-113).

An essential obligation of the ruler—God's agent on earth—was protection of God's creatures through strict administration of justice. He and those to whom he delegated his judicial powers did what was just and right in the sight of God. In a *Misāl* or letter of appointment of the chief judge of Delhi Alauddin is supposed to have specified some essential deeds and the extent of his jurisdiction, defined his duties and functions, and enjoined upon all to recognise him and comply with his orders. It

conversant with, such affairs. He also opened his lips in admiration. At first he praised the works, ability and capacity of Khizr and afterwards made some encouraging observations about me, Ilyās, his old protege. He said that although Khizr was a man of auspicious nature for wherever he went things flourished and there was abundant growth of vegitation and enough of irrigational facilities, yet his brother, Ilyās, had also been always a river agent (*Ghumashta-i-Bahr*) and he had much practical knowledge of the matter and for many years he had remained engrossed in such activities. If the king of the world, the Lord of the land and sea, deputed him to look after the river passages and ferries of Jamuna and the Ganges he would perform this work efficiently. The king sent for me, Ilyās, and made me deputy manager of the fleet of the river boats (*Nayabat-i-Bahr-i-Begi*).

Being so favoured by the court I became busily engaged in the execution of the work associated with the water passages and the crossing of rivers. The boats which had all been assembled in one river were despatched elsewhere to be plied in different rivers and the excessive latitude which had been enjoyed by the boatmen was ended and they were properly controlled. Though there were some complications, they were got over, and the refractory boatmen were suspended and their work was entrusted to others. I made each of them responsible for his work by catching hold of his jugular veins. The fishermen who gathered many Dirhams by catching and selling fishes and exacted money even for the skin of the fishes gave with great difficulty, after making many excuses, out of their entire capital earning, only that much which amounted to the income of two months and kept the balance earned during the 12 months to themselves in their own store (i.e. they gave only two twelve of their earning to the state). So long as there was no one to look after the realization of the water tax, they continued to catch fishes in the rivers and sold them for themselves. They were a set of strange crocodiles who drank away the whole river and made it dry and their own the preserve. They would have wished me, Ilyās, to have come out of the river thirsty, but I was myself very cautious, and I took them unawares and overwhelmed them by throwing them in whirlpool.

After disposing of the affairs of the fish-catchers I turned towards the washermen and found that every one of them amassed 100 Dirhams every week and yet complained shouting, "Si, Si", I asked them when the fish catchers paid some thing more than 60 by applying their fishing

had nourished the life of the soldiers became stale. The roads became more safe and straight like the straight lines on the top of the head of the women where hair is parted (Māng). The veils of chastity were widely worn by virtuous ladies The districts became free from anxieties like children contented in the lap of their affectionate mothers. Robbers fled away from the shadow of wealth as shadow flees from behind the sun. The gigantic elephants have not the courage to tread haughtily in the path of the little ants and the mouth-tied lions have not the spirit to laugh at the unsteady frolic of the lame deer. Night and day he (Sultan) has no other work than to provide comforts to the children of Adam (I-20-22).

In view of the extremely rare or meagre data about the methods employed in the 13th century to improve the productive quality of land by providing irrigational facilities and about the sources of revenue other than the usual ones, the followfng description, though fictitious, despite the date given, 1 Jamadi 1,712, is not devoid of significance for a student of history. It tells us about the digging of wells, tanks, reservoirs, streams, and use of water wheels and the designation of persons employed to look after such works and to collect duties on river side from fisherman and washermen. The state share of fisheries is said to have amounted to 1/6th of the earning of the fish-catchers and the washermen were made to pay half of that, i. e. 1/12th. One, Ilyās, the *Ābdār* (keeper of water) says "I have been busy these days in digging the earth and excavating reservoir, from where water flows like silver, and in every place, and on every roads, and near every mausolium,.wells and ponds have been made for the use of travellers. My brother, Khizr, had been honoured as Malik *Sharabdar* and was orderd to take the works of constructing gardens, and running streams in lands which had become denuded of water on account of natural calamities so that people might make use of them and enable others to derive enjoyment from their verdure, shade and produce, and also that every day heaps of fruits and flowers might be sent to the elevated court. The king has also bestowed special favours on him and has appointed him to look after and supervise the works of the gardeners and well-keepers so that the works of digging of wells and streams and utilising the wheels for drawing water (*Dulab*) might be managed efficiently and every seeker would have a cup of water very easily". It is good that a brief account of this irrigational work has been sent to the royal court and has evoked the pleasure and appreciation of Alexander II. It so happens that one day some hints of this state of things was dropped to Qāzi Jūfar who is himself well versed in and fully

"In matters relating to diffusion of justice and welfare of the subjects, he has, by his illuminated intellect, formulated rules and ordinances the like of which could not be reflected in the mirror of Alexander's imagination, and could not be seen in the cup of Jamshed. To ensure the cheapness of foodgrains which are the leaven of life's sustenance he had, by his own balanced judgement, devised a kind of scale of regulations (i. e. fixed standard of measurement and price rates) because of which, if for years the clouds wandering round the sun do not pour the sweats of their brow (it does not rain), the hot tempered wind does not wave or move its fan, the red-faced soil does not grow any green verdure, and the fire-kindling sun fails to ripen the crops, even then the common multitude would still get ready (fresh) food from special royal granery (i. e. he had laid down the rules that a certain proportion of the yield of the crop should be kept in reserve stocks for the emergent situation). As regards the other essentials of life of the common people, even if they be the red sulpher or white ruby they were made both cheaper and more easily and abundantly available than the yellow amber and insignificant berries. Moreover, wealth which is the elixir of desires (Ultimate objective) and the treasure-house of cherished aspirations, has been gathered out of the elephant-loads of gifts and the abundant charities, and there is no difficulty felt by any body in making purchases. As a result of this convenience and comfort and prosperity have become quite visible in the country. The poor people are living happy life as sparrows which get their share of grains from every garden" (I-19-20).

This is followed by a short account concerning "sovereignty, safety and security." The Divine Ordination wrote the mandate, "I have made you my vicegerent on earth" and decreed that "you should be the ruler and adjuster of affairs, and I selected you to administer justice", and according to another Quranic expression "Verily God gives you order to govern with justice and benevolence" the good fortune, felicity and prosperity of the subjects made them exceedingly happy and contented with his administration of justice. On account of their excessive joy they kept nocturnal vigils. Owing to general peace and security that prevailed all the weapons of war were lying idle. The skilled archers washed their hands off their arrows and the overzealous warriors of the faith have closed the aqueducts to the flow of blood from their daggers. The swords of the faithful which were cleaner than the hearts of the orthodox Sunnis have become rusted like the rusted iron hearts of the Hindus. The sweet provision of the Turks (Tatar Chai-Turkana—a kind of sweet-meat) which

erected up to the sky. Those cities which had been levelled down by the assaults of the Mongols and which had been deprived of securty and comfort and had become completely bereft of elegance and gaiety became so populated again through the helping hand of the caliph of many borders that if they raised and pointed their fingers towards any place they would not but find mansions, galleries or balconies. (I-14-17).

Relating to 'peace and victory' he writes further "Lo and behold the spreading of the carpet of peace and security over the whole dominion. From the fort of Delhi to the courtyard (area) of Khorasan a carpet of ruby-coloured satin has been laid with the blood of the red-faced Chinese and, consequently, all tumults have subsided, mischiefs and disturbances have ended, and the mischief-mongers have been made to roll down. In that direction the mountain-like armies of Chinghese have been driven beyond the oxus river by the stormy wind of His Majesty's dread, and, on this side, the powerful Rāis of India who, with their thousand elephants used to trample down the ranks of the Turks have not only been forced to surrender thier elephants and wealth, but some of them who had still held their heads high have been crushed in such a way as to throw thier heads like oil cans under the elephant's feet. And with the oil of those cans the stiffness and roughness of the elephant's feet has been removed by being greazed. Some who had laid thier heads low before the columns of the state threshold received the privilege of being favoured and trained for riding on the elephants (I-18-19)

We next come upon a very important observation indicative of food and tariff policy of the Sultan. Emphais has been laid in it on three things of which the food grain was the first. The Sultan devised a plan to lay by every year the produce of the land in the royal stores as a safe-guard against the occurrence of famine and drought. Secondly, he made rules by which essential goods and even costly commodities were made easily and abundantly available at cheaper rates to the people. By his planned regulation consumer's goods were controlled. Thirdly, he managed to keep the exchequer filled up by getting money from the different sources of income, including charities and voluntary gifts. The necessary consequence of all this was that every one in the state was in a position to a confortable life. The short relevant extract which may be compared with the detailed description of such measures as have been given by the historian, Barni, opens with the heading "Care taking of the common people"

their treasure gradually and little by little, sometimes to ward off the evils and calamities from them, and sometimes to gain glory by following the dictum of the Quran "give Zakāt" in order to protect their planets of existence from the burning onsloughts of the Divine warning." Their foreheads and sides will be branded by them (gold and silver). If the wicked saturny people (high way-men) have an eye on their annually earned wealth and want to snatch it away from their powerful hands they are put in chains by our pleiades-studded swords. As regards the poor people and way-farers of different directions who travel a long distance on their foot and injure their feet in the hope of getting my favours, I help them sufficiently from the treasure of my munificence so that the palm of their hands may acquire a red hue by holding the jewels in their hands (IV-115)

This is followed by similar observations regarding the grants of favours and encouragements to saintly and pious personages, teachers of deep and sound scholarship, and students who dissolved the marrow of their brains and the tallow of their pupils, and in enkindling the lamp of learning, burn out the candle of their lives (IV-116-117).

Amir Khusrau has given his own estimate of the achievments of Alauddin Khalji under various headings. After bestowing many grandiloquent titles on "Alauddunia Waddin Sultan Muhammad" such as "the sun of caliphs and the Sultans", "the shadow of God on the two worlds", "the defender of the community of Muhammad", the commander of the faithful etc. and praising his "black parazol", he writes about the chastisement of the Mongols. The clipped-headed ones who every year brought the chains from Tamar Qiq to take away captives from India were themselves either cut down by the sword or were sent in chains to the hell. Some escaped the sword by being enchained and their lives were spared. Although continuous enchaintment meant their virtual liberation, some dare devils being puffed up with their power and strength, broke their chains and raised uproar and disturbances. The command was issued that some of the Tamans (who commanded ten thousand) be thrown from the battlements of the fort down into the river and drowned, and the rains of blood were made to pour on the ground from the necks of the other Tamans, and their berry-coloured bodies were buried in the earth so that from these seeds red-hued men and Tatari sweet basils may sprout up. Afterwards, out of the heads of those dogs of Mars towers were built up. In other distant parts of the kingdom similar towers were

Next, Amir Khusrau makes the Sultan express his attitude towards the general public and some special classes of people "I fasten tight the five fingers of the ever-mighty people, who twist the necks of the subjects with the thin-most (nicest) hair of justice so that the bad blood which has accumulated and is running in their veins by eating the blood and flesh of the oppressed people should ooze out of the tips of their nails. (IV-112) I have deputed ardent and zealous informants and agents and sympathetic scouts and spies to enlighten me about the afflictions and misfortunes of those destitute and unprovided people in whose dark cells there is neither fire in the day nor lamp of light in the night so that I may issue parwana (command) for burning the flame of (infusing) hopes in their hearts by firecoloured gold and extinguish the fire of their stomach with the water of favours. The iron hands of the industrious artisans and professional workers are key to the doors of their livelihood. My thoughts are always rivetted on opening them in order to seize the first opportunity to get access to them. Every drop of sweat that falls from their brow becomes a pearl for the saying "one who earns is a friend of God" (is the inscripition on the Dirham earned by the sweats of their brow). Gathering a few pieces of coppers around them they turn them out with the help of those silvery Dirhams (sweats) into wonder-drug (Kimia) of livelihood in the from of golden breads and bronze cakes (girda) and they place these in their clay plates and wooden bowls. I send sympathetic chiefs towards them so that if the fixed tax or duty levied upon them comes up to one Dirham annually it should be made light and collected as lightly as the petals of flowers. The hopeful cultivators dig the earth and saturate it with the drops of their sweats rather than those of the rains and sow pearls on the ground with every drop from their brow. They come out in the form of fruits and produces. As in the sowing ground (corn fields) of the world the reeping of the corns is better than other good deeds, so in estimating the share of the state for the official granary (Khirmān-i-Takhsis) I make the wooden beam of the pair of scale from *Alif* Ins'af (justice) and *Nun* of the sides (palla) of the weighing balance serves the purpose of my equity, and I take the legal share from the place of the cultivated produce and fill it up in the store house of the judgment day so that it may serve as my provision in the future world (IV-114-115).

Each one of the world-roving merchants whose desires are laid bare of their coverings by the heat of the sun, plies his trade from the first to last of the month so that the empty purse may be filled up in due course by the help of their skilful hands. They use whatever they collect for

ing none of my victorious army must tread and trample the cultivated fields of the village peasants with the hoofs of the horses nor must any of the grass suppliers take even a blade of grass and straw from the thatched roof of any villager (II-7).

For the 'Ashāb-i-Zimma' (protected non-Muslims) who have tied their necks of submission with the strong string of the religious law and have entrusted themselves to our charge and care I have stretched very far (given full lattitude) the strings of the subsistance (regarding avenues of earnning their livelihood) in such a way that they should not be involved in agonies by entering into competition (Kashā Kash) with their rivals (Munāziān) (IV-112).

If the rigidity of their views, indicative of the sense of the text "We follow the path if our fore-father's", is so deeply imprinted on their souls and serves as an amulet in the veins of their neck and can in no way be removed from their crooked nature, but they are prepared to bear the burden of responsibilities on their shoulders (i.e. if they pefer to be Zimmis to the abjuration of their ancestral faith) you should allow them to enter the circle of (guarantee) their safety and security. They must be submissive and should not show any sign of hostility and antagonism. (They know) that if they do not do so they will severely be dealt with by the sword and thoroughly punished....The aforesaid group of people know that their welfare lies in abstaining form all kinds of mischiefs and shunning all such acts as may tend to mischiefs and disturbances. They should be like those virtuous people who, what to speak of committing sin, even avoid all occasions of association with the sinners. At the time of the demand of Khirāj and Jizya (tribute and poll-tax) they should show such aubmissiveness that if they demand the water of their eyes they are prepared to part with the greeze of their pupils, and they are readily responsive to the system to such an extent that if their big men (leaders) be ordered to get into the rat's hole they would run towards it and creep into it (IV-139-140). This is followed by the advice given to Prince Farid to give complete protection and safety from the sword to the people of south when they surrendered the reins of their loyalty and submission to his hand. The views expressed here and by Barni in his history though reflecting the attitude of the contemporary Muslim Divines can hardly be said to be in complete conformity with the Quranic injunctions, for any thing taken or done in excess of that which is laid down is forbidden.

and given him superiority due to his own inherent qualities and not because of accident or freak of fortune; and enabled him to attain a kingdom for which others after him might not be as worthy or deserving".... When my dignified personality attained this sublime rank or station, the fortune of forethought made me sit, knee to knee, with others in the way of counsel and consultations so as to see what real picture of happy issues regarding regulation of the affairs of the world and amassing of treasures for the store house of the future world becomes clearly visible by placing two mirrors face to face (for thoroughly understanding of one another).. Then it became quite apparent to me that whosoever occupies the throne, it becomes incumbent upon him to irrigate the garden of sovereignty with the water of the stream of religion; to draw all around the dominion a circle so that the demons and devils of evils and mischiefs may not have access within the ring of Solomon and their shadow does not fall on human beings or genii involving them in calamities and dangers; to spread the sheet of the parasol of God's shadow so far and wide as to bring all those who are stricken with the sun of misfortune under Divine shade; to enforce his command in such a way as to put iron (strong) reins in the mouth of the oppressive man-eaters so that the nerves and limbs of the common man may be saved from their tearing rending teeth, just as the saying is "if there be no Sultan the people will devour one another"; to spread the carpet of justice over the whole of his large kingdom in such a way as to make all the mischief makers go to sleep for ever leading to the cessasion of all uproars and tumults; and to level down the steepy pointed hills, murderous glens and passes and thorny brambles and bushes for the march of the huge army in such a way that all the ups and downs in the expansive kingdom are put right and made easy and comfortable, and the face of the earth becomes plain and free from all mean minded, refractory and undesirable persons (IV-104-107).

Here are some extracts regrading the protected non-Muslim subjects "As regards those who have come under my care and protection (Zimma), I reagard each and every direction of the holy book which says "verily God commands you to be fair and just and benevolent taowrds those who come under your protection to be the best and the most advisable for the faith and the state, and I follow scrupulously every letter of the Divine ordinance "Be loyal to the behest of Allah and be kind to the creatures of God", and I consider this as the preamble of the book of government and administration. My definite order is that while march-

popular tradition that "Had there been no Sultan some people would have devoured others", meaning thereby that there would be fight and faction and no peace in the absence of a binding force among the people in the shape of a strong ruler. He attributes the way and methods of consultations and deliberation (Tariq-i-Mushāwarat) to the contemporary Sultan and tells us about the rights, duties and responsibilities of the ruler. There are some striking features. There is nothing to show that Alauddin or others thought that religion had nothing to do with politics. Emphasis is laid on carrying out the behest of God in regard to different classes of people—hard working peasants and artisans, merchants and wayfarers, scholars, teachers, students, pious and saintly personages etc. and above all the "Ashāb-o-Zimma" or non-Muslim protected subjects. The reference to matters concerning the livelihood (Maīs shat) of the Zimmis and assurance of protection against open competition with their rivals is worth noticing. But elsewhere (IV-140) what he writes to his son about the Zimmis recalls to our mind the relevant dialogue between Qāzi Mughis and Alauddin. Another thing which attracts our notice, in view of the age in which the book was compiled, is that the Sultan placed himself before the public for testing and examining him regarding the government and administration. "Tā Jāyeza Ulul-Amr-i-Minkum Az Farmān-i-Man Hadiya-i-Lauh-i-Paishāni-i-Tābian-i-omur-i-Mulk-Dāri Gardad" (so that the examination of my claim to be the person meant by the expression "those who are in authority amongst you" may be found writ large on the forehead of the subjects of the State (IV-102). He had to abide by the law of God. But there is no reference anywhere through out the book as to what would or should happen in case he failed to do so. Allowing the need for some discreet concealment on the one hand and exaggerated laudation on the other, it is probable that Amir Khusrau had his own misgivings about the ways of the reigning kings. Among the counsels to one of his sons he says "one should not rely on the caressing (favours) of the kings for they are like the sun which gives lustre and takes it away——Beware ! verily, a man of sound sense does not rely on water and fire and on one who commands" (i. e. the king) (IV-265).

The relevant extracts from a supposed Farman of Alauddin are as follows:— "Praise be to God who has given this elevated position to the states for the exaltation of the faith of Muhammad; has made it a special privilege of the Sultan to rule over the lasting kingdom, and has made him occupy the well-laid seat of honour of the canon law which is valid for ever; has distinguished him with the special eminence and excellency

among themselves). There is no conception of kingship or autocracy or any acquisition of Divine sanction in the Islamic scriptures, and Islam does not recognise any sacerdotal or ordained hereditory priesthood, any ecclesiastics or theologian who was appointed by a divine or superior authority and whose interpretation of the canon law was infallible. Any body who is well-versed in the Quran and Hadis can interpret the Divine ordinances as laid therein and assist the ruler in enforcing them. Neither the ruler is a Devaputra nor those who perform the priestly functions are different from ordinary human beings. It is not fair to suspect a theocracy in Islamic sovereignty because there is no direct intervention of God in the affairs of the Government and society and the Shariat and Zawâbit law are not quite like those of the ancient jewish community. Obedience to the Amir or head of the state is mandatory, but a safeguard against autocracy has been provided for by the necessity of consulting in the transaction of all political business. Obedience to God and to Prophet is incumbent on the rulers as on any man. Those rulers who do not obey God and the prophet will forfeit the right of being obeyed. Though all ultimate authority rests in God and not in the people, His agent upon earth is not utterly irresponsible for, while acting according to His revealed will, he has to consult "men of the sword" and the "men of the pen" who are the chosen of the community, and he is never authorised to set aside or go beyond the injunctions of the Shariat law and ignore certain established usages and conventions. Explaining the Quranic words "if ye differ in any thing among yourselves refer it to God and His Apostle, if ye do believe in God and the Last Day", a modern translator and commentator says "where, in actual fact, there is sharp division between law and morality, between secular and religious matters, Islam still expects secular authority to be exercised in righteousness and on that condition enjoins obedience to such authority. Righteousness as an essential principle or qualification of a ruler has been stressed in the Quranic command". "To do virtuous deeds and to refrain from forbidden acts". (Yusuf Ali's translation of the Quran).

Amir Khusrau quotes the Quranic verse "obey God, obey the Apostle, and those who are in authority from amongst you. "He is conscious of the change that had come with the changing times. It was the historical reality in his time and country that the centre of authority holding actual power in the state was the majestic personality of the Sultan rather than of the caliph of theoritical speculation. He realised the need of a strong and effective ruler and quoted more than once the

POLITICAL AND ECONOMIC FRAGMENTS FROM RISĀIL-UL-IJAZ OF AMIR KHUSRAU

In a paper read at the Ranchi Session of the Indian History Congress an attempt was made to glean from Amir Khusrau's Risāil-ul Ijāz some matters of political and historical interest. There is, however, much in this voluminous prose work of the 13th century versatile writer about his thoughts and feelings, views and impressions of the pervading atmosphere which is well worth the attention of those who are interested in the political and administrative history and want to know something about economic aspects and social behaviour of the people of that distant age. Literary glimpses of life and conditions, political, social, economic and religious have got their limitations, and this is especially the case not only with the factual inadequacy and narrow political approach but also because of the luxuriant verbiage, verbal nicities, and pompous complicated phraseology of Amir Khusrau's style. They can not serve as a safe basis for historical deductions, but we may take them as reflecting the spirit of the age, and at any rate, the way of thinking of one who was himself a writer of historical Masanavis and a notable historical personality.

We may begin with what Amir Khusrau says and puts forward on behalf of the greatest of the Khalji Sultans about the principles of State, policy or methods of government, and his claims and achievements to ensure peace, justice and prosperity in his widely-flung realm. It would be interesting, however, to know how far what Amir Khusrau writes about the system of state-craft was in accord with the political thoughts of orthodox Islam of the medieval age. According to the ideal envisaged by Islam real sovereingnty belongs to God from whom all authority flows to man who is the vicegerant (Khalifa) of God on earth, and is capable of executing the will or command of God in the form of Divine or canon law called Shara. Islam requires that the ruler should be just and merciful, the ruled should obey, and there should be counsel and consultation between the two for there is the principle enunciated in the revealed dictum "Amrahum Shura Baynahum" (Their business is to consult

Wa Saktah Az Ahano-Sang" (It was a realm and not a mere fortress, and was full of manly valiant people. It was sky high and built in the air and was made out of iron and stone) In Chunin Qila-i-Mahmud Jahandar Giraft Ba dilairi was Shujaat Na Ba makr-O-Nairang. (Such a fort was captured by Mahmud, the world-possesser, because of his intrepidity and valour and not through subterfuge or unfair manoeuvring) "Girda-i Yu Baisha-O Koh-i-Kishan O Sabz Chunaok-Guzare Bad O Rah-i Mar Daro Na Khush-o-Tang (Round the fort was dense forest and chain of hill like mounds full of green vegetation. The density was so great that neither the gust of wind nor even a snake could creep through it). We need not consider here the problem or theories of the origin and derivation of the name of this ancient locality.

for some notice. Cloves could be had from the south and east and taken to the west; but saffron, if grown, as now, only in Kashmir, could have been taken from the north west to the eastern regions and not vice versa. If Cambodia, Indo-China and the islands of the Indian archipilego had saffron producing tracts there was the possibility of saffron being brought to Bihar from there and conveyed thence to Agra.

Should we take the whole thing as a figment of the author's imagination ? But this can not be said about the reference to Agra which is said to have owed its importance, if not its existence, to Sikandar Lodi of the 15th century. The earliest Persian chronicles of the 13th and 14th centuries are completely silent about it, but it was already a place of considerable importance and had a great fortress in the time of the Ghaznawads of Multan, Lahor and Jalandhar.

Note :—The earliest reference to Agra in Persian literature is found in the Diwan of Masud Saad Salman (D. 515-1121), a courtier and panegyrist of Prince Saifuddaula Mahmud, a great grand-son of his celebrated name-sake, Mahmud of Ghazna. He obtained the Indian viceroyalty from his father, Sultan Ibrahim bin Masud (1058—1099 A. D), in 469 = 1079. His *Qasidas* contain some new information of historical value We are told that soon after his appointment he marched at the head of 40 thousand troops from Ghazni and embarked on a career of conquests in Hindustan. King Jaipal's strong fort of Agra which had never felt the weight of Muslim arms and was described as "Doshiza" (virgin) was undated.

Jaipal described as "Amir-i-Agra" had a frightful dream and offered to surrender and pay a huge amount of 'Tankas', but he was not spared and the fort was taken after two day's stiff resistance on Nauroz day (New years' day). There is an interesting line in one of the Qasidas which shows that the Lahor-born poet was familiar with the Indian or the Hindavi tongue "Cho Raad az Abr Bagharrid Kos-i-Mahmudi-Baramad Az Pasay Diwar-i-Hisn *Mara Maar*" (p. 265) i. e The drum of Mahmud roared like thunder from the cloud and from behind the walls of the fort the cry arose 'Mara Maar'. Some of the verses give an idea of the region and the site of the fort 'Mah-i-Nauroz Digar Bar Ba ma Roo-way Namud-Qila-i-Agra Daravurd Malik Zada Ba chang" (The Nauroz festivity has again shown itself to us,—the fort of Agra has been captured by the king's son). "Qishwar-i-Bud Na Qila Hama Pur Mard-i-Dilair—Bar Hawa Bar Shuda

addressee, worthy of respect attention, would make the impossible possible so as to lead to the recovery of the lost money, and no amount of pretext would stand in the way. A small sum of a few *Tankas* is being sent to meet the expenses of the road-watching officials (Shaghl-i-Rasad). Although the attainment of the object appears at present to be doubtful, there are hundreds of people, in the headquarter of the addressee, who can advance some money. At the expiry of the current year, and within one month after, that a small sum in instalments having been collected might be deposited in the *Baitulmal* (State Treasury) For the humble slave, Hasan, this amount may be taken as a loan of magnanimity (*Qarz-i-Hasana* i. e. lent without interest and repaid at the pleasure of the borrower) and the whole matter may be treated in such a way that there is no noise or publicity about it (II-318-23)

References to trade by land and sea, some imports and exports, are not wanting, but there is no clear information about the organisation of commerce and means and modes of locomotion and transport. We are told about a class of wandering merchants who travelled in Caravans, for the sake of safety, conveying their merchandise from one place to another. But they could not escape the onslaughts of robbers and high-way men who infested the roads and routes and waited in ambush to pounce upon the Caravans at opportune moments. A Caravan of Tambulis, carrying loads of betel leaves, was proceeding from Gujrat towards Delhi. To escape from the obligation of paying the usual tax or duty (Baj) on their goods, they had changed their routes and were passing through a thick jungle. When they had reached a place which had two old and deserted wells they were suddenly waylaid by a band of *Rawat* horsemen of *Jalor* who killed and wounded all those who resisted the plunder of their goods (II-249-50)

No less interesting is the case of a Caravan which was proceeding from Bihar towards Agra, and was carrying cloves and saffron leaves (Qaranful Wa Shakh-i-Zafran), in their bags. When they had passed through the mango orchards of Ambi and had come near the forest of Chandrnath (which was infested by robbers), the aroma of the precious commodities had spread and saturated the atmosphere. Getting the scent the robbers quickly, rushed to the place like cold boisterous winds of autumn and stripped them off everything leaving them like the withered trees of the autumn season (I-156). Two things in this small piece call

gold flowed they might go to China and Cathay and blacken those regions by their nefarious deeds. They pretended to be on terms of friendship with the people, big and small, but ruined the foundation of their prosperity. Resembling them was a Hindu named Khanna Abegi who dealt in chips and rubbish and allowed himself to be led wherever they wanted to push up their business. They sold lettuces at the rate of cloves, and the people with wide open eye were so blind as to fall into the pit (pit of perfidy). When they entered the city they encamped near the mint place (Darul-Zarb) The writer exchanged greetings with them not yet knowing that they had perfidious hearts. They poured silver like water and overwhelmed their new acquaintances with favours They were more critical judge of men than the writer, for looking slyly at his face theealised that they could exploit him to their advantage. One day they represented that they had some jewels in their possession which they were afraid to bring out lest they might be robbed of them. They said that they were in need of one thousand Tankas, which they would invest in business, and when their business prospered they would return the whole amount. Falling a prey to their deception he gave them all that he had accumulated by undergoing many pains and facing many difficulties. The sharp (Arabic speaking) tongued people posed that they had taken the money on credit and they promised to return the same after a month. But even after the expiry of 6 months they failed to discharge the debts.

If an appeal is made or recourse had to the religious tribunal (Diwan-i-Shara) they would negotiate and fill the ears of the *Qazi* with the jingling sounds of gold *Tankas* so as to prevent him from hearing the evidential words, and they would so seal the mouth of *Amir-i-Dad* with *Adali* coins as to make him unable to speak out the truth. In power and resources they are like hills and our words with them are like winds (having no weight with them). But for the support of a *Farman* from a powerful authority which can make the mines yield jewels hidden in stones, it was not possible to bring out the (misappropriated) money from them. As in all matters pertaining to the broken-hearted weak ones, nothing can be done by way of allaying and soothing them without the help of the big and strong ones, it is earnestly requested that the cause of tyranny may be treated with firm authority so that whatever was the stock of comfort of the writer and has gone into the grips of those powerful ones might be brought out of their hands intact. Although their grip is hard and strong like iron a severe action would break it, and the *Farman* of the august

essentially legal provisions for four brides. There is an over flow in the market. Well-decked and well equipped slave girls with carriers of burden and other paraphernalia can be had either for ten Tankas or for twice of twelve. The garments and clothes are also very cheap. One can purchase at the rate of one yard for two 'Diram-i-Rikabi' cotton of such fine thin and delicate texture that if the turban-wearer wraps his head with a hundred yards thereof his hair will be visible from under it You can guess the cost of other clothes. Fruits, food, and vegetables and the other essential commodities for cooking and eating are as plentiful and easily available in the shops and streets of the market places as books of the students and the Musalla of the mystical people (IV-173-4).

Whenever any market man finds a chief or leader (Rais) he cries and cringes and when he has to deal honestly with the Musalmans he becomes indifferent. The merchants of black deeds have no capital except that of their black faces (or interest). The cloth merchant should be made to learn the straight procedure (dealings) from his straight measuring yard, and the grain merchant from the perpendicular shaft of his balance which never bends and is never curved. The money changers who make bad coins good can never make their hearts good. There is a difference between marklist-dealers or traders who make a profit of one out of ten and contented traders of the ultimate end (Ma, al) who make a profit of ten out of one. Although the dealer in gold weighs it on the balance made of brass and the monopoliser of grains (Muhtakiran or regrator) weighs the brass on a golden scale, if you look at things closely you will find the absence of 'barkat' on the scales (pallas) of both. The jeweller should not be compared with the grain merchants, and pure gold should not be weighed on scales made with the help of skins. The weaver and the makers of gauze fabric are co-professionals, and one is the copy of the other.

The profiteering and unscrupulous character of a set of foreign merchants has been exposed in a fairly long passage the substance of which is as follows : "Hasan Mazarib (a factor or manager) who was a citizen of Delhi wrote a petition to a high administrative official whom he addressed as Malik-ut-Tujjar (prince of merchant). He sought his intervention for the recovery of the amount from a group of deceitful foreign merchants, who had travelled widely on land and sea, and having visited Syria, Euthopia, Zanzibar, Egypt, and Madain had come to Delhi, the flourishing capital, so that after a clean sweep of this city of Mint through which streams of

Dirams. Although in the eyes of the people such a pearl was of no value yet on the day of Resurrection it would be of no less in worth and value than the real pearl. On the whole, all these artisans are content with their small wages, but they contribute to the well-being of the state and put the seal of the saying "the labourer is a friend of God on the coin of their honour."

The picture presented of the poor cultivators (Kashawarzan-i-Miskin) is not different from what we find today. With sweats trickling down from his fore-head, he tears open the field with his plough (juftawan); waters the dry and parched soil; sows the seeds which sprout, one into thousand; removes the rubbish, roots and grass; plies his sickie (Badas) for cutting the ready corn, say of shali paddy or wheat etc; removes the grains from the straw; makes them ready for the handmills for grinding, and thus provides food for many 'other' people.

That the state was not quite oblivious of its duty towards the painstaking peasants and professional workers (Peshwaran-i-Ranjkash) is indicated from an extract in the alleged letter of Sultan Alauddin, written in the year of his accession." I have deputed smart and kind informants and secret agents to enlighten me about those poor industrious people who live in dark corners without much provisions, with no fire in the day and lamp in the night. I have issued the Parwanas so that with fire-coloured money they may inflame hopes in their hearts and extinguish the fire raging in their stomach with the waters of favours ...Their iron hands are keys to the doors of their daily portion ...The cultivators dig the earth and saturate it with drops of sweats instead of those of the rains, as a result of which they get the produce ...As regards the harvest reaped and piled up in barns, in estimating the share (of the state) I shall make the post of the balance from Alif of Insaaf (halves) and from Noon of the scale of justice; according to this measure, the legal share will be taken by me from the place of the cultivated produce; and I shall store it in the granary for the Judgement day.(IV-114-5).

We get interesting references to trade, internal and external, to markets and cheapness of commodities, and also about the dishonest ways of the shop keepers and dealers in trade and craft. "In the market place people, on account of over-crowding, jostle against one another.... and higgle and haggle like the disputing, turbaned theologians. Goods and chattles are very cheap, so much so that ten Dirams will suffice for

to them. A method of achieving this purpose was that one should put the crown of superiority off one's head and follow in the foot-steps of manly people. He invokes the blessings of God on the hands of those tradesmen and artisans (Kasiban), who earned their bread by lawful means. He refers to the leather workers and says that they picked up with their teeth of wisdom the salt-saturated leather for making shoes and stocking and by their actions they contributed to the good and comfort of the people, and at the same time earned their bread lawfully and without adopting any inadmissible methods. Verses : The biting of leather for the sake of lawful bread is better than eating the mutton of sheep (Dumba). The tailoring profession is commendable in the eyes of far-sighted persons because the worker spends his life in sewing garments which cover the bodies of men. The wages that the workers get is well-earned provided the linen supplied or portion thereof was not misappropriated. By cutting away portions of cloth he cut the curtain away from himself and exposed himself to his fault finders. The shoe maker's bread was more lawfully earned than that of the dishonest tailor The Kafsh doz (boot-maker) tears his leather to provide foot-wear to people but nobody tears his own skin. While the Khaiyyat or Darzi with his double tongued scissors tears the cloth of others and obtains a patch for himself from the cloth he cuts. Therefore one who wants that on account of one's ill-gotten money one may not have to rub one's hands of grief on the day of Resurrection (IV 272-273)

References to many other professional workers such as cooks (Tabbakhan), bakers (Khabbazan), confectioners, (halwaiyan), potters (kuzagaran), carders (rismantab), butchers (Qassaban) carpenters, (Najjar) fishermen (Mahigiran), snake charmers (Margir), jugglers (Mushabbad), painters (Naqqashan), grainmerchants (Ghalla Faroshan), woodcutters (Hezum Kashan), goldbeaters (Zarkoban), distilars (Kalal), cultivators (Muzarian and Kushawarzan), though not devoid of interests, may be passed over. But it is difficult to ignore what our author says elsewhere again on 'Muhtarifa' (IV-172). "The Artisans who earn their livelihood by lawful means, include some who, by means of their needles. make blossoming flowers; some who by digging into quarries bring out gold; some who earn their lawful bread through the use of pig's hair in which however, there is no trace of illegal earning; and some who while labouring at bricks and stone drop shining gems (of sweats) from their fore-heads and get in return for those shining pearls only a couple of

in making bows from the glues of the fish. A certain embro[illegible] employed his needles so nicely as to make flowers of gold blossom. One of the tailors was so expert with his scissor that he could split a hair into two and could stitch with his needles two hairs into one, and another old one whose white flowing beard resembled fringe of a woman's scarf was so skilful that when called upon to repair a rent, split or fissure in the garment he could produce an embroidered quilt out of it. There was yet another who besides the wages that he got for sewing has for himself a portion of the cloth and out of the misappropriated piece he could make a kneepan (Miyan-i-Izar) and a breast cover (Sangatu) for his wife. As regards the cap makers, some were made so light that they could be blown off the head by the sweet breeze, while others were made so heavy and were so awkward looking that they had better be thrown down on the ground. There were fine looking eyes-staggering boots and shoes, and also those whose bad soles made the feet swollen. Some were so bad that the proper place for them was not the feet of the customer but the head of the maker. The goldsmith was a master of manipulation and was expert in taking out a portion of the gold by heating it and using borax. While the wages of the 'Baqqal', 'Sarraf', 'Bazzaz,' have been exposed, those of the weaver (Jolaha), as a whole, have been favourably commented upon. They make fine fabrics out of the yarn spun by them. Their honest labour at their looms and the implements and materials they made use of have been referred to in many places (IV-57-6`).

Though a member of the upper order and one who moved in highest circles, Amir Khusrau was ever-conscious of the dignity of labour and he has shown in unmistakable terms his sympathy for the common wage earners, peasants and labourers. He has commended the professional artisans who earned their livelihood by lawful means but has not spared those given to corrupt methods. He says that the trade and professions were the magnetic means of livelihood, and slackness and indolence led to the uplifting of hands for begging. To pour the quick silver (sweats) from the silvery fore-head is to attain the alchemy of lawful gold. He has shown his dislike for such professions as the manufacturing of the weapons of wars which though a lawful means of earning livelihood was related to power and authority of kings and nobles who were intent on wounding and killing. The professions not approved of by Islam should be avoided, and such professions should be chosen as might conduce to the comfort of the common people and not mean harm and injury

on fine silk. A man of piety is one who has no ego and Darwish is like the sun which spreads its light over the whole world. (IV-33-35).

As regards the Ulamas our author distinguishes an Alim-i-Rabbani (Godly) from an Alim-i-Muzawwir (Knave and cheat), the former being likened to sun and the lamp and the latter to the glow worm visible only in night and looking like a lamp, The big twisted turban on the head of an Alim has been likened to the coil of the dragon sitting on a treasure. The turban-wearing ignorant fellow has been compared with the donkey of the washerman and the ox of cloth merchants. One who is an expert in plausible explanations of things has, says our author, a serpent hidden in his vest. A useful Alim (teacher) is like a water which is pure in itself and purifies others. The learned man who is given to practice more than precept is like a treasure keeper who constantly adds to the treasury. And one who knows but does not act is like a box full of books and a wall full of carved engravings. The learned man who hunkers after unlawful food and is accustomed to plausible and deceiteful explanations has been condemned as one who burns the Mushaf (Quran) and cooks the flesh of of the hog

Amir Khusrau then proceeds to tell us of three types of people, commonman, those who take to reading and writing, and those who actually produce written works, The first is like a river from which the thirst is not quenched. The second is like an earthen mug (Kuza) full of water or an ewer (Sabu) or a jar (Khum) or a pool (Hauz). Whatever lies in all these will ultimately come out and every drop of water being finished they would all become empty. But those who write and produce books on whatever subject they have specialised in are like a shining stream which is not exhausted by drawing and expending therefrom (IV 35-37).

In a section entitled 'Muhtarafa' (artisan's profession) we find a similar emphasising or exhibition of differences between things and artisans, good and bad, skilful or otherwise. There are references to various classes of professional workers such as cap-makers, shoe-makers, tailors, weavers, balcksmiths, goldsmiths, needle workers and embroiderers, makers of bows and arrows, cloth-merchants, shop-keepers, money-changers. Khawaja Daud Ahangar was an expert and industrious blacksmith. He made very fine springy and flexible swords. He used the fire to convert iron into water, but he every day blackened his face by manufacturing implements used for inflicting wounds. Sayeed Kamangar took great pains in his profession as a result of which he had attained perfections

were wide open. When I went upstairs on the roof my head began to reel and heard the voice, of angels. When I looked down on the ground I had a panoramic view of the whole tract from Siri to the Jamuna for the moment. I lost my thirst and hunger but ultimately gave myself up to comfort and easeloving. Next day I wanted to pay the rent of 12 months to the special slave girl who was incharge of the house but she refused to take it saying that she would accept it if her master allowed her to do so. Some days passed and when they saw my sufistic disposition a small group of wickedly mad people including the son of Tamar Khan who had occupied the house and who had never spent a day without wine and women to which I had been a witness began to torment me by pelting stones at me. I sought the protection of the wall and lending my ears to the hole behind a wall I played the evesdropper. From whatever door he wanted to enter he found it difficult to carry his accomplices along with him. His neighbours were with him and always sided with him. They incited him to reduce me to extremities, but I connived at the misdeeds of the vultures(V-87-39).

A striking feature of Amir Khusrau's treatment is the juxtaposition, or comparison by contrast, of men and things, placing them one against the other. Various social classes, Muslims and Hindus, Turks, Mangols, Afghans, Sayyads, Mashaikh or Sufi mystics, Ulamas, or theologians, Jurists, nobles, officials, peasants, wage-earners, artisans, craftsmen and slaves have all come in within the colourful picture of the literary artist. About the saintly personages he says that the Hazar mekhi khirqa (the religious mendicants habit made up of numerous patches) of the Darwaish is a sacred threshold for the descent of the angelic spirits. The sufistic cap is the goblet of divine love or the mendicant's bowl of the low spirited ones. The man of sanctity and piety taking his rest with a mat under his head is like a river which throws up all sorts of rubbish and the engraving of mat on the back of the Darwaish looked like the calligraphic display of the saying, "My poverty is my pride" The holes in the patched and tattered garment of the Darwaish served as the window for having the spectacle of the other world. The cap of the Darwaish is very much superior to the turban of the Ulamas. The attach ment to wealth by the Sufis is as incompatible as a golden bow string, and the association of the Mashaikh with kings is as misfitting or improper as a blanket on the golden royal chair. The Darwaish who is associated with men of affluence is as displeasing for the eyes as the stitches of course wool

holes appeared in the ceiling that I thought that the covering of the cloud would suffice. When the vaulted hall (Suffa-i-Taq) became a pool of water I sallied out towards the basin of the house (Hauz Khana) which had become like a privy (Abkhana). I withdrew towards the outer bigger hall which was becoming smaller and clung to the threshold or portico (Dahliz) which itself had been overwhelmed with holes. I went upstairs but the roof had become a vast expanse for the watery horse-men (bubbles). I proceeded further and looked around to put down my legs which slipped and I fell headlong on the ground. I stood up and with utter difficulty got down from the first story. When I reached the courtyard the large stone-walls began to roll down. The damped wall gave away and came down. When I looked at the houses which had become a mass of bricks (perhaps unbaked) my body made of water and clay melted down. From the house I went into the street and entrusted myself to my horse. Horses resembled boats on the sea. The street was narrow and the walls of the quarter occupied by the paper manufacturers were very lofty. Whenever I raised my head above I was apprehensive of bricks and timber falling on and striking me. At the end of the street I saw a lofty buildling which was bending down on its back. When I advanced further I saw the balcony or the portico (Rawaq) toppling down along with the roof. Then I ran towards the house of my uncle, Sipahsalar Iftakharuddin, my horse which reluctantly moved out of the house jumped from house to house, being extremely terrified by the sounds of the tumbling houses. The horses which had been the resort and rendezvous of men had come down to the ground, when I arrived at the house of my uncle I found its owner sitting under a canopy of straw which was also leaking. He asked me about my house and its inmates and I quoted the Arabic expression "they were encircled by the waves and both were submerged."(V-57-61.

Elsewhere he says that he was staying in the house of one Majdud-daula for which the last 2-1/2 months rent had been pre-paid, leaving not a berry (habba) or barley (Jaw) as due. When I first set my foot in it I saw a garden like that of paradise. The lofty hall and walls and twelve-arches vied with the sky and with the 12 towers of the Zodiac with this difference that they were not upside down. The tank or the reservoir of the house (Hauz Khana) was so large as to eclipse the citadel of Shaddad and its water could be compared with that of Kausar. The library (Kitab Khana) was fully equipped and decorated with calligraphic inscriptions. The pillars of the house were high, straight and fine and its high doorways

craftsmen, skilled and unskilled etc. An outstanding feature of the book is the valuable information that it furnishes us with about the state of learning and education in subjects like Fiqha (Jurisprudence), Mantiq (logic), Falsafa (philosopy), Ilm-i-Tib (medicine) and Sarf-o-Nahv (Grammar, Etymology and Syntax).

A fairly large number of books on various subjects appear to have been in use in intellectual circles, some of them being probably included in the prevalent course of instructions as text books. Panj Ganj, Mizan, Kafia, and books of Masadir, Tasrif and Nahv, referred to, are still in use and we also find mention being made of Misbaah Zubdah, Lataif-i-Zamaskhari, Zariri, Aslub-i-Jawahir-i-Azhari, in the Risail. Some of the widely used works referred to are Maqamat-i-Hariri, Kalila Dimna, as translated by Bahai-i-Baghdadi, Mukhtasar (Al-maani) Qasida-i-Shatibia, Mutawwal, Adab-ul-Quazi, Sharaf-i-Adab (rhetoric and literature), Baizawi, Kashshaf of Zamaskhari, Mashariq-ul-Anwar, Masabih (Us-Sunnah), Tafsir-i-Zahid, Madarik (traditions and commentary), Hidaya, Faraiz-i-Husami, Manar (Ul-Anwar) Muhit, Mabsut, Manzum, Kanz, Tariqa-i-Nasafi, Fatawai-i-Seraji, Fatawa-i-Khani, Sharai (Ul-Islam), Jama-i-Saghir, Jama-i-Kabir, Bazdawi (Book of Imam), Hawi (Jurisprudence and principles of Islamic Law), Maqamat-i-Hamidi of Hamadani, Kashafu-ul-Mahjub, Suluk-ul-Muridin (being version of Ghazzalis, Ihaya-ul-Ulum by Majduddin Jarjami) Asrar-i-(Fakhrudin Razi, Bahrul Manni (philosophy and mysticism), Miftah-ul-Ulum (Logic), Qanun, Kitab-us-Snafa, Mujaz (Medicine). Other books referred to are Kitab-ul-Ghayats, Akhbar-un-Nayyarain, Zakhira (I, 53, 55, 114, 119, 140; II 97, 196; IV 185, 195, 222, 242, 281, 284, 309, 317, 318, 321, V)

That the State had some thing to do in encouraging and patronizing education is evident from the instructions issued to the Qazi of the metropolis. The foundation of the Madrasas should be laid on gems and jewels of knowledge rather than stony walls, and students should be settled and sheltered so that they may do good deeds and become greedy of sciences (Ulum) instead of being apathetic towards learning and lessons (II-15). The ceremony of conferring academic distinction has been described as Shamla "bandi for which we have got the term Dastar Bandi" in Mulfu-literature (IV—195).

We get ... lea about the dwelling place of a man of position like the author from a witty letter which he addressed to his friend, Tajuddin, in which he describes the disasterous effects of heavy rains and storm. "The roof was so badly leaking as if it was a sieve and so many

and described as 'Kuhl-al-Jawahir (collyrium or antimony in which gems along with other ingredients were reduced to a fine powder.) and a book 'Maqtal-i-Hussain', which appears to have been the earliest of the Elegiac works in India on the tragedy of Karbala, now unfortunately lost. We find reference (IV-330), to 'Nau Rozi or New Year's day of the Persian Calender being that which was observed originally by the Magians when the sun enters the Aries and also to the Muslim festivals of Rabi I commemorating the birth and death of the prophet. He tells us about Id-ul-Fitr, the day of festivities following the one months' fast of Ramzan; about Id-ul-Azha also called Id-ul-Qurban held in the commemoration of Abraham offering up his son, Ismail to God; and about Shab-i-Barat the night of the 15th of the month of Shaaban on which the Muslims made offerings and oblations in the name of the deceased personages. The night after 14 Shaaban, was also called Shab-Bedari or nocturnal vigil. On the day of the first Id garments of fine species of linen and silken clothes (Qasabaha) were worn, 'Halwa-i-Shakar Pech', and white fine cakes (Ruqaq) were also taken on 'Shasha-i-Id' or the 6th day of the Id (I-198). There are short epistles or notes on Shabi-i-Siyam, Shabi-i-Qadr, the two Ids and Ashura (IV 324-25). The first is called 'Roz-i-Qismat-o-Barakat (distribution of fortune and blessings). The pious and devout ones kept night vigil and spent the whole night in prayers. Innocent children played with fire works. The whole of the city became the garden of Khalil because of the light of the lamps resembling the flower of pomegranates and every one, in the light of his own condition, sent a few lamps to the neighbouring mosque. The writer also wished to burn the lamp of light in his own house and enlighten it with prayers. In Ramzan, after breaking the fast "Zalibay-Nabat" (the well known sweet Jilabi) and 'Fuqqa' (a sweet beverage) were offered in trays. Hearing the 'Bang' (call) of the Muazzin, they went to perform the special fast prayers called 'Taraweeh.' On seeing the new moon they broke the fast and congregated to make and enjoy festivities. The Drum was beaten for nine times and fine bread cake and Halwa were sent from house to house as presents. Rose water was sprinkled and fragrant perfumes were offered. On the occasion of the 2nd Id, sheep and goat (Gospandan) were sacrificed.

There is much worth noticing about sweets and other articles of food, clothes and costumes, utensils and furniture, housing arrangements, pastime and recreation, family life, social divisions, position of women, trade and professions, agricultural and industrial products, artisans and

sons, Ghayasuddin Ahmad,[4] Yaminuddin Mubarak, and Nuruddin Taiyab and entitled "W'az-o-Nasa, ih" (counsels and admonitions) deserves a separate treatment because of its importance.

It would be interesting to know that Amir Khusrau, who is reputed for his contributions towards a common medium of communication and a common mixed culture gives very little in the Risail about language and literature of the indigenous Hindu population. Excepting a single Doha[5] which occurs at the end of one of the Risails of the Ms. copy O.P L., Patna, there is no specimen, conversational or otherwise, of the vernacular or the regional language with which, however, he was not unfamiliar. Of course, he has used some purely Hindi words several of which have, however, double meanings. Some such words are 'Chuna', 'Supari', 'Mar Mar', 'Maash', 'Mung', 'Rui', 'Jauo', 'Ayee', 'Ayee' etc. We also get other Hindi words such as, 'Bira','Bar' (tree) 'Jolaha', 'Di Di', 'Nayaka','Tils', 'Piyaz',' Vaid', 'Kulab', (potter) 'Deomandla', 'Nagbel', 'Chambertali' etc. He has given us much about Music not only in this book but also in 'Qiraous-Saadain' and other Masnavis; but it is the foreign rather the Indian system of music, musical instruments, musical melodies, and the musicians about which he writes. Of course, in the Risail he has something to say about the 'Hindi Kalavatans' and the 'Hindi Saaz and Sur' or (instruments and melodic tones or tunes) but it is the 'Pardas and Maqamats' rather than the 'Raags and Ragnis' which find mention in his works. He does not say anything about his own alleged contributions though he claimed proficiency in the art. He refers to competitive contests between the Indian and foreign musicians, but there is nothing about Gopal Naik or Sitar or Seh-tar and the introduction of a common mixed Indo-Persian system of music known now as northern system of Hindustani music.

There is a frequent mention of the use of collyrium or antimony in the eyes specially on the Ashura or the 10th day of Muharram, and the observance of Rozai-I-Maryam or Saum-i-Maryam or Saum-i-Samt which means the three day's fast in complete silence in the month of Rajab (I, 197, IV, 323). Amir Khusrau felt highly gratified on the receipt of such gifts from a Sayyad as a prayer book to be recited on the first ten days of Muharram, a 'Surma Daan' or box holding collyrium wrapped in paper,

---

4 Partly considered in a paper still unpublished.

5 Perhaps it is an interpolation.

answer the question, "how things actually were," but, one can very well realise "the way things were looked at" by one of the great 13th century's intellectuals.

The book is impressive in size and also in source-contents, covering as it does practically every aspect of life, socio-religious, economic and cultural. It does not ignore even such apparently commonplace but still current practices as the following:—"Water mixed with milk was sold at the rate of milk" (IV-259); the washerman who earns 100 Dirhams every week, utters 'si, si' while he is at work, was found garbed in the clothes of other people"; (II-112); "the tumbul attendants of poor means offer a few betels to the men of position and expect to be tipped" (II-257); "it does not behove one to take augury from sneezing which is due to cold" (IV-36); "they hang a black crow on a newly-built house to avert the calamity of evil eyes" (IV-37); "among the congregation of people of grief and lamentation they sing Hinduistic songs (while carrying the bier of an old person)" (II-250); "in India there is a custom that workers of spells and magic practice incantations with the help of a reed, and whosoever is struck with it becomes tractable and submissive" (IV-161); "the conjuror who swallows swords and daggers etc......" (IV-261).

The main Persian text is interspersed with verses which have got their own significance. Some of the letters and pieces covering many pages are in Arabic. Some sections called 'Harf' are fairly big and self-contained, but most of the pieces are small and disjointed. Harf 3 of volume II, concerned with the "fundamentals[1] and the derivative principles of Music" covers 17 pages, and will be dealt with separately. It is followed by a discourse on the games of chess and backgammon (Nard) Hunting of birds[2] and beasts, fowls and tigers, form the subject of another section of volume II (60-69). The games of Polo and Kite-flying also find mention in more than one place. The interesting section on Tambul[3] or betels which spread over 19 pages of volume II has been already utilized elsewhere. An important section, Harf 3 of volume IV (256-330), which consists of three long letters, addressed to the author's

1. Paper entitled "Amir Khusrau on Music in Rasail-ul-Ijaz" at the Aligarh Session of All India Oriental Conference.
2. Dealt within a paper still unpublished.
3. Vide the paper "Betel chewing among the early Muslims of India".

or a desire to demonstrate one's literary ability and accomplishments. They reflect more clearly and accurately the views and outlook, style and methods than the official writings and from their apparently crude stuff there might possibly emerge a better and truer picture of contemporary human happenings.

An attempt was made in a paper contributed to the Ranchi Session of the Indian History Congress to throw some light on matters of historical interest found in Amir Khusrau's Risail-i-Ijaz-i-Khusravi. The utility of the large and ponderous volumes (5 in number) on epistolography, written in a most grandiloquent verbose style has been doubted by scholars, but one interested in social history cannot afford to neglect the cultural parts and the glimpses of the social and religious life which form the core of the book but are lying hidden in involved style of words and phrases, puns and puzzles. Amir Khusrau was an eys-witness of the multitude of happenings of a varied character and had become fully acquainted with manners and morals of the men not only in his surroundings but also of those whom he came in contact with in different parts of the land during a fairly long period covered by the reigns of Sultans from Balban to Ghiyasuddin Tughlaq. He held strong views on ethical and religious aspects of life, and had a certain antipathy against those who led lives of heterodoxy, immorality and corruption. If one of the purposes of history is that it should not only be true to facts but also morally instructive, the first hand observations of Amir Khusrau about the men and matters of the time and his literary disclosures of their faults and merits cannot but attract our notice. His style is difficult and epigrammatic and his inventive genius enabled him to coin many facts and events and names of persons and places. This might make one think that there is not much of actual information and it is not safe to deduce things of social import from what was not real but imaginary. But many things about the mental aspirations, ideas and outlook of the educated classes, and the manners and customs and religious and economic conditions of the time about which political chronicles are generally silent come only within the purview of this type of literature which is free from all restraints and inhibitions. The contents of even the fictitious letters and other pieces, some of which are dated, are not absolutely devoid of value, meaning and substance. At any rate, they may be taken as the reflection of the attitude and outlook and expression of the varied and accumulated experiences of one who was himself a part of history. They may not enable one to

LIFE AND CONDITIONS AS DEPICTED IN RISAIL-I-IJAZ-I-KHUSRAVI

There is a growing awareness of the need of adding to our knowledge of the socio-economic and cultural factors which were at work in Medieval India, and studying the variety of topics that come in the field of social history. Our knowledge of the life and conditions in the early Muslim period is still perfunctory, uneven and fragmentary. Life as depicted in purely nonhistorical, religious and literary works, such as hagiography, canonical or juristic books, folktales and romance, poetry, belles letts, epistolography etc. has not been studied as it was due to it. An adequate social history cannot be written without careful and painstaking scrutinization of all possible source-materials. It may be argued that isolated statements and fragmentary information that can be culled from the works of Sufi mystics, legists, poets, rhetoricians and writers of fictions and anecdotes have so much of the marvellous and the miraculous in them, are so exaggerated and over-dramatized, and are shrouded in such verbose and metaphorical language as to be hardly worth the time consumed and the energy spent over them. Some may say that fragmentary nature of such religious and literary sources have little or no bearing upon the general trends of social life, religious thought and movements.

But a student of history under the spell of the past which he seeks to understand as a key to the present, and concerned as much with vices as with virtues, would not feel deterred from his pursuits in what he considers to be his quarry, however, arduous it might be. He would sift and select from the fragmentary records, interpret them properly, give the detached and disjointed incidents and occurrences a coherence and make them meaningful. The outcome of his efforts may constitute stuffs of history, or least serve as backgrounds of history. The one great advantage of the above source-materials is that they emanated not as command-performance but because there was some inner urge or impulse, religious or otherwise

or fairy before the husband, but to be bashful, modest and fearful and to be known and seen from behind the curtain mounted with the fringed of the veil.

Our author enjoins upon the wives to keep themselves within the limits of their homes and have watchful eyes on all the resources of their houses; have privacy with none except husband, even with brothers and nearest relations; remain engaged in their domestic duties rather than being busy with the combs and mirrors; treat the husband's face as the mirror; practise thrift, and make particles of gold and silver, earned by the husbands, into thousand; avoid being quarrelsome, harsh-tongued and short-tempered lest they might annoy the husbands, and drive away the domestic attendants; behave well towards the female servants; consider contentment as their ornaments, if the husbands be poor and without means of subsistance; in short to cultivate such moral excellences as to make him feel proud of being the father of a daughter, hoping to be remembered as such, through her, after his death (M.A.).

from the pains of pregnancy and child birth she has undergone entails on her offsprings a load or burden the least particle whereof will suffice to weigh down the scale of the Judgment Day. Even if a son offers 30 cities to her for carrying his burden and sucking him during the period of 30 months he cannot render her all her dues (*H. Ijaz* II, 164, 325). The long sermons to his daughter and to "all the women" (Sair-i-Masturat) in *Hasht Bhisht* (38 verses) and *Matla-ul-Anwar* (109 verses) would lead one to think that the great poet was extremely orthodox and conservative in his attitude towards the fair sex. In one of his verses he seems to lament the birth of his daughter; but he immediately offers his thanksgivings to God for the gift and says that his father had also a mother; the latter was also a daughter; Messiah was born without a father; but there was no case of any one being born without a mother (H.B.).

Addressing his seven years old daughter, Mastura, he says "although your brothers like you are of good stars (disposition) they are not better than you in my eyes (MA)". When you enter into wedlock and qualify yourself for occupying the Sedan I would wish you first to be chaste and continent and then wealthy. My first counsel to you is that you should exert with assiduity in your devotion to God and remain under the arched place of worship like your eyes. There is no better ornament for you than the rosary. Seek good name and character through your own body by being chaste and abstemious, and be a friend of purity. For a woman of bold conduct and deliberations needles and spindles are spears and arrows. Even if you have enough of gold, don't feel ashamed of the spindle which is of iron. It is not sagacious to give up the spinning wheel and needle, for these are the means of covering the body. If you want to be at ease and free from all calamities, keep your face towards the wall and have your back at the doors. The secluded ones are applauded and those who wander about in the streets are disgraced. The woman who runs in the streets is not a woman but a bitch. The swing (Bad Pech) and tambourine (Duff) which the women play upon are no better than pillories and ropes for them. Songs and melodies appear at first to be simple affairs, but when carried to extremes they serve as virtual invitation to drunkenness. Wash your face of the false cosmetics (Gulguna), and try to be honourable without the red colour (ghaza) on the face. The real 'Jalwa' (meeting of the bride and bridegroom) is not that to look like a bedecked idol

old and young are quickly struck by their hypnotic charms. Another strange thing is their claim that they can fly high in the air like birds; but this does not stand to reason. Again by virtue of their charms they claim that they do not get drowned in the encircling whirlpool. Even if you put them in a tight sack and throw it on the surface of the water they would swim across from one bank to another without being drowned. Another strange thing is their claim to withhold and let go rains and moisture from the clouds. They have got such a collyrium that if a person desires and applies it to his eyes he can make himself invisible. There are many such wonderous things which are reported about them, but which may be said to be beyond the capacity of everyone except the watchful protectors (spiritual men) of the time. One who has seen all these things may not deny them; but those who have not seen them cannot believe all of them. Though all these are charms and fancies, yet, there is something which may be taken to be really true and I would tell you that for your approval."

There are many appreciative verses of Amir Khusrau in *Nuh-Sipihr*, a command performance, about the fidelity of the Hindus, male and female, to the object of their love and devotion The dying of the Hindus for expressing their fidelity is a tning to be astonished at; their dying either by the stroke of the sword or burning in the cruel fire. (*Hast Ajab Murdan-i-Hindu Ba Wafa Murdanash Az Tegh Wa Ze Atash ba Jafa*). The women burnt herself out of love for her husband and the man practised self destruction for his idol or for his lord and patron (*Zan Ze Paye, Mard Basa Zad Ba Hawas-Mard Ze Bahre But-o-Ya Munim-o-bas*). Although in Islam such things are not allowed, but see what great deeds these are. (*Garche Dar Islam Rawa Nist Chunin-Laik Cho Bas Kari-i-Buzurg Ast be bin*) If such kind of acts had been allowed by the Shariyat, many virtuous people would have gladly sacrificed their lives for the sake of their love and devotion. (*Gar ba Shariyat Bawad In Na'u Rawa-Jan Bedehand Ahl-i-Saadat ba Hawa*).

Amir Khusrau's conception of womanhood as a mother, daughter, and wife, and his ideas of the correct role of women in society, her interests and activities, deserve more than a passing notice. He says that the mother is "the origin of the mercy of God", and "the paradise is under her feet". The rights accruing

a variety of strategems they sometimes showed themselves as fairies and sometimes as devils"

More interesting is the versified account of the spells and incantations found in *Nuh-Siplhr*. "Many wonderous things have appeared in this land the like of which has not been mentioned of any other country. If I happen to describe most of them it would become as long as a tale, and, therefore, I am recounting only a few of them. Firstly, within this area, the enchanters bring a dead man back to life by their magical charms. This statement requires substantiation. I am giving a hint to those who will seek it. The person bitten by a snake who does not rise at the time is brought back to life after six months. In order to learn the art one has to proceed to the East by way of water as swiftly as the lightning. When he reaches the borders of Kamrup the master magician turns him into an animal. The other thing is that the Brahmans treasure the powers of enchantment in their hearts and if they exercise their spell on a freshly killed person the latter becomes alive provided he has not been removed away. If he is asked about the future events he may tell that if they are not terrified. So long as his tongue remains intact he is capable of speech but when it is dissolved we should not expect any speech from him. Another wonderful thing is that either by a true method or any pretexts and pretences they prolong the life which is not prone to decay. This is achieved in this way that since the number of breaths of every man for each day is fixed by calculation, one who accustoms himself to the taking care or holding the breath prolongs his life when he takes less number of breaths each day. The Yogi by practising restraints of breath within the idol temple remains alive for 200 or 300 years. Another strange thing is that by their artful regulation of nose breathings they predict events of the future. That is, if they stop and release their breath through their right and left nostrils, they give out same thing of the future. The other thing is that they have developed the art of transferring their souls from their own bodies to those of others. In the hilly regions of Kashmir there are many cave habitations of such people. Another thing is that they knew the art of assuming the forms of wolf, dog and cat. Again by practising their art they remove the blood from one body and infuse it into that of another. It is also a strange thing that both

and magic) and Chashmbandi (tricks that deceived the eyes) which the Gabrs (infidels) practised so as to draw a veil over peoples eyes have been referred to in the K.F. also (63-64). In his masnavi of *Laila Majnun* the Amir refers to the conjuration (Shubada) or sleight of hand of the dagger-swallowing man (Khanjar-asham) and one who inflicts wounds on his arms and sides for the sake of his belly (Bazu ze paye shikam kunad resh).

In his masnavi named *Aina-i-Sikandari* Amir Khusrau has referred to some of the typical customs and manners of the Hindus "out of sheer foolishness the common Hindus drink water out of hands of their palms in spite of the fact that they had a hundred earthern pots with them (p. 32). From the red colour of the twilight the mountain peak looked like the forehead of the elephant which had been besmeared with vermillion. When the snake charmer catches a snake, he nourishes such a bloody reptile with milk (53-54). When I slightly removed the veil from the side of the ear I caused the cap to fall down on the head and the head from the shoulder, (this refers to the new bride's Anchal affair when she moves a little the border or hem at the end of the veil. She covered her rosy face under 'Maijar' (a cloth worn by women to preserve their headdress from being soiled by unquent or pomatum of their hair) and thus shaded closed the eyes of the evil wisher and prevented him from seeing her.

Here are a few lines from *Ashiqa* about the conjurors and acrobats and their juggling or sleight of hands. "They were so dexterous in their use of swords that they could split a hair into two halves like a young hero. With the dagger, clean and pure as the wing or the feather of the flies, they cut the flying flies into two without making any boast of it. The rope-dancer played on the top of the ropes just as the hearts are constrained by curling locks. He was not only exhibiting his feat by twisting his body round the rope but was rather playing with the thread of his life. With his dexterous hands he threw the ball high in the sky and with it went the galloping stead round the circular disc. The conjuror swallowed the sword like water as if he was drinking water as a syrup. He let the sharp poinard slip into his throat through his nose just as one takes water into his nostrils. The child warriors exhibited their feet by jumping to and fro on the running horses like flowers borne on the wings of the wind. The masqueraders exhibited their skill in different ways. By practising

calling the faithful to prayer (IV-81). Like the Hindu, a Muslim woman dying before her husband was decorated with vermilion paste being applied to her (gul-guna kunand). Festivals and festivities have also come in the picture. Such were the occasions of Nauroz (new year's day, according to Persian calender on which the Sun enters Aries); the two Ids; Shab-barat (14th or night of the 15th of *Shaaban* involving nocturnal vigil, making of offerings and oblation to the departed souls, display of lamps and general illuminations, and fire works, played by children); Lailat-ul-qadr (27th of Ramzan, when the Quran is said to have descended from heaven); Lailat-ul-miraj (the night of prophet Muhammad's ascent to heaven). When Amir Khusrau invited his mystic friends to attend a Qawwali get-together, some thrown in a state of ecstacy, danced, that is rotated on their legs (pa-koftand) their hips being in motion ('Kachol juftaha shud'), while some clapped their hands (dast zidand); Ashura (the 10th of Muharram when the orthodox Sunnis kept whole day fast, applied collyrium to the eyes, and also read out from the book, Maqtal-i-Husain which dealt with the tragedy of Karbala. On the occasion of Id-ul-Fitr, which marked the breaking of the Ramzan fasts, after the visibility of the moon. Dasta-i-Nan, Halwa and Zaliba-i-nabat were sent out in big trays (tabaq) to the houses of friends and the vessel with rose-water (gulabdan) was in frequent use. Id was announced by the beating of the drum nine times.

There are references also to some common place but still current practices. Water mixed up with milk was sold at the rate of milk (IV-259); goldsmiths, while pretending to purify gold use Suhaga (borax) and steal gold; the washerman who earns 100 dirhams every week, and who utters 'si, si' while he is at work, is found garbed in the clothes of other people (II-112); the tumbul attendants of poor means offer a few betels to the men of position and expect to be tipped (II-257); it does not behove one to take augury from sneezing which is due to cold (IV-86); they hang a black raven in a garden or on a newly-built house to avert fatal misfortunes and calamity of evil eyes (IV-87); among the congregation of people of griefs and lamentations they sing Hinduistic songs, while carrying the bier of an old person (II-250); in India there is a custom that workers of spells and magic practise incantations with the help of a cane and whosoever is struck with it becomes tractable and submissive (IV-161). The conjuror who swallows swords and daggers, etc.......... (IV-261). Afsun (spells

(IV-114) and also into the thatched houses of the poor people (Muflisan) covered with thorns (Khasposh) which cannot prevent the leakage of pearl-like drops (of rains) nor the penetration of sun's rays and particles of dust through its holes (II-18). On the other hand, he takes us into the high roofed, two storied houses of the upper class people which had vaulted halls (Suffa-i-taq), pool of water (Hauz Khana), bath room or privy (Ab-Khana), library (Kitab-Khana), courtyard (Sahan) threshold (Dahliz), portico (Rawaq) with lofty pillars, painted walls and high doorways (V-57-61, V-87-89). In *Nuh Sipihr*, Amir Khusrau tells us about a poor helpless Hindu (Hindu-i-Miskin), who works himself to death, on account of the tyranny of the Khuta (Khurad Az Khuta Khun). He tells us about the drunkard Sufi (Sufi-i-Qallash), who goes into the tavern, and also the pious mystic of pure character (Sufi-i-ba-safa), who has become extremely popular due to his character.

The *Nuh-Sipihr* again tells us of the Indian dancing girls, with their forehead decorated with sandals and jewels, the parting of their hair being filled with pearls and diamond pendants, wearing a nose ornament and clad in the Devagiri garment. At the end of the fifth of the *Risala*, there is a satirical reference to some bad type of the women of the south. One is the Didi Miskin of Devagiri who made her black face white by coming out of the flour mill to cast glamorous side glances on people, and the other was Uchhaldi, the mistress of a brothel, and a typical representative of Nayakans of India. She and her followers always looked youthful amongst men; her ears were like water-drawing buckets hanging down in wells, and her lips were like raise... les of a drain. On one side of her nose a pearl was suspended from the nostrial, while on the other the snot (neta) having frozen on account of cold breeze looked like a hanging pearl. Her nose made her much too self-conscious.

Birth of a male child was welcomed with festivities and presents (V-251). Father or guardian arranged the marriage of their sons and daughters, and sometimes the hands of a grown-up girl were asked for direct by the suitors (V-215). Rich presents were offered by friends and relations to the married couple (V-221-24); a professional people called Murda Khwan recited the Quranic suras specially of Yasin over the dying and the dead (IV-39-40). The public crier put his fingers in his ears while

jugs, jugglets, and flagons had disappeared. (R. II. 270-71). *Khazain-ul-Futuh* also tells us how the roots of all iniquities, lust and adultery were cut off; wine, the daughter of grape and the sister of sugar, was turned into vinegar, and the prostitutes with their locks at the lower part of their ears and addicted to adultery were chastised and became veiled. This is followed by references to thieves, robbers, highway-robbers, night-prowlers, cut-purse, grave-diggers, shroud stealers, pick-pockets, who were held up from the banks of Sindh river to the sea-coasts (on the East) and were thoroughly chastised. The blood-sucking necromancers, magicians and man-devouring witches (Kaftari), who speared their senseless teeth in the flesh of people's children and caused a stream of blood to flow were stoned to death after being buried upto the throat (Sangsar). Last in the list comes the heinous fraternity of incestuous miscreants (Ibahatian), who held secret nocturnal assemblies wherein a mother cohabited with her son, the aunt with her sister's son, the father with his daughter, the brother with the sister. These libidinous wretches were tortured to death, the saw of iron being drawn over their heads (K.F. text, pp. 18-21).

He also writes about "Sunnian-i-Pak-o-Saf (orthodox Charyari Muslims), Muatazilan and Rafizis (rationalists and Schismatics Muslims). At one place he writes "If in this age the Rafizis (Shia heretics) were to nominally claim their rights, the pure Sunnis ought to remind (warn) the rightful caliph on oath"......(KF). He refers in derisive tone to the polluted 'Hinduān'; the bearded and severely despotical Afghans (Afghanak-rishail and Ushtulum) who were vain and arrogant; the lion-nosed, dog-tongued, Tartar-lipped, thinly-bearded Mongols; the Tabbetans with narrow close eyelids; the dog-faced, cat-eyed Araxenian Chinese with frowning and wrinkled foreheads. On the other hand, he mentions about a dozen types of Turks such as the moon-faced Aibaka, silver-bosomed and iron-bodied Qamash and Tamar, white-headed Aqwaish, the vigorous and manly Sunqur, the warlike intrepid Qilich, the loud-talking red-haired Sanjar, the pleasing open-handed Tangar; Qizil Arsatan, the red-lions, the incomprehensible Gorid and also Kam Tughid and Ai-tughid (R.I. 166).

Amir Khusrau gives us a peep into the "Dark corners' (Zawaya-i-Tarik) of people without provisions (Be-toshagan) which have neither fire in the day nor the light of the lamp in the nigh

others; and keeps the grain stored in the granary of the Judgment Day. The real benefactors will never allow their labours to go in vain. In the same piece we are told about a Navisinda-i-Hindu (Hindu clerk or accountant) whose two-faced reed pen (Qalam-i-Juftawan-Kah) which being wielded to keep an account of produce (Hirz Challa) becomes as important as the corn itself for it splits under the disposition (affects the mental equilibrium) of the poor peasants just as the plough does in the case of the cultivated field, and his tongue serves the purpose of a sickle (badas) of the field which splits and removes everything that comes in the way (this shows that in making the entries of the produce the petty Hindu official acted dishonestly and he was so sharp-tongued as to summarily dispose of all complaints, just as the sickle removes all that comes in the way (R.I.IV. 64-65).

The Amir's observations on the ways of the sots and drunkards, Rabis (usurers), Rashis (bribers), Zanis (adulterers) "who are alike in form and spirit" and also Muhtakiran (hoarders and profiteers) show that such vices were widely prevalent in his time. Wine drinking, though strictly prohibited by Islam, had become a habit with the people, and even some men included in his religious groups had become addicted to it. We are told of a drunkard Mu-ezzin who entered the magnificent mosque of Qazi Imran in a state of intoxication and the smell of liquor coming out of his mouth defiled the pillars and rafters of the mosque which had been made of sweet-scented sandal and aloe wood (R.I. IV-175). Some recluses joined the Sultan in secret drinking party and some Ulemas poured liquor in the same bosom in which the Quran was treasured" (*Matla-ul-Anwar*, Chap. 11). Of the trinity of joy, wine, women and music, all of which form important themes in the *Risai'l*, the first and the third have been accorded separate sections (II-267-275 and 275-291) which is also the case with the following discourses on Nard and Shatranj (games of backgammon and chess (II-291-298) which are also noticed in *Khazain-ul-Futuh* (pp. 42-43). In the "account of wine bibing the author who was himself a teetotaller gives an indirect hint to Alauddin's prohibition of the drinking and sale of wine". But by the vicissitudes of the revolving sky the big wine jars became small (were broken)...... the spiders had woven their webs on the doors and walls of the tavern......the fellow drunkards who were the flies of wine had dispersed and gone into retirement...... the minstrel, the cupbeare , Kabab, Nuql (desserts), the goblets,

Sandal, and many other perfumes. They had Gulala (locks of hair hanging loose), Jaad (ringlets of curly locks). The male Syeds had also double Jaad and men used Masma (dye made of leaves of wood or indigo).

We get some interesting observations in *Risai'l* (IV-856) on different kinds of cloth "Jama-i-Yak-Shiqqadar Muina (The garments with fissures or crevices) which wards off a whole hill of snow; Yakta-i-Bahraman (red coloured upper garment without lining which is very delicate like water and covers the beautiful ones upto the neck); Yakta-i-Hari (silken) which on account of its brilliant glare and fineness resembles the rays of the sun; Yakta-i-Chambartari, which had the quality of covering the defects (of poverty and misery), but had a defect of its own in that its wearer remained naked inspite of putting it on; the Yakta-i-Parnan, a green, thin and delicate garment like the feather of the flies; the Devagiri garments, white and fine like the spider's web; Yakta-i-Awadhi which had become sugar-coloured and stained on account of moisture; the jama (garment) of the special wardrobe is harsher (more coarse) than mean-minded ones, which the slave, asked to use as a pae-taba, kicked off with his legs; Katan-i-Rusi, which general Aibak Tatar sent, was harsher than the temperament of the Russians and was narrower than the eyes of the people of Khata (China). The *Yaktayi-i-Narma Latif* resembling the skin of the snake had been set as a memento and in lieu of that the green Maqna like Jama-i-Chuk (like green scum or kayee) has been received. The Dastar, as thin as water, Kulah-i-Chihar Taranji, the rose coloured Yaktai (Gulnari) a piece of long cloth (Katan) which on account of its being excessively cool is ever in tremor, and a piece of Jar Mauji and one Miyar-i-Ma'abari (turban or veil made in Ma'abar or Madura) from which water easily came out, and Yakta-i-[illegible]abadi have also been referred to (I-177-8).

The *Risai'l* tells us about different kinds of people, good or bad. For example we are told about Kuzhawarzan-i-Miskin (poor cultivators) who take their pair of ploughs (Juftawanan) to the fields, and with pearl-like sweat trickling down from their fore-head break the dry or parched earth; irrigate it with their own hands; and when the seeds thrown inside the earth sprout and blossom up with grains, one into thousands, he plies his crescent like reaping sickle; gets the crops, say of Shali paddy, wheat or others, removes the grain from the straw; provides food for himself and

also refers to the varieties of cloth from 'Kirpas' to 'Harir' which cover the nakedness of body; from 'Bihari' to 'Gul-i-Baqli' which are used both in summer and winter, from 'shirt or under garments to Galim (blanket of goat's hair) which differ greatly in their hair; from 'Jaz' to 'Khaz' which are similarly engraved or painted; from Devagiri to Mahadeonagari which are allurement both to the body and the mind" (page 25).

The types and modes of dress have also been referred to. Such were the large turbans (Dastar) and Ammama, worn by Ulemas and religious groups on the head over a close-fitted skull-cap called Kulah and, consequently, they were called Dastarbandan, Mutammiamah, and Kulahdaran. In *Risai'l* we get that the big turban folded like a coiled serpent was made of such fine and light stuff that a hundred yards of this cloth could be wrapped round the head and yet the hair underneath was visible. The other clothes they used were Pairahan, Qaba (sleeved close-fitting jacket or coat open in front), Aba (a kind of coat or cloak), Jubba (a species of upper coat, resembling a skirt), Rida (mantle), Saravil (a sort of drawer or trouser like Pae-Jama), Shalwar (baggy trouser), Lungi (narrow strip of cloth passed round the waist and thigh), Barani (a cloth for keeping off rains), Dotai (a kind of double cloth). The sufis and durveshes were clad in Khiroa-i-hazar-Mekhi (the mendicant's habit made of numerous patches), Kulah-i-Chihar Taranji or Chihar Taraki (four cornered cap), Kafsh (shoe, sandal or slipper), Nalain (a pair of shoes of a particular kind with wooden soles), Labaicha or Labada and Chadar as, also Moza; and sandals were of different types we find mention being made of Kafsh-i-Yaky-Mehkhi and Seh-Mekhi (hooks), Kafsh-i-Zardozi (embroidered), and Kafshak-i-Hanni used by men of affluence). The garments of women consisted of Naqab (veil hanging over the face), Maqna (a veil worn over the head), Durrah'a (tunic; upper garment with buttons and loops), Pae-cha (drawer or trouser), Chadar (scarf), Qasb (women's headgear). Izar or Kishtak (drawer), Pairahan (loose or close-fitted shirt from the neck to the naval), Reshaha-i-Damani (women's skirt mounted with fringes), Sangchi-i-Zanan (sina posh or breast-belt), Gulband (neck cloth), Chirin Baf (a piece of cloth of delicate kind of texture). Izar and Fido were worn by both men and women. They parted their hair just in the middle of the head *i.e.*, a track was made just in the centre of the head (*Rah-ha az farq-i-rast rast kard-nd*) R.I.-I-21). They used also cosmetics like Ghaza, Gulguna.

"Mail ba Qaisunqur o bughra makun-Shulla-i-Tutamajit Ighra Makun".

Our author has told us much about the second most essential need of man, that is, cloths and apparels. They were of various stuffs or texture, silken, cotton, woollen, linen, embroidered, painted and of gold work. There are many references, in different places of his various works, to Khaz (coarse kind of silken cloth), Deba (brocade), Harir (silken cloth), Zarbaft (cloth of gold), Zardozi (embroidered cloth), Makhmal (velvet), Atlas (dull coloured satin-red, tending to be black), Mushajjar (a kind of figured silk brocade of painted silk cloth), Daq (a kind of costly stuff; also a course darewsh garment, painted and embroidered), Katan (a kind of linen cloth said to be rent by the exposure to the moonlight), Kirpas (a kind of long cotton cloth; also fine linen or muslin), Parnean (a kind of fine painted silk from China) Aksun (a rich black-coloured silken cloth worn by princess or boastful people; also a species of brocade). Amir Khusrau is very lavish in his praises of the cloths of Devagiri and Bihar, and Oudh, specially the first. It is interesting to see what he says about Bihari or Rupak-i-Bihari and Devagiri cloth. He writes under Jama-i-Devagiri in his diwan called *Nihayatul-Kama* (page 52).

"How can I describe adequately the fine quality of the cloths Had it not been so, the hard-hearted planet (Mars) would have skinned the moon and brought it to the end of the month (what the poet means to say is that the Devagiri cloth is so fine and thin that if the moon is deprived of its skin and thinned, it would not be thinner than that). Even a hundred yards of such a fine cloth can be made to pass through the eye of the needle and yet it is of such fine and strong texture that the point of the steel needle cannot pierce it without difficulty. It may be said to compare favourably with the drops of water, as if the drop trickle down against nature from the streamlet of the sun Elsewhere he says, "It is so transparent and light that it looks as if one is wearing no dress at all, but has only rubbed the body with pure water". The fine subtle Hindustic silken garment of which, if doubly folded ten yards are out of one, were drawn Owing to the extreme fineness ten (hundred) yards can easily be contained in the eyes which do not suffer in the least thereby Neither water nor oil nor the iron or pointed needle can pierce or penetrate through it like drops of water. *Khazain-ul-Futu*

drinking and their hearts and soul had got nourishment from the delicious delicacies, a few topmen stood up and uncovered in the name of each one present, a tray of Fuqqa (a kind of drink made of water and barley and of dried grapes, something like beer). Its strong effervessence went to the body and unloosened hundreds of knots of life's thread. When the provisions and the accessories were removed from the dinner table, the turn came for serving betel leaves among the men of the assembly"

This is followed by more than a dozen lines in praise of betel leaves. Amir Khusrau has made frequent mention of Pan which was invariably offered to the guests, specially at the end of the dinner, in his various works. This was the practice of his maternal grandfather, an Indian Muslim whose "rang-i-qirgun" (dark as pitch) glittering in sun's glare pleased the child Khusrau so much while he was perched on his shoulder. The long discourse in Volume II of the *Risai'l* in which we find 42 virtues mentioned as against 43 demerits of betels and betel chewing, has already been published elsewhere. The *Risai'l*, contains references to many articles of food such as Kabāb (meat cut in small pieces and roasted with onion and eggs and stuck on skewer), Zaliba-i-Nabat (IV 325 our Jalaibi), Sirka (vinegar), Jughrat (curds) (IV-51), Girda-i-Paneer (cake of cheese), Paludah (Paluda, a kind of flummery or Sweetmeat II-177-517), Murabba (I-169, a preserve or confection), Sikbat or Sikbati (I-612, a dish made of mea' wheat-flour and vinegar), Khushka (I-23 boiled rice), Shakkar Paich (I-196, a kind of sweetmeat made of rice or wheat and sugar; also paper to wrap with sugar in), Ruqaq (IV-325, thin cakes), Tutmaj (thin slices of pastry or vermicelli), Lauzina (a kind of sweetmeat in which almond is mixed up; also almond shaped confection IV-15) Sharabi-i-Asir, (grape-wine) and Sharab-i-Naishkar (wine manufactured out of sugarcane IV-53), Sikanjabin (1-23, lime-juice or other acid mixed with honey or sugar), Ghulahakkari (I-60, a kind of sweetmeat made of rose and sugar, something like Gulqand), a Qaisunqur (a kind of meat syrup of birds), Bughra (a kind of dish with dressed pastry or macaroni or a worm shaped white paste called vermicelli or *sewa'in* invented by King Bughra Khan) and Shulla (Pulao or dish made up of rice, spices, butter, flesh or fowl) have been also referred to in *Matla-ul-Anwar* (Chap. II).

dishes which were served on the table. The Nan (bread) was carried round like the circular disc of the sun. The nan-i-tunuk (thin fine bread like chapati) was so crystal clear that one's face could be seen through it. I should describe it as the disc of the sun rather than a bread; it was worth if Jesus spread it on the table. The nan-i-turi (of Turkish or Mongol variety) was puffed up like a dome because of the joy felt at being included among the royal dishes. This was the season why kak (biscuit or dry bread), became surly and pale-faced. The sambosa (a kind of small pastry of minced meat of a triangular form) became a delicacy because of the three elements constituted by it (Asar= Arad, Sarid, Raughan). The barra-i-biryan (fried or roasted kid) excelled the disc of the sun (refers to circular mutton chop). The tongue tasted the meat prepared out of the rib of the goat; it was placed at the top of the polaw (a dish composed of meat and rice, seasoned and cooked with butter, spices and honey. It refers to gravy or abgosht or yakhni of biryani). The meat pieces cut out from the sides of skinned goat looked like so many crescents. Strangely enough thirty first crescents (Ghurra) came out of the day of the new moon (Salakh skinned or flayed). The fat of the thick tail of dumba (a kind of sheep) weighed two *mans*; it was more delicious than that of ahu-barra (fawn). The head of the goat came intact with teeth exposed and excited the laughter from those sitting at the table (well-cooked but intact buz musallam like murgh musallam). The hilly dumba of which trayful of meat was brought had been reared and nourished for ten months till its two horns had come out on its head. Hundreds of delicacies and all varieties of food cooked in the cauldron (deg) were placed on the table and people partook of them with great relish, using their lips and fingers. A large variety of birds, fowls, such as waji (quail), tihu (a bird smaller than a patridge), durraj (black patridge), charz (bustard, a bird of game whose flesh is tender and delicate) had been cooked in a variety of ways. There were trayful of sugar-constituted halwa (a kind of sweet-meat made of flour, ghee and sugar) with a flavour and taste like that of the dishes of paradise. There were tablets or cakes of sabuni (a mixture of almond, honey, sesame oil), which was as tasteful as sugar and as good and straight as an old whitish garment. Then, many kinds of fragrant perfumes were sprinkled on, or mixed up with the eatables. They were more fragrant than camphor and saffron. When their palates had part-taken of their shares of eating and

and cultural pattern and performances as to display the writer's literary skill and accomplishments and to cater to the tastes and the needs of the time. The poets are generally in the habit of exaggerating things, and one should not expect their works to be marked by moderation and balance. Amir Khusrau was not an exception. He has gone to the absurd length in the later portions of the fifth *Risai'l* of his *Ijaz* in his highly obscene remarks, which cannot be put before the modern readers. Social standards of beliefs and practices, manners and morals are not necessarily the same among the different people and at different times. It is not safe to judge the past from the present. But even this part about episodes and persons concerned, is not altogether worthless for unfortunately Barni and others support him in some respects.

Though much that Amir Khusrau, who has been not unjustly styled as "the social historian" of the 13th century, has left to us in his numerous works, specially his masnavis and *Risal-ul-Ijaz* which is an interesting heritage as well as an example of the author's literary accomplishment, compels attention, we have to be very cautious and careful in clearing the grain from the husk. There are difficulties, and much painstaking effort is needed to tap the sources still wrapped up in Persian garb. We can confine ourselves in this short paper only to certain aspects and past conditions of society by way of examples, and draw the attention of the readers to what our author says about diet and drink, cloths and costumes, beliefs and practices, other than religious, and above all the various categories of people as to how they lived, thought and behaved, and what their good and bad points were

In Qiranu's-Sadain, while dealing with that which pertained to royalty and not to ordinary social life he writes about food and table inanners of Sultan Kaiqubad. After referring to the large (thousand) varieties of menus and dishes, sent in 9 tripod trays from the royal kitchen to the table, he writes about the nature and orders of the viands as follows :

"Hundred of cups of sweet vegetable juice, tasteful and nourishing as the water of life, were first taken round, and placed before the companians whose liquor-saturated palates were thus washed off by Jull ıb (purge of water and sugar). By taking the lip-sticking sherbat (syrup) broken (languishing) spirits were reunited and set right After this course the turn came of the

majority of unnamed Muzarian (cultivators), Dihqanan (rustic agriculturists), Qasbatiyan (villagers or townsmen), Sangtarashan (stone-cutters) were Hindus and Mahigiran (fishermen) and Margiran (snake catchers) have been definitely described as Hindus. Some of them were good and lived by their honest and industrious labour, while others were definitely bad and dishonest. A learned man and a mystic sufi himself, the Amir did not spare the greedy hypocrites among them and he considered the laity to be a "hundred times better than the priestly class." He writes in *Matla-ul-Anwar* (Chapter VI).

> "*Hast Base Sufi-i-Pashmina posh-kas na rasad bang-i-Muezzin ba gosh......................In hama Shaikhan-i-Khaza in parast-Barhamanand but-i-e Zarrin ba dast*

On the other hand, about low class wage earners he writes appreciatively that they pour the sweat of their brow to earn their lawful food; they work with their hands, night and day, and go to the length of making holes, with their teeth, in the leather to serve mankind. He has very good words to say about the tailors and the cobblers who were more hard-working and straight forward in their dealings than others, specially goldsmiths. The Amir writes frequently about the weavers who were simpletons but honest and industrious. We are told how they worked, at what they worked, their tools and apparatus and the services they rendered to society.

The characters portrayed and the situations depicted appear to be mostly imaginary, fictitious and overdrawn; yet the portraiture and the descriptions comprising the illustrative selections here may be taken to represent some real personality, actualities and possibilities as seen and found at the time in society by the observant eyes of the acute writer. Even the word-picture as drawn by the Amir and his pen-drawings are very often helpful and suggestive. Literature is the imperishable voice of life and of the period that produces it; and is, indeed, the mirror of the soul of society. It gives us a glimpse into the existing and actual social life of the time, and, therefore, there is much in it which forms a very interesting study of social evolution.

It may be said that literary picture based on scanty and scattered references is not only incomplete, but is also sometimes misleading. The motivating factor was not so much to paint a true picture of social elements, social organisation and institutions.

verbose contents and the ornate and occasionally over-dramatised picture of life and conditions from birth to death, about food and drink, cloths and costumes, manners and customs, festivities and festivals, social behaviour, family life, arts and crafts, games and music, hunting execursion, agriculture, irrigation, pastime and amusements, virtues and vices of society etc. may be taken as a fairly understandable delineation of what had existed or had been seen or thought about by our author. Those who have read Amir Khusrau's works in the original will not question the considered view of late lamented Dr. Ashraf that he was "pre-eminently a historian of contemporary social life" (*Life and Conditions in Medieval India*).

To reconstruct life lived and to form a consolidated picture of society as it existed in such a distant age from isolated and disjointed fragments and incidental allusions to contemporary men and events, scattered in books composed in high flown language and style, is neither easy nor a satisfactory task. It is difficult to get a full and vivid picture of contemporary life. But one need not be unduly skeptical about all that he says, specially what he writes in the *Risai'l*, about a variety of people such as the turbaned Ulemas, saintly and imposter Sufi mystics, quarrelling jurists, the Syeds with double locks of hair, slaves of both sexes and of different extractions, with characteristic names, artisans, and various functional groups, corrupt officials, dishonest merchants, shop-keepers (baqqal, or bazarganan) carpenters, blacksmiths, goldsmiths, money changers (sarraf), oil pressers (raughangran), black marketeers, hoarders (muhtakiran), singers, dancers (pa-koban) courtesans (tawaif, ruspiyan), mimics, acrobats, jugglers, conjurors (mushabbid, bazigar, gadan ghazian, rasan bazan), (rope dancer), maqamiran (gamblers); but in all his works except *Nuh-Sipihr*, it is Muslim rather than Hindu society, more of the urban areas than of the countryside, which arrested his attention most. There are only a few Hindu names in the *Risai'l* such as Saunpal Zargar (jeweller), Nepal Khuta (tax-gatherer), Narayan Raughangaghar (oilman), Deo Chand, Debir-i-Mudabbir (ingenious writer or secretary), as compared with a plethora of Muslim names of Jolaha (weavers), Tanindah (spinner), Bazzaz (cloth merchant), Challa Faroshan (grain merchants), Khaiyyat and Darzi (tailor), Ahangar (ironsmith), Zirahgar (armour maker), Kamangar (bow-maker), Ruingar (metal worker), Muzayyan or Hajjam (barber), Zarkoban (gold beaters), etc. Of course, the

and was above his age in taking detached view about men, alien and indegenous, high and low, rich and poor, nobles and labourers. But he had his limitations and unevenness as a writer of books of historical value for in marshalling his material and supplying factual information he becomes rhetorical with the result that sober facts are very often lost in his literary devices and mazes of words and expressions.

Whatever may be said about the political factors, dealt with, and there may, here and there, be some omissions, but not distortions or misrepresentations; but there is no lack of candour and impartiality in what he says, more in allusions than straight to the point, about things of social and cultural import. In places he shows himself sardonically human, distributing judicious criticisms, and also mild or unstinted praise with a fairly even hand. We may refer here to the third chapter of his book, *Nuh-Sipihr*, revealing the partriotic fervour of the first great national poet of Muslim India. It is thrilling to read the following:

> "*Hindu-i-Dahqan ba Kuhan Chadaragi-Shab ba Charagah buwad ba Kharagi; Bar lab-i-Ju. Ze ab-i Khumuk Barhamanah Ghusl Kunand Akhiri-i-Shab Ghota Zarian-Khud Gah-e-Garma na buwad Shan Ghami-i-Khaz-Saya-i-Shakh bas o az kulba Do Gaz*"—And yet "*Barhamane hast ke dar Ilm-o-Khirad-Daftar-i-Qanun-i-Aristu to darad*".

The ill-clad Hindu rustic or peasant who passes his night with his horses under the azure sky, and the Brahmin who takes his ceremonial bath in the cold water of the stream in the latter part of the night and who is content with a cell or a closet, even the shade of a tree, in all seasons should not be looked down upon. The Brahmin is such an embodiment of wisdom and learning that he can easily tear to pieces all the records and books of Aristotle.

His observations on many aspects of every day life, though scattered and found in bits and pieces, may be assembled into an orderly picture, and are, therefore, well worth consideration.

Amir Khusrau's oriental pattern of rhetorical history and his literary works reflect the spirit of the times and the tendencies at work, specially among the Muslims of his days, and this also is not devoid of some significance for those interested in social and cultural history. What emerges after a careful sifting of the

Khusrau's Works As Sources of Social History

Some works of Amir Khusrau like *Khazain-ul-Futuh*, which is in prose, and 5 out of 10 masnavis, namely *Qiranu's Sadain*, *Miftah-ul-Futuh* or *Tarikh-i-Alai*, *Nuh-Sipihr*, and *Tughlaqnama* have been included among the many different types and classes of historical literature. His *Kulliat*, the 4 diwans and the *Khamsa Masnavis*, and specially his stupendous epistolary and rhetorical work, *Risail-ul-Ijaz* are purely literary works and *Afzal-ul-Fawaed*, contains the table talks of his spiritual guide, Hazrat Nizamuddin Auliya but these are also not absolutely devoid of suggestive references and allusions of some historical and cultural interests.

Scant attention has been given to *Risai'l* which though verbose and full of verbal gymnastics and literary acrobatics bear some genuine documents and have a wide range and variety of details bearing on law and exegis, grammar, lexicography, tradition, morality etc., and also many things of historical value concerning social psychologoy, life and conditions of the period. It may, however, be argued that the work is diverting rather than authoritative since it is often difficult to distinguish between the fictitious and the imaginary and the actual; the historian would naturally like to have concrete facts.

Judged by the modern ideas on history as an objective study, Amir Khusrau may not be taken seriously by historical specialists. History with him was contemporary history. He had little or no spell of the past, and he was largely concerned with the experiences and observations of his own generation. Of course being highly connected, deeply learned, moving freely in all circles, not only in the imperial metropolis but in the different parts of northern and peninsular India, this celebrated poet and prolific writer had excellent opportunities of seeing and judging things for himself. He never professed himself to be a historian but gloried in being essentially an Indian and called himself the "Parrot of India". He had no religious narrowness or social and even racial prejudices

better than the moon, the expression amounted to a vow of separations, whether if a fly fell in a vessel of water that water could be used even though along with the poisonous feather the other feather which was its antidote, had been immersed in it; whether the water of a jar in which a *Karbash* (a poisonous lizard: Hindi *chalpasa*) had fallen, could be used for ablution, and so on and so forth. Our author makes a fun of the long-bearded regular observers of prayers and fastings who practised usury and made excessive profits by lending money and gold, and also of those who neglected their prayer in discussing the question of prayer and problems of *Fiqh* of the four schools of jurisprudence. He has no sympathy with those who were engaged in hair-splitting discussions of problems of logic and metaphysics. He writes, "O pedagog of religion and law, bad in disposition and fowl mouthed and big turbanned, what is the sense in wrangling over prayer when the time of prayer itself is missed." He writes, "there is no wisdom in that learning which represents and attempts to float the boat in a well. May that man of learning perish who defiles his learning by mixing it with envy and malice, and harms these creature of God. Verily, foolish persons want to cover the ill-concealed ignorance by attempting to make it forceful by loud voice."

The *Pandnama* or the letter of admonition forms a very interesting reading for the writer who throws much sidelights on his own disgusting experiences and he admits his own disillusionments. He tells us about the widely prevalent sins and corruption. 'Hama rui-zamin sail-i-fasad girafta ast' i.e. the world is flooded with deprevity and wickedness. The satanic people with their satanic ways had to be shunned ; cruelty, selfishness, lust, sensuality, inebriety and lethargy which were among the besetting evils, had to be kept away from ; liberality should be shown even to strangers for even a silly ass is generous to his wife and family ; royal favours which shed lustre but took away dignity should not be sought for ; craft which was a magnet attracting lawful means of subsistence towards itself, had to be resorted to and the indignity of stretching out one's hands in supplication which was beggary, should be realised. The sweat on the silver-like forehead of the man who worked hard for lawful aims, was an alchemy. *The Amir writes appreciatively of the weaver's* craft and cobbler's profession and that they do for their lawful earning by dint of their hard labour. The *Kishawarz* (peasant or cultivator) plying his pair of ploughs in the field, cutting up the parched earth then irrigating it with their pearl like sweats which trickle down from their foreheads all the time, are at last rewarded with crops to which they apply their crescent-like sickle, and after cleaning the grains from the straw store it in the granary for the judgment day.

There is another aspect which may deserve cursory glance. The age in which Amir Khusrau lived was an age of moral deprevity, brutality and idle talks. The atmosphere appears to have been surcharged with corruption and also futile discussion of the trivies of 'Fiqh' and 'Hadith'. Amir Khusrau writes contemptuously about such people as *rabi* (usurer) and *zani* (adulterer) who resambled in form and deed and were the greatest among the sinners. He also ridicules pedantic '*Ulama-i-bahhas*' (disputent, dogmatic scholars) who indulged in profitless discussions in loud voices over such trivial questions as to whether a man could use the lamp oil ; whether it was allowed for one on the bank of the rivers to perfom *tayammum* or *Wazu* with sand instead of water ; whether when a man said to his wife that she was no

colletion of five treatises on Arabic grammar), *Sarf*, *Mizan* and *Munsha'ib*, the seeker received higher degrees of instructions in Madrasa or by sitting on their knees (*zanu zadan*) before learned divines in various branches of knowledge such as *Abad-o-Insha* (science of polite learning and Belles letters), *Ma'ani-o-Bayan* (Rhetoric), *Ilahiyat* (theologyg i.e. traditions, commentaries, law or jurisprudence), *Hikmat* (Philosophy, Mathematics and Airthmatic), *Ilm-i-Nazar* (speculative science); *Tanjim* (astronomy), *Tibb* (medicine), *Mantiq* (logic) etc. Though there is no express mention of curriculum or fixed series of studies required for graduation, we get reference to a large number of books on ethics, traditions, law, logic, scholasticism, mysticism etc. which may have been used in major fields of studies. Such are *Mashariq-ul-Anwar*, *Quduri*. *Zakhira*, *Maqamat-i-Hariri*, *Baizawi Jami-i-Saghir wa Kabir Lata'if Mufassal*, *Fatawa-i-Siraji*, *Misbah-ul-Doju*, *Ihya-ul-Ulum*, *Kashf-ul-Mahajub*, *Suluk-ul-Muridin* and the other books of Ghazali Majduddin Jajarmi, Zamashkeri, etc. There is no reference to examination held or any degree conferred, but we are told about *shamla bandi* (the ceremony of tying a shawl round the waist or throwing it on the shoulder or wrapping it about the head) which indicated the successful termination of educational career. The ideal to be kept by the learners (*muta'allimin*) was that by their studies and attainments each one should become a unique of the age (*yagana-i- ruzgar*) and reach such a stage in the advancement of knowledge that people might call them the second of *No'man* (the celebrated lawyer Imam Abu Hanifa) and the third of Shaikhain (i.e. the two worthy disciples of Imam-i-Azam, namely Imam Yusuf and Imam Muhammad.

In a long letter of counsels addressed by Amir Khusrau to his son Ghiyasuddin Ahmad, the importance of education and study (*Kitab wa ta'Jallum*) for differentiating the lawful from the unlawful has been emphasised upon. All such knowledge was to be picked up which could be put into practice but not in a way so as to make one a mere carrier of burdons like an ass carrying on a burden of books or a washerman's ass with loads of garments on it. Among the ten books mentioned for special study are *Quduri*, *Misbah-ud-Doja*, *Fatwa-i-Siraji*, *Zakhira*, *Muhit*, *Mabsut*. *Mufassal*, *Jami-i-Saghir-o-Kabir*, *Nafe'*.

even the pen was in mourning. A certain extract is well worth translating. "The benedictory prayer offered throughout these ten days, has been received and the same time *Kuhl-ul-Jawahir* (collyrium mixed with ground pearls) placed in the special antimony box and folded within paper has been delivered to this sincere one. My pupil of the eye accepted it and it was applied to the black part of the eye. There was the book entitled *Maqtal-i-Husain* which also had been sent for. Because of the dust of the ground of that martyrdom which serves as an antimony for the penetrating sight of the true believers, that book had become so torn to pieces as you would say that in lamenting the fate of the Prophet's family members the garment got torn and was affected; and its leaves had become highly disordered as if you would think that it had been struck at Karbala by a stormy wind". There is reference also to the distribution of alms and charities among the poor and the destitute beggars.

Although Amir Khusrau says that what emerged from his pen in the *Rasa'il* should be taked, as his *tasawwurat-i-zehni* or mental reflections, worth correction or refutation. The literary glimpses of social and religious life that we get are not all merely fanciful for many of the social customs that he depicts are not very different from those of today. Take the case of education which played a very important role in the social set-up of medieval India. The ceremony of initiating a Muslim child in the duty of reading and writing started with *Bismillah* and *Sura-i-Fatiha*; the child commenced learning to read by reciting in the name of God, and this was an occasion of social festivity. Letters of the Arabic alphabets were written on *takhta-i-chubin* (a school boy's written woodmade board) and the boy was made to put his fingers on each individual and spell them correctly. Later on the sounds of vowels and consonants, first separated and then combined were taught and care was taken to ensure correct pronunciation. Repetition of lessons (*takrar-i-sabaq*), according to necessity, in loud voice, was a must to fix them in the memory. The boy was taught prayers and benediction (*at-tahiyyatund darud*). Some were made to be memorizers (*Huffaz*) and correct reciters (*Qari*) of the Quran (*Mushaf*). Passing through the elementary stage of private schools (*maktab*), and rising above the level of *Panj-gunj* (a

fasts when lips and mouths are completely sealed in respect of food and drink. The fast of *tai* (continuous fasting for 3 days observed by Sufi mystics) was observed. The 19th and the 27th of Ramazan was treated as Lailat-ul-Qadr or Shab-i-Qadr (when Quran descended from Heaven). The *tarawih* (an extra prayer and genuflexions with recital of the Quran) was observed in the month and the fast was broken at evening with such kinds of drinks as *fuqa* (made of water and barely, and often of grapes) and sweets named *zaliba-i-nabat* (Jilebi), *lozina* (a confection of almonds).

Next is the reference to the two 'Ids.' Id-ul-Fitr or the festival of breaking the one month fast of Ramazan on the first of Shawwal, and 'Id-i-Azha or Id-i-Qurban, the sacrifice festival, held in commemoration of Abraham offering up his son, Ismail, on the 10th of Zihijja, the last Arabian month. The former was marked with great pomp and festivities; children were decorated and dressed with clothes of *harir* (silken garments); people ran to the *Idgah* to offer the *dogana* (two genuflexions in prayer). There was also beating of the drums nine times announcing the happy termination of the fast. Bread and halwa placed on trays were sent as presents from house to house. The *Gulabdan* (vessel for rose-water) was in constant use and so was the sprinkling of perfumes. The devout observed also *shesha* or Sheshroza or six days fast after Id. As regards the festival of sacrifice an ox or sheep or camel was sacrificed in discharge of a vow and the pilgrims at Mecca performed the rites of *Ihram* or the act of putting on a special dress and halted at Arafat (a sacred hill, 12 miles from Mecca). As regards India our author refers to the sacrifice of *gusfand* which means a sheep, a ram and a goat and to the offer of the usual prayer and also to the three days of *tashriq* turning the face eastwards and saying 'Takbir' i.e. Allah-o-Akbar).

The first ten days of the Arabic month, Muharram, are held sacred on account of the martyrdom of Husain, son of Ali and Fatima at Karbala, on the orders of Yazid. The tenth of the month is called *Ashura* which is the day of the celebration of the Muharram festival. Amir Khusrau describes the ten days and *Ashura* as the days of the slaughter of Husain for which

organization. For the Hindus the tradition had been built up of festivals for religious rnd commemorative purposes and the exact time and mode of conducting them had been fixed. They served as occasions of trade, amusements and recreation and display of devotional sentiments. The influence of festivals on social life and family relations of the Hindus was great. Somewhat different was the case of those of the Muslims. Amir Khusrau has written in his own way about all the important Muslim festivals such as Id-ul-Fitr, Id-ul-Zoha, Shab-barat, Muharram, Ashura, Nauroz, Prophet's anniversary, *Lailat-ul-Qadr*. Nobody knows the exact date of the birth, more specially of the death, of the Prophet of Islam. But people had taken that to have happened during the first 12 days of the month of Rabi I. This has been rhetorically referred to :

روز وفات بود قبله و بعده نیز با باید .

The letter *ha-i-hawwaz*, 27th of the Arabic alphabet counts five reckoning by *abjad*. Adding it before and after *ba*, the second letter of Arabic which counts two, we get 12 when Fatiha prayer is offered to the Prophet.

The 14th day of the month of Shaban and the night preceeding the 15th is generally called Shab-i-Barat which is appropriated to the commemoration of the dead ancestors and saintly personages; On this occasion the Muslims make offerings and oblation to the deceased. It was, as it is even now, believed that the Divine Predestinator apportions or bestows what is necessary for the support of life on the 14th. Referring to it Amir Khusrau writes 'commission or assignmeant of various kinds occurred on the occasion along with exemptions and immuniiy' He describes the 14th night as 'Lail-i-mubarak barat' 'Rozi-i-qismat-i-mubarak', refers to the observance of manifold prayers and night vigils, and tells us about the illumination and fire play of the children. The innocent children indulged freely in the play with fire and in throwing fire works and the whole town looked carnation-coloured garden like bright coloured red rose. He adds that every one, according to his means, sent lamps to the mosques for illumination. (*Rasa'il IV* p. 325). Then comes the month of Ramazan

matrimony, deserves in the opinion of the man, three divorces. But although a man may be water and fire (tears of grief and anger) the woman will have an upper hand because of the weapon of the paper she has in hand (i.e. Mehr or the marriage portion settled upon the wife before marriage). It serves as a chain binding the neck and the throat. But *mehr* (kindness) may become a bond of affection if between the two there is nothing *zir-o-zabar* (topsy-turvy); for a woman's affection (mehr) for man is far better than matrimony (mehr); but for man mehr (fondness) for woman is far worse than mehr or the bridal gift (fondness would lead to submissiveness and the peace of life would disappear). In these literary figures we get indication of polygamy, widow remarriage, termagant woman, docile husband, divorce and more specially dowry which sometimes served as a deterrant to a capricous husband. Perhaps Amir Khusrau disfavoured marriage with widows for he writes :

آنکو زنکۂ پیوستہ را زن خواهد در خانۂ او خاستۂ زن باشد ۔

'One who takes a widow as his wife, in the household everything will be as desired and wanted by the woman.'

Leaving aside the rhetorical parts some facts dealing with or reflecting the social life of the time can be easily drawn. But as the writer did not write for the historians, references to social customs and manners are scattered, disconnected and scanty, and even after a careful analysis there are difficulties in getting a full picture. The descriptions of contemporary society are often of imaginary society and necessarily coloured. But if we do not stick closely to the textual representation, with all their limitations the reference and allusions will be found to be very useful for constructing the life of the past.

Let us consider what Amir Khusrau says about festivals and festivities so as to see whether we get a picture which was as true to contemporary life as to that of the present. Muslim festivals as compared with those of the Hindus, are fewest and are not so closely inter-woven with religious worship and social

paraphernalia of marriage portion, rich ornaments studded with jewels and precious stones for head, neck, forefingers and feet have been referred to (*Rasa'il* II, p. 120).

Some were happy marriages, there being complete identitiy of views and sentiments; but sometimes, conjugal relations became loose and the relations between the couple became strained, largely due to the fault of the wife. The wife of Najibuddin was very harsh-tempered. To add to the trouble the father, Khwaja Saleh, was also of hot and sour temperament and he made the situation for his son-in-law so bad as to compel him to flee to his uncle for protection. Fortunately, the venerable aunt of the bride with rosary in hand intervened and expostulated with her brother. "Your son-in-law stands in a position of your son, and it is not advisable to cause separation of the wife from your virtual son." She cited the examples of 'Ayisha and Fatima, the prophet's wife and daughter respectively, from whom the lessons had to be learnt. We get in the *Rasa'il* an imaginary account of two beautiful, wealthy, grown up, highly chaste girls whose wealth attracted a greedy man who was bent on using force to have them. Fortunately they enjoyed the fatherly patronage of Khwaja Ariz who saved the situation and one of the two girls was given in marriage to his adopted son named Jauhar who was born of a chief (mehtarzada) but was a writer by profession. (*Rasa'il II, p. 60*).

While offering his hearty congratulation on the marriage of a certain couple the writer warns the husband against subjecting his will to that of his wife for yielding and submission might turn ease and comfort into pain and affliction. When one allowed one's hand to be clenched with that of the wife like henna it would not be strange if one's hand became bloodstained. If an old man gave ear to and submitted to the sermons of the woman, the woman would turn into man. Let not the 'arus or bride become the Shah or a king.

Incompatibility, infertility or other things led to separation of the couple by means of divorce. A man possessing two bags of dirham (one who has two wives) is in the view of the woman a double-shelled dice, and a woman who has entered twice into

Felicitation and offerings of presents also took place. There is very fond of his mother, speaks highly about her, and even in advanced age loved to sit at her feet. He writes much about the duties of the sons or daughters to their parents, specially to their mother at whose feet lay the paradise, and whose services could never be required adequately in present life. Yet he was much too obsessed with the idea of privacy and seclusion. He always uses the word *mukhaddarat* which means a virtuous woman, concealed behind the veil of chastity, true to the marriage bed, and always veiled when going abroad. He wished young vergins to be kept retired, behind the curtain. They were possessed of their own property, besides the irrefutable claim of bridal gift from husband, an essential element in marriage; but they were looked down upon as of the inferior position and subordinate to man. Some of Amir Khusrau's dictum says

عروسی را که پس غربال نہان کند بیختنش حاجت نیست ۔

'The bride who keeps her face concealed behind the sieve does not require sifting'. And yet like many the birth of a male child was more welcome to him than that of a daughter. In *Hasht Behisht*, addressing his seven years old daughter he wrote, " Would to heaven that you could have come out of the mother's womb as the child of eight months (who usually do not survive)." But immediately after turning his language from such an obvious meaning, he writes, "But as what is God-given has to be judged right and proper, and it is sinful to quarrel with those who have been the gift of God, I have accepted whatever the Lord Almighty has bestowed upon me. What He has given cannot be turned back. I offer my thanks-giving for whatever has come from His door. He gives only to the deserving what is suitable and becoming to him". He goes further and says, "At any rate, my father also has come from a mother, and my mother has been the daughter of some one." He concludes "that it is possible for one to be born without a an allusion to a marriage in a high circle between Malik Najmuddin, son of Malik-ul-Jibal Hasan with Zumurrud Khatun, daughter of Malik Asad Shamsuddin. The bridal throne the

father, as has been proved by the birth of Messiah from the sinless Maria, but without a mother of happy existence nobody speaks of any one to have been born."

Amir Khusrau was a wealthy personage, but he exhorted his daughter never to give up her work at the spinning wheel; never to indulge in peeping from behind the door or the curtain, or cast her looks in different directions; never to forsake the women's spindle (*duk*) and the needle (*suzan*): never to neglect the use of veil or concealing sheet of cloth; and to always keep her face towards the wall and her back towards the door. According to him, "the woman who walks or runs in streets is not a woman but a bitch". He did not like woman's excessive fondness for embellishment of her body and much too adorning of the face for that might cause mischief, disgrace and ignominy. Also in his view "when the expenses of the wife exceeded those of the husband, the affairs of the household would become topsy-turvy.

Marriage as expressed by the terms *Kabin* (matrimony), *Nikah* as a social institution, and polygamy, keeping and purchasing slave girls, and divorce as prevailing social customs have been frequently alluded to in rhetorical language. The hand of a grown up girl was sought by suitors, sometimes by themselves, but more usually on their behalf by their parents. It, however, depended on the father to give consent to the marriage after consulting his relations. Bakhtiyar Amjad offered himself in marriage and gave an account of his high social status and also the wealth and prosperity that the family had once possessed; but the circumstances had changed for the worse. He had, however, many personal qualifications. (*Rasa'il* V, p. 314) On the occasion of the marriage the usual Quranic verse beginning with "fankehu hunna" (perform Nikah) was recited, and among the rites *Jalwa* (the meeting of the bride and the bridegroom in the presence of the relatives, and showing the face of one to the other through mirror) and scattering and throwing about money and flowers called *Rikhtani*, have been alluded to. There are frequent references not only in the *Rasa'il* but also in *Ashiqa* and *Dewal Devi Khizr Khan*, to some of the marriage rites and ceremonies, ornamentations by the bride, *mashshata* (bride's dresser), *takht-i-arusi* (bridal throne), *hajla* (the bridal bed with mirror and ornament).

consolidated picture of the society, as it existed in such a distant age, on the basis of isolated and disjointed fragmentary pieces, incidental allusions and references to men and events, and social divisions of castes and labours, yet the way in which the various classes of people, with their habits and manners, good and bad, have been referred to, suggest that we get glimpses of real contemporary life at the end of the 13th and beginning of the 14th centuries. The Amir refers to *Wazi'-o-Sharif* (nobles and prebians) *ashab-i-amal va shughl va hirfa* (workers, artisans and businessmen), *mashaikh* and *ulama* (the pious and theologians), *hukama* (philosophers and physicians), *muzakirin va mutarassilin* (preachers or letter-writers) who formed the upper stratum of the society. He also refers to *arazil-i-qaum* whereby he meant the ignoble sections of the society. They included *halwagaran* (confectioners), zar-kuban (gold-beaters), load-lifters, vessel-bearers, slaves, males and females, and also corrupt dishonest merchants, shopkeepers, money-changers, usurers, etc. His references to social divisions, market places, goods produced and sold by independent artisans on small scales suggest the existence of corporate bodies of artists and artisans, manufacturers, hoarders and marketeers. Amir Khusrau was conscious of the dignity of labour, and writes with admiration about the skill and knack shown by even such people as weavers and cobblers, blacksmith, ironsmith, etc.

But, perhaps he did not like that the professional artists and artisans should abandon their hereditary avocation and take to new lines of work. In this connection we may quote a line found in *Rasail*.

ضحك الورا از سل سيفا حائك

This means that it would look as funny if the weaver takes up and wields the sword ; people will laugh at those who cross the limits of what they have been cherishing in their hearts.

Judged from modern standards, Amir Khusrau's views about the females of his time may be taken to be very conservative and preservative of old traditional principles and practices. He was

There is an interesting sentence, "Musha'bid or the juggler or the conjurer (Hindi nat) swallows swords and daggers so that, through those wound inflicting implements, he may have a share in ease and comfort." There is a suggestive verse as

جوله ازین شرم که شد سایه شین   رفت فرو تا کمر اندر زمین

'The weaver blushed lest the shadow of disgrace should fall upon him and, therefore, descended upto his loins into the ground.' This refers to the weaver's shop or loom or kargah which has a hollow in the ground in which his feet play (work) moving from side to side or in and out.

Some terms and words convey something pertaining to the society — such as *masura* or the reed used by weavers to wind their thread upon; *mushra-i-tiflan* i. e. anything including amulet or charm for children to drive away evils. Another word is *minwal* or the beam or wooden stick of weaver's loom on which he rolls, twists and turns the cloth

کسی ندانند که کسوت بخت بچه منوال بافته شود .

'Nobody knows how the frame or texture of his fate would be twisted and woven.' Many tit bits indicative, to some extent, of the atmosphere of the age can be found in the *Rasa'il*. In India a usage has developed that tne conjurors practise their charms or incantation with the help of their reed. Whomsoever he strikes with his reed becomes docile and submissive. We get an interesting reference to the token coins of leather "Diwan-i-Charmin"

"There is nothing surprising if by the enforced command of the august.........the leather dirham has been now current.'

Only those who are prone to taking one sided and unhistorical view can say that Amir Khusrau was an advocate of equality and universal brotherhood of man, and that he was entirely free from bias, prejudices or discriminative attitude. Though it is not quite safe to come to a final judgment about the life and paint a

while they were at work, earned hundred dirhams a weak, but freely donned the garb of their clients.

History is not a matter of imagination but of observations and study of evidences written or oral, direct or indirect. Indirect evidences furnished by literary sources may be sometimes misleading and liable to be misinterpreted; and yet they cannot be ignored altogether. Allusions and references in the texts even in their literary garb, have some essentials of historic value. The *Rasa'il* furnish many concrete examples. A few *tambolis* (betel-leaf sellers) who frequently brought these goods from the side of Gujarat were once carrying the load of these silvery pungent commodity and were passing through the jungle. They were suddenly attacked by some armed horsemen, who were the Rawats of Jalor, just when they were resting around a very old well. One of the tambolis drew out his 'Khanda' for self-defence but this provoked the assailants all the more who killed him along with a large number of his fellow people. Only a few survivors came to lay the complaint before *Majilis-e-Ala.* A similar plunder occurred when a caravan laden with such commodities as cloves and saffron (?) was proceeding from Bihar towards Agra and was passing through a Mango grove known as Chandranath. Sunbul Bihari was told that the whole of Hindustan was filled with the fragrance of alove-wood emitting from the perfumed mausoleum of the martyred saint at Bahraich and it behoved him and the members of his fraternal assemblies to banish the air of comfort and the odours of the pleasantness of life at Khalakhar (Kilokhari) which is at Delhi and, for Raihan (Imaduddin) the rebel had became so headstrong and powerful that he arrogantly asserted that he would destroy Sumbul root branch. We know that Salar Masud Ghazi, reputed as a warrior-saint and a nephew of Sultan Mahmud of Ghazni had fought against, was slain by the Hindus, and lies buried at Bahraich (U. P.). He had become a myth in the 13th and 14th centuries. Two Tughlaq sovereigns and Sultan Shamsuddin Haji Iliyas of Bengal paid their reverential visits to his shrine at Bahraich. Kilokhari, the new city of Delhi, had been colonised by Kaiqubad and Raihan, the Indian born rival of Balban, had once held charge of Bahraich in Muharram 657, five months before his overthrow and death at the hands of Malik Sanjar.

'On sneezing one should say praise be to God so that the heaviness or contraction may disappear.'

هرکه او (قمر) را دید جشم نکشاید مگر در روی خاص وعا م.

'On seeing the new moon one does not open one's eyes except to glance first at the face of people high or low.'

رسم چنان بود که هرکه تقصیر میکرد اورا در صف نعال کنند

'It is the custom that one who committed a fault or sin was made to stand in the place where shoes and slippers are left before being finally disposed of.'

In *Aina-i-Sikandari* and also in the *Rasail*, the poet laughs at some typical manners and customs of the Hindus.

بسی ابله هندوان کلال بدست آب نوشند با صد سفال

'Because of sheer foolishness the Hindu-potters drink water out of their palms inspite of the fact that they have hundreds of earthen pots besides them.'

Elsewhere he writes when the snake charmer catches a snake he (foolishly) nourishes such a bloody thing with milk. He refers in many places to the cow-herds who, though they carried their animals to houses, managed to mix water with milk and charged the price at the rate of milk. We are told about the tailor whose double-tongued scissors, inflicted injuries on something not belonging to him, and at the same time who shamelessly tore out a piece or patch for his own private use. Significantly enough Amir Khusrau disfavoured the manufacturing of arms and weapons of war for these implements inflicted injuries on the body of human beings. He also disapproved the profession of a goldsmith who pretended that the scum or dross of gold was purified by heating it with *kafshir* (borax or Hindi sohaga) but he actually managed to steal bits of gold. He rediculed the washermen who uttered *si si*

هفت و نهش کرده چو ماه تمام   جلوه کنم در نظر خاص وعام

'Seven plus nine' or sixteen refers here to 'Solah Singar' or the sixteen ways of embellishments or ornaments of the Hindu ladies. The same thing has been referred to in a line addressed to the poet's daughter Mastura in the line

چون شدی بہر هفت و نه در رنج   نقد عصمت فتاد در شش و پنج

'If you feel grieved for lack of 'seven and nine', the current coin of chastity will fall 'in sixes and fives' (distress)'. The references are to the articles of the ladies' toilet, dress and ornamentation, henna, *wasma* (woad), *surma* (collyrium), *surkhi* (red colour), *ghaza* (face-rouge), *safidab* (white paint), *ghalia* (civet), *sar-aweza* (head-dress or veil), *gushwara* (ear-ring), *silsila* (chain), *halqa-i-bini* (nose-ring), *galuband* (necklace), *bazuband* (armlet), *dastana* (bracelet), *khalkhal* (ankle-ornament), *angushtar* (ring), etc.

مخدرات موی ز فرق راست راست کرده

The veiled ladies divided their hair in a straight line at the top of their heads ; this is called in Hindi *mang*.

چون از نون کن متولد گشت صیت احمدی در گوش بانگ نماز داد .

Here is a reference to God, the omnipotent, Lord and Creator and to the Quranic verse "Be, and it was or is", and also to the age-old practice of sounding the call to prayers in the ears of the new-born child.

چون عطسه زند الحمد لله گوید تا سنگی بر طرف سر.

of such puzzling amphibolous words and expressions. In connection with the description of betel leaf he uses the words *Warak-i-Kafuri* which means both a white paper and also a *Kafuri* or *Kapuri Pan.* The expression 'Barin Muhimm-i-buzurg birah fitad', 'birah' means betel leaf made up, and if read as *herah* it means in Persian deviation from the right path. Then there is "pishi an jan-separi kunad" which in Persian means resigning one's life into that of another, while *Supari* is the Hindi betel nut. We get also the use of Nura (quick lime) and chuna which in Persian is *ahak* or lime and it also can be read as Chunna that is how like that. There is a sentence with "Mung Mung Maash Maash" which if read in Persian, indicates multiplicity, while the Hindi Mung and Maash are vetches.

There is a line in *Rasail*

جولاهه و تننده هردو همکار اند وعکس یکدیگر

There is a pun in *jo-lah*, the latter meaning a kind of red silken stuff. The weaver and the spider have been likened with each other as the former weaves cloths of cotton and linen for garments and robes and the latter weaves a cobweb. In both cases the warp is rolled round and carried over the comb or the stick respectively.

As a court poet Amir Khusrau was mainly concerned with the affairs of the elite of the court circles. but his word-pictures give sufficient indication of his interest in the social life of the common people and his keen sense of observation enabling him to depict the views, feelings as also the habits and external practices of the masses. In the *Khazain* he writes

بنگرکه چند جانهای دیوان هندو درغبار لشکر پادشاه گرد باد
شده اند۔

'Behold, the spirit of so many Hindu demons which are revolving in the whirl wind of dust shooting up from the ground of the royal camp'. Many still believe in gobling or spirits called *deo-bhoot* which haunt and lurk in what is called *bagula* in Hindi and *gird-bad* in Persian. In *Matla-ul-Anwar* we get a line

رسیدی پدیدی مرا دی بخانی   زمانی بباشی بیاری بشانی

The first means 'you came yesterday saw me in the house; if you halt a little you will be deserving a friendship'. In Arabic it would mean 'you are my guide and my match capable of salvation, the object of my desire, I feel disgusted for my women are quarrelling.' More important, however, are such lines in the preface of Ghurratul-Kamal and in other works which show the Amir's mastery over the Indian languages.

آئی آئی همان بیاری آئی   ماری ماری براه موری نائی

There is another elsewhere :

گفتم صنما بہای زلفت چه بود   آواز برآورد که در در موئی

The last words are significant, meaning either that 'each hair is worth a pearl' or what is the sense in Hindi 'begone, you rogue.' The word *Jauhari* in *Qiran-us-Sadain* and many places in the *Rasail* has been used in double sense, jauhari meaning jeweller or 'Jau' meaning barley, and 'Hari', that is diety. In the line

داریم آرزو که حکایت کنیم بات

the last word is Hindi which may also be read as *pat* meaning *barg* or leaf. In Persian it may stand for 'Ba-to' or 'Pae-to'. There is a couplet :

هر برهمن که دید رخ خوبت ای صنم
زنار را گسست و لگد زد بروی لات

Lakad in Persian means kick and so is *lat* in Hindi but the latter also means an idol worshipped by the pagan Arabs of Mecca. The *Rasail* furnishes numerous examples

been strained and torn off. A Muslim pilgrim to Mecca met him on the way and questioned him about his strange affair of crawling and wounding his body when he could easily walk on his feet and reach his destination safely and in a shorter space of time. The Hindu ascetic replied that he had dedicated his life to the god of Somnath which was the object of his worship. At this our author remarks that one, instead of deriding this attitude, should appreciate the sincerity of devotion and fidelity to the object of worship shown by the Hindu. He exhorts his fellow people and co-religionists to appreciate the spirit of self-sacrifice and imbibe such feelings.

I have already written elsewhere about different classes of people, good and bad, high and low, their essential needs of food and drink, cloths and garments, dwelling places, both lofty mansions, thatched houses and leaking huts with holes for sunrise and rain water to get in, and also separate papers containing Amir's observations on the principle and practice of music, listing more than two scores of merits and demerits, each side, of betel leaves Pan, hunting excursions with animals and birds of hunt, and have published a fairly big paper containing gleanings about social and economic aspects from the works of the Amir. The pen-drawings of Amir Khusrau in his poetical works or in *Rasail-ul-E'jaz* which, in size, form and contents, are quite different from his other works and are replete with multityped figures of speech, have also got their importance, for besides showing his extra-ordinary power of inventing new literary devices, they are helpful for a correct appraisal of his contribution to Hindi. His suggestive allusions to the manners and habits of the people in his time are no less interesting. He gratified the needs and desires of his contemporaries by providing literary food to them through his amphilogies or *iham* in which his words and couplets are to be read both in Arabic and Persian or Persian and Hindi. There are his anigmas or *mu'ammas* of various types centring on many things. Such acrobatic verses or sayings, include what the Amir calls *Sanayi and Badayi*. One is called by him as *do ruya* which is read in different ways. A certain Persian couplet may be turned into Arabic when entirely different meaning can be read:

be astonished at. A love-stricken Hindu woman was unique in that she dashed berself to death like the moths at the candle.

چون زن هندو کسی در عاشقی دیوانه نیست

سوختن بر شمع مرده کار هر پروانه نیست

هست عجب مردن هندو به وفا　　مردنش از تیغ و ز آتش به جفا

He admired the dying either oy the sword or by burning in the cruel fire of men and women. The woman burnt herself due to love for her husband and the man practised self-distinction for the idols whom he worshipped as his lord and patron.

Although in Islam such things are not allowed, but see what great deeds, these do :

گر به شریعت بود این نوع روا　　جان بدهند اهل سعادت به هوا

'If such kinds of acts had been allowed by the Shariat or religious law, many virtuous people would have gladly sacrificed their lives for the sake of the object of their love and devotion.'

Besides *Nuh Sepahr*, such appreciative verses are found also in *Ashiqa* and elsewhere. In the former we are told about a fire worshipping Hindu who being urged by his inner spirit of devotion tore off the skin of his limbs and threw them like parchments in the fire. Being chided for such an insane behaviour, said to be an act of worship, he replied that the questioner could not have seen the smoke arising from the fire of his grieved and anguished heart. What he did was to attain his object which was union with his beloved, separation from whom was like a dark gloomy night. According to Amir Khusrau, such a spirit of devotion and dedication should not be light-heartedly condemned. A similar story is found in *Laila Majnun* where we are told about a Hindu ascetic who, while proceeding on his pilgrimage to Somnath, was measuring the road with his paces. Lying on the ground with his face downwards he dragged himself slowly, step by step, with the results that much of the skin of his breast had

was meant for the Muslim readers. They are said to have been in comparable ring dove and turtle doves (fakhta and qumri) quite distinguished from the black crows (Zaghan Sayah ru) characterised by darkness of unbelief and infidelity with hearts full of black biles of errors and sins. Throughout the bulky volume one comes across of only 6 or 7 names of the Hindus. Balchand, the crow faced, Saunpal, the zargar or goldsmith, Narayan raughangar or oil presser, Nepal Khuta, Deochand etc,. All other names of different sections and of sexes and racial extractions are those of Muslim society. Amir Khusrau writes derisively and sarcastically about many of them also, but he showered choicest condemning epithets on the people of the major community.

We cannot miss the marked contrast in the writing and feelings of the great patriot and the first national poet of India. There are not factual evidences of many things recorded in the *Rasa'il* but what we find in the work leads one to think that the Amir had not got out of the rut and risen above the level of men imbued with false sense of superiority and resembling the narrow minded Mullas and conservative and even reactionary theologians of the time, despite his deep devotion and sincere attachment to the renowned Chishti Saint, Hazrat Nizamuddin Aulia Mahbub-i-Ilahi who was an embodiment of large-hearted liberalism and catholicism. The Amir, sometimes, fails to furnish proofs of his broad-minded views of toleration. The credit that is given to him for initiating and releasing the sympathising forces, liquidating barriers, social, religious, racial and linguistic, and making the development of the common cultural phases and outlook a reality, will require more cogent, authentic and specific proofs, than what we get in the *Rasa'il* which catered to the tastes, desires and tendencies of his Muslim fellow people.

The Hindus very often extorted the admiration of the Amir. This we find mostly in his Masnavis. In *Nuh Sepahr* he writes about the remarkable fidelity of the Hindu males and females to their object of love and devotion and incidentally he tells us of the age-old socio-religious customs which formed a confirmed feature of India. The dying of the Hindus for expressing their fidelity and sincerity was not an uncommon affair and such as to

pen; that as long as I do not pat it at its back with my hand, there is no playing to and fro; and that as far as the sword was concerned I had no hand over it in any way."

In the long account of this *Ma'rika-i-Saif-o-Qalam* there are other things which can be peeped through the figures of speech. Being touched and inflamed by the oral reproofs of the sword, the pen became highly infuriated and began to emit the blackish smoke of its heart's core like the reed pipe (flute). It said "Oh you who are like a juggling Hindu (*Hindu-i-Qarachuli*) and have become a protege and plaything in the hands of the Hindus; being deeply immersed like the Brahman in the Baids (Vedas) you are slumbering as a faithless one (bedin) within the scabbard with your bodies smeared with ashes like the idol worshippers of Benares; and you consider that to be the purification of your soul. You call yourself a Mehrabi (the curved or arched blade of the scimeter resembling the arches of mosques) and bring on the question of woollen garb and the shearing of the pain of the head."

One feels tempted to compare what Amir Khusrau writes in his Masnavis or *Qiran-us-Sa'dain*, *'Ishqia*, and particularly *Nuh Sepahr* with what one finds in *Miftah*, *Khaza'in*, and much more in *Rasa'il*. One can understand and also make some allowance for what the Amir writes about *Hinduan-i- palid* (of impure faith) and *Dauzakhi* (hellish) in *Miftah* and *Khaza'in* for they deal with wars and campaigns against the infidels, but it would not be so easy to explain the highly derisive language used in the *Rasa'il* which does not deal with campaigns and conquest in a country dominated in number by the unbelievers. It does not look well for the great patriot and sincere lover of India which he took to be a paradise on earth, to refer to it as an abode of darkness (*Zulmat-i-Hindustan*) and to the Indians as men of bad faith (*bad kish*), crow-faced (*zaghru*) with hearts as hard as iron grown rusty (dil-i-ahanin zangar girefta). The *Rasa'il* was not written with an eye on the good will of men like Qutbuddin and more specially of the renegade Hasan Khusrau and the latter's relations and fellow people of Bradu tribe of Gujarat. This work, colossus in size, overburdened with a profusion of figurative language, and of artificially constructed words and expressions conveying far-fetched double meanings,

and their religious philosophy and culture had good deal of justification for his enthusiasm and pride in being a Hindustani and the parrot of India had to thank his Indian rather his Turkish ancestors. Though he often accompanied the army while it was on the march or active in the field and he writes much about wars and armament, strategy, organization, implements, equipments and weapons of various kinds, he never gave evidence of his warlike propensities and martial pursuits for which the Turks have been world famous. Neither he nor anyone of his contemporaries or even any later writer has given the least indication or reference that he weilded his sword, grappled with his enemies and shed their blood. He used his pen and not the sword against the Mongols who had taken him along with his friend, Hasan Sajazi, the Sa'di of India, as their captive, and dragged them for miles and miles together by tying them with ropes to their horses. Hasan never wrote a word about it but Amir Khusrau chastised them by satirizing the barbarian hoids who wore baggy cotton cloaks and caps of sheepskin, had extravagantly long mustacheo and scanty goat beards and their bodies were covered with lice and they devoured dogs and pigs with their nasty teeth in their foul emitthing mouths. He was conscious of his weak point. In *Ghurrat-ul-Kamal* Khusrau compares Poetry with Music and gives reasons for his preference to the former. In the fifth of his *Rasa'il* a considerable portion has been devoted to a dialogic contest between pen and sword with the scale being made eventually to weigh heavily against the latter. A portion of the concluding extracts shows the Amir's self confession. In this contest the pen was at its best in giving lucid exposition of its view point, and the sword was manoeuvring to take the offensive and rebut all the propositions and arguments of the pen. Suddenly the pen tipped its point in the inkstand, and the sword getting its opportunity, turned its face towards me and said, "Oh Khusrau, you are a Turk and a gem of the sword; come and support me by lending me your helping hand for my strength lies in the strength of the arms of the Turks. I replied that I was indeed a Turk but only in (physical) forms, that my affair could not be well-settled (regulated) without the aid of the

هست یکی این زمین از دور زمن   هست مرا مولد و ماوای و وطن

and secondly, that according to the sayings of the Prophet of Islam, patriotism and love of one's country is an article of faith :

وین ز رسول آمده کای زمره دین   حب وطن هست ایمان به یقین

He never went outside India which was regarded by him as a paradise on earth

کشور هند است بهشتی به زمین

He admired the simple living and high thinking of the Indians, specially the learned class of the Brahmans, who though scantily dressed when performing his ritualistic ablution in cold water at dawn, carried such a great store of learning in his breast that he could tear to pieces all the canonical works of Aristotle :

برهمن هست که در علم و خرد   دفتر قانون ارسطو بدرد

His highly eulogistic descriptions of India and the Indians had some solid foundations. For example, though somewhat exaggerated, his references to the skill possessed by the Indian in producing very high order of textile fabrics and the garments made out therefrom are supported by other evidences :

جامهٔ هندی که ندانند نام   کز تنکی تن بنماید تمام
مانده بپیچیده به ناخن نهان   باز کشائیش بپوشد جهان

And much that he writes about the peculiar features and contributions of the Indians, their store of knowledge and learning

racial extraction, Turks and Hindustani. He refers to his father, Amir Saifuddin Mahmud Shamsi, an immigrant Turk of Lachin tribe, who died fighting in an Indian battle when his son was yet within his teens. He writes much about his maternal grandfather, a converted high caste Hindu, perhaps a Rawat or Rajput, who held the important office of *Ariz-i-Mamalik* and *Rawat-i-Arz* or defence minister for a long time under such a powerful sovereign as Balban who had a very poor opinion of low class people. The heritage of Amir Khusrau from his Indian-born mother and grandfather was greater than that from his paternal side. He admits that he was the offspring of a mixed parentage. He writes :

زنسل عارض‌اسود منم آن نسخت معنی
کز اهل خویشتن یك یك نشانی باز دادم من
سوادی بود از نازکترین دیباچهٔ دولت
زنوك کلك تقدیر و بیان آن سوادم من
خسان را من کنم غرقه گهر را من کنم اجرا
از آن ابر سیه بین طرفه دریائی که زادم من

Describing himself as 'turfa darya' or the wonderful stream and his maternal grandfather as *Abr-e-Seyah* or black cloud, he tells us that he not only belonged genealogically to that black complexioned *Rawat-i-Arz* but owed much to him for his teaching and education, and it was he who inspired him to cultivate his mind and acquire his varied and manysided accomplishments. The sharp and penetrating intellect and the skill to manipulate words and expressions in a variety of ways, were the legacies and an inheritance of his Indian parentage. Besides his intellectual brilliance, his amalgamating and progressive tendencies, his patriotism, intense love for the country of his birth, and his admiration for the contribution made to the world of learning and culture by the Indians can be easily explained. He was quite sincere when he assured his critics that his preferences to India were due mainly to two factors, first that it was the land of his birth,

country. For moulding his notions and sentiments to suit the prevailing atmosphere the poet was rewarded with an elephant-load of wealth.

Quite unlike his much talked poetical work *Nuh Sepahr*, was the imponderable rhetorical work, the *Rasail*, in which the Amir has wraught his literary marvels. The work treats mostly of the people of different types and may be taken to serve better the purpose of those who are interested in social history. It was not an outcome of a desire to please those who were high and mighty nor was it meant to serve the purposes of propaganda. Except the high pitched laudatory epithets lavishly showered, not without some justification. on Sultan Alauddin Khalji, but quite undeservedly on such a man of vile and worthless character as his son and successor, Qutbuddin Mubarak Khalji, who has been atrociously designated as "Hami Hamat-ul-Islam Wal Muslimin" and made to resemble the first of the orthodox caliphs who succeeded the Prophet and the second caliph well known for his justice (Adl-i-Umari was brought back after 700 years-he writes), there is little or nothing in this work to challenge the credibility of the author or to ascribe any mundane motive to him. The varied contents of this work marred by a profusion of figures of speech, curious specimens of verbal quibbles, puns and puzzles, and various kinds of literary devices, all being the invention of the writer, may be confusing to a modernist and are not easily intelligible and understandable to a reader of an average capacity. But they have got the value in that they have a great relevance to the spirit of the time and the tastes of the people. Amir's literary effusions in this work relate to the people and represent the portrayal of their social lifes and cultural forms of activities and of the behaviours of various classes of people, mostly of Muslim faith and professions and of the urban areas.

Amir Khusrau was the product and also an exponent of a new epoch and of a synthesised culture which was made up of elements, alien and indigenous, with opposites reconciled so as to appear as one unified whole. He was one of the rare types of writers who are self-revealing and self-expressive of their personalities, modes, emotions, thoughts and opinion. His personality was a sample of a cross-section of population combining the qualities, traditions and culture of different types of

and rhetorical works of Amir Khusrau may turn out to be very valuable working hypothesis for sociological studies. One has to apply historical methods for enquiring into the reality of things about the social aspects of the period. In judging Amir Khusrau as a social historian from his literary works we have to differentiate those which he wrote at the behest of kings and princes and deal with the courts and courtiers, costumes and apparels, varieties of menues of the table, appurtenances, equipments and parapherenalia, displaying their pomp and grandeur, from those which he wrote because of some inner urge and impelling influences to display his talents and press his view-points about arts and letters upon the attention of people of literary tastes. We should not be oblivious of the fact that the Amir had his limitations as a social historian. Much is made of the oft-quoted *Nuh-Sepahr* in which the writer is at his best in asserting the superiority of India and the Indians to all the countries and peoples of the world. He has written in it about the climate, famine, flora, and fauna of India, knowledge and learning of the Hindus, their contributions in scientific, literary and cultural spheres and to religion and philosophy. All this is taken as proof positive of the poet's passionate patriotism and his emotional love for the country of his birth. One should not ignore the stark reality that the great poet writes differently and rather contemptuously, about the Hindus elsewhere. His much admired Brahman of *Nuh Sepahr* loses his lustre in *Matla-ul-Anwar* where he says that the cow worshipping Brahman is an ass and so is one who venerates the cow-dung. He had a remarkable knack of swimming along the currents, changing and adjusting himself to every changing situation, and worshipping the rising sun, completely forgetting the benefits he had received from the sun that was set. It is not reasonable to suppose that his real feeling of respect and regards for the Indian intellectuals and emotional attachment to and love for the land of his birth was mixed up with and was influenced, to a considerable extent, by the desire to please the particular social group which was then in power. We can presume though we have no clear evidences that he was motivated to please Hasan Khusrau and his Baradu fellow-tribesmen who held a dominant place in the court, freely practised their Hinduism, and were perhaps imbued with the idea of changing the political complexion of the

widely travelled, moving freely in all circles, not only in the imperial metropolis, Delhi, but in the different parts of northern and peninsular India, he had the capacity and excellent opportunities of seeing and judging things for himself. His semi-historical Masnavis and the *Miftah* and the *Khazain* that he wrote about the first two Khalji sovereigns and their campaigns and conquest in the north and the south, suffer not only from verbose, ornate and overdramatized descriptions, but also from a certain lack of candour in that, due to compulsion of circumstances, and exigencies of the situation. He had to omit certain inconvenient embarassing facts such as the atrocious murder of the first by the second of the Khalji ruler, some Mongol victories over Delhi army, the charge of parricide of the first sovereign levelled by some against the second of the Tughlaqs, and above all the strained relations between Hazrat Nizamuddin Aulia and some of the Mamluk, Khalji and Tughlaq Sultans. Be it said to his credit, however, that he had the courage sometimes to include in his panegyrical odes his ideas on conduct and duties of kings, and that he ignored but did not distort facts.

There was a good deal of justification for the considered view of the late lamented Dr. K.M. Ashraf that Amir Khusrau was pre-eminently a historian of contemporary social life, for what he has written about life and conditions of people from birth to death, about their food and drinks, cloths and costumes, toilets and ornaments, sports and amusements, manners and customs, social relations and behaviour, varied professions, means of livelihood, marriage and family life, arts and crafts, recreations, hunting excursions, agricultural and irrigational methods, language and literature, learning and education, virtues and vices of society, may be taken, when shorn of all verbiage and artificial literary ornamentations, as a fairly understandable delineation of what had existed or had been seen or thought about by our author. Such information as Amir Khusrau has furnished us within his Masnavis and in his *Rasail* enables us not only to theorise but also to get at the truth about the social conditions and cultural patterns of the age he lived in.

Considering the paucity of materials about social life in what are professed historical records, the allusions and references, remarks and observations, even of wit and humour in the literary

important in their own ways, for they sometimes provide valuable data which are useful in sociological studies, they are much too tinctured with superstitious beliefs, saturated with conservative traditions, preconcerted, irrational notions and beliefs, bias and prejudices, and tainted with a generality of puerile trifles. Much that is extraordinary, improbable and incredible is taken as miraculous and accepted as facts, and too much stress is laid on formal rituals and empty recurring of prayers. But even literary and religious sources with all their limitations are not absolutely devoid of importance because of the proximity of the time of the facts and things they record, the tastes of the age they indicate, and the picture of the times they depict. For our purpose and on this occasion it would suffice to concentrate on the most outstanding of the literary sources available to us in the works of Amir Khusrau, a man of versatile genius, of varied interests, humane and a humanist, liked by all classes of people, high and low, saying something about all whom he came in contact with. He was, however, not a Sufi in the proper sense of the term and many things attributed to him need critical survey and assessment. The chief importance of his works lies in the selection of Indian themes reflecting the tendencies, spirit, tastes, level, and pattern of society, culture, learning and conditions in general of the people of his age.

Some of his works like *Tarikh-i-Alai* or *Khazain-ul-Futuh*, *Miftah-ul-Futuh*, *Ashiqa*, *Nuh Sepahr* and *Tughlaqnama* have been included among the many different types and classes of historical literature. His *Kulliyat*, the five *Diwans*, and the *Khamsa* Masnavis, and his stupendous five-volume *Risail-ul-Ejaz* were neither command performances nor do they deal with historical themes; they were the outcome of some inner urge, and what we get in them about the things of social and cultural import, after sifting the miscellaneous materials and clearing the grain from the husk are well worth our special attention. Amir Khusrau never claimed himself to be a historian, dealing with the past as a lesson for the future. He was interested in contemporary history and was largely concerned with what came within his personal experiences, and he made his observation about men and things, events and episodes of his own generation. Being a man of high connection, possessed of an inquisitive mind and keen observant eyes, deeply learned,

Amir Khusrau as a Social Historian

History has been generally considered as chronicles of kings, courts and conquests; and not as a record of the varying fortunes, variation of manners and beliefs of the people of a country like India. It is the narrative of occurrences and events, exploits, wars and politics, virtues and vices of rulers, foreign and indigenous which mattered most for the chroniclers and was the main reason for their attraction. They exaggerated the events, essentially political and military, ignored or paid scant attention to, or underestimated their social bearing, progress, or deterioration which were the outcome of pressures of parties and politicians. There is very little or clearly stated information in political chronicles about social conditions and institutions, groups or grades, social structures, aptitudes and functions, the modes and ideals of life of different classes, of people, upper, lower, middle, commercial, educated, uneducated, professionals, artisans, labourers, agriculturist, wage earners, slaves, beggars and vagrants, etc. of urban and rural areas. One wishes in vain to find in them full and understandable accounts of food and clothing, housing conditions, parts of the noble edifices, the conditions of lowly huts and dark corners, family or domestic life, feasts and festivals, games and pastimes, amusements and ornaments, rites and ceremonies, habits and customs, modes and morality, social ethics, interrelations, superstitious beliefs in omens and charms, astrology, good and bad days, dreams, witchcraft, and so on and so forth.

Important sources of information of such things are often found lying here and there, interspersed and hidden in literary maziness as artifices or in hagiological literatures. Literary works are laden with rhetorical, verbose expressions and sober facts are mixed with, and lost in, fanciful devices, verbal quibbles, hyperboles, and prolix trivialities. The hagiological works, though

17. *Ibid.*, p. 232.
18. *Ibid.*, pp. 83-4.
19. *Ibid.*, p. 23.
20. *Ibid.*, p. 149.
21. *Ibid.*, p. 16.
22. There is a significant line in M. F. 'Kare Nami Bahadur Shah Sawaran Barun Zad Naubate Ba Chand Yaran' (Kare, the renowned brave Warrior and master of the horse came out and beat the forum with some of his followers). But Kare could not be Karad.
23. Amir Khusrau who was so fond of playing upon words with double meanings has given *Kabak* (partridge) and *Taiku* (Quail). In K. F. he mentions the Mongol chiefs, Iqbal, Tai, Bu and Kapak.
24. Rai Bunbal, Haider, Zirak as well as Kadar are not easily identifiable.
25. Compare the celebration in the recent times of *Monchon Ka Kunda.*'
26. *Tughlaq-Nama*, p. 25.
27. *Ibid.*, p. 86. Much more of such things are referred to in the *Ijaz-i-Khusrawi, Matta-ul-Anwar and Hasht-Bihisht.*
28. Generally the Bhats were geneologist or family bards and not the enchanters or *afsungaran.*
29. This 'hai, hai' is different from the auxiliary verb 'hai' of Khariboli. The text of the *diwan* of Hafiz, written or printed in India has this line which, if genuine, is very significant for those interested in linguistic studies. *Saqi agarat hawa-i-ma hai-juz bada mayar pesh-i-mo-shai.* The 15th century saint of Bihar, Qazi ola shuttari, puts this expression 'Khanda Hai Phanda Kahan' in the mouth of the 14th century Saint of Uchh, Makhdum Syed Jalal Bukhari *(Maadan-ul-Asrar).*
30. According to some the addition in the *Ashiqa* came after the death of Mubarak Khalji, for Amir Khusrau could not afford to say anything disparaging of the Sultan in his life time.

reputation, and also to get reward for his literary performances. Viewed favourably he was a historian. It has to be admitted that his works have great historical value and the contributions made by him to historical literature are in no way negligible.

REFERENCES

1. Chapter V of P. Hardy's *Historians of Medieval India* deals with the treatment of History by Amir Khusrau.
2. See H. Elliot and Dowson, *History of India as told by its own Historians*, Vol. III, Chapter XII.
3. Hardy, *Historians of Medieval India*, p. 43.
4. He and his maternal grandfather were very enthusiastic about the characteristic Indian 'chew'. See the writer's fairly long paper entitled '*Betal Chewing and the early Muslims.*' Amir Khusrau writes about Imad-ul-Mulk, the Rawat-i-Arz or Ariz-i-Mamalik: 'I am the first of significant knowledge to owe my decent from that black-cheeked one (black *ariz*), and I have pointed out each and every particular of my family origin or lineage. That black one was the most elegant preamble to the state. I am a creation of the tip of the pen of destiny and a citation of that black one. I drown the dry grass (mean, base and ignoble thing) and bring out the pearl. Behold what a wonderful (ever-flowing) river has come out of that black cloud.'
5. Khusrau, *Ijaz-i-Khusravi*, (Lucknow 1865), Vol. I, pp. 28–31.
6. Strong and weak kings, Wazirs and other officials *Ibid.*, Vol. IV. pp. 40-44, good and bad artisans, Vol. IV, 48-49; also bad *Qazis*, corrupt officials, lawyers indulging in hair-splitting trivialities; theologian; Mashaikhs, good or bad, men of perverted tastes, *mukhannass*, dancers slaves, males and females etc.
7. See Khusrau, *Hasht Bihisht*, (Lucknow 1873), pp. 21–25, for the letter addressed to his daughter, Mastura.
8. Khusrau, *Matla-ul-Anwar*, (Lahore 1280 A. H.), the 10th Maqala, pp. 192–198.
9. They had advanced up to and invested the Imperial capital between 697–705 A. H. See Barani for a detailed account.
10. The question of court attendance, change of residence, rivalry with Khizr Khan, devotion to the saint, acceptance of Khusrau Khan's money, and *soma* were the chief factors.
11. Some of his versions are indirectly confirmed by other sources, e.g., Ibn-i-Battuta describes Khusrau Khan's followers as being the bravest and the greatest who defeated Tughlaq's troops and pillaged his camp.
12. See Khusrau, *Tughlaq-Nama*, ed. Syed Hashim Faridabadi (Aurangabad 1933) The published text which contains many errors wrongly gives '*si sad*' (3,000).
13. *Ibid.*, p. 112.
14. *Ibid.*, pp. 128–29.
15. *Ibid.*, p. 132.
16. *Ibid.*, p. 23.

fellows were engaged with their sorcery to give them protection.' We need not consider the ensigns and emblems of the Tughlaq except that, unlike the Hindus, the distinguished mark of his flag was the peacock feather. As regards the Hindi words and phrases, a number of these have been aptly brought in. It would suffice to quote one very significant line in its original : 'Cho Bukshadand Tir-i Be Khata ra-Bazari Guft' *(hai hai tir mara.)*[29]

Before concluding, it seems necessary to say that Amir Khusrau's historical works have defects and merits of their own. His isolated fragments of historical continuum of about four decades, couched in a highly artificial, affected and obscure language and style cannot be put in comparison with the works of other medieval historians. His understanding of history did not centre upon records of historical occurrences systemetically and chronologically arranged, nor upon a set of ideas, but on persons and certain attractive themes. He does not always write in a straight forward manner, and seldom expresses his real sentiments lest that might offend and annoy those who were at the helm of affairs. He wrote with restraint about people whom he disliked for their character and conduct. He could not turn his eyes away from the atrocious deeds of Malik Kafur and Mubarak Khalji, but he had no hesitation in putting forward a lame excuse for the latter. He wrote in the *Ashiqa*[30] in the lifetime of that worthless son and successor of Ala-ud Din : 'When the unkind or callous *(be mihr)* Sultan became cynical and surly *(tursh chihr)* and malicious towards his kith and kin, he saw it advisable for his state to shed their blood and thought them to be fit for the sharp sword. He decided to become vindictive and malignant so that the country should be freed from co-sharers. He secretly despatched some one to Khizir Khan and disclosed apologetically what he had in his heart (the evil thought) that he was nursing against him.' One should keep a balance in one's praise and blame and should not be unnecessarily severe and deprecatory in one's attitude. It would not be fair to judge the past with the yardstick of the present standard. It cannot be said that Amir Khusrau felt any animus towards those who were vicious and worthless, but it was dangerous to be out-spoken in public life. The favourite of Nizam-ud-Din Aulia, the great saint of Delhi, was not a *khiraqa-posh darwesh* (wearer of Sufi garments made up of patches), and we cannot expect him to have laid bare the character and motivation of the great ones of the time or to have disentangled the casual relations of human events. His primary concern was to demonstrate his literary ability and gain a lasting

also through good fortune. Again, in the battle of Turtaq and Ali Beg you knocked down many heads like so many cauldrons. Your next target was the army of Kapak[23] and Taibu. You were responsible for the killing of the infidels, one by one. Again, near Bunbal, by the side of the river (sea), the army of the infidels had assembled like a river. It consisted of one Tuman (10,000) of fighting infidels. Similar was the number of the Rai of Bunbal.[24] The earth was bending under the weight of the infidels like a river. Your glorious name was Tughlaq-i-Ghazi and the Mughal also bore the name of Tughlaq. You Tughlaq had taken the sword in hand for the sake of the holy war. That Tughlaq had kept the arrow in the handle of his bow for the sake of the infidels......You pierced the heart of the infidels with your glance and made them all captives or slaves. You also exacted money from the Rai of Bunbal, and realised the river tolls for the year. You then marched against Haider and Zirak and broke the rank and file of those valiant ones. In this way you fought eighteen battles here and there, and in all these you came out victorious.'

The *Tughlaq-Nama*, like other works, is not devoid of things of social and cultural import. That it was a well established custom of the time to give a feast and entertain the guests at the first sign of the incipient beard,[25] is evident from the pathetic words of prince Abu Bakr, addressed to his miserable mother, just when he was about to be killed by the assassins. 'The down on the cheek of the youth is the signal for festive hospitality ; you may mourn for me without any mourner.'[26] We get here a glimpse into another prevalent practice. You see many jacket (or gown) wearing brides wandering about in the street of this city full of lusts.[27] Referring to the Hindu warriors, Amir Khusrau writes : 'There were Ahir Deo, Abar Deo, Amar Deo, demons upon demons, Narsih Sainsih, Barsih, Harmar, Bairimar, Parmar, all serpent-like and shouting *mar-mar* (strike, strike). The sandal-coloured robes on their bodies made the moist sandlewood dry with shame. All had wrapped themselves with a piece of silken cloth, ready to die, and felt proud of possessing bejewelled swords. Yet it is the custom with the Hindus that when they march out for battle, they wrap their heads with a kind of silken cloth called *baharaman*......By tying the tail of cows on to their flags the Hindus associated hundreds of violence with the hairs of the cow's tail. Many of them had hog's teeth hanging from their necks, symbolizing their ferocity and suggesting that they were in no way inferior to tigers. The war Bhatts[28] (bards) of those worthless

life of the age. Actually, very few have cared to scrutinize its contents, carefully and critically, and an ardent student of history is bound to be rewarded with useful information lying scattered here and there in it.

That the works of Amir Khusrau form a handy mine of factual information, which should not be taken to be historical irrelevancies, can be easily established. The historian Barani, at times, quotes him to confirm some of his views. In many particulars Barani's assertions are supplemented by the facts furnished by Amir Khusrau. There are many things which are found in his works alone. An example here will do. Barani tells us very little about the early life of the founder-Sultan of the Tughlaq dynasty. Amir Khusrau has put the following into the mouth of those who exhorted him to assume the crown : 'When the men of sober counsels heard this, they said what you have said befits you and is true ; but in throwing away your office you are taking away the pearl from yourself and putting it on others. All of us know what came about on account of your sword as that cannot be described by the tip of the pen. When the Khan (Ala-ud-Din) attacked the fort of Ranthambhor and laid siege to it, then the Rai Karad[24] made a stormy attack so that he should cut the iron siege by the sword of steel. He sent a strong force from within the fort which was like a mountain torrent sweeping off goods and chattels. There was such a loud and confused outcry in the camp of the Khan that one was falling on the other. You were ordered by the Khan to advance, and you went ahead of other chieftains. You displayed such valiant exertions in that battle as to make a whole world distressed. Two-thirds of the Rai's army was cut down and the remaining one-third managed with hundreds of pretexts to stay on. When you returned victorious from there you became a (much sought after) hawk in the hands of the Khan. This was the beginning of your good luck and the dawn of your rising fortune. When the Sultan was gone, the faith and the fidelities of the Tughlaqs remained with you......When another infidel (Mongols) marched against Baran (Bulandshahr) and made many Muslims his slaves like the Hindus, the king (Ala-ud-Din) sent you in that direction. You alone were responsible for the flow of the streams of their blood. There were four Tumans (each being the head of 10,000) and four Mirs (Chiefs) who were all princes of the Tartar dominion. When you encountered that agile, swift-winged force, you did what you did for a small return. When you decided to face the ill-starred Iqbal you came out victorious over him

and useful. There is not much to feel enthused over the ornate description of Delhi, of the Congregations at the Mosque, the lofty Minaret Mazina, and the Hauz-i-Shamsi or Sultani. The outer and inner Hisar (fortified enclosures) of the capital city, situated on the hills, the Shahr-i-Nau, wrongly said to have been built by Kaiqubad, the Rauza-i-Bagh and the river near by. The descriptions of the routes adopted from Delhi to Awadh *(Qiran-us-Saadain)*, Dipalpur to Delhi, *(Tughlaq-Nama)*, Delhi to the extreme southern regions across the Narbada and the Vindhya range *(Khazain-ul-Futuh)*, are not enlightening to some. The detailed account of the march of his army threading its way, stage by stage, from one place to another such as Alampur, Hansi, Madina, Rohtak, Mandoli, Palam, Kashanpur, Lahravati, *(Tughlaq-Nama)* is, perhaps, not of sufficient importance to catch the critic's eye, nor does the receipt of the letters by the provincial rulers of very distantly placed regions within the shortest possible time throw any light on the means of transport and communication available in the 14th century. As regards Ala-ud-Din's campaigns in the north and the south, though the dates, even months, have been given, the names of places, rivers and passes have been mentioned, and some indication is there, such as the reference to the availability of diamonds in abundance, the scheme of topography and chronology falls short of a historian's handiwork. It is not realised that many of the places mentioned are not easily identified because of their changed names on modern maps.

If the function of the historian is to enlighten and illuminate by throwing fresh, almost new, light on, and adding to the existing stock of knowledge of the past, then the wealth of solid, factual information, not available elsewhere, and furnished by Amir Khusrau's works, specially the *Miftah*, *Khazain*, and *Tughlaq-Nama*, entitle the author to be called a historian. Though the *Ashiqa*, *Nuh Sipihr*, *Qiran-us-Saadain* and even the *Risail-i-Ijaz* are not wanting in valuable information of political value, they are works of solid worth for those working in the field of social and cultural history. Of these the highly verbose, artificial, wearisome style of the *Risail*, which contains, in four big volumes, the accumulated mass of specimen letters and documents emanating from the inventive mind and prolific pen of Amir Khusrau between 682/1283 and 725/1325 have scared away scholars, and has been dismissed as a book of imaginary epistolary correspondence, full of frivolous futile matters, having no bearing on the political, social, intellectual and cultural

that the Delhi forces of Khusrau had already advanced upto Sarsuti, instead of being frightened by the numerousness of the enemy army he felt happy. He showed mirth and hilarity at his prospects like the ferocious wolf at the abundance of sheep and ram.'[18]

Amir Khusrau has been charged with not 'conceiving of human individuals as acting in or being acted upon by historical situations as modern historians would conceive them.' Some of his lines are well worth one's consideration in this connection. 'Such is the sure and certain narration of the story that whatever happened to Qutb-ud-Din (Mubarak Khalji) it was pre-ordained by the True Power.'[19] One single significant line tells us a lot about the whole background of Khusrau Khan's episode : 'If unfitting things had not been practised upon me such things would not have come out from me. I would not have committed this treachery.'[20] This laconic but meaningful reply, given in explanation of his misdeeds, refers to the root cause and to, perhaps, not an unjust grievance. What has been displayed in all its nakedness by Barani has been left unspecified by our refined and cultured poet-historian. He has not, however, spared his erstwhile deceased patron, has laid bare his character and conduct which caused his ruin, and has waxed eloquent on the consequences of licentiousness and negligence of rulers. 'Wine and love, lust and youth, pleasure and enjoyment, dominion and success. How can one whose mind is filled up with such air currents give thoughts to, and feel concerned with, the future ? It does not behove the ruler to become immersed in love and lust. A king is the constant protector of God's creatures. It would be wrong for such a guardian to remain intoxicated. If the shephered spoils himself by the use of pure wine, the herd goes in a state of sleep in the stomach of the wolf. In law, which means the rules and regulations of the Government, the stability of (political) affairs lies in vigilence and watchfulness. How can it befit a man who holds in his fists the cash of regions to lie carelessly on his back in his bed. It is not becoming on the part of a person to sleep over his affairs, for eventually he may be weighed down by the burden of his own remorse. This is specially the case with a king, for the enemies near his skin are much greater in number than his friends.'[21] If history has a moral purpose, such views and observations against the background of political events, as we find here and elsewhere, cannot be dismissed merely as trivial, unrealistic and conventional.

Amir Khusrau's critic does not find the particulars of geographical areas and topographical details given by him to be illuminating

the horse), had not lost their heart after their earlier discomfitures.' 'Malik Ghazi was standing in the battle-field, while his cavalry was engaged in plunder and pillage. All of a sudden a tumultuous Hindu horde, lying in ambush, appeared to deliver a severe assault. More than a thousand of Braus of black visage made a furious onslaught, and the Hindi daggers moved swiftly in shedding blood. That contingent of the Braus force fell on the standard and the rods of the banner were broken into pieces. The banner and ensign of Malik Ghazi were laid low on the ground. All glory to God. 'What a bold heart was possessed by Malik Ghazi that in spite of this severe and surprise attack he did not stir out of the place he was occupying !'[14] This is followed by the lines indicating the measures adopted and the efforts put up to retrieve the situation. Here our poet-historian philosophises : 'When fortune places the crown on the head of a person, his enemy is annihilated in consequence of the damage done by him. Whatever lock is handled by him, every one of his fingers does the work of the key. If you see with discernment, you will find the quality of capability and fitness in everything through the ordination of Providence.'[15]

Was Tughlaq's victory and his eventual enthronement a mere accident, or was it destined by the Causer of Causes that he should act in a way so as to prevail ? Amir Khusrau's critic has a fling at the 'moral Islamic way' in which vicissitudes of fortune overtaking the Alais' family was lamented, but he does not fling his searching eyes on some significant lines which could provide answer to one of his charges about the non-mention of the sources of information.' 'Such misfortunes and calamities about which I used to hear before have now been seen by my own eyes.'[16] This observation occurs in connection with the detailed and pathetic account of the gruesome murder of the two princess, Farid and Abu Bakr, aged 15 and 14, who had received good education and had anished the Quran. One was practising archery, another was an intelligent boy interested in calligraphy, and both were in the act of prayer after performing the ceremonial ablution with dust in the absence of water when they were cut down by the sword of the ruffians. The sad and piteous tale of the blinding of the three surviving princes, Ali, Baha, and Usman, aged between 8 and 5 has been described on the testimony of a reliable eye witness. 'It is from the afflicted heart of one who was an eye witness of the calamity that such things have dripped out.'[17] Elsewhere, after dilating on the virtues of truth and fidelity, our author refers to a well-informed witness. 'Thus said one who was very well-acquainted with affairs that when Ghazi Malik came to know

Shaaban, 720, near Hauz-i-Khas of Delhi, our author says that a contingent of the usurper's army of probably ten thousand warlike Bradu (also spelt as Braus) cavalry broke through and paralysed the forces of Ghazi Malik, who was left only with 300[12] soldiers to rely upon. Nothing daunted, he stuck to his place. His bold stand and brave words inspired some of his followers led by Bahram Aiba, Baha-ud-Din Shaista and Malik Shadi. But they were hardly 500 in number. Let us read what Amir Khusrau has written in the *Tughlaq-Nama*: 'When all these gathered together they came to 500 and even less than that. When Malik Ghazi looked in front and behind he found only this small force and nothing more. But he did not care about the huge horde which he fancied was surrounding the umbrella (*chhatra*). He cried out "God is great" at the top of his voice, and rushed forward foaming (as waves) towards the (opposite) umbrella and its bearer. He delivered his assault, boiling with rage, with such a fury that the entire battle-field began to resound with it. The impetuous attack of that excellent one of faith caused the confused assembly to become doubly confounded......In whatever direction Malik Ghazi turned his reins, no sooner the enemies saw him than they seemed to be giving up their ghost. A man suddenly appeared before him and at once received a fatal wound from an arrow. Then boldly, and with a fierce charge, he struck down the umbrella (*chhatra*) with such a hard blow that it fell upside down on the head of the luckless fellow (Khusrau). With the fall of the umbrella on the ground the order and arrangement of the enemy and the ceremonial dignity and insignia (carried as ensigns upon the elephant) fell in disorder. Hasan (Khusrau) was in headlong flight with his fleeing forces and the trumpet was blowing heralding proclamation (of Victory).'

Fortunately for the valiant Tughlaq his chief opponent was spiritless and over-awed. But by unloosening the purse-strings of the accumulated treasures, and playing, perhaps, on the explosive sentiments of his erstwhile fellow-religionists he had gathered an immense horde around him. There were the intrepid, desperate, 'Braus, arrayed in front of the war elephants.' 'Ten thousand cavalry of Ranas and Rawats,' and self-seeking Muslims 'who had become the attendants and servants of the Hindus and their constant companions and shadows.' In fact his army was so heavily manned by Hindus and Muslims as to astonish both the infidel and the faithful.[13] The Braus, each one of whom was swift and agile on the back (of

sallied out and rushed like a river full of raging waves. In this furious (sweeping) charge they showed such firmness and constancy that one wing of the army of Malik Ghazi was dislodged and overthrown. Having penetrated through the opposite array of forces they fell on the rear. So much tumult and uproar arose among the people that one set of them fell upon the other. Many of the strong and sturdy troops took to flight and every one turned his bridle towards different directions. (But) Malik Ghazi did not leave his place with a small company of his troops, for he felt a pleasure in fighting for his life. Besides a single company of 300 cavalry behind him, none remained either in front or at the back. When Malik Ghazi saw the situation he was furious with rage and burst out angrily before those who were present. 'So long as my head remains in its place I shall not be alone. I would not look for help towards others for God is my helper.'

These extracts speak for themselves about the sane and sober attitude and methods of Amir Khusrau. But they may not be taken into account by those who think that 'Amir Khusrau's figures are either Virtuous or Vicious. They are gods or devils, not men.' The reference in the last sentence to the prospective Tughlaq Sultan's reliance on God may be provoking for one who contends that not only for 'Amir Khusrau but for all medievel Muslim historian and biographers, human characteristics are created outside the world of time and events, that is by God.' The orientalist and occidentalist ways and systems of religious and social thought do not always tally. It is the orientalist view that outstanding individuals are important in history, but an Invisible Power also plays, at times, a large part in making or marring their fortunes. The effort and endeavours of men are really responsible for the outcome of events and occurances, but human actions are always subject to the Divine ordination. Ali, the fourth Caliph, said : 'I have realised the existance of the Divine Power by the failure of my firm resolutions.' The Quran says : 'It often happens that the armies which are very small in number come out victorious over those which are numerically very large and superior.' The Western scholars, wedded to the materialistic view of life and actions, cannot appreciate these statements. But historical literature is not wanting in illustrative instances of unexpected occurances. It is worthwhile quoting some more verses from the same work.

Continuing his narrative of the second fight, on the initiative taken bv Khusrau Khan, on Saturday the first of the month of

intellectual honesty of our poet-historian, we have to take into account the prevailing atmosphere of the days of the despotic, meddlesome rulers and the need of advisable appropriate concealments. Partial omission of some provocative particulars, colourful verbose, literary presentation of facts and characterisation of high dignitaries were permitted by the stultifying conventions of the time, and they do not necessarily mean a tendency towards wilful suppression of truth. In fact, some of Amir Khusrau's seeming over-dramatizations, or over simplifications or even omissions and gaps do not matter much, for what emerges from his ornate and embellished picture is generally an accurate presentation of historical matters, including some new[11] facts not noticed by others. Amir Khusrau was a man of religion with a sense of dignity and responsibility. We may not forgive the historian in him for not bringing forward all the facts known to him, but considering his difficulties and limitations we cannot charge him with deliberate distortion of facts. On the other hand, we have evidence that he had an open, impartial and even a magnanimous mind. While writing about the apostates, oppressors and exterminators of the Alai family, regarded as their worst enemies by the contemporary Muslims, he gives an unmistakable proof of a refreshing candour and objective attitude.

Those who have gone through the pages of Barani relating to the atrocious deeds committed by Khusrau Khan and his accomplices, may compare his fulminations and invectives against the people described by him as accursed and foul Parwari outcasts and scavengers, with the following verses of Amir Khusrau on page 19 of *Tughlaq-Nama :* 'Many Hindus who are known as Bradus had joined him and had become his accomplices in his perfidious deeds. Bradu is the descriptive epithet of those interpid Hindus who risk their lives (heads). These martial people are reckless of their lives and also know how to knock down the heads of others. This class of people are always in the front rank of their rulers, and are ever prepared to sacrifice their lives at the behest of their rulers. The unbelieving infidels, not looking into their futurity, are, in a war fought all at once, like ten-headed demons. Hasan (Khusrau Khan) assembled and stationed them all at a place (treasury) and put on their feet fetters of gold.' Again, on p 124 we are told about the fierce offensive taken by those dauntless warriors and the initial success that they achieved. When the two armies came to face each other with firm determination to create cracks in the opposite ranks, conquer and overthrow them from the side of the luckless Khusrau, one flank of his army

and chronologically, giving a connected and systematic account of the past and making valid historical analysis. But history with Amir Khusrau was contemporary history, and, he could not shake off his obsession with literary accomplishments.

Amir Khusrau has nowhere claimed to be a historian, and has frankly told us that he wrote his desultory studies on important historical topics either on the suggestion of, or for presentation to, the reigning sovereigns. There was no inner urge to do so. History cannot be written without some basis of selection from the multitude of happenings which constitute the quarry. Amir Khusrau's selection appears to be arbitrary and not in accord with what was inherent in the events and themes dealt with. But the principle of selection in most cases was not of his choice, but was dictated. He pours forth his eulogium with hyperbolic exaggerations not only on Ala-ud-Din, who was great in many ways, but also on his worthless and despicable successor in the *Nuh Sipihr*, and even in the prefactory[6] remarks of the *Ijaz-i-Khusrawi*. Even the best and the greatest of sovereigns had their virtues and vices, but Amir Khusrau is said to have been concerned with all that was good and he skips over all that was bad. Even a cursory glance over some of the pages of the ponderous volume of[6] the *Ijaz-i-Khusrawi* and over his observation in his romantic Masnavis, the *Hasht Bihisht*[7] and the *Matla-ul-Anwar*,[8] in respect of women, would suffice to enable one to revise such an opinion about him.

Many of the connected facts may have been known to him, but he has omitted some material which, circumstanced as he was, might have been embarrasing for him to recall. Perhaps he dared not mention in the *Khazain-ul-Futuh* or the *Tarikh-i-Alai* the brutal murder by Ala-ud-Din of his uncle and father-in-law, the mild good-natured founder-Sultan of the Khalji dynasty, on 16th Ramazan, 695. He mentions this date as the date of the accession of Ala-ud-Din to the throne. Even in his unofficial work, the *Ijaz-i-Khusrawi*, he ignores the heinous actions of his patron Sultan. We know from Barani about the critical situation created by the Mongols led by[9] Qatlagh Khawaja and Targhi, but Amir Khusrau has nothing to say about the discomfitures of the terrible and unscrupulous Sultan at the hands of his enemies, external or internal. He has made no reference to the uneasy relations between his spiritual[10] guide and Kaiqubad, Mubarak Khalji and Ghiyas-ud-Din Tughlaq in the *Qiran-us-Saadain*, *Nuh Sipihr* and *Tughlaq-Nama*.

But before challenging the character and questioning the

intervention of the Divine in human affairs, nor stereotyped descriptions of events connected with the deeds of kings, courtiers and nobles, unwholesome eulogium on those who were in power, and condemnation of those undeservedly praised during their life time, in total disregard of their good and bad, just and unjust, religious and impious actions. The historian is concerned more with groups than with individuals, more with human decisions than with Divine causation, more with the study of the past than with the delineation and appraisal of the facts and changes occuring in one's lifetime.

One cannot deny the aptness of much of such remarks, specially if one ignores the 13th Century tone, and the situation and the atmosphere of the age in which Amir Khusrau lived. He has been appraised mainly on the basis of his poetical and prose works, and, undoubtedly, he occupies a very high position as a talented litterateur and artist which he so eminently deserved. But his competence as a writer of history is questioned. Would it be fair, however, to say that his works do not contain all that a modernist likes to be the concept and appreciation of history. To what extent are we justified in blaming him for his failure to realise the need of a wide historical panorama, of a continuous, objective, critical, chronological, factual narrative, true to facts and morally instructive, and for his not rising above the pride and prejudices, fashions and traditions of the time ? Did he really miss the bus ? It is true that, as the son of an Amir of Iltutmish who was of Lachin Turkist extraction and the grandson, on his mother side, of a high official of Balban's court and of Indian origin, he had excellent connections in political circles, and had opportunities of observing many of the important events and gathering extremely important historical information from the notable and learned personalities he had contact with.

But history was not his prime concern. Religion, love of art and literature, search for beauty and the fulfilment of his economic needs by legitimate means were his dominant life motives. There was a possibility of his being deeply involved in contemporary politics by virtue of his upbringing and position, but as a Sufi and as one of the famous disciples of Nizam-ud-Din Aulia, he was of the world and also out of it in the sense that although he had to earn for his bread by his literary trade, he kept himself out of the controversial questions and situations arising from the ups and downs in the field of politics and religion. He was a man of learning and intelligence and was capable of handling historical subjects critically

determinatives. Nowadays we think that it is not the factual details, the mere narration in a dry as dust manner, of the series of events that actually happened—which count and constitute history. The more important thing is to say 'how this has come out of that.' A historian is expected to probe into the causes and effects and to find out the forces that helped to shape the events as they occured. The essence of history lies in an enquiry into the past, dedication to truth, objectivity, cause-effect nexus of events and movements, sound and critical judgement, and a sense of reasonableness in historical interpretation. The task of the historian is not like that of an advocate to prove or disprove a major fact or event, but to sift and evaluate the varied and multitudinous source-material and to act in the capacity of a judge and jury. He is mainly concerned with a diagnosis of the total situation on the basis of all available and verifiable evidence. He must tap and state all his source-material.

Judging by the standard laid down above, is one in a position to say that Amir Khusrau made some significant contributions with regard to history ? Can one concede about him what Elliot and Dowson have said about Benakiti[2] that he was a poet as well as a historian ? But a modern Western scholar opines that Amir Khusrau did not write history : he wrote poetry.'[3] The task of the historian is to reconstruct the past. He seeks to probe into things said and done so as to understand the present and predict the future. But the past did not have any spell for Amir Khusrau except when he was impelled by hopes of reward and desire for undying literary fame to carry out the behests of the ruling sovereigns. All his six historical works are characterized by disjointed themes, lacking in chronological sequences by florid, fanciful, verbose style and hyperbolic tone, by artificial literary devices, poetic imageries and literary art forms, sacrificing perspicacity, continuity, and accuracy of historical and topographical details. Looking at Amir Khusrau's life and career, the formative influences on him and the operating principles which might have guided him, a modernist may justly feel disappointed. He had a fairly long life, was possessed of potential capacity to understand and act upon his environment, and to utilise the accumulated experiences of past generations, interpreting them in such a way so as give them a realistic historical pattern and make them meaningful and useful for future generations. He allowed his opportunities to lapse. History does not involve, as Amir Khusrau might have thought, the assumption of unintelligible and inscrutable ways and course of Fate and

AMIR KHUSRAU AS A HISTORIAN

Unlike the philosophic Hindus who viewed this world, including human life, as an illusion and had, consequently, a certain disregard for history, the Muslims, like the ancient Chinese and the Greeks, seem to have had from the very beginning a keen desire to know the past and to collect and keep a record of men and events, happenings and occurrences. Their innate sense of enquiry and historical consciousness made them interested in the course of human affairs and anxious for rescuing the past from oblivion. They began to compile books containing biographical sketches, historical anecdotes and chronicles of events, public or private. Historiography, accordingly, flourished under the early Turks in India. Different types of historical literature were produced in India during the early medieval period. Historical writings of the period were of different variety in respect of style, literary form, outlook, method, content and value. The works of Minhaj Siraj, Hasan Nizami, Fakhr-i-Mudabbir are so different from one another, and also from those of Barani, Afif and others. But they were all professional historians and have been accepted as such by even modern European writers of history. The case of Amir Khusrau who, besides his five *diwans*, has four 'historical *masnavis*', and two prose works, also containing historical matter, is a little different, according to some writers,[1] as we shall see hereafter. The fact is that the view of history in that age was, as a whole, quite different from what we find today. The old medieval tradition of historiography that historical works could be written in a special style and might combine oratory and poetry, cannot commend itself to a modernist who abhors or finds very inconvenient the old patterns of rhetorical history. It is quite natural that the views on history and other subjects held by modern thinkers should have changed with the change of time, and the perspective of historians should not be the same as it was before.

History is now taken in a more comprehensive sense. Some centre their narratives on wars or conquests, others concentrate on law and government, state and politics; and yet others view the economic, social, religious and cultural factors to be important

PROF. SYED HASAN ASKARI (b. 1901), Khujwa, Siwan / Saran, graduated, 1922, from G.B.B. (now L.S.) College Muzaffarpur, got his M.A. (in History) from Patna University, 1924, and B.L. 1925. Was Lecturer in History, Patna College, 1927, Asstt. Professor from 1924 to 1950, and Professor of History from 1950 to 56.

Associate Member of Indian Historical Records Commission, Member of Bihar Research Society's Council and Editorial Board of the Medieval India Quarterly, Served as Hon. Secretary of the Bihar Regional Records Survey Committee, Hon. Joint Director of the K. P. Jaiswal Research Institute, Patna.

He was conferred 'Honoriscausa' by Magadh University in recognisition of his valuable contribution to Medieval Indian History and Culture.

CONTENTS

AMIR KHUSRAU

AS A HISTORIAN

by
Prof. S. H. Askari
Patna

Contents

nters : Liberty Art Press. New Delhi and Patna Litho Press, Patna.
blisher : ——————— Khuda Bakhsh Library, Patna-(Phone 50109)
itor : Dr. A. R. Bedar
nual subscription : Rs100-00 (Inland), 20-00 Dollars (Asian countries), Dollars (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

47

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004
(INDIA)

خدابخش لائبریری

سہ ماہی

جرنل

پٹنہ

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر : ۳۲۴۴۴/۷۷
شمارہ : اڑتالیسواں
قیمت : پچیس روپے

قیمت فی شمارہ : پچیس روپے
سالانہ : ۱۰۰ روپے (ہند)
۴۰ ڈالر (ایشیا)، ۵۰ ڈالر (دیگر ممالک)

فہرست

۱۹۸۸ء

خدا بخش لائبریری نے چشمہ لیتھو پریس، رمنا لین، پٹنہ۔۴ اور لبرٹی آرٹ پریس دہلی سے چھپوا کر شائع کیا۔
ایڈیٹر : عابد رضا بیدار

وُرودِ مسعود

خود نوشت سوانح حیات

از

پروفیسر مسعود حسین خاں
علیگڑھ

خدا بخش لائبریری نے موجودہ صدی کے اردو فارسی کے اہم محققین، ادبا، شعرا اور ناقدین کی خود نوشت سوانح عمریاں شائع کرنے کی ایک اسکیم بنائی ہے۔ 'ورود مسعود' اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ——— ڈاکٹر اقبال حسین، وامق جونپوری اور ڈاکٹر معین احسن جذبی وغیرہ کی سوانح عمریاں بھی جلد ہی شائع ہوں گی۔

ڈاکٹر مسعود حسین (ب ۲۸ جنوری ۱۹۱۹) پروفیسر رشید احمد صدیقی کے شاگرد خاص اور بعد میں ان کے رفیق کار، ماہر لسانیات و دکنیات، اردو ادب کے اہم ناقد ——— اور ان موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ نومبر ۱۹۴۳ تا مئی ۱۹۶۲ علی گڑھ کے شعبہ اردو سے وابستہ رہے، جون ۱۹۶۲ تا جولائی ۱۹۶۸ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے پروفیسر رہے، اگست ۱۹۶۸ تا اگست ۱۹۷۳ علی گڑھ کے شعبہ لسانیات کے پروفیسر و صدر شعبہ رہے۔ نومبر ۱۹۷۳ تا اگست ۱۹۷۸ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر رہے۔ اس کے بعد اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر کے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد اب یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے انھیں پروفیسر ایمریٹس کے عہدے پر فائز کیا ہے۔

اس خود نوشت سوانح عمری میں شائع ہونے والے مواد سے خدا بخش لائبریری کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ مصنف کے اپنے تجزیے اور تجربے ہیں ——— ایسے مواد سے جو بری کسی کو ناگوار ہو نام حذف کر دیا گیا ہے پھر بھی اگر کوئی ایسا مواد راہ پا گیا ہو تو ادارہ کو اس میں شریک نہ سمجھا جائے۔

——— ادارہ

فہرست

ع

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایّام تو

پہلا باب

خاندان۔ وطن۔ ولادت۔ بچپن

وُرُودِ مسعود کی داستان کا آغاز ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء بروز منگل، فجر کی اذان کے وقت غلام حسین خاں کی حویلی سے (جو عرفِ عام میں 'محل' کے نام سے مشہور تھی) شروع ہوتا ہے جہاں بڑے گھر کی بیٹی فاطمہ بیگم نے اپنے چوتھے بچے اور دوسرے لڑکے کو جنم دیا۔ بچّے کے والد، مظفر حسین خاں نے اُس کا نام مسعود تجویز کیا جس کے آگے مورثِ اعلیٰ کے نام 'حسین خاں' کے اضافے کے بعد پورا نام 'مسعود حسین خاں' قرار پایا۔

میرے والد مظفر حسین خاں، چھٹی پیڑھی میں حسین خاں کی نسل سے تھے جو قائم گنج ضلع فرخ آباد (یوپی) میں اپنی درویش صفتی اور علمیت کی وجہ سے 'مدّا خون' (مدّا آخون/آخوند = بڑے استاد) کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ ۱۷۰۵ء کے لگ بھگ اپنے توام بھائی حُسن خاں کے ہمراہ صوبہ سرحد کے آزاد قبائلی علاقے تیراہ سے تلاشِ معاش میں قائم گنج آئے تھے۔ تیراہ، بنّوں کوہاٹ کے شمال میں آفریدی پٹھانوں کا علاقہ ہے، جن کی آبادیاں دُرّۂ خیبر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آفریدی قبیلے کا ذکر پہلی بار سکندرِ اعظم کے مورخ ہیروڈٹس نے 'اَپریدا' کے نام سے کیا ہے۔ اُس کے مطابق اس قبیلے نے سکندرِ اعظم کی فوجوں کو درّۂ خیبر سے گذرتے ہوئے سخت پریشان کیا تھا۔

قائم گنج کی نوآباد بستی میں آفریدی پٹھانوں کی آمد فرخ آباد کے نوابانِ بنگش کے بلاوے پر اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ہوئی تھی۔ بنگش قبیلہ اُن سے قبل آکر گنگا کے کنارے

'پٹیالی ڈانگ' (پہاڑی) کے علاقے میں بس چکا تھا اور اس کا ایک من چلا نوجوان، محمد خاں بنگش، فرخ آباد کے نوابانِ بنگش خاندان کی داغ بیل ڈال چکا تھا۔ اسی نے سنہ ۱۷۱۳ء میں اپنے بڑے بیٹے قائم خاں کے نام پر قائم گنج کا قصبہ آباد کیا اور اس کے ایک سال بعد ۱۷۱۴ء میں فرخ سیر کے نام پر گنگا ہی کنارے بیس میل کے فاصلے پر فرخ آباد کو بسا کر اپنا صدر مقام بنایا۔ نووارد آفریدی پٹھان اپنے اپنے 'خیلوں'[1] کے نام پر قصبہ قائم گنج کے اردگرد محلے بسا کر آباد ہو گئے مثلاً کلاں خیل، ککّی خیل، مَوالخیل، شَکَل خیل وغیرہ۔ بعض محلوں کے نام قدیم بستیوں کے نام پر رہے، ان میں سے بعض میں ہندو مسلمان مشترک طور پر اپنی اپنی حد بندیوں کے ساتھ بسے ہوئے ہیں، جیسے پتورہ، کُبیر پور، چلانکا، چلوکی وغیرہ۔ ہمارا آبائی مکان مَوالخیل میں ہے جب کہ ننہیال پتَورہ میں واقع ہے جو صرف چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ ددھیال کے مکان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ محلے کے دوسرے مکانوں سے الگ تھلگ چاروں طرف باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ ابتدا میں ہمارے پردادا 'غلام حسین خاں' عرف جھمّن خاں کا مکان موجودہ مکان سے تھوڑے فاصلے پر کھیتوں کے درمیان، شَکَل خیل میں واقع تھا۔ اس کی بنیاد کے آثار اب تک موجود ہیں۔ مَوالخیل کا مکان ہمارے پردادا نے دکنی کن ٹنجنٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے دوسرے وکیل بیٹے، فدا حسین خاں کی آمدنی سے ذاتی بھٹّا لگا کر لکھوری اینٹ کا (جسے قائم گنج میں 'کگیا' اینٹ کہتے ہیں) ۱۹۰۰ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بارے میں خاندان میں یہ روایت مشہور ہے کہ دورانِ تعمیر ایک دن انھوں نے نہایت غیض و غضب کے عالم میں مزدوروں اور معماروں کو سخت سُست کہا، اس وقت درویش کرم علی شاہ میاں، جن سے انھیں حد درجہ عقیدت تھی، وہاں موجود تھے۔ وہ نہایت خاموشی سے اس منظر کو دیکھتے رہے۔ جب جھمّن خاں کا غصّہ (جس کے لیے وہ سارے قائم گنج میں مشہور تھے) فرو ہو گیا تو انھوں نے انگلی کے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور کہا "جھمّن خاں! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا تعمیر کردہ نیا مکان آباد رہے تو تمہیں آج کی نازیبا حرکت کا کفارہ دینا ہوگا اور وہ یہ

---

[1] "سرحدی پٹھانوں کی سیاسی اور معاشرتی تنظیم کی اکائی 'خیل' کہلاتی ہے" (پٹھانوں کی دنیا) ان کے اوپر 'جرگہ' ہوتا ہے۔

ہے کہ تعمیر کا کام فوراً بند کر دو اور میرا رتھ لے کر فلاں سادھو کے پاس متھرا چلے جاؤ۔ وہاں چالیس روز تک اپنے مٹھ میں وہ جو خدمت تم سے لے اسے خوش دلی کے ساتھ انجام دو۔"
چنانچہ غلام حسین خاں نے اپنے مرشد کی ہدایت پر عمل کیا، تعمیر کا کام بند ہو گیا اور وہ مختصر سے زادِ راہ کے ساتھ متھرا کے لیے چل پڑے۔ کرم علی شاہ میاں کے سنت دوست نے ان سے چالیس روز تک جاروب کشی کی خدمت لی۔ اس تزکیۂ نفس کے بعد وہ قائم گنج لوٹے اور تعمیرِ مکان کا سلسلہ پھر شروع کیا۔

اُن کے اِس کفارے کا 'محل' کی آبادی پر کہاں تک اثر پڑا یہ محلِ نظر ہے، اس لئے کہ ۱۹۰۰ء تا حال یہ مکان صحیح معنوں میں کبھی بھی آباد نہیں رہا۔ البتہ شادی بیاہ کے موقعوں پر اہلِ خاندان جمع ہو جاتے اور یہ کچھ دن کے لیے کھُل جاتا۔ یا دادا اور والد دِق کے موذی مرض میں گرفتار ہو کر اپنی زندگی کے آخری دن بِتانے کے لئے یہاں آ گئے تھے، یا ہماری دادی بیوہ ہو جانے کے بعد ۱۹۰۷ء میں اپنے بچوں کی ٹولی لے کر چند سال تک اس میں مقیم رہیں اور پھر طاعون کی وبا کا شکار ہو گئیں۔

۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء کو میری پیدائش اسی گھر کے زنانے حصّے کی بائیں طرف والی کوٹھری میں ہوئی تھی۔

میری والدہ کے پاس کافی دودھ نہ ہونے کی وجہ سے مجھے گھر کی دھوبن پنجابی جیردا (جورو) کا دودھ پینا پڑا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس کا اثر میری شخصیت پر کیا پڑا (غالباً کچھ بھی نہیں) البتہ میری آمدنی پر یہ اثر ضرور پڑا کہ میرے برسرِ کار ہو جانے کے بعد ہمیشہ مجھ سے اپنا حق لیتی رہی۔ اور مسلمان ماں کی روایت کے مطابق مجھے یہ دھمکی دیتی رہی کہ اگر میں اس کا حق نہیں دوں گا تو وہ مجھے دودھ نہیں بخشے گی۔ آج جب میں اپنے نواسوں اور نواسیوں کے دودھ کے لئے حفظانِ صحت کے جس انتظام اور اہتمام کو دیکھتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے عہدِ طفلی کو جیتے جاگتے کیسے پار کر لیا۔ میں نے تو دھوبن ہی کا دودھ پیا تھا۔ میرے منجھلے ماموں کو تو گدھیا (گدھی) کا دودھ پینا پڑا تھا! اُس وقت میرے والد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی کرنے کے بعد ریاست حیدرآباد کے ضلع ورنگل میں محکمۂ عدالت میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز

تھے۔ ابھی ملازمت کو تین سال کی مدت نہیں گزری تھی کہ دق کے خاندانی مرض نے گھیر لیا۔ اُن کی زندگی
کے آخری سال مرض الموت میں گزرتا را سی مکان میں گزرے جہاں انھوں نے اپریل ۱۹۲۱ء میں عمر
۲۸ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اس وقت میری عمر دو سال دو مہینے کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ میں اکثر دبے
پاؤں اُن کے کمرے میں پہنچ جاتا اور چارپائی کے پاس پڑی ہوئی جھاڑو اُٹھا کر زور سے مارتا۔
اُنھیں سراسیمہ دیکھ کر مجھے لطف آتا۔ وہ چھُوت کی وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ کوئی بچّہ ان
کی چارپائی کے پاس آئے اس لیئے زور سے چلّا کر پکارتے "ارے کوئی ہے۔ دیکھو یہ مسعود نے
پھر وہی حرکت کی"۔ ان کی شخصیت اور عادات کے بارے میں اہلِ خاندان سے بہت سی کہانیاں
سنتا رہتا تھا لیکن حافظے پر زور دینے کے باوجود میرے ذہن میں ان کی کوئی تصویر نہیں بنتی۔ یہ بھی
سنا تھا کہ وہ بہت کم سخن تھے۔ ان میں ایک خاص قسم کی متانت تھی جس سے ان کے تمام چھوٹے
بھائی خوفزدہ رہتے تھے۔ چھوٹے بھائیوں سے جو اُنھیں 'بھائی جان' کہتے تھے وہ عام طور پر رقعوں
کے ذریعے بات کرتے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اُن میں تحفظِ زن کا افغانی جذبہ شدّت
سے موجود تھا اور ان کی ممانعت تھی کہ والدہ کسی قسم کا باریک کپڑا جس سے بدن جھلکے، نہ پہنیں، بلکہ
اس بات پر ایک بار اُنھیں مارا بھی تھا، جس پر میرے نانا 'جانِ عالم خاں'، اپنی رئیسِ اعظمی کے زعم میں
مکان پر چڑھ کر آئے تھے۔ اس پر میرے والد نے بھی سخت رویّہ اختیار کیا۔ بہرحال معاملہ آگے
نہ بڑھا اور عزیزوں کی مداخلت سے رفع دفع ہو گیا۔

والد کے انتقال کے بعد ہماری والدہ بچّوں کو لے کر اپنے میکے پتورہ چلی آئیں۔ میری نہال
ایک بھرا پُرا خاندان تھا۔ میری نانی صاحبہ اپنی بڑی بیٹی کو بہت چاہتی تھیں لیکن وہ بھی بیوگی کے
صدمے کا کچھ علاج نہ کر سکیں۔ والدہ دن بھر روتی رہتیں، یہ تو دیکھنے والوں کا بیان ہے، دل پر
کیا گذرتی ہو گی اس کا علم کسی کو نہیں۔ بالآخر رو رو کر انھوں نے خود کو اس درجہ ہلکان کیا کہ دماغ
میں رسولی بن گئی۔ سال بھر تک میری نانی صاحبہ اُنھیں فتح گڑھ اور لکھنؤ ہر جگہ علاج کی خاطر
لے گئیں لیکن ہونی اَن ہونی نہ ہو سکی اور بالآخر اپریل ۱۹۲۳ء کو والد کے انتقال کے تین سال
بعد چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو بلکتا چھوڑ کر وہ بھی راہیِ ملکِ عدم ہوئیں۔ میں اس وقت ۵
برس دو مہینے کا تھا۔ اُن کے کل پانچ اولادیں ہوئیں: ۱۔ امتیاز حسین خاں ۲۔ خدیجہ بیگم

۳۔ رفیعہ بیگم۔ ۴۔ مسعود حسین خاں اور ۵۔ شاہد حسین خاں۔ رقیہ کا انتقال اُن کے سامنے بچپن میں ہو گیا تھا۔ شاہد والد کے انتقال کے بعد پیدا ہوا اور والدہ کے انتقال سے کچھ ہی عرصے کے بعد ڈیڑھ سال کا ہو کر، اپنی انّا کی ہڑک میں، جو اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی، اور جسے وہ اپنی ماں سمجھتا تھا، روتا، رلاتا گذر گیا۔ میرے حافظے میں اس کی موت کا منظر محفوظ رہ گیا ہے۔ ننھیال کے زنانے میں چھجّے کے نیچے ایک چارپائی پر اس کی ننھی سی لاش رکھی ہوئی تھی اور خاندان کی عورتیں اس کے نزدیک بَین و بکا کر رہی تھیں۔ بار بار میری والدہ فاطمہ کا نام لیا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر میں ایسا مبہوت کھڑا ہوا تھا گویا میں خود مر گیا ہوں!

اس طرح مظفر حسین خاں اور فاطمہ بیگم کی اولاد کا سلسلہ تین بچّوں سے چلا۔ ۱۔ امتیاز حسین خاں ۲۔ خدیجہ بیگم اور ۳۔ مسعود حسین خاں۔ امتیاز حسین خاں جنھیں میں قائم گنج کی زبان میں "ادّا"[1] کہتا تھا، عثمانیہ یونیورسٹی میں پہلے صدر شعبۂ کامرس اور بعد کو پرنسپل سکندر آباد کالج کے عہدے تک پہنچے۔ ملازمت ہی کے دوران مارچ ۱۹۶۲ء میں حرکتِ قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ میری اور ان کی عمر کے درمیان تقریباً ۹ سال کا فرق تھا۔ اس لئے میرے اور ان کے مابین بڑے اور چھوٹے بھائی کی دوری کا رشتہ قائم رہا، دوستی کا نہیں۔ وہ بڑی محبّت اور مروّت کے انسان تھے۔

میری بیوی کا خیال ہے کہ اُن سے زیادہ نیک انسان ہمارے خاندان میں کوئی دوسرا نہیں ہوا ہے۔ اُن کے بارے میں میرے جذبات کا اندازہ اس قطعے سے کیا جا سکتا ہے جو میں نے اُن کے لوحِ مزار پر کندہ کرایا ہے۔

وہ لختِ دل تھا مظفرؔ[1] کا فاطمہؔ[2] کا لال — محبِّ ذاکرؔ[3] و محبوبِ یوسفؔ[4] و محمودؔ[5]
جہانِ مہر و محبّت کا اک حسین خیال — دلِ خدیجہؔ[6] تھا وہ اور دیدۂ مسعودؔ[7]

[1] یہ لفظ پنجابی زبان میں بڑے بھائی اور باپ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور قائم گنج کی زبان میں اسی علاقے کے پٹھانوں کے ساتھ آیا تھا۔

[1] مظفر حسین خاں (والد) [2] فاطمہ بیگم (والدہ) [3] ذاکر حسین خاں (چچا) [4] یوسف حسین خاں (چچا) [5] محمود حسین خاں (چچا) [6] خدیجہ بیگم (بہن) [7] مسعود حسین خاں (بھائی)

خدیجہ بیگم میری بڑی بہن ہیں جو حیات ہیں اور فی الحال اپنی چھوٹی صاحبزادی کے ساتھ علی گڑھ میں مقیم ہیں۔

والدہ کا چہرہ مہرہ میرے حافظے میں بالکل محفوظ نہیں رہا۔ صرف اس قدر یاد ہے کہ لکھنؤ میں وہ جس محلے میں علاج کے سلسلے میں مقیم تھیں وہاں بندروں کی کثرت تھی جو ان کی تشویش اور میری تشویق کا باعث رہتے۔ دماغ کی رسولی کا اثر اُن کی ایک آنکھ پر بھی پڑا تھا جو انگارے کی طرح سرخ رہتی تھی۔ ننھیال میں بچپن گذرنے کی وجہ سے اُن کا تذکرہ میں بار بار سنتا، اس لیے اکثر تنہائیوں میں ان کو اپنے تصوّر میں لانے کی کوشش کرتا اور جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو بے تحاشا میرے آنسو نکل پڑتے اور یتیمی کے غم کو میں شدّت کے ساتھ محسوس کرتا۔

مورثِ اعلیٰ حسین خاں (ملا آخون) نے پٹھانوں کی کئی نسلوں کی تربیت کی تھی۔ ان کا انتقال سو برس سے اوپر ہوا تھا اس لیے آخر میں ایک صوفی باصفا کی حیثیت سے بہت سے پٹھانوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کرلی تھی۔ ان کے بیٹے احمد حسین خاں اور پوتے محمد حسین خاں نے قلم پر شمشیر کو ترجیح دی اور مختلف رجواڑوں میں فوجی ملازمتیں اختیار کیں۔ ان دونوں کی حیات کے بارے میں تفصیلات نہیں ملتیں۔ پردادا غلام حسین خاں (عرف جھمن خاں) نے ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی۔ وہ افسرالملک کے ساتھیوں میں تھے۔ خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد، ساتھیوں کے اصرار کے باوجود، انھوں نے اپنے وطن قائم گنج کی سیدھ لی۔ تقریباً یہی وطیرہ قائم گنج کے اُن تمام پٹھان گھرانوں کا رہا ہے جو فوجی ملازمت کے سلسلے میں خود باہر رہتے اور بال بچوں کو قائم گنج میں رکھتے، جہاں ہر گھرانے کی کچھ سکنی و صحرائی جائیداد ہوتی تھی۔ آموں کے موسم میں طویل مدت کی رخصت پر وطن آتے۔ اپنی طویل غیرحاضری کی وجہ سے وہ اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ یہی صورتِ حال ہمارے دادا فدا حسین خاں کی تھی جو جھمن خاں کے دوسرے بیٹے تھے۔ اُن کے بڑے بھائی عطا حسین خاں نے تو والد کے نقشِ قدم پر چل کر ریاست حیدرآباد میں فوجی ملازمت اختیار کی اور رسالدار کے عہدے تک پہنچے لیکن چھوٹا بھائی جو جسمانی اعتبار سے بھی کمزور تھا قائم گنج ہی میں رہ کر مڈل اسکول کی تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اس سے فارغ ہو کر کچھ مراد آبادی سامان کے ساتھ وہ ...... حیدرآباد

پہنچے جہاں خاندان اور وطن کے کئی اشخاص بسلسلۂ ملازمت پہلے سے موجود تھے۔ تجارت کے ساتھ ساتھ اُنھوں نے ٹریس کے ایک وکیل صاحب کی توجہ سے وکالت کے امتحان کی تیاری شروع کردی۔ چونکہ اِن امتحانات کا ذریعۂ امتحان اردو تھی اور اس پر اُنھیں خاصا عبور تھا، اس لئے امتیاز کے ساتھ وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ترقی کے زینے کھُلتے گئے۔ کچھ عرصہ حیدرآباد میں وکالت کرنے کے بعد وہ اورنگ آباد منتقل ہوگئے۔ جب وہاں اپنی ذہانت کا سکّہ جمالیا تو ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کی غرض سے پھر حیدرآباد مراجعت کی۔ یہاں اُن کی قانونی ذہانت کے جوہر اور کھلے اور بہت جلد ان کا شمار چوٹی کے وکیلوں میں ہونے لگا۔ پیشہ ورانہ کامیابی کے ساتھ دھَن برسنے لگا۔ اُن کا انتقال ۱۹۰۷ء میں صرف ۳۹ برس کی عمر میں ہوگیا اور انھوں نے صرف سولہ سال وکالت کی، لیکن اس قدر کمایا کہ حیدرآباد کے بیگم بازار میں ایک شاندار دو منزلہ تعمیر کرایا جس کے بالائی حصّے میں اہلِ خاندان کی رہائش تھی اور نچلی منزل میں اُن کا ذاتی پریس تھا جس میں اُنکی تصانیف، قانون کی کُتب اور رسالہ "آئینِ دکن" طبع ہوتا۔ حیدرآباد پہنچ کر وہ قائم گنج کی جانب سے غافل نہیں رہے جہاں ان کے والد مقیم تھے۔ دو گاؤں خریدے اور اپنے والد کو آمادہ کیا کہ وہ اپنی نگرانی میں پختہ حویلی تعمیر کرائیں، جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔ اس حویلی کا زنانہ حصّہ تو قائم گنج کے دیگر متموّل گھرانوں جیسا ہے یعنی ایک کوٹھا ایک وسیع دالان جس کے کناروں پر دو کوٹھریاں یا کمرے ہیں سامنے اونچی کرسی کا چوڑا سا چبوترہ اور اس کے نیچے بڑا سا آنگن۔ البتہ مردانہ حصّہ قائم گنج کی عام حویلیوں سے مختلف ہے اور اس میں حیدرآبادی فنِ تعمیر کا ٹھاٹھ آگیا ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں نے اسے "فدا حسین خاں کا محل" یا صرف "محل" کے نام سے یاد کرنا شروع کردیا۔

فدا حسین خاں کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوگیا۔ اُس وقت تک اُن کے چھ بیٹے پیدا ہو چکے تھے، ساتویں محمود حسین خاں اُنتقال کے کچھ عرصے بعد پیدا ہوئے۔ میرے والد مظفر حسین خاں سب سے بڑے تھے۔ اُن کا سنہ پیدائش ۱۸۹۲ء ہے۔ تیسرے بیٹے ذاکر حسین خاں اور پانچویں یوسف حسین خاں سے سب متعارف ہیں۔ دادا کے انتقال کے بعد ہماری دادی نازنین بیگم جب حیدرآباد سے قائم گنج آئیں تو ان کے ساتھ چھوٹے بچوں کی ایک کھیپ سی تھی۔

محمود حسین خاں کو چھوڑ کر، جو بہت چھوٹے تھے، باقی پانچوں بھائی (چھٹے بھائی جعفر حسین خاں کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا) اٹاوہ اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کر دیئے گئے جہاں سے فارغ ہو کر میرے والد علی گڑھ کالج میں ایف۔اے، بی۔اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے۔ ان کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے بھائی عابد حسین خاں، زاہد حسین خاں اور ذاکر حسین خاں بھی پہنچ گئے۔ یوسف حسین خاں اور محمود حسین خاں نے کچھ عرصے علی گڑھ گورنمنٹ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں نئی قائم شدہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ والد نے علی گڑھ سے تمام امتحانات امتیازات کے ساتھ پاس کئے اور اس کے بعد حیدرآباد جا کر ریاست کے محکمہ عدالت میں مجسٹریٹ ہو گئے۔

میری والدہ فاطمہ بیگم، جانِ عالم خاں (عرف ننھے میاں) اور اصغری بیگم (عرف بی بی) کی سب سے بڑی اولاد تھیں۔ جانِ عالم خاں اس زمانے میں تموّل اور جائیداد کے اعتبار سے قائم گنج کے رئیسِ اعظم کہلائے جاتے تھے اور ان کا مکان عرفِ عام میں بڑا گھر مشہور تھا۔ ننہال کی خوشحالی کے اصل بانی میرے نانا کے چچا حاجی فضل امام خاں تھے جنھوں نے نہ صرف صحرائی جائیداد پیدا کی بلکہ کپڑے کی تھوک تجارت اور نیل کی کوٹھیوں سے اس قدر کمایا کہ پٹھانوں میں ممتاز حیثیت اختیار کر لی۔ وہ لاولد تھے، اس لئے انھوں نے اپنے بھتیجے کو سب کچھ سونپ دیا۔ جانِ عالم خاں انھیں کی جائیداد اور کمائی کے بل بوتے پر ساری عمر جانِ عالم پیا کا کردار ادا کرتے رہے اور رامش و رنگ سے زیادہ سروکار رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے جب علی گڑھ میں اسکول اور کالج قائم کیا تو ان کے گماشتے مسلمان زمینداروں کے نوجوانوں کی تلاش میں قائم گنج بھی پہنچے اور حاجی فضل امام سے جانِ عالم خاں کے بارے میں بات چیت کی لیکن حاجی صاحب کسی قیمت پر اپنے بھتیجے کو فرنگی طرزِ تعلیم دلانے پر تیار نہیں ہوئے۔ قائم گنج کے ماحول میں ان کی اسلامی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا۔ اس لئے ان کی لیاقت اُردو کے مُنشی سے آگے نہ بڑھ سکی۔

میری ننہال نہ صرف تموّل بلکہ مشترکہ خاندان کی آبادی کے لحاظ سے بھی بڑا گھر تھا۔ میرے نانا دو بھائیوں میں تنہا اولاد تھے لیکن خود ان کے نصف درجن سے زائد بچے پیدا ہوئے جن میں سے چار بھائی اور دو بہنوں کی نسل کا سلسلہ خوب چلا۔ میری والدہ فاطمہ بیگم سب سے

بڑی اولاد تھیں۔ دوسری بہن راحت بیگم عرصے کے بعد میرے چچا یوسف حسین خاں سے منسوب ہوئیں۔ ماموں سلطان عالم خاں نے خاندان کی معاشی حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یو۔پی کی سیاست میں خوب نام کمایا اور سمپورنا نند کی کانگریسی وزارت میں نائب وزیر کے عہدے تک عروج حاصل کیا۔ چوں کہ وہ کچھ عرصے تک مسلم لیگ کے بھی سرگرم رکن رہے تھے، اس لئے بعد کے ہر الیکشن میں ان پر اس کی فردِ جرم لگائی جاتی اور بالآخر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ میرے دوسرے ماموں، قدوس عالم خاں (جو میرے خسر بنے) جائداد کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی انتظامی صلاحیت سے جائداد کی آمدنی دونی کر دی، باغات لگائے اور ایک بہت بڑا فارم بنا لیا۔ دونوں بھائیوں میں عشق سا تھا اس لئے کہ میں نے جائداد یا آمدنی کے حسابات کے سلسلے میں دونوں میں کبھی من و تو کا جھگڑا نہیں دیکھا۔ سلطان عالم خاں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی تھا کہ اُن کے پاس مالیات کا ماہر اور فراہم کنندہ ایک چھوٹا بھائی ہر وقت اُن کی پشت پر موجود رہتا۔ میرے تیسرے ماموں، ناکام وکیل اور کامیاب شاعر، غلام ربّانی تاباں ہیں۔ جن کے اور میرے درمیان بہت سی ذہنی قدریں مشترک رہی ہیں۔ وہ خاندان کے پہلے شاعر ہیں اور میں دوسرا۔ ہم دونوں کے علاوہ خاندان کے کسی فرد کو پہلے یا بعد کو توفیقِ شعر نہیں ہوئی، حالانکہ ذاکر صاحب اور یوسف صاحب دونوں کا مذاقِ شعری نہایت لطیف تھا۔ یوسف صاحب نے اقبالؔ اور غالبؔ کے نقاد کی حیثیت سے نام بھی پیدا کیا۔ چوتھے ماموں خورشید عالم خاں، جو ڈاکٹر ذاکر حسین کے داماد بھی ہیں، پارلیمنٹ کے رکن اور مرکزی سرکار کے مختلف محکموں کے ریاستی وزیر کی حیثیت سے جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کی تخصیص یہ ہے کہ وہ میرے ہم عمر ہیں اور بچپن کے ساتھی۔ ان کا مزید تذکرہ اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے وقت کروں گا۔

والدہ کے انتقال کے بعد مجھے بڑی ممانی (بیگم سلطان عالم خاں) نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ وہ بڑی نیک بی بی تھیں۔ ان کا تعلق رائے پور کے ایک ممتاز خٹک پٹھانوں کے خاندان سے تھا۔ میں ان کے ساتھ اکثر ڈولی میں بیٹھ کر اُن کے میکے رائے پور جاتا۔ اُن کی اور میری نانی میں ساس اور بہو کی روایت کے مطابق، اکثر چل جاتی۔ مجھے اس وقت بڑی تکلیف ہوتی جب نانی صاحبہ حقارت کے لہجے میں انھیں "خٹکنی" کہہ کر پکارتیں۔ گویا خٹک کوئی کمتر ذات ہے

ہمارے علاقے میں ایک پست ذات کا نام کیٹ تھا۔ بچپن میں، میں سمجھتا تھا کہ یہ ان کا سلسلہ
اس ذات سے جا رہی ہیں۔ بعد کو معلوم ہوا کہ خٹک پٹھان نسلی اعتبار سے آفریدی پٹھانوں
سے کم نہیں۔ لیکن پٹھانوں کی سب سے بڑی کمزوری ان کا نسلی تفاخر ہے جو صرف دوسری قوموں
تک محدود نہیں رہتا بلکہ جس کی زد میں پٹھانوں کے دوسرے قبائل تک آجاتے ہیں۔ میں نے
سنا ہے کہ میرے منجھلے ماموں، قدوس عالم خاں کی شادی جب علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں
میں ہوئی تو قائم گنج میں اس پر بھی بڑی چہ میگوئیاں رہی تھیں۔

پتورہ کے بڑے گھر کی سب سے عظیم شخصیت نانی صاحبہ یا 'بی' تھیں۔ میری ابتدائی
زندگی پر ان کا گہرا اثر رہا ہے۔ وہ ایک عجیب و غریب شخصیت کی مالک تھیں، ولایتی رنگ
روپ، گوری چٹی، کرنجی آنکھیں اور گراں ڈیل جس محفل میں بیٹھتیں، چھا جاتیں۔ حقہ اور پان
کی شوقین، آخر عمر میں جب منہ پوپلا ہو گیا تھا تو پن کُٹی ساتھ چلتی۔ حقہ کا ہر وقت تازہ رہنا
ضروری تھا۔ وہ پڑھی لکھی تو معمولی تھیں لیکن علم مجلسی سے اچھی طرح واقف تھیں۔ مَردوں تک
کے کان کاٹتی تھیں۔ ڈاکٹر امیر دا (ڈاکٹر محمد امیر خاں) کا بھائی کہتے منہ سوکھتا تھا اور وہ اپنے سامنے
بحیثیت طبیب کے انھیں ہیچ پوچ سمجھتیں۔ ان کے تجویز کردہ ہر نسخے کو 'ہنھ دُت' کہہ کر رد کر دیتیں۔
طبی معلومات رکھنے کے علاوہ چھوٹی موٹی سرجن بھی تھیں۔ دور دور دیہات سے لوگ ٹوٹے ہوئے
ہاتھ پیر جڑوانے پتورہ آتے۔ آج بھی قائم گنج میں ان کی اس مہارت کے معترف مل جائیں گے جنھوں
نے ان کے کھاٹر طریقوں کے ضرب و کرب جھیل کر اپنے اترے ہوئے کولہے یا بازو ٹھیک کرائے ہیں۔
اس قسم کے علاج کے لئے جب کوئی دیہاتی پہنچتا تو گھر کے بچوں کے لیے جشن کا سا سماں بندھ
جاتا۔ پہلے اس کو فرش پر لٹایا جاتا پھر گھر کے ملازمین کی جس قدر کمک مل سکتی تھی وہ حاصل کر کے
اس کو گانٹھ دیا جاتا، اس طرح کہ ہل ڈل بالکل نہ پائے۔ پھر ڈنٹاتے کر نانی صاحبہ آتیں۔ حکم ہوتا
کہ منہ پر رومال ڈال کر پردے کا التزام لازم ہے۔ اس طرح وہ بیچارہ جلاد کی شقاوت کا نظارہ
تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بعد عضو کی رعایت سے ڈنڈے کا سہارا لے کر ہاتھ یا بھاری پاؤں رکھا
جاتا۔ جس دوران مظلوم درد سے بے قرار ہو کر چیختا تو ڈانٹ پڑتی اور پاؤں کا وزن بڑھا دیا جاتا۔
وہ جس قدر بلبلاتا اور 'دیا امّی مر گیا' کی آواز بلند کرتا اسی قدر عضو کو کھینچنے کا عمل تیز تر کر دیا جاتا

غرض اسی دھاچوکڑی میں کہیں ہڈیوں سے چٹ یا کھٹ آواز آتی، اعلان کیا جاتا کہ ہڈی بیٹھ گئی۔ گرفت ڈھیلی کر دی جائے اور دباؤ بھی۔ مریض اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد آدھ مُرا سا ہو جاتا۔ پھر اسے مَلنے کی دوائیں تجویز کی جاتیں۔ وہ روتا ہوا جاتا لیکن ہفتہ عشرہ کے بعد دعائیں دیتا، ہنستا ہوا آتا۔

انھوں نے اپنے دو معرکۃ الآرا علاج میرے اور اپنی پوتی بجمہ پر بھی (جو بعد کو میری دلہن بنی) بچپن میں کامیابی سے آزمائے تھے۔ میری عمر آٹھ برس کی ہوگی کہ مجھے گنڈ مالا (کنٹھ مالا، خنازیر) کا مرض ہو گیا تھا۔ مختلف قسم کے علاج کیے لیکن گلے کی گانٹھیں مکمل طور پر ختم نہ ہوئیں۔ ایک دن بولیں مسعودا کا (قائم گنج میں غالباً پشتو کے زیر اثر ناموں کے آگے ایک الف کا اضافہ کر دیا جاتا تھا) علاج اب میں کروں گی۔ چنانچہ اپنے بنجر پر بسے ہوئے کنجڑوں کو حکم دیا گیا کہ جہاں سے بھی ہو کالا سانپ مار کر فراہم کریں۔ جب وہ آگیا تو اسے کڑوے تیل میں اس قدر اُبالا گیا کہ اس کا گھلوا ہو گیا۔ اس کے بعد اس کو کپڑے میں چھان لیا گیا۔ یہ تھا کالے سانپ کا تیل۔ اب میرے گلے کے دونوں جانب کی گلٹیوں پر روزانہ کی مالش کی جاتی ساتھ میں شکر آمیز کسی چیز کے بیج کے لڈو بنا کر کھلائے جاتے۔ لیجئے صاحب! جو کام مہینوں میں نہیں ہوا تھا وہ ہفتوں میں ہو گیا اور اس کے بعد مجھے یہ عارضہ کبھی نہیں ہوا۔

اسی طرح بجمہ جو کہ تقریباً اندھی پیدا ہوئی تھیں اور جن کے بارے میں ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ یہ لڑکی اندھی رہے گی اس لئے کہ اس کی پتلی نہیں بنی ہے، جب ہر طرف سے مایوسی ہو گئی تو الااللہ کہہ کر اس کو صحتیاب کرنے کا بیڑا خود اُٹھا لیا۔ نانی صاحبہ کو طب کے مجربات کے علاوہ ٹوٹکے بھی بہت یاد تھے جو انھوں نے درویشوں، فقیروں اور جوگیوں سے سُن رکھے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا بچّی کے لیئے روز آدھ پاؤ بکری کے گوشت کے پارچے لائے جائیں۔ یہ پارچے آنکھوں کے اوپر ایک مخصوص مدّت کے لیئے باندھ دیئے جاتے۔ رفتہ رفتہ سُرخی غائب ہونے لگی اور چند ہفتوں کے اندر آنکھوں میں روشنی آگئی۔ ایسی کہ آج ۵۸ سال کی عمر میں بھی قائم ہے!

بی، بڑی اچھی داستان گو بھی تھیں، ایسی کہ گھر کے سارے بچے اُن کے افسانوں

کو بھی حقیقت سمجھتے۔ مثلاً گورکھپور اور اس کے نواح کا (جہاں والد کے ساتھ ان کا بچپن گزرا تھا) ذکر کرتے ہوئے کہتیں، وگھنے گھنے جنگل ہیں، جس میں سانپ ہی سانپ ہیں کہ قدم قدم پر کلبلاتے پھر رہے ہیں۔ کہار ان کی ڈولی لیے جنگل سے گزر رہے ہیں کہ اتنے میں دیکھا راستہ میں پھل ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ کہار اور ملازم دوڑ کر اٹھاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو کنڈلی مارے ہوئے سانپ ہیں! اس کے بعد ہم لوگوں کو ہر راستہ میں پھل ایک لپٹا ہوا سانپ نظر آتا تھا۔

میرے اُن کے درمیان ایک خصوصی ربط تھا۔ کہتی تھیں مجھے مسعود کو دیکھ کر اپنی مری ہوئی بیٹی فَطّو (فاطمہ) یاد آجاتی ہے۔ وہ اکثر مجھے اپنی مری ہوئی بیٹی کی نشانی کہتیں۔ اس پر ہم دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا جاتیں اور میں خیال کی دنیا میں اپنی ماں کو ڈھونڈھنے لگتا جن کی کوئی نشانی میرے حافظے میں محفوظ نہیں تھی۔ چنانچہ اس جذبہ کے تحت مجھے گھر میں کئی رعایتیں ملی ہوئی تھیں مثلاً دن بھر مٹی کی ہانڈی میں کئی بھینسوں کا دودھ ہلکی آنچ پر اوٹتا رہتا تھا، سہ پہر تک اس پر ملائی کی ایک سرخ روٹی سی بن جاتی۔ ملائی میری کمزوری اُس وقت بھی تھی اور آج بھی ہے۔ مجال نہیں تھی کہ انکی اجازت کے بغیر اس کا ایک ٹکڑا بھی کسی کو دیا جائے۔ وہ اسے بلو کر پہلے مکھن بنائیں اور پھر اُرد کی دال اور جاڑوں میں کھچڑی کے لیے اصلی گھی نکال لیتی تھیں۔ لیکن جب کبھی یہ اُن کی 'مری بیٹی' کی نشانی' بالائی پر بالادستی کر بیٹھتا تو اُسے کچھ نہیں کہتیں۔ "چلو اُسے کھا لینے دو" بس یہ منہ سے نکلتا۔

ننہال میں میرے ہاتھ میں پیسہ بہت کم آتا تھا۔ نانا صاحب بیٹوں اور پوتوں کو تو اپنی داد و دہش کا درخور سمجھتے تھے، لیکن نواسے اور لڑکیاں ان کی مرحمت کے دائرے میں بہت کم آتے۔ مجھے کبھی کچھ ملتا تھا تو نبی ہی سے۔ یہ خاص طور پر اس وقت جب ان کا پیسوں کا صندوقچہ کھلا ہو اور میں کھڑا تک رہا ہوں۔ ننہال میں کھانے پینے کی چیزوں میں کوئی امتیاز اور تخصیص نہیں کی جاتی تھی اور چونکہ ان پر اختیار نانی صاحبہ کا ہوتا یا بڑی ممانی صاحبہ کا، مجھے دونوں کی ہمدردی حاصل تھی۔ چنانچہ اس زمانے میں دودھ، ملائی، گھر کا نکلا ہوا تازہ مکھن، گھی دہی اور عمدہ گوشت خوب کھایا۔ باغات سے موسم کے پھلوں کی جنس، آجاتی، تالابوں سے مچھلیاں اور سنگھاڑے، غرضیکہ ایک زمیندار گھرانے کے اَللّے تللّے تھے۔ تعطیلات میں جب

میں دہلی سے گھر آتا تو مہینے دو مہینے کی پُرخوری سے صحت بن جاتی اور چہرے پر سُرخی دوڑ جاتی۔ اس کے بعد سال کے باقی ۹، ۱۰ مہینے کی کم خوری انھیں زائل کرنے کے لیے کافی تھی، اِس طرح کہ داد و ستد کا حساب برابر ہو جاتا۔

بی، عبادت گزار تھیں۔ ایک چوکی پران کی جانماز بچھی رہتی جس پر پنج وقتہ پابندی سے ادا کرتیں لیکن انھوں نے تمام اسلامی شعائر و فرائض کو اپنی سہولت کے مطابق سہل بنا لیا تھا۔ مثلاً نماز پڑھتے وقت اگر وہ دیکھتیں (اور نماز میں وہ دائیں بائیں دیکھتی ضرور رہتیں) کہ کوئی ملازمہ اُن کی مرضی کے خلاف کام کر رہی ہے تو بلا تکلف نیت توڑ کر اس پر لام کاف شروع کر دیتیں۔ اِس سے فارغ ہونے کے بعد پھر اطمینان سے نیت باندھ لیتیں۔

ناناصاحب نے آخر عمر تک اپنے اوپر اِس قسم کی کوئی مذہبی پابندی عائد نہیں کی۔ غالب کی طرح وہ روزہ کو روزی بنا لیتے تھے۔ غالب کو اپنی بیوی سے یہ گلہ رہتا تھا کہ وہ ہر وقت گھر کو فتح پوری کی مسجد بنائے رکھتی ہیں، ناناصاحب کو اپنی بیوی سے "ٹکریں" لگاتے رہنے کی شکایت تھی۔ دونوں رندِ شاہد باز تھے۔

اِس ماحول میں میری ابتدائی تربیت ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا رویہ "ای لیے پر طبیعت اِدھر نہیں جاتی"، کا رہا۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر رہا لیکن اسلامی شعائر کی پابندی کو غیر ضروری جانا۔ جنسی آزاد خیالی کی بنیاد بھی اسی ماحول میں پڑی جہاں بزرگ اپنی جنسی فتوحات کا تذکرہ بے دریغ کرتے تھے اور ایسے ایسے لفظ اور فقرے فحشیات کے طور پر استعمال کرتے تھے جن سے فیلن اور سید احمد دہلوی جیسے فرہنگ نویس تک شرما جائیں۔ میرا دامن جو فحشیات سے بچا رہا وہ صرف اس لیے کہ میری ددھیال کی روایات میری ننھیال کی روایتوں پر غالب رہیں۔ جنس کی جانب سے میں خیالات میں آزاد رہا لیکن عملی طور پر جھینپو ہونے کی وجہ سے مَس و مَساس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیرس کے نگار خانے میں یہ اعتراف نہ کرتا ؎

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مسعود
وہ تار سا بھی رہا، اور شمار سا رہا (پیرس)

میری ننہال تین پختہ حویلیوں پر مشتمل تھی۔ زنانہ مکان، جو سب سے قدیم تھا، سنہ ستاون کے ہنگامے میں اُسے گوروں کے ساتھ مل کر گرمیوں نے جلا دیا تھا، جس کے جلنے کے نشانات اس کے زینے کی کڑیوں پر اُس وقت تک موجود تھے۔ گھر والے بھاگ کر رشتہ داری میں تلسر یا گے گاؤں میں چلے گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ساری نقدی گھر کے کنوئیں میں ڈال گئے تھے جو واپسی پر انھیں مل گئی۔ گلی کے دوسری طرف نیا مکان تھا، یہاں مردانی نشست رہتی۔ دونوں مکانوں کو ایک پُل کے ذریعے جوڑ دیا گیا تھا۔ زنانے مکان سے متصل کسی اور کا کچا گھر تھا اور اس کے بعد پھر لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی پختہ کوٹھی، جہاں بوڑھے ابّا حاجی فضل امام خاں کی نشست تھی۔ میں نے بڑھاپے میں انھیں دیکھا تھا، سُرخ و سفید چہرہ، بھک سفید داڑھی، کاندھے پر رومال اور ہاتھ میں ملاکا کین کا موٹا سا بید۔ شام کا کھانا وہ پابندی کے ساتھ زنانے گھر میں آکر مغرب سے پہلے کھاتے تھے۔ ان کے ہم دسترخوان ہونے کا شرف صرف مجھے اور خورشید کو حاصل تھا۔ اور ہماری لاگ صرف اُن کی کھیر تھی جو سیر بھر دودھ میں تھوڑے سے چاول ڈال کر گھنٹوں پکتی رہتی تھی اس طرح کہ بالکل ربڑی بن جاتی تھی۔ وہ کھاتے وقت سُٹر سُٹر کرتے جاتے تھے جس سے ہمارا جی گھبراتا تھا۔ ہم دونوں بلیّوں کی سی کھیر پر تاک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ کھیر وہ اپنی انگشتِ شہادت سے کھاتے تھے اور حسبِ منشاء استعمال میں لانے کے بعد مٹی کا طباق ہم دونوں کی جانب بے نیازی کی شان سے بڑھا دیتے تھے۔ ابھی وہ ہاتھ دھونے سے فراغت حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم چھینا جھپٹی کر کے باقی ماندہ کھیر چٹ کر جاتے۔ اس قدر سوندھی اور مزیدار کھیر میں نے اپنی عمر میں پھر کبھی نہیں کھائی۔

میرا زیادہ وقت زنانے میں گذرتا، یہاں بہت سی ماموں زاد بہنیں تھیں۔ ہر وقت ایک ہنگامہ سا رہتا۔ اس میں ماماؤں اور ملازماؤں کے بچّے بھی شامل ہو جاتے، جن کی تعداد ہم لوگوں سے بھی زیادہ تھی۔ اَشرا کی ماں (اشرف کی ماں) ہم سب کے لیے بہت زیادہ اہمیت کی مالک تھی۔ وہ بڑی بلکمال باورچن تھی اور نانی صاحبہ کا ترکی بہ ترکی جواب۔ شاید ہی کوئی دن جاتا ہو جب دونوں میں نوک جھونک نہ ہوتی ہو۔ بی کی گالی گفتاری کے باوجود یہ ناممکن تھا کہ وہ بڑے گھر کی ملازمت چھوڑ دے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے یا لڑ کر غصّے میں گھر بیٹھ جاتی تو نانی صاحبہ

کو اس دن کھانا اچھا نہیں لگتا۔ کہتی تھیں کہ اُشرا کی ماں کے ہاتھ کی بات ہی اور ہے۔ وہ خود بھی کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں اور انھیں اچھے کھانے کی پرکھ بھی خوب تھی۔ دونوں کا پکایا ہوا قورمہ اور چپاتی خاصے کی چیز ہوتا۔ اُشرا کی ماں نہ صرف کھانا پکانے میں استاد تھی، کھانے میں بھی باکمال تھی۔ وہ اپنی پسند کی بوٹیاں گرم گرم پوپلے منہ میں رکھ لیتی اور جب تک کوئی بچّہ چیخ کر کہتا کہ کھا گئی، کھا گئی وہ انھیں نگل لیتی اور پھر منہ کھول کر دکھاتی اور کہتی "دیکھو تو بچے بھی کیا طوفان لگاتے ہیں"۔ گھر جاتی تو اپنے سارے گھر کے لیے کھانا چھپا کر لے جاتی

گلی کا ایک سرا ایک گول کھُلے میدان میں کھُلتا۔ یہیں پر محلّے کی مسجد تھی۔ ایک طرف جہان خانی پٹھانوں کا پھاٹک اور احاطہ تھا اور اس سے ملحق اتوخاں کا زنانہ اور بیٹھک تھی۔ اتوخاں عمر کے اُس حصّے میں تھے جب انسان نماز اور گالی دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا کام نہیں کرتا۔ ان کی سب سے دلچسپ گالی خود 'پٹھان' سے متعلق ہوتی جسے وہ 'بدذات' کہتے تھے۔ میدان کے عین درمیان میں نیم کا ایک چھتنار درخت تھا، جس کی عمر کے بارے میں مختلف روایتیں تھیں۔ اس کے نیچے کھٹّے پڑے رہتے اور آس پاس درختوں کی کچھ موٹی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی تھیں جو اسٹول کے طور پر کام آتیں۔ اس جگہ کو محلّے والوں نے 'نیم تلے' کا نام دے رکھا تھا۔ اسی سے ناناجان نے 'نیم تلے کی دوستی' کا محاورہ تراشا تھا۔ ظاہر ہے صدرِ مجلس جان عالم خاں ہی ہوتے، باقی سب چھُٹ بھیئے۔ لیکن ان چھُٹ بھیئوں کو مساوات کا حق حاصل تھا۔ انھیں محبت سے قابو میں رکھا جا سکتا تھا کسی دباؤ سے نہیں۔ مجال نہیں کہ جان عالم خاں اپنی دولت یا رسوخ کے باوجود کسی کو تم سے تو کہہ دیں۔

نیم تلے کی نشست میں پابندی سے موجود ہونے والوں میں ایک گل آشیر خاں تھے جو سامنے کے پھاٹک میں رہتے تھے۔ وہ جنّو خاں (جان عالم خاں) کے کارندے رہ چکے تھے لیکن بے تکلفی سے انھیں 'جنّوا' کہتے تھے۔ شہباز خاں تھے جو جان عالم خاں کے ہم پیشہ و ہم راز تھے اور باہر کے موکلوں کے گماشتے۔ آخر عمر میں جب جنّو خاں بہت اونچا سننے لگے تھے تو شہباز خاں کو چیخ کر بات کرنا پڑتی تھی۔ لطف جب آتا جب وہ کسی 'نوبہار ناز' کو تاک کر آتے اور اس کی اطلاع پنچم سُروں میں یہ کہہ کر دیتے کہ 'بڑے راز کی بات بتا رہا ہوں' اور یہ راز کی بات

ضرورت کے پیشِ نظر اس قدر بلند آواز سے کہی جاتی کہ

این راز ہماں راز کہ معلومِ عوام است

مجھے یاد نہیں کہ میری بسم اللہ ہوئی یا نہیں ہوئی یا کب ہوئی، البتہ یہ جانتا ہوں کہ چھ سال کی عمر میں مجھے محلے کے میونسپل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ اسکول میں ایک ہیڈ منشی احمد حسین تھے (جو یک چشم تھے، اس لیے کانے منشی کے نام سے معروف تھے) اور دو چھوٹے منشی تھے جن میں ایک ذات کا کُرمی تھا۔ پٹّوں پر پڑھائی ہوتی تھی، صرف منشی صاحبان کرسیوں پر براجمان ہوتے۔ تختیوں پر لکھائی، درسی کتب کی رٹائی اور جولاہے کا ایک لڑکا جس کا کوئی قریبی عزیز کوئٹہ میں تھا، اس کے لائے ہوئے اخروٹوں کا کھانا یاد ہے۔ پڑھائی سے فارغ ہونے کے بعد مدرسے کے پشت پر واقع میدان میں دوڑ لگوائی جاتی تھی۔ پتورے کے اس اسکول میں میں نے کیا سیکھا اور کیا نہیں سیکھا، ذرا بتانا دشوار ہے۔ کانے منشی کو جب لڑکے تنگ کرتے تو مدرسے کے نیم سے ایک تازہ سنٹی توڑ کر ان کی خبر لیتے بلکہ اکثر سنٹی کے ساتھ پٹّوں کے درمیان ٹہلتے رہتے۔ اس وقت ہم لوگ کم از کم نصف وقت تک خود کو محفوظ سمجھ کر خوب شرارتیں کیا کرتے تھے۔ جب منشی جی کی کانی آنکھ دوسری جانب ہوتی تو دوسرے رُخ کے طلبہ کو ہری جھنڈی دے دی جاتی تھی، یعنی اب انھیں آزادی ہے۔ اس طرح باری باری سے ہم لوگ لطف اندوز ہوتے تھے۔

چھوٹے مسلمان منشی کے طاقت ور ہونے کا بڑا رعب تھا۔ کہتے تھے کہ وہ وکٹوریہ کے زمانے کا موٹا پیسہ کرسی کی درز میں پھنسا کر انگوٹھے سے موڑ دیتے تھے۔ یہ بھی روایت تھی کہ ان کے قبضے میں جن ہیں۔ ہمارے کُرمی منشی سے اس قسم کی کوئی روایت منسوب نہیں تھی۔ وہ محنت کے ساتھ پہاڑے رٹاتے تھے۔ جب اسکول چھوڑا ہے تو ہمارے علم کی کل کائنات اردو لکھنا پڑھنا اور حساب کی گنتی اور پہاڑے تھے۔ آگے اللہ اور صفرا

دس برس کی عمر تک میرے ارد گرد جو ماحول تھا اور اس کے کردار جب حافظے کے پردے پر ابھرتے ہیں تو بیشتر گتھیوں مخلوط ہوتا ہوں۔ مردانے میں روز کے حاضر باشوں میں نور عالم خاں تھے جنھیں عزیز داری کی بنا پر احتراماً چچا نوری کہا جاتا تھا۔ ان کی مالی حالت خستہ تھی۔

اس لیئے بڑے گھر والوں کی جانب سے حسد کا جذبہ رکھتے تھے۔ باوجود جاہل مطلق ہونے کے علم مجلسی میں طاق تھے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ اُنھوں نے اپنی دوسری بیوی کو جوئے میں جیتا تھا۔ جب مقابل کا پٹھان جواری مسلسل ہارتا گیا تو اس نے آخر میں اپنی کنواری لڑکی کو داؤں پر لگا دیا۔ زہے قسمت، چچا نوری وہ داؤں بھی جیت گئے۔ جیتنے کے بعد جھٹ بچّہ لائے اس پر چادر باندھی اور نئی نویلی کو لے کر گھر چلے۔ بات کے دھنی پٹھان نے اُف تک نہ کی۔ گھر پر پہنچتے ہی کسی ملّا کو پکڑ کر لائے اور کھڑے کھڑے نکاح کیا۔ اس کے بعد وہی اُن کی چہیتی بیگم ہیں اور اُن سے کئی اولادیں ہوئیں۔ چچا نوری غریب تھے لیکن پٹھانوں کی مساوات کی روایت کے مطابق وہ اپنی عزّت کرانا جانتے تھے۔ مجال نہیں تھی کہ کوئی ان پر فقرہ بھی کس سکے۔ سب کا نام لیتے اور تخاطب میں برابری کا سلوک رکھتے۔ مختاری اور ہیکڑی ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ مبالغہ آرائی سے بھی کام لیتے تھے۔ اگر کسی کے ساتھ میلے میں جا کر بھینس خریدنے میں (جس کی شناخت کے وہ ماہر تھے) مشورہ دے دیتے تو اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتے کہ میں نے فلاں خاں کو بھینس خرید وادی۔

زنانے گھر کے پڑوس میں ڈاکٹر امیرد ا (محمد امیر خاں) کا پختہ مکان تھا۔ وہ فوج میں گھوڑوں کے ڈاکٹر تھے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد تخفیف میں آ گئے۔ اب ان کی توجہ چوپایوں کے بجائے 'دوپایوں' کے علاج کی جانب ہو گئی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد اُنھوں نے محض دل لگی کی خاطر اپنا مطلب قصبے کے بازار میں کھول لیا تھا۔ ان کا زیادہ تر وقت برادری کے پٹھانوں کی مفت خدمت کرتے گزرتا۔ گھر میں کسی کی بھی طبیعت خراب ہو جاتی، سب سے پہلے وہی طلب کیے جاتے۔ ۱۹۳۰ء میں جب میں ڈھاکے سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر اعصابی امراض میں گرفتار آیا تو مجھے بھی ان کی 'حذاقت' سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مجھ پر جب دورے کی سی کیفیت ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے اور میں موت کے قریب آ کھڑا ہوا ہوں۔ یہ منظر میری ماں اور دیگر تمام عزیزوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر امیرا ایک دو ملاقاتوں میں میری [illegible] کو بھانپ گئے۔ کچھ انھیں اس بات سے بھی کوفت تھی کہ وہ وقت [illegible] جاتے [illegible]۔ ایک بار جب میں نے اس قسم کی تکلیف کی شکایت

کی اور چیخا چلایا اور ڈاکٹر امیر دا کو فوری طور پر طلب کیا گیا تو انھوں نے آتے ہی کہا "مجھے دیا سلائی دو کیونکہ میں آج مسعود کے پاجامے میں آگ لگادوں گا۔" دیا سلائی آگئی اور جب وہ واقعتاً اسے جلا کر میری جانب بڑھے تو میں نے خیال کیا کہ یہ پاگل ڈاکٹر آج مجھے نہیں چھوڑے گا۔ چنانچہ یا تو میں حد درجہ کمزوری کا اظہار کر رہا تھا یا مجھ میں اس قدر توانائی آگئی کہ چارپائی سے تڑپ کر سیدھا دروازے کی جانب بھاگا۔ ڈاکٹر امیر دا کو اس کے بعد یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ "اسے مراق ہو گیا ہے یہ بیمار ویمار کچھ نہیں ہے، بس جب دورہ پڑے اس کے ساتھ یہی حرکت کرو۔ اس کے بعد کبھی میری طبیعت خیر بھی ہوتی تو میں کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کرتا لیکن ڈاکٹر امیر دا کے بارے میں عرصہ تک میری رائے خراب رہی۔

میری اس رائے کی تصدیق اُن کے بعض طبی کارناموں سے بھی ہوتی ہے جو اُن سے سرزد ہوئے۔ محلّے کے قمر دا خاں کی داڑھ میں سخت درد اُٹھا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچے۔ وہ گھر میں جا کر اندر سے ایک زنگ خوردہ زنبور لائے۔ کہا منہ کھولو اور درد والی ڈاڑھ کے قریب کی اچھی داڑھ زنبور سے پکڑلی۔ اب قمر دا خاں لاکھ چیخیں چلائیں، دو جھٹکوں میں اچھی ڈاڑھ زنبور سے مروڑ کر کھینچ لی۔ جب قمر دا خاں نے واویلا مچایا تو کہنے لگے اب دوسری داڑھ خودبخود اچھی ہو جائے گی۔ بازار کے مطب میں جہاں وہ کبھی کبھی جاتے تھے ایک لڑکا دوا کی خشک شیشیوں میں پانی ڈال کر انھیں ہلاتا اور مکسچر تیار کر دیتا۔ ان کے علاج سے جو بھی اچھا ہو جائے اسے ھُوَالشّافی کا معجزہ سمجھنا چاہیئے تھا۔

ان کے بھائی نواب میر خاں کو میں زیادہ پسند کرتا تھا۔ وہ قائم گنج کے شاید پہلے میٹرک تھے اور اُن کی انگریزی کی استعداد بہت اچھی تھی۔ ساتھ ساتھ ذوقِ سخن بھی رکھتے تھے اور استادانہ انداز کے گرم گرم عشقیہ شعر نکالتے تھے۔ میری اور اُن کی عمر میں بڑا تفاوت تھا لیکن عمر کا یہ فاصلہ ہمارے مشترک ادبی ذوق نے ختم کر دیا تھا۔ وہ اکثر مجھے اپنے اشعار سناتے اور داد کے طالب ہوتے۔ بہت بعد کو میں نے ان کی شاعری پر ایک مضمون "ہماری زبان" میں لکھا تھا۔ عقیدے کے اعتبار سے وہ مائل بہ الحاد تھے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ دہریے تھے۔ میرے خیال میں بنیادی طور پر وہ آزاد خیال تھے۔ یعنی سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود نہیں تھے۔ نانی صاحبہ سے ان کی بھی

زک جھونک رہتی۔ کبھی ہمارے یہاں شام کو لڑکیاں مل کر مولود شریف پڑھتیں تو دوسرے دن صبح نمودار ہوتے۔ نانی صاحبہ کو پڑوس کے رشتے سے بھاوج کہتے تھے۔ آواز دیتے کہ ذرا ٹٹّی کی اوٹ کر لو تو میں آجاؤں۔ آکر پاس کے پلنگ پر بیٹھ جاتے اور نہایت سوکھے منہ سے پوچھتے۔ "بھاوج! رات کو کیا ہنگامہ تھا، یہ کون گا رہا تھا۔

ہاتھوں میں چھپک چھلّے کانوں میں بالیاں
ہم کو غریب جان کے دیتے ہیں گالیاں

یہ سن کر نانی صاحبہ سر پیٹتیں اور کہتیں "دیکھو تو بڈھے کو کیا ہو گیا ہے؟" اور نواب میر خاں ہنستے ہوئے دروازے کے باہر لپک جاتے۔ محلّے کی مسجد میں جب کبھی لوٹا چوری ہوتا (اور یہ اکثر ہوا کرتا تھا) تو لوگ کہتے ہو نہ ہو یہ چوری نواب میر خاں نے کروائی ہے۔ وہ اس کی کبھی تردید پیش نہیں کرتے۔ حالانکہ اس فعل سے ان کا دور دور واسطہ نہیں ہوتا۔ ع بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ قدرِ مشترک تھی تو صرف یہ کہ دونوں نے اپنی پسند کی لونڈیوں سے نکاح کر لیا تھا۔ قائم گنج کے پٹھانوں کیلئے سانولی سلونی لونڈیوں، مہترانیوں اور دھوبنوں میں گوری چٹی پٹھانیوں سے زیادہ جنسی کشش ہوتی تھی۔ اسی کشش کے نتیجے کے طور پر اکثر گھرانوں میں خانہ زادوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جنھیں قائم گنج والے "خنادار" کے نام سے پکارتے تھے۔

جنسی آزادی کی اس فضا میں اِکّا دُکّا ایسی شخصیتیں بھی موجود تھیں جنھیں خیرِ مجسّم کہا جا سکتا تھا۔ انھیں میں ایک حافظ عطا میاں تھے، جن کا پیشہ مدرّسی تھا اور محلّے کی مسجد میں امامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچّوں اور بچیوں کو مکان پر آکر قرآن کا درس دیتے۔ ہمارے گھر کے سب بچوں اور بچیوں نے ان ہی سے درسِ قرآن لیا ہے اور سب کے سب اس فرشتہ صفت انسان کی نیکی کے معترف رہے ہیں۔ مجھ پر بچپن میں ان کی شخصیت کا جادو اس قدر چل گیا تھا کہ ہر چند میں ان کے نجی مدرسے کا طالبِ علم نہیں تھا لیکن اکثر وہاں پہنچ جاتا۔ مدّھم لہجے اور مدّھم چال کا یہ فرشتہ لنگی باندھے لیا کرتا

زیب تن کئے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا لیے جب ہماری گلی سے گزرتا تھا تو خیال ہوتا تھا کہ پٹھانوں کی اِس بستی کا انسان نہیں ہے۔ عطامیاں کوئی عالم نہیں تھے لیکن ان کے ساتھ ساتھ ٹکی کا ایک ہالہ سا چلتا تھا۔ یہ میرا ہی نہیں گھر کے دوسرے بچّے اور بچیوں کا بھی خیال تھا۔

محلّے کے ایک ٹھیٹھ پٹھان سون خاں بھی تھے۔ وہ نیم تلّے کے سامنے کے پھاٹک کے احاطے میں رہتے تھے۔ عمر ساٹھ کے پیٹے میں تھی لیکن دانت گر جانے کی وجہ سے منھ پوپلا بہت پہلے ہو گیا تھا۔ ہر وقت اضطراری کیفیت میں رہتے اور اس قسم کی حرکتیں بھی کرتے تھے۔ وہ ہمارے مردانہ مکان کی روزانہ نشست کے مستقل حاضرین میں تھے۔ انھیں غصہ دلانا بہت آسان تھا۔ ذرا سی بات میں بھڑک اُٹھتے۔ اس وقت ان کی ٹھڈّی کپکپانے لگتی۔ بعض اوقات ہم لوگ صرف یہ دلچسپ منظر دیکھنے کے لئے ان کو غصّہ دلایا کرتے تھے۔ غصّہ کی انتہائی کیفیت میں وہ ایک دم مونڈھے سے اُٹھ کھڑے ہوتے اور اپنا چمڑودا جوتا اُتار کر اپنے سر پر تڑ تڑ مارتے اور کہتے جاتے "اب اگر سونا تمھارے یہاں آئے تو اس میں کھلانا جس میں کتّا کھاتا ہے" اس کے بعد یہ جا وہ جا۔ چند روز تک اُن کی غیر حاضری رہتی۔ اس کے بعد پھر اس طرح چلے آتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا! ہم لوگوں میں آپس میں اشارے ہوتے کہ سون چچا کی چاند کو اب کچھ دنوں تک آرام کر لینے دو۔ تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد یہ عمل پھر شروع ہو جاتا۔

اسی طرح عزیز چچا (عزیز خاں) تھے۔ جو بڑھاپے میں پنجر بن گئے تھے لیکن باتیں وہی ہیکڑی کی جب آتش جوان تھا۔ انھیں بڑھاپے یا کمزوری کے الزام کی برداشت نہیں تھی۔ فوراً ہاتھ زمین پر رکھ کر ڈنڈ لگانے کی پوزیشن لے لیتے تھے لیکن ایک دو ڈنڈوں کے بعد ہی زمین پر چت لیٹ جاتے۔ قلم گنج کی زبان میں آن بان کے لیے ایک لفظ ہے 'فرک' اور دوسرا 'ٹھنولی' ہے۔ یہ سب اسی کے کرشمے تھے۔

چوں کہ بڑے ماموں، سلطان عالم خاں ابتدا سے ایک سیاسی شخصیت کے مالک تھے اس لیے اُن سے ملنے کے لیے ہمارے مردانے میں بھانت بھانت کے لوگوں کا صبح سے شام تک تانتا بندھا رہتا تھا اور پان سے تواضع ہوتی تھی اور ایک ملازم [illegible] مسلسل زنانے اور مردانے مکانوں کے درمیان دوڑتا رہتا۔ اچھا مردانے [illegible] اُس سے زیادہ وفادار ملازم کا تجربہ مجھے اپنی زندگی میں نہیں ہوا۔ جس [illegible]

میں داخل ہوا اسی سے مر کر نکلا۔ وہ میرے دونوں بڑے ماموؤں کی صبح سے شام تک ہر قسم کی خدمت کرتا۔ گھر کے بچے اس سے مانوس تھے۔ گھر میں اس کی حیثیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ جب میری شادی کا مسئلہ چھڑا اور گھر ہی کی ایک 'بنتِ عم' سے ہونا قرار پائی تو اسے باقاعدہ شکل دینے کے لیے ایواہی کو استعمال کیا گیا۔ اسی نے آکر میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ میں اپنے بڑے بھائی اور بہن کو حیدرآباد لکھوں کہ وہ میری نسبت کے لیے باقاعدہ سلسلہ جنبانی کریں۔

محلے کے بچوں (اور بعد کو نوجوانوں) میں ایک اور شخصیت جس کا میری زندگی میں بڑا عمل دخل رہا ہے، حکیم سرور عالم خاں کی ذات ہے۔ وہ میرے بچپن کے ساتھی ہیں اس وقت سے جب وہ عرفِ عام کے 'حکیم جی' ابھی تک نہیں بنے تھے۔ انھوں نے طبابت کی سند بہت بعد کو طبیہ کالج دہلی سے لی تھی۔ میں اُن کی طبابت کا تو کبھی قائل نہیں رہا لیکن بحیثیت مخلص دوست اور اچھے انسان کے ہمیشہ قدر کی۔ ان کی وضع داری کا یہ عالم ہے کہ وہ اوّل تا آخر ایک ہی انداز میں تعلقات نبھاتے رہے ہیں۔ دائمی نزلے کے مریض ہونے کی وجہ سے اپنے سر اور کانوں کو ایک بڑے سے مفلر سے ہمیشہ لپیٹے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے معاً غزل کے کسی شاعر کا وہ خیال یاد آجاتا ہے کہ جب 'مسیحا' خود بیمار ہو تو مریض کی کیا امید کی جاسکتی ہے۔

درونِ خانہ میرے ہر وقت کے ساتھیوں میں میرے چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں تھے۔ ہم دونوں کی عمروں میں صرف سوا سال کا فرق تھا۔ میں ان سے چھوٹا تھا۔ لیکن عمر یا رشتے کی بزرگی سے ہماری یاری میں فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہر قسم کے کھیل کود میں میرا ان کا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ چاہے کنکوں کا شکار ہو، گلی ڈنڈا ہو یا آموں پر زور آزمائی، ہمارا محبوب مشغلہ دگیر تھا' یعنی اینٹوں یا مٹی سے گھروندے بنانا۔ یہ کام اکثر گرمیوں کی طویل دوپہروں میں ہوتا، جب گھر کے سارے بڑے خراٹوں کے ساتھ خس کی پنکھوں کے نیچے سوتے تھے اور ہم باوجود نانا صاحب کی تنبیہ اور ہدایت کے تھوڑی دیر لیٹ کر دبے پاؤں باہر نکل جاتے۔ گھروندے سازی کے اس کھیل میں مجھے خورشید ماموں سے ہمیشہ یہ شکایت رہتی کہ وہ خود راج کا رول ادا کرنے لگتے اور مجھے مزدور کا کام کرنے کے لیے کہتے۔ 'اینٹیں لاؤ، گارا بناؤ، چھت کے لیے ٹیاں تیار کرو۔' میری انا کو اس سے

ٹھیس لگتی، میں بغاوت کر بیٹھتا اور پھر اس کے بعد سارا کھیل بگڑ جاتا۔

پتھورے کے مدرسے سے نکل کر میں تو جامعہ ملیہ چلا گیا اور خورشید فرخ آباد کے مشن اسکول۔ اس کے بعد ملاقات صرف تعطیلات میں ہوتی۔ خرگوش کے شکار کا سلسلہ جاری رہا لیکن اب توجہ زیادہ تر ڈنڈ مگدر، دودھ کی پلائی اور آموں کی کھلائی، کی جانب ہو گئی تھی۔

قائم گنج کی یادوں میں میرے لیے سب سے دلچسپ وہاں کی مخصوص زبان تھی۔ قائم گنج کا قصبہ قنوجی بولی کے علاقے میں آباد ہے جو برج بھاشا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ وہاں پونے تین سو برس پہلے پٹھان خاندان درۂ خیبر سے پشتو بولتے ہوئے آئے تھے۔ دو تین پیڑھیوں تک پشتو کے اثرات نمایاں رہے خاص کر عورتوں کی بولی میں۔ میرے زمانے تک آتے آتے پشتو کے صرف چند لفظ رہ گئے تھے وہ بھی نسوانی محاورے میں مثلاً مَندِگر (عصر) مُسخُتن (عشا)، پیغلا (کنواری لڑکی)، تربوُر (دشمن، لغوی معنی چچازاد بھائی جو خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے ہمیشہ دشمن ہوتا تھا)۔ پشنے (بلی) تنبے (کواڑ) واپے زان (پیچھے ہٹو)۔ خوارا (خواہر)۔ غترغرٹے کا وقت (مشکل کا وقت) اشر بینو پیٹی (جس کے سب مر گئے ہوں) حریان پیٹی (بدتمیز)

مفرد الفاظ اور محاورات کے علاوہ پشتو کے کچھ گیت بھی تھے جو ڈومنیاں (افغانی نسل کی) بچے کی پیدائش یا شادی کی رسموں کے وقت بغیر معنی سمجھے گاتی تھیں۔ بچے کی پیدائش کے گیت کو لرلے خوری، کہتے تھے جو اس کی ابتدا میں آتا ہے۔ اسی طرح سہرے کے گیت تھے بچوں کی لوریاں تھیں حتیٰ کہ خاندان کی بڑی بوڑھیاں نماز کی نیت تک پشتو میں کرتی تھیں۔

پشتو کے ان اثرات سے قطع نظر جو نسلاً بعد نسلٍ کم ہوتے گئے، قائم گنج کے پٹھان گھرانوں میں کھڑی بولی اردو بولی جاتی تھی جس میں قدیم اردو کے متروک الفاظ اور تراکیب کثرت سے ملتی تھیں مثلاً کدھو، کدھیں (کبھی) لئوں (تک)، اِتّا، اُتّا، جِتّا، اِن نے، اُن نے کِن نے، محاورے بھی بہت دلچسپ تھے جو اور کہیں سننے میں نہیں آتے جیسے:

لاربانہ ہونا = خوشامد کرنا

پینگ کڑھے باڑی = پاگل ہونا

کونیوں سے نکل جانا	=	بالکل ختم ہو جانا (دوستی وغیرہ)
اَبے تبے	=	الٹے تلے
پَنیر پڑنا	=	صلح صفائی کرانا
کُلف پڑنا	=	لڑائی ہونا (قفل)
اُورے پُورے کرنا	=	خوشی کو ختم کر دینا
مَنّوے پڑنا	=	منانا
لگے بگے	=	یار دوست
نَخ نَخ کرنا	=	گلا سوکھنا (پیاس سے)
تُخ پُخ کرنا	=	ڈر سے ہگ دینا
گونا گرجانا	=	زور ختم ہونا
بلگیاں کھانا	=	بل کھانا

پٹھانوں کی زبان گالیوں اور کوسنوں سے بھری ہوتی۔ گالیوں کی تو فہرست کیا دوں اُن سے اِن کی دجنیت کے علاوہ کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ کوسنے جو میں نے نانی صاحبہ کی زبان سے سنے ہیں وہ دلچسپ ہیں۔

تجھے سہار کا دیو / کالا دیو مارے		(سہار = سحر)
تو کالی آندھی پر اُڑے	=	برباد ہوئے
تو پیلے تکوؤں سے نکلے	=	اچانک مرجائے
پُچھپاتی کھٹیا نکلے	=	اچانک مرجائے
رنس کی ایڑھیاں رگڑے	=	لمبی بیماری سے مرے
کڑ کڑاتی بجلی گرے	=	اچانک موت ہوئے
دانہ دانہ کرنا	=	برباد کرنا
تنت منت ہونا	=	برباد ہونا

نندو خاں کے ڈھیلے کھائے ۔ مرادمر جائے (نندو خاں قائم گنج کا پرانا قبرستان ہے جہاں ہمارے مورث اعلیٰ حسین خاں دفن ہیں)

دلچسپ بات ہے کہ قائم گنج کے پٹھانوں کی آبادی قنوجی کے بحر ذخار میں ٹاپوں کی طرح تھی۔ یہاں کے پٹھان اپنے علاقے کی بولی بہ خوبی سمجھتے تھے لیکن شان یہ تھی کہ بولتے تھے اپنی کھڑی (اردو) میں نے بچپن میں اکثر یہ سین دیکھا کہ اسامی ناناجان کے پاس آئے ہوئے ہیں۔ وہ مونڈھے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اسامی زمین پر اکڑوں بیٹھے سرکار، ہجور کر رہے ہیں۔ وہ اپنی بات قنوجی میں کر رہے ہیں اور نانا جان اس کا جواب کھڑی میں دے رہے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کی بات مکمل طور پر سمجھ رہے ہیں۔ لیکن ایک پارٹی بہ مجبوری اور دوسری فخریہ جا کے طور پر ابلاغ کے زینے پر چڑھنے یا اُترنے سے انکار کرتی ہے۔ کہاں صاحب، خاں صاحب رہتے ہیں اور گنوار گنوار!

پٹھانوں کی اس اردو میں بہت سی لسانی خصوصیات ایسی تھیں جن کی معیاری اردو متحمل نہیں ہوسکتی۔ قنوجی کی صرفی و نحوی شکلیں بھی در آئی تھیں جن کا خاں صاحب کو احساس تک نہیں تھا لیکن ہماری نسل جو جامعہ ملیہ اور علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھی متبسم ہو جاتی تھی مثلاً ہیَن (یہاں) ھوَن (وہاں)، اُتے ھَن (اسی وقت۔ ھَن یعنی لمحہ) ھنوں آدمی (بہت سے آدمی)۔ چکو (چاقو)، کُرآن (قرآن)، کُلَف (قفل)۔ وہ جاتا ہیگا۔ (جا رہا ہے)، ہوئے گا (ہوگا)۔ بعدی (بعد)، متی (مت) ہَلا (ہاں) وغیرہ۔ قائم گنج کے پٹھانوں کی زبان کی ایک جھلک ذیل کے مکالموں میں مل جائے گی۔

دو پٹھانوں کے درمیان مکالمہ

ہنّدو خاں (مدبیرالدین خاں)

ممّدو خاں (عبدالحمید خاں) ہوت! ارے تم کاں جارئے او
کہاں جا رہے ہو

بسلسلہ شہرہ بعمل ہی آیا۔
شہرہ بعمل

مدّو خاں (عبدالحمید خاں)

ہلا، ارے اڈّا تو ہیاں؟ کلاں خیلوں سے کب آیا؟ ارے آمیرے سنگ، ایک
ال بھائی یہاں (محلہ کا نام) ساتھ

ضروری کام ہے۔

مدّو خاں:

ارے مَیں کل سے تیرے مارے ہینگو ہینگو پھر رّیا ہوں برّے تو ملتا ای نیئں۔ ملوم
ہی نہیں لیکن رہا ڈانواں ڈول دیسے معلوم

بھی ہے کّی خیلوں میں متّو خاں اور بنی عالم خاں میں لٹھ پونگا چل گیا۔ ارے مُدوا! دونوں بڑے
(محلہ کا نام)

سنگ اور بہت چھٹ ہیں، پٹھونلی پر آجاتے ہیں تو نہ کنواں دیکھتے ہیں نہ کھائی۔ کل جو اُن میں
سنگھ 'پٹھانیت'

لٹھ پونگا ہوا تو میں بھی ہُوا ایں کھڑا تھا۔ اللہ کی سوں بال بال بچ گیا نیئں تو ہُوا ں ہی ڈھیر
وہیں نہیں قسم وہاں ہی

ہوتا۔ یہ پٹھان بھی بڑے مُڑک کے لوگ ہوتے ہیں۔ جان چلی جائے موچھ نیچی نہ ہونے پائے۔
آن بان

اِسی کو پٹھونلی کہتے ہیں۔

زنانی بولی میں محاورے کا رنگ اور چوکھا ہو جاتا ہے۔

دو پٹھانیوں کا مکالمہ

حمیدن: اری خوارا تینے کھول نا، کِتّے خن کھڑی بھئی ہوں۔ کوئی رہین سُنتا ای نیئں۔
ہی نہیں یہاں ہوئی کتنی دیر خواہر (بہن) کواڑ

حنّا: اری لاڈی اوں بولو! کئو سب خیر سلّا ہے۔
خیریت کہو (بہن) ہوں دہی

حمیدن: اری کا ئے کی خیر سلّا۔ مڑو کا ذہن کدن چل رہا ہے۔
مرد جھگڑا

کوئی ڈاکٹر مرض کو سمجھ ای تیئں پاتا۔ مَیں کیتی اُوں یہ اوپہ کی ہوا ہے۔ وہ
ای نہیں کہتی ہوں

بڈھا اڑیاں رگڑے گا بڑے میری سُنے گا نئیں۔
لیکن نہیں

مُنّا: اری یہ متی کہو۔ یہ گھرا گھر بیٹھا ہے۔ جروان تو کسی گنتی شمار میں کا ہے کو
مت کہو عورتیں

ہونے لگیں میں نے کیا تھا لڑکی کو سسرال متی بھیجو بڑے اُس کے بھائیں
کہا مت لیکن اثر

نہیں ہوئی۔ اب ہواں پھاکے کرے۔ یا چند وپیٹے کوئی خبر کا لیوّیا نئیں ہے۔
وہاں فاقے سر لینےوالا نہیں

حمیدن: اری خوارا تو اُسے بُلائے گی کیسے۔ وہ تو دوسرے جی سے ہے۔ کیا اُس کی
بہن حاملہ

سسرال کے ٹول ٹبر کو بھی کھلائے گی۔ اچھا یہ بتا کل ننے ادّا کے دَرزُر کو چلے گی۔
خاندان تعزیت

اب میں چلتی ہوں۔ وہ، آگیا ہوگا، مَدِگر کی نماز پڑھنا ہے۔
شوہر عصر

مردوں کی زبان ہوکہ عورتوں کی جنسی اشاروں اور حوالوں سے بھری ہوتی تھی۔

جامعہ ملیہ کے ثقہ ماحول میں رہنے کے بعد ان کی جانب عجیب وغریب قسم کا ردِّ عمل ہوتا تھا اسں سلسلے میں منجھلی ممانی (قدوس ماما خا، کی اہلیہ اور میری ساس) جن کا تعلق علی گڑھ کے شیروانی خاندان سے تھا، اِس عجیب و غریب آزاد محاورے، کو سُن سُن کر شرم سے زمین میں گڑ جاتی تھیں۔ وہ شیروانی خاندان کی روایت کے مطابق ہم سب کے ناموں کے آگے 'میاں' لگا دیتی تھیں۔ مسعود میاں، خورشید میاں لیکن جب دوسرے دالان سے مسودا، خورشیدا کا نعرہ بلند ہوتا تو بھونچکی رہ جاتیں۔ ہماری ددھیال کا تعلق چونکہ حیدرآبا

دکن سے رہا تھا اس لیئے ہمارے خاندان میں 'میاں' کا لفظ احتراماً یا شفقت کے طور پر بڑے چھوٹے دونوں کے لیئے استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً میں اپنے چچا کو 'یوسف میاں' کہتا اور وہ مجھے 'مسعود میاں' کہتے۔

اس ماحول سے گھبرا کر مجھلی ممانی صاحبہ نے اپنی مستقل رہائش بالائی منزل پر کر لی تھی اسی لیئے نانی جان طنزاً انہیں 'چھینکے کی ہنڈیا' کہا کرتی تھیں۔ کہتیں "اری اس حریان (حیران) بیٹی سے کہو (کہو) کہ کبھو نیچو (نیچے) بھی آجایا کرے۔"

قائم گنج کے پٹھانوں کے عموماً دو نام ہوتے تھے، ایک بڑا اور دوسرا چھوٹا۔ بعض اوقات دونوں میں صوتی تعلق نظر آتا جیسے جنّو خاں (جان عالم خاں)، اجّو (آرزو حسن)، مدّو خاں (مدید الدین خاں)۔

اور بعض اوقات دونوں میں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اور دوسرا نام عموماً غیر اسلامی دیسی ہوتا تھا مثلاً بدّا خاں (عبدالستار خاں)، حُو خاں (عبدالغفار خاں)، گُنجو خاں (چراغ الدین خاں) بُدھن خاں، چِنّا خاں، مُنّا خاں، نَتھو خاں، تَھنیا خاں، مَدھن خاں، مُنن خاں، مُنّو خاں۔ یہاں تک کہ بعض انگریزوں تک کے نام فوجی ملازمت کے توسط سے قائم گنج پہنچ گئے تھے جیسے لٹور خاں جو اصل میں 'لینٹور' تھا۔

پٹھانوں کا عمومی لہجہ کھرا ہوتا لیکن اکھڑ نہیں جیسا کہ میرٹھ اور اطراف کے اضلاع کی کھڑی بولی میں پایا جاتا ہے۔ کوئی پٹھان 'پشتو' بولی نہیں بولتا لیکن برج بھاشا کے کچھ اثرات اس کے لہجہ میں پائے جاتے ہیں جو دوآبہ کے کھڑے لہجہ سے اسے میز کرتے ہیں۔ پٹھان بچے کو اردو کے معیاری لہجے یا محاورے پر قدرت حاصل کرنے میں کوئی دقّت نہیں ہوتی اس لیئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اردو کے نقطۂ نظر سے اہلِ زبان ہوتا ہے۔

پٹھانوں کی زبان کے زیرِ اثر ہندوؤں کی بعض ذاتیں اور طبقات بھی کھڑی کا استعمال کرنے لگے تھے جیسے کائستھ اور بازار کے بنیئے۔ چھوٹی عدالتوں میں ابھی تک اس کا چلن تھا اور قصبے کے تحصیلی اسکول میں اردو ہی کا رواج زیادہ تھا۔ مسلمان بچوں کی دینی پڑھائی زیادہ تر مساجد کے ملحق مکتبوں میں ہوتی یا بعض خوش حال گھرانوں میں مولوی اور منشی گھر پر آکر پڑھا

جاتے تھے۔

یہ سن کر تعجب ہوگا کہ قائم گنج کے پٹھانوں کا لباس دھوتی تھا۔ جان عالم خاں آخر وقت تک اسے استعمال کرتے رہے۔ حالاں کہ تحقیراً وہ گنوار اور بزدل کے لیے 'دھتیال' کی ترکیب بھی استعمال کرتے رہے۔ جب قائم گنج سے باہر جاتے تو لمبا کوٹ اور علی گڑھ کٹ پاجامہ ضرور نکل آتا۔ خود میں نے بچپن میں دھوتی باندھی ہے۔ دھوتی 'رسنگی' (بہادری) کی نشانی بھی جاتی تھی۔ نوجوان پٹھان لونڈے جو کسرت اور دودھ کے شوقین تھے اپنی پنڈلیوں کے بالوں کو استرے سے مونڈتے تھے جس سے ان کی پہلوانی کا شوق نمایاں ہوتا تھا۔ جیب میں قائم گنج کا بنا ہوا خنجر نما چھوٹا یا بڑا چاقو رکھتے تھے۔ یہ قائم گنج کی خاص صنعت شمار کیا جاتا تھا۔ میں نے بھی اس قسم کے چاقو کو برسوں اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس کے پاس ہونے سے ایک نفسیاتی مضبوطی کا احساس ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے جب کہ قائم گنج کے لونڈے اس کی بار بار آزمائش کرتے رہتے تھے مجھے اس کے کھولنے تک کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ قائم گنج کی زبان میں اسے 'ڈیکو' کہتے تھے اور سب سے چھوٹے چاقو کو 'ڈیکیا'۔ لکھنؤ کا چوڑی دار تو قائم گنج کو نہ زیر کر سکا لیکن علی گڑھ کے تنگ مُہری کے پاجامے کا رفتہ رفتہ میرے بچپن میں رواج بڑھتا گیا۔ سر پر عموماً صافہ باندھا جاتا تھا لیکن نئی نسل کسی قسم کی ٹوپی بھی پہننے لگی تھی۔ شیروانی کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ اس کا رواج تو ان خاندانوں کے ذریعے رفتہ رفتہ پھیلا جن کا تعلق علی گڑھ یا حیدرآباد سے ہو گیا تھا جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھ میں لاٹھی یا مرزاپور کا ڈنڈا ضرور ہوتا۔ بیت یا چھڑی بھی تعلیم یافتہ نسل قائم گنج میں لائی ہے۔ البتہ بندوق رکھنے اور شکار کھیلنے کا شوق عام تھا۔ ہمارے پردادا شیر کا شکار کھیلنے ہمالیہ کی ترائی تک جاتے۔ ہم لوگ شکاری کتوں کو لے کر آس پاس کے کھیتوں اور باغات میں نکل جاتے جہاں خرگوش کے شکار میں بڑا مزہ آتا۔ شکاری کتوں کو 'ٹگے لگے' کہہ کر ہلکارنا اور پھر شکار کے پیچھے دوڑنا، ہم جوئی کا سا لطف آجاتا تھا۔ ہمارے گھر میں ماموؤں کے پاس ہر قسم کے آتشیں اسلحہ تھے لیکن احتیاط تھی کہ بچے اس کو ہاتھ نہ لگائیں۔ چنانچہ میں نے بندوق سے پہلا فیر ۱۹۷۰ء میں کیا۔ وہ بھی لائسنس کی تجدید کراتے وقت، حالاں کہ میرے پاس بندوق پچھلے اٹھارہ برس سے موجود ہے، اور میری بیوی اس بندوق سے کئی بار فیر کر چکی ہیں

جب وہ اس سلسلے میں میرے اوپر ہنستیں تو میرا بندھا ٹکا جواب یہ ہوتا کہ میں نے بندوق کا لائسنس چوروں کی وجہ سے لیا ہے۔ جب کسی چور سے سابقہ پڑے گا تو اس وقت فیر کر دوں گا۔ پندرہ برس تک میرے لائسنس کی تجدید سفارشوں کے ذریعے بغیر ذاتی حاضری کے ہوتی رہی۔ پچھلے سال اچانک حکم ملا کہ تھانے میں ذاتی حاضری دینا ضروری ہے اور سب انسپکٹر کے سامنے دو فیر داغنا ہوں گے۔ بندوق لے کر دود پور تھانے میں اپنے ایک عزیز کے ساتھ حاضر ہوا۔ میرے عزیز کو تشویش تھی کہ جب آج تک بندوق نہیں چلائی ہے تو یہ امتحان کیسے دے سکوں گا۔ خیر انسپکٹر صاحب نے تھانے کے احاطے میں کھڑے نیم کے درخت پر لٹکے ہوئے سیاہ کپڑے پر مجھ سے فیر کرنے کو کہا۔ میں نے نہایت اطمینان سے کارتوس نال میں ڈالا، گھوڑا چڑھایا اور دن سے سیاہ کپڑے پر مار دیا۔ جس اطمینان اور صفائی کے ساتھ میں نے یہ پہلا فیر کیا اس پر مجھے اور داروغہ دونوں کو تعجب ہوا۔ کہنے لگے "شری مان جی، آپ تو بہت اچھے بندوقچی معلوم ہوتے ہیں اب دوسرے فیر کی ضرورت نہیں۔" میں نے اپنے جی میں کہا سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آسان نکلا اب میں اپنے دوسرے فیر کے لیے یا تو کسی چور کے یا تین سال کے بعد تجدید لائسنس کا انتظار کر رہا ہوں!

خرگوش کے شکار کے لیے علاوہ میں نے پتنگ بازی کا بھی ناکام شوق کیا ہے۔ یعنی میری پتنگ کبھی دس فٹ سے اوپر نہ جا سکی جس پر مجھے بہت غصہ آتا اور اسے پھاڑ کر پھینک دیتا۔ گلی ڈنڈا بھی کھیلا معمولی کامیابی کے ساتھ۔ گولیاں اور تاش بھی کھیلے، اس طرح کہ ہمیشہ ہارا۔ شطرنج سے بھی شوق کیا لیکن ہمیشہ مات کھائی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں کسی کھیل میں کامیابی حاصل نہیں کر سکوں گا اور نہ کی۔ بچپن سے کانوں میں یہ تک بندی پڑی ہوئی تھی ؎

پڑھو گے لکھو گے تو ہو گے نواب
جو کھیلو گے کودو گے ہو گے خراب

حواس خمسہ میں میری قوت شامہ اور سامعہ بچپن سے نمایاں رہی ہیں چنانچہ جب بھی بچپن کی یادیں ذہن میں آتی ہیں تو دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ نیم اور سنبھلے کے پھولوں

کی مہک سے اور آم کے بور کی بھینی بھینی خوشبو سے۔ ہمارے مکانات میں نیم یا مولسری کے درخت کا ہونا لازمی تھا۔ اس کے ساتھ پاس کے باغات کے ترشاوے کے پھولوں اور آم کے بور کی لپٹیں آتیں۔ صبح کے وقت ان میں گہری سانسیں لینا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ گھروں کے اندر بیلے، چمیلی اور جوہی کے درخت ہوتے۔ نواڑی سب سے پہلے پھولتی اس کے بعد بیلا اور پھر چمیلی۔ شوقین نوجوان اُن کے گجرے بنا کر پہنتے۔ عورتیں بالوں میں گوندھتیں۔ میں رات کو انھیں سرہانے رکھتا۔ پھولوں کی قدرتی مہک میری آج بھی کمزوری ہے جس کو میں ہر قسم کے عطر پر ترجیح دیتا ہوں۔

قوتِ شامہ کی طرح میرا سامعہ کا حس بھی بچپن سے تیز رہا ہے۔ اس لیے بچپن میں چڑیوں کی چہچہاہٹ، کوئل کی کوکو اور شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ میرے لیے ہمیشہ سامعہ نواز ہوتی تھیں۔ خاموشی میرے لیے ہمیشہ باصدا ہوتی اس لیے کہ جس قدر یہ گہری ہوتی میں گلہریوں، چوہوں اور ٹڈوں کی آوازیں سنتا۔ قوت سامعہ کی اس مہارت ہی کی وجہ سے آگے چل کر میں اچھا ماہرِ صوتیات بن سکا۔ شور و غل چاہے وہ نوحۂ غم کا ہو یا نغمۂ شادی کا میرے لیے ہمیشہ عذابِ جان بن جاتا ہے۔

دوسرا باب

جامعہ ملیّہ اسلامیہ (۱)

ننہال میں بچوں کی تعلیم و تربیت کی جانب بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔ نانا صاحب علی گڑھ جاتے جاتے رہ گئے۔ بڑے ماموں ضرور پہنچ گئے لیکن انٹرمیڈیٹ کی پہلی کلاس سے ایسے بھاگے کہ مڑ کر نہ دیکھا۔ منجھلے ماموں جامعہ ملیہ اسلامیہ بھیجے گئے انھوں نے بھی آٹھواں درجہ پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مذہبی تعلیم کی جانب بھی توجہ کم رہی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کسی بھی مولوی سے قرآن کا ایک سیپارہ بھی پڑھا ہو۔ میری جہالت کا یہ دور شاید طویل تر ہو جاتا اگر ۱۹۲۶ء میں بڑے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ کے منصب پر فائز نہ ہو جاتے۔ وہ منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا جب فروری ۱۹۲۶ء کی ایک سہ پہر اہلِ قائم گنج کا ایک ہجوم انھیں لینے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آگرے کی جانب سے آنے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھی اپنی لمبی ٹانگوں کے باوجود ایک ملازم کی گود میں لدا وہاں موجود تھا۔ ریل سیٹی دیتی ہوئی پلیٹ فارم پر آ کر رکی۔ اس سے ایک متین و مقطع جوان گاڑی سے برآمد ہوا جسے ہجوم نے گھیر لیا۔ مجھے ان تک پہنچتے پہنچتے کافی عرصہ لگ گیا، لیکن انھوں نے مجھے ایک نظر میں پہچان لیا اور گود میں لے کر سینے سے لپٹا لیا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرے چھوٹے چچا محمود میاں (ڈاکٹر محمود حسین خاں) مجھے اپنے ساتھ لے کر جامعہ ملیہ داخلے کے لیے جائیں گے۔ جو اس وقت قرول باغ میں کرایے کی عمارتوں میں تھی۔ جامعہ ملیہ میں میرا داخلہ ۱۰ اگست

۱۹۲۷ء کو درجۂ دوم میں ہوا۔ چھوٹے چچا نے اندازتاً میری عمر ایک سال چار مہینے زیادہ لکھوا دی جو بعد کو میٹرک کے سارٹیفکٹ میں جوں کی توں رہی اور مجھے یونیورسٹی کی ملازمت سے اس مدّت کے بقدر پہلے ریٹائرڈ ہونا پڑا۔

جامعہ ملّیہ میں میری رہائش بچوّں کی اقامت گاہ، خاکسار منزل میں رہی جس کے دو حصّے تھے، ایک کے نگراں ارشاد الحق صاحب تھے اور دوسرے حصّے کے جہاں نسبتاً زیادہ عمر کے بچے رکھے جاتے تھے، اختر حسن فاروقی صاحب۔ ارشاد الحق صاحب، ہمارے انگریزی کے استاد بھی تھے اور اختر صاحب ڈرائنگ کے ٹیچر۔ ساتھی طلبہ میں پوربی یوپی کے آفتاب، قائم گنج کے شفیق احمد اور قدوائی خاندان کے اخلاق الرحمٰن قدوائی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ میری اور آفتاب کی دوستی اور ہمہ وقت کی یک جائی پر اختر صاحب کو اکثر فقرہ کستے ہوئے سنا، حالاں کہ معاملہ صرف "افلاطونی محبت" تک محدود تھا۔ پانچوں وقت کی نماز کی پابندی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد لائن بنا کر سب طالب علم کچھ فاصلے پر پہاڑیوں سے گھرے ہوئے میدان کا رُخ کرتے جہاں جامعہ کالج کے استاد پروفیسر کیلاٹ عمر اور غذا دونوں سے غیر متناسب ڈنڈ بیٹھک اور دوڑ لگواتے۔ شام کو ہاکی کھیلنے کے لیے پھر اسی میدان میں آنا پڑتا تھا جہاں تک جسمانی تربیت اور ڈسپلن کا تعلق ہے اس میں کیلاٹ صاحب کے انہماک کا بڑا ہاتھ ہے۔ وہ ایک مالاباری عیسائی تھے جو نہ معلوم کس طرح ۱۹۲۲ء میں بھٹک کر جامعہ آگئے تھے۔ کنوارے تھے اور دمہ کے دائمی مریض۔ بایں ہمہ انھوں نے کالج میں درس دینے کے ساتھ جامعہ کے اسکول کے بچوں اور کالج کے طلبہ کی جسمانی حالت بہتر بنانے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ دہلی کی کڑاکے کی سردی میں بھی وہ سب سے پہلے میدان میں پہنچتے اور ورزش اور کھیل دونوں میں بساط بھر حصّہ لیتے۔ ان کا کرایہ کا مکان قرول باغ کی پہاڑیوں کے کنارے پر تھا، جہاں سے ان کی ہمہ وقتی موجودگی کا احساس رہتا۔ ان کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو یہ تھا کہ علی گڑھ اور دہلی میں ایک عمر بتانے کے بعد بھی وہ بہت ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی بول سکتے تھے۔ چنانچہ جب کوئی لڑکا ڈنڈ لگاتے لگاتے اپنا سینہ زمین پر ٹیک دیتا یا دوڑ میں پھسڈّی رہ جاتا تو اس کے چوتڑوں پر ہاتھ مار کر کہتے "تم گدّا (گدھا) الّو کا موافِک (موافق)" یا "تم دوتی (دھوتی) والا" حالاں کہ مکان پر وہ خود بنیان اور ملیالی

قسم کی دھوتی میں ملبوس رہتے تھے۔ انھوں نے ایک طرح سے کالج کی اعلیٰ درسیات کے علاوہ نونہالانِ وطن کی جسمانی تربیت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا۔ جامعہ ملیہ کے نظم و ضبط میں اس جسمانی ورزش اور تربیت کا خاص مقام تھا۔ قوم کے ننھے سپاہی کو ایک روشن ذہن اور سیرت کے ساتھ ایک مضبوط جسم کی بھی ضرورت تھی۔ آج جامعہ ملیہ کیلاٹ صاحب جیسے خدائی خدمت گار کو بالکل بھول گئی ہے۔ انھوں نے ایک پوری نسل کی ذہنی اور جسمانی تربیت کی ہے۔ جسمانی تربیت کی شہادت کے لیئے مجھ پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ چونکہ کیلاٹ صاحب کالج میں پڑھاتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا اس لیئے ذہنی سطح پر انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا ذکر ایک سینیر جامعی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی زبانی سُنیئے:

"ہمارے اساتذہ میں سب سے زیادہ لائق اور بافیض مسٹر کیلاٹ تھے جو سیاست اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ نصاب کے علاوہ وہ طالب علموں کی عام معلومات بڑھانے کے لیئے روز ایک لکچر دیتے تھے جو نہایت دلچسپ ہوتا تھا اس کا موضوع بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مذہب اور اخلاق اور کبھی علم الانسان (انتھراپولوجی)۔ طرزِ بیان شُستہ اور برجستہ تھا انگریزی زبان پر بڑی قدرت تھی۔ بولتے بھی اچھا تھے اور لکھتے بھی اچھا تھے ...... تاریخ کے علاوہ انھیں انگریزی ادب سے بھی خاص لگاؤ تھا .... کیلاٹ صاحب کے لکچروں میں میں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارے سامنے علم کی دُنیا کے دروازے کھل گئے ہوں جو اب تک بند تھے۔

کیلاٹ صاحب کی وضع اور سیرت کے اُستاد آج ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ناپید ہیں ..... کیلاٹ صاحب کا اوڑھنا بچھونا جامعہ تھی۔" (یادوں کی دنیا)

کیلاٹ صاحب کی آج کوئی یادگار جامعہ ملیہ میں نہیں لیکن ان کے شاگردوں کے دلوں میں موجود ہے ؏

رفتید ولے نہ از دلِ ما

جامعہ ملیہ کے دارالاقامہ کی زندگی میں "اسپارٹن" اسپرٹ کی خاص اہمیت تھی۔

ورزش کے میدان سے لوٹتے تو دو بڑے پاپے اور ایک پیالی دودھ کا ناشتہ ملتا۔ جی میں
کہتا: قائم گنج کے مکھن، ملائی اور گھی والے مسعود کہاں آکر پھنسے ہو! لیکن رفتہ رفتہ اس تزکیۂ نفس
کا عادی ہوتا گیا۔ ناشتے کے بعد کتابیں لے کر اسکول چلے جاتے جس کی عمارت خاکسار منزل
سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ یہیں شیخ الجامعہ کا صدر دفتر تھا۔

چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ کے نگراں، ارشاد الحق صاحب ایک بااصول شخصیت
کے انسان تھے۔ وہ بچوں سے ہمدردی بھی رکھتے تھے اور ڈسپلن پر نظر بھی۔ پابندیٔ نماز و
اوقات پر اصرار کرتے۔ بچوں کو صفائی کی تاکید رہتی۔ صبح اٹھتے ہی ہر بچہ اپنا بستر خود ٹھیک
کرتا۔ میرے دل میں ان کی بہت عزت تھی اور وہ میرا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔ ۱۹۷۳ء
میں جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر اوکھلا پہنچا تو اس وقت وہ بستر مرگ پر تھے۔
مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں وہ چمک آگئی جو ایک استاد کو اپنے چہیتے شاگرد کو اعلیٰ منصب
پر فائز دیکھ کر ہوتی ہے۔ میری توجہ جامعہ ملیہ کی زیر تعمیر جامع مسجد کی جانب خصوصی طور
پر مبذول کرائی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان کے یہاں ایک وقت کا کھانا ضرور کھاؤں۔
میرا جواب ہمیشہ یہی ہوتا کہ جلدی کیا ہے جب آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو کھاؤں گا
لیکن اس کی نوبت کبھی نہیں آئی اور وہ اپنے مولا سے جا ملے۔

خاکسار منزل کے بڑے بچوں کے دارالاقامہ کے (جہاں میں چند سال کے بعد منتقل
ہو گیا تھا) نگراں اختر حسن فاروقی صاحب تھے جنھوں نے لکھنؤ کے اسکول آف آرٹس میں
تعلیم پائی تھی۔ وہ اپنے فن کے ایک کامیاب استاد تھے اور طالب علموں میں آرٹس سے دلچسپی
پیدا کر دیتے تھے۔ حلیے کے اعتبار سے بھی وہ آرٹسٹ معلوم ہوتے تھے۔ نئی نئی شادی ہوئی تھی۔
بیگم کو دو مختصر سے کمروں میں جو انھیں بحیثیت نگراں ملے ہوئے تھے پس پردہ رکھتے تھے،
حالاں کہ ہم میں سے کسی کی عمر اس وقت چودہ برس سے زیادہ کی نہیں ہوگی۔ بورڈنگ ہاؤس
کے اس حصے میں اخلاق الرحمٰن قدوائی میرے روم فیلو تھے۔ اخلاق تحریر و تقریر کے
اعتبار سے اوسط درجے کے طالب علم تھے، لیکن انسانی معاملات میں ان کی سوجھ بوجھ مجھ سے
اچھی تھی۔ خود جوڑ توڑ سے فوڈ مانیٹر بن جاتے اور مجھے کہہ سن کر پیپر مانیٹر بنوا دیتے! انھیں

اپنی دنیا اور میری عاقبت کا بہت خیال رہتا تھا۔ میں اس بار اس انتخاب پر بہت زیادہ خوش نہیں تھا، خاص طور پر دہلی کے کڑاکے کے جاڑے میں فجر کی اذان کیلئے صبح صبح اٹھنا قیامت تھا۔ وضو کے لیے گرم پانی کا انتظام بس یوں ہی سا تھا۔ زیادہ تر ہمیں کنوئیں کے تازہ پانی پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ان حالات کے تحت اکثر ایمان متزلزل ہو جاتا۔ ایک صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ پو پھٹ چکی تھی۔ اس لئے تڑپ کر اٹھا اور بغیر وضو کئے برآمدے میں کھڑے ہو کر اذان دینا شروع کر دی۔ اختر صاحب اس وقت تک اٹھ چکے تھے اور گرم پانی سے وضو کر کے اذان کا انتظار کر رہے تھے۔ جونہی میں نے اللہ اکبر کہا وہ اپنے کمرے سے برآمدے میں برآمد ہوئے۔ ایک نظر میں بھانپ لیا کہ میں بغیر وضو کے اذان "پڑھا" رہا ہوں۔ چپکے سے پیچھے آ کر انھوں نے عین اذان میں میرا کان پکڑ لیا۔ اذان یک لخت رک گئی۔ بولے "ہَت نالائق! پر یہ بیڑا غرق ہوا اور بغیر وضو کے اذان دیتے ہو"۔ غالباً میری اس ترکیب کے بارے میں وہ کئی روز سے شبہ کر رہے تھے اور موقع کی تاک میں تھے۔ میں نے اپنے جرم کا فوراً اقرار کر لیا اور اس کے ساتھ یہ اعتذار کہ "ماسٹر صاحب! (ماسٹر صاحب) اس کڑاکے کی سردی میں بغیر گرم پانی کے وضو کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر کر لیا تھا"۔ لیکن وہ کب ماننے والے تھے۔ مجھے طلبہ کے سامنے رسوا کیا گیا۔ البتہ اس واقعہ کا یہ مثبت نتیجہ ضرور نکلا کہ دوسرے روز سے فجر کی نماز کے لیے طالب علموں کو گرم پانی ملنے لگا۔ میں نے اپنی عاقبت خراب کر کے اپنے ساتھیوں کی دنیا اچھی کر دی!

اسی زمانے کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ تعلیمی سال کے شروع میں طالب علم اپنے گھروں سے آتے تو از قسم حلوہ وغیرہ ضرور ساتھ لاتے، جسے وہ تینت تینت کر رکھتے تاکہ زیادہ دنوں تک لطف اندوز ہو سکیں۔ اخلاق الرحمٰن نے سونگھ لیا کہ بعض متمول گھرانوں کے طالب علم اس سال حلوہ اور خشک میوہ جات قسم کی چیزیں کافی مقدار میں لائے ہیں اور اپنے خاص خاص دوستوں کے علاوہ کسی کو ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ مجھ سے بولے کہ فجر کی نماز میں جس دن اختر صاحب نہ آئیں اور تم امامت کرو، اس روز سورت طویل کر دینا اور رکوع و سجدہ میں خشوع خضوع بڑھا دینا۔ چنانچہ ایک روز یہی ہوا اور ایسا ہی کیا گیا۔ ادھر اخلاق چند باکمالوں کے ساتھ پچھلی صف سے نیت توڑ کر دھیرے سے کھسک لیے اور کمروں میں جا کر غارت گری شروع

کردی۔ جب کام مکمل کر لیا تو مالِ یغما کو چھپا کر پچھلی صف میں آکر پھر کھڑے ہو گئے اور کھنکھار کے ذریعے اپنی کامرانی کا اشارہ کیا۔ پھر سلام پھیر کر دعا مانگی گئی "اے میرے رب! تو سب کا رزّاق ہے"۔ اس کے تھوڑے ہی دیر بعد ایک طرف کہرام تھا اور دوسری طرف 'فتوحات' کے شادیانے۔ شکایت ہوئی لیکن اس سے قبل 'فتوح' خلوئے معدہ کو پُر کر چکی تھیں۔

اسکول کے اساتذہ میں سب سے بارعب شخصیت برکت علی صاحب کی تھی جو عام حاضری بھی لیتے تھے اور ریاضی بھی پڑھاتے تھے۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے استاد تھے لیکن چوں کہ ساری عمر عالمِ تجرّد میں گذری تھی اس لیے طبیعت میں قدرے سختی تھی۔ وہ اردو خالص کھڑی بولی کے (بجنور سے تعلق تھا) لہجہ میں بولتے تھے یعنی 'اُس کو' کو واؤ معروف سے اور فعل مضارع کے صیغے کو "تا" کے بغیر جیسے کرے ہے جائے ہے وغیرہ۔ ہم سب ان کے پڑھانے اور سمجھانے کے معترف تھے لیکن ان کے قریب آنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ کچھ آتش اور آتش پرست کا سا رشتہ تھا۔ اُن کی ہنسی سے بھی ڈر لگتا تھا اور زکام سے بھی، معلوم نہیں دونوں کس وقت بگڑ جائیں۔

اُن کے برعکس ہمارے عربی اور دینیات کے استاد مولوی سعد انصاری صاحب طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہ اپنی ناراضگی زیادہ سے زیادہ " نالائق " سے ظاہر کرتے۔ مصر ہو آئے تھے اور وہاں کے قومی ترانے "مصرُ عزیزۃٌ لی وطن" سے بہت متاثر تھے۔ ایک لفظ کی تحریف کے بعد اُنھوں نے اسے ہندی ترانے میں بدل دیا تھا۔ "ھندُ عزیزۃٌ لی وطن"۔ کلاس میں ہم سب سے اسے گانے کے لیے کہتے۔

اردو کے اُستاد سعید انصاری صاحب تھے جو میرے جامعہ ملیہ وائس چانسلر ہو کر آنے تک حیات تھے۔ اس وقت وہ جامعہ کی جامع مسجد کی تعمیر کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے اس کی تعمیر میں دل و جان سے مصروف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسجد کا سارا فرش سنگِ مرمر کا ہو۔ میں نے لاکھ اقبال کے اس شعر کا حوالہ دیا ؎

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو

لیکن وہ اپنے منصوبہ پر اڑے رہے۔ آخر میں جب روپے کی کمی پڑ گئی تو میں نے سعودی سفارتخانے

سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا اور وہاں سے تین لاکھ کی نقد رقم ملنے کے بعد اس کام کی تکمیل ہوئی۔ یہ مسجد حیدرآباد کے مشہور آرکیٹیکٹ فیاض الدین صاحب کے ذہن کا نقشہ ہے اور اس کا مادی وجود سعید انصاری صاحب کی لگن اور ریاضت کا پھل ہے۔

جامعہ ملیہ کے اسکول میں، مَیں نے ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۲ء تعلیم حاصل کی۔ اس چھ سال کے قیام نے میری کایا ہی بدل دی۔ میں قائم گنج سے ایک کندۂ ناتراش آیا تھا جس میں ''ضد'' کی صفت کے علاوہ اور خصوصیت نہیں تھی۔ جامعہ ملیہ کے ماحول میں مجھے قومی احساسات اور تصورات کا پہلی بار علم ہوا۔ ساری فضا قومیت اور ایثار سے سرشار تھی۔ ہر دفتر میں اقبال کا یہ شعر کتبے کی شکل میں آویزاں پایا ؎

ما زتخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

اور مولانا حالی کی یہ رباعی :

دنیائے دَنی کو نقشِ فانی سمجھو ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر لمحے کو مہر جاودانی سمجھو

یہیں میں حالی اور اقبال کی عظمت سے بھی آشنا ہوا۔ فکرِ اقبال جو تقسیم ملک کے بعد عرصہ تک 'فکرِ ممنوعہ' کے طور پر عتاب کی نظروں سے دیکھی گئی ہے، اُس وقت اس کا غلغلہ تھا۔ جامعہ کے طلبہ کے سامنے ایک اچھے ہندوستانی اور سچے مسلمان کا مسلک تھا اور بتایا جاتا تھا کہ دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ یہیں میں نے غالب کی فرضی تصویر اور اصلی دیدہ زیب دیوان کو دیکھا جو شرکتِ کاویانی، برلن نے شائع کیا تھا۔ جامعہ ہی کی چہار دیواری میں میں نے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور گاندھی جی کو پہلی بار دیکھا۔ گاندھی جی اپنے پوتے کی وفات پر آئے تھے جسے انھوں نے جامعہ کے لیئے وقف کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے پوتے کے اِنتقال کا ذکر نہایت رقت آمیز لہجہ میں کیا جس سے ہم سب بہت متاثر ہوئے لیکن جب انھوں نے 'میں میں' کرنا شروع کیا (گجراتی مَیں کا تلفظ یوں کرتے ہیں) تو مجھے اُن پر رحم آنے لگا۔ بڑا ہوا اردو والوں کے اس احساس تفوق کا! انھیں کے ایما سے بعد کو ان کے صاحبزادے دیوداس گاندھی نے جامعہ میں کئی سال تک قیام کیا اور ہم لوگوں کو ہندی پڑھانے کے علاوہ تکلی اور چرخہ

سکھانے کا فن سکھایا۔ ہاتھ کے کام کی تعلیم میں اہمیت کو یہیں جانا۔ ماسٹر عبدالحیٔ صاحب سے کارپینٹری سیکھی اور منشی محمد علی فرخ آبادی سے خوشخطی۔ باغبانی اور زراعت کے فن کی شد بد یہیں ہوئی۔ جامعہ میں سب کھدر پوش تھے کیا اُستاد کیا طلبہ۔ کئی بار ہمارے ساتھیوں نے ولایتی کپڑوں کے ڈھیر لگا کر اسے نذرِ آتش کیا تھا۔ تیرہ اپریل کو جلیانوالہ باغ کے خونی حادثے کی یاد میں دن بھر کا سارا کام ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کرتے، جس میں بیت الخلا کی صفائی بھی ہوتی۔ اردو زبان و ادب کا چسکا بھی جامعہ کی دین ہے۔ ہماری انگریزی کی استعداد تو واجبی رہی لیکن اُردو میں اسی زمانے میں چھوٹے موٹے ادیب بن گئے۔

اسی زمانے میں مجھے پہلی بار کشمیر جانے کا موقع ملا۔ یہ اس اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ اسی سفر میں علامہ اقبال سے اُن کے درِ دولت پر ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جامعہ ملیہ کے کالج کے استاد سید نذیر نیازی صاحب نے جو علامہ اقبال کے ہم وطن اور عقیدت مند تھے، ڈھائی مہینے کی طویل رخصت اس غرض سے لی کہ وہ کشمیر جا کر وہاں علامہ کے انگریزی خطبات کا اردو میں ترجمہ کریں گے۔ اس کا وعدہ وہ بہت پہلے کر بیٹھے تھے، لیکن دہلی کی مصروفیات میں اس کام کی طرف توجہ نہ دے سکے۔ اس کا ذکر جب انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ "آجکل مسعود کی صحت ٹھیک نہیں رہتی ہے بہت دُبلے ہو گئے ہیں انھیں بھی اپنے ہمراہ لیتے جائیے۔ اُن کا خرچ میں برداشت کروں گا۔" کشمیر جاتے ہوئے ہم لوگ راستے میں دو روز کے لیے لاہور ٹھہرے۔ ظاہر ہے نذیر نیازی صاحب علامہ اقبال سے بغیر ملے کیوں کر آگے بڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ دوسرے ہی دن سہ پہر کو علامہ اقبال کی کوٹھی پر گئے جو میکلورروڈ پر واقع تھی۔ علامہ کوٹھی کے باہر مونڈھے پر پاؤں سمیٹے ہوئے قمیص اور شلوار زیب تن کئے تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ نیازی صاحب کو پہچانتے ہی انھوں نے کہا "آؤ جی نیازی جی! کہو کیا حال چال ہیں؟" نیازی صاحب نہایت نیاز مندی کے ساتھ ایک مونڈھے پر بیٹھ گئے اور مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے علامہ سے بولے: "یہ مسعود حسین ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کے بھتیجے۔ صحت کی تلاش میں میرے ساتھ کشمیر جا رہے ہیں۔ آپ کے چند ہیں اور انھیں آپ کا سارا اردو کلام ازبر ہے۔" علامہ ایک مشفقانہ نظر ڈالتے ہوئے

مجھ سے بولے "کشمیر جا کر ایک شفتالو روز کھاؤ، سرخ ہو جاؤ گے"۔ اتنا کہہ کر وہ نیازی صاحب سے محو گفتگو ہو گئے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا دونوں کی گفتگو کا محور علامہ کے خطبات تھے۔ انھوں نے اس بات پر طمانیت کا اظہار کیا کہ اب نیازی صاحب کشمیر کے دورانِ قیام میں انھیں ضرور مکمل کر لیں گے لیکن کشمیر میں ڈھائی ماہ قیام کرنے کے بعد جب لوٹے تو ترجمہ چند صفحات سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ انھوں نے اب مصلحت اسی میں سمجھی (میرے اصرار کے باوجود) کہ علامہ سے ملاقات نہ کی جائے۔ علامہ سے انھوں نے اپنا وعدہ اُن کے انتقال کے بیس برس بعد پورا کیا!

دہلی پہنچ کر لوگوں نے جب علامہ اقبال کے بارے میں میرے تاثرات معلوم کرنے چاہے تو میں نے یہی کہا کہ میرے ذہن میں جو شاعر کا تصور تھا میں نے انھیں اس سے مختلف پایا۔ باریک ترشی مونچھیں، کروکٹ بال، بھاری بھر کم ڈیل ڈول، مجھے ان پر پنجابی پہلوان ہونے کا گمان زیادہ گزرا۔ میرے ذہن میں اردو شاعر کی تخلیقی شخصیت کا جو تصور تھا وہ یک لخت پاش پاش ہو گیا اور میری ذہنی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوئی ؏

تماشا کامیاب آیا تمنا بے قرار آئی

میرا کشمیر کا یہ سفر کئی لحاظ سے کامیاب رہا۔ وہیں میں نے پہلا شعر کہا۔ ڈھائی مہینے میں وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور فواکہات نے مجھے سرخ و سفید بنا دیا۔ ہمارا وہاں قیام ستمبر تا وسط دسمبر ۳۳ء رہا۔ اس لیے وہاں کے خزاں کی رنگینی بھی دیکھی اور سیب، ناشپاتی اور خشک میوہ جات کی بہتات بھی۔ قیام نذیر نیازی صاحب کے رشتے کے بھائی کے یہاں "بند" پر سرکاری کوارٹرس میں تھا۔ روز شام کو ٹہلتے ہوئے لال چوک پہنچ جاتے جہاں سے سیب، خشک میوہ اور خاص طور پر علامہ اقبال کے تجویز کردہ شفتالو خرید کر لاتا۔ نذیر نیازی صاحب کی بھاوج کشمیری کھانا بہت اچھا پکاتی تھیں، جو چاولوں کے ساتھ بڑا مزہ دیتا تھا۔ اس مستقر سے وادی کے دوسرے دلچسپ مقامات کے دھاوے مارے جاتے۔ گلمرگ اور کھلن مرگ کے دھاوے میں سیالکوٹ کے مہتاب پال بھی ساتھ تھے۔ وہ وہاں کسی عہدے کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے لیکن شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف تھے۔ ان کا اور نذیر نیازی صاحب کی ادبی بحثیں ہوتیں۔ میرے لیے تفریح کا سب

دلچسپ مشغلہ دریائے جہلم کے کنارے کا "بند" تھا۔ اُس زمانے میں ولایتی اسباب سے بھری ہوئی دوکانوں اور منتخب سیاحین کے خرید وفروخت کا بازار ہونے کی وجہ سے یہ بہت بارونق تھا۔ جہاں آج سرکاری ایمپوریم ہے، اُسی میں ریزیڈنٹ کی رہائش گاہ اور دفاتر تھے۔ دریا کے پار پبلک لائبریری تھی جہاں شکارے میں پار کرکے جاتا اور وہاں سے بشرر کی ناولیں پڑھنے کو لے آتا۔ میں نے جس قدر ناولیں اُس زمانے میں پڑھی ہیں بعد کو سب ملا کر بھی اتنی نہیں پڑھیں۔

پاس میں ریزیڈنٹ کے میر منشی سراج الدین صاحب کا مکان تھا، جہاں کبھی کبھی چلا جاتا تھا وہ علامہ اقبال کے بڑے معتقد تھے۔ ان کے مکتوب الیہ بھی رہے ہیں۔ وہ بڑے صاحب علم اور سخن فہم تھے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک خط میں انھیں لکھا تھا "آپ ہندوستان کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کو شاعری سے طبعی مناسبت ہے اور اگر نیچر ذرا سی فیاضی سے کام لیتی تو آپ کو زمرۂ شعراء میں شمار کرتی۔"

لیکن میری دلچسپی کا مرکز وہ اِس لیئے بنے کہ وہ ایک چابکدست جلد ساز تھے اور اپنے فرصت کے اوقات میں اپنی کتابوں کی نہایت خوبصورت جلدیں باندھنے میں مصروف رہتے۔ اُن کے پاس جلد سازی کا مکمل ساز وسامان تھا۔ باتیں کرتے جاتے اور اپنے ہاتھ کے کام میں مصروف رہتے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ بھی دیکھنے کے لائق تھا۔ ہر چند وہ اپنی کتب مستعار دینے کے قائل نہیں تھے لیکن اس کو دیکھ کر ہی خوش ہوتا اور جی میں منصوبہ باندھتا کہ علم سے ہر دلچسپی رکھنے والے کو انھیں کی طرح جلد ساز ہونا چاہیئے۔

یہ مہاراجہ کے استبداد کا زمانہ تھا۔ پوری وادی پر سیاسی سکوت چھایا ہوا تھا۔ البتہ کبھی کبھی لال چوک میں جھنڈیاں اڑتی نظر آجاتی تھیں۔

ہر طرف چہل پہل رہتی صرف مظلوم کشمیری منظر سے غائب رہتا۔

تیسرا باب

"بنگلہ دیش، اک رنگ بھون" (دوئم)

۱۹۳۲ء کا سال میری زندگی میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی سال میرے چھوٹے چچا، ڈاکٹر محمود حسین خاں، جرمنی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر ہندوستان واپس آئے اور تلاشِ روزگار میں اپنے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں حیدرآباد میں مقیم ہوئے۔ اتفاق سے دہلی سے بڑے چچا، ذاکر میاں، بڑے بھائی امتیاز حسین خاں اور میں بھی گرما کی تعطیلات گزارنے کے لیے وہاں پہنچے۔ یہ ایک طرح کا عرصے کے بعد خاندان ملن، تھا۔ محمود میاں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ تعلیم میں کسی اسامی کے لیے کوشاں تھے اور ڈھاکہ یونیورسٹی میں بھی درخواست دے رکھی تھی۔ حسنِ اتفاق ایک روز ڈھاکے سے اطلاع ملی کہ وہاں یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں اُن کا انتخاب بحیثیت ریڈر ہو گیا ہے۔ احساسِ دوری کے باوجود فوراً وہاں کے لیے پابہ رکاب ہو گئے، شرط یہ لگا دی کہ مسعود کو بھی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ اس وقت تک اُن کی شادی نہیں ہوئی تھی اور وہ دوری اور تنہائی دونوں کو بہ یک وقت برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سب بزرگوں نے اُن کی ہاں میں ہاں کی۔ بس پھر کیا تھا بے سروسامانی کی حالت میں اُن کے ساتھ طویل سفر پر روانہ کر دیا گیا۔ اس طرح جامعہ سے میرا چھ سال کا تعلق ختم ہو گیا۔ کلکتے اور اس کے بعد دریائی بندرگاہ گوالندو تک کا سفر ہم نے ریل سے طے کیا۔ اس دوران محمود میاں کے 'مجھن خانی، جلال کا مظاہرہ دیکھا جب انھوں نے ایک قلی کے محبت کرنے پر

ایک چھتری اس کے سر پر توڑ دی۔ وہ بہت باغ و بہار انسان تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا، لیکن غصے میں بے آپے ہو جاتے۔ قائم گنج کی بوڑھیوں کا ایک محاورہ اُن جیسوں ہی کے لیے تھا، 'پٹھان کا پوت، ذرا میں ولی ذرا میں بھوت!'

گوالندو سے اسٹیمر پکڑا جس نے چند گھنٹے کے دریائی سفر کے بعد ہمیں ابندرگاہ نرائن گنج پہنچا دیا۔ وہاں سے پھر ریل لی اور گھنٹہ بھر میں ڈھاکہ پہنچ گئے۔ یونیورسٹی کیمپس کے اندر نیل کھیت روڈ پر پہلے سے ایک مکان الاٹ ہو چکا تھا۔ یہ سلیم اللہ مسلم ہال کی پشت پر تھا۔ آس پاس یونیورسٹی کے اساتذہ کی رہائش کے لیے دوسرے چھوٹے بڑے مکان بنے ہوئے تھے۔ ہمارے ایک پڑوسی رام پور کے فدا علی خاں تھے، جو شعبۂ فارسی و اردو کے صدر تھے۔ تھوڑے فاصلے پر 'شیر شاہ' کے مشہور مصنف قانون گو صاحب کا مکان تھا۔ وہ بڑے محنتی انسان تھے۔ برآمدے میں ایک فارسی داں منشی صبح تا شام بیٹھا رہتا جس سے استفادہ کرتے رہتے۔ صدرِ شعبۂ انگریزی حسن صاحب کی کوٹھی تھی۔ وہ انگریزوں کے انداز میں نہایت ٹیپ ٹاپ سے رہتے تھے۔ یہ تو بعد کو علی گڑھ پہنچ کر راز کھلا کہ انگریزی کا پروفیسر بہ حلیۂ اردو بھی پایا جاتا ہے۔

ڈھاکہ پہنچ کر اب میٹرک داخلے کی فکر ہوئی۔ میں نے جامعہ سے آٹھواں درجہ پاس کیا تھا، اردو ذریعۂ تعلیم سے۔ ڈھاکے میں ہر جگہ انگریزی میڈیم تھا۔ تلاش بسیار کے بعد مجھے آرمنی ٹولہ گورنمنٹ ہائی اسکول کی نویں کلاس میں داخلہ مل گیا۔ یہ اسکول ایک ٹریننگ کالج سے ملحق تھا اس لیے دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر، مسٹر بسواس، ایک بنگالی عیسائی تھے۔ اسکول کے دیگر تمام اساتذہ بھی بنگالی ہندو تھے۔ صرف اردو فارسی کے استاد عندلیب شادانی صاحب کے ایک مسلمان شاگرد تھے۔ وہ بھی بنگالی نژاد تھے اور اسی لہجہ میں اردو بولتے تھے۔ اردو پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد صرف تین تھی۔ ایک میں، ایک نورالدین اور ایک ڈھاکہ ہی کے رہنے والے ایرانی خاندان کے فرد جن کا نام یاد نہیں رہا۔ نورالدین کے دادا [illegible] تھے۔ اس نے ان کے گھرانے میں ایک [illegible] بنگالی

کا علاقہ ہے لیکن ڈھاکے کے نوابین کے خاندانوں اور اسلام پورہ جیسے کچھ محلوں میں بنگالی لہجہ میں اردو کا رواج تھا۔ یہاں کے لوگوں کو دونوں زبانوں کی واقفیت تھی لیکن وہ اپنی مادری زبان اردو کو ہی سمجھتے تھے۔

نوابینِ ڈھاکہ کے ارد گرد اہلِ اردو کا جو طبقہ تھا اس میں سرجن بھی تھے۔ طبیب بھی تھے اور اہلِ علم بھی۔ ڈھاکہ ہی میں بیٹھ کر مرزا آغا جان طیش دہلوی نے وہاں کے شعراء کو اردو کے دہلوی محاورے سے متعارف کرانے کے لیے ۱۸۸۱ء میں "شمس البیان فی مصطلحات الہندستان" تصنیف کی۔ میں جب وہاں تھا تو حکیم حبیب الرحمٰن نہ صرف ڈھاکے کے مشہور طبیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اہلِ علم اور شاعر بھی تھے۔ ان کے محمود میاں سے گہرے تعلقات تھے۔ مجھ پر بڑی شفقت رکھتے تھے۔ نواب خاندان کے کئی نوجوان مختلف اوقات میں میرے کلاس یا کالج فیلو بھی رہے۔ ان میں سر ناظم الدین کے بھتیجے، شہاب الدین صاحب کے دو فرزند اب تک حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ ہیں۔ انٹر میڈیٹ کالج میں مجھ سے ایک سال سینئر نواب خاندان کے قیصر تھے، جو بہت اچھے طالب علم اور اسپورٹس مین تھے بعد میں ترقی کر کے وہ چین میں پاکستان کے سفیر ہو گئے تھے۔ یہ سب لوگ اردو والے تھے۔ البتہ مجھ سے بات کرتے وقت تھوڑی سی جھجک محسوس کرتے، دہلی اور لکھنؤ کے علاقے کی اردو کی یہاں اس قدر دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ حضرات بنگالی بھی فرّاٹے کے ساتھ بولتے تھے لیکن اردو کو اپنی مادری زبان تسلیم کرتے تھے، اس لیے تعلیمی اداروں میں اسے مادری زبان کی حیثیت سے پڑھتے اور گھروں میں اسی زبان میں بات چیت کرتے۔ بنگال میں مرشد آباد اور ڈھاکہ اُردو کے دو جزیرے تھے جو بنگالی کے بحرِ زخّار میں، میرے زمانے تک اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھے۔

میرے اسکول کے ساتھیوں میں دو طالب علموں نے اپنے اپنے طور پر امتیاز حاصل کیا۔ ایک نور الدین جو اپنے والد کی طرح بعد کو ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار ہوئے۔ وہ بڑے شرمیلے انسان تھے۔ اس لیے مجھ سے کھلنے میں انھیں خاصی دیر لگی۔ لیکن جب کھل گئے تو میرے ساتھ گرمیوں کی تعطیل میں قائم گنج اور دہلی تک آئے اور پھر میری تحریک پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آ کر بی۔اے میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ نے انھیں زیادہ دنوں تک انگیز نہیں کیا، اس لیے

بہت جلد چھوڑ کر واپس ڈھاکہ چلے گئے۔ دوسرے ساتھی نورانرائن چودھری کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ٹھیٹھ بنگالی تھے، لیکن "ہمارا باپ آیا، ہمارا ماں آیا، ہمارا بہن آیا، شب آیا" قسم کی ہندوستانی میں گفتگو کر لیتے تھے۔ وہ طالب علمی کے زمانے میں مجسمہ سازی اور سنگ تراشی سے دلچسپی رکھتے تھے۔ میں اکثر ان کے یہاں جاتا تھا۔ میری فرمائش پر اُنھوں نے مجھے اِس زمانے کے گراموفون ریکارڈوں پر بنے ہوئے کُتّے کی تصویر کا مجسمہ تراش کر تحفہ کے طور پر دیا تھا جو اب تک میری میز پر پیپر ویٹ کی شکل میں رکھا رہتا ہے۔ عرصہ کے بعد جب وہ شہرت یافتہ شنکو چودھری کے نام سے دہلی میں مقیم تھے اور ایک روز مجھ سے ملنے جامعہ ملیہ آئے تو میں نے اُن کا تراشا ہوا کتّا اُنھیں دکھایا۔ خیال تھا کہ وہ اسے اپنے ایّامِ جاہلیت کی یادگار سمجھ کر عزیز رکھیں گے، لیکن اُنھوں نے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی، اِس لیے میری نیت، جو تحفہ کے طور پر اُنھیں واپس دینے کی تھی، بدل گئی۔ اور وہ میرے پاس ہی رہ گیا ہے۔ شنکو مجسمہ سازوں کے حلقوں میں آج ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہائی اسکول کے بعد وہ برسوں شانتی نکیتن سے منسلک رہے اور وہیں اُنھوں نے پہلے نام کمایا۔ اب لَلِتْ کلا اکیڈمی کے صدر ہیں۔

ڈھاکہ میرے لیے ایک اجنبی ماحول تھا۔ اردو بولنے کے بہت کم مواقع ملتے تھے۔ مگر ایسی نہ تھی کہ میں اپنے تکلّمی ذریعۂ ابلاغ کو میر صاحب کی طرح بند کر دوں۔ ایک طرح سے غالب اور اقبال کے ماحول سے نکل کر میں ٹیگور اور نذرُل کے ماحول میں آ گیا تھا۔ اسکول میں انھیں کے گانے اور ترانے گائے جاتے، رابندر سنگیت کا ہر طرف چرچا تھا۔ میں اُس وقت تک بنگالی سے اچھی طرح واقف نہیں ہوا تھا۔ لیکن جب اُس کے گیت سُنتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ بغیر معنوں کے کوئی چیز میرے خون میں اُترتی جا رہی ہے۔ انھیں دنوں اردو کے شعر میری زبان سے پھوٹنے لگے۔ اب جو اُس زمانے کی چند غزلوں کو دیکھتا ہوں تو نہیں کہہ سکتا کہ یہ وارداتِ قلبیہ ہیں یا روایتِ شعری کے زائیدہ،

میں ہوں اقرار سراپا مجھے پھر کیا انکار
وہ ہیں انکار سراپا انھیں پھر کیا اقرار

جہاں میں کچھ بھی بنو تم مگر خیال رہے
مرے لیئے تو وہی ہو جو مجھ کو یاد نہ ہو

بیٹھنا وہ ناز سے اور دیکھنا سوئے شفق
چاہتے ہیں وہ بھلانا ہم کو اس انداز سے

میرا خیال ہے کہ اگر میں عمر کے اس حصے میں ڈھاکہ منتقل نہ ہو گیا ہوتا تو میری باقاعدہ شاعری کا آغاز بہت پہلے ہو جاتا۔ بعد کو اس کی تحریک علی گڑھ پہنچ کر ۱۹۴۲ء میں ہوئی۔

میٹرک کا امتحان میں توقع سے زیادہ امتیازات سے پاس ہوا۔ اردو اور فارسی میں پچھتر فیصد سے زائد نمبر پائے اور ڈھاکہ بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مزید تعلیم کے لیئے وظیفہ ملا اور ڈھاکے کے ممتاز گورنمنٹ انٹر کالج میں داخلہ لیا۔ اس کی عمارت رمنہ کے علاقے میں ریس کورس کے سبزہ زار سے ملحق تھی۔ یہ دراصل تقسیم بنگال کے بعد مشرقی بنگال کے گورنر کی رہائش کے لیئے تعمیر ہوئی تھی۔ مشہور تھا کہ اس میں آکر لڑکوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں اس کے پرنسپل فخرالدین صاحب تھے جن کا تعلق بہار سے تھا اور جو انگریزی لہجے میں اردو بولتے تھے حالانکہ وہ سر راس مسعود کے زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے تھے اور انھیں کی حمایت میں سر راس نے وائس چانسلری سے استعفٰی دیا تھا۔ اساتذہ سب کے سب بنگالی تھے۔ اردو فارسی کے استاد، ہمارے اسکول کے استاد سے بھی گئے گذرے تھے، عبارت اور لہجہ دونوں اعتبار سے۔ البتہ انگریزی کے ایک استاد کا نقش اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ وہ شیکسپیئر کا ڈرامہ Tempest پڑھاتے تھے اور اس کے کردار Prospero کی مانند لہراتی ہوئی داڑھی کے ساتھ ڈرامائی منظر کشی کر دیتے تھے۔ ساری کلاس انھیں Prospero کہتی تھی۔ انگریزی فارسی کے علاوہ میرے پاس معاشیات اور تاریخ کے مضامین تھے۔ میں معاشی انسان کبھی نہیں رہا۔ البتہ ادب اور تاریخ سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔ بالآخر بی۔ اے میں جا کر یہی میرے دو مضمون رہ گئے۔

انٹرمیڈیٹ میں میرا عزم فرسٹ پوزیشن پانے کا تھا۔ اب میری انگریزی بھی اچھی ہو گئی تھی۔ تعلیمی سال کے شروع سے میں نے نہایت منظم اور مرتب طور پر پڑھائی شروع کر دی۔ دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ میری قلعہ بندی پر بعض اوقات محمود میاں ناراض تک ہو جاتے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں امتحان کے قریب میں شدید قسم کے خلل اعصاب کا شکار ہو گیا۔ ریڑھ کی ہڈی سے سرد لہر اٹھتی ہوئی جرام مغز تک جاتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے دل بند ہونے جا رہا ہے۔ طبی مشورہ کیا تو ضعفِ اعصاب کا مرض (Neurasthenia) تجویز ہوا۔ بے شمار ٹانک پیے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ محمود میاں کی رائے ہوئی کہ امتحان میں نہ بیٹھوں۔ میرا اصرار تھا کہ مجھے بیٹھنا ہے۔ بالآخر بیٹھا، بیمار کی طرح لیٹ کر امتحان دیا، فرسٹ ڈویژن تو پایا لیکن پوزیشن نہ مل سکی۔ میں اب ڈھاکے سے سخت دل برداشتہ تھا۔ چاہتا تھا کہ فوراً چھوڑ دوں۔ محمود میاں نے بہت روکا لیکن میں جوں ہی سفر کے قابل ہوا، دہلی کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں سے ایک ملازم کے ساتھ مسوری چلا گیا جس کا خرچ مجھے میرے چھوٹے چچا نے دیا تھا۔ اب میں اُبلا اُبلا کھانا، پابندی سے صبح و شام ٹہلتا اور دواؤں کا پٹارا میرے ساتھ رہتا۔ رفتہ رفتہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر میں نے اپنے مرض پر قابو پا لیا اور اپنا تعلیمی سال نہیں ضائع ہونے دیا۔ میرے اس کمال کا ذکر بعد کو ذاکر میاں اکثر لوگوں سے کیا کرتے تھے۔ طبیعت کی بحالی کے باوجود ضعفِ اعصاب کے دورے عرصے تک پڑتے رہے۔ اُس وقت میرا دل بیٹھنے لگتا اور موت کا اندیشہ رگِ جاں کے قریب ہوتا۔ یہ سلسلہ بی اے کی تعلیم کے دوران تک چلتا رہا۔

اِس بیماری کے علاج کے سلسلے میں میرا سابقہ ڈھاکہ اور دہلی میں بہت سے ڈاکٹروں سے پڑا۔ ذاکر میاں کے مشورے سے میں نے یونانی علاج بھی کیا۔ شفیق الرحمٰن قدوائی مرحوم، جن کی شفقت کا ایک زمانہ معترف تھا، مجھے شریف منزل (بلیماران) حکیم محمد احمد خاں کے مطب لے گئے۔ حکیم صاحب، حکیم اجمل خاں مرحوم کے بھتیجے تھے اور اُن کے بعد، اُن کی حذاقت کا دہلی میں عام شہرہ تھا۔ پہنچ کر دیکھا کہ حکیم صاحب گاؤ تکیہ لگائے مسند پر تشریف فرما ہیں۔ سامنے فرش پر مریض ایک حلقے کی شکل میں بلائے جانے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب

کے بائیں بازو پر ایک بڑا سا اُگالدان رکھا ہوا ہے جس میں وہ ہر دو چار منٹ کے بعد پان کی پیک 'پڑرچ' سے تھوک دیتے ہیں۔ منہ پان سے اس قدر بھرا ہوا ہے کہ اردو فارسی بن کر نکلتی ہے۔ دائیں جانب پر ایک چابکدست نسخہ نویس 'یک زانو' ان کے 'فرمودات' کا منتظر بیٹھا ہے۔ میرا نمبر آیا ہے تو انھوں نے دو انگلیاں میری نبض پر رکھیں اور حال پوچھے بغیر' دوبار' پڑرچ پڑرچ' کر کے نسخہ نویس سے کچھ بدبدائے۔ لیجئے نسخہ تیار تھا۔ شفیق صاحب نے لپک کر نسخہ لے لیا اور باہر نکل کر دوا خریدنے کے لیے' سامنے 'ہندوستانی دواخانہ' پہنچے۔ ایک شربت تھا، ایک معجون تھی' مغلظا جو اہر والی اور آخر میں ایک اور دوا جس کے بارے میں شفیق صاحب کا اصرار تھا کہ یہ رہنے دی جائے۔ میں جس قدر اس کے بارے میں دریافت کرتا وہ ٹالنے کی کوشش کرتے۔ میں نے بحث بھی کی کہ آدھے نسخے سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ کچھ شرماتے جاتے مگر خریدنے پر تیار نہ ہوئے۔ بعد کو میں نے معلوم ہی کر لیا' یہ عضو خاص کے لیے 'طلا' تھا۔ گویا حکیم صاحب نے میرا مرض' حلق' تجویز کیا تھا۔ اس کے بعد سے طب یونانی سے میرا اعتقاد بالکل اٹھ گیا۔

ڈھاکے میں پڑھنے سے جب تھک جاتا تو دھان کے لہلاتے کھیتوں میں گھومنے نکل جاتا۔ ڈوبتے ہوئے سورج اور اس کی کرنوں سے رنگی ہوئی بدلیوں کو گھنٹوں بیٹھا دیکھا رہتا۔ میری عمر اُس وقت سترہ برس کی تھی وہ عمر جس میں کسی شے کی ہر شے میں تلاش ہوتی ہے

یعنی ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

بنگال کے حسنِ ملیح یا زلفِ سیاہ پر کہیں نظر پڑ جاتی تو اسی سے لطف اندوز ہوتا' تسکین کی عدم دستیابی میں ذوقِ نظر اور بڑھ جاتا۔ میرا ادبیک 'روپ بنگال' جو میں نے اس کے دس برس بعد لکھا ہرگز نہ لکھا جاتا اگر اس کی مادی بنیادوں کا میں نے اس دور میں مشاہدہ نہ کیا ہوتا۔ اس کے اقتباسات یہاں دینا اس لئے ضروری ہیں کہ انھیں پڑھتے وقت میں عمر کے فاصلے طے کر کے ایک بار پھر 'بنگلا دیس' پہنچ جاتا ہوں۔

بنگلہ دیس

کس جادوگر کا یہ گھر ہے،
بنگلہ دیس اک رنگ بھون!
گھنے گھنے بانسوں کے جنگل
ہرے بھرے سب کھیت اور بن
کرشن برن سے بھی کچھ گہری
جس کی دھرتی اور گگن

روپ انیلا نیلا نیلا
اور ندیوں کی روپہلی باہیں
اُجلی اُجلی پھیلی راہیں
ڈالی ڈالی میں آ رنگن
سوتی لتاؤں میں ہوتی کانا پھوسی سی
پھول بنوں میں یہ چھٹکی چھٹکی سی پھبن

دیس بھی نیلا، بھیس بھی نیلا
پھولوں کی خوشبو سے بوجھل
مند ہوا کا آنچل
دھان، دھنک اور ساگر جل تھل

پون کے جھونکے ہانپتے پھرتے
وہ ٹوٹا سا چاند کا درپن!

سارے دیس پہ اک دھانی آنچل سا پھیلا
ایک اُداسی، ایک اُداہٹ
اک سپنا سا، ایک نشہ سا
کھُلے کھُلے سارے بندھن!

اُودی اودی نیلی گھٹائیں
دھان کی ہر بالی دُوسری بالی سے
کان میں کچھ چپکے سے کہتی،
کھیتوں کی کوروں سے لگ کر
دور پہ وہ اک ندّی بہتی
دھیرے دھیرے،
اک سپنا سا بہہ نکلا ہو
رادھا کی آنکھوں سے جیسے!

اِک سویا سا دیس!
نیند کی ماتی جس کی ندیاں
چُپ چُپ روتیں، غم کو سہتیں، بہتی جاتیں
درد بھری سی، دھیرے دھیرے چلتیں مرّی سی
نَیَن میں دکھ کو گھولے
جی میں لاکھوں پھپھولے
ملن کی آس لیے چلتی ہیں، ہَولے ہَولے

- - - - - - - - - - - - - -

یہاں کی بڑوائی چکیلی

پھول بھی جیسے نیند کے ماتے
چاند بھی چپ، تارے بھی چپ چپ
کرم سے سب انجان
پریم سے سب پہچان

اِس بھٹکے آکاش کو دیکھو،
دیکھو تاروں کی دو آنکھیں،
اپنی کرنوں کی پلکوں سے
دھیرے دھیرے، اَن تھک، اَن تھک،
نت بُنتیں سپنوں کے جال!
ہے دُکھ سے بھرپور یہ دیس!
دُکھ بھری آہیں ہر جھاڑی میں
کمل کمھلائے، بادل چھائے
پریم کا پیڑ سے ڈھیلا تنگ ہے
سوئی سوئی من کی ترنگ ہے
کرم کا پریم سے کیا سنجوگ
پریم تو بنگلہ دیس کا روگ!

بنگلہ دیس تو پریم کی بھومی، راگ کی بھومی، رنگ کی بھومی ہے۔ بنگلہ دیس کی یہ سیریز ان یادوں کے ان سیکڑوں رنگین ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہے جو میرے حافظے میں محفوظ رہ گئے تھے۔ کچھ یہی حال 'روپ' کا ہے جو بے شمار روپوں کا بہروپ ہے:

روپ

منجلی وہ بنگال کی بالا
جس کے روپ انوپ کے کارن

بنگلہ دیس ہے کرشن بَرَن!
وہ بھی نیلے دیس کی سندری
اُس کا جوبن —
کالے کیس، کُنٹس اور کاجل
جامنی ہونٹ رسیلے،
نَین ہٹیلے،
ڈھیلا انگ — بدن کی رنگ ترنگ آبی ساری ... بہہ رہی تھی
مہک وہ کیسر تن کی! ہوش اُڑا دے
آنکھیں! رنگ کی اک پچکاری
جیسے دن سے آنکھ مچولی!
کھیلتی ہو اندھیاری!

بنگلہ دیس کی سندر بالا
اس کے گلے میں
کومل کملوں کی اِک مالا
انگ انگ میں چُھکار
آنکھوں میں اک اُلجھی لوبی
مُکھ میں بھری ہوئی جھنکار
ڈھلا ڈھلایا روپ
جیسے چاند کی دھوپ
یا جیسے سنگیت
کوئی مسعود کا گیت!
کالے کیس، جھکی جھکی ساون کی گھٹائیں

نپی تلی مسکان، بنی ہوئی انجان
پون سی ڈولتی پھرتی اِدھر اُدھر

وہ —

شام کی پلکوں میں سوتی تھی
شبنم سے مُنہ کو دھوتی تھی
لہروں سے نت کھیل تھا اُس
چڑیوں سے کچھ میل تھا اُس کا
خوشبو پیتی، ہنس ہنس جیتی،
لے کر من میں پریم کی اُلجھن
پلکوں کی جھالر سے کچھ موتی برساتی
متوالی، نیلم پیالی سے مَد چھلکاتی

ایک کلی جو —
بادلوں کے سایوں میں پل کر
نکھر اُٹھتی ہو
راگ کی آگ تھی جس کے من میں
دُھلی دُھلی نتھری سی آنکھیں
تیکھے چتون — جن میں تھا اک نرم لچاؤ
چاہت، چاہ، چہل اور چاؤ
اُچپل، چنچل، ایک سُبھاؤ
ٹھٹھک ٹھٹھک اٹھکیلیاں کرتی
چال میں نرت کے بھاؤ!

کھیلتی تھی کانن کانن میں
پھولوں کے کچھ سُندر کھیل
کیول کلیوں سے تھا میل۔
آنکھ نشیلی، بات رسیلی
آنکھیں! جن میں لاکھوں سپنے
ساگر، لہریں، جھیلیں۔ اُودی گھٹائیں
رادھا کرشن کی آنکھ مچولی!

دھانوں کے کھیتوں کی روح، مہک رہی تھی
بانسوں کے جنگل کی بالا، چہک رہی تھی
پریم کا اُمرت پی پی کر وہ پلی بڑھی
اس کے دل میں بند کلی کا راز!
بول سُریلے، پریم اتھاہ!!

اِس روپک میں اقبال اور ٹیگور کے فلسفے کی آمیزش بعد کی چیز ہے لیکن 'دیس' اور 'روپ'، کا تمام تر پس منظر میرے قیام ڈھاکہ کی کمائی ہے۔

میرے شعری تجربے کا یہ پس منظر 'دیس'، اور 'روپ'، تک محدود نہیں۔ اس روپک کے دوسرے 'کینٹو'، 'ایک شام' 'بانسوں کے جنگل میں' اور 'آموں کے کنج میں' بھی دیکھا جا سکتا ہے، جہاں بنگالن لڑکی 'منجل'، 'افغانی' کو لے کر گھومتی ہے اور دونوں اپنے مکالموں کے ذریعے زندگی کے دو مختلف فلسفوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ 'منجل'، ٹیگور کی ویدانتی فکر، وحدت وجود کی نمائندہ ہے اور 'افغانی'، اقبال کے فلسفہ خودی کا۔ میرے لیے 'منجل' کی تجسیم دشوار ہے لیکن 'افغانی' میں غیر شعوری طور پر 'منم' کی کارفرمائی ہو سکتی ہے۔ یہ 'روپک'، میں نے اس زمانے میں لکھا گیا جب تقسیم کا آرا اسروں پر چل رہا تھا۔ اپنے مجموعۂ کلام 'دونیم' کے پہلے ایڈیشن میں (۱۹۵۰ء) میں نے روپک کو بغیر کسی تشریحی نوٹ کے شائع کیا تھا، خواہ ترجمان

نے شاہراہ میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر افسوس ظاہر کیا تھا کہ ہمارے شاعر کو کم از کم اس وقت تو پریم کے گیت نہیں گانا چاہیے تھا۔ چنانچہ دوسرے ایڈیشن (۱۹۸۶ء) کو شائع کرتے وقت 'روپ بنگال' کے لیے مجھے تشریحی نوٹ لکھنا پڑا:

"'روپ بنگال' (۱۹۴۷ء) ایک ایسے عالم کرب و حزن کی یادگار ہے، جب ہر شے 'دونیم' نظر آرہی تھی۔ ایک تاریخ ——— اور ایک تہذیب کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ سیاست کی موجِ خوں سے بہت دور روشنی کے صرف دو مینار سہارا بنے ہوئے تھے۔ ایک ٹیگور کا بے خودی کا ویدانتی تصور اور دوسرا اقبال کا اثباتِ ذات کا فلسفہ 'خودی'۔ اس روپک میں 'افقانی' جو حیات و حرکت کا پیکر ہے، اقبال کی فکر کا ترجمان ہے۔ بنگالی لڑکی 'منجل' ٹیگور کی ویدانتی فکر کی نمائندہ ہے۔ بنگال کے مختلف مناظر میں یہ ساتھ ساتھ گھومتے ہیں اور مصروفِ گفتگو نظر آتے ہیں۔ افقانی 'وجود' کا سبق پڑھاتا ہے۔ منجل 'وحدت وجود' کا۔ دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ شاعر نے اپنی ترجیح کے مطابق اس کا حل آخری 'کینٹو' 'آموں کے کنج' میں پیش کیا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس رہا کہ 'دونیم' کے پہلے ایڈیشن پر تبصرہ کرنے والے ناقد اس 'روپک' کی تہہ تک نہ پہنچ سکے ؎

آشنا کم دید و پنہاں نہ دید

بہرحال یہ 'روپک'، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اسکول کے طلبہ نے ۷۵ء-۱۹۷۰ کے درمیان کئی بار ڈاکٹر ترنگ کی ہدایت کاری میں اسٹیج کیا۔ مبصرین کا خیال تھا کہ تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھتا ہے، البتہ اسے ایک افتتاحیہ کی ضرورت تھی جو اب فراہم کر دیا گیا ہے۔

۱؎ اس بات کا اعتراف ہے ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں 'معاشرتی حقیقت' کی طرف سے میری آنکھیں زیادہ تر بند رہیں۔ سیاسی اعتبار سے میں بنگالیوں کی دہشت پسندی سے بہ تقاضائے عمر متاثر تھا لیکن سوائے چند انقلاب پسند دوستوں سے گفتگو کرنے کے اور کسی چیز کا مرتکب نہ ہو سکا۔ البتہ اس بات کا شدید احساس تھا کہ بنگالی مسلما

وہاں کے ہندوؤں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے پس ماندہ ہے۔ اسلام پورہ کے کچھ "مار پچھاڑیوں"
(مار کے پھینک دوں گا) قسم کے داداؤں کے علاوہ جسمانی اعتبار سے بھی وہ پیچھے تھے۔ تعلیم
میں تو وہ بہت پیچھے تھے ہی، صنعت و تجارت میں بھی ہاتھ کی دستکاری اور چھوٹی دوکانداری
کے علاوہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ صرف نوابانِ ڈھاکہ کا خاندان تاجوں کی سیاسی زندگی کا محور تھا'
لیکن خود اُن کا وجود تاجِ برطانیہ کا مرہونِ منت تھا۔

۱۹۴۷ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو چند سال کے لیے ایسا معلوم
ہوا کہ نئی قومیت ایک مذہبی اساس پر تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں ذہن کے تعمیری دور میں ڈھاکہ میں
رہ چکا تھا۔ اس لیے میں نے اِس نئی قومیت کو ہمیشہ مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ بنگالی مسلمان
اور پنجابی مسلمان میں سوائے مذہب کے اور کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ قومیت کے دوسرے
عناصر ترکیبی، مشترک جغرافیائی حدود، مشترک تہذیب، مشترک معیشت اور مشترک زبان
بالکل مفقود تھے۔ مفکرِ اسلام لاکھ کہا کریں ع

تو اے شرمندۂ ساحل اُچھل کر بے کراں ہو جا

بنگالی مسلمان دیندار ہوتے ہوئے دین کے نام پر اپنی انفرادیت کو پاکستان میں مکمل طور پر ضم کر دینے
کو تیار نہیں تھا۔ اردو کے مقابلے میں اسے اپنی بنگالی عزیز تھی۔ ٹیگور اور نذرل کے نغموں کا
جو بچپن سے دلدادہ رہا ہو وہ اقبال اور جوش کی شاعری کی داد کس طرح دے سکتا تھا۔ آخر
آخر میں "حروف القرآن" کے حوالے سے بنگالی کے لیے اردو رسم خط اختیار کرنے کی تجویز پیش
کی گئی یا بائے اردو مولوی عبدالحق بھانے گئے کہ "اسلام کی جوئے شیر کے کوہ کن" "سید سلیمان
ندوی آیاتِ قرآنی پڑھتے ہوئے پہنچے لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ قائد اعظم کے عین اعلان
کے وقت کہ "اردو اور صرف اردو ہی مملکت کی قومی زبان ہوگی" شیخ مجیب کی قیادت میں
بنگال کے طلبہ نے "بنگالی زندہ باد" کے نعرے لگائے۔

میں نے اسی احساس کے پیشِ نظر یکم ستمبر ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں آخری صفحہ کے تحت
'کفارہ' کے نام سے یہ الفاظ لکھے تھے:

" مشرقی و مغربی پاکستان کا موجودہ المیہ، سیاسی و معاشی ہی نہیں،

ایک سانحہ، واقعہ ہائلہ بھی ہے۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس المیہ کے ستم گر اردو زبان سے منسوب ہیں"۔

رشید احمد صدیقی صاحب کے یہاں اس مضمون کا ردّ عمل یوں ہوا:

"اردو والے جس طور پر اردو کو ایک غیر رضامند طبقے یا خطّے پر تھوپنا چاہتے (اور) بنگالی کو بے حیثیت کرنا چاہتے تھے اس کو میں کب پسند کرتا ہوں۔ ایسوں کی مخالفت میں آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اپنی جگہ پر بالکل درست ہے لیکن آج کل جن حالات کا سامنا ہے اس میں نہ کہتے تو بہتر تھا"

خواجہ غلام السیّدین صاحب کا اس مضمون کو پڑھ کر جو اچانک مراسلہ ملا، اس کا لہجہ اس سے بالکل مختلف تھا

عزیزی تسلیم

"میں نے یکم ستمبر" ہماری زبان میں آپ کا مضمون کفارہ' پڑھا۔ مجھے مضمون اور اس کا طرز بیان دونوں بہت پسند آئے۔ بات کہنے کی تھی اور خوشی ہے کہ اس کو آپ نے مضبوطی اور سلیقے سے کہا"

مخلص، غلام السیّدین

بنگالی زبان کی محبت نے مشرقی پاکستانیوں کو حیاتِ نو بخشی۔ ڈھاکہ کے "شہید مینار" کی قیمت دے کر انھوں نے بنگالی کے مساوی حق کو منوایا اور جب بات یوں بھی نہ بنی تو آزاد بنگلہ دیش کی تحریک کا آغاز ہوا۔

میری بنگلہ دیش کی تفہیم اپنے نوجوانی کے تجربات کی بنا پر کچھ اسی انداز کی تھی۔ بنگالی مسلمان اپنی زبان کے سلسلے میں ظرافت تک برداشت کرنے کو تیار نہیں۔ اس کا مجھے اندازہ برسوں پہلے اس وقت ہوا تھا جب میں نے پیام تعلیم میں دو بنگالی بابو' کے عنوان سے یہ مزاحیہ نظم بچوں کیلئے شائع کی تھی۔

بُونگالی بابو

ہام ہے اِک بُونگالی بابو
ٹُوٹی پھوٹی زانتا اُردو
پھر بھی تم سے ہم بولے گا
بنگلہ بولی ہم کھولے گا
اُردو کیا اِک بولی ٹھولی
بنگلہ اِک رشُ گُلّا بولی
کیا ہے گولیب کیا ہے اِکبَل
دیکھو ٹھاکر دیکھو نجرُل
بنگلہ دیش کی بات ہی آرہے
شُندر لوگ ہے شُندر گھار ہے

مزاح کی یہ کوشش سروں پر سے گزر کر میرے ہی سر آ پڑی، اور کلکتہ کے کئی اخباروں میں اس کے خلاف خوب خوب خامہ فرسائی ہوئی۔

ڈھاکہ دوسری بار میں مَیں ۱۹۷۶ میں ایک سرکاری ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے گیا تھا۔ بنگلور انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے ڈاکٹر راؤ میرے رفیقِ سفر تھے۔ ہم لوگ رَمنہ کے علاقے میں ایک بڑے ہوٹل میں مقیم تھے۔ ڈھاکہ کو بالکل بدلا ہوا پایا۔ خیر یہ تبدیلی تو ہر بڑے شہر کا مقدر ہو گئی ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی بنگالی مسلمان کی نفسیات میں پائی۔ خود اعتمادی کے ساتھ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کا شدید جذبہ ملا۔ ہر اردو بولنے والا اب بھی وہاں بہاری کہلاتا ہے۔ ان کے مسئلے کے باوجود اردو سے عناد ختم ہو گیا ہے۔ بنگلہ دیش اب اپنے وجود پر پیچ و تاؤ کھا رہا تھا۔ وہ کس قدر اسلامی رہے

اور کس قدر بنگالی۔ مغربی بنگال سے شناخت کے لیے وہ اسلام کا سہارا لے رہا تھا۔ ٹیگور اسے عزیز تھا لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں مغربی بنگال کے بنگالیوں کو۔ ٹیگور کی فکر کا بہت بڑا حصہ عام مسلمان بنگالی کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتا تھا۔ میں نے بنگلہ دیش کے بہت سے دانشوروں سے اِس بارے میں گفتگو کی، کسی کا بھی ذہن صاف نہیں پایا۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔

طویل عرصے کے بعد ہمدمِ دیرینہ، ہائی اسکول کے ہم جماعت، نورُالدّین سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔

چوتھا باب

مرحوم دہلی کالج

مسوری سے واپس آکر دو سال تک میرا قیام بڑے چچا (ڈاکٹر ذاکر حسین) کے ساتھ قرول باغ میں رہا جہاں وہ جامعہ کے قریب کرائے کے ایک مکان میں مقیم تھے۔ میں نے اب اینگلو عربک کالج (مرحوم دہلی کالج) کے بی۔ اے میں داخلہ لے لیا تھا۔ یہ کالج اپنی پرانی عمارت غازی الدین حیدر کے مدرسے میں اجمیری گیٹ کے پاس واقع ہے ۱۹۴۷ء کی غارت گری کے بعد اس کا احیاء دہلی کالج کے پرانے نام سے کیا گیا۔ چند سال قبل اس کا نام پھر بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ میں جامعہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے اس وقت کالج کی سوسائٹی کا صدر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ خورشید عالم خاں صاحب کے اشارے پر جب اس کا نام بدلنے کی تجویز پیش کی گئی تو مفتی عتیق الرحمٰن نے جو مجلس کے رکن تھے، یہ کہہ کر اس کی مخالفت کی تھی کہ ذاکر صاحب کے نام پر تو اور بڑی عمارتوں اور سڑکوں کے نام رکھے جا رہے ہیں، دہلی کالج کے نام سے اہلِ دہلی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں اس لیے اُسے اسی طرح رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ میرا خیال تھا کہ مفتی صاحب کی رائے نہایت صائب تھی لیکن صدرِ مجلس کی حیثیت سے میرا خاموش رہنا ہی اَولیٰ تھا۔ بہرحال خورشید عالم صاحب کی اس در پردہ دھمکی کی وجہ سے کہ شاید اندرا گاندھی کالج کا نیا ٹرسٹ، نام کی تبدیلی کے بغیر بنانے پر آمادہ نہ ہوں، کالج کا نام بدل کر ذاکر حسین کالج کر دیا گیا۔ اس طرح دہلی کالج دو بار مرحوم ہوا۔ اس کے اینگلو عربک کالج نام سے تو میری طبیعت بھی منقبض رہا کرتی تھی۔ بہرحال بی۔ اے میں میں اسی

کا طالب علم رہا۔ بی۔ اے۔ میں میں نے تاریخ اور فارسی اختیاری مضامین کے طور پر لیے تھے۔
انگریزی، اُردو لازمی تھے۔ انگریزی، کالج کے انگریز پرنسپل مسٹر واکر اور ایک اِسکاچ مسٹر
ٹوری مر پڑھاتے تھے۔ ٹوری مر کا پڑھایا ہوا تو وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے، لیکن واکر صاحب بہت
اچھے منتظم اور اُستاد تھے۔ شام کو کالج کے طالب علموں کے ساتھ ٹینس کھیلتے اور انگریزی
تحفظاتِ ذہنی کے باوجود کسی چرچ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے طلبہ سے ہمدردی کا جذبہ
رکھتے تھے۔ وہ جوہر شناس بھی تھے۔ میرا ٹیوٹوریل کلاس اُن کے پاس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ
اس کے لیے ایسے مضامین لکھے جائیں جن میں طالب علم کو بطور خود سوچنا پڑے۔ میں ان کے اس
معیار پر پورا اُترا تو ڈاکٹر ذاکر حسین سے ایک ملاقات میں ذکر کیا اور کہا "مجھے اس بات کی
خوشی ہے کہ مسعود میں اپنے طور پر سوچنے کی صلاحیت ہے"۔ میرے دوسرے اساتذہ میں قابلِ ذکر
آفتاب صاحب تھے جو تاریخ پڑھاتے تھے۔ علی گڑھ سے ایم۔ اے کیا تھا۔ ہم لوگ نہ صرف ان
کی شخصیت سے متاثر تھے بلکہ طریقۂ تعلیم سے بھی۔ اُن سے سینئر چشتی صاحب تھے جو اُس وقت
انگلستان گئے ہوئے تھے۔ واپسی پر کچھ عرصے تک انھوں نے بھی ہماری کلاسیں لیں، لیکن اُن
پر انگلستان اور وہاں کی زندگی کی یادیں ایسی حاوی تھیں کہ اُن سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ البتہ
ان کا انگریزی کا تلفظ بہت اچھا تھا، چہرہ مہرہ بھی سرخ سفید تھا۔ جب اس پر بحث ہوتی کہ کس
کی کرامات' ہے تو میں بااصرار کہتا کہ 'خانہ' کی تو بہرحال نہیں ہوسکتی۔ ذاکر کے بڑے عقیدت مندوں
میں تھے اور جب جامعہ قرول باغ سے اوکھلا آگئی تو وہاں بھی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اکثر چھٹی کے دن
آن دھمکتے اور قیام و بعدۂ طعام کا سلسلہ شام تک رہتا۔ ذاکر میاں اُن کی اِس بے تحاشا عقیدت
سے عاجز تھے لیکن اپنی عادت کے مطابق کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ اتفاق سے ۱۹۴۷ء میں ایکدم
پاکستان وجود میں آگیا اور چشتی صاحب ان لوگوں میں تھے جنھوں نے پرِ پرواز سب سے
پہلے کھولے۔ بعد کو ایک دن ذاکر میاں کو یہ کہتے سنا کہ بھئی پاکستان بننے سے ہمیں بھی ایک
فائدہ ہوا اور وہ یہ کہ چشتی صاحب سے نجات مل گئی۔

فارسی کے اُستاد منظور حسین موہوی تھے۔ فقرے باز، پانوں کے رسیا اور دبنگ،
مجال کیا کہ کوئی کلاس میں دم مار سکے۔ ایک ہی فقرے میں چت کر دیتے تھے لیکن وہ بھی عاجز

تھے ہمارے ایک اینگلو ساتھی (نام ؟) سے جن کی سمجھ میں شعر بالکل نہیں آتا تھا۔ چنانچہ جب عُرفی یا نظیری اپنے قصائد میں محبوب کا سراپا بیان کرتے (جس میں زلفوں کو مارِ سیاہ، دانتوں کو موتیوں کی لڑی، گردن کو صراحی، بھنوؤں کو کمان، مژگاں کو تیر اور کمر کو معدوم بتاتے تو یہ حضرت مسلسل مسکراتے رہتے۔ موسوی صاحب کنکھیوں سے اُن کا مسکرانا دیکھتے رہتے اور اچانک بول اُٹھتے۔ دیکھئے حضرت! اب یہ آپ میں سے کسی نہ کسی سے ضرور پوچھ بیٹھیں گے کہ تم ایسی مجوبہ سے شادی کرنا پسند کروگے اور کلاس کے بعد واقعی ایسا ہی ہوتا!

موسوی صاحب کی مرزا محمود بیگ صاحب سے گہری دوستی تھی۔ مرزا صاحب خاص ذوق والے تھے اور کالج میں فلسفے کے اُستاد تھے۔ عمر بھر تجرد میں گذاری۔ اس لیئے وہ ہر فقرے پر سوچ میں ڈوب جاتے تھے۔ گفتگو کی اِس سست روی کو وہ پھر ایک بے ساختہ قہقہے کے ذریعے تیز رفتار بناتے۔ میں اُن کا شاگرد نہیں رہا لیکن کالج سے نکلنے کے بعد مختلف حالات میں اُن سے قریب تر ہو گیا۔ ، اپنے کالج کے شیدائیوں میں تھے جس کے بعد کو پرنسپل بھی ہو گئے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا اور تدفین کے لیئے جامعہ ملیہ کے قبرستان لائے گئے تو موسوی صاحب جنازہ کے ساتھ تھے۔ اس وقت تک وہ بہت کمزور ہو چکے تھے۔ ایک عزیز دوست کی جدائی سے اور نڈھال نظر آئے۔ آکر پاس کی ایک پختہ قبر کے کنارے پر بیٹھ گئے، میں بھی ان کے پاس بیٹھ گیا اور غالب کی طرح محسوس کرنے لگا ع

اب وہ رعنائی خیال کہاں ؟

بی۔ اے۔ کے میرے دوستوں میں حبیب اللہ خاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے والد چودھری اللہ دیا ایک رانگھڑ راجپوت تھے جنھوں نے ٹھیکیداری میں خاصا کما لیا تھا اور ایک پختہ دو منزلہ قرولباغ میں بنوا لیا تھا۔ حبیب اللہ خاں میں ایک عجیب راجپوتی شان تھی ہمیشہ سینہ سپَر رکھتے، یہاں تک کہ سائیکل پر بھی اُن کی یہی کوشش رہتی۔ والد نے طالب علمی کے زمانے میں شادی کر دی تھی جس سے وہ مطمئن و مسرور نظر آتے تھے جیسا کہ ان کے گھریلو تذکروں سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے میں ابھی تک 'بیرونِ قلعہ' کی مخلوق تھا لیکن حبیب اللہ کی متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے متاثر تھا اور زندگی کے کسی ہم سفر اور ساتھی کی

تلاش کی خواہش دل میں پیدا ہونے لگی تھی۔ ہم دونوں کبھی کبھی سینما بھی جاتے تھے۔ ان دنوں دیویکا رانی اور نسیم پردۂ سیمیں کی رانیاں تھیں۔ حبیب اللہ سے میں اکثر مشورہ کرتا کہ میں کس جیسی کا انتخاب کروں، اِس لیئے کہ خاندان میں دو لڑکیاں تھیں جو ان دونوں کی شکلوں سے مشابہت رکھتی تھیں۔ حبیب اللہ کا مشورہ دیویکا رانی جیسی کا ہوتا۔ میں نے بالآخر نسیم جیسی کا انتخاب کیا۔

ایک اور ساتھی جن کے دماغ میں کچھ سنک تھی (اور اب بھی ہے) انعام الحق تھے ان کا شمار اچھے طالب علموں میں ہوتا تھا۔ دوستی کے لیئے میں انھیں زیادہ معتبر نہیں سمجھتا تھا۔ علی گڑھ سے انھوں نے انگریزی میں ایم۔اے کیا اور اس کے بعد زمانے میں گم ہو گئے۔ دو برس پہلے جب میں ایک ثقافتی ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے پاکستان گیا اور لاہور الحمرا میں منعقد کی گئی ایک تقریب کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ سے محوِ گفتگو تھا کہ اچانک ایک گورے اور دراز قد شخص نے میرا بازو پکڑا اور دور تک کھینچتا لے گیا، پھر آنکھوں میں اپنی نیلی آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ پہچانا؟ مجھے انھیں پہچاننے میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہوگا، البتہ ڈاکٹر سید عبداللہ کے پاس سے یوں کھینچ کر چلے آنا مجھے کسی قدر ناگوار گزرا۔ میری اُن سے یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ میں نے کہا "ہاں، پہچان لیا، تمھاری صورت سے نہیں تمھاری حرکت سے"۔ معلوم ہوا کہ وہ اس وقت اقبال پبلک لائبریری، لاہور کے ڈائرکٹر ہیں۔ پکڑ کر لائبریری لے گئے، جو قریب تھی، پھر اصرار تھا کہ اس کا ہر گوشہ اُن کے ساتھ گھوموں۔ میں نے ایک شیلف پر رکھی ہوئی کچھ کتابیں دیکھیں۔ بعض سے دلچسپی کا اظہار کیا۔ جب میں کئی گھنٹے گذارنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوا تو میری پسندیدہ کتابوں کا ایک بنڈل میرے ساتھ تھا۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "انعام الحق! اب تم سمجھدار ہو گئے ہو"۔

ایک اور ساتھی محمود علی تھے۔ وہ فلسفے کے طالب علم تھے۔ چنانچہ علی گڑھ پہنچ کر انھوں نے فلسفے میں ایم۔اے کیا۔ اس فلسفے دانی کا بُرا ہو کہ پہلے وہ وزارتِ تعلیم میں گھس گھس کرتے ڈپٹی سکریٹری ہو گئے۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد سید حامد کی وائس چانسلری میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کی حیثیت سے کچھ عرصے کام کیا لیکن زیادہ نہیں

ٹھہر سکے۔ اُن کے متانت، خلوص اور دیانت کے ہم سب قائل رہے۔

بی۔ اے۔ کے دوران مجھے پہلی بار ذاکر میاں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل میں نے جامعہ میں چھ سال بورڈنگ ہاؤس میں گزارے تھے۔ اب اٹھتے بیٹھتے چوبیس گھنٹے کا ساتھ تھا۔ اس وقت وہ تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کا گھر صرف چچی صاحبہ (شاہ جہاں بیگم عرف بتلی بیگم) کی سلیقہ مندی کی بدولت چل رہا تھا۔ گھر کے سامنے شبّا بنیئے کی دوکان تھی جہاں سے اکثر سودا اُدھار آتا تھا۔ یہ شبّا اس وقت حیات تھا جب ذاکر میاں وائس پریسیڈنٹ ہو کر ۱۹۶۲ء میں ہمارے دہلی آئے، وہ اُن سے ایک بار آ کر ملا بھی۔ دونوں کے درمیان کیا گذری یہ معلوم نہیں۔

اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے اُن کے یہاں ایسے حالات میں جا کر نہیں پڑ جانا چاہیئے تھا۔ لیکن میرے اس فعل سے اُن کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔ چچی صاحبہ جو پکاتیں وہ سب کھاتے۔ دونوں بچیوں ـــــ سعیدہ اور صفیہ ـــ کے کھانے پہننے کے لیئے کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ انھوں نے بھی بچپن میں سادہ کھایا اور موٹا پہنا۔ چچی صاحبہ بڑی خوش دلی کے ساتھ کھانا پکاتیں۔ اُن کے اس سادہ کھانے میں۔ ایک گوشت کا سالن اور ایک دال، جو مزہ ملتا تھا وہ کہیں نہیں ملا۔ باورچی خانے میں بیٹھ جاتا۔ وہ گرم گرم روٹیاں پکاتی جاتیں اور میں کھاتا جاتا۔ ذاکر میاں بھی اسی غذا پر مطمئن تھے۔ البتہ جب جرمن خاتون مس فلپس بورُن جو ساری جامعہ کی آپا جان تھیں، جامعہ آگئیں تو ان کے یہاں جا کر منہ کا مزہ بدل لیتے۔ ان کی زندگی بھی اس شعر کے مصداق تھی ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

کبھی کبھی وہ گھر آ کر میرے توسط سے چچی صاحبہ سے گفتگو کا سلسلہ چھیڑتیں اور بتاتیں کہ ذاکر صاحب قوم کے لیئے بہت بڑا کام کر رہے ہیں، ہم سب کو ان کی مدد کرنا چاہیئے، تو چچی صاحبہ نہ معلوم کس جذبے کے تحت کہتیں "چل جھوٹی کہیں کی"! اسے میں انگریزی میں ترجمہ نہ کر پاتا۔

میں نے 'آپا جان' کو آخری بار بسترِ مرگ پر ڈاکٹر جوشی کے اسپتال میں سنہ ۱۹۴۳ء میں دیکھا۔ اس وقت جو میرے تاثرات تھے وہ اس گیت میں ڈھل کر نکلے۔

ھچکولے

وشن چندر!

میں اِک گہرا ساگر!
جس کے سینے پر کچھ لہریں
(من کی ترنگیں)
بُن، بَن، ہَنس ہَنس کھیلیں
مٹ جانے کو!

چوم سکیں یہ چاند کو کیسے
اُچھل اُچھل کر
اُٹھیں پَل پَل
کیول
گر جانے کو

کایا سے جب چھو نہیں پاتا
دور رہو تم
لے کر چاہ ــــ اتھاہ تمھاری
ہو جاتا اپنے میں گُم
میرے سینے میں پھر تُم!! (سنہ ۴۳ء)

اِس زمانے میں میں نے ذاکر میاں کا جمال اور جلال دونوں دیکھے۔ جمال کی شہادتیں بہت سی مل جائیں گی، البتہ جلال کا ایک واقعہ سُنانا چاہوں۔ گھر میں اوپر کے کام کے لیے ایک چھوٹا سا لڑکا لطیف مُلازم تھا۔ وہ شرارت کی پُڑیا تھا۔ کسی وقت نچلا نہیں بیٹھتا اور کوئی نہ کوئی حرکت کیے جاتا۔ نہ تو اس پر چچی صاحبہ کی لاگ ڈانٹ اثر کرتی اور نہ میرا یا کسی اور کا بُرا بھلا کہنا۔ ایک دن اُس کی اس قسم کی حرکت کی شکایت ذاکر میاں کے کانوں تک پہنچی، عرصے سے اس کی شرارتیں دیکھتے اور سُنتے آئے تھے۔ ایک دم جلال میں آگئے اور کہا لاؤ آج اِسے میں ٹھیک کروں گا۔ گھر میں ایک بڑا گہرا کھاری پانی کا کنواں تھا۔ اس پر ڈول رسی پڑے رہتے تھے۔ فوراً رسی کا ایک سرا لیا اور اس سے لطیف کی کمر اور ہاتھ جکڑ دیے۔ اس کے بعد ڈول کی مانند اسے کنوئیں کے اندر سرکانا شروع کیا۔ لطیف کی سینکڑوں چیخیں تھیں۔ گھر میں ہل چل مچ گئی۔ چچی صاحبہ سہم گئیں کہ اگر کچھ ہو گیا تو۔ بہرحال بڑی بڑی مشکلوں سے ذاکر میاں کو رضامند کر لیا گیا کہ اس بار چھوڑ دیں۔ لطف یہ تھا کہ جو ہر وقت شکایتیں کرتے تھے اب گڑگڑا کر سفارشیں کر رہے تھے۔ خدا خدا کرکے لطیف کو کنوئیں سے باہر کھینچا گیا۔ کنوئیں سے وہ ایسے 'غسلِ اصلاح' کرکے نکلے کہ اس کے بعد پہچانے ہی نہیں جاتے تھے کہ وہی لطیف ہیں۔ پھر تو ہر ہر قدم پر 'جی حضور' اور 'جی ہاں' تھے۔

ذاکر میاں کا زیادہ وقت جامعہ کے دفتر اور اس کے مختلف کاموں میں گزرتا۔ مکان پر جو خالی وقت ملتا وہ مکان کے سب سے چھوٹے کمرے میں لیٹ کر گزارتے اور کچھ پڑھتے رہتے۔ میں نے انھیں اکثر غالب، اقبال یا کسی فارسی شاعر کے اشعار گنگناتے سُنا۔ انھیں وہی اشعار پسند تھے جو خود ان کی زندگی کے ترجمان تھے۔ اس اعتبار سے اقبال ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ وہ بنیادی طور پر جمالیات، اخلاقیات اور شعر کے آدمی تھے۔ معاشیات سے، جو اُن کی اعلیٰ تعلیم کا مضمون رہا تھا، دور ہو چکے تھے۔ ان کے ارد گرد بہت کم کتابیں دیکھنے میں آتیں اور جو تھیں ان کا معاشیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ قرول باغ کے اِس مکان میں نہ تو گلاب تھے، نہ سبزہ و گل اور نہ گملے نہ تصاویر۔ البتہ خطاطی کے چند دل آویز نمونے ضرور آویزاں رہتے تھے۔

ذاکر میاں کی زندگی میں نظم و ضبط کی بہت کمی تھی۔ اقبال کی طرح وہ بھی حرکت بسانی کی برکت کے قائل نہیں تھے۔ عین وقت پر کام کرتے۔ میرے خیال میں اُن کی نثر میں جو شاعرانہ زیر و بم اور آب و رنگ ملتے ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سخت دباؤ اور تحریک پر قلم اُٹھاتے تھے۔ جب لکھتے تو اپنی کوٹھری میں بند ہو جاتے۔ ملنے ملانے کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ کھانا وغیرہ وہیں بھیج دیا جاتا۔ اس کے بعد بھی گھر میں چین نہیں ملتا تو سلیم الزماں صدیقی صاحب، مجیب صاحب یا آپا جان (مس فلپس بورن) کے یہاں خود کو مقید کر لیتے اور اس وقت تک برآمد نہیں ہوتے جب تک کوئی خطبہ، مضمون یا ریڈیو کی تقریر قلم بند نہیں ہو جاتی ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ پہنچ کر اسی طرح کی کیفیت میں اُن پر قلب کا پہلا دورا پڑا تھا۔

ذاکر میاں میں جامعہ ملیہ کی پریشان کن مصروفیات کے باوجود ظرافت کا حس قائم رہا۔ خیال میں اس طرح کا حس بنیادی طور پر غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہوتا ہے اس لیے کہ بقول کانٹ ظرافت کا جوہر حساسیت ہے۔ جب کسی انسان میں یہ بصیرت پیدا ہو جائے کہ وہ اشیاء کی بوالعجبی کو ایک نظر میں بھانپ لے اور ان سے لطف اندوز ہو سکے تو یہ حس کارفرما ہوتی ہے۔ اُن کی یہ حس کبھی فقرے بازی کی شکل میں، کبھی لطیف طنز کے پیرائے میں کبھی ہلکے سے قہقہے کی صورت میں نمودار ہوتی تھی۔ اُن کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی آجاتا اُسے مہمان بنا لیتے اور پھر یہ خواہش ہوتی کہ اُس کی زیادہ سے زیادہ خاطر کی جائے۔ چچی صاحبہ اُن کی اس عادت سے پریشان رہتی تھیں، اور کیوں نہ ہوتیں، اس بن بلائے مہمان کی سب سے زیادہ زد اُن پر پڑتی تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہی ہوا۔ ذاکر میاں باہر سے لپکتے ہوئے آئے، اور کہا دو آدمی کھانا کھائیں گے۔ چچی صاحبہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شوربے کی مقدار پانی ڈال کر دوگنی کر دی۔ جب کھانا نکل کر باہر آیا اور دیکھا کہ بس ڈھب ڈھب شوربا ہے جس میں چند بوٹیاں تیرتی پھر رہی ہیں، مہمانوں کے سامنے ہنس کر بولے: "بھئی مسعود! لانا تو میرا لنگوٹ تاکہ اس میں غوطہ لگاؤں۔ اِس کنارے سے اُس کنارے اور اُس کنارے سے اِس کنارے۔" ہم سب اُن کے اس فقرے سے لطف اندوز ہوئے سوائے چچی صاحبہ کے جو سُن کر نہایت برافروختہ ہوئیں۔

میرا خیال ہے کہ ذاکر میاں کی حسِ ظرافت نے انھیں زندگی کے تنگنائے سے ہمیشہ

سہل گزارا۔ ظرافت کے ظرف میں وہ ہر قسم کی نامعقولیت کو اپنے لیے گوارا بنا لیتے۔ اسی
ہ ان کی گفتگو میں نہ توڈنک ہوتا تھا اور نہ پھکڑ۔ اسے ہم صحیح معنوں میں 'مزاح المومنین' سے
بیر کر سکتے ہیں۔ البتہ جامعہ کی محدود برادری میں انھیں اپنی ذہنی برتری کا احساس ضرور تھا۔
پنے بعض ساتھیوں سے چڑ کر کہا کرتے تھے "یہ لوگ چڑیا کا سا دماغ رکھتے ہیں" لیکن ان لوگوں
ساتھ لے کر چلتے تھے۔ جہاں بھی نیکی اور خوبی نظر آتی تھی اس کی قدر کرتے تھے۔ بدی اور بُرائی
لے لیے' لوگوں کو معاف کر دیتے تھے۔ ان کی یہ وسیع القلبی کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتی تھی' اس
لیے کہ پٹھان کی (اور وہ بھی قائم گنج کی) روایت تو بدلے کی رہی ہے۔

زندگی میں نظم وضبط کی کمی کا ازالہ انھوں نے غیر معمولی 'ضبطِ نفس' سے کیا تھا۔ مجھے یاد نہیں
پڑتا کہ انھوں نے مجھے یا اپنی بچیوں کو کبھی بھی کسی بات پر جھڑکا یا ڈانٹا ہو۔ میں نے گھر کے اندر یا باہر
انھیں کبھی غیظ کے عالم میں نہیں دیکھا، حالاں کہ ان کے دادا چھمن خاں کا غصّہ قائم گنج میں مشہور
تھا۔ یوسف میاں نے اپنی خودنوشت 'یادوں کی دنیا' میں ذاکر میاں کے 'عدم تشدد' کے ماخذ کی
تلاش کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے کہ بچپن میں وہ اپنے چھوٹے بھائی زاہد حسین خاں سے پٹ
لیا کرتے تھے۔ اس لیے اہلِ خاندان کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وہ 'عدم تشدد' کی پالیسی
پر عمل پیرا ہوتے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ بہرحال اُن کی آئندہ کی ایثار اور قربانی کی زندگی کے
لیے یہ تربیت اچھی تھی؛ چاہے وہ چھوٹے بھائی سے ملی ہو۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں میں اپنے دوسرے دو چچاؤں۔ ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر
یوسف حسین۔ کا بھی ذکر کرتا چلوں۔ محمود میاں چھوٹے چچا تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں میں ان
کے ساتھ چار سال تک ڈھاکہ میں رہا تھا جہاں سے میں نے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کیا تھا۔ وہ
بڑے باغ و بہار آدمی تھے۔ ان کا قہقہہ مشہور تھا۔ وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کو اپنی بزمِ بے تکلف میں
شریک کر لیتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے طلبہ اور رفقائے شعبہ میں بہت مقبول تھے۔ وہاں ان کی
بے تکلف دوستی عندلیب شادانی صاحب سے تھی۔ جن کی عبارت' اشارت ہر بات نستعلیق ہوتی
تھی۔ بدقسمتی سے ان کے صدر شعبہ آسام کے ڈاکٹر بورا تھے جو فارسی میں باہر سے ڈگری لے آئے
تھے لیکن جن کی اس زبان میں لیاقت محض واجبی تھی۔ شادانی صاحب، محمود میاں کے ناتے

سے مجھ سے بھی بے تکلفانہ محبت سے پیش آتے تھے۔ ایک دن کہنے لگے مسعود میاں! تمہیں تو اردو فارسی کا بہت ذوق ہے، حافظ کے اس مصرع کا مطلب تو بتاؤ ع

خامُش مشو کہ کارِ تو از ناری رَوَد

میں سوچ ہی رہا تھا کہ بولے پُورا صاحب نے تو کلاس میں اس کے معنی یہ بتائے ہیں "(اے حافظ) خاموش مت رہ ہارن بجائے جا اس لئے کہ تیری کار نالے پر سے گزری ہے"۔ وہ ڈھاکئی اردو کے بہت بڑے ناقد تھے اور اس کے سینکڑوں لطیفے انھیں از بر تھے مجھ انھیں بہت عزیز تھے۔ ڈھاکہ کے اجنبی لسانی ماحول میں واقعی ع

عندلیب شادانی! تیرا دم غنیمت ہے

میرے چچاؤں میں سب سے زیادہ غُصیلے محمود میاں ہی تھے۔ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا قہ کب قہر میں تبدیل ہو جائے گا۔ غالباً پردادا غلام حسین خاں کے غصّے کا بڑا حصّہ انھیں کو وراثت م ملا تھا۔ لیکن دل کے بہت صاف تھے اس لیے ان کے آس پاس کے لوگ اسے انگیز کر لیتے تھے۔ چھوٹی چچی نہایت نیک بی بی تھیں جب کوئی ان کی نیکی کی تعریف کرتا تھا تو کہتے کہ "اتنی نیک ہونا بھی ٹھیک نہیں کہ بنچاد (دھوبی کا نام) کے گدھے گھر میں ہانک لائے"۔ میرے ان کے در کشیدگی امتحانات کے قریب پیدا ہو جاتی تھی۔ میں کمرے میں قلعہ بند ہو جاتا تھا اور اُن کی خواہش ہوتی کہ شام کو باہر آ کر اُن کے ساتھ گپیں ماروں۔ اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کی یہ خواہش بجا تھی، اس لیے کہ ڈھاکہ میں 'ادھر' کا آدمی ہم نفس و ہم زباں کے لیے ترس جاتا تھا۔

محمود میاں سے بڑے میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں تھے۔ طویل مدّت تک ان کے ساتھ رہنے کا مجھے موقع کبھی نہیں ملا۔ لیکن جب تک وہ حیدر آباد میں تھے میں ان کے یہاں جا رہتا تھا۔ اس کے بعد پرو وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ گئے تو تقریباً ہر روز ملنے کے لئے ان کی کوٹھی پر جاتا۔ میرے اُن کے درمیان شکل و صورت کی شباہت کے ساتھ اور بھی کئی قسم کی مشترک ذہنی اقدار تھیں۔ ان کی بیگم (میری خالہ اور چچی دونوں) اب بھی بیٹھے بیٹھے کہ اٹھتی ہیں "اس وقت مسعود کی شکل مجھے بالکل 'اُن' کی سی لگ رہی ہے"۔ وہ مجھ معنوں میں

ہل قلم تھے۔ پیشے کے لحاظ سے مورّخ لیکن دلچسپیوں کے لحاظ سے ادیب۔ انھوں نے ابتدائے ملازمت ہی میں اقبال پر مبسوط تصنیف 'روحِ اقبال' لکھدی تھی جس کے کئی ایڈیشن ہندوستان اور پاکستان میں شائع ہو چکے ہیں اور جو اقبال کے فکر و فن پر تین چار بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ آخری عمر میں اُن کی دلچسپی غالب سے بڑھ گئی تھی تو اس پر تابڑ توڑ کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔ "غالب اور آہنگِ غالب' 'غالب اور اقبال کی جمالیات' یہ محسوس کرتے ہوئے کہ غالب کو ایک عالمی سطح پر روشناس کرایا جائے اس غرض سے انھوں نے غالب کے اردو دیوان کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا جس کی ہندوستان سے زیادہ باہر مانگ ہے۔

وہ ذاکر میاں اور محمود میاں کے علی الرغم نہایت مرتب زندگی گزارنے کے عادی تھے وقت سے کھانا، وقت سے ٹہلنا اور وقت سے کام کرنا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پرو وائس چانسلری کے پُر آشوب زمانے میں بھی وہ اپنے علمی کاموں کے لیے چند گھنٹے ضرور نکال لیتے تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے فرانسیسی ادب کی تاریخ' 'حسرت موہانی کی شاعری' 'کاروانِ خیال' جیسی فکر انگیز تصانیف لکھیں۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد شملہ کے انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈیز کے فیلو ہو کر تین سال کے لیے وہاں چلے گئے تو وقتِ معینہ پر انسٹی ٹیوٹ کے لیے Indo-Muslim Polity کے نام سے سلاطینِ دہلی کے نظامِ سیاست پر چھوٹی سی کتاب انگریزی میں لکھ ڈالی۔ ورنہ انسٹی ٹیوٹ کے فیلوؤں کی عام روایت یہ تھی کہ شملہ کی پُر فضا آب و ہوا میں دو سال تک صحت بنا کر وعدہ وعید کر کے خالی ہاتھ لوٹ آتے تھے۔ مجھ سے اس کے ڈائرکٹر نہار رنجن رے نے ایک بار بڑے تحسینی انداز میں کہا تھا کہ یہ عمر رسیدہ اچھے اچھے جوانوں سے زیادہ پابندیٔ اوقات سے کام کرتا ہے۔

یوسف میاں میں بھی محمود میاں کی طرح جمال پر جلال حاوی تھا۔ جب جلالی کیفیت میں آجاتے تو نفع و نقصان سے بالاتر ہو کر جو جی میں آتا کہہ جاتے اور کر جاتے۔ ان کا وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی سے اختلاف مزاج کی اسی افتاد کی بناء پر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ زیدی صاحب نے اُن سے استعفا طلب کر لیا تھا۔ لیکن یونیورسٹی کی مجلسِ منتظمہ کی اکثریت اِن کے ساتھ تھی۔ اس لئے آخر میں زیدی صاحب کو سمجھوتہ کرنا پڑا۔ ان کے سب سے بڑے حمایتی

عبدالمجید خواجہ صاحب تھے جنھوں نے نہایت بے تکلفی سے ایک بار مجھ سے کہا تھا "مسعود! تمھارے دونوں چچاؤں میں ذاکر سیاسی آدمی ہیں اور یوسف پٹھان ہیں"۔ علی گڑھ میں بائیں بازو کے ہلِ سیاست سے ان کی کشمکش بھی اسی مزاج کا شاخسانہ تھی۔ یوسف صاحب ایک تو مارکی فکر کے ناقدین میں تھے۔ دوسرے اشتراکیت کے جو نمونے علی گڑھ میں اُن کے سامنے تھے اُنکو وہ کردار کے اعتبار سے نہایت گھٹیا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے لیے مسلم یونیورسٹی جیسے ادارے میں کوئی جگہ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ ان سے اس وجہ سے بھی نالاں تھے کہ ان میں سے بعض صلاحیت رکھنے کے باوجود علمی کام دیانت کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ میں اس میں ان کا ہمخیال تھا۔ زیدی صاحب اس کے برخلاف خالص سیاسی انسان تھے۔ اس لیے مارکسی نظریات کے نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کے گھیرے میں آجاتے۔ یوسف میاں کے مزاج کی اس افتاد سے ذاکر میاں تک رنجیدہ مگر خاموش رہا کرتے۔ ایک طرف دوست اور دوسری طرف بھائی تھا اور بھائی بھی ایسا جس نے آڑے وقت میں ہمیشہ ان کی ناز برداری کی لیکن زیدی صاحب کے احسانات کا بوجھ زیادہ تھا۔ خاص طور پر جب علی گڑھ آکر انھیں قلب کا دورہ پڑا تو زیدی صاحب اس وقت ریاست رام پور میں بڑے وزیر تھے انھوں نے نواب رام پور کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ علی گڑھ سے ذاکر صاحب کو اپنی اسپیشل ٹرین میں بغرضِ علاج رام پور لے آئیں میں اس وقت علی گڑھ اسٹیشن پر موجود تھا جب ذاکر صاحب کو گاڑی پر چڑھا دیا گیا تو اچانک نواب صاحب اُن کے ڈبے میں نمودار ہوئے اور کہا " ذاکر صاحب! اب آپ میری Juris-diction میں ہیں" (اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ اس وقت ہر والیٔ ریاست کا حدِّ اختیار اس کی اسپیشل سے شروع ہوجاتا تھا) ذاکر میاں نے کہا جی سرکار! مجھے کچھ عجب سا لگا اس کے بعد ذاکر میاں رام پور سے علی گڑھ لوٹ آئے تب بھی نواب صاحب کی جانب سے دو نرسیں کئی مہینے تک ان کی کوٹھی پر دیکھ بھال کے لیے تعینات رہیں۔

یوسف میاں کے جلال کا ایک اور مظاہرہ ان کے ریٹائرڈ ہونے اور دہلی میں بس جانے کے بعد نظر آیا۔ شملے سے واپس آنے کے بعد کچھ عرصے وہ ذاکر میاں کی کوٹھی کے ایک حصے میں مقیم رہے۔ اس وقت ذاکر میاں نائب صدرِ جمہوریہ تھے۔ جب مئی ۱۹۶۷ء میں وہ صدرِ جمہوریہ

جو کر راشٹرپتی بھون میں منتقل ہو گئے تو یوسف میاں نظام الدین میں کرائے کے فلیٹ میں آ گئے۔
اب انھیں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر انھیں دہلی میں ریٹائرڈ زندگی گذارنا ہے تو مختصر سے
آشیانے کا ڈول ڈالنا چاہیئے۔ حیدر آباد میں بنجارہ ہلز پر ان کا بڑا کشادہ بنگلہ تھا لیکن اب چونکہ دکن
واپس جانے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیئے وہ اسے فروخت کرنے کی فکر میں تھے۔ اِس
سے انھیں اس قدر رقم بآسانی مل جانے کی توقع تھی کہ وہ دہلی میں اپنی رہائش کے لیئے ایک آرام دہ فلیٹ
بنا سکیں۔ مسئلہ تعمیر کے لیئے زمین کا تھا۔ اس وقت انھیں یاد آیا کہ اوکھلے میں انھوں نے جامعہ لینے کے
ابتدائی زمانے میں ایک بڑا پلاٹ نہایت سستے داموں میں لے لیا تھا جس میں سے ایک تہائی انھوں
نے ذاکر میاں کو اور ایک تہائی محمود میاں (وہ کچھ عرصے کے لیئے ڈھاکہ سے آل انڈیا ریڈیو کی سروس میں
دہلی آ گئے تھے) تحفۃً دے دیا تھا۔ باقی ایک تہائی بھی ذاکر میاں کے بڑے داماد خورشید عالم خاں نے
ان سے سستے داموں خرید لیا تھا۔ خورشید نے کچھ عرصے پہلے محمود میاں کا مکان (مع زمین) بھی اصل
قیمت (تقریباً چودہ ہزار) میں خرید لیا تھا۔ یوسف میاں کی خواہش تھی کہ اب اُن کی ضرورت کے موقع پر
اس میں سے اس قدر زمین انھیں دے دی جائے کہ وہ ایک چھوٹا مکان تعمیر کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ زمین
بیر پکڑ لیتی ہے اور خاندانی جھگڑوں کی جڑ ہوتی ہے۔ اُن کی تجویز کو خورشید صاحب اور ان کی بیگم
نے قبول کرنے میں ٹال مٹول کی۔ ذاکر میاں حسبِ معمول خاموش رہے۔ جب حاجت روائی کی کوئی شکل
نہیں نکلی تو یوسف صاحب کو آخری بار جلال آیا اور انھوں نے اس بار براہِ راست ڈاکٹر ذاکر حسین خاں،
صدر جمہوریۂ ہند کو خط لکھا کہ اگر ان کے اس قدر احسانات کے باوجود انھیں زمین کے ایک قطعہ سے محروم
رکھا گیا تو وہ راشٹرپتی بھون کے سامنے دھرنا دیں گے۔ ذاکر میاں نے صورتِ حال کو بھانپ لیا، وہ
اپنے چھوٹے بھائی یوسف کے مزاج سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنے داماد اور بیٹی سے کہا کہ یوسف
کو سامنے کی ایک تہائی زمین سے ایک قطعہ دے دو۔ اور اگر تم لوگ ایسا نہیں کرو گے تو میں خرید کر
دوں گا جس کی قیمت اب ہزاروں ہوگی۔ اس اخلاقی دباؤ کا اثر پڑا۔ یوسف میاں کو جامعہ نگر میں ایک
قطعۂ زمین مل گیا جس پر بعد کو انھوں نے اپنا مکان تعمیر کر لیا اور دھرنا دھرا رہ گیا۔

یوسف و برادر: یوسف کے اِس قضیئے کا ذکر جب کبھی خاندان میں ہوتا تو ہر شخص اپنے
اپنے خیال کے مطابق رائے دیتا۔ میری رائے یہ تھی کہ قانونی اعتبار سے یوسف میاں کا اس زمین پر

کوئی حق نہیں ہے اس لیے کہ وہ کچھ عطیہ کے طور پر اور کچھ واجبی قیمت پر ان لوگوں کو دے چکے ہیں۔ ان
اخلاقی حق ضرور پہنچتا ہے۔

اُس وقت ذاکر میاں کے یہاں میرے علاوہ ایک اور عزیز رحیم الدّین خاں بھی مقیم تھے۔
وہ جامعہ ملیہ میں اسکول کے طالب علم تھے اور چوں کہ ان کا رجحان زیادہ تر کھیل کی جانب تھا اس
لیے تعلیم سے خاطر خواہ بہرہ مند نہیں ہو پاتے تھے۔ چچی صاحبہ نے ان کو تعلیم یافتہ بنانے کی ذمہ دار
میرے اوپر ڈال دی۔ چنانچہ میں ان کا خود ساختہ اتالیق بن گیا۔ وقت کی پابندی کے ساتھ زبردستی
اُن کو پڑھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن شاید اُن پر اپنا فوجی مستقبل روشن تھا اس لیے دما
میں کوئی چیز نہیں جمتی تھی۔ مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ اسکول کے بچوں کے لیے کس قد
گھٹیا استاد ہوں۔ جہاں تحمّل کی سخت ضرورت ہوتی ہے وہاں میں ذرا ذرا سی خطا اور چوک پر آ
ہو جاتا تھا۔ شروع شروع میں سخت کلامی سے کام لیا۔ اس کے بعد سخت گیری پر اُتر آ
حساب کے سوالات کی غلطیوں پر میں ان کی انگلیوں پر پیمانہ مارتا۔ اس سے بھی جی پ
نہ ہوتا تو طمانچے مار کر گال سُرخ کر دیتا۔ وہ بہت گورے رنگ کے تھے۔ اس
طمانچوں سے رنگ اور چوکھا ہو جاتا اور چہرہ تمتما اُٹھتا، آنکھوں میں آنسو آ
لیکن شاباش پٹھان بچے کا کہ نہ کبھی اُف کی اور نہ کسی سے شکایت کی۔ ایک
دن میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے انھیں اس حالت میں دیکھ کر
علاحدہ لے جا کر سرزنش کی ۔ اس کے بعد اُن کا مجھ سے فیضیاب ہونے کا سلس
بند ہو گیا۔ ابھی دو سال پہلے جب میں پاکستان ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت
سے گیا تھا تو اسلام آباد پہنچ کر میں نے اپنی چچا زاد بہن ثاقبہ کو (جو لفٹیننٹ جنرل رحیم الد
کی بیوی ہیں) ٹیلیفون کیا اور ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے دوسرے د
مجھے شام کے کھانے پر مدعو کیا تو لفٹیننٹ جنرل صاحب سے بھی ایک عرصے کے بعد
ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مجھے اپنے اسکول کی عمر کے دو بچوں سے متعارف کرا

ہوئے کہا کہ "مسعود بھائی میرے استاد بھی رہے ہیں۔ مگر سخت گیر استاد رہے ہیں۔
جب میں اپنی نالائقی کا ثبوت دیتا تھا تو میری انگلیوں پر کھٹ سے پیمانہ مارتے تھے"۔
میں نے کہا یہ صرف "نصف سچ" ہے، یہ بھی نہیں میں ان کے گورے گورے گالوں کو گلنار
بھی کر دیا کرتا تھا۔ رحیم الدّین خاں اُس وقت پاکستانی فوج کے چیف آف اسٹاف
تھے، اور جنرل ضیاء الحق کے ہمدھی!

پانچواں باب

علی گڑھ (۱)

(۳۹ تا ۴۱ء)

۱۹۳۹ء کی جولائی میں اینگلو عربک کالج کی پوری ٹولی داخلے کے لیے علی گڑھ پہنچی۔ انعام الحق نے ایم۔ اے انگریزی میں داخلہ لیا۔ حبیب اللہ خاں نے فارسی کا انتخاب کیا (حالاں کہ میرے نزدیک اُن کی اردو بھی مشتبہ تھی) محمود علی نے ایم۔ اے فلسفے میں اور میں نے ایم۔ اے تاریخ میں۔ میرے داخلے کی کارروائی بہ نفسِ نفیس رشید احمد صدّیقی صاحب نے اِس طرح کی بغیر توجہ کیے میرے ہاتھ سے داخلہ کا فارم لے لیا اور آئیے حضرت کہہ کر میرے ساتھ اسٹریچی ہال میں جا نکلے جہاں ان دنوں داخلہ کا بازار لگتا تھا۔ کلرکوں سے لے کر پرووسٹ اور دیگر اربابِ داخلہ تک بے شمار میزیں لگی ہوئی تھیں۔ یہاں پر اندراج کرائیے یہاں ہال اور ہاسٹل کا انتخاب کیجیے، یہاں فیسِ داخلہ جمع کر دیجیے۔ ہر میز پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ پیرِ کار عام طور پر سینیر طلبہ یا رشید صاحب جیسے بعض اساتذہ تھے۔ میں نے دیکھا کہ رشید صاحب کا جس میز کی طرف رُخ ہوتا ہے پرے کا پرا ہٹ جاتا ہے۔ کلرک ہو کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایک ہلکی سی اُٹھک بیٹھک لگاتا اور اُن کے فقرے کی تاب نہ لا کر جھٹ ان سے فراغت حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

اُس دن رشید صاحب کے وار بھرپور پڑ رہے تھے اور شاید ہی کوئی مردہ دل ہو جو اِس سودا اور اِن کے غمزہ سے پہلو تہی کرنے کی ہمت کرتا ہوں سمجھیے جو کام گھنٹوں میں ہوتا تھا منٹوں میں ہو گیا۔ اِس دوران میں میری طرف سے مسلسل تجاہلِ عارفانہ رہا۔ ایک

ہوگا اور لگا، جب آخر میں مجھے داخلہ کا فارم تھماتے ہوئے کہا لیجئے حضرت! باقی کام آپ کا ہے فیس وغیرہ داخل کیجئے اور شعبۂ تاریخ کا رخ کیجئے۔

ابھی میرے قدم شعبۂ تاریخ میں جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ ایک مؤرخ ہی کے ورغلانے پر (میری مراد پروفیسر حبیب سے ہے جو ان دنوں علی گڑھ آ نکلے تھے) اُکھڑ گئے، اور ہفتہ عشرہ کے اندر ہی تبدیلئ مضمون کی درخواست لئے سہما سمٹا شعبۂ اردو میں صورتِ سوال کھڑا تھا۔ رشید صاحب سے میں نے جب اپنی اِس نیت کا تذکرہ کیا تو بولے: "خوب! یہ میں نے کب کہا تھا کہ آپ مجھ پر مسلّط ہو جائیں" پھر ٹھونک بجا کر پوچھا "کیا بالکل طے کر لیا ہے؟" میں نے کہا جی ہاں ایک مؤرخ ہی کے کہنے پر"۔ کہا "اچھا لائیے درخواست" اور شانِ بے نیازی سے اُس پر دستخط کر دیئے۔

لیجئے اب میں شعبۂ اُردو کا طالب علم بن گیا۔ اچھے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے مجھے آفتاب ہوسٹل میں جگہ بھی مل گئی جہاں سب کمرے "سنگل سیٹ" کے تھے اور جو پڑھاؤ' طالب علموں کا سب سے محبوب ہوسٹل تھا۔ شعبۂ اردو میں اِس وقت کئی حضرات درس دیتے تھے لیکن ایم۔ اے۔ کو پڑھانے کی ذمہ داری رشید صاحب اور سرور صاحب تک محدود تھی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی لکچرر تھے لیکن ان سے مجھے شرفِ شاگردی کبھی حاصل نہیں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ خلوصِ جذبات یا حافظے کی فروگذاشت کی وجہ سے پاکستان میں جہاں بھی متعارف کرانے کا موقع ملتا ہے، وہ مجھے فخریہ اپنا شاگرد بتاتے ہیں!

رشید صاحب کے نام نامی اور ان کی بعض تحریروں سے میں پہلے سے واقف تھا۔ میں اُن خصوصی تعلقات سے بھی واقف تھا جو اُن کے اور ذاکر میاں کے درمیان زمانۂ طالب علمی سے چلے آ رہے تھے۔ آل احمد سرور صاحب میرے لیے نئے تھے۔ وہ ابھی دو سال پہلے اردو میں پرائیویٹ ایم۔ اے کرنے کے بعد انگریزی سے منتقل ہو کر شعبۂ اردو میں آئے تھے۔ کہتے تھے اُن کے اِس فیصلے کو رشید صاحب اور ذاکر صاحب دونوں کی تائید حاصل تھی۔ بی۔ اے۔ تک وہ سائنس کے طالب علم رہے۔ یک لخت ایم اے انگریزی کی جانب جھک پڑے اور

فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ اس کے بعد اُردو میں بھی درجۂ اوّل میں کامیاب ہوئے۔ غرضکہ اردو ادب کے کامیاب استاد بننے کے لیے پوری طرح مسلح تھے۔ ان کا علم بھی مستحضر تھا۔

انگریزی اور اردو ادب کے تقابلی مطالعے سے اپنے لکچروں کو اور زیادہ پُرمغز بنا دیتے تھے۔ حافظہ اچھا پایا تھا اِس لیے جب اشعار نقل کرنے پر آجاتے تو دریا بہا دیتے۔ پڑھاتے بھی بہت لگن اور تیّاری سے تھے۔ اِس لیے پوری کلاس اُن کی ہمہ دانی سے متاثر تھی۔

رشید صاحب کی ڈگر اس سے مختلف تھی۔ وہ انگریزی ادب سے بہت کم واقف تھے البتہ فارسی شعر و ادب پر اچھی نظر تھی۔ پڑھانے میں ان کا جی بھی نہیں لگتا تھا اس کی تیاری بھی نہیں کرتے تھے۔ بنیادی طور پر وہ انشاء پرداز تھے۔ ان کا دائرۂ تدریس بھی محدود تھا یعنی غالبؔ، اقبالؔ، حسرتؔ، جگرؔ، اصغرؔ اور چند مزاح نگار یا انشاء پرداز۔

سرورؔ صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ "توازن" کا شکار ہیں، اس لیے ادب میں کچھ بھی نہیں تول پاتے۔ ان کی تنقید پر یہ مصرع چسپاں کیا جاتا تھا ع

جنابِ شیخ کے نقشِ قدم یوں بھی ہیں اور یوں بھی

کبھی ترقی پسندوں کے ہم سفر رہے اور کبھی جدیدیوں کے رہبر بنے۔ ع

معشوقِ ما بہ شیوۂ ہر کس برابر ست

رشید صاحب ترقی پسندی کو مسلسل مشتبہ نظروں سے دیکھتے رہے کسی جگہ لکھا ہے " ہر وہ ادبی تحریک جس کا آغاز اور مصدر کعبہ و کاشی سے ماوراء ہو میں اسے شبہ کی نظر سے دیکھتا ہوں" لیکن صلحِ کُل کے مسلک رکھنے کی وجہ سے اگر ان کا کوئی فقرہ کسی کے لیے ڈنک بن جاتا تھا تو فوراً معافی مانگ لیتے تھے۔

طالب علموں میں اکثر دونوں استادوں کا موازنہ کیا جاتا تھا۔ سب لوگ اس بات پر متفق تھے کہ رشید صاحب کی بات اپنی بات ہوتی ہے جب کہ سرورؔ صاحب کی پرائی۔ دوسرے الفاظ میں سرورؔ صاحب کا علم کتابی و اکتسابی تھا۔ رشید صاحب اس کے برعکس غالبؔ ہوں کہ اصغرؔ ان پر ذاتی تاثرات بیان کرتے۔ اس لیے ان کا ایک ایک جملہ بصیرت کا نگینہ بن جاتا تھا۔ سرورؔ صاحب کا علم قاموسی تھا۔ رشید صاحب

کا دجدانی۔ ہم لوگوں نے دونوں سے اپنے اپنے طور پر استفادہ کیا ہے۔

افسوس اس بات کا ہے کہ دونوں استادوں میں آخر آخر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ رشید صاحب کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی وجہ سے انھیں ملازمت میں توسیع نہیں مل سکی۔ اس پر علی گڑھ کے حلقوں میں بہت دنوں تک چہ میگوئیاں بھی رہیں۔ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ جو اس قدر قریب رہے ہوں وہ اس قدر دور بھی جا سکتے ہیں۔ سرور صاحب نے ایک دو بار رشید صاحب کے دولت خانے پر حاضری دے کر معاملہ کو سلجھانا بھی چاہا لیکن رشید صاحب کے دل کی گرہ نہ کھلی۔

دونوں کے عقیدت مند اور محرم راز ہونے کی حیثیت سے میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آنے والی نسلوں کے لیے، واقعات جیسے کہ ہیں بیان کر دوں۔ رشید صاحب کی جانب سے لوگوں کی یہ شکایت کہ کرنل بشیر حسین زیدی سے قرب کی وجہ سے سرور صاحب نے رشید صاحب کی مدت ملازمت میں توسیع نہیں ہونے دی صحیح نہیں۔ بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ رشید صاحب جب ۱۹۵۸ء میں حسن خدمت سے سبکدوش ہوئے تو ان کی اصل عمر ۶۵ سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ ملازمت میں توسیع سال دو سال کی ہوتی تھی۔ ذاکر صاحب نے صرف پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر ہادی حسن کو خصوصی توسیع چار سال کی دی تھی۔ ظاہر ہے کوئی وائس چانسلر ۶۵ برس سے اوپر کے کسی استاد کو مزید توسیع نہیں دے سکتا۔ وجہ جواز صرف یہ پیدا کی جا سکتی ہے کہ رشید صاحب ہائی اسکول کے سارٹیفکٹ کے مطابق ۱۹۵۸ء میں صرف ۶۰ سال کے ہوئے تھے لیکن صحت اور کارکردگی کے اعتبار سے وہ اس سے کہیں زیادہ کے لگتے تھے۔ ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو تھا جنھوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ "جب تک رشید صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں اس کی ترقی و توسیع ناممکن ہے"۔

رشید صاحب کی جانب سے اس معاملے میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ سرور صاحب کو اس معاملے میں خاموشی نہیں اختیار کر لینی چاہیے تھی، جیسی کہ انھوں نے کی۔ اس لیے کہ وہ عرصے تک رشید صاحب کی توجہ کا مرکز بنے رہے تھے۔ یہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ ان کی حمایت میں لب کشا ہوتے۔ رشید صاحب جیسے حساس انسان نے اسے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور پھر کبھی معاف نہیں کیا۔ ان کی

دل شکستگی بار بار ان کے خطوط میں ابھر آتی ہے۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی سیرتوں اور مزاجوں میں بھی بعد المشرقین تھا۔ رشید صاحب کی شخصیت زیادہ گُدھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً دلِ تنگ رکھتے ہیں وہ ابتدا میں جس کو بڑھاتے ہیں آخر میں آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے۔ یہ میری نہیں اُن کے ایک اور عزیز شاگرد پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی رائے ہے۔ معاشرتی سطح پر بھی طبائع کا تباین بہت زیادہ تھا۔ سرور صاحب کے یہاں تواضع کرنے سے زیادہ تواضع کروانے پر زور ملتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دسترخوان بہت کشادہ تھا۔ ان کے یہاں معقول نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خود سدا کے حاجتمند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔ اسی لیے انسانی سطح پر ان کے رشتے ان کے دوستوں اور عقیدتمندوں سے زیادہ استوار رہے ہیں۔ وہ اچھا شاعر ہونے کے لیے اچھا انسان ہونا لازمی قرار دیتے تھے۔ اسی لیے اصغر اور جگر کے مقابلے میں انھوں نے جوش کو ہمیشہ نامعقول سمجھا۔ "نامعقول شاعر نہیں ہوسکتا" ان کا ایک قولِ محال تھا۔

... طور پر خلوت، خواص اور خود پسند تھے، ان کا ... باہر سے ناہنجار اور اندر سے

... ان کیا۔ اس میں میرا ... پختہ کار مسعود ذوقی ... کے پرچے میں مجھے سو میں ... یعنی کل ۷۵ نمبر۔ مجھے احساس ... بھی تھا کہ اس کے بعد ... کے ہاتھوں اس میں ریکارڈ نمبر ... بعد کو اسی کو اپنا موضوع تحقیق بنایا۔

ہے "ہر وہ ... کی نظر سے دیکھتے ... لیے ڈنک بن جاتا تھا۔ ... طالب علموں میں اکثر ... پر متفق تھے کہ رشید صاحب کی ... دوسرے الفاظ میں سرور صاحب کا ... برعکس غالب ہوں کہ اصغر ان پر ذاتی ... ایک جملہ بصیرت کا نگینہ بن جاتا تھا۔

علی گڑھ کے قیام میں میں نے صرف اپنے ادبی ذوق اور علمی افق ہی کو فراخ نہیں کیا بلکہ اس دور کی مسلم سیاست اور مسلمان کی امیدوں اور آرزوؤں کا بھی مجھے اندازہ ہوا۔ یہ زمانہ مسلم لیگ کے احیاء کا دور تھا۔ میرے ذہن کی تربیت جامعہ ملیہ کی قوم پرستی کی فضا میں ہوئی تھی۔ مذہب کی جانب میرا رویہ جامعہ ملیہ کے پنج وقتہ کے باوجود غالب کا سا بن چکا تھا ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اس لیے میں نے اس دور کی مسلم لیگ کی سیاست کو محض ایک تماشا بین کی حیثیت سے دیکھا۔ ہر دور میں علی گڑھ میں اشتراکی فکر رکھنے والوں کا ایک مختصر مگر منظم حلقہ رہا ہے۔ ادب میں یہی "ترقی پسند" کہلاتے تھے۔ میں بھی رشید صاحب کی طرح ان کو مشتبہ نظروں سے دیکھتا تھا۔ دراصل مارکسزم میرے ذہن کو کبھی بھی زیر نہیں کر سکی۔ میرے اردگرد جو نام نہاد ترقی پسندوں کے نمونے تھے وہ بھی متاثر کن نہیں تھے۔ شراب کا نشہ، سگریٹ کا دھواں، غیر اخلاقی اقدار یہ سب میری فطرت کے منافی تھیں۔ میں اچھی زندگی کو صحت مند مرتب زندگی سمجھتا تھا۔ مُلّائیت کا نقاد تھا اور اشتراکیت میں مجھے ایک قسم کی مُلّائیت کا ذہن کارفرما نظر آتا۔ وہی یہ کہ ہم صراطِ مستقیم پر ہیں۔ دیکھئے، کسی فکر کو میرا ذہن کبھی قبول نہیں کرتا چاہے اس کا ماخذ کہیں سے ہو۔ میں اکثر دوستوں سے کہتا کہ دماغ بند ہی رکھنا ہے تو اسلام کیا برا ہے۔ فلسفیانہ سطح پر میں اس کا قائل بھی نہیں سکتا تھا کہ انسان معاشی حالات کا غلام ہوتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کو فاعل مختار سمجھا اس لیے شعر و ادب میں فرد کی انفرادیت کا قائل رہا۔ بہت بعد کو جب ۱۹۵۶ء میں نے اپنا مجموعۂ کلام "دونیم" کا پہلا اڈیشن شائع کیا (اب ۱۹۸۶ء میں دوسرا شائع ہو چکا ہے) تو تمہید شعر کے طور پر یہ الفاظ لکھے۔

" شاعرانہ شخصیت اپنے معاشرتی ماحول میں بے ہمہ اور با ہمہ ہو کر اسی طرح سے بلکن رہتی ہے جیسے ہمارا سماشرتی دائرۂ کائنات کے طبعی ماحول میں۔

[illegible]

کو نہیں سلجھاتا اُسی طرح معاشیات کے اصولوں کی ادب و شعر پر تطبیق بہت
دور تک دست گیری نہیں کرتی۔ شعری عمل اُس وقت تک پُرکار نہیں بنتا جب تک اس
میں کشاکش انفرادیت نہ ہو۔"

میں نے اسی خیال کا اعادہ اپنے اس دور کے ایک مضمون "سماج اور شعر" میں کیا تھا
جو پہلی بار فکر و نظر (علی گڑھ) میں شائع ہوا تھا۔ جس پر قاضی عبدالودود سے داد اور کمیونسٹ
پارٹی کے سرکاری آرگن کے ایک اداریے سے 'بیداد' ملی تھی۔ اس میں میں نے مارکس کا
یہ اقتباس دیا تھا۔

"یہ امر واقعہ ہے 'فنونِ لطیفہ' کے اعلیٰ ترین ارتقاء کے بعض ادوار کا نہ تو اس عہد
کے سماجی ارتقا سے بلاواسطہ رشتہ ہوتا ہے اور نہ اُس عہد کی مادی بنیاد یا
معاشرتی ڈھانچے سے۔"

اس کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا:

"دراصل معاشی اور فنی اقدار کے اثرات دائرے کی شکل میں مرتب ہوتے ہیں اور
یہ مختلف ادوار کی اپنی اپنی توانائی اور بصیرت پر منحصر ہے کہ وہ کس درجہ خود کو حیاتِ
معاشی کی بندشوں سے آزاد کر سکتے ہیں۔۔۔۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں میں ادب
کو 'آلۂ کار' یا 'حربہ' کے طور پر استعمال کرنے کا تصور بھی نہیں ملتا۔ دراصل
دونوں نشاۃ الثانیہ کے 'انسانِ کامل' کے تصور سے اس قدر متاثر تھے کہ انسان
کی یک طرفہ معاشی زندگی کو سب کچھ سمجھنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا۔"

میرے لیے یہ کہنا ذرا مشکل ہے کہ میری مذہبی و سیاسی آزاد خیالی کی ماخذ کیا تھے۔
صرف قیاس کر سکتا ہوں کہ بچپن کا وہ آزاد خیال ماحول جس میں معتقدات کی کمی تھی یا شاید
وہ نسلی امتیازات جو مجھے افغانی قبائلی زندگی سے وراثتاً ملے تھے جن میں شدید انفرادیت
اور عقلیت شامل ہیں۔ میری بیوی نسوانی ضعیف العقیدگی کی بہت سی ذہنی باتیں بیان
کرتی رہتی ہیں جس کا ردّعمل میں برسوں سے ان الفاظ میں پیش کرتا رہا ہوں "مجھی! یہ بات
دماغ میں نہیں دھنستی"۔ یہ جملہ اب اُن کے لیے چڑ سی بن گیا ہے لیکن حقیقتِ حال یہی ہے،

جس بات کو ذہن قبول نہیں کرتا میرے لیے اس کو یقین کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید یہی
وجہ ہے کہ میں نے توہمات، مہمل روایات اور دیومالائی تصورات کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اسی لیے
قدیم ہندوستانی تہذیب کی تجدیدات کی جانب طبیعت نہیں جاتی۔ مجھے سنِ شعور سے جہاں مسلمانوں
کی بہت سی خرافات سے چڑ رہی ہے، اشتراکیوں کے خود کو ہمیشہ صراطِ مستقیم پر سمجھنے سے بھی
اسی قدر بیزار رہا ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے اکثر کہتا تھا کہ یہ بھی ایک طرح کے کٹ ملا ہیں
جو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے جدلیاتی منطق سے حقیقت اور صداقت کو پا لیا ہے حالانکہ یہ دعویٰ مارکس نے
بھی نہیں کیا ہے۔ پھر اپنے اردگرد ان کے چلتے پھرتے نمونے دیکھ کر اور ذاتی سطح پر خود کو ان سے
بہتر پا کر اور زیادہ بیزار ہو جاتا۔ مزدوروں کا دم بھر کر آپ بورژوا طبقے کے عیش کے تلاشی رہیں،
یہ کہاں کا کردار ہے! اس لیے جس طرح میں ہمیشہ کٹ ملاؤں سے بحث و مباحثہ کرنے سے گریز
کرتا تھا ان سرخوں کو بھی دور رکھتا تھا اور بعد کو سلام مچھلی شہری کے اس مصرع سے خوب
لطف اندوز ہوتا رہا ع

مجھے بچاؤ! کہ سرخوں میں گھر گیا ہوں میں

ان لوگوں نے مجھے ہمیشہ صرفِ نظر کیا لیکن میں گھاٹے کے اس سودے پر رضامند رہا۔

علی گڑھ میں میرے دن بیشتر اپنے ساتھ گذرتے۔ صبح اٹھ کر ہلکی سی ورزش۔ اس کے بعد کیونڈر سے دودھ میں
گاجریں اور چھوارے ابال کر ان کا ناشتہ۔ ہاسٹل سے جو دو توس آدھی گولی مکھن اور چائے ملتی وہ میں اکثر بیرے
کو دے دیتا۔ کالج سے واپس آنے کے بعد ہاسٹل سے جو کچھ ملتا اس پر اصلی گھی کا تڑکا لگا کر نوش
کر جاتا۔ ہاسٹل کے سالن کے متعلق مشہور تھا کہ یہ سرسید کے نسخۂ کلاں کے بموجب پکایا جاتا ہے اس
لیے اس کا نام چاہے قورمہ ہو یا دوپیازہ۔ مزہ یکساں ہوتا ہے۔ ترکاری کی پلیٹ میں موسم کی سب سے
دستیاب اور سستی سبزی کو ترجیح دی جاتی۔ جولائی میں جب یونیورسٹی کھلتی تھی تو بھنڈی کا موسم ہوتا،
بس تو پھر بھنڈی کا سلسلہ شروع ہو جاتا جس پر تار بہرحال وہی سرخ رنگ کا ہوتا جو گوشت کے
لیے علاحدہ سے تیار کیا جاتا۔ اور دال تو پتلی مشہور ہی ہے وہ کیوں کر اپنی شہرت پر بٹہ لگنے دیتی۔
گل جائے تو بہت سمجھیے۔ آفتاب ہاسٹل کی زندگی میں پہلے سال کمرہ نمبر ۶۶ اور دوسرے سال
[illegible] مقیم تھا۔ کھانا میرے لیے ہمیشہ مسئلہ بنا رہا۔ داخلہ لینے کے بعد انٹروڈکشن نائٹ کا مسئلہ تو

روز رفع دفع ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ ایک سینیئر کی جانب سے اشارہ مل گیا تھا کہ آج کی رات ہوشیار رہنا۔ انٹروڈکشن نائٹ کی علی گڑھ میں نووارد طلبہ پر جو ہیبت ہوتی ہے وہ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس سے گزر چکے ہیں۔ طرح طرح کے بیہودہ مذاق کیے جاتے ہیں۔ گانے کو کہا جاتا ہے، وہ نہیں آتا تو پھر ناچنے پر اصرار کرتے ہیں۔ غرض کہ چند گھنٹوں کے لیے نوواردوں کی عزت و ناموس ایک ہجوم کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو اپنے کو 'سینیئر' کہتے ہیں۔ میں ایک سینیئر ہی کے اشارے پر ان سینیئروں کو ہاتھ دے گیا' یعنی شام کو دہلی کے لیے چمپت ہوگیا۔ چنانچہ رات کے سناٹے میں جب سینیئروں کی برات شور مچاتی نکلی اور کمرے کمرے نوواردوں کی گرفتاری کا عمل شروع ہوا تو انھیں سخت مایوسی ہوئی جب انھوں نے میرے کمرے میں بڑا سا تالا لگا دیکھا۔ آواز بلند ہوئی یہ تو بڑا استاد نکلا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو انھیں میرے کمرے کے سامنے دیوار کے سہارے سے کھڑی ہوئی بانس اور بانڈوں کی نئی کھاٹ نظر آئی، جو میں دو روز قبل، حسب روایت، رسل گنج سے خرید کر کے یہ لاد کر لایا تھا۔ نعرہ لگا اِسی کو اٹھالو۔ دوسرے روز جب میں دہلی سے واپس آیا اور ہاسٹل کے سینیئروں کو میری واپسی کا علم ہوا تو دو طالب علم مجھے بلا کر ایک سینیئر کے کمرے میں لے گئے جہاں پہلے سے کچھ طالب علم موجود تھے۔ کچھ لعن و تشنیع ہوئی۔ سزا کے طور پر کچھ گانے کو کہا گیا مگر وہ ہجوم کی سی بات کہاں۔ سستا چھوٹا، چلتے وقت میں نے کہا میری کھاٹ تو واپس کر دیجیے۔ کہا گیا وہ تو بحق سرکار ضبط کی جا چکی ہے۔

اِس عرصے میں، میں طلبہ کی یونین کی سیاست سے بھی دور رہا۔ صرف ایک بار اپنے ہم وطن اور دوست مختار آزاد کی خاطر یونین کا الیکشن لڑانے میں حصّہ لیا تھا جس میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ رات کو رسم کے مطابق شکست خوردہ امیدوار کا جنازہ نکلا۔ اس کے خاص خاص کام کرنے والوں کی تلاش ہوئی۔ اس رات بھی میں کمرے کے بجائے میکڈانل ہاسٹل کی دیوار کے سائے تلے آرام کر رہا تھا۔ لیکن جن کا نام مختار آزاد تھا وہ بڑی موٹی کھال کے سیاست باز تھے۔ اس کے بعد بھی سکریٹری شپ اور نائب صدارت کے امیدوار بن کر میدان مقابلہ میں اترتے رہے۔ بالآخر 'جوئندہ یابندہ' ایک سال کامیاب ہوئے اور نائب صدر منتخب کر لیے گئے۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات دہلی میں ہوئی اور جب سے

علی گڑھ کا حال پوچھا تو ایک حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولے: "کیا پوچھتے ہو، بس اِس سے اندازہ کر لو کہ علی گڑھ نے مجھے یونین کا نائب صدر منتخب کر لیا ہے!" میں اس خود شناسی و احتسابی پر ہکّا بکّا رہ گیا۔ تقسیمِ ملک کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر گئے، وہاں بھی نچلے نہیں بیٹھے۔ کراچی میں مزدور یونین کے سکریٹری بن گئے۔ چوں کہ ان کا خلوص اپنی ذات سے ہوتا تھا اس لیے اس کے لیے کچھ فوائد کارخانہ داروں سے حاصل کر لیے۔ مزدور بگڑ گئے اور پکڑ کر خوب مرمت کی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

علی گڑھ میں ایم۔ اے (اردو) کے دو سال میری ذہنی ریاضت کا زمانہ تھا، اور ادبی تربیت کا بھی۔ شعبۂ اردو میں عرصۂ دراز سے دو ادبی انجمنیں کام کر رہی تھیں۔ اردوئے معلّٰی اور حدیقۃ الشعرا۔ ان کے تحت ادبی نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ علی گڑھ کے اُبھرتے ہوئے ادیبوں اور شاعروں کے لیے یہ پلیٹ فارم کا کام دیتی تھیں۔ ان میں اراکینِ شعبہ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، معین احسن جذبی، ڈاکٹر محمد عزیز، خورشید الاسلام کے علاوہ مولوی ضیا احمد بدایونی اور دیگر اہلِ ذوق شرکت کرتے۔ رشید صاحب اپنے طالب علموں کا حوصلہ بڑھانے میں کمال رکھتے تھے۔ ستائش کے ایسے جملے کہہ جاتے کہ ممدوح تک شرما جاتا۔ ان کا مقولہ تھا کہ میرا اس میں کیا بگڑتا ہے آپ لوگوں کا بھلا ہو جاتا ہے۔ کاش چھوٹوں کا دل بڑھانے کا یہ جمع خرچ ہمارے دوسرے اساتذہ کو بھی آتا۔

ایم۔ اے کے دوسرے سال میں سو نمبر کے ایک پرچے کے بجائے کسی موضوع پر مختصر سا مقالہ لیا جا سکتا تھا۔ میں نے "پریم چند کی افسانہ نگاری کے دور" اپنے لیے موضوع منتخب کیا اور توقع سے زیادہ اس میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت تک یعنی ۱۹۴۰ء تک پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں بہت زیادہ نہیں لکھا گیا تھا اسی لیے اس مقالے کے بعض ابواب مختلف رسائل اور کتابوں کے لیے نقل کر کے بھیجے جاتے رہے۔ اب پریم چند پر مستند اور غیر مستند
[illegible]

اردو ایم۔ اے کی تعلیم ہی کے دوران میری ہندی دانی کی بنیاد پڑی۔ ایم۔ اے کے پہلے سال میں ایک مشترکہ پرچہ فارسی اور ہندی کا ہوتا تھا۔ ہندی پڑھانے کا انتظام یک نفری شعبۂ ہندی میں تھا جہاں پنڈت رام سروپ شاستری طلبہ کے انتظار میں اپنے شعبے میں گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اس زمانے میں علی گڑھ میں طلبہ عام طور پر ہندی سیکھنے سے گریز کرتے تھے۔ میں شامت کا مارا ایک دن پنڈت جی کے شعبے کی جانب جا نکلا جو اس وقت شعبۂ انگریزی کے کونے پر ڈیڑھ کمرے اور نصف چپراسی پر مشتمل تھا۔ انھیں جب کوئی طالب علم مل جاتا تو اسے عبادت کے طور پر پڑھاتے۔ گھنٹہ بھر کے بجائے دو گھنٹے دیتے۔ اس خلوص کے باوجود طالب علم بہت جلد فارغ التحصیل' ہو کر بھاگ جاتے۔ چوں کہ میں اپنی درسی ذمہ داری کو نہایت سنجیدگی سے ادا کرنے کا عادی تھا، اس لیے پنڈت جی نے مجھے مکمل طور اپنے چنگل میں لے لیا۔ کسی روز اگر غائب ہو جاتا تو چپراسی بھیج کر مجھے آفتاب ہاسٹل سے (جو بالکل سامنے تھا) بلوا لیتے ابتدا میں تو مجھے یہ پکڑ دھکڑ اچھی نہیں معلوم ہوئی لیکن جب رفتہ رفتہ ہندی میں درک ہوتا گیا تو میرے ان کے درمیان 'گرو' اور 'چیلے' کا سا رابطہ قائم ہو گیا۔ کہتے تھے کہ "مجھے اب تک صرف دو پرخلوص طالب علم ملے ہیں۔ سنسکرت میں اختر حسین رائے پوری اور ہندی میں مسعود حسین خاں"۔ آج یہ سوچتا ہوں کہ ہندی دانی میرے کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں کام آرہی ہے تو پنڈت جی کی یاد میں میرا سر احسان مندی سے جھک جاتا ہے۔ میری بعد کی گیت نگاری اور تاریخی لسانیات میں تحقیقی کام اسی ہندی دانی کی بدولت ممکن ہو سکا جو پنڈت جی کی دین ہے۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں ایم۔ اے۔ کے امتحان سے فارغ ہوا تو ایک عجیب خلائے بافراغت کا احساس ہوا۔ امتحان کی تیاری اور فرسٹ کلاس پانے کی دھن میں وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ اب فراغت تھی ایک خلاء کے احساس کے ساتھ۔ اب آنکھیں منزلِ مقصود سے ہٹ کر اندر کی جانب کھلنے لگیں۔ جب میں ۱۹۳۹ء میں علی گڑھ آیا تھا تو مجموعی طور پر درجۂ اول کا طالب علم تھا لیکن اردو میں میری استعداد بہت اچھی نہیں تھی۔ اس کا سبب میں تیسرے باب میں بتا چکا ہوں، میرا چار سال کا قیامِ ڈھاکہ تھا۔ اس لیے علی گڑھ کے دو سالہ قیام میں

مجھے نہ صرف اردو ادب کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا بلکہ رشید احمد صدیقی جیسے
منجھے ہوئے انشاء پرداز کے 'فقروں' سے بھی ہمہ وقت سابقہ پڑا، جن پر علی گڑھ جان دیتا تھا۔
ایک بزرگ تو قبل از وقت موت تک کے لیے تیار تھے بشرطیکہ رشید صاحب اخیر اپنے گنجہائے
گراں مایہ' میں جگہ دے دیں۔ رشید صاحب اس پر آمادہ نہیں ہوئے اس لیے وہ ابھی تک بقید حیات
ہیں۔

رشید صاحب اور سرور صاحب کی عبارت اور اشارت ہی پہ کیا اس عہد کا اردو کا طالب علم
علی گڑھ کے در و دیوار سے 'اردو تہذیب' کے آثار و اثرات کو جذب کرتا تھا۔ علی گڑھ نے
دہلی و لکھنؤ کے ادبی اسکولوں کی حد بندیوں کو توڑ دیا تھا۔ لہجہ کے فرق کے باوجود تحریر و نگارش
کی درجہ بندی ہو گئی تھی۔ جو مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد سے اپنی انگریزیہ اور انگریزی
پرستی کی وجہ سے نہ ہو سکا، وہ طالب علموں کی یونین، مختلف ہاسٹلوں اور شعبوں کی انجمنوں
اور 'کافی د' پھوس' جیسے ریستوران کی ادبی نشستوں اور مباحثوں نے کمی پوری کردی۔
ہر طرف شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ ہر نئی کتاب 'برائے آرائیاں' ہوتیں، گرما گرم بحثیں جن کا
انجام اکثر بخیر نہیں ہوتا تھا۔ اس سے ذہن کو جلا ملتی۔ میں مقرر سے زیادہ سامع کا رول ادا کرتا
لیکن بہرحال 'انجذاب' کا عمل جاری رہتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر تقسیم ملک کا حادثہ پیش نہیں آتا تو
علی گڑھ متحدہ ہندوستان میں اردو کا سب سے بڑا گڑھ بن جاتا۔ ۱۹۴۰ء کے
علی گڑھ میں اس کے آثار موجود تھے۔ انگریزی کا طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ ہندی کا دور دور
نہیں تھا۔ خود شعبۂ انگریزی کے اساتذہ اور طلباء میں اردو میں لکھنے اور کمال حاصل کرنے کا جذبہ
پیدا ہو گیا تھا۔ خواجہ منظور حسین جیسے محترم اساتذہ ان کی ہمت افزائی کر رہے تھے۔ سرور صاحب
جیسے 'دودھاری' شعبۂ انگریزی سے اردو میں منتقل ہو رہے تھے۔ رشید صاحب کا مکان باہر سے
آنے والوں کے لیے 'ادبی قیام گاہ' بنا ہوا تھا، جہاں سید سلیمان ندوی سے لے کر حسرت موہانی
اور جگر مرادآبادی تک کا اجتماع ضدین ہوتا اور نونہالان علی گڑھ کو آداب نشست و برخاست سیکھنے کا موقع ملتا۔

میں اب اردو زبان کے رموز و نکات سے آشنا ہونے لگا تھا۔ الفاظ کے طلسم معنی
کو سمجھنے اور ان میں احساس کی بکھری ہوئی بجلیوں سے متاثر ہونے کی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔

زبان کی قواعد کا بھی علم ہوا اور اس کی بے قاعدگیوں کا بھی۔ مجھے پہلی بار انسان کی انفرادی
اور اجتماعی زندگی میں زبان کا جو رول ہوتا ہے اس کا احساس ہوا۔ اور جس قدر یہ احساس
گہرا ہوتا گیا میری اردو زبان سے محبت فزوں تر ہوتی گئی۔ اسی لیئے میں نے اوپر اردو کو ایک
تہذیب کہا ہے۔ اب میں مذہب سے ہٹ کر زبان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگا۔ خاص طور پر اس
کے انشا پردازانہ اور شاعرانہ استعمال کے بارے میں اور سب مجھے اس قسم کے اشعار تعلّی نہیں
'نکتۂ راز' معلوم ہونے لگے۔:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس طرح میرا شغف شعر اور مطالعۂ شعر سے بڑھتا گیا۔ یہ سب ایک طرح سے ذہنی تیاری
تھی اس 'نزولِ شعر' کے لیئے جس کا آغاز سال بھر بعد ۴۲ء سے شروع ہو جاتا ہے۔

میری علی گڑھ میں تربیتِ شعر نہ ہوتی تو سخنوری تو کجا شاید سخن فہمی کی بھی نوبت نہ آتی۔
میں نے اس کا ایک عبرتناک منظر علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا۔ جگر صاحب علی گڑھ تشریف
لائے ہوئے تھے۔ حسبِ معمول رشید صاحب کے یہاں ان کا قیام تھا۔ رشید صاحب اپنے
مہمان کی آمد پر تو مسرور ہوتے لیکن مہمان کے مہمانوں سے پریشان رہتے۔ خیر ایک سہ پہر
جگر صاحب کے اعزاز میں مولوی ضیاء احمد بدایونی نے ایک مختصر سی نشست اپنے دولت کدے
پر رکھی۔ میں بھی موجود تھا۔ جگر صاحب اس روز بہت موڈ میں تھے اور لہک لہک اپنا تازہ
کلام سناتے رہے۔ چوں کہ مجمع مختصر اور سخن فہموں پر مشتمل تھا، خوب خوب داد مل رہی تھی۔
حاضرین میں فلسفے کی [illegible] الدین صاحب بھی تھے جنھیں ضیاء احمد صاحب نے برنائے
خلوص مدعو کر لیا تھا۔ چونکہ سخن فہمی کی جانب سے معذور تھے اس لیے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے
خاموشی کے ساتھ ہر شعر کے انجام پر غور کرتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اہلِ مجلس
اس قدر پھڑک کیوں جاتے ہیں۔ نشست کے خاتمے پر جب [illegible] پوچھتے
[illegible] جگر صاحب [illegible] صاحب!
[illegible]

بات؟" کہنے لگے "نہیں کوئی ایسی خاص بات نہیں البتہ کلام سناتے وقت میں دیکھ رہا تھا کہ میرے شعر مسلسل اُن سے ٹکرا کر واپس آجاتے تھے!"

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اس زمانے میں سخن فہمی اور سخنوری کے لیے علی گڑھ سے بہتر کوئی محفل نہیں تھی۔ اختر انصاری، مجاز، سردار جعفری، جذبی، جاں نثار اختر، اختر الایمان، راز مراد آبادی شکیل بدایونی، مسعود علی ذوقی بزم پر چھائے ہوئے تھے۔ ان میں میرا ربط ضبط زیادہ تر اختر انصاری اور جذبی سے رہا۔ دونوں شعبۂ اردو میں میرے رفیق کار رہے۔ ایک 'نرگسیت' کا شکار تھا تو دوسرا 'خود رحمی' کا۔ لیکن دونوں نے اپنی ذہنی پیچیدگیوں کے اظہار کا وسیلہ شعر کو باکمال طریقے پر بنالیا ہے۔ اختر الایمان کے بارے میں مجھے کبھی خیال نہیں آیا کہ وہ اس قدر کامیاب نظم نگار بنیں گے۔ جاں نثار اختر کی نزاکت خیال اور نازک احساسات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔ سردار بہت جلد علی گڑھ سے نکل (بلکہ نکال دیئے گئے) آگئے تھے۔ ان سے میری پہلی ملاقات علی گڑھ آنے سے قبل اینگلو عربک کالج میں ہوئی تھی جہاں میں تھرڈ ایر کا اور وہ فورتھ ایر کے طالب علم تھے۔ راز، شکیل، اختر سعید خاں اور بے شمار شاعر مشاعروں کے مرد میدان تھے اور اپنے ترنم کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ مشاعرے کالج میں بھی ہوتے تھے لیکن علی گڑھ کی نمائش کا مشاعرہ بڑی دھوم دھام سے آتا۔ باہر سے آئے ہوئے اساتذہ کے درمیان علی گڑھ کے تازہ واردانِ بساطِ شعر اپنے بال و پَر کھولتے۔ صنفِ نازک سے داد مل جاتی تو پھولے نہ سماتے۔ شاعر ہونے کے لیے 'شاعر' لگنا، بھی ضروری تھا۔ بڑے بڑے بال، سفید علی گڑھ کٹ پاجامے پر سیاہ شریج کی شیروانی (عصمت چغتائی کی زبان میں کوڑیالے) جس کے اوپر کے بٹن کھُلے ہوئے، ترکی ٹوپی تہ کی ہوئی احتیاط سے جیب میں رکھی ہوئی (تاکہ بروقت ضرورت کام آئے) ایک نگاہِ غلط انداز کے ساتھ گھنٹوں یار دوستوں کے ساتھ، نمائش گاہ میں تیز برقی قمقموں کی روشنی میں چکّر پر چکّر لگاتے۔ اپنی یا کسی دوست کی جیب میں پیسے ہوئے تو کباب پراٹھوں کی دوکانوں کی جانب جا نکلے اور خورجہ کے شلجم کے اچار کے ساتھ، گرما گرم بحث میں نقرۂ گرم نوش کیا۔ یہ معمول تقریباً دس بارہ روز تک رہتا۔ سیاہ برقعوں میں ملبوس (بقول شخصے کالی ناگنیں) جب سرِ سراتی نمائش گاہ میں داخل ہوتیں تو دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتیں۔ لیکن اسلامی صاحب کی :

ہائے ری! مجبوریاں، محرومیاں، ناکامیاں

ایک جاں نثار اختر 'گرلس کالج کی لاری' پر ایک رومانی نظم لکھ مارتا اور ایک مجازؔ کو 'نمائش' میں حسن کے یہ پیکر نظر آتے :

وہ کچھ دوشیزگانِ ناز پرور
کھڑی ہیں اک بساطی کی دکان پر
وہ رخساروں پہ ہلکی ہلکی سرخی
لبوں میں پرفشاں روحِ گلِ تر
تبسّم اور ہنسی کے نرم طوفاں
فضاؤں میں مسلسل بارشِ زر

اور جب شباب سے انقلاب کی جانب گریز ہوتا تو یہ مشورہ دیا جاتا ؎

تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا (مجاز)

تسکین اور ذوقِ نظر دونوں کی کمی اور حجاب و نقاب کی زیادتی سے ایک اختر انصاری کے رومان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ایذا پرستی کی لذت پیدا ہو جاتی :

یہ شاعری نہیں ہے تمنّا کی قبر پر
تعمیر ایک تاج محل کر رہا ہوں میں

اور کبھی ایک جذبیؔ کے یہاں ملال کی یہ جلتی ہوئی کیفیت ملتی ہے

وہ جو خود دار ہیں، خود دار رہیں اے غمِ دل
اُن سے کہہ دو کہ تمہیں یوں تو نہ چاہے گا کوئی
ڈوبتے چاند کی سوگند نہ جاؤں گا وہاں
میری بے خواب نگاہوں کو نہ سمجھے گا کوئی

میں علی گڑھ کے اس ادبی ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن مارچ ۱۹۴۱ء میں ایم-اے کا امتحان دینے کے بعد زندگی کی نئی جولانگاہوں کی تلاش میں نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ دو سال کے بعد رومانوں کے اس شہرِ طرب اور دیوانوں کے اس دشتِ جنوں کو خیرباد کہنا مقدر ہو چکا تھا۔ البتہ اس عرصے میں پہلے غمِ دوراں اور غمِ جاناں کی گودگداہٹوں سے گزرنا لازم تھا۔

چھٹا باب

(کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں)

اردو ایم۔اے کے انہماک میں نہ تو حال کا احساس ہوتا تھا اور نہ مستقبل کی فکر لاحق تھی۔ ۲۰؍مارچ ۱۹۷۱ء کو جب امتحان کا آخری پرچہ کرکے ہاسٹل لوٹا تو ایسا معلوم ہوا جیسے صدیوں کی تھکن سوار ہو گئی ہو۔ بیکار ہو جانے کا احساس الگ تھا۔ علی گڑھ اب کاٹنے لگا اِس لیئے فوراً دہلی کے لیئے روانہ ہو گیا۔ وہاں بھی جی نہ لگا تو وطنِ مالوف قائم گنج کی راہ لی۔ وہیں مجھے امتحان کے نتیجے سے آگاہی ہوئی۔ فرسٹ کلاس فرسٹ۔ فرسٹ کلاس تو یقینی تھا لیکن رؤف رونی جیسے 'پڑھو' اور مسعود علی ذوقی جیسے صاحبِ ذوق اور ریختہ کار سے مقابلہ تھا۔ یہاں بھی وقت نہ کٹتا اگر آموں کی فصل نہ آجاتی! ان سے نبٹنا بھی ہم لوگوں کی زندگی کا ایک اہم مشغلہ تھا ننہال بھری پُری اور خوشحال تھی۔ خاندانی باغات تھے۔ ہر باغ سے 'جنس' مقرر ہوتی۔ اس لیئے جب آموں کا موسم شروع ہوتا تو ان کی بھی آمد ہونے لگتی۔ آجکل کی طرح منافع کی خاطر قبل از وقت اُجاڑ نہیں کیا جاتا تھا اِس لیئے لذّتِ کام و دہن کی آزمائش کے لیئے طویل مدت ملتی۔ ہر وقت قلمی اور دیسی آم لگن میں بھیگے رہتے اور نوجوانانِ خاندان ان پر ہاتھ مارتے رہتے۔ جب یہ شہد بھری صراحیاں ہاتھ آجاتیں تو گندم و گوشت کی کس کو پروا رہتی۔ ایک بار میرے تیسرے ماموں غلام ربّانی تاباں نے شرط بد کر ۴۲ دسہری آم ایک نشست میں کھائے تھے۔ چھوٹے ماموں خورشید عالم خاں۔ تو اِس زمانے میں کھانا ترک کر دیتے، بس آم ثم آم' یہاں تک کہ معدہ

ساتھ چھوڑ جاتا۔ آموں کے ساتھ دودھ بھی بہ کثرت استعمال میں آتا کہ ان کا بدرقہ کہا جاتا ہے۔
چوں کہ گھر کی بھینسیں تھیں اس لیے دودھ کی ہانڈی صبح سے شام تک چولھے پر چڑھی رہتی جہاں
یہ نہایت خفیف درجۂ حرارت پہ اُبلا کرتا۔ چند گھنٹے میں اس پر ملائی (یہاں بالائی بہتر) کی
اس قدر موٹی سُرخ تہ جم جاتی کہ دیکھ کر دل پھسل جاتا۔ گھر کی مالک یعنی نانی صاحبہ ('بی') کی
قدغن تھی کہ خبردار ملائی کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ وہ اس کو بلو کر مکھن اور گھی نکالتی تھیں۔ اُن دنوں
اور گھی، آج کے برعکس صحت کے لیے گوشت سے کم نہیں سمجھے جاتے تھے۔ قائم گنج میں اُڑد کی دال اور قورمے کے
لیے خالص گھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مجھے بچپن سے ملائی کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ میں بھی کرشن کنہیا
کا دیہ کا 'ماکھن چور' تھا۔ فرق اتنا تھا کہ میں خود نہیں چراتا تھا بلکہ اس کے لیے دوسروں کی خدمات
حاصل کرتا تھا۔ گھر ماموں زاد بہنوں سے بھرا ہوا تھا۔ جن میں اختری اور نجمہ بڑی تھیں۔ عمریں
یوں ہی بارہ تیرہ سال کی ہوں گی۔ نجمہ کو زیادہ بھولا پایا کر اُسے یقین دلایا کہ چوری کی ساری ذمہ داری
چوری کرانے والے کی ہوتی ہے نہ کہ چوری کرنے والے کی۔ چنانچہ خاص طور پر مغرب کے اندھیرے
میں وہ اپنا کام کر جاتی اور پر پچ بھری سُرخ تہ دار ملائی میرے کام و دہن کے کام آتی۔ اس
قدر احتیاط کی جاتی تھی کہ دودھ کی 'ملیا' (ہانڈی) سے ساری کی ساری ملائی غائب نہ ہو جائے،
صرف ایک حصّہ پیچھے سے کاٹ کر نکال لیا جائے۔ لیکن اکثر اس پر کہرام مچ جاتا اور مجھے یہ
میّا! میں ناہیں کھایو ماکھن روتی
کی صفائی پیش کرنا ہوتی۔ نانی صاحبہ بہت چیخ و پکار کرتیں۔ مختلف ملازموں اور ملازماؤں
پر شبہ کیا جاتا۔ لیکن کبھی یہ سُراغ مل جاتا کہ اس سے فیض یاب کون ہوا ہے تو مجھے نہایت
فراخ دلی سے معاف کر دیتیں، یہ کہہ کر کہ وہ تو چھٹیوں بھر کا مہمان ہے۔ البتہ نجمہ
کو سخت تنبیہ کر دی جاتی۔

اس ملائی چوری کے عمل میں اور جو ہوا سو ہوا مجھے نجمہ سے یک لخت دلچسپی کا احساس
ہونے لگا۔ وہ مجھے زیادہ اچھی لگنے لگی، چھوٹا سا قد، نوجوانی خط و خال، گدرایا سا جسم، ایسا
معلوم ہونے لگا کہ اب وہ بچپن کی سرحدیں پیچھے چھوڑ چکی ہے۔ لیکن اس بات کا سِرا

اہم ۱۹۱۹ء میں گرما کی تعطیلات گزارتے وقت میرے سامنے وہی مسئلہ تھا جو ہر نوجوان کے سامنے تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ ملازمت کا دُور دُور پتہ نہیں تھا۔ ہر چند اردو ایم۔ اے۔ اس وقت نیا نیا تھا اور اس کے فارغ التحصیل بھی زیادہ نہیں تھے، لیکن ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد لوگوں نے بھانپ لیا تھا کہ اس ڈگری کی زیادہ وقعت نہیں۔ ہر کوئی کہتا انگریزی میں ایم۔ اے کیوں نہیں کیا تاریخ بھی بری نہیں تھی۔ چنانچہ خیالی بنایا کیا کرے (اس کوٹھی کے دھان اُس کوٹھی گئے)، میں نے بھی ڈبل ایم۔ اے کی ٹھان لی۔ اس بار علی گڑھ کے بجائے دہلی کا رخ کیا۔ اور فلسفہ کو اپنا ہدف بنایا۔ زبان و ادب کا طالب علم ہونے کے باوجود فلسفے سے میری دلچسپی پرانی تھی اور بجی طور پر اناپ شناپ اس کی کتابیں پڑھنا میرا محبوب مشغلہ رہا تھا۔ چنانچہ آپ نے اس پرانے شوق کو پورا کرنے کے لیئے میں نے اردو سے بھی زیادہ بے معرف مضمون، ایم۔ اے فلسفہ میں دہلی جا کر داخلہ لے لیا۔ اب میں ہندو کالج کا طالب علم بن گیا جو اس وقت کشمیری گیٹ میں واقع تھا۔ کالج میں فلسفے کے تین استاد تھے۔ ڈاکٹر سکسینہ، ڈاکٹر اندر سین اور پریم چند۔ ایم۔ اے کی کلاسوں کے درس کی ذمہ داری اوّل الذکر دو حضرات کے سپرد تھی۔ سکسینہ صاحب رند شاہد باز تھے۔ جوش کے ہم نوا اور ہم پیالہ تھے۔ ان کا ذکر جوش نے اپنی خود نوشت یادوں کی برات میں بھی کیا ہے۔ ہر کایستھ کی طرح طلاقتِ لسانی اور لطیفہ گوئی پر قدرت رکھتے تھے۔ اندر سین ان کے برعکس تھے۔ ایک منظم اور مرتب شخصیت کے مالک۔ جرمنی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ لائے تھے۔ علم حاضر تھا۔ بات رک رک کر اور سوچ سوچ کر ایک فلسفی کی طرح کرتے اور ہندو کالج کے ماحول کے نہیں معلوم ہوتے تھے چنانچہ ان کا حشر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ چند ہی سال کے بعد ملازمت چھوڑ کر پانڈیچری کے آشرم چلے گئے۔ ایم۔ اے کی کلاسوں میں صرف چار طالب علم تھے۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ لڑکیوں میں اس زمانے کے مشہور سرجن ڈاکٹر جوشی کی صاحبزادی بھی تھیں۔ لڑکوں میں دہلی کے کایستھ گھرانے کے نگم تھے۔ وہ میرے ہمدم و ہم راز تھے۔ لیکن کالج سے نکلنے کے بعد زمانے میں ایسے گم ہوئے کہ عرصۂ دراز تک ان کا سراغ نہ مل سکا۔ ایک دن جب میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر تھا، تو اچانک نمودار ہوئے۔

میں نے پہلی نظر میں انھیں پہچان لیا۔ دیر تک بیٹھے باتیں ہوا کیں۔ وعدہ و وعید ہوئے کہ ملتے رہیں گے لیکن پھر پتہ نہ چل سکا وہ کہاں ہیں اور کیسے ہیں۔

اِس زمانے میں ایک بار پھر میں اپنے بڑے چچا ذاکر میاں کے یہاں دنصف مہمان کے طور پر مقیم تھا۔ یعنی جگہ کی قلت کی وجہ سے میں نے مکتبہ جامعہ سے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا تھا۔ البتہ کھانا چچا کے یہاں کھاتا تھا۔ اُن کی بڑی بچی اب سیانی ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی خیال میں آتی تھی، لیکن میں ابھی بر سرِ روزگار نہیں تھا اور تھوڑے ہی عرصے میں گھر والوں کو بھی اندازہ ہو گیا کہ ہم دونوں کی طبائع ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

یاد نہیں پڑتا کیوں، لیکن ایم۔ اے فلسفہ کے پہلے سال کی کلاسوں میں شرکت کرنے کے بعد میں نے اچانک امتحان نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے سمجھایا بھی لیکن اب مجھے قائم گنج پھر بُلا رہا تھا۔

اپریل ۴۲ء، پھر وہی قائم گنج اور میں۔ وہی آم، وہی مَلائی وہی مردانے گھر کی طویل بیٹھکیں۔ صرف فرق یہ تھا کہ شاعری کی دیوی نے گُدگُدانا شروع کر دیا تھا۔ ہندی کے چھایا وادی گیت نگار اور ٹیگور کی گیتانجلی زیادہ تر زیرِ مطالعہ رہتے۔ اچانک معلوم ہوا کہ سینے میں دلِ گداختہ پیدا ہو چکا ہے۔ محبت اور پریم ایک لا محدود عمل کا تسلسل معلوم ہونے لگا۔ کس کا پریم، یہ نہیں بتا سکتا، بہرحال تھا وہ یوں پہلا گیت بن کر پھوٹا!

یہ کیا کہتے ہو تم پریتم!
ختم ہوئی وہ بات
پھول کے کان میں جو بھونرے نے
گُن گُن کر کے گائی
منھ سے کہہ نہ سکی جو تم سے
آنکھوں نے بتلائی

ختم کہاں وہ بات
وہ جلتی دن رات
ہم دونوں کا جیون اِس کے
سامنے اِک پرچھائیں
وقت کی چُپ چُپ بہتی گھڑیاں
اِس کو تاپ نہ پائیں
کھائی مات پہ مات
ختم کہاں وہ بات (۱۹۴۲ء)

میری شاعری میری زندگی ہے۔ جو اس 'خود نوشت' میں نہیں ملے گا وہ در پردہ اس میں مِل جائے گا۔ اسی لیے میں نے اس کا جا بجا سہارا لیا ہے۔ میں اب بھونرے اور پھول کا ذکر کر رہا تھا، آنکھوں کی اُلجھی بولی کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، ہم دونوں کا پہلی بار تذکرہ زبان پر آنے لگا تھا، اور اس عزم کا اظہار کہ وقت ہمارے اپار پریم کو ناپ نہ پائے گا۔ شرح دل کے اس سے زیادہ اشارے اور کیا فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ یقیناً میں نے کہیں مات کھائی تھی۔

شعر کی یہ تنہائیاں صرف آموں کے باغوں یا کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر میسّر ہوتیں۔ میرا زیادہ وقت مردانے گھر کی بیٹھک میں گزرتا جہاں بڑے ماموں "ادّا میاں" کی مرکزی شخصیت کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم رہتا۔ سیاست پر گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ دوسری جنگِ عظیم کی خبروں پر تبصرہ ہوتا کسی شریکِ محفل کو ہدف بنا کر اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ اصل مسئلہ وقت کاٹنے کا تھا۔

میرے ماموؤں کے پاس تمام زمینداروں کی طرح وقت کی بہتات تھی اس لیے ہر قسم کے لوگ اپنی اپنی سہولت کے مطابق آتے اور ان کے اوقات کے کچھ حصے پر قابض ہو جاتے۔

جب ان نشستوں سے اکتا جاتا تو 'کوٹھی' کا رُخ کرتا۔ یہ ہمارے زنانے اور مردانے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر بوڑھے آبا (حاجی فضل امام خاں) کی بیٹھک تھی۔ یہیں سے وہ کپڑے کا کاروبار کرتے اور یہیں کاشتکاری کے آلات، بیل، بھینس اور گھوڑوں وغیرہ کے رہنے کا انتظام تھا۔ ان کے بعد سے اس کے کمرے اور ہال خالی پڑے رہتے تھے۔ چنانچہ

تعطیلات میں میں اپنا 'پھڑا' وہیں جمالیتا۔ یہیں میں نے ہندی اور سنسکرت کا درس لیا،
یہیں میری ورزش کا ساز و سامان مگدر وغیرہ رکھے رہتے اور یہیں میرا گوشۂ تنہائی تھا۔
۲۴ء کا بیشتر حصہ میں نے یہیں گزارا۔ یہیں سے صبح و شام ڈنڈا ہاتھ میں لے کر
کھیتوں اور باغوں کی جانب ٹہلنے نکل جاتا۔ تھوڑے فاصلے پر ریل کی پٹری تھی ٹہلنے کے لئے
یہ بہت اچھی جگہ تھی۔ میرے ساتھ اکثر منجھلے ماموں (جو بعد کو میرے خسر بنے) بھی ہوتے۔
ایک دن صبح کے وقت ہم لوگ ریل کی پٹری کے راستے پر ٹہلتے دور جا نکلے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا
"کیا تھک گئے ہو؟" میں نے کہا "آپ تھک گئے ہوں گے، میں تو نہیں تھکا ہوں"۔ بس پھر کیا
تھا ہم دونوں کی پٹھانی رگ چڑھ گئی۔ اب نہ وہ لوٹنے کا نام لیتے ہیں اور نہ میں۔ ایک دو تین
چار، پانچ میل بس چلتے ہی چلے گئے، حتیٰ کہ اگلے اسٹیشن رُودائن تک پہنچ گئے جو چھ میل کے
فاصلے پر تھا۔ اب دونوں کا برا حال تھا لیکن پٹھانی عندم عندا میں لوٹنے کا کوئی بھی نام نہیں لیتا تھا
رفتہ رفتہ جسمانی تھکن کے پردے میں عقل آنا شروع ہوئی اور دونوں ایک مقام سے پیچھے
کی طرف یک لخت لوٹ پڑے اس طرح کہ ع

نہ اُن کی جیت ہوئی اور نہ میری ہار ہوئی

قائم گنج کے ان دنوں کی یادوں کی سیر بین میں آج کئی کردار ابھرتے ہیں۔ ان
میں نور عالم خاں (چچا نوری) کی شخصیت سب سے دلچسپ تھی۔ وہ ہماری ننہال کے قرابت داروں
میں تھے، لیکن غریب تھے۔ انھیں شکایت تھی کہ حاجی فضل امام خاں نے اپنی ساری جائداد
اپنے بھتیجے جان عالم خاں دے دی اور اپنے بھانجے نور عالم خاں کو کچھ نہیں دیا ورنہ ان کی
حالت آج یہ نہ ہوتی۔ تاہم خون پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔ اس لیئے رشتہ توڑ بھی نہیں سکتے
تھے۔ اپنی ناداری اور احساس کمتری کو وہ ہیکڑی سے چھپاتے تھے۔ حلیہ کے اعتبار سے
پنڈاری معلوم ہوتے تھے یعنی داڑھی ٹھوڑی پر دو حصوں میں منقسم رکھتے۔ پڑھے لکھے
بہت کم تھے لیکن علم مجلسی رکھتے تھے۔ آمدنی کا ذریعہ بڑھانے کے سلسلے میں انھیں کسی پیشے
یا فن سے عار نہیں تھا جو ابھی کھیل لیتے تھے اور ایک بار کا داؤں تو تا کا میاب رہا کہ وہ

کی لڑکی تک کو جیت لائے۔ ہارنے والا بھی بستی کا پٹھان تھا اور جب اُن سے مسلسل ہارتا گیا تو بات کی پچ کے لیے آخری داؤں پر اپنی نوجوان بیٹی کو لگا دیا۔ نور عالم خاں یا تو قسمت کے دھنی تھے یا یہ اُن کے ہاتھ کی صفائی تھی یہ داؤں بھی جیت گئے۔ پٹھان کی بھوں پر میل تک نہیں آیا۔ لڑکی کو بُلایا اور اُن کے حوالے کیا۔ یہ جھٹ جا کر یکہ لائے، پردے کے لیے چادر باندھی اور سواری کو گھر لے آئے۔ فوراً ایک مُلاّ کا انتظام کیا گیا اور نکاح پڑھایا گیا۔ یہ سب ان کی پہلی بیوی کے سامنے ہوا جس نے نہایت صبر سے اِس تماشے کو دیکھا۔ ساری رسمیں پوری ہونے کے بعد شام کو انھوں نے میکے جانے کی اجازت لی اور پھر کبھی نہیں لوٹیں۔

نور عالم خاں نہ صرف ہیکڑی باز تھے، پرلے درجے کے مختار بھی تھے۔ جانوروں کی شناخت کا انھیں خاص ملکہ تھا۔ لوگ خوشامد کر کے انھیں میلوں اور ہاٹوں میں لے جاتے اور اُن کے مشورے سے جانور خریدتے۔ شام کو جب وہ ہمارے یہاں آکر بیٹھتے تو کہتے میں نے فلاں کو بھینس خرید وادی، فلاں کو گائے۔ اِس انداز میں گویا قیمت انھوں نے جیبِ خاص سے ادا کی ہو۔

ان کے بھائی دیدار عالم خاں گوشت کھانے کے بہت شوقین تھے۔ چوں کہ عام طور پر بکری کا گوشت فروخت کرنے والے 'چِک' ذات کے ہندو ہوتے، اِس لیے انھیں کسی مسلمان کی خدمات کی ضرورت ہوتی کہ ذبیحہ فراہم کر سکیں۔ دیدار عالم خاں کی خدمات اِس کے لیے موجود تھیں۔ صبح ہوئی اور ہاتھ میں لے کر چھری نکلے۔ اِس خدمت کے لیے شیکسپیر کے یہودی کی طرح وہ پاؤ بھر گوشت کے حقدار بن جاتے۔ خاں صاحب کو پاؤ بھر گوشت مل جائے تو کیا بات اور وہ بھی مفت۔

سیاسی اعتبار سے یہ بڑی ہل چل کا زمانہ تھا۔ مسلم لیگ کی سیاست شباب پر تھی ؎

مُسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

کا ترانہ ہر ایک کی زبان پر تھا۔ مجروح سلطان پوری قائم گنج آکر مہینوں ہمارے یہاں قیام کرتے اور نہایت خوش الحانی سے اپنی سیاسی غزلیں اہلِ قائم گنج کو سناتے۔

مسلمانو! نہ گھبراؤ خدا کی شان باقی ہے
ابھی اسلام زندہ ہے ابھی قرآن باقی ہے

مسلم لیگ کے مقامی شاعر حفیظ مجیبی صاحب تھے جو فرخ آباد سے ہفتہ وار مجیب نکالتے تھے۔ ان کا بڑے ماموں صاحب سے بڑا ربط ضبط تھا۔ پرانے خلافتی تھے، اب مسلم لیگ میں آ گئے تھے۔ ان کی بعض سیاسی نظمیں اور غزلیں محلّوں میں پٹھان بچّے گاتے پھرتے تھے۔ مسلم لیگ کا اس قدر دور دورہ تھا کہ اس کا اثر مسلمانوں کے کم پڑھے لکھے طبقات تک پھیل چکا تھا۔ جو لوگ اس منظر کو دیکھ چکے ہیں وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خیال سے کبھی متفق نہیں ہو سکتے کہ مسلم لیگ اس وقت صرف مسلم زمینداروں اور اعلیٰ طبقوں کا رچایا ہوا تماشا تھی۔ مسلمانوں میں ہر طرف بے اطمینانی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد یہ بے اطمینانی اور بڑھ گئی تھی۔ جاہل لوگ بھی ہندو مسلمان کی اصطلاحوں میں سوچنے لگے تھے۔ ہمارے محلّے میں مشرّف حسین خاں ٹیلر ماسٹر تھے جو اردو میں بس "شُدبُد" رکھتے تھے لیکن سیاسی ہنگاموں کی وجہ سے اردو کے ایک روزنامے کا مطالعہ اُن کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ ہجّے کر کے رُک رُک کر پڑھتے تھے، مگر پڑھتے تھے۔ ایک دن اردو کا اخبار ہاتھ میں لیے "کف در دہاں" ہمارے یہاں آئے اور کہنے لگے، "ادّا میاں (سلطان عالم خاں کے لیے) آپ کے ہوتے ہوئے یہ کیا غضب ہے کہ روز "ہندو کو ڈبل" ہے اور مسلمان کو کچھ نہیں۔ دیکھا تو "ہندو کوڈبل" کی سُرخی تھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا!

اس زمانے میں یعنی قائم گنج کے طویل قیام میں میں نے دو کام اور کر ڈالے۔ ایک طرف تو صحت بنانے کا پروگرام بنایا۔ ڈنڈ اور بیٹھک اور مگدر کا شوق اور دوسری طرف بجمہ کی وساطت سے دودھ ملائی، کا کثرت سے استعمال۔ مجھے وزن بڑھانے کا بڑا شوق تھا۔ اس لیے کہ میں کثرتِ غذا کے باوجود مسلسل کم وزن رہتا تھا۔ دبلا اس قدر تھا کہ پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ نرخرے کی ہڈی اس قدر نمایاں تھی کہ شیروانی کا ہک لگانا مشکل ہو جاتا۔ آج اس کے برعکس ہے یعنی قلّتِ غذا کے باوجود زیادہ وزن رکھتا ہوں۔ کوئی تدبیر

نہ اُس وقت کارگر ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ ہمارے خاندان میں تیس کے پیٹے میں جاکر خود بخود وزن بڑھنے لگتا ہے۔ جوانی بھری ہوئی نہیں ہوتی۔ ایک دوسرا کام یہ کیا کہ مقامی پاٹ شالہ کے ایک بنارسی پنڈت کو ہندی اور سنسکرت پڑھنے کے لیۓ بہت قلیل مشاہرے پر مقرر کر لیا۔ وہ اس کے لیۓ روز تین میل مسافت طے کر کے آتے اور اگر میں گھنٹہ بھر درس کا شغل رکھنا چاہتا تھا تو وہ جوشِ مُعلّمی میں دو گھنٹے پڑھا تے۔ ساتھ ساتھ ہر بیماری کے لیۓ ویدک کے نسخے بھی بتاتے جاتے۔ تلسی کا پودا اُن کے نزدیک ہر مرض کی دوا تھا۔ میں نے اسے نزلہ کھانسی کے لیۓ آزمایا، اور اُس کے بعد یہ گھر کے آنگن کی ہمیشہ زینت رہا۔

۱۹۴۲ء کا قیام قائم گنج جہاں میرے لیۓ اکتسابِ ہندی کے لیۓ یادگار رہا۔ اس زیادہ یادگار اس لیۓ بھی رہا کہ دودھ اور ملائی کے توسط سے میری رسائی رفتہ رفتہ اس شخصیت تک ہونے لگی جس کے مقدر میں میری رفیقۂ حیات بننا لکھا تھا۔ نجمہ میرے دوسرے اموں قدوس عالم خاں کی بڑی لڑکی تھی۔ اُن کی شادی، روایات کے برخلاف، آفریدی پٹھانوں سے باہر علی گڑھ کے شیروانی پٹھانوں میں ہوئی تھی۔ نجمہ کی والدہ رئیس دتاولی نواب یوسف خاں شیروانی کی صاحبزادی اور نواب فراہیم خاں صاحب رئیسِ بڈھانسی، کی چھوٹی بہن تھیں۔ ان کی شادی میں قائم گنج کے پٹھانوں نے بڑے بڑے لطیفے کیۓ تھے۔ ایک صاحب فیرنی کی بیس پچیس طشتریاں کھا گئے۔ دوسرے صاحب ہاتھ ٹیک ٹیک کر گوشت کی قامیں دوسرے مہمانوں کے سامنے سے اٹھا لیتے تھے۔ شادی کے بعد شیروانیوں میں ان ناگفتہ تراشوں کی بوالعجبیوں کا کافی دن تک چرچا رہا۔ بچاری دلہن نے جب قائم گنج کا ماحول دیکھا تو پہلے دن سے انھیں احساس ہو گیا کہ نبھانا پڑے گا۔ وہ ہم سب بچوں کو مسعود میاں، خورشید میاں کہہ کر مخاطب کرتیں جب کہ گھر والے مسعودا، خورشیدا، کے نام سے یاد کرتے دلچسپ تو میں نام الف زائدہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کے طریقے، آداب، مذہب کی جانب روّیہ غرض کہ ہر چیز اُس ماحول سے مختلف تھی، جس میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ لیکن شاباش ہے اس شیروانی بیٹی کو جس نے سب کچھ جھیلا اور اُف تک نہ کی اور اپنے شوہر اور بچوں کی جی جان

سے خدمت کرتی رہی۔ وہ سسی ناتیاں جب ساس (نانی صاحبہ) سے ٹکرا ئیں تو کم از کم دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ یہ بے چاری خاموشی کے ساتھ اوپر چھت پر چلی جاتیں جہاں انھوں نے اپنے لیے ایک کوٹھری اور سامنے کا برآمدہ مخصوص کر لیا تھا۔ نانی صاحبہ نے اسی لیے انھیں 'چھینکے کی ہنڈیا' کا لقب دیا تھا۔ مجھے وہ دُلھناپے سے پسند تھیں۔ اکثر ان کے گھونگھٹ میں اپنا منہ ڈال دیتا اور اُن کا 'مسعود میاں، مسعود میاں' کہتے منہ سوکھتا تھا۔ جوں جوں ان کی بڑی بیٹی نجمہ سیانی ہوتی گئی اُن کا دھیان میری طرف ہوتا گیا۔ میرے خیال میں ہماری شادی کا منصوبہ ان کے ذہن میں خود ہمارے فیصلوں سے بہت پہلے بن چکا تھا۔ یہ شاید جلد معرضِ وجود میں آجاتا کہ اچانک وہ دق کے موذی مرض شکار ہو گئیں جس کا سلسلہ ، سال تک چلتا رہا۔

پہلے تذکرہ کر چکا ہوں کہ ۱۹۴۱ء کی تعطیلات گرما میں مجھے پہلی بار نجمہ سے قربت کا احساس ہوا۔ کچھ تو اُس کا الھڑپن اور کچھ اس کی لڑکوں جیسی شرارتیں، جس پر اس کی والدہ خوب دُھنتیں تھیں، بھانے لگیں۔ وہ اس وقت ۱۱، ۱۲ برس کی ہوگی۔ معلوم نہیں کیوں اُسے میری خدمت کرنے میں لطف آتا تھا۔ کھانا کھلانا، دودھ مہیا کرنا اور خاص طور پر چھپا کر میرے لیے ملائی نکال لانا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے پیچھے کچھ جنسی جذبے کی کار فرمائی تھی۔ وہ اب تک اس کا اقرار نہیں کرتیں۔ میں اس سے عمر میں بہت بڑا تھا، یعنی ایم۔اے کر چکا تھا۔ میرے خیال میں میری اس کی قربت صرف مشترکہ خاندان کی یکجا رہائش کا نتیجہ تھی۔ میں اِس وقت اسے کسی جنسی نقطۂ نظر سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ بس 'اچھی لگنا' سے تعبیر کر سکتا ہوں۔ دوسری بہنوں کو بھی (بڑے ماموں کی لڑکی اختری اس سے بڑی تھی) یہ احساس ہونے لگا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں اور اسے میری خدمت میں لطف آتا ہے۔

ستمبر ۱۹۴۲ء کی ایک شام بہر حال جو مبہم تھا وہ واضح ہو گیا، جو سویا ہوا تھا وہ بیدار ہو گیا، جب نئے گھر کی چھت کے سائبان میں، میں لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے سرہانے سلمیٰ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ سلمیٰ کے جانے کے بعد اچانک میں نے پوچھا 'میرے ساتھ دہلی

چلوگی؟" اور اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا، "ہاں چلوگی"۔ میں نے دفعتاً اس کا سر
جھکایا اور ایک بوسہ لے لیا۔ مجھے آج تک اس بات پر حیرت ہے کہ اس کے جواب کی تہ میں کوئی
ایسا خیال نہیں تھا، اور میں بھی یہی سمجھتا ہوں، لیکن اپنی اس حرکت پر میرے بدن میں کرنٹ
سا دوڑ گیا اور مجھے صحیح معنوں میں پہلی بار احساس ہوا کہ میں بچہ کے بہت قریب آگیا ہوں۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد مجھے آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے انٹرویو کارڈ ملا، جہاں میں نے
پروگرام اسسٹنٹ کی جگہ کے لیے کئی مہینے پہلے درخواست دے رکھی تھی۔ انٹرویو کمیٹی کے صدر
ڈائریکٹر جنرل پطرس بخاری تھے اور اس کے ایک رکن ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے، جس کا علم
مجھے پہلے سے نہیں تھا۔ اس بار میں نے اپنے دوست حبیب اللہ خاں کے یہاں قیام کیا۔ کچھ
اس مصلحت سے کہ میں اب تک اچکن دھاری تھا اور چاہتا تھا انٹرویو میں سوٹ پہن کر جاؤں۔
حبیب اللہ نے مجھے ایک اچھا سوٹ مستعار دیا اور جب پہن کر چلا تو کہنے لگے اس سوٹ میں تمہارا
کون انتخاب نہیں کرے گا۔ انٹرویو آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے دفتر میں تھا جو اس وقت علی پور
روڈ پر تھا۔ جب میں انٹرویو کے لیے کمرے میں داخل ہوا تو ذاکر میاں مجھے سوٹ میں ملبوس دیکھ
کر مسکرائے۔ (انھوں نے مجھے اس حلیے میں کبھی نہیں دیکھا تھا) اور بخاری صاحب سے کہا
"یہ میرے عزیز ہیں لیکن میں انھیں اس لباس میں نہیں پہچانتا" اس کے بعد بیشتر سوالات
بخاری صاحب ہی نے کیے۔ انھیں یہ جان کر تعجب ہوا کہ علی گڑھ کا تعلیم یافتہ اور بہت اچھی ہندی
جانتا ہے۔ اس کے بعد تیسرے صاحب سے کہا کہ ذرا ان کی ہندی کی خبر لیجیے۔ انھوں نے چند باتیں پوچھیں
اور مطمئن ہو گئے۔ میں نے ہندی پنڈت رام سروپ شاستری اور بنارس کے ایک پنڈت سے
پڑھی تھی، اس لیے وہ میرے "شدھ" تلفظ سے زیادہ متاثر ہوئے۔

دوسرے ہی روز، ذاکر میاں سے ملے بغیر میں قائم گنج واپس چلا گیا۔ مہینہ بھر کے اندر اطلاع
ملی کہ میرا انتخاب بحیثیت پروگرام اسسٹنٹ ہو گیا ہے اور میری ملازمت کا آغاز دہلی اسٹیشن
سے ہو گا۔ میری خواہش بھی یہی تھی۔ تیار بیٹھا تھا، فوراً دہلی کے لیے روانہ ہو گیا اور وہاں کے
اسٹیشن ڈائرکٹر اڈوانی صاحب کو اپنی آمد کی رپورٹ دی۔ مجھے ہندوستانی ٹاکس

سیکشن میں لگایا گیا جس کے پروگرام ایگزیکٹو ن۔م۔راشد تھے۔ ان کی ماورا ایک سال
قبل شائع ہو چکی تھی اور ادبی حلقوں میں اس کا خاصا چرچا تھا۔ میں نے راشد کی 'ماورا' کا
مطالعہ بالاستعاب کیا تھا اور اس سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ جنسیت کے حاوی رجحان کے
باوجود یہ اپنی ہیئت، اسلوب اور اظہار کے لحاظ سے مجھے کرشن چندر کے الفاظ میں "ایک نئے
تجرباتی دور کی تمہید" معلوم ہوئی۔ چنانچہ میں راشد کا نام سن کر بڑی عقیدت کے ساتھ
اپنے پروگرام ایگزیکٹو کے کمرے میں داخل ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں اقبال کو روبرو دیکھ کر پہلا دھچکا لگا
تھا؛ راشد کے غیر شاعرانہ حلیہ پر نظر پڑی تو دوسرا دھچکا لگا۔ میں یقین تک نہیں کر سکا کہ 'ماورا'
کا خالق اس افسرانہ شان کا مالک ہو سکتا ہے۔ بات چیت کا انداز بھی غیر شاعرانہ تھا۔ چنانچہ
میں راشد شاعر کو بالکل بھول گیا اور اب افسر راشد کے ساتھ دن کٹنے لگے۔

مجھے پہلی بار اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ یوپی اور دہلی کا آدمی اپنے پنجابی واقف کاروں
سے کیوں تال میل نہیں رکھتا۔ اور وہ ہم لوگوں کو کیوں لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ راوی اور گنگا کا سنگم
کیوں کر ممکن ہے؟ میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا محمود بیگ صاحب
کی عنایت سے ہو گیا۔ میرے قیام کا انتظام اینگلو عربک کالج کے ہاسٹل کے ایک کمرے میں مرزا
محمود بیگ صاحب کی عنایت سے ہو گیا۔ کمرہ کیا تھا غازی الدین حیدر کے مدرسے کا ایک حجرہ تھا۔
پاس کے حجرے میں میرے علی گڑھ کے دوست ڈاکٹر خورشید فاروقی، استاد عربی رہتے تھے۔ قائم گنج
سے میں گھر کی ملازمہ آشرا کی ماں کے چھوٹے بیٹے سیدّا (مقصود علی) کو ساتھ لے گیا۔ بڑا کارگزار آدمی
تھا مگر کھانا حسبِ منشا پکاتا تھا۔ البتہ کھلانے سے زیادہ خود کھانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

چوں کہ علی پور کا ریڈیو اسٹیشن اجمیری دروازے سے خاصے فاصلے پر تھا، اس لیے
میں قرب و جوار میں کسی مناسب جگہ کی تلاش میں رہا۔ دہلی یونیورسٹی کے کوارٹرز میں اینگلو عربک
کالج کے انگریزی کے ایک استاد عباسی صاحب تنہا رہتے تھے۔ انھوں نے جب میری حاجت
کا تذکرہ سنا، فوراً حاجت روا بن کر اپنے ساتھ رہنے کی پیش کش کی۔ عام طور پر کوئی پیشکش
بہت آسانی سے مل جائے تو میں اسے مشتبہ سمجھتا ہوں، لیکن اس وقت نہ سمجھ سکا کہ یہ بھی
ان کے لکھنوی تکلفات کا ایک انداز تھا اور سادہ لوحی میں سیدا کے ساتھ اپنا مختصر سا

سباب باندھ کر ایک اتوار کو اُن کے یہاں پہنچ گیا۔ اس وقت وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے۔
روغ گورا، بہانہ بسیار، کسی بھی طرح مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار آمادہ نظر نہیں آئے، لیکن اتنا
باکر پروس کے ایک کوارٹر جس پر ایک سردار جی نے قبضہ کر رکھا تھا اور وہ بھی تنہا تھے، مجھے
ن کے سر تھوپ دیا۔ سردار جی دہلی یونیورسٹی میں ریسرچ کے طالب علم تھے۔ دن بھر غائب رہتے
ور رات کو نمودار ہو جاتے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ ہم کوارٹر کے صحن میں سوتے تھے۔ مجھے یہ بعد کو
معلوم ہوا کہ سردار جی از روئے احتیاط رات کو تالا لگا دیتے تھے۔ میں نے اس کی ضرورت
نہیں سمجھی اس لیے کہ اپنے کمرے کے سامنے میری چارپائی ہوتی تھی۔ باہر کے برآمدے میں میرا ملازم
سوتا تھا۔ دو تین راتیں خیریت سے گزریں۔ ایک صبح جب اٹھا تو دیکھا کمرے کا دروازہ کھلا پڑا ہے
اندر گیا تو صفاً صفاً یعنی میری تمام املاکِ منقولہ، سوٹ کیس، کپڑے۔ گھڑی، جوتے کوئی شب
زندہ دار اٹھا کرلے گیا ہے۔ صرف سائیکل رہ گئی تھی، اسی پر سوار ریڈیو اسٹیشن کے دفتر بھاگا۔
ساتھیوں کی ہمدردی سے ادر خفت ہوتی تھی، اس لیے کہ زبانی خرچ تھا۔ البتہ ن۔م۔ راشد
نے مجھے مالی امداد کی پیش کش کی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ اس آفیسر ٹائپ شاعر کے سینے
میں دل بھی ہے۔ لیکن میں نے ان کی یہ پیش کش قبول نہیں کی اس لیے کہ میرے ملازم کے پاس
اس قدر روپے تھے کہ میں قائم گنج پہنچ سکوں۔ صرف چند روز کی چھٹی کی درخواست کی، جو فوراً مل
گئی۔ سیدھا قائم گنج پہنچا اور ارجنٹ آرڈر پر کپڑے سلوائے۔ چند روز جو وہاں گذرے وہ
خفت در خفت گذرے۔ میری ذہانت کی ساکھ اس وقت بالکل ختم ہو گئی جب بچہ نے بھی
میری ہنسی اڑائی ؎

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ ونام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

وہاں سے واپس آکر میں نے پھر اینگلو عربک کالج کی جانب مراجعت
کی جہاں میرا حجرہ ابھی تک خالی تھا۔
اسی زمانے میں ہم لوگوں کو حکم ملا کہ ریڈیو اسٹیشن علی پور روڈ سے نئی عمارت پارلیمنٹ
اسٹریٹ (موجودہ سنسد روڈ) میں منتقل کیا جائے گا۔ اس طرح کہ براڈکاسٹ میں

کوئی خلل نہیں پڑے۔ اس میں کئی روز لگ گئے۔ بالآخر نئی عمارت میں آکر میں نے ہندوستانی
ٹاکس انچارج کی حیثیت سے کام شروع کیا، یعنی اُردو، ہندی دونوں زبانوں کی ٹاکس کا پروگرام
بنانا اور پھر اُن کے لیے مناسب ٹاکرز کو بک کرنا میری ذمہ داری ہوگئی۔ اسی زمانے میں
میں نے نگیندر رنگاناتھ کو جو کامرس کالج میں ہندی کے لکچرر تھے ریڈیو سے متعارف کرایا۔ اُردو میں
مرزا محمود بیگ نے تو اپنی پہلی تقریر میرے ہی کہنے پر نشر کی۔ بعد کو وہ دہلی اسٹیشن کے بہترین
ادیبوں میں نشر کرنے والے قرار پائے۔ سنا ہے ان کی منتخب ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ حال میں
شائع ہونے والا ہے۔ ان کے علاوہ علی گڑھ سے بہت سے حضرات کو کھینچ کر ریڈیو کی دُنیا میں
لایا۔ اس زمانے میں بخاری صاحب اس بات کے لیے کوشاں رہتے کہ پروگرام اسسٹنٹ کو
میز ہی تک اپنی کارروائی محدود نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ 'میدان' میں جاکر نئے نئے خیالات اور
نئے نئے براڈکاسٹ کرنے والوں کو تلاش کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس سلسلے میں میرا اکثر علی گڑھ اور
آگرے جانا ہوتا تھا۔ میرے بعد اعجاز حسین بٹالوی چارہ اور چارہ گر کی تلاش میں اکثر علی گڑھ
آتے اور میرے ساتھ امین ہاسٹل میں قیام کرتے۔ وہ بڑی دلچسپ باتیں کرتے تھے۔ خالص لاہور
کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اس لیے علی گڑھ کے نستعلیق اور 'بریک بولی' بولنے والے حضرات
ان کی سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ اس کے بعد ان سے سابقہ لندن میں پڑا جس کی تفصیل "دیارِ فرنگ"
والے باب میں آئے گی۔

ریڈیو اسٹیشن ہی پر میں نے پہلی بار میراجی کو دیکھا۔ وہ اس وقت ریڈیو آرٹسٹ
کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میلی سی پتلون کے اوپر شیروانی پہنے اور کتابوں یا مسودات
کے بنڈل ہاتھ میں لیے پاس والے کمرے میں آکر بیٹھ جاتے۔ ان سے شیروانی کے اشتراک باوجود
دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے۔ البتہ ایک صاحب نے مجھے اُن کی اس پیشین گوئی سے
آگاہ ضرور کیا کہ "مسعود، بے چارہ شریف آدمی ہے، ریڈیو اسٹیشن کی گوں کا نہیں"۔ لیکن اسسٹنٹ
ڈائرکٹر فرید میرے کام سے بہت مطمئن تھے۔ شام کو ہفتے میں دو بار پروگرام اسٹیشنوں کی
ٹرانسمیشن پر بھی ڈیوٹی لگتی۔ ایسے میں اگر کسی مقتدر شخصیت کا براڈکاسٹ ہوتا تو پطرس بخاری
بہ نفس نفیس اچانک نمودار ہو جاتے۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ انھوں نے بھی ایک جگہ میری

ف کرنے کے بعد یہ الفاظ کہے تھے کہ میں "ریڈیو ٹائپ" نہیں لگتا۔ ان کا یہ کہنا صحیح تھا،
ں لیے کہ ملی گڑھ کا تعلیم یافتہ پاجامہ اور شیروانی پہنے لاہور کے کالجوں کے سوٹ بوٹ
نے والے بجیلے نوجوانوں سے بالکل مختلف ہوتا تھا، اور بخاری انہیں بجیلوں کو پسند
تے تھے۔

ابھی میری ریڈیو کی ملازمت کو چھ مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ دوسروں کی طرح
ے بھی محسوس ہونے لگا کہ غلط جگہ آ پھنسا ہوں۔ کچھ روز غلطاں و پیچاں رہا، نکلوں تو
اں نکلوں۔ ایک روز اچانک استعفا لے کر اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مزید
گشت بدعماں تھے۔ ڈرامہ سیکشن کے انچارج ناصری (دہلوی)، میرا جی کی پیشین گوئی کا
کر کرتے ہوئے پائے گئے۔ گرجا کمار ماتھر جو اس وقت محض ریڈیو آرٹسٹ تھے یہ سن
ر میرے پاس آئے اور سمجھانے لگے کہ ایسی اچھی سرکاری ملازمتیں کہاں ملتی ہیں۔ وہ خود اس
زمانے میں اس کے لیے کوشاں تھے۔ شام کو اپنے گھر لے گئے، بیوی سے ملایا اور کہا دیکھو دنیا میں
ان جیسے مہاتما لوگ بھی موجود ہیں۔

لیکن میں اپنی کشتیاں جلا کر سوئے منزل رواں تھا۔

ساتواں باب

علی گڑھ (۲)

(۴۳ تا ۵۰)

ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے سیدھا علی گڑھ پہنچا اور درِ پیرِ مغاں کو پھر کھٹکھٹایا۔ رشید صاحب کو میری اس ملازمت کو چھوڑنے پر سخت تعجب ہوا۔ کہنے لگے یہ آپ کو کیا سوجھی کہ اچھی بھلی سرکاری ملازمت یک لخت چھوڑ دی۔ یہاں علی گڑھ میں کیا رکھا ہے ہو سکا تو بس یہی پچاس ساٹھ روپے کا ریسرچ کا وظیفہ میں نے کہا رشید صاحب! بس اب تو یہی ٹھانی ہے۔ کہنے لگے اچھا تو آئیے یوں بھی زندگانی کر دیکھئے۔ غالب کا شعر مکمل ہونے کے بعد میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس بار آفتاب ہاسٹل کے بجائے عثمانیہ میں داخلہ لیا تاکہ شعبۂ اردو اور لٹن لائبریری سے زیادہ قریب رہ سکوں۔ تحقیق کا عمومی میدان "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا" رہا۔ سرور صاحب میرے کام کے نگراں مقرر ہوئے۔ لیکن چوں کہ خود ان کے مطالعہ کا میدان یہ نہیں رہا تھا اس لیے کام کو سرانجام دینے کی تمام تر ذمہ داری خود میرے سر آن پڑی۔

اسی سال یہ خوش آیند بات ہوئی کہ نومبر ۴۳ء میں جونیئر لیکچرر کے طور پر میری عارضی تقرری شعبۂ اردو میں ہو گئی اور ساتھ ہی رشید صاحب کی سفارش پر مجھے نوساختہ "امین ہاسٹل" کا ریزیڈنٹ وارڈن بنا دیا گیا۔ اس طرح میری رہائش کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس ہاسٹل کو کلکتے کے ایک تاجر امین صاحب کے عطیے سے دورانِ جنگ

وار ٹیکنیشین ہاسٹل کے طور پر ڈاکٹر سر ضیاء الدّین نے بہ عجلت تمام بنوایا تھا۔ اس وقت یہ یونیورسٹی کا سب سے گھٹیا ہاسٹل سمجھا جاتا تھا، جہاں کم مالی استطاعت رکھنے والے طلبا یا دیگر اقامت گاہوں کے "سزا یافتہ" رہتے تھے۔ اس کے دروازے کچی شیشم کے تختوں سے بنائے گئے تھے جن میں سر کنڈوں کے بجائے لوہے کی موٹی موٹی کنڈیاں لگی ہوئی تھیں، یہ دروازے کچّی لکڑی کے ہونے کی وجہ سے برسات کے موسم میں اکثر جلتے اس طرح کہ ان کی کنڈیاں لگانا دشوار ہو جاتا۔ ہر دوسرے تیسرے روز میرے پاس شکایت آتی کہ آج فلاں کمرے کا دروازہ اکڑ گیا، فوری کمک کی ضرورت ہے! چوں کہ جنگ کا زمانہ تھا، اس لیے اشیائے خوردنی اور کپڑا کنٹرول راشن سے ملتا تھا۔ اوپر سے حکم تھا کہ طلبہ کو ۲/۳ گیہوں میں ۱/۳ جَو کا آٹا ملا کر روٹی دی جائے۔ اہلِ مطبخ کے تصرّف سے دونوں کا تناسب بدل جاتا اور چپاتیاں کچّی اور کالی اُترتیں۔ طلبہ میں اس صورتِ حال پر بے چینی پیدا ہو گئی۔ جب معاملہ قابو سے باہر ہونے لگا تو میں نے اوپر اطلاع بھیجی۔ ڈاکٹر ضیاء الدّین کے سکریٹری کا پیغام ملا کہ وائس چانسلر بہ نفسِ نفیس آئیں گے اور طلبہ سے خطاب کریں گے۔ سب لوگ ڈائننگ ہال میں جمع ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب تشریف لائے۔ دورانِ گفتگو وہ مجھے مسلسل وارڈن ٹیکنیشین وارڈن کہتے رہے۔ طالب علم مسکرا رہے تھے اور میں انگشت بدنداں تھا۔ میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب انھوں نے طلبہ سے کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو تو گیہوں کی روٹی دینے کا حکم دیا تھا، پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ طلبہ نے انھیں عقیدت اور مجھے غیض کی نظروں سے دیکھا۔ تالیاں بجیں اور میری نگاہیں جھک گئیں۔ خیر جیسے تیسے جلسہ ختم ہوا۔ میں وائس چانسلر صاحب کو ان کی موٹر تک چھوڑنے گیا۔ جب انھوں نے موٹر میں قدم رکھا تو میں نے ہمت کر کے کہا "ڈاکٹر صاحب آپ نے لڑکوں سے جو گیہوں کی روٹی کا وعدہ کیا ہے تو پھر اس کا انتظام بھی کیجیے۔" کہنے لگے "میں نے طلبہ ہی سے تو کہا ہے آپ سے تو کچھ نہیں کہا، آپ حالات کے پیشِ نظر جو کر رہے ہیں کیے جائیے۔" واہ! واہ!! ڈاکٹر سر ضیاء الدّین احمد زندہ باد۔ ع

مشکل کہیں جسے اُسے آساں بنا دیا

اس ہاسٹل کے دائیں بازو کے کونے والے تین کمروں میں اپنی "پیٹر" جلائیے

بعد میں مجھے اپنی ریسرچ کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ملا۔ میرا ذاتی ملازم سبحان کونلے کی انگیٹھی
پر بہت اچھا کھانا پکا دیتا۔ رہائش اور خدمات کی دیگر تمام سہولتیں ہاسٹل کے وارڈن کی
حیثیت سے حاصل تھیں۔ تکلیف تھی تو صرف بجلی کے نہ ہونے کی جس کا احساس گرمی کے موسم
زیادہ شدید ہو جاتا۔ اس ہاسٹل میں دیگر اقامت گاہوں کی طرح الجھنیں بہت کم تھیں۔ چونکہ
پسماندہ قسم کے طلبہ سے سابقہ تھا وہ وارڈن صاحب کے سامنے آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بدنام
قسم کے طلبہ وہ تھے جنھیں ہاسٹلوں سے کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں لازمی منتقلی کے ذریعہ
یہاں بھیجا گیا تھا۔ ان میں دکالے پانی کے قیدیوں کی طرح سنجیدگی اور وقار آ جاتا تھا۔ خوب
جانتے تھے کہ یہاں کے بعد کہیں اور جانے کا ٹھکانا نہیں۔ البتہ ایک واقعہ میں کبھی نہیں بھول
سکتا جو پروفیسر شبیر احمد خاں (سابق صدر شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے تعلق رکھتا
ہے۔ اس وقت وہ بی۔ اے۔ کے طالب علم تھے۔ ایک روز برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گرانڈیل
قسم کے طالب علم نے علی گڑھ کی روایت کے مطابق زور سے السلام علیکم کہہ کر میرے ہاتھ
میں پرووسٹ کے دفتر سے نکلا ہوا حکم نامہ لا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ موصوف کو مارلیسن کورٹ سے
اپنے ہم کمرہ سے مارپیٹ کرنے کی پاداش میں امین ہوسٹل کو در بدر کیا گیا ہے۔ میں نے
پرچہ پڑھا اور زہر خند کے ساتھ کہا "شبیر خاں صاحب! اگر آپ سے یہاں بھی اس قسم کی حرکت
سرزد ہوئی تو پھر کہاں جائیے گا؟" کہنے لگے "وارڈن صاحب! میں یقین دلاتا ہوں اب
اس قسم کی حرکت پھر کبھی نہیں کروں گا، وہ تو غصے میں کر بیٹھا تھا۔" میں نے انھیں ایک
شاہجہان پور کے نجیب الطرفین پٹھان (شبیر خاں دیسی پٹھان تھے) کے ساتھ رکھ دیا۔
کچھ دن تو اچھے گذرے۔ اس کے بعد خبر ملی کہ یہاں بھی ان کا اپنے ہم کمرہ کے ساتھ اختلاف
رائے ہو گیا۔ بلائے گئے۔ ان کے لبوں پر شکایت تھی لیکن شرمندہ تھے۔ دراصل شبیر خاں
صاحب فرسٹ کلاس طالب علم تھے، مہذب بھی۔ لیکن مغلوب الغضب تھے۔ اس لیے غصے پر
بھوت بن جاتے۔ میرے سامنے پھر قول و قرار ہوا۔ اس کے بعد وہ ڈیڑھ دو سال امین ہاسٹل
میں رہے لیکن مجھے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔

یہ دور میری شدید ذہنی کاوش کا زمانہ تھا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے میں اپنی

ریسرچ کے لیے "اردو زبان کی ابتدا اور ارتقاء" کا موضوع منتخب کیا تھا۔ میرے سامنے سُنیتی کمار چٹرجی کی "بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا" پروفیسر ژول بلاک کی "مراٹھی زبان"، بابورام سکسینہ کی 'اودھی کی ابتدا اور ارتقا' اور دھیریندر ورما کی "ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس" جیسے کئی نمونے موجود تھے۔ ایک طرح سے میرا میدان تاریخی لسانیات کا تھا۔ توضیحی لسانیات کا ہندوستان میں چلن بہت بعد کو ۱۹۵۵ء کے قریب ہوا ہے۔ یہاں میری ہندی دانی اور سنسکرت کی 'شُدبُد' کام آئی۔ گریرسن کی لنگوئسٹک سروے آف انڈیا مسلسل زیرِ مطالعہ رہتی۔ اردو کے سلسلے میں مجھے سب سے زیادہ مخالفین کی یہ بات کھلتی تھی کہ وہ اُسے بدیسی زبان سمجھتے تھے۔ جس زمانے میں اس کی ابتدا اور ارتقاء پر تحقیق کر رہا تھا یعنی سنہ ۴۲ء، ۴۴ء میں، اس وقت مسلم لیگ کی تحریک شباب پر تھی اور اسی کے ساتھ مسلمانوں اور اردو سے نفرت بھی۔ ایسے میں میں نے اُردو کی جڑوں کو دُور ہند آریائی میں مضبوط کیا۔ مسلمانوں کے داخلۂ دہلی سے قبل اس کی تاریخ کے سلسلے میں اس تمام مواد کو سمیٹا جو ہندی اور اس کا مشترک تھا۔ اس طرح اس کی جڑیں ویدک زمانے تک چلی گئیں۔ یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ دوسری ہند آریائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ترقی یافتہ ہے اس لیے کہ اس نے اپنا سروکار صرف 'پراکرت' سے رکھا ہے اور اسی نسبت سے سنسکرت سے اجتناب کیا ہے جس کی اہمیت ۱۹۴۷ء میں ولیم جونز کی دریافت کے بعد تاریخی لسانی حلقوں میں بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میری تحقیقی تصنیف "مقدمۂ تاریخ زبانِ اردو" کی پہلی اشاعتوں میں اس پہلو پر اس قدر زور دیا ہے کہ خود زبانِ اردو کے ارتقا کے لیے بہت کم صفحات دیئے گئے۔ اس کا ازالہ میں نے ۱۹۸۰ء کے ایڈیشن میں کیا ہے جس میں ہند آریائی کا حصہ کم کر کے اردو کی تاریخ کے حصے میں معتدبہ اضافہ کیا گیا ہے۔

میں دو برس تک اپنے مقالے کے سلسلے میں غلطاں و پیچاں اور سرگرداں رہا۔ خود ہی کوزہ و کوزہ گر۔ دن رات پڑھتا تھا، ضرورت سے زیادہ نوٹس لے لیتا تھا۔ نہ ریسرچ کے طریقۂ کار سے واقف تھا اور نہ مقالہ نویسی کے آداب سے۔ ان باتوں کی اس زمانے میں السنہ کے شعبوں میں کوئی تربیت نہیں دی جاتی تھی۔ میرے نگراں، آلِ احمد سرور صاحب، جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں اس میدان کے واقف کار نہیں تھے۔ البتہ انھوں نے یہ میری مدد ضرور کی کہ

جب انجمن یونیورسٹی اور ناگری پرچارنی سبھا کے دفاتر سے استفادہ کرنے کے لیے میں نے بنارس کا سفر
کیا تو انھوں نے اپنے خسر صاحب کو تعارفی خط لکھ دیا۔ وہ اس زمانے میں وہاں سٹی مجسٹریٹ
تھے۔ انھوں نے مجھے بڑی محبت کے ساتھ اپنے یہاں قیام کی دعوت دی اور مذکورہ بالا دونوں اداروں
تک پہنچنے میں میری مدد کی۔

شب و روز کی محنت سے میں نے دو سال کی مدتِ مقررہ میں اپنا مقالہ تیار کر کے پی ایچ ڈی
کی ڈگری کے لیے ۱۹۴۵ء میں داخل کر دیا۔ اسی سال مجھے ڈگری بھی مل گئی۔ یہ مسلم یونیورسٹی کے ریکارڈ
پر ہے کہ آج تک کسی طالب علم نے اس قدر مختصر مدت میں اپنے پی ایچ۔ ڈی کے کام سے فراغت حاصل
نہیں کی ہے۔ میرے مقالے کے ممتحن سید سلیمان ندوی صاحب اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور تھے۔
دونوں نے مقالے پر اس قدر اچھی رپورٹیں دیں کہ مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے مبارکباد کا
ایک خصوصی ریزولیوشن پاس کیا۔ یہ شرف بھی غالباً میرے سوا آج تک کسی اور کو
حاصل نہیں ہوا ہے۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس 'کارے کردم' کے بعد بھی 'شادم' نہیں تھا۔ میری
بے اطمینانی کی وجہ اس میں اردو کے ارتقاء کے سلسلے میں ناواجب اختصار تھا۔ ہر نئے ایڈیشن
کے وقت میں اس کمی کو پورا کرنے کا ارادہ کرتا تھا اور اس کے بعد رہ جاتا تھا۔ یہ توفیق جا کر مجھے
۱۹۷۸ء میں ۲۸ سال کے بعد ہوئی۔ اس قدر طویل وقفہ ایک طرح سے اس کے لیے اچھا ہی
رہا۔ اس لیے کہ اپنے حیدرآباد کے دورانِ قیام (۶۲ تا ۶۸ء) مجھے دکنی اردو کے ذخائر کو بالاستیعاب
دیکھنے کا موقع ملا اور قدیم اردو کی وسعت اور عہد بعہد ارتقا کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ مجھے علمی شہرت
زیادہ تر اسی تصنیف سے ملی ہے۔ یہ اب برصغیر ہند و پاکستان میں ایم اے کے نصاب اور حوالے کی
ایک مستند کتاب بن چکی ہے۔ حال میں ایک کم سواد نے اس کی تنقیص کو اپنی شہرت کا ذریعہ
بنانے کی کوشش کی ہے۔ لہ:

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدہر بماند

آپ سوچتے ہوں گے کہ اس علمی ریاضت کی شدت اور رفتار کو قابو میں رکھنے کے
لیے میں نے کیا ذرائع اختیار کیے ہوں گے۔ لیجیے سنیے۔ میں ہر کام کرنے کی مکمل منصوبہ بندی

کو میں شام کی طویل ٹہل سے دور کیا کرتا تھا اور ذہنی تھکن کو شعر و شاعری کے مشغلے سے۔ میری شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز اسی زمانے میں ہوا اور چوں کہ ہندی میں کتب بینی کافی کرنی پڑتی تھی، اس لیے ہلکے پھلکے مطالعے کیلئے میں نے ٹیگور کی گیتا جلی کا پہلے ترجمے اور بعد کو اصل بنگالی میں مطالعہ کیا۔ ہندی کی چھایاوادی کویوں جے شنکر پرشاد، سُمترا نندن پنت، نرالا، مہادیوی ورما کے انتخابات بھی پیشِ نظر رہتے۔ اچانک ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں شاعر بن گیا ہوں۔ شعر پہلے پہل گیت بن کر پھوٹے۔ شعر کے لیے جذباتی سوتے میرے یہاں پہلے سے موجود تھے، یعنی ۲۵، ۲۶ برس کی عمر اور تنہائی۔ علی گڑھ کی بیہڑ فضا میں نہ تسکین کا سامان اور نہ ذوقِ نظر کا۔ عصمت چغتائی نے اس مجبوری کو اپنی ناول 'ٹیڑھی لکیر' میں علی گڑھ کے طالب علموں کو یونیفارم — سیاہ شیروانی اور سفید پاجامہ — کے حوالے سے 'کوڑیالا' کہا ہے۔ یہاں کے طالب علموں کا لحاظ رکھیے کہ انھوں نے سیاہ برقعوں میں ملبوس طالبات کو کبھی بھی 'کالی ناگن' نہ سمجھا نہ نام دیا بلکہ اسے اپنے رومان کے لئے ہمیشہ ایک 'عجائب اکبر' کہا۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ اسی زمانے میں میں نے ایک سیاہ برقعہ والی کی پرچھائیں بن کر اس کا فاصلے سے کئی برس تعاقب کیا ہے۔ مجھے اس کی شکل کی رتی تک نہیں دکھائی، ایک متشرع خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بشیتر ہاتھ بھی زیر نقاب رہتے، اور مورنی کے حسن کا اندازہ اس کے پاؤں سے کس طرح کیا جا سکتا ہے!

وہ فلسفے کی طالب علم تھی، جس کی چوٹی پر چڑھنے میں ناکام رہا تھا۔ اس لیے اور پُراسرار معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ذہانت اور فلسفہ دانی کا شعبۂ فلسفہ میں شہرہ تھا جو اس زمانہ میں شعبۂ اردو سے ملحق تھا۔ تابِ گویائی نہ پا کر میں نے نہایت 'باادب ہوشیار' قسم کے اسے چند رقعے لکھے اس نے وہ پرنسپل ویمنس کالج کو بڑھا دیئے وہاں سے پراکٹوریل ڈپارٹمنٹ بھیج دیئے گئے۔ وہ تو خدا بھلا کرے میرے ریزیڈنٹ وارڈن مرحوم مختار صاحب کا، جو اسسٹنٹ پراکٹر بھی تھے! انھوں نے نہایت نیک نیتی سے یہ دعویٰ کر رہے تھے مسعود جیسا شریف لڑکا ذکاوت؟ انھیں محبت میں شرافت کی مجبوریوں کا علم ہوتا، لکھ ہی نہیں سکتا۔ تحقیق کی غرض سے اپنی تحویل میں لے لیے اور چوں کہ میرے ہی کمرے کے پاس میرے ہمراز آغا افتخار حسین کا کمرہ تھا (جو فلسفے کے طالب علم تھے اور اس برقع پوش کے کلاس فیلو) سمجھے ہو نہ ہو یہ آغا کی شرارت ہے۔ آغا کو

طلب کیا گیا، مختار مرحوم اپنے ڈیل ڈول سے تھانے دار معلوم ہوتے تھے۔ ایک ڈپٹ جو انھوں نے لگائی آغا اقبال مجرم بن گئے۔ ان کو تنبیہ کر دی گئی۔ مجھے ہمیشہ تعجب رہا کہ آغا نے میری تحریر کو اپنی تحریر کیوں کر مان لیا! مختار مرحوم ریٹائرڈ ہونے کے بعد جب بھی ملتے آغا کا ذکر کر کے انھیں برا بھلا کہتے اس طرح میری شرافت کا بھرم ان کے مرتے وقت تک قائم رہا۔ کاش آج وہ زندہ ہوتے اور میرا اقبالِ جرم کی یہ تحریر پڑھ سکتے۔

جب دال نہ گلی تو میں نے قدم روک لیے اور پھر گھر کے نہال کا خیال کرنے لگا۔ اور تحقیق کی رفتار تیز تر کر دی۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے گئے۔ فروری ۱۹۴۰ء میں میری شادی بنت عم بخمہ سے ہو گئی۔ میں انجینئرنگ کالج کوارٹر نمبر ۸ میں مقیم تھا کہ ایک روز ایک صوفی صورت خرقہ پوش نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا وانھوں نے اپنا نام بتایا۔ نام سے فوراً پہچان گیا کہ اسی برقعہ پوش کے والد بزرگوار ہیں۔ ان کی صوفیانہ طرز زندگی کے قصے سُن چکا تھا۔ بہت شفقت سے ملے۔ اندر سے میرے بچے کے رونے کی آواز آئی۔ کان کھڑے کیے اور پوچھا ما شاء اللہ آپ بال بچوں والے ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں "پچھلے سال میری شادی ہو گئی ہے" کہنے لگے میری لڑکی جو کرامت حسین گرلز کالج میں لیکچرر ہے اس کو آپ کے نام کی رٹ ہو گئی ہے۔ کچھ بیمار سی رہنے لگی ہے اور جب دورہ پڑتا ہے تو چیختی ہے مسعود! مسعود! میں جواب دیتا ہوں مردود! مردود! لیکن اب کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں نے ان کا جملہ دہرایا "جی ہاں اب کوئی چارۂ کار نہیں" اشارہ کیا کہ شرع میں ایک زائد جائز ہیں۔ میں نے مؤدبانہ کہا میری شرع میں نہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم ہو گیا اس لیے کہ کچھ عرصے کے بعد پورا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا۔

۱۹۷۷ء میں پاکستان سے اچانک ایک خط ملا۔ یہ برقعہ پوش کی چھوٹی بہن کا تھا جنھوں نے مجھ سے اپنے بھائی کا جامعہ ملیہ کے کیمپس میں جو مکان رہ گیا تھا اور جس پر اب اغیار کا قبضہ تھا، واگزاشت کرانے کے سلسلے میں مدد چاہی تھی۔ آخر میں لکھا تھا، والد کا انتقال ہو چکا ہے اور بڑی بہن کا بھی جو حیدرآباد میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں مگر ہیں پر

تھوڑی دیر کے لیے ساکت و صامت رہ گیا۔ خیال پینتیس سال قبل کی علی گڑھ کی فضاؤں میں پرواز کرنے لگا۔ گھر لوٹا تو میں نے بجمہ کو سینے سے لگا لیا اور سارے راز سربستہ بتا دیئے ان کا مجھ پر اعتماد اور بڑھ گیا۔ شاید اسی لیے میں اپنی مرحوم خیالی محبت کو، کچھ دنوں بعد یہ خراجِ عقیدت پیش کر سکا۔

پرچھائیں کی موت

وہ پرچھائیں تھی

سیاہ برقع میں ملبوس ایک پرچھائیں

میرا روشن وجود جس کا برسوں تعاقب کرتا رہا

میری دزدیدہ نظریں جس کی سیہ نقاب سے

برسوں کشاکش میں مبتلا رہیں

— تاکہ اس کے رُخِ روشن کو بے نقاب کر سکیں

— تاکہ اس کے خط و خال کو رنگوں کا غسل دے سکیں

لیکن سماج کو یہ منظور نہ تھا

میں جلتا رہا اور وہ کوئلہ بنتی رہی

اپنے انگاروں کو دباتی رہی

بغیر یہ خیال کیے کہ اس کی نزار ہڈیاں

ایک دن جل کر مشتِ خاک بن جائیں گی

وقت فاصلے میں تبدیل ہوتا گیا

بالآخر ایک دن وہ بھڑک اٹھی

اور اس کی زبان پر پہلی بار خدا کے بجائے میرا نام آ گیا!

مسعود — گونج آئی — مردود!!

وہ میری یادوں کے طاق کا گلدستہ بن گئی

لیکن میں اس کے روشن وجود میں سایہ بن کر داخل ہوتا گیا
دونوں بے خبر۔ لیکن دور ہو کر قریب
یکا یک خبر کی بجلی ٹوٹی کہ چند سال پہلے وطن سے دور
وہ قبر کی تاریکیوں میں اتر گئی
"غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا"
میری زبان پر پہلی بار خدا کا نام آگیا! (۱۹۷۹)

بات کی رَو میں مَیں جس زمانے کا ذکر کر رہا تھا اس سے بہت آگے نکل گیا۔ ذکر تھا اس دور کی تحقیق اور تخلیق کا جن کی دوہری ڈگر پر ان دنوں رواں دواں تھا۔ تحقیق سے گریز تخلیق میں کرتا اور پھر اسی کی جانب لوٹتا۔ میرے لیے یہ خیال، اور "استدلال کے ہم دگر ہونے کا زمانہ تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ تحقیق و تخلیق ذہن کی متضاد صلاحیتوں کی پیداوار ہوتی ہیں۔ لیکن ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ ہر وہ شخص جو تعقل کی سطح پر کام کرتا ہے کسی نہ کسی قسم کے تخلیقی کام سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے اور کبھی کبھی اس عمل میں شرکت بھی کرتا ہے۔ میں دن میں اردو کی داستان لکھتا اور شام کے سائے یا رات کی تاریکی میں گیت یا غزل کے ستارے تراشتا۔ یوں کہ میری شاعری اور میری زندگی میں گہرا ربط رہا ہے۔ اسی لیے اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ کا آغاز ان جملوں سے کیا۔

"شعر میرے لیے ذریعۂ نجات رہا ہے۔ اس نے کبھی بھی مشغلہ یا مشق کی صورت اختیار نہیں کی۔ یہ ہمارا فن بھی نہیں ٹھہرا۔

اس قدر ضرور ہے کہ [illegible] میری [illegible] سبب ہے کہ شعر میرے لیے ہمہ وقت کا مشغلہ نہ بن سکا۔ شاعری کی دیوی کا [illegible] مشہور ہے۔ اس کا ہو کر آدمی پھر کسی کام کا نہیں رہتا۔ اور میں یہ قیمت دینے کو تیار نہیں تھا۔"

[illegible] تحقیق کے ساتھ [illegible] بھی تھا۔ میں عام طور پر [illegible]

یا گنگناہٹ کے سہارے شعر کہتا تھا۔ کبھی کبھی بستر پر لیٹے ہوئے خاموشی میں بھی شعر ہو جاتے۔
بعض گیت اور غزلیں ایک دار میں ہو گئی ہیں۔ بعض تخلیقی نقش، ناتمام رہ گئے ہیں جن کی جانب بار بار
مراجعت کرنا پڑی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ آمد اور آورد میں خطِ فاصل کھینچنا دشوار ہے۔ شعر کا محرک
کوئی جذبہ اور خیال بھی ہو سکتا ہے جو عرصے سے ذہن میں بالیدہ ہو رہا ہو۔ کبھی کبھی ایک مصرع یا ترکیب
ذہن میں آتے ہی تخلیق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ نرا آورد کا شعر اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہنے
والا جذبہ کی آنچ سے خالی ہو۔ اگر محسوسات کا دباؤ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہے تو زبان کا
سانچہ اور ہیولا خود بخود تیار ہونے لگتا ہے۔ رگ رگ میں روح کا بے تابانہ رقص تیز رفتاری اور شدت
کے ساتھ عمل پیرا ہوتا ہے اس لیے اس کو دیر تک انگیز کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ طویل نظموں
جسے ایڈگر ایلن پو نے چند اچھی چھوٹی اور چند کمزور بڑی نظموں کا مجموعہ کہا ہے" اگر مناسب حصص
یا ڈرامائی کرداروں میں تقسیم نہ ہوں تو سپاٹ ہو جاتی ہیں۔ میں نے 'خوابِ سنگ' یا 'روپ بنگال'
کے علاوہ کوئی طویل نظم نہیں کہی۔ ایک کو ہیئت اور دوسری کو ڈرامائی تاثر نے سنبھال لیا ہے۔ میں
نے اپنے شعری تجربے کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

" شعر کیسے بنایا اُترتا ہے؟ خارجی احوال اس وقت پیشِ نظر نہیں، اُس کے اثرات
مسلّم، لیکن تخلیقی عمل کا سرا کہیں اور ہے۔ اسے کو وہاں سے لینا ہوگا جہاں سے شاعر ذہنی تیاری میں
مبتلا نظر آتا ہے۔ کوئی ایک خیال، ذرا سی واردات، کوئی ایک لفظ یا مصرع اور ذہنی
تیاری کا عمل شروع ہو گیا۔ نفسیاتی اصطلاح میں یہ سمجھئے کہ روح میں ارتعاش
پیدا ہو گیا۔ آئی اے رچرڈز کے الفاظ مستعار لیجئے تو یہ کہ نازک ترین دماغی اعصاب
میں اہتزاز پیدا ہو گیا۔ جب یہ جاگ، یہ ارتعاش، یہ اہتزاز کسی لفظ کے ذریعہ پیدا
ہوتا ہے تو تنقیدی تجزیہ کافی دور تک دستگیری کرتا ہے لیکن جب یہ کیفیت جامد
صورت میں نہیں بلکہ مجرد تصورات میں جذبات زدہ تخیل سے زینہ بزینہ قدم پہنچے
[illegible] تشبیہات و استعارات کی ایک مبہم سی کائنات پھیلی ہوئی معلوم ہوتی
ہے، جسے الفاظ کی چہار دیواری رفتہ رفتہ سمیٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ چہار دیواری بار بار
[illegible] شگوفے سے شگوفہ تیزی سے پھوٹتا [illegible]

بھی ان لمحات کا تجزیہ کرنے سے معذور ہے۔ ایک گوئٹے کو معلوم ہوتا ہے کہ
جامِ انسانی میں شرابِ روحانی انڈیلی جا رہی ہے۔ ایک نیٹشے کو ہم کسی آسمانی طاقت
کا آلۂ کار نظر آتے ہیں۔ میر کو 'وہ' اور غالب کو 'ایک شخص' پسِ پردہ نظر آتا ہے۔
غرض کہ شعور اور لاشعور کا کوئی امتیاز اس وقت ممکن نہیں۔ فنکارانہ عمل جذبہ و تخیل
کی غیر معینہ کیفیات سے شروع ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ مبہم واضح ہوتا ہے اور بے نام
نام پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ زبان اور ہیئت کے سانچے ابھرنے لگتے ہیں۔"

میرے سلسلے میں دقت یہ تھی کہ میرا ذہن بہ یک وقت شعر کی گرمی اور لسانیات
کی سردی کو محسوس کرتا تھا۔ اگر چند گھنٹے میں زبان کے تجزیے پر صرف کرتا تو چند لمحے شعر کے
بے تابانہ رقص کے ساتھ بسر کرتا تھا۔ ذہن کے دونوں رویوں میں تصادم اس وجہ سے نہیں ہوتا تھا
کہ تخلیقی عمل کے وقت تنقیدی شعور تہ نشین ہو جاتا تھا۔ میں اکثر غلط الفاظ اور غلط محاورات
باندھ جاتا۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ اس وقت تک میرا کلاسیکی شاعری کا مطالعہ محدود تھا لہٰذا میں زبان
کی نوک پلک سے کما حقہٗ واقف نہیں تھا۔ میں نے خاص طور پر لکھنوی شعرا کے مطالعے کی جانب سے
اغماز کیا تھا، حالاں کہ زبانِ شعر کی منجائی جس طرح انھوں نے کی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں
ملتی۔

اس زمانے میں آمدِ شعر خوب تھی۔ 'وہ بات' (۴۲ء) میں لکھا۔ 'بچھوڑے'، 'میں کیسے
آنکھ اٹھاؤں'، 'سورج کا گیت'، 'آج تو شاید وہ آجائے'، 'آج بھی انکار' یہ سب گیت
۴۳ء کے دوران لکھے۔ باقی گیت زیادہ تر ۴۴ء اور ۴۵ء کی یادگار ہیں۔ غزلوں کا دور ۴۵ء سے
شروع ہو جاتا ہے اور نظموں کا ۴۶ء سے (تفصیل کے لیے دیکھیے 'دو نیم'، دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۶ء علی گڑھ)
اس شعری تجربے کے وقت میری عمر ۲۵، ۲۶ سال کی تھی۔ میں عمر کے خالص رومانی دور سے نکل
کر مردانہ بلوغت کے دور میں قدم رکھ چکا تھا۔ جنس کا دریائے بے تابی جسم میں زوروں سے
موج زن تھا۔ علی گڑھ کے برقعہ پوش ماحول میں ہر پردہ نشین معشوق نظر آتا تھا (ایک
خیالی معشوق کا ذکر [illegible] کر چکا ہوں)۔ چوں کہ میں نظر باز نہیں تھا اس لیے 'دید'
کے مواقع صرف سلام [illegible] کے آس پاس سے آگے نہیں بڑھتے، لیکن بہر حال دل

سی چیز کا متلاشی ضرور تھا۔ بے نام کی جستجو رہی۔ جب اظہار کا حتی موقع نہیں ملتا تو پرواز
تخیل کے ذریعے شعر کی دنیا میں غرق ہو جاتا۔

۱۹۴۴ء میں میری باقاعدہ نسبت نجمہ کے ساتھ ہو گئی۔ کہہ چکا ہوں کہ بھابی جان (منجھلی ممانی) نے نجمہ کے لیے میرا انتخاب تو بہت پہلے کر لیا تھا لیکن اب دق کے موذی مرض میں گرفتار ہونے کے بعد ان کی خواہش اصرار میں تبدیل ہو گئی کہ جلد نسبت ہو جائے۔ میرے بڑے بھائی بہن دونوں حیدرآباد میں تھے۔ خط لکھے گئے اور پھر دونوں کی تحریک پر ۱۹۴۴ء میں میری نسبت باقاعدہ طور پر کر دی گئی۔ میری نسبت اور بعد کو شادی دونوں میں گڈے گڑیا کے بیاہ کا انداز رہا۔ بھائی اور بہن دونوں حیدرآباد میں تھے۔ تحریک وہی کر سکتے تھے لیکن انھیں کون لکھے۔ ننہال کا پورا خاندان لڑکی کا طرفدار تھا۔ جب بھابی جان (منجھلی ممانی صاحبہ) نے یہ صورت دیکھی تو گھر کے سب سے معتبر ملازم اچّو (آرزو حسن) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ایک دن، حسب معمول میں کوٹھی (پرانا مردانہ مکان) میں لیٹا ہوا تھا کہ اچّو آیا اور مجھ سے کہنے لگا" میاں آپ اپنے بھائی بہن کو خط کیوں نہیں لکھتے تاکہ نسبت پکّی ہو جائے" میں ذہنی طور پر تو اس کے لیے تیار تھا لیکن قدیم خاندان کے لڑکوں میں شرم و لحاظ کا مادّہ ہوتا ہے، وہ ہمیشہ مانع رہا۔ سوچتا رہا کہ کیسے لکھوں اور پھر کس کو لکھوں، بڑے بھائی یا بڑی بہن کو۔ بالآخر بہن کے نام قرعۂ فال نکلا۔ میں نے لفافہ منگوایا اور دو سطروں میں اُن سے خواہش کی کہ وہ نانا جان کو (وہ وہی خاندان کے بزرگ تھے) اس نسبت کے بارے میں لکھیں۔ خط ملا تو انھوں نے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں سے مشورہ کیا اور پھر ننّے میاں کو نسبت کے لیے خط لکھا۔ ادھر میں حیدرآباد کے خط کا روزانہ انتظار کرتا۔ بالآخر ایک سہ پہر کو نانا جان اپنے ہاتھ میں کھلا خط لیے زنانے گھر میں آئے اور بی، (نانی صاحبہ) سے بولے لو نجو کی نسبت کا یہ خط آگیا ہے۔ پھر کہا بھئی لڑکی کے ماں باپ کی مرضی بھی پوچھ لو۔ انھوں نے کہا بس طے ہے ان کی مرضی کیا پوچھنا۔ یعنی قائم گنج کی زبان میں "لڑکی دل گئی" گڈے گڑیا کی نسبت کا یہ سارا تماشا میرے سامنے ہوا۔ اب جو تعطیلات میں قائم گنج جاتا تو اجنبی احساس کے ساتھ جاتا۔ ہر ایک کی نظر
... جھجک سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرا

عجب برازیاں دودھ والی کا تھا جس کے لیئے مجھے کسی دوسری بنتِ عم کا سہارا لینا پڑتا۔ مگر وہ بات کہاں....

اسی زمانے میں میں نے علی گڑھ کے صحرا میں بیٹھ کر بجّہ کی یاد کے دیئے روشن کیے اور 'جمال' کے عنوان سے اسے یہ خراجِ محبت پیش کیا:

جمال

کہاں سے آ گئیں رنگینیاں تمنّا میں
کہ پھر خیال نے لالے کھلائے صحرا میں

تری نگاہ سے مری نظر میں مستی ہے
ترے جمال سے موجیں ہیں دل کے دریا میں

یہ ہو رہا ہے گماں تیرے جسمِ خوبی پر
کہ خلد کے حور چلی آئی ہو نہ دنیا میں

نظر میں کچلے ہوئے موتیوں کی جھکاریں
لبوں پہ رنگ جو ملتا ہے جام و مینا میں

وہ مسکرانے سے آنکھوں میں بے شمار کنول
وہ کسمساتی ادائیں تمام اعضاء میں

نپا تلا سا تبسم، بچی ہوئی سی نظر
سمٹی سمٹی سی وہ پلکیں غبارِ شرما میں

وہ نرم نیچے سے کندن بدن کی رنگ ترنگ
تنی ہوئی سی وہ کرنیں لباسِ زیبا میں

جو گوشے گوشے میں پنہاں ہیں اس کے سو گریز
خیال گم ہوا جاتا ہے قدِ رعنا میں

ن۔ علی گڑھ مسلم لیگ کا گڑھ بن چکا تھا۔ قائدِ اعظم جناح اِس دانش کدے میں بار بار آتے اور اسے اپنے 'اسلحہ خانے' سے تعبیر کرتے۔ میرا قوم پرستی کا ذہن جامعہ ملیہ کے ماحول میں بن چکا تھا۔ ذاتی طور پر میں ہندی اور ہندوؤں کے بہت قریب رہ چکا تھا۔ ڈھاکہ کے چار سالہ قیام میں مجھے ہندو کلچر کے سب سے تربیت یافتہ نمونوں کو بنگالی زندگی میں دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ہندی زبان اور شاعری کے مطالعے نے ہندو ثقافت سے وہ اجنبیت بھی دور کر دی تھی جو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہن میں بالعموم ہوتی تھی۔ میں عملی سیاست سے بہت دور رہتا لیکن بہر حال سیاسی حالات کا میری فکر و تصورات پر اثر انداز ہونا لازمی تھا۔ ہندو کلچر، تاریخ اور ادبیات کے بہت قریب رہنے کے باوجود میں ان کی معاشرتی زندگی اور دیو مالائی تصورات کا ہمیشہ نقّاد رہا ہوں۔ میں اِس ثقافت میں بہت سی ڈھائی ہزار سال پہلے کی خرافات دیکھتا ہوں۔ یہ نہیں کہ اسلامی تہذیب خرافات سے یکسر عاری ہے لیکن چوں کہ اسلام نسبتاً جدید زمانے کی پیداوار ہے اِس لیے دیو مالائی ڈھلات سے خالی ضرور ہے۔ یوں میں عملی مسلمان کبھی نہیں رہا (سوائے جامعہ ملیہ کے اسکول کے زمانے کے) لیکن اسلام اور اسلامی اقدار کو عزیز رکھتا ہوں۔ اِس پس منظر کی وجہ سے اِس زمانے میں مسلم لیگ کی سیاست سے متاثر ہو گیا۔ میرے ارد گرد یہی ماحول تھا۔ علی گڑھ ہو کہ قائم گنج۔ لیکن میرے خواب و خیال میں بھی یہ نہیں آیا تھا کہ ملک 'دو نیم' ہو سکتا ہے۔ مجھے اکثر یوپی کے مسلمانوں کی لیگ پرستی پر ہنسی آتی تھی جس کے لیے 'دیجائے رفتن، نہ پائے ماندن' کا بندوبست رکھنا ضروری ہے۔

لیکن جو ہونا تھا سو ہوا۔ میں نے ۱۹۴۷ء کا پورا منظر اپنی ہاسٹل سے دیکھا۔ روز افواہیں گرم ہوتیں کہ مسلم یونیورسٹی پر چڑھائی ہونے والی ہے۔ چوں کہ یہ ہاسٹل اس وقت یونیورسٹی کیمپس کے بالکل کنارے پر تھا اس لیے ہمارے لیے شب و روز خطرہ رہتا۔ دن سو کر اور راتیں جاگ کر گذرتی تھیں۔ آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی؛

کوئی بھی رونقِ محفل کو دیکھ سکتا ہے

تمہیں بتاؤ جب آنکھوں میں اس قدر نم ہو

دیارِ ہند سے جاتے ہوئے بتانِ فرنگ
وہ داغ دیئے گئے جس کا نہ کوئی مرہم ہو
کنارِ گنگ و جمن آپ چھوڑ کر مسعودؔ
کہیں نہ جائیں نظر اُن کی لاکھ برہم ہو

عملی سیاست سے دُور ایک حساس دل انسان اپنے طور پر کوائفِ وطن کو اس طرح محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اس قسم کے جذبات سے مملو شاعری کی داد دینے والے بہت کم رہ گئے تھے۔ مجھے ۱۹۴۷ء کے آس پاس کی ایک صحبت یاد رہ گئی ہے۔ عبدالمجید خواجہ صاحب نے اپنے یہاں کچھ حضرات کو کھانے پر مدعو کیا تھا جس میں علی گڑھ کے ضلع مجسٹریٹ بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسبِ روایت، سخنوروں سے کلام سُنانے کی فرمائش کی گئی۔ جب میں نے اپنی غزل کے مذکورہ بالا اشعار ترنم کے ساتھ پڑھے تو عبدالمجید خواجہ صاحب کے سینے کا قوم پرست بلبلا اٹھا۔ وہ بار بار ضلع مجسٹریٹ کو مخاطب کر کے ان اشعار کو اٹھاتے تھے اس طرح کہ وہ بے چارا خود کو مدعا علیہ کے کٹہرے میں کھڑا محسوس کرنے لگا۔

جب ۱۹۴۷ء کی موجِ خوں سر سے گذر چکی اور منجھلی ممانی صاحبہ کی صحت روز بروز گرنے لگی تو اصرار ہوا کہ اب میری شادی ہو جانی چاہیئے۔ لیکن کون کرے۔ میرے بڑے بھائی بہن تو حیدرآباد میں تھے، جہاں کے سیاسی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے اور چاروں جانب سے خاموشی تھی۔ تمام عزیزوں کا یکجا ہونا مشکل ہوتا تھا۔ اس لیئے طے پایا کہ رسم نہایت سادگی سے ادا کر دی جائے۔ دولھا بھی اس وقت ننہال کا تھا اور دلہن بھی ننہال کی۔ جیسے ایک گھروندے میں گڈے گڑیا کا بیاہ ہو رہا ہو۔ چنانچہ میں ممانی صاحبہ کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے علی گڑھ سے ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو قائم گنج کے لیئے روانہ ہو گیا۔ وہاں گاڑی ساڑھے چار بجے کے قریب پہنچتی تھی۔ تقریباً چھ گھنٹے کا سفر تصورات کے عالم میں گزرا۔ قائم گنج جب پہنچا تو اسٹیشن پر اڑتی ہوئی خبر سنی کہ گاندھی جی کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ گھر پہنچا تو ایک سراسیمگی کا عالم پایا۔ سب کو یہ فکر تھی کہ کس نے قتل کیا ہے۔

اگر کسی مسلمان نے یہ حرکت کی ہے تو قیامت گزر جائے گی لیکن تھوڑے ہی دیر میں ریڈیو نے قاتل کا نشان پتہ بتا دیا۔ شادی ۲۱ر جنوری کو مقرر تھی۔ لیکن گاندھی جی کے سوئم تک ملتوی کرنا پڑی۔

بچپن سے میری عادت رہی ہے کہ موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلتے۔ لیکن ۳۰ر جنوری کی رات کو میں دیر تک سسکیوں سے روتا رہا!

نکاح کی رسم اب ۳ر فروری کی سہ پہر کو مقرر ہوئی۔ نجمہ ۳۰ر جنوری سے پہلے مائیوں بٹھا دی گئی تھیں، ہاتھوں میں مہندی لگ چکی تھی۔ اُن کے ساتھ سلمیٰ بھی۔ بھائی جان کی خواہش کے مطابق طے پایا تھا کہ ان کے بیٹے بدر عالم خاں کی بھی شادی اسی روز ہو جائے۔ چنانچہ ۳ر فروری کی سہ پہر کو مُلّا جمّی نے (جن کے بارے میں مشہور تھا کہ شوق کرتے ہیں) ہم دونوں کا نکاح چند چھواروں پر، مقامی عزیزوں کے سامنے مردانے مکان کے چبوترے پر پڑھا دیا۔ نہ سہرا تھا نہ دھوم دھام۔ میرے خیال میں اس قدر سادہ شادی اسلام کے ابتدائی عہد میں ہوئی ہو تو ہوئی ہو، اور کہیں دیکھنے یا سننے میں نہیں آئی بس دو گڈّوں اور دو گڑیوں کا بیاہ تھا جو کر دیا گیا۔ میرے بڑے بھائی کے خسر منظور عالم خاں نے شکایت کی کہ امتیاز تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے، یہاں کسی کو خبر کیے بغیر یہ سب کچھ کر دیا گیا۔ لیکن مرض الموت میں گرفتار ایک مریضہ کی خواہش کا احترام بھی ضروری تھا۔ میں بھی انتظار سے عاجز آ چکا تھا۔

شادی کے دو روز بعد میں علی گڑھ چلا آیا۔ یہاں میں نے پہلے سے یونیورسٹی کا ایک کوارٹر اپنے نام الاٹ کرا لیا تھا۔ چھ ہفتے بعد جا کر نجمہ کو بھی لے آیا۔ امین ہاسٹل کی سکونت ترک ہوئی اور انجینئرنگ کوارٹر نمبر ۴ میں متاہلانہ زندگی کی آسودگی کا آغاز ہوا۔

---

۴۸ تا ۶۲ء (درمیان میں ۲½ سال کے وقفے کے علاوہ جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گیا ہوا تھا) میری نشست و برخاست کا محور پروفیسر ظفر الدین کی قیام گاہ تھی جہاں مجھ جیسے چند اور صاحبان روزانہ جمع ہو جاتے تھے۔ ظفر الدین صاحب فلسفہ کے استاد تھے۔ جوانی میں انھوں نے امام غزالی کی فکر پہ کام کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمہ کے مریض ہو گئے جس نے ان کا سارا تحریری دم خم نکال چھوڑا

شادی پنجاب کے کسی قصبے میں کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی میں برسرِروزگار ہونے کے بعد انھوں نے دوسری
خلیل مراد صاحب کی صاحبزادی سے کی جو فزکس میں لکچرر تھے اور میرس روڈ پر خلیل منزل کے مالک۔
کی دوسری بیگم علی گڑھ کی تعلیم یافتہ تھیں۔ ان سے دو بچے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے، مگر دمہ
عارضے کے بعد ان سے علیحدگی ہو گئی۔ وہ پہلے ایم۔ ایم ہاسٹل کے وارڈن کی حیثیت سے اور پھر یونیورسٹی
مکان میں یکّا و تنہا رہتے تھے۔ انھیں مُسرائٹ کی ضرورت تھی اور محلّے کے نوجوان اساتذہ کو ایک
بیٹھک کی۔ چنانچہ ان کا مکان ایک مستقل نشست گاہ بن گیا تھا۔ جہاں سہ پہر تا نصف شب لوگ آتے
رہتے۔ اِس نشست کے خاص رکن میرے علاوہ احسان رشید صاحب، ابرار مصطفیٰ صاحب، عمر علی
صاحب، وحید قریشی اور ظفر احمد صدیقی صاحبان تھے۔ باقی موقتی تھے، یعنی آتے جاتے رہتے تھے۔
اس نشست مغرب کے بعد شروع ہوتی۔ اس وقت دربارِ عام والے اٹھ جاتے یا اٹھا دیے
جاتے۔ عمرالدین صاحب کا معمول تھا کہ اگر کوئی شخص خانقاہ کے آداب سے ناواقفیت کی بنا پر
اپنی نشست کو مغرب کے بعد طول دینا چاہتا تو اسے یاد دلا دیا جاتا کہ اسے اور بھی بہت سے
کام ہوں گے جنھیں جا کر کرے۔

یہ مجلس خالص غیر سیاسی تھی۔ موضوعات فلسفے سے لے کر واقعات یونیورسٹی پر تبصرے مسلمانوں
کے بارے میں ترددات سے ہوتی ہوئی وحید قریشی کی بذلہ سنجی پر ختم ہوتی۔ بیچ بیچ میں عمرالدین صاحب
کھانسی کی شدّت کو ختم کرنے کے لیے بھپارے لیتے کر نسوار اور شربت نزلہ تک استعمال
کرتے جاتے۔ گرم گرم چائے کا مسلسل دور چلتا رہتا۔ جوں جوں رات بھیگتی ان کے دمہ کی شکایت
بڑھتی جاتی اور اسی نسبت سے ان کی یہ خواہش کہ حاضرین ان کا شب کی تنہائی میں
ساتھ دیں۔

وہ صحیح معنوں میں مردِ قلندر رہتے جو زہر ہلاہل کو کبھی کہنے نہ سکا قند پر عمل کرتے تھے۔ دل کے
کھرے اور لہجے کے اکھڑ تھے۔ زبان ان کی لونڈی تھی جو فرمایا وہی مستند ہو گیا۔ مثلاً کہتے تھے کہ "ہم نے
علی گڑھ کے لیے بڑی بڑی سیکری فائی یاں" Sacrifices کر رکھی ہیں لیکن کوئی ریکگ نائز
Recognize نہیں کرتا" پلیژر Pleasure کو "پلیژر" اور میژر Measure کو میژر کہتے اپنی جوانی
... کے مشہور استاد ڈاکٹر ظفر الحسن کے

شاگرد تھے۔ ڈاکٹر ظفرالحسن اُستاد ہی نہیں طالب علموں کے لیے پیر و مرشد بھی تھے۔ آخری عمر لہراتی داڑھی کے ساتھ چوغے میں ملبوس رہتے تھے۔ طالب علم ان کی علیت سے مرعوب اور شخصیت سے خائف رہتے تھے۔ ادھیڑ عمر میں جب انھوں نے شادی کی تو اطبا نے حلوۂ مغز گنجشک (گوریا) تجویز کیا جس کی فراہمی کے لیے عمرالدین صاحب کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چنانچہ ؎

بنا کر چڑی مار نے ایک جال
لیا جال کو اپنے کاندھے پہ ڈال

کی شکل میں صبح سے شام تک مارے مارے پھرتے اور کہیں سے درجن ڈیڑھ درجن گوریا پکڑ کر لاتے، جن کو ذبح کر کے ان کا مغز نکالا جاتا پھر دیگر مبہی اجزا کے ساتھ اُن کا حلوہ اصلی گھی میں تیار کیا جاتا۔

ذاکر باغ میں رشید صاحب اور ان کا دروازہ آمنے سامنے تھا لیکن دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر رہتے تھے۔ دراصل دونوں دو مختلف کلچروں کے نمائندے تھے۔ یہ گنگا اور راوی کے پانی کا فرق تھا لیکن ۱۴ راگست ۷۴ء کو رشید صاحب نے عمرالدین صاحب کی وفات پر جو خط مجھے حیدرآباد لکھا تھا، اس سے اُن کی قربت کا علم ہوتا ہے۔

"عمرالدین صاحب کی وفات کچھ دنوں سے غیر متوقع نہیں رہی تھی۔ کئی مہینے سے مری ہمت ان کو دیکھنے جانے کی نہ ہوئی باوجود اس کے کہ وہ طرح طرح سے بار بار یاد کرتے رہے اور احسان کا بھی اصرار رہا۔ جس کو زندہ ہنستا، بولتا محبت کرتا ہوا دیکھتا چلا آیا اس کو موت میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا۔

عمرالدین صاحب سے ان کی طالب علمی کے زمانے سے آشنا رہا۔ رفیق باصفا تھے۔ آپ اور احسان کو تو شاید وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ظاہر کتنا کھردرا اور ناقابلِ التفات، باطن بہ ہمہ وفا سے کیسا مُزیّن و متعطّر!"

کسی محترم یا عزیز کی موت پر بھی میرے آنسو نہیں نکلے اُن کی تلافی میں شعر سے کرتا ہوں:

بیادِ دوست

اندھیری رات میں یوں گل ہوا چراغِ دوست
حیات اب نہ کبھی پائے گی سراغِ دوست
بس ایک یاد! کہ روشن ہیں جس سے دیدہ و دل
مژہ پہ ہے یہ ستارہ تو دل میں داغِ دوست

کہیں تو کس سے کہیں جا کے داستانِ دوست
یہ سانحہ ہے عجب، مرگِ ناگہانِ دوست
وہ جس کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں نظریں یوں شب و روز
کہ جب ملا کوئی انساں ہوا گمانِ دوست

یہ کھویا کھویا سا کیوں آج ہے دیارِ دوست
یہ کیوں ہے خاک بسر آج رہ گزارِ دوست
مگر یہ دل کہ گزرگاہِ ماہ و سال نہیں
رہے گا تا بہ ابد محوِ انتظارِ دوست

نہ کہیے کچھ کہ یہی ہے بس اب رضائے دوست
نہ کیجیے اُف کہ یہی ہے یہاں وفائے دوست
یہ پردہ داری و دوری، یہ فصل و مجبوری
برائے دوست ہوئی یہ بھی اک ادائے دوست

حیدرآباد میں جب یہ شخصی مرثیہ لکھ رہا تھا تو مجھے اک لمحہ کے لیے محسوس

کہ میں اپنے شہر اور اپنے لوگوں سے دور ہوں۔ میری یادوں کے پردے پر ماضی کی تصویریں اُبھرنے لگیں۔ عمرالدین صاحب کا دَم دَرے کے ہاتھ میں ہونا لیکن پھر بھی جینے کی آرزو کا زندہ رکھنا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی سے فرمائش ہوتی کہ آج پنچایتی کھانا ہوگا۔ میکر یہاں کی ڈِش مقرر تھی، قیمے بھرے کریلے۔ ہم سب کو محسوس ہوتا کہ ہم سب انکے اہل خانہ ہیں۔ انھیں کی تحریک پر علی گڑھ سے رخصت ہوتے وقت احباب نے میری جتنی دعوتیں کیں شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہوں۔ وہ میری علی گڑھ واپسی کے رشید صاحب ہی کی طرح منتظر تھے لیکن میں وہاں چار سال کی تاخیر سے پہنچا۔

آٹھواں باب

دیارِ فرنگ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں (اقبالؔ)

(۵۰ تا ۲۵۳)

یونیورسٹی کے انجینئرنگ کوارٹرز نمبر ۲ میں نجمہ کے ساتھ ڈھائی سال تک مقیم رہا۔ اس زمانے کا سب سے اہم واقعہ میرے پہلے بچے جاوید حسین کی (جو اب انجینئرنگ کالج میں فزکس کا پروفیسر ہے) ۲ر جنوری ۱۹۵۰ء کو ولادت ہوئی۔ میرے اور نجمہ دونوں کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ ہمارے آگے پیچھے خاندان کا کوئی بڑا نہ تھا جو اس سلسلے میں ہماری رہبری کرتا۔ جرمے کے بعد میرے اندر کا شاعر جاگ اٹھا، اس موقع پر "ننھا شاہکار" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

میرا ننھا سا شاہکار ہے تو
ماں کی آنکھوں میں نو بہار ہے تو

پھول کی پنکھڑی سے نازک تر
حرفِ نازک سے شرمسار ہے تو

شعر ہے، خون کا مجسم شعر
گنگناتا ہوا سا پیار ہے تو

ہیں غم زندگی کے ابرو خم
یار ہے اور حسین یار ہے تو
رقص کی اس کے ایک جولانگہ
زندگی کو نیا دیار ہے تو
جو محبت کو پہلی بار آیا
بے قراری میں وہ قرار ہے تو (۶۵۰)

ادھر میں اپنے بچے کی ولادت پر مسرت کی تمثیلات تراش رہا تھا کہ خبر ملی میرے ایک عزیز شاعر شاگرد اشعر ملیح آبادی کی موت نہایت کسمپرسی کے عالم میں واقع ہوئی۔ ولادت اور موت کے دوراہے پر کھڑے ہو کر میں نے جانے والے کا ماتم ان الفاظ میں کیا:

اشعر کی موت

اشعر کی موت ایک گلِ تر کی موت ہے
چشمِ صدف میں یا کسی گوہر کی موت ہے
روحِ ادب سے کہہ دو جواں مرگ شاعر و!
قطرے کی موت ہے، تو سمندر کی موت ہے
کس سے کہوں کہ دامنِ عسرت کے سائے میں
شاعر کی موت ہے، کہ گداگر کی موت ہے
میں گاتا ایک گیت یہ ٹلتی کسی طرح
لیکن یہ سنگ دل ہے، یہ پتھر کی موت ہے (۶۵۱)

دونوں نظموں کو ساتھ ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو نشاطیہ اور المیہ کا فرق محسوس ہوگا۔ ایک میں تخیل کی کشیدہ کاری ہے تو دوسرے میں الم کی سوزن کاری۔ مجھے اپنی یہ دونوں نظمیں پسند ہیں۔

اِدھر کچھ عرصے سے میں سفرِ یورپ کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں میں نے مسلم یونیورسٹی سے دو سال کی رخصتِ تعلیمی لی اور ۷ ستمبر ۱۹۵۰ء کو بمبئی سے پانی کے جہاز سے روانہ ہو کر ۲۴ ستمبر کو لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچ گیا۔ راستے میں جہاز عدن اور پورٹ سعید پر رُکا۔ معلوم ہوا ابھی ہم مشرق ہی میں ہیں۔ وہی افلاس، چخ چخ، چیخ پکار اور گندگی۔ ہندی ہو کہ یمنی یا مصری، زبانوں کے فرق کے ساتھ ہم ایک ہیں۔ البتہ جب کچھ روز کے بعد جہاز نے جنوبی فرانس کی بندرگاہ مارسیلز پر لنگر کیا اور چند گھنٹے کے لیے ہم لوگ ساحل پر اُترے تو معلوم ہوا دنیا ہی بدلی ہوئی ہے۔ جابجا میزوں پر فرانسیسی مے ارغوانی کی بوتلیں چنی ہوئی تھیں اور ساقیانِ مہ وش ساقی گری میں مصروف تھے۔ ہمارے جہاز کے بہت سے ساتھی بلا امتیاز مذہب و ملت ان میزوں پر پروانہ وار گرے اور نوشا نوش کا کاروبار شروع کر دیا۔ بھیڑ کا ایک باعث وہ نوخیز کم سن فرانسیسی لڑکیاں بھی تھیں جو ہنس ہنس کر جام پیش کر رہی تھیں بشرطیکہ دام آپ کی جیب میں ہوں۔ میں اس منظر کا ایک حصّہ بنا کچھ فاصلے پر کھڑا سوچ رہا تھا ؎

میرا بھی خیال ہے گو میں نے پی نہیں
کوئی حسیں پلائے تو یہ شے بُری نہیں (ریاضؔ)

انگریزی حُسن کے جو نمونے اب تک ہندوستان میں دیکھے تھے وہ بے نمک، بے رنگ اور سپاٹ تھے۔ بحیرۂ روم کے سواحل کے، لاطینی خون سے سرشار حُسن کے نظارے پہلی بار دیکھنے کو ملے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ان کے بارے میں جو تاثرات میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے پچیس برس قبل تھے (دیکھیے یادوں کی دنیا) بالکل وہی میرے تھے۔ ہمارے ذہن میں مکمل نسوانی حُسن کا جو تصور تھا اسے ان لڑکیوں میں متشکل پایا۔ وہ بہت تیز فرانسیسی بولتی تھیں، بس کچھ ایسا احساس ہوتا تھا ؎

کیا باتیں ہیں کہ جھڑتی ہیں گلِ نغمہ صدا
کیا دہن ہیں کہ نکل آتی ہے پھر بات میں بات
کیا نگاہیں ہیں کہ شبنم میں شعاعیں پیوست
کیا ادائیں ہیں کہ شاہوں نے یہاں کھائی مات

مارسیلز سے جہاز جبل الطارق ہوتا ہوا لندن کی بندرگاہ تل بری پہنچا۔ وہاں مجھے لینے کے لیے انور انصاری اور ان کی بیگم غزالہ انصاری موجود تھیں جو سال بھر پہلے لندن آچکے تھے۔ ان کی موجودگی کی وجہ سے مجھے وہ دقتیں نہیں اٹھانا پڑیں جو عام طور پر تازہ واردانِ انگلستان کو پیش آتی ہیں۔ میرے قیام کے لیے پہلے سے اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کی پشت پر Tavistock Square کے ایک پرائیویٹ ہاسٹل میں انتظام تھا۔ میں اس بات سے خوش تھا کہ جہاں میرا داخلہ ہوا ہے یہ اس سے بہت قریب تھا لیکن چند روز رہنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اس کی نوعیت تو سرائے کی سی ہے۔ ایک ایک کمرے میں کئی کئی پلنگ تھے وہ بھی اوپر نیچے ڈبل، یعنی ایک پلنگ پر میں اوپر کی منزل میں تھا اور ایک اور لڑکا نیچے کی منزل میں۔ ہر وقت آمد و رفت اور پلنگ کی چوں چوں سے تنگ آکر میں نے قیام گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ بالآخر Swiss Cottage کے علاقے میں ایک سوئس لینڈ لیڈی کے یہاں کمرہ مل گیا۔ وہ عرصے سے لندن میں بود و باش اختیار کیے ہوئے تھیں اور فی الحال پاس پاس کے دو مکانوں کی مالکہ تھیں۔ ان میں زیادہ تر وہ غیر یورپی طلباء کو قیام و طعام کے معاوضے پر رکھتیں۔ یعنی کمرے کا کرایہ لیتیں اور ناشتہ اور شام کا کھانا دیتیں۔ سارا کام خود کرتی تھیں۔ میرے لیے یہ علاقہ اس لیے بھی دلچسپی کا باعث تھا کہ پاس ہی کی سڑک Belsize Avenue پر دس بارہ سال قبل میرے بڑے بھائی امتیاز حسین خاں مقیم رہ چکے تھے۔ زیر زمین ریل Tube کا اسٹیشن سامنے تھا جہاں سے دس منٹ کے اندر یوسٹن پر ریل بدلنے کے بعد آدمی لندن یونیورسٹی کے علاقے میں پہنچ جاتا تھا، جہاں اسکول واقع تھا۔

سوئس کاٹیج میں چند ماہ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکا۔ کچھ عرصے کے بعد مکھن کے معاملہ پر سوئس لینڈ لیڈی سے میرا اختلاف ہو گیا۔ جنگِ عظیم دوم کو ختم ہوئے پانچ سال کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن انگلستان میں مکھن اور انڈے جیسی روزانہ کی اشیائے ضرورت راشن سے ملتی تھیں۔ لینڈ لیڈی ہمارے راشن کارڈ پر سارا راشن لے لیتی اور ہمیں اس قدر بھی نہیں دیتی کہ کسی وقت ہم اپنی پسند کی کوئی چیز پکا سکیں۔ اس کے کرایہ داروں میں میرے علاوہ پاکستان کے بھی تین نوجوان تھے۔ انھوں نے تحریک اٹھائی اور مجھے اگوا

بنا دیا۔ میں نے کمرہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی میں کام آگیا اور وہ اپنے مقام پر رہے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک صاحب کی (جن کا اصل تعلق لکھنؤ سے تھا) میرے کمرے پر پر نظر تھی۔

وہاں سے میں نکلا تو Nottingham Place پہنچا۔ یہ مقام مادام تُساد کے موموں کے مجسموں کے میوزیم کے قریب تھا۔ لندن کا یہ میوزیم بھی عجیب وغریب جگہ ہے۔ ہر ملک وقوم کے مشاہیر کے موم میں ڈھلے ہوئے مجسمے یہاں نصب ہیں۔ ان میں بعض تو اس قدر حقیقی معلوم ہوتے ہیں کہ نقل پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ ناٹنگم پلیس کی قیام گاہ لندن یونیورسٹی سے زیادہ قریب تھی لیکن یہاں میرا قیام بہت مختصر رہا۔ گرما کی تعطیلات میں پیرس چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر وہاں دوبارہ جانے کے انتظامات میں لگا رہا۔ یہاں میرے ساتھ ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبۂ بنگالی کے اُستاد عبدالحیٔ بھی کچھ عرصہ مقیم رہے۔ وہ بھی السنۂ مشرقیہ کے اسکول میں شعبۂ لسانیات کے طالب علم تھے۔ علم اور حسن کے درمیان اپنے وقت کو تقسیم کرنے کا ہنر انھیں خوب آتا تھا۔ اسکول سے لسانیات میں ایم۔ اے بھی کیا اور ہائڈ پارک کے حسن رہ گزر سے لطف اندوز بھی ہوئے۔ ڈھاکہ واپس جا کر چالیس برس کی عمر میں اپنی ایک نوجوان طالبہ سے عشق کیا اور جب کامیابی نہیں ہوئی تو ریل سے کٹ کر جان دے دی۔ مجھے ان کی موت کا قلق مہینوں رہا۔

میں نے اسکول آف اورنٹیل اسٹیڈیز کے شعبۂ لسانیات میں داخلہ لیا۔ خیال تھا کہ توضیحی لسانیات کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اردو کے کسی پہلو پر تحقیق کروں گا۔ لسانیات کے شعبہ کے سربراہ پروفیسر جان روپرٹ فرتھ تھے، جو عرصۂ دراز تک ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ دراصل سارا اسکول ایسے اساتذہ سے بھرا ہوا تھا جو ہندوستان کے راندۂ درگاہ تھے اور جن کے ذہن میں ہندوستان کی یادیں تازہ تھیں۔ ۱۹۵۰ء کا انگریز پروفیسر اور آزاد ہندوستان کا طالب علم دونوں بہت سے تحفظاتِ ذہنی رکھتے تھے۔ پروفیسر فرتھ کو اپنے علم میں شہرت تھی اُن کے عام لسانیات کے لکچروں میں بعض اساتذہ تک شرکت کرتے تھے۔ ہندوستان میں طویل عرصہ تک قیام کرنے کے باوجود انھوں نے یہاں کی کسی زبان میں مہارت [illegible] لیتے تھے۔

ان کا جونیر اسٹاف اس اعتبار سے اور گیا گزرا تھا۔ انھیں میں ۴۵ سالہ مس Evans تھیں (جو بہت بعد کو شادی کرکے Mrs. Whitley بن گئیں) وہ اردو/ ہندی سے بالکل ناواقف تھیں۔ لیکن ہندوستانی طلبہ کی ٹیوٹر انچارج تھیں وہ پروفیسر فرتھ کے Prosodic Features کے نظریے کا اردو/ ہندی پر بے دریغ اطلاق کرتی تھیں اور ان زبانوں کے اپنے تلفظ کو معیاری تلفظ سمجھ کر اس کی ڈرل کراتی تھیں۔ خاص طور پر اردو کی معکوسی (ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ وغیرہ) یا نفسی آوازوں (بھ۔ پھ۔ تھ۔ وغیرہ) کا جب وہ تلفظ کرتیں تو میرے لبوں پر مسکراہٹ کھیل جاتی۔ میں ڈرل میں ان کے تلفظ کو قبول کرنے سے انکار کرتا اور خاموش بیٹھا رہتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری یہ حالت ہو کہ ع

زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

اس کے برعکس دیگر ہندوستانی طالب علم طوطے کی طرح جو وہ کہلواتیں کہتے رہتے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے عبدالحئی اس میں اپنی بنگالی کا گول مول یا 'پشکاری' تلفظ ملا دیتے تھے جسے سن کر میرے منہ سے کبھی کبھی 'کھی کھی' کی آواز پیدا ہو جاتی۔ مثلاً وہ کہتیں 'چلتا'، (در اصل 'چلٹا'، کہتیں) تو عبدالحئی 'چولتا' کہتے۔ وہ 'سندر' کہتیں تو عبدالحئی 'شُندر' کہتے۔ خود اپنا نام 'گونڈل حوئی' بتاتے اور مس ایونس کو 'مِش ایبون' کہتے۔ چوں کہ انگریزی کے t/ اور d/ نہ تو اردو کے ات/ اد/ کے مساوی ہیں اور نہ اٹ/ اڈ/ کے بلکہ ایک درمیانی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے مس ایونز مسلسل انگریزی صوتیات کے مطابق ان کا تلفظ کرتیں اور میرے صحیح تلفظ کو غلط بتاتیں۔ یہاں سے اُن کی مجھ سے ناراضگی کا آغاز ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے پروفیسر فرتھ کے کان بھرنا شروع کیے۔ وہ بھی سوچنے لگے کہ تین سال پہلے کا غلام ہندوستانی اور اس قدر باغی! چنانچہ ان کا بھی رویّہ بدلنے لگا۔ یا تو انھیں میری خیریت دریافت کرنے کا اس قدر شوق تھا کہ اگر کبھی پیشاب خانے میں مَیں فراغت کے لیے کھڑا ہوں اور وہ بھی مزدوناً آ گئے ہیں' تو عین عالمِ فراغت میں وہ مجھ سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے۔ انھیں کیا معلوم کہ ہندوستانی معاشرے میں یہ حرکت عجیب و غریب سمجھی جاتی ہے۔ وہ بلا تکلّف ذات و کائنات کی باتیں کرتے رہتے اور میرا پیشاب خطا ہو جاتا۔

لندن کے قیام کی ایک شام مجھے کبھی نہیں بھولے گی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء میں جب لندن پہنچا تو معلوم ہوا افقِ ہند کے سارے گم شدہ ستارے وہاں موجود تھے۔ ان ستاروں نے لاہوری روایت کے مطابق خود کو ایک 'حلقہ' (معروف بہ 'ہلکا') کی شکل میں منظم کر لیا تھا۔ اس حلقہ کا جلسہ ہر مہینہ کے آخری سنیچر کو کسی نہ کسی رکن کی قیام گاہ پر منعقد ہوتا۔ اس حلقے کی زد سے کسی نووارد کا بچ نکلنا مشکل تھا۔ آپ شاعر ہوں یا متشاعر، ترقی پسند ہوں یا غیر ترقی پسند، وسیع لندن کے اس محدود حلقے میں آپ کسی نہ کسی وسیلے سے ضرور جا پہنچیں گے۔ پھر یہ کہ تو وہاں کئی سلسلے تھے: فرنگی محل کے کمیونسٹ انور انصاری اور ان کی بیگم غزالہ انصاری، علی گڑھ کے پرانے گنہگار 'حلقۂ یاراں' کے سردار، جگت چچا، صدیق احمد صدیقی اور پھر حلقے کے میر شکار اعجاز حسین بٹالوی، جن سے میری واقفیت اس وقت سے تھی جب وہ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر کام کرتے تھے۔

شاید جنوری ۵۰ء کا آخری سنیچر تھا۔ حلقہ کا جلسہ لندن کے پُرتکلف ویسٹ اینڈ میں افسانہ نگار غلام عباس کے فلیٹ میں منعقد ہوا۔ صاحبِ خانہ خود اس روز ایک مہمان لطیف کی پذیرائی میں مصروف تھے۔ اس لیے ان کا ایک قدم اپنے باورچی خانہ تھا تو دوسرا حلقے کی مجلس میں۔ ایک مسلسل دوڑ ادب اور حسن کے درمیان تھی۔ مجلس کا نقشہ عباس صاحب کی بڑی گول میز کے اردگرد جما ہوا تھا۔ کوئی کرسی پر تو کوئی فرش پر اگراتے میں کوئی خاتون آجاتیں تو کسی نہ کسی کو کرسی خالی کرنی پڑتی۔ احتیاط پسند اسی لیے پہلے سے خاک نشین تھے۔

اس دن کے میرِ مجلس حفیظ جاوید تھے۔ اُن کے داہنے ہاتھ پر اعجاز بٹالوی؛ سکریٹری حلقہ، مسلسل گل افشانیٔ گفتار پر آمادہ نظر آرہے تھے۔ یہ آمادگی خواتین کی تعداد اور نسبت سے تپش آمادہ تر ہوجاتی جارہی تھی۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے میں ایک حلقہ گیر جماہی کے ساتھ جنابِ صدر نے جلسہ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سکریٹری نے پچھلے جلسے کی رپورٹ سنائی اور کہا آج کی خاص چیزیں دو نظمیں ہیں جو منیب الرحمٰن اور مسعود حسین سنائیں گے قرعہ میرے نام پڑا۔ نظم آزاد تھی، عنوان تھا 'انتظار'۔

یہاں پر حلقہ کی بعض روایات کا ذکر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ حلقہ کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسے 'انجمن ستائشِ باہمی' قسم کی چیز نہ بننے دیا جائے۔ اس میں ہر قسم اور دبستان

کی چیز پڑھنے کا مجاز تھا لیکن تنقید بے لاگ ہوگی۔ کینہ کرنے لاگی۔ فاصلا، بے تعلق اس کی تنقید کے
محور تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ جس طرح سنگم پر کھڑے ہو کر آپ گنگا اور جمنا کے دھاروں کا رنگ فوراً
پہچان لیتے ہیں اسی طرح حلقہ بھی دو دائروں میں تقسیم تھا۔ مارکسی اور غیر مارکسی۔ مارکسی نقادوں کی
قیادت انور انصاری اور منیب الرحمٰن کر رہے تھے، ایک عقل سے دوسرا جذبات سے۔ ان کے
ساتھ ایک کارواں تھا اور پھر گرد کارواں۔ دوسرا پرا اعجاز بٹالوی اور غلام عباس کا
تھا جن میں سے ایک غنیم کی کاٹ مسلسل گفتار سے کرتا اور دوسرا ڈھیٹ خاموشی سے۔ ان
دونوں گروہوں کے درمیان ایسے بھی تھے جو ادھر بھی تھے اور ادھر بھی۔ چچا صدیق تھے
جن کے متعلق مارکسیوں کا اصرار تھا کہ وہ ہمارے ہیں لیکن ان کی شگفتہ مزاجی خندہ ہائے گل
کو بھی برداشت نہیں کرتی تھی۔ کچھ رندِ حلقہ تھے کچھ صوفی اور بیشتر نقش و نگار یا خود مارکسی
ادیبوں کے مخلص گرینڈ تھے، کچھ کیمونسٹ ملّا، کچھ مجاہد، اور کچھ عارف، اعجاز کی زندہ دلی
پر حلقہ کا توازن قائم تھا۔

خیر جلسے کا آغاز میری آزاد نظم "انتظار" سے ہوا:

تھکی تھکی سی یہ شامیں سوادِ مغرب کی

میں رو رہا ہوں —

کہ ان کی سحر نہیں معلوم!

ہجومِ لالہ و گل

(داغ ہائے دل کو نہ پوچھ!)

لبوں پہ چھڑکا ہوا ہر طرف یہ خونِ گلاب

شباب، آتشِ لب، چشمِ نیلگوں کا فسوں

یہ بوسہ ہائے دراز!

وہ حسنِ رفتہ کو سو سو جتن سے رنگِ قیام

یہ سب قرار نگاہیں، یہ جاگتے سائے

وفا بھی شرما جائے

نظم کا پہلا بند ختم ہوا تو میں نے حاضرین پر نگاہ ڈالی۔ منیب الرحمٰن کی نظریں کھوئی
کھوئی سی پائیں۔ معلوم نہیں لبوں کی محرابوں کے پار کیا دیکھ رہے تھے۔ انور انصاری سماجی شعور کی
بند و بند کی 'خونِ گلاب' کی ترکیب سے آسان گزر کر 'آتشِ لب' میں کھوئے ہوئے تھے۔ اعجاز
بٹالوی، ہجومِ لالہ و گل میں 'بو سہائے دراز' کی جانب سے داخل ہونے کی کوشش میں معروف
تھے۔ چچا صدیق وجد میں تھے اور غلام عباس کے ہونٹوں پر وہی خاموش تبسّم۔

نظم آگے بڑھی:

اِنھیں غرض ترے مشرق کی سرزمینوں میں

وہ سر پہ برسوں سے آنچل کو اپنے ڈالے ہوئے

ہے انتظار میں کس کے ؟ — کوئی نہیں آتا

وہ انتظار، جو مغرب کے فن نے پیدا کیا

کبھی کبھی بتِ سنگین میں یا لکیروں میں !

وہ انتظار، جو آنکھوں، لبوں نے، باہوں نے

کیا تھا، آئیں گے — لیکن کوئی نہیں آتا

وہ انتظار، جو بیگانۂ وفا نہ ہوا

کھلی ہوئی ہیں وہ آنکھیں —

کہ تھک چکی ہے نظر

مگر وہ شام و سحر مشعلیں جلائے ہوئے

تکا کریں یوں ہی محرابِ روز و شب کے پار

کہ وقت شرما جائے !

نظم کے خاتمے پر میری نظر نے پھر اہلِ حلقہ کا جائزہ لیا۔ آنکھوں میں تنقید کی الجھی
بولی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، لیکن حملہ آور ہونا ضروری تھا۔ دفعتہً انور انصاری
نے محسوس کیا ہے کہ شاعر 'انحراف' کر گیا ہے۔ اعجاز بٹالوی کا تخیل انتظار اور وفا کے

دائروں میں گھومتا ہوا محراب ابرو و لب کے پار جھانکنے لگا۔ وہ داد پر مُصر تھے۔

تنقید کی ابہامی فضا کو صدرِ جلسہ نے ایک جماہی کے ساتھ یہ کہہ کر توڑا "اب سہیل کی نظم کے بارے میں کوئی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں تو کہیں ...... ہر طرف خاموشی دیکھ کر ...

"اچھا تو میں خود تنقید شروع کرتا ہوں۔"

لیجئے صاحب تنقید شروع ہو گئی۔

میری اور حلقہ دونوں کی شومئی قسمت حفیظ جاوید اس روز پرائے بس میں تھے۔ آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسے میں وہ تنقید کی آڑ میں کیا کچھ کہہ گئے ہوں گے۔ میں کچھ دیر الجھا۔ ان کے فنی اعتراضات کا جواب میرؔ و غالبؔ کے حوالے سے دینا چاہا۔ لیکن جب میرؔ و غالبؔ پر بھی برسنے لگے تو خاموش ہو گیا۔ میں پوچھتا رہا کہ حضرات! میری نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟ جواب ملا اس میں سماجی اقدار معدوم ہیں۔ زبان کے استعمال میں جدلیاتی حقیقت پسندی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے وہ تو معاملہ زلفِ دراز کا سا طول پکڑ جاتا کہ میں نے خواتین کے قیمتی وقت اور ان کی دیگر مشغولیت کا حوالہ دیا تب کہیں جا کر گلو خلاصی ہوئی۔

اس کے بعد افسانے بھی ہوئے اور نظمیں بھی۔ داد بھی ملی اور بیداد بھی ہوئی۔ مگر میں مسلسل سوچتا رہا کہ اہلِ سخن کے بجائے کبھی کبھی سخن فہموں کی بھی آزمائش ہونی چاہیئے جسے دیکھئے نقد و بصر کا کانٹا لیئے پھرتا ہے۔ مانگے تانگے کے کچھ باٹ ہیں، دھرے اور تول دیا۔

انھیں خیالات میں غلطاں و پیچاں بارہ بجے رات کو اپنی قیام گاہ پر واپس لوٹا۔

اگلے مہینے کے آخری سنیچر کی شام کو حلقہ کا پھر جلسہ ہوا۔ وہی غلام عباس کا فلیٹ، کم و بیش وہی حاضرین۔ جلسہ شروع ہونے ہی والا تھا کہ میں نے انور انصاری سے کان میں چپکے سے کہا "آپ کو معلوم ہے آج کل میں برٹش میوزیم میں کام کر رہا ہوں، وہاں غالب کی ایک غیر مطبوعہ نادر غزل ہاتھ لگی ہے اگر صدر صاحب اجازت دیں تو اسے بھی آج کے پروگرام میں شامل کر لیا جائے۔" انور انصاری نے بڑھ کر بات اعجاز بٹالوی کے کانوں تک پہنچائی وہ منکرِ غالب کیوں کر ہو سکتے تھے، خوشی کا ایک نعرہ لگایا اور میری اس دریافت کا اعلان کیا۔ پھر کیا تھا ہر طرف سے مانگ تھی "غالب کی غزل، بھئی غالب کی غزل پہلے ہونی چاہیئے۔" منیف الرحمٰن

ادتا معفل چہرے پر اس وقت ایسی مسرت کی لہر سی تھی گویا نایاب دفینہ مل گیا ہو۔ میں نے
سے کاغذ نکالا، ناک پر عینک درست کی اور کہا "حضرات غالب کی اس غیر مطبوعہ
کا تعلق میرے خیال میں اُن کے ابتدائی دور کی شاعری سے ہے جب "خامۂ بیدل"
کا رہبر تھا۔ آپ سب سخن فہم ہیں لیجئے اسداللہ خاں کے تیور دیکھئے۔ اس کے بعد
سے یہ اشعار پڑھے:

تری افسردہ دلی بادۂ خوش رنگِ خمار
میری افسردہ دلی داغِ سویدائے بہار

جنسِ بازارِ محبت کہ ہے وصلِ زنگار
عرضِ خمیازۂ ایجاز کہ نقشِ دیوار

زندگی گرسنہ و کوہکن و تیشہ بدوش
صحنِ صحرا چمنِ شوق کو احرامِ بہار

جادۂ غم نگہ کم ہے کہ جز بیش نہیں
قیمتِ شورشِ پیہم بھی نہیں زخمۂ تار

کتنا اندوہ رُبا ہے یہ ربابِ ہستی
کس قدر عربدہ جو ہے نگہِ موجِ غبار

طلبِ ناز کہ ہے مستیٔ بیدار سے دنگ
رنگِ ہستی طلبِ شوق سے کتنا بیزار

کفِ گردوں میں اگر جامِ زمرّد نہ ہوا
حسرتِ دل میں بھی ممکن نہیں عالم کا فشار

ہم محبت کو ترا نقشِ قدم عرضِ نیاز
ہم حقیقت کو تری بندشِ غم زخمۂ تار

دیدۂ و دل غمِ ہستی سے اسد بے معنی
فیض معنی سے محبت ہوئی حرفِ اخبار

مطلع پر مکمل سکوت تھا۔ یہ کسی معمولی شاعر کا نہیں غالب کا کلام تھا۔ دوسرے شعر پر گ
ہلیں۔ بھلا غالب بغیر داد کے کیوں کر نپٹتے۔ سب سے پہلے حسبِ عادت، اعجاز بٹالوی نے لُٹ
کی، "سبحان اللہ!" اور جب میں دوسرے شعر پر تھا تو چیخ کر کہا واہ! واہ! "داغِ سودائے
ان کی آوازِ تحسین ابھی گونج ہی رہی تھی کہ انور انصاری نے پھڑک کر یہ مصرع اٹھایا ع

زندگی گرسنہ و کوہ کن و تیشہ بدوش!

اور پھر یہ نہ سوچا کہ ع

صحن صحرا چمنِ شوق کو احرامِ بہار!

صدرِ مجلس حفیظ جاوید بھی جو آج اپنے بس میں تھے، ہر شعر پر پھڑک کر داد دے رہے
تھے۔ تنقیدی تخیل بغیر آسمان کے پرواز کر رہا تھا، طلبِ ناز، دستیِ بیداد، اور کفِ گرد
بن اور ریگزار رہے تھے۔ گرسنہ زندگی کی تیشہ بدوشی تنقید کی جدلیاتی راہوں کو کھول رہی تھی
تنقید کا بحران اس وقت آیا جب چچا صدیق نے نہایت سنے تول کر تحسینی انداز میں کہا "دہی
نقشِ فریادی والا رنگ ہے" ابھی تنقیدِ داد اور بیداد کی فضا میں سانس ہی لے رہی
تھی کہ میں مقطع کی سخن گسترانہ بات تک پہنچا اور بے تحاشا ہنس پڑا۔

چچا صدیق فوراً بھانپ گئے کہنے لگے میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ "نقشِ فریادی
والا رنگ ہے۔ لیکن ان کا یہ جملہ تحسین کا نہیں اعتراف کا تھا۔ ایک صاحب جو پچھلے
کے جلسے میں موجود نہیں تھے یہ کہتے ہوئے سنے گئے "مسعود صاحب! آخر ہم لوگوں نے
کیا قصور کیا ہے؟" لیکن اعجاز بٹالوی مصر تھے کہ یہ غزل غالب کی ہو نہ ہو اس کے
بعض اشعار میں "گنجینۂ معنی کا طلسم" موجود ہے۔ "واللہ مسعود صاحب! اسے اپنی بیا
میں ضرور رکھیے گا۔"

میں نے کہا، "میں اپنی بیاض میں رکھوں یا نہ رکھوں آپ اسے حلقے کی روداد
ضرور رکھیے گا۔"

۵۳ء میں یورپ سے واپس آکر میں نے اس واقعہ پر "لندن کی ایک شام" کے عنوا
سے ایک مضمون لکھا جو علی گڑھ میگزین کے طنز و ظرافت نمبر (۵۳ء) میں شائع ہو

اعجاز بٹالوی نے بھی اِس جملات کو حلقہ کی رپورٹ میں محفوظ کر لیا اور لندن سے واپسی پر معاصر (لاہور) میں لندن کے حلقۂ ارباب ذوق کا ذکر کرتے ہوئے اس کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔

مِس ایونز کی شکایات آخر کار رنگ لائیں۔ پروفیسر فرتھ نے ایک دن بلا کر مجھ سے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ مِس ایونز آپ کے رویّے سے مطمئن نہیں ہیں۔ میں نے کہا میں ان کے طریقۂ تعلیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں خود یونیورسٹی میں اردو کا استاد ہوں، تاریخی لسانیات پر تحقیق کر چکا ہوں اس لیے میں بے معنی صوتی مشقوں میں (جو میرے نزدیک مشتبہ بھی ہیں) اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں مزید تحقیق کے لیے آیا ہوں، صوتیاتی ڈرل کے لیے نہیں۔ فوراً فرتھ کے اندر کا سویا ہوا انگریز جاگ اٹھا۔ نہایت بے رُخی کے ساتھ بولے۔ "آپ ہندوستان میں کچھ بھی ہوں، یہاں داخلہ لیا ہے تو ہمارے طریقِ کار کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ آخر کار عبدالحئی بھی تو ڈھاکہ یونیورسٹی میں بنگالی کے استاد ہیں وہ کیوں نہایت خوش دلی کے ساتھ حصہ لیتے ہیں؟" میں نے کہا "ان کی مادری زبان بنگالی ہے ممکن ہے ہندوستانی زبان کی ڈرل سے کچھ فائدہ اٹھالیں، میرے لیے تو یہ تضیع اوقات کے سوا اور کچھ نہیں۔"

مجھے اسی روز اندازہ ہو گیا کہ اب یہاں دال نہیں گلے گی۔ لسانیات کے شعبے میں ہندوستان کی زبانوں کے بارے میں صرف فرتھ تحقیق کرا سکتے تھے اور وہ صدرِ شعبہ کی حیثیت سے انتظامی کاموں میں بہت مصروف رہتے۔ اس سے جو وقت بچتا تو اپنے صوتیاتی نظریے کی قطع و برید میں مصروف رہتے جس سے انھیں علمی حلقوں میں شہرت ملی تھی۔ میری خواہش دراصل یہی تھی کہ اس نظریے کا اردو کے بعض صوتیاتی پہلوؤں پر اطلاق کروں۔ اس پر میں نے انھیں طویل مضمون لکھ کر دکھایا تھا جس سے وہ بہت مطمئن تھے۔ کہنے لگے اس سے قبل صرف ڈاکٹر ڈوشونا تھ پر ساد نے بھوجپوری پر کے نظریے کو آزمایا ہے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لی ہے۔ لیکن میری ساری ریاضت دھری رہ گئی اور "مِس خام" باتیں بنے گئیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اب یہاں [illegible] لیے کوئی جگہ نہیں۔

گرما کی تعطیلات میں چند ساتھیوں کے ساتھ پیرس گھومنے گیا۔ گھومنے کیا ٹٹولنے گیا کہ وہاں لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں کیا سہولتیں مل سکتی ہیں۔ وہاں کالج دُ فرانس میں مشہور مستشرق اور میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے استاد لوئی ماسیوں Louis Massignon درس دیتے تھے۔ پاس میں صوتیات کا ادارہ Institute de Phonetique واقع تھا جس کے ڈائرکٹر پروفیسر پیئرفوشے تھے۔ میں نے دونوں حضرات سے رابطہ قائم کیا اور ان کی جانب سے ہمت افزائی پاکر پیرس منتقل ہوجانے کا منصوبہ بنالیا۔ چنانچہ داخلے کے فارم اسی وقت بھر دیئے اور فرانسیسی سیکھنے کے لیے Alliance Francaise میں نام درج کرالیا۔ اس طرح تعطیلات کو بامقصد بنالیا۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں مَیں باقاعدہ طور پر پیرس منتقل ہوگیا جہاں میری خوش قسمتی سے یونیورسیٹیر Cité Universitaire (شہر جامعہ) کے مرکزی ہوسٹل Maison Internationale (بین الاقوامی دارالاقامہ) میں مجھے سنگل سیٹ کا کمرہ مل گیا۔

پیرس میں میرے سامنے اب دو محاذ تھے ایک تحقیق اور دوسرا فرانسیسی زبان میں مہارت حاصل کرنے کا۔ دن بھر سوربون، لانگ زو (السنہ مشرقیہ کا اسکول) اور ببلوتک نیسونال (نیشنل لائبریری) میں گذرتا اور شام میں ایل یانس فرانسیز Alliance Francaise میں جہاں دو شفٹوں میں فرانسیسی زبان کی پڑھائی ہوتی تھی مجھے فرانسیسی کا پڑھنا اور لسانیات پر فرانسیسی میں لکھی ہوئی کتابوں سے استفادہ کرنا بہت جلد آگیا۔ اس لیے کہ انگریزی اور فرانسیسی کی علمی اور اصطلاحی زبان میں حد درجہ یکسانی پائی جاتی ہے لیکن ابھی دوسری سطحات تحریری اور تکلمی پر بہت کام کرنے کی ضرورت تھی۔ لانگ زو میں میری ملاقات دو فرانسیسی طالب علموں سے ہوئی موسیو اُرزُواں اور مادام لِلیان نَدرو۔ ایک ہندی سیکھ رہا تھا اور دوسری اردو۔ دونوں سے باہم دگر تبادلہ کا پروگرام بن گیا۔ اس طرح میری فرانسیسی بولنے کی مہارت تیزی سے بڑھنے لگی۔ فرانسیسی زبان کے املا اور تلفظ میں زمین آسمان کا فرق ہے اس کے لیے قدم قدم پر اہل زبان کی رہبری کی ضرورت بڑی ہے لکھا جاتا ہے 'پیرس' پڑھا جاتا ہے 'پاری'، لکھتے ہیں 'ورسیلز' بولتے ہیں 'ورسائی'۔ میں اِن دونوں کا ممنون ہوں کہ اِن سے لین دین میں فائدہ میرا زیادہ ہوا۔ مادام للیان ندرو جو بہت اچھی انگریزی بھی جانتی تھیں اور ان کے شوہر 'ندرو'، جن کا تعلق ماریشس سے تھا

اور جو مسلمان تھے، صحافی تھے، وہ بھی فرانسیسی اور انگریزی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان دونوں کی مدد سے میرے مقالے کی زبان کی نوک پلک درست کرنے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ میں نے انھیں اس کا معاوضہ بھی دیا لیکن اس سلسلے میں ان لوگوں نے جو محنت کی وہ معاوضے سے کہیں زیادہ تھی۔ خود مجھ سے مادام نُذرو نے اردو کے سلسلے میں استفادہ کیا کہ موسیو نُذرو کے انتقال کے بعد وہ ایک وظیفہ پر کراچی یونیورسٹی آئیں اور گارساں دتاسی کی تاریخ ادبیاتِ ہندی و ہندستانی کا اردو میں ترجمہ کر کے اور اس پر حواشی لکھ کر وہاں سے اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کام کے لیے ان کے نگراں پروفیسر ابو اللیث صدیقی اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری تھے۔ اتفاق سے یہ مقالہ جانچنے کے لیے علی گڑھ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کو بھیجا گیا جو گارساں دتاسی کے خطبات کے مترجم تھے۔ چوں کہ وہ اس زمانے میں پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے انتظامی امور میں بہت معروف رہتے تھے، اس لیے انھوں نے مقالے کو میرے سپرد کیا۔ میں نے اس ذمہ داری کو بہ خوشی قبول کیا۔ شاید مادام نُذرو کو (جنھوں نے اب کناڈا کے ایک فرانسیسی سے شادی کر لی ہے) یہ معلوم بھی نہ ہو کہ ان کا پیرس کا علمی قرض میں نے اس طرح ادا کر دیا۔ لیکن اس میں کوئی طرفداری کا پہلو نہیں رہا۔ وہ مقالہ واقعی اس قابل ہے کہ شائع کیا جائے۔ دو سال قبل جب میں کراچی گیا تھا تو فرمان فتح پوری سے اس کا تذکرہ آیا۔ معلوم ہوا کہ اس وقت مادام نُذرو اپنے فرانسیسی شوہر (؟) کے ساتھ جنوبی کوریا کے شہر سیول میں مقیم ہیں، جہاں ان کے شوہر کناڈا کے سفارت خانے میں کام کر رہے ہیں۔

موسیو اُردواں بھی فرانس میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وارد ہند ہوئے۔ پہلے کیرالہ میں قیام کیا، وہاں انھوں نے ایک ملیالی لڑکی سے شادی کی۔ بعد کو فرانسیسی کے اُستاد کی حیثیت سے اُن کا دہلی یونیورسٹی میں تقرر ہو گیا، جہاں کچھ عرصے پہلے وہ اپنی بیوی اور بچی کے ساتھ مقیم تھے۔ ایک بار علی گڑھ آ کر میرے یہاں چند روز قیام بھی کیا۔ انھوں نے ہندی میں وہ کمال حاصل نہیں کیا جو مادام نُذرو نے اردو میں کیا۔

کئی سال کی محنت شاقہ کے بعد مجھے بالآخر فروری ۱۹۵۳ء کو Doctorat

[illegible] سے نوازا گیا۔ اور میرا مجموعی نمبر

Très Honorable (نہایت معزز) رہا۔ پروفیسر لوئی ماسیون، پروفیسر فوشے اور پروفیسر سوریو نے میرا زبانی امتحان لیا۔ فرانس میں زبانی امتحان کے لیے صلائے عام ہوتی ہے۔ سوریو جمالیات کے پروفیسر تھے اور ان کے ساتھ میں نے ایک ضمنی پرچہ Question Supplemantaire تیار کیا تھا، جس کا عنوان تھا "شعر کے تخلیقی عمل میں قوتِ ارادی کا حصہ"۔ یہ جمالیات سے متعلق ہے۔ پیرس یونیورسٹی میں تحقیق کے خاص موضوع کے علاوہ متجانس علوم میں دو مختصر رسالے بھی تیار کرائے جاتے ہیں تاکہ طالبِ علم کی نظر میں وسعت رہے۔ اسے ضمیمہ کا سوال کہا جاتا ہے۔

میرا پیرس کا قیام کئی اعتبار سے سودمند رہا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ فرانس کی روایتی آزاد فضا میں آزاد ہندوستان کے طالبِ علم کو وہ گھٹن محسوس نہیں ہوتی تھی جس کا احساس اس زمانے میں انگلستان کی یونیورسٹیوں میں قدم قدم پر ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ آقا اور غلام کے نئے رشتے استوار ہونے کے لیے کم از کم ایک نسل کی مدت چاہیے اور میں انگلستان آزادی ملنے کے تیسرے سال چلا گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں میرے ذہن کی بھی کوتاہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز کے علاوہ اگر میں آکسفورڈ یا کیمبرج میں ہوتا تو یہ صورت پیش نہیں آتی۔ لیکن اسکول ایسے راندۂ درگاہ انگریزوں سے بھرا پڑا تھا، جو عالم بن کر ہندوستان میں رہے، کوئی زبان نہیں سیکھی اور انگلستان جا کر السنۂ مشرقیہ کے ماہر بن بیٹھے۔ میرے جذبات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک بار کسی کام سے میں پاکستانی سفارت خانے گیا۔ وہاں دیکھا کہ لفٹ کو اوپر لے جانے پر ایک سفید پگڑی والا مامور ہے۔ اپنا کام ختم کر کے جب لوٹا تو اس وقت بھی وہ موجود تھا۔ مجھے نیچے لے جا کر اس نے لفٹ کا چارج دوسرے شخص کو دے دیا۔ اب اس کی ڈیوٹی ختم ہو گئی تھی۔ سفارت خانے سے ہم دونوں نکل کر زمین دوز ریل (ٹیوب) کے اسٹیشن کی جانب چلے۔ راستے میں وہ ہم کلام ہوا تو میں نے بھی دریافت کیا، حضرت آپ یہاں کیسے؟ وہ خاصی روانی کے ساتھ انگریزی لہجے میں اردو بول لیتا تھا۔ کہنے لگا کیا کرے جب سے ہندوستان سے آیا ہے سب مزہ بھول گیا، ہم یہ کرتا ہے اور ہمارا بیوی بڑا لوگ کے فلیٹ کا فرش رگڑتا ہے۔" اس کے بعد اس نے اپنی بیگم کی محنت شاقہ

کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایسا محاورہ استعمال کیا جو ناگفتنی ہے اور میں کہتا ہوا ٹیوب میں چڑھ گیا کہ یہ بات تم اپنے لیۓ کہہ سکتے ہو اپنی میڈم کے لیۓ مت بولا کرو۔

اسی طرح ایک اور واقعہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں ۵۱ء میں پہلی بار انگلستان سے فرانس گیا تو ریل میں اپنے ساتھ ایک انگریز کو بیٹھا ہوا پایا۔ پہلے تو اُس نے اِس ڈینٹو کو اِس لائق نہیں سمجھا کہ ہم کلامی کا شرف بخشے۔ لیکن جب سفر اور سکوت کی اکتاہٹ زیادہ بڑھی تو اس نے مختصر سوالوں میں گفتگو شروع کر دی۔ مجھے انگریزوں کے دکھڑ سکوت، کو توڑنے میں بڑا مزہ آتا ہے ایک دفعہ جب اُس کو اس لحاظ سے زچ کر لیتا ہوں تو پھر بے تکلّف گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیتا ہوں۔ چنانچہ یہی اُس وقت ہوا۔ تھوڑی دیر کی بات چیت میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اُس خطّۂ ارضی سے بخوبی واقف ہے جہاں سے میرا تعلق ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ ۴۷ء سے قبل یو۔پی کے فلاں گورنر سے اس کی قرابت داری رہی ہے اور اُس کے توسط سے وہ اس صوبے کے بیشتر زمینداروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ترائی کے جنگلوں میں شیر کا شکار کھیل چکا ہے۔ اُس نے خاص طور پر نواب صاحب بامنیت اور یو پی کے کئی اور بڑے جاگیرداروں کے نام لیۓ۔

تھوڑی دیر میں پیرس کا ریلوے اسٹیشن آ گیا۔ میں قلی کی تلاش میں ڈبّے کے باہر کھڑا ہوا تھا کہ وہ صاحب بہادر، لاٹ صاحب کے عزیز شیر افگن اپنے دونوں ہاتھوں میں دو بڑے بڑے سوٹ کیس لٹکائے ہانپتے کانپتے لپکتے جا رہے تھے!

ع دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

پیرس کی فضا لندن سے بالکل مختلف تھی۔ وہاں حاکم و محکوم کی کوئی یادیں درمیان میں نہیں تھیں۔ یوں بھی فرانسیسی بنیادی طور پر بیروں بیں قوم ہے اور انگریزوں کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ یہ "جھینپو" ہوتے ہیں اور اپنے بودے پن کو چھپانے کے لیۓ دبے رہتے ہیں۔ اُن کی کم سخنی اور دیر آشنائی کا یہی راز ہے۔ فرانس میں رنگ و نسل کا امتیاز بھی کم ملا۔ میں نے یہاں بار ہا کالوں کے بازوؤں پر حسین فرانسیسی دوشیزاؤں کو لٹکے دیکھا۔ اپنے ہاسٹل میں ایک گورے اور کالے کے درمیان برابر کی مکّا بازی دیکھی تو رنگ روپ کے اعتبار سے میرا شمار درمیانی زمرے میں تھا لیکن بیشتر فرانسیسی مجھے اطالوی ہسپانوی، یا ترک سمجھتے تھے۔ اس لیۓ رنگ و نسل کے تعصب سے مجھے کبھی دوچار نہیں ہونا پڑا۔ اور

اس لحاظ سے میں فرانسیسی سماج کے ہر طبقے میں اچھی طرح گھل مل جاتا تھا۔ البتہ زبان کے روزمرّے کی نزاکتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی شرمندگی اٹھانا پڑتی تھی خاص طور پر جب فرطِ زبان سے فرانسیسی میں "تمہیں سونا چاہتا ہوں" کے بجائے "میں ساتھ سونا چاہتا ہوں" نکل جائے۔ ان کے لاطینی مزاج میں وہی گرم اختلاطی پائی جس کا اقبال نے اسپین میں مشاہدہ کیا تھا اور اپنی نظم مسجد قرطبہ میں ذکر کیا ہے۔

پیرس کو جس قدر انسان نے اپنی تخلیقی کاوشوں سے حسین بنا لیا ہے فطرت نے بھی بُخل سے کام نہیں لیا ہے۔ پیرس میں میرا پہلا سابقہ وہاں کی خزاں سے اکتوبر ۱۹۵۰ء میں پڑا تو کشمیر کی خزاں یاد آگئی:

سونا اُگل دیا ہے فرنگی خزاں نے آج
شرما دیا بہار کو زخمِ نہاں نے آج
بادِ سحر میں بڑھ گئیں کچھ سرد مہریاں
کیا بے رخی دکھائی ہے آبِ رواں نے آج
برگِ خزاں سے پوچھئے بخشا ہے کس نے رنگ
تیری حنا نے یا مہکے خونِ جواں نے آج
مسعود اعتبارِ بہاراں بڑھا دیا
رنگینیٔ زوال و غمِ جاوداں نے آج

(پیرس ۱۹۵۱ء)

قیامِ یورپ کا اثر ہندوستانیوں پر مختلف انداز میں مرتب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے اپنی خودنوشت "یادوں کی دنیا" میں اس کا ذکر نہایت مثبت انداز میں کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مجھے تولون میں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بڑے بڑے جنگی جہاز نہ تھے بلکہ نسوانی حسن تھا۔ میں نے ایسا باغ و بہارِ حسن اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔۔۔ رنگ گورا، آنکھیں اور بال سیاہ قد بوٹا سا ۔۔۔۔ چال کا انداز، بقول داغ

شہر جگمگے، وہ جہاں سرو و باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیمِ بہار ہو کے چلے "

تو ورن کے قہوہ خانے میں بیٹھ کر جب میں فطرت اور انسان کے حسن کا مشاہدہ
کر رہا تھا تو معاً مجھے غالب کی گل والی غزل یاد آئی:

تیرے ہی جلوے کا ہے وہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل "

خود میرے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے تھے، لندن میں نہیں بلکہ فرانس پہنچ کر۔ لندن میں تو میں مغربی تہذیب کا ناقد ہی رہا جیسا کہ میری نظم 'انتظار' سے ظاہر ہے جو میں نے نومبر ۵۰ء میں لکھی تھی، جس کا تذکرہ اس سے قبل آچکا ہے۔

پیرس کے ایک سال کے قیام کے اندر وہ حادثہ پیش آیا جس نے میرا قبلہ مغرب سے موڑ کر مشرق کی طرف کر دیا۔ 'انتظار' کے ٹھیک ایک سال بعد (نومبر ۱۹۵۱ء) پیرس میں میں نے نظم "مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر" لکھی جو خود تشریحی حیثیت کی مالک ہے:

چلی گئی وہ امیدوں کے قافلے لے کر
مرے خیال کو دھندلا سا دے کے اک پیکر
یہ آسماں پہ گہر اور زمین پہ پتھر
یہ سوچتا ہوا شاعر، یہ سوچتا منظر
کوئی بہار سے پوچھے، بہار میں کیا ہے
وہ کہہ گئی تھی کہ آئے گی پھر، نہ آئی مگر
دلوں میں چھوڑ کر انگڑائیاں ادھوری سی
کدھر گئی ہیں وہ بانہیں، وہ لب، وہ زلف کدھر!
ہوا یہ اس کی محبت میں اجنبی احساس
کسی کی زلف بلا بن کے آئی اپنے سر

پتہ نہ تھا کہ حقیقت یہاں فسانہ ہے - ۲

خبر نہ تھی کہ محبت یہاں ہے راہ گذر

ہر آستاں سے پھرائے اپنا کاسۂ چشم

مرا جنوں مجھے لاتا ہے پھر ترے در پر

قبول کر کہ مجھے دے کر ستارۂ مژگاں

ترے ہی گھر کے ہوا سب گھر نجوم سحر

مہ و ستارہ ہیں میری زمیں سے دور بہت

کنار خاک میں ملتا نہیں انھیں محور

مہ و نجوم کا عالم مجھے عزیز کہ تو

مری زمین ہے بہتر کہ آسماں بہتر ؟

قیام یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے تنہائی کا احساس ایک مشترک تجربہ ہے جو وہاں کے 'بتان خود آرا' کے ہجوم اور 'بادہ ہائے ناب گوارا' کی لذتوں کے باوجود کم نہیں ہوتا۔ میں اسے کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ محسوس کرتا تھا۔ میرے لیے یہ احساس لندن کی گھٹی گھٹی فضا ہو کہ پیرس کا آزاد ماحول، ہر جگہ یکساں رہا۔ اسی لیے میری اس دور کی نظمیں اور غزلیں میری سب سے اچھی غزلوں نظموں ہیں۔ نظموں کے نمونے دیکھ چکے۔ اب چند غزلوں کے اشعار سنیے۔

لندن ۱۹۵۱ کی ایک غزل :

مری غزل ترا صدقہ، مری نوا ترا غم

یہ موت موت ہے اور توڑ دوں میں قلم

ترا خیال، تری یاد، میرا فن، مرا شوق

ہنر کا باقی رہے کوئی بھی نہ پیچ و خم

وہ انتظار کہ آنکھوں نے آہٹیں سن لیں

یہ دھڑکنیں ہیں کہ ہوتی نہیں کبھی مدھم

تری وفا کے تصور سے کانپ اٹھتا ہوں
مرے جنوں میں یہ انداز ہیں مگر کم کم
گلوں میں، غنچوں میں، تاروں میں ڈھونڈتا ہی رہا
مگر وہ آنکھ جو ہر دم کسی کے غم میں تھی نم!
جنوں نے بخیہ گری آج بھی نہیں سیکھی
تری مژہ کا تصور مگر رہا پیہم
ہجوم لالہ و گل اور یہ بے شمار خطوط
ہزار نقش ملے پر نہ مل سکا آدم
کدھر ہے تو مرے مشرق، اے مرے مشرق!
عزیز جام سفالیں ترا، تری شبنم

انتظار، دوری، تنہائی، وفا اس دور کی شاعری کے کلیدی لفظ ہیں جو اس زمانے کی ذہنی کیفیت کی غمازی کرتے ہیں:

خیالِ دوریٔ جاناں سے آنکھ بھر آئی
خبر نہیں کہ محبت نے کیا قسم کھائی (لندن اکتوبر ۵۰ء)

آپ دامانِ صبا باندھتے ہیں
کس سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
کتنے پرکار ہیں خوبانِ فرنگ
دل کو زلفوں سے سوا باندھتے ہیں (لندن، مارچ ۵۱ء)

مغرب کی فضا میں 'پیمانِ وفا' کی تلاش عبث ہے اس لیے کہ ـــ

نہ بام و در، نہ فضا میں، نہ آسماں ہم راز
مری نوا کو مگر اجنبی دیار ملا

خیالِ دامنِ اُلفت کہاں، کہاں مقصود
وہ نارسائی رہا اور شرمسار ملا (پیرس ۱۹۵۱)

اس نارسائی کے باوجود مَیں مغربی تمدن کا ان معنوں میں نقاد نہیں رہا جن معنوں میں اقبال تھے۔ اقبال کی نظر اس تہذیب کی مادیت پر رہی ہے اسی لیے کہا ہے:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بَر سے مجھے
فرنگ رہ گزرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

لیکن اس قسم کا کوئی رَدِّعمل میرے یہاں پیدا نہیں ہوا۔ غالباً اس کی وجہ ہوگی کہ میں فلسفیانہ سطح پر نہیں سوچتا تھا۔ اقبال کی تنقیدِ مغرب تمام تر اسی سطح کی ہے:

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اِسے
فرنگ دل کی خرابی، خرد کی معموری

میں جب یورپ گیا ہوں تو میری عمر ۴۱½ سال کے قریب تھی۔ اقبال کے مذکورہ بالا اشعار (پہلے شعر کو چھوڑ کر) اُن کے دوسرے سفرِ یورپ کی یادگار ہیں جب ان کی عمر ۵۵ سال کی تھی۔ پہلے سفرِ یورپ کے وقت وہ البتہ ۲۸، ۲۹ سال کے تھے۔ 'ازتکاب جرمِ الفت'، کی اس دور کی یہ داستان سُنیے:

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو
رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے

حُسنِ نسوانی ہے بجلی تیری فطرت کے لیے
پھر عجب یہ ہے کہ تیرا عشق بے پروا بھی ہے

ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب
اے تلوّن کیش تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

مغرب کی جانب ہندوستانی ذہن کے ردعمل کی مختلف سطحیں تھیں سیاسی، معاشرتی اور فلسفیانہ۔ سیاسی سطح پر میرے دل میں انگریزوں کی جانب سے جو تلخی بھری ہوئی تھی وہ پیرس جا کر ختم ہو گئی۔ معاشرتی سطح پر میں نے لندن اور پیرس کو ایک سا پایا، بجز اس کے کہ انگریز لئے دیئے رہتا۔ فرانسیسی زیادہ کھلے دل سے ملتا۔ فرانسیسی لڑکیوں کے یہاں انگریز لڑکیوں سے زیادہ گل افشانیٔ گفتار اور گرم اختلاطی پائی۔ دونوں جگہ جنسی آزادی اور رواداری، مشرق سے کہیں زیادہ دیکھی سوائے اس کے کہ فرانسیسی اپنا الٹا ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بوقت ضرورت کی حفاظت کے لیے سیدھے ہاتھ سے تلوار کھینچ سکے اور انگریز اپنا بایاں ہاتھ عورت کے بازو میں ڈال کر چلتا ہے تاکہ بہ آسانی اسے نالے میں ڈھکیل سکے۔

یورپ میں ہندوستانی نوجوانوں کو سب سے زیادہ خیرہ کرنے والا وہاں کا حُسن نسوانی ہے۔ خاص طور پر نسوانی حسن کے وہ ڈھلے ہوئے پیکر جو لاطینی ممالک (فرانس، اٹلی، اسپین وغیرہ) میں ملتے نظر آتے ہیں، ان کے لیے بے حد جنسی کشش رکھتے ہیں۔ ان کے جسم کے کمبخت دلآویز خطوط، یقیناً مشرقی حُسن کے پیکروں سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ ان کو قیام، بھی زیادہ رہتا ہے 'بیسی اور چھبیسی' کی مثل اُن پر صادق نہیں آتی۔ ان کی جانب منفی اور مثبت دو قسم کے ردِّعمل ہوتے ہیں لیکن دونوں سے ان کی یکتائی کا اثبات ملتا ہے۔ ایک ردِّعمل اقبال جیسوں کا ہے۔

یہ حوریانِ فرنگی دل و نظر کا حجاب
بہشتِ مغربیاں جلوہ ہائے پا بہ رکاب
دل و نظر کا سفینہ سنبھال کر لے جا
مہ و ستارہ ہیں بحرِ وجود میں گرداب

دوسرا ردِّعمل اقبال کے ناقد ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے یہاں ملتا ہے (یادوں کی دنیا) جنھوں نے لندن کے حسینوں کو دیکھ کر اقبال کے استاد داغؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

ٹھہر گئے وہ جہاں سرو باغ تھے گویا
اگر چلے تو نسیم بہار ہو کے چلے

میں نے ڈاکٹر یوسف حسین کی طرح حسن کے ان نمونوں کو تنقیدی سے زیادہ تحسینی انداز میں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے مجموعی طور پر اقبال یورپی تمدن سے انصاف نہیں کر سکے ہیں۔

مغرب کے نازو نوش کے اس ماحول میں بھی میں 'لال پری' سے دور رہا۔ اس میں اس قدر مذہبی قدغن کا خیال نہ تھا جتنا کہ اپنی صحت اور خاندانی روایت کا۔ یہی صورت سگریٹ نوشی کے سلسلے میں رہی جس کا مجھے تا حال کوئی تجربہ نہیں۔ اس کے بارے میں تو میرا خیال ہے کہ اسلامی ممنوعات و مکروہات میں اسے بھی سکہ مُت سے لے کر شامل کر لینا چاہیئے۔ اگر امتناعِ شراب اور تحفظِ زن عالمی تہذیب کو اسلامی تحفہ ہے تو امتناعِ تمباکو نوشی سکہ مُت کا۔

پیرس کے دورانِ قیام ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور بشیر حسین زیدی صاحب وہاں پہنچے عابد صاحب کے قیام کا انتظام میں نے بیچ یونیورسٹی کے قریب ایک ہوٹل میں کیا تھا۔ کھانے کے لئے وہ میرے یہاں آجاتے۔ ایک روز زیدی صاحب نے جو یونیسکو میں شرکت کرنے ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، مجھ سے کہا کسی دن ہمیں 'ورسائی' کا محل دکھلا دیجئے۔ چنانچہ عابد صاحب کے ہمراہ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ کئی گھنٹے تک لوئی چہاردہم کے اس بے مثال محل کی سیر کی۔ لنچ نکل کر پاس کے ایک ریستوران میں کیا۔ چونکہ فرانسیسی سکہ دو فرانک، قیمت میں بہت ہلکا ہوتا ہے، اس لیے بل ہزاروں تک پہنچا۔ بیرا جب بل لایا تو میں نے چاہا اس میں شرکت کر لی جائے تاکہ کسی ایک پر سارا بوجھ نہ پڑ جائے۔ لیکن زیدی صاحب نے علی گڑھ کے سینئر کی روایت کے تحت ایسا نہیں ہونے دیا۔ ریستوران سے نکلتے وقت میں نے عابد صاحب سے اپنی قلبی بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "زیدی صاحب کا آج بہت خرچ ہو گیا"۔ قلبِ مطمئنہ کے ساتھ اپنے مخصوص لکنت کے انداز میں بولے "مسعود صاحب! اِن کا تو خرچ ہوتا ہی رہتا ہے"۔ میں چپ تھا!

پیرس کے دورانِ قیام 'انسٹی ٹیوٹ دو نینیک' کی تجربہ گاہ میں میں نے اردو عروض کے سلسلے میں ایک انوکھا تجربہ کیا۔ میرا عرصے سے خیال تھا کہ تمام کلاسیکی عروضوں، عربی، سنسکرت، لاطینی

ب موجودہ زبانوں پر اطلاق کیا جاتا ہے تو اُن کے جسم پر جامۂ عروض، تنگ ہو جاتا ہے ۔ اسی کو
نلف زحافات سے پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اتفاق سے انسٹی ٹیوٹ میں میرے ایک
نی ایرانی اور دوسرے عرب تھے ۔ میں نے اپنے نکتہ کو ثابت کرنے کے لیۓ ان کی خدمات حاصل
)۔ اس کے بعد حافظ کی مشہور غزل جو بحرِ مضارع مثمن سالم میں ہے ۔ اس کے دو مصرعے کے
اور غالب کا ایک اردو مصرعہ :

(۱) الا یا ایھا السّاقی اَدِر کاساً وناولہا (عربی)

(۲) کہ عشق آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا (فارسی)

(۳) ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے (اردو)

اس کے بعد تینوں نے اپنے اپنے مصرعے بآوازِ بلند پڑھے جنھیں ٹیپ کر لیا گیا۔ لطف یہ تھا کہ
ہم سب ایک ہی بحر کو استعمال کر رہے تھے لیکن ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو خارج از وزن قرار
ے رہا تھا۔ ایرانی، عربی کے مصرعے کو بھی اپنے انداز میں پڑھ کر کہتا اس کو یوں نہیں یوں پڑھو۔ عرب
ہتا تھا کہ تم عربی کا مصرع پڑھ ہی نہیں رہے ہو۔ جہاں تک غالبؔ کے مصرعے کا تعلق تھا دونوں بہ یک
زبان اسے خارج از وزن بتاتے تھے ۔ اس تجربے کے بعد یہ بات ثابت ہوئی کہ تینوں زبانوں کا عروض
ایک ہوتے ہوئے تینوں زبانوں کا "سُر لہجہ" (Intonation) مختلف ہے۔ یہ سُر لہجہ ایک ہی بحر
پر اس طرح حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کی صوتی نوعیت بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔ اس طرح عروض
ایک پیمانہ ہے جس سے زبان کا سُر لہجہ بہہ نکلتا ہے ۔ اس لیۓ ہر زبان کو اپنا عروض اُس زبان کے
سُر لہجہ کے مطابق مرتب کرنا چاہیے ۔

میرے اس تجربے کو انسٹی ٹیوٹ کے اساتذہ اور ریسرچ کے طلبہ نے بہت غور سے
سنا اور اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ اسی طرح لاطینی بنیاد عروض کو انگریزی، جرمن، فرانسیسی زبا
کے سُر لہجہ (Intonation) کے حوالے سے دیکھا جائے۔ میرا خیال ہے اس انداز کے مطالعے
سے ہم زحافات کے چکروں سے باہر نکل آئیں گے، اور ہر زبان کے سُر لہجہ پر اس کے عروض
کی بنیاد قائم کر سکیں گے۔ اس کے لیۓ ضرورت اس بات کی ہے کہ توضیحی لسانیات نے
صوتیات کے بارے میں جو گہری بصیرت دی ہے اس سے کام لیا جائے۔ اردو عروض کی

نئی تشکیل کے وقت ہمیں ہندی چھند کے اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا لیکن مغلت ان کی طرح اس کی نقل کرنا ضروری نہیں بلکہ اس کے جائزے کے لیے بھی ہمیں علم صوت کے جدید علم کا اطلاق کرنا ضروری ہے

پیرس میں میرے کچھ مہینے قدرے تنگ دستی میں گزرے۔ لندن سے وہاں منتقل ہونے میں میرا کافی خرچ ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد یونسکو کے ایک ہندوستانی افسر مسٹر ڈھینگڑا کی عنایت سے مجھے انگریزی سے اردو میں اخبارات کے لیے خبروں کا ترجمہ کرنے کا کام ملنے لگا۔ یونسکو میں ترجمہ کا نرخ بالا تھا۔ اس لیے میرے پاس اس قدر پیسے بچ جاتے تھے کہ میں ضرورت کی کچھ چیزیں خاص طور پر کتابیں خرید سکوں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ یونسکو میں ترجمے کا کام جب مجھے ملنے لگا تو ظاہر ہے کہ کسی پہلے مترجم کا نقصان ہوا ہوگا۔ انھوں نے پاکستانی سفارت خانے کے ذریعہ یہ اعتراض کرایا کہ جو اردو ترجمے اب اخبارات کیلئے کیے جا رہے ہیں انھیں پاکستانی اخبارات کو قبول کرنے میں تامل ہے، اس لیے کہ ان کی زبان معیاری نہیں ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ کسی ہندوستانی ہندی داں سے کرائے جا رہے ہیں۔ یونیسکو کے ڈپٹی ڈائریکٹر اس معاملے کو ڈھینگڑا صاحب کے نوٹس میں لائے جنھوں نے میری سفارش کی تھی۔ ڈھینگڑا صاحب نے لکھ بھیجا کہ ان ترجموں کا کرنے والا فلاں آدمی ہے جو مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہے۔ اس کی اردو پر حرف نہیں رکھا جا سکتا اس لیے کہ علی گڑھ اردو کا ٹکسال ہے۔

اس کے بعد پاکستانی سفارت خانے سے نہ کوئی جواب آیا اور نہ کوئی اعتراض۔ ڈپٹی ڈائریکٹر یونسکو نے مجھے چلتے وقت بڑا اچھا سارٹیفکٹ دیا اور اس بات کا اندیشہ ظاہر کیا کہ اب پھر ہمارے یہاں ہندوستان اور پاکستان کی اردو کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔

فروری ۱۹۵۳ء میں زبانی امتحان سے فارغ ہو کر وطن واپسی کے لیے رخت سفر باندھا دوستوں نے ہر چند کہا پیرس کی ایک بہار تک اور رک جاؤ۔ لیکن اب آنکھوں میں کوئی اور ہی بہار بسی ہوئی تھی۔ میں نے رود بار انگلستان کو اسٹیمر کے ذریعے پار کیا اور ساؤتھمٹن

اپنا بحری جہاز پکڑا، جس کا ریزرویشن بہت پہلے کرا چکا تھا۔ پھر وہی راستہ جبل الطارق پورٹ سعید
ان، بالآخر دو ہفتے کے بعد بمبئی پہنچا۔ بمبئی سے سیدھا حیدرآباد کا رُخ کیا جہاں یوسف میاں
الماجہ میرے منتظر تھے۔ چند روز کے قیام کے بعد قائم گنج کے لیے روانہ ہو گیا۔ ہندوستان کی
لی بسری تہذیب کا پہلا مظاہرہ اس وقت ہوا جب گاڑی آگرے سے قائم گنج کی جانب چلی۔
ن پر شور سنا "ہولی ہے ہولی ہے" اور اس کے ساتھ ریل کے ڈبّوں پر تازہ گوبر اور کیچڑ اور
زوں کی بارش شروع ہو گئی۔ ڈبے میں ہولی کی وجہ سے صرف چند مسافر تھے۔ جب پتھراؤ بڑھ
ؤں نے کھڑکیوں کے ٹوٹتے ہوئے شیشوں سے مامون رہنے کے لیے بیت الخلا میں پناہ لی۔
عالم میں کاس گنج پہنچا، جہاں میرے ماموں زاد بھائی بدر عالم خاں اور ایک محلے دار حکیم مسعود عالم خاں
لینے آئے تھے۔ وہ تو میری طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ اچانک میں بیت الخلا سے برآمد ہوا۔
میں دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ حکیم صاحب نے ڈانٹ کر مجھ سے کہا کیا ہولی کے دن بھی
فر کیا جاتا ہے، میں نے کہا ہرگز نہیں، بھول گیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ سبق آج تک یاد ہے، اس
یے کہ اکیسویں صدی کے باب داخلہ پر کھڑے ہونے کے باوجود ہماری "سبھیتا" کا رنگ ڈھنگ
بھی تک نہیں بدلا ہے۔

لیکن کچھ دیر بعد قائم گنج پہنچ کر سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ اسٹیشن پر استقبال کے
لیے عزیزوں کا جمِ غفیر تھا۔ میرا بچہ جاوید بھی کسی کی گود میں تھا۔ اب وہ تین سال کا ہو گیا تھا۔ رشتے
کے چچا منظور احمد خاں کے ایما پر استقبالیہ کی تقریب ترتیب دی گئی تھی۔ سب سے پہلے اسٹیشن
سے مجھے جلوس کی شکل میں ددھیال کے مکان لے جایا گیا، وہاں اُن کی جانب سے چائے پانی کا
انتظام تھا۔ یہ بالکل اسی انداز میں کیا گیا تھا جیسا کہ ۲۷ برس پہلے ذاکر میاں کی جرمنی سے
واپسی پر ہوا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر ننہال گیا۔ نانی صاحبہ منتظر تھیں؛ کوئی اور بھی انتظار
کر رہا تھا۔ سب نے خوش آمدید کہا سوائے میرے بچے جاوید کے جس نے ایک اجنبی کو اہمیت
دیئے جانے پر اپنا ردّ عمل ایک "فری ہینڈ اسٹروک" کی شکل میں ظاہر کیا۔ نانی صاحبہ جھپٹ پڑیں۔
وہ تو سب نے ہائیں ہائیں کہا تو بچ گئے "ورنہ صاحب زادے پٹ جاتے۔

[illegible]

میں اکیلا علی گڑھ چلا گیا۔ اِس مرتبہ بڑی مشکل سے انجینیرنگ کالج کوارٹر نمبر ۴ الاٹ ہوا جس
میں ایک ٹی۔بی کی مریضہ رہ چکی تھیں۔ اس لیے کچھ عرصہ اس کی قلعی وغیرہ کرانے میں لگا، اس کے
بعد بیوی بچے کو لانے کے لیے پھر قائم گنج چلا گیا

ابھی ہم لوگ اپنے نئے گھر میں ٹھیک سے جمنے بھی نہیں پائے تھے کہ قائم گنج سے
نانی صاحبہ کے انتقال کی خبر ملی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ صرف میری ولایت سے واپسی کا انتظار
کر رہی تھیں !

نواں باب

علی گڑھ (۳)

(۵۳ تا ۵۹ء)

علی گڑھ واپسی پر شعبۂ اردو میں ۱۹۵۴ء میں ریڈر بنادیا گیا۔ ریڈر بننے کے بعد میری درسی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ ایم۔ اے کی کلاسوں کو تاریخ زبانِ اردو، دکنی اردو کا ادب، جدید شاعری اور اقبال کا درس دیتا۔ رفتہ رفتہ طالب علموں کے ذریعے میرے درس کی شہرت پھیلنے لگی۔ طلبہ اس بات کا فخریہ ذکر کرتے کہ ہم مسعود صاحب کے شاگرد رہے ہیں۔ اکثر اوقات میں اپنے شاگردوں کو پہچان بھی نہیں پاتا لیکن وہ اصرار کیے جاتے کہ ہم فلاں سنہ میں فلاں کلاس میں آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ایسی صورت میں میں نہایت انکسار کے ساتھ اُن کے دعوے کو تسلیم کر لیتا۔ دوسروں سے بھی اپنے شاگردوں کے بارے میں توصیفی کلمات سُن کر خوشی ہوتی۔ مجھے صرف ایک شاگرد نے مایوس کیا ہے جو اب دہلی کی ایک بڑی یونیورسٹی میں اردو کے درس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، جب اس یونیورسٹی کے ایک سینئر استاد نے مجھ سے شکایت کی کہ مسعود صاحب! ہر چند فلاں صاحب کو اصرار ہے کہ وہ آپ کے شاگرد رہ چکے ہیں، لیکن ان کی استعداد اور حرکات دیکھ کر یقین نہیں آتا۔" میں نے کہا وہ مستثنیات میں سے ہیں اور عرصہ ہوا میں اُن سے دست بردار ہو چکا ہوں۔" کہنے لگے "مگر وہ تو آپ سے دست بردار نہیں ہوتے!"

میں فطرتاً الیکشن باز نہیں ہوں جیسا کہ پانچویں باب میں مذکور ہو چکا ہے، طالب علمی کے زمانے میں صرف مختار آزاد کا الیکشن مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی سکریٹری شپ کے

لیے لڑا یا تھا جس میں وہ ہار گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ تا ۱۹۸۴ اپنے لیے چار الیکشن لڑے جن میں سے علی گڑھ کے تینوں الیکشنوں میں کامیاب ہوا۔ چوتھا علی گڑھ سے باہر کا تھا، اس میں ناکام رہا۔ تفاوتِ زمانی کے باوجود تسلسل کی خاطر میں ان سب کا ذکر ایک جگہ کروں گا۔

یورپ سے واپسی پر میں نے پہلا الیکشن مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل کی انتخابی سیٹ کے لیے ۱۹۵۴ء میں لڑا۔ اس میں میرا مقابلہ اپنے معالج ڈاکٹر اسلام الحق انصاری سے تھا جو اس وقت طبیہ کالج میں استاد تھے۔ میں نے جب اپنے کھڑے کیے جانے پر اُن سے تاسف کا اظہار کیا تو اُن کا اصرار تھا کہ میں ہرگز اس سے دست بردار نہ ہوں۔ میرے خاص کارکن شعبۂ کیمیا کے ریڈر ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی تھے۔ اس میں غیر متوقع طور پر مجھے کافی ووٹوں سے کامیابی حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اِن دنوں وائس چانسلر تھے۔ شام کو حسبِ معمول جب میں ان کی کوٹھی پر گیا تو انھوں نے تعجب کے لہجہ میں پوچھا، "حضرت! آپ کی کامیابی کیوں کر ہوئی؟" چونکہ ڈاکٹر انصاری، ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں کے معالج تھے، اس لیے شاید ان لوگوں کی ہمدردی ان کے ساتھ ہو۔ میں نے ذاکر صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "اس لیے کہ لوگوں سے میرے تعلقات Personal تھے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے Professional!" سُن کر خاموش ہو گئے۔ لطف یہ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہارنے کا مجھے بھی افسوس رہا!

دوسرا الیکشن ۱۹۷۰ء میں مَیں نے اسٹاف ایسوسی ایشن کی صدارت کے لیے لڑا۔ اس میں میرے خاص کارکن شعبۂ قانون کے رحمٰن علی خاں صاحب تھے اور مقابلہ شعبۂ جغرافیہ کے پروفیسر محمد شفیع سے تھا۔ رحمٰن علی خاں نے پروفیسر شفیع صاحب کے خاص کارکن پروفیسر قمرالحسن فاروقی (شعبۂ کامرس) سے مفاہمت کے لیے بات چیت کی لیکن انھیں اپنی کامیابی کا یقین تھا اس لیے دونوں طرف سے زوروں پر تیاری ہونے لگی۔ میں کبھی بھی الیکشن میں ووٹ مانگنے نہیں نکلتا ہوں۔ یہی صورت شفیع صاحب کی جانب سے رہی۔ نتیجہ نکلا اور میں سات ووٹوں سے جیت گیا! دوسرے دن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب سے ملاقات ہوئی جو اس وقت وائس چانسلر تھے، کہنے لگے شفیع صاحب تو آپ سے سینئر رہے ہوں گے۔ میں نے کہا مَیں اُن سے عمر میں سات سال بڑا ہوں، اسی لیے مجھے سات ووٹ زیادہ ملے علی گڑھ اپنے سینئر کا احترام کرتا ہے۔

میرے ساتھ سکریٹری کی جگہ کے لیے انجینرنگ کالج کے رشید الظفر صاحب کا انتخاب ہوا۔ یہاں سے ہماری اُس دوستی کا آغاز ہوا جو تا حال جاری ہے۔ وہ بڑی فعّال شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی لیے بہت سے مخالف پیدا کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر علی گڑھ کے مارکسٹ حلقوں میں وہ ہمیشہ غیر مقبول رہے اس لیے کہ وہ ان کا ترکی بہ ترکی جواب تھے۔ میرے دوران صدارت سب سے افسوس ناک واقعہ پروفیسر رئیس احمد سے متعلق پیش آیا جن کے کسی بیان پر جس کی زد مسلم یونیورسٹی کے مسلم کردار پر پڑتی تھی، سارا علی گڑھ ان کے خلاف شمشیر بکف ہو گیا۔ اسٹاف ایسوسی ایشن نے بھی ملامت کا ریزولیوشن پاس کیا۔ دائیں اور بائیں بازو کی صف آرائی مکمل تھی۔ اُن کی موافقت اور مخالفت میں دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ میں مسٹر شکتی رئیس کی مدافعانہ تقریر سے بہت متاثر ہوا۔ چاہا کہ کوئی بیچ کی راہ نکل آئے لیکن نہ ہو سکا۔ علی گڑھ میں آپ دائیں اور بائیں کے درمیان نہیں رہ سکتے۔ صورت یو پی کے اُس انگریز گورنر کی سی ہوتی ہے جس نے قومی تحریک کے سلسلے میں کہا تھا "جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں وہ ہمارے مخالف ہیں"۔

رشید الظفر صاحب کے ہوتے ہوئے تو نہیں لیکن ان کے بعد جب ایک سینیر لیکچرر ترقی کر کے تھوڑے عرصے کے لیے سکریٹری بن گئے تو انھوں نے بنام سکریٹری صدر کے اختیارات سلب کرنا شروع کر دیئے۔ وہ صدر کو صرف صدارت کے فعل عبث کے لیے سمجھنے لگے حالاں کہ اسٹاف ایسوسی ایشن کے دستور سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے اور یوں بھی سوائے کمیونسٹ ممالک کے سکریٹری ہمیشہ صدر کے تحت کام کرتا ہے۔ بہرحال میں نے اس تناؤ کو محسوس کرنا شروع کیا تھا کہ میری دو سالہ مدت صدارت ۱۹۷۲ء میں ختم ہو گئی۔

تیسرا الکشن میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نو تنظیم شدہ کورٹ کے لیے ۱۹۷۳ء میں لڑا۔ کورٹ کے آئین کے مطابق دو رکن اردو کے حلقے سے منتخب ہوتے تھے۔ اس کے لیے میرے اور سرور صاحب کے علاوہ بیرون علی گڑھ کے کئی امیدوار تھے۔ علی گڑھ نے اپنے قدیم طالب علموں کا ساتھ دیا اور ہم دونوں بآسانی منتخب ہو گئے۔ مجھے سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ ہم دونوں کی مدت رکنیت ۷۵ء میں ختم ہو گئی۔ بڑا افسوس ہے کہ دوبارہ انتخاب کے وقت حکومت کی بجائے انتخاب کرانے کے بجائے چانسلر اکثر اخلاق الرحمن قدوائی کے ایما سے ایک کمیٹی بنا دی

گئی جس نے اس زمرہ اور دوسرے کئی زمروں میں من مانی کرکے جسے چاہا نامزد کرادیا۔ اردو کے آخر سے مالک رام صاحب اور خواجہ احمد فاروقی صاحب نامزد ہوگئے جن کا علی گڑھ سے تعلق نہ بحیثیت طالب علم کا رہا ہے اور نہ بحیثیت استاد۔ میں نے ایک ملاقات میں اپنے پرانے ساتھی اخلاق محمد مجیب اس کیلئے طعنہ دیا تو کہنے لگے مجھے اس سلسلے میں دھوکا ہوا۔ چونکہ یہ پوری کارروائی غیر قانونی تھی اس لیے چند صاحبان اس کے خلاف اسٹے آرڈر لے آئے ہیں۔

ایک انتخاب جو میں نے بڑے اعتماد سے لڑا لیکن ہار گیا' ساہتیہ اکادمی کی اردو کنوینر شپ کی جگہ کے لیے تھا۔ اعتماد مجھے اس لیے تھا کہ میری تائید میں اکادمی کے صدر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور اس کے سکریٹری سری پربھاکر ماچوے' دونوں تھے' اردو کے چاروں ممبروں نے میرا نام بالاتفاق رائے تجویز کیا یا تائید کی، جس میں قرۃ العین حیدر صاحبہ، مالک رام صاحب اور ڈاکٹر مسعود حسین بھی تھے۔ انتخاب سے ایک دن پہلے مالک رام صاحب مجھ سے ضرور ملے تھے' یہ کہنے کے لیے کہ میں ان کے حق میں دست بردار ہوجاؤں لیکن جب میں نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ میں ماچوے صاحب سے وعدہ کرچکا ہوں تو انھوں نے بھی میرے نام کی تائید کی۔ میرے مقابلہ میں ڈرامہ نگار حبیب تنویر تھے جب نتیجہ نکلا تو وہ جیت گئے۔ مجھے بعد کو معلوم ہوا کہ دو روز قبل کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر میں ساہتیہ اکیڈمی کے کمیونسٹ ممبروں اور 'ہم سفروں' کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں مختلف زبانوں کے کنوینروں کے نام طے کرکے 'وہپ' جاری کردیا گیا تھا۔ میں کبھی بھی کمیونسٹوں اور ترقی پسندوں کے حلقوں میں اپنی آزاد خیالی کی وجہ سے پسندیدہ نہیں رہا ہوں۔ مختلف زمانوں میں علی گڑھ میں اور اس کے باہر بھی مجھ پر 'کار فرمائی' کا عمل ضرور رہا ہے لیکن کانٹے کے وقت میں میں نے ہمیشہ خود کو تنہا پایا ہے۔ چوں کہ ذاتی تعلقات میں میرے اندر مروت بہت زیادہ ہے اس لیے بعض اوقات یہ لوگ دوست بن کر بالادستی حاصل کر لیتے ہیں لیکن نہ میں انھیں اپنے نقطۂ نظر سے معتبر سمجھتا ہوں اور نہ یہ لوگ اپنے کام کے لیے مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں سے بعض حضرات مثلاً ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو میں ذاتی حیثیت سے پسند کرتا ہوں۔ لیکن ان میں بڑی تعداد موقع پرستوں کی ہے جو ذاتی مفاد کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک شرافت اور مروت جیسی صفات بورژوا اخلاقی کمزوریاں ہیں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ان تمام الکشنوں میں مجھے کاسۂ گدائی لے کر کہیں پھرنا پڑا۔
بار بار چند مخلصین کو خیال آیا کہ مجھے کھڑا کیا جائے۔ انھوں نے ہی میرے لیے دوڑ دھوپ کی اور
کامیاب کرایا۔ زندگی میں یہی میرا رویہ مختلف عہدوں کی جانب رہا ہے۔ چاہے وہ جامعہ ملیہ کی
وائس چانسلری ہو یا جامعہ اردو کی شیخ الجامعی جس پر میں پچھلے پندرہ سال سے فائز ہوں۔ جب
میں نے جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کے عہدے کے تیسرے انتخاب کے وقت یہ کہا کہ میں کرسی سے
چپکے رہنے کا عادی نہیں" تو اس پر امیر جامعہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمایا "یہ تو آپ اہلِ سیاست
پر طنز کر رہے ہیں"۔ میں نے جواباً صرف یہ مصرعہ پڑھا ع

اُن کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں

۱۹۵۵ء میں مجھے لسانیات کے ماہرین کی ایک کانفرنس میں پونا مدعو کیا گیا جس کی صدارت
کرنے کے لیے انگلستان سے مشہور مستشرق پروفیسر رالف ٹرنر تشریف لائے تھے۔ مسئلہ پیشِ نظر
یہ تھا کہ راک فیلر فاؤنڈیشن کے وسیع عطیے کو، جو دکن کالج پونا کو توضیحی لسانیات کو عام کرنے کے لیے
دیا گیا تھا کس طرح مفید اور منظم طور پر استعمال کیا جائے۔ دعوت نامہ دکن کالج کے ڈائرکٹر ڈاکٹر
ایس۔ ایم کاترے کی جانب سے تھا۔ شرکا میں چوٹی کے ماہرینِ لسانیات پروفیسر سنیتی کمار
چٹرجی، ڈاکٹر بابورام سکسینہ، ڈاکٹر دھیریندر ورما، ڈاکٹر سکمار سین، پروفیسر سری کنٹھیا، پروفیسر
سوریاجی اور ڈاکٹر پی۔ بی۔ پنڈت نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے لسانیات کے علم کو عام کرنے
کے لیے مختصر مدتی سرما اور طویل مدتی گرما اسکولوں کا منصوبہ بنایا۔ ۱۹۵۵ء کے دسمبر سے ان کا آغاز
ہو گیا۔ میں شروع سے اس کے اساتذہ کی فہرست میں رہا اور سال میں دو بار پڑھانے کے
لیے پونا جاتا رہا۔ ایسے معروف اہلِ علم کی صحبت میں خود بھی سیکھتا رہا اور میری نظر میں ہندوستانی
زبانوں کے بارے میں وسیع النظری پیدا ہوتی گئی۔ میرے ذہن میں موجود

ہندوستان میں اردو کا جو منصب اور مقام ہے وہ بھی واضح ہوتا گیا۔ ہر شخص اپنی مادری زبان کے
بارے میں جذباتی رنگ میں سوچتا ہے، میں بھی اس سے خالی نہیں تھا خاص طور پر آزادی ملنے کے بعد ہندی
متعصب ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت ہند

کی ریاستوں میں اس کے ساتھ جو دھاندلی ہوئی ہے اس سے دل برداشتہ رہتا تھا۔ میں نے اس مجمع
میں اردو کا سب سے بڑا ہمدرد پروفیسر سنیتی کمار چڑجی کو پایا۔ ممکن ہے ان کی یہ ہمدردی بعض معاویہ میں
ہو اس لیے کہ   اس سے قبل وہ ہندی ساہتیہ سمیلن اور دوسرے کئی ہندی اداروں سے انعام
پا چکے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے ارتقا کے لیے سنسکرت کی جو اہمیت ہے اس پر مسلسل زور دیتے
رہتے تھے لیکن بہرحال ایک بنگالی ہونے کے ناتے اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہنے سے نہیں چوکتے تھے۔
وہ کئی لحاظ سے مجھے ایک دلچسپ انسان نظر آئے۔ جید عالم لیکن طبیعت میں بچوں کی سی سادگی۔ ابوالکلام
(لغوی معنوں میں) تھے کہ مسلسل بولنے پر بھی نہیں تھکتے تھے۔ حافظہ بھی غضب کا پایا تھا۔ حاضرین و سامعین
کے پیشِ نظر قرآن تک کی چند آیات پڑھ کر سنا دیتے تھے اور سنسکرت کے اشلوک تو ان کی نوکِ زبان
پر رہتے۔ اردو کے بارے میں کہتے تھے کہ بڑی شستہ و رفتہ زبان ہے اور اسی کی نسبت سے ہندی
کو کھڑی اور کھردری بتلاتے۔ ان کی تجویز تھی کہ اگر 'اردو ہندی' سے جنس کی دخل اندازی نکال دی
جائے تو اس زبان کا سیکھنا بہت آسان ہو جائے، جیسی کہ یہ کلکتے کے بازاروں میں بولی جاتی
ہے۔ میں ہنس کر کہتا اس بنگالی شرط کے ساتھ تو اردو مُتعہ کے لیے بھی نہیں ملے گی۔ اس کی تذکیر و
تانیث ہی میں تو اس کا لطف ہے۔ قدیم اردو میں تو یہ اس قدر تھی کہ حروف، صفات اور افعال امدادی
تک اس سے متاثر ہوتے تھے! اب تو ہم نے اسے خاصا سہل بنا لیا ہے لیکن اور سہل بنا کر "وہ مرد گیا
وہ عورت گیا، ہمارا باپ گیا، ہمارا ماں گیا، خوب (سب) گیا" آپ لوگوں کی یہ مزید
سہولت کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ معدہ قوی پایا تھا اس لیے ۵،۰ کے چھیٹے میں بھی لذتِ کام و دہن
کے دلدادہ تھے، اور اس کا ایک گل ہند ذوق رکھتے تھے۔ وہ ہمارا شہر کا "بشری کمنڈ" اسی ذوق
سے کھاتے جس لطف سے اپنا "رشن گلّا"۔ ہر چند ان کا توضیحی لسانیات کا علم مستحضر نہیں تھا لیکن
وہ اپنی انسائیکلوپیڈیائی معلومات گراں ڈیل شخصیت کی وجہ سے لسانیات کے اسکولوں پر چھائے
رہتے۔ میری درسیات نظری و عملی صوتیات تک محدود تھیں چونکہ یہ کورس ہر طالب علم کے لیے
لازمی تھا اس لیے مجھے مستقبل کے بیشتر اساتذۂ لسانیات کے استاد ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔
پروفیسر اشوک کیلکر، پروفیسر جگدیپ سنگھ، پروفیسر گل، ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، پروفیسر عبدالعظیم
ڈاکٹر ملیحہ سلطانہ وغیرہ وغیرہ۔ عملی صوتیات کی مشقوں کیلئے ہم کسی ایسی زبان کو منتخب کرتے

تھے جو ہمارے طالب علموں کے لیے بالکل نئی ہوتی کہ انھیں نئی نئی اصوات کے سننے اور ادا کرنے کی مشق ہو سکے۔ اس زبان کے نمائندے کو دس روپیہ فی گھنٹہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ ایک بار طے پایا کہ کوئی عربی زبان بولنے والا گرفتار کیا جائے اس لیے کہ اس زبان میں ہندوستانی طالب علموں کے لیے وافر صوتیاتی مواد ملتا ہے۔ چنانچہ کسی کے توسط سے پونا کے ایک یہودی کو تلاش کر لیا گیا جو فلسطین میں عرصے تک مقیم رہنے کی وجہ سے عربی کی اچھی مہارت رکھتا تھا۔ ایسے الفاظ کی ایک فہرست تیار کی گئی جن میں عربی کی مخصوص آوازیں ق، غ، ع، ح، ذ، ص، ض، ط، ظ اور ھمزہ پائے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کو اس سے ادا کرایا جاتا تھا اور طلبہ انھیں صوتیاتی رسم خط میں لکھتے اور ان کی ادائیگی کی نقل کرتے۔ اس عمل میں بعض اوقات آٹھ آٹھ دس دس بار اس گرفتار کو دہرانے کی زحمت دی جاتی۔ کچھ طلبہ تفننِ طبع کی خاطر بھی اس کو تھکانے کے جتن کرنے لگے۔ ایک روز جب اس کا گلا ان آوازوں کو ادا کرتے کرتے بیٹھ سا گیا تو دونوں ہاتھوں کو ہوا میں ہلا کر مجھ سے کہنے لگا "اس قدر محنت صرف دس روپے کے لیے۔ بس اب کل سے نہیں۔" لاکھ سمجھایا کہ یہ علم کی خدمت ہے تجارت نہیں ہے، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا اور آنا چھوڑ دیا۔

ہندوستانی ماہرینِ لسانیات کے علاوہ ان اسکولوں میں امریکہ سے بھی کچھ اساتذہ آتے تھے۔ ان میں سے بعض خاصے معروف تھے یا بعد کو ہوئے مثلاً پروفیسر فرجیکس، پروفیسر گلیسن جونیئر، ڈاکٹر جان گمپرز۔ ہندوستان میں جدید لسانیات کا آغاز دراصل انھیں اسکولوں سے ہوا جو پانچ سال تک راک فیلر فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے دکن کالج پونا میں منعقد کیے جاتے رہے۔ اس کے بعد لنگوئسٹک سوسائٹی آف انڈیا نے ان کی ذمہ داری لے لی۔ مالی دقتوں کی وجہ سے پہلے سرما کے اسکول بند ہوئے اور رفتہ رفتہ گرما کے اسکولوں کے انعقاد کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ تاہم اگلے پانچ سالوں میں ہندوستان کے دوسرے شہروں، دہرہ دون، حیدرآباد، اناملائی اور ترویندرم میں یہ اسکول منعقد ہوئے۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ میں نے آخری بار ۱۹۶۴ء میں ترویندرم کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ میرے دوست پروفیسر وی۔ آئی۔ سبرامنیم اس کے ڈائریکٹر تھے۔ دور دکن کا یہ میرا پہلا سفر تھا۔ اس لیے وہاں کے مناظر (جس میں ناریل کا درخت خاص اہمیت رکھتا ہے) اور تہذیبی مظاہر سے خوب لطف اندوز ہوا۔ ہندوستانی عیسائیوں کی وہاں خاصی آبادی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عیسائیت ہندو

سے ہم آہنگ ہو گئی ہے اور حضرت عیسیٰ بھی من جملہ دیگر دیوتاؤں کے ایک دیوتا بن گئے ہیں تعلیم یافتہ لوگوں کا تناسب ہندوستان کے کسی بھی دوسرے علاقہ سے زیادہ ہے۔ ملیالم کے رسائل اور اخبارات کثیر تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور پڑھے جاتے ہیں۔ عورت زندگی کے کاروبار میں برابر کی حصہ دار ہے اس لیے بھی کہ وراثت کا سلسلہ اس کی جانب سے چلتا ہے۔ کوئی کھانا ناریل، کاجو اور انناس کے بغیر مکمل نہیں خیال کیا جاتا۔

ہمارا سمر اسکول اپنے آخری مراحل میں تھا کہ اچانک پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے ساتھ اسکول برخاست کر دیا گیا اور وہ تمام پروگرام بھی جو اختتامی جلسے اور سبرامنیم صاحب کی ضیافت سے متعلق تھے۔ لسانیات کو ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں رائج کرنے کا طریقہ کار یہ تجویز ہوا کہ پہلے زبانوں کے شعبہ جات میں لسانیات کے دو پرچے شامل کئے جائیں اور طالب علم کی سند پاس تخصیص کا اظہار کیا جائے۔ اس کے بعد یو۔ جی۔ سی۔ کی تائید سے لسانیات کے علاوہ شعبے قائم کیے جائیں چنانچہ میرے یورپ سے واپس آنے کے بعد مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایسا ہی کیا گیا۔ مجھے توقع تھی کہ چند سالوں میں اس شعبے کے اندر لسانیات کی پروفیسری نکل آئے گی۔ یہ پہلا قدم ہوگا علاحدہ لسانیات کا شعبہ قائم کرنے کی جانب، لیکن بعض لوگوں کی کم توجہی کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا رشید صاحب ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اردو کی صدارت سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ اب کرنل بشیر حسین زیدی وائس چانسلر تھے اور پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو۔ انھیں ۱۹۵۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین لکھنؤ سے غالب پروفیسری پر لے آئے تھے جو ان کے علی گڑھ کے پرانے ساتھی، عطاء اللہ صاحب کے (جو امریکہ میں مرغوں کے بادشاہ بن گئے تھے)، گراں قدر عطیے سے غالب کے اردو کلام کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔

اسی زمانے میں میں نے ایک کام اور کر ڈالا۔ یورپ سے ۱۹۵۳ء میں واپس آنے کے بعد ہی میں نے ایم۔ ایم۔ ہال کے سامنے دو بیگہ (پختہ) زمین کا ایک قطعہ اپنے دوست ڈاکٹر خورشید فاروق سے خرید لیا۔ اس زمانے میں دودھ پور کی زمینیں گزوں سے نہیں بیگھوں کے حساب سے سستے داموں مل جاتی تھیں۔ پاکستان بن چکا تھا۔ علی گڑھ سے ہجرت کا سلسلہ اب تک جاری تھا

سے اس لیے عمرانی و سکنی جائیداد کی قیمتیں بہت گر گئی تھیں۔ ۲۰ اپریل ۵۲ء کو میں نے تھوڑے سے سرمایے کی فراہمی کے بعد خدا کا نام لے کر اس قطعہ پر اپنے مکان کی داغ بیل ڈال دی۔ قائم گنج سے دو معمار اور چند مزدور بلوانے تاکہ تعمیر کے مقام پر شب و روز رہ سکیں تعمیر کے سلسلے میں میرے مشیر کار خلیل مراد صاحب، پی ڈبلیو ڈی، شعبۂ فزکس تھے جنھیں تعمیر کا بیس برس کا تجربہ تھا اور جو خدائی خدمت گار کے جذبے سے ہر نئی تعمیر کے قریب از خود پہنچ جاتے تھے۔ وہ پروفیسر عبدالدین کے خسر تھے اور مجھ پر بہت مہربان۔ اپنی عمر کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ میرے ساتھ تعمیر کے مقام پر دھوپ میں کھڑے رہتے۔ تعمیر کے سلسلے میں ان کا نظریہ "کفایت" کا تھا جسے وہ معمر قیمت پر ترجیح دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس سلسلے میں میرے بڑے راج، محمد حسین سے ان کا اختلاف ہونے لگا۔ میں بھی، باوجود سرمایے کی قلت کے، گھٹیا اور سستے کام پر راضی نہیں تھا۔ بالآخر میرے (ان کی دانست میں) بیجا صرف کو دیکھ کر انھوں نے یک لخت آنا بند کر دیا۔ اور اس طرح اُن کے مفت کے مشورے سے میں محروم ہو گیا۔

ایک شام جب ذاکر میاں سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی "سنا ہے آپ نے مکان بنوانا شروع کر دیا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں کی۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے مشیر خلیل مراد صاحب ہیں۔ یہ وہ حضرت ہیں کہ جس نئی تعمیر کے پاس سے گزر جائیں تو اس کا ستیاناس کر دیں"۔ میں اُن سے یہ تو نہیں کہہ سکا لیکن دل میں ضرور کہا کہ "آپ سے تعمیر کی بات اس لیے پوشیدہ رکھی کہ آپ جس تعمیر میں دلچسپی لیں تو اسے تاج محل بنا دیں"! اس مکان کی تعمیر میں مجھ جیسے قلمی انسان کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے یہ ان کی تفصیل کا موقع نہیں۔ سیمنٹ پر کنٹرول تھا اس کا پرمٹ بیک وقت دس دس بیس بیس بوریوں سے زیادہ کا نہیں ملتا تھا، لیکن کھلے چور بازار میں دو دو روپے زیادہ دے کر آپ جس قدر چاہیں لے سکتے تھے۔ البتہ جب اشد ضرورت کے وقت اس قسم کی خریداری کر لی جاتی تھی تو دھڑکا لگا رہتا تھا۔ میں نے اس دھندے میں اپنی بیوی کو زیادہ جیالی پایا۔ ان کی دلچسپی اس لیے بھی زیادہ ہو گئی تھی کہ ان کے نام سے میں نے سرکاری کو اپریٹو سے سات ہزار کی رقم قرض لی تھی جس کے لیے زمین کا بیع نامہ ان کے نام کرانا پڑا تھا۔ چنانچہ مکان بن جانے کے بعد وہی اس کی قانونی مالکہ قرار پائیں۔ خود کو لٹا کر گھر بنانے کی پاداش میں اب تک ان کی یہ دھمکی سنا پڑتی ہے "یہ گھر میرا ہے جس کو جب چاہوں نکال دوں"!

گھر کی تعمیر کے دوران میں، چھ مہینے تک مطلق جاہل ہو گیا تھا۔ گرما کی تعطیلات کے ساتھ میں نے اپنی جمع شدہ چھٹی ملالی تھی۔ سارا وقت، اینٹوں کے بھٹوں یا لوہیوں کے بازار کے چکر لگانے یا راشن آفس میں انتظار کی گھڑیاں کاٹنے میں گزرتا۔ گرمی کا موسم تھا اس لیئے میں ہیٹ کا استعمال کرتا تھا جس سے میرے ماتھے پہ "ابلقِ ایام" کی سی کالی اور سفید دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے ایک بار بایں صورت، سائیکل دوڑاتے دیکھا تو مسکرائے اور کہا یہ کیا حال بنالیا ہے۔ میں نے اس پر انھیں اپنا یہ تازہ شعر سنا دیا ؎

اک مکاں عالمِ امکاں سے وہ لائے ہیں بہ ضد
ہوگئے حضرتِ مسعودؔ بھی تعمیر پسند

بہرحال چھ مہینے کی دوڑ دھوپ کے بعد مکان کا اس قدر حصہ مکمل ہو گیا کہ ہم لوگ ۲ر اکتوبر ۵۹ء کو انجینئرنگ کوارٹر کو خیرباد کہہ کر اس میں منتقل ہو سکیں۔

اس مکان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ منتِ انجینئر یا اوورسیر اٹھائے بغیر میری نگرانی میں تعمیر ہوا تھا۔ میں ہی اس کا آرکیٹکٹ تھا، میں ہی انجینئر اور میں ہی اوورسیر۔ میں نے چنڈی گڑھ کے خالق، مشہور فرانسیسی آرکیٹکٹ Le Corbusier کا یہ جملہ کہیں پڑھا تھا کہ "اگر کوئی مکان استعمال کے نقطۂ نظر سے قابلِ اطمینان ہو تو وہ خود اپنا طرزِ تعمیر تخلیق کر لیتا ہے۔" آج میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ مکان میری اور میرے خاندان والوں کی ضروریات کو بوجوہ احسن پورا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا ایک اپنا طرزِ تعمیر بھی ہے جو نایاب ہے! کیوں نہ ہو ایک اناڑی سے سرزد ہوا ہے۔

اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ میں نے اپنی رہائش اور کتب خانے کے لیئے دو کمرے اوپر کی منزل میں اس انداز کے بنائے ہیں کہ وہاں پہنچ کر میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں۔ میرے لائبریری کے کمرے کی دیواروں میں کتابوں کے شیلف بنے ہوئے ہیں۔ درمیان میں بڑی سی کھڑکی کے سامنے میری میز ہے جہاں سے میں دور تک اس میدان کا نظارہ کرتا تھا جو علامہ اقبال ہال بننے سے قبل یونیورسٹی کے قبرستان تک پھیلا ہوا تھا۔ مکان دو بیگھہ زمین کے عین وسط میں ہے اس لیئے بڑی حد تک ہمسایہ سے محفوظ ہے اور اب کھلی زمین میں یوکلپٹس اور اشوک کے اونچے اونچے درخت ہو گئے ہیں، جن کی وجہ سے ایک کاٹیج کا سا سماں پیدا ہو گیا ہے۔ ہر وقت یہ عالم رہتا ہے کہ پڑوس کے ہاسٹل کے طلبہ

میں اس کا نام Haunted House پڑ گیا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کی وائس چانسلری (۴۸ تا ۵۶ء) کا دور علی گڑھ کے لیے نہایت پُرآشوب زمانہ تھا۔ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے مردم شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس بدنصیب ادارے کو بلاخیز سیاسی تلاطم سے بچانے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا انتخاب کیا تھا۔ علی گڑھ نے انھیں تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ قبول کیا۔ اس لیے کہ اس ادارے کو اس کا ماضی ہر لحظہ آئینہ دکھاتا تھا۔ مولانا آزاد کے پیش نظر ہندوستانی مسلمانوں کی بازآبادکاری کا اہم مسئلہ تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اُن کی نظر میں ہر لحاظ سے اس کے لیے مستند بھی تھے اور معتبر بھی۔ علی گڑھ زخم خوردہ اور سہما ہوا ضرور تھا لیکن اسے اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں تھا۔ نجی ملاقاتوں اور مجلسوں میں سکتہ کا عالم ہوتا یا سکوت کا۔

اس سکتہ اور سکوت کے عالم کو ختم کرنے کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین معمور کیے گئے تھے۔ وہ دل میں بڑے بڑے حوصلے لے کر آئے تھے لیکن آتے ہی ۴۹ء میں ان پر قلب کا دورہ پڑا جس نے ماہیتِ قلب کر دی۔ اب علی گڑھ کو حیاتِ نو بخشنے کے پروگرام کے ساتھ خود کو زندہ رکھنے کا عمل شامل ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ ان کے عزائم کی کمزوری اور شخصیت کی تبدیلی میں اُن کی اس بیماری کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اب نرسوں، ڈاکٹروں اور شام کے بیٹھنے والے چند مقربین میں گھر کر رہ گئے۔ ان میں رشید احمد صدیقی صاحب، ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن (میڈیکل آفیسر) سید نوراللہ صاحب (پرووائس چانسلر) حکیم عبداللطیف صاحب (پرنسپل طبیہ کالج) اور ڈاکٹر عبدالعلیم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بیماری کے باوجود ان کا ظرافت کا حس قائم رہا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کبھی کبھی آتے لیکن بہت طویل نشست کرتے۔ مطلب کی بات اس نشست کے سب سے آخر میں کہتے۔ ان کی اس طویل نشستی کے بارے میں ایک دن کہنے لگے "بھئی یہ بہت بھاری پیندے کے آدمی ہیں۔" حسِ مزاح کے ساتھ ساتھ ان کا تنقیدی شعور بھی بیدار رہا۔ ایک دن کہنے لگے کہ "توفیقِ الٰہی نہ ہو تو دنیا کی ساری سہولتیں مہیا ہو جانے پر انسان کام نہیں کرتا۔" یہ اشارہ تھا شعبہ Taleem کے صدر کے اس اصرار کی جانب کہ اُن کے شعبہ کی کارکردگی کو بڑھانے کے لیے ان کے لیے ضروری ہے۔ مجھے تعجب اس وقت ہوا جب انھوں نے گاندھی جی کے بارے میں ایک دفعہ

یہ رائے دی کہ انھیں سیاست سے پہلے علاحدہ ہو جانا چاہیے تھا اور دوچکا اس وقت لگا جب اقبال کے تذکرہ پر اچانک بولے "بھئی! وہ پنجابی تھے" یہ سوچا رہ گیا کہ یہ مولانا محمد علی کی زبان تو نہیں ہے جو "اسرارِ خودی" کے اقبال کے پرستار رہے اور اس کے بعد انھیں غالباً سیاسی اختلافات کی بنا پر "اقبال مرحوم" کہنے لگے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ مولانا محمد علی ہی کی تحریک پر گاندھی جی نے اقبال کو ۱۹۲۰ء میں جامعہ ملیہ کی پرنسپلی کی پیش کش کی تھی جسے انھوں نے ذاتی مجبوریوں کا بہانہ بنا کر قبول کرنے سے معذرت کر لی تھی یہیں اس سے بھی واقف تھا کہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب اسمبلی کے ممبر منتخب ہو جانے کے بعد اقبال نے زمیندار جماعت کی حمایت کی تھی۔ اس تمام معلومات کے باوجود ذاکر صاحب کا اقبال کی "پنجابیت" کے تذکرہ کا پس منظر میری سمجھ میں نہیں آیا۔

ذاکر صاحب اور رشید صاحب دونوں ایک دوسرے کی دوستی کا دم بھرتے تھے۔ رشید صاحب کے لیے ذاکر صاحب "مرشد" تھے۔ "مضامینِ رشید" میں اس نسبت کا اعلان ملتا ہے۔ ذاکر صاحب جب بھی علی گڑھ آتے رشید صاحب کے یہاں قیام کرتے۔ لیکن ذاکر صاحب کو رشید صاحب کی شعبۂ اردو سے متعلق ناکردگی سے شکایت رہی۔ اسی لیے وہ ۱۹۵۵ء میں لکھنؤ سے آل احمد سرور صاحب کو اپنے امریکی دوست عطاء اللہ صاحب کی قائم کردہ غالب چیئر پر لے آئے اور ان سے یہ وعدہ لیا کہ وہ خود کو صرف علمی کاموں میں مصروف رکھیں گے اور یونیورسٹی کی انتظامیہ سے بالکل الگ رہیں گے۔ لیکن ۵۶ء میں کرنل بشیر حسین زیدی کے وائس چانسلر بنتے ہی انھوں نے ایک ہال کی پرووسٹی قبول کر لی۔ یونیورسٹی کی سیاست اور دوسری مصروفیات کی بنا پر وہ تفویض کردہ غالب کے اردو دیوان کا ترجمہ بھی نہیں کر سکے جس کی وجہ سے ذاکر صاحب آخر وقت تک اُن سے شاکی رہے اور عطاء اللہ صاحب نے تو نازیبا کلمات استعمال کرتے ہوئے قانونی کارروائی کی دھمکی تک دی۔ دراصل پتّہ مار کام سرور صاحب کے بس کا کبھی نہیں رہا۔ ایک ذہین انسان ہونے کے ناتے وہ طلاقتِ لسانی اور تنقیدی اشارات و متفرقات کے مردِ میدان ہیں۔ چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ ہر موضوع پر تیزی کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں عرصے سے اقبال پر تصنیف کا ایک خاکہ ہے جس کی تکمیل وہ کشمیر کے دس سالہ قیام میں بھی جب اقبال ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا، نہ کر سکے۔

ذاکر صاحب نے اپنی علالت کے باوجود علی گڑھ کو سیاسی ورلڈ بلا سے بچانے میں نمایاں کام
یا۔ اُن کی براہِ راست رسائی پنڈت نہرو اور مولانا آزاد تک تھی۔ اِسی لیے اُتر پردیش کے کسی عامل
اوزیر کو علی گڑھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی شخصیت کا اسلامی پہلو نمایاں تھا۔ وہ
لی گڑھ کے نمازاوڈلواے رہ چکے تھے۔ اِسی لیے علی گڑھ کا وہ حلقہ جو اسلامسٹ، کہلاتا تھا
ن کے خلاف کوئی فتویٰ نہیں دے سکا۔ انھیں کے ایما پر ڈاکٹر عبدالعلیم اور ڈاکٹر نورالحسن لکھنؤ سے علی گڑھ
لی گڑھ کے جانے پہچانے کمیونسٹ محمود حسین صاحب کو فعّال جان کر رجسٹراری کے عہدے پر فائز کیا۔ یہ لوگ
بھی ذاکر صاحب کے ممنونِ احسان رہتے۔ لیکن یہ توازنِ طاقت بہت دنوں تک نہیں چل سکا۔
بب چند سال کے بعد ذاکر صاحب ڈاکٹر گل کو ممتاز سائنس داں سمجھ کر امریکہ سے یونیورسٹی کے
شعبۂ فزکس میں پروفیسر کی حیثیت سے لائے اور ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا تو دہنی سے بائیں بازو والوں سے
جدا افتراق شروع ہوئی۔ ڈاکٹر گل کی علمی لیاقت کے بارے میں میرے لئے کچھ کہنا ذرا دشوار
ہے اس لیے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، لیکن اس کی شہادت دے سکتا ہوں کہ وہ ایک مضبوط انسان
تھے جنھیں ذاکر صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ ۱۹۶۹ء میں جب ذاکر صاحب کی میت راشٹرپتی
بھون کے بڑے گنبد کے نیچے آخری رونمائی کے لیے رکھی ہوئی تھی تو من جملہ اعزہ کے جس شخص
کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے وہ ڈاکٹر گل تھے۔ اُن کا اب علی گڑھ یا ذاکر صاحب سے
کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

رفتہ رفتہ بائیں بازو کے حضرات نے ذاکر صاحب کی علالت سے فائدہ اٹھا کر خود کو مجتمع کرنا
شروع کر دیا۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کی جامعہ کے پرانے رشتے سے ذاکر صاحب تک شام کی نشستوں میں
رسائی تھی۔ ذاکر صاحب ان کے تساہل اور علمی ناکردگی سے آزردہ رہتے لیکن انھیں عام معاملات میں
صائب رائے سمجھتے تھے۔ اُن میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ کمیونسٹ آئیڈیالوجی سے گہرا شغف رکھنے
کے باوجود، کچھ باعتبار خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم اور کچھ باعتبار پیشہ (وہ ادارۂ اسلامیکے
سربراہ تھے) اس قبیل کے چھوٹے بھیئوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع الخیالی اور شرافتِ نفس
کے مالک تھے۔ ذاکر صاحب پر اثر انداز ہونے کا ان کا طریقہ نہایت دقیق اور نفسیاتی ہوتا۔ ذاکر
صاحب ان کی رائے سے ایک زمانے میں اس قدر متاثر تھے کہ اپنے دوست رشید صاحب کے

یہ عمل جذباتی عمل کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے۔ رشید صاحب اکثر اس کی شکایت بھی کرتے رجسٹرار کے دفتر پر محمود حسین صاحب کی حکمرانی تھی جو مستعد اور کارگزار آدمی تھے اور انگریزی کے استاد ہونے کی حیثیت سے انھیں اس کی تحریر و تقریر پر پورا عبور تھا۔ انگریزی وہ بولتے نہیں تھے بلکہ اس کی قرأت کرتے تھے، جس کی وجہ سے طلبہ میں ان کا نام 'قاری محمود' پڑ گیا تھا۔ بہت جلد ذاکر صاحب کو اس حلقے کی بڑھتی ہوئی مضبوط گرفت کا احساس ہونے لگا اور جب یہ لوگ پروفیسر گل کے خلاف اکیڈمک کونسل کے بعض منتخب شدہ ممبران تک کو حرکت میں لے آئے تو انھوں نے خطرے کا مکمل طور پر احساس کر لیا۔

کیمونسٹ سیاست کا، چاہے وہ کسی ملک کی ہو یا یونیورسٹی کی کسی بھی تحریک کو منظم کرنے کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے، یعنی فیصلے ایک چھوٹی سی منظم جماعت کرتی ہے۔ اس کے بعد ذاتی روابط اور پروپیگنڈے کے ذریعے ایک وسیع حلقے کی ہمدردی حاصل کی جاتی ہے۔ غیر منظم اشخاص ان کی سیاسی چالبازی کا بہت جلد شکار ہو جاتے ہیں اور کبھی انسان دوستی کے نام پر، کبھی جمہوریت کے جھنڈے تلے (حالانکہ اصل جمہوریت سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہوتا) کوئی نوجوان 'ترقی پسند' ہونے کو کیوں کر رد کر سکتا ہے۔ یہ تو ایک بے ضرر ترکیب ہے جس سے کم از کم انسان کا نفس تو موٹا ہو جاتا ہے۔ غیر ترقی پسند یا رجعت پسند کہلانا کون پسند کرے گا۔ حالاں کہ از روئے قواعد 'ترقی پسند ادب' کی ترکیب سرتاسر غلط ہے اس لیے کہ ترقی پسند ادیب ہو سکتا ہے ادب نہیں۔ لیکن چلتی کا نام گاڑی ہے۔

علی گڑھ کے قیام میں، مَیں بھی اس دور سے گزر رہا ہوں۔ میری خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی 'اسلامیوں' اور 'کیمونسٹوں' دونوں نے مجھے مستقبل کا 'ہم سفر' سمجھ کر مجھ پر کام کیا ہے۔ ایک زمانے میں منٹو سرکل کے مشہور استاد سید محمد ٹونکی صاحب (جو ان معنوں میں عجوبۂ اضداد تھے کہ نماز بھی پڑھتے تھے اور پکے کیمونسٹ بھی تھے) مجھے اپنی گوں کا سمجھ کر کیمونسٹ پارٹی کا ہفتہ وار میرے پاس بیچنے کے لیے اپنی ہاسٹل آتے۔ میں نے چند ہفتے اسے خریدا لیکن اس میں سوائے پارٹی کے پروپیگنڈے کے مجھے کچھ نہیں ملا۔ ایک بار جب وہ اس کے چند پرچے لیے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے تو میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "ٹونکی صاحب آپ کی مروت

میں اسے خرید لیتا ہوں لیکن مجھے اس میں کچھ ملتا ہے نہیں"۔ ایک جھٹکے کے ساتھ پرچہ میرے ہاتھ سے لیا اور یہ جا وہ جا۔ اس کے بعد کبھی نہیں لوٹے۔ میں نے بے اختیاری میں ایک بات کہی تھی لیکن آخر میں سبک سار رہا۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے آخری دور میں اس حلقے کی گرفت کو محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے قبل وہ اکثر مجھ سے کہتے تھے کہ زندگی کا کھیل ایک قسم کی پتنگ بازی ہے۔ پتنگ کا پیچ ڈھیل سے بھی لڑایا جاتا ہے اور کھینچ کر بھی۔ میں ڈھیل کا پیچ لڑانے والوں میں ہوں۔ اس کے بعد کہتے اللہ میاں کی رسّی بھی ڈھیلی بتائی جاتی ہے۔ میں نے ایک بار کہہ دیا کہ زیادہ ڈھیلی رسّی دیجئے تو جانور رسّی سمیت بھاگ جاتا ہے۔ یہ سن کر با معنی انداز میں خاموش ہو گئے۔

۵۶ء آتے آتے ان کا ذہن علی گڑھ کو چھوڑ دینے کا بن چکا تھا، حالاں کہ ابھی اُن کی وائس چانسلری کی کچھ مدّت باقی تھی۔ اس کی جانب انھوں نے سب سے پہلے اشارہ رشید صاحب سے کیا۔ رشید صاحب یہ سن کر بڑے سراسیمہ تھے۔ ہفتوں شام کی نشستوں میں تنہائی پا کر انھوں نے 'مرشد' سے اپنا ارادہ بدلنے کو کہا۔ ادھر علی گڑھ میں زبردست فرقہ وارانہ فساد ہو گیا جس سے بددلی اور بڑھ گئی۔ ایک شام میں وائس چانسلر کی کوٹھی کے دروازے میں داخل ہوا تو رشید صاحب اندر سے تیزی کے ساتھ لپکتے ہوئے باہر نکلے۔ مجھے دیکھ کر ذرا توقف کیا پھر کہا "مسعود صاحب! آج میں نے ذاکر صاحب سے کہہ دیا ہے کہ آپ یونیورسٹی کو کرت رلیف کے ہاتھوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں"۔

'مرشد' چلے گئے تو 'مرید' کا ایمان متزلزل ہو گیا۔ پہلی بار رشید صاحب کے قلم سے ان کے خلاف تحریر نکلی جو "ذاکر حسین حیات اور شخصیت" کے مختصر پیش لفظ کی شکل میں تھی۔ جب وہ کچھ روز تک دہلی اور حیدر آباد میں قیام کرنے کے بعد پٹنہ کے راج بھون میں داخل ہو گئے تو رشید صاحب کو ایک اور صدمہ پہنچا لکھا "انھیں علی گڑھ سے نکل کر کہیں جانا تھا تو جامعہ ملیہ جاتے" جس کے لیے انھوں نے خود اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

ذاکر صاحب کا ڈھیل کا طریقہ کار علی گڑھ میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جامعہ ملیہ ایک مدّت سے ان کی ادارت میں ... ان کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔ ذاکر صاحب اگر ایک

جانب طنزاً یہ کہتے تھے کہ یہ چڑیا کے برابر دماغ رکھنے والے لوگ ہیں" تو دوسری طرف کوئی کلرک یا چپراسی بھی ناراض ہو جاتا تو اسے منانے کی فکر میں رہتے۔ بچوں کے ادیب ایس مجیبی صاحب، ان کے سکریٹری تھے۔ بیگم صاحبہ سے کچھ عزیزداری بھی ہوتی تھی۔ بڑے نازک مزاج آدمی تھے۔ ذاکر صاحب ان کی تنک مزاجی سے تنگ رہتے۔ ایک دن کہنے لگے "ہماری زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ مجیبی صاحب سے نبھائے جائیں۔"

علی گڑھ زیادہ بڑی دنیا تھی۔ یہاں برادری کے اصولوں سے نہیں جوڑ توڑ سے کام چلتا تھا۔ ذاکر صاحب جس سانچے میں ڈھل چکے تھے وہ علی گڑھ کے لیے سازگار نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت ذہین انسان تھے اس لیے دوست دشمن سب کی صلاحیتوں کو سمجھتے تھے لیکن سمجھ کا جو تقاضا ہوتا اس کے مطابق عمل پیرا نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے اکثر "اُستاد" قسم کے لوگ اچھے استادوں کو پیچھے ہٹا کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ خوشامدی میری رہتے اور خود دار گھلتے ہیں۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے تم ڈاکٹر متراکو جانتے ہو۔ میں نے کہا نام سنا ہے، دیکھا آج تک نہیں۔ کہنے لگے دیکھو گے کیسے وہ گھر سے نکلتے ہیں تو فزکس کے لیے لیب میں چلے جاتے ہیں اور وہاں سے نکل کر گھر۔ آج وہی مترا CSIR کے ڈائرکٹر ہیں۔ وہ لوگوں کو پہچانتے خوب تھے۔ کیمسٹری کے شعبہ کے ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے اس وقت ڈاکٹر عمر فاروق کام کر رہے تھے پروفیسر شپ کے امیدوار تھے۔ لندن کے امپریل کالج کے پی ایچ۔ ڈی تھے، لیکن وہاں سے واپس آنے کے بعد حسب روایت علی گڑھ کوئی تحقیقی کام نہیں کیا تھا۔ دن رات تاش کھیلتے، گپ مارتے یا حقہ پیتے۔ انھوں نے سن رکھا تھا کہ ذاکر صاحب تحقیق کرنے والے کے بڑے قدرداں ہیں۔ چنانچہ اپنے چند اسکالروں کو حکم دیا کہ لیبارٹری میں گئی رات تک کام کرتے رہا کریں۔ ادھر سے جب بھی گذر ریئے ساری فیکلٹی آف سائنس میں تاریکی چھائی ہوتی لیکن کیمسٹری کا شعبہ جگ مگ کرتا ہوتا۔ ذاکر صاحب کے بھی نوٹس میں یہ بات آئی۔ معاملہ کی تہ تک پہنچ گئے اور کہنے لگے "آجکل کیمسٹری کے شعبہ میں ہر شب چراغاں ہوتا ہے۔" بات عمر فاروق صاحب کے کانوں تک پہنچ گئی۔ بہت ناراض ہوئے اور چند ماہ کی طویل رخصت لے کر انگلستان پہنچے تاکہ اپنے فرسودہ علم کو تازہ کر سکیں۔ اس وقت میں بھی

[illegible]

ہو آتے۔ واپس آکر اپنے علم تازہ کے معرکے رشید صاحب کو سناتے (جن سے اُن کا خلوص ذاکر صاحب کے وائس چانسلر ہو جانے کے بعد بہت بڑھ گیا تھا) اور کنکھیوں سے میری جانب دیکھتے جاتے۔

غرض کہ علی گڑھ اس قسم کی اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسری مصیبت علی گڑھ میں اقربا پروری کی تھیں۔ مشہور صحافی آغا شورش نے ایک زمانے میں علی گڑھ کے بعض برسر اقتدار خاندانوں کے شجرے شائع کیے تھے۔ جو چپراسی اور کلرکی کی جگہوں سے لے کر پروفیسری اور پرووسٹ تک کی اسامیوں کا احاطہ کرتے تھے۔ اسی سے باہمی رقابتیں اور مناقشات پیدا ہوتے تھے۔ آپ ایک کلرک کو چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے زنجیر دور تک ہل جاتی تھی۔ برادری کا ایک پورا حلقہ بگولے کی طرح آپ کو اپنی سمیٹ میں لے لیتا تھا۔ یہ 'حرم' کے اندر کی لڑائی تھی۔ اس کے باہر کی زور آزمائی تو علی گڑھ مسلسل کرتا رہا ہے۔

اسے علی گڑھ کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ علی گڑھ کبھی بھی اکثریت کے دل میں گھر نہ کر سکا حالاں کہ اس ادارے میں غیر مسلم طلبہ اور اساتذہ کی تعداد ہمیشہ معتد بہ رہی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ رہی ہے کہ شہر علی گڑھ، جس میں غیر مسلموں کی بڑی اکثریت ہے، اور اس کے دھرم سماج اور بارہ سینی جیسے کالجوں کے طالب علم اور اساتذہ کی آنکھوں میں مسلم یونیورسٹی ہمیشہ کھٹکتی رہی، ۴۷ء سے پہلے بھی اور ۴۷ء کے بعد زیادہ شدت سے۔ ذاکر صاحب چاہتے تھے کہ علی گڑھ کو سیکولر ہندوستان کا 'تصویر چہ' بنا دیا جائے۔ ان کے خیال میں مسلم اقلیت کی بقا کے لیے یہی ایک تدبیر تھی۔ اس میں دو طرفہ تنگ نظری کی دقتیں حائل تھیں۔ ہندو سمجھتے تھے کہ پاکستان بننے کے بعد مسلمانوں کا ہندوستان پر کوئی حق باقی نہیں رہا۔ وہ یہاں سے چلے جائیں اور یا ان کی شرائط پر اس ملک میں رہیں۔ مسلمان دو صرف 'ڈول ریشن ریشن' رکھتا تھا اسے اب خاک وطن کے ہر ذرہ کو دیوتا سمجھنے میں تامل تھا۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین دونوں کو اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا لیکن اس کے ساتھ وہ اسی غلو کے ساتھ خود کو ہندوستانی بھی سمجھتے تھے۔ اس انداز نظر کے تضادات اس وقت اور منقح ہو جاتے ہیں جب سالہا پرشوتم داس ٹنڈن جیسے لوگوں سے پڑتا ہے جنھوں نے ایک بار اردو کے

حوالے سے، ذاکر صاحب کی قوم پرستی کے بارے میں شبہہ کا اظہار کیا تھا۔ اسٹریچی ہال کے ایک جلسے میں اس سلسلے میں ذاکر صاحب کا جواب اور جلال دونوں دیدنی تھے۔

میرے خیال میں ہندوستانی قومیت اور مسلمان کے سلسلے میں مولانا آزاد اور ذاکر صاحب کا بتایا ہوا راستہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آج بھی صحیح ہے۔ ہمیں اس ملک میں بہرحال رہنا ہے اس لیے اس سے وفاداری بشرطِ استواری اپنی بقا کے لیے لازمی ہے۔ لیکن ہمیں اپنا اسلامی تشخص کرنا بھی (اور یہاں میں "اسلامی" صرف محدود مذہبی معنوں میں نہیں بلکہ وسیع ترین تہذیبی اور تاریخی معنوں میں استعمال کر رہا ہوں) قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندوؤں کے اچھے اور دانشمند طبقے کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے تاکہ رجعت پسند انہ قوتوں کے ساتھ نبرد آزمائی کی جاسکے۔ مسلمانوں کے ذہن کے جالوں کو جدید تعلیم کے ذریعہ صاف کرنا ہوگا۔ اسلام کے نام پر جو بہت کچھ خرافات پھیل گئی ہے، اسے دور کرنا ہوگا۔ دوسری جانب ہم وطنوں کی اپنے تہذیب و تمدن کے ظلمت پسندانہ اور دیومالائی عناصر کی جدید تعلیم کے ذریعے اصلاح کرنا؛ جب اصلاح کا یہ عمل دونوں طرف ہو جائے گا تو تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو پر ہم سنگم کا نقطہ ڈھونڈ لیں گے چاہے وہ مولانا آزاد کے وحدتِ ادیان کی شکل میں ہو یا ذاکر حسین کے عالمی انسان دوستی کے نظریے میں۔

دسواں باب

'ڈھونڈھنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں'

(اقبال)

(۵۹ تا ۶۰ء)

علی گڑھ میں ترقی کی راہیں مسدود ہوئیں تو وقتی طور پر ایک نئی راہ نکل آئی۔ لسانیات کے اسکول میں میری ملاقات ڈاکٹر جان گمپرز سے ہوئی جو بنیادی طور پر انسانیات کے طالب علم تھے لیکن سماجی لسانیات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ انھوں نے میرٹھ کے نواح کی 'ہندوستانی' پر اس نقطۂ نظر سے کچھ کام بھی کیا تھا۔ وہ یہودی النسل جرمن تھے لیکن ان کا خاندان امریکن بن چکا تھا۔ ان سے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ ہندوستان سے واپس جا کر جب وہ Association of Asian Studies کے عہدہ دار بنے تو میں انھیں یاد رہا اور از خود انھوں نے ایسوسی ایشن کی سینئر فیلوشپ کے لیے میرا نام تجویز کیا۔ اس کی اطلاع مجھے ۱۹۵۹ء میں میسور میں ملی یہاں میں سمر اسکول میں پڑھانے کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس فیلوشپ کے تحت مجھے اجازت تھی کہ اپنی پسند کی یونیورسٹیوں میں جا کر ایک ایک سمسٹر رہوں اور جس پروفیسر کے لکچروں میں چاہوں شرکت کروں۔ چنانچہ اس کے لیے میں نے ٹیکساز یونیورسٹی، آسٹن اور ہارورڈ کا انتخاب کیا۔ آسٹن میں پروفیسر اے۔ اے۔ ہل تھے جو لسانیاتی اسلوبیات کے ماہر تھے۔ ہارورڈ میں لسانیات کا کوئی خاص ماہر پیش نظر نہیں تھا لیکن مجھے وہاں کے السنۂ مشرقیہ کے شعبہ جات اور ہارورڈ یونیورسٹی کی لائبریری میں مخزونہ السنۂ مشرقیہ کے ذخائر سے دلچسپی تھی۔

میں نے نیویارک تک کا سفر کے۔ ایل۔ ایم کے ہوائی جہاز سے کیا۔ یہ میرا ہوائی جہاز سے پہلا سفر تھا۔ مجھے اس وقت تک ہوائی سفر کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانے میں بہت سی ہوائی کمپنیوں کے ایجنٹ علی گڑھ آتے اور وہیں بیٹھے بیٹھے بکنگ ہو جاتی۔ میرے پاس ایر فرانس کا ایجنٹ بھی آیا تھا۔ میں نے مذاق میں کہا کہ یہ تو 'ایر چانس' ہے پہنچے پہنچے، نہ پہنچے نہ پہنچے، تو خفا ہو کر چلا گیا۔ ہماری پہلی منزل قاہرہ تھی جہاں جہاز رات کو پہنچا۔ قاہرہ کے ایرپورٹ پر کھانے پینے کی اشیاء کے متعلق سے وہ تمام گندگی دیکھی جس کے لیے مشرق مشہور ہے۔ دوسری منزل روم تھی۔ روم کے ایرپورٹ پر اُترنے کے لیے جب ہوائی جہاز چکر لے رہا تھا اور پرواز کے دوران وہاں کے آثار الصنادید کی جھلکیاں نظر آئیں تو بے اختیار اقبال کا یہ شعر زبان پر آ گیا۔

سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلّی یاد آتی ہے وہی عظمت، وہی عبرت، وہی شانِ دلآویزی

اطالوی یورپ کے 'باورچی' کہلائے جاتے ہیں۔ اُن کے لیے یہ ایک تحقیری کلمہ ہے لیکن قاہرہ کے بعد یہاں جو کچھ کافی کے ساتھ نوش کیا اس کا ذائقہ کام و دہن میں دیر تک رہا، اس طرح کہ کلّی کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ تیسری منزل مغربی جرمنی کا شہر فرانک فرٹ تھا۔ ایرپورٹ پر صفائی کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر وقت نوکِ زبان چاٹتے رہتے ہیں۔ یہاں دوپہر کا کھانا کھایا۔ مرغ اس درجہ تندرست تھا کہ چھوٹا موٹا دنبہ معلوم ہوتا تھا۔ چوتھی منزل ہالینڈ کا ایمسٹرڈم تھا جہاں K-L-M کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ اس لیے عارضی پرمٹ دے کر شہر کی سیر کرائی گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے نیشنل میوزیم بھی گئے جہاں ازمنہ وسطیٰ کی مصوری کے شاہکار دیکھے۔ یہ مصوری 'خطوط' سے زیادہ 'خط و خال' پر مشتمل ہے اس لیے پسند آئی۔ ڈچ عام طور پر سہ لسانی ہوتے ہیں یعنی انگریزی اور جرمن زبان بولنے پر قدرت رکھتے ہیں، اس لیے بات چیت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

شام کو یہاں سے چل پڑے۔ صبح ہوائی جہاز سے نیویارک پہنچا۔ اسی شام ریل سے آسٹن (ٹیکساس) کا سفر اختیار کیا جو میری پہلی منزل تھی۔ آسٹن کو شمالی نیویارک سے مختلف پایا۔ یہاں لوگوں میں لاطینی نسل ہونے کی وجہ سے حسن اور لباس دونوں میں مشرقیت پائی۔ شہر بھی کھلا اور صاف ستھرا تھا۔ دیہاتیں یونیورسٹی شہر کی جان تھی۔ البتہ بسوں میں کالوں کے لیے علاحدہ نشستوں کی تخصیص دیکھ کر صدمہ ہوا۔

یہ امریکی مدنیت پر سیاہ داغ ہے۔

پروفیسر ہل شعبۂ انگریزی کے استاد تھے لیکن لسانیات کے ماہر تھے۔ اس زمانے میں امریکی یونیورسٹیوں میں ادب اور لسانیات کے اساتذہ میں رشتہ کشیدہ ہو گیا تھا، بعینہٖ جس طرح ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں آج پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر انگریزی ادب کے استاد اس علم کی ادب پر یلغار کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور پروفیسر ہل اسی میدان کے اسکالر تھے جو لسانیات کا اطلاق تفہیم ادب کے لیے کر رہے تھے۔ ادب کے اساتذہ کہتے تھے کہ ادبی تنقید نے ادب کی تفہیم کے لیے جو اصول وضع کر دیئے ہیں انھیں کے ذریعے اس کی تنقیص یا تحسین کی جانی چاہیئے۔ لسانیات کے ماہرین کا خیال تھا کہ ادبی تنقید کی اصطلاحیں گنجلک اور مبہم ہوتی ہیں اس لیے کہ ان میں کوئی واضح لسانی تصور نہیں ہوتا۔ یونانیوں کے زمانے سے جو اصطلاحیں دہرائی جا رہی ہیں ان سے ادبی تنقید آگے نہیں بڑھی ہے۔ ذوق کے نام پر ادبی تنقید زیادہ تر تاثراتی ہوتی ہے یا عمرانیاتی علوم کی دلدل میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ ۱۹۵۰ء تک جدید لسانیات اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ بلوم فیلڈ کی معرکۃ الآرا کتاب "زبان" ۱۹۳۳ء میں شایع ہوئی۔ اس نے توضیحی لسانیات کا نظریاتی چوکھٹا فراہم کر دیا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد لسانیات کا اطلاق اکتساب زبان اور تفہیم ادب پر کیا جانے لگا۔ پروفیسر ہل اس وقت لسانیات کا ادب پر اطلاق کرنے والوں کے سرخیل تھے۔

جب میں پروفیسر ہل سے ان کے دفتر میں ملا تو دیکھا، دفتر کیا تھا، چھوٹی موٹی لائبریری تھی جس میں کتابوں کے شیلف چھت تک جاتے تھے جن تک پہنچنے کے لیے الومنیم اسٹیل کی سبک سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ کلاس سے فارغ ہوتے تو اپنے 'دفتر لائبریری' میں طلبہ سے ملاقاتوں کے ساتھ تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے۔ علی گڑھ کے ایک وائس چانسلر سید ہاشم علی صاحب کو یہ حسرت رہی کہ یہاں کے پروفیسروں کے کمروں میں جس چیز کا فقدان ہے، وہ کتاب ہے۔ میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ صرف دفتر کے کمروں ہی میں نہیں یہ نایاب شے ان کے مکانوں میں بھی شاذ ملتی ہے! بعد کو معلوم ہوا کہ پروفیسر ہل کی اس سے بھی زیادہ بڑی لائبریری ان کے مکان پر تھی۔ مکان پر ہوں کہ دفتر میں، وہ ہمہ وقت اپنے علمی کاموں میں مصروف رہتے۔

پروفیسر ہل کے لکچروں میں، جن میں میں پابندی سے حاضری دیتا تھا۔ وہی پایا جس کی

مجھے تلاش تھی یعنی لسانیات اور ادب کو کس طرح ہمدگر کیا جاسکتا ہے۔ میں ادبی تنقید کی فقرے بازی اور قولِ محال سے بیزار تھا۔ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب" "غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" جن فقروں پر لوگ سر دھنتے تھے میری سمجھ میں اُن کا مفہوم نہیں آتا تھا۔ میں زیادہ سے زیادہ انھیں انشا پردازی کہہ سکتا ہوں، ادبی تنقید ہرگز نہیں۔ ان سے مجھے لطف مل سکتا ہے بصیرت نہیں ملتی۔ جہاں تک قدما کے مشاہدات کا تعلق ہے ان میں کچھ جان پاتا تھا۔ لیکن ہر سطح پر علم کے حوالے سے ان کی نئی تشریحات کی ضرورت محسوس کرتا۔ بیان و بلاغت کی کتب میں 'حرف' کا تصور اس طرح چھایا رہا ہے کہ 'صوت' کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ حالاں کہ حرف تو صرف جامہ ہے زبان کی جان تو صوت ہوتی ہے۔ صرف و نحو کی سطح پر منطق اور فلسفے نے ہماری قواعد کی جو درجہ بندی کر دی ہے اس سے ہم سرِ مو تجاوز نہیں کر سکے ہیں۔ قواعد نویسی کے ہم نے تین چوکھٹے بنا رکھے ہیں۔ (۱) یونانی۔ لاطینی (۲) سنسکرت (۳) اور عربی۔ باقی تمام جدید زبانوں کی قواعد کو ہم ان چوکھٹوں میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعض اوقات چوکور میں گول۔ فتح محمد جالندھری نے اپنی اردو قواعد میں عربی کے تتبع میں صیغۂ تثنیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور اس کے بعد لکھ دیا ہے کہ یہ اردو میں نہیں ملتا۔

غرض قواعد نویسی ہو یا عروض و بلاغت کے اُصول ہماری علمی نظر ان گہرائیوں تک نہیں جاتی جو توضیحی لسانیات نے اس صدی میں پیدا کر دی ہے۔ شعر و ادب بھی زبان سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اس کے اصول وضع کرنے میں علم زبان سے آغاز کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ لفظ و معنی کی بحث پڑے تو دیو مالا کی چھوٹ پڑتی ہے یا ہم فلسفیانہ موشگافیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم یہ محسوس تو کر لیتے ہیں کہ شاعر "گنجینۂ معنی کا طلسم" بناتا ہے لیکن اس ترکیب کے پیچھے جس صفاتی حقیقت سے سامنا ہے اس کی توجیہ نہیں کر پاتے۔ چنانچہ یا تو "شاعری جزو الیست از پیغمبری" کہتے آئے ہیں یا "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" ہم نے زبان کے تہ نشین امکانات کو چامسکی کے وقت تک مطلق سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔

چامسکی کی معرکتہ الآرا تصنیف Syntactic Structures پہلی بار ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی جس نے جدید لسانیات کی دنیا ہی بدل دی۔ آج لسانیات کی ہر سطح صوتیات، صرف، نحو،

معنیات - پر چامسکی کا نظریہ اثر انداز ہو رہا ہے لیکن پروفیسر ہل کا تعلق بلوم فیلڈ کے دبستان سے تھا۔ انھوں نے ابھی تک (یعنی ۱۹۵۹ء تک) چامسکی کے نقطۂ نظر کو لائق اعتنا نہیں سمجھا تھا اس لیے ان کی 'لسانیاتی اسلوبیات' کی اساس بلوم فیلڈ کے نظریے پر قائم تھی۔

چامسکی کے لسانی نظریے کو ماہرینِ لسانیات اس وقت تک کس قدر مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے جو فرانس کے مشہور لسانیات کے ماہر پروفیسر مارتی نے مجھ سے پٹیالہ کی ایک کانفرنس میں بیان کیا تھا۔ پروفیسر مارتی نے عرصہ تک کولمبیا یونیورسٹی میں بھی لسانیات کے پروفیسر اور لنگوئسٹک سوسائٹی آف امریکہ کے نامور جریدہ 'زبان' کی مجلسِ مشورت کے رکن رہے ہیں۔ چامسکی نے Syntactic Structures کا مسودہ ایک طویل مقالے کی شکل میں لکھ کر پہلے 'زبان' میں شائع ہونے کے لیے بھیجا تھا۔ 'زبان' کے کارگزار ایڈیٹر نے رائے کے لیے اسے پروفیسر مارتی نے کو بھیجا۔ مارتی نے اس کے سلسلے میں نہایت مختصر الفاظ میں لکھا "اس مقالے کا لسانیات سے کوئی تعلق نہیں اس لیے 'زبان' کے علاوہ کہیں بھی شائع کیا جا سکتا ہے"۔ چامسکی کے نظریے میں متداول لسانی نظریے سے اس قدر مغائرت تھی اور اس کی فکر پر فلسفہ اور ریاضی کا اس قدر ہجوم تھا کہ ماہرینِ لسانیات نے ابتدا میں اسے لائق اعتنا تک نہیں سمجھا۔ آئنسٹائن کو نیوٹن کے ٹھوس مادی نظریے کو رد کرنے میں اسی قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ دونوں کی فکر کی اہمیت اہلِ علم پر رفتہ رفتہ آشکار ہوئی تھی۔

آسٹن میں میں نے تقریباً دو سمسٹر گذارے، اس کے بعد ہارورڈ کا رُخ کیا۔ ابھی تک مجھے ہوائی جہاز سے سفر کرنے میں تکلف تھا اس لیے ریل کے ذریعے ساری امریکا کا چکر لگاتا ہوا۔ لاس اینجلز، سان فرانسکو، شکاگو اور نیویارک ہوتا ہوا، ہارورڈ پہنچا۔ اپنے پہنچنے کی اطلاع پہلے سے کر دی تھی اس لیے طلبہ کی امدادی جماعت کی جانب سے میرے قیام کا بندوبست قریب میں ایک لینڈ لیڈی کے یہاں کر دیا گیا تھا۔ ہارورڈ تعلیم کی قبلہ گاہ ہے۔ اس بارے میں یہاں سے جو نکلتا ہے اسے نہ صرف امریکہ کی دوسری یونیورسٹیاں بلکہ ہندوستان تک کی جامعات اپنا لیتی ہیں۔ جنرل ایجوکیشن کی اسکیم نکلی تو علی گڑھ تک اس کی زد میں آ گیا، بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہمارے یہاں تخصیصی تعلیم ہے کہاں۔ ہمارے یہاں تو ہر چیز جنرل ہوتی ہے! اس

تعلیم کی ضرورت تو اس سماج کو ہے جہاں تخصیصی تعلیم، بالخصوص میکانکی تعلیم نے انسان کو کل کا پرزہ بنادیا ہو۔

ہارورڈ میں لسانیاتی لوگ بہت کم تھے لیکن دریا پار .T.I.M میں نوام چامسکی جیسے مشہور آفاق لوگ موجود تھے۔ بلوم فیلڈ کی 'بیوہاریت' کا طلسم ٹوٹ رہا تھا اور لسانیات نئی پرواز کے لیے پر تول رہی تھی۔ ہارورڈ کے ادارے میں اس وقت مشہور عالم آئی۔ اے رچرڈز بھی موجود تھے لیکن انھوں نے اپنی تحقیقات کو اب صرف انگریزی زبان پڑھانے کے طریقوں تک محدود کردیا تھا۔ جس شخص نے ساری عمر ادب کی ماہیئت اور معنی کی معنویت سمجھنے میں گزاری تھی آخری عمر میں بچوں اور بالغوں کو انگریزی پڑھانے کے طریقوں کی ایجاد پر وقت صرف کر رہا تھا! ہارڈ ورڈ میں میں نے خود کو کسی پروفیسر یا لکچروں کے سلسلے سے وابستہ نہیں کیا لیکن اس کی مشہور آفاق لائبریری سے استفادہ کرتے ہوئے فن شعر پر بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس زمانے میں میرے سر میں سودا سمایا ہوا تھا کہ زبان کے نازک ترین استعمال یعنی شاعرانہ استعمال کی کنہ تک پہنچ سکوں۔ لسانیات کا مطالعہ اب میرے لیے ثانوی ہو گیا تھا۔ جب ادبی نقادوں کی لفاظی سے گھبرا جاتا تو پھر لسانیات میں غوطہ زن ہوتا۔ قدما کے علم بیان و بلاغت کے بارے میں مشاہدات اور فرمودات کو لسانی علم کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کرتا۔ اس میں چامسکی کے نظریے سے بہت مدد ملتی اس لیے کہ اس نے علم لسان کی آنکھیں باہر کے بجائے اندر کی جانب کردی تھیں۔ اب 'معنی' اس قدر 'بے معنی' نہیں تھا جس قدر کہ 'بلوم فیلڈیوں' نے سمجھ رکھا تھا لیکن اس کے لیے 'نفسیاتی لسانیات' پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔ ہارورڈ ہی میں میں نے ادب اور 'مارکسزم' پر مختلف تصانیف پڑھیں جس کا نتیجہ میرے "سماج اور شعر" والے مضمون کی شکل میں نکلا جو میں نے امریکہ سے واپسی کے بعد لکھا اور جس پر بعض حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی اور سی۔ پی۔ آئی کے جریدے میں یہ تک لکھا گیا کہ بیڈ الرڈول رہے ہیں۔ حالاں کہ ردبل اسی قدر جھنکار دیتے ہیں جس قدر کہ ڈالرز! امریکہ کے قیام میں میری دلچسپی کا مرکز "تخلیق شعر" کے مسائل رہے۔ اس لیے کہ لسانیات کا اطلاق کرنے سے پہلے جاننا چاہتا تھا کہ شعر کے بارے میں ادبا، نقادوں [illegible] کا سوچنا

اور کہا ہے۔ صرف ان ادبی نقادوں کے اقوال میں بصیرت ملی جنھیں خود تخلیقِ شعر کا تجربہ تھا۔ لیکن ان کے بیانات بھی تاثراتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی جدید لسانیات سے واقف نہیں تھا۔ مختلف اصوات کس طرح ارکانِ تہجی کی شکل اختیار کرتی ہیں اور پھر یہ ارکان کس طرح 'لفظ' کی تشکیل کرتے ہیں، ان کے دائرۂ نظر سے دور تھا۔ پھر یہ نظر نحوی ساخت میں جا کر اور اُلجھ جاتی تھی۔ معنیات کی سرحدوں پر جا کر تو ماہرِ لسانیات بھی ساکت و صامت ہو جاتا ہے لیکن ادبی ناقدین کی طرح وہ قیاس آرائیوں سے اجتناب کرتا ہے اور شاعر کے منتخب کردہ الفاظ پر متبادل الفاظ رکھ کر غور کرنے لگتا ہے۔

ادبی تنقید کی ایک اور اُلجھن جس سے میں اس زمانے میں دوچار تھا یہ تھی کہ جب ادبی نقاد عام بیانات پر اُتر آتا ہے تو وہ نہ اصنافِ ادب پیشِ نظر رکھتا ہے اور نہ اصنافِ شعر، شلاً ناول اور افسانہ کی حقیقت نگاری شعر کی حقیقت نگاری سے الگ ہو گی اور شعر میں بھی غنائی شاعری کے اُصولِ نقد بیانیہ شاعری یا نظم نگاری کے اصولوں سے مختلف ہوں گے۔ غنائی شاعری موسیقی سے قریب ترین ہے۔ جس طرح موسیقی کے موثر ہونے کا اندازہ 'سماجی تنقید' سے نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح غنائی شاعری کو (جس میں غزل کا اہم مقام ہے) ہمیشہ سماجی اقدار کے تابع نہیں لایا جا سکتا۔ غزل میں 'خود کاوی' کی جو کوشش ہوتی ہے اُسے شاعر کی شخصیت کے حوالے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک دِل کے، غالب یا میر خود اپنی ذات' پر پیچ و تاب کھانے سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ کسی سیاسی انقلاب کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں نے نقدِ شعر کو متنِ شعر اور شاعر کی لسانی مہارت کے مطالعے تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔

اب میں اپنی فیلو شپ کے اختتام پر آ چکا تھا اور واپسی کے لیے پر تول رہا تھا کہ اچانک برکلے سے ڈاکٹر جان گمپرز کا خط ملا کہ کیلیفورنیا یونیورسٹی (برکلے) کے ساؤتھ ایشین ڈپارٹمنٹ کے صدر، پروفیسر ہیلر کی یہ خواہش ہے کہ فیلو شپ کے اختتام پر ہندوستان واپس جانے کے بجائے میں ایک تعلیمی سال کے لیے برکلے آ جاؤں اور ہندی اردو کی تعلیم کے سلسلے میں [illegible] شعبے کے اساتذہ کی مدد کروں۔ میں رکنے کا خواہشمند تو تھا لیکن [illegible] آل احمد سرور کے خط پر خط آ رہے تھے کہ

وہاں لسانیات کے پرچوں کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے، دوسرے بیوی بچے علی گڑھ میں تھے اور امریکی سماج کی خوفناک تنہائی سے گھبرا گیا تھا اس لیے میں نے بے دلی کے ساتھ ڈاکٹر گمپرز کو لکھا کہ میں رک جاؤں گا بشرطیکہ آپ کی یونیورسٹی میرے بیوی بچوں کے (جو اس وقت تعداد میں تین تھے) بلانے کا بندوبست کر سکے۔ میری اس درخواست پر غور کیا گیا اور میرے مشاہرے میں تھوڑی سی تخفیف کرنے کے بعد میرے بال بچوں کے سفر خرچ اٹھانے کی ذمہ داری لے لی گئی۔ اس کے بعد میں نیو یارک منتقل ہو گیا۔ یہاں ڈیڑھ مہینے کے انتظار کے بعد میری بیوی دو بچوں کی انگلی پکڑ کر اور ایک کو گود میں لے کر ایک صبح ہوائی جہاز سے اتریں۔ نیو یارک کے قیام میں میں نے اس شہر اور اس کے نواح کی خوب سیر کی اور وہاں کی مشہور پبلک لائبریری کو بھی کھنگالا۔ انتظار اور تنہائی کا میرے لیے یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا۔

ع آہ اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں

'آباد ویرانے' کا یہ تجربہ مجھ تک مخصوص نہیں تقریباً ہر ہندوستانی نے جسے چند سال یورپ یا امریکہ میں گزارنے پڑے ہیں اس کو محسوس کیا ہے۔ بعض نے اس سے نجات پانے کے لیے 'حوریانِ فرنگی' کی صحبت میں پناہ لی، بعض نے 'نوشی' اور مدہوشی میں۔ چوں کہ میں اقبال کی طرح (تازہ ترین تحقیق کے مطابق) دونوں سے محروم رہا، اور متاہلانہ زندگی کی آسودگی سے آشنا بھی تھا، اس لیے کام سے فراغت پا کر فرصت کا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ بعض اوقات بلا کسی مقصد کے نیو یارک کی سڑکوں یا باغوں میں مارا مارا پھرتا، وہاں بھی جی نہیں لگتا تو عجائب گھروں میں گھومتا رہتا۔ تسکین نہ ملنے کی صورت میں ذوقِ نظر آتشِ شوق کو اور بھڑکاتا۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ انسان اپنی اصل سے کٹ کر کس قدر بھیانک زندگی گزارتا ہے! یہاں فراقؔ نے سہارا دیا ؎

میں ہوں، دل ہے، تنہائی ہے
تم بھی ہوتے، اچھا ہوتا

نیو یارک سے برکلے کا سفر پھر ہم نے ریل سے اختیار کیا۔ ریل سے اتنے لمبے سفر امریکہ میں عام طور پر پسند نہیں کیے جاتے۔ ریلیں تو وہاں بار برداری کا وسیلہ ہیں۔

راستے میں ٹھنڈا دودھ پینے کی وجہ سے میری چھوٹی بچی نادرہ کو شدید قسم کا نزلہ اور زکام ہو گیا۔ اسی حالت میں ہم برکلے پہنچے جہاں پہلے سے نچلے متوسط طبقے کے علاقے میں ایک کاٹیج ہمارے لیے کرائے پر لے لی گئی تھی۔ کاٹیج کے مالک کسی جونیئر کالج کے ریٹائرڈ استاد ڈاکٹر موئر تھے۔ انھوں نے بچی کو بیمار دیکھ کر پڑوس کے ایک کلینک کا پتہ دیا جو کئی ڈاکٹروں نے اشتراک میں قائم کیا تھا۔ بچی کو فوراً لے جا کر دکھایا اس لیے کہ اُسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ تجویز ہوا کہ کلینک کے دوسرے حصّے میں خون، پیشاب اور پاخانے کے ٹیسٹ کرائے جائیں۔ اس کے بعد دوا تجویز ہو گی۔ بل سیکڑوں پر پہنچ گیا۔ تیسرے روز پھر بچی کو لے کر گئے۔ اب تجویز ہوا کہ گردے متاثر ہیں۔ ان کا ایکسرے کرایا جائے۔ اس پر الگ سے گراں قدر رقم خرچ ہوئی۔ ہماری مالی پریشانی بڑھنے لگی۔ میری بیوی نے کہا مجھے تو یہ سب لوٹنے کا دھندہ معلوم ہوتا ہے، بچی کے نہ گردے خراب ہیں اور نہ پھیپھڑے۔ معمولی زکام ہے، البتہ غدود متاثر ہیں اس لیے تیز بخار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ گھریلو معالجہ کیلئے چند اجزا خرید کر لائیں اور اُن سے جو علاج کیا تو بچی دو روز میں بالکل ٹھیک تھی۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میں نے دوستوں سے کہا یہاں علاج کے بجائے مرجانا سستا ہے۔ ایک ستم ظریف نے کہا کہ مرنے کے بعد اگر گڑنے کی خواہش ہے تو یہ اس سے بھی زیادہ مہنگا پڑتا ہے۔ اس کے بعد اندازہ ہوا کہ امریکی ذہن ہر وقت ڈالر کے چکر میں کیوں رہتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی بات یا آدمی کو بھی ڈالروں میں تول کر بتایا جاتا ہے یعنی یہ ملین ڈالر کی بات ہے یا وہ ملین ڈالر کا آدمی ہے۔

ہمارے مالکِ مکان ڈاکٹر موئر نہایت شائستہ اور خلیق انسان تھے۔ وہ متوسط طبقے کے ہر امریکی کی طرح محنتی اور جفاکش بھی تھے۔ ہماری کاٹیج کافی پُرانی تھی اور ہر قسم کی مرمت چاہتی تھی وہ اپنے موٹر میں بڑھئی کے سارے اوزار بلکہ گھاس کاٹنے کی مشین تک لے کر آتے ہر قسم کی مرمت خود کرتے اور سامنے کے لان کی گھاس تک خود کاٹتے۔ انھیں ہاتھ کا کام کرنے میں کسی قسم کا عار نہیں تھا۔ یوں بھی امریکہ میں انسان کے ہاتھ کی بہت قیمت ہے۔ جنس سستی ہے لیکن اس میں انسان کا ہاتھ لگ جائے تو قیمت دُگنی ہو جاتی ہے وہاں ۔۔۔ کا ، ہم ، اجرت اس قدر مقرر ہے کہ ہم اس کا سان و گمان بھی نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے ڈاکٹر موز اپنے گھر کا سارا کام کرنے بعد ہی کرائے کے مکان کا رخ کرتے ہوں گے۔ ایک بار رات کو تیز ہوا سے جو خلیجِ سان فرانسسکو کی جانب سے چلتی تھی، برآمدے کے کچھ شیشے ٹوٹ گئے۔ موز صاحب کو جب علم ہوا تو ایک روز موٹر میں چھوٹے بڑے شیشے، ان کو کاٹنے کی ایک کنی اور پٹڈنگ (مسالہ) لے کر آئے اور کام پر پل پڑے۔ میری بڑی بچی فریدہ کے لیے جس کی عمر اس وقت چھ سال ہوگی، یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ وہ موز صاحب کے ارد گرد مسلسل گھومتی رہتی اور سوالوں کی بوچھار شروع کر دیتی، یہ خیال کر کے کہ موز صاحب اس کی زبان ضرور سمجھتے ہوں گے۔ "ایں موز صاحب! یہ آپ کیا کاٹ رہے ہیں، شیشہ کیسے کٹ جاتا ہے۔ کنی میں کیا لگا ہوا ہے وغیرہ" موز صاحب اس خیال سے کہ بچی اضطراب میں کہیں پاؤں شیشوں پر نہ رکھ دے بار بار کہتے "Sit Down"۔ وہ بچاری موز صاحب کی "ترکی" کیا سمجھتی یہ ناراض ہو کر دھمکا رہے ہیں۔ ماں کے پاس باورچی خانے میں دوڑی ہوئی گئی اور کہا "امی! امی! موز صاحب مجھ سے کہہ رہے ہیں "ڈنڈا لاؤں"۔ دیکھئے تقلیبِ صوت کے اعجاز نے کس طرح ایک بچی کی سماعت کے لیے "سِٹ ڈاؤن" کو "ڈنڈا لاؤں" میں تبدیل کر دیا! جب میں نے موز صاحب کو یہ لطیفہ سنایا تو فریدہ کو پیار کرتے جاتے اور ہنس ہنس کر لوٹ جاتے تھے، بار بار پیار سے کہتے "ڈنڈا لَو، ڈنڈا لَو"۔

برکلے میں میں نے اُردو ہندی کی تدریس کے ساتھ اپنی دلچسپی کا مطالعہ بھی جاری رکھا۔ امریکن یونیورسٹیوں میں کتب خانوں میں جو سہولتیں ہیں وہ قابلِ رشک ہیں۔ کونسی کتاب ہے جو وہاں موجود نہیں۔ اور جو موجود نہیں وہ منگا دی جاتی ہے۔ کتب خانوں کا عملہ عبادت کے طور پر آپ کی خدمت کرنے کو تیار رہتا ہے۔ غرض کہ ایسا ماحول ہوتا ہے کہ پڑھنے لکھنے کو خود بخود جی چاہتا ہے۔ کتب کی فراہمی کے علاوہ جدید فوٹو گرافی کی ٹیکنک سے جس قدر سہولتیں پیدا کی جاسکتی ہیں وہ بھی سب موجود تھیں۔ میں نے برکلے کی لائبریری میں فوٹو فلموں کی شکل میں مسلم لیگ پر ایسا مواد بھی دیکھا جو ہندوستان تک میں دستیاب نہیں۔ یہ مواد غالباً کسی ایسے ریسرچ اسکالر کی فرمائش پر مہیا کیا گیا تھا جو مسلم لیگ کی تحریک پر کام کر رہا تھا۔ مشہور روزناموں کی فلمیں الگ تھیں ان کا ایک علاحدہ سکشن تھا

مجھے شعبے کی جانب سے عراق کے ایک پروفیسر کا جو طویل رخصت پر ملک سے
ہر گئے ہوئے تھے، کمرہ دیا گیا۔ اس سے ملحق عربی کے ایک استاد کا جن کی شہرت
مر تک پھیلی ہوئی تھی کمرہ تھا۔ امریکی یونیورسٹیوں میں حسن خدمت پر سبکدوش
ساتذہ کا نہ صرف احترام کیا جاتا ہے بلکہ اگر ان میں سے کسی میں دم خم باقی رہ گیا
ہو تو انھیں وہ تمام سہولتیں دی جاتی ہیں جو دیگر اساتذہ کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ شعبے کے
ربی کے استاد ڈاکٹر برنر کے استاد تھے اور میں دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر برنر ان کا کس قدر احترام
رتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا ان کا احترام امریکی کلچر کی دین تھی یا اس کا ماخذ دور مشرق کی سرزمین کی برکت
تھی اس لیے کہ دونوں یہودی النسل امریکی تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان میں حوصلۂ
قلم و رقم اب تک باقی تھا۔ پابندی سے آتے اور اپنا علمی کام کرتے۔ ان کے کمرے میں کتابوں کا اس
قدر انبار تھا کہ خفیف چھت تک پہنچتا تھا اُن تک رسائی کے لیے الومنیم اسٹیل کی سبک سیڑھی تھی۔
میں ہمیشہ اُن سے اس خدشے کا اظہار کرتا کہ کہیں وہ چڑھنے میں گر نہ پڑیں۔ کہتے کہ نہیں میرے
پیروں میں دم خم ہے۔ انھوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ "میں نے آپ سے زیادہ خاموش پڑوسی
آج تک نہیں دیکھا" میں نے جواب دیا ؎

فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے

پھر اس مصرع کا مطلب سمجھایا تو بہت خوش ہوئے۔ یہ نہیں بتایا کہ اقبال نے یہ مصرع
مسولینی کے لیے کہا تھا۔

پروفیسر موصوف شعبے کے عربی کے استاد اور میرے عزیز دوست مسٹر برنر کے استاد
تھے جو ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ دونوں یہودی تھے۔ شعبے کے صدر مسٹر بیلر تھے لیکن ان کا
تعلق کسی ہندوستانی زبان سے نہیں تھا۔ صرف ڈاکٹر جان گمپرز کو ہندوستان اور ہندوستانی
زبانوں سے دلچسپی تھی۔ اتفاق سے وہ بھی یہودی تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہودی
امریکہ کی مالیاتی دنیا ہی پر نہیں علمی دنیا پر بھی کس طرح چھائے ہوئے ہیں۔

برکلے سے ملا ہوا سان فرانسسکو کا اُم البلاد ہے جو مشرق کا نیویارک ہے۔ لیکن
جب کہ نیویارک ہلکے رنگوں اور دھندلکوں کا جہاں ہے سان فرانسسکو نیلے آسمان اور نیلگوں

سمندر کا سواد اعظم رکھتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے بھی یہ نیویارک سے بہتر ہے اور چوں کہ کیلیفورنیا
کو امریکہ کا کشمیر کہا جاتا ہے، فواکہات کی کثرت، موسم کی تازگی اور شہر اور قصبوں کی صفائی
دیکھ کر اقبال کا یہ مصرع یاد آتا تھا ع

افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند

دودھ کی ندیاں، شہد ناب کی بہتات، مشروبات کی کثرت، کام و دہن کی آزمائش
کے لیے کیا کچھ نہ تھا۔ مرغ کا گوشت سب سے سستا پایا، چنانچہ ہم لوگوں نے زیادہ تر اسی کو آزمایا۔
بچے اس آزمائش سے اس قدر عاجز آگئے تھے کہ جب ثابت مسور کی دال (بس یہی دال وہاں
ملتی تھی) پکتی تھی تو من و سلویٰ سمجھ کر کھاتے۔ میں یونیورسٹی کے کیمپس سے نکلتے وقت پاس کے
ریستوران سے المونیم فوائل میں لپٹا ہوا بجلی کے ہیٹر پر بھنا ہوا ایک مرغ شام کے کھانے کے لیے
ضرور خرید لیتا۔ وہ گھر پہنچنے پر بھی بھبکتا ہوا نکلتا۔ بچے اس پر بھی راضی نہیں تھے۔ دودھ
سے بھی سیر ہو گئے تھے۔ البتہ آئس کریم شوق سے کھاتے۔ یہی حال پھلوں اور ان کے
عرق کا تھا۔ ہر چیز سے نیت بھر گئی تھی۔ گھر کا ہر فرد اس غذا پر سرخ سفید ہو گیا تھا۔ اس
وقت تک میں 'کولسٹرول' وغیرہ کی تباہ کاریوں سے واقف نہیں تھا۔ اتفاق سے ہندوستان
آنے سے چند ہفتے قبل میں نے صحت کی انشورنس کے تحت اپنا میڈیکل معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر نے
تنبیہ کی کہ مسٹر حسین آپ کے خون میں شکر بہت بڑھ گئی ہے، وزن بھی زیادہ ہے۔ آپ
اب احتیاط شروع کر دیجئے۔ پھر کچھ ہدایات اور دوائیں لکھ کر دیں اور کہا ہندوستان
پہنچ کر ہر تین مہینے پر اپنا طبی معائنہ کراتے رہیے۔ جتنا کھایا پیا تھا یہ سُن کر سب نکل گیا۔ واپس
آنے کے بعد اپنے 'خون' سے کشاکش کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ تاحال جاری ہے۔ جب بھی
کوئی شیرینی پیش کرتا ہے خود کو 'نمک خوار' بتا دیتا ہوں۔

اپنے بڑے بچے جاوید کے سلسلے میں مجھے امریکن اسکولوں کے تعلیمی نظام کا بھی تجربہ
ہوا۔ اس کی عمر دس سال کے قریب تھی۔ ہماری خواہش تھی کہ اس کا تعلیمی سال ضائع
نہ ہو، اس لیے پڑوس کے ایک اسکول میں داخلہ کرا دیا۔ ظاہر ہے اس کی انگریزی
بہت کمزور تھی اس لیے وہ کلاس میں بے جان سا خاموش بیٹھا رہتا اور ٹیچر دیکھ

سوالات کا جواب نہیں دے پاتا۔ چند ہفتوں کے بعد مجھے اس کے کلاس ٹیچر نے اسی کے ہاتھ رقعہ بھیجا جس میں یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ان سے جاکر اسکول میں ملوں۔ گیا تو انھوں نے نہایت تشویشناک لہجے میں کہا "مسٹر حسین، آپ کا بچہ نارمل نہیں ہے"۔ دریافت کرنے پر تفصیلات بتانے لگیں، اور نفسیات کے کسی ماہر کے پاس لے جانے کے لیے کہا۔ میں صورتِ حال کو فوراً سمجھ گیا کہ جاوید کے بارے میں یہ اسی انداز میں سوچ رہی ہیں جس طرح ہمارے یہاں پہنچنے پر وہاں کے ڈاکٹروں نے میری چھوٹی بچی کے معمولی سے زکام کا بتنگڑ بنا کر آدھے درجن ٹیسٹ بنا دیئے تھے۔ میں نے کہا آپ تشویش نہ کریں اور مجھے پرنسپل صاحبہ سے ملنے کا موقع دیں۔ چند روز میں اُن سے ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا۔ گیا تو وہ مجھے زیادہ سمجھدار اور معقول نظر آئیں۔ میں نے کہا جاوید بالکل نارمل بچہ ہے۔ اس کی 'ایب نارمل' حرکتوں کا تعلق انگریزی زبان کی استعداد کم ہونے کی وجہ سے ہے۔ دو تین مہینوں میں دیکھیے گا وہ کلاس میں چل نکلے گا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ اس کے بعد پھر اس کی کوئی شکایت نہیں آئی۔ امریکہ کے ڈاکٹروں کا تجربہ تھا ہی، ان کے تعلیمی نظام کا یہ تجربہ مزید ہوا تو بے ساختہ زبان سے نکلا:

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا

البتہ اس قدر ضرور کہوں گا کہ باوجود بعض خرابیوں کے (مثلاً ہر امریکن بچے کا خط خراب ہوتا ہے) امریکی سماج اپنے بچوں کو مستقبل کی دولت سمجھ کر عزیز رکھتا ہے۔ یہ صورت چاہے خاندان میں نہ ہو (جہاں ہر تین شادیاں ایک طلاق پر ختم ہوتی ہیں) لیکن سماج اور حکومت کی نظر میں ضرور ہے۔ میں نے دیکھا اسکولوں کے چاروں طرف سڑکوں پر آہستہ موٹر چلانے کی ہدایت لگی ہوتی ہیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ ان پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں خفیہ پولیس کے لوگ "اسپیڈ" کی شناخت کے لیے باریک تار سڑکوں پر ڈالے ہوئے دور بیٹھے رہتے ہیں۔ ان تاروں پر سے موٹر گذرتے ہوئے اپنی رفتار بتا جاتی ہے اور قانونی کارروائی کے لیے اس موٹر کا نمبر فوراً نوٹ کر لیا جاتا ہے۔

سماجی احساس کی ایک اور مثال کا واقعہ مجھے یاد آ رہا ہے۔ جاوید کے اسکول کے سامنے بچوں کے کھیلنے کا میدان تھا۔ جہاں ایک دن پڑھ دستہ [illegible] آ گیا۔ بچوں کو

فٹ بال کے ساتھ اچھلتے کودتے دیکھ کر وہ بھی اچھلنے لگا۔ اِس اُچھل کود میں اتفاق سے اس کا دانت جاوید کی ٹانگ میں لگ گیا۔ بس پھر کیا تھا اسکول اور محلّے دونوں میں کہرام مچ گیا۔ ٹیلیفون کھڑکھڑانے لگا۔ ایک خاتون نے (جو کتے کی مالک تھیں) پہلے تو ہم سے معافی مانگی اس کے بعد یقین دلایا کہ ان کے کتے کے ٹیکا لگا ہوا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس سلسلے میں میڈیکل ایڈ پر جو بھی خرچ ہو اُسے وہ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ سماجی ذمہ داری کے احساس کی یہ انتہا تھی۔

برکلے میں سال بھر گذارنے کے بعد بالآخر وطن کو واپسی کی تیاری ہونے لگی باوجود نعمتوں اور راحتوں کے واپسی کی خوشی تھی اور اقبال کا یہ شعر وردِ زبان رہتا ہے

فرنگ میں کوئی دن اور بھی ٹھہر جاؤں
مرے جنوں کو سنبھالے اگر یہ ویرانہ

میرے خیال میں اقبال ہی نہیں اِس ذہنی کیفیت سے قیامِ فرنگ میں ہر ہندوستانی گزرتا ہے۔ "وہ مشتِ خاک" جس سے وطن عبارت ہے اور جس کے بدلے میں حالی نے دبہشت تک لینے سے انکار کیا ہے "مشتِ خاک" نہیں "طرزِ حیات" ہوتا ہے جس کے باہر انسان زیادہ دنوں تک خوش نہیں رہ سکتا۔ یہ کبھی تنہائی بن کر ستاتا ہے اور کبھی دوری کی شکل میں کاٹتا ہے۔ میرے ان تاثرات کا دھندلا سا عکس اس غزل میں دیکھئے جو میں نے قیامِ فرنگ کے پہلے سال میں لکھی تھی جب میں تنہا تھا:

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ ملا
ہزار نقش ملے، کوئی رازداں نہ ملا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصورِ رخِ جاناں کا امتحاں نہ ملا
یہ سچ نہیں ہے کہ چھٹنے کے بعد جانِ وصال
تجھے زمیں نہ ملی، مجھ کو آسماں نہ ملا

ادائے خاص ملی اور صلائے عام ملی
مگر کہیں بھی وہ انداز جان جاں نہ ملا

گداشناسیٔ اہل کرم مسلّم ہے
ہم اُٹھ کے جس کے قدم لیں وہ پابلند ملا

جہاں بھی دیکھا وہیں پایا تجھ جان جمال
تری نگاہ کا پرتو کہاں کہاں نہ ملا

وہ دل ہی کیا جو محبت سے آشنا نہ ہوا
سفینہ کیا وہ جسے بحر بیکراں نہ ملا

کسے سنائیں غزل بہر شرح دل مسعود
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ ملا (امریکہ اکتوبر ۶۵ء)

چنانچہ ہم سب ہندوستان لوٹنے پر خوش تھے۔ پھر طے کیا کہ سفر خشکی اور سمندر سے کیا جائے، حالانکہ ہمیں ہوائی جہاز سے سفر کرنے کی اجازت تھی اور اس کے ذریعے ہم دو روز کے اندر پہنچ سکتے تھے، چنانچہ برکلے سے نیویارک تک کا سفر پھر ریل سے طے کیا۔ نیویارک سے کوئن میری (جواب معطل ہو چکا ہے) برٹش کمپنی کا جہاز لیا۔ جہاز کیا تھا سمندر پر تیرتا ہوا شہر تھا۔ اس کے عرشے، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، ایسا معلوم ہوتا تھا آپ کسی پانچ ستاروں کے ہوٹل میں آگئے ہیں۔ تینوں بچوں سمیت کھانے کے لیے دونوں وقت ہم لوگ ڈائننگ روم جاتے۔ چونکہ میری بیوی کو ذ بیحہ کا بہت خیال رہتا تھا اس لیے روز مچھلی کی فرمائش ہوتی۔ چنانچہ انگریز بیرا، جو غیر معمولی طور پر مسخرا تھا، ہمیں دیکھتے ہی کہتا "فش اینڈ چپس" آ رہے ہیں۔ 'چپس' کا اشارہ ظاہر ہے تینوں بچوں کی جانب ہوتا۔ ہفتہ بھر میں بحر اوقیانوس پار کر کے لندن پہنچ گئے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا پہلے سے انتظام تھا۔ بال بچوں کو تین روز تک لندن کی سیر کرائی۔ ایک فریج اور کچھ چھت کے پنکھوں کی خریداری کی اور بحری جہاز سے بمبئی کے لیے روانہ ہو گئے۔

دس برس پہلے لندن میں سال بھر رہ چکا تھا۔ اس وقت لندن، دہلی

اور بمبئی کے مقابلے میں ایک نہایت عمدہ شہر معلوم ہوا تھا۔ امریکہ سے واپسی پر یہاں کی ہر چیز گھٹیا لگی۔ بچوں کے لیے دودھ لیتے، وہ کم تر، ریستوران میں کھانا کھایا وہ گھٹیا ملا۔ غرض کہ امریکی معیار سے ہر چیز کو فروتر پایا۔ وہاں سے سوئے مشرق روانہ ہوئے تو جہاز ہی سے بمبئی کی خوشبو آنے لگی۔ بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا کہ لندن اس سے ہزار درجہ بہتر تھا۔ یہاں کی تو ہر چیز بد سے بدتر تھی، لیکن یہ احساس کہ — اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے! — زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا۔

بمبئی میں معلوم ہوا اس روز ریلوں کی اسٹرائک تھی۔ ہم نے ہوائی جہاز کے سفر کے بدلے میں فرسٹ کلاس ایر کنڈیشنڈ کا ریزرویشن کرایا تھا۔ بڑی مشکل سے ایک گاڑی میں جگہ ملی۔ ساری گاڑی کو خالی پایا۔ سروس کی قلت اور تنہائی کے خوف سے فرسٹ کلاس میں تھرڈ کلاس کا لطف آیا!

گیارھواں باب

دکھن ملک بھوتیچ خاصا اَہے ' (وجہی)

(۶۲ تا ۶۸ء)

علی گڑھ واپس آکر میری بے اطمینانی بڑھتی گئی۔ میرے لیے ترقی کے راستے مسدود تھے۔
موجودہ صدرِ شعبہ، پروفیسر آل احمد سرور مجھ سے عمر میں صرف سات سال بڑے تھے جیسا کہ اشارہ
کرچکا ہوں وہ شعبہ میں لسانیات کی دوسری پروفیسری کے لیے بہت زیادہ خواہش مند بھی نہیں
تھے۔ میری امریکہ کی غیر حاضری میں انھوں نے لسانیات کی ایک ریڈرشپ حاصل کرلی تھی۔ اب
ان کی خواہش تھی کہ میں اس پر چلا جاؤں تاکہ میری ریڈری پر ڈاکٹر محمد عزیز کا تقرر کیا جاسکے،
جو ابھی تک لکچرر تھے۔ میں ڈاکٹر عزیز صاحب کا بڑا احترام کرتا تھا اس لیے کہ وہ اللہ کے ایک
نیک بندے تھے۔ لیکن میرے ساتھ جو بے انصافی ہو رہی تھی (جس کا چرچا علی گڑھ میں
عام تھا) اس کے پیشِ نظر میں نے اس منتقلی سے انکار کر دیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ نئی
ریڈری پلان کی پوسٹ تھی اور میرا تقرر شعبے کی سب سے پرانی ریڈری رشید احمد صدیقی صاحب
کی جگہ پر ہوا تھا۔ میرے اس انکار کے بعد خوش ہوں، کہ ڈاکٹر عزیز صاحب کا کوئی
نقصان نہیں ہوا۔ کسی نہ کسی تاویل کے ذریعے لسانیات کی ریڈری پر ان کا تقرر کر دیا گیا،
حالاں کہ عزیز صاحب اور میں دونوں، اس بارے میں متفق تھے کہ ان کی ترقی
کا سب سے آسان طریقہ یہ ہوتا کہ مجھے لسانیات کی پروفیسری قائم کرکے اس پر

ترقی دے دی جاتی اور ان کا تقرر میری جگہ پر ہو جاتا۔ کہا جاتا ہے کہ پروفیسر شپ قائم کرنے کی تجویز اکیڈمک کونسل میں پیش بھی ہوئی تھی لیکن چوں کہ صدر شعبہ کی مرضی نہیں تھی اس لیے ریڈری میں تبدیل کر دی گئی۔

میں اب علی گڑھ سے غیر مطمئن تھا۔ اور نظریں اِدھر اُدھر دوڑانے لگا تھا۔ اس زمانے میں پروفیسری بڑی مشکل سے ملتی تھی، ایک تو یہ بہت کم تھیں۔ دوسرے مقابلہ بہت سخت تھا۔ حسنِ اتفاق پروفیسر عبدالقادر سروری کسی کام کے سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ ان سے مجھے نیاز مندی حاصل تھی اور وہ میرے کام کے قدر داں تھے۔ جب وہ پونا کے سمر اسکول میں بحیثیت طالب علم آئے تھے تو اس وقت انھوں نے مجھے استاد کی حیثیت سے بھی دیکھا تھا، بلکہ اردو داں ہونے کے باعث ڈاکٹر کاترے نے انھیں صوتیات کے اس گروپ میں رکھا تھا جسے میں پڑھا رہا تھا۔ انھوں نے مجھے جونیر سمجھ کر درخواست دی کہ انھیں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے گروپ میں منتقل کر دیا جائے۔ ڈاکٹر کاترے اس پر برہم تھے کہ ایک اُردو کا آدمی اور بنگالی کے گروپ میں جانا چاہتا ہے۔ جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے ڈاکٹر کاترے سے پُرزور سفارش کی کہ ان کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے انھیں چٹرجی کی کلاس میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ ڈاکٹر کاترے ناراض اِس بات پر تھے کہ وہ ایک نئے علم کی واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جونیر سینیر کے چکّر میں پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے بہرحال، ہمارے معاشرے میں حفظِ مراتب کی جو روایت ہے، اس کا حوالہ دے کر انھیں قائل کر لیا اور قبل اس کے کہ وہ میری کسی کلاس میں شرکت کر سکیں، ان کے نام کا چٹرجی کے رجسٹر میں اندراج ہو گیا۔ میں نے اس راز کو سروری صاحب پر کبھی افشا نہیں کیا۔

بہرحال علمی اعتبار سے وہ میرے قدر داں تھے! انھوں نے علی گڑھ کے اس بار کے سفر میں برسبیلِ تذکرہ اپنے ریٹائرڈ ہونے کا تذکرہ کیا اور بالواسطہ انداز میں یہ جاننا چاہا کہ آیا میں حیدر آباد آنے میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ میں نے ہامی بھر لی۔ چند مہینوں کے بعد ان کا خط ملا جس میں اردو کے شعبے کی پروفیسری کے اعلان کا تراشہ اور ساتھ میں درخواست

کا فارم ملفوف تھا۔ میں نے نہایت بے دلی کے ساتھ اسے بھر کر بھیج دیا۔ فروری ۶۲ء میں اچانک رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے یہاں سے مجھے انٹرویو کی اطلاع ملی اور میں دکن کے لیے پابہ رکاب ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو میرے بڑے بھائی اقبال حسین خاں ششدر رہ گئے۔ ساری عمر وہاں گزارنے کے بعد بھی وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کو نہ معلوم کیوں میرے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ دوسرے دن میں اپنی تصانیف کا پلندہ اٹھائے، سوٹ پہنے انٹرویو کے لیے آرٹس کالج کی سنگین عمارت میں پہنچا جہاں وائس چانسلر کا دفتر تھا۔ دفتر سے ملحق ایک کمرے میں امیدواروں کو بٹھایا گیا تھا۔ خاص خاص امیدواروں میں دو عثمانیہ کے تھے یعنی ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ اور ایک میری طرح باہر کے یعنی ڈاکٹر گیان چند جین جو اس وقت بھوپال سے آئے تھے۔ میں غالباً چوتھے نمبر پر بلایا گیا۔ اندر جا کر دیکھتا ہوں تو سروری صاحب کے علاوہ پروفیسر اعجاز حسین اور پونا کے شری بھگوت دیال ورما موجود تھے۔ شری ورما پونا کے ایک کالج میں اردو فارسی کے استاد تھے اور یہ حسن اتفاق تھا کہ چند سال قبل وہ لسانیات کے سمر اسکول میں میرے طالب علم کی حیثیت سے شرکت کر چکے تھے۔ صدر انتخاب کمیٹی وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس ریڈی تھے۔ پرنسپل اور ڈین کی حیثیت سے پروفیسر عبدالقادر نے شرکت کی جو میرے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ مجھے اپنے منتخب ہو جانے کی قوی امید ہو گئی، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ میں ابھی باہر نکل کر اپنے کاغذات ٹھیک ہی کر رہا تھا کہ ایک کلرک آیا اور مجھ سے کہا "صاحب دراصل وائس چانسلر کہہ رہے ہیں کہ آپ ابھی نہ جائیں" اور لوگ جو کمرے میں تھے انھوں نے نتیجہ کو بھانپ لیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے پھر طلب کیا گیا اور ڈاکٹر ریڈی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں عثمانیہ جوائن کرنے میں کتنا وقت لوں گا۔ وہ چاہتے تھے کہ ایک آدھ مہینے میں آجاؤں۔ لیکن میں نے کہا کہ علی گڑھ کا کورس نا تمام پڑا ہے، اس کے بعد امتحانات ہوں گے اس لیے مجھے جون تک مہلت دی جائے، اس وقت تک عثمانیہ یونیورسٹی تعطیلات گرما کے بعد کھل جائے گی۔

شام تک اردو کے نئے پروفیسر کے انتخاب کی خبر عام ہو گئی۔ میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب سے ملا تو انھوں نے بڑے مزے لے لے کر

گیان چند صاحب کی اُمیدواری کا قصہ سنایا۔ کہا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا یہ الہ آباد کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انھوں نے ہمیں کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو انھیں اس انتخاب کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو اچانک میرے پاس خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدرآباد تو جانا ہے ہی ایسی تاریخ دی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہم سفر تھے۔

شام کو زور صاحب سے بھی ملاقات ہوئی تو انھوں نے اپنی معمولاً نیازمندی سے کہا "آپ سے بہتر اور کون عثمانیہ کو مل سکتا تھا۔ میں نے تو صرف حقِ شاگردی ادا کیا ہے"۔ میں ان کے یہ کہنے پر رشتہ خطی تھا، حالاں کہ خوب جانتا تھا کہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں تھے بلکہ پونا کے ایک کالج کے استاد تھے!

دو روز کے بعد جب علی گڑھ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اتفاق سے اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو پایا۔ اسی سفر میں انھوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سُنایا تھا۔

جون ۶۲ء میں حیدرآباد پہنچ کر سروری صاحب سے شعبۂ اردو کا چارج لیا۔ وہ اس وقت توسیعِ ملازمت پر چل رہے تھے۔ بعد کو مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ریڈی شعبے میں ان کی کارگزاری سے زیادہ خوش نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ میں جلد از جلد حیدرآباد پہنچ جاؤں۔ میں وہاں تنہا پہنچا تھا اور اپنی ہمشیرہ کے ساتھ ریڈ ہلز (لال ٹیک) میں مقیم تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میری بیوی بھی بال بچوں کو لے کر آ گئیں۔ چند ہفتے لال ٹیک میں مزید قیام کرنے کے بعد میں اڈیکمیٹ میں یونیورسٹی کے مکان میں منتقل ہو گیا جو ڈاکٹر ریڈی کی عنایت سے مجھے الاٹ ہو گیا تھا۔ یہ مکان کسی زمانے میں ایک جاگیردار نے شہر سے باہر موسمِ گرما گزارنے کے لیے بنوایا تھا۔ سامنے کی زمین میں جہاں موجودہ انجینئرنگ کالج ہے، اس کا آموں کا باغ تھا۔ مکان میں مکانیت بہت کم تھی صرف دو بڑے کمرے اور ایک بہت بڑا ہال تھا جو غالباً رقص و سرود کی محفلوں

کے کام آتا ہوگا۔ اس کا ڈرائنگ روم کافی عظیم تھا، رومن فنِ تعمیر کے اونچے ستون اور کشادہ سرد رہتا۔
ڈاکٹر ریڈی جب کبھی شہر جاتے ہوئے اس طرف سے گزرتے تو مجھ سے بعد کو ضرور کہتے "نواب
کا محل معلوم ہوتا ہے"۔ میں کہتا "جی ہاں! صرف باہر سے" میرا اصل مسئلہ اس 'محل' کے لیے فرنیچر
اور اسبابِ آرائش فراہم کرنے کا تھا جو میں اپنے قیام کی چھ سالہ مدت میں بھی نہ کر سکا۔ مکان مل
جانے کے بعد مجھے بچوں کے داخلے کی فکر ہوئی۔ جاوید علی گڑھ سے ساتواں درجہ پاس کرکے آیا تھا'
اُسے مسعود یزدانی صاحب کی بیگم صاحبہ کی سفارش سے حیدر آباد کے ایک اچھے اسکول، گرامر
اسکول، میں داخلہ مل گیا۔ دونوں بڑی بچیاں ۔ فریدہ اور نادرہ ۔ لڑکیوں کے مشہور محبوبیہ
اسکول داخل ہو گئیں۔ اس اسکول کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ نظام شاہی میں جاگیردار
گھرانے کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا تھا اور یہاں سے لڑکیاں مردانہ بولی ۔ میں جاتا
ہوں، میں جاؤں گا ۔ کہتی ہوئی نکلتیں۔ میں نے اس کی تحقیق کی تو معلوم ہوا بولی ٹھولی کا یہ انداز
مغل شہزادیوں سے نکلا تھا جن کی بلوغت کی عمر پہنچنے تک لڑکوں کی طرح تربیت کی جاتی
تھی، بغیر دوپٹے کا لباس، گول کامدار ٹوپی اور کھڑا پاجامہ ان کا لباس ہوتا۔ گھڑسواری کی
تربیت دی جاتی۔ وہ مردانہ بولی بولتیں اور ان کو بیٹی کے بجائے 'بیٹا' سے بلایا جاتا۔ آج بھی ہم
لاڑ میں بیٹی کو 'بیٹا' کہہ دیتے ہیں۔

حیدر آباد پہنچنے کے دو مہینے کے بعد ہی میرے آخری 'بیٹا' (یعنی بیٹی زیبا) کی پیدائش
ہوئی۔ صحت اور وزن کے لحاظ سے بھی وہ 'بیٹا' معلوم ہوتی تھی۔ ساڑھے بارہ پاؤنڈ وزن'
موٹے موٹے ہاتھ پاؤں۔ لیڈی ڈاکٹر زبیدہ اس کو فخریہ اپنے کلینک میں آنے والوں کو دکھاتیں۔
کچھ عرصے تک اس کی ولادت کے چکر میں رہا۔ اس سے فارغ ہو کر شعبہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ڈاکٹر
ریڈی نے دورانِ گفتگو اس سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا۔ در اصل انتشار و افتراق
اس شعبے کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا جو ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور پروفیسر عبدالقادر سروری
کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے کھلی جنگ میں تبدیل ہو چکا تھا، اور ہر وائس چانسلر کے لیے دردِ سر
بنا رہا۔ ڈاکٹر ریڈی کا خیال تھا کہ اب اس شعبے کو کسی 'غیر ملکی' (بیرونِ حیدر آباد کا) کے
سپرد کرنا چاہیے تاکہ اس کی پارٹی بندی ختم ہو۔ شعبے کے اساتذہ میں سب سے سینیئر

ڈاکٹر حفیظہ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ تھیں جو بحیثیت ریڈر مرکزی شعبہ میں کام کر رہی تھیں۔ زینت ساجدہ ویمنس کالج کی اچھی استاد بھی جاتی تھیں۔ ہمدرد اور پُرخلوص خاتون تھیں۔ لیکن مزاج کا یہ عالم تھا کہ کی بات جس سے اُس نے شکایت ضرور کی۔ ڈاکٹر حفیظ مرنجامرنج جسمانی اعتبار سے نحیف مگر کلاسیکی ادب میں ٹھوس قابلیت کے آدمی تھے۔ ان کا معرکتہ الآرا تحقیقی کام وہ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کا رسالہ نہیں، ان کے کئی سو سال بعد کسی دوسرے اہلِ تصوف نے تصنیف کیا تھا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، پروفیسر سروری صاحب کی ترجیحی فہرست میں نمبر ایک تھی۔ انھیں کے ساتھ انھوں نے اردو نثر کا ارتقا نامی تحقیقی مقالہ تصنیف کیا تھا، جسے حوالے کی کتاب سمجھا جاتا ہے، لیکن اس کے بعد وہ کوئی خاص کام نہ کر سکیں۔ وہ خاطر تواضع کرنے اور تعلقات بڑھانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ ان کے پاس توصیفی کلمات کہنے کا جمع خرچ بھی بہت زیادہ تھا۔ نوجوان اساتذہ میں سب سے اچھی صلاحیت کی مالک ڈاکٹر سیدہ جعفر تھیں۔ وہ بھی سروری صاحب کی عزیز شاگرد تھیں لیکن شاید آخری زمانے میں استاد اور شاگرد کے ویسے تعلقات نہیں رہے تھے اس لیے کہ ایک بار باتوں کی رَو میں سروری صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ "یہ جتنی زمین کے اوپر ہیں اتنی ہی اندر ہیں"۔ بہر حال مجھے اُن سے اِس قِسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا، اور ان کا قد زمین کے اوپر بڑھتا ہی گیا۔ میں نے انھیں ریڈر بنانے میں پوری مدد کی۔ اب دکنیات کی ماہر کی حیثیت سے ان کا علمی حلقوں میں احترام سے نام لیا جاتا ہے۔

شعبے کے پہلے سال کی تقسیم کار کے وقت میں نے تاریخ زبان کے پرچے کے علاوہ دکنی نثر کے شہ پارے، وجہی کے 'سب رس'، کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی لی۔ مجھے یاد ہے کہ میرے اس انتخاب کے وقت اساتذہ اور طلبہ دونوں میں چہ میگوئیاں تھیں۔ یعنی ایک 'غیر ملکی' دکنی کے شاہکار کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب میں نے 'سب رس'، کے متن کو اردو زبان کے ارتقا کے ساتھ مربوط کر کے درس دینا شروع کیا تو ذہین طلبہ نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ 'ملکی' ہوتے ہوئے بھی دکنی

ہو۔ ترکہ آپ 'زبان'، جانتے بھی ہیں۔ دکن کی تمام تر خصوصیات جو اسے جدید اردو سے ممیز کرتی
ہیں وہ اس کے پراکرت نژاد الفاظ ہیں جو فتوحاتِ علائی و تغلق کے ساتھ گجرات اور دکن
پہنچے تھے اور جن کا منبع و سرچشمہ نواحِ دہلی کی بولیاں تھیں۔ وہ نہ تلگو سے مستعار لئے گئے ہیں اور
نہ کنڑ سے۔ مراٹھی کے بعض الفاظ سے اشتراک اس وجہ سے پایا جاتا ہے کہ ہند آریائی خاندان کے رشتے
سے مراٹھی، ایک متجانس زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ دکن کے اساتذہ اور محققین دونوں کی یہ
محرومی رہی ہے کہ وہ نواحِ دہلی کی بولیوں سے ناواقفِ محض رہے ہیں۔ چاہے وہ ڈاکٹر محی الدین
قادری زور ہوں یا پروفیسر عبدالقادر سروری۔ سروری صاحب کسی قدر ہندی سے واقفیت
رکھتے تھے۔ زور صاحب کو پنڈت ونشی دھر النکار سے مدد لینی پڑتی تھی۔ اس لحاظ سے دکنی
اردو کے سب سے اچھے اسکالر ڈاکٹر شری رام شرما گزرے ہیں، جنھوں نے ہندی میں اپنی
معرکتہ الآرا کتاب 'دکھنی ہندی کا اُدبھو اور وکاس' ۱۹۶۴ء میں تصنیف کی اور نام کمایا۔
ان کی بھی دقتیں دو تھیں، ایک تو انھیں دکنی اردو کو 'دکھنی ہندی' ثابت کرنا تھا اور دوسرے وہ
دکنی کے مخطوطات سے، اردو کم جاننے کی وجہ سے، خاطر خواہ استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے
بعض اوقات زبردست غچا کھا جاتے تھے۔ بہر حال اُن کا بڑا احترام کرتا تھا اور مجھے سخت افسوس
تھا کہ ایسے اہلِ علم کو شعبۂ ہندی کے اربابِ حل و عقد نے عرصہ تک لکچرار کی اسامی پر ڈالے رکھا۔ افسوس
اس بات کا ہے کہ جب حق بہ حقدار رسید، تو وہ ایک حادثے میں جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

دکنی اردو کے سائنسی مطالعہ کے ساتھ میں نے اردو زبان کی ابتدا اور ارتقا سے
متعلق (جو میری تحقیقات کا خاص موضوع رہا ہے) علمی نقطۂ نظر کی ترویج کرتے ہوئے اپنی
تحریروں میں 'دکنی' کے مقامی نام پر شمس اللہ قادری اور عبدالحق کے پسندیدہ نام 'قدیم اردو'
کو ترجیح دی۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ اردو کا 'دکنی' نام سولھویں صدی سے پہلے نہیں ملتا۔ وجہی
تک نے 'سب رس' میں اسے 'زبانِ ہندوستان' کہا ہے۔ اس سے پہلے اس کا عام
نام ہندی اور ہندوی رہا ہے۔ قدیم اردو (یا اردوئے قدیم) کے نام پر دکن کے بہت سے
اہلِ علم نے ناک بھوؤں چڑھائی لیکن میرا اندیشہ دوراز صحیح ثابت ہوا۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ
[illegible] نے اسے صاف صاف 'دکھنی ہندی' بنا دیا۔ امرت رائے کا تو

خیال ہے کہ اردو کی بدعت وَلی اور اس کے بعد سے شروع ہوئی ورنہ اس سے قبل کی دکنی تمام تر ہندی یا ہندوی ہے جس کا ادب ہندی تاریخ ادب کا اسی طرح جزو بنایا جاسکتا ہے جس طرح برج بھاشا یا اودھی کا ادب۔ لیکن یہ ان کی بدنیتی یا خود فریبی ہے۔ وجہی کی 'سب رس' یا نصرتی کے قصائد قدیم اردو کے نقوش ہیں نہ کہ قدیم ہندی کے' اسلوب اور فرہنگ دونوں اعتبار سے۔ اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ یہ غالب و اقبال تا نظیر اکبرآبادی اور پریم چند سب کا احاطہ کرتی ہے لیکن اپنی 'کھڑی بولی' اساس سے یک لحظ غافل نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ برج بھاشا اور اودھی کے ادب پاروں کو اپنانے سے انکار کرتی ہے۔

علمی اعتبار سے عثمانیہ یونیورسٹی میں میرا چھ سالہ قیام (۱۹۶۲ تا ۱۹۶۸ء) خود میرے لیے بارآور رہا۔ اسی دوران میں نے 'قدیم اردو' کے نام سے اردو کے قدیم متون کو، سائنسی انداز میں مرتب کرکے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا، جن میں پرت نامہ، بکٹ کہانی' اور ابراہیم نامہ کے متون میرے مرتب کردہ ہیں۔ ابراہیم نامہ کا متن نہایت ادق زبان میں لکھا ہوا تھا اور اس کا صرف ایک ہی خطّی نسخہ دستیاب تھا، اس لیے باوجود کوشش کے ڈاکٹر زور بھی اس کی تدوین کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ میں نے یہ ہفت خواں دو سال کی محنت شاقہ کے بعد طے کیا۔ اسی زمانے میں میں نے اپنے علمی و لسانیاتی مضامین کا انتخاب 'شعر و زبان' کے نام سے ۱۹۶۶ء میں شائع کیا۔ اس میں تخلیق شعر، مطالعۂ شعر (صوتیاتی نقطۂ نظر سے)، 'سماج اور شعر'، 'ہندوستان میں اردو کا عروج و زوال'، 'دکنی یا اردوئے قدیم'، علی گڑھ تحریک، مسلم یونیورسٹی اور اردو زبان اور 'اردو صوتیات کا خاکہ' جیسے اہم مضامین شامل ہیں۔ ایک اور اہم کتاب جو میں نے اس زمانے میں ترتیب دی 'عیسوی خاں کا قصّہ مہرافروز و دلبر' ہے، جس کا واحد نسخہ آغا حیدر حسن کے کتب خانے کی زینت تھا اور جو انھوں نے نہایت فیاضی سے مجھے مرتب کرنے کے لیے دیا۔ یہ شمالی ہند کی سلیس زبان میں لکھی ہوئی ایک قدیم داستان ہے۔ اس داستان کو یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ہندی والوں کے لیے بھی قدیم ہندی کی نثر کے اوّلین نمونے کے طور پر اہمیت رکھے گی بڑی محنت سے ہندی رسم خط میں مع حواشی کے شائع کیا لیکن جو لوگ وجہی کی 'سب رس' کے دعویدار ہیں انھوں نے بھی اس سے اغماز کیا۔ صرف ہندی کے نقاد رام ولاس شرما نے اپنی معرکۃ الآراء

تصنیف "بھارت کے پراچین بھاشا پریوار اور ہندی" میں ہندی کے ارتقا سے بحث کرتے ہوئے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ آندھرا پردیش ساہتیہ اکاڈمی نے میرا "دکنی اردو کی لغت" کا پراجکٹ منظور کیا اور مجھے ایک تنخواہ دار اسسٹنٹ بدیع حسینی صاحب کو اس کام کے لیے فراہم کیا۔ میں نے اس میں از خود ڈاکٹر غلام عمر خاں کو شریک کیا۔ بعد کو مجھے اس سلسلے میں تلخ تجربہ ہوا۔ جب یہ کام اپنے آخری مراحل میں تھا اور میں حیدرآباد سے پرواز کرنے کے لیے پر تول رہا تھا تو انھوں نے شرپسند کالکرنی کے ساتھ یہ مشہور کیا کہ یہ سارا کام تو ان دونوں کا ہے جو مسعود حسین خاں نے ہڑپ کر لیا ہے۔ حالاں کہ عمر خاں میں اس کام کو تنہا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی اس لیے کہ وہ ہندی یا شمالی ہند کی بولیوں کے کینڈے سے قطعاً ناواقف تھے۔ میں تو ریکارڈ کی خاطر یہ تک کہنے کو تیار ہوں کہ اس لغت کی تدوین میں مجھے اپنے شاگرد اور اسسٹنٹ بدیع حسینی سے کہیں زیادہ مدد ملی ہے، جن کی نظر دکنی کے محاورے پر بہت اچھی تھی۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے لغت کا معاوضہ بھی مجھ ہی کو دیا ہے۔

اسی قسم کے علمی اشتراک کا دوسرا تجربہ مجھے پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی جانب سے ہوا جنھوں نے بکٹ کہانی کے تیسرے ایڈیشن میں میرا لکھا ہوا پہلے ایڈیشن کا دیباچہ حذف کر کے اپنا کام بنا لیا ہے۔ حالاں کہ بکٹ کہانی کا قدیم ترین نسخہ (نمبر۹) جو ادارۂ ادبیات (حیدرآباد) کا مخزونہ ہے اور جس پر اس متن کی اساس ہے سرتاسر میرا مرتب کردہ ہے اسی طرح بکٹ کہانی کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کا ایک ایک لفظ میرا لکھا ہوا ہے۔ ترتیب و تہذیب کے اس کام میں شریک غالب ہونے کے باوجود میں نے فراخ دلی سے سرورق پر اس کے مرتبین میں پہلی جگہ ان کے نام کو دی تھی۔

کئی لحاظ سے حیدرآباد کا چھ سالہ قیام میری علمی زندگی کا ایک یادگار زمانہ رہا ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کا مجھے مکمل اعتماد حاصل رہا۔ اس میں وائس چانسلر ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ ریڈی، پرنسپل اور ڈین پروفیسر عبدالقادر اور ان کے بعد سنسکرت کے پروفیسر آر۔ نیدر۔ سشرما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ رفقائے شعبہ نے مجھ سے مکمل تعاون کیا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کا نام لوں گا جو اردو

کی پروفیسر شپ کے دعویدار رہے تھے۔ مجھ پر غیر ملکی ہونے کا لیبل بھی چسپاں نہ ہو سکا اس لیے کہ میرے دادا فدا حسین خاں پچھلی صدی کے اختتام پر حیدرآباد جا کر بس گئے تھے اور وہاں بیگم بازار میں اپنی رہائش کے لیے دو منزلہ بھی تعمیر کرالیا تھا۔ والد نے بھی اپنی ملازمت کا آغاز وہیں سے کیا لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔ میرے چچا ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور بڑے بھائی امتیاز حسین خاں نے بھی نیک نامی کے ساتھ اپنی ساری زندگی عثمانیہ یونیورسٹی کی نذر کی۔ اور بڑے بھائی تو بالآخر حیدرآباد ہی کی خاک کا پیوند ہو گئے۔ حیدرآباد پہنچنے کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے دادا کی طرح مجھے بھی شاہ نصیر کی اِس جنّت میں رہ پڑنا چاہیئے۔ چنانچہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کے شوہر محمود صاحب کے مشورے سے ہم دونوں نے میر عالم تالاب کے کنارے نہایت پُر فضا مقام پر دو پلاٹ خرید لیئے اور پروگرام بنا لیا کہ علی گڑھ کا مکان بیچ کر یہاں تعمیر کی جائے۔ لیکن ۱۹۶۸ء میں میری مراجعت علی گڑھ کے بعد یہ پروگرام منسوخ کرنا پڑا اور اس قطعہ کو فروخت کر دیا۔

نہ صرف اپنا تحقیقی کام کرنے کے مواقع مجھے عثمانیہ میں ملتے رہے، بعض طلبہ نے میری نگرانی میں نہایت اعلیٰ تحقیقی مقالے بھی لکھے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان میں ڈاکٹر مغنی تبسم کا مقالہ "فانی: حیات اور شاعری" اور ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا "رشید احمد صدیقی: حیات اور شاعری"، تحقیقی ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ مغنی تبسم صاحب نے اردو میں پہلی بار فانی کے آہنگ کا تجزیہ صوتیات کے اُصولوں کی روشنی میں کیا، جس میدان میں میں اپنی امریکہ کی واپسی کے بعد سے کام کر رہا تھا۔ سلیمان اطہر جاوید صاحب کی بڑی سفارشوں اور مشکل کے بعد رشید صاحب کے حضور تک رسائی ہوئی اور احسان رشید صاحب کی مدد سے ان کی حیات کے بارے میں نایاب مواد حاصل کیا۔ مجھے اس بات کی تھوڑی سی خلش رہی جو کام علی گڑھ میں ہونا چاہیئے تھا وہ عثمانیہ میں ہوا۔

وجہیؔ نے قطب مشتری میں سچ ہی کہا ہے کہ دکھن ملک بھوت خاصا اہے۔ یہ خاصہ کئی لحاظ سے ہے۔ اس کا سب سے دلچسپ پہلو یہاں 'ملکی' اور 'غیر ملکی' کا مسئلہ ہے۔ یوں تو مقامیت، کا شکار کسی حد تک ہر خطہ ہوتا ہے لیکن یہ جذبہ حیدرآباد میں کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ سقوطِ حیدرآباد سے پہلے تو یہ ایک متعدّی مرض کی طرح پھیلا ہوا تھا جس کا شکار شمالی

ئے ہوئے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور شعراء تک ہو جاتے تھے، لیکن ۱۹۶۲ء میں جب میں حیدرآباد
چاہوں اس وقت تک یہ صرف اندازِ فکر کے طور پر باقی تھا۔ مجھے اس سے بھی بوجوہ سابقہ نہیں پڑا۔
س وقت تک اس کے سیاسی اسباب ختم ہو چکے تھے۔ جامعہ عثمانیہ، عثمانیہ یونیورسٹی بن چکی تھی۔
مال سے لوگوں کی آمد بھی ختم ہو گئی تھی۔ اب منفی جذبے کی جگہ دکن اور دکنی کے ایک مثبت تفاخر
نے لی تھی۔ مثلاً 'دکنی زبان' اور 'دکنی ادب' کی اصطلاحوں پر اصرار تھا۔ یعنی 'دکھنی ہندی' کے
اندیشہ ہائے دراز کے پیشِ نظر 'دکنی اردو' کی اصطلاح متروک کرنی چاہی تو اس کو بھی تائید
نہیں ملی۔ 'قدیم اردو' (عبدالحق) یا 'اردوئے قدیم' (شمس اللہ قادری) کی تراکیب تو قطعاً قابلِ قبول
نہیں تھیں۔ بالآخر وہی ہوا کہ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ، شری راہل سنکرتاین اور ڈاکٹر شری رام
شرما جیسے محققین نے اسے 'دکھنی ہندی' میں تبدیل کر دیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو آصفی دور میں ملکی کی تحریک چلانے والے بیشتر خاندان
شمال سے آئے ہوئے تھے کسی نے دکن کی تعریف کرتے ہوئے اسے ریل کے تیسرے ڈبے سے تشبیہ
دی ہے جس میں ایک بار داخل ہو جانے کے بعد آپ 'اہلِ خانہ' ہو جاتے ہیں اور بعد کو آنے والوں کو
آپ 'بیرونِ خانہ' کہہ کر ان پر دروازہ بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود خاندانِ آصفیہ غیر ملکی تھا۔
ان کے ساتھ آئے ہوئے دیگر امراء و روساء اور عسکری غیر ملکی تھے۔ ایران و عرب سے تعلق رکھنے
والے خاندان غیر ملکی تھے۔ مخدوم محی الدین اور سلیمان اریب جیسے ادیبوں کے بھی آباء و اجداد غیر
ملکی تھے۔ فرق صرف تفاوتِ زمانی کا تھا۔ کوئی دو سو برس پہلے آیا تھا تو کوئی سو برس پہلے۔ فانی
نے جو دکن ہی کے پیوندِ زمین ہوئے غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا۔ اپنے
اس احساس کو زبانِ غزل میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ۱۹۴۸ء میں رسّی تو جل چکی تھی مگر 'دکنیت' کے تفاخر کی شکل
میں بل باقی تھا۔ ان حالات میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے 'آصف جاہ اوّل' تصنیف کی،
[illegible]

مرتب کی اور بانیٔ حیدر آباد، محمد قلی قطب شاہ کی حیات اور کارناموں پر سب سے مستند مونوگراف لکھا۔ میرے حیدر آباد پہنچنے تک یوسف صاحب تو علی گڑھ آچکے تھے لیکن جامعہ عثمانیہ کی باقیات میں سب سے اہم شخصیت پروفیسر ہارون خاں شیروانی کی تھی جس نے میری نسبتی عزیزداری بھی تھی۔ انھیں دیکھ کر مجھے جامعہ عثمانیہ مرحوم کی عظمت و جلال کا خیال آجاتا تھا۔ سن رسیدگی کے باوجود ان کا علمی انہماک پُرانے اہلِ علم کی یاد دلاتا تھا۔ میں نے ان کی سی مرتب اور منظم علمی زندگی گزارتے ہوئے بہت کم عالموں کو دیکھا ہے جو کام ہاتھ میں لیتے اسے تکمیل تک پہنچاتے۔ میں اکثر ان کے دولت کدے پر حاضری دیتا۔ مکان کیا تھا ایک کتب خانہ تھا جس میں صبح سے شام تک پابندیٔ اوقات کے ساتھ وہ کام کرتے رہتے تھے۔ آخری زمانے میں ان کا زیادہ تر وقت تاریخِ دکن کی تالیف میں گذرتا جو وہ ڈاکٹر جوشی کے تعاون سے مرتب کر رہے تھے۔ ایک دن اچانک میرے یہاں آئے اور کہنے لگے "مسعود میاں! آپ کو میرے لیے ایک کام کرنا ہے۔ انکار نہ کیجئے گا۔" دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تاریخِ دکن کے ازمنہ وسطیٰ کی جلد کے لیے مجھ سے دکنی اردو کے ادب پر ایک باب لکھوانا چاہتے ہیں۔ مجھے اس ذمہ داری کو قبول کرنے میں کسی قدر تامل تھا، اس لیے کہ دکنی اردو کی ادبیات کے حیدر آباد میں کچھ اور ماہر اور دعویدار موجود تھے۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ جو کام میں کر سکتا ہوں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ بہر حال انھیں کی ہمت افزائی پر میں نے قلم سنبھال لیا اور اب وہ مضمون ایک ذیلی باب کی شکل میں تاریخِ دکن کی مذکورہ جلد میں شامل ہے۔

شیروانی صاحب کی علمی دلچسپیاں متنوع تھیں۔ تاریخ کے علاوہ انھیں اردو زبان اور اس کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں بے تکان لکھتے تھے۔ ساتھ ہی ان کا فارسی زبان کا علم اور فارسی مخطوطہ شناسی کا ملکہ غیر معمولی تھا۔ یہ ان کی بدقسمتی ہے کہ مورخ کی حیثیت سے مؤرخین کے ترقی پسند گروہ نے جن کا فارسی کا مبلغ علم بس یوں سا ہوتا ہے، ان کی قدر نہ کی اور "غیر ملکی" ہونے کے ناتے، دکن کی ساری عمر خدمت کرنے کے باوجود، وہ حیدر آباد میں یاد نہیں رکھے گئے۔ لیکن ازمنہ وسطیٰ کے مورخین کا وہ طبقہ جن کی اس دور کے بنیادی ماخذات تک رسائی ہے ان کی تصانیف کو آج بھی حوالے کی کتب کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تاریخ کا کوئی زاویۂ نظر، علمی کمی کا بدل نہیں بن سکتا!

حیدرآباد میں بہ ہمہ وجوہ مطمئن ہونے کے باوجود علی گڑھ کی یاد اور خلش باقی رہی۔ یہ
ح ۱۹۶۶ء میں بڑے بھائی کے اچانک انتقال کے بعد تیز تر ہوگئی۔ وہاں میرا ذاتی مکان تھا،
ہالوت قائم گنج نہایت قریب تھا۔ میرے بیشتر عزیز و اقارب یو۔پی۔ اور دہلی میں بسے ہوئے
دکن کی کشش بھائی صاحب کی طرح شاید مجھے زمیں کا پیوندِ زمین بنادیتی اگر خاتونِ خانہ یعنی میری
ی کی علالت بیچ میں آڑے نہ آجاتی۔ میرے ایک لڑکا اور چار لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں پریم چند کی زبان
گنگا جمنا کی طرح بڑھتی آرہی تھیں" عمر بھر جو کمایا تھا وہ کھایا۔ ان لڑکیوں کا کیا ہوگا؟ یہ سوال مجھ
پہلے اُن کے ذہن میں پیدا ہونے لگا۔ حیدرآباد کے معیار کا گھوڑ جوڑا کہاں سے آئے گا، جہاں لڑکیاں
دی ہاٹ میں بکتی ہوں وہاں ہم اپنے محدود وسائل اور اجلے خرچ کے پیشِ نظر قیمت کہاں سے
سکیں گے۔ ہماری فیملی پلاننگ بھی تاخیر کی شادی کی وجہ سے ابھی نہیں ہوئی تھی۔ یعنی ریٹائرڈ ہونے تک
زیادہ سے زیادہ دو بچوں کو لگا سکتے تھے۔ باقی تین بچیوں کا کیا ہوگا؟ ملازمت میں میری اچھل کود
پنشن کا حق بھی سوخت کر دیا تھا اور جو کچھ پراویڈنٹ فنڈ ملتا رہا وہ اکھاڑ پچھاڑ کی نذر ہوتا رہا۔ بچہ
تفکرات سے مجھے دوچار کرتی رہتی۔ پہلے تو میں حسب معمول سُنی اَن سُنی کرتا رہا، لیکن تکرار میں اثر
ہے، بالآخر اس کا شکار ہوگیا۔ اِدھر علی گڑھ سے خبریں آنا شروع ہوئیں کہ وہاں لسانیات
پروفیسری آنے والی ہے۔ لسانیات کا شعبہ نواب علی یاور جنگ کے ذہن میں بھی تھا اور
باکہ مجھے بعد کو ڈاکٹر ریڈی نے بتایا کہ انھوں نے مجھے واپس لے جانے کی فرمائش بھی کی تھی،
لیکن ڈاکٹر ریڈی اس بات پر آمادہ نہیں ہوئے اور اُن سے کہا "نواب صاحب ا
پ بھی عثمانیہ کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں۔ یہاں کے شعبۂ اردو کی تاریخ بھی آپ
نظر میں ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ مسعود حسین کو لے جاکر اس شعبے کا حشر پہلا جیسا
دیں۔ انھوں نے آکر اسے سنبھال لیا ہے اور میں ان کے کام سے بہت مطمئن ہوں"۔
اس کے بعد نواب صاحب نے مجھے واپس بلانے کا خیال چھوڑ دیا۔

لیکن ۱۹۶۵ء میں جب ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے
یوں کہ وہ سیاسی خیالات کے اختلافات کے باوجود میرے قدر دانوں میں تھے، انھیں
گڑھ سے میری ہجرت کے اسباب کا بھی علم تھا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا یہ تھا کہ

پرو وائس چانسلر فضل الرحمن صاحب سے کہا کہ مجھے خط لکھ کر دریافت کیا جائے کہ وہ علی گڑھ لسانیات کی پروفیسری پر آنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ فضل الرحمن صاحب کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے اس مضمون کا خط لکھا تھا، لیکن وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ چنانچہ علیم صاحب کی تحریک سے کافی عرصہ تک میں غافل رہا۔ جب کچھ دنوں کے بعد علی گڑھ ایک امتحان کے سلسلے میں آنا ہوا اور علیم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے شکایت کی کہ حضرت! اب تو آپ خط کا جواب تک نہیں دیتے۔ میں نے کہا کیسا خط؟ اس وقت انھوں نے تفصیل بتائی اور میرے یہ بتلانے پر کہ اس قسم کا کوئی خط مجھے تا حال نہیں ملا ہے، اپنی پیش کش کو دہرایا۔ میں نے فوراً قبول کر لی، ان شرائط کے ساتھ کہ میں انٹرویو میں حاضر نہیں ہونگا اور دوسرے یہ کہ میرا تقرر چند اضافوں کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انتخابی کمیٹی کا ہونا ضروری تھا، وہ ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی بھی تھے۔ انھوں نے فوراً میرا نام تجویز کرتے ہوئے کہا "وہ آپ ہی کے آدمی ہیں انھیں بلا لیجئے۔"

بہت جلد مجھے تقرر کا پروانہ مل گیا۔ اس کو لے کر میں ڈاکٹر ریڈی سے ان کی کوٹھی پر ملا اور کہا کہ مجھے ان کی سرپرستی میں یہاں ہر قسم کی آسائش اور عزت حاصل ہے لیکن میری ذاتی مجبوریاں ہیں جن کے تحت مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ بادلِ ناخواستہ انھوں نے مجھے اس کی اجازت دی اور پھر وہ گفتگو سنائی جو ان کے اور علی یاور جنگ کے درمیان میرے بارے میں ہوئی تھی، جس کا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔

میرے تقرر کی خبر علی گڑھ میں پھیلی تو بہی خواہوں اور دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رشید صاحب نے ۱۲ جولائی ۱۹۶۸ء کے خط میں لکھا:

"۱۰ جولائی کا نوازش نامہ ملا۔ القصہ شیراز بہت پہلے سے "یوسفِ گم گشتہ" کے کنعان واپس آنے کی بشارت دے رہے تھے۔ لیکن کیا کیجئے اس 'قمر در عقرب' یا اشٹ گرہ، کو (معلوم نہیں سنسکرت کا صحیح مترادف استعمال کر رہا ہوں یا نہیں بہت دن ہوئے یہ لفظ سننے میں آیا تھا)

جس کی نحوست و نجاست یونیورسٹی پر مسلط ہے۔ پرو وائس چانسلر صاحب سے درخواست کی ہے کہ آپ کی خدمت میں تقرر کا اطلاع نامہ (باضابطہ) جلد سے جلد بھجوا دیں تاکہ آپ یہاں پہنچنے کا انصرام بروقت اور آسانی سے کر سکیں۔ ابر و باد و باراں کی بے دریغ بخشی سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کے خیر مقدم کے لیے میگھ دوت نے حیدر آباد کے موسم کو علی گڑھ منتقل کر دیا ہو۔"

خلیق احمد نظامی صاحب نے مختصراً لکھا "حق بہ حقدار رسید۔"

بارھواں باب

علی گڑھ (۴)

(۶۸ تا ۷۳ء)

اگست ۶۸ء میں حیدرآباد کو خیرباد کہہ کر میں پھر علی گڑھ آن دھمکا۔ اس سے قبل میں اپنا مکان 'جاوید منزل' جو یونیورسٹی کے پاس کرائے پر تھا، واگذاشت کرا چکا تھا۔ حیدرآباد میں کچھ سامان اونے پونے بیچا اور باقی ایک ٹرک پر لدوا کر علی گڑھ کے لیے روانہ کر دیا۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں ایک بار پھر میرا کافی نقصان ہوا۔ لیکن علی گڑھ واپس آنے کی اس قدر خوشی تھی کہ اس کی پروا نہ کی۔ میرے مزاج میں ہے کہ جب کسی کام کو پورا کرنے کی دھن سما جاتی ہے تو پھر اس میں اخراجات کی مطلق پروا نہیں کرتا۔

علی گڑھ پہنچ کر معلوم ہوا کہ لسانیات کا شعبہ صرف کاغذ پر قائم ہوا تھا۔ میرا اس کی پروفیسری پر تقرر ضرور ہو گیا تھا لیکن نہ تو طلبہ تھے نہ اسٹاف اور نہ کمرے۔ وقتی طور پر آل احمد سرور صاحب، صدر شعبۂ اردو کی عنایت سے ان کے شعبے میں مجھے ایک کمرہ مل گیا اور پڑھانے کے لیے تاریخ زبانِ اردو کے چند گھنٹے۔ یہاں بیکار بیٹھ کر میں اکثر سوچتا کہ اگر یہ صورت چھ سال قبل نکل آتی تو میرا حشر اس کہاوت کے مطابق کہ "جاؤ پوت دکھن، یہ ہیں کرم کے لچھن"، کیوں ہوتا۔ گھر سے بے گھر ہونے کی نوبت کیوں آتی' اپنی ملازمت کی پنشن سے کیوں محروم ہوتا۔ میں ایسے کاموں میں تقدیر پر زیادہ بھروسا

نہیں کرتا۔ البتہ انسان کی تدبیر پر یقین رکھتا ہوں۔ چنانچہ ایک شخص کی 'ترکیب' سے میں دکھن اور دوسرے شخص کی 'تدبیر' کے ذریعے پھر واپس علی گڑھ آیا!

اگلے سیشن یعنی ۱۹۶۹ء میں شعبۂ لسانیات کے لیے تین کمرے جنرل ایجوکیشن سینٹر میں مل گئے اور چار طالب علموں پر مشتمل ایم۔اے کی پہلی کلاس اسی سال کھل گئی۔ شعبۂ اردو سے میرے پرانے طالب علم ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی خدمات لسانیات کے شعبے میں منتقل کر دی گئیں۔ اگلے سال ۱۹۷۰ء میں چار نئے طالب علموں نے داخلہ لیا۔ ایک اور استاد اقتدار حسین خاں کا بحیثیت لیکچرر اضافہ ہوا۔ نئے شعبہ کی درسیات کا تمام تر رُخ ہم نے اردو زبان کی جانب رکھا کہ یہی اس کے قیام کی وجہ جواز تھی۔ جب پی ایچ ڈی میں داخلے کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسے موضوعات کا انتخاب کیا گیا جن کا براہ راست تعلق اُردو زبان سے تھا مثلاً "سولھویں تا اٹھارہویں صدی کی شمالی ہند کی اردو کا لسانی تجزیہ"، "اردو ہندی کا تقابلی مطالعہ"، "دہلی کی کرخنداری اردو کا تجزیہ"، "دکنی اردو کا تجزیہ" وغیرہ وغیرہ میرے پرانے ساتھی ڈاکٹر انور انصاری، جو اب شعبۂ نفسیات کے صدر تھے، جنرل ایجوکیشن سنٹر کے ڈائریکٹر بھی تھے۔ جگہ کی سخت قلت کی وجہ سے ان سے شعبے سے ملحق ایک کمرے کا تقاضا کیا۔ اس میں جنرل ایجوکیشن کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ پہلی گفتگو میں انھوں نے اس پر ہمدردانہ غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن اس کے بعد 'بہانۂ بسیار' کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں بھی اہلِ غرض بن کر پیچھا کرتا رہا۔ اب ان سے شرفِ ملاقات تک حاصل نہیں ہوتا تھا۔ لکھنوی تکلف کے انداز میں کہلا بھیجتے، "مسعود صاحب تکلیف نہ کریں، میں خود حاضر ہوں گا۔" اس تکلف اور تکلیف دونوں سے تنگ آکر میں نے وائس چانسلر ڈاکٹر عبدالعلیم کا رُخ کیا۔ انھوں نے طعنہ دیا کہ "وہ تو آپ کے پرانے یار ہیں" میں نے کہا "جی ہاں! یہی تو بدنصیبی ہے، دوستی کا حجابِ اکبر درمیان ہے"۔ کہنے لگے "یہاں تو ہر شخص اپنی ریاست بنائے بیٹھا ہے"۔ میں نے کہا "وائس چانسلر کا ریاست شکن' ہونا ضروری ہے"۔ میری یہ بات ان کی معمول کی گہری خاموشی میں ڈوب گئی اور میں پھر کنارہ پر رہ گیا!

خدا خدا کر کے شعبے کی قسمت جون ۷۲ء میں پلٹی جب آرٹس فیکلٹی کی نئی عمارت

میں اس کو تیسری منزل پر چند کمرے مل گئے اور شعبہ جنرل ایجوکیشن سینٹر سے وہاں منتقل ہو گیا۔ وہاں دو بڑے کمرے تھے۔ ایک میں سمینار لائبریری اور دوسرے میں صوتیات کی لیبارٹری قائم کی۔ سمینار کے لیے میں خود دہلی جا کر منشی رام منوہر لال کی دکان پر گھنٹوں صرف کرتا اور کتابیں منتخب کرتا۔ صوتیات کی تجربہ گاہ کے لیے ایک سینئر ٹیکنیشین مبین احمد خاں صاحب کا تقرر کرایا اور ٹیپ ریکارڈر اور ٹیپ خریدے۔

اسی زمانے میں مادر علمی شعبہ بھی میری سرگرمیاں بڑھیں۔ ۱۹۶۹ء میں سرور صاحب چھ ماہ کے لیے امریکہ گئے تو مجھے انجمن ترقی اردو کا قائم مقام سکریٹری نامزد کیا گیا۔ میں نے دفتری کام کے علاوہ اس کے دو رسالے سہ ماہی 'اردو ادب' اور ہفتہ وار 'ہماری زبان' کی ادارت کا کام بھی سنبھال لیا۔ 'ہماری زبان' کے اداریوں نے مجھے اردو داں طبقے سے بحیثیت صحافی متعارف کیا۔ میرے بیشتر اداریے اردو زبان سے متعلق ہوتے جن پر مجھے مسلسل داد رشید صاحب سے ملتی۔ وہ ہر اداریے پر رقعہ کی شکل میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتے۔ میں ان کی اس حوصلہ افزائی کو اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتا اور میرے قلم کو مہمیز ملتی۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(۱) 'سنسکرت، اصطلاحاتِ علمیہ اور اردو زبان' (۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء)

"ہماری زبان' کا پچھلے ہفتے کا اداریہ خوب تھا، ترتیب، مقدمات، عبارت اور لب و لہجہ ہر اعتبار سے' مبارک باد دیتا ہوں۔ خیال تھا کہ ملاقات ہو جائے گی تو زبانی تہنیت پیش کروں گا۔"

(۲) 'اردو ایک تہذیبی قدر اور ضرورت' (۱۲ر نومبر ۱۹۶۹ء)

" 'ہماری زبان' میں آپ کا تازہ ترین اداریہ خوب ہے عبارت کیا، اشارت کیا ادا کیا! اور یہ سب لنگوئسٹک ہونے کے باوجود! ..... اس سے قبل جتنے مضامین تھے وہ مبنی بر حقائق تھے۔ یہ ہمارے تہذیبی تقاضوں (غیرت اور حمیت) کا اقرار اور اعلان ہے۔ خدا آپکو خوش رکھے۔ کارے کردی!"

(۳) 'اردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم' (۱۸ر نومبر ۱۹۶۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا اداریہ (اردو ذریعۂ تعلیم) دیکھا۔ میں سمجھتا ہوں ایسے مدلل و مسلسل مضامین، سب و شتم اور جزع و فزع سے پاک اردو کی حمایت میں کہیں اور شائع نہیں ہوئے۔"

(۴) 'اردو رسم خط' (۴ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"آج ہماری زبان کا یکم دسمبر کا شمارہ ڈاک سے موصول ہوا۔ اردو رسم خط کے عنوان سے آپ کا اداریہ بے نظیر ہے۔ ایسے اہم اور متنازعہ فیہ مسئلے پر اس جامعیت اور قابلیت سے اتنا مختصر مضمون میری نظر سے نہیں گزرا۔ پھر اس کا سنجیدہ، شریفانہ اور علمی لب و لہجہ۔ میرے نزدیک یہ مضمون اِس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔"

(۵) 'اردو ہے جس کا نام.....' (۱۱ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"پرسوں ہماری زبان میں آپ کا مضمون اردو کی مرکزیت اور لامرکزیت سے متعلق پڑھا۔ جب سے آپ نے یہ اداریے لکھنے شروع کئے ہیں اردو کے معرکہ آرا و مسائل پر اس اختصار و جامعیت کے ساتھ، ایسے خوبصورت اسلوب اور شگفتہ عالمانہ انداز میں کسی اور کا کوئی مضمون کم سے کم میری نظر سے نہیں گزرا۔ مدتوں پہلے سے بھی۔

بار بار اِس قسم کے توصیفی کلمات، وہ بھی آپ کو لکھنا، کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کا جو حق ہے وہ ہر حال میں اور ہر وسوسے و خطرے کو نظر انداز کر کے آپ کو پہنچا دینا، بہر حال اولیٰ ہے۔"

(۶) 'گروگرنتھ صاحب اور اردو' (۱۸ دسمبر ۱۹۶۹ء)

"جب سے انجمن کا کام آپ کے سپرد ہوا ہے، ہماری زبان کے اداریے ہر اعتبار سے بڑے وقیع ہونے لگے ہیں.... ان مضامین کا مجموعہ ضرور شائع ہونا چاہیئے۔" (۱)

(۷) 'اردو بہ نام ہندی' (۵ جنوری ۱۹۷۰ء)

"ہماری زبان کے سالِ نو کا آپ کا پہلا اداریہ پیشِ نظر ہے۔ جس جامعیت کے ساتھ زبان کے کتنے تاریخی لسانی اور نزاعی مسائل کو آپ نے عالمانہ حقیقت پسندانہ اور دلنشیں انداز

میں قلم برداشتہ قلم بند کیا ہے اُسے میں اظہار و ابلاغ کا بہترین نمونہ سمجھتا ہوں.... میرا مستقل خیال ہے کہ آپ کے اداریوں کا "آخر میں" انجمن کی طرف سے ایک مجموعہ شائع کیا جائے" (۲)

(۸) ۱۹۷۱ کی مردم شماری اور اردو ' (۲۳ فروری ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان (یکم فروری کا) کل ملا۔ شمار و اعداد کے فن یا فنوں کو آپ نے ادب کا درجہ دے دیا ہے "

(۹) ' دل اور دے ان کو.....' (۱۱ فروری ۱۹۷۰ء)

"اس ذہانت اور خوش مذاقی سے، جس کا اظہار عنوان کے انتخاب اور اس طرح کی دوسری باتوں سے ہوتا ہے، میں اس کا اندازہ کر لیتا ہوں کہ لکھنے والا کس مرتبے اور معیار کا ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ انجمن اور ہماری زبان کا جو چارج آپ کو ملا ہے، اس میں اللہ کی کوئی مبارک مصلحت پوشیدہ ہے"

(۱۰) اردو : علاقائی یا دوسری سرکاری زبان ' (۱۳ مارچ ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان ، ۸ مارچ کا اداریہ اسی اعلیٰ پایہ کا ہے جیسے آپ کے اداریے ہوا کرتے ہیں، تنقیح، توضیح، زبان اور زور، ہر اعتبار سے..... آپ کا شمار میں اُن چند (چند سے بھی کم) لوگوں میں کرتا ہوں، جو ہندوستان میں اِن دنوں اردو کے بہترین وکیل اور سفیر کہے جا سکتے ہیں"

(۱۱) ' اردو کا محضر نامہ ' (۲۵ اپریل ۱۹۷۰ء)

" ہماری زبان کا اسپیشل نمبر تھوڑی دیر ہوئی ملا.... آزادی کے بعد اردو کا یہ کاغذی پیرہن یادگار رہے گا۔ عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا "

---

(۱) و (۲) رشید صاحب کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے میرے ایک عزیز شاگرد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے ۱۹۷۳ء میں ان اداریوں کا مجموعہ " اردو کا المیہ " کے نام سے مرتب کر کے شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کرایا۔

اِن اداریوں کے لیے تحسینی کلمات صرف رشید صاحب تک محدود نہیں تھے۔
مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم نے انجمن ترقی اردو کے جلسے میں کہا کہ ان سے اردو کی تحریک چل پڑی ہے۔ ایک ملاقات میں سکندر علی وجد صاحب نے، جو اس وقت ایم.پی تھے مجھ سے کہا "مسعود صاحب! آپ کی گراں قدر تصنیف 'اردو کا المیہ' گھر اور لوک سبھا دونوں جگہ میرے پاس رہتی ہے۔ اسی سے میں اردو کے اعداد و شمار لیتا ہوں اور اسی سے اردو کی حمایت کے لیے دلائل۔"

۱۹۷۰، ۱۹۷۱ اور ۱۹۷۲ء کے تین سال میرے لیے بڑی گہما گہمی کے تھے۔ ایک نئے شعبے کی تشکیل و تدریس کی ذمہ داریاں، انجمن ترقی اردو سے انتظامی وابستگی۔ قدیم متون کی ترتیب کا تسلسل، غرض کہ نہ اپنی صبح تھی اور نہ ہی شام۔ اسی زمانے میں میں نے شمالی ہند کے ایک قدیم متن روشن علی سہارنپوری کے عاشور نامہ کو مرتب کیا جو ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے اور جس کا واحد نسخہ رضا لائبریری، رام پور کا مخزونہ ہے۔ اس کا فوٹو عکس مجھے سید سفارش حسین صاحب نے لا کر دیا تھا اور جب وہ خود اس سے عہدہ برآ نہ ہو سکے تو مجھے اس کی جانب مائل کیا۔ میں نے سال بھر کی محنت کے بعد اس کی ترتیب و تدوین مکمل کرلی۔ جب میں نے خواہش ظاہر کی کہ اس کے مؤلفین میں ان کا نام بھی شامل کیا جائے تو بولے "اس میں میرا کیا ہے" ترتیب و تدوین آپ کی، پیش لفظ آپ کا۔ میں نے تو صرف خدمت کی ہے۔" کتاب شائع ہوتے وقت میں نے مولفین میں ان کا نام، ان کے یہ کہنے کے باوجود شامل کیا۔ علمی کاموں میں یہ فیاضی میرا ہمیشہ کا وطیرہ رہا ہے۔ حالاں کہ اس قسم کے اشتراک کے دو تلخ تجربے مجھے ہو چکے ہیں۔ ایک ڈاکٹر غلام عمر خاں سے، "دکنی اردو کی لغت" کے سلسلے میں، جن کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے اور دوسرا پروفیسر نورالحسن ہاشمی سے جن کے ساتھ بکٹ کہانی کی تدوین میں، میں شریکِ غالب کی حیثیت رکھتا تھا لیکن میرا حشر بقولِ غالب ع

"کہ جو شریک ہے میرا شریکِ غالب ہے" ہوا۔

میں نے شریکِ غالب ہونے کے باوجود مولفین میں ان کا نام اوّل رکھا۔ لیکن اس کا تیسرا ایڈیشن شائع کراتے وقت انھوں نے میرے مقدمہ کا بیشتر حصّہ اس سے

عارج کرکے آخر میں صرف اپنا نام رکھا!

میں اب عمر کے چوّن سال پورے کرچکا تھا۔ باوجود مرتب زندگی اور احتیاط کے بہرحال کام کی زیادتی سے اب جسم ٹوٹنے لگا تھا۔ جنوری ۳، ۱۹۷۴ء کو جب میں رات کی گاڑی سے لکھنؤ جانے کی تیاری کررہا تھا تو معلوم ہوا کہ زمین پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے، اور دل بیٹھا جارہا ہے۔ شدید کمزوری کا دورہ پڑا۔ فوراً میرے ہم زلف ڈاکٹر حسین احمد، جو بچوں کے ڈاکٹر ہیں، اس ادھیڑ عمر کے ناتواں کو دیکھنے آگئے۔ ان کے توسط سے ڈاکٹر گپتا کو جواہر لال میڈیکل کالج میں دکھایا۔ ہر قسم کے ٹیسٹ تجویز ہوئے۔ ای۔ سی۔ جی ہوا۔ بعد کو تشخیص ہوئی کہ خون میں شکر کی زیادتی اور فربہی کی وجہ سے یہ دورا پڑا تھا۔ غذائی احتیاط اور بندشیں سخت کردی گئیں۔ کچھ عرصے کے لیے لٹا دیا گیا اور حکم ملا کہ بالائی منزل کی رہائش چھوڑ کر پلنگ اور بستر نیچے لایا جائے۔ کموڈ میں کھا ج یہ ہوئی گھٹنوں میں درد رہنے لگا۔ ہڈیوں کے ڈاکٹروں، ڈاکٹر عباس اور ڈاکٹر صادق کو دکھایا۔ صادق صاحب نے کمال صفائی سے کہا "ڈاکٹر صاحب ہم لوگ آپ کا علاج کرسکتے ہیں لیکن اس مرض میں مکمل شفا ناممکن ہے"۔ میڈیکل کالج سے یہ سن کر بہت نڈھال لوٹا، اس لیے کہ میں اپنے پاؤں کو قلب سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ بہرحال اب میری دوڑ قلب اور ہڈیوں کے ماہرین کے درمیان تھی۔ ایک اعتبار سے جواہر لال میڈیکل کالج کا قیام، علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے ایک نعمت سے کم نہیں۔ میں اس نعمت سے بارہا بہرہ ور ہوا ہوں۔

میں نہایت پکّے ارادے کا انسان ہوں، بہ شرطیکہ کسی قسم کی چنوتی کا سامنا ہو۔ زندگی میں عموماً کترا جانے کا قائل ہوں لیکن جب مقابلہ آجاتا ہے تو ڈٹ کر کرتا ہوں۔ جب ہڈیوں کے ڈاکٹر صاحبان نے مایوسی کا چیلنج پیش کیا تو میں نے طے کرلیا کہ میں اس کا مقابلہ کرکے رہوں گا۔ اس کے بعد وزن کو کم کرنے کا ایک باقاعدہ پروگرام بنایا اور غذا کے سلسلے میں اس قدر احتیاط کی کہ کوئی صوفی یا سادھو بھی کیا کرے گا۔ چند مہینوں میں ۱۵ کلو وزن کم کرلیا۔ رفتہ رفتہ پابندی سے ٹہلنا اور ہلکی ورزش بھی شروع کردی۔ قبلہ قلب کی جانب سے تو مطمئن ہوچکا تھا، غذا اور ورزش کی احتیاط و پابندی نے پانوؤں

کا بھی مزاج ٹھیک کر دیا۔ وزن کم ہو جانے کی وجہ سے جوانی کے خط و خال ابھر آئے۔ طبی مشورے پر میں بالائی منزل سے نیچے آ گیا تھا۔ اس سے مجھے سخت کوفت تھی اس لیے کہ میرا کتب خانہ بالائی پر نیچے آ گیا تھا، جس کا نقشہ مکان تعمیر کرتے وقت میں نے خود بنایا تھا۔ اس کی صدر کھڑکی کھلے میدان کی جانب کھلتی تھی جہاں سے میں، اقبال ہال بننے تک، مسلم یونیورسٹی کے قبرستان کا نظارہ کر سکتا تھا۔ یہاں پر پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر عمر الدین جیسی ہستیاں ابدی نیند سو رہی ہیں۔ میں لکھنے پڑھنے سے تھک کر جب قبرستان کی جانب نظر اٹھاتا تو پردۂ خیال پر رشید احمد صدیقی مرحوم کی تصویر ابھر آتی تھی:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سمائے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

نیچے کی منزل میں آ کر میں اپنے گھر میں اجنبی بن گیا تھا، حالاں کہ وہاں میری بیوی بچیاں سب تھیں۔ تاہم زندگی کو باہمہ اور بے ہمہ گزارنے کی جو عادت ابتدا سے پڑی تھی اس میں کسی تبدیلی کو برداشت کرنا میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد میں نے پہلا کام یہ کیا اپنا پلنگ اور بستر اوپر کی منزل پر لے گیا جہاں میری رنا زنیناں حرم تھیں، زینے پر بے تکان چڑھنے لگا۔ قلب، قدم کا اور قدم قلب کا ساتھ ایک آہنگ کے ساتھ دینے لگے اور بقدر ۵ اکلو سبک سار ہو جانے کی وجہ سے جسم میں پھرتی آ گئی۔

رشید صاحب نے مجھے پھر سے تندرست پا کر جامعہ اردو کا جوا میرے کاندھوں پر لا رکھا۔ جنوری ۷۳ء میں ان ہی کی تحریک سے میں شیخ الجامعہ اور ڈاکٹر رفیق زکریا امیرِ جامعہ منتخب ہوئے۔ ابھی میں جامعہ اردو کی ذمہ داری پوری طرح سنبھال بھی نہیں پایا تھا کہ ستمبر ۷۳ء میں میرا انتخاب جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کی حیثیت سے ہو گیا۔ جب میں رشید صاحب سے "ارشاد" لینے کے لیے پہنچا اور شکایت کی کہ آپ نے ایک پٹھان کو شیخ بنا دیا اور اب نواب صاحب چھتاری اور جسٹس ہدایت اللہ

نے اسے "ڈبل شیخ" بنا دیا، تو کہنے لگے اب لطیفے کو زیادہ سنگین نہ بنائیے اور جامعہ ملیہ کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہو جائیے۔ جامعہ کا آپ پر کئی طرح سے حق ہے۔

جامعہ ملیہ کی وائس چانسلری پر میرا انتخاب کس طرح عمل میں آیا۔ اس کی تفصیل میں نے کسی اور باب میں دی ہے۔

لیجیے ایک بار پھر بنجارا لاد چلا۔ پہلے مکان کے لیے کرایہ دار کی تلاش ہوئی وہ بھی ایک سرکاری دفتر کی شکل میں مل گیا۔ کچھ سامان ساتھ لیا اور باقی کو مکان کے دو کمروں میں بند کیا اور چل دیا۔

مسلم یونیورسٹی سے میرا تعلق قائم رہا اس لیے کہ جامعہ ملیہ میں ۵ سال کے ڈپوٹیشن پر گیا تھا۔ دوسرا تعلق جامعہ اردو کا رہا۔ جامعہ اردو کی مجلس عام نے میرا تعلق اس سے نہیں ٹوٹنے دیا اور مجھے ایک بار پھر ۷۳ء میں شیخ الجامعہ منتخب کر لیا۔ البتہ مقامی طور پر نگرانی کے لیے میری تجویز پر ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کو نائب شیخ الجامعہ بنا دیا گیا۔ میں ہر مہینے ایک یا دو بار آتا جاتا رہا۔ الحاج عبید الرحمٰن خاں شروانی اعزازی خازن کی حیثیت سے پہلی بار ۷۳ء میں منتخب ہوئے۔ وہ عرصے تک مسلم یونیورسٹی کے اعزازی خازن رہ چکے تھے اور مالیات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا عام رجحان کفایت اور بچت کی جانب تھا۔ وہ خاندانی رشتے کے حوالے سے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور اسی نسبت سے میں ان کا احترام کرتا۔ ہر بڑے خرچ پر ان کا کفایتی نوٹ لگانا ضروری تھا اس لیے کہ ان کے خیال میں اس کے بغیر کسی ادارے میں خازن کی وجہ جواز کیا ہے۔ چوں کہ وہ اس حیثیت میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ بھی برسوں کام کر چکے تھے اور ان کے بڑے مداح تھے، لطف لے لے کر سناتے کہ جب میں کسی خرچ پر اپنا کفایتی نوٹ لگاتا تو ذاکر صاحب کہتے: "شیروانی صاحب آپ کا اعتراض سر آنکھوں پر لیکن کام بھی ہونا ہے، اس لیے اب آپ ہی اس کے لیے راہ نکالیے۔ اور اس کے بعد میں "ہرا ڈال اور لال نکال" کے جادو سے خرچ کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ پیدا کر دیتا۔

سنانے کو یہ قصہ مجھے سنا گئے، اب میرے ہاتھ ایک ایسی جادو کی چھڑی آ گئی

کر یں ذاکر صاحب کے حوالے سے اعتراض کرنے والے پر اعتراض کو زائل کرنے کی ذمہ داری ڈال دیتا اور وہ اپنے قلم سے اپنے اعتراض کو کاٹ دیتے۔ اس طرح بات بھی رہ جاتی اور کام بھی ہو جاتا۔

ع ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا

اردو کو میں نے پیشے کے طور پر اختیار کیا تھا اب وہ میرا مقدر بنتی گئی۔ ہماری زبان کے ادارےیے لکھتے وقت اس کی تاریخ اور تشکیل کے ساتھ ساتھ اس کی تقدیر پر بھی سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہر ہر قدم پر اس زبان کے ساتھ کیا کیا بے انصافی کی جا رہی ہے۔ میں ہندی کا کبھی مخالف نہیں رہا، میں نے اس زبان کو بڑے چاؤ سے اس زمانے کے علی گڑھ میں سیکھا جب پنڈت رام سروپ شاستری کو ہندی کے طالب علم کی تلاش ہوتی تھی اور آفتاب ہاسٹل سے چپراسی بھیج کر بلایا جاتا تھا۔ ہندی شاعری سے ہی متاثر ہو کر پہلے پہل مجھے گیت نگاری کی تحریک ملی۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد سے ہندی والوں کا جو رویہ اردو کی جانب رہا ہے اس نے بہت سی اچھی چیزوں میں میرے ایمان کو متزلزل کر دیا ہے۔ ریاستی حکومتوں نے (خاص طور پر اتر پردیش میں) اس کا تعلیمی نظام درہم برہم کر دیا۔ مردم شماری میں اس کے اعداد و شمار طرح طرح کی ترکیبوں سے گھٹا کر لکھے جانے لگے۔ اتر پردیش اور بہار میں اردو بولنے والے اتنے بھی نہیں درج کئے گئے جتنے کہ مسلمان ہیں! ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ہر الکشن سے پہلے جھوٹے وعدے کئے گئے۔ اردو والوں سے کہا گیا کہ جب ہر ریاست کے مسلمان وہاں کی زبان اپنا چکے ہیں تو ہندی کے علاقے کے مسلمان ہندی کو کیوں نہیں قبول کرتے۔ آج ملک کی 'ایکتا' اور 'اکھنڈتا' کا کس قدر ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے لیکن اس کے سب سے بڑے دشمن خود ہندی والے ہیں جنھوں نے ملک کی 'ایکتا' اور ہندی زبان کو لازم و ملزوم سمجھ لیا ہے۔ خالصتان کی تحریک کا یہ رنگ نہ ہوتا اگر ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں پنجاب کے ہندوؤں نے اپنی مادری زبان پنجابی کو اپنانے سے انکار نہ کر دیا ہوتا۔ جب یہ صورت نہ چل سکی تو یہ لاپچ دیا گیا کہ زبان پنجابی

رہے لیکن اس کے لیے رسم خط دیوناگری تسلیم کیا جائے۔ اردو کے لیے دیوناگری رسم خط کی تحریک یہاں بھی چلائی گئی۔ بہار میں شری جگن ناتھ مشرا نے ریاست کے لسانی ایکٹ میں ترمیم کرا کے جب اردو کو بھی ثانوی زبان کی حیثیت سے داخل کرا دیا تو ہندی کے دانشور (دائیں اور بائیں بازو دونوں طرف کے) بلبلا اٹھے۔ مہا دیوی ورما اردو کے خلاف میدان میں کود پڑیں۔ امرت رائے نے اردو کو ایک لسانی انحراف بتایا، جو دلّی کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور ماقبل ولی کے ادب کو 'ہندوی' کا نام دے کر ہندی تاریخ ادب کی کڑی بنا دیا۔ ترقی پسند دانشور نامور سنگھ اور ترقی پسند مصنفین نے اردو کی انفرادی حیثیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا بلکہ اسے ملک کے لیے بدنصیبی بتایا۔ ڈاکٹر گیان چند جین سے اشارہ پاکر امرت رائے نے اردو کو دستور کے آٹھویں شیڈول میں شامل کرنے کو پہلی لسانی بھول بتایا۔

اس کا جواب صرف یہ ہے کہ 'نورا تلخ تر' اور گام ما تیز تر' کر دیا جائے۔ اس بات کا اعلان کیا جائے کہ اردو اس ملک کی سیکولرزم کی ایک نشانی ہے اور اگر اس کے چاہنے والوں میں چند بھی نہ رہیں تب بھی مسلمانوں کی تہذیبی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اسے برقرار رکھا جائے۔

میں نے اس دوران اردو سے متعلق جو مضامین لکھے ان میں بار بار کہا کہ تاریخ کے بعض ادوار میں زبان، عقیدہ سے بھی زیادہ کسی جماعت کے تشخص اور بقا کے لیے اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خود اردو والے اپنے لیے اس کو ایک 'قدر' تسلیم کریں۔ جب یہ ان کے لیے 'قدر' کا حکم رکھے گی تو اس کی تعلیم و ترویج اُن کا وظیفہ بن جائے گا۔ اردو کے زوال کی ذمہ داری بہت کچھ اغیار پر ہے۔ لیکن تھوڑی بہت خود اردو بولنے والوں پر بھی ہے۔ جس کی انجمنیں، بیورو اور اکادمیاں نرخی کاموں کو اس کا اصل کام سمجھتی ہیں۔ ہم 'سنگ و خشت' کے لیے مرے مٹتے ہیں اور حرف و صوت کو لائق اعتنا تک نہیں سمجھتے۔ کیا مسلمانوں میں کوئی پنڈت آنند نرائن مُلّا جیسا موجود ہے جو ان کی طرح یہ کہہ سکے:

"میں اپنا مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن اپنی مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا۔"

اردو کے بارے میں میرے تلخ لہجے سے بعض دوستوں کو یہ شبہ ہوا کہ میں اپنی سیکولرزم کی ڈگر سے ہٹ گیا ہوں۔ میں بہ بانگِ دہل اعلان کرتا ہوں کہ میں نہ تو فرقہ وارانہ ذہنیت رکھتا ہوں اور نہ مولویانہ ذہن۔ میں مُلّا ہوں لیکن پنڈت آنند نرائن جیسا اُردو کا مُلّا۔ میں نے جب اپنے اداریوں کے مجموعے "اردو کا المیہ" کا انتساب ان الفاظ میں کیا:

"فریدہ، نادرہ، شاہدہ، زیبا
اور اُن جیسی لاکھوں اردو کی بیٹیوں کے نام جو اپنی مادری
زبان سے محروم کر دی گئی ہیں۔"

تو میرے دوست اور اردو کے قدیم خدمت گزار سری نواس لاہوٹی نے اشارۃً کہا کہ آجکل آپ بہت تلخ نوا ہو رہے ہیں۔ میں نے کہا کسی بھی جماعت کے لیے "زبان کشی" ہر قسم کی "کشی" سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس طرح آپ ایک نسل کو گونگی بہری بنا دیتے ہیں۔ یہ ہماری بےبسی کی انتہا ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کی مادری زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے۔ ہم انگریزی اور ہندی سیکھنے کے خلاف نہیں لیکن یہ دونوں مادری زبانیں نہیں ہیں۔ مادری زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دینا ہمارا دستوری حق ہے۔ اس دستوری حق کو قانونی حق میں تبدیل کرنا ضروری ہے۔

اردو کے سلسلے میں جو ناانصافی اس ملک میں ہو رہی ہے اُس نے میری قوم پرستی کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ نہ میرے حق میں مفید ہے اور نہ میرے وطن کے حق میں۔ میں اسے ہندی والوں کی کم نظری اور تنگ دلی سمجھتا ہوں کہ وہ ہندی کی ترویج کے لیے "اردو کشی" کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھیں ابھی تک غالباً اپنی زبان پر مکمل بھروسہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ اس سے بھی بےخبر ہیں کہ "اُردی" (اُردو + ہندی) جنوبی ایشیا میں لسانی ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکی ہے جس کی تگ و تاز پاکستان (پاکستان و ہند) تک محدود نہیں بلکہ وہ برصغیر کی حدود سے باہر نکل کر سنگاپور اور عدن اور پورٹ سعید تک پہنچ چکی ہے۔ یہ ایک لسانی "تری مُکھی" ہے جس کے دونوں روپوں کا برقرار رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ دنیا کی پانچویں عالمی زبان کی حیثیت سے اپنا مقام لے سکے۔

دراصل ہندی والے صرف اُردو سے خائف نہیں۔ ہندوستان کی دوسری زبا
تامل، ملیالم، تلگو، مراٹھی، بنگالی، پنجابی وغیرہ کی بڑھتی ہوئی یلغار سے بھی لرزاں ور
ہیں۔ ان سے تو زور نہیں چلتا، بے چاری اردو کے کان اینٹھنے لگتے ہیں۔ کاش وہ
عالم کے اِس سبق سے آشنا ہوتے!

ع خدراے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

تیرھواں باب

جامعہ ملیہ اسلامیہ (۲)

(۷۳ تا ۷۸ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسۂ ثانوی کا ایک فرار شدہ طالب علم جب چالیس سال کے
ل وقفے کے بعد ۳ نومبر ۱۹۷۳ء کو اس کے سربراہ کی حیثیت سے وہاں پہنچا تو اُس کے
ھ عجب طرح کے ملے جلے جذبات تھے۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ اس کرسی پر میں وہ بیٹھ رہا تھا
س پر اس کے چچا ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۲۶ تا ۱۹۴۸ء براجمان رہ چکے تھے۔ اس کرسی تک پہنچانے
یں جامعہ ملیہ کی تثلیث کے ایک رکن ڈاکٹر سید عابد حسین کا دستِ غیب تھا۔ وہ میرے
ے میں پروفیسر محمد مجیب کی ۱۹۷۳ء میں پہلک بیماری کے بعد سے سوچ رہے تھے۔ جامعہ
لیہ کے امیرِ جامعہ جسٹس ہدایت اللہ سے خط و کتابت کے ذریعے مجھے متعارف کر رہے
تھے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ جسٹس صاحب نے نواب صاحب چھتاری کو سلیکشن
ٹی کا صدر نامزد کیا ہے تو انھوں نے براہِ راست ان کو بھی لکھا۔ نواب صاحب مجھ
ے پہلے سے واقف تھے۔ ان کا ذہن از خود میری جانب کام کر رہا تھا۔ عابد صاحب
، سفارش نے اس کی تصدیق کر دی۔

ایک روز صبح صبح جب نواب صاحب کے چھوٹے صاحبزادے، اتن میاں (ابن سعید
ان صاحب) میرے ہاں اچانک موٹر پہ پہنچے تو مجھے تعجب سا ہوا۔ میں نے پوچھا خیریت تو

ہے؟ کہنے لگے نواب صاحب کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ کل جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا فون آیا تھا۔
انھوں نے نواب صاحب کو جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر کی انتخاب کمیٹی کے لیے صدر نامزد کیا ہے۔
نواب صاحب نے اسے قبول کر لیا ہے۔ ٹیلیفون کرنے کے فوراً بعد آپ کا نام ان کی زبان پر
آیا اور مجھ سے پوچھا کہ وہ کیسے رہیں گے۔ میں نے کہا بہت اچھے رہیں گے لیکن خود ان کی مرضی
تو معلوم ہو جائے۔ فرمایا تم ہی یہ کام کرو۔ اس لیے اب آپ کا منشا لینے کے لیے آیا ہوں۔ انتظامی
معاملات میری سرشت سے بعید تھے لیکن کچھ نواب صاحب اور عابد صاحب جیسے بزرگوں کی
دلچسپی اور کچھ جامعہ ملیہ سے میری قدیم وابستگی، بغیر زیادہ غور کیے 'ہاں' کردی۔ اب مجھے جامعہ
ملیہ کے وائس چانسلر منتخب ہو جانے کا یقین ہو گیا۔

اس سلسلے میں یہاں ایک لطیفہ بیان کرتا چلوں۔ اس کے راوی سید سفارش حسین
صاحب تھے جن کو کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے مزاج میں بڑا درخور تھا۔ اوکھلے میں مقیم
ہونے کی وجہ سے وہ اُن کے یہاں ہمہ وقت کے حاضر باش تھے۔ کچھ مشترک علمی دلچسپیوں کی
وجہ سے میری بھی ان سے اچھی خاصی ملاقات تھی، اس لیے جب بھی وہ علی گڑھ آتے تو مجھ سے
ضرور ملتے۔ ایسی ہی ایک ملاقات میں انھوں نے مجھے روشن علی کے عاشور نامے کی فوٹو نقل
عنایت کی تھی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "بھئی ڈاکٹر! آپ کے بارے میں آسمانوں میں مشورے ہو رہے
ہیں"۔ میں نے کہا "یعنی چہ"۔ کہنے لگے عابد صاحب اور سیدین صاحب دونوں کا خیال ہے کہ
پروفیسر مجیب کے بعد آپ جامعہ ملیہ آجائیں۔ البتہ زیدی صاحب آپ کے بارے میں
کچھ تحفظاتِ ذہنی رکھتے ہیں۔ ایک دن جب آپ کا تذکرہ اُن سے آیا تو کہنے لگے "میں انھیں
اچھی طرح جانتا ہوں۔ بڑی صلاحیت کے آدمی ہیں۔ بس یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر یوسف حسین کے
بھتیجے ہیں"۔ ڈاکٹر یوسف حسین کی جانب اس اشارہ کا پس منظر یہ تھا کہ جب وہ مسلم یونیورسٹی
کے وائس چانسلر تھے اور یوسف صاحب پرو وائس چانسلر، تو دونوں میں شدید اختلاف
ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ انھوں نے یوسف صاحب سے استعفیٰ طلب کر لیا تھا
اس کے بعد سے ان کی رائے یوسف صاحب کے بارے میں اچھی نہیں رہی تھی۔ سفارش
صاحب جب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے نہایت عاجزانہ انداز میں کہا "سفارش صاحب!

آپ زیدی صاحب کے مقربینِ خاص میں ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہوگا کہ ان کے اس اندیشے کے بارے میں میرا جواب ان کے کانوں تک پہنچا دیں"؟ بولے "کیا"؟ میں نے کہا "یہی کہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین کا بھی بھتیجا ہوں"۔ سفارش صاحب یہ سن کر پھڑک گئے۔ زیدی صاحب سے جا کر کہا میں نے پوچھا "زیدی صاحب کا جواب؟" کہنے لگے "لاجواب"!

ہاں، تو ۳ر نومبر ۷۳ء کی دوپہر جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو یادوں کا ایک ہجوم تھا، میری رہائش کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کا ذاتی مکان کرائے پرلے لیا گیا تھا، اس لیے یادوں کا ہجوم اور بڑھ گیا۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور جامعہ میں آشنا چہروں کی تلاش کی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین سامنے کے مکان میں مقیم تھے۔ اُن کے یہاں ایک سے زائد بار حاضری دی اور نیک و بد، سمجھا۔ میرے اسکول کے استاد اور دارالاقامہ کے نگراں، ارشاد الحق صاحب حیات تھے لیکن بسترِ مرگ پر ان کے یہاں حاضری دی۔ بڑی محبت سے پیش آئے اور اپنی اس نیت کا اظہار کیا کہ میں کسی دن ان کے یہاں آکر کھانا کھاؤں۔ میں نے کہا "آپ اچھے ہو جائیے، کھانے کے بہت سے مواقع نکلتے رہیں گے"! لیکن ایسا نہ ہو سکا اور وہ جلد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ابتدائی اسکول کے سابق استاد عبدالغفار مدھولی صاحب کے یہاں گیا۔ وہ دمے کے پُرانے مریض تھے لیکن اردو پڑھانے کے اپنے تعلیمی تجربات سے اب تک دست بردار نہیں ہوئے تھے۔ دفتر میں اپنے پُرانے ساتھیوں میں سے شعیب الرحمٰن صاحب اور عبداللطیف اعظمی صاحب کو پایا۔ شعیب الرحمٰن صاحب، ارشاد الحق صاحب کے بھانجے تھے اور میرے زمانے میں خاکسار منزل کے ایک کمرے میں خاندان کے چند اور بچا بچیوں کے ساتھ ایک بُوا کی نگرانی میں رہتے تھے، میں انھیں اس وقت سے جانتا تھا۔ اس وقت وہ جامعہ ملیہ کے رجسٹرار تھے۔ عبداللطیف اعظمی صاحب شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے پروفیسر محمد مجیب سے مجھے ایک طرح کے 'ورثہ' میں ملے تھے۔ جامعہ ملیہ ہی کی پیداوار تھے اور ان سے بھی میری پُرانی واقفیت تھی۔ اسمٰعیل خاں صاحب سے ملاقات ہوئی جو میرے

اسکول کے ساتھیوں میں تھے اور اس وقت ٹیچرز ٹریننگ کالج میں استاد تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آزاد رسول صاحب سے بھی میں اسی وقت سے واقف تھا۔ اب وہ مدرسۂ ابتدائی کے نگراں تھے لیکن کسی اور ہی عالم میں رہتے۔ بچوں کی تربیت سے زیادہ ان کا رُجحان تزکیۂ نفس کی جانب تھا۔ انھوں نے ٹین کا ایک شیڈ ڈال کر اسے محمد علی ہال کا نام دے دیا تھا۔ جب جامعہ ملیہ کی جامع مسجد کی تعمیر مکمل ہو گئی اور اس کے لیے مدرسہ ابتدائی کی جانب راستے کی ضرورت ہوئی تو اس میں محمد علی ہال آڑے آیا۔ میں نے اس شیڈ کو ہٹانا چاہا تو انھوں نے بہت واویلا مچایا' فتویٰ دیا کہ شیخ الجامعہ صاحب ایک مسجد کو ڈھا رہے ہیں۔ حالاں کہ صورت حال یہ تھی کہ اس ہال میں نماز بھی ہوتی تھی اور ڈرامے بھی کھیلے جاتے تھے۔ اس لیے میں نے اسے محض خدا کا گھر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ میرا خیال تھا اب جب کہ خدا کا بڑا گھر بن گیا ہے اس کی راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو اسے ہٹا دینا چاہیے۔ چنانچہ احتجاج اور فتوے کے باوجود کہ دم و شداوز بچوں کے لیے بڑی مسجد کا راستہ کھل گیا۔ دفتر میں سابقہ بتو دفتری سے پڑا جو ذاکر صاحب کے زمانے سے شیخ الجامعہ کی پیشی میں تھے لیکن جن کی دلچسپی دفتر کے باہر اپنی چائے کی دکان میں زیادہ رہتی تھی۔ پیرانہ سالی کے تمام آثار نمایاں ہونے کے باوجود وہ ریٹائر ہونے پر مُصر تھے۔ چوں کہ ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ریکارڈ دستیاب نہیں تھا اس لیے انھیں' اسی قسم کے چند اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے ساتھ' طبی معائنہ کے سپرد کیا گیا' اور جب ڈاکٹر کی رپورٹ پر انھیں خاصی مہلت دینے کے بعد ریٹائرڈ کیا گیا تو یہ کہتے ہوئے پائے گئے "دجناب' جامعہ سے جو نکل گیا وہ کچھ نہ کچھ بن گیا۔ ذاکر صاحب ہی کو دیکھ لیجیے۔ ہم نے بھی اگر جامعہ چھوڑ دی ہوتی تو آج کچھ بن گئے ہوتے"۔ اسی قسم کے 'جامعی' سے سابقہ پڑنے کے بعد ہی رشید احمد صدیقی صاحب نے کہیں لکھا ہے "جب کبھی میں جامعہ جاتا ہوں تو مجھے جس قدر اس کے شیخ الجامعہ کا احترام کرنا پڑتا ہے' اسی قدر اُن کے چپراسی کا۔ اس لیے کہ دونوں خادمِ ملّت ہیں!!"

شیخ الجامعہ کی کرسی پر جم کر بیٹھنے کے بعد میں اکثر سوچتا تھا کہ چالیس سال کے عرصے میں جامعہ کیا سے کیا ہو گئی ہے اور میں خود کتنا بدل چکا تھا۔ اسی زمانے

میں میں نے عبدالغفار مدہولی صاحب کی خود نوشت "اک معلم کی زندگی" کا دوبارہ مطالعہ کیا۔ اس پر پروفیسر مجیب کا مختصر سا پیش لفظ تھا جسے بغور دیکھا۔ مجیب صاحب نے اس میں نہایت ایمانداری سے اعتراف کیا ہے کہ انھوں نے خود کو جامعہ کے مقاصد اور اندازِ نظر سے ہم آہنگ نہ پاتے ہوئے بھی "حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم" پر عمل کیا ہے۔ اِس کی شہادت ان کے صاحبزادے پروفیسر محمد امین نے بھی اِن الفاظ میں دی ہے:

"اُن کو اس سے مطلب نہ تھا کہ قوم کی خدمت کریں۔ ان کو اصلیت میں اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا تھا جس کو جھیلنے سے ان کو نفسیاتی تسکین ملے۔ یہ فلسفہ بغیر حضرت عیسیٰ کی زندگی اور دستوِسکی کے خیالات کے گہرے مطالعہ کے، مشکل سے سمجھ میں آئے گا۔" (جامعہ، مجیب نمبر)

یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اس ادارے سے زیادہ گہری وابستگی رکھنے والی شخصیتوں۔ یعنی ڈاکٹر ذاکر حسین اور ڈاکٹر عابد حسین نے اس کا دامن چھوڑ کر اپنے عمل کے لیے وسیع تر جولاں گاہیں تلاش کر لی تھیں، لیکن اودھ کا یہ "شیخ"، اور جاگیردارانہ مزاج سے متصف یہ منحنی انسان گل محمد کی طرح قطب بنا جامعہ میں آخر وقت تک ڈٹا رہا۔ جامعہ ملیہ کا ماحول پروفیسر مجیب کے لیے کئی لحاظ سے اجنبی تھا۔ ایک تو ان کے ذہن کی، جواہر لال نہرو کے ذہن کی طرح 'لامذہبیت' میں پرورش ہوئی تھی، جب کہ جامعہ ملیہ پر مولانا محمد علی کی اسلامیت کا ٹھپہ لگا ہوا تھا۔ ذاکر صاحب اور عابد صاحب، اِس اعتبار سے محمد علی نہیں تھے لیکن دونوں آزاد خیال ہوتے ہوئے، اسلامیت کی چلمن کے پس پشت رہتے تھے۔ مجیب صاحب اتنا بھی نہ کر سکے۔ ان کے مذہبی افکار اور ان کی اخلاقیات جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فضا سے بالکل مختلف تھے۔ البتہ امارت کی آن بان کا تقاضا یہی تھا کہ ؎

ہم اس فتنہ خو کے در سے نہ اُٹھیں گے اب اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مسلم یونیورسٹی اگر مسلمانوں کا 'گڑھ' رہا ہے تو جامعہ ملیہ بھی ان کا نگر ہے۔ قوم پرستی جس کی لہر پر جامعہ ملیہ وجود میں آئی تھی، وہ بھی اس کی اسلامیت کو نہ دبا سکی۔ اس

اعتبار سے دونوں کے مسائل یکساں ہیں، یعنی ذہین اور محنتی طلبہ کی کمی اور روشن خیال اساتذ
کا فقدان۔ دونوں جگہ واویلا ہوتا ہے کہ اغیار چھائے جا رہے ہیں۔ سائنس، انجینئرنگ اور
ایجوکیشن کی فیکلٹیوں میں غیر مسلم طلبہ کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ علی گڑھ کے میڈیکل
اور انجینئرنگ کالجوں میں ہر قسم کی تدابیر کے باوجود غیر مسلم طلبہ کی تعداد کو بڑھنے سے
روکنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اعلیٰ سطح پر یہ گھٹ کر غیر مسلم بن جاتا ہے اور اسی نسبت
سے اردو کی حیثیت بطور ذریعۂ تعلیم کمزور ہو جاتی ہے۔ اردو ذریعۂ تعلیم جامعہ کے
اغراض و مقاصد کا ایک اہم ستون تھا۔ علی گڑھ میں اردو کی جانب سے اغماض
سرسید کے آخری دور سے شروع ہو گیا تھا۔ جامعہ کا قیام جن بنیادوں پر عمل میں آیا
تھا وہ بھی آزادی ملنے کے فوراً بعد مسمار ہونے لگیں۔ ان دونوں اداروں میں اسلام
اور اسلامیت کی خدمت لب بہت کی جاتی ہے مگر ان کے اصلی کردار کو صرف اردو ذریعۂ تعلیم
کے وسیلے سے بچایا جا سکتا تھا لیکن اس کے لیے دونوں اداروں میں قوت ارادی کمزور
ہو چکی ہے اور ہم اس کے لیے طرح طرح کی تاویلیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ روزی روٹی
کا حوالہ دیتے ہیں اس لیے کہ ہم اردو کی آئینی حیثیت کو ابھی تک نہیں منوا سکے ہیں۔ یہ صحیح
ہے کہ آئین کی رو سے ہم سرکاری امداد سے چلنے والے اداروں کو فرقہ وارانہ خطوط پر ترقی
نہیں دے سکتے لیکن کون سے آئین میں لکھا ہے کہ ہم لسانی اور مادری زبان کی بنیادوں
پر تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکتے۔

جب میں جامعہ ملیہ پہنچا تو میرے دماغ میں یہ خیالات گھوم رہے تھے۔
اسکولوں کی جانب سے قدرے اطمینان تھا کہ ان میں جامعہ کی روایات باقی تھیں،
اور اردو ذریعۂ تعلیم تھی لیکن کالج کی سطح پر جامعہ کا توازن بالکل بگڑ چکا تھا۔ ہر سطح
پر اردو کے ساتھ ہندی ذریعۂ تعلیم کی بیخ لگی ہوئی تھی۔ چوں کہ کالج کے درجات میں غیر مسلم
طلبہ کا ہجوم تھا اس لیے یہاں بے بسی تھی۔ اردو ذریعۂ تعلیم کو ۱۹۴۷ء کی دہشت انگیزی میں ختم
کر کے ہم نے ہندی کے لیے دہانہ خود کھول دیا تھا۔ حالاں کہ جامعہ جیسے اداروں میں ہندی
کا مقام انگریزی جیسا ہونا چاہیے تھا یعنی ایک اہم زبان کا، جو جہاں اعلیٰ معیار سے سکھائی

بائے ، ذریعۂ تعلیم کا ہرگز نہیں۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم رو بہ زوال تھا۔ اس کی جگہ بھی اردو کو لینی چاہیئے تھی۔

اردو ایم۔اے کھل چکا تھا لیکن کس مپرسی کے عالم میں تھا۔ اس کے صدر شعبہ ریڈر کے گریڈ میں تھے۔ اساتذہ کی تعداد اور استعداد بھی کچھ یوں ہی سی تھی۔ اتفاق سے پہلے ہی کنووکیشن میں یو۔جی۔سی۔ کے چیرمین مسٹر جان کنووکیشن کا خطبہ پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں جامعہ کی توسیع کی جانب جو اشارے کیے، اس میں اس بات پر زور دیا کہ یہاں کا شعبۂ اردو ملک میں سب سے ممتاز ہونا چاہیئے، اس لیے کہ اردو زبان کی تدریس و ترویج جامعہ ملیہ کی اساس میں ہے۔ وہ کیرالا کے ایک عیسائی قوم پرست تھے اور جامعہ جیسے قومی اداروں کی تاریخ سے بخوبی واقف تھے۔ ہمارے تشریف لائے تھے وہاں ڈاکٹر ذاکر حسین سے بھی ان کا تعلق رہا تھا۔ مجھے اُن کے خطبے سے اشارہ مل گیا۔ اس لیے چند ہفتے بعد ہی یو۔جی۔سی کے دفتر میں حاضر ہوا اور جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کا تقاضا کیا۔ اس سلسلے میں ان کی ہمدردی دیکھئے کہ فوراً نائب چیرمین ڈاکٹر ستیش چندر کو بلایا اور ان کے سامنے جامعہ کے لیے اردو کی پروفیسری کی منظوری دے دی۔ یہ کام جس قدر آسانی سے ہو گیا، میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں خوش خوش واپس لوٹا اور سب سے پہلے یہ خوش خبری عابد صاحب کو سنائی۔ اب ہم دونوں کو اس جگہ کے لیے ایک فعال شخص کی تلاش ہوئی جو جامعہ کے شعبۂ اردو کو ملک میں ایک ممتاز جگہ دینے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے کہ اس وقت کے ریڈر اور صدر شعبہ پڑھے لکھے انسان ہونے کے باوجود یہ صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ کافی غور و خوض کے بعد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ پر نظر پڑی جو اس وقت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ریڈر تھے لیکن متنازعہ فیہ شخصیت کے مالک تھے۔ پروفیسر مجیب نے اس جگہ کے لیے ڈاکٹر گیان چند کو بھی امید دلا رکھی تھی چوں کہ جامعہ کے شعبۂ ہندی کے صدر ایک مسلمان تھے، اس لیے ہمارے لیے یہ خیال بھی دلچسپی رکھتا تھا کہ اس طرح اردو کی سیکولر حیثیت زیادہ مضبوط ہوگی، اگر جامعہ جیسے قومی ادارے میں اردو کا سربراہ ایک ہندو ہو۔ ڈاکٹر گیان چند کا نام بھی زیر غور رہا، لیکن

صلاحیت رکھنے کے باوجود انھیں اردو کے خُلقیہ (Ethos) کی گوں کا نہ پایا۔ ا
تھا کہ عادی تھے لیکن ان کے بائیں بازو سے انتہائی شغف اور چوکھٹے کی فکر کو جامعہ
کے لیے مناسب نہیں پایا۔ لہٰذا لوٹ پلٹ کر نظر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہی پر جمی اُن کی
متنازع فیہ شخصیت کے باوجود۔ ڈاکٹر محمد حسن اس ترجیح پر سخت شاکی ہوئے اور اس کے
پہچاننا چھوڑ دیا۔ میں اِس قسم کی آزادی اپنے دوستوں کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں د
ان کے پُرانے مراسم تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں ریڈری کی اسامی پر ان کا تقرر خواجہ احمد
صاحب نے بہت سے تحفظاتِ ذہنی کے ساتھ میری ہی سفارش اور ذمہ داری پر کیا
جو ان کی یہ شانِ بے نیازی دیکھی تو میں بھی خدا بن بیٹھا اور میں نے ان کے وجود ہی کو اپ
سے خارج کر دیا۔ یہ میرے ردِّ عمل ہی کا شاید اثر تھا کہ عرصے کے بعد ان کا ایک خط آ
میں کچھ شکایت اور کچھ اپنے رویّہ پر شرمندگی تھی وہ چاہتے تھے کہ راہ و رسم کا دروازہ پھر ک
لیکن یہ اس سے زیادہ نہ کھل سکا کہ ہم سر اور ہاتھ کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ ایک
کو پہچاننے لگے۔

نارنگ صاحب ایک نہایت ذہین انسان ہیں، طلاقتِ لسانی کے ماہر قلم کے قلم
فعّال شخصیت کے مالک۔ ۱۹۴۷ء کے بعد وہ بلوچستان سے ہجرت کر کے واردِ دہلی ہوئے
یہیں انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمّل کی۔ بلوچستان میں ان کا ماحول سرتاسر مسلمانوں کا
جس کا اثر تا حال ان کی شخصیت سے جھلکتا ہے۔ انھوں نے آتے ہی جامعہ کے شعبۂ اردو
جان سی ڈال دی۔ ایسے ایسے سیمینار کرائے کہ باید و شاید ملک میں ہر طرف ان کی دھوم مچ
اسی زمانے میں مَیں نے اوکھلا روڈ پر جامعہ کالج کے سامنے ایک کوٹھی خرید کر شعبۂ اردو کو
اس کی تزئین میں انھوں نے اپنا سارا سلیقہ دکھا دیا۔ ہر طرف ان کے انہماک اور کام کا
تھا بجز ایک چھوٹے سے گروہ کے جس کا تعلق بائیں بازو سے تھا اور جو نارنگ کی رسوائی پر
سے تُلا ہوا تھا۔ جامعہ کی دیواروں پر لکھا گیا کہ وہ CIA کے ایجنٹ ہیں۔ ان کی ذاتی ز
کے حوالے سے کردار کشی کی گئی۔ حالاں کہ ان میں سے اکثر کی ذاتی زندگی اُن سے بدتر تھی۔
جب دیکھا کہ اس پروپیگنڈے کا شیخ الجامعہ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر شیخ الجامعہ

بدن بنایا جانے لگا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نارنگ صاحب کے ایک استقبالیہ میں میں نے ان کو جامعہ میں خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا "نارنگ جامعہ کے لیے اور جامعہ نارنگ صاحب کے لیے ایک چیلنج ہیں۔ دیکھئے دونوں ایک دوسرے سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں"! آج اپنا وہ قول مجھے رہ رہ کر یاد آ رہا تھا۔ بائیں بازو کے گروہ کے سرغنہ کالج آف ایجوکیشن کے پرنسپل ڈاکٹر سلامت اللہ تھے جو خود وائس چانسلری کے امیدوار تھے۔ مجھے شروع سے ان سے بھی نبٹنا پڑا۔ ابتدا میں مجھے جامعہ کے وسیع حلقے کی تائید حاصل رہی۔ اس لیے یہ گروہ سوائے غلط پروپیگنڈے کے اور کچھ نہ کر سکا۔ لیکن ۷۷ء میں نارنگ صاحب سے ایک بڑی چوک ہو گئی جس کا تذکرہ میں بعد کو کردوں گا، پہلے درجہ چہارم کے ملازمین کی سرگرمیوں کا حال بیان کردوں۔ ان کی ایسوسی ایشن پر ایک کلرک صاحب نے قبضہ کر رکھا تھا، جو اس کے فنڈ پر صبح سے شام تک سگرٹوں کا دھواں اڑاتے پھرتے اور ٹیکسیوں پر سوار وزارتِ تعلیم کے دفتر کے چکر لگاتے رہتے۔ میں نے اپنی عمر میں اُن سے چلتر انسان نہیں دیکھا۔ انھیں اپنی لیڈری کو قائم رکھنے کے لیے بہت سے گُر آتے تھے۔ شروع شروع میں میں نے "جامعہ اسپرٹ" میں ان ملازمین کے مسائل کو ہمدردی سے حل کرنے کی کوشش کی۔ جامعہ کے محدود وسائل کے اندر ان کے جائز مطالبات کو پورا کیا۔ جو مانگیں پوری نہ کر سکا ان کے لیے یو۔ جی۔ سی۔ کو سفارشی خطوط لکھے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ ہی دنوں کے بعد ایک روز پھر شیخ الجامعہ کے دفتر کے باہر نعروں کا شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا کہ صاحب اپنے گرگوں کے ساتھ ہنگامہ آرا ہیں اور مجھ سے ملنے کے خواہش مند۔ ان سے کہا گیا کہ صرف ۵، ۶ اراکین پر مشتمل ایک وفد شیخ الجامعہ کے دفتر میں ملنے کے لیے آ سکتا ہے۔ صاحب مسکراتے ہوئے تشریف لائے۔ انھیں آدابِ مجلس ازبر تھے۔ اس لیے تلخیٔ کلام کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ انھوں نے ایک بار پھر اپنی مانگوں کو نمبر وار دہرایا۔ میں نے کہا میں آپ کی پندرہ مانگوں میں دس پوری کر چکا ہوں باقی پانچ کے لیے یو۔ جی۔ سی اور وزارتِ تعلیم کو لکھ چکا ہوں۔ اب کیا شکایت رہ گئی ہے۔ کہنے لگے شیخ الجامعہ صاحب اب بھی ہماری پانچ نہیں، پندرہ مانگیں ہیں۔ میں نے کہا "یہ کیونکر؟"

کہا کہ دس نئی مانگیں شامل کرکے پندرہ کی لسٹ پھر پوری کردی گئی ہے۔ میں نے کہا "بہت خوب! یہ تو شیطان کی آنت کی طرح کبھی بھی ختم نہیں ہوں گی" ہنس کر بولے "شیخ الجامعہ صاحب! ہمارا کام ہے مانگیں پیدا کرنا اور آپ کا کام ہے انھیں پورا کرنا" جس دن یہ ختم ہو جائیں گی اس دن ہماری لیڈری بھی ختم ہو جائے گی۔ ایک لمحے کے لیے تو میں سکتے میں آ گیا لیکن بہت جلد سمجھ گیا اور اس کے بعد میں نے 'جامعہ اسپرٹ' میں مسائل حل کرنے کے فلسفہ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا۔

اب میرے اور درجۂ چہارم کے ملازمین کے درمیان زور آزمائی کا آغاز ہو گیا۔ میں نے مجلس منتظمہ میں درجۂ چہارم کے ملازمین کے آئین میں تبدیلیاں کرادیں، یہ دفعہ داخل کرادی کہ ایسوسی ایشن کے عہدہ داروں کا درجۂ چہارم کے ملازمین سے ہونا ضروری ہے۔ اس طرح صاحب کی لیڈری کو ختم کر دیا۔ ان کو با مصرف بنانے اور مصروف رکھنے کے لیے ان کا تبادلہ کر دیا۔ لیکن شورش کا سلسلہ جاری رہا اور اب وہ دور سے ڈوریاں کھینچ کر کٹ پتلیوں کا تماشا کرنے لگے۔ ملک کی بدقسمتی اور وائس چانسلروں کی خوش قسمتی سے ۱۹۷۵ء میں اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا اعلان کیا۔ اب ہر قسم کے احتجاجی کھیل تماشے بند تھے۔ ایک دوبار ان لوگوں نے کروٹ لینے کی کوشش کی تو اوکھلے کے تھانے دار نے بلا کر دھمکا دیا اس کے بعد چوہوں کی طرح سب بلوں میں گھس گئے۔ اگلے دو سال امن سے گزر گئے۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں اچانک ایمرجنسی ختم کردی گئی۔ دوسرے ہی روز شیخ الجامعہ کے دفتر کے سامنے نعرہ بازی ہو رہی تھی، اس بار انتقامی جذبے کے ساتھ!

اب میں "واقعۂ نارنگ" کی جانب رجوع کرتا ہوں جس کا سرا اٹھا کر چھوڑ دیا تھا۔ نارنگ صاحب کے بارے میں لکھ چکا ہوں کہ انھیں ایک خاص نقطۂ نظر کے تحت دوسرے بعض اچھے اساتذۂ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ ملیہ لایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو یہ بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ فیہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ ایک حوصلہ مند مگر انسان ہیں۔ طبیعت میں خود پسندی اور شدت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو وہ کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں جب منفی ہو جاتی

زجارحانہ انداز اختیار کرلیتی ہے۔

جامعہ میں ایک دو سال تو ان کے اچھے گزرے، صرف بائیں بازو کا گروہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتا رہا۔ اب اس میں وہ لوگ بھی شریک ہوگئے جو ان کی بے پناہ توانائی اور فعالیت سے خائف تھے۔ جامعہ کے اساتذہ میں ایک طبقہ نااہلوں کا ایسا بھی تھا جو نہ خود کام کرنا چاہتا تھا نہ کسی کو کام کرنے دینے کا قائل تھا۔ ان کی قوت ان کی گروہ بندی میں تھی۔ چنانچہ عام تائید حاصل کرنے کے لیے انھوں نے نارنگ صاحب پر اب فرقہ واریت کا الزام لگانا شروع کردیا۔ میں ذاتی علم کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ نارنگ صاحب فرقہ وارانہ ذہن نہیں رکھتے۔ لیکن جب دیگر اساتذہ نے ان کے خلاف اس حربے کو استعمال کرنا چاہا تو پھر انھوں نے بھی اس کے استعمال میں دریغ نہیں کیا۔ جامعہ کالج میں ہندو طلبہ کا تعلق بیشتر سماج کے ان طبقات سے تھا جہاں فرقہ واریت کے جذبات عام تھے۔ وہ جامعہ کی روایات سے بھی واقف نہیں تھے، نہ اُس کے خُلقیہ سے۔ انھیں میں ایک شورہ پشت نوجوان   تھا جس کا تعلق پاس پڑوس کے ایک گاؤں سے تھا۔ میں اُسے شورہ پشت اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ ہمیشہ جامعہ کو بدنام کرنے کے درپے رہتا۔ ایک بار اُس نے سیڑھیاں لگا کر جامعہ کالج کی تمام عمارتوں پر نعرے لکھ دیئے تھے۔ جب میں نے اس سے باز پُرس کی تو ہنس کر کہا "شیخ الجامعہ صاحب ان عمارتوں پر کئی سال سے قلعی اور رنگ نہیں ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ اسی طرح ہو جائے!" خیر تو نارنگ صاحب نے سیاست کا جواب سیاست سے دینے کے لیے اُس سے اور اُس جیسے چند طالب علموں سے ربط ضبط پیدا کیا اور جامعہ میں 'مسلم فرقہ واریت' کے نقطے پر دونوں ہم رائے ہوگئے۔ اس شورہ پشت نے اس کی اطلاع   کے شعبے کے (جہاں وہ طالب علم تھا) ایک مسلمان استاد   صاحب کو دی جو نارنگ صاحب کی تاک میں تھے۔ دونوں میں سانٹھ گانٹھ ہوئی۔ انھوں نے اسے امتحان میں بہت اونچے نمبر دینے کا وعدہ کیا اور اس نے نارنگ صاحب کی گفتگو کو ٹیپ کرنے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اسے ایک نہایت اثر پذیر

ٹیپ ریکارڈر فراہم کیا گیا۔ اس نے پلان کے مطابق نارنگ صاحب کو ٹیلیفون کیا۔ گفتگو کا سلسلہ
جامعہ ملیہ سے شروع ہوا اور یہاں ہندو طالب علموں سے جو تعصب برتا جاتا ہے اس سے ہوتا
ہوا بعض اشخاص تک جا پہنچا۔ جن کے بارے میں اس نے اس انداز سے سوالات کیے کہ نارنگ
صاحب کھل گئے۔ ٹیلیفون پر گفتگو کا یہ سلسلہ تقریباً آدھ گھنٹے چلتا رہا اور ٹیپ ہوتا رہا۔ نارنگ
صاحب کو یہ سان وگمان بھی نہ ہوا کہ میری صدا بندی کی جا رہی ہے۔ غرض کہ اس نے اپنے
سوالات سے ان سے ایسے جوابات حاصل کر لیئے جن سے ان کے دل کی بات کا پتہ چلتا تھا۔
یہ اس نے' اس امید میں کہ اب تو مجھے بی۔اے۔ میں فرسٹ کلاس مل ہی جائے گا' اپنے
کے استاد کو لاکر دیا۔ وہ دوسرے دن فاتحانہ انداز میں میرے مکان پر آئے اور
بولے "شیخ الجامعہ صاحب! میں آپ کو ایک ٹیپ سنانا چاہتا ہوں" ٹیپ ریکارڈر ان
کے ساتھ تھا۔ میں نے سنا تو حیرت میں رہ گیا۔ لیکن گولی بندوق سے نکل چکی تھی۔ اس
کے بعد وہ ٹیپ جگہ جگہ سنایا گیا۔ ٹیپ سے مزید ٹیپ بنائے گئے اور اب وہ لاؤڈ اسپیکر
کے ذریعہ بڑے بڑے مجموں کو سنایا جانے لگا۔ مجھ سے مانگ کی گئی کہ مجلس عاملہ کا خصوصی
جلسہ طلب کر کے نارنگ صاحب کو فوری طور پر معطل کیا جائے۔ مجلس عاملہ کے اراکین
نے بھی نارنگ صاحب کا ٹیپ سنا۔ میں نے تجویز کیا کہ معطل کرنے کے بجائے عاملہ یک نفری
تحقیقاتی کمیٹی مقرر کر دے۔ اس لیئے واقعہ کا ثبوت تو آپ لوگوں کے پاس محفوظ ہے، نارنگ
صاحب برسرکار رہتے ہوئے' اس پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ لیکن میری اس تجویز
کو مسترد کر دیا گیا اور اب ایجی ٹیشن کی رفتار تیز تر کر دی گئی۔ میں اپنی تجویز پر اڑا رہا
کہتا رہا کہ جامعہ برادری اس سے قبل جامعہ کی عمارتوں پر جو کچھ ان کے بارے میں لکھتی رہی ہے وہ
اس سے کہیں زیادہ سخت تھا جو کچھ کہ نارنگ صاحب نے جامعہ کے بعض اصحاب کے بارے
میں ٹیلیفون پر کہا ہے۔

بہرحال ہنگامہ آرائی بڑھتی رہی اور اب ہمہ وقتی سیاست بازوں نے اس کا
رخ نارنگ صاحب کے بجائے میری جانب پھیر دیا۔ صدر شعبہ کا ایک خفیہ جلسہ ہوا
جس میں میرے خلاف عدم اعتماد کا میمورنڈم تیار کیا گیا اور وہ اشوکا ہوٹل [illegible]

ایت اللہ امیر جامعہ کی خدمت میں پیش کیا، جو اتفاق سے اس وقت دہلی آئے ہوئے تھے۔
ے اس وقت اس کا علم نہ ہو سکا۔ البتہ کچھ روز کے بعد جب میرا بمبئی جانا ہوا اور امیر جامعہ
ے مکان پر 'تنظیمی ملاقات' کے لیے گیا تو انھوں نے مجھے اپنے دفتر میں بلا لیا۔ جوں ہی میں سامنے
ا کرسی پر بیٹھا انھوں نے دراز سے ایک فائل نکال کر دی اور کہا "آپ جب تک اس
ر نظر ڈالیے، میں زیرِ قلم تحریر کو ختم کر لوں۔" یہ وہی میمورنڈم تھا جو صدور شعبہ نے انھیں اشوکا
ہوٹل میں دیا تھا۔ اس میں 'واقعۂ نارنگ' کی تفصیل دینے کے بعد آخر میں یہ جملہ تھا "ہم لوگ
شیخ الجامعہ پر اپنا اعتماد کھو چکے ہیں۔" نیچے دستخط دیکھے تو نام بنام تھے۔ صرف میر کارواں، یعنی
پرنسپل جامعہ کالج ضیاء الحسن فاروقی صاحب کے نہیں تھے جنھوں نے امیر جامعہ تک اساتذہ
کی رہبری کی تھی۔ ایک دو صدورِ شعبہ کے بھی نہیں تھے۔ امیر جامعہ جب اپنے کام سے فارغ
ہو گئے تو میں نے ان سے اس مسئلے پر گفتگو کرنی چاہی۔ انھوں نے اغماز کیا اور میمورنڈم کو اس
لائق تک نہیں سمجھا کہ مجھ سے تفصیلات تک پوچھتے۔ اتنے میں جھلکتی ہوئی کافی کے دو پیالے آگئے
اور ہم لوگ اس سے لطف اندوز ہونے لگے۔

جسٹس ہدایت اللہ کا مجھ پر اور میرا ان پر جو اعتماد تھا وہ اور بڑھ گیا۔ مجھے اس
بات پر فخر ہے کہ پونے پانچ سال کے عرصے میں، جو میں نے ان کے ساتھ گزارا، ایک بار بھی
انھوں نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی۔ حالاں کہ آج کل تو چانسلروں کا یہ معمول ہو گیا
ہے کہ وائس چانسلر کی نکیل اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں 'جسٹس' تھے
جو معاملات سے خود کو ایک معروضی بلندی پر رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ امیر جامعہ شیخ الجامعہ
کی مدد کے لیے ہوتا ہے نہ کہ اس کے کاموں میں روڑے اٹکانے کے لیے۔

نارنگ صاحب کے خلاف جامعہ میں تحریک جب کسی طرح ختم ہوتی نظر نہ آئی تو مجھے
پولیس کے مشورے پر تین اساتذہ اور ایک طالب علم کے مچلکوں کے لیے اجازت دینی پڑی۔
اس کے بعد خدا خدا کر کے دن رات کے وہ میلے ختم ہوئے جہاں ٹیپ بجا کر نارنگ صاحب
کے خلاف جذبات کو بھڑکایا جاتا تھا۔ واقعۂ نارنگ پر سب سے اچھا تبصرہ امیر جامعہ ہی
نے کیا۔ ایک ملاقات میں کہنے لگے "مسعود صاحب! ان پروفیسر صاحبان کتنے عقل مند لگ

ہوتے ہیں کہ طالب علموں سے آدھ آدھ گھنٹہ ٹیلیفون پر بات کرتے ہیں اور ان کا عذر یہ نہیں سمجھ پاتے ہیں"

ہنگامہ آرائی کی شکل تو ختم ہو گئی لیکن چمکلوں کی وجہ سے میرے خلاف تحریک خفیہ انداز میں چلتی رہی۔ میں بھی اب جامعہ سے بددل ہو چکا تھا۔ جون ۷۷ء میں تو میں نے تقریبا طے سا کر لیا تھا کہ مجھے اپنی پروفیسری پر علی گڑھ واپس چلا جانا چاہیئے، جس کا تذکرہ میں نے اپنے سیکریٹری عبداللطیف اعظمی صاحب سے کیا بھی تھا۔ لیکن جسٹس ہدایت اللہ صاحب کے اصرار پر اپنا یہ ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ مجھے سب سے زیادہ ملال اس بات کا تھا کہ جن شاخوں پر آشیانہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ کچھ لوگ جو چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے بے جھجک سامنے آ گئے۔ بعض نے طلبہ کو صفر کا نا اپنا پیشہ سا بنا لیا۔ چنانچہ جب ایک بار طلبہ کا ہجوم نعرے مارتا ہوا میری رہائش گاہ کی جانب بڑھا تو یہ ان کے ساتھ تھے۔ جامعہ کے استادوں میں بعض

مجھے ان سب کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس کے باوجود جامعہ کے اساتذہ اور اہلکاروں کا پر خلوص اور سمجھدار طبقہ میرے ساتھ رہا۔ انھیں کی مدد سے میں جامعہ کو اس پُر آشوب دور سے نکال سکا۔

میں نے نہ صرف شعبۂ اردو کی از سر نو تنظیم کی بلکہ بعض حضرات نے 'اسکولوں' کے نام پر جو چھوٹی چھوٹی جاگیریں بنا رکھی تھیں انھیں توڑ کر فیکلٹی سسٹم جاری کیا۔ اس سے بعض مفاد پرستوں پر زد پڑی۔ انھیں میں سے ایک صاحب جن کی پہنچ وزارت تعلیم تک تھی اس کے ڈائریکٹر تک پہنچ گئے اور ان کے کان بھر دیئے۔ چنانچہ شری انل بوردیا، جو اب تک ہماری جانب نرم گوشہ رکھتے تھے اور جامعہ کی مجلس عاملہ کے نامزد سرکاری رکن تھے، ان کے بہکاوے میں آ کر میری تعلیمی اصلاح کی مخالفت کرنے لگے۔ چوں کہ اس معاملے میں مجلس کی اکثریت نے میرا ساتھ دیا اس لیئے اس وقت تو دال نہ گلی لیکن آئندہ چل کر جامعہ کے ہر کام میں روڑے اٹکانا ان کا معمول سا ہو گیا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ بیورو کریسی اپنی ہمہ دانی کے زعم میں کس طرح تعلیمی اداروں کا ناک میں دم کر سکتی ہے خاص کر

اگران کے سربراہوں کی سیاسی پیچ وزیر تعلیم تک نہ ہو، اس سے قبل میرا ٹکراؤ، نورالحسن صاحب کے دوران وزارت میں ڈائریکٹر شری چتکارا سے ہو چکا تھا، اور مجھے سید حامد حسین اور کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ ان کی شکایت کرنے کے لیے ان کے بنگلے پر جانا پڑا تھا۔ نورالحسن صاحب نے ہماری شکایتیں سن کر جہاں بہت سی باتیں کیں ایک دلچسپ بات یہ بھی کہی تھی کہ مقابلہ پٹھان کا پٹھان سے ہے صرف مسلم اور ہندو پٹھان کا فرق ہے۔ اشارہ تھا میرے پٹھان ہونے کی طرف اور شری چتکارا کے صوبہ سرحد سے آئے ہوئے شرنارتھی ہونے کی جانب۔ جب شری چتکارا ریٹائرڈ ہو گئے تو امیر جامعہ نے بھی سانس لے کر کہا: "چلئے جامعہ کا چتکارا سے چھٹکارا ہو گیا"

میری وائس چانسلری کا آخری نصف سال، یعنی ۱۹۷۸ء کا نصف اول زیادہ پر آشوب تھا۔ اس سلسلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر علی محمد خسرو صاحب نے بڑی اچھی بات کہی تھی۔ اُن کے خیال میں ہر وائس چانسلر کے پہلے ایک دو سال ہنی مون کے ہوتے ہیں۔ تیسرے سال سے خانگی زندگی کی سی کھٹ کھٹ شروع ہو جاتی ہے جو آخری سال میں شورش بن جاتی ہے۔ میں اب اپنی وائس چانسلری کے آخری سال سے گذر رہا تھا۔ ایمرجنسی ختم ہو چکی تھی۔ شر پسند اساتذہ اور درجۂ چہارم کے ملازمین دونوں مخالفت کے پلیٹ فارم پر یکجا ہو گئے تھے۔ چلتے چلتے میں نے امیر جامعہ کو خط لکھ کر، آئین کی ایک دفعہ سے فائدہ اٹھا کر جامعہ پر انکوائری بٹھا دی۔ اس کے لیے میں نے شبانہ روز محنت کر کے اپنے معتمد علیہ اسسٹنٹ شعیب احمد خاں کی مدد سے اساتذہ کی ذاتی فائلوں کا مطالعہ کیا اور فرداً فرداً مواد جمع کیا۔ ان دفینوں سے عجیب عجیب خزینے برآمد ہوئے۔ کسی نے فائل سے ہائی اسکول کا سارٹیفکٹ غائب کرا کے اپنی تاریخ پیدائش بدلوا دی تھی۔ دو استاد ایسے ملے جو ۱۹۶۹ سال سے پی۔ ایچ۔ ڈی میں نام کا اندراج کرائے ہوئے تھے اور ان کے قلم سے تاحال چند صفحات تک برآمد نہیں ہوئے تھے۔ ایک صاحب ہائی اسکول تا ایم۔ اے تھرڈ ڈویژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے وغیرہ وغیرہ۔

جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے سپریم کورٹ کے ایک جج مرتضیٰ فضل علی صاحب

کو انکوائری کے لیے مقرر کیا۔ ان کی کوٹھی پر میرے اور متعلقہ حضرات کے بیانات لیے گئے
اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ سپریم کورٹ کا جج بھی "آدمی" ہوتا ہے! آخر آخر میں انھوں
نے انکوائری سے یہ کہہ کر کنارہ کشی کر لی کہ میں برسرِ کار جج ہوں اس لیے فیصلہ نہیں دے
سکتا۔ ہدایت اللہ صاحب نے ان کے بعد سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس ایم ایم بیگ
صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کام کا تکملہ کر دیں۔ ظاہر ہے ان کو انکوائری کا جو مواد
دیا گیا تھا اس کی روشنی میں وہ اپنی رائے دے سکتے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض حضرات
کو سرزنش کی اور بعض کی غلط کاریوں کو نمایاں کیا۔

ان تمام کاموں میں ۱۹۸۰ء کا نصف سال گزر گیا۔ میری وائس چانسلری کی پنج سالہ
مدت ۳؍ نومبر ۱۹۸۰ء کو ختم ہو رہی تھی۔ لیکن میں نے طے کر لیا تھا کہ ۱۵؍ اگست میرے لیے بھی
یومِ آزادی ہوگا اور میں دو سال کے بعد تقرر پر مسلم یونیورسٹی چلا جاؤں گا۔ میں نے اس
عندیے سے امیرِ جامعہ کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ میں ایسا نہ کروں،
اور کم از کم اپنی باقی ماندہ مدت پوری کر لوں۔ اس کے لیے انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے
وائس چانسلر پروفیسر علی محمد خسرو کو لکھا یا ٹیلیفون پر بات کی۔ خسرو صاحب نے اس
کا فوراً اجازت دے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں امیرِ جامعہ کی خواہش پوری نہ کر سکا اور
۱۵؍ اگست کی تاریخ کو آگے نہ بڑھا سکا۔

اس سے کچھ پہلے جامعہ کی مجلسِ عاملہ کا جلسہ تھا جو حالات کے پیشِ نظر میری
رہائش گاہ ہی پر رکھا گیا تھا۔ اس میں جسٹس بیگ کی رپورٹ پیش ہونا تھی۔ جامعہ میں
مشہور ہو گیا تھا کہ کئی اساتذہ کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی۔ ان اساتذہ نے اس
خوف و تردد کے پیشِ نظر میری رہائش گاہ کے سامنے ایک مظاہرے کی تنظیم کی۔ پولیس
کا انتظام تھا اس لیے احاطے میں داخل ہونے کی کسی نے ہمت نہیں کی۔ برآمدے سے ہم مظاہرہ
کو دیکھتے رہے۔ عجیب عجیب چہرے نظر آئے وہ بھی جو کچھ عرصے پہلے تک میرے ساتھ سائے
کی طرح چلتے تھے، وہ بھی جن کے بارے میں مجھے کہنا پڑا " تو بھی اے بروٹس

مجلسِ منتظمہ کے جلسے میں وزارتِ تعلیم کے نمائندے مسٹر ی پنڈتا نے میری خدمات
ران اقدام کو سراہتے ہوئے جو میں نے پچھلے چند سالوں میں جامعہ کے نظم و ضبط کے سلسلے
ں کئے تھے، ایک تحسینی ریزولیوشن پیش کیا جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ جسٹس بیگ کی
سفارشات پر غور کیا گیا اور انھیں یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ چوں کہ وائس چانسلر جامعہ کی
ملازمت سے سبک دوش ہو رہے ہیں اس لیے ان پر پھر کبھی غور کیا جائے۔ اس کے
بعد وہ جامعہ کے سرد خانے میں چلی گئیں۔

جامعہ ملیہ کے دورانِ قیام جہاں اور بہت سے فائدے ہوئے مجھے بیرونِ ملک سفر
کرنے کے کئی مواقع بھی ملے۔ ان میں سعودی عرب کے دو سفر یادگار ہیں۔ پہلا سفر میں نے
۱۹۶۰ء میں سرکاری حج ڈیلیگیشن کے رکن کی حیثیت سے کیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود،
جو اس وقت محکمۂ قانون میں ریاستی وزیر کے عہدہ پر فائز تھے اس کے لیڈر تھے۔ ان کے
ہمراہ ان کی دوسری نوجوان بیگم تھیں۔ اس کی ایک رکن آسام کی وزیر بیگم انورہ تیمور تھیں۔

ڈاکٹر سید محمود بہت خلیق مگر تند مزاج کے انسان تھے۔ جدّہ
پہنچتے ہی ان کا اختلاف ہندوستانی سفیر قریشی صاحب سے ہو گیا، جو بڑھتا ہی چلا گیا۔ سفیر صاحب
کو اپنے آئی۔ سی۔ ایس۔ ہونے کا زعم تھا اور سید محمد صاحب کو اپنی وزارت کا۔ کسی وجہ سے
وہ میرا بڑا خیال کرتے تھے اس لیے اپنے دل کی بات مجھ سے کہہ دیتے تھے۔ ادھر ہندوستانی
سفارت خانے میں ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کے چھوٹے بھائی انعام الرحمٰن تھے جو سفیر صاحب
کے بہت قریب تھے۔ میری ان سے پرانی واقفیت تھی۔ چنانچہ ہر روز ہم ایک دوسرے سے مشورہ
کرتے اور کوشش کرتے کہ بہ نام ہندوستان دونوں میں ٹکراؤ کی نوبت نہ آنے پائے۔
مکہ مکرمہ میں وفد کے قیام کے لیے قریب کے ایک فندق (ہوٹل) میں ہمارا

[illegible] تھا کھانا بہت مہنگا تھا جس کے لیے ہمیں سرکاری طور پر جو بھتہ دیا جاتا تھا وہ سخت ناکافی تھا۔ آخر شام میں سیدنا طاہر سیف الدین کے رباط کی فیاضی پر گذر بسر کرنا پڑا جہاں سے دونوں وقت کھانا مفت آجاتا تھا۔

اب حج کا ہنگام آگیا۔ نہ صرف حرم کے اندر بلکہ شہر مکّہ میں حاجیوں کی وہ ریل پیل تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ شام کو سوق اللیل میں داد و ستد کا وہ بازار گرم ہوتا کہ معلوم ہوتا تھا حج کا اصل مقصد تجارت ہے۔ حرم کے پاس ایک پیلے رنگ کی دو منزلہ عمارت تھی جس میں اوقاف کا دفتر تھا۔ اس پر پتھر کی تختی پر کندہ تھا کہ یہ جائے پیدائش حضرت محمدؐ کی ہے۔ مجھے نہایت ہی یہ رویہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی۔ کہاں سرکار مدینہ کا مولد اور کہاں یہ سرکاری دفتر۔ آخر یہ ایمان اتنا کمزور تو نہیں کہ ہم مولد رسول کی پرستش کرنے لگیں۔ مکّہ کا وہ قبرستان جاکر دیکھا جہاں حضرت خدیجہ اور دوسرے اکابرینِ امّت دفن تھے۔ سب ہموار اور بے نشان۔ طوافِ کعبہ کے لیے حرم شریف میں داخل ہوا تو توحید کے پروانوں کا وہ ہجوم کہ اللہ کی پناہ۔ ہر شخص مصروفِ طواف تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ افریقہ اور الجیریا کے چھ فٹی قوی ہیکل سورما عورتوں اور ضعیفوں کے پاؤں کچلتے ہوئے ایسے نکل جاتے تھے کہ دنیا و مافیہا کی خبر تک نہ ہوتی۔ طوافِ کعبہ کرنے کے بعد ہر شخص کا ہدف حجرِ اسود کا بوسہ تھا۔ کعبے کی سیڑھیوں پر غلاف کا سرا پکڑے ایک حاجب بیٹھا رہتا۔ میں نے دیکھا کہ لوگ بند مٹھی اس کی طرف بڑھاتے ہیں۔ کچھ دست بدست منتقل ہو جاتا۔ اور وہ اس مومن کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کو اپنے ہاتھ سے ہٹاتا ہوا ایک لمحے کے لیے اس کے لب سنگِ اسود تک پہنچا دیتا، جو کثرتِ بوسہ سے اب ایک کاسہ سا بن گیا ہے۔ میں نے یہ صورت دیکھی تو الٹے پاؤں پھر آیا، درِ کعبہ وا نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ جو تماشا دیکھا اس کے باعث۔ دوسرے روز میں نے عبداللطیف اعظمی صاحب کو دہلی خط میں لکھا: ع

تماشا کامیاب آیا تمنّا بے قرار آئی

مختلف زمانوں میں حرم کی توسیع ہوتی رہی ہے۔ سعودیوں نے اسے اطالوی سنگِ مرمر سے لیس سا دیا ہے۔ معلوم نہیں اقبال کے یہاں یہ ردّ عمل کیوں کر ہوا، اس لیے کہ وہ باوجود نیت زیارتِ کعبہ سے مشرف نہیں ہوئے تھے۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹی کا حرم اور بنا دو!

میں نے قیامِ مکہ کے چند روز دردوں بینی میں گزارے میری آنکھیں اب اندر کی
ل رہی تھیں حرم کی مسجد میں اپنے ساتھیوں سے الگ تھلگ گھنٹوں خاموش بیٹھا
حرم کے آس پاس کے دوکانداروں کو دیکھتا جو دکانوں پر صرف ایک جال لگا کر نماز
رنے یہاں آتے تھے۔ وہ رٹ فرض پڑھتے تھے اور اس تیزی سے پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا
بس ٹکریں لگا رہے ہیں۔ انھیں الفاظ بدبدانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ غالباً نماز
الفاظ اور آیات کی سطریں پوری کی پوری اُن کے تصور میں آجاتی ہوں گی اس لیے لفظ
درکھ کر چلنا اس قدر مختصر مدت میں محال تھا مجھے اس پر بھی تعجب ہوتا کہ محض ایک جال
ذریعے بیرونی مصنوعات سے بھری ہوئی یہ دکانیں اغیار کی دست برد سے کیوں کر محفوظ
جاتی ہیں جب کہ خود میری نیت ڈانواں ڈول ہو جاتی تھی۔ اچھا ہی ہوا کہ عمل تک نوبت
میں پہنچی ورنہ دست بریدہ ہندوستان پہنچتا کہ اسلام میں سارق کی سزا یہی ہے۔ اسی
ہ کہا جاتا ہے سعودی عرب کی سڑکوں پر آپ سونا اُچھالتے ہوئے چل سکتے ہیں۔
حج اور اس کے دیگر مناسک سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ 'دیارِ حبیب' یعنی
مدینے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس وقت سعودی عرب کی شاہراہوں کا صحیح اندازہ ہوا۔
ن پر کم رفتاری سے موٹر چلانا خطرناک ہے۔ سڑکیں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کالی ربر کو پگھلا
کر بچھا دیا گیا ہے۔ میلوں چلے جائیے جھٹکا نہیں لگتا۔ مدینے کو مکے سے زیادہ پُر سکون، فرحت
بخش اور سرسبز پایا۔ گنبدِ خضریٰ کی جھلک ہر طرف باغات و سبزہ زاروں میں نظر آئی۔ جس
جالی کو پکڑ کر دعا مانگنے کی خواہش ہر حاجی کو ہوتی ہے وہاں حاجیوں کا پہرہ پایا۔ کسی نے بتایا کہ
فجر کی نماز سے پہلے پہنچ جائیے تو جالی کے قریب آیا جا سکتا ہے۔ ایک صبح ایسے ہی لمحے میں اندر
کی جھلک دیکھی۔ تین قبریں ہیں جن پر سائبان لگے ہیں۔ ایک آں حضرتؐ، دوسرے حضرت
ابوبکر صدیقؓ اور تیسری حضرت عمرؓ کی۔ دوسرے لمحے حاجب سر پر تھا اور میں دور کھڑا ہوا
تھا۔ وہاں بہت پہلے سے بس یہی تین قبریں رہ گئی ہیں۔ پانچ کے ہوٹل کی چھت سے

جنت البقیع کا نظارہ کیا (ہوٹل والے کو ۵ ریال دے کر) وہاں بھی ہر طرف سپاٹ میدان نظر آیا۔ عقیدت مند ہاتھ میں کچھ پتھر چھپا کر لے جاتے ہیں اور حضرت فاطمہ اور دوسرے اہلِ خاندانِ رسول کی قبروں کی نشاندہی انھیں رکھ کر کرتے رہتے ہیں۔ یہی حال غزوۂ بدر کے شہیدوں کے قبرستان کا ہے جو راستے میں دیکھا۔ سب سے زیادہ متاثر ہوا اس پہاڑ اور درّہ کو دیکھ کر جہاں سے حملہ کر کے حضرت خالد بن ولید نے جنگ کا نقشہ بدل دیا تھا۔ مدینہ میں عبدالملک صاحب جامعی سے ملاقات ہوئی۔ وہ عرصے سے وہیں آباد ہو گئے تھے اور اس وقت ابتدائی مدارس کے انسپکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ وہ مجھے اپنی موٹر نما کسی چیز میں بٹھا کر "بیر عثمان" لے گئے۔ یہ وہ کنواں تھا جو حضرت عثمان نے یہودیوں سے خرید کر رفاہِ عام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مدینہ کی ہر ہر گلی اور نخلستان پر تاریخ اسلام کے نقش کندہ ہیں۔

سعودی عرب کا میرا دوسرا سفر، ۱۹۷۷ء میں پیش آیا۔ یہ عالمی اسلامی تعلیمی کانفرنس کے سلسلے میں ہوا تھا۔ میرے ہم سفر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر علی محمد خسرو تھے۔ وہ بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انھوں نے بڑی ڈھیل کی وائس چانسلری کی ہے۔ لیکن ان کے دردِ دل کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگے "مسعود صاحب! جب میری موٹر کٹ میلے سے اتر کر دہلی کا رُخ کرتی ہے تو میرے اعصاب میں سکون کی سی کیفیت آ جاتی ہے لیکن جب دہلی سے آتے ہوئے یہ کٹ میلے پر چڑھنا شروع کرتی ہے تو اعصابی تشنج پھر شروع ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا "ہر وائس چانسلر کا یہی مقدر ہے۔ میرے سلسلے میں کٹ میلے پر یہ عمل برعکس انداز میں ہوتا ہے۔"

پاکستان سے کافی حضرات اس میں شرکت کرنے آئے تھے جن میں میرے شاگرد اور دوست کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر احسان رشید بھی تھے۔ احسان رشید علی گڑھ میں بھی ایک انجمن ساز شخصیت کے مالک تھے اور یہاں بھی ویسا ہی پایا۔ ہمارے قیام و طعام کا انتظام اس بڑے انٹرنیشنل ہوٹل میں تھا جو حدودِ مکہ سے باہر ایک بڑے عربی خیمے کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ ایسے تمام اجتماع جن میں غیر مسلم بھی شریک ہوں اسی ہوٹل میں منعقد کیے جاتے ہیں اس لیے کہ حدودِ حرم میں ان کے لیے قدم رکھنا ممنوع

ہے۔اس قسم کی تخصیص کا تجربہ مجھے جنوبی ہند کے ایک مندر میں ہوا تھا۔جہاں لسانیات کے سمر
کول کا ایک گروہ جب پہنچا تو مسلمان ہونے کی وجہ سے مجھے مندر میں جانے کی ممانعت کر دی
تی۔اب جب کہ صورت مکہ میں دیکھی تو اطمینان ہوا کہ اس اعتبار سے کعبہ و کاشی یکساں ہیں،
س لیے شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا، کانفرنس کے پہلے ہی سیشن میں تعلیم کے اسلامی خطوط کا تعین
ر دیا گیا اس طرح کہ مسلم طبیعیات، مسلم نباتیات، مسلم جغرافیہ غرض کہ ہر علم کی تدریس کس طرح
سلامی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ میری عقل میں شروع سے یہ منطق نہیں آئی، اس لیے اس
قضیہ کے صغریٰ و کبریٰ کو کیا سمجھتا۔ میں نے مسلم اقلیتی ممالک کی سب کمیٹی کا رکن ہونا منظور کیا۔ وہاں
بحث و مباحثہ کے دوران سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ ایسے ممالک میں جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے
مسلم سائنس اور مسلم آرٹس کے کیا معنیٰ ہوں گے۔ میں نے بحث کے دوران اپنے ساتھیوں
کو ہندوستان جیسے ممالک کے سیکولر تعلیم کے خطوط اور ان میں اسلامی عناصر کی آمیزش
کے امکانات کی جانب اشارہ کیا، لیکن مسلم ذہن جب ہٹ دھرمی پہ اتر آتا ہے تو پھر
زیائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہو جاتی ہے۔ مباحثہ، مجادلہ کی صورت اختیار کر
لیتا اگر خرطوم (سوڈان) یونیورسٹی کے وائس چانسلر، جو ہندوستان ہو آئے تھے، اس
کمیٹی کے صدر نہ ہوتے اور میرے نقطۂ نظر کی حمایت نہ کرتے۔

اس سے بدحظ ہو کر میں نے اپنی تمام تر توجہ لذتِ کام و دہن کی جانب مبذول کر دی
جس کے اس ہوٹل میں سارے سامان تھے۔ عرب گوشت بے دریغ کھاتا ہے اور اس سے
زیادہ ضائع کرتا ہے۔ کانٹے چمچے پر اپنی انگلیوں کو ترجیح دیتا جنھیں سنّت کے طور پر بعد کو
چاٹتا ہے۔ یہاں دنبے کے پیٹ سے بھنا ہوا مرغ برآمد ہوتا۔ مجھے تلاش رہی کہ یا خدا
کہیں اونٹ کے شکم سے بھنا ہوا دنبا نکل آئے۔

جامعہ کی وائس چانسلری ہی کے دوران مجھے ایک تعلیمی کانفرنس میں قاہرہ جانے
کا بھی موقع ملا۔ یہاں بھی خسرو صاحب میرے ہم سفر تھے۔ اس کانفرنس پر الازہر والے چھائے
ہوئے تھے جس کے شیخ کچھ عرصہ پہلے جامعہ ملیہ آچکے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں اسکالر آدمی

تھے۔ جتنی دیر جامعہ میں رہے عربی مخطوطات کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے کام کی ایک دو چیزیں دریافت کرلیں۔ مصری عربوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔ وہاں قدیم اسکالر شپ کے بھی نمونے ملتے ہیں اور جدید کے بھی۔ قدیم و جدید کے فرق کو بھی وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں اور دونوں کی اپنے اپنے مقام پر اہمیت کو بھی جانتے ہیں۔

مصر میں دریائے نیل (جس کے درمیان ہمارا ہوٹل میری دان تھا) کے حسن کے کے علاوہ صحرا کے ان دیو ہیکل پاسبانوں کو بھی دیکھا جنھیں اہرام مصر کہتے ہیں۔ ابوالہول کو واقعی 'ہول' کا باپ پایا۔ قدیم مصری ذہن کس بڑے کے پیمانے پر اشیاء کو متصور اور پھر ان کی تجسیم کرسکتا تھا، یہ دیکھ کر ہول اور حیرت دونوں ہوئے۔ حسن قلوپطرہ کی تلاش ہوئی تو مصر کے بازاروں میں کچھ نقش و نگار ملے۔ رود نیل کی دلکشی اب بھی باقی ہے۔

جامعہ کے پونے پانچ سال کے قیام پر جب غور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیسا کھویا کیا پایا، تو ذاتی طور پر کھونے کا پلا کچھ بھاری نظر آتا ہے۔ بنیادی طور پر میرے ذہن کی افتاد انتظامی کے بجائے تعلیمی ہے۔ تعلیمی معروفیات میں مجھے خوشی زیادہ ملتی ہے۔ اسی لیے علی گڑھ کے طویل قیام میں، ابتدا میں وارڈن رہنے کے بعد میں نے کبھی کوئی دوسرا عہدہ قبول نہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے مجھے سرسید ہال کے پرووسٹ کے عہدہ کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اس سے بھی معذرت کرلی تھی۔ لیکن جب عابد صاحب اور دیگر بزرگوں نے مجھے جامعہ چلے آنے کو کہا تو اسے میں نے بہ خوشی منظور کرلیا۔ اس کی وجہ کرسی کی ہوس نہیں بلکہ اس ادارے سے وہ محبت تھی جو اسکول کے دنوں سے میرے قلب میں جاگزیں تھی۔ چنانچہ میں نے اس جذبہ کا اظہار جامعہ پہنچ کر پہلی تقریر میں اس طرح کیا تھا کہ "لوگ اوکھلی میں سر دیتے ہیں میں نے اوکھلے میں سر دیا ہے"۔ اسی اسپرٹ کے ساتھ میں جامعہ پہنچا تھا۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ وائس چانسلری کی ذمہ داریوں کے ساتھ مجھے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے فرصت نہیں ملے گی۔ حالانکہ پروفیسر محمد مجیب مشورہ مجھے یہی تھا کہ میں اپنا

علمی کام جاری رکھوں، انتظامی معاملات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جامعہ پہنچ کر مجھے بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ تصنیف کا قلم رکھ کر دستخطوں کے قلم پر اکتفا کرنا ہوگا۔ جامعہ کے میرے پونے پانچ سال اِس لیے علمی اعتبار سے "بنجر" رہے کہ سوائے چند خطبات اور مضامین کے اور کچھ نہ لکھ سکا حالاں کہ حیدرآباد کے چھ سالہ قیام اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کی ۵ سالہ لسانیات کی پروفیسری کے دوران میں نے علمی و تحقیقی کام خاصا کیا تھا۔ اب دفتر، کار اور بنگلے کی سہولت تھی۔ پانچ اسٹار ہوٹلوں میں سرکاری ضیافتوں میں شرکت، اونچی کرسی والوں سے ملاقاتیں، یہ سب کچھ تو تھا لیکن ہمیشہ یہ احساس رہا کہ میاں مسعود! نہ یہ تمہارا صحیح مقام ہے اور نہ منصب۔ بعینہٖ جس طرح آل انڈیا ریڈیو کی چھ مہینے کی سروس کرنے کے بعد محسوس ہوا تھا۔ چنانچہ جیسا کہ کہیں ذکر کر چکا ہوں میں نے ایک سال قبل استعفا دے کر علی گڑھ چلے جانے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے شری انل بورڈیا (جو اس وقت وزارتِ تعلیم میں ڈائریکٹر تھے) اور شری چھابڑا کا (سکریٹری یو۔ جی۔ سی) کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مجلس منتظمہ کے سرکاری نامزد کردہ رکن کی حیثیت سے وائس چانسلر علی محمد خسرو کی میری بازملازمت کی تجویز میں پیچ لگا دی اور میں جاتے جاتے رُک گیا۔ بعد کو جب میں نے شری چھابڑا سے اس کی ہنس کر شکایت کی تو انھوں نے اس کی ساری ذمہ داری انل بورڈیا پر ڈال دی۔ مجھے یاد آگیا کہ جب وہ جامعہ ملیہ کی مجلسِ عاملہ کے سرکاری رکن تھے تو ایک مسئلہ پر میرا اُن سے اختلاف ہو گیا تھا۔ میں اس واقعہ کو بھول گیا تھا لیکن انھیں یاد رہا!

جامعہ پہنچ کر میرا خیال تھا کہ اس کے ایک قدیم طالب کی حیثیت سے اور میرے خاندان سے اُس کا جو تعلق رہا ہے اس بنا پر، ڈاکٹر سید عابد حسین کی خواہش اور رشید احمد صدیقی صاحب کی دعاؤں کے ساتھ میں اِس اِدارے کی روحِ گم شدہ کو واپس لا سکوں گا۔ چنانچہ جاتے ہی میں نے اِس کے شعبۂ اردو میں پروفیسر کی اسامی قائم کرائی، اور اس کے لیے علاحدہ سے عمارت خرید دی۔ بعد کو جب کالجوں کا نظام ختم ہو گیا اور ان کی جگہ مختلف فیکلٹیوں نے لے لی تو میں نے خاص طور پر عربی، فارسی اور اسلامیات کا ایک مرکز قائم کیا تاکہ جامعہ اپنے ماضی سے وابستہ رہ سکے۔ جامعہ کے سوشل ورک کی حیثیت کے پیشِ

سوشل ورک اسکول کے "ڈھانچے" کو ختم کرکے سوشل سائنز کی فیکلٹی میں تبدیل کیا۔ اور شعبۂ نفسیات کا اس میں اضافہ کیا گیا۔ رفتہ رفتہ یہ کھلا کہ بیشتر اساتذہ کا نہ جامعہ اسپرٹ سے کوئی تعلق تھا اور اس کے اسلامی ادارہ ہونے سے غالب کے بقول نفسانفسی کا عالم تھا ؎

اپنی ہستی ہی سے ہو، جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

چنانچہ عجب عجب طرح کے اتحاد باہمی پائے اسلئے سیدھے کا، دیندار دنیادار کا۔ علمی اقدار یا حبِ جامعہ سے کسی کو سروکار نہیں تھا۔ اپنی چودھراہٹ قائم رکھنا ضروری تھی، جامعہ چاہے بھاڑ میں جائے۔ پھر قربانی کے بکرے کے طور پر وائس چانسلر تو ہمیشہ موجود ہی رہتا ہے۔ پروفیسر مجیب کے زمانے میں جو ڈھیل مل گئی تھی، اس کا جاری رہنا ضروری تھا۔ غالباً انھوں نے ان حالات سے دل برداشتہ ہوکر آخری زمانے میں جامعہ کی توسیع میں دلچسپی چھوڑ دی تھی اور اپنا سارا وقت اپنی علمی یا دوسری ذاتی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔

جامعہ کے اساتذہ میں بہت بڑی تعداد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مسترد کردہ نااہلوں کی تھی۔ ان میں فرسٹ کلاس کیریر کے لوگ بہت کم تھے۔ ان میں سے بیشتر ریڈر اور صدر شعبہ کے منصب پر مجیب صاحب کے زمانے میں فائز ہوچکے تھے اور بغیر کسی علمی کام کے جامعہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ پروفیسری کے خواب دیکھ رہے تھے۔ چوں کہ بیشتر مضامین میں پوسٹ گریجویٹ کلاسیں نہیں کھلی تھیں اس لیے ان میں سے اکثر کو ایم اے کلاسیں پڑھانے یا تحقیقی کام کرانے کا ایک دن کا بھی تجربہ نہیں تھا۔ تاہم جامعہ کالج کے پرنسپل، انتخابی کمیٹیوں میں یہ کہہ کر ان کی سفارش کرتے کہ اگر ان کو ایم۔ اے پڑھانے کا تجربہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری جامعہ پر ہے جس نے ان کو اس کام کا موقع فراہم نہیں کیا؟ گویا جامعہ کے باہر بھی ایسے اُمیدوار موجود نہیں تھے! اسی الٹی منطق سے ایک صاحب کو ذوالعف سے لے کر ہی تک تھرڈ کلاس تھے پروفیسر بنادیا گیا اور سیکنڈ کلاس

ے تو سبھی لوگ پروفیسر بن گئے، لیکن میرے جامعہ چھوڑنے کے بعد۔

جب اُن بزرگوں اور رفیقوں کو یاد کرتا ہوں جن کے ساتھ یا جن کے درمیان
ں نے جامعہ چلائی تو ڈاکٹر سید عابد حسین کے علاوہ دو نام فوراً ذہن میں آتے ہیں۔
ر جامعہ جسٹس ہدایت اللہ صاحب کا اور دوسرے اعزازی خازن مدحت کامل
صاحب کا۔ ہدایت اللہ صاحب کی جانب سے مجھے ہر موقع پر تائید ملی، اس کا
پہلے کر چکا ہوں۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ان کی عدم مداخلت کی پالیسی کا سرچشمہ ان
ک کرسئ عدالت پر فائز رہنا تھا جامعہ ان کے نقشۂ حیات میں ایک چھوٹا سا مقام
۔ کہا جاتا تھا کہ وہ خود اس مرتبہ کے لیے راضی نہیں تھے لیکن اپنی رفیقۂ حیات کے
ے پر بادلِ ناخواستہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے انتقال کے بعد ۱۹۶۹ء میں قبول کر لیا تھا۔
لیے انھیں جامعہ کے معاملات سے بہت زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس بات کا اندازہ
س بات سے ہوا کہ جب کبھی میں نے جامعہ کی توسیع کے سلسلے میں امداد چاہی تو کہا
، وزیرِ اعظم کی سطح پر تو بات کر سکتا ہوں لیکن وزیرِ تعلیم یا یو۔ جی۔ سی
ین وغیرہ سے وائس چانسلر نبٹے تو بہتر ہے۔" بڑی مشکل سے میں
بار جامعہ کے معاملات کے سلسلے میں۔ یو۔ جی۔ سی کے چیئرمین پروفیسر ستیش چندر
ٹری شری چھابڑا کو اُن کے اشوکا ہوٹل کے 'سوئٹ' میں چائے پر مدعو کیا تھا، اور
دیکھا اس ملاقات کے بعد کئی معاملات کا تصفیہ جلد ہو گیا۔ لیکن وہ اس قسم کی
قاتوں کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ میری وائس چانسلری کے دوران وہ پہلے
اندھی اور دوسرے سال، جنتا کے برسرِ اقتدار آجانے کے بعد شری مرار جی ڈیسائی
ن کو جانے کے لیے ع معشوق ما بہ شیوۂ ہر کس برابر است کے مصداق جب اندرا جی
۔ ان کے ہر گام پہ وہ نام خدا کہتے تھے۔ عالم یہ تھا کہ جب کنونشن کا جلوس پنڈال
خل ہوا تو اس کی سربراہی امیرِ جامعہ کی حیثیت سے ہدایت اللہ صاحب کر رہے تھے
وائس چانسلر کی حیثیت سے سوز جہاں کے ساتھ تھا۔ ہدایت اللہ صاحب ہر پانچ

قدم کے بعد جب فرش کا جوڑ آتا مڑتے اور اندرا جی سے کہتے: "احتیاط سے قدم رکھئے گا" جب یہ انتباہ دو تین بار ہو گیا تو اندرا جی سے نہ رہا گیا اور مجھ سے آہستہ سے کہا" ان سے کہیئے کہ وہ مجھ سے زیادہ اپنی فکر کریں" یہ امر واقعہ بھی ہے کہ اندرا جی سے زیادہ وہ ڈگمگ ڈگمگ چل رہے تھے کنونشن کے خطبے اور میرے استقبالیہ کے بعد بھی ایک لطیفہ ہوا۔ ہم دونوں نے عرض مدعا اور جواب عرض مدعا میں اردو اشعار کا استعمال بے تحاشا کیا۔ دوسرے روز اخباروں میں نکلا کہ جامعہ کے کنونشن میں شیخ الجامعہ اور وزیر اعظم کے درمیان شعر بازی رہی۔ اس کے بعد وزیر اعظم کی جانب سے داد و دہش کے اعلان کی باری آئی تو ہدایت اللہ صاحب نے مجھ سے کہا کہ دس لاکھ کا اعلان کر دیجئے یہ میری ناتجربہ کاری سمجھئے کہ میں وزیر اعظم کا منہ دیکھنے لگا اور انھوں نے فوراً کہا اس قدر میں کہاں سے دوں گی۔ اس کے بعد پرچے پر ۵ لاکھ لکھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ چنانچہ گھاٹے کا سودا رہا۔

مرارجی ڈیسائی کنونشن ایڈریس دینے آئے تو ایسا معلوم ہوا کہ ہدایت اللہ صاحب ان سے بھی اتنے ہی قریب ہیں جتنے کہ وہ اندرا جی سے تھے۔ اس کی شاید ایک وجہ ان کا 'بمبئی والا' ہونا اور دوسری وجہ ان کی بیوی کا ایک گجراتی ہندو ہونا بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال یہ عالم بالا کی باتیں ہیں۔ اونچی سیاست میں کون کس کے قریب ہوتا ہے یہ ہم جیسے 'ماسٹر' کیا جانیں۔

اس کنونشن میں جامعہ والوں نے وزیر اعظم کو بالکل مختلف پایا۔ لڑکوں میں اس زمانے میں ایجی ٹیشن تھا اس لیئے انھوں نے پروگرام بنایا تھا کہ وہ کنونشن میں گڑبڑ کریں گے خفیہ پولیس کو اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ چنانچہ ایسے تمام طالب علموں کے پیچھے پولیس کے جوان موجود تھے۔ جوں ہی انھوں نے شور و غل کا آغاز کیا، منہ پر ہاتھ رکھ کر انھیں پکڑ کر باہر لے گئے جہاں خدمت کے لیئے پولیس کی لاریاں کھڑی ہوئی تھیں۔ بس ایسا معلوم ہوا کہ ایک حرکت مذبوحی ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مرارجی ڈیسائی نے اندازہ کر لیا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے سختی سے ڈانٹا اور کہا جس تعلیمی ادارہ کے طالب علموں کو آداب معاشرت نہ آتے ہوں اُن اداروں کو بند کر دینا چاہیئے جیسا کہ میں نے چانسلر کی حیثیت سے ودیا پیٹھ (گجرات) کو کیا ہے۔ ہماری یادوں میں یہ پہلا کنونشن تانہ تھا۔ جب اندرا جی آئی تھیں اور جامعہ کو پانچ لاکھ روپے کی خطیر رقم کا عطیہ دیا تھا۔ مرارجی بھائی نوقع

سے فائدہ اٹھا گئے۔ ہمیں مانگنے کی ہمت نہ ہوئی انھیں دینے کی توفیق نہیں ہوئی۔ اس کے بعد چائے کے موقع پر بھی وہ بدحظ ہی سے رہے۔ صرف سنترے کے ایک گلاس عرق پر اکتفا کیا۔ البتہ جب میں نے ان کے 'پیشاب' کے ذریعے علاج کا تذکرہ کیا (جس کے بارے میں ان کا حال میں کتابچہ شائع ہوا تھا اور میں نے خاص طور پر خرید کر پڑھا تھا) تو ان کے خشک چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

دوسری شخصیت جن کا میرا ساتھ پونے پانچ برس تک رہا، قدوائی خاندان کے ایک فرد مدحت کامل قدوائی تھے۔ وہ مجیب صاحب کے زمانے سے اعزازی خازن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ سعودی عرب میں ہندوستان کے سفیر رہ چکے تھے اور اب ویسٹ اینڈ میں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ میرے انتہائی ہمدرد اور خیر خواہ تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ میں یہاں وائس چانسلر کی مدد کے لیے آیا ہوں نہ کہ روڑے اٹکانے کے لیے۔ چنانچہ مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں پڑتا جب میرا ان کا اختلاف ہوا ہو۔ چوں کہ ان کے جامعہ برادری سے تعلقات وسیع تھے اس لیے ان کے ذریعے اکثر انتظامی معاملات سلجھانے میں مدد ملتی تھی۔

میرے سکریٹری عبداللطیف اعظمی بھی ایک 'کردار' تھے وہ مجھے مجیب صاحب سے ورثہ

میں ملے تھے۔ جامعہ والوں کا خیال تھا کہ ہر وائس چانسلر کو انھیں 'بھگتنا' پڑتا ہے۔ اس پر مجھے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا اپنے سکریٹری الیاس مجیبی صاحب کے بارے میں یہ کہنا یاد آجاتا تھا کہ "ہماری تخلیق کا تو واحد مقصد یہ ہے کہ ہم مجیبی صاحب سے نبھائے چلے جائیں!"

خیر میرے سلسلے میں یہ نوبت نہیں آئی۔ چوں کہ میں لطیف صاحب سے پہلے سے واقف تھا اس لیے وہ دوستی اور احترام کے باریک فرق کو سمجھتے تھے۔ وہ جامعہ کے اُن چند لوگوں میں تھے جن پر میں مکمل اعتماد رکھتا تھا اور جنھوں نے وفاداری کا حق بہ شرطِ استواری نبھایا۔ انھوں نے مجھے بہت سی ناخواستہ بلیات سے محفوظ رکھا۔ ان کے اسی رویے سے جامعہ برادری کے اکثر حضرات ناراض رہتے تھے۔ چوں کہ وہ اہلِ قلم بھی تھے اور رسالہ جامعہ کا بیشتر کام وہی کیا کرتے تھے۔ میں نے مجلس عاملہ میں ایک ریزولیوشن پیش کرکے انھیں رسالہ جامعہ کا نائب مدیر بنا دیا، جو وہ تاحال ہیں۔ رسالہ جامعہ اب تک انھیں کے دم سے پابندی سے نکل رہا ہے

جامعہ کے قیام کے آخری سال میں میں یکم اکتوبر ۷۷ء کو مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے ساٹھ سال کی عمر پہنچنے پر سبک دوش ہو گیا۔ ابھی جامعہ میں میری ملازمت کا تقریباً ایک سال باقی تھا، جس کے ۹ مہینے میں نے مکمل کیے اور ۱۵ اگست ۷۸ء کو دو سال کی بازملازمت پر پھر علی گڑھ آگیا۔

اس سال کا ایک اہم واقعہ دسمبر ۷۷ء میں میری بڑی بیٹی فریدہ کی شادی ہے۔ اس نے علی گڑھ سے باٹنی میں فرسٹ کلاس ایم۔ایس۔سی۔ کرنے کے بعد جامعہ کے ٹریننگ کالج سے بی ایڈ کر لیا تھا۔ اس کے کئی پیغام آئے۔ بالآخر نسبت ڈاکٹر عبدالرشید سے قرار پائی جو مرکزی سرکار کے شوگر کین انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ میں سائنس داں کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شادی کی رسم بڑی سادگی کے ساتھ ادا کی گئی اور اس کے بعد میری بیوی نے اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ رشید بہت سعادت مند نوجوان ہیں۔ مشرقی یوپی۔ کے ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں لیکن حالات کی مجبوری کے تحت انھیں اردو لکھنے پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ میں انھیں ان کی اردو 'ندانی' پر اکثر آڑے ہاتھوں لیتا ہوں۔ ایک دن ان سے میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ "اس خطے کا کوئی مسلمان اگر اردو سے بے بہرہ ہوتا ہے

تو وہ مجھے مسلمان ہی معلوم نہیں ہوتا۔ "اقبال سے معذرت کے ساتھ:

؎ کافر ہے اردو، ہوں میں دیکھ مرا ذوقِ شوق!

میں نے اپنی تعلیمی ملازمت میں بچیوں کے لیے زیادہ پس انداز نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کو اعلیٰ تعلیم دلا دینا ہی کافی ہوگا۔ لیکن ہندوستانی سماج میں یہی سب کچھ نہیں۔ بہرحال یہ میری بیوی کی کفایت شعاری کی (جو مجھ سے نظر بچا کر کی جاتی تھی) بدولت تھا کہ ہم لوگ اپنی چار بچیوں کے ساتھ تھوڑا بہت کر سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں ہم سے بہت تقاضے بھی نہیں ہوئے۔ لیکن سماجی روابط میں بغیر تقاضے کے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ اس کا انتظام میری بیوی نے 'خفیہ کفایت' کے ذریعے کر دیا۔ اس طرح کہ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ میری تنخواہ میں غالب سا کوئی ساہوکار بھی شریک ہو گیا ہے۔

اسی زمانے میں ترقی اردو بورڈ (ختم شد) سے میرا تعلق گہرا ہو گیا۔ میں ۱۹۷۳ء سے اس کے اردو لغت کے منصوبے میں بحیثیت ایک ایڈیٹر کے اس کی تیسری جلد (د تا س) پر کام کر رہا تھا۔ میرے اسسٹنٹ جنیدی صاحب مع ساز و سامان کے علی گڑھ سے منتقل ہو کر میرے ساتھ جامعہ نگر آ گئے تھے لیکن ان کی مسلسل علالت اور میری انتظامی مصروفیات کی بنا پر اس میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہو سکی۔ جنیدی صاحب کے علی گڑھ واپس چلے جانے کے بعد میں نے مسعود ہاشمی صاحب کا انتخاب کیا۔ وہ صلاحیت کے آدمی ثابت ہوئے اور جب میں ۱۹۷۸ء میں علی گڑھ منتقل ہو گیا تو اس کے بعد بھی کام کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے "اردو لغات کا تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے میرے ساتھ پی ایچ ڈی میں داخلہ لیا۔ جامعہ ملیہ کی مجلسِ تعلیمی نے خصوصی طور پر علی گڑھ منتقل ہو جانے کے بعد بھی مجھے بدستور نگراں رکھا۔ اب اس مقالے پر انھیں پی ایچ ڈی کی ڈگری مل گئی ہے۔

۱۹۷۳ء ہی سے میں لسانیات کی اصطلاحات کمیٹی کا صدر مقرر کر دیا گیا تھا۔ اس عرصے میں علی گڑھ اور جامعہ ملیہ میں اس کے کئی جلسے ہوئے اور وضع شدہ اصطلاحات کا پہلا مسودہ تیار کر لیا گیا۔ پہلے مسودہ کی تیاری میں ڈاکٹر محمد ذاکر اور آخری میں ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ

سے کافی مدد ملی۔ اصطلاحاتِ لسانیات کا یہ کام میری صدارت میں مکمل ہو کر بیورو کی جانب سے شایع ہو چکا ہے۔ اس پر میں نے بڑی محنت کی ہے۔ اس کے اراکین بدلتے رہے لیکن میں شروع سے آخر تک صدر کی حیثیت سے اس کا ذمہ دار رہا۔ ان کو وضع کرتے وقت پہلی بار اندازہ ہوا جب تک ایک طرف اس علم کے تصورات پر عبور نہ ہو اور دوسری طرف ہماری اصطلاحات سازی کے لیئے خاص طور پر عربی زبان کے مادوں سے واقفیت نہ ہو، اس وقت تک آپ اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ اس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ اردو اصطلاحات سازی میں نہ تو بول چال کی زبان سے کام چلتا ہے اور نہ سنسکرت کے مادوں اور تراکیب سے۔ بین الاقوامی اصطلاحات بھی زیادہ ساتھ نہیں دیتی خاص طور پر جب مرکبات سے سابقہ ہو۔

۱۹۷۷ء میں جنتا گورنمنٹ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ہر شعبے میں اُلٹ پلٹ کی گئی ترقی اردو بورڈ (بیورو) کی تنظیم بھی از سرِ نو کی گئی یعنی تنخواہ دار ڈائرکٹر کے بجائے حسبِ سابق اعزازی نائب صدر کا عہدہ پھر قائم اس عہدہ پر پہلے جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب عرصے تک کام کر چکے تھے۔ اس روایتِ دیرینہ کے پیشِ نظر ۱۹۷۸ء میں اس پر میرا تقرر ہو گیا لیکن جنتا سرکار کے ہٹتے ہی بیورو کی تنظیم میں تبدیلی کر کے پھر تنخواہ دار ڈائرکٹر کا عہدہ قائم کر دیا گیا۔

جامعہ اردو علی گڑھ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پہلی بار میرا انتخاب ۱۹۷۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۷۶ء – ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۲ء اور ۱۹۸۴ء میں مسلسل میرا انتخاب ہوتا رہا۔ اس طرح اس ادارے سے میری وابستگی کے ۱۵ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اتنی طویل مدت کے لیے کوئی دوسرا شخص شیخ الجامعہ نہیں رہا ہے۔ مختلف اوقات میں نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میرے ساتھ ڈاکٹر عتیق صدیقی (۷۵ تا ۸۰ء) اور پروفیسر عبد العظیم صاحب نے (۸۱ تا ۸۶ء) کام کیا۔ اعزازی خازن کی حیثیت سے جنیدی اور الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی صاحب (۷۵ تا ۸۵ء) نے کام کیا اور ۸۶ء سے ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ صاحب اس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ اردو کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے میں نے کیا خدمات انجام دی ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ آگے آئے گا۔

چودھواں باب

علی گڑھ (۵)

(۷۸ تا ۱۹۸۶)

۱۶ اگست ۱۹۷۸ء کو میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی باز ملازمت میں آگیا۔ کچھ عرصے کے بعد لسانیات کے شعبے کے نئے پروفیسر اور صدر میرے پرانے شاگرد ڈاکٹر عبدالعظیم بھی نیویارک سے آگئے۔ اُن کا اس جگہ پر تقرر میری ہی تحریک پر ہوا تھا، حالاں کہ وہ امریکہ میں صرف عارضی لیکچر تھے اور انٹرویو کے لیے بھی نہیں آئے تھے۔ اس عہدے کے دعویداروں میں میرے دوسرے شاگرد ڈاکٹر عبدالغفار شکیل بھی تھے، جو میری غیر حاضری میں پانچ سال تک ریڈر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ وہ اوسط درجے کی صلاحیت کے استاد تھے اور اسی وجہ سے عبدالعظیم صاحب کو ترجیح دے کر ڈبل پروموشن کے ذریعے پروفیسر بنا دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ غفار شکیل صاحب اس تبدیلی کو خوش دلی کے ساتھ قبول کریں گے اور میری موجودگی میں دونوں کے تعلقات ہموار رہیں گے۔ لیکن معاملہ برعکس نکلا۔ انھیں علم سے زیادہ اپنی زیادہ عمر پر ناز تھا۔ چنانچہ اُن کے ذہن پر 'مظلومیت' کی نفسیات طاری ہو گئی۔ اور انھوں نے نہ صرف شعبے کے کاموں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی بلکہ رفقائے شعبہ سے (بہ شمول میرے) ہر قسم کے تعلقات ختم کر لیے۔ طالب علموں کو پڑھانے میں گریز کرتے تو اپنی 'مظلومیت' کی داستان سنانے لگتے:

یہ دیکھ کر میں بھی کنارہ کش ہو گیا اور اپنے علمی کاموں میں، جو قیام جامعہ ملیہ میں صفر ہو گئے تھے، تیزی کے ساتھ منہمک ہو گیا۔ چنانچہ انھیں چند سالوں میں میں نے روشن عملی سہارنپوری کا عاشورنامہ مرتب کرکے شعبے کی جانب سے شائع کیا۔ تدریس کے لیے تاریخ زبان اردو کے علاوہ اسلوبیات کو اپنا مخصوص میدان بنایا۔ اور اس نقطۂ نظر سے کئی اجتہادی مضامین لکھے۔ میری ہی تحریک پر میرے ایک شاگرد، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سولن کے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کی پرنسپلی چھوڑ کر شعبۂ لسانیات میں لکچرر کی حیثیت سے آئے۔ انھیں ریڈر کی تنخواہ تو دے دی گئی لیکن اس کا منصب نہ مل سکا۔ خیال تھا کہ چند سالوں میں اس کی بھی صورت نکل آئے گی

وہ اب تک لکچرر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے ذہین، محنتی اور فرض شناس استاد ہیں اور میرے خیال میں ان کا معاملہ

ع ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے ست

کا ہے۔ لسانیات کے استاد اور تحقیق کے نگراں کی حیثیت سے جوں جوں ان کی شہرت بڑھی وہ حسد کا شکار ہوتے گئے۔

بے انصافی ہو گی اگر یہاں میں نئے صدر شعبہ پروفیسر عبدالعظیم کا ذکر قدرے تفصیل سے نہ کروں جنھیں بڑی توقعات کے ساتھ شعبۂ لسانیات کی صدارت پر لایا گیا

ان کے تعلیمی کیریئر کی ابتدا ایک عزیز شاگرد کی حیثیت سے ہوئی۔ میں نے انھیں بی اے کی کلاس میں دریافت کیا۔ میں ان کی لگن، محنت اور بعد کے سخت حالات سے، جن سے وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے بے حد متاثر تھا۔ جیسے جیسے ان کے ذاتی حالات سے واقف ہوتا گیا میری ہمدردی بڑھتی گئی

مجھے اس بات کا بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کا ادبی ذوق بہت معمولی ہے اس لیے ان کی توجہ لسانیات کی طرف کرائی جس کے لیے ان کے ذہن کی ساخت اور

سخت محنت کرنے کی عادت مناسبت رکھتی تھی۔ چنانچہ اردو ایم۔ اے میں میرے ساتھ
تاریخِ زبانِ اردو کا کورس کرنے کے بعد میری ہی تحریک اور مدد سے وہ میسور کے لسانیات
کے سمر اسکول تک پہنچے۔ ۱۹۵۸ء میں میں امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے ۱۹۶۰ء میں جب واپس
آرہا تھا تو ڈاکٹر جان گمپرز نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں ایک ایسا اسسٹنٹ دوں جو لسانیات
سے بھی واقف ہو، اردو کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو اور اردو ٹائپنگ بھی جانتا ہو۔ ان کے
پیشِ نظر برکلے یونیورسٹی (کیلفورنیا) کے اردو نصابات کی تیاری کا منصوبہ تھا۔ میں نے
عظیم صاحب کے نام کی سفارش کی۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر گمپرز نے انھیں برکلے بلا لیا۔ وہاں
ساؤتھ ایشین اسٹیڈیز کے شعبے کے تمام اساتذہ کا دل انھوں نے اپنی محنت سے جیت لیا۔
اس کے بعد انھوں نے اپنے بال بچوں کو بھی بلا لیا اور کولمبیا یونیورسٹی (نیو یارک) منتقل
ہو گئے۔ جہاں پروفیسر ولیم ڈائی ور کے ساتھ پی ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ چوں کہ اس عرصہ میں
ان کی زیادہ توجہ کمائی اور اپنے بچوں کی تعلیم کی جانب رہی اس لیے پی ایچ۔ ڈی کا کام بہت
سست رفتاری سے کرتے رہے۔ ۱۹۷۳ء میں میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہو کر دہلی چلا
گیا اور ڈاکٹر عبدالغفار شکیل میری جگہ بحیثیت ریڈر اور قائم مقام صدر شعبہ کی حیثیت سے
کام کرتے رہے۔ اسی عرصے میں شعبۂ لسانیات میں ایک اور پروفیسری کی جگہ منظور ہوئی۔
پروفیسر خسرو نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے بلا تکلف عبدالغفار شکیل صاحب کے مقابلے
میں عظیم صاحب کا نام پیش کیا۔ اس وقت وہ کینا اسی یونیورسٹی میں عارضی لکچرر تھے۔
میرا خیال تھا کہ انھوں نے اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کر لی ہے۔ لیکن یہ راز بعد کو کھلا کہ انھوں نے
اس کام کو ختم تو کر لیا تھا لیکن جب ان کا تقرر ہوا ہے اس وقت تک انھوں نے پی ایچ۔ ڈی
کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی۔

پروفیسر خسرو نے میری رائے پر اعتماد کرتے ہوئے غیر حاضری میں ان کا پروفیسری پر
تقرر کر دیا۔ میں بھی انتخاب کمیٹی کا رکن تھا۔ جب انھیں اس تقرر کی اطلاع کینیڈا میں ملی تو
انھوں نے وہاں سے مجھے ٹیلیفون کیا اور اپنی پی ایچ۔ ڈی کے بارے میں تفصیلات
بتائیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین پر اسی وقت

تک قدم نہ رکھیں جب تک انھیں پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری نہ مل جائے۔ اس کے بعد انھوں نے یونیورسٹی سے تین ماہ کی مہلت مانگی اور شب و روز محنت کے بعد ڈگری حاصل کرلی۔ چنانچہ جب اکتوبر ۸۰ء کے آخر میں وہ علی گڑھ پہنچے تو سند یافتہ تھے۔ میں جامعہ سے فارغ ہوکر ۱۵ اگست ۸۰ء ہی کو اپنی باز ملازمت پر علی گڑھ پہلے سے پہنچ چکا تھا۔

عظیم صاحب کا دورِ صدارت ابتدا میں بہت اچھا رہا سوائے اس کے عبدالغفار شکیل نے ان کے تقرر کو عقلی یا جذباتی طور پر بھی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ شعبے کے ہر کام سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوسرے شعبوں میں جاکر ہم سب کے خلاف پروپگنڈا کرنا ان کا معمول ہوگیا۔ اسی زمانے میں میرے مشورے سے عظیم صاحب شعبے کے ایک گمشدہ لعل کو (میری مراد ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ سے ہے) سولن کے اردو ٹیچنگ اور ریسرچ سینٹر سے واپس لائے۔ وہ وہاں پرنسپل سینٹر کی حیثیت سے ریڈر گریڈ کی تنخواہ پا رہے تھے لیکن تحفظِ شاہرہ کی شرط پر وہ شعبۂ لسانیات کی لکچراری پر آنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ خیال تھا کہ تنخواہ تو انھیں ریڈر کی مل ہی گئی ہے ریڈر کا منصب بھی بہت جلد مل جائے گا۔

اب عظیم صاحب تدریس و تحقیق کے بجائے فیکلٹی آف آرٹس کے انتظامی امور میں زیادہ دلچسپی لینے لگے۔ اس کے لیے ضروری ہوگیا کہ وہ فیکلٹی کی سیاست میں سرگرم حصہ لیں اور اسی نسبت سے دوست اور دشمن بنائیں۔ انھیں سیاست کا چسکا شاید اس وجہ سے بھی لگا کہ انھیں غفار شکیل صاحب کے ہمہ وقتی پروپگنڈے کا جواب دینا بھی ضروری ہوگیا۔ بعض صدور شعبہ نے شکیل صاحب کا پارٹ لیا۔ اس طرح فیکلٹی آف آرٹس سیاست کا اکھاڑہ بن گئی۔ جنوری ۸۶ء میں عظیم صاحب ڈین بھی بن گئے

میں شعبے سے دو سال باز ملازمت پر اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر رہنے کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر سبک دوش ہوچکا تھا۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل' اب دیکھنے کی مروت بھی باقی نہیں رہی۔ اس زمانے میں وہ مجھ تک سے مربیانہ انداز کا برتاؤ کرنے لگے۔ مثلاً کبھی کہتے میں لنگوئسٹک سوسائٹی کا نام مسعود حسین لنگوئسٹک سوسائٹی کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی لاسا لگاتے کہ وہ میری ایک تعویر

بانی/صدر شعبہ کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات کے سیمینار میں ٹانگنا چاہتے ہیں۔ میں قبل از وقت
متشکرانہ نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے بعد اپنے اوپر لعنت بھیجتا کہ میری اب یہ اوقات
رہ گئی ہے!

مجھے ان واقعات اور بدلتے ہوئے حالات سے سخت تشویش رہتی۔ بالآخر میں نے اپنی
ہمدردی کا وزن اپنے محروم طلبہ اور بیگ صاحب جیسے اساتذہ کی جانب ڈال دیا۔ چنانچہ دو
ایک ملاقاتوں میں میں نے عظیم صاحب سے کھل کر باتیں کیں اور آخر میں صاف صاف
کہہ دیا کہ کسی انسان کو خود کو خدا نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ذہن کی اسی بحرانی کیفیت میں جب
لسانیات کی ایک انتخابی کمیٹی میں ڈاکٹر ہنس راج ڈار کا تقرر ان کی سخت مخالفت کے
باوجود ہو گیا تو انھوں نے اگست ۱۹۸۷ء میں یونیورسٹی کے پروفیسر اور جامعہ اردو کے

نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے استعفا دے دیا ۔ ہمدردوں کی دوڑ دھوپ سے انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے تو اپنا استعفیٰ واپس لے لیا لیکن چوں کہ اس قسم کی کوئی کوشش جامعہ اردو کے سلسلے میں نہیں ہوئی وہ کچھ عرصے کے بعد منظور کر لیا گیا ۔

اس کے بعد انھوں نے میرے یہاں کا آنا جانا بند کر دیا لیکن میری جانب ان کا احترام کا جذبہ قائم رہا ۔ کچھ عرصے بعد غالباً میرے احسانات کا بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے شعبۂ لسانیات سے مجھے پروفیسر ایمریٹس بنانے کی تجویز منظور کرائی جو فیکلٹی اکیڈمک کونسل سے متفقہ طور پہ پاس ہوتی ہوئی بالآخر جولائی ۸۷ء میں یونیورسٹی کی ایگزیکیٹو کونسل نے منظور کر لی ۔ عظیم صاحب اب خواہش مند تھے کہ میں پروفیسر ایمریٹس بننے پر ایک خطبہ دوں ۔ جو میں نے "اردو زبان : تاریخ، تشکیل، تقدیر" کے عنوان سے ۱۳ر جنوری ۸۸ء کو وائس چانسلر سید ہاشم علی کی صدارت میں دیا ۔ اس میں میں نے ببانگِ دہل کہا کہ "سر سید تا حال علی گڑھ نے اردو کے حق کو ادا نہیں کیا ہے" مجھے نہیں معلوم اس کا مجموعی اثر مجمع پر (جو بڑی تعداد میں تھا) کیا پڑا لیکن سید ہاشم علی نے خطبے کے اختتام پر یہ کہا کہ ان کے پیشِ نظر اردو کرسپانڈنٹ کورس کی تجویز ہے ۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ عظیم صاحب اور میرے تعلقات میں جو کشیدگی آ گئی تھی وہ دور ہو چلی ہے ۔ پروفیسر ایمریٹس کی حیثیت سے شعبۂ لسانیات میں میرے لیے ایک کمرہ بھی مخصوص کر دیا گیا ۔ میں نے وہاں جانا شروع کر دیا کہ بدقسمتی سے وہ واقعہ پیش آیا جس کی بدولت ہم ایک دوسرے سے اور زیادہ دور ہو گئے ۔ ۱۶ر فروری ۸۸ء کو لسانیات کی پروفیسری کا انٹرویو تھا ۔ بہت دنوں کے بعد اس بار سید ہاشم علی صاحب نے مجھے بھی اس کمیٹی کا رکن نامزد کیا ۔ میں نے کمیٹی کے سامنے بیگ صاحب کا معاملہ بالتفصیل زوردار طریقے پر پیش کیا ۔ دو ہی امیدوار تھے، ڈاکٹر اقتدار حسین خاں اور ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ ۔ ڈاکٹر اقتدار حسین، بیگ صاحب سے صرف دو سال سینیئر تھے لیکن بیگ صاحب شعبۂ لسانیات کے پہلے پی ایچ ۔ ڈی تھے ۔ انھوں نے ڈاکٹر اقتدار حسین خاں سے چار سال اور عظیم صاحب سے ۲ سال قبل حاصل کی تھی ۔ وہ سولن کے اردو ریسرچ سنٹر کی پرنسپلی کو چھوڑ کر یہاں آئے تھے

ں کا گریڈ ریڈر کے برابر تھا۔ میں نے یہ بھی کہا کہ اقتدار حسین خاں پروموشن کی پروفیسری
کے مستحق بن چکے ہیں اور اس پر بآسانی ہو جائیں گے۔ دوسری جگہ پر بیگ صاحب کو کر دیا جائے
ملازمت میں کھانچا پڑ جانے کی وجہ سے پروموشن اسکیم سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے

میری ایک

نہ ملی اور وائس چانسلر نے یہی فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر اقتدار حسین کا اس پروفیسری پر تقرر
کر دیا جائے۔ میں اس بے انصافی کو (جو بیگ صاحب اور شعبۂ لسانیات دونوں سے تھی)
برداشت نہ کر سکا اور مجھے اپنے ضمیر کو اختلافی نوٹ لکھ کر سبک سار کرنا پڑا۔
میری پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی اور یو۔جی۔سی سے پروموشن اسکیم میں توسیع کی اجازت
دو ہفتے کے اندر آ گئی! اگر میری تجویز کو مان لیا جاتا تو اقتدار حسین خاں صاحب اور بیگ صاحب
دونوں اسی وقت پروفیسر ہوتے اور شعبۂ لسانیات کا وقار بڑھ جاتا۔

میرے اوپر عظیم صاحب کی کارگزاری اور وائس چانسلر کے فیصلے کی کمزوری دونوں
کا بڑا اثر پڑا اور میں نے طے کر لیا کہ اب عظیم صاحب سے مصالحت کی کوئی شکل ممکن نہیں۔
مگر واہ ری   کسی نے کہا کہ بیگ نے باپ کو بیٹے سے لڑوا دیا۔ کسی نے کہا
کہ بیگ نے میری ساری عمر کی ریاضت برباد کر دی۔ اس ریاضت ایک بار پھر با کار بنانے
کا یہ منصوبہ بنایا گیا کہ مجھے 'نذرِ مسعود' کے نام سے ایک جلد پیش کی جائے۔ فوراً ایک
کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس میں بیگ صاحب کے علاوہ شعبے کے سارے اساتذہ کو شامل
کیا گیا۔ باہر سے پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر اصغر عباس کے نام
شامل کئے گئے۔ اتفاق سے جس روز مشورت کمیٹی کی پہلی میٹنگ تھی اس سے دو روز قبل
سرور صاحب میرے یہاں آئے اور اس تجویز کا تذکرہ کیا۔ میں نے ان سے احترام کے ساتھ
کہا۔ نذر تو اس وقت نذر ہوتی ہے جب قبول کر لی جائے جب میں اسے قبول کرنے کو تیار
نہیں تو اس سعیِ رائیگاں سے کیا حاصل۔ انھوں نے میرا اشارہ پا لیا اور عظیم صاحب کو تیسرے
روز میٹنگ سے قبل میری نیت اور اپنی معذرت لکھ بھیجی۔ کچھ اسی قسم کی گفتگو میں نے

مختارالدین صاحب سے بھی کی تھی۔ لیکن انھوں نے اس کے باوجود مشورت کے جلسے میں شرکت کی اور سرور صاحب کی رائے سن کر ایک بہت اچھی پیالی چائے کی پی کر فرحاں و شاداں میرے یہاں آئے! ور ساری تفصیل سنائی۔ سنا ہے موصوف نے شام کو سرور صاحب کے یہاں پھر دھاوا بولا اور بربنائے اس خلوص کے جو انھیں مجھ سے ہے ان کو میرے اوپر اثر انداز ہونے کے لیے آمادہ کرنا چاہا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

خاندانی محاذ پر اس زمانے میں میں نے اپنی دوسری بیٹی نادرہ کی (جس نے انگریزی میں فرسٹ کلاس ایم۔اے۔ کیا تھا) شادی سے فراغت حاصل کی۔ اس کا امتحان صرف ایک دن پہلے ختم ہوا اور دوسرے دن ناصر محمد خاں سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ اس کے نانا قدوس عالم خاں صاحب سب کے لیے یہ نئی بات تھی کہ لڑکی نہ مایوں میں بیٹھی اور نہ اور رسمیں ہوئیں اور سیدھی دلہن بنا دی گئی۔ میں نے اب اپنی بچیوں کی شادی کے لیے ایک نئی تکنیک ایجاد کی۔ یعنی یہ گھر کے آنگن میں ہوگی اور اس میں دونوں طرف سے مدعوین کی تعداد اس قدر محدود ہوگی کہ نکاح تا کھانا سب گھر کے اندر کیا جا سکے۔ مجھے خوشی ہے کہ ناصر محمد خاں کے والد فضل محمد خاں (مرحوم) نے اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کیا، اس طرح فریقین بے جا اسراف سے بچ گئے۔ ناصر محمد خاں، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ ہیں اور اس وقت جدّہ میں سول انجینئر کی حیثیت سے ایک فرم میں کام کر رہے ہیں۔ نادرہ کی شادی میں جو طرز قائم ہو گیا اسی انداز پر میں نے ۸۲ء میں باقی ماندہ دونوں بچیوں کا نکاح کیا۔

پندرھواں باب

"رخت بہ کاشمر کشا....."

(۱۹۸۱ تا ۱۹۸۲ء)

پچھلے باب کی داستان میں تسلسل کی خاطر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۸ء تک لے آیا ہوں۔ لیکن اس مدت میں چند اور واقعات رونما ہوئے جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے۔

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ۱۹۷۸ء میں جامعہ ملیہ سے واپس آکر میں نے دو سال تک شعبۂ لسانیات میں باز ملازمت کی جس پہ میرا تقرر پروفیسر علی محمد خسرو نے کیا تھا۔ نئے وائس چانسلر سید حامد باز ملازمت کے بارے میں زیادہ گرم جوش نہیں تھے اس لیے جب پروفیسر عبدالعظیم نے میری دو سال کی مدّت میں مزید توسیع کی خواہش کی تو انھوں نے باوجود ہمدردی کے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ ایک دو ماہ تک میں بیکار رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۸۱ء میں اچانک پروانہ ملا کہ مجھے سال بھر کے لیے اپنے ہی شعبے میں وزٹنگ پروفیسر بنا دیا گیا ہے۔ یو۔ جی۔ سی کے قاعدے کے مطابق جس یونیورسٹی میں کسی نے ملازمت کی ہو وہاں اُسے وزٹنگ پروفیسر نہیں بنایا جاتا۔ بعد کو معلوم ہوا اس کے لیے سید حامد صاحب نے خاص طور پر یو۔ جی۔ سی کو لکھا تھا اور وہاں اس شرط کے ساتھ منظوری ملی تھی کہ اسے آئندہ کے لیے نظیر نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس طرح میں

مزید سال پھر شعبۂ لسانیات سے منسلک رہا۔ آخر کار ستمبر ۱۹۸۱ء میں مسلم یونیورسٹی کی ملازمت سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا۔

دورانِ ملازمت مسلسل آمد و رفت کی وجہ سے میرے ریٹائرمنٹ بے نی فٹس پر بُرا اثر پڑا۔ جب ۱۹۶۸ء میں عثمانیہ سے علی گڑھ واپس آیا تو اس وقت تک پنشن اسکیم آچکی تھی۔ میرے ریٹائر ہونے میں اس وقت ۹ سال دو مہینے تھے۔ اس خیال سے کہ تعلیمی سال کے دوران ریٹائر ہونے والوں کو سال کے آخر تک توسیع خود بخود مل جاتی ہے۔ میں نے پنشن اسکیم کا انتخاب کیا۔ پنشن کے لیے کم از کم دس سال کی مدّتِ ملازمت درکار ہے۔ میری شومئی قسمت دورانِ ملازمت قاعدوں میں تبدیلی ہوئی اور توسیعِ ملازمت کا طریقہ ختم کر کے بازملازمت کا جاری کیا گیا۔ بازملازمت کی مدّت کا شمار پنشن کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اس طرح دس سال کی مدت میں میرے دس مہینے کم رہے۔ مجھے اب پراوِڈنٹ فنڈ کی اسکیم میں پھر جانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں پنشن کے حقوق سے کلیتہً محروم رہ گیا۔ قسطوں میں جو پراوی ڈنٹ فنڈ ملتا رہا وہ خرچ ہوتا رہا۔ اس سے واحد فائدہ میں مکان کی تعمیر میں اٹھا سکا۔ جس کے لیے میں نے ۱۹۵۵ء میں بہت سستے داموں دو بیگھہ کا پلاٹ یونیورسٹی کیمپس کے بالکل قریب خرید لیا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی سے جب ۱۹۸۱ء میں مکمل طور پر سبکدوش ہوا ہوں تو میرے پاس پراوی ڈنٹ فنڈ کے چند ہزار کی رقم کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ہمیشہ اچھا کھایا اُجلا پہنا، اس لیے پس انداز کچھ نہ کر سکا۔

علی گڑھ کے شعبۂ لسانیات میں میری وزٹنگ پروفیسری کی مدت ختم ہوئے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ کشمیری یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں میرا تین ماہ کے لیے بحیثیت وزٹنگ پروفیسر تقرر ہو گیا۔ میں وہاں ستمبر ۸۲ء کے وسط میں پہنچا اور ۱۵ دسمبر تک فرائض انجام دیئے۔ چلتے وقت یونیورسٹی نے مارچ ۸۳ء سے ایک تعلیمی سال کے لیے پھر اس حیثیت میں میرے تقرر کی توسیع کی۔ دو حصّوں میں میرا تقرر صرف تعطیلات کی تنخواہ بچانے کی نیت سے کیا گیا۔

میں اس پر بھی خوش تھا، دو وجہوں سے، ایک تو لسانیات سے مجھے ایک بار پھر شعر و ادب کی جانب گریز کرنے کا موقع ملا اور دوسری خوشی کی بات میرے لیے یہ تھی کہ جنتِ ارضی میں ایک بار پھر طویل قیام کا موقع مل گیا۔ تکلیف صرف کھانے کی تھی۔ ابتدا میں میں نے گیسٹ ہاؤس کے میس میں کھانا شروع کیا لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ گاڑی یوں نہ چل سکے گی۔ چنانچہ مارچ ۸۳ء میں تعلیمی سال کے آغاز سے میں نے طے کر لیا کہ اب دستِ خود دہانِ خود کا تجربہ رہے گا۔ کھانا پکانے کے فن سے میں قطعاً ناواقف ہوں۔ اس سلسلے میں میں نے ایک اچھے برہمن کی طرح ہمیشہ اپنی نصف بہتر کا سہارا لیا ہے جو اتفاق سے اس فن کی ماہر ہیں۔ ہمیشہ انھیں کے ہاتھ کا پکایا کھایا، حالاں کہ میں اس طبی قول سے واقف ہوں کہ "حملۂ قلب" کو دعوت دینا ہو تو ایک خوب صورت اور عمدہ کھانا پکانے والی عورت سے شادی کر لو"۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ دونوں صفات سے متصف ہونے کے باوجود میری بیوی میرے لیے 'دل شکنی' کا باعث اب تک نہیں ہوئیں، بلکہ ہمیشہ راحتِ جاں کے ساتھ ساتھ قوتِ دل کا باعث بنی رہیں۔ بہرحال اس زمانے میں طباخی کے نئے نئے تجربے خوب ہوئے۔ گوشت تو 'مینو' سے قطعاً خارج رہا۔ لیکن ارہر کی دال پکاتا تو مونگ کی دال بن جاتی۔ تنگ آ کر دودھ، ڈبل روٹی اور انڈے پر اکتفا کیا۔ البتہ خشک، تازہ میوہ جات کا کثرت سے استعمال رہا۔ کچھ ہی عرصے میں تقلیلِ بدن کا عمل شروع ہو گیا اور تخفیص نکل آئی لیکن صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا۔ ہلکا پھلکا ہونے کے ساتھ چاق چوبند محسوس کرنے لگا، ناشپاتی اور بگوگوشوں نے گالوں پر غازہ سا پھیر دیا۔ ہماری فاقہ مستی اس طرح رنگ لائی۔ جون ۸۳ء میں بچے آ گئیں، اور خاں صاحب کا پھر 'ٹھاٹھ' کھانا شروع ہو گیا۔ کشمیر کا گوشت دبشرطیکہ وہ کشمیری بھیڑ کا ہو، پنجابی بھیڑ کا نہیں، نہایت عمدہ ہوتا ہے۔ بجلی کے اسٹوو ہی پر بچے اپنے فنِ طباخی کا کمال دکھانے لگیں؛ اس طرح کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کی طالبات کے لیے لنگر سا کھل گیا۔ خاں صاحب کے جسم پر 'ڈبل فوم' پھر سے چڑھنے لگا۔

اس دور کی فاقہ مستی اور لذّت پرستی یہ سب تیاری تھی علامہ اقبال کے فکر و فن سے نبٹنے کے لیے۔ چنانچہ جلد میں نے مکمل دل جمعی کے ساتھ خود کو اس کام میں جھونک دیا۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ تھوڑے سے فاصلے پر اقبال لائبریری کے ایک حصے میں واقع تھا۔ یہ شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کی دور بینی اور پروفیسر آل احمد سرور کی محنت کا ثمرہ تھا۔ سرور صاحب پہلے نو قائم کردہ 'اقبال چیئر' پر ۱۹۷۷ء میں پروفیسر کی حیثیت سے آئے تھے۔ چند سال کے بعد اس نے ایک انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کر لی جہاں اقبال اور متعلقاتِ اقبال پر تحقیقی کام ہوتا تھا۔ سرور صاحب کے علاوہ یہاں

ڈاکٹر کبیر احمد جائسی اور سید محمد امین اندرابی صاحب مستقل حیثیت سے کام کر رہے۔ اور ایک جگہ وزیٹنگ پروفیسر کے لیے مخصوص تھی۔ مجھ سے قبل اس جگہ پر عالم خوندمیری منتخب کام کر چکے تھے۔ انسٹی ٹیوٹ کے پاس اقبال اور متعلقات پر مشتمل ایک اچھی لائبریری تھی جہاں پاکستانی مطبوعات اور رسائل دستیاب تھے۔ کئی طالب علم اقبال سے متعلق موضوعات پر ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی۔ کے لیے کام کر رہے تھے۔ میرے ذمہ متفرق کام تھے جن میں اپنے منتخب کردہ موضوع پر لکچر دینے کے علاوہ اقبال کے فکر و فن کے کسی موضوع پر ایک کتابچہ بھی تصنیف کرنا تھا۔ اتفاق سے سرور صاحب نے جس طالبہ طالبہ محمودی کو میری نگرانی میں دیا وہ اقبال کے تصوراتِ جمالیات پر کام کر رہی تھیں۔ انھیں معیاری کام کرانے کے لیے مجھے خود بھی اس موضوع پر مطالعہ کرنا پڑا۔ اس طرح اس مختصر سے رسالے "اقبال کی نظری و عملی شعریات" کی داغ بیل پڑی جس پر ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی نے مجھے ۱۹۸۴ء کا اردو انعام دیا۔ میں نے اس میں اقبال کے شعریاتی تصوریات سے بحث کرنے کے علاوہ لسانیاتی اسلوبیات کے نقطۂ نظر سے اقبال کے صوتی آہنگ کا جائزہ لیا ہے اور نمونۃً چند نظموں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ غالباً میری تنقید کا یہی نیا انداز تھا جس کی وجہ سے مجھے ساہتیہ اکیڈمی کے ایوارڈ کا مستحق سمجھا گیا۔

انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام سال میں ایک دو کل ہند پیمانے پر اقبال پر سمینار بھی منعقد کرائے جاتے تھے۔ جن میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ بعد کو انسٹی ٹیوٹ کے اشاعتی پروگرام کے تحت شائع ہوتا۔ اب تک اس طرح کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر لکھے ہوئے میرے بھی کئی مضامین شامل ہیں۔

کشمیر کے قیام میں میرے اندر کا شاعر آخری بار جاگ اٹھا۔ میں نے پہلا شعر ۱۹۳۲ء میں جب میں اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں کشمیر گیا تھا، کہا تھا ۔

نہیں نہیں نہیں جاتے تم اس طرف کو مگر
قدم قدم پہ یہ لرزہ قدم کا کیسا ہے

اور آخری شعر بھی وہیں ۱۹۸۲ء میں پچاس برس کے بعد کہا۔

ہر گلی کوچے میں ہر موڑ پہ وہ ہی آہٹ
کیسا یہ شہر ہے، ہر راہ میں تم ہی تم ہو!

میں نے ۱۹۵۶ء تک جو کچھ کہا تھا اس کا انتخاب 'دونیم' کے نام سے اسی سال شائع کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شعر کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ اس کا باعث کچھ میری عملی زندگی کی مصروفیات اور کچھ مطالعۂ لسانیات تھا۔ بہر حال نہیں کہہ سکتا کہ تخیل و جذبات کو ۶۲ برس کی عمر میں اس جنّتِ ارضی میں کس چیز یا 'شخص' نے مشتعل کیا کہ شعر پھر اُبل پڑا۔ شام کو میں نسیم باغ کے سامنے جھیل ڈل کے کنارے لگے ہوئے چمن میں پابندی سے ٹہلنے جاتا۔ وہیں شعر کا نزول ہوتا۔ دو غزلیں تو میں اس قطعۂ چمن میں لکھیں جہاں آج شیخ محمد عبداللہ آسودۂ خواب ہیں۔ ایک کو 'وادیٔ گل' کا عنوان دے کر میں نے دونیم کے نئے ایڈیشن (۱۹۸۶ء) کی نظموں میں شامل کر دیا اور دوسرے کو بلا عنوان کی غزل رہنے دیا۔ جیسا کہ بار بار کہہ چکا ہوں کہ میری شاعری، میری اصل خود نوشت ہے لیکن اسے بین السطور دیکھنا ہوگا:

وادیٔ گل

دیدنی دید ہے اے عمرِ رواں! کچھ بھی نہیں
یہ جہاں کتنا حسین ہے، یہ جہاں کچھ بھی نہیں
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ تماشا، یہ نگہ،
یوں تو سب کچھ ہے یہاں اور یہاں کچھ بھی نہیں
تیرے ابرو سے سوا دہ نگہِ تشنۂ خوں
تیر جب نکلا کماں سے تو کماں کچھ بھی نہیں

عمر کے فاصلے طے کر نہ سکا جذبۂ شوق
خونِ دل کچھ بھی نہیں، قلبِ تپاں کچھ بھی نہیں
ڈھونڈھئے چل کے کہیں عمرِ گذشتہ کا سراغ
کشتیٔ دل کے لیے سیلِ زماں کچھ بھی نہیں
ان نظاروں میں نظر اپنی بھی جانب مسعود
وادیٔ گل میں بجز دل کا زیاں کچھ بھی نہیں
(کشیر، ستمبر ۶۸ء)

کیا اِس میں "ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا" کی حسرت اور "دل کو خوں کرنے کی فرصت ہی سہی" کا احساس نہیں ملتا؟

یہ حسرت جب کسی "شخص" کی تمنّا کا پیکر اختیار کر لیتی ہے تو غزل کا یہ پیکر اختیار کر لیتی ہے:

ترے خیال سے رقص رواں ہے میری غزل
تری نگاہ سے اب تک جواں ہے میری غزل
یہ لفظ و معنی کا رشتہ یہ میرا، تیرا وجود
ذرا میں پیدا، ذرا میں نہاں ہے میری غزل
ہدف شناس! یہ دل تیرے انتظار میں ہے
تری نظر کے لیے تو کماں ہے میری غزل
مرے وجود میں پنہاں ہوں مثلِ آتشِ گل
مرے وجود میں جیسے نہاں ہے میری غزل
تری نگاہ نے بخشی وہ رفعتِ جذبات
کہ اس زمین میں بھی آسماں ہے میری غزل
کہاں سے اہلِ سخن لائیں طالعِ مسعود
وہاں گذر نہیں ممکن، جہاں ہے میری غزل
(کشیر، اکتوبر ۶۸ء)

لیکن یہ ۶۲ برس کی عمر کی شاعری تھی جب کہ کہا جاتا ہے کہ فنِ شعر کی عمر اس کے نصف برابر ہوتی ہے۔ محرکات موثر طریقے پر اسی وقت کارگر ہوتے ہیں جب زمین تیار ہو۔ آپ لاکھ ساٹھے پاٹھے ہوں، شعر کی دیوی کی نظر میں تو آپ کچھ سٹھیا ئے ہی کہے جائیں گے۔

کشمیر کے قیام میں مجھے کئی دلچسپ تجربے ہوئے۔ ایک تو اس زیریں رقابت کے جذبے کا احساس ہوا جو کشمیریوں اور غیر کشمیریوں کے درمیان رہتا تھا۔ یہ کبھی کبھی اخباروں کے کے مزاحیہ کالم میں اس انداز میں اُبھر آتا تھا کہ "شمالی ہند کی جتنی بوڑھی گائیں ہیں، ہماری شاداب وادی میں چرنے چلی آتی ہیں"۔ کبھی کشمیری مچھلی اور پنجابی مچھلی یا کشمیری بھیڑ اور پنجابی بھیڑ کی تفریق میں ظاہر ہوتا تھا۔ دراصل (شاید تاریخی اسباب کی بنا پر) کشمیری زبان میں 'پنجابی' 'غیر ملکی' کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک طالبہ نے مجھے بتایا کہ وہ لوگ مجھے اور سرور صاحب کو 'علی گڑھ کا پنجابی' کہتی ہیں!

اتفاق سے "شمالی ہند کی یہ بوڑھی گائیں" کشمیر۔ یونیورسٹی میں خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں! ابتداء سے وائس چانسلر بھی سب کے سب غیر کشمیری ہوتے رہے۔ جب میں وہاں تھا تو وحیدالدین ملک صاحب وائس چانسلر تھے۔ وہ زبان کے پھوہڑ تھے اس وجہ سے بھی علی گڑھ والوں کا پنجابی ہونا ثابت ہو جاتا تھا۔ ان کا اپنے رجسٹرار پر (جو کشمیری تھے) خفگی کا ایک عالم میں نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد عبداللہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ایک جلسے میں تشریف لائے تھے۔ جلسے کے بعد سب لوگوں کو اقبال لائبریری میں ایک نمائش کے افتتاح کے لیئے جانا تھا۔ ظاہر ہے وائس چانسلر صاحب شیخ صاحب کی کار میں تھے۔ کار اقبال لائبریری کے دروازے پر پہنچی۔ لوگوں نے بڑھ کر شیخ کو نرغے میں لے لیا۔ اتنے میں کار کا دروازہ جو بند ہونے کے خودکار آلے سے مسلح تھا، بند ہو گیا۔ وائس چانسلر صاحب کار کے اندر رہ گئے۔ شیخ صاحب کی پذیرائی کی گھما گھمی میں کسی نے یہ تک نہیں دیکھا کہ وائس چانسلر کہاں ہیں۔ وہ اندر سے کار کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتے

رہے مگر سیکورٹی کا یہ دروازہ کیوں کر کھلتا۔ بہرحال شیخ صاحب نے مقررہ مقام پر پہنچ کر نمائش کے افتتاح کا فیتہ کاٹا اور اسے دیکھنے کے لیے ہجوم کے ساتھ ہال کے اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت کسی کو وائس چانسلر کی غیر حاضری کا احساس ہوا تو انھیں کار کا دروازہ کھول کر لایا گیا۔ رجسٹرار یونیورسٹی شرمندہ کھڑے تھے اور وائس چانسلر صاحب نمائش کے دروازے پر کھڑے ہوئے انھیں بے نقط سنا رہے تھے۔ ایک نمائش ہال کے اندر تھی اور ایک تماشا ہال کے باہر ہو رہا تھا!

کشمیریوں کا غیر کشمیریوں کے بارے میں جو احساس تھا، میرے خیال میں اس کی ذمہ داری غیر کشمیریوں پر بھی تھی۔ وہی احساسِ برتری کا جذبہ، جس کی ہمیں شکایت انگریزوں سے رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ باہر سے آئے ہوئے لوگ جو کشمیریوں کی سطح پر اتر کر ان کے جذبات و خیالات کا احترام کرتے ہیں، وہ ان میں محترم اور عزیز رہے ہیں۔ مثلاً پروفیسر رئیس احمد کو پروفیسر وحیدالدین ملک سے زیادہ مقبول پایا۔ ایک اسلامی ذہن کے کشمیری استاد نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اسلامی شعائر کے پابند ملک سے تو کمیونسٹ رئیس احمد اچھے تھے کہ وہ انسان کی عزت کرنا جانتے تھے، اور ہمیشہ معقولیت سے کام لیتے تھے۔ شعبۂ اردو میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کو جتنی مقبولیت حاصل رہی۔ اردو کے کسی دوسرے پروفیسر کو نہیں رہی۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے قیام کے تھوڑے ہی عرصے میں اردو ادب سے متعلق کشمیریوں کی خدمات پر کئی تصانیف لکھ ڈالیں۔

عام طور پر اہلِ کشمیر نے اردو کو اپنی تعلیمی و سرکاری زبان کی حیثیت سے شیخ محمد عبداللہ مرحوم کی قیادت میں تسلیم کر لیا تھا۔ اردو کی اہمیت اس لیے بھی تھی کہ یہ کشمیر کے تین مختلف اللسان علاقوں۔ جموں، لداخ اور وادئ کشمیر۔ کے درمیان ایک رابطے کی زبان کا حکم رکھتی ہے۔ تاہم نوجوان کشمیریوں میں کشمیری کو سرآمد بنانے کا جذبہ خاصا شدید تھا۔ اسی کے تحت کشمیر یونیورسٹی میں کشمیری کا شعبہ قائم کیا گیا جس کے سربراہ کشمیری کے مشہور شاعر رحمان راہی تھے۔ وہ کشمیری تحریک

ے میر کارواں تھے اور اردو فارسی کی اچھی استعداد رکھنے کے باوجود اردو والوں
جانب سے شاکی اور مشتبہ رہتے تھے۔ میں نے جب ان سے لسانیاتی سطح پر کشمیری
بان کے سلسلے میں ہمدردی کی باتیں کیں تو کچھ مطمئن ہوئے اور کھلے۔ میں نے
ان الفاظ میں کہا اپنی مادری زبان کے سلسلے میں اُن کے جو عزائم ہیں اردو والوں
ان کا احترام کرنا چاہیئے۔ اردو کو کشمیر میں قائم رہنے کا حق اسی وقت ہے جب
اہلِ کشمیر اپنی ضرورت کے مطابق اسے رکھنا چاہتے ہیں۔ جو لوگ کہ خود ہندی والوں
سے انصاف کے طالب ہیں وہ کشمیری کا حق کیوں کر سلب کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل بیان کر چکا ہوں، میں اگست ۱۹۸۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملازمت
سے مکمل طور پر سبکدوش ہو گیا تھا، یعنی دو سال باز ملازمت اور ایک سال وزٹنگ پروفیسر
کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد۔ ابھی بے کار رہتے مجھے ایک ماہ بھی نہیں گزرا تھا کہ پروفیسر
آل احمد سرور کی تحریک پر مجھے کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پہلے تین ماہ اور اس
کے بعد مزید ایک تعلیمی سال کے لیئے وزٹنگ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ کشمیر میں پہلی بار اسکول
کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۳۲ء میں آیا تھا۔ طویل وقفے کے بعد دوسری بار ایک
کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیئے حیدر آباد سے ۱۹۶۶ء آنا ہوا۔ اس کے
بعد کئی بار مختصر مدت کے لیئے اس جنتِ ارضی کا چکر لگایا لیکن بھرپور انداز میں یہاں
قیام کا موقع یا تو ۱۹۳۲ء میں ملا تھا یا اِس بار ۸۲ء، ۸۳ء میں۔

وہاں میرا قیام یونیورسٹی کیمپس میں نسیم باغ میں تھا جہاں مجھے پہلے
ایک کمرہ اور جون ۸۳ء میں بیوی کے آجانے کے بعد دو کمرے رہائش کے لیئے
دیئے گئے تھے۔ اکبر بادشاہ کا بنا کردہ چنار کا یہ باغ جھیل ڈل کے کنارے
واقع ہے جہاں سے جھیل کا پُر لطف نظارہ ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔
عین وسط میں 'چار چناری' کا جزیرہ ہے اور ڈل کے دوسرے کنارے پر چشمہ
شاہی، شالامار اور نشاط باغ تھے۔ مغلیہ عہد کی صبح و شام کی دلچسپیوں کا

ذکر کسی شاعر نے اس انداز میں کیا ہے ؂

صبح در باغِ نشاط و شام در باغِ نسیم

چناروں کی کثرت کی وجہ سے نسیم باغ کے باشندے موسم سرما میں دھوپ سے محروم رہتے ہیں لیکن اگست کے گرم مہینے میں بھی یہاں بجلی کے پنکھے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ موسم خزاں میں رنگوں کی وہ بہار ہوتی ہے جیسے چناروں کے درختوں میں آگ سی لگ گئی ہو۔ سردی کا موسم آتے آتے یہ درخت برہنہ (مادر زاد برہنہ) ہو جاتے ہیں۔ پتے سوکھ کر زمین پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ کشمیریوں کی سردی کے موسم کی مونس 'کانگڑی' کے لیے چنار کے پتوں کا ایندھن سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ برہنی کے دل کی مانند مسلسل سلگتا رہتا ہے۔ کشمیری کانگڑی کو ساتھ لے کر سو بھی جاتے ہیں۔

جی گھبراتا تو 'شکارا' کرایے پر لیتا اور ڈل کو پار کر کے نشاط باغ یا شالامار جا پہنچتا۔ اس سے زیادہ پُرسکون سفر کا تجربہ مجھے اور کہیں نہیں ہوا۔ اتوار کا دن بالعموم دریائے جہلم کے کنارے 'بند' پر گزرتا' جہاں 'احدوس'، یاکسی اور ریستوران میں منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کشمیری 'گوشتابہ' کا لطف اٹھاتا اور پھر 'بند' کے چکر لگاتا۔ ۳۲ء میں جب میں کشمیر آیا تھا تو اسی 'بند' کے کنارے سرکاری کوارٹروں میں ڈھائی مہینے تک میرا قیام رہا تھا اس لیے اس کی یادیں حافظے میں تازہ ہو جاتیں۔ میرے ایک کشمیری واقف کار' جو آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھے' مجھے وہاں اکثر ٹہلتا پاکر ایک روز کہنے لگے 'آپ کو تو 'بند' سے عشق سا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا عشق اور وحشت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ میں اِس جنتِ ارضی میں تنہائی کی وحشت کو بہلانے یہاں آجاتا ہوں۔

میں جب ستمبر ۸۲ء میں کشمیر پہنچا تو شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ حیات تھے اور صاحبِ اقتدار۔ اس سے قبل میں اُن سے دو تین بار دہلی میں مل چکا تھا۔ جابجہ اُردو

نے جب شریمتی اندرا گاندھی کو 'ڈکٹر یٹ ادب' کی اعزازی سند دہلی یونیورسٹی کے
شنکر ہال میں منعقدہ خاص کنووکیشن میں دی تھی، تو وہ اور ڈاکٹر کرن سنگھ
دونوں اس میں موجود تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ڈاکٹر کرن سنگھ مرکزی وزارت میں
شامل تھے اور شیخ صاحب ابھی تک مسندِ وزارت سے محروم تھے۔ اس کے
بعد دوسری ملاقات حکیم عبدالحمید صاحب کے دولت کدے پر ایک دعوت میں ہوئی تھی
اس وقت ان کا انداز گفتگو کسی حد تک جارحانہ تھا۔ سردار پٹیل پر طنز کرتے
رہے حتیٰ کہ جب میں نے اردو کی کس مپرسی پر گفتگو کرنا چاہی تو اسے بھی
انھوں نے ایک غیر اہم موضوع قرار دیا۔ اس صحبت میں مجھے مرزا افضل بیگ
ان سے زیادہ سمجھدار اور گہرے نظر آئے۔ بات کم کرتے تھے مگر تول کر۔ مشہور
تھا شیخ صاحب کے 'نفسِ غیر ناطقہ' وہی تھے۔

لیکن اس کے بعد جب ایک بار شیخ صاحب جامعہ ملیہ تشریف لائے
تو انھیں بالکل بدلا ہوا پایا۔ اب وہ ملت کی باتیں بھی کر رہے تھے، اردو کی
بھی اور اقبال کی بھی۔ ان کے ایثار اور قربانیوں کے پیشِ نظر میرے دل
میں ان کا بڑا احترام تھا۔ کشمیر پہنچ کر مجھے کشمیریوں کو شیخ صاحب سے جو عقیدت
تھی اور شیخ صاحب کو اقبال سے اس کا صحیح اندازہ ہوا۔ انھوں نے نہ صرف
اقبال چیئر اور اقبال انسٹی ٹیوٹ کی داغ بیل ڈالی بلکہ کشمیر یونیورسٹی کی لائبریری
کا نام بھی اقبال لائبریری رکھا۔ شیخ صاحب کی کشمیر اور کشمیریوں کے لیے قربانیوں
کا اعتراف ہر شخص کی زبان پر تھا سوائے نوہٹہ کے علاقے کے میر واعظ اور چند قدیم
خاندانوں کے بعض افراد کے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ہم تو اُس 'شیخ'
کے قائل ہیں جو ہماری آزادی کی تحریک کا ہیرو اور 'شیر' رہا ہے'۔ اُس 'شیخ'
کے نہیں جو وزارتِ عظمیٰ کا مسند نشیں ہو کر اپنے اہلِ خاندان کا مربی بن گیا ہے۔
انھوں نے اپنے 'یارِ غار' مرزا افضل بیگ کو کشمیر کی سیاست سے دودھ کی مکھی کی
طرح نکال باہر کیا؛ اس کا بھی لوگوں کو قلق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب شیخ صاحب

آخری بار افضل بیگ کی عیادت کو گئے تو انھوں نے بستر مرگ پر کہا "شیخ صاحب! میں ہمیشہ آپ کے پیچھے چلا ہوں۔ اب میں آپ سے آگے جا رہا ہوں آپ میرے پیچھے آیئے"۔

شیخ صاحب کو آخری بار میں نے ۱۵ اگست ۸۲ء کو گورنمنٹ سینٹرل ایمپوریم کے لان پر یوم آزادی کی تقریب میں دیکھا۔ وہ صحت کے اعتبار سے اس وقت تک بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ اس قابل بھی نہیں رہے تھے کہ لوگوں سے کھڑے ہو کر ہاتھ ملا سکیں۔ ادھر اُدھر دیکھا گئے جیسے فرض کفایہ ادا کرنے آگئے ہوں۔ موٹر میں اپنی نشست تک آئے اور موٹر ہی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ تین ہفتے کے بعد ۸ ستمبر کو اپنے مولا سے جا ملے۔

ان کی تدفین کا منظر میں نے نسیم باغ سے دیکھا۔ یہ ڈل کے کنارے عین اُسی مقام پر ہوئی جہاں میں روز شام کو ٹہلنے جاتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ جگہ انھوں نے اپنے لیے، پہلے سے مختص کر لی تھی۔ ڈل کے کنارے اس چمن کے ایک کنارے پر حضرت بل کی درگاہ ہے، جہاں شیر کشمیر ہر جمعہ کو نماز کے بعد گرجتا تھا اور دوسرے کنارے پر ان کی آخری آرام گاہ ہے۔ میرا بس چلتا تو حضرت بل جیسی دوسری سنگ مرمر کی پاکیزہ عمارت شیخ صاحب کے مزار پر بنوا دیتا!

شیخ صاحب کی تدفین کا منظر دیدنی تھا۔ ایک شورِ ماتم تھا جس میں بچے، بوڑھے مرد، عورتیں، شہری، دیہاتی سب شریک تھے۔ تدفین کے بعد عقیدت کا یہ منظر بھی دیکھا کہ لوگ مٹھیوں میں ان کے مرقد کی مٹی بھر کر تبرک کے طور پر ساتھ لے گئے۔ یہ غالباً بودھوں، کشمیری اسلام پر اثر تھا۔ یہ اثر ان کے طرزِ عبادت پر بھی نظر آیا۔ حضرت بل میں نماز پانچ منٹ کی ہوتی تو "قُل، گھنٹہ بھر تک ہوتا رہتا۔ لا الٰہ اللہ کی آواز جب ڈل کے پانی پر چاروں طرف کے پہاڑوں سے ٹکرا کر واپس آتی تو بقول اقبال، "شبستانِ وجود لرز اٹھتا۔

کشمیر کے دوران قیام میں، میں کچھ دنوں کے لیے اپنی عقلیت کو بالائے طاق رکھ
[illegible]رگاہی بن گیا تھا۔ ہاری پربت کے دامن میں مخدوم صاحب کی بڑی درگاہ ہے
[illegible]کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ وادیٔ کشمیر کے ولی ہیں اور یہاں ہر کام ان کے
[illegible]سے ہوتا ہے۔ میں اس زمانے میں اپنے اکلوتے بیٹے جاوید کی جانب
[illegible]بہت متردّد رہتا تھا۔ اس نے نیویارک یونیورسٹی سے فزکس میں پی ایچ ڈی
[illegible]یازات کے ساتھ کرلی تھی اور اب میری خواہش تھی کہ وہ ہندوستان واپس
[illegible]را اپنا گھر بسائے۔ کشمیر یونیورسٹی کے فزکس ڈپارٹمنٹ میں اس کا بحیثیت لیکچرر
[illegible]روپے کے بغیر تقرر بھی ہو گیا تھا۔ گھر بسانے کے سلسلے میں اُس کا ذہن صاف نہیں تھا
[illegible]ایں ہاں اور ذرا ایں نہ۔ ہم لوگ چاہتے تھے کہ جس طرح ہو یہ طائرِ رمیدہ زیرِ دام
جائے۔ ظاہر ایسے میں جہاں کسی اچھی لڑکی پر نظر پڑتی تو دل میں منصوبے بننا
شروع ہو جاتے تھے۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں مخدوم صاحب کے خاندان کی ایک طالبہ، طالعہ مخدومی
ریسرچ کر رہی تھیں چوں کہ ان کا موضوع "اقبال کے تصوراتِ فن و جمالیات" تھا
[illegible]س لیے سرور صاحب نے خاص طور پر مجھے اُن کی نگرانی پر مامور کیا۔ کچھ عرصے
[illegible]یں نہ صرف طالعہ کے جوہر مجھ پر کھلے وہ بھی میرے حسنِ سلوک کی وجہ سے مجھ سے
[illegible]بہت زیادہ مانوس ہوتی گئیں۔ ان کے والد عرصے سے بیمار اور حواس باختہ
تھے۔ ممکن ہے انھیں میری شفقت میں ایک پدرانہ محبت کا بدل ملنے لگا ہو۔ جون
۸۳ء میں جب میری بیوی بھی سری نگر آگئیں تو طالعہ ان کی شخصیت سے بھی
بہت متاثر ہوئیں اور ایک دن کہنے لگیں میری والدہ اور ان میں ہر اعتبار سے
بڑی مشابہت ہے بس ایک کو چھپاؤ اور دوسرے کو نکالو۔"

[illegible]نظروں نے بہت جلد جاوید کے لیے طالعہ کا انتخاب کر لیا۔ میں نے ان سے
غائبانہ [illegible] [illegible]رت بھی کرادیا۔ اسی زمانے میں جاوید کا کشمیر یونیورسٹی میں
لیکچرر [illegible] سے انتخاب عمل میں آگیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ سب وادی کے

ولی مخدوم صاحب کے حکم سے ہو رہا ہے اس لیئے میں نے ہر اتوار کی صبح باوضو ان کی درگاہ پر حاضری دینی شروع کر دی۔ یہ ذہن میں رہے کہ اس قسم کی حرکت میں نے کبھی چوبیس خواجاؤں کی چوکھٹ والی دلی میں بھی نہیں کی تھی، اس لیئے کہ میرا ذہن کسی بھی قسم کی مزار پرستی کو قبول نہیں کرتا۔ مزاروں کے عود و لوبان کی خوشبو اور قُل اور قوّالی کے شور سے میری سوچنے کی صلاحیت مفقود سی ہو جاتی ہے لیکن بہر حال مخدوم صاحب کی درگاہ میں بڑی عقیدت سے جاتا، دیر تک آنکھیں بند کیئے بیٹھا رہتا اور اُن سے انھیں کے خاندان کی ایک لڑکی کا طالب ہوتا۔

اِدھر میں نے جاوید کو امریکہ خط لکھ کر ٹٹولنا شروع کیا۔ کبھی امید بندھتی تھی اور پھر ٹوٹ جاتی تھی۔ جب اس نے کشمیر کی ملازمت کی پیش کش کو بالآخر ٹھکرا دیا اور شادی کے مسئلے پر بھی گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تو میرے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ مجھے اس سے بھی شکایت ہوئی اور مخدوم صاحب سے بھی جو اس کے دل کو نہ بدل سکے۔ ایک دن شکارے میں بیٹھ کر ڈل کو پار کیا اور نشاط باغ جا کر اضطراب کے عالم میں جاوید کو خوب کوسا اور بد دعائیں دیں۔ اس وقت میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ بس جھیل ڈل مجھے ایک بڑی چشم پُر آب کے مانند نظر آرہی تھی!

اس علاقۂ محبت، کی جانب میں نے قدم جس احتیاط سے بڑھائے تھے اسی احتیاط سے پیچھے ہٹا لیئے۔ کچھ عرصے کے بعد طالعہ کی شادی ہو گئی۔

میں اقبال کے فکر و فن کا شائق اپنی طالب علمی کے زمانے سے رہا ہوں۔ اس کے بعد ایم۔ اے کی کلاسوں کو مدتوں اقبالیات کا درس دیتا رہا ہوں۔ لیکن جس یکسوئی کے ساتھ مجھے اقبال کے مطالعے کا موقع اپنے کشمیر کے سوا سالہ قیام میں ملا اور کہیں نہیں ملا۔ اس سے میری عقیدت مطالعہ کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ یہ مطالعہ میں ایک مکمل سپردگی کے ساتھ کرتا۔ اور میرا یہ خیال راسخ ہوتا

گیا کہ کسی بڑے شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لیے خود کو اس کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے اردو کے عظیم شاعر صرف دو ہیں۔ غالب اور اقبال، اور اقبال کو منظم فکر کے اعتبار سے غالب پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ اسی زمانے میں رفتہ رفتہ مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اقبال کی فکر کے تمام پہلوؤں سے متفق نہیں ہوں۔ ان کی فکر کی مابعدالطبیعاتی سطح اور اس کے تصورات ــ خودی، عشق، وجدان، عظمتِ آدم، مردِ مومن، تصورِ ابلیس وغیرہ میں بہت جاذبیت اور عمومیت پائی لیکن جب وہ اس سطح سے اتر کر معاشرتی مسائل پر آتے ہیں تو وہاں میرا آزاد ذہن ان کا ساتھ نہیں دیتا تھا اور میں انھیں اسلام کی آڑ میں بہت زیادہ قدامت پسند پاتا تھا۔ میں خودنوشت کے گذشتہ ابواب میں مسلسل یہ اشارہ کرتا آیا ہوں کہ بچپن سے میرا ذہن آزاد خیالی کی طرف مائل رہا ہے اور میں نے ہر مذہب کو (بہ شمول اسلام) عقلیت کے معیاروں پر پرکھنے کی کوشش کی ہے، خاص طور پر مذاہب کی فروعات کو۔ اقبال اپنی مذہبی فکر میں (اور نتیجۃً معاشرتی افکار میں) ہندوستانی مسلمانوں کے متوسط طبقے کے اندازِ فکر سے آگے نہ جا سکے۔ وہ فقہِ اسلامی کی از سرِ نو تدوین کرنے کا عزم رکھتے تھے اور ایک جگہ کہا بھی ہے کہ اس دور کا مجدد وہی کہلائے گا جو اس کام کو انجام دے گا۔ کاش وہ اس کام کو مکمل کر لیتے تو معلوم ہوتا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

شروع شروع میں اقبال کے فن کے جادو نے مجھے اس انداز میں سوچنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ مجھے ایک رَو میں لے جاتا تھا اور میں اسلامی تاریخ کو صحیح تناظر میں نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اب اقبال کی اسلامی فکر اور "اسلامیت" کو میں نے ناقدانہ نظر سے دیکھنا شروع کیا اُن کی "ہمہ اسلامیت" کی معنویت کے بارے میں اندیشہ ہائے دراز پیدا ہونے لگے۔

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لیے

مجھے ایک جنت پرست کا خواب نظر آنے لگا۔ تاریخ عالم پر جب میری نظر پڑ جاتی تو مجھے اس بات پر یقین کرنے میں تامل ہوتا کہ سارے عالم کی تنظیم اسلام کی اساس پر کی جا سکتی ہے جیسا کہ اقبال کا عقیدہ تھا۔ دنیائے عرب میں جو انتشار تھا اس سے میرے خیال کی تصدیق ہو جاتی تھی۔

میں اب اس قسم کے تصورات یا زن، رقص اور تیاتر کے بارے میں اقبال کے خیالات کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔ لیکن شعر کے پیرائے میں ہر بار اقبال کا وار بھرپور پڑتا۔ اور میں ان کے اس قسم کے اشعار کو بھی وحی الہام سمجھ کر وردِ زبان رکھتا۔ جنھیں عقل یا تاریخی شعور قبول نہیں کرتا ؎

نے پردہ، نہ تعلیم، نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اب میری ذہنی کشمکش یہ تھی کہ اقبال کا ہر حرف، حرفِ آخر، کا حکم نہیں رکھتا۔ ان کی فکر کے بارے میں اگر خالص علمی انداز میں گفتگو کی جائے تو اس کے بہت سے گوشے "غیر منوّر" نکلیں گے لیکن ان کے فن کی ساحری سے کس طرح بچا جائے کہ جو کہہ دیا ہے وہ دل میں تیر بن کر اُتر جاتا ہے۔ مثلاً ان کی نظم "مسجدِ قوت الاسلام" ہی کو لے لیجئے کس پیمبرانہ آواز کے ساتھ دعوت دی ہے۔

کیوں مسلماں نہ خجل ہو تری سنگینی سے
کہ غلامی سے ہوا مثلِ زجاج اس کا وجود!

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکۂ بود و نبود

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص مورخ کی نظر سے 'مسجد قوت الاسلام' کو دیکھتا اور جانتا ہے کہ اس کی تعمیر کے لیے ایک دوسرے مذہب کی عبادت گاہ کی تخریب کی گئی ہے (جس کے آثار آج بھی نمایاں ہیں) تو وہ بحیثیت انسان کس طرح اقبال کی اس تمجید اور تکبیر میں تہِ دل سے شرکت کر سکتا ہے۔

لیکن ایسا نہیں ہے کہ اقبال کے افکار کے اس حصے سے قاری متاثر نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ 'جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے'، فنِ شعر کے جادو پر یہ قول پوری طرح صادق آتا ہے۔ اِسی لیے کہا گیا ہے کہ 'صداقتِ شعری'، 'تاریخی صداقت' سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ سحر اور علم کی صداقت ہوتی ہے جس کی عقل منکر ہوتی ہے اور دل شہادت دیتا ہے۔

چنانچہ رفتہ رفتہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہیں سروکار اقبال کی فکر سے زیادہ ان کے فن سے رکھنا چاہیئے۔ اقبال کی فکر کی ساری 'برائی' اسی 'تہمتِ شعر' کی وجہ سے ہے جس کو زائل کرنے کے لیے وہ بار بار تاویلیں پیش کرتے رہے۔ اُن کی عظمت کا اصل راز خود ان کے بقول یہ ہے ؎

یہ کون غزل خواں ہے پُرسوز و نشاط انگیز
اندیشۂ دانا کو کرتا ہے جنوں آمیز

معاشرتی سطح سے قطعِ نظر اقبال کے سیاسی تصورات میرے لیے اور بھی اُلجھن کا باعث رہے ہیں۔ مثلاً ان کا 'اسلامیت'، یا 'قومیتِ اسلام'، کا تصور۔ باوجود اس کے کہ وہ نہایت خوبصورت شعری پیکر میں پیش کیے گئے ہیں، جنھیں پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے انسان کی سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے لیکن جو منطقی استدلال یا تاریخی حالات کی کسوٹی پر مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ میں قطعی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ جب دنیائے عرب میں ایک اسلامی مملکت کی تشکیل نہیں ہو سکی تو اس کے دامن میں

اس قدر مختلف النوع قومیتیں جیسے ترکی، ایران، افغانستان، پاکستان یا بنگلہ دیش کس طرح محض 'عقیدہ' کے اشتراک کی بنیاد پر یکجا کئے جا سکتے ہیں؟ جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ "اقبال اسلام کو ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول یا انسانی اتحاد کو وجود میں لانے کے لیے ایک عملی تحریک تصور کرتے تھے" (زندہ رود ص ۶۵۷) یہ تاریخ انسانی کا ایک خواب ہے یا حقیقت؟

اسی طرح بحیثیت ایک ہندی مسلمان ہونے کے میں اقبال کے آخری دور کے شمال مغربی اسلامی مملکت کے خواب کو اپنے لیے کیوں کر حقیقت سمجھ سکتا ہوں۔ پاکستان کی قیمت ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے خون سے چکائی ہے!

میرے خیال میں اقبال کی سیاسی فکر کو بدلتے ہوئے حالات کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے "ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنا نظریہ تبدیل کرے اور بقول ایمرسن صرف پتھر ہی اپنے آپ کو نہیں بدلتے" (زندہ رود ص ۶۵۵)۔ آجکل جو اقبال کی آخری دور کی سیاسی فکر کے بارے میں بحث چل نکلی ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ اقبال ابتدا میں یقیناً قوم پرست تھے۔ ان کی قومی اور وطنی شاعری کا جواب پوری اردو شاعری میں نہیں ملتا لیکن جب یہ قوم پرستی ان کی اسلامیت کے آڑے آتی گئی تو وہ اس حقیقت سے کنارہ کش ہو کر 'ہمہ اسلامیت' کا خواب دیکھنے لگے۔ صرف کبھی کبھی 'شعاعِ امید' جیسی نظموں میں 'خاکِ وطن' کی محبت ایک بار پھر ان کے دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ؎

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبالؔ کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب

یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ نظم ۱۹۳۶ء میں خطبۂ مسلم لیگ (۱۹۳۰ء)

ہت بعد لکھی گئی ہے، جو شاملِ ضربِ کلیم ہے۔
اقبال ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۷ء مسلم لیگ کے دیگر قائدین کی طرح ایک آزاد اسلامی
ت کی اصطلاح میں نہیں سوچ رہے تھے۔ انھیں "پاکستان" کی نہیں مسلمانوں
ے لیے ایک تہذیبی "گھر" کی تلاش تھی۔ ۳۷ء تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان کے سیاسی
لات تیزی سے بدلنے لگے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کئی صوبوں میں برسرِ اقتدار
ئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلم عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کا پروگرام
ایا۔ اب اقبال کی سیاسی بصیرت پر بھی یہ بات روشن ہو گئی جو سر سید نے ۱۸۶۷ء
ں اردو کے معاملے میں بنارس میں محسوس کی تھی۔ یعنی "یہ دونوں قومیں کسی معاملے
یں صدقِ دل سے اور پوری طرح ایک دوسرے سے اشتراک نہیں کر سکتیں۔۔۔"

انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کو لکھا:

"۔۔۔ شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ اور ارتقا اس ملک میں اس وقت تک
ممکن نہیں جب تک کہ ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔
سال ہا سال سے یہی میرا پختہ عقیدہ رہا ہے اور میں اب اسی عقیدے
کو مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل
سمجھتا ہوں۔۔۔۔ مسلم ہند میں ان کے مسائل کے حل آسانی رائج کرنے کی خاطر
ملک کی تقسیم کے ذریعے ایک یا زائد مسلم ریاستوں کا قیام اشد ضروری ہے۔
کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت آن نہیں پہنچا؟ ۔۔۔۔"

تین ہفتے کے فصل سے اقبال نے محمد علی جناح کو دوسرا خط ۲۱ جون ۳۷ء کو
لکھا جس میں تقسیمِ ملک اور بنگال کے مسلمانوں کا زیادہ کھلے الفاظ میں تذکرہ کیا
ہے:

"۔۔۔۔۔ ہندوستان میں قیامِ امن اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ اور تسلط
سے بچانے کی واحد ترکیب وہی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے، یعنی صوبوں

پر مشتمل ایک جداگانہ وفاق کا قیام . . . . میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ شمالی
مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز
کر دینا چاہیئے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق
سے وابستہ ہے . . . ."

ان دو خطوں کی موجودگی میں جو انتقال سے صرف دس گیارہ ماہ قبل لکھے
گئے ہیں اقبال کی سیاسی فکر کا جواز ڈھونڈھنا، حقائق سے انحراف کرنا ہے۔ مسلم
اقلیت کے صوبوں کو انھوں نے جس سہل انگاری کے ساتھ صرفِ نظر کیا ہے اس
کے بارے میں ہندی مسلمان اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے ؎

اقبالؔ! اپنا محرم کوئی نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

تاہم اقبال ایک عظیم مفکر اور شاعر ہیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ان کے اس جرم پر
کہ انھوں نے تقسیمِ ملک کی حمایت کی انھیں نہ تو ان کی ہندوستانیت سے محروم کیا جا سکتا
ہے اور نہ اُن کی فکر کے عالمی پہلوؤں سے۔

پاکستان کی تائید تو شری راجگوپال اچاری نے بھی کی تھی اور اس کی منظوری
مہاتما گاندھی اور مولانا آزاد کے علی الرغم پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل نے دی تھی۔
تو کیا یہ سب لوگ ہماری قومی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے کیے جائیں گے؟
دراصل ٹیگور ہوں کہ اقبال ان شخصیتوں کو سیاست کے بدلتے ہوئے پیمانوں سے
ناپنا غلط ہو گا۔ ٹیگور کی 'ویدانیت' ہو کہ اقبال کی 'اسلامیت'، وحدتِ انسانیت کا دوسرا
نام ہے۔ دونوں آج بھی ہند و پاک کے افق پر شعر کی توسِ قزح کے ذریعہ فصل میں
وصل کی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہیں۔

سولھواں باب

علی گڑھ (۶)

(۸۳ء تا حال)

صبح کا بھولا شام کو واپس آئے تو اسے بھولا نہ جانیئے۔ علی گڑھ میرا مقدّر بن چکا تھا۔ ابھی کشمیر کی شاداب وادی میں اِس بوڑھی گائے کی کُلیلیں ختم نہیں ہوئی تھیں کہ علی گڑھ سے بُلاوا آگیا۔ وہاں ترقی اردو بورڈ (ثم بیورو) کا ایک اردو۔اردو لغت کا منصوبہ ۱۹۷۳ء سے چل رہا تھا۔ اس کے تحت پانچ مولفین — پروفیسر آل احمد سرور، مالک رام صاحب، پروفیسر نذیر احمد، پروفیسر مختار الدین اور راقم الحروف کو ایک ایک جلد کا ایڈیٹر مقرر کر کے ایک ایک اسسٹنٹ کی مدد سے ایک جامع اور جدید لغت کی تالیف کا کام ۱۹۷۳ء میں سپرد کیا گیا تھا۔ بوجوہ اس کام میں زیادہ پیش رفت نہ ہو سکی اور چار پانچ برس کے بعد بورڈ کی جانب سے اعتراضات ہونے لگے۔ جب میر نصر اللہ صاحب، وزارتِ تعلیم کے ایڈیشنل سکریٹری کی حیثیت سے اردو بیورو کے افسرِ اعلیٰ تھے تو انھوں نے لغت کی سست رفتاری کے پیشِ نظر یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام انگریزی۔اردو لغت کے نمونے پر پانچ مولفین سے لے کر ایک کے سپرد کر دیا جائے تو زیادہ ذمہ داری سے ہو سکے گا۔ اتفاق سے دونوں لغات کے ․ ․․ ے ایک زمانے میں ترتیب دیئے گئے تھے جب کہ

انگریزی۔ اردو لغت کا کام تنہا پروفیسر کلیم الدین کے سپرد کیا گیا، اردو۔ اردو لغت کا کام پنچایتی بنا دیا گیا وہ بھی ۲۵۰ روپے کے حقیر اعزازیے پر۔ اس وقت مالک رام صاحب کے علاوہ ہم سب یونیورسٹی میں پروفیسری کی خدمات پر مامور تھے اور قاعدے کے مطابق اپنی تنخواہ کے ۲۰ فی صد سے زیادہ اعزازیہ نہیں لے سکتے تھے، اور وہ اسی قدر ہوتا تھا۔ بہر حال اور جو وجوہ ہوں اردو لغت کے کام میں پیش رفت نہیں ہو سکی۔ جب کہ پروفیسر کلیم الدین اپنے مکان پر انگریزی اردو لغت کا دفتر جما کر اطمینان سے کام کرتے رہے۔

جولائی ۸۲ء تک وزارت تعلیم نے طے کر لیا کہ اردو لغت کی تنظیم نو انگریزی اردو لغت کے انداز پر کر کے اس کام بھی ایک شخص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ میر نصر اللہ صاحب کے دفتر میں ایڈیٹوریل بورڈ کا جلسہ ہوا جس میں ان کی تجویز پر طے پایا کہ یہ کام راقم الحروف کے سپرد کر کے لغت کا دفتر علی گڑھ میں میرے مکان کے دو کمروں میں انگریزی۔ اردو لغت کے انداز اور شرائط پر قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ میں نے یکم دسمبر ۸۲ء کو کشمیر کو خیر باد کہا اور علی گڑھ آ کر اپنے نئے کام کا چارج لے لیا۔ چارج ان معنوں میں کہ دوسرے مولفین کے یہاں سے تیار شدہ کارڈ متعلقہ لغات اور دیگر سامان کو اپنے یہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی ترقی اردو بیورو کے ارباب حل و عقد کو امدادی اسٹاف کے تقرر کی اجازت کے لیے عرض داشتیں بھیجنا شروع کیں۔ واہ رے دفتر وزارت تعلیم اور واہ ری بدنصیب اردو! وہاں لغت اردو کی فائل پر یہ نوٹ لکھا گیا کہ ایڈیٹر کے تقرر کی اجازت تو مل گئی ہے لیکن باقی اسٹاف کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ میں انگشت بدنداں تھا! کیا آپ یقین کریں گے کہ دفتری گھس گھس میں اسٹاف کے تقرر کی منظوری مجھے جون ۸۳ء میں جا کر ملی۔ اس کے بعد مجھے پہلے ۶ ماہ کی مدّ فاضل سمجھ کر ادائیگی نہیں کی گئی۔ حالاں کہ میں نے اپنا کام دسمبر ۸۲ء میں کشمیر سے واپس آنے کے فوراً بعد شروع کر دیا تھا۔ بالآخر وزارتِ تعلیم کو بہت تگ و دَو کے بعد یہ ادائیگی کرنا پڑی۔ اس طرح کام کا آغاز بد دلی کے ساتھ ہوا۔ جون ۸۳ء سے

ب بیشتر مددگاروں کا تقرر ہوگیا تو تالیفِ لغت کے کام میں تیز رفتاری آنا شروع
ہ‍ِئی۔ میرے بیشتر مددگاروں کو لغت نویسی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ صرف ایک یوسفی
صاحب کو پہلے سے اسی اسکیم میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ لیکن وہ جغرافیہ میں
ایم اے تھے اس لیئے آپ کی اردو کی معلومات محدود تھی جس کی کمی وہ اپنی محنت
اور وقت کی پابندی سے کر دیتے تھے۔ میں نے دو سال کے اندر اس لغت کی جلد اوّل
جو تا س کے حروف پر مشتمل تھی مکمل کرلی اور اس کی پریس کاپی تیار کرکے
ادارے کے ڈائریکٹر کو بھیج دی۔ اس کے بعد جلد اوّل کی تیاری کے لیئے چھ مہینے اور
دیئے گئے، اس کا بھی کچھ حصّہ مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد اسکیم ختم کر دی گئی اور تا حال دو
یونیورسٹیوں کی سفارشوں کے باوجود معاملہ معلّق ہے اور اس کا سارا ساز و سامان
اب تک میرے یہاں پڑا ہوا ہے۔

لغت نویسی کے فن میں داخل ہونے کے بعد مجھے علم ہوا کہ فرہنگ آصفیہ کے
اختتام پر اس کے مؤلف نے جو لکھا ہے وہ فاعتبروا یا اولی الابصار کے
مصداق حرف بحرف صحیح ہے۔

"..... ہمارے ناظرینِ فرہنگ واقف ہوگئے ہوں گے کہ ہم نے کس کس
جاں کاہی، جانفشانی اور اخراجات برداشت کرکے اس فرہنگ کو انجام پر پہنچایا...
خود ہماری آٹھوں پہر کی روزانہ مجتوّل نشست نے مصائب کے ضمن
میں یہ مزید عنایت فرمائی کہ پیٹ بڑھا کر توندل کر دیا۔ ریاحی بواسیر ضعفِ مثانہ
بہم پہنچا دیا، معدہ بگاڑ دیا، اعصاب کو ڈھیلا کر دیا....."

لغت نویسی کی ہمارے یہاں روایت قدیم ہے لیکن ہمارا لغت نویس
اس فن کی اُن باریکیوں سے واقف نہیں جن کی مغرب میں آکسفورڈ ڈکشنری یا
ویبسٹر کی لغتِ کلاں نے روایات قائم کی ہیں۔ میں نے اردو لغت کا نمونہ ویبسٹر کی
لغتِ کلاں سے لیا۔ اندراجات کے اصول، ذیلی اندراجات کا محل و مقام، تلفظ،
قواعدی زمرہ اور سب سے اہم الفاظ کے مشتقات کا التزام رکھا۔ مثالیں صرف

ان الفاظ کی دیں جو یا تو متروک ہو گئے ہیں یا جو مخصوص معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ محاورات بھی ضرورت کے مطابق دیئے لیکن صاحب آصفیہ یا مہذب اللغات کی طرح لغت کو محاورات کی کھتونی بنانے سے احتراز کیا اس لیئے کہ ہر زبان میں محاورات پر مشتمل علاحدہ سے لغات تصنیف کی جاتی ہیں۔ اس لغت کو جامع تر بنانے کے لیئے اس میں دکنی اردو کے الفاظ کا بھی شمول کیا گیا۔ غرض کہ ہر لحاظ سے حوالہ کی ایک ایسی کتب بنانے کا التزام کیا جس کی مدد سے قدیم تا جدید ہر عہد کے ادب کا مطالعہ کیا جا سکے۔ مختلف علوم کی اصطلاحات کو اسی قدر جگہ دی گئی جس قدر کہ وہ عام زبان کا حصہ بن گئی ہیں۔

مجھے اس کا بھی احساس ہوا کہ لغت نویسی ایک تاب شکن فن ہے اور ایک اس میں داخل ہو جانے کے بعد انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ اس کا مولف شیر کے منہ میں اپنا ہاتھ دیتا ہے۔ تحسین سے کم اور تعریض سے زیادہ سابقہ پڑتا ہے اور اس کو مرنے کے بعد ستائش ملے تو ملے، جیتے جی یہ اس سے محروم رہتا ہے۔ لغت کی تالیف کے لیئے طویل مدت اور کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کام عجلت میں نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن سرکاران مسائل سے بے خبر ہوتی ہے اور ہتھیلی پر سرسوں اگانے کی قائل ہوتی ہے۔ چنانچہ وزارت تعلیم نے ۴۲ء ۱۹ سے لے کر ۴۳ ۱۹ء تک کی مدت اور اخراجات کو مجھ سے محسوب کر کے ڈھائی سال کے بعد اس اسکیم کو یک لخت بند کر دیا۔

لغت نویسی کے فن سے مجھے ذاتی طور پر بہت فائدہ پہنچا۔ ہر قسم کے الفاظ کی پرکھ ہو گئی۔ اس تربیت کے بعد اب میں صحیح معنوں میں لغت کی باقی ماندہ جلدوں کا حق ادا کر سکتا تھا۔ لیکن اس کی نوعیت ابھی تک نہیں آئی ہے اور اب جو آئی تو یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ میری تربیت یافتہ جماعت تتر بتر ہو گئی ہے۔ اردو کے جس ٹائپسٹ کو میں نے بڑی محنت سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ لغت کا مسودہ صحیح ٹائپ کر سکے دوسروں کے ہاتھوں میں

چلا گیا ہے۔ غرضیکہ آشیانے کے لیئے ایک ایک تنکا پھر جمع کرنا پڑے گا۔ اب میں ترقی اردو بیورو کے وعدوں پر بے دلی کے ساتھ یقین کرتا رہتا ہوں۔

اسی زمانے یعنی ۱۹۸۴ء میں بیرونِ ہند کا ایک غیر متوقع سفر درپیش آیا جسکی تمام تر ذمہ داری میرے عزیز دوست پروفیسر احسان رشید پر ہے جو اس وقت اُردن میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے متعین تھے۔ حکومت اردن کا ایک ثقافتی ادارہ ہر سال ایک علمی و تحقیقی سیمینار منعقد کرتا ہے جس میں باہر کے اساتذہ و علماء کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر مختارالدین احمد صاحب تقریباً ہر سال اس میں شرکت کرتے ہیں۔ احسان صاحب کی تحریک پر اس سال مجھے بھی مدعو کیا گیا۔ میں پریشان تھا کہ میں وہاں اپنی موجودگی کا اظہار کس طرح کرسکوں گا اس لیئے کہ میں عربی زبان بالکل نہیں بول سکتا، سمجھتا بھی نہیں صرف پڑھ کر مطلب نکال لیتا ہوں۔ بہر حال موقع سے فائدہ اٹھا کر میں مختارالدین صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ ان کے ساتھ ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں، جن کا پروگرام وہاں سے مقاماتِ مقدسہ کی سیر تھی۔ وہاں ہمارا قیام ایک نہایت نفیس ہوٹل میں تھا۔ کانفرس کے اجلاس بھی اسی ہوٹل میں ہوتے تھے۔ کھانے پینے کی اشیاء کی افراط تھی۔ جب سے میرے خون میں شکر دریافت ہو گئی ہے میں ہاتھ روک کر کھاتا ہوں، خاص کر میٹھے سے اجتناب کرتا ہوں۔ لیکن خورد و نوش کے اس ماحول میں اس حکیمانہ قول کو نظرانداز کرنے لگتا ہوں کہ خوردن برائے زلیستن نہ کہ زلیستن برائے خوردن۔ کیوں صاحب پھر زندگی ضروری کیا ہے جب قدم قدم پر نواہی سے سابقہ ہو۔ ایک شام کا ڈنر پرنس حسن بن طلال برادرِ خورد و ولی عہد شاہ حسین کی جانب سے تھا۔ میں نے اس سے بہتر روسٹ کہیں نہیں کھایا، وہ تو ہماری میز پر وہاں کے میڈیکل کالج کے ایک بزرگ شریک ہو گئے نہ خود کھاتے تھے نہ اوروں کو کھانے دیتے تھے۔ یا فتاح! یہ کیا مصیبت ہے ہر لذیذ غذا کا تیر قلب یا جگر پر پڑتا ہے۔ کھانا کھا کے بے مزہ رہا۔

کانفرنس کے اختتام پر احسان رشید صاحب مجھے ہوٹل سے اٹھا کر لے
گئے۔ دو تین دن ان کے یہاں قیام رہا۔ ان کی بیگم کا آپریشن ہوا تھا اور وہ ح
اسپتال سے مکان پر آئی تھیں لیکن احسان صاحب کی توجہ میں کمی د پا
بحرالمیت (ڈیڈ سی) لے گئے جو سطح سمندر سے نیچے ہے۔ اس کے دوسرے
اسرائیل کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے روز اپنے ڈرائیور سے کہا کہ
شعیب کی قبر اور اصحاب کہف کا غار دکھا لاؤ۔ دونوں چیزیں قابلِ دید ہیں
شعیب کی قبر بلا مبالغہ نو دس فٹ کی ہوگی۔ کہا جاتا ہے اس زمانے میں ا
کے تمام لوگ لمبے ہوتے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر رومن سلطنت کے آ
بڑے بڑے ستونوں کی شکل میں دیکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا شو
ولآویزی کی شان ہوگی۔ اصحابِ کہف کا قصّہ تو قرآن کریم میں بھی
سگِ اصحابِ کہف کی ہڈیاں تک شیشے کے اندر محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔ ا

اردن ایک قدیم ملک لیکن جدید ریاست ہے۔ میں اس بات پر
تھا کہ اہلِ اُردن کی خوشحالی کا راز کیا ہے۔ بالکل ایک یورپی ملک
ہے۔ ایک روز وہاں کی یونیورسٹی دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اسے کسی بھی
سے صفائی اور سلیقے میں کم نہیں پایا۔ سب سے پہلے مہمان کو یونیورسٹی
مختصر سی فلم دکھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی دلچسپی کے مطابق ان شعبہ
جاتا ہے جن کو وہ دیکھنا چاہے۔ میں نے لائبریری جانا پسند کیا۔ اس
امریکی یونیورسٹی کی لائبریری کے مماثل پایا۔ سہولتوں اور سروس دونو
سے۔ طلبہ کو بھی ہندوستان سے زیادہ چاق چوبند پایا۔ یہ سب دیکھ کر
رہ گیا کہ اس قدر ترقی یافتہ قوم کو اسرائیلی کس طرح زیر کیے رہتے ہ
وہ ان سے بھی بہتر ہوں گے۔

اُردن سے واپسی پر چند روز راستے میں کراچی رکا۔ بیشتر وقت
عزیز دوست فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ اردو لغت بورڈ کے دفتر

میں نے فرمان صاحب سے کہا کہ آپ لوگوں نے یہ بہت بڑا کام اٹھایا ہے۔ اتنی بڑی لغت کے لیے قدیم متون کی ترتیب کا کام پہلے ہونا چاہیے۔ مصنفین اور تصانیف کے سنین کے بارے میں فیصلے ہونے چاہئیں۔ ان کے بغیر تاریخی اصولوں پر لغت کیوں کر مرتب کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے ان دقتوں کا اعتراف کیا اور کہا "لا محدود التواء کے مقابلے میں کچھ تو کیا جانا چاہیے کی پالیسی بہتر ہوتی ہے۔"

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی اسکیم کو ایک بند باب سمجھنے کے بعد میں نے اپنی ساری توجہ جامعۂ اردو اور اپنے تصنیفی کاموں کی جانب مبذول کر دی۔ جامعۂ اردو کا، جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے میں جنوری ۱۹۷۳ء میں پہلی بار شیخ الجامعہ منتخب کیا گیا تھا۔ اسی سال نومبر میں دہلی بحیثیت وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ میرا تقرر عمل میں آیا اور وہاں چلا گیا۔ میری غیر حاضری میں جامعہ اردو کے کام کی نگرانی نائب شیخ الجامعہ ڈاکٹر عتیق صدیقی کرتے رہے۔ میں مختلف مواقع پر، خصوصاً مختلف مجالس کی صدارت کرنے کے لیے دہلی سے علی گڑھ آتا جاتا رہا۔ لیکن اگست ۱۹۷۸ء میں جب میں جامعہ کو خیرباد کہہ کر پھر علی گڑھ آگیا تو جامعہ اردو کی ذمہ داری میں نے پھر سنبھال لی۔ کچھ عرصے کے بعد جب تیسری بار میرا انتخاب عمل میں آیا تو میری تجویز پر پروفیسر عبدالسلام، صدر شعبۂ لسانیات کا انتخاب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ہو گیا۔ اعزازی خازن کے عہدے پر الحاج عبیدالرحمٰن خاں شیروانی حسب سابق کام کرتے رہے۔ ان کے بعد ۸۶ء میں اس عہدے پر ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس زمانے میں جامعہ کے امتحانات میں بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھ کر چودہ ہزار کے قریب ہو گئی۔ ۱۹۷۶ء میں معلم اردو کا نیا امتحان کھل جانے کے بعد طلبہ نے اس کی جانب بھی توجہ کی۔ اس لیے کہ یہ پروفیشنل امتحان ہے۔ طلبہ کی تعداد کے ساتھ آمدنی بھی بڑھی۔ سالانہ بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہو گیا۔ آمدنی بڑھنے کے ساتھ ہم نے کئی بار اہلکارانِ جامعہ اردو کے گریڈوں

پر نظر ثانی کی اور ہنگائی بھتہ میں ہر سال اضافہ کیا۔

ایک خیال جو میرے ذہن میں عرصے سے گھوم رہا تھا یہ تھا کہ جامعہ اُردو کے میڈیکل کالج سڑک کے رُخ پر اگر دکانیں تعمیر کر دی جائیں تو اس کی آمدنی میں اضافہ ہو جائیگا۔ یہ ضمانت ہوگی جامعہ کے بُرے دنوں کے لیے۔ میں اِس سلسلے میں جب بھی تجویز رکھتا مجلس عام کے ایک بااثر رکن یہ کہہ کر کہ اس سے جامعہ کی عمارت کی 'جمالیات' خراب ہو جائے گی، مسترد کرا دیتے۔ بالآخر اورنگ آباد کی ۸۲ء کی مجلس عام کے جلسے سے پہلے میں نے امیر جامعہ، ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو کی اور ان کی مدد چاہی۔ چنانچہ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس سال بہ سال دہرائے جانے والے اعتراض پر کل اختیارات صدر کو سونپ دینے کی تجویز رکھی، جو منظور ہوگئی اور اس کے بعد انھوں نے دکانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے مجھے ہری جھنڈی ہلا دی۔ آجکل ترقی پسندی جس قدر آسان ہے تعمیر پسندی اسی قدر مشکل ہے۔ میں نے کچھ ذاتی تجربے کی بنا پر اور کچھ دوسرے لوگوں کے تجربے کی مدد سے دکانوں کا اچھا سا نقشہ بنوایا۔ جس میں جامعہ کی مرکزی عمارت کی جالیات اور پیش منظر کا نمایاں خیال رکھا گیا اور ان دکانوں کو 'اردو بازار' کے نام سے ۱۹۸۷ء میں مکمل کر دیا۔ اسی سال امیر جامعہ نے مجلس عام کے اراکین کے سامنے اس کا افتتاح کیا۔ اس وقت ہر شخص کے لب پر تحسین کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ 'اردو بازار' صحیح معنوں میں جمالیات اور مالیات کا سنگم بن گیا ہے۔

اس 'کارے کردم' کے ساتھ میری خواہش تھی کہ نئے انتخابات کے وقت میں سبکدوش ہو جاؤں، لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میری مدتِ عہدہ آئندہ انتخابات ہونے تک بڑھا دی گئی۔ پچھلے چند سالوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ بعض حضرات کی جاہ طلبی کی وجہ سے جامعہ اردو میں سیاست آتی جا رہی ہے۔

میرا ایک خواب اور اردو ذریعۂ تعلیم کے جونیر اسکول قائم کرنے کا رہ گیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کو شرمندۂ تعبیر کر سکوں گا۔ یہ خواب میں اپنے

شاگرد اور جامعۂ اردو کے اعزازی خازن، ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ کے لیے
رے جارہا ہوں ۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت تپاک ظاہر کیا ہے اور چوں کہ
س وقت جامعہ کا بجٹ تین لاکھ سے بڑھ کر دس لاکھ ہوگیا ہے اور اسی قدر رقم
سڈ پازٹ میں پس انداز ہے، قدم بقدم جامعہ اردو اس منزل کی جانب بھی بڑھ
ی ہے۔ دیکھنا ہے کہ معترضین جامعہ اردو کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے!
جامعہ اردو کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیق زکریا صاحب سے میری رفاقت کا یہ
ررھواں سال ہے، یعنی جنوری ۱۹۷۳ء سے وہ جامعہ اردو کے چانسلر اور میں
س کے وائس چانسلر کی حیثیت سے کام کررہا ہوں ۔ اس میں شک نہیں کہ وہ
یک فعّال شخصیت کے مالک ہیں ۔ ان میں علمی وعملی دونوں قسم کی صلاحیتیں
داداد ہیں ۔ ابتدائی چند سالوں میں ان کے توسط سے جامعۂ اردو کو چند بڑی رقوم بھی
کومتِ اتر پردیش اور مہاراشٹر کی جانب سے ملیں ۔ یہ انھیں کے سیاسی اثرات
کرشمہ تھا کہ شریمتی اندرا گاندھی، اپنے مشیروں کی صلاح کے علی الرغم جامعۂ اردو
ا' ڈکتورِ ادب' کی اعزازی ڈگری قبول کرنے پر تیار ہوگئیں ۔ اس سلسلے میں دہلی
ینیورسٹی کے شنکر ہال میں مارچ ۱۹۷۴ء میں ایک خصوصی کنونشن کی تقریب
منعقد کی گئی، جس میں مرکزی سرکار کے کئی وزراء کے علاوہ شیخ محمد عبداللہ بھی شریک
تھے ۔ بایں ہمہ اس قدر ضرور عرض کرنا چاہوں گا کہ اپنے 'منصفانہ' طرزِ عمل کی وجہ
سے بعض اوقات ان کا رویہ دوسرے عہدیدارانِ جامعہ اردو اور اراکینِ مجلس عام
کے ساتھ وہ نہیں ہوتا جس کی تعلیمی حلقوں میں توقع کی جاتی ہے ۔ جامعہ اردو کو بعض
اوقات وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرلیتے ہیں ۔ مثلاً ایمرجنسی کے
زمانے میں اس کی مجلسِ عام کا تائیدی ریزولیشن پاس کرنا ۔ ان میں اور چیف
جسٹس ہدایت اللہ صاحب میں، جن کے ساتھ مجھے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کرنے
کا شرف حاصل رہا ہے، بنیادی فرق ایک 'جسٹس' اور 'وزیر' کا ہے ۔

۱۹۸۵ء میں اردو لغت کی پیشہ ورانہ مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد میں نے جامعۂ اردو کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اپنی علمی تعمیر کا بھی سلسلہ شروع کردیا۔ اسی زمانے میں ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک و منیجر اور اپنے دوست اسد یار خاں صاحب کے پیہم اصرار پر میں نے "مقدمہ تاریخ زبانِ اردو" کا ترمیم و اضافہ شدہ ایڈیشن تیار کیا جسے انھوں نے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۹۸۷ء میں آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع کیا۔ اس سے ایک سال قبل وہ میرے مجموعہ کلام "دونیم" کا اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کرچکے تھے۔ میرے مرتب کردہ کے قصہ مہر افروز و دلبر کا نیا ایڈیشن انجمن ترقی اردو عنقریب شائع کرنے والی ہے۔

میرے انگریزی تحقیقی رسالے A Phonetic and Phonological study of the word in Urdu کا ترجمہ ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ نے نہایت صحت اور محنت کے ساتھ کیا جسے شعبۂ لسانیات نے اہتمام سے ۸۶ء میں شائع کیا۔ اسی سال میں نے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام لکھنؤ میں "ہندوستانی زبانوں میں اردو کا مقام" پر خطبہ دیا۔ جنوری ۸۸ء میں "نیاز فتحپوری کے اسلوب نگارش" پر نیاز میموریل خطبہ کراچی (پاکستان) جاکر دیا۔ جہاں مجھے "نیاز فتحپوری ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ (دہلی) کے لیے ایک مقالہ بعنوان "ڈاکٹر یوسف حسین خاں بحیثیت ناقدِ اقبال" ۸۸ء میں لکھا، جو انسٹی ٹیوٹ کے اگلے مجلے میں شائع ہوگا۔ اترپردیش اردو اکاڈمی کے لیے نظیر اکبرآبادی کی نظموں کا انتخاب تیار کیا اور ساہتیہ اکاڈمی (دہلی) کے لیے محمد قلی قطب شاہ پر "ہندوستانی ادب کے معمار" سیریز کے لیے ایک مونوگراف تصنیف کیا۔ یہ دونوں زیر طبع ہیں

دسمبر ۱۹۸۴ء میں میں مرکزی وزارت تعلیم کے ایک ثقافتی وفد کے رکن کی حیثیت سے میں پاکستان گیا۔ اس وفد کے لیڈر کنور مہندر سنگھ بیدی تھے اور دیگر اراکین میں ڈاکٹر فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، [illegible] آزاد،

پروفیسر حامدی کاشمیری، اور ڈاکٹر خلیق انجم تھے۔ ہماری پہلی منزل کراچی تھی جہاں ہوائی اڈے پر ہمارے استقبال کے لیے ڈاکٹر جمیل جالبی، جمیل الدین عالی صاحب، غلام ربّانی آگرو صاحب (ڈائریکٹر پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز) ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور دیگر مشاہیر موجود تھے۔ یہاں کی ایک مجلس میں ہم نے ہندوستان میں اُردو کی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر پرچے پڑھے۔ پاکستان کے اردو لغت بورڈ کا معائنہ کیا اور روزنامہ 'جنگ' کے دفتر میں سوال وجواب کی ایک صحبت میں شرکت کی، اور اس کی طباعت کی جدید ٹیکنیک کو دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ کراچی کے چوٹی کے ہوٹل آوری ٹاور میں سرکار کی جانب سے ہمارا قیام تھا۔ ہوٹل میں مُشروبات تلخ، مسلمانوں کے لیے ممنوع تھے۔ اس لیے ان سے استفادہ کنور صاحب، نارنگ صاحب، اور جگن ناتھ آزاد صاحب نے خوب اٹھایا۔ ان کے طفیل میں کچھ پاکستانی شعراء وادباء بھی غیر قانونی طور پر مستفید ہوتے رہے۔ ہم مُسلین، ترسا کئے۔ ہر ستم بالائے ستم یہ کہ نقل کے لیے جو بُھنے ہوئے بادام ہر کمرے میں رکھے رہتے تھے، میرے پڑوسی جگن ناتھ آزاد نے اپنی بڑھتی ہوئی ضرورت کے پیش نظر میرے کمرے سے غائب کرنا شروع کر دیئے۔ ایک دن میں ان کے کمرے میں گیا اور اپنا 'نقل' یہ کہہ کر طلب کیا میں نقل اور مے دونوں سے محروم ہونا نہیں چاہتا ورنہ بدعا دوں گا۔ معلوم نہیں کہ یہ دھمکی کن لمحات میں دی تھی کہ دوسرے دن سے آزاد صاحب کے اسہال شروع ہو گئے! اب ان کے بھی نُقل میں نقل کرتا تھا!

کراچی ہی کے دوران قیام ہمیں دن بھر کے لیے ہوائی جہاز سے موہن جوداڑو لے جایا گیا۔ اس کو نہ دیکھنا اپنے ورثے کے قدیم سرمائے سے محروم رہ جانا ہے۔ چنانچہ پاکستان کی ادبی اکیڈمی کے ڈائریکٹر آگرو صاحب کی رہبری، اور ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کی معیت میں ہم نے وادی سندھ، کے قدیم ترین آثار کو بالتفصیل دیکھا۔ یہاں شہری مدنیت کے تمام آثار موجود تھے۔

کشادہ سڑکیں، مکانات، غسل خانے، عبادت گاہیں غرض کہ ایک ترقی یافتہ تمدن کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ جب ہم ایک عبادت گاہ کے آثار کو بغور دیکھ رہے تھے تو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے نہایت معصوم سا سوال اپنے رہبر سے کیا "کیا یہاں کسی مسجد کے آثار نہیں ہیں؟"!!

دوپہر تک قیام گاہ پر واپس آئے تو تھک کر چور تھے۔ وہاں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پُر تکلف مگر قصباتی انداز کے کھانے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ کھانے کے بعد سندھی موسیقاروں نے کچھ دیر نوازا۔ اس کے بعد وفد کے ہر رکن کو ایک ایک سندھی شال کا تحفہ پیش کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سندھ کی رسم قدیم ہے۔ جب چلنے لگے تو سندھی ہندو نوجوانوں اور لڑکیوں کا ایک گروہ ہم سے ملنے آیا۔ زور سے السلام علیکم کہا لیکن ماتھے کی بندیوں سے شناخت ہو گئی۔ جگن ناتھ آزاد نے بے تابانہ انداز میں بڑھ کر ان سے کچھ پوچھ گچھ کی اور واپس آکر ہمیں بتایا کہ یہ لوگ کئی لاکھ کی تعداد میں سندھ میں موجود ہیں اور حکومت کے رویّے سے مطمئن ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں "جس طرح مسلمان ہندوستان میں!"

کراچی سے ہم اُڑ کر اسلام آباد پہنچے۔ اس نئے شہر کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا لیکن اب تک دیکھنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ واقعتاً نہایت دلکش مقام پر بسایا گیا ہے، پس منظر میں مری کی پہاڑیاں ہیں۔ کچھ دہرہ دون کا سا انداز پایا۔ گرمی کے موسم میں چند میل کے فاصلے پر مری پہاڑ پر چلے جائیے اور قدیم انداز کی شہریت سے دلچسپی رکھتے ہوں تو راول پنڈی اتر آئیے۔ ابھی یہ شہر عالم کُن فیکون میں ہے۔ صدر کا محل اور جامع مسجد زیر تعمیر تھیں لیکن سڑکیں، مکانات، بازار، ہوٹل اور دفاتر بن چکے تھے۔ نئی دہلی کی طرح وسیع و عریض ہے۔ اس لیے متوسط طبقے کے لئے ذرائع آمد و رفت کا مسئلہ رہتا ہے۔ یہاں ہمیں کئی استقبالیئے دیئے گئے جس میں 'مقتدرہ' کا سب سے دلچسپ تھا۔ اس کے سربراہ اردو کے مشہور مزاح نگار شفیق الرحمٰن تھے

وہ بنیادی طور پر فوجی تھے اور سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد فوجی مقتدرین نے ان کے سپرد مقتدرہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کی علمی سرگرمیوں کی تمام تر ذمہ داری ڈاکٹر وحید قریشی کی تھی جو اس وقت اس کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

اسلام آباد میں ہمارے پروگرام میں صدر پاکستان سے ملاقات کرنا بھی شامل تھی۔ یہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ ہمارے اعزاز میں دعوت دینا چاہتے ہیں جس میں ادیبوں اور شاعروں کو لاہور اور کراچی تک سے بلایا گیا ہے۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ایران کے اعلیٰ عہدیدار اپنے تمام مہام کے ساتھ آ گئے۔ صدر پاکستان کی تمام تر توجہ ان کی جانب ہو گئی۔ لہٰذا طے پایا کہ چونکہ لاہور بھی ہمارے پروگرام میں تھا، پہلے وہاں ہو آئیں۔ اس کے بعد ایک دن کے لیے صدر پاکستان کی دعوت کھانے راولپنڈی لوٹ آئیں۔ لاہور میں ادیبوں کا جم غفیر زیادہ پایا۔ الحمرا میں پرچہ خوانی تھی لیکن بجلی فیل ہو جانے کی وجہ سے ہال کے بجائے باہر انتظام کیا گیا۔ پچھلی قطاروں تک آواز نہ پہنچنے کی وجہ سے نہ مقالہ نگار کو مزا آیا اور نہ سامعین کو۔ اس لیے لاہور کا سفر علامہ اقبال کے مزار پر فاتحہ خوانی اور میل ملاقات تک محدود رہا۔ ہم اس سے قبل کراچی میں قائد اعظم کے مزار پر حاضری دے آئے تھے۔ اس کو ہر اعتبار سے جاہ و جلال کا مظہر پایا۔ علامہ اقبال کا مزار چونکہ شاہی مسجد کے دامن میں ہے اس لیے یہ نہ صرف مختصر ہے بلکہ غیر نمایاں بھی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مسجد کے زیر سایہ خرابات کی گنجائش ہے کسی مزار کی ہرگز نہیں۔ یقین نہ آئے تو اقبال اور مولانا آزاد کے مزاروں کا دیکھیے، دونوں شاہی مسجدوں کے جاہ و جلال میں غرق ہیں!

اسلام آباد کے سفر میں مجھے ایک نیا احساس ہوا (جس کی بعد کو شہادت ہمارے سفیر سنگھ صاحب نے دی) وہ یہ کہ پاکستان میں فوجی حکومت کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد تو از روئے سیاست میں سفکیا اسلام علامہ اقبال کا پلّہ بھاری

قائدِ اعظم محمد علی جناح کا پلڑا ہلکا ہوتا جارہا ہے۔ جناح صاحب سے عقیدت اور ان کی مقبولیت اب کراچی تک محدود ہے جب کہ اقبال پاکستان کی پوری فضا پر چھاتے جارہے ہیں۔ پاکستانی ٹیلی ویژن پر دونوں کی تصویریں ان کے اقوال اور اشعار کے ساتھ دکھائی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کسی سیاست داں کا قول اقبال کے شعر کی 'براقی' کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ اقبال کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ اس کی فکر پاکستان کو ایک اسلامی اساس بخشتی ہے جب کہ قائد اعظم کی اسلامی اساس ہی بہت کمزور تھی۔ ہر چند اقبال نے آخری ایام میں انھیں اپنا قائد کہا ہے لیکن اب سارا پاکستان اقبال کو اپنا قائد سمجھتا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کو جو مقام دیا جارہا ہے وہ اس کے مستحق بھی ہیں۔ پاکستان کسی نہ کسی معنوں میں "اسی مفکرِ اسلام کی امنگوں آرزوؤں، امیدوں اور جستجوؤں" کا عکس ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہندی مسلمانوں کے لیے ان کی سیاسی فکر کی اب کوئی معنویت نہیں رہی ہے۔

دوسرے دن لاہور سے سیدھا اسلام آباد پہنچے، صدرِ پاکستان کی ضیافت کھانے کے لیے۔ اسلام آباد سے شام کو موٹروں میں راول پنڈی جانا تھا جہاں صدر پاکستان کی قیام گاہ تھی۔ اس وقت کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سے ایک لطیفہ سرزد ہو گیا۔ جب ہوٹل کے صدر دروازے پر سب جمع ہو گئے اور روانہ ہونے ہی والے تھے کہ کنور صاحب نے مجھے کوئی کام یاد دلایا جس کے لیے مجھے اوپر کی منزل پر اپنے کمرے جانا ضروری ہو گیا۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میرا انتظار کریں گے۔ چند منٹ بعد جب میں واپس آیا تو قافلے کے سارے ساتھی جا چکے تھے۔ مجھے بعد کو ٹیکسی سے راول پنڈی جانا پڑا۔

صدر پاکستان کی ضیافت ان کی رہائش گاہ کے بڑے ہال میں تھی۔ ان کی تواضع و مدارات کے بارے میں جو حسنِ ظن رکھا تھا، ویسا ہی پایا۔ چہرے پر مستقل خندۂ دنداں نما تھا، گرم جوشی اور گرم اختلاطی۔ مجھے ان کے خاص گول میز پر بیگم ثاقبہ رحیم الدین اور جنرل رحیم الدین کے درمیان جگہ دی گئی۔ یہ دونوں میرے

صلبی رشتے سے عزیز ہیں اور جنرل ضیاء الحق کے نسبتی رشتے سے۔ ضیافت کے بعد دونوں جانب سے منتخب حضرات نے اپنا کلام سنایا۔ میں نے وہ غزل سنائی جو ۵۸ء میں امریکہ میں لکھی تھی لیکن بعض اشعار حسب حال تھے۔

ترے دیار میں کوئی بھی ہم زباں نہ ملا
ہزار نقش ملے، کوئی راز داں نہ ملا
میں سوچتا ہوں کہ یہ بھی حسین ہیں لیکن
تصورِ رُخِ جاناں کا امتحاں نہ ملا
کسے سنائیں غزل بہرِ شرحِ دلِ مسعود
کہ اس دیار میں کوئی بھی نکتہ داں نہ ملا

غزل پڑھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کا پس منظر بیان کر دینا چاہیئے تھا تاکہ پاکستانی میزبانوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ لیکن موقع ہاتھ سے نکل گیا اور اب ہم رخصت ہو رہے تھے۔ میں نے جنرل ضیاء سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "آپ کے بارے میں جو سُنا تھا ویسا ہی پایا" کہنے لگے "اس بار آپ آئیں گے تو ہمارے یہاں ہوں گے"۔

دوسرے روز لاہور کے ہوائی اڈے پر پھر پہنچے۔ اب سوئے وطن رواں تھے۔ یہاں جگن ناتھ آزاد نے، جن کے میرے درمیان پاکستان کے سارے سفر میں مزاح المومنین قسم کی نوک جھونک ہوتی رہی، یہ تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ریل سے سفر کیا جائے، میں نے کہا جی ہاں، مجھے اس سے اتفاق ہے اس لیئے کہ میں پنجاب کے طول و عرض سے نہایت اطمینان سے گزر جاؤں گا لیکن آپ کا جگن ناتھ امرتسر ہی میں رہ جائے گا البتہ 'آزاد' دہلی پہنچ جائے گا۔

راولپنڈی کے قیام میں ہم ننکانہ صاحب بھی گئے، جہاں پنجاہ صاحب گردوارہ ہے۔ یہاں ایک پہاڑی چشمہ بہتا ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ باباگرونانک نے پتھر پر اپنا پنجہ لگا کر دھارے کو روک دیا تھا۔

دھاریے کے منہ پر جو پتھر ہے اس پر انسانی پنجے کا نشان اب تک نمایاں ہے۔ میں اس کرامت سے تو زیادہ متاثر نہیں ہوا لیکن جس خاموش تنہائی میں گوردوارہ اپنا تماشائی بنا ہوا تھا اسے دیکھ کر افسوس ضرور ہوا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی نے چوکھٹ پر ماتھا ٹیکا اور دس روپے نذر کئے۔ جگن ناتھ آزاد صاحب نے ماتھا تو نہیں ٹیکا لیکن پانچ روپے نذرانے کے دیئے۔ وہاں بند دروازے کے علاوہ کوئی نذر لینے والا تک نہیں تھا۔ وہاں سے لوٹے تو میں گرونانک کی عظمت کے بارے میں سوچتا رہا۔ مہاتما گوتم بدھ کے بعد ہندوستان کی تاریخ کی اگر کوئی غیر مسلم شخصیت مجھے متاثر کرتی ہے تو وہ گرونانک کی ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے کس عقیدت سے انھیں یاد کیا ہے ؎

اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو "واہ گرو!"

وہاں سے لوٹتے وقت میں نے اقبال کے عقیدت مند اور اپنے دوست جگن ناتھ آزاد سے عجیب وغریب سوال کیا اور وہ اس سیاق میں کہ انھوں نے کہا جب مجھے کوئی 'شری' کہتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی گالی دے رہا ہو۔ میں نے کہا تلوک چند محروم کے صاحبزادے' عیسیٰ خیل کے باشندے آپ کی تو رگ و پے میں اقبال سرایت کئے ہوئے ہے۔ یہ مجھے بتایئے کہ آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو کس طرح انگیز کرتے ہیں:

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ اِلّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ اِلّا اللہ
زمانہ اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں' لا الٰہ اِلّا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ اِلّا اللہ

عملی مسلمان نہ ہونے کے باوجود، میرے وجود میں یہ اشعار ایک برقی سی دوڑا دیتے ہیں۔ آپ اس 'برہمن زادہ' کی وجدانی اسلامیت سے یکسر کرپکے نکلتے ہیں۔
اگر آپ اقبال کے اس قسم کے کلام کو من میں ڈوب کر محسوس کرتے ہیں تو آپ کو اب تک مشرف بہ اسلام ہونے سے کس چیز نے مانع رکھا ہے۔ گہرے سوچ میں پڑ گئے میں نے اپنے سوال کے نشتر کو اور زیادہ گہرا نہیں چبھویا۔

میں نے موجودہ زمانے میں ثقافتِ اسلامی سے قریب جن چند ہندو بزرگوں اور دوستوں کو پایا ہے ان میں پنڈت آنند نرائن مُلّا، جناب مالک رام صاحب، جگن ناتھ آزاد صاحب، اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے نام سرِ فہرست ہیں۔ اور ڈاکٹر گیان چند جین، اردو کے بڑے محقق ہونے کے باوجود میری اس فہرست سے خارج ہیں۔ لیکن مجھے آج مسلمانوں میں ایک بھی صاحبِ قلم ایسا نظر نہیں آتا جو ہندو ثقافت میں رچ بس گیا ہو!

۸۲ء میں میں اپنی آخری گھریلو ذمہ داریوں سے فارغ ہو گیا، یعنی شاہدہ اور زیبا کی شادیاں کر ڈالیں۔ چھوٹی بیٹی زیبا کی شادی جنوری ۸۲ء میں عبدالحق خاں صاحب سابق پرنسپل ٹیچرز ٹریننگ کالج کے چھوٹے صاحبزادے محمد عمران خاں سلّمہٗ سے ہوئی، جو جامعہ ملّیہ کے انجینئرنگ کالج میں لیکچرر ہیں۔ اور شاہدہ کی شادی چھ ماہ کی تاخیر سے جولائی ۸۲ء کو اپنے خالہ زاد بھائی ڈاکٹر شارق عالم آفریدی سے ہوئی جن سے اس کی نسبت عرصے سے طے تھی۔ برات کراچی سے آئی تھی۔ شارق فی الحال امریکہ میں ڈاکٹری کی اعلیٰ ڈگری کے لیے کام کر رہے ہیں اور شاہدہ بھی ان کے ساتھ وہیں مقیم ہے۔ زیبا نے باٹنی میں ایم۔ اے۔ فرسٹ کلاس کیا تھا۔ شاہدہ نے میری تحریک پر ایم اے۔ لسانیات میں داخلہ لیا اور اوّل درجہ میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد ایم۔ فل۔ کیا جس میں اس نے "قائم گنج کے پٹھانوں کی لسانی خصوصیات" پر مختصر سا مقالہ لکھا۔ یہ بعض لحاظ سے ایک منفرد تالیف تھی جسے آئندہ پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پھیلایا جا سکتا تھا۔ لیکن شادی کے بعد اس کی

ساری ریسرچ دھری رہ گئی۔ ہندوستانی لڑکیوں کا یہی المیہ ہوتا ہے کہ اچھی طالبات بھی بعض اوقات گھر گرہستی میں پھنس کر رہ جاتی ہیں۔ میری ایک پرانی خواہش یہ تھی کہ میری چاروں لڑکیوں میں سے کوئی نہ کوئی اپنے لیے تعلیمی کیریئر اختیار کرے۔ ان سب کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت اچھا رہا ہے لیکن غالباً اپنی والدہ کی تربیت کے زیرِ اثر ان سب نے گھریلو زندگی کو ملازمت پر ترجیح دی۔ بہر حال ان کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ اب جو چاروں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں تو 'گھر' خالی ہو چکا ہے۔ صرف کم بیش کی تثلیث رہ گئی ہے: میں (۶۹ سال)، میری بیوی (۵۸ سال) اور میرا اکلوتا بیٹا، جاوید حسین (۳۸ سال)۔

سترھواں باب

"شادم از زندگیٔ خویش ....."

میں اب عمر کی سترّویں سال کی چوٹی پر کھڑا ہوں۔ ۲۸ر جنوری ۱۹۸۹ء کو امید ہے، اسے سَر کرلوں گا۔ یتیمی کے بچپن سے لے کر شادمانی کے اس دور تک جب میں اپنی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو خود کو مطمئن پاتا ہوں۔ ہر چند ماں باپ کی بے وقت موت کی وجہ سے میں ان کی محبّت اور شفقت سے محروم رہا۔ زندگی کے بعض موڑوں پر مجھے ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا اور اس وقت بے بسی کے عالم میں میری آنکھوں آنسو چھلک اٹھتے۔ لیکن چوں کہ میرے حافظے میں ان کا کوئی مادّی نقش محفوظ نہیں تھا، اس لیے اس کیفیت پر بہت جلد قابو پالیتا، اور اس کے ساتھ یہ احساس قوی تر ہو جاتا کہ مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ مجھے میری ننھیال کے مشترکہ خاندان نے زندگی کی بہت سی تلخیوں سے بچالیا۔ اسی لیے میں ایسے خاندان کی برکتوں کا قائل رہا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے ضروریاتِ زندگی کے سلسلے میں وہ فراغ دستی حاصل نہیں رہی جو مجھے ہوتی اگر والدین کی شفقت کا سایہ نصیب رہتا لیکن میں اس اعتبار سے خوش قسمت رہا کہ مجھے ایک محبت اور خدمت کرنے والی رفیقۂ حیات ملی، جس نے [illegible] کی کمی کو بہت کچھ دل سے بھلا دیا۔ وہ مجھ سے عمر میں ۱۲ برس چھوٹی تھی، جب ۱۹۴۰ء میں وہ میرے گھر میں دلہن بن کر آئی تو اس وقت سترہ

کی بھولی بھالی لڑکی تھی۔ آتے ہی اس پر خانہ داری کا بوجھ پڑ گیا۔ اپنی والدہ کی تربیت کی وجہ سے وہ اِس پُرآشوب دور سے خوش اسلوبی سے گزری۔ کم عمری کی وجہ سے اس سے کبھی کبھی کوتاہیاں ہو جاتی تھیں۔ میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر بُرافروختہ ہو جاتا غصّے سے زیادہ ضد ہوتی۔ لیکن داد دیتا ہوں اس وفا کی دیوی کے صبر و تحمّل کی، وہ ہر بار یہی کہتی کہ میری ماں نے رخصت کرتے وقت نصیحت کی تھی کہ بیٹی! جس گھر میں جا رہی ہو کیسے ہی نامساعد حالات کیوں نہ ہوں وہاں سے چار کے کاندھوں ہی پر نکلنا۔ اس مہر و وفا کی دیوی کے صبر و تحمل نے بالآخر کام کیا اور یہ کندۂ ناتراش پٹھان بچہ رفتہ رفتہ رام ہوتا گیا۔ مجھ کا کہنا ہے کہ عین غیظ کے عالم میں بھی اس کے اس اعتماد میں کبھی کمی نہیں آئی کہ میں اُسے دل سے چاہتا ہوں، اس لیے انتظار کرتی رہی کہ اِس وحشیٔ رمیدہ پر کبھی تو فتح حاصل ہو گی۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہم دونوں کی محبت، رفاقت سے مل کر دو آتشہ ہو گئی۔ اب من تو شدم تو من شدی کا مقام ہے۔ وہ یقیناً میری نصف بہتر ہے اور میں اس کا نصف کم تر۔

اب جو اپنی نالائقیوں کا خیال آتا ہے تو وہ منظر سامنے آجاتے ہیں جب میں اسے سرزنش کرتا تو اس کے گلابی رخسار آنسوؤں سے تر ہو جاتے۔ میں بہت جلد اپنی حرکت پر نادم ہو جاتا اور وہ نہایت فیّاضی سے مجھے معاف کر کے زندگی کا سرا وہیں سے اٹھا لیتی جہاں اُسے چھوڑا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ تجدیدِ محبّت کا یہ عمل اگر بار بار نہ ہوتا تو شاید بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ یہ بھی نہ بڑھتی۔ چوں کہ وہ میری بیوی ہی نہیں میرا "انتخاب" بھی تھی اور یہ انتخاب مشترک خاندان کے اس ماحول میں ہوا تھا جس کی عکّاسی حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے۔ اس لیے میں اپنی واردات کے اظہار کے لیے یہاں سے حسرت کے حسن کارانہ الفاظ کا سہارا لیتا ہوں:

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے
ہم کو اب تک عاشقی کا وہ زمانہ یاد ہے

با ہزاراں اضطراب وصد ہزاراں اشتیاق
تجھ سے وہ پہلے پہل دل کا لگانا یاد ہے

تجھ سے کچھ ملتے ہی وہ بے باک ہو جانا مرا
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

تجھ کو جب تنہا کبھی پانا تو از راہِ لحاظ
حالِ دل باتوں ہی باتوں میں جتانا یاد ہے

غیر کی نظروں سے بچ کر سب کی مرضی کے خلاف
وہ ترا چوری چھپے راتوں کو آنا یاد ہے

دوپہر کی دھوپ میں مجھ کو بلانے کے لیے
وہ ترا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے

آج تک نظروں میں ہے وہ صحبتِ راز و نیاز
اپنا جانا یاد ہے، تیرا بلانا یاد ہے

دیکھنا مجھ کو جو برگشتہ تو سو سو ناز سے
جب منا لینا تو پھر خود روٹھ جانا یاد ہے

چوری چوری ہم سے تم آ کر ملے تھے جس جگہ
مدتیں گزریں پر اب تک وہ ٹھکانا یاد ہے

"گفتہ آید در حدیثِ دیگراں" کا تطابق جو میری اور حسرت کی عشقیہ واردات کے درمیان ملتا ہے، مجھے اپنا "سرِّ دلبراں" بیان کرنے کی زحمت و رسوائی دونوں سے فارغ کر دیتا ہے۔

بخت نے مجھے پانچ تندرست، خوبصورت اور ذہین بچوں کا باپ بنایا۔ میری چاروں لڑکیاں — فریدہ، نادرہ، شاہدہ اور ثریا — اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنے گھروں کی ہو چکی ہیں، جہاں وہ خوش اور مطمئن ہیں۔ میں اب پانچ بچوں کا نانا بن چکا ہوں۔ گرما کی تعطیلات

ہیں جب ان کے آنے سے گھر بھر جاتا ہے تو مجھے اپنے بچوں کے بچپن کا سماں یاد آجاتا ہے اور دن بھر کی کلفت کو فت ختم ہو جاتی ہے۔

نجمہ بڑی گہری ممتا کی مالک ہیں۔ انھوں نے اپنی بچیوں کو اس کا بہرۂ وا دیا ہے۔ ان کی چاروں بچیاں اپنی ماں پر جان دیتی ہیں۔ جس پر اکثر مجھے رشک آ ہے۔ میری جانب ان کی محبت، خدمت اور خیال کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

اپنے لڑکے جاوید حسین کی جانب سے۔ جو اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انجنی میں فزکس کا پروفیسر ہے۔ البتہ ہم دونوں فکر مند رہتے ہیں۔ اس کا تعلیمی ریکا ہندوستان اور امریکہ دونوں جگہ شاندار رہا ہے۔ اسی بنا پر اُسے پہلے ایک امریکن اور اس کے بعد ظہران کی یونیورسٹی آف پیٹرولیم اینڈ منرلز (۱۹۸۸ء) میں کولمبیا یونیورسٹ سے پی ایچ۔ ڈی کرنے کے فوراً بعد ملازمت مل گئی۔ اپنے تحقیقی کام اور تعلیمی تجربے بنا پر وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۳۵ سال کی عمر میں پروفیسری کے اعلیٰ عہدے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک سعادت مند بیٹا ہے لیکن اپنی دنیا میں اس قدر مست رہتا ہے کہ نہ اُسے اہلِ خاندان کا خیال ہے اور نہ سماجی رشتوں کا۔ اس تنہائی پسندی نے اس کے ذہن سے گھر بسانے کا خیال بالکل نکال دیا ہے۔ مجھے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ سوائے کتاب کے اسے کسی کی رفاقت عزیز نہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ (اب وہ ۳۸ برس کا ہو ہے) نہ صرف وہ ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے بھی نکل

سعدیؔ از دستِ خویشتن فریاد

ہم اس کے ماضی سے مطمئن رہے ہیں، حال بھی ایسا بے حال نہیں لیکن مستقبل میں اس پر کیا گذرے گی؟ اس کے لیے دونوں متوحش اور مشوّش رہتے ہیں۔

جب میں اپنی گذری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے ایک خاص قسم کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے سب سے بڑی خوشی اس بات سے ہوتی ہے

کہ خود کو دوسروں اور اپنی نظر میں باوقار پاتا ہوں۔ میں روایتی قسم کا مذہبی انسان نہیں ہوں تاہم مخصوص قسم کی سرّیت کا قائل ہوں اور وہ حضرات جو ان گلزار گاہوں کے راہ رو رہے ہیں ان سے عقیدت رکھتا ہوں۔ زندگی میں میرا عمومی رویّہ عقلیت پسندی کا ہے لیکن سینے میں ایک دلِ گداختہ رکھتا ہوں۔ سیاست کو اجتماعی زندگی کی ناگزیر ضرورت سمجھتے ہوئے مشتبہ نظروں سے دیکھتا ہوں اس لیے کہ اس میدان میں جواہر لال جیسے انسان کم نظر آتے ہیں۔ میری نظر میں اہلِ علم و ہنر زیادہ لائقِ تعظیم ہیں اسی لیے میر، غالب، اقبال اور ٹیگور جیسی ہستیوں کو دل سے عزیز رکھتا ہوں۔

عزتِ نفس مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ یہی میری طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ میں نہ کسی کی توہین کرنا چاہتا ہوں اور نہ توہین برداشت کرتا ہوں۔ عام طور پر صلح کل میرا مسلک ہے لیکن جب خودی اور خود داری پر چوٹ پڑتی ہے تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دینے پر تیار رہتا ہوں۔ میں عام طور پر دوست داری کا رویّہ رکھتا ہوں لیکن نامعقولوں سے انتہائی درجے کی سرد مہری بھی دکھا سکتا ہوں۔ میری بڑی بیٹی زبیدہ کو میرا یہ قول بہت پسند ہے کہ جب میں کسی کو پسند نہیں کرتا تو اس کے وجود تک کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیتا ہوں اور ہندوستان کی ستّر کروڑ کی آبادی کے ہجوم میں پھینک کر اس کی جانب سے مکمل طور پر غافل ہو جاتا ہوں۔ ایسا شخص کبھی سامنے آ بھی جاتا ہے تو میں اسے نہیں پہچانتا۔ اسے دیکھ کر مجھے غصّہ بھی نہیں آتا اس لیے کہ یہ بھی اثباتِ وجود کی ایک علامت ہوگی۔

انسانی تعلقات میں بھی ذکی الحس اور زود رنج واقع ہوا ہوں لیکن اسی وقت جب کسی کے قول و فعل سے مجھے تکلیف پہنچی ہو۔ بنیادی طور پر میں جلوت کا نہیں خلوت کا آدمی ہوں۔ اس لیے زندگی میں میرے دوستوں کا حلقہ ہمیشہ محدود و مخصوص رہا۔ میں کسی دوست کو اپنی نسبت سے احساسِ برتری کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ میرے لیے سب دوستوں کے قد برابر ہوتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اگر

وہ کسی لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے تو میں اس کی قدر کرتا ہوں۔ جہاں کسی دو
نے آنکھیں بدلیں میں نے راہیں بدل لیں ۔ دوست داری کے مسلک کے سلسلے
مجھے رحیم خان خاناں کا یہ دوہا بہت پسند رہا ہے :

رحمن دھاگا پریم کا مت توڑو جھٹکائے
ٹوٹے پاچھے پھر نہ ملے ملے گانٹھ پڑ جائے

اسی لیے ساری عمر میرا سفر ہجوم سے تنہائی کی طرف رہا ہے۔ میں تنہائی سے
مطلق نہیں گھبراتا اس لیے کہ خود سے نہیں گھبراتا۔ البتہ اس دن کے تصور سے
کبھی کانپ اٹھتا ہوں جب 'مونسِ تنہائی' کی رفاقت سے محروم ہو جاؤں گا۔
میں عام طور پر پابندیٔ اوقات سے کام کرتا ہوں لیکن بعض دنوں میں میرے
معمولات میں کوئی نظم و ضبط نہیں رہتا۔ یہی صورت جسمانی ورزش کی ہے، جس میں
مجھے صبح و شام ٹہلنا سب سے زیادہ پسند ہے۔ دہلی جیسے بڑے شہروں میں میرا سب
سے محبوب مشغلہ 'دکان بینی' رہا ہے۔ اس مشغلے میں گھنٹے گزار سکتا ہوں۔ میری
اس عادت پر میرے دوست ڈاکٹر خلیق انجم نے ایک بار کہا تھا "آپ کو کناٹ پلیس
سے خریداری کرنے کا بہت شوق معلوم ہوتا ہے حالاں کہ وہ سب سے مہنگا بازار ہے"
انھیں کیا معلوم ہے کہ کناٹ پلیس سے صرف کتابیں خریدتا ہوں جن کی قیمت ہر جگہ
یکساں ہوتی ہے۔ باقی دید ہی دید ہے خرید کچھ بھی نہیں۔ روپے پیسے کی جانب
سے لاپرواہ رہا ہوں یعنی کوئی گوں کی چیز مل جاتی ہے تو پھر "مانع دشت نوردی
کوئی 'زنجیر' نہیں ہوتی۔ پیسہ کو میں نے ہمیشہ خرچ کرنے کی چیز سمجھا لیکن اسی قدر
کہ قرض لینے کی نوبت نہ آئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آج تک نہ کسی
قرض نہیں لیا اور نہ دیا۔ کبھی دینا پڑا تو اس کو شمار نہ کیا۔ روپے پیسے کے سلسلے میں
مجھے عرفی کا یہ مشہور مصرع بہت پسند ہے ؎

ہر چہ باشی باش عرفی اندکے زردار باش

یہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ میں کسی منظم مذہب کا پابند نہیں ہوں سب

مذاہب کو تاریخ کی ردکا آوردہ سمجھتا ہوں، جو اپنا اپنا رول ادا کرتے ہیں اور فرسودہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے احیاء کا دور شروع ہوتا ہے، دوسرے الفاظ ان کے خرقۂ کہنہ میں نئی فکر کے پیوند لگنا شروع ہو جاتے ہیں لیکن ایک جگہ سے پیوند لگتا ہے تو دوسری جگہ سے مسک جاتا ہے۔ سب مذاہب میں کچھ دیرپا اقدار ہوتی ہیں جو اخلاقی اور معاشرتی قدروں کی شکل میں زندہ رہتی ہیں۔ لیکن ان اقدار کو بھی اضافی سمجھنا چاہیئے اس لیئے کہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا میں اقدارِ مطلقہ قسم کی کوئی چیز قائم بالذات نہیں ہوتی۔ ان کا مقام تو اعیانِ نا مشہود میں ہو سکتا ہے۔

میں تاریخ انسانی کو ہمیشہ معاشی محرکات کے تابع نہیں سمجھتا۔ ہر شخص اپنی زندگی میں تجربہ کر سکتا ہے کہ اس کا ہر عمل معاشی دباؤ پر سرزد نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن جسم و جان کا ایک عجیب و غریب مرکب ہے جس کی پُر پیچ راہوں میں وہ اقدارِ عالیہ پیدا ہوتی ہیں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں۔ اسی طرح فنونِ لطیفہ اور افکار و تصورات ہمیشہ معاشیات کے تابع نہیں ہوتے۔

میں چوکھٹوں اور سانچوں کی فکر کا قائل نہیں ہوں چاہے وہ سیاسی ہو یا معاشی یا مذہبی۔ یہ انتہائی شکل میں 'عقیدہ' کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور عقیدہ منافیٔ عقل ہوتا ہے۔ میں چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کا انفرادی حق سے کبھی بھی دستبردار ہونا نہیں چاہتا۔ انسانی سماج کے لیئے اشتراک بہت اچھی قدر ہے لیکن اشتراکیت کی جن شکلوں میں یہ رونما ہوا ہے، اس سے تشویش پیدا ہوتی ہے 'زر' زن اور زمین' کی اشتراکیت سے مسائل کم ہونے کے بجائے زیادہ ہو جاتے ہیں۔ 'زن' کے اشتراک پر تو اب تک کمیونسٹ روس تک عمل پیرا نہیں ہو سکا ہے۔

ستر برس کی عمر ہو جانے پر بھی میں ابھی زندگی سے تھکا نہیں ہوں۔ ؎

میری پیری میں ہے مانندِ سحر رنگِ شباب

ابھی تک میرے دل و دماغ چاق و چوبند ہیں اور مجھے کسی قسم کا جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہوا ہے۔ خون میں شکر کی زیادتی ہو جاتی ہے جسے میں غذا میں احتیاط کر کے قابو میں رکھتا

ہوں۔ مجھ میں ابھی تک حوصلۂ قلم و رقم باقی ہے۔ بلکہ یہ کہوں کہ زود قلم زیادہ ہو گیا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ علمی کاموں کے کچھ منصوبے رہ گئے تھے جن کی میڈیا سیٹی میں لگا ہوا ہوں۔ البتہ شاعری اب دور کی آواز ہو گئی ہے اور یہ تمنّا دل کی دل میں رہ گئی کہ کاش میں اپنے خونِ جگر سے کچھ اور شعری پیکر تراش سکتا! بعض اوقات اپنا کلام دیکھتا ہوں تو ایک اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ میں نے کیوں کر کہا؟ اگر مجھے زندگی دوبارہ عطا ہو تو مجھے کے ساتھ شعر کی دیوی کا پھر خواہش مند رہوں گا۔

بچوں کی جانب سے اطمینان ہے لیکن میری بیوی بیمار رہنے لگی ہیں۔ خون کا دباؤ ہے، ذیابیطس کی بھی شکایت ہے اور سب سے تکلیف دہ بات جوڑوں کا درد ہے اب پتّے میں کنکر پڑ گئے ہیں جس کے لیے آپریشن تجویز کیا گیا۔ یہ آپریشن چند ہفتے قبل خوش اسلوبی کے ساتھ ہو گیا۔ بجز آپریشن کے سلسلے میں ایک بہادر عورت ہیں۔ میں جس قدر جرّاحی سے گھبراتا ہوں وہ نہایت اطمینان کے ساتھ اسے قبول کر لیتی ہیں۔ کہتی ہیں میرا عقیدہ ہے کہ موت کا ایک دن معیّن ہے، اس لیے اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس عمر میں مجھے ان کی رفاقت کی سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے میری خواہش ہے کہ وہ ابھی زندگی میں دیر تک میری ہم سفر رہیں۔ ہر چند وہ بار بار یہی خواہش کرتی ہیں کہ وہ اس دنیا سے سہاگن جائیں۔

بیویوں سے قطع نظر مجھے اپنے مکان سے بھی بہت محبت ہے۔ میں نے اس کا نام جاوید منزل اپنے بیٹے کے نام پر رکھا تھا۔ اس کا دوسرا نام جو اس وقت میرے ذہن میں تھا وہ "وجودِ مسعود" تھا۔ اب یہ اس خود نوشت کا رکھ دیا گیا ہے۔ لیکن

چالیس سال کے ہمسفر

ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ کے جل گئے

جناب سید حامد
نئی دہلی

نئی تعلیمی پالیسی اور ہندستانی مسلمان

جس طرح فرد کے لیے احتساب ضروری ہے اسی طرح جماعت کے لیے بھی۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ کام آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اپنے سالانہ اجلاسوں میں کیا کرتی تھی، کانفرنس کے ہاتھوں سے زمامِ احتساب نکل گئی، اب کوئی جائزہ لینے والا نہیں رہا کہ ہندوستانی مسلمان کس حالت میں ہیں اور کس سمت جا رہے ہیں۔ دوسری طرف جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، آزادی کے بعد حکومتِ ہند نے مردم شماری کے تحت فرقہ وارانہ تعلیمی حالت کے اعداد و شمار شائع کرنا بند کر دیے۔ اس وقت یہ حال ہے کہ ہم اندھیرے میں ٹٹولتے رہتے ہیں کہ ہم کہاں پہنچ گئے، زوال کے کتنے مراحل ہم نے طے کر لیے اور کتنے ہنوز باقی ہیں، اور زوال کو روکنے کی کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں؟ ہم میں سے کچھ لوگ جنھوں نے مایوس ہونا نہیں سیکھا جلسے اور سیمینار کرتے رہتے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعلیمی حالت زیرِ بحث آتی ہے۔ اس مہینے کے شروع میں بمبئی کی انجمنِ اسلام نے ایک سہ روزہ سیمینار بلایا تھا۔ وہاں اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا گیا کہ ملک کے مسلم تعلیمی اداروں میں ربطِ باہم اور ان کے معیار کی ترقی اور مسلمانوں کے تعلیمی احتساب اور پیش رفت کے لیے ایک ملک گیر ادارہ کی ضرورت ہے جس کا کام وفاقی نگرانی، نصاب کی تشکیل، معائنہ، منصوبہ سازی اور اشاعتِ علم ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے ادارہ کی ضرورت پر غور اور ضرورت کے احساس کو عام کریں تاکہ اس کی تاسیس کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ ضرورت دراصل صرف تعلیمی اداروں کو وفاق کی لڑی میں پرونے کی نہیں ہے، بلکہ ان انجمنوں کی شیرازہ بندی بھی لازمی ہے

مقامی سطح پر اپنی بساط کے مطابق مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کے لیے کام کررہی ہیں۔ ایسی انجمنوں کی تعداد کافی نہیں لیکن کم بھی نہیں۔ آپ کے شہر بنارس میں اس کی ایک بہت اچھی مثال سرسید سوسائٹی ہے جس نے گزشتہ چار سال کے عرصے میں تعلیمی اور اصلاحی شعور کو عام کرنے کی کوشش کی ہے، جس نے ایک پرانے اسکول کو سہارا اور حوصلہ دیا ہے اور ایک چھوٹا سا پبلک اسکول کھولا ہے۔ اس نے ایک بڑے اور اعلیٰ معیار کے پبلک اسکول کا منصوبہ بنایا ہے جس میں عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جائے گی۔ یہ بات حیرت اور افسوس کی ہے کہ بنارس کے پُرحوصلہ اور دردمند باشندوں نے اتنے بڑے کارِ خیر کے لیے ابھی تک سات لاکھ روپے کی ابتدائی رقم کا بھی انتظام نہیں کیا جس سے اس اعلیٰ اسکول کے لیے زمین خریدی جاسکتی۔

اعداد و شمار میسّر نہ ہوں تو جائزوں، اشاریوں اور موٹے موٹے تاثرات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب ہمیں بتاتے ہیں کہ ہندوستانی مُسلمان تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کے سارے فرقوں سے پیچھے ہیں اور یہ فاصلہ دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ ملک کی زندگی اور اس کی پیش رفت میں اُن کا حصّہ بہت کم ہے۔ اور ملک نے ترقی کے جو قابلِ لحاظ مراحل طے کیے ہیں اُن کا فائدہ اُنھیں بہت کم پہنچا ہے۔ دیکھتے دیکھتے وہ فرقہ جو ملک کی زندگی میں اکثریت کا ہم قدم تھا، اس حیثیت کو پہنچ گیا جسے کیمپ فالوویا غُبارِ کارواں کہہ سکتے ہیں۔ ملک کے بٹوارے اور اس کے جلو میں ہونے والی خوں ریزی اور اُکھاڑ پچھاڑ نے اسے سراسیمہ کردیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا مُتوسط طبقہ، جس کے حصّے میں رہنمائی اور پیش قدمی آئی ہے اور جسے ریڑھ کی ہڈی کا نام دیا جاتا ہے، مقصد، غرض یا دہشت کے تحت اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کی نیّت، وفاداری، اور سلامتی صحیح ہوتے ہوتے مشکوک ہوگئی۔ اسے ایک ایسے جمہوری نظام کا سامنا کرنا پڑا جس میں اس کی حیثیت عضوِ ضعیف کی تھی اور جس کی حکمتِ عملی اور زیرکی اور چابک دستی سے وہ ناواقف تھا۔ کسی نے اس کو یہ نہیں بتایا (اور یہ اس کی قیادت کا قصور تھا) کہ جمہوریت میں پنپنے کے لیے سب سے

بڑی ضرورت ایک باخبر اور متحدہ رائے عامہ کی ہوتی ہے؛ اور جمہوریت میں نہ کوئی طبقہ حاکم ہوتا ہے نہ کوئی محکوم۔ اسے اس کی آہٹ بھی نہ ملی کہ انتخابات کے آلے کو ملک و ملت دونوں کے مفاد کے لیے کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے ایوانِ اقتدار اور دفاتر میں ہر طرف اکثریت کے ہی افراد نظر آئے اور اس نے ان کی آنکھوں میں ہمدردی اور محبت کے بجائے بے مہری اور کبھی کبھی عناد بھی دیکھا۔ اور ان لوگوں کے متعلق جو خود اس میں سے اٹھے تھے اور جنھیں اسمبلی اور پارلیمنٹ کے لیے چُنا گیا تھا، اس کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی کہ انھیں اس کی ترجمانی اور پیروی میں اپنی ذات اور اپنے منصوبوں کے لیے خطرات نظر آئے۔ دوسری طرف اکثریت اور حکومت نے یہ رُخ اختیار کیا کہ جو مسلمان مسلمانوں کا ذکر کرے، ان کی دشواریوں اور شکایتوں کو منظرِ عام پر لائے، یا ان کے ازالے کے لیے فریاد کرے، اسے متعصب اور فرقہ پرست اور بنیاد پرست اور رجعت پسند اور وطن دشمن سمجھا اور کہا جائے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ مسلمان صالح، متوازن اور معتدل رہنمائی سے یکسر محروم ہوگئے۔ جن رہنماؤں پر متواتر انتہاپسندی کی تہمت لگائی گئی ان میں سے کچھ بہ درجۂ مجبوری اور بزورِ ضد ویسے ہی بن گئے اور کچھ گھروں میں بیٹھ رہے؛ اور ان کے "روشن خیال" نمائندوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ زبان جب کھولیں تو نیشنل انٹیگریشن اور نیشنل مین اسٹریم کی ستائش میں اور حکومت کو یہ بتانے کے لیے کہ مسلمان مطمئن اور خوش ہیں اور جو غیر مطمئن ہیں ان کی وفاداری مشتبہ ہے۔

الغرض مسلمانوں نے جمہوریت کی پذیرائی دانش و بینش کے ساتھ نہیں کی۔ ان میں سے بعضوں کے تحتِ الشعور میں اقبال کا یہ شعر گونجتا رہا:

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کاری شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

(جمہوری طریقے سے دور بھاگو اور کسی پختہ کار انسان کے ہاتھ پر بیعت کرلو۔ کیونکہ دو سو گدھوں کے دماغ ایک انسان کی فکر کا مقابلہ نہیں کرسکتے)

وہ دو باتیں نظر انداز کر گئے : ۱۔ جمہوریت ہی جماعت کے قبضۂ اختیار میں ہے اور صالح اور مؤثر جمہوریت ہی سب سے بہتر نظامِ حکومت ہے اور انسانی تہذیب کا قافلہ اسی سمت میں سفر کرتا رہا ہے اور بہ تدریج اس منزل پر پہنچا ہے :
۲۔ ہندوستان نے ایک ایسی جمہوریت اختیار کی ہے جو آئین اور پالیسی کی رُو سے مذہب کی پابند نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جس طرح پاکستان نے اسلامی جمہوریت اختیار کی ہندوستان ہندو جمہوریت کا اعلان کر دیتا۔ اس وقت مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کی کیا حیثیت رہ جاتی؟ اس وقت وہ کھل کر برابری اور انصاف کا مطالبہ بھی نہ کر سکتے۔

غالباً شاد عظیم آبادی کا شعر ہے:

یہ بزمِ مَے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

ہماری طرف سے کمی یہ رہی ہے کہ ہم نے کوتاہ دستی اور کوتاہ اندیشی کو اپنا شعار بنا لیا اور اپنے جائز حقوق کی طرف سے غفلت برتی۔ یہاں یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہوگا کہ حقوق کی تصویر کا دوسرا رُخ فرائض ہیں۔ یہ اعتراض کرنے سے میری مُراد یہ نہیں ہے کہ ہم جو کچھ مانگتے وہ ہمیں مل ہی جاتا : لیکن کچھ نہ کچھ ضرور ملتا، کوئی جمہوریت دیر تک جائز مطالبات کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ تقاضا کرتے وقت لہجہ میں نرمی اور شائستگی ہونی چاہیے، لیکن انکسار نہیں۔ کیونکہ یہ سوال نہیں ہے، اپنے حق کی طلب ہے۔
ہماری بات کم ہی سُنی گئی جیسے سُنی جانی چاہیے تھی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم نے وہ رائے عامہ بنائی ہی نہیں جمہوریت جس کا احترام کرتی ہے۔ ہم بد دل ہو کر بیٹھ گئے، کُڑھنے، سُلگنے اور آہیں بھرنے لگے۔ اس احساس نے کہ ہمارے ساتھ نا انصافی ہو رہی ہے ہمارے حوصلے اور عمل کی طاقت اور آگے بڑھنے کی صلاحیت کو پست کر دیا۔ شکوہ سنجی مزاج بن جائے تو بات بنتی نہیں بگڑنے لگتی ہے شکایتیں وہی کرتے ہیں جو اپنے دُکھ کا مداوا خود نہیں کر سکتے زخمن میں خود کو سنوارنے اور مضبوط

کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی؛ جو نالہ و فریاد اور نکتہ چینی کو عمل کا بدل سمجھ بیٹھتے ہیں۔

ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

ہیں حکومت سے، اکثریت سے، دوسرے فرقوں سے شکایت بعد میں ہونی چاہیے، پہلے کوشش یہ کرنی چاہیے کہ اپنی ان کمیوں اور محرومیوں کو دُور کریں، جو خود ہماری وجہ سے ہیں۔ قدرت کا قانون یہ ہے کہ جس کسی نے بھی کمزوری پر قناعت کر لی، موت نے اُسی آن اُسے آدبوچا:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

انگریزی کی ایک مثل ہے کہ علم طاقت ہے۔ انسان طاقتور ڈنڈ بیٹھک سے نہیں ہوتا، علم سے ہوتا ہے اور ملک اور قومیں بھی اپنی آگہی کے بقدر طاقتور ہوتی ہیں۔ عربوں نے اوائلِ اسلام میں علم حاصل کیا اور دنیا کو تسخیر کر ڈالا؛ عربوں نے موجودہ دور میں علم کو ترک کر دیا تو ایک چھوٹے سے ملک نے اُن کو زیر و زبر کر دیا، اُس بڑی دولت کے باوجود جو عربوں کے پاس تھی اور جسے زرِ سیّال کہتے ہیں۔

اس تمام گفتگو سے نتیجہ یہ نکلا کہ جمہوریت میں پامال نہ ہونے، اور فیضیاب ہونے اور پیش قدمی کرنے کے لیے دو باتیں ضروری ہیں: پہلی باخبر اور متحد رائے عامہ کی تشکیل و اشاعت؛ دوسری اس طاقت کا حصول جسے علم اپنے ساتھ لاتا ہے۔ غور کیجیے تو ایک تیسری بات بھی درکار ہوگی؛ حکومت کے ایوان اور دفاتر میں ہماری قابلِ لحاظ موجودگی۔ اس کے لیے مقابلے کے امتحانوں میں شرکت لازمی ہے۔ الغرض ان تینوں مقاصد کے حصول کا ذریعہ صرف ایک ہے: تحصیلِ علم۔ اس وقت سماں یہ ہے کہ ہم تعلیمی اعتبار سے درماندہ ہیں۔ بہت سے ماں باپ بچّوں کو اسکول نہیں بھیجتے، انھیں بچپن سے گھریلو صنعتوں میں جھونک دیتے ہیں جس سے ان کے ذہن اور جسم کے نشو و نما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ بعض ماں باپ شروع میں شرماحضوری اپنے بچّوں کو ابتدائی اسکول میں داخل کر دیتے ہیں اور پہلی فرصت میں انھیں

اسکول سے اٹھا لیتے ہیں۔ تاکہ گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ سوچیے یہ کتنا بڑا جرم
ہے جس کا ہم ارتکاب کرتے ہیں۔ ہماری آئندہ نسل اس وطیرہ سے تباہ ہو رہی ہے۔
ان چند باتوں میں جن میں ہم نے امتیاز حاصل کیا ہے بچوں سے اسکول چھڑا دینے
یا ڈراپ آؤٹ کی شرح ہے۔ آئندہ نسلوں کی تباہی میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو
لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے ہماری غفلت نے اُسے پورا کر دیا۔ ہم ملک کی زندگی کے
مختلف شعبوں میں برادرانِ وطن کے ساتھ مقابلہ کیوں نہیں کر پاتے ؟ اس لیے کہ
ہمیں گھر میں نہ تعلیمی ماحول ملتا ہے۔ نہ تعلیمی مدد۔ ہماری تعلیم کی بنیاد کمزور رہ جاتی
ہے اور جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو یہ کمزوری رنگ لاتی ہے، آنکھیں دکھاتی ہے۔
ہمارے اعتماد کو گھائل کر دیتی ہے : جہاں اعتماد گھائل ہوا صلاحیتیں کند ہو جاتی
ہیں۔ صلاحیت اپنے عروج پر جب ہی پہنچتی ہے جب حوصلہ ساتھ دیتا ہے۔ ایک
دروازہ سے بنیادی کمزوری اور گلہ مندی داخل ہوتی ہے تو دوسرے دروازے
سے حوصلہ باہر نکل جاتا ہے۔ ہماری اس کم حوصلگی اور کم علمی کی تحریر آپ کو ملک
کی پیشانی پر لکھی ہوئی ملے گی۔ نہ اہلِ علم و فضل ہمارے یہاں نظر آئیں گے۔ نہ اہل
اقتدار، نہ اہلِ امتیاز۔ تلاشِ صلاحیت (ٹیلنٹ سرچ) مقابلے کے امتحانوں
(ڈاکٹری، انجینیرنگ، آئی آئی ٹی، بزنس مینجمنٹ کے انسٹی ٹیوٹ، کوئیز (عام
باخبری کی آزمائش) کے نتیجے نکلتے ہیں تو ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ بڑی
اور درمیانی صنعتوں میں ہمارا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ جو ملت جس پر چھوٹی بات
اور چھوٹی سطح حرام تھی اب چھوٹے پن کے طلسم میں گرفتار ہے۔ چھوٹی موٹی صنعت'
چھوٹی موٹی تجارت جو عام طور پر خوانچہ اور بساطخانہ سے آگے نہیں بڑھتی، چھوٹا
سا افق جو محلہ اور مقامی شخصیات تک محدود رہتا ہے، چھوٹی سی نگاہ، چھوٹا سا
حوصلہ۔

ہم آسانی سے بہکانے میں آجاتے ہیں، ہمیں بھڑکا دینا کوئی دشوار نہیں'
ہمارے اندر آپس میں پھوٹ ڈالنے کے لیے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہمارے

یہاں وقت کی قدر نہیں ؛ صفائی کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے ، محنت سے ہم جی چُراتے ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ سے ہمارا ناطہ جُڑا ہُوا ہے۔ ہر شخص اپنی راہ الگ نکالتا ہے۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں کر پاتے۔ ادارہ چلانے اور اس طرح آگے بڑھنے کی صلاحیت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی اُٹھے اور ملت کو یہ بتانے کی کوشش کرے کہ مذکورہ کمزوریوں سے برأت حاصل کریں۔ تو کوئی نہ اس کی سُنے گا نہ اُسے سمجھے گا، کہ عقل کو ہم نے مُعطل کر رکھا ہے ؛ نشیب و فراز اور پیچ و خم سے آگہی میں دشواریاں ہی دشواریاں ہیں ، آسان راستہ جذباتی تن آسانی سے نکلتا ہے۔ ہم میں اپنی بھلائی بُرائی کا شعور باقی نہیں رہا۔ شعور نہ رہے تو صحیح فیصلہ کیونکر ہو اور صحیح قدم کیسے اٹھایا جائے ؟ سمجھنے بوجھنے سوچنے بچارنے کی عادت علم سے آتی ہے، اسی سے عقل پر جِلا ہوتی ہے، اسی سے افق وسیع ہوتا ہے اور انسان اپنے تنگ دائرے سے نکل آتا ہے۔

ثابت ہوا کہ ہماری بیماریوں اور کمزوریوں اور پسماندگیوں کا علاج صرف علم ہے۔ اگر ہم علم کو مضبوط پکڑلیں گے تو دنیا کی دوسری نعمتیں ہماری گرفت میں آجائیں گی۔ تاریکی اور پسماندگی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ علم نہ صرف ہم کو بہتر انسان اور بہتر مسلمان بنائے گا ، نہ صرف ہمیں اپنے بھلے بُرے سے آگاہ کرے گا ، نہ صرف ہمیں حسد ، بغض اور کینہ اور تنگ نظری سے بچائے گا ، نہ صرف ہمارے امکانات کو قوت سے عمل میں لائے گا، بلکہ زندگی کا جو شعبہ ہم نے اختیار کیا ہے اس میں ہماری کارگزاری کو حال سے کہیں بہتر بنادے گا۔ علم سے ہمیں فراست اور بصیرت اور آگاہی ملے گی اور اس کے علاوہ آسائش ، آرام ، عافیت اور دولت ۔

علم سے مُراد صرف دنیاوی علم نہیں ، دینی علم بھی ہے۔ اگر ہم نے دنیا کا علم حاصل کرلیا اور دین سے بے خبر رہے تو یہ ٹوٹے کا سودا ہے۔ اس طرح ہماری شخصیت ادھوری رہ جائے گی اور ایک بہت مختصر سی زندگی کی لذتوں کی خاطر ہم دائمی زندگی کے سکون و عافیت کو کھو بیٹھیں گے، ہم اپنی تخلیق کی غایت سے غافل ہوجائیں گے اور اپنے خالق کی عبادت اور اس کی مخلوق

کی خدمت سے محروم رہ جائیں گے، دنیوی علوم کی تحصیل کے لیے حکومت (مرکزی، ریاستی اور مقامی) نے بڑے سروسامان کیے ہیں، اور مختلف جماعتوں نے جن میں سے مسلمان بھی ایک ہیں، خود اپنے عصری اسکول بھی کھولے ہیں۔ دینی تعلیم کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ انھوں نے دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلما جیسی جامعات کھولیں اور ملک کے مختلف حصوں میں دارالعلوم اور دینی کالج، مدرسے اور مکتب بھی۔ ملک میں جا بجا ہمیں مدرسے اور مکتب ملیں گے۔ ان چھوٹے چھوٹے مکتبوں اور ان کے خستہ حال معلموں نے اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ فتنۂ ارتداد کو روکنے میں اُن کا بڑا حصہ ہے۔ اگر مسلمان اس ملک میں من حیث القوم زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ مدرسوں کا دفاع اور تقویت کی جائے اور گوشہ گوشہ میں مدرسے قائم کیے جائیں اور ان کو معقول ڈھنگ سے چلانے کا انتظام ہو، اور کوئی مسلمان بچہ ایسا نہ رہ جائے جسے دین کی تعلیم نہ ملی ہو۔

دینی تعلیم اور ذہنی آگہی کی حالت اس وقت حیرت ناک ہے۔ مثالیں بے شمار ہیں، میں صرف ایک دوں گا۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے تلاش صلاحیت یا ٹیلنٹ سرچ کی ایک اسکیم شروع کی ہے۔ اس کے سامنے ایک بچی انٹرویو کے لیے آئی جس نے ہائی اسکول میں امتیازی نمبر حاصل کیے تھے، جس کی معلوماتِ عامہ بہت اچھی تھی۔ اس کا نام معراج فاطمہ تھا۔ پوچھا گیا کہ معراج کے معنی کیا ہیں۔ جواب ملا، میرا راج۔ یہ جواب ملت کے منہ پر طمانچہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بچوں کا اسلامی نام رکھ دیا اور ان کی تربیت کا حق ادا ہو گیا۔ الزام اس نئی نسل کو نہ دیجیے جو دین سے بیگانہ اُٹھ رہی ہے؛ اس نسل کو دیکھیے جس کے زیر سایہ وہ اُٹھی ہے۔ کیا مسلمان والدین اس حد تک از کار رفتہ ہیں کہ وہ دین کی بنیادی باتیں اپنے بچوں کے ذہن اور دل میں نہیں بٹھا سکتے۔ کیا وہ اتنے کنگال ہیں کہ بچوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکتے۔ کیا وقت کی تنگی کا سوال صرف دینی تعلیم کے ضمن میں اُٹھتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ وہ لوگ جو بچوں کی دنیوی تعلیم پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے

ہیں اس سے بہت کم صرف ان کی دینی تعلیم پر کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ جواب صاف ہے۔ وہ دین کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ وہ اہمیت صرف اس بات کو دیتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے علوم پڑھ لیں جن کی مدد سے انھیں نوکری مل جائے اور وہ اپنا پیٹ پال سکیں۔ تو گویا انسانیت کا منتہا پیٹ پالنا ہے۔ وہی پیٹ پالنا جو جانوروں کی ابتدا ہے۔ حق شناسی۔ خدا پرستی اور دردمندی اگر نہ آئی تو انسانوں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہ گیا۔ انتہائی غفلت ہوگی اگر ہم یہ اہتمام نہ کریں کہ ہر مسلمان گھر میں اس زبان میں جو اس کے مکیں بولتے ہیں ایک چھوٹا سا کتابچہ ضرور ہو جس میں اسلام کی بنیادی معلومات رسول اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کی سوانح اور دنیائے اسلام کی مختصر تاریخ دی گئی ہو۔ یہ امر ہم سب کی توجہ کا مستحق ہے اور خصوصاً ان اداروں کا جو دینی تعلیم سے سروکار رکھتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے ایک نظم کی ضرورت ہوگی جو ہر محلے پر حاوی ہو۔ والدین کا فرض ہوگا کہ اس میں لکھی ہوئی باتیں بچے کے کانوں میں شروع سے ہی ڈالیں اور وہ بڑا ہو جائے تو اسے یہ کتابچہ پڑھائیں اور اسے ذہن نشین کراتے رہیں۔ یہ کام دشوار نہیں ہے۔ تھوڑی سی توجہ اور وقت چاہتا ہے۔ یہ کام ہمیں کل سے ہی شروع کر دینا چاہیے، جہاں کہیں ہم ہوں۔

اس نفسیاتی امر کو ملحوظ رکھیے کہ جو نقش بچپن میں بیٹھتے ہیں وہ حافظے سے کبھی محو نہیں ہوتے۔

صبح کا بھولا شام کو گھر ضرور آتا ہے۔ پہلے نقوش اس دینی تعلیم کے ہونے چاہییں جو گھر میں دی جائے۔ یہ نقوش اس مشاہدہ پر بھی مبنی ہوں جو دین سے متعلق عبادات اور افعال بچہ اپنے بڑوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔

اس تعلیم و تربیت کی دوسری سیڑھی محلے کے گھر، مسجد یا مدرسے میں قرآن کی تعلیم ہوگی۔ اس نظام کو پھر زندہ کرنا چاہیے جس کے تحت پڑھی لکھی خواتین فی سبیل اللہ اپنے پڑوس کے بچوں کو دین کی تعلیم دیا کرتی تھیں۔ ایسا کرنا بھی زیادہ دشوار نہیں ہے۔ بحمد للہ مسلمان آبادیوں میں کئی گھر اب بھی ایسے مل جائیں گے جہاں عورتیں دین میں

دستگاہ رکھتے ہیں اور جن کے پاس اس خزانے کو نئی نسل تک منتقل کرنے کے لیے
وقت بھی ہے۔ سوال صرف انھیں تلاش اور آمادہ کرنے کا ہے۔ جو قریہ قریہ بستی بستی
اور محلہ محلہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ہم لوگ اس وقت میں سے جس کا ایک کثیر حصہ ہم خوشدلی
سے برباد کر دیتے ہیں، تھوڑا بہت وقت اس کارِ خیر کے لیے نکال سکیں۔ سب
لوگ نہیں کچھ لوگ تیار ہو جائیں تو یہ مرحلہ سر ہو جائے۔ ایک دفعہ یہ کام شروع
ہو گیا تو خود بخود چلتا رہے گا۔

اس زینہ کی تیسری سیڑھی دینی تعلیم کے وہ مدرسے ہیں جو شہروں اور دیہات
میں قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کثیر تعداد ان مدرسوں کی ہے جنھیں دینی تعلیمی کونسل
معرضِ وجود میں لائی۔ ان مدرسوں کی تعداد میں غیر معمولی توسیع کی ضرورت ہے۔ اور
موجودہ مدرسوں کو بہتر بنانا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اہم نگرانی کے نظام کو مضبوط
کرنا ہے۔ بہت سے اضلاع میں یہ تلخ تجربہ ہو رہا ہے کہ اتنا روپیہ بھی فراہم نہیں
ہو پاتا کہ ضلع کے ناظم تعلیم دین (ڈسٹرکٹ آرگنائزر) کی تنخواہ نکل آئے۔ یہ بات ہم سب
کے لیے شرمناک ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ دینی تعلیمی نظام کا سرچشمہ بستی کا ضلع
ہے جہاں عدیل عباسی صاحب مرحوم کی سعیٔ بلیغ کے نتیجہ میں وہ مہم شروع
ہوئی جس کو چٹکی کی تحریک کا نام دیا گیا۔ شہر اور دیہات ہر جگہ ہماری بہنوں نے
یہ بات مان لی کہ جب گوندھنے کے لیے آٹا نکالا جائے گا تو اس میں سے ایک چٹکی
الگ کر دیا جائے گا۔ نام چٹکی کا دیا گیا لیکن عملاً مٹھی بھر آٹا نکالا گیا۔ ایک ہفتہ
میں جتنا آٹا اس طرح جمع ہو جاتا وہ نقدی کی شکل میں دینی تعلیم کے لیے دے دیا
جاتا۔ اس نظام کے تحت ہزاروں مدرسے کھولے اور چلائے گئے اور اب تک
چلائے جا رہے ہیں۔ مگر اب کچھ عرصے سے اس تحریک میں وہ گرمی نہیں رہی۔
علاوہ ازیں اس تحریک نے زور مشرقی اضلاع میں ہی پکڑا، مغربی اضلاع میں
خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ گزشتہ ماہ میں سنبھل ضلع مرادآباد میں یو۔پی کے
مغربی اضلاع کی دینی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ امید ہے کہ اس کانفرنس کے نتیجہ

میں جسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم نے صدارت سے نوازا"
روشنی اور آگہی کی یہ تحریک مغربی یو۔پی میں بھی فروغ پائے گی۔ ہمیں پوری ریاست
کو سیراب کرنا ہے۔ مدرسوں کی مالی مشکلات کو دور کرنا، آرگنائزروں کو تلاش کرکے
انھیں معقول مشاہرہ دینا اور خود صوبائی دینی تعلیمی کونسل کے مرکز کو مضبوط کرنا اور
اس لائق بنادینا کہ دینی مدارس کی نگرانی، امداد اور توسیع کا کام بخیر وخوبی انجام
پاسکے، یہ سارے امور ہم سب کی توجہ چاہتے ہیں۔ چٹکی کے نظام کی بڑی خوبی یہ ہے
کہ تعلیم کی تحریک میں ایک بڑے طبقہ کی شرکت ہو جاتی ہے اور کسی پر بار نہیں پڑتا اور
یہ احساس عام ہوجاتا ہے کہ دینی تعلیم ضروری ہے اور ہر ایک مسلمان اس بات کا ذمہ دا
ہے کہ کوئی مسلمان دینی تعلیم کے تعلق سے اَن پڑھ نہ رہ جائے۔ دوسرا طریقہ وسائل فرا
کرنے کا یہ قرار پایا ہے کہ ایک ماہ میں گھر پر جتنا خرچہ ہو اس کا ۱/۳۰ حصہ دینی تعلیم کی نذ
کیا جائے۔ غور کیجیے کیا ہم اتنی چھوٹی سی مدد بھی تعلیم دین کی نہیں کرسکتے۔ پھر ہمیں
اس کا حق کس نے دیا کہ مسلمانوں کے حالِ زار پر افسوس کریں اور ان کے علمِ دین
بے بہرہ ہونے پر متاسف ہوں۔ کوئی قوم اور کوئی جماعت غم کے احساس و اظہار
کامیاب اور سرخرو نہیں ہوتی۔ اس قسم کا احساس رسمی اور اظہار کھوکھلا سمجھا جائے
اگر اس کے لیے ہم عمل اور ایثار کرنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ پڑھے لکھے اور نسبتاً خوشحا
لوگوں پر پوری قوم کا قرض ہے۔ ہمارے بیشتر دینی بھائی اَن پڑھ ہیں اور ہم میں سے
ایک بڑی تعداد اسلام کی مبادیات سے بھی ناواقف ہے۔ ان لوگوں کو دینی تعلی
دلانا ہمارا اوّلین فرض ہے۔ ورنہ ہمارے دیس میں اسلام باقی نہیں رہے گا مسلم
کا تو نقصان ہوگا ہی خود ملک بھی ثقافتی افلاس سے دوچار ہوجائے گا۔

مدرسے کھولنا اور چلانا ہی کافی نہیں ہے۔ کیونکہ دو ریاستوں کیرالا اور گجرا
کو چھوڑ کر باقی ریاستوں میں یہ عالم ہے کہ جو بچے عام اسکولوں میں پڑھنے جاتے
مذہب سے انھیں اونگھتی ہوئی آگاہی بھی نہیں ہوتی۔ اَن کے لیے مسجدوں میں صُ
دینی تعلیم کا اہتمام لازمی ہے یہ کام محلہ محلہ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر وہ خلیج جو مغربی

اور انگریزی خوانوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے، پاٹی نہیں جا سکتی۔ اسی طرح عربی مدرسوں میں اس کا اہتمام ہونا چاہیے کہ اس کے طالب علم کسی مرحلہ میں عصری تعلیم کی طرف بہ آسانی منتقل ہو سکیں۔ یہاں انگریزی، سائنس اور حساب کی تعلیم درکار ہوگی۔ مدرسوں کے پاس وسائل کم ہیں۔ مذکورہ مضامین پڑھانے والے استادوں کو بڑی تنخواہیں دینا ہوں گی۔ مان لیجیے کہ وسائل ہو بھی گئے، تو ایک ہی مدرسہ میں تنخواہ کے اعتبار سے دو قسم کے استادوں کی موجودگی سے نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے بھی یہ ضروری ہے کہ ہر ضلع اور ہر شہر میں ایک انجمن تعلیم یا ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی جائے جو مقامی تعلیمی مسائل کو اجتماعی وسائل اور باہمی مشورے کے ذریعے حل کرے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن اور قابلِ عمل ہو سکتا ہے کہ مقامی اسکول یا کالج سے مذکورہ مضامین کے استاد مدرسہ میں آکر مذکورہ مضامین کی جز وقتی تعلیم دے دیا کریں، یا مدرسہ کے طالب علم قریب کے اسلامی اسکول میں جا کر وہ مضامین پڑھ لیں لیکن ہر جگہ مسلمانوں کے اہتمام میں چلنے والے مدرسہ اور انگریزی اسکول کا ایک دوسرے کے قرب میں ہونا ضروری نہیں ہے۔ ایسا اتفاق کم ہی شہروں میں ہوگا۔ ایسی صورت میں مدرسہ کے اوقات کے بعد مدرسہ کے طلبہ کو خود مدرسہ یا کسی دوسری مناسب جگہ پر بیرونی استادوں کے ذریعہ انگریزی، ریاضی اور سائنس کی تعلیم دی جائے گی۔ اور ان اساتذہ کی خدمت میں معقول مشاہرہ پیش کیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ عربی مدرسوں کا نصاب پہلے ہی سے گھٹا ہوا گنجان اور بھاری ہے۔ زائد مضامین پڑھانے کے لیے وقت کہاں سے آئے گا۔ اس مسئلہ کو دو طرح سے حل کر سکتے ہیں: اوّل تو ان مضامین کو حذف کر کے جن کا تعلق دین سے نہیں ہے؛ دوسرے، کورس کی مدت میں سال یا دو سال کا اضافہ کرنے کے ذریعہ۔ اس تجویز پر اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس طرح دینی عنصر بہ تدریج کم ہوتا جائے گا اور عصری اور غیر دینی مضامین بڑھتے چلے جائیں گے۔ اگر احتیاط برتی اور نگاہ رکھی جائے تو اس کھٹکے کو دور کر سکتے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ یہ تجویز دینی حلقوں

میں مقبول نہیں ہوگی لیکن بادی النظر کے اس ردِ عمل میں ترمیم ہو سکتی ہے۔ اگر موجودہ طرز و نصابِ تعلیم کو بدلا نہیں گیا تو اس کے نتائج بالآخر مضرت رساں ہو سکتے ہیں۔ اس وقت یہ عالم ہوگیا ہے کہ علما کے خاندانوں کو چھوڑ کر بیشتر طالب علم جو عربی مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں زیادہ ذہین نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی تو والدین انھیں اس لیے مدرسوں میں بھیجتے ہیں کہ وہ اسکولوں میں نہیں چل سکتے۔ ان طالب علموں کے سر پر جب دستارِ فضیلت باندھی جائے گی تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ عالم ہونے کا حق ادا کر سکیں گے؟ ہمیں دینی مدرسوں میں اوسط اور اوسط سے زیادہ ذہانت کے طلبہ کے لیے کشش کا سامان پیدا کرنا ہے۔ یعنی یہ امکان پیدا کرنا ہے کہ وہ دینی تعلیم مکمل کرکے یا اس کے ابتدائی حصّہ پر راسخ ہو کر جدید تعلیم کی طرف جب چاہیں چلے جائیں ہمارے اعلیٰ مدارس کے فارغین کو عصرِ حاضر کے علوم سے آگہی اس لیے بھی درکار ہے کہ وہ نئی نسل کو، جو عقیدہ سے زیادہ عقل پر زور دے رہی ہے اور جو آغاز ہی شک و شبہ سے کرتی ہے، دین کی صداقت اور فیوض کا قائل کر سکیں۔ اور جب ضرورت پڑے تو اجنبیوں کو دینِ اسلام سے، نئے حالات اور نئے علوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے، روشناس کر سکیں، اور دین پر جب الحاد یا دوسرے مذاہب کی طرف سے حملہ یا اعتراض ہو تو اس کا دفاع کر سکیں اور جواب دے سکیں۔

لیکن یہ انتظام ضرور رکھا جائے کہ بیرونی مضامین جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اختیاری ہوں۔ جو طالب علم انھیں پڑھنا چاہیں انھیں پڑھا دیے جائیں جو نہ چاہیں، وہ انھیں نہ پڑھنے کے لیے آزاد ہوں۔ یہ بات بھی واضح ہونی چاہیے کہ دینی مدارس میں حکومت مداخلت نہ کر سکے۔ اور یہ بات اس سے بھی زیادہ واضح کہ دینی مدارس کے نصاب میں جو ترمیم بھی ہو ان کے اہتمام کے اتفاق سے ہو۔ دراصل یہ مسئلہ اتنا اہم ہے کہ علمائے کرام کی مجلسِ شوریٰ کی توجہ کا مستحق ہے۔ وہ اپنی صوابدید کے مطابق، مذکورہ تجاویز کو دیکھتے ہوئے، جو مناسب سمجھیں فیصلہ کریں۔

دینی تعلیم کے ساتھ اردو کی تعلیم کا مسئلہ اٹھتا ہے۔ اردو اتنی دلکش اور معنی

اور متمول زبان ہے کہ ہندوستان کی بدقسمتی ہوگی اگر وہ مٹ گئی یا محدود ہوگئی۔ مسلمانوں کے لیے اس کی مزید اہمیت یہ ہے کہ اس کے اندر عربی، فارسی، ترکی الفاظ کا ذخیرہ اور اس کے رسم خط کے ذریعہ ان کی رسائی، اسلام اور دنیائے اسلام تک ہو جاتی ہے۔ یوں تو علم کی تحصیل مسلمان عورتوں اور مردوں پر فرض ہے لیکن اردو زبان کی تحصیل میں ان کے لیے دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ جو عرضداشتیں اور محضر وقتاً فوقتاً حکومت کو اردو کے سلسلہ میں دیے گئے، ان کی حیثیت حرف غلط سے زیادہ نہیں سمجھی گئی۔ اس وقت کئی ریاستوں میں اردو اگر باقی ہے تو وہ ایک حد تک عربی مدرسوں کی بدولت۔ تعلیم کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ بچے کی ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں ہونی چاہیے، ورنہ اس کو ادراک اور اظہار اور نشوونما کی دشواریاں درپیش ہوں گی۔ اردو کو بچانے اور بڑھانے کے لیے تین کام کرنے ہوں گے۔

۱۔ حکومت سے مطالبہ کہ اردو کے ساتھ ناانصافی ختم ہونی چاہیے اور ان طالب علموں کو جو اردو پڑھنا چاہتے ہیں، اس کا پورا موقع ملنا چاہیے؛ جن بچوں کی مادری زبان اردو ہے، ان کی ابتدائی تعلیم اردو میں ہی ہونی چاہیے۔ سہ لسانی فارمولا میں اردو کو شامل کرنا ان ریاستوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے جہاں اس کا چلن ہے۔

۲۔ اردو پڑھانے کا جز وقتی انتظام، خواہ گھر پر، خواہ کسی دوسری جگہ۔

۳۔ ان اسکولوں میں جو مسلمانوں کے زیر اہتمام ہیں، اردو کی پڑھائی کا خاص انتظام کیا جائے۔

ہمیں تعمیر کے نقطۂ نظر سے مذکورہ بالا دوسری اور تیسری تجویز پر زور دینا چاہیے کہ یہ کام ہمارے کرنے کا ہے، ہمارے بس کا ہے اور اسے ہم کر سکتے ہیں۔ حکومت سے مطالبہ کا جہاں تک تعلق ہے، اس کے پیچھے ہماری پوری رائے عامہ کا دباؤ ہونا چاہیے۔ پالیسی کا اعلان کافی نہیں ہوتا۔ پروگرام کی وضاحت اور نفاذ کی ضمانت پر اصرار نہ ہوا تو مطالبہ کرنے سے کیا حاصل۔

ہمارے انتظام میں جو اسکول اور کالج ہیں ان میں سے بیشتر خلل پذیر ہیں؛

ان میں آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، ان کا معیار اور نتائج قابلِ تبریک نہیں ہوتے۔ وہ بالعموم سائنس اور حساب اور انگریزی کی تعلیم اچھی نہیں دے پاتے ۔ ان مضامین کے اچھے استاد بھی انھیں ہاتھ نہیں آتے۔ مستثنیات ضرور ہیں لیکن رائے تو اکثریت کو دیکھ کر قائم کی جاتی ہے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

کوئی تنظیم ضلع اور ریاست کی سطح پر ایسی ہونی چاہیے جو ان اداروں میں نظم و ضبط اور تعلیم کے معیار کو اونچا کر سکے۔ جس کا فیصلہ اساتذہ اور انتظامیہ دونوں کو منظور ہو۔ یہی تنظیم اس کی ذمہ داری بھی لے کر گھروں میں تعلیمی ماحول اور تعلیمی رہنمائی اور مدد کی جو کمی ہے اس کی تلافی اجتماعی کوشش اور ریمیڈیل اور پروفیشنل کلاسوں کے ذریعہ کی جائے۔ ضرورت اس کے لیے وسائل اور حسن انتظام کی ہوگی۔

ہمارے کاریگروں کے ہاتھ میں ہنر ہے لیکن علم سے ان کے ہنر پر صیقل نہیں ہونے پاتی وہ اپنے ہنر اور اپنی گھریلو صنعت کو ترقی نہیں دے پاتے۔ وہ ہر قدم پر سرمایہ کے دست نگر ہیں۔

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

یہاں اس نکتہ کو دہرانا شاید بے محل نہ ہوگا کہ ارتقائے انسانی کے ماہرین اس تعلق پر زور دیتے ہیں جو ہاتھ اور دماغ کے مابین ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کے ہاتھ کی ساخت اور اس کی گرفت جس کا محور انگوٹھا ہے، مغز کے نشو و نما کا سبب بن گئی۔ اس کے بعد انسان نے جو ترقی کی وہ ہاتھ اور دماغ کی شرکت کار کے باعث ہوئی۔ جن صنعتوں نے ہاتھ پر زیادہ تکیہ کیا اور دماغ کو نظر انداز کر دیا وہ پچھڑ گئیں۔ جن صنعتوں نے ہاتھ سے بھی زیادہ زور دماغ پر دیا وہ آگے بڑھ گئیں۔ ہمارے کاریگروں کے دستِ حسن آفریں کو اگر دماغ سے، اس دماغ سے جو تازہ ترین علم و ہنر سے جلا پا چکا ہے ۔۔۔ کمک ملتی رہے تو

آسمان سے تارے توڑ لائیں۔ ہو رہا ہے اس کے بالکل برعکس۔ ایک طرف زمانہ کی ناقدری نے اُن کے دلوں کو بجھا دیا ہے۔ دوسری طرف علم کی روشنی میں جو نئی نئی راہیں مشقِ ہُنر اور ولولہ پردازی کے لیے کھُلتی رہتی ہیں اُن میں سے بیشتر ان پر بند ہیں۔ انھیں تھوڑی بہت جو روشنی ملتی ہے وہ مانگی ہوئی ہے۔ صارف کیا چاہتا ہے؟ برآمد کرنے والے کے تصورات کیا ہیں؟ ڈیزائنر ان دونوں کو ڈیزائن میں کس طرح منعکس کراتا ہے۔ یہی وہ حصار ہے جس میں اہلِ حرفہ کام کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ کام بے کیف اعادہ، بے مزہ تکرار کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دل کہیں دماغ کہیں ہاتھ کہیں۔ ان کا وہ ربط باہم جو زندگی کو ذوق، کام کو کشش، اور جدّت کو مہمیز دیتا ہے، معدوم رہتا ہے۔ ایسا کام وبالِ جان بن جاتا ہے۔ ہمارے کاریگروں میں سے چند کو چھوڑ کر باقی سب اسی لامتناہی مصیبت میں گرفتار رہتے ہیں۔ جو کام بے دلی سے کیا جائے اس کا اثر اعصاب اور جسمانی اور دماغی صحت پر پڑتا ہے۔ پھر انھیں کام کرنے کا ماحول بھی ایسا ملتا ہے جو صحت کے لیے مُضر ہے۔ تنگ و تار کوٹھریاں جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں، چھوٹے چھوٹے گھر اور بہت سے مکیں۔ گنجان بستیوں سے ہمیں بتدریج نکلنا چاہیے۔ شہر کے باہر اپنی نوآبادیاں بنانی چاہئیں۔ سمٹنے میں پسپائی اور بیماری ہے، پھیلنے میں نُصرت اور صحت۔ یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا جو تاہم گہری اور مُنظّم توجہ کا طالب ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ ہمارے اہلِ حرفہ کو جو ہمارے دست و بازو ہیں، اپنے بچّوں کو اچھی تعلیم دینی چاہیے؛ اسراف کو ختم کیجیے، فضول خرچی سے دامن بچائیے؛ ضرورت پڑے تو پیٹ کاٹیے اور بچّوں کو پڑھائیے، تاکہ وہ خاندان کے نام کو روشن کر سکیں اور اپنے خاندانی ہُنر میں چار چاند لگا سکیں، اپنے افق کو وسیع کر سکیں۔ ان میں سے ایک تعداد پشتینی کاروبار کو چھوڑ کر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی نام پیدا کر سکے:

رُکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بُو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

بی کبھی ہمیں اپنے شہر، اپنے پیشہ، اپنے نقطۂ نظر اور اپنی افتادِ طبع کی حدود سے نکلنا چاہیے
اکہ ہم تازہ دم اور وسیع النظر ہو کر اپنے گھر یا اپنے معاشرہ میں واپس آئیں۔ زمان و مکان کا
قل ذہنی صحت اور توازن کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ مکان کا نقل تو بڑی حد تک جسمانی
فہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ زمان کا نقل صرف ذہنی اور روحانی ہوتا ہے۔ یعنی ماضی کی
سیر کرنا اور مستقبل کے خواب دیکھنا جن کی اساس تعمیر، تنظیم اور حوصلہ مندی پر ہو۔

ہمارے دین کے نزدیک شرک بہت بڑا گناہ ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات و صفات
ں کسی کو شریک کرنا کسی حال میں جائز نہیں، مقاصد میں شرک بھی ناروا ہے۔ اگر مقصد
ہے خدمتِ خلق یا اعلائے کلمۃ اللہ، تو اس میں خواہش ناموری و اقتدار کی آمیزش
ہیں ہوتی چاہیے۔ میں نے بہت سے شہروں میں دیکھا ہے کہ ان اداروں کی طرف سے
وایک عرصہ ہوئے قائم کیے گئے تھے، غفلت برتی جاتی ہے، اور چھوٹے بڑے
زیادہ چھوٹے، کم بڑے) ادارے کھول دیے جاتے ہیں تاکہ ان اداروں سے
اشرکتِ غیرے کسی صاحبِ خیر کی شہرت اور سرخروئی ہو۔ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو
ساحبِ خیر بننا ہے یا صاحبِ نام، سرخروئی اس دنیا میں حاصل کرنی ہے یا عاقبت
ں۔ اگر خیر محض ہدف ہے اور آخرت کی سرخروئی مدِ نظر ہے تو خدمتِ خلق اور کارِ خیر کو
اتی اقتدار، وجاہت اور شہرت کا ذریعہ نہ بنائیے۔ شاعر تو یہاں تک کہ گیا ہے کہ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

س بے باکی پر برہم ہونے کی ضرورت نہیں، شعراء تو پروانۂ استثنا لکھوا کر آتے ہیں۔ شاعر
ی مراد صرف یہ ہے کہ طاعتِ خالق اور خدمتِ خلق غرض کی ملاوٹ کو قبول نہیں کرتی۔
للہ تعالیٰ نیت کو دیکھتا ہے۔ لہٰذا خدمتِ خلق کے نام سے انا کی تسلی کے سلسلہ کو ختم
ونا چاہیے۔ اپنی ڈفلی الگ الگ بجانے سے بہتر ہے کہ اہلِ خیر مل کر مقامی ملی ضروریات
پر غور فرمائیں اور انھی کے مطابق متحد ہو کر اداروں کی بنا ڈالیں اور ان اداروں کو
سہارا دیں جو پہلے سے قائم ہیں۔ سوال مقدار کا نہیں معیار کا ہے۔ چھوٹے موٹے

اُسٹے یسد ہے اداروں کی تعداد بڑھ گئی تو کیا حاصل ہوا؟ بدگمانی اور بدخیری۔ اداروں کو معیاری بنائیے اور ضرورت کے مطابق نئے معیاری ادارے قائم کیجیے۔ جو لوگ نماز میں کندھا سے کندھا ملاتے ہیں وہ مسجد سے باہر نکلتے ہیں تو اتحاد اور یک جہتی کو فراموش کیوں کر دیتے ہیں۔ نماز جس اتحاد کا سبق دیتی ہے وہ زندگی پر حاوی ہونا چاہیے۔ اگر ہم زوال کے سیلاب کو تھامنا چاہتے ہیں اور ترقی کے راستے پر گامزن ہونا ہمارا مقصد ہے تو ہمیں سر توڑ کر اور قدم سے قدم ملا کر تعلیمی، اصلاحی اور تعمیری کاموں میں لگنا ہوگا۔

تعمیری کام تو بعد میں آتے ہیں پہلے خانہ جنگی کو ختم کیجیے جو دیمک کی طرح ہمیں چاٹ رہی ہے اور جس نے ہمیں مضحکہ اور استہزا کا مورِد غیروں کی نگاہ میں بنا دیا ہے۔ ایک طرف تو ہمیں ذات اور برادری کا روگ لگ گیا ہے۔ برادری کو ماننے میں کوئی خرابی نہیں لیکن کیا ہماری برادری وہ عالمگیر انسانی برادری نہیں جس کا پیغام اسلام کی شکل میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ اُس چھوٹی برادری کے اپنے الگ کچھ مسائل ہو سکتے ہیں جو کسی پیشہ یا حرفہ پر مبنی ہو۔ ان مسائل کو مل کر حل کرنا چاہیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مسلمانوں کو چھوٹے چھوٹے خانوں میں بانٹ دیں اور اس زبردست اشتراکِ عقائد و اعمال کو بھول جائیں اسلام جس کا نام ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو نہ صرف (خدا نخواستہ) ہم اپنے دین سے پھر جائیں گے بلکہ اپنا دفاع بھی مخالف دیں طاقتوں کے مقابلے میں نہ کر سکیں گے۔

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک | ایک ہی سب کا نبی دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی اللہ بھی قرآن بھی ایک | کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

نفاق نے ہماری بدقسمتی سے ایک اور شکل اختیار کر لی ہے۔ شیعہ سُنی، بریلوی دیوبندی آپس میں اس طرح گرم نبرد ہیں، جیسے اسلام صرف خانہ جنگی کی تعلیم دیتا ہو۔ ہماری ہر طرف

ہنسی اُڑتی ہے اور ہم اپنے بھائیوں کو گالیاں دینے اور دائرۂ اسلام سے خارج کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہمیں احساس ہی نہیں کہ یہ سارے لچھن خودکشی کے ہیں۔ کیا اسلام کے بنیادی عقاید سے زیادہ اہمیت فروعات کی ہے، کیا ہم اتحاد پرور اصول کو چھوڑ کر نفاق انگیز فروع میں اُلجھ جائیں گے۔ اگر ہم نے اس بے معنی اور خود سوز خانہ جنگی کو ترک نہیں کیا تو ہماری بقا کے لالے پڑ جائیں گے۔ آستین چڑھانے کے بجائے ہمیں اپنے بھائیوں کے آگے مصالحت کا ہاتھ بڑھانا اور انکسار کا سر جھکانا چاہیے۔ ورنہ مہاجات اکبر اور عداوت آگ بن کر ہمیں بھسم کر دے گی۔

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ہمارے ملک میں پلانڈ ڈولپمنٹ یا ہمہ جہت منصوبہ بند ترقی کا دور ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا۔ اسے ۳۵ سال گزر گئے۔ اربوں روپے قطعہ بند ارتقا پر صرف ہوئے۔ ہمیں اس میں سے کیا ملا؛ حصہ رسدی بھی نہیں ملا حالانکہ وہ اقلیتیں جو بیدار ہوتی ہیں وہ اپنے حصہ رسدی سے زیادہ پا جاتی ہیں۔ اقلیتی صورتِ حالات کی منطق ہی یہی ہے کہ اکثریت سے زیادہ محنت کریں اور ملک کی ترقی کے لیے خود کو اکثریت سے زیادہ بکار آمد بنائیں۔ کچھ تو ہمارے خلاف نفاذ کی متعدد سطحوں پر امتیاز برتا گیا لیکن اس سے کہیں زیادہ ہمیں خود سے نقصان پہنچا۔ ہمیں خبر بھی نہ ہوئی کہ کون سی اسکیموں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر خبر ہو بھی گئی تو کچھ بے حسی اور کچھ مخالفت اور عصبیت کے اندیشہ نے ہمارے قدم پکڑ لیے۔ اس سلسلے میں میں زیادہ موردِ الزام اس طبقہ کو ٹھہراؤں گا جس سے خود میرا تعلق ہے۔ وہ لوگ جو پڑھ لکھ گئے تھے اور وکاس کے منصوبوں سے واقف تھے انھوں نے کوشش ہی نہیں کی کہ اس آگاہی کو اپنے بھائیوں تک لے جائیں۔ یہ کام ہر شہر میں کرنے کا تھا۔ اس غفلت اور بے حسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ ۳۶ سالوں میں مسلمانوں نے سب سے پچھڑی قوم ہونے کا ناقابلِ فخر امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ اور پچھڑنے کی رفتار سے وہ اب بھی مطمئن نہیں نظر آتے اور اسے اور تیز کرنے کے درپے ہیں۔ عقلمند دوسروں کی

غلطیوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی غلطیوں سے فائدہ اٹھائیں اور کم سے کم آئندہ پندرہ سالوں کو ضائع نہ ہونے دیں۔ اس بار ساتویں پنجسالہ منصوبے کے ساتھ ساتھ پندرہ سال کا تناظری منصوبہ (Perspective Plan) بنا ہے۔ اس کے پروگراموں اور اسکیموں کی تشریح اور تعبیر اور تعاقب ہم پر لازم آتا ہے۔ یہ کام ہر شہر میں ہونا چاہیے اور ریاستی اور مرکزی سطح پر بھی۔ لیکن اس کے لیے ادارے اور وسائل درکار ہوں گے۔

فی الحال تو ہمیں نئی تعلیمی پالیسی کو مضبوطی سے پکڑ لینا چاہیے۔ اس پالیسی سے پورا فائدہ اٹھانا اور اس کے نفاذ کی نگرانی کرنا، اس کی کمیوں اور نفاذی خامیوں کو دور کرانا ہمارا فرض ہے۔ ۱۹۸۵ء میں وزارتِ تعلیم نے تعلیم کے چیلنج کے نام سے ایک دستاویز شائع کی جس میں تعلیمی صورتِ حالات کا بیان صاف گوئی کے ساتھ کیا گیا تھا اور تعلیمی مسائل اور مستقبل کی ترقیاتی ضروریات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ سال بھر اس دستاویز پر ملک گیر بحث ہوتی رہی۔ اس بحث کو ملحوظ رکھتے ہوئے حکومت نے اپنی نئی تعلیمی پالیسی بنائی جو تعلیم کی قومی پالیسی کے نام سے پارلیمنٹ میں منظور ہونے کے بعد مشتہر کی گئی۔ اسی کے چند ماہ بعد اس پالیسی سے متعلق ایک عملی پروگرام یا پروگرام آف ایکشن بھی پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد جاری کیا گیا۔

قومی تعلیمی پالیسی کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک سطح کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ تعلیمی ڈھانچہ ۱۰ + ۲ + ۳ ہے۔ نصاب میں ایک مشترک جزو ہے، جسے نصاب کا بطن یا کور کریکلم کہا گیا ہے۔ اس کے دوسرے اجزا مقامی حالات کے مطابق مختلف ہو سکتے ہیں۔ "بطنِ نصاب" میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی، آئینی فرائض اور وہ مضامین شامل ہیں جو قومی تشخص سے قریبی ربط رکھتے ہیں اور مشترک تمدنی ورثہ، مساوات، جمہوریت، صنفوں کی برابری، ماحول کے تحفظ، دیواروں سے آزاد سماج اور چھوٹے خاندان اور سائنسی نقطۂ نگاہ کو فروغ دیتے ہیں۔ برابری اور برابر مواقع فراہم کرنا اور تعصبات اور بدگمانیوں کو دور کرنا اس نصاب کا ایک اہم نشانہ ہے۔

ابتدائی تعلیم کی ہمہ گیری، تعلیم بالغان، سائنسی اور تکنیکی تحقیق کی طرف نئے نظام تعلیم کا رُوئے سخن ہے۔ اس کی ایک اہم خصوصیت زندگی بھر ساتھ دینے والی تعلیم ہے۔ خانہ دار عورتوں، نوجوانوں، زرعی اور صنعتی محنت کشوں اور پیشہ وروں کو مواقع ملنے چاہئیں زندگی بھر علم حاصل کرنے کے اور وہ بھی اپنی پسند اور سہولت کے مُطابق۔

تعلیم کا موضوع مشترک فہرست میں شامل ہو گیا ہے۔ اس طرح مرکز تعلیمی نظام پر براہِ راست اثر انداز ہو سکتا ہے۔

تعلیمی دستاویز نے ایک پورا باب وقف کیا ہے" برابری کے واسطے تعلیم" کے لیے۔ اور اس ضمن میں تعلیم نسواں، اور درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی تعلیم، اپاہجوں کی تعلیم، بالغوں کی تعلیم کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ ایک پیراگراف اقلیتوں کی تعلیم کے بارے میں ہے:

"بعض اقلیتی جماعتیں تعلیمی اعتبار سے محروم یا پسماندہ ہیں۔ برابری اور سماجی انصاف کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان جماعتوں کی تعلیم کی طرف پہلے سے زیادہ دھیان دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان اقدامات میں وہ آئینی ضمانتیں شامل ہوں گی جس کے تحت ان کو آزادی ہے کہ اپنے اسکول قائم کریں اور چلائیں، اور ان کی زبانوں اور ثقافتوں کا تحفظ بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ نصابی کتابوں کی تیاری اور معروضی انداز سے کی جائے گی اور اسکولوں کا پروگرام بھی غیر جانبدارانہ ہوگا۔ مشترک قومی مقاصد اور نصب العین کے عرفان کے ذریعہ ایسی یکجہتی کو فروغ دیا جائے گا جو کہ بطن نصاب (کور کریکلم) کے مطابق ہو۔

تعلیم بالغان کا ایک وسیع پروگرام عمل میں لایا جائے گا تاکہ حرف ناشناسی کو ختم کیا جاسکے، خصوصًا ۱۵ سے ۵۵ سال کی عمر والوں میں کوئی اَن پڑھ باقی نہ رہے۔ اس کے لیے بہت سے قدم اٹھائے جائیں گے جس میں ٹی وی، ریڈیو، فاصلہ سے تعلیم، لائبریریاں، ریڈنگ روم اور سیکھنے والوں کی تنظیمیں اور خود خواندگی کے لیے امداد شامل ہیں۔"

قومی تعلیمی پالیسی چھوٹے بچے کے ارتقا پر خاص زور دیتی ہے، خصوصًا ان بچوں

کے ارتقا پر جو آبادی کے ایسے حصوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں پڑھنے والوں کی پہلی نسل اکثریت میں ہے۔ اس کے لیے خوراک صحت اور سماجی، ذہنی جسمانی، اخلاقی اور جذباتی ارتقا کی فکر ایک ساتھ کی جائے گی۔ ابتدائی طفولیت کی نگہداشت اور تعلیم (ECCE) کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ یہ مراکز بھی کھولے جائیں گے جن میں ننھے بچوں کی دن بھر دیکھ بھال ہوگی تاکہ ان کی بہنیں بھی جو ان کی نگہداشت کی ذمہ دار ہیں تعلیم حاصل کر سکیں۔ ای سی سی ای کے پروگرام میں مقامی لوگوں کو پوری طرح شریک کیا جائے گا۔

ابتدائی تعلیم کا مرکز اور ہدف توجہ بچے کو بنایا جائے گا۔ اُن بچوں کے لیے جو پڑھائی کی پہلی پیڑھی سے تعلق رکھتے ہیں زائد تعلیم کا انصرام ہوگا تاکہ اس کمزوری کی تلافی ہو سکے جسے وہ گھر سے لے کر آتے ہیں۔ اسکولوں کو بہتر بنانے کے لیے ایک مہم شروع کی جائے جسے آپریشن بلیک بورڈ یا تختہ سیاہ کی مہم کا نام دیا گیا ہے۔

ان بچوں کے لیے جو بیچ میں اسکول چھوڑ بیٹھتے ہیں اور کام کرنے والے بچوں کے لیے جو اسکول نہیں جا سکتے غیر رسمی تعلیم فراہم کی جائے گی۔ غیر رسمی تعلیم کے مراکز یعنی Non-Formal Education Centres این ایف ای (NFE) کو جدید آلات سے لیس کریں گے۔ مقامی سماج سے لائق اور خدمت آمادہ نوجوانوں اور خواتین کو بہ حیثیت معلم کے چنا جائے گا۔ اور ان میں سے ان افراد کو جو لیاقت کا ثبوت دیتے ہیں رسمی تعلیم میں داخل ہونے کا موقع مل سکے گا۔ نصاب کے لیے ایک فریم مہیا کیا جائے گا جس میں مقامی حالات کی رعایت کی گئی ہو۔ این ایف ای مراکز کو چلانے کی بیشتر ذمہ داری رضاکارانہ انجمنوں اور پنچایتوں کو سونپیں گے۔

نئی تعلیمی پالیسی ان بچوں کے مسئلہ کے حل کو جو اسکول چھوڑ بیٹھتے ہیں، اولین ترجیح دے گی۔ بڑی دقت نظر اور جزرسی کے ساتھ ان بچوں کی بازیابی اور تعلیم کے لیے حکمت عملی مرتب کی جائے گی۔ اس کوشش کو غیر رسمی تعلیم کے ساتھ بھی جوڑا جائے گا۔ اس بات کی ضمانت کی جائے گی کہ وہ سارے بچے جو ۱۹۹۰ تک گیارہ سال کے ہو جائیں گے انھیں

اس وقت تک ۵ سال کی باقاعدہ تعلیم یا غیر رسمی (نان فارمل) تعلیم ضرور مل جائے گی۔ اور ۱۹۹۵ء تک سارے بچوں کو ۱۴ سال کی عمر تک مفت اور لازمی تعلیم کا فیض پہنچے گا۔

ثانوی تعلیم میں زیادہ زور استحکام پر ہوگا۔ اسی دور میں بچوں کو تاریخ کا شعور اور قومی ورثہ کا عرفان حاصل ہوگا۔ اور اس مقصد سے نصاب کی تشکیل ہوگی۔ ثانوی تعلیم دینے والے اداروں کو بڑھایا جائے گا تاکہ ہر جگہ کے رہنے والوں کی ان تک دسترس ہو جائے۔

مثالی اسکول کھولے جائیں گے۔ نمونہ ایک ہی ہوگا لیکن ضروری تبدیلیوں اور تجربوں کی اجازت دی جائے گی۔ ان کا مقصد ہوگا (۱) اکتسابِ فضیلت، عدل اور سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ، (۲) ملک کے مختلف حصوں کے بچوں کو خصوصاً دیہات کے بچوں کو ایک ساتھ رکھیں گے تاکہ قومی یکجہتی کو فروغ ہو، اور ان کے امکانات شکل پذیر ہو جائیں اور ان مثالی اسکولوں کے ذریعہ ملک بھر کے اسکولوں کو بہتر بنایا جا سکے۔ یہ اسکول اقامتی ہونگے اور بچوں سے کسی قسم کی فیس نہیں لی جائے گی۔

پیشہ وارانہ تعلیم (ووکیشنل ایجوکیشن Vocational Education) کا اہتمام بہت دھیان اور سلیقہ سے کیا جائے گا۔ یہ کورس عام طور پر ثانوی تعلیم کے بعد دستیاب ہوں گے لیکن اگر ضرورت پڑی تو انھیں آٹھویں جماعت کے بعد بھی لے سکیں گے۔ صنعتی تربیت کے اسکول (آئی ٹی آئی۔ انڈسٹریل ٹریننگ اسکول) پیشہ وارانہ تعلیم کے ملک گیر نظام میں پیوست ہو جائیں گے۔ صحت، زراعت، مارکیٹنگ، سماج سیوا وغیرہ کے لیے بھی ووکیشنل تربیت دی جائے گی۔ ایسے زاویۂ نظر اور ایسی معلومات اور ہنروں کو بڑھاوا دیا جائے گا جو خود روزگاری اور صنعتی و تجارتی پیش قدمی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حکومت عورتوں، دیہاتی اور قبائلی طلبہ اور معاشرہ کے محروم طبقات کا خاص خیال رکھے گی۔

غیر رسمی، لچکدار اور حاجت بستہ پیشہ ورانہ پروگرام کا فائدہ نوخواندوں، ابتدائی تعلیم حاصل کیے ہوئے نوجوانوں، اسکول چھوڑ بیٹھنے والوں اور ان لوگوں کو جو کام میں لگے ہوتے ہیں یا بے روزگار یا نیم روزگار ہیں پہنچایا جائے گا۔

ووکیشنل کورس کے فارغین کے لیے آگے تعلیم کی راہیں کھول جائیں گی ۱۹۹۰ء
تک ثانوی تعلیم کے طلبہ کا دس فی صد اور ۱۹۹۵ء تک ۲۵ فی صد ووکیشنل کورس کرچکا
ہوگا۔ ان کو اپنا روزگار شروع کرنے یا روزگار دلانے کے جتن کیے جائیں گے۔

اس بار پالیسی بنانے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بہت غور و فکر اور صلاح و مشورہ کے بعد
لائحۂ عمل یا پروگرام آف ایکشن بھی بنایا گیا۔ اس دستاویز کا مقصد یہ ہے کہ ان اقدامات کی
صراحت کردی جائے جو نئی تعلیمی پالیسی کی تعمیل کے لیے ضروری ہیں۔ پروگرام کے دکھائے
ہوئے خطوط پر اسکیمیں بنائی جائیں گی۔ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکز، ریاستوں
اور استادوں اور عوام کا اشتراکِ عمل ضروری ہے؛ اور اس کی پیش رفت کی بابت
متواتر مشورہ۔ پروگرام کی دستاویز میں لکھا ہے کہ تعلیم کا قومی نظام، "National
System of Education" یا (N.S.E) این۔ ایس۔ ای، تعلیمی نظام کے اندر جو تفاوت
راہ پا گئے ہیں ان کو جڑ سے مٹانا چاہتا ہے، اور سرکاری یا بہ الفاظ دیگر عوامی اسکولوں کے
معیار کو اونچا کرنا چاہتا ہے تاکہ عام والدین کو اپنے بچوں کو ایسے پرائیویٹ اسکولوں میں نہ
بھیجنا پڑے جہاں بڑی بڑی فیس دینا پڑتی ہیں۔ اسی مقصد کے لیے ضلع تعلیمی بورڈ یا ڈسٹرکٹ
بورڈ آف ایجوکیشن، تعلیم و تربیت کے ضلع انسٹی ٹیوٹ (District Institutes
of Education + Training) اور دیہی تعلیمی کمیٹیاں (Village Education Committees)
بنائی جائیں گی۔

اس وقت ننھے بچوں کے نشو و نما کے لیے Integrated Child Development
Services "بچوں کے نشو و نما کی مجموعی اور متحدہ خدمات" نے قابل قدر کام کر دکھایا
ہے۔ ارادہ ہے کہ ای سی سی ای پروگرام کے کارکنوں کی تعداد بڑھادی جائے۔ نگہداشت
اطفال میں کام کرنے والوں کو بالآخر پرائمری اسکول کے استادوں کے برابر لایا جائے گا
اس پروگرام کے تحت جن طبقات کی طرف خصوصی دھیان دیا جائے گا ان میں گندی
بستیوں کے مکین، اہل حرفہ کے خاندان، اور غیر منظم صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور بچے شامل ہیں۔
ہدف یہ ہے کہ ساتویں منصوبہ کے خاتمہ تک صفر سے ۶ سال تک کے بچوں کے لیے

نگہداشت و تعلیم (ای سی سی ای) کی سہولتیں قبائلی بلاکوں اور ان بلاکوں میں جہاں درج فہرست ذاتوں (شیڈیولڈ کاسٹس) کی معتد بہ تعداد ہے اور بڑے شہروں کی گندی بستیوں میں فراہم کردی جائیں۔ ۱۹۹۰ء تک کم سے کم ڈھائی لاکھ مراکز مزید کھل جانے چاہئیں۔ "آئی سی ڈی ایس" یا Integrated Child Development Services کے علاوہ قبل ابتدائی (پری پرائمری) اور روزینہ نگہداشت (Day - care) کے مراکز کو اس ضمن میں بڑھاوا دیا جائے گا اور ان کی مدد سرکار کرے گی۔

ای سی ای مرکزوں میں صحت اور غذا کے پروگراموں کا اضافہ کیا جائے گا اور استادوں کی تربیت، اور تعلیمی مسالہ کی فراہمی کا انتظام ہوگا۔

جہاں تک میڈیا کا تعلق ہے دوردرشن، آکاش وانی، این سی ای آر ٹی وغیرہ اہم علاقائی زبانوں میں سافٹ ویئر یا پروگرام تیار کریں گے۔

مانیٹرنگ یا نفاذ وتعمیل کا متواتر جائزہ لینے کے طریقے اپنائے جائیں گے۔

ابتدائی اور غیر رسمی تعلیم کے ضمن میں "عملی پروگرام" میں تجویز کی گئی ہے کہ ان بچوں کے لیے جو کام کرنے کی وجہ سے اسکول نہیں جاسکتے یا جن کے گھروں سے اسکول بہت دور ہیں، بڑے پیمانے پر غیر رسمی تعلیم کا نظام برپا کیا جائے گا۔

نفاذ یا تعمیل کی حکمت عملی کا مرکزی وصف ہوگا علاقہ وار اور آبادی وار منصوبہ سازی کرنا۔ ان بچوں کا جو اسکول سے باہر ہیں ۷۵ فی صد حصہ ۹ ریاستوں یعنی آندھرا پردیش آسام، بہار، جموں وکشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں ہے۔ ان ریاستوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا گیا ہے۔ دوسری ریاستوں اور خود ان ریاستوں میں زیادہ پچھڑے ہوئے علاقے بھی ہیں جن پر خصوصی توجہ دینی ہوگی۔ ملک کا "کامن اسکول سسٹم" یعنی عام اچھے اسکولوں کے ہمہ گیر نظام کی طرف بڑھے گا۔ اسکولوں کے سدھار کا پروگرام ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پھیلا دیا جائے گا۔ "یو ای ای" یونیورسل ایلیمنٹری ایجوکیشن یا ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کی ہر منزل پر مقامی لوگوں کو شریک کیا جائے گا اور ارباب تعلیم مقامی سوسائٹی کے رُوبرو جواب دہ ہوں گے۔ نئے اسکول ہم

اس جگہ کھولے جائیں گے جہاں پچاس بچوں کے داخلے کا امکان ہو۔ یہ کام تعلیمی نقشے اور مقامی آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ درج فہرست قبائل اور ذاتوں اور دوسرے محروم طبقوں کے لیے اقامتی اسکول اور بورڈنگ کھلیں گے۔ آشرم اسکولوں کے پروگرام کو بہتر بنایا جائے گا۔ مقامی آبادی کے افراد اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے استادوں کے ساتھ گھر گھر جائیں گے۔ ان سارے خاندانوں کی لڑکیوں کو جو غریبی کی لکیر سے نیچے ہیں مفت کتابیں، کاپیاں، دو جوڑے یونیفارم اور دوسری ہمت افزا امداد دی جائے گی۔ جو بچے ابتدائی اسکولوں میں پڑھتے ہیں انھیں ریاستی بسوں میں بغیر کرایہ دیے اسکول لے جایا اور وہاں سے گھر لایا جائے گا۔ ان اسکولوں، استادوں، دیہاتوں اور غیر رسمی تعلیمی مراکز کو جو بچوں کو گھر بیٹھنے سے روکیں گے، قابلِ لحاظ انعام دیے جائیں گے۔ وہ لوگ جو بچوں سے اپنے کارخانوں میں کام لیتے ہیں قانوناً مجبور کیے جائیں گے کہ انھیں آرام، خوراک اور جزوقتی تعلیم دیں۔ مقامی عوام اور والدین کے حسبِ اطمینان "یو ای ای" ہمہ گیر ابتدائی تعلیم کا پروگرام چلایا جائے گا۔

غیر رسمی یا نان فارمل تعلیم کا فائدہ تعلیمِ نسواں کو بالخصوص پہنچے گا۔ جہاں کہیں ممکن ہوگا اس کے لیے انسٹرکٹر خواتین رکھی جائیں گی۔ ہر بیس پچیس مراکز پر ایک نگراں یا سپروائزر کا تقرر ہوگا۔ ۱۰۰ مراکز مل کر ایک پروجیکٹ بنائیں گے جو بالعموم ایک بلاک پر حاوی ہوگا۔ "این ایف ای" اور "تعلیمِ بالغان" کی انتظامی اور نگرانی سطح، جہاں ممکن ہوگا، ملا دی جائے گی۔ رضاکارانہ خدمت کرنے والی ایجنسیوں کو غیر رسمی تعلیم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ ان کی امداد کی تجاویز عطیات دینے والی ایک کمیٹی کی نظر سے گزریں گی اور جب کبھی ضرورت ہوگی تو رضاکار یا والنٹری ایجنسیوں (وی اے؛ V.A.) کو کمیٹی سے گفتگو کے لیے بلا بھی لیں گے۔ اُن کی ابتدائی تجاویز جن کی میعاد ۳ یا ۴ سال ہوگی ریاستی حکومت کے ذریعہ مرکز کو بھیجی جائیں گی، اور بعد کی تجاویز براہِ راست۔

ضرورت مند بچوں خصوصاً کام کرنے والے بچوں کو وظائف دیے جائیں گے تاکہ وہ رسمی تعلیم جاری رکھ سکیں۔ ان بچوں کے لیے جو غیر رسمی دھارا سے فارغ ہوتے ہیں،

پیشہ ورانہ (ووکیشنل) اور ٹیکنیکل تعلیم و تربیت کے بہت سے نصاب مرتب ہوں گے۔

ساتویں پنج سالہ منصوبے میں، چھٹے منصوبے کی طرح، تعلیمی اعتبار سے پچھڑی ہوئی نو ریاستوں میں حسب ذیل ڈھنگ سے امداد دی جائے گی۔

۱۔ ریاستوں کو نان فارمل مراکز قائم کرنے اور چلانے کے لیے ۵۰ : ۵۰ کی شرح سے امداد۔ ان مراکز میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں تعلیم پائیں گے۔

۲۔ صرف لڑکیوں کے لیے نان فارمل (غیر رسمی) تعلیم کے مراکز قائم کرنے اور چلانے کے لیے مرکز ریاست کو ۱۰ : ۹۰ کی شرح سے امداد دے گا۔

۳۔ رضا کار یا والنٹری ایجنسیوں کو نان فارمل تعلیم کے مراکز کھولنے اور چلانے کے لیے مرکز ۱۰۰ فی صد امداد دے گا۔

تعلیمی اعتبار سے ترقی یافتہ ریاستوں میں منجملہ دوسروں کے ان بچوں کو بھی ان اسکیم کا فائدہ ملے گا جو یا تو سلمز یا گندی بستیوں میں رہتے ہیں یا کام کرتے ہیں۔

ہمہ گیر تعلیم (یا یونیورسل ایجوکیشن۔ "یو ای") کی پیش رفت اور کیفیت (کوالٹی) احتساب اور مانیٹرنگ کا بہت مضبوط انتظام ہوگا۔ مقامی سماج کو اس احتساب میں شریک کیا جائے گا۔

ثانوی تعلیم اور "نادودیہ" یا نئی طرز کے مثالی اسکولوں کے سلسلہ میں "عملی پروگرا کی دستاویز منجملہ دوسری باتوں کے، کہتی ہے کہ ہر ریاست میں ایک نقشہ یہ دکھا کے لیے بنایا جائے گا کہ اسکول اس وقت کہاں کہاں ہیں اور کون سی ایسی جگہیں ہیں اسکول سے محروم ہیں اور جہاں اسکول کھلنے چاہئیں۔ اس پلاننگ یا منصوبہ سازی میں لڑکی کے اسکولوں اور پچھڑے ہوئے طبقے کو اولیت ملے گی۔ کوٹھاری کمیشن کی سفارش کے مطا پرائمری اور اپر پرائمری اسکولوں کا باہمی تناسب ۱ : ۳ رکھا جائے گا۔ اس پروگرا عمل جامہ "نیپا" (NIEPA یا National Institute of Educational Planning & Administration تعلیمی منصوبہ سازی و تعلیمی اہتمام کا قومی انسٹی ٹیوٹ (این سی ای آر ٹی) National Council of Educational Research & Training

یا تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسل) کے تعاون سے پہنچائے گا ۔ ۲۰۰۰ء تک کوئی علاقہ بغیر اسکول کے باقی نہ رہے گا۔ اوپن یا آزاد اسکول ان لوگوں کے لیے قائم کیے جائیں گے، جن کی ابتدائی تعلیم غیر رسمی ڈھنگ سے ہوتی ہے۔

نادودیہ اسکول جو بہت ہی ہونہار اور کارگزار بچوں کے لیے مخصوص ہے، ہر ضلع میں کھولا جائے گا۔ اس میں ۷۵ فی صد بچے دیہات کے ہوں گے۔ کوشش ہوگی کہ اسکول کی آبادی کا ایک تہائی لڑکیوں پر مشتمل ہو۔

ان ذہین لڑکوں کے لیے جن کی لیاقت بعض مضامین میں بہت اچھی اور بعض میں معمولی ہے، الگ انتظام کیا جائے گا تاکہ ان کی صلاحیتیں بروئے کار آسکیں۔

"عمل پروگرام" میں ووکیشنل یا پیشہ ورانہ تعلیم کے منصوبہ کا ذکر تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔ ہم یہاں صرف یہ کہہ کر آگے بڑھیں گے کہ "جے سی وی ای" "ایس سی وی ای" اور متعلقہ ریاستی شعبے عورتوں، قبائلیوں اور اپاہجوں، مدد کرنے والی رضاکار تنظیموں کی نشاندہی اور مدد کریں گے۔

عورتوں کو برابری دینے کے لیے تعلیم :-

ہماری اَن پڑھ آبادی کا ۵۷ % عورتیں ہیں اور جو بچے اسکولوں میں داخلہ نہیں لیتے ان میں ۷۰ % لڑکیاں ہیں۔

نشانے :-

۱ ۔ ۱۹۹۰ء تک لڑکیوں میں پرائمری تعلیم ہمہ گیر ہو جانی چاہیے اور ۱۹۹۵ء تک ابتدائی (ایلیمنٹری) تعلیم۔

۲ ۔ ۱۹۹۵ء تک ۱۵ سے ۳۵ سال عمر کی عورتوں کے لیے (جس کی تعداد تخمیناً ۱۸ کروڑ ہے) تعلیم بالغان۔

۳ ۔ ووکیشنل، ٹکنیکل اور پروفیشنل تعلیم تک عورتوں کی رسائی میں اضافہ۔

۴ ۔ تعلیمی نظام پر نظر ثانی اور اس کی تنظیم نو تاکہ عورتوں کو ہر طرح سے برابر لایا جاسکے۔

"پروگرام" نے عورتوں کے مرتبہ، طاقت، اہمیت اور اختیار کو بڑھانے کے لیے بہت سی تجاویز رکھی ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اساتذہ کے تقرر میں عورتوں کو ترجیح دی جائے۔ ملک میں ۱۰۴ آئی ٹی آئی (انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ) یا صنعتی تربیت کے ادارے لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں اور عام صنعتی تربیت کے اداروں میں ۹۷ ونگ لڑکیوں کے لیے مختص کر دیے گئے ہیں۔ اس پروگرام کو نئی تنظیم اور تقویت دی جائے گی۔

"عملی پروگرام" کا ایک باب "اقلیتوں کی تعلیم" کے لیے وقف ہے۔ یہ باب دستور کے آرٹیکل ۲۹، ۳۰ اور الف ۳۵۰ کے حوالے سے شروع ہوتا ہے اور یہ اعتراف کرتا ہے کہ ان آرٹیکلوں کی دی ہوئی ضمانتوں کی تعمیل ناہموار رہی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق مذہبی اقلیتیں کل ملا کر ہندوستان کی آبادی کا ۱۷٫۴ فی صد ہیں: مسلمان ۱۱٫۴۲٪، عیسائی ۲٫۴۳٪، سکھ ۲٪، بدھ ۰٫۷٪ اور جین ۰٫۵۲٪۔ وزارت داخلہ نے قومی سطح پر مسلمانوں اور نو بدھوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ تسلیم کیا ہے۔ خاص اقدامات کی ضرورت ہے ان پچھڑی ہوئی اقلیتوں کو بقیہ سماج کے برابر لانے کی تاکہ وہ قومی ترقیاتی کارروائی میں پوری طرح حصہ لے سکیں۔

۸۶-۸۷ کے لیے پروگرام :-

۱۔ دس کمیونیٹی پالی ٹیکنیکوں کے ذریعہ ان علاقوں میں ٹیکنیکل مہارت بہم پہنچانا جہاں اقلیتوں کی بڑی تعداد آباد ہے۔

۲۔ نصاب کی کتابوں کا جائزہ اور تخمینہ قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے۔ یہ کام این سی ای آر ٹی نے شروع کیا ہے۔

۳۔ اقلیت کے تعلیمی اداروں کے منیجروں اور پرنسپلوں کے زاویۂ نگاہ کو نئے رُخ دینے اور استادوں کی تربیت کا پروگرام جسے "این سی ای آر ٹی" بہ تدریج عمل میں لائے گی۔

۴۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی وہ اسکیم جس کے تحت یونیورسٹیوں اور کالجوں کو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ طالب علموں کو مقابلہ کے امتحانوں کے لیے تیار کرنے کے واسطے امداد دی جاتی ہے۔

ساتویں پلان کے بقیہ تین سالوں کے لیے پروگرام (۸۸-۸۷ لغایت ۹۰-۸۹):

مذکورہ بالا اسکیمیں جاری رہیں گی۔ علاوہ بریں این سی ای آر ٹی، ڈیپارٹمنٹ آف ویلفیر (شعبۂ فلاح) اور شعبۂ تعلیم مشورہ کر رہے ہیں علی گڑھ، کشمیر، عثمانیہ اور مراٹھواڑا یونیورسیٹیوں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلروں سے ریسورس سنٹروں (Resource Centres) یا مراکزِ وسائل و تدبیر کے متعلق۔ یہ مراکز اپنے حلقہ کے اقلیتی تعلیمی اداروں کو تربیت و ہدایت دیں گے۔ ساتویں پلان کے لیے ان مراکز کو چلانے کے واسطے ۶۵ لاکھ روپے کی مانگ کی گئی ہے۔ اس پلان میں اقلیتوں کی آبادی کے لیے ۵ مزید پالی ٹیکنک قائم کیے جائیں گے۔

طویل مُدّتی پروگرام :-

روایتی وضع کے اسکولوں میں سائنس، ریاضی اور انگریزی پڑھانے کے سلسلہ میں کوشش کی جائے گی۔ جہاں کہیں ممکن ہوگا "ابتدائی طفولیت کے تعلیمی ادارے" (ای ای سی) مذکورہ اسکولوں اور ان علاقوں میں کھولے جائیں گے جہاں اقلیتوں کی کثیر آبادی ہے۔ ان اداروں میں سماجی اعتبار سے کارآمد اور پیداواری کام شروع کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے شعبۂ تعلیم ایک مرکزی اسکیم تیار کرے گا۔

پرائمری تعلیم :-

۱۔ تعلیمی سہولتوں کے بارہ میں لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو جن اعداد و شمار کی ضرورت رہتی ہے ان کی فراہمی کا مستقل انتظام ہوگا۔ یہ کام ریاستی حکومتوں پر چھوڑا گیا ہے۔

۲۔ لسانی اقلیتوں کے لیے استادوں کی منظوری اور تقرری میں جو دیر ہوتی ہے اس کو دور کرنے کے لیے ریاستی حکومتیں یہ اختیارات ضلع کلکٹر کو تفویض کر دیں گی۔

۳۔ اقلیتی زبانوں میں نصابی کتابوں کی دستیابی کا جائزہ اور ان زبانوں میں کتابوں کے چھپنے کا انتظام۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتوں کے کرنے کا ہے۔

۴۔ اقلیتی زبانوں کے استادوں کے لیے ٹریننگ کی سہولتوں کا جائزہ اور جہاں ضرورت

(۲) وہاں ان سہولتوں میں اضافہ کرنے کے لیے اقدام۔

۵۔ کوشش کی جائے گی کہ نصابی وقت کا ۱۵ فی صد مقامی ہنر فنوں اور ہنروں پر صرف کیا جائے اور اہلِ حرفہ اور مزدوروں کے بچوں کے لیے شام کے کلاس شروع کیے جائیں۔

متوسط اور اعلیٰ ثانوی تعلیم (مڈل اور ہایر سکنڈری ایجوکیشن):

ایس سی ای آر ٹی (اسٹیٹ کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، یا تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کونسل) اور دوسرے ریسورس مراکز اور ریاست کے بدایتی ادارے اقلیتی اسکولوں/کالجوں میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم (سوشل سائنسیز) انگریزی، اور کیریر کی رہنمائی والے استادوں کو ٹریننگ دیں گے۔ فی الحال این سی ای آر ٹی یہ کام کر رہی ہے۔

۲۔ ایس سی ای آر ٹی کے ذریعہ اقلیتی اداروں کے منیجروں اور پرنسپلوں کو جدید تعلیمی طریقوں سے باخبر کیا جائے گا۔ یہ کام بھی فی الحال این سی ای آر ٹی چھوٹے پیمانے پر کر رہی ہے۔

۳۔ اقلیتی اداروں میں، قومی یکجہتی کی خاطر، علاقائی زبان کے استادوں کا تقرر، سہ لسانی فارمولے کے تحت۔

۴۔ اقلیتی اداروں میں طالب علموں کی کمزوری دور کرنے کے لیے کوچنگ یا خصوصی تدریس۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں انجام دیں گی۔

۵۔ کمپیوٹر سے ابتدائی آگاہی کی اسکیم میں اقلیتی اداروں کو معقول حصہ ملے گا۔

ووکیشنل اور ٹیکنیکل تعلیم:۔

ان ہایر سکنڈری اسکولوں میں جو تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں کو خاص طور پر فیض پہنچاتے ہیں، ووکیشنل کورسوں کا اجرا۔

۲۔ اس بات کا اطمینان کر لینا کہ اقلیتی ادارے، ووکیشنل اور ٹکنیکل تعلیم سے پورا فائدہ اٹھائیں۔

۳۔ ان علاقوں یا بلاکوں میں جہاں اقلیتی آبادی کی کثرت ہے، کرافٹ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹس کا قیام، اس التزام کے ساتھ کہ ۸۰ فی صد جگہیں اہلِ حرفہ یا کاریگروں کے بچوں کے لیے ریزرو کر دی جائیں۔

عورتوں کی تعلیم : (۱) چونکہ عورتوں کی حرف شناسی اور لڑکیوں کے داخلہ کی شرح تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اقلیتوں میں سب سے کم ہے، اس لیے لڑکیوں کے اسکولوں کے کھولنے، خواتین ٹیچرس کے تقرر، لڑکیوں کے ہوسٹلوں کی تعمیر اور حصولِ علم کے لیے اس قسم کی ترغیبات جیسے دن کے کھانے اور یونیفارم کا اہتمام ان سب میں اقلیتوں کی ضرورتوں کی پوری طرح تشفی ہونی چاہیے۔

۲ - اقلیتوں کی کثیر آبادی والے ہر ضلع میں حرفہ دستکاری میں لڑکیوں کو ٹریننگ دینے والے پروڈکشن کم ٹریننگ سنٹر (پیداواری و تربیتی مرکز) کا کھولا جانا۔ جہاں تک ممکن ہو ان میں خواتین ٹیچر رکھی جائیں۔ یہ کام بھی ریاستی حکومتیں کریں گی۔

تعلیمِ بالغاں اور ننھے بچوں کی تعلیم کی رضاکارانہ تلقین کے لیے اقلیتوں کے پیشہ وروں کو تربیت دی جائے : ہر اقلیتی ادارے کے ساتھ ایک مرکز کو منسلک کر دینا تاکہ ان اسکیموں سے لوگ آگاہ ہو جائیں اور نگرانوں یا سپروائزروں کو تربیت دی جا سکے۔ یہ کام بھی ریاستی سرکاریں کریں گی۔

لائبریریاں، ریڈنگ روم اور اکسٹینشن کا (توسیعی) کام :

اقلیتی علاقوں میں لائبریریاں اور ریڈنگ رُوم کھولے جائیں گے؛ کچھ بلاکوں میں تجربہ کے طور پر تعلیم کی توسیع کا کام پائلٹ پروجیکٹ کے طور پر۔ یہ کام بھی ریاستی سرکاریں کریں گی اور اس کے لیے وسائل کا ان کی طرف سے معقول انتظام ہوگا۔

اقلیتوں کے زیرِ اہتمام تعلیمی ادارے :

۱ - ان اسکولوں کو تسلیم کرنے اور درخواستوں پر بلا تاخیر فیصلہ کرنے کے لیے واضح رہنما خطوط اور ہدایات۔ ہر ریاست، اسکولوں کو تسلیم کرنے کے بارے میں پالیسی بنائے گی اور اسے اچھی طرح مشتہر کرے گی۔

۲ - ان پروگراموں کی صحیح تعین اور نفاذ کے لیے مانیٹرنگ کا مؤثر انتظام ہونا چاہیے۔

۳۔ اقلیتی اداروں کا ایک ریاست گیر فیڈریشن یا وفاق کا قیام تاکہ اقلیتی اداروں کا تعاون تعلیمی ترقی کے اقدامات کے نفاذ اور ضروری انفرا اسٹرکچر کی فراہمی، تعلیمی معیاروں کے برقرار رکھنے اور اساتذہ کے مفاد کی حفاظت کے لیے حاصل کیا جا سکے۔ ان جماعتوں کو سرکاری طور پر تسلیم کیا جائے اور ان کو مالی امداد دی جائے۔

علاقائی کیفیت کا لحاظ (ایریا اپروچ) :

نئے اسکول کھولتے وقت اقلیتی کثرت کے چالیس اضلاع کا لحاظ رکھنا ہوگا، تاکہ اقلیتی بچوں کی رسائی تعلیم گاہوں تک بخوبی ہو سکے۔ وہ چالیس اضلاع حسب ذیل ہیں :

ریاست	اضلاع
اُترپردیش :	رامپور، بجنور، مرادآباد، سہارنپور، مظفرنگر، میرٹھ، بہرائچ، گونڈہ، غازی آباد، پیلی بھیت، دیوریا، بارہ بنکی، بستی۔
مغربی بنگال :	مرشدآباد، مالدہ، مغربی دیناج پور، بیربھوم، ندیا، ۲۴ پرگنے، کوچ بہار، ہاوڑا۔
کیرلا :	ملاپورم، کوزی کھوڈ، کنانور، پالگھاٹ، وایاناڈ۔
بہار :	پورنیا، کٹیہار، دربھنگا۔
کرناٹکا :	بیدر، گلبرگہ، بیجاپور۔
مہاراشٹر :	بڑا بمبئی (گریٹر بامبے)، اورنگ آباد۔
ہریانہ :	گوڑگاؤں۔
مدھیہ پردیش :	بھوپال۔
راجستھان :	جیسلمیر۔
گجرات :	کچھ

کمزور طبقات کے لیے صلاحیت اور ذرائع (میرٹ کم مینس) کی بنیاد پر وظائف کی اسکیم جس کے تحت اچھے اداروں میں داخلے کی ضمانت بھی ہو، فیس معاف کی جائے

یا فیس میں رعایت دی جائے ، اور اہلِ حرفہ اور دوسرے کمزور گروں کو اس مزدوری کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے جو ان کا بچّہ اسکول جانے کی وجہ سے کر نہ سکا یہ اسکیم بھی ریاستی حکومتیں عمل میں لائیں گی۔

تنظیمی اور انتظامی مسائل :

۱۔ بنیادی یا ابتدائی جائزے (یا سروے) اور ان کے بعد معیّن وقفوں کے ساتھ ایسے سروے جن سے پڑھے لکھوں کی تعداد اور تعلیمی اکتسابات میں اضافہ کی رفتار معلوم ہوتی رہے ؛ مختلف پہلوؤں پر تحقیقی مطالعے یا ریسرچ اسٹڈیز تاکہ ان اقدامات کو جن کا مُدّعا کمزوریاں دُور کرنا ہے بہتر بنایا جا سکے، بالخصوص اقلیتی علاقوں میں اسکولوں کے تناسب کی اصلاح - یہ کام بھی ریاستی سرکاریں انجام دیں گی۔

۲۔ تعلیمی اعتبار سے پچھڑی ہوئی اقلیتوں کی مؤثر نمائندگی تعلیمی بورڈوں اور صلاح کار کمیٹیوں پر، مرکز اور ریاستوں میں ہوگی۔

۳۔ مذکورہ بالا اقدامات کی مؤثر تعمیل سے باخبر رہنے (کو مانیٹر کرنے) کے لیے مرکز کے اور ریاست کے شعبہ ہائے تعلیم میں ایک اکائی (یا سیل) قائم کیا جائے گا۔

۴۔ ہر سال اقلیتی سے متعلق پروگراموں پر نظرِ ثانی (ریویو) کی جائے گی۔

تعلیم بالغان :

۱۹۵۱ء اور ۱۹۸۱ء کے درمیان خواندگی کی شرح ۶۷ء۱۶ سے بڑھ کر ۳۶٫۲۳٪ ہوگئی لیکن اس عرصے میں اَن پڑھوں کی تعداد ۳۰ کروڑ سے ۴۳٫۷۰ کروڑ ہوگئی

نئی پالیسی دا سے ۳۵ سال کی عمر والے دس کروڑ انسانوں کو تعلیم بالغاں کا فائدہ پہنچائے گی۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ بالغوں کی تعلیم پُرکشش اور کامیاب جبھی ہو سکتی ہے جب اس کے ساتھ وہ اطلاعات اور ہُنر اور مہارتیں بھی ہوں جو بالغ طالبِ علم کے پیشے یا کاروبار کو فائدہ پہنچا سکیں۔ اس کے علاوہ "این پی اے ای" (نیشنل پروگرا

آف ایڈلٹ ایجوکیشن) یا "تعلیم بالغاں کا قومی پروگرام" قومی نشان اور دکاس اور ترقی کے پروگراموں سے آگاہی اور ظلم سے نجات کے شعور پر زور دے گا۔ طے کیا گیا ہے کہ تعلیم بالغاں کی رفتار اور ماحول کو بہتر بنانے کے لیے سائنس اور ٹکنولوجی کا استعمال اور طریق تعلیم (پیڈاگوجی) پر تحقیق کی جائے گی۔ دکاس کے پروگراموں سے تعلیم بالغان کا ناتہ جوڑیں گے۔ کاروباری خواندگی (فنکشنل لٹریسی) کا ایک زبردست ہمہ گیر پروگرام شروع کیا جائے گا۔ عوام کا عملی تعاون اس پروگرام کی کامیابی کے لیے حاصل کیا جائے گا۔ سارا تعلیمی نظام اس مہم کی کامیابی کا بیڑا اُٹھائے گا۔ "آر ایف ایل پی (R F L P) یا Rural Functional Literacy Projects (دیہی کاروباری خواندگی کے پروجیکٹ) اور S A E P (State Adult Education Programme) یا تعلیم بالغاں کے ریاستی پروگراموں کو مضبوط کیا جائے گا۔ معلمات کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔ رضا کار ایجنسیوں کا تعاون زیادہ حاصل کیا جائے گا اور انھیں اپنے طور سے پروگرام کو چلانے کی آزادی ہوگی مزدوروں کی تعلیم کے پروگراموں پر نظر ثانی کی جائے گی۔ شریک دریا بیٹھ مزدور عورتوں اور بچوں اور دیہاتی مزدوروں کی طرف زیادہ دھیان دیں گے "سنٹرل بورڈ آف ورکرز ایجوکیشن" یا "مزدوروں اور محنت کشوں کی تعلیم کا مرکزی بورڈ" خواندگی یا ابھرتا اور مزدوروں کی تعلیم کے پروگرام اپنے ہاتھ میں لے گا۔ ایمپلائر یا آجر کو (اگر ضرورت ہوئی تو قانون کے ذریعے) آمادہ کیا جائے گا کہ اپنے مامورین، ماجورین یا ورکرز کے لیے خواندگی اور مہارت کو بڑھانے کے پروگراموں کا اہتمام کریں۔ تعلیمی اداروں کو ناخواندگی مٹانے کے لیے معقول مدد اور رشد دی جائے گی۔

تعلیم کو جاری رکھنا (Continuing Education): دیہات میں ۵۰۰ کی آبادی کے لیے ایک جن شکشن نلایم (عوامی تعلیمی مرکز) کھولا جائے گا۔ "جے ایس این" J. S. N. کو تعلیم بالغاں اور غیر رسمی تعلیم کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا اسکول کی عمارت یا پنچایت گھر میں اس کے تحت لائبریری، ریڈنگ روم، چرچا

متذل، ثقافتی سرگرمیاں فراہم کی جائیں گی۔ تعلیم اور تفریح کے مقاصد کے لیے ریڈیو، دوردرشن اور فلموں کو بروئے کار لائیں گے۔

میں نے نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر بالقصد تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ "نئی تعلیمی پالیسی" اور "عملی پروگرام" دونوں دستاویزوں کے ایسے حصوں سے اقتباس لیے گئے ہیں جن کا فائدہ اقلیتیں براہِ راست اُٹھا سکتی ہیں۔ ایک راہ اس مطالعہ سے یہ بھی نکلتی ہے کہ پسماندہ اقلیتوں کے لیے مذکورہ اقدامات کے علاوہ بہت سے امدادی قدم اور اُٹھائے جانے چاہیے تھے۔ اس کی طرف علیحدہ توجہ کی جائے گی، حالانکہ اس کا وقت جب تھا جب "تعلیم کا چیلنج" شائع ہوا تھا اور اس کے بعد جب "نئی تعلیمی پالیسی" بنی تھی، اور اس کے بعد جب "عملی پروگرام" کی تشکیل ہوئی اور وہ ایوان میں پیش کیا گیا۔ تھوڑا بہت جو کچھ آخری دونوں دستاویزوں میں راہ پا گیا ہے، وہ سیمناروں میں اس مسئلہ کو پے درپے اُٹھانے کا نتیجہ ہے۔ بڑی ضرورت اس وقت اس بات کی ہے کہ لمحہ کی نزاکت اور تعلیمی پالیسی کی غیر معمولی اہمیت کا احساس مسلمانوں کو ہو جائے اور وہ آگے بڑھ کر اس پالیسی کا پورا پورا فائدہ اٹھائیں، اور اس کے نفاذ میں حتی الامکان حصہ لیں۔ ابھی تک یہ ہوتا رہا ہے کہ زیادہ تر عمّال کی بے رُخی اور کمتر ہماری بے حسی کی وجہ سے نہ صرف عام فائدہ کی پالیسیوں اور اسکیموں کا فائدہ ہمیں برائے نام ملا ہے بلکہ ان اسکیموں اور پروگراموں کی منفعت سے بھی، جو ہمارے لیے وضع ہوئیں، ہم کم و بیش محروم رہے۔ بہت بڑی احتیاج اس وقت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شہر اور ضلع اور راجدھانیوں میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو تعلیمی پالیسی اور پروگرام کی سطر سطر سے واقف ہوں، اور جو برابر نگاہ رکھیں کہ پالیسی اور پروگرام کا پورا فائدہ ہمیں پہنچے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مقابلے کے امتحانوں کے لیے کوچنگ کی اسکیم، جو ہمارے لیے چلائی گئی تھی، غلط ہاتھوں اور غلط مرکزوں میں پہنچ جانے اور کچھ خود ہماری بے خبری یا بے حسی

کی وجہ سے ابھی تک ہمارے کچھ کام نہیں آئی (اُسے راہ پر لانے کی کوششیں جاری ہیں)۔ این سی ای آر ٹی کی ریسورس سنٹروں کی جو اسکیم اساتذہ کی صلاحیتوں میں اضافے کے لیے شروع کی گئی، وہ ابھی تک حکومت کی مالی منظوری کا انتظار کر رہی ہے اور ایسی یونیورسٹیاں جیسے علی گڑھ اور جامعہ، بددل ہونے لگی ہیں۔ اگر ہم نے تنظیمیں برپا نہیں کیں اور ان پروگراموں اور اسکیموں کے طرزِ نفاذ کو برابر زیرِ نظر نہیں رکھا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ ہم عمومی اور خصوصی دونوں پروگراموں کے فائدے سے محروم رہ جائیں گے اور ملک کے دوسرے طبقات تعلیم، اور اس کے نتیجے میں، دوسرے شعبوں میں، ہم سے اور زیادہ نکل جائیں گے۔ ہم ملک کی تعلیم و ترقی میں اتنا بھی حصہ نہیں لے سکیں گے جتنا اب تک لیا ہے، اور ان سے وہ قلیل فائدہ بھی نہ اُٹھا سکیں گے، جو اب تک اُٹھایا ہے۔ آپ اگر عزت کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو علم کا دامن مضبوطی سے پکڑ لیجیے اور تعلیمی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کے شرکت کیجیے اور ان پر اثر انداز ہوئیے۔ یہ خطرہ ہر وقت پیشِ نظر ہونا چاہیے کہ بعض تنگ نظر اہلکار دورانِ نفاذ، پالیسی اور پروگرام کے رُخ کو اس طرح بدل سکتے ہیں کہ نفع کے بجائے ہمیں نقصان پہنچے۔ یو پی کے بعض مراکز میں نئی پالیسی کے تحت اخلاقی تعلیم دینے کا جو انتظام کیا گیا ہے، وہ سخت قابلِ اعتراض ہے۔ اس کا نتیجہ یا تو گمراہی ہوگا، یا مسلمانوں کا جدید تعلیم سے برگشتہ ہو جانا۔ اس طرح کے اقدامات سے مسلمانوں میں اس علیحدگی پسندی اور کنارہ کشی کو شہ ملے گی، جس کی عام طور پر، بغیر اسباب میں جائے شکایت کی جاتی ہے۔ نفاذ کے انحرافات کو فوراً ریاستی اور مرکزی حکام کے علم میں دلائل کے ساتھ لانا چاہیے۔

ایک بات اس بارے میں اور درخورِ التفات ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت پروگرام اور اسکیمیں چلائی جا رہی ہیں اور چلائی جائیں گی، ان میں روزگار کے بہت سے مواقع نکلیں گے۔ ان میں ہمیں انصاف، قومی یکجہتی، اور ہر پروگرام کی قبولیت اور کامیابی ان سب کی رُو سے پورا حصہ ملنا چاہیے۔ ہمیں اس بات پر نظر رکھنی اور اس مطا

کو زبان دینی چاہیے۔ نیشنل انٹیگریشن اور ہندوستان کے ثقافتی ورثہ اور جدّوجہد آزادی کو ہمارے نئے نظامِ تعلیم میں مرکزی مقام دیا گیا ہے۔ یہ بات برمحل اور قابلِ ستائش ہے۔ لیکن ہمیں چوکنّا رہنا چاہیے کہیں وہ لوگ جو فراخ دلانہ اور وسیع مشرب قومی پالیسی سے دلی اتفاق نہیں رکھتے، عصبیت کو راہ نہ دے دیں اور ایسا مواد اس میں داخل نہ کر دیں جو اسلام کے خلاف ہو یا مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرتا ہو۔ ہمیں اس پر نگاہ رکھنے کے لیے پڑھے لکھے اور باخبر لوگوں کی ایک انجمن بنانی چاہیے۔ ہمیں خود بھی ان تینوں موضوعات پر اپنے مؤرخین اور سماجی عالموں اور روشن خیال غیر مسلم اہلِ قلم سے لکھوانا چاہیے۔ یاد رکھیے کہ جو باتیں اب نصاب میں داخل ہو جائیں گی، وہ ہمارے بچوں کے ذہن اور عقائد پر براہِ راست اثر انداز ہوں گی۔ دور درشن اور آکاش وانی کے پروگراموں کا ناظرین خصوصاً بچوں اور نوجوانوں کے ذہن پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ سوچ سمجھ کر ان پروگراموں میں اس طرح دخیل ہوں کہ ہندوستان کے حسین، وسیع، بوقلموں اور ملے جُلے تمدّن کا ان میں انعکاس ہونے لگے۔ اس تہذیب اور ثقافت کو بنانے میں مسلمانوں کا جو حصّہ ہے اس کو خوبصورتی کے ساتھ منظرِ عام پر لانا چاہیے۔ وہ حصّہ دبتا اور ڈھکتا جا رہا ہے۔

حاضرینِ کرام کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ کام بہت بڑا اور ہشت پہلو ہے۔ اس کو اچھی طرح سے انجام دینے کے لیے عمومی تعاون کے علاوہ شہر اور ضلع، ریاست اور مرکز کی سطح کی تنظیمیں درکار ہوں گی۔ ان تنظیموں کے قیام کی طرف باخبر افراد کو قدم بڑھانا چاہیے؛ اس میں تاخیر مہلک ہوگی۔ لیکن ان سب تنظیموں کے بن جانے کے انتظار کرنے میں خرابی یہ ہے کہ زمانہ اور ہمارا ملک بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے؛ اس نے پہلے بھی ہماری سُست رفتاری اور دیر بیداری کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اب بھی ہماری خوش خرامی سے ہم آہنگ نہیں ہوگا۔ جو لوگ اپنی رفتار کو سُست کر دیتے ہیں، وقت کا تیز رو قافلہ ان کو کچلتا ہوا آگے نکل جاتا ہے۔ اور کوئی ان پر ماتم کرنے والا باقی نہیں رہتا۔ جن افراد کو اللہ تعالیٰ نے تھوڑا بہت

بھی علم، شعور اور عصری آگہی سے نوازا ہے وہ اس درماندہ ملت کے مقروض ہیں۔
ان کو یہ قرضہ اُتارنا ہے۔ قرضہ اُتارنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے ان بھائیوں کی
رہبری کریں جنھیں علم اور آگہی حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملے۔ ہم یہ کہہ کر مطمئن نہیں
ہوسکتے کہ مسلمان جاہل ہیں یا غافل ہیں یا نفاق پرور ہیں اور اپنی تباہی اور زوال
کے خود ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ جاہل اور بے خبر ہیں، تو اس کا الزام براہِ راست ان
مسلمانوں پر آتا ہے جو پڑھے لکھے اور باخبر ہیں۔ مؤرخ ان کو بے قصور ٹھہرائے گا
اور الزام ان پڑھے لکھے اور خوش حال افراد کو دے گا جنھوں نے انتہائی بے غیرتی
اور بے حسی اور خود غرضی کے ساتھ اپنے آپ کو عامۃ المسلمین سے کاٹ لیا ہے۔ الگ
کرلیا ہے اور جوان کی رہنمائی اور مدد سے اس خیال سے بے تعلق ہوگئے ہیں کہ ایک
تو وہ خود ترقی یافتہ ہیں ترقی باختہ لوگوں کی انھیں فکر کیوں ہو۔ دوسرے ان میں سے
بعض یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں سے خود کو الگ کرکے وہ دوسروں، بہ شمولِ حکومت، کی
نگاہوں میں سرخرو ہوں گے۔ اس سے بڑی بھول کوئی نہیں ہوسکتی۔ وہی شجر
برگ و بار لاتا ہے جس کی جڑیں اسی زمین میں پھیلی ہوئی ہوں، تناور درخت کا
یہی شیوہ ہے۔ البتہ کچھ بے غیرت بیلیں ضرور ایسی ہوتی ہیں جو درختوں سے لپٹ
جاتی ہیں اور ان کے سہارے بڑھتی اور پنپتی ہیں۔ انھیں ایک چھوٹا سا بچہ بھی ہاتھ
کے اشارے سے توڑ کر پھینک سکتا ہے۔

یہ بے بضاعت انسان بہت غور و فکر کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے
اقلیتوں کے جانبر اور سُرخرو ہونے کے لیے تین شرطیں ہیں اور ان تینوں کا پورا
ضروری ہے:

۱۔ اپنے دین، مسلک، روایات، ثقافت اور زبان پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں
۲۔ اس کے افراد اکثریت کے افراد سے کہیں زیادہ محنت کرکے اپنی کارگزاری اور لیاقت کا لوہا منوالیں اور ملک و قوم کے لیے اپنی افادیت کو تسلیم کرالیں اور ۳۔ یہ
شرطیہ کار بند رہتے ہوئے، اکثریت اور دوسرے فرقوں کے ساتھ اپنے تعلقات
خوشگوار اور شگفتہ رکھیں۔

گزشتہ سال بھر سے اکثریت کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات میں شگفتگی کی
جگہ شکر رنجی اور تناؤ نے لے لی ہے۔ اکثریت کو یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ وہ محاصرہ
میں ہے اور اقلیتوں کے پو بارہ ہیں۔ اس سے زیادہ گمراہ کن اور بے اساس بات کوئی
ہو ہی نہیں سکتی۔ ہمیں چاہیے کہ ہندوؤں کی طرف غیرت مندی کے ساتھ دوستی اور
تعاون اور خوش فہمی اور خیرسگالی کا ہاتھ بڑھائیں۔ انھیں بتائیں کہ اسلام کا شیوہ
تسلیم و رضا اور اس کا پیام رافت و رحمت و خدمت ہے۔ اسلام میں قریب والوں
اور ہمسایوں کا بڑا حق ہے۔ ہر جگہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے
ہیں، اور جب تک دفاتر میں مسلمانوں کا گزر تھا یہ دونوں قومیں ایک ساتھ کام کرتی
ہیں اور اب بھی بعض دفتروں، کارخانوں، کاروباروں میں وہ ساتھ ساتھ کام کرتے
ہیں۔ اسلام وطن کا احترام کرتا ہے لیکن وطن دوستی سے آگے نہیں جاتا۔ وطن
رستی کی طرف نہیں بڑھتا، وہ ساری انسانیت کو ایک برادری تصور کرتا ہے۔ خالق
ی عبادت اور خلق کی خدمت اس کی تعلیم ہے۔ ایسے مسلمان ملیں گے جو ایسا نہیں
رتے لیکن انھیں ہم اسلام کا آئینہ دار نہیں کہہ سکتے۔ برادرانِ وطن کی خیر اندیشی
ارا اخلاقی فرض ہے۔ ہندوستان نے بے کیف اور مسلط کی ہوئی یک رنگی کو آزادی کے
قت صراحت کے ساتھ رد کر دیا۔ اس کی جمہوریت، مساوات اور سیکولر عقیدہ کی
یاد ہی یہ ہے کہ مختلف طبقوں کو اپنے عقائد اور روایات کے مطابق زندگی بسر
نے کی آزادی میسر ہو۔ جو صاحبان ملک بھر کے لیے ایک سول کوڈ کے نفاذ پر زور
ے رہے ہیں، وہ ہماری سیکولر جمہوریت کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، اور اگر آپ
ے ایک ہندی محاورہ استعمال کرنے کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ وہ ہمارے
ن کی سالمیت، وسعتِ نگاہ اور سیکولرزم پر کھٹور اگھات کر رہے ہیں۔ کیا وہ
ن سی بات بھی نہیں جانتے کہ ناروا اصرار سے ہمیشہ ضد پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں
ہیے کہ انھیں ہم سمجھائیں کہ عائلی قانون کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نظر براہِ راست
ب سے اخذ کیا گیا ہے، درآنحالیکہ ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں ایسا نہیں ہے۔

جب وہ یکساں سول کوڈ کی بات کرتے ہیں تو انھیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمانوں سے کہ رہے ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ دو۔ اگر وہ یہ جانتے تو کبھی ایسا نہیں کہتے۔

بعض قومی اخبار۔ نہ جانے کیوں اشتعال اور نفاق کو ہوا دے رہے ہیں تاریخ ان افعال و اعمال کا ریکارڈ ہے جو کبھی خیر پر اور کبھی شر پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک اخبار نے اس قسم کی تصویریں چھاپنی شروع کر دیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ مسلمان بادشاہوں نے بعض مسجدوں کو مندروں میں تبدیل کر لیا اور جو رام جنم بھومی اور اس کے جلو میں کرشن جنم بھومی کے متعلق تنازعہ کو ہوا دینے لگے۔ اس پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے وابستہ مؤرخین اور سماجیات کے ماہرین نے اس اخبار کو ایک خط بھیجا جس میں اس روش کے خلاف احتجاج کیا اور مذکورہ مولدوں کی تاریخی حیثیت کو نہایت مشتبہ بتایا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اگر تاریخ کے افعال کو ہم الٹنا چاہیں گے تو پھر ان مندروں کا کیا ہوگا۔ جو بدھوں اور جینیوں کی عبادت گاہوں کی جگہ پر بنائے گئے تھے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم ماضی کی پرچھائیں حال کے تعلقات پر نہ پڑنے دیں اور ایک خوشگوار اور ہم آہنگ مستقبل کی تیاری میں اپنے سارے بھائیوں کے ساتھ مل کر جُٹ جائیں۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخی رہی، تو مسلمان تو پسیں گے ہی، لیکن خود ہمارے ہندو بھائی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پائیں گے اور ملک کی ترقی کی رفتار، ترقی معکوس میں بدل جائے گی۔ حالیہ واقعات ہمیں بتا رہے ہیں کہ ہمارا ملک آشتی، امن اور انصاف کی بنیادوں پر ہی ترقی کر سکتا ہے۔ ناانصافی اور عصبیت اور تنگ نظری اور جہالت اور دشنام طرازی اور الزام تراشی، خواہ ہندوؤں کی طرف سے ہو خواہ مسلمانوں کی طرف سے، یکساں مذموم ہے فرقہ وارانہ مسائل کو تو ناحق پھیلا دیا گیا ہے۔ جو مسائل خوشحالی، ترقی اور سکون کے راستہ کا روڑا بن گئے ہیں، وہ اخلاقی مسائل ہیں۔ جھوٹ، فریب، تشدد، ریاکاری، ظلم، ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، ملاوٹ، تنگ نظری، عداوت، ہیں

ان اخلاقی معائب کے خلاف اعلانِ جنگ کر دینا چاہیے؛ یہ وبا کی طرح پھیلتے ہیں تو مذہب۔ نسل اور زبان اور علاقہ کا امتیاز نہیں کرتے۔ حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے ان اخلاقی عیوب کے خلاف جہاد کر رکھا ہے۔
ان کی پیامِ انسانیت کی تحریک، ہندوستان کے سارے باشندوں کو بُرائی چھوڑ کر بھلائی کی طرف آنے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے باہمی غلط فہمیاں مٹانے کے لیے مکالمہ یا ڈائلاگ کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے جس میں وہ غیر مسلم دانشوروں سے خطاب کرتے ہیں۔ دور رہ کر بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور ان کے رُخ، موقف اور رویّہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہندو صاحبان چونکہ اکثریت سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی خود بخود ہو جاتی ہے؛ میڈیا اور اخبارات اور اربابِ اختیار و اظہار کے ذریعہ۔ مسلمان ایسی اقلیت ہیں جس کی بڑی اکثریت اَن پڑھ ہے؛ وہ کمزور ہیں اور درماندہ اور دل برداشتہ۔ انھیں چاہیے کہ اپنی صورتِ حالات، اپنے مسلک اور اپنی مجبوریوں کو اہلِ وطن پر نرم اور مُدلّل ڈھنگ سے واضح کریں۔
اخبار کا ذکر آیا۔ ہمارے پاس کوئی انگریزی روزنامہ نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے دل کی بات دل ہی میں رہ جاتی ہے اہلِ وطن اسے سمجھ ہی نہیں پاتے حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی نے اس اہم ضرورت کی طرف بھی توجّہ دی ہے مجوزہ انگریزی قومی اخبار کے لیے سرمایہ کی فراہمی عوام کو ہی کرنا ہوگی۔ اس کے علاوہ ہر ریاست کے صدر مقام سے ایک روزنامہ مقامی علاقائی زبان میں بھی نکلنا چاہیے جس کے لیے مقامی کوشش درکار ہوگی، اور راجدھانی سے ہندی کا ایک روزنامہ اس کی چنداں احتیاج نہیں کہ یہ سب اخبار ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے ہوں ان سب کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ تازہ ترین صحافتی خوبیوں سے خود کو خاص و عام کے لیے پُرکشش بنائیں، قومی نقطۂ نظر کی ترجمانی کریں، اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور نقطۂ نظر سے بھی قارئین کو آگاہ کریں۔ یہ دَور بے رحم حد تک ذرائع ترسیل و ابلاغ

کا دَور ہے۔ کوئی جماعت ان سے محروم ہو کر پنپ نہیں سکتی۔ اخباروں کا یہ سلسلہ بتدریج وجود میں آئے گا۔ سعی یہ ہونی چاہیے کہ معیار کے بارے میں کسی قسم کی مفاہمت نہ کی جائے۔ ذہین اور ہونہار مسلم طلبہ کو صحافت کی طرف لے جانا چاہیے۔

اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں ایسے باخبر مسلمانوں کو چن کر اُن کا ایک حلقہ بنانا چاہیے۔ ان کے ذمّے یہ کام ہو کہ عام اخباروں میں مضامین اور خطوط کے ذریعہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو سامنے لائیں اور ان کے متعلق جو غلط خبریں نکلیں یا غلط فہمیاں پھیلیں ان کی تردید و توضیح کریں؛ بحث مباحثے کے انداز سے نہیں بلکہ متحمل طریقے سے، نرمی کے ساتھ، سمجھانے اور دلنشیں کرانے کے لیے۔

ایک نئے ہندوستان کی تشکیل میں، جو ٹکنولوجی اور سائنس کی تازہ ترین ترقیوں سے ہم قدم ہو، اور جو مغربی تہذیب کی لعنتوں اور مشرق کی بعض برائیوں سے بَری ہو، مسلمانوں کو اہلِ وطن کے ساتھ پورا تعاون کرنا چاہیے۔ تعاون کرتے ہوئے انھیں یہ ملحوظ رکھنا ہوگا کہ تعاون برابر والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ایک بالاتر ہے اور دوسرا فروتر، ایک تیز رفتار ہے اور دوسرا پا شکستہ تو دونوں برابری کی سطح پر ساتھ ساتھ چل ہی نہیں سکتے۔ پھر تو ایک طرف سے تحقیر ہوگی اور غصّہ اور دوسری طرف سے جراحت خوردہ بدگمانی۔ تعاون ہمیشہ صحت مند مقابلہ کا ہمعنان ہونا چاہیے۔ غور کیجیے تو یہ پائیے گا کہ ہمارے وطن کی اکثریت باوجود احیائیت کی نمایاں کوششوں کے اپنے محور سے ہٹ چکی ہے۔ ہم سے بھی زیادہ، وہ تہذیبِ حاضر سے مرعوب ہے؛ غافل اس بات سے کہ:

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

ترقی اور اخلاقیات کو اس نے بندشوں سے آزادی کے مترادف سمجھ رکھا ہے۔ سائنس کی لائی ہوئی مادی ترقیات سے سرشار ہو کر وہ اپنے ورثہ کے صالح عناصر کو بھول

چکی ہے، ان کی تعبیر غلط انداز سے کر رہی ہے۔ اخلاقی احتساب اور گرفت اور جزا و سزا کے تصورات سے وہ رُخ پھیرے ہوئے نظر آرہی ہے ۔ ان کی احیائیت جوابی ہے اور اس کا روئے سخن دراصل مسلمانوں کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اخلاقی حالت مسلمانوں کی بھی خراب ہے ؛ جہالت اور بے حسی اس پر مستزاد ؛ لیکن ان کے اس انتہائی جدید طبقہ کو چھوڑ کر جو جھاگ کی طرح اوپر آگیا ہے، مسلمان عوام سے محروم نہیں ہیں۔ اگر وہ خود کو سنبھال پائے اور بے اخلاقی اور نری مادیت اور سست عنانی سے اپنے آپ کو بچا سکے، تو کیا عجب (اگرچہ ان کی عام پستی کو دیکھتے ہوئے بظاہر ایسا سوچنا شیخ چلی کا ساتھ دینا ہے) کہ وہ ملک میں اچھی قدروں کو رائج اور بحال کرنے میں ایک مثبت کردار ادا کر سکیں۔

دینی تعلیم ہی اخلاق و اقدار کی حفاظت کر سکتی ہے۔ مدرسے سخت ناموافق حالات میں دین کی حفاظت اور اشاعت کر رہے ہیں۔ لیکن ان کی جغرافیائی تقسیم ناہموار ہے۔ محلّہ محلّہ ایسے مدرسے کھلنے چاہئیں ؛ کوئی مسجد ایسی نہیں رہنی چاہیے جس میں دین کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔ ان کو سنوارنے اور مضبوط کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے اور ان پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ بعض یونیورسٹیوں نے ان کی اسناد کو تسلیم کیا ہے ؛ باقی یونیورسٹیوں سے بھی رجوع کرنا چاہیے۔ مدرسوں کی نگرانی معائنہ اور اعانت کے لیے ہر ریاست میں اسی طرح کا شیرازہ مطلوب ہے، جیسا کہ یو۔پی کی دینی کونسل کا ہے۔ ایک کل ہند دینی کونسل کا قیام بلا مزید تاخیر

باضابطہ کوشش اس بات کی درکار ہے کہ دینی اور عصری تعلیم کا نقشِ دوئی مٹ جائے اور ہماری نئی نسل دونوں سے بہرہ ور اُٹھے۔ نئی تعلیمی پالیسی اس کے پروگراموں اور اسکیموں کے نفاذ پر قریہ قریہ نگاہ رکھی جائے، اور جہاں کوئی انحراف نظر آئے اس کی جانب موثر انداز سے مختلف سطحوں پر توجہ دلائیں۔ ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے استادوں کی صلاحیت اساتذہ کا تقاضہ کر رہی ہے۔ ہمیں ایک

تنظیم اس مقصد کے لیے قائم کرنا چاہیے۔ ہمارے طالب علموں کو، جو گھروں پر ماحول اور مدد سے اکثر محروم رہتے ہیں، ریمی ڈیل اور پروموشنل امداد درکار ہے؛ یعنی جو کمزور ہیں ان کی کمزوری دور کی جائے اور جو ذہین ہیں ان پر صیقل کی جائے تاکہ وہ آگے چل کر مقابلوں میں کامیاب ہو سکیں۔ غیروں اور اپنوں کی آگہی کے لیے معیاری اخبار نکلنے چاہئیں۔ ان سب کاموں کے لیے تنظیم اور وسائل درکار ہوں گے۔ اُن کی فراہمی کا اہتمام جی لگا کر، سر جوڑ کر اور قدم ملا کر کیا جائے، یہ سوچ کر کہ یہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے آخری کوشش ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اکیسویں صدی، ہماری حالت کو بیسویں صدی سے بدتر پائے۔

ووکیشنل اور ٹکنیکل تعلیم ہمارے لیے ضروری ہے اور موزوں بھی۔ علم سے طاقت آتی ہے، اور ہاتھ کے ہنر سے خود مختاری اور آزادی اور اعتماد۔ (۱) ٹکنیکل تعلیم (۲) لڑکیوں کے اسکول اور بورڈنگ ہاؤس (۳) ریمی ڈیل اور پروموشنل امداد۔ عصری تعلیم کے لیے ہماری یہ تصوراتی ترجیحات عملی تعبیر کی طالب ہیں۔ دینی تعلیم کے درسی نظام کو مضبوط اور وسیع کرنا ہے اور اس تعلیم کو گھر گھر پہنچانا ہے۔

ان ساری تجویزوں کا انحصار ایک دوسرے پر نہیں ہوگا۔ ہر ایک قائم بالذات ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسری سے توانائی اخذ کرتی ہے اور اسے توانائی پہنچاتی ہے۔ ہمہ گیر تنظیمیں مختلف سطحوں پر قائم ہو جائیں بہت اچھا۔ لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا ہے۔ محلّہ کی سطح سے کام شروع کر دینا ہے۔ اسی طرح ہمیں ان ساری قومی اسکیموں سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے جو منصوبہ بندی کے تحت ملک کے ہمہ گیر وکاس کے لیے بنائی اور چلائی گئی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہمیں اپنے اجتماعی شعور اور اپنی ملی حمیت اور کوشش کو مہمیز بنا دینا ہے۔ یاد رہے کہ ترقی کی دوڑ میں ملک کے برابر آنے کے لیے ہی ہمیں غیر معمولی کوشش کرنا پڑے گی۔ اور برابر آئے بغیر ہم مزید ترقی کے نئے منصوبوں سے فائدہ نہ اٹھا پائیں گے۔ برابر آنے کی کوشش انتہائی منظم ڈھنگ اور جانفشانی سے ہمیں کرنا ہوگی؛ کوئی دوسرا ہماری خاطر یہ کوشش نہیں کرے گا۔

حکومت سے ہمیں تقاضے متواتر کرنے چاہئیں۔ ہر تقاضے کے ساتھ خود اپنی کوشش کو دو چند کر دینے میں ہی خوش حالی، اقبال مندی اور ترقی ہے۔ تقاضے کا جواب اگر ہمدردی کے ساتھ دیا بھی گیا تو ہمارے ہاتھ کیا آیا؟ صرف چند الفاظ، اور نیم دلانہ تعمیل۔

دینی تعلیم کی توسیع کا فال آوٹ یا ضمنی نتیجہ اردو کی بقا کے حق میں ہو گا اُردو کا محاذ مطالبے سے زیادہ مجاہدہ کا خواہاں ہے۔ فریاد و فغاں سے کام کبھی چلا ہے نہ اب چلے گا۔ اُردو کا حق ملک سے ہم مانگتے رہیں گے۔ لیکن اسے اس کا حق دیں گے ہم ہی۔ اور اس کو حق دینے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے: بچوں کو گھر پر اُردو پڑھانا۔ اُردو جیسی زبان کے ساتھ، جو ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کا جیتا جاگتا مرقع ہے، نا انصافی کا برتاؤ، رواداری کے دعووں کو کھوکھلا بنا دیتا ہے۔ لیکن ہمارے پاس نکتہ چینی اور شکوہ سنجی کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ لمحہ کمر کسنے اور دعا کے لیے ہاتھ اُٹھانے کا ہے۔ دعا کے لیے التجا کرنے کا ہے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے — اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے — پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
ہر چپقلش دہر مخالف میں ترا نام — ہتھیار جوانوں کا ہے پیروں کا عصا ہے

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

(خطبۂ افتتاحیہ، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، بنارس، منعقدہ ۲۲، ۲۳ر نومبر ۱۹۸۶ء)

جناب سید شہزاد حیدر
3- Madrasa, Upper Kot
شہر

ذاکر صاحب: چند یادیں

جناب سید شہزاد حیدر

میرے والد سید افتخار حیدر زیدی مرحوم کا اور ڈاکٹر ذاکر صاحب مرحوم کا ساتھ ۱۹۰۶ء میں جب کہ تقسیم بنگال کی وجہ سے ملک میں شورش تھی، لارڈ کرزن کا زمانہ تھا، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ (یو پی) کے درجہ چہارم میں ہوا اور یہ ساتھ لگاتار اسی اسکول میں درجہ نہم تک قائم رہا۔ پھر ۱۹۲۰ء تک مختلف مقامات پر تعلیم مختلف شعبوں میں ہوا جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان ایسی محبت اور قربت قائم ہو گئی جو تادم حیات قائم رہی۔ یہاں کی تعلیم سے فارغ ہو کر ذاکر حسین صاحب مزید اعلیٰ تعلیم کی غرض سے جرمنی چلے گئے اور میرے والد نے تعلیم سے فارغ ہو کر وکالت کا ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد فوجداری کے وکیل کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ میرے والد کو چونکہ وکالت کا پیشہ شروع ہی سے ناپسند تھا، اس لیے اس پیشہ کو چھوڑنے کی غرض سے کچھ دیگر راستے ۱۹۲۶ء تک اختیار کیے، مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی اس وجہ سے ۱۹۲۶ء کے بعد سے مستقل طور پر پیشۂ وکالت کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ اس پیشہ میں میرے والد کو جو کامیابی مثل دیگر وکیلوں کے نہ ہوئی، اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ انھوں نے کبھی بھی کسی جھوٹے مقدمہ کی پیروی نہیں کی۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ایک مسلمان وکیل کا جھوٹے مقدمہ میں جھوٹے موکل کی طرف سے پیروی کرنا، مذہب اسلام اور قرآن سے خیانت ہے۔ ظاہر ہے ایسے وکیل کو کامیاب ہونے کے مواقع کہاں حاصل ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی بلکہ ان کے محرروں کی بھی زندگیاں تنگدستی اور افلاس کا شکار رہیں۔

جناب سید افتخار حیدر زیدی مرحوم

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم اپنی شروع زندگی ہی سے کانگریسی خیالات کے رہے اور گاندھی جی و پنڈت
نہرو وغیرہ لیڈروں کے حلقہ میں رہے۔ برخلاف اس کے میرے والد نے کبھی بھی سیاست سے دلچسپی نہیں لی۔ غالباً
اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اوّل تو مذہبی زندگی جس میں تزکیہ نفس بھی شامل تھا گزارنے کے عادی تھے، اور دوسری
بات یہ تھی کہ وہ فرنگیوں کی مکاری، کانگریس کی قومی یکجہتی۔ خلافت کمیٹی کی تحریک ترک موالات اور آغا خان کی
صدارت میں مسلم لیگ کی پالیسی کو سمجھنے میں اپنے آپ کو قاصر پاتے تھے۔ اور یہی ایک فاصلہ تھا جو میرے والد اور ڈاکٹر
ذاکر حسین کے درمیان تھا مگر اس سے تعلقات اور قربت پر کبھی اثر نہیں پڑا۔ چنانچہ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم
یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہو گئے، تو انھوں نے خود ہی یہ محسوس کیا کہ میرے والد کے اندر وہ خوبیاں نہیں ہیں جو ایک
کامیاب وکیل کے واسطے ضروری ہیں۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی چٹھی نمبر ۱۸۰ ڈی ۲۰ مئی ۱۹۵۲ء کے ذریعہ میرے والد
کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اندر نائب رجسٹرار کے عہدے کی پیشکش کی جس کو میرے والد نے قبول نہ کیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین
صاحب مسلم یونیورسٹی سے نکل کر صوبہ بہار کے گورنر، پھر وہاں سے نائب صدر جمہوریہ ہند اور آخر میں صدر جمہوریہ ہند
عہدے پر پہنچ گئے۔ اس تمام عرصہ میں دونوں ہستیوں کے تعلقات مستحکم رہے، خط و کتابت رہی، آنا جانا رہا۔ جب
ہمارے یہاں کوئی پریشانی ہوتی اور ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو جاتا تو وہ اس کو حل کر دیتے، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جب
میرے بھائی بہن ایک ساتھ بیمار پڑ گئے، تو انھوں نے دہلی بلا کر ان کا علاج کرا دیا۔ جب میں نے انٹر کلاس پاس کیا
تو انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور مزید تعلیم کو جاری رکھنے کے واسطے پڑھائی کا خرچہ برداشت کرنے
ذمہ داری اپنے اوپر لے لی چنانچہ وہ ہمیشہ پرنسپل ڈی، اے، وی کالج بلند شہر کے نام جہاں میں تعلیم پاتا تھا چیک
روانہ کر دیا کرتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا، جہاں تک وہ ہمارے ساتھ ہمدردی اور مدد اپنی جیب اور ذاتی کوشش
کر سکتے تھے ہمیشہ تیار رہتے تھے، مگر جب ہماری مدد کا سوال بجائے ذاکر حسین کے راشٹرپتی یا راشٹرپتی بھون سے
جڑتا نظر آتا تو اس کے واسطے دروازہ مقفل ہو جاتا اور ایسا ہوتا کہ ہماری ہزار کوشش کے باوجود بھی نہ کھلتا۔ مثلاً انھوں
نے جب وہ راشٹرپتی تھے تو کسی ایسے فنڈ سے جو صدر کے پاس ایسے کاموں کے واسطے مخصوص ہوتا ہے، میرے والد
کا ایک قلیل سا وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو ان کو تاحیات ملتا رہا۔ چونکہ نام وظیفہ کا تھا اور تھا بہت قلیل اس وجہ سے میرے
والد نے ان کو تحریر کیا کہ کیا اچھا ہو کہ اگر آپ اس وظیفہ کو اُس PENSION میں تبدیل کر دیں جو مجھے ماہ کی پہلی تاریخ
کو یہاں خزانہ سے مل جایا کرے، تو اس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اس طرح دیا۔ "میں آپ کے مقصد کو سمجھ گیا
مگر چونکہ آپ اپنی زندگی کے کسی حصہ میں بھی سیاست میں داخل نہیں ہوئے اس وجہ سے آپ پولیٹیکل سفرر نہیں ہیں،

آپ اس خانہ ہی میں نہیں آسکتے تو میں کس طرح آپ کی PENSION کا بوجھ سرکاری خزانہ پر ڈال سکتا ہوں۔ جو وظیفہ مل رہا ہے، وہ آپ کو زندگی بھر ملتا رہے گا خواہ صدر کوئی ہو۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ملک کے صدر تھے۔ تو کبھی کوئی ایسا کام نکل ہی آتا کہ وہ میرے والد کو بلا لیتے اور جب وہ بھون پہنچ جاتے خواہ میں ہی کیوں نہ ساتھ ہوں۔ سرکاری سطح پر مہمان بن کر قیام کرتے۔ مگر جب کبھی میرے والد اپنے کسی کام سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کرنے کو تاریخ مانگتے تو ڈاکٹر صاحب بڑی عقیدت سے تار دے دیتے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی تحریر فرما دیتے کہ آپ کا قیام راشٹرپتی بھون میں نہیں ہو سکے گا۔ ایک مرتبہ میرے والد نے میری ملازمت کے بارے میں طویل خط لکھا، اور یہ بھی لکھا کہ شہزاد نے اب بی۔ اے کر لیا ہے۔ اگر اس کو کوئی مناسب ملازمت مل جائے تو ہمارے واسطے کافی سہولت ہو جائے۔ جس کا جواب ڈاکٹر صاحب نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے ہوئے خط سے دیا (چٹھی نمبر ۵۰۴، ۱۲/ ۱۷ پی۔ مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۶۹ء):

"WITH REGARD TO SHAHZAD I AM AFRAID I WILL NOT BE ABLE TO DO ANYTHING. I HAVE MY OWN REASONS FOR SAYING THIS. I HOPE YOU WILL UNDERSTAND AND EXCUSE ME."

پھر اسی مضمون کو تفصیل کے ساتھ اردو میں اپنے ہاتھ سے تحریر کر کے [illegible] کیا۔ تعجب تو یہ تھا کہ باوجود ایسی سرد مہری کے جواب سے دونوں کے تعلقات میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، اور درمیان میں کوئی فاصلہ نہ پڑا تھا۔ یہاں تک ایک مرتبہ صدر کی حیثیت سے بلند شہر کراس کر رہے تھے تو وہ ڈاکٹر ذاکر حسین جس کو تمام دنیا کے دوست ممالک قومی ترانہ کے ساتھ گارڈ آف آنر دیں، ۲۱ توپوں کی سلامی دیں۔ ملک کے اندر جب وہ دہلی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے آئیں تو انتظامیہ پوری جامع مسجد کو اپنے گھیرے میں لے لے، لیکن جب وہ بلند شہر کراس کرے تو اوپر کوٹ محلہ کی گلیوں میں سے گزرتا ہوا اپنے مخصوص عملے کے ساتھ ہمارے گھر میں آ گئے، ناشتہ کرے، قہقہوں کے درمیان باتیں کرے، اپنا بچپن یاد کرے۔ بچپن کے بعض دوستوں کو یاد کرے، خود ہلے اور دوسروں کو ہلائے گویا صحیح معنوں میں افتخار صاحب کا بچپن کا لنگوٹیا یار آیا ہے۔ درمیان میں نہ کوئی شکوہ ہے نہ شکایت۔ ایک طرف شہزاد ہے۔ اس کے باپ ہیں اور بھائی بہن ہیں اور دوسری طرف ذاکر حسین ہیں۔ بچپن کی یادیں ہیں اور خلوص ہے، یا یہ جملہ ہے "شہزاد ابھی نوکری کر کے کیا کرو گے۔ ابھی پڑھو کیا پریشانی ہے۔"

یہاں تک تو میرے والد اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کے تعلقات کی تصویر تھی۔ اب میں اپنے ایک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں، جو قریب قریب ڈاکٹر صاحب کی حیات کے آخر میں واقع ہوا۔

جیسا کہ مندرجہ بالا مضمون سے ظاہر ہے میں نے اپنے بچپن میں ذاکر حسین صاحب کی گود بھی دیکھی تھی اور انگلی بھی پکڑی تھی۔ جب بڑا ہوا تو کبھی گھڑی مانگ لی اور کبھی قلم جھٹک لیا۔ پھر جب سن بلوغ کو پہنچا تو وہ نہ صرف میرے دعا گو

سب ہے، بلکہ بیدار اور کسی قدر سرپرست کے خانے میں آگئے تھے۔ ایسی ایسی نصیحتوں کے خطوط لکھتے جو دل پر اثر کر جاتے۔
جب میں نے بی۔ اے کر لیا، تو میرے گھر کا ماحول میری مزید تعلیم کے سلسلے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا، مجبور ہو کر میں نے ایک
درخواست ایک سرکاری محکمے میں بغرض ملازمت گزاری۔ اس ملازمت کے سلسلہ میں میری جلد کو ایپلیکیشن مکمل تھیں بجز عمر کے کہ مطلوبہ مدت
سے صرف چھ ماہ زائد تھی۔ عام طور پر چند لوگوں کی تاریخ پیدائش پر صرف سال کا اندراج ہوتا ہے اور مہینے کا نام نہیں ہوتا تو ان کی عمر کی پیدائش کا
مہینہ جولائی تصور کیا جاتا ہے خواہ پیدائش جنوری میں ہو یا دسمبر میں۔ چونکہ محکمہ کا سوال تھا۔ ملازمت باعزت
تھی اور اتفاق سے انٹرویو بھی دہلی میں ہوتا تھا۔ اس لیے درخواست جمع کرنے کے بعد دہلی میں صدر صاحب سے ملاقات کرنے کا ارادہ
کر لیا اور بغیر پروگرام فٹ کیے ہوئے دہلی پہنچ گیا۔ اُس دور میں راشٹرپتی بھون کی اہمیت میرے واسطے کچھ تو ایسی زیادہ
نہ تھی چونکہ متعدد بار اُس میں گھوم چکا تھا۔ اسی طرح اُس دور کا راشٹرپتی میرے واسطے ایک چچا کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی
خواہ کوئی بھی ہو اور کتنا ہی قریب سے قریب کیوں نہ ہو، اس کے واسطے بھی ان قواعد کی پابندی کرنا لازمی ہوتی ہے جو مقرر ہیں
اور ان رکاوٹوں کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے جو شروع ہی سے کھڑی کر دی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ دہلی پہنچ کر میں ان سب کو عبور
کر گیا۔ یہاں تک کہ راشٹرپتی بھون کے ایک کمرہ میں مہمان کی حیثیت سے مقیم بھی ہو گیا تو متعلقہ سکریٹری نے مجھے مطلع کیا کہ آپ
کی آمد کے سلسلے میں یہ حکم ہے کہ آپ قیام کریں مناسب وقت پر ملاقات کے واسطے طلب کر لیا جائے گا۔ چنانچہ اُس سکریٹری کی
نگرانی میں میرے تین دن گذر گئے۔ ایک دن اتفاق سے میرا اور ان کا سامنا ہو گیا اور پھر اُسی دن دوپہر کے بعد مجھے طلب کیا گیا۔
میں اس مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں چچا صاحب براجمان تھے۔ چند سکنڈ دعا سلام اور مسکرانے میں گذر گئے، اس کے بعد فوراً ہی سنجیدگی
سے سوال کر لیا: "کیسے آئے ہو شہزادے" میں نے بہت خوبصورتی سے گھر کی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ اپنا مقصد بیان کیا اور
یہ بھی کہا کہ چچا جان میرے مستقبل کا سوال ہے، والد صاحب بھی کافی کمزور ہو گئے ہیں، ملازمت کے ملنے میں صرف عمر میں چھ ماہ کی
زیادتی رکاوٹ ڈال سکتی ہے۔ اگر آپ فلاں صاحب کو ایک ٹیلیفون کر دیں تو میرا کام بن جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب جیسا کہ
ان کی عادت تھی بہت سکون سے مجھے بولنے کا وقت دیتے رہے۔ جب میں خاموش ہو گیا تو میرے منہ بولے چچا نے اپنے منہ بولے
بھتیجے کو جواب دیا: "شہزاد میاں تم کو معلوم ہے میں نے متعدد بار تحریر بھی کر دیا ہے کہ میں نے سفارش کا کھاتا بند کر دیا
ہے۔ میں سفارش کے چکر میں کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔ تم خود کوشش کرو۔ اگر محکمہ میں نوکری نہ ملے، دوسرے محکمہ میں کوشش
کرو۔ اچھا تو یہ ہے کہ جس طرح بھی ہو ابھی اور پڑھو۔" ذاکر صاحب [illegible] پر میرے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ حالانکہ ڈاکٹر
صاحب کچھ اور بول رہے تھے، مگر میری قوتِ سماعت مفلوج ہو چکی تھی۔ صرف میں نے یہ سنا کہ میں کسی کو ٹیلیفون نہیں کروں گا
چنانچہ میں نے بھی کوئی مہمل سا جواب دیا، جو مجھے یاد نہیں کہ کیا کہا۔ کرسی پر سے کھڑا ہو گیا یہ کہہ کر کہ اب کبھی کسی کام سے
شہزاد آپ کے پاس نہیں آئے گا اور بغیر آداب کیے ہوئے دروازہ کی طرف چل پڑا۔ لیکن ابھی دروازہ تک پہنچا نہ تھا

کہ انھوں نے آواز دی "شہزاد" میں نے جیسے آواز کو سنا ہی نہیں۔ بدستور قدم اٹھاتا رہا اور چلتا رہا۔ لیکن پھر ایک بار اور آواز سنائی دی "شہزاد" میں رک گیا۔ واپس آیا۔ فرمایا بیٹھ جاؤ۔ چند سکنڈ تک ڈاکٹر صاحب بھی خاموش رہے اور میں بھی خاموش رہا۔ اب میں نہیں بول رہا تھا میرا استغفار در گیت چہرہ بول رہا تھا۔ اور ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد فرمایا "شہزاد تم ناراض ہو گئے۔ میں تمہاری اچھی طرح نہیں ... ہوں۔ تم کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا رہا اور سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ سب اپنی جگہ پر ہے۔ میں اس ملک کا صدر ہوں راشٹرپتی ہوں۔ اس ملک کے ہندوستانی عمر کے تمام بچے میرے بچے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تم میرے اوپر اعتبار۔ یہ حق رکھتے ہو۔ مگر کیا تمہاری طرح کے اس پریوار میں اور خاندان جوان نہیں ہوں گے جو اپنی کسی نہ کسی کمی کی وجہ سے مجبور نہ ہوں گے۔ مگر وہ بچے میرے پاس آ نہیں سکتے۔ اگر آ سکتے ہوں وہ بھی تو میرے پاس نہ آئیں یا نہ آ سکیں۔ میرے نزدیک آنے والے اور نہ آنے والے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر میں تمہارے سلسلہ میں یہ سفارشی چٹھی لکھ دوں تو مجھے ان سب کے ساتھ بھی اسی طرح یہ چٹھی جاری کرنے کے واسطے ہر وقت تیار رہنا پڑے گا جس کی وجہ سے DESERVING CANDIDATE کی حق تلفی ہوگی۔ اور میرے پاس نہ تو اس کام کے واسطے وقت ہے اور نہ میرا ضمیر گوارا کرتا ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔ I AM SORRY EXCUSE ME ڈاکٹر صاحب نے چند جملوں میں سب کچھ کہہ دیا۔ سب کچھ آئینہ کر دیا۔ اب میرے واسطے کوئی گنجائش نہ تھی۔ زبان گنگ ہو گئی تھی۔ میں کھڑا ہوا۔ آداب گزارا۔ رخصت ہوا اور چل پڑا۔ میں دروازہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور وہ اب دھیمے لہجے میں مجھے ہدایت کر رہے تھے۔ فلاں ... سے مل کر جانا۔

دہلی سے واپس ہو رہا تھا اور نہ معلوم کتنی مرتبہ یہ شعر پڑھا ہوگا ؎

گلگونہ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو — اے خون شدہ دل تو تو کسی کام نہ آیا

میں نے اپنا مقصد آگے چل کر اپنی کوشش سے حاصل کر لیا۔ اس ملاقات کا ذکر بے کیا ق میں نے مندرجہ بالا سطور میں اپنے الفاظ میں کیا ہے۔ لیکن زیادہ تر الفاظ اور جملے وہی ہیں جو ذاکر حسین صاحب مرحوم کی زبان سے نکلے تھے۔ آج میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھے۔

ہمارا یہ عظیم لیڈر، ہمارا یہ محبوب لیڈر قوم اور ملک کی خدمت کرتے کرتے ۱۹۶۹ء میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ ہم نے اس کی خدمات کے سلسلہ میں جو کچھ انعام دیا۔ اس کی ترجمانی شاید یہ اشعار کرتے ہوں ؎

لہجے کا رنگ نکہت فن ساتھ لے گیا — وہ کیا گیا کہ حسن سخن ساتھ لے گیا
جب ہو گیا تمام اجالوں کا ایک دور — اپنی وہ ایک ایک کرن ساتھ لے گیا
دے کر کتاب زیست کا ہم کو ورق ورق — ہم نے جو دے دیا وہ کفن ساتھ لے گیا

ڈاکٹر محمد اکرام خاں
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ذاکر صاحب
میرے استاد

ذاکر صاحب بڑے آدمی تھے اور بڑے بھی اُن بڑوں میں تھے، جو قریب سے دیکھنے پر اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے بڑے تھے جن کی دُور سے دیکھنے والے عزت کرتے ہیں اور قریب سے دیکھنے والے اُن پر عاشق ہو جاتے ہیں۔ ذاکر صاحب کے ایک عاشق خواجہ غلام السیدین بھی تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"حبیب محترم!

ہوائی جہاز کا سفر اور قلم اشک افشاں۔ اس لیے قلم سرمہ سے لکھنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سفر کے دوران میں نے علی گڑھ کا خطبۂ صدارت پڑھا۔ خَلَقَ الْاِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَان، اور علی گڑھ گزٹ کا "ذاکر نمبر"۔ دل عقیدت سے لبریز ہے اور آنکھیں پُرنم۔ اور قدرت سے یہ شکایت کہ جب وہ ایسی تخلیق کر سکتی ہے تو ہم جیسے خس و خاشاک پر طبع آزمائی کی زحمت کیوں فرمائی۔" آپ کا

سیدین ۸، فروری ۵۷ء

یہ خط میں نے اس لیے پڑھا کہ اس مجمع میں ایسے بہت سے بزرگ اور احباب تشریف فرما ہیں جنھوں نے سیدین صاحب کی طرح ذاکر صاحب کو دیکھا ہے، اُن کے ساتھ برسوں کام کیا ہے، اُن کے سامنے بیٹھ کر پڑھا ہے، اُن کے مشوروں کو مانا ہے، ان کی سرپرستی اور نگرانی میں، ان کی کڑی تنقید اور ماں باپ جیسی شفقت سے اپنے کو بنایا ہے اور اپنی زندگی کے رُخ اور رنگ کو بدلا ہے۔ یہاں کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو ان کی نگرانی اور شفقت کے ہٹ جانے کے بعد یہ سمجھے ہوں گے کہ ان کے نہ ہونے سے کون سا اچھا کام ہے جسے دھکا نہیں لگا۔ وہ جب تک ساتھ رہے تو اُن کے کاموں کا حلقہ پوری طرح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب اُن کے اٹھ جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ایک آدمی کا ہاتھ کہاں کہاں تھا اور اس کی عقابی نظر کہاں کہاں پہنچتی تھیں اور وہ حاجت مندوں، دکھ درد کے ماروں اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگوں کی کس طرح مدد فرماتے تھے۔

اس مجمع میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جنھیں ذاکر صاحب کے ساتھ کام کرنے یا ساتھ رہنے کا موقع نہیں ملا ہوگا اور کچھ
ایسے بھی افراد ہیں جنھوں نے ذاکر صاحب کو دیکھا بھی نہ ہوگا۔ ویسوں کی تعداد اب بڑھتی چلی جائے گی۔ نئے حالات ہوں
گے، نیا زمانہ ہوگا اور نئے مسائل۔ کیا عجب ہے کہ جامعہ جس کے چپے چپے میں ذاکر صاحب کی روح موجود ہے اور جس کی نئی
اور پرانی عمارتوں کی ایک ایک اینٹ سے ان کے خون جگر اور پسینے کی مہک آتی ہے زندہ ہے اور ذاکر صاحب کو بھلا دیا
جائے اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہمارے بعد آنے والی نسلیں بہت بڑی قومی دولت سے محروم ہو جائیں گی۔ نہیں ایسا نہیں ہو
سکے گا۔ وراثت زندہ ہوگا یہ کہ جو ذاکر صاحب سے نہیں مل سکا ہے وہ ان سے جامعہ میں مل لے گا۔ جو ان کو نہیں دیکھ سکا
ہے وہ انھیں یہاں دیکھ سکے گا، جو ان کے پاکیزہ خیالات اور ان کی جسمانی، ذہنی اور روحانی قدروں سے استفادہ نہیں
کر سکا ہے وہ انھیں جامعہ میں پائے گا اور پورے طور سے فائدہ اٹھا سکے گا، پھر ان سے مل کر ان کو پا کر اور ان کو دیکھ کر
اپنے کو بنائے گا اور اپنی زندگی کا رخ صراط مستقیم کی طرف موڑ سکے گا۔ جامعہ ذاکر صاحب کے فلسفۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم کی
جیتی جاگتی تصویر ہے۔

ذاکر صاحب کا ذکر کروں اور یہ نہ بتاؤں کہ میری تقدیر ان کے ذریعے بدل گئی ہے اور بنائی گئی ہے تو احسان
فراموشی ہوگی اور زبردست ناشکری۔ انھوں نے میری طرح انگنت بے سہارا اور بے یار نوجوانوں کی زندگیاں بنائی اور
سنواری ہیں، انھوں نے ہزاروں غریبوں کا پیٹ پالا ہے۔ ہزاروں بیواؤں کی سرپرستی فرمائی، ہزاروں یتیم بچوں اور بچیوں
کو ماں باپ جیسا پیار دیا۔ کیا بتاؤں خدا نے ان سے کیسے کیسے اور کتنے نیک کام کرائے ہیں اور اس احتیاط میں کہ کسی کا دل نہ دکھے
اپنے دل کو مستقل دکھیا بنا لیا۔ انھیں دوسروں کی خدمت کا شوق تھا اور اس شوق میں انسان سے کبھی غافل نہیں ہوئے تھے۔ خطا
سے چشم پوشی کرتے اور اچھائیوں کو ڈھونڈ نکالتے کہتے تھے کہ: "آدمی آدمیوں کے متعلق اچھے سے اچھا گمان رکھے اور چاہے
فریب کھائے، ہر روز نئے سرے سے آدمیوں کی نیک دلی پر یقین کرے اور عقل مندوں کو اور بیوقوفوں کو کہ دونوں گمراہ
ہوتے ہیں، معاف کرے۔" ذاکر صاحب علی گڑھ میں آٹھ سال بحیثیت وائس چانسلر رہے۔ اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر
استعفیٰ دیا تو انڈین ایکسپریس کے نامہ نگار نے یہ سوال دریافت کیا کہ آپ کے نزدیک اچھی اور کامیاب زندگی کیسی ہونی چاہیے
ذاکر صاحب نے جو جواب دیا وہ یہ ہے: "زندگی میں سب سے سکون بخش چیز یہ ہے کہ آدمی اپنے ساتھی انسانوں کی خدمت کر سکے
اس کے دل میں یہ یقین ہو کہ وہ گھٹیا کام نہیں کر رہا ہے۔ یہ ہے میرا نظریہ اچھی زندگی کے بارے میں۔"

اگر یہ بات بے محل اور بے جوڑ نہ معلوم ہو تو میں علی گڑھ یونیورسٹی کی سالانہ رپورٹ سے وہ چند جملے
نقل کروں جن میں ذاکر صاحب کی خدمات کو سراہا گیا ہے، "انھوں نے دلیری سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اپنے اعتماد او

ساتھیوں اور طلبا کے پکے عقیدے کے ساتھ اس ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ مقصد کی لگن، تعلیمی مسائل پر گہری نگاہ، استادوں اور طلبا کی مشکلات پر ہمدردانہ غور وفکر اور تمام مسئلوں میں انسانی نقطۂ نظر رکھنے کی بدولت وہ یونیورسٹی کے طلبا اور اسٹاف کے لیے جوش وخروش اور امنگ کا وسیلہ بنے رہے۔ کونسل انتہائی محبت اور احسان مندی سے ہمیشہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی بے پایاں خدمات کو یاد رکھے گی اور ان کے نظریات کی کامیابی کیلئے ان تھک جدوجہد جاری رکھے گی۔"

ذاکر صاحب فطری طور پر استاد تھے اور اچھے استاد تھے۔ اچھے استاد کی تمام تر خوبیاں اُن کی شخصیت میں یکجا ہو گئی تھیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان اپنی ذات کی طرف نہیں دوسروں کی طرف تھا۔ ان میں قوت کی آرزو، کمائی کا پیسا جمع کر کر کے ڈھیری لگانے کی لت، لالچ، ہوس اور غرور نہ تھا۔ ان کا دل ہمدردی، ہمدمی، میل ملاپ، فیاضی، دوسروں کو سہارا دینے اور مدد کرنے کے لیے بےچین رہتا تھا۔ وہ سماجی آدمی تھے۔ اور دوسروں کو اچھا سماجی انسان بنانے کا شوق تھا۔ ان کا دل محبت اور خدمت کے جذبے سے لبریز تھا۔ ان کی محبت میں نہ مذہب وملت کا امتیاز تھا اور نہ رنگ ونسل کا لحاظ۔ انھیں بچوں سے بھی محبت تھی اور بڑوں سے بھی۔ انھیں جانوروں سے بھی محبت تھی اور انسانوں سے بھی۔ انھیں پودوں سے بھی محبت تھی اور پتھروں سے بھی۔ انھیں پھولوں سے بھی محبت تھی اور کانٹوں سے بھی۔ انھیں تو خدا کی ساری مخلوق سے محبت تھی اور اُن کی محبت کی اساس عزت اور خدمت تھی۔ ان کی بڑی صاحبزادی بیگم سیدہ خورشید نے اپنی کتاب "ذاکر صاحب کی کہانی" میں لکھا ہے:۔ "میاں کو بچوں سے بھی محبت تھی اور بڑوں سے بھی۔ وہ ہر انسان کو عزت اور محبت کا مستحق سمجھتے تھے انھوں نے شاید ہی کبھی کسی چھوٹے سے چھوٹے شخص کو بھی حقارت سے مخاطب کیا ہو۔ ہمیشہ اچھے الفاظ اور اچھے القاب سے خطاب کرتے تھے۔ آپ، جناب، میاں، صاحب، نام کے ساتھ ضرور لگاتے۔ کبھی کسی پر اپنی بڑائی نہ جتاتی۔ اپنی تکلیفوں کا اظہار کبھی نہ کرتے۔ دوسروں کی تکلیفوں کو سنتے اور ہمدردی کرتے اور دلاسہ دیتے ... لوگ ان کے پاس مایوس آتے اور خود اعتمادی اور حوصلہ کی دولت اپنے ساتھ لے کر لوٹتے۔ لوگ اپنے دکھ درد سنا کر ہلکے ہو جاتے اور یہ ان کو نہ سکتے۔ کروٹیں بدل کر تدبیریں سوچتے رہتے اور ان کے مداوے کے جتن کرتے رہتے۔"

ذاکر صاحب استاد بھی تھے اور مفکر تعلیم بھی۔ انھوں نے تعلیم کے متعلق جو سوچا اسے جامعہ کے تعلیمی مرکز اور دوسرے اداروں میں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جس طرح اسی زمانے میں جرمنی میں کرشن اشائنر اور امریکہ میں جان ڈیوی پرانے تعلیمی نظام کو ختم کرنے اور جدید تعلیمی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے تھے، اسی طرح ذاکر صاحب کام کے ذریعے تعلیم کے اصول پر جامعہ میں تجربہ کر رہے تھے۔ اُن کے تعلیمی طرز فکر وعمل کو دیکھ کر گاندھی جی نے بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ان کی صدارت میں مرتب کرائی۔ ذاکر صاحب کے یہاں تعلیم کا مقصد بچے کی تمام تر پوشیدہ صلاحیتوں

اُبھارنا اور انھیں سماجی کاموں میں استعمال کرنا ہے۔ ان کے نزدیک ذہنی نشو نما فرد اور اس کے ماحول کے درمیان عمل اور
رد عمل سے ہوتی ہے۔ وہ ذہن کی مجبوریت کے مقابلہ میں فعالیت پسند کرتے ہیں، اسی لیے چھ سے چودہ سال تک پوری تعلیم
رفوں اور سماجی اور قدرتی ماحول کے ربط سے مکمل کرانا چاہتے ہیں۔ ان کے یہاں انفرادی مقابلے کی بجائے اشتراکی عمل، تن
سانی کی بجائے محنت، نفرت کی بجائے محبت، انتقام کی بجائے امن، بدگمانی اور خود غرضی کی بجائے اعتماد اور بے غرضی کے
بات بیدار ہوتے ہیں۔ وہ انفرادی زندگی کو جماعتی زندگی کا تابع بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن انفرادیت کو دبانے اور
لنے کے سخت خلاف ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کا مفہوم سماجی ہے۔ جینے کا مقصد خدمتِ خلق ہے اور تعلیم کا مقصد فرد کی
شخصیت کی مکمل نشوونما سمجھتے ہیں" تعلیم نام ہی اس کا ہے کہ متعلم کے کل قوائے ذہنی و جسمانی کی تربیت کر کے ان میں ہم آہنگی
پیدا کی جائے۔ اور اسے تمدنی زندگی کے کل شعبوں کا محرم بنا کر اس میں ذہنی استعداد کے مطابق حصہ لینے کیلئے تیار کیا جائے۔"
ذاکر صاحب کے قول اور فعل میں ہمیشہ مطابقت پائی گئی جو کہا وہ کیا، جو لکھا وہ تجربے کے بعد لکھا۔ میں نے
سدا ان کے قول و فعل میں سچائی اور مطابقت پائی۔ مثال کے طور پر ان کی کتاب "تعلیمی خطبات" میں ان کا مضمون "سیرت
کی تربیت" پڑھیے، بڑا دلچسپ اور سبق آموز مضمون ہے۔ پورے مضمون کی تشریح یا تفسیر کا وقت نہیں۔ لکھتے ہیں:
"اک سیرت کی تعمیر کے لیے چار عناصر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ ارادے کی قوت کا ایک کم سے کم درجہ، اجتہاد فکر کا ایک کم
سے کم مرتبہ، حسِ جماعتی کی ایک کم سے کم ذات اور اثر پذیری کی ایک کم سے کم وسعت، گہرائی اور پائیداری" حضرات! گستاخی
ضرور ہے لیکن یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ میں نے ذاکر صاحب کو اکثر و بیشتر موقعوں پر گھر کے اندر اور باہر اس
نظر سے دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں ان کے قول و فعل میں تضاد نظر آجائے۔ لیکن ہر موقع پر ان کی سیرت میں یہ چاروں
عناصر موزوں اور شگفتگی کی حالت میں پائے گئے۔ ذاکر صاحب مانے ہوئے اسکالر تھے، ان کا تعمیری انداز فکر تھا، وہ بلند
مرتبہ کے ماہر تعلیم تھے اور ہر دلعزیز استاد۔

●●

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید
شعبۂ اردو
لارڈ ونکٹشورلو یونیورسٹی، تروپتی

رشید صاحب اور ذاکر صاحب

۱۹۶۲ء کی بات ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے میں نے "رشید احمد صدیقی: شخصیت اور فن" کے مو
کا انتخاب کیا۔ میرے لیے ضروری تھا کہ اُن اصحاب سے ربط پیدا کروں جن سے رشید صاحب کے مراسم رہے۔ ایسے اصحا ب
ذاکر صاحب کا نام سرفہرست تھا، جو ایک عرصے تک رشید صاحب کے "ہم نوالہ، ہم پیالہ، ہم سبق اور ہم خیال تھے۔ ذاکر
اس وقت ہمارے ملک کی نائب صدرات کے منصب جلیل پر فائز تھے۔ ان کو مکتوب لکھنے کا خیال آیا۔ لیکن دوسرے
مجھے یہ بات بھی ذہن میں آئی کہ وہ تو بڑے آدمی ہیں اور معروف بھی۔ اور جیسا کہ ایسے آدمیوں کا خاصّہ ہوتا ہے، عام طو
خط و کتابت سے گریز کرتے ہیں اور اس میں بھی اپنی بڑائی پاتے ہیں۔ میں ٹھہرا ایک طالب علم، نائب صدر جمہوریۂ ہند
مجھے کیا خط لکھیں گے، میرے خط کا جواب کیا دیں گے۔ چند روز اسی شش و پنج میں گذر گئے۔ آخر کار مکتوب روانہ کر دیا
التماس کے ساتھ کہ فلاں تواریخ میں دہلی میں رہوں گا۔ رشید صاحب کے تعلق سے اُن سے ملاقات کا متمنی ہوں۔ مجھے تو
تھی کہ جواب آئے گا۔ ہفتہ عشرہ ہی گذرا ہوگا، نہ صرف ذاکر صاحب کا جواب آیا بلکہ انھوں نے میری دی ہوئی توار
ہی میں ملاقات کے وقت کا تعین کر دیا۔

ذاکر صاحب سے ملاقات کے نقوش، آج بھی میرے ذہن میں تازہ، شفاف اور شاداب ہیں۔ میں یہ سط
تسوید کر رہا ہوں لیکن محسوس ہوتا ہے جیسے ۲۲ نومبر ۱۹۶۲ء ہے۔ شام کی ۴½ ساعت۔ میں نائب صدر جمہور
ہند کی کوٹھی، ۶۔ مولانا آزاد روڈ، نئی دہلی کے باذوق اور مہذب انداز سے سجے سجائے ملاقاتیوں کے کمرے میں
ہوں۔ لیجیے! ذاکر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ میں تعظیماً ایستادہ ہو جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں۔ ہم
دونوں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ چند الفاظ میں، میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ وہ مجھ سے میری تعلیم اور حیدرآباد کے بارے
میں اتنی باتیں کر لیتے ہیں کہ بیگانگی کا احساس مٹ جاتا ہے۔ جیسے میں کسی مشفق، اپنے کسی بزرگ رشتہ دار سے گفت و شنید

میں معروف ہوں۔ وہ میرے ہر سوال کا جواب بڑی دلنشینی سے دیتے ہیں۔ رشید صاحب کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی نگاہوں میں روشنی، چہرے پر شگفتگی اور لہجہ میں دلنوازی پیدا ہو جاتی ہے۔ رشید صاحب کے بارے میں اُن کا یہ جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہا ہے "رشید صاحب جیسا دوست کسی کو ملے تو اس کو مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ اسی دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ رشید صاحب کی سوانح کا باب تیار کر لوں تو اس کی ایک کاپی اُن کی خدمت میں ارسال کروں۔ میں بات چیت کرتا رہا، جو چیز میں نے محسوس کی وہ یہ کہ ذاکر صاحب نے اپنے عہدے کے شکوہ، دبدبے، رعب اور شان کو کسی طرح نمایاں ہونے نہیں دیا، بلکہ وہ ایک عام انسان کی طرح گفتگو کرتے رہے اور بحیثیت انسان کے اپنی شرافت، اپنائیت اور اپنے خلوص کا جادو جگاتے رہے۔ میں مسحور ہوتا رہا۔ کسی نے کہا ہے کہ بڑے آدمی کی پہچان یہ بھی ہے کہ اُس سے ملاقات کے بعد ہم میں بڑائی کا احساس پیدا ہو۔ چنانچہ اسی طرح بڑائی اور عظمت کا احساس لئے میں اُن سے وداع ہوا۔

اس ملاقات کو عرصہ ہو چکا۔ ۲۰۰۵ء میں اپنے مقالے کی تیاری کے سلسلے میں مجھ کو ایک بار اور دہلی اور علی گڑھ کا سفر درپیش ہوا۔ اُسی عنایت کے ساتھ میری دی جولائی تواریخ میں ذاکر صاحب نے ملاقات کا شرف بخشا۔ ذاکر صاحب سے پہلی ملاقات کے نقوش، میرے ذہن میں تازہ تھے، کسی گلاب جیسے، گلابوں کے تختے کی طرح۔ اور ذہن میں یہ خیالات بھی آ رہے تھے کہ ذاکر صاحب کے دوبارہ تعارف کی ضرورت ہوگی۔ پہلی ملاقات کو تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے، اس طویل عرصہ میں وہ مجھ کو کیوں یاد رکھنے لگیں۔ پتہ نہیں ان کو روزانہ کتنے افراد سے ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن میرے استعجاب کی حد نہ رہی۔ میں اُسی ملاقاتی کمرے میں، جس میں نومبر ۲۰۰۶ء میں بیٹھا تھا۔ ذاکر صاحب کا انتظار کر رہا تھا، چند لمحے گذرنے نہ پائے کہ ذاکر صاحب تشریف لائے۔ اُن کے قدموں کی چاپ، اُن کے چلنے کا انداز میں آج تک فراموش نہ کر سکا ہوں، جیسے عزم و ایقان اور محکم ارادوں کی صلابت، کسی پیکر میں ڈھل چکی ہو، جیسے تدبر، سنجیدگی اور متانت نے کسی انسان کا روپ دھار لیا ہو۔ جیسے فکر و فلسفہ مجسم ہو چکے ہوں، جیسے شائستگی اور شرافت خراماں خراماں ہوں جیسے کلاسیکی قدریں گوشت پوست کی صورت میں ڈھل کر چلی آ رہی ہوں۔ ابھی میں تسلیم کر ہی پایا تھا کہ ذاکر صاحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے دریافت کیا: "کہیے! اچھے ہیں آپ! آپ کا مقالہ ختم نہیں ہوا؟" ذاکر صاحب کے ان الفاظ نے مجھ میں ایک عجیب امنگ اور حوصلہ پیدا کر دیا۔ ایک خود اعتمادی دے دی۔ مجھے مسرت ہوئی کہ ذاکر صاحب نے مجھے فراموش نہیں کیا ہے۔ میں نے انھیں رشید صاحب کی سوانح کا باب پیش کیا۔ چند لمحوں کے لیے انھوں نے اُسے ادھر اُدھر سے دیکھا، اظہارِ پسندیدگی کیا اور پھر میرے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے میں کسی عزیز سے مدت کے بعد مل رہا ہوں، اور وہ میرے حالات دریافت کر رہا ہے۔

میں سمجھتا تھا طنز و مزاح کے بارے میں ذاکر صاحب کی معلومات کچھ یونہی سی ہوں گی لیکن انھوں نے تو اردو طنز و مزاح نگاروں پر ایک پُر مغز لکچر دیدیا بلکہ ترکی کے نامور مزاح نگار ناصر الدین خواجہ کے بارے میں اتنی معلومات بہم پہنچائیں جو مجھے شاید ہی کہیں اور سے دستیاب ہوتیں۔ میں ہمہ تن گوش بنا ذاکر صاحب کی گفتگو سنتا رہا۔ چائے مع لوازم ے آئی، انھوں نے مجھ سے چائے پینے کے لیے کہا، اور خود کہنے لگے۔ اسلوب کیا ہے؟ تنقید کیسی ہونی چاہیئے؟ ادب میں شخصیت کا کیا مقام ہے؟ خطوط میں شخصیت کیونکر واضح ہوتی ہے؟ وغیرہ وغیرہ! غرض مختلف موضوعات پر ذاکر صاحب کے بارے میں جو کچھ پڑھا اور سنا تھا، ذاکر صاحب کی شخصیت کو اس سے کہیں زیادہ وقیع، جمیل، جامع، گمبھیر، بارآور، باوزن، باوقار، پُر شکوہ اور بیکراں پایا۔ کہیں زیادہ، کہیں زیادہ!!

ذاکر صاحب سے ملاقات کے لیے جتنا بھی وقت مقرر ہوتا وہ از راہِ عنایت، ہمیشہ اس سے زیادہ گفتگو کرتے انکے پرائیوٹ سکریٹری اکثر، کہہ نہ دیتے کہ ملاقات کے لیے کوئی اور آچکا ہے۔ میں چاہتا کہ وہ بیٹھے رہیں۔ اور میں رخصت کی اجازت چاہوں لیکن وہ عجیب بڑے آدمی تھے کہ استادہ ہو کر مصافحہ کرتے اور میرے ساتھ کمرے سے باہر تک آیا کرتے۔

ذاکر صاحب سے دوسری ملاقات کے بعد اُن کی شفقت کچھ ایسی رہی کہ جب بھی خط لکھتا، بڑی چاہ سے بڑے شوق سے جواب سے سرفراز کرتے۔ صدر جمہوریہ کی حیثیت سے اُن کے انتخاب پر، نیز اُن کی ہر سالگرہ پر خط لکھتا چند ہی روز میں جوابی مکتوب آتا۔ تہنیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نیک خواہشات کا اظہار اور ڈھیر سی دعائیں!

میں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اُن کا مبارکباد کا مکتوب آیا۔ میں نے اپنے مقالے کی اشاعت کی تیاری شروع کی۔ رشید صاحب سے گہرے مراسم کی روشنی میں، چاہتا تھا کہ میری کتاب "رشید احمد صدیقی؛ شخصیت اور فن" کا پیش لفظ ذاکر صاحب تحریر فرمائیں۔ میں نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔ وہ صدر جمہوریۂ ہند کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ ان کی مصروفیات روز افزوں ہو چکی تھیں۔ اُن کو پیش لفظ لکھنے کے لئے وقت کہاں؟ میرا ایقان یہی تھا۔ اس لئے بھی کہ اپنی قومی و ملکی مصروفیات کے باعث ان کی علمی و ادبی سرگرمیاں ختم نہ بھی ہو چکی ہوں، ختم ہونے کے برابر تھیں۔ انھوں نے پیش لفظ تو نہیں لکھا لیکن جس عمدگی اور خوبصورتی کے ساتھ گریز کیا۔ اس سے میری دل شکنی نہیں، ہمت افزائی ہوئی حوصلہ ملا۔ وہ خط میرے سامنے ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"سچ تو یہ ہے مجھے یہ رسم پسند نہیں۔ دوسروں سے کچھ لکھانے کی بجائے خود ہی لکھنا چاہیئے۔ آپ بھی اگر اس رسم سے بچ سکیں تو احتراز فرمائیے۔"

کتاب شائع ہوئی۔ میں نے سب سے پہلے ذاکر صاحب کی خدمت میں روانہ کی۔ ۲۰، ۲۵ روز ہی میں ذاکر صاحب

نامہ لا۔ انھوں نے کتاب کے بارے میں اپنی گرانقدر رائے ان الفاظ میں تحریر کی:

"یہ کتاب مجھے اس لیے عزیز ہے کہ میرے ایک عزیز ترین دوست کی زندگی اور کام کی تصویر پیش کرتا ہے۔"

ذاکر صاحب نے رشید صاحب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا، "رشید صاحب میرے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں
شید صاحب کا فن ہے۔ کیونکہ رشید صاحب کے ذہن میں ایک کردار موجود ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اُن کو اپنے تصور
دار میری شخصیت میں ملتا ہے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ مصنف کے کرداروں کا وجود خارج میں ہوا کرتا ہے کیونکہ کردار
ور تو مصنف کے ذہن میں موجود رہتا ہے۔ وہ خارج سے اپنے کردار کے لیے کوئی نام لے سکتا ہے۔ لیکن کردار تو بہرحال
کا پیدا کردہ ہے۔ میں نے ذاکر صاحب سے پوچھا کہ آپ کی شخصیت میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ رشید صاحب نے
کا اس قدر زیادہ اثر قبول کیا۔ ذاکر صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا کہ "میں نہیں سمجھتا کہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی
جس نے رشید صاحب کو متاثر کیا۔ ظاہر ہے میں نے اپنی زندگی میں کئی لوگوں سے ملاقات کی ہے اگر مجھ میں خوبی ہوتی
ر شخص مجھ سے متاثر ہوتا۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ ہر شخص مجھ سے متاثر نہیں ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مجھ میں
ئی خوبی ہونے سے زیادہ مصنف کے ذہن میں خوبی موجود ہے جو اس کو میرے بارے میں لکھنے پر مجبور کرتی ہے
اسی سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اہم بات یہ ہے کہ ہم فنکار کے فن کو دنیا کی اور چیزوں سے تقابل
کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ فن کو فنکار کی تخلیق سمجھ کر دیکھنا چاہیئے اور بس۔

بات شخصیت کی بھی ہو رہی تھی۔ ذاکر صاحب کے نزدیک گویا شخصیت کی ایسی اہمیت نہیں۔ وہ کہنے
لگے: "ادب میں مصنف جو چیز لکھ دیتا ہے وہ عموماً اُس کی شخصیت سے جداگانہ ہوتی ہے۔ فن پارے کو فنکار کی
شخصیت سے رجوع کرنا اور اس کی شخصیت کے آئینہ میں دیکھنا کچھ غیر ضروری سی بات ہے۔ اور سچ پوچھیے تو شخصیت
کا سمجھنا کیا ضروری ہے۔ ادب کو ویسے شخصیت کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ ادب کو ادب کی حیثیت سے دیکھا جائے۔
ادب کے اپنے معیارات ہیں، ان معیارات کی روشنی میں اس کو جانچا جائے۔ اسی طرح ادب کا سماجی اسکول ہوتا ہے اور
اس ادب کے پیرو فن پارے کو اس کے سماجی تناظر میں دیکھتے اور اس کے سماجی تعبیر ڈھونڈتے ہیں۔ یہ چیز غلط ہے۔
اچھے باپ کے بُرے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ اسی طرح بُرے باپ کے اچھے بیٹے بھی ہو سکتے ہیں اور رہتے
ہیں۔ بہرکیف ادیب، ادب ہوتا ہے۔ اس کا اسی زاویہ سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

رشید صاحب کے طرز تحریر کے بارے میں بعض تنقید نگاروں کا کہنا ہے کہ وہ غیر مربوط ہے۔ اس بارے

ا اظہار خیال کرتے ہوئے ذاکر صاحب نے کہا کہ کسی مصنف کا ہم ان بنیادوں پر تجزیہ کیوں کریں کہ وہ کس طرح لکھتا
اور اس کا طرزِ تحریر اس کا جیسا ہے یا اُس جیسا کیونکہ مصنف یا کسی اور فنکار کے لیے دوسروں کی تقلید کرنا کوئی اچھی بات
یا مصنف کا طرزِ تحریر اُس کا اپنا ہونا چاہیئے۔ مصنف کی خوبی یہ ہے کہ وہ "وہ" ہو، اوروں کی طرح نہ ہو، بلکہ صاحب
اسلوب کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی طرح لکھتا ہے، نہ جو کسی اور کی طرح لکھتا ہے، اچھا نہیں لکھتا۔

اپنے ہال میں دیوار سے آویزاں ماڈرن آرٹ کی ایک تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے
پوچھا: "یہ تصویر آپ کی سمجھ میں آتی ہے؟" میں نے کہا: "یک نظر تو سمجھ میں نہیں آتی۔" تب وہ کہنے لگے "یہ ہندوستان
کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ کی تصویر ہے۔ اس آرٹسٹ کی مقبولیت کا سبب یہی ہے کہ وہ نہ چغتائی کی طرح تصویر
بناتا ہے، اور نہ کسی اور نامور مصور کی تقلید کرتا ہے بلکہ اس آرٹسٹ کا فن اچھوتا اور اُس کا اپنا ہے۔ اسی طرح ہر مصنف
کی اپنی طرزِ ادا ہوتی ہے۔ یوں بھی حکومت نے طرزِ ادا کے تعلق سے کوئی قانون تو منظور نہیں کیا ہے کہ ایسے لکھو اور
ایسے نہ لکھو۔ وہ نقاد جو مصنف سے خاص خاص باتوں کا مطالبہ کرتے ہیں وہ عجیب و غریب ہیں۔ نقاد کی سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ وہ
سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کے پاس تمام معیار موجود ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آخر خود نقاد کا اپنا معیار کیا ہے۔
اردو میں تنقید کے بارے میں ذاکر صاحب نے اظہارِ خیال کیا کہ ریویو تبصرے بے لاگ نہیں ہوتے۔ کہیں تو دوستداری کی جاتی ہے اور کہیں بلاوجہ مخالفت
اور مذمت۔ ذاکر صاحب زندہ آدمی پر لکھنا علمی تحقیق کے لیے مناسب خیال نہیں کرتے تھے۔ اُن کے نزدیک ادب
کی تحریر کے بعد جب تک ایک طویل عرصہ نہ گذر جائے وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہوتا اور لوگ اب تو ادیب
کو مرنے بھی نہیں دیتے اور اس کو اپنی تحقیق اور تنقید کا عنوان بنا دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی زمانے
میں جو ادب اچھا ہوتا ہے اور خاصی واہ واہ حاصل کرتا ہے دس سال گذر جانے کے بعد اس کو کوئی پڑھتا
بھی نہیں۔ اس لیے چاہیئے تو یہی کہ ادب اور ادیب کو فوراً تحقیق اور تنقید کا موضوع نہ بنایا جائے۔

رشید صاحب کے بارے میں ذاکر صاحب کے خیالات بڑے ہی سیدھے سادے تھے۔ ذاکر صاحب تعلیمی زندگی میں
رشید صاحب سے دو سال آگے تھے۔ ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں بحیثیت طالب علم ۱۹۱۲ء میں داخلہ لیا اور رشید صاحب
نے ۱۹۱۵ء میں۔ لیکن ان دونوں میں دوستی انتہائی گہری اور پر خلوص تھی، اوروں کے لیے باعث رشک! تعلیمی زندگی
کے بعد جب دونوں نے مختلف شعبوں کو منتخب کیا، اُس کے بعد مرتے دم تک دونوں کی دوستی میں فرق نہیں آیا۔ وہی
اپنائیت، وہی بے تکلفی! ذاکر صاحب رشید صاحب کو اپنا بہترین اور نہایت ہی عزیز دوست خیال کرتے تھے۔ اُن کا خیال
تھا کہ اگر کسی کو ایسا دوست مل جائے جیسے کہ رشید صاحب تھے تو اُس شخص کو دوستوں کے معاملے میں مطمئن ہو جانا چاہیئے۔

ہ رشید صاحب کے خلوص و محبت کے بے پناہ قائل تھے۔ وہ رشید صاحب کو ایک بلند پایا مصنف قرار دیتے تھے۔
بلی ان کی نظروں میں رشید صاحب مصنف کی بہ نسبت معلم کی حیثیت سے زیادہ بلند تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ رشید صاحب
ے کتنے ہی لوگوں کو لکھنے کا شوق دلایا اور کئی ایک کے ذوق سلیم کی تربیت کی کہ اس کا احسان اردو ادب پر ان کی
تصانیف سے زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ میں ایک عرصے تک اردو زبان کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ اس
کی کوشش کی جاتی تھی کہ اردو فارسی کا جز و رہے۔ لیکن رشید صاحب کی وجہ سے علی گڑھ میں اردو کی حیثیت بن گئی۔
ذاکر صاحب غیر معمولی جاذب توجہ، گمبھیر اور پر اثر شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے انداز گفتگو میں اُن
کے عہدے اور منصب کا جاہ و جلال نہیں، اُن کی شخصیت کا تدبر پایا۔ وہ بات اس طرح کرتے گویا لفظ لفظ، تول تول
کر ادا کر رہے ہیں۔ وزیر اعظم نہرو کے پیکر میں نمایاں چیز اُن کی شیروانی کے بٹن میں لگا گلاب تھا۔ ذاکر صاحب کے سراپا
میں بھی آپ کو ایک ایسی چیز ملتی ہے، اُن کا چشمہ۔ وہ خاموش بھی رہتے۔ اُن کے ہلکے سیاہ رنگ کے اس چشمے کے پیچھے
سے اُن کی آنکھیں بہت کچھ کہتی نظر آتیں۔ اپنے بارے میں، مخاطب کے بارے میں، اور — اور ایک جہاں کے بارے میں۔

●●

جناب قیوم خضر
پٹنہ

ذاکر صاحب کی جامعہ میں

میں جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم پا رہا تھا ۔ قرول باغ کے خاکسار ہوسٹل میں رہتا تھا۔ اسی ہوسٹل میں ہمارے شہر کے ڈپٹی یعقوب صاحب کے لڑکے میاں حسنات بھی میرے ساتھ رہتے تھے۔ ایک رات کو مجھے جو شرارت سوجھی تو میں ان کی الماری کھول کر ڈبے سے سارا خشک میوہ یعنی اخروٹ، بادام اور کشمش چٹ کر گیا اور اس کی جگہ پتھروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے رکھ دیئے۔ جب میاں حسنات نے دوسری صبح کو ڈبہ کھولا تو میوہ کی بجائے پتھروں کے ٹکڑوں کو دیکھ کر بہت برہم ہوئے۔ ان کا شک براہِ راست مجھ پر گیا اور انھوں نے ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ ارشاد صاحب کو جا کر میری شرارت کی شکایت کی۔ ارشاد صاحب نے مجھے بلوا بھیجا، جیسے ہی میں ان کے کمرے میں پہونچا، ویسے ہی شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب بھی آگئے۔ ان کو دیکھ کر تو میرے چھکے ہی چھوٹ گئے، اور سوچا کہ آج برے پھنسے اور اگر کہیں سزا کے طور پر ہوسٹل سے نکل جانے کا حکم صادر ہو گیا تو پھر بڑی رسوائی ہوگی۔ یہ دل میں سوچ ہی رہا تھا کہ ارشاد صاحب نے مجھ سے شرارت کی وجہ پوچھی، تو میں نے برجستہ عرض کیا: "جناب! میری قسمت میں جو تھا، سو میں نے کھایا اور حسنات صاحب کی قسمت میں جو ہے سو وہ کھائیں۔" جواب کی اس برجستگی سے ذاکر صاحب اور ارشاد صاحب دونوں مسکرا پڑے اور پھر ذاکر صاحب نے ارشاد صاحب سے میری شرارت کی تفصیل پوچھی، اس کے بعد میری طرف پلٹے اور بڑے پیار سے مجھ سے فرمایا: "صاحبزادے! اگر خشک میوہ کھانے کی تمہیں خواہش ہو تو میرے پاس چلے آنا، میں تمہارے لیے انتظام کر دوں گا۔" اور پھر آئندہ ایسی شرارت نہ کرنے کی تنبیہ کی۔

●●

...ٹر محمد صدیق نیازمند
شعبۂ فارسی
...یر یونیورسٹی، سرینگر

شرح احوال و آثار و سبک شعر ملا ساطع کشمیری

سرزمین کشمیر از نظر رشد زبان و ادبیات فارسی بسیار بارور و زرخیز بوده است. این زبان شیرین در عهد پادشاهان شهمیری
اولین خانوادهٔ پادشاهان مسلمان محلی آن دیار می باشد تقریباً با عهد تیموریان در ایران به آن خطهٔ دلپذیر راه یافت. در
عهد پادشاهی سلطان زین العابدین (بدشاه = شاه کبیر) این زبان برسمیت شناخته شد و حتی زیادی نگذشت که جای زبان
سانسکریت را که زبان رسمی آن دیار بود، گرفت. بدین منوال زبان فارسی اولین بار در کشمیر زبان اداری و درباری
قرار گرفت. در طول مدت شش قرن اخیر یعنی از ۷۵۰ هجری قمری تا نیمهٔ دوم سدهٔ چهاردهم هجری قمری در جنبه های
گوناگون از شعر و سخن و علوم و ادبیات گرفته تا طب، نجوم و هیئت شخصیت های برجسته بوجود آمده و تمام اینها انگیزه های
خود را با این زبان شیوا ابراز نموده اند.

دربار مغولان گورکانی هند از نظر تقویت شعر بزرگ ترین تربیت گاه شاعران این عصر یکی از دوره های بسیار
پر ارج بشمار میرود، زیرا شاعران بس نامدار و نثر نویسان چابکدست در همین عصر بوجود آمدند. از نمونه های برجستهٔ
نثری و شعری آنها می توان باین نکته پی برد که شالودهٔ یکی از سبک و روش های ویژهٔ این عصر که بنام سبک هندی موسوم
است، در هند استحکام پذیرفت و باوج خود رسید. ناگفته نگذریم که بعلت یورشهای پی در پی و مساعی ارتشبدان مغول کشمیر
در سال ۹۹۲ هجری قمری استقلال خود را بزمان فرمانروایی اکبر شاه گورکانی از دست داد و بعنوان یکی از سرکارها یعنی صوبه
بهند ملحق گردید. چون بعضی از ایرانیان مغول بکشمیر آمد و شد داشته اند و در نتیجه آن شاعران فارسی گوی کشمیر تحت تاثیر
شاعران دربار مغول قرار گرفتند. لذا در نتیجهٔ تاثیر پذیری و آمیزش با شاعران دربار مغول سبک تازهٔ
یعنی سبک هندی که در هند نفوذ فوق العاده پیدا کرده بود، مورد توجه و تقلید شاعران کشمیری نیز

قرار گرفت. شاعرانی مانند مظهری کشمیری، فانی کشمیری، غنی کشمیری، جویا و گویا پیدا شدند که سبک هندی را پیروی نموده اند. ملا ساطع کشمیری یکی از شاعران همین دسته بوده است که در اشعار خود بیدریغ از سبک هندی تتبع نموده و بر اثر کاری فوق العاده و نمحات خود یکی از برگزیده شاعران این سبک درآمده و بعنوان ستارهٔ درخشان در آسمان ادب فارسی می درخشد و خواهد درخشید.

تذکره نویسان راجع به اسم ساطع اختلاف نظر دارند. گروهی از تذکره نویسان وی را بنام ابوالحسن یاد میکنند. علاوه بر این دستهٔ دیگر از تذکره نویسان اسم وی را آخوند عبدالحکیم نوشته اند. محمد اعظم دیده مری صاحب واقعات کشمیر که با ساطع روابط دوستانه و صمیمانه داشته است و تقریباً بیست سال از محضر ساطع استفادهٔ علمی می کرد. بعلاوه اغلب اوقات از وی اصلاح شعر هم می یافت، می نگارد که اسمش عبدالحکیم بوده است. ع۲ اصلح میرزا مولف تذکرهٔ شعرای کشمیر که خود را بعنوان شاگرد ساطع معرفی نموده است، تائید میکند که اسم ساطع آخوند عبدالحکیم است ع۳ اینکه بعضی از تذکره نویسان وی را ابوالحسن می پندارند کنیت وی است. در حالیکه ما در تائید این امر دلیل و براهین قاطعی بدست نداشتیم.

همانطور که تذکره نویسان دربارهٔ اسم ساطع باهم اختلاف دارند دربارهٔ اسم پدر ساطع هم همین مشکلات روبرو هستیم. بعضیها اسم پدر ساطع ملا محمد علی کشمیری نوشته اند در صورتیکه محمد اعظم دیده مری و بعضی از تذکره نویسان و مورخان ساطع را پسر ملا آغا غالب می پندارند.

ساطع چطور ایام کودکی خود را بسر برده، ما دربارهٔ آن اطلاع قاطعی بدست نداریم و بدرستی نمی توان حدس زد که شاعر کی چشم بجهان گشوده است. اطلاعی که دربارهٔ ایام کودکی و طالب علمی وی بدست میرسد این است که در دوران طالب علمی می کرد و طبع موزون داشت و در ایام طفولیت و طالب علمی شعر میگفت و در وهلهٔ اول شاگردی ملا ملک شهید اختیار نمود. بیمن تربیت استاد در کمترین زمان در این فن تبحر پیدا کرد. حتی در فن شعرگوئی چنان پیش رفت نمود که ملا ملک شهید خود را شائستهٔ تربیت او ندیافته وی را بخدمت میرزا داراب جویا فرستاد ع۵ بدین نحو ساطع شاگردی جویا اختیار نمود. ساطع بکمک و معاونت میرزا داراب در جلسه ها و محافل علمی و ادبی آن زمان شرکت می جست. حتی که صحبت مجالست با استاد و بعضی از استادان معاصر آن روزگار طبع موزون ساطع را جلا بخشید. در شعرگوئی ترقی نمایان کرد و بر اقران خود فائق شد. نکته سنجی که از استاد جویا یاد گرفته است ساطع استاد خود را بتعظیم اینطور یاد میکند:

مرا جویند استادان زبهر نکته سنجیدن   همین بس حجت ساطع که جویا بود استادم

ممدوحان ساطع: ساطع در کشمیر زندگانی خود را با نهایت فقری گذرانید لذا مسافرت به پشاور نمود تا معاش کند. در اثنای راه به ملا محمد سعید اشرف که یکی از شاعران بنام روزگار خود بوده است ملاقات نمود. چون طبع او موزون و میل در شعرگویی استعداد یافت شاگردیش اختیار نمود و اصلاح شعر از وی گرفت. پس در دوم عالمگیر محمد معظم در آن زمان ناظم پشاور بود. وی خود هم شعرشناس بود و نیز شاعران و سخن سرایان را بسیار دوست می داشت. ساطع این موقع را غنیمت شمرده اول تقرب اسلام خان که میر آتش محمد معظم شاه بهادر بود، پیدا کرد و بعداً به وساطت وی به دربار شاه راه یافت. رساله مختصر بنام گلشن اسلام به نثر فارسی باسم اسلام خان نوشت. ساطع از قصاید خود بمدح همین اسلام خان سروده است اینک نمونه هایی از آن در اینجا می آوریم:

۱. اسلام خان بهادر عالی جناب را — زیبا بود ز حلقهٔ چشم ظفر رکاب

۲. من از نواب عالی دودمان اسلام خان گفتم — که آمد آسمان با ماه عید از جبهه سایانش

۳. یعنی آن نواب عالی دودمان اسلام خان — کز محیط همتش گردون بود کم از حباب

ساطع از اسلام خان احسان بیشتر دیده است خود می گوید:

گرچه فیض مهر یکسان میرسد ذرات را — ساطع ما دیده از نواب احسان بیشتر

وقتیکه عالمگیر فوت نمود محمد معظم بنام قطب الدین محمد معظم بهادر شاه. بر تخت سلطنت هند جلوس نمود شعر ساطع بیش از بیش رونق یافت و به دربار وی منسلک شد.

قطب الدین محمد معظم بهادر شاه ۱۹ ماه محرم ۱۱۲۴ هجری قمری فوت نمود و بعد از هرج و مرج نه ماه فرخ سیر پادشاهی یافت.

بمدح وی هم شعر گفته است. اشعار بعرض فرخ سیر رسانده و آن از وسیله تقرب و انعام و بخشش گردانیده است و جایزه های فاخر بدست آورد. علاوه بر قصاید متعدد ساطع سه مثنوی مختصر از نظر همین پادشاه گذرانیده است. بهترین دلیل برای این امر باشد اشعار زیر که بمدح این پادشاه از کلیات ساطع برگزیده شده است.

۱. ز توصیف شه اقبال مندی — به ایوان میرم شعر بلندی

زبان پیوسته میگردد بکامم — دهد نخل ثنا بار سلامم

۲. بدرگاه شهنشاه حق آگاه — شه فرخ سیر غازی جمجاه

بکام ساطع مدحت سرانجام — زبان گویاست بهر شکر انعام

بیا ساطع زبان رنگین بیان کن ‌‌ ‌ رگ ابر قلم گوهر فشان کن
بمدح آنکه آمد در شهان طاق ‌ ‌ شه فرخ سیر غازی آفاق
ز مهر و مه ستاند تلج تو باج ‌ ‌ که بود این سر فرازانه ابراج
چو دست شاه آمد گوهر افشان ‌ ‌ فلک گردیده تا پای دامان

ییان ممدوحان ساطع باید عبدالعظیم خان، رضوی خان، امیرالامرا صمصام الدوله خاندوران و برادر وی مظفر
ن را اسم برد. ساطع در کلیات خود اشعار متعدد در مدح اینها دارد. وی رضوی خان را اینطور توصیف میکند:

رضوی خان که مهر مدحش کرد ‌ ‌ مطلع را مشارق الانوار

ر توصیف عبدالعظیم خان ساطع می گوید:

دید آفتاب کوکبه عبدالعظیم خان ‌ ‌ شان مبارزان فلک اقتدار را

رجای دیگر میگوید:

کجا بهدیه برد طبع من جواهر مدح ‌ ‌ مگر بدرگه عبدالعظیم خان آرد

آخرین ممدوح ساطع امیرالامرا صمصام الدوله خاندوران بوده است. از الطاف و بخشش های این
یر ساطع بهره برده. و اما دوری از وطن و سفرهای طولانی هند وی را ناراحت ساخته و از هوای سوزانده هند بسیار
ل شکسته بود. لذا بفکر مراجعت کشمیر بود. صمصام الدوله شاعر را اجازه برای مراجعت بکشمیر داد. صاحب سفینه هندی مینویسد:
"آخر بعنایت عالیجاه امیرالامرا خاندوران خان بهادر پرداخته و بیمن تفضلات آن عالیجاه خدمتی در کشمیر
افت. آنجا رفت. چون قدری جاگیر هم در آنجا یافته بود، معیشت بخاطر جمع نمود."
صاحب روز روشن میگوید که: "بمدح صمصام الدوله قصیده های بلیغ گفته، بجایزه اش سیورغالی
در وطن حاصل نمود."

اشعاری که ساطع در مدح صمصام الدوله سروده است بتعداد زیاد است و ما در اینجا نمی توانیم تمام آنها
را نقل کنیم. اینک نمونه در اینجا نقل میگردد:

۱- نه مخصوص سکندر بود اقبال جهانگیری ‌ ‌ که ساطع خاندوران سپهسالار هم دارد
۲- بمدح خاندوران چون معانی را بیان سازد ‌ ‌ بساطع کی رسد سحبان فصاحت هم خبر دارد
۳- ثنای خاندوران بهادر پیشه کن ساطع ‌ ‌ که غیر از مدح او مقصود از این فن نمیباشد

قطع مشکل کند از بهر تو یکدم ساطع   خان دوران که ظفر خواند بصمصام اورا

...تن (۹) هم یکی از ممدوحان ساطع است. کلیات ساطع قطعه ای دارد که در مدح وی سروده شده است. یک
... از آن در اینجا نقل میکنیم:

بجز تو مدح و ثنا را بدرگه که برم   که مرجع بنود شعر را بجز دیوان

مسافرتهای ساطع: چنانکه قبلاً اشاره شد که ساطع بعلت کمبود سرمایه زندگی و برای بدست آوردن
... از آن زندگی خود را اداره بکند راه مسافرت را پیش گرفت. در ابتدا به پشاور رفت و چندین سال پشت
... در آنجا ماند و بالاخره بتوسط اسلام خان میر آتش شاه بهادر بدربار وی تقرب حاصل نمود. چون محمد و... بدهلی
...ت ساطع هم همراهی وی به دهلی ... گردید. و تا بقتل رسیدن فرخ سیر که در سال ۱۱۳۱ هـ قمری بوقوع پیوست در
...لی ماند. اما چنان بنظر میرسد که وی از این مسافرتهای طولانی بسیار خسته و دلگیر شده بود. هوای گرم و سوزنده
هند وی را از پا درآورده بود کیفیت هوای پشاور را در اشعار خود اینطور بیان میکند:

قصد هلاک کرده هوای پشاورم   از تب فکنده بود در آتش سپندوار

جای دیگر درباره هوای گرم هند گله دارد و میگوید:

در هوای هند از تشنه و تمای من میرسد   از گداز خود چو نخل شمع آبم داده اند

ساطع از سفرهای دراز بستوه آمده بود و خودش را در هند زنده بگور تصور میکرد چنانکه میگوید:

زنده در گور کرد این سفرم   درد شد صاف کامرانی من

چون آرزو برای برگشتن بوطن خود دارد لذا نیایش بدرگاه ایزد متعال میکند تا بوسیله حضرت امام موسی کاظم
برایش راهی پیدا شود مراجعت بکشمیر کند. باشعار زیر توجه کنید:

شب از خرابی احوال خویش میگفتم   که می نخورده بدینسان کسی مباد خراب
سفر نمود تنک مایه ام چنانکه مرا   بجز هوای وطن نیست در گره چو حباب
خرد بگوش دلم این سخن نهانی گفت   که عرض حال بکن پیش آن رفیع جناب
امام موسی کاظم که مدح او ز قلم   نمود وقف کلیدی برای فتح الباب

جای دیگر می گوید:

نیم آن ریگ که در شیشه ساعت باشد   روز و شب ارچه سفر کردن من [illegible]

اشعار زیر بر می آید که خاندان ساطع را بالاخره بکشمیر فرستاده است. چنانکه می گوید :

فرستادی بگلگشت بهشت آباد کشمیرم　　　که غیر از جنت بخشیده مور سلیمانی

در عوض خدماتی که ساطع در دربار شاه بهادر انجام داده است، بادشاه وی را در کشمیر جاگیر تفویض نمود

مانکه پدر بار همین پادشاه بوده است که ساطع تقاضانامهٔ خود برای احیای جاگیر فرستاده است. ویک کپی از این تقاضانامه

ونز در موزهٔ بریتانیا اشتباهاً با یک نسخهٔ نثری ملا طغرای مشهدی مضبوط است و دارای یک برگ است و شمارهٔ برگ ۸۰

رد. صاحب مجمع النفائس می نویسند که صمصام الدوله ساطع را در کشمیر جاگیر تفویض نمود ولی چنانکه از اشعار ساطع روشن

بشود که جاگیر تفویض شدن بحق وی شامل لطف و عنایات شاه بهادر است. زیرا هنگامیکه کسی دست تطاول بسوی آن دراز

ده بود ساطع برای دادرسی اشعار زیر را بدربار بادشاه فرستاده بود :

مور در پیش سلیمان عرض حالی میکند　　　ذرهٔ پیش آفتاب آسمان عز و جاه

چند روزی شد که در دفتر خط انور رسید　　　گشت نازل گوئیا خط الشعاع از مهر و ماه

باوجود اینچنین لطفی که شد در حق من　　　باوجود این عنایات جناب پادشاه

ظالم از جاگیر من دست تصرف بر نداشت　　　من بدار العدل انصاف تو می کردم پناه

مجرد بودن ساطع : در کلیات ساطع به بعضی از اشعار بر می خوریم که دال بر آن است که وی متأهل

نبوده بلکه در تجرید زندگی بسر برده است آنجا که در شعر زیر جور و جفای روزگار را بیان می کند در ضمن آن اشاره

به مجرد بودن خود هم میکند :

بر نتابد از تجرد کلبه ام سامان فقر　　　موج سیلابست نقش بوریا در خانه ام

از اشعار زیر هم تجرید شاعر هویدا میگردد :

۱- گرچه تن چون صورت دیبا بکسوت داده ام　　　لیک میداند تجرد همچنان عریان مرا

۲- هوای عالم تجرید در سر دارم آن طفلم　　　که باشد دامن صحرای امکان کاغذ بادم

۳- مرا عریان تجرد با جنون دارد درین وادی　　　نگنجم به پیراهن ز بس بالیدم از شادی

۴- منصب آوارگی دارم تجرد مشربم　　　گردباد دشت عشقم خانه بردوش توام

فقر و گرسنگی ساطع : چنانکه گفته شد که ساطع از ممدوحان خود لطف و مهربانیهای فراوان دیده است.

ولی از اشعارش روشن میشود که وی زندگی خود را با نهایت فقر و گرسنگی بسر میبرد. به اشعار زیر توجه فرمائید:

وحشیم دارد بساط فقر گویا ننگ ‌‌‌‌‌‌‌‌ از نی مژگان آهو بوریای خانه ام

فقر کی ساطع بدیها گوشه گیر انداخت ‌‌‌‌ این کشاکش بر نیاید چون کمان از خانه ام

چون ساطع از روزگار و اهل روزگار زجر ها دیده است لذا از آنها نالان و بیزار بود. اشعار زیر بعلت مناسبت در اینجا نقل گردیده است:

خصم سرکش کی حریف دیده گریان ماست ‌‌‌‌ چهره گردون کبود از سیلی طوفان ماست

تا نی ما خونابه نوشان را دماغ باده نیست ‌‌‌‌ هر که غم خوردن گوارایش بود مهمان ماست

بروایت تذکره نگاران وی دیوان شعر دارد. مولف سفینه خوشگو درباره وی می نویسد که دیوانی ضخیم دارد. صاحب ریاض الشعرا میگوید که دیوانش از سه هزار بیت متجاوز است واما سراج الدین خان آرزو درباره دیوان اشعار او می نویسد که وی دیوان مختصری دارد. صاحب مخزن الغرایب تعداد اشعار ساطع را قریب چهار و پنجهزار می نویسد.

وفات ساطع: درباره تاریخ وفات ساطع مثل تاریخ ولادت وی تذکره نویسان باهم اختلاف نظر دارند. صاحب روز روشن سال وفات ساطع ۱۱۵۶ هجری قمری نوشته است و در سفینه خوشگو و تحفه ابراهیم تاریخ درگذشت وی ۱۱۵۰ هجری قمری درج است این اختلاف حتی تا آنجا رسیده است که بنظر بعضی از تذکره نویسان ساطع در دهلی فوت کرده. درباره سال وفات ساطع منابع قابل ملاحظه ای که از نظر تاریخی بسیار پر ارج هست واقعات کشمیر است و نویسنده آن محمد اعظم دیده مری میباشد. دیده مری نه تنها معاصر ساطع بوده است بلکه میان وی و ساطع روابط دوستانه برقرار بود. علاوه براین دیده مری از وی در شعر اصلاح هم میگرفت. در هنگام وفات ساطع دیده مری زنده بوده است آنچه که وی درباره ساطع می نگارد از روی شواهد عینی است. لذا روایت وی بر تمام تذکره نویسان فوقیت دارد. درباره وفات ساطع وی می نویسد:

"(ساطع) بیست و یکم رمضان سال چهل و سه هجری (۱۱۴۳ هـ) رحلت نمود. عالمی را از خویش و بیگانه گرفتار تاسف و تلهف فرمود، بتخصیص راقم حروف که قریب بیست سال بفرط محبت و اتحاد مجلس آرای لطف صحبت و باده پیمای الفت بذکر اشعار آبدار و طرح قافیه های هدایت شعار چه در حضور و غیبت بزم طبع راحت افزای حاصل بود. قرین درد فراق گذاشت و این تاریخ را راقم حروف بمبالغه بر صفحه تاریخ نگاشت تا ...

"نور ایمان بر قدش ساطع"

« نور ایمان بر قدش ساطع » برابر است با ۱۲۴۳ برطبق روایت مذکور ساطع بیست و یکم رمضان المبارک ماه ۱۲۴۳ هجری قمری در کشمیر بجهان پدرود گفت.

آثار ساطع: طبع ساطع برای سرودن اشعار فارسی موزون بوده است. وی از آغاز زندگی بشعر و سخن علاقه داشت و پیروی از استادان بزرگ و سخنوران نامدار فارسی کرده تقریباً در تمام اصناف شعر مهارت بدست آورده بود کلیاتی که ساطع از خود باقی گذاشته است. شامل قصاید، غزلیات، قطعات، ترکیب بند، رباعیات، مثنویات و منشآت است علاوه بر نظم و نثر ساطع در علم لغت نیز آشنائی داشت. چنانکه وی کتاب معروف لغت برهان قاطع را تلخیص نموده و سر نو آنرا ترتیب داده است و اسم آن کتاب حجت ساطع گذاشته بود.

نسخهٔ کامل از کلیات ساطع در کتابخانهٔ سازمان تحقیق و اشاعت استان جموں و کشمیر سری نگر بشمارهٔ ۵۲۵ محفوظ است. و نسخهٔ دیگر از کلیات ساطع بشماره - درهمین کتابخانه نگهداری میشود کلیات مورد بحث ۳ مثنوی، ۲۹ قطعه، ۶۴ قصیده، ۱ ترکیب بند، ۱۴ رباعی تقریباً چهارصد غزل و منشآت به نثر فارسی دارد.

این نسخه دارای ۱۸۳ برگ است هر برگ ۱۲ سطری کاغذ نسخه کشمیر برنگ نخودی جلد چرمی برنگ قهوه ای. اسم کاتب و سنهٔ استنساخ ندارد. سه مهر روی این نسخه ثبت است. مهری که برگ ۶۵ الف دارد متن آن این است. « سهج رام سبها ۱۹۰۹ بکرمی ».

برگ ۱۷ الف و ۱۸ الف مهر "ملا صدرالدین محمد" ثبت است.

برگ ۱۷ الف مهر محمد منور و سنه ۱۲۳۶ھ دارد.

با در نظر گرفتن عبارات و متن مهرهای فوق میشود حدس زد که این نسخه قبل از سال ۱۲۳۶ هجری استنساخ شده باشد.

با این همه که از سه نسخهٔ دیگر دیوان ساطع هم اطلاع داریم اما هر یکی از اینها گزیده ای است لذا لازم است که هر سه دیوان را در اینجا اجمالاً معرفی بکنیم.

یک نسخه از دیوان ملا ساطع کشمیری در کتابخانهٔ آصفیه حیدرآباد (که کنون اسمش "آندرا پردیش گورنمنت اورینتل مینوسکرپت لائبریری" شده است.) بشماره ۴۰۴۳ ثبت است. تعداد اوراق ۹۷، کاغذ کشمیری، جلد برنگ مشکی سرلوح مطلا نسخه جدول‌دار دارای ۳۴۲ غزل و ۴۳ رباعی.

نسخهٔ دوم دیوان ملاساطع که در موزه سالار جنگ حیدرآباد (آندهرا پردیش) بشماره ۲۲۹۱ مضبوط است.
ی ۱۰۰ برگ است. هر صفحه دارای ۱۰ سطر. نسخه بخط نستعلیق متوسط استنساخ شده است. نسخهٔ مورد بحث ۱۲ قصیده
بیب بند، تقریباً چارصد غزل و چهار رباعی دارد.

نسخهٔ چهارم از دیوان ساطع در کتابخانه رضا رامپور ثبت است و ۱۴۹ برگ دارد.

چنانکه گفته شد که ساطع نثر خوب هم مینوشت و در آن مهارت وافر داشت. در فن نثر نویسی بی همتا بود
مداعظم دیده مری درباره نثر نویسی وی می نگارد که "در نثر هم بی نظیر وقت بود". بقول صاحب مرآة آفتاب
اساطع نثر خوب مینوشت. بروایت سفینه هندی ساطع در نثر برابر نصیرای همدانی عبارت رنگین می نوشت.

یک نسخهٔ خطی بخط نستعلیق از منشآت ملاساطع کشمیری در کتابخانه دیوان هند بریتانیا بشماره ۲۹۴۲ مضبوط
است که در یازدهم ماه ربیع الثانی ۱۱۷۷ هجری قمری استنساخ شده است گویا نسخهٔ مذبور فعلاً قدیم‌ترین نسخهٔ خطی
از منشآت ملاساطع کشمیری است. نسخهٔ دوم از منشآت ملاساطع همانست که در آخر کلیات وی قرار میگیرد در سازمان
تحقیق و اشاعت استان جموں و کشمیر نگهداری میشود.

مطبوعات خدابخش لائبریری پٹنہ

قیمت

۱۔ ایک مشرقی کتابخانہ: خدابخش لائبریری کا تعارف از اسکاٹ او کونر (انگریزی) — 10/-

۲۔ خدابخش: خدابخش لائبریری کے بانی کی ایک مختصر مگر جامع سوانح از سر جدو ناتھ سرکار اور صلاح الدین خدابخش (انگریزی) — 10/-

۳۔ مصوری کا تاج محل: خدابخش لائبریری میں محفوظ جہانگیر کے ایک نادر نمونہ (تاریخ خاندان تیموریہ) کا تعارف از ورونک ۲۲ رنگین تصاویر۔ (انگریزی) — 15/-

۴۔ مجموعہ مقالات پروفیسر سید حسن عسکری، پہلی جلد: شیخ ارشد، شرف الدین یحییٰ منیری، زین بدر عربی اور ملک بیو پر مضامین۔ (انگریزی) — 10/-

۵۔ تدوین متن کے مسائل: خدابخش سیمینار کے مقالات اور مباحثے (اردو) — 15/-

۶۔ پنڈت موتی لال نہرو کا خطبہ صدارت: انڈین نیشنل کانگریس کی یوپی کی پہلی صوبائی کانفرنس (۱۹۰۷ء) میں: ایک اہم دستاویز (اردو) — 10/-

۷۔ فرہنگ آصفیہ [illegible] پر تبصرہ عظیم الحق قاضی عبدالودود کے قلم سے (اردو) — 10/-

۸۔ بہار اردو لغت جلد اول: فرہنگ بہار از یوسف الدین احمد بلخی (م ۱۹۷۱ء): بہار میں عام طور پر بولے جانے والے الفاظ اور محاورات کی ایک اہم لغت (اردو) — 15/-

• ترتیب و تدوین

۹۔ مجمع النفائس از سراج الدین علی خان آرزو (م ۱۱۶۹ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ (فارسی) — 10/-

۱۰۔ باغ معانی از نقش علی (م ۱۱۴۴ھ): بارہویں صدی ہجری کے فارسی شعرا کا دوسرا اہم تذکرہ (فارسی) — 10/-

۱۱۔ صحف ابراہیم از علی ابراہیم خان خلیل (م ۱۲۰۸ھ): بارہویں صدی ہجری کے شعرائے فارسی کا تیسرا اہم تذکرہ (فارسی) — 10/-

۱۲۔ مثنوی تصویر محبت از میر شمس الدین فقیر (م ۱۱۸۳ھ) عظیم آبادی: ایک داستان محبت جو میر کی شعلۂ عشق کا ماخذ بنی (فارسی) — 10/-

۱۳۔ شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان از مرزا جان طپش (م ۱۲۲۹ھ): شاہ عالم کے عہد کی محاورات اردو کی لغت — 10/-

۱۴۔ تاریخ ہائے پیدائش و وفات معاصران: قطعات حسرت از شمس العلما محمد حسرت عظیم آبادی (م ۱۳۲۲ھ) (فارسی) — 10/-

۱۵۔ کنز تاریخ: شاہ غلام یحییٰ عظیم آبادی (م ۱۳۰۲ھ) کے قطعات تاریخ (فارسی) — 10/-

۱۶۔ تذکرہ کاملان رام پور: مرتبہ حافظ احمد علی خان شوق (م ۱۳۳۲ھ) (عکسی اشاعت) امیر مینائی کی انتخاب یادگار کے بعد ابتک رامپور کے مشاہیر اور روہیلوں کی تہذیبی تاریخ کا تنہا ماخذ۔ تقریباً ۵۰۰ مشاہیر رامپور کا تذکرہ تصحیح و اضافے کے ساتھ۔ (اردو) — 60/-

• رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت

۱۷۔ جلد اول: ادیب الہ آباد: نوبت رائے نظر کے ماہنامہ 'ادیب' الہ آباد کے کل فائل (۱۹۱۰-۱۹۱۳ء) سے ادبی، علمی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی مضامین کا ایک انتخاب۔ — 45/-

۱۸۔ جلد دوم: العصر لکھنؤ: پیارے لال شاکر کے ماہنامہ 'العصر' لکھنؤ (۱۹۱۳-۱۸ء) کے تمام دستیاب اکتالیس شماروں کا انتخاب جس میں ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ فلسفہ، سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مضامین شامل ہیں۔ ۲۲ مشاہیر کی نادر عکسی تصاویر کے ساتھ — 45/-

۱۹۔ جلد سوم: صبح امید لکھنؤ: ماہنامہ صبح امید لکھنؤ (۱۹۲۱-۱۹۴۰ء) کے مکمل فائل سے ادبی، علمی اور تاریخی مضامین کے علاوہ تحریک آزادی کی معاصر دستاویزات اور انقلاب روس کے ہندستان پر اثرات سے متعلق مضامین کا انتخاب — 45/-

۲۰۔ ۱۹۳۶ء میں قاضی عبدالودود کا معیار: قاضی عبدالودود کے مشہور اردو ماہنامہ 'معیار' پٹنہ (۱۹۳۶ء) کے مکمل فائل کی عکسی اشاعت: ایک بھرپور تجزیاتی تعارف اور مقدمہ کے ساتھ — 45/-

۲۱۔ جدید غزل گو: ۱۹۴۰ء کی ایک دستاویز: نیاز فتحپوری کے ماہنامہ 'نگار' ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر کی عکسی اشاعت ۱۹۴۰ء تک کے غزل گو شعراء، خود انتخاب کردہ کلام، خود نوشت سوانح، شعراء کی اس عہد کی تصاویر اور خود نوشت تحریریں۔ — 35/-

خدابخش سلسلۂ خطبات

۲۲۔ عہد سلطنت (۱۲۰۶-۱۵۲۶ء) کے صوفی ادب پر ایک طائرانہ نظر: از ڈاکٹر بروس لارنس (امریکا) (انگریزی) — 10/-

۲۳۔ عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو: از ڈاکٹر ہاشم امیر علی (انگریزی) — 10/-

۲۴۔ فارسی اور ہندوستان: از پروفیسر نذیر احمد (اردو) — 10/-

۲۵۔ میری تنقید: ایک بازدید: از پروفیسر کلیم الدین احمد (اردو) — 10/-

۲۶۔ صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ: از پروفیسر سید حسن عسکری (انگریزی) — 10/-

۲۷۔ اسلام کی چودہ صدیاں مکمل ہونے کی تقریب میں: ہند مسلم مسئلہ اور اسلام: عصر جدید کے بارے میں چند خیالات: از عبداللطیف ٹی بی سی (انگریزی) — 10/-

۲۸۔ فارسیات میں ہندوستان کا حصہ: جدید تحقیقات کی روشنی میں: از ڈاکٹر عابد رضا بیدار [illegible] (انگریزی) — 10/-

۲۹۔ فکر اسلامی: بدلتی دنیا میں: از پروفیسر رشید احمد صدیقی (انگریزی)؛ از پروفیسر آصف فیضی (انگریزی) — 10/-

۳۰۔ مشرق وسطی: ... (شمالی افریقا اور مشرق وسطی): از ڈاکٹر آر۔ ایس۔ [illegible] (انگریزی) — 10/-

۳۱۔ بین المذاہب مفاہمتی مسائل: ایک تاریخی جائزہ بھی اور ایک مذہبی واردات بھی: از ڈاکٹر آرتھر [illegible] (انگریزی) — 40/-

۳۲۔ افکار رومی: از عبدالسلام خان (اردو)

فہارس مخطوطات خدابخش

۳۳۔ مفتاح الکنوز: جلد اول — سوم (فہرست مخطوطات عربی) — فی جلد 10/-

۳۴۔ مرآۃ العلوم: جلد اول — سوم (فہرست مخطوطات فارسی) — فی جلد 10/-

۳۵۔ فہرست مخطوطات اردو جلد اول — 10/-

توضیحی کیٹلاگ: مخطوطات خدابخش (انگریزی)

۳۶۔ جلد اول و دوم: مخطوطات فارسی (شعر فارسی)؛ جلد ۷: مخطوطات فارسی (تاریخ ہند)؛ جلد ۲۰: مخطوطات عربی (حدیث)؛ جلد ۲۹: مخطوطات عربی (قرآنیات)؛ جلد ۳۱: مخطوطات فارسی، شعر فارسی، تاریخ، سوانح اور تصوف؛ جلد ۳۲: مخطوطات فارسی (دائرۃ المعارف، سائنس، طب، منطق اور اخلاقیات)؛ جلد ۳۳: مخطوطات عربی (فقہ اسلامی) — فی جلد 50/-

خدابخش لائبریری جرنل (سہ ماہی)

۳۷۔ خدابخش لائبریری جرنل: اردو، انگریزی، عربی و فارسی چاروں زبانوں میں مضامین شائع کرنے والا ایک سماجی تحقیقی مجلہ، ۱۹۷۷ء سے جاری، اب تک ۴۹ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔

قیمت فی شمارہ: 15 روپے

سالانہ: 60 روپے (ہند)، 12 ڈالر (ایشیا)، 24 ڈالر (دیگر ممالک)

تازہ مطبوعات

۱۔ امیر خسرو بحیثیت مورخ (دوم): از پروفیسر حسن عسکری (انگریزی) — 25/-

۲۔ ہندستانی مسلمانوں کے مسائل: از سید حامد — 30/-

۳۔ طب اسلامی: جنوبی ایشیائی علاقائی سمینار: روداد و مقالات — 50/-

۴۔ رقعات رشید صدیقی: از ڈاکٹر مسعود حسین — 30/-

۵۔ ذوقِ تحقیق کی صداقت : از بی۔ این۔ پانڈے	5/-
۶۔ مولانا آزاد کی یادیں : (ہندی)	15/-
۷۔ خوشتر گرامی کا رسالہ زبان، ۱۹۲۹ (عکسی نقل)	30/-
۸۔ اسلامک اسٹڈیز : از ڈاکٹر زبیر صدیقی (انگریزی)	10/-
۹۔ علی گڑھ تحریک : از سید حامد	5/-
۱۰۔ سجاد حیدر یلدرم : از ترکان دیرکان	10/-
۱۱۔ اسلام اور ہندوستان : از بی۔ این۔ پانڈے	10/-
۱۲۔ اورنگ زیب ایک نیا زاویہ نظر : از ڈاکٹر اوم پرکاش (ہندی)	15/-
۱۳۔ آثار آزاد : خطوط آزاد بنام بجنور عظیم آبادی : از قدرت اللہ فاطمی	30/-
۱۴۔ ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینے میں	50/-

It passed through many stages of growth, during the period of Industrial Revolution in Europe. The Arabs took off from where the Greeks had left and the west took off from where the Arabs had left.

In conclusion we may say that it is absurd to say that *Tibb or Arabian* medicine in India is eastern and that Allopathy is western. They are the two branches of the same tree. The difference lies in their evolution and progress. Most of the Muslim countries today have adopted Allopathy and have given up Tibb. But in India the tradition continues. It has survived mainly for two reasons : In the first place, it is cheaply available in the masses and secondly, until the nineteenth century, there was no competition with Allopathy which gradually became popular after the domination of the British in India. Prejudices against Allopathy, however, do continue to remain in the minds of the masses, but these are gradually dying out. Another aspect of its popularity is that it avoids operations and drugs are prepared by the physicians himself or ingredients recommended by him which are acquired by the patient. With dawn of the twentieth century, Tibb came under the direct influence of Allopathy, its twin sister which posed as a forceful competition. This century has produced, however, eminent physicians like *Hakim Ajmal Khan* of Delhi. He is well known for his invention, the Ajmaline. Modern Muslim Physicians like *Hakim Abdul Hamid* of Delhi are paying greater attention to research in Tibb and are thus modernizing the ancient science. Let us hope that Tibb will bear the scientific rigours of modern times and shall become a supporter of Allopathy rather than remain its adversary. Allopathy, however, has no limits in its scope and incredible achievements today due to the advancement of science and technology.

—:-:—

new theory or concept was met with severest opposition from the Church and anything that did not conform to the teachings of the Bible was denounced as a heresy. In medicine, a critical attitude developed. Experimentation was emphasized. The Arabic texts were studied from a critical point of view and were compared with the original Greek texts. Thus developed a tendency against Arabism. The medical students in Madrid revolted against study from the term above and learnt the works, of Galen and Avicenna. Paracelsus (d-1541) who reformed alchemy and medicine openly revolted against Galen and Avicenna and burnt their works in the market-place openly. In the same century, Harvey propounded his blood circulation theory. Traditionalism in medicine thus released itself from the dogmatic influence of Christianity as well as from traditionalism in education. Paracelsus also freed chemistry from the concept of soul, spirit, etc. which had dominated it from the ancient times. It was thus that Arabian medicine took a new turn in Europe. Anatomy and physiology were studied afresh by dissecting bodies and such other experiments. The second major step forward was taken in the nineteenth century when the bacteria was discovered as the cause of diseases. Muslim physicians of Spain had freed themselves from the theological prejudice which regarded plague as a divine punishment and considered the epidemic (Black Death, 14th century) as a contagion. But the sources of the disease had not yet been discovered. This was done in the nineteenth century. The doctrine of the contagious character of the disease was not emphasized by the Greek physicians and was almost passed over by most medieval medical writers.

It was the new shape of the ancient Greeco-Arab medical science as it appeared in Europe from the sixteenth century onwards that came to be known as *Allapnthy*.

Allopathy has, therefore, incorporated in it the human experience of medical knowledge of over two thousand years. It has in it the elements of ancient Greek system, the ancient Iranian and Indian systems which had enriched the Arabian medicine in the middle ages, and above all, the rich experience of the Muslim physicians of over four centuries. Today, it is a universal science incorporating in it the major portion of human medical experience.

Inspite of the shortcomings of the Muslim physicians and in the face of all the restrictions imposed by religion against dissection, etc. it can be said with authenticity that Muslims' contribution to medicine was in no way insignificant. Apart from the development on the clinical side, they advanced surgery though in a limited way. Instruments used by the surgeons could have improved and become refined if chemistry and matellurgy were allowed to grow after the eleventh century as they did before. They used a variety of anaesthetic material to make the patient go to deep sleep before any operation. They looked down upon the method of surgery as used in contemporary Europe. They specialised in drugs and produced pharmacopoeias of immense utility to the physicians. Above all, they made significant contribution in diagnosis and methods of treatment which was purely pragmetic. It is their big experienc in diagnosis and treatment of disease as recorded in the extant medical literature that forms an interesting source material for research and investigation on the drugs and the compounds prepared by them. Chemical analysis of the ingredients of the medical plants, minerals, etc. used by them would reveal a host of valuable knowledge for modern medicine. Thus, although they did not produce a William Harvey or a Louis Pasteur, but they certainly produced an Alhazen or an Avicenna whose works remained the sole texet-books taught in Europe till the seventeenth century.

The causes of the general stagnation of the Islamic Sciences from the 12th century downwards were in my opinion (1) growth of orthodoxy in Islam from the time of al-Ghazzali, (2) change of the educational system, (3) rise of *fundamentalism* in Islam from the time of the Turkish invasions (4) lack of patronage on the part of the Musilm rulers of the sciences except a few; and (5) the entry of the portiguese in the Indian occean. When Harvey discovered the blood circulation, medical knowledge of both the east and the west was at the same level. It was only when the west was able to have direct access to Greek texts that the European physicians were able to compare them with their Arabic commentaries and were able to judge the comparative value of the two. This was the beginning of the Renaissance in Europe. Science was struggling against the hold of the Church and against traditionalism. Every

--

Among them was special type of syringe, double barrelled, for extracting sceptic material from the body. However, surgery could not advance much, because of the theological concepts that flesh was impure and that genital organs should always remain covered, came in the way of the surgical operations. These ideas were propagated through the commentaries and given wide publicity by those who wanted to keep the position of the surgeons inferior to that of the physicians. Although the surgeons were not looked down upon by the physicians as they were in medieval Europe, Avicenna, according to Elgood, is partly responsible for forcing this positions upon the surgeons. The commentaries spread the lies for it fitted well with the theological concept of the impurity of flesh. But Haly Abbas considered treatment by drugs and treatment by surgery of equal importance, though he gives surgery a secondary position in his treatise '*Liber Regius*'. The surgeons figured on the staff of the hospitals of Baghdad as equals of the physicians.

Muslim scholars and physicians did not make any significant advance in increasing their knowledge of the body itself, and depended upon the theoretical knowledge and concepts acquired from the Greeks. E. G. Browne rejecis the story given in *Nam-a-i Danishwaran* that Yuhanna b. Masawayh dissected bodies of monkeys acquired from Nuba for its soruces. Ibn Abi U aybi'a does not give full details of it. He was, therefore, of the opinion that to accept the story of Ibn Abi Usaibi'a there is no other authentic and dependeble evidence. Whatever the truth of the srory the fact remains that, generally speaking, human bodies were not dissected by the physicians. Had they done so, they would have revolutionalized theoretical knowiedge and would have long discarded the Greek theories. This did not happen in the history of Unani medicine. This took place in Europe when the texts of Galen and Avicenna were discarded and the physicians turned to the body directly. As a result new theories arose and were propounded on the basis of direct experience of the body. Ibn al-Nafis is, credited with the discovery of the theory of blood circulation long before Harvey. Was it based on dissection or mere conjecture? This is a most point.

Finally, two bio-bibliographical works of high importance were written, one by al-Qifti (d. 1248) and the other, Ibn Abi Usayb'a's work (d. 1270).

From the eleventh century onwards, the works of the Muslim physicians and their knowledge passed on to Europe through translations into Latin from Arabic, mainly from Spain and Sicily. Eleventh century also marked the period of the stagnation of Arabian medicine, as well as of general stagnation in most of the sciences. Many of the modern historians of science writing on Islamic sciences have raised the question as to the causes of the general intellectual decline from this period onwards and generally agree upon it, but none has so far been able to give a satisfactory answer. I have done some thinking of the subject.

But before going into this general question which affected the future development of medicine also, let us explain to the lopsided growth of mdicine itself up to the eleventh century. The Greeks, had the theory of medicine. The Muslim physicians, on the other hand, added to medical knowledge by referring to clinical and therapeutic experience only. They leave the theory and the thought of the Greeks untouched. They would have improved and added to the theoretical side also provided there were no religious or social taboos against dissecting the bodies. Science cannot advance unless theory and practice go hand in hand. Max Meyerhof points out, 'It must be remembered that Muslims were strictly prohibited from dissecting either human bodies or living animals. Thus experiment was practically impossible in medicine, so that none of Galen's anatomical and physiological errors could be corrected. E. G. Browne is of the opinion that there was no practice of dissecting the bodies. However, considerable advance was made by the Muslim physicians on the clinical side. The hospital system (bimAristAn) was developed. Doctors visited the patients in the hospitals and even took classes there. Hygienic sites were selected for the establisment of the hospitals. Nursing system neither developed in east nor in the west until the time of Florence Nightingale.

Muslim physicians also practised surgery and operations were performed. Operations of the eye were the most advanced. A number of instruments for operation were invented and developed.

of great independent thinkers, it was certainly a very important factor in their supperession. The twelfth century was the watermark in medical activity. The work of Rhazes, Avicenna, and 'Jabir' were reproduced, summarized, commented on, but outstanding works became rare.

During this period *Pharmacological* treatises abound and later Arabic books on compound remedies are still in fervour. With the beginning of the fourteenth century, magic and superstitious practices began to creep into the medical works of the Muslim writers whose medical knowledge was often derived from religious writings. There is thus a further deteriorations of the general standard of the material.

In Spain the philosophical bias predominated among medical men. Ibn Zuhr (d.1162) displayed disdain for surgery and surgeons and was a more consulting physician than a general practitioner. Averros reveals himself as an Aristotelian thinker, particularly in the second part of his book *Kulliat fi't Tibb* where he deals with physiology and psychology. Often he pits the opinions of Rhazes and Evezoar against those of Hippocrates and Galen. The great plague of the fourteenth century, the '*Black Death*' furnished an occasion for Muslim physicians in Spain to free themselves from theological prejudices which regarded plague as a divine punishment and to consider the epidemic as a contagion. To appreciate the teaching of these writers it must be remembered that the doctrine of the contagious character of disease is not emphasized by the Greek physicians and is almost passed over by most medieval medical writers. In the sciences other than medicine the output of books during the period of decline was very great, but the deterioration no less marked. There are known books of some forty Arabic and Persian alchemists after the eleventh century. Yet their works add very little to the subject. Ibn Khaldun was a violent opponent of alchemy. Prominent in optics was the Persian Kamal-al-Din (dc. 1320) who repeated and improved on Alhazen's experiments with the *Camera obscura*. He also observed the path of the rays in the interior of a glass sphere in order to examine the refraction of sunlight in raindrops. This led him to an explanation of the genesis of the primary and secondary rainbows.

Baghdad (Jesu Haly) and Ammar of Musul (Canamusali) left two excellent treatises, increasing the Greek canon of ophthalmology with numerous additions, operations and personal observations. Both were translated into Latin and were the best text-books on eye-diseases until the first half of the 18th century when the Renaissance of ophthalmology set in France.

Optics was developed to its highest degree by Abu Ali al-Haytham (Alhazen) (965). Alhazen opposes the theory of Euclid and ptolemy that the eye sends out visual rays to the object of vision. His name is still associated with the so-called 'Alhazen's problem'. He examined the refraction of light-rays through transparent mediums (air, water). In detailing his experiments with spherical segments (glass vessels filled with water), he comes very near to the theoretical discovery of magnifying lenses, which was constructed practically in Italy three centuries later. Roger Bacon and all medieval Western writers on optics—the Pole Witelo or Vitellio—base their optical works largely on Albazen's *Opticae Thesaurus*. His work also influenced Leonard de Vinci and Johann Kepler. The latter modestly entitled his fundamental work on dioptrics *Ad Vitellonem Praraliponena* (Frankfurt 1604). Most of Alhazen's successors did not adopt his theory of vision, but al-Biruni and Avicenna share independently and fully his opinion that it is not a ray that leaves the eye and meets the object that gives rise to vision. Rather the form of the perceived object passes into the eye and is transmuted by its transparent body (i. e. the lens). The lens played an important role in the period of industrialization; it was fitted to the telescope which revaluationized astronomy. He wrote on physical optics and a book *on Light*. Light he regarded as a kind of fire that is reflected at the spheric limit of the atmosphere. Other of his treatises deal with the rainbow, the halo, and with spherical and parabolic mirrors, etc.

Whilst the orthodox thinkers of early Islam generally tolerated the growth of sciences and philosophy we may say that, from the time of the great religious teacher al-Ghazzali (d. 1111) onwards, this tolerance gave place to disapproval of these studies 'because they lead to loss of belief in the origin of the world and in the creator'. Whether or not this attitude was alone sufficient to prevent the rise

and apparatus, which is always devoid of mystical elem
While 'Jabir' and the other Arabian alchemists divide mine
substances into 'Bodies' (gold, silver, etc.) 'Souls' (sulphur, arsen
etc.), and 'Spirits' (mercury and sal-ammoniac), Rhazes classif
alchemical substances as vegetable, animal, or mineral, a conce
tion which comes from him into modern speech.

'Jabir' (Geber to the Latin West) is not the same as th
eight-century mystic of the same name. The works produced i
the tenth century bearing that name were probably the works of
secret society similar to *Ikhwan-al-Safa* (Brethren of Purity)
Due to the mystical tendencies derived from the Gnostics and
the neo-Platonists, alchemy tended to become the subject of
ineffable speculation and superstitious practice, passing into
fraudulent deception. 'Jabir' clearly emphasized the importance
of experiment than any other early chemist. Thus he was enabled
to make noteworthy advances in both the theory and practice of
the subject. His influence can be traced throughout the whole
historic course of European alchemy and chemistry.

Haly Abbas (d. 994) was another important physician who
composed an excellent and compact encyclopædia *al-Kitab al-Maliki* which deals with both theory and practice of medicine.
It begins with a critique of previous Greek and Arabic medical
treatises.

Abu Ali al-Husayn b. Sina (980-1037) was one of the greatest
scholars of the Islamic world, though less remarkable as a physician than as a philosopher and a physicist. He concentrated the
legacy of the Greek medical knowledge with the addition of the
Arabs' contribution in his *al-Qanun fi'l-Tibb*, which is the culmination and masterpiece of Arabic systematization. With him, 'the
Prince of Chief Physicians' Islamic medicine reached its zenith in
the East.

During this period treatises on simple drugs were also
written which formed parts of the great encyclopaedias, but were
also composed as separate monographs.

Ophthalmology was another branch of medicine which reached
its height about 1000 A. D. The Christian oculist 'Ali b. 'Isa of

works on medicine based on Greek medical science enriched by Indian system of medicine. Among the typical works produced by them were "pandects" and "cram books". The pandects were recapitulations of the whole of medicine, discussing the affections of the body, systematically beginning at the head and working down to the feet, but most of these are lost. These were typical of the period of Arab learning. Another type of medical literature was "the cram book" in the form of questions and answers, which gave to medicine its scholastic aspect. Again, pharmacological and toxicological treatises were composed by Arab physicians from Jabir b. Hayyan downwards. Medicine now passed from the hands of Christians and Sabaeans into the possession of Muslim scholars, mostly Persians. Instead of pandects compiled from antique sources, imposing encyclopaedias were composed. From the ninth to the eleventh century, for about three hundred years, the Islamic world produced a galaxy of physicians, some of whom were the greatest of all times.

Among the great names of the period we have that of Muhammad b. Zakariya al-Razi (c.865-925), who was known as Rhazes in the Latin west. He produced more than 200 works, half of which are medical. His writings included many short missives of an ephemeral character. He also wrote on anatomy and the most celebrated of all of his works is : *On small-pox and Measles* which is "the first clear account of these two diseases which has came down to us". He gives sound and detailed advice as to the treatment of the pustules after the full development of small pox. But his greatest medical work is *al-Hawi, i. e.* "the Comprehensive Book" which included Greek, Syriac, and early medical knowledge in their entirety. It also includes a chapter on ophthalmology. For each disease Razi first cites all the Greek, Syrian, Arabic, Persian and Indian authors, and at the end gives his own opinion and experience and preserves many striking examples of his clinical insight.

In *alchemy* (chemistry), although dependent partly on the same sources as 'Jabir', Rhazes excels him in his exact classification of substances, and in his clear description of chemical processes

capital, Christian doctors visited the Umayyad court a popularized the science among the Arabs. But it was not un *Banu Abbas* came to power and established Baghdad as the capital that Greek medicine truly flourished all over the Islam world. The well-known family of the *Bakhtishu'* served t cause of medicine during the Abbasid period. It was the genuin interest of the early Abbasids, their liberal attitude towards learni and patronage of scholars, establishment of research centres, tha served the seeds of intellectual and literary activities. Th intensive translations activity in the early stages inculcated a passion for Greek, Iranian and Indian knowledge. This intellectual activity ultimately resulted in the Islamic renaissance which lasted until the 15th or the 16th century A.D. J.D. Bernal views it differently. In his opinion it was the continuation of the Greek tradition and may be described as a delayed action. But it was not simply a delayed action. The Muslim savants revived and, in fact, preserved ancient knowledge not only of the Greeks but also of the Iranians and the Indians through the translations. They went a step further: they not only learned the sciences but made original contributions in several disciplines like astronomy, algebra, chemistry, physics, geology, mechanics, logic, medicine, geography, philosophy and so on. Their knowledge was didactic encompassing the knowledge of several ancient civilizations.

Among the translators in the field of Medicine, the most prominent name was that of Hunayn b. Ishaq who was responsible for translating "practically the whole immense corpus of Galenic writings". His son Ishaq and nephew Hubaysh also made important contributions in this respect. Hunayn, in the opinion of Max Meyerhof, gave his supreme position in the east during the medieval period and indirectly also in the west. ? In the early period, both Syriac and Arabic translations were prepared but in the later half of the ninth century, Arabic tronslations increased in number and the centre of medical learning shifted from Jund-e-Shapur to Baghdad and Samarra. Thus, for nearly three centuries beginning from the period of translations, Christian, Sabaean, Jewish and Muslim scholars produced

rather "second class" in medical heirarchy. Hence, the term is used even today in a derogatory sense. But the term "*hakim*" (Philosopher) as used for a physician in India, was a respectable term and was synonymous with the term "doctor". Hence, both the terms "*hakim*" and "doctor" came to be used in east and the west in place of a '*tabib*' and "physician" which are more appropriate for the profession.

Until the dawn of the Industrial Revolution, or the 17th century, Greek medicine had not branched off into *Tibb* and Allopathy. It was taught largely on theoretical basis and practicals were shunned. It was from this period onwards that the teaching methods and the syllabi took a different course in Europe. This gave rise to Allopathy and *Tibb-i-Unani* lagged behind.

In order to get a clearer picture of the growth of Greek medicine in the medieval period, let us now examine the social, intellectual and educational factors that gave rise to the break-up of the system into two branches. This will place both the branches in their proper and correct historical perspectives. It will also reveal the causes of the advancement of Allopathy and those of *Tibb's* stagnation in the east.

Ample work has been done by modern orientalists on how Greek medicine survived at different centres of learning like Rome, Alexandria, etc. and how it then passed on to the Islamic world after the rise of Islam. However, long before the rise of Islam, it had ceased to be a living force.[1] Although there is evidence of the existence of a system of medicine current in Arab before the rise of Islam, but it could hardly have been a scientific system. About the middle of the sixth century, A. D., there arose in Jund-e-Shapur (Iran), an important medical school at which the Nestorian Christians played an important role in introducing the ancient Greek system of medicine. When *Banu Umayya* established their gavernment with Damascus as the

---

1. Max Meyerhof, The Legacy of Islam (Old ed.), P. 312

knowledge had the priority in this respect. But once the Greek knowledge was actually transmitted through Arabic translations of Greek or Syriac original treatises, it acquired ascendancy and became popular. Indian Ayurvedic system gradually receded and then lost its importance. It was largely because of its therapeutic value. Although, the ancients like Susrud and Charaka, had developed surgery and performed delicate operations, this was not continued by the Indian surgeons or physicians of Baghdad.

In the early stages, Greek medicine was introduced to Europe through Latin translations of Arabic classics on the subject which in turn were based on Greek sources. By the eleventh and twelfth centuries Unani medicine was fairly advanced in the Islamic world. Western physicians during this period learned and taught the science either directly through Arabic or through their Latin translations. During this early stage, eminent scholars of Arabic like Adelard of Bath, rendered Arabic scientific works into Latin. Spain in the West and Sicily in the south were the main centres of Islamic-Arabic learning which were visited by these scholars and knowledge—philosophy, astronomy, mathematics, physics, chemistry, etc.—was transmitted by them to Europe. In fact, these literary activities helped a great deal in ushering in the age of Renaissance in Western Europe. However, it was not until the fall of Constantinople and its conquest by the Ottaman. Turks in 1453 that the renaissance movement received an impetus Christian scholars of the erstwhile Byzantine empire migrated to Western Europe introducing original Greek works on science and philosophy. Thus, Western Europe got a direct access to the Greek works at a time when they were already acquainted with part of it in Latin translations of Arabic works. The fall of Constantinople was a political victory for the Turks but it was also a boon for Western Europe intellectually.

Greek medicine, therefore, acquired a new footing and the classics of Greek as well as Muslim physicians, philosophers and doctors continued to be taught in both the east and the west. The term *tobib* in Arabic was applied to a physician and the term "*Jarrah*" to a surgeon. However, the latter were considered

There is a general impression in India and elsewhere too, that Unani 'Greek' medicine or *Tibb* and Allopathy are totally two different systems of medicine, unrelated to each other. That the former is 'eastern' while the latter, 'Western'. It is to clear this notion that I have ventured to state the correct historical position of the two systems. Then, there is a tendency, again based on similar notion, among the practitioners of both the systems, to belittle each other or to consider the other person's system inferior to his own. The historical truth, however, is that, in the ultimate analysis, both the systems, namely Unani and Allopathy have their genesis in the ancient Greek system. The very word "Unani" is derived from "Ionian", and throughout the medieval period, it was known as Greek medicine. If one is to look at the two systems historically, one will find that the difference arose in the latter medieval period as a result of the lack of progress of the one and the advancement of the other. Hence, it is the degree of evolution and scientific growth that demarcated the area of one from the other and a cleavage took place between the two in modern times.

The Greek system of medicine was adopted and practised by the Muslims from the Abbasid period (from the 8th century A. D.) when translations of masters like Hippocrates and Galen were made. The translation activity continued for quite some time and made Greek Medicine popular in the Islamic world. It may be pointed out, however, that even before the transmission of the Greek medical science through the translations, ancient Indian systems of medicine had become known to the Muslim scholars of Baghdad. In the case of the Indian system called Ayurved, the works of Susrud and Charaka were rendered into Arabic from Sanskrit through the efforts of the Indian scholars who took the medical treatises to Baghdad, and popularized them there. Indian physicians established their practice in Baghdad and were quite popular with the elite of the society.

Greek medical as well as other scientific knowledge, especially astronomy and mathematics was a late comer; Indian

Prof. S. Maqbul Ahmad (b. 1920 Approx.). Took hi M. A. from the University of Bombay and B. Litt. and D. Phil from Oxford University. He served Aligarh Muslim Uuiversity fo over 28 years. He established serveral deptts. in the Universites o Aligarh and Kashmir. He also served Kashmir University as Director, Centre of Central Asian Studies. He is fellow of the Royal Asiatic Society, London, Member, German Oriental Society and Hon. Member of the Royal Jordanian Society for Islamic Civilisation Research.

He is the author of a number of books and articles on Islamic history and geography, among them Al-Idrisi, India and the Neighbouring Territories, Leiden, Al-Idrisi, Opus Geographicum, Rome and Naples (ed.); Indo-Arab Relation, ICCR, New Delhi, articles in the Encyclopaedia of Islam (New edition). Leiden, Dictionary of Scientific Biography, New York.

Khuda Bakhsh Extension Lectures 1985

UNANI MEDICINE AND ALLOPATHY

A COMPARATIVE STUDY

by

PROF. S. MAQBUL AHMAD
Aligarh

CONTENTS

Printers : Liberty Art Press. New Delhi and Patna Litho Press, Patna.
Publisher : Khuda Bakhsh Library, Patna (Phone 50109)
Editor : Dr. A. R. Bedar
Annual subscription : Rs100-00 (Inland), 20-00 Dollars (Asian countries), 40 Dollars (other countries)Rs. 25-00 per copy.

Khuda Bakhsh Library

JOURNAL

48

1988

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA-800004